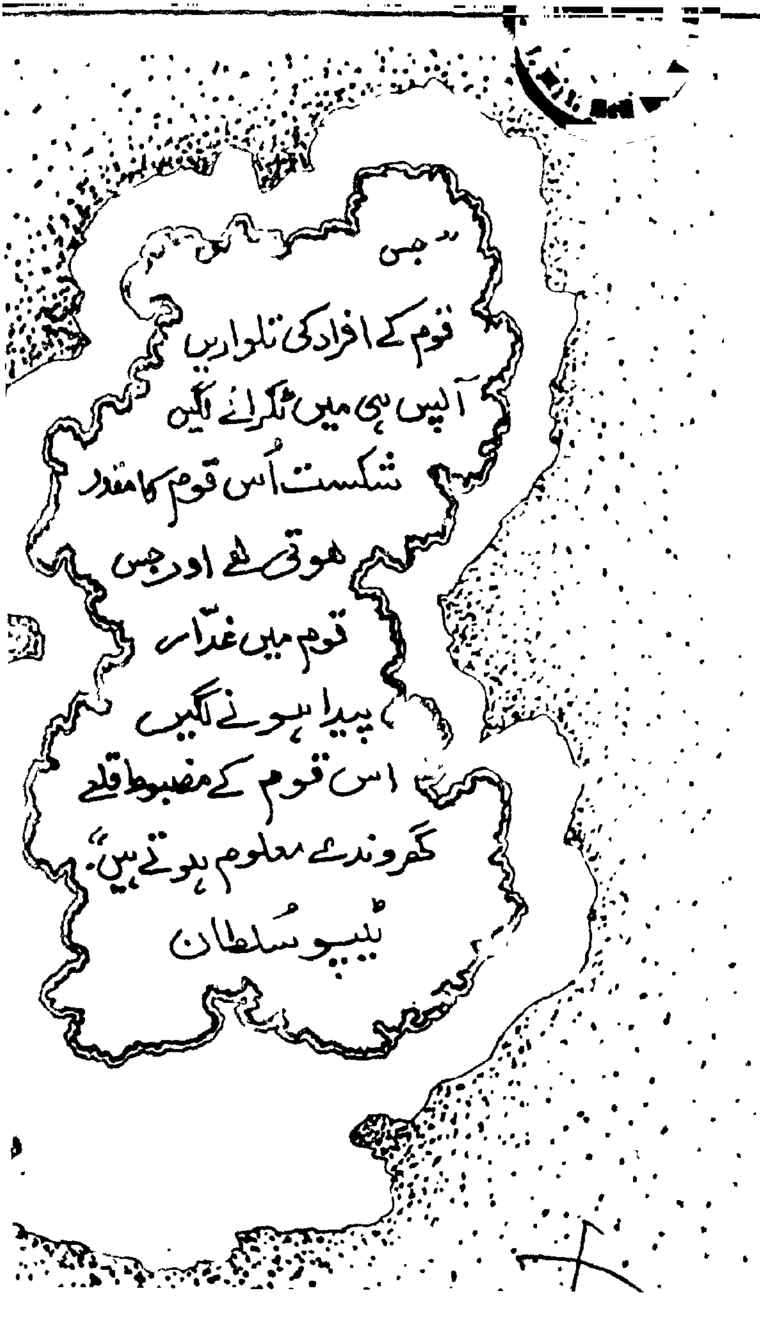
ماہنامہ

# تہذیب الاخلاق

جو ابر یہاں سے اٹھے گا
وہ سارے جہاں پر برسے گا

جنوری ۱۹۹۲ء




**Rs.4·50**


ادارہ
تہذیب الاخلاق
اینڈ
نشات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

# ٭ مجلس ادارت ٭



# ٭ اغراض و مقاصد ٭

۱. جہل، رجعت پسندی اور فرقہ پرستی کے خلاف جدوجہد، ذہنی بیداری، دانشوری اور مربوط فکری کی روایت کا احیاء۔ ماضی شناسی، حال آگہی اور مستقبل بینی کی دعوت۔ ۲. مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع، زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت ۳. ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط و اتحاد کا فروغ اور اردو ہندی کو قریب تر کرنے کی کوشش۔ ۴. ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی۔ ۵. ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نمو میں سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت کا چرچا ۶. سائنسی علوم و فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت ۷. علوم و فنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف

# ٭ مقالہ نگاروں کیلیے ٭

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے

عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے

مسودہ بڑے سائز 20 cm x 30 cm کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دور دور سطروں میں صاف صاف تحریر ہو کٹے پھٹے اور ناصاف مسودات رد کر دیئے جائیں گے۔

مقالہ میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنے والے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا ہوا ٹکٹ لگا لفافہ بھی ہو۔

بانی
سرسید احمد خاں

جلد ۱۱ — شمارہ ۱

# MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER
# تہذیب الاخلاق

جنوری ۱۹۹۲ء

سرپرست
## پروفیسر محمد نسیم فاروقی
وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر
## کبیر احمد جائسی

نائب مدیر
شباب الدین

انچارج سرکولیشن
شفیق احمد

تزئین
سرفراز

خط و کتابت کا پتہ:
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق [illegible]
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ، انڈیا
([illegible])

| | | |
|---|---|---|
| زر سالانہ: | انڈیا | Rs. 45.00 |
| * | بیرونی ممالک | US $ 20.00 ہوائی ڈاک |
| * | | US $ 8.00 بحری ڈاک |

PHONE 24827

ترسیل زر کا پتہ:
[illegible] تہذیب الاخلاق [illegible]
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

EDITOR,
TAHZIBUL AKHLAQ &
[illegible],
ALIGARH MUSLIM
UNIVERSITY, ALIGARH.

# مندرجات





[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]


مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد ۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق
اینڈ نشانات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ پریس: اے ایم یو پریس، علی گڑھ

# اداریہ

نئے مسیحی سال کے آغاز سے تہذیب الاخلاق کی زندگی کا بھی نیا سال شروع ہوتا ہے، اب تہذیب الاخلاق نے اپنی زندگی کے دس سال پورے کر کے گیارہویں سال میں قدم رکھا ہے۔ ان دس برسوں میں تہذیب الاخلاق ہی نے نہیں ساری دنیا نے زمانے کا جو سرد و گرم دیکھا ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں تاہم اتنا کہے بغیر چارہ بھی نہیں کہ بعض بعض محاذوں پر زندگی کو جو پے بہ پے کامیابی اور فتح حاصل ہوتی جا رہی ہے اس کی اہمیت اور معنویت اپنی جگہ مسلّم، ہم چاہیں تو اس کو تہذیبی پیشرفت کا ایک سنگ میل یا روشن باب قرار دے لیں مگر انسانی زندگی کے مسایل ہیں کہ الجھتے ہی چلے جا رہے ہیں انسانی زندگی کے مسایل کو حل کرنے کے لیے رت نئے تجربے ہو رہے ہیں، نظام حکومت کو بدلا جا رہا ہے، بہت سی چیزوں پر قدغن لگائی جا رہی ہے اور بہت سی چیزوں پر عاید شدہ پابندیوں کو ختم کیا جا رہا ہے مگر نہ تو مذکورہ قدغن ہی انسانی مسائل کا حل پیش کر پا رہی ہے اور نہ ہی عاید شدہ پابندیوں کا خاتمہ۔ اگر ایک طرف ایک مسئلہ کا حل تلاش کر لیا جاتا ہے تو دوسری طرف اس سے کہیں زیادہ سنگین اور بھیانک مسئلہ ہمارے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ گزشتہ دس برسوں میں پیشرفت کے عنوان سے ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے اس سے کہیں زیادہ سنگین اور بھیانک مسایل ہمارے سامنے آن کھڑے ہوئے ہیں جن کا حل دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اس احساس کی روشنی میں گزشتہ دس برسوں کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ گزشتہ دہے میں ہم نے پایا تو بہت کم ہے لیکن کھویا بہت کچھ ہے۔

ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں شدید انتشار کا دور دورہ ہے۔ وسائل نقل و حمل نے اب وسیع و عریض دنیا کو ایک بڑے سے گھر میں بدل کر رکھ دیا ہے۔ اگر ایک کمرے میں کوئی غیر معمولی یا غیر فطری بات وقوع پذیر ہوتی ہے تو اس کا اثر گھر کے تمام کمروں پر پڑتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ گھر کا ایک کمرہ غیر معمولی وقوعات کا آماجگاہ بنا رہے اور دوسرے کمروں کی زندگی ان وقوعات سے اثر انداز نہ ہو۔ دنیا کے کسی ملک میں اگر کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس کا اثر کم و بیش ہر ملک پر پڑتا ہے خواہ جغرافیائی اعتبار سے

ملک کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں۔ ۱۹۷۱ء سے شروع ہونے والے دہے کا سب سے اہم واقعہ ایران کا انقلاب تھا
نے اپنے پاس پڑوس ہی کے نہیں دور دراز کے ملکوں کو بھی محسوس اور غیر محسوس دونوں طریقوں سے متاثر کیا
ہ انقلاب کی اہمیت معنویت اور اس کے دوررس ہونے کا صحیح اندازہ تو پچاس سال بعد ہی لگایا جا سکے گا اس
ت تو اس کو ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ قرار دینے پر اکتفا کیا جائے گا۔ ۱۹۹۱ء سے شروع ہونے والے دہے کا
آغاز ہی ہوا ہے لیکن اس دہے کے پہلے سال ہی میں جو غیر معمولی واقعہ رونما ہوا ہے اس کے اثرات غالباً اس
ہے پر برابر پڑتے رہیں گے۔ ہمارا اشارہ سوویت یونین کے خاتمے کی طرف ہے۔ روس اپنی جگہ پر برقرار رہے
وسط ایشیائی اور یورپی جمہوریتیں اپنی جگہ برقرار رہیں گی لیکن سوویت یونین کا نام تاریخ کی کتابوں میں دفن
ہو جائے گا۔ بیسویں صدی کے آخری دہے کے اس عظیم واقعے کا اثر دنیا کے ہر ملک پر پڑے گا۔ ان اثرات
نوعیت کیا ہوگی اس کی طرف اشارہ کرنا قبل از وقت بات ہے۔

ہندوستان ہی میں نہیں دنیا کے تقریباً ہر ملک میں تشدد کا رجحان روز افزوں ہے، اس رجحان کا سنگین
پہلو یہ ہے کہ جو لوگ اس کا شکار ہوتے ہیں وہ بالکل بے قصور ہوتے ہیں۔ ہوائی جہازوں کو بموں سے اڑا دینا، چلتی
ہوئی ٹرینوں میں اندھا دھند فائرنگ کرنا، ٹرینوں، بسوں اور کاروں کو روک کر ان پر سوار لوگوں کو بے دردی سے
موت کے گھاٹ اتار دینا اب آئے دن کی بات ہو چکی ہے۔ اخبارات میں یہ خبریں شایع ہوتے ہوتے اتنی پامال ہو چکی ہیں
کہ شاید لوگوں نے اب ان خبروں کو پڑھنا اور ان وارداتوں کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا ہے لیکن یہ مسئلہ کا حل
تو ہے نہیں کہ شترمرغ کی طرح خطرہ سامنے دیکھ کر ریت میں سر چھپا لیا جائے۔ تشدد کے اس بڑھتے ہوئے رجحان
کو نہ تو دنیا کی کسی حکومت کا قانون ختم کر سکتا ہے نہ ہی فوج، پیرا ملٹری فورسس اور پولس کے محکمے سے وابستہ افراد۔
اس کا خاتمہ تو اسی وقت ممکن ہے جب اس کے لیے ملکی پیمانے پر عوامی جد و جہد کی جائے، عوام کو اپنے ساتھ لیا جائے اور عوام ہی
کے ہاتھوں تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان کو ختم کرایا جائے۔ مگر یہ سب کرے کون؟ "مزروعت" بڑھنے پر بہر "پارسا" تشدد کے رجحان
کو ہوا دیتا ہے، اس کے لیے خام مواد فراہم کرتا ہے اور رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھس میں چنگاری ڈال کر دور جا کھڑا
ہوتا ہے۔ جب یہ عالم ہے تو تشدد کا رجحان ختم ہو تو کیسے؟

تہذیب الاخلاق کوئی سیاسی رسالہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کے ایڈیٹر کا یہ منصب ہے کہ وہ سیاسی مسایل پر اظہار
خیال کرے لیکن جب اہل سیاست کے لگائے ہوئے گل بوٹے آگ اگلنا شروع کر دیں تو اپنے گھر کو بچانے کے لیے اہل
سیاست کی چالوں کو تو سمجھنا ہی پڑے گا اور جہاں تک ہو سکے ان کے مضر اثرات کو بے نقاب تو کرنا ہی ہوگا تاکہ اہل سیاست
کے گھروں کے ساتھ ساتھ خود ہمارے گھر جل کر خاکستر نہ ہو جائیں۔ ۱۹۹۱ء اپنی تمام خرابیوں اور خوبیوں کے ساتھ ہم سے
رخصت ہوا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ۱۹۹۲ء ہم کو کس طرف اور کہاں لے جاتا ہے؟

کبیر احمد عباسی

# وحشیانہ نیکی

سر سید احمد خاںؒ

انسان وحشیانہ طور پر ایک نیک کام کرتا ہے، اور جو کہ وہ دراصل نیک ہوتا ہے لوگوں کے دل میں بیٹھ جاتا ہے اور اس وحشیانہ پنے کی برائی جس وحشیانہ پن سے یہ کام ہوا، آنکھوں سے چھپ جاتی ہے۔ مگر عمدہ تعلیم میں یہ اثر ہے کہ ان وحشیانہ حرکتوں کو چھڑا دیتی ہے اور صرف نیکی ہی نیکی رہ جاتی ہے۔

نقل ہے کہ ایک شخص کے پاس دو حبشی لڑکے تھے۔ ان دونوں میں جانی دوستی اور دلی محبت تھی۔ اس شخص کے پاس ایک حبشن نو عمر لڑکی بھی تھی، جو اس قوم میں نہایت ہی خوب صورت سمجھی جاتی تھی۔ اتفاقاً دونوں جوان لڑکے اس پر عاشق ہو گئے اور دونوں نے اس کو شادی کا پیغام دیا۔ وہ لڑکی دونوں میں سے جس کے ساتھ شادی ہو راضی تھی، مگر اس نے کہا کہ تم دونوں دوست آپس میں اس بات کا تصفیہ کر لو کہ دونوں میں سے کس کے ساتھ شادی ہو۔

عشق اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ ایک تو اس سے شادی کر لے اور دوسرا محروم رہے اور دوستی بھی ان میں ایسی سچی تھی کہ بغیر آپس کی صلاح اور بغیر آپس کی خوشی کے دونوں میں کسی کو شادی کر لینا پسند نہ تھا۔ آخر کار عشق اور دوستی میں جھگڑا ہوا، مگر کوئی جیت نہ سکا، دونوں برابر رہے۔

تب وہ دونوں لڑکے اپنی معشوقہ کو ایک دن جنگل میں لے گئے اور دونوں نے اس کو چھری مار کر مار ڈالا اور جب اس کا خون بہنے لگا تو دونوں لے چاٹنے لگے۔ دونوں نے مردہ لاش کو خوب گلے لگایا اور دلی محبت سے اس کے دلفریب گالوں کا بے پناہ بوسہ لیا اور پھر اس کی لاش کے گرد بیٹھ کر رونے اور پیٹنے لگے۔ خوب ماتم کیا، خوب چھاتی پیٹی اور پھر دونوں نے اپنے تئیں بھی مار ڈالا۔

اس عجیب واقعہ سے انسان کے دل کے جوشوں کی جو تعلیم و تربیت سے شائستہ نہیں ہوئے، عجیب و غریب حالتیں معلوم ہوتی ہیں، جو واقعہ کہ میں نے ابھی بیان کیا، وہ حیرت اور گناہ سے بالکل بھرا ہوا ہے تو بھی ایسے نیک دل اور دلی ایمان داری سے سرزد ہوا ہے کہ اگر اس کی عمدہ طور سے تعلیم و تربیت ہوتی تو اس سے نہایت عمدہ عمدہ نتیجے حاصل ہوتے۔

انسان کا ایسے ملک میں پیدا ہونا، یا وہاں جا کر رہنا اور تعلیم و تربیت پانا جہاں تعلیم و تربیت کا چرچا ہو اور علم و شائستگی پھیلی ہوئی ہو، نہایت خوش قسمتی کی بات ہے، گو ان ملکوں میں ایسے لوگ بھی

ہوتے ہیں جو ان وحشی لڑکوں سے کچھ بہتر نہیں ہوتے ۔
شائستہ ملک کی مثال مورت بنانے والے سنگ تراشن کے کارخانے کی سی ہے کہ جب آدمی وہاں جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ابھی تو کوئی پتھر اسی طرح ڈھوکے کا ڈھوا ہی رکھا ہوا ہے اور کسی میں ابھی صرف ٹانگیں ہی بنی ہیں اور کسی میں ہاتھ پاؤں منہ سب کٹ چکا مگر ابھی انگھڑ ہے؛ اور کسی میں انسان کے تمام اعضا درستی سے بن چکے ہیں مگر صاف ہونے اور جلا ہونے باقی ہیں، کوئی مورت نہایت خوب صورت اور دلربا بن کر تیار ہو چکی ہے ۔ اس وقت انسان کے دل میں ضرور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ پتھر کا ڈھوا کہاں تک ترقی پا سکتا ہے اور ہر ایک انگھڑ صورت سوائے شاذ و نادر کے، آذر سے بت تراشن کے ہاتھ سے نہایت خوب صورت یا قریب قریب خوب صورت کے ہو سکتی ہے ۔

نامہذب ملک کی مثال منڈے پہاڑوں کی سی ہے، جہاں بجز پتھر کے ڈھوکوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا ۔ کوئی مثال ایسی نظر نہیں آتی، جس سے انسان کو یہ خیال ہو کہ وہ کہاں تک ترقی کر سکتا ہے اور اس میں کیا چیز نہیں ہے جو وہ اب تک انگھڑ پتھر کی مانند ہے جو نیکیاں خود اس میں ہیں، اس سے بھی وہ ناواقف ہے کیونکہ وہ نیکیاں مثل پتھر کے ڈھوکے کے اس جگہ میں چھپی ہوئی ہیں اور بے تعلیم و تربیت کے وہ ظاہر نہیں ہو سکتیں ۔

یہی خیالات مجھ کو اس بات پر برانگیختہ کرتے ہیں کہ میں اپنی قوم کو مہذب قوم سے ملنے اور شائستہ ملک میں میں جانے کی ترغیب کرتا ہوں اور اس خیال سے ہمیشہ رنج میں رہتا ہوں کہ ہماری قوم میں جس قدر نیکیاں ہیں، وہ بھی نامہذب ہیں ۔ دنیاوی برتاؤ میں آپس کا ملاپ، دوستوں کی دوستی، دین داروں کی دین داری امیروں کی امیری نہایت ناشائستہ اور نامہذب طور سے واقع ہوئی ہے ۔ اگر وہ عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاوے تو انسان کے لیے اس زندگی میں اور آنے والی زندگی میں دونوں میں نہایت ہی مفید ہو ۔

" انسان دنیا سے جاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں ۔ تین عمل نفع بخش اور باقی رہنے والے ہیں

۱۔ علم نافع
۲۔ وقف فی سبیل اللہ
اور
۳۔ ولد صالح ۔ "

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

# مسلم یونیورسٹی برائے خواتین

محمد شریف خاں ▽

ہمارے ملک میں تعلیم خواتین عمومی طور پر اور تعلیم مسلم خواتین خصوصی طور پر غفلت کا شکار ہے۔ تعلیمی منصوبہ بندی میں بھی اس کا خاطر خواہ انتظام نہیں رکھا گیا ہے۔ مسلم عوام میں تعلیم کی بے حد کمی ہے اور خواتین کی تعلیم تو ناگفتہ بہ حالت سے دوچار ہے۔ ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ تعلیم چاہے ان میں سے کسی پر بھی نظر ڈالیں اس میں مسلم عوام بہت پس ماندہ نظر آتے ہیں اور مسلمانوں میں مسلم خواتین تو اور بھی زیادہ پیچھے دکھائی دیتی ہیں۔ یہ مسئلہ صرف تعداد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ جو تعلیم خواتین کو فراہم بھی کی جاتی ہے اس میں مردوں کی ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے۔ مسلم معاشرے میں خواتین کا ایک اہم مقام ہے اور ممتاز حیثیت ہے اور اپنی اس ممتاز حیثیت کا کردار ادا کرنے کے لیے ان کو خصوصی تعلیم کی ضرورت ہے، ایک خصوصی نظام تعلیم کی ضرورت ہے اور ان سب کے لیے ایک مسلم یونیورسٹی برائے خواتین کی ضرورت ہے۔ اس یونیورسٹی کی ذمہ داری اس تعلیمی ذمہ داری سے مختلف ہوگی جو مخلوط نظام تعلیم میں فراہم کیا جا رہا ہے۔ اس کی خصوصی ذمہ داری ہوگی کہ وہ مسلم طالبات کی خصوصی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنا تعلیمی پروگرام تیار کرے جو مخلوط نظام تعلیم میں ممکن نہیں ہے۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ خواتین کی کچھ ممتاز خصوصیات ہوتی ہیں جس کی بنیاد پر ہمارے ملک میں بھی کچھ خواتین یونیورسٹیاں قایم کی گئی ہیں جو اپنا خصوصی کام انجام دے رہی ہیں۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی خصوصی ضروریات کو دیکھ کر ایک مسلم کالج کی بنیاد ڈالی جو خدا کے فضل و کرم سے ایک مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ اگر ان کو وقت ملتا اور وسایل اجازت دیتے تو وہ ایک مسلم یونیورسٹی برائے خواتین کی بھی بنیاد ڈالتے۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اب اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ایک مسلم یونیورسٹی برائے خواتین کی بنیاد ڈالی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی بنیاد تو ہندوستان کے کئی مسلم خواتین کالج کی شکل میں اب بھی موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو ترقی دے کر مسلم یونیورسٹی برائے خواتین میں تبدیل کیا جائے۔ حکومت ہند نئی تعلیمی پالیسی کے تحت خواتین کی تعلیم کو فروغ دینا چاہتی ہے اور کیونکہ نئی تعلیمی پالیسی نے مسلمانوں کو تعلیمی طور پر پس ماندہ قبول کیا ہے۔ لہٰذا

---

▽ پروفیسر شعبہ تعلیم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ (یو۔پی)

یہ کام عین حکومت ہند کی تعلیمی پالیسی کے مطابق ہوگا۔

ہزاروں مسلمان طالبات اپنی اعلیٰ تعلیم سے اس لیے محروم رہ جاتی ہیں کیونکہ ان کے والدین یا سرپرست اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کی لڑکیاں مخلوط تعلیم کے ذریعے اپنی علمی لیاقت میں اضافہ کریں جس کی بنا پر بہت سی ذہین مسلم طالبات اپنے جائز حق سے محروم ہو جاتی ہیں، یہ بڑی محرومی کی بات ہے کہ مسلمانوں کے جو خاندان اعلیٰ اسلامی قدروں میں یقین رکھیں اور اس پر عمل پیرا ہوں تو اُن کی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم سے اس لیے محروم ہو جائیں کیونکہ خواتین کے لیے کوئی مسلم یونیورسٹی نہیں ہے۔ یہ محرومیت ایک طرف طالبات میں اسلام اور اپنے والدین سے بغاوت کے جذبے کو فروغ دیتی ہے اور دوسری طرف والدین اور سرپرستوں پر دباؤ ڈالتی ہے کہ وہ اسلامی قدروں کو پامال کریں۔ اس کے علاوہ اس سے ان مسلمان خاندانوں کو شہ بھی ملتی ہے جو مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر اسلامی قدروں کو پس پشت ڈال چکے ہیں۔

جو حضرات اور خواتین اعلیٰ تعلیم سے متعلق ہیں وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ جو لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے شوق میں مخلوط نظام تعلیم کے تحت اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہیں ان کو کس کس پریشانی سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ گھر یا ہاسٹل سے تعلیم گاہ تک آنے جانے میں اور تعلیم گاہ میں ایک کلاس روم سے دوسرے کلاس روم تک جانے میں جن ذہنی اذیتوں اور فقرہ بازیوں کا شکار ان کو ہونا پڑتا ہے۔ اس سے یا تو وہ خود طالبات واقف ہوتی ہیں یا ایسے لوگ جو اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں کام کرتے ہیں۔

اس مخلوط تعلیم کا ایک اور بڑا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ نہ صرف طالبات کو ایسے اداروں میں داخلہ لینا پڑتا ہے جن میں زیادہ تعداد مردوں کی ہوتی ہے بلکہ جو کالج خصوصی طور پر خواتین کے لیے قائم کیے گئے ہیں ان میں بھی مردوں کا تقرر کیا جانے لگا ہے اور دن بہ دن ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اس کے لیے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ خواتین دستیاب نہیں ہیں اول تو یہ عذر خود خواتین کے خلاف سازش کا نتیجہ ہے۔ دوئم یہ خود اس بات کا متقاضی ہے کہ خواتین کی علیحدہ یونیورسٹیاں قائم کی جائیں تاکہ ہر مضمون میں خواتین اعلیٰ تعلیم پائیں اور جتنے بھی خواتین کے کالج ہیں ان کے لیے خواتین معلمات دستیاب ہوں۔

اس بات کی آواز تو سنائی دینے لگی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اکیلی اس قابل نہیں ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس لیے جنوب میں ایک اور مسلم یونیورسٹی قائم کی جائے اور یہ عین ممکن بھی ہے کہ ایسا ہو جائے کیونکہ جنوب میں مسلمانوں نے اچھے مسلم کالج قائم کر لیے ہیں، مگر ابھی اس بات کی طرف توجہ نہیں دی گئی کہ طالب علموں کی دوسری یونیورسٹی قائم کرنے سے قبل مسلم خواتین کی پہلی یونیورسٹی بھی قائم کی جائے۔

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کے مقابلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کرنے میں پیچھے رہ گئے جس کے اثرات آج تک دکھائی دیتے ہیں۔ اگر خواتین کے لیے مسلم یونیورسٹی قائم کرنے میں مزید دیر کی تو اس کے نتائج پہلے تجربے سے بھی زیادہ ہولناک ثابت ہوں گے۔ مرد کی تعلیم ایک فرد کی تعلیم ہوتی ہے مگر عورت کی تعلیم ایک خاندان کی تعلیم ہوتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں اور انگریزوں کی حکومتوں میں ہندو مرد تو اپنے مذہب سے بیگانہ ہو گئے تھے اور انھوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں سے اپنے ربط و ضبط بہت زیادہ بڑھا لیے تھے مگر ہندو دھرم کی حفاظت ہندو عورتوں نے کی تھی اور اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم بھی ان ہی نے گھر پر دی تھی۔ اسی طرح اگر مسلمان عورتیں تعلیم یافتہ ہوں

گی تو مسلمانوں کی مادری زبان اور ان کا مذہب اور ان کی ثقافت محفوظ رہے گی، ورنہ مسلمان مرد تو زبان اور تہذیب سے دور جا چکا ہے۔

اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ وہ یونیورسٹی خالص اسلامی قدروں پر قایم کی جائے کیونکہ جو مسلمان خواتین مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس ڈھنگ پر اعلیٰ تعلیم چاہتی ہیں وہ تو مخلوط تعلیم سے بھی فائدہ اٹھا سکتی ہیں اور ایسی خواتین یونیورسٹیوں میں بھی تعلیم پا سکتی ہیں جو پہلے ہی ہمارے ملک میں قایم ہو چکی ہیں۔ جو مسلم طالبات اور جو مسلمان خاندان اعلیٰ تعلیم میں اسلامی اقدار کو اہمیت دیتے ہیں ان کے لیے یہ یونیورسٹی بڑی مفید ثابت ہوگی۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ اس طرف فوری توجہ دی جائے تاکہ مسلمان خواتین میں اعلیٰ تعلیم کو فروغ حاصل ہو۔

---

علی گڑھ میں ہر جگہ کے نوجوان طلبا، ہر گوشۂ ملک سے آتے ہیں۔ دن رات کا ساتھ رہتا ہے۔ ہر شخص کو خواہ وہ کسی مذاق یا میلان کا ہو اپنا رفیق و ہمدم مل جاتا ہے۔ علی گڑھ کی اس خصوصیت کا اثر یہ ہے کہ یہاں کا ہر طالب علم رفتار، گفتار و کردار میں بے نقاب ہو کر رہتا ہے خواہ وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ کوشش کرے۔ یہی سبب ہے کہ یہاں کے ہر طالب علم کا ایک ربط نہانی علی گڑھ سے مدت العمر قایم رہتا ہے اور وہ علی گڑھ کی یاد کو اپنی زندگی کی سب سے اچھی یاد سمجھتا ہے۔ چنانچہ کسی علی گڑھ والے کو میں پبلک لائف میں پاتا ہوں تو اس کے طالب علمی کے اعمال نامہ پر نظر ڈال کر اندازہ لگا لیتا ہوں کہ وہ کیا ہے، کیسا ہے۔ خواہ پبلک میں اس کے اعزاز میں نعرہ ہائے تحسین بلند کیے جاتے ہوں، خواہ نعرہ ہائے نفریں۔

—— رشید احمد صدیقی

# عربوں کے نقوش و اثرات

محمد اسلم صدیقی ▽

بحیثیتِ مجموعی عربوں کے تمدن اور علوم و فنون کے نقوش و اثرات بے حد پُرکشش اور دور رس نتائج کے حامل تھے۔ چنانچہ جہاں جہاں وہ پہنچے، وہاں کی آبادی اُن کے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کے نقوش آج بھی نمایاں ہیں۔ یہ موضوع اگرچہ بہت دلچسپ اور پُرتاثیر ہے لیکن اس مختصر تحریر میں صرف مشرق اور مغرب کے علاقوں میں جو عربی اثرات پڑے اُن کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے۔

## عربوں کا اثر مشرق پر

اگرچہ ممالک شرقیہ پر باستثنائے حجاز، بہت سی قوموں نے تسلط حاصل کیا اور ایرانیوں، یونانیوں اور رومیوں وغیرہ نے وقتاً فوقتاً اُن پر حکومت کی۔ ان پر ملکی تسلط تو طاقت پر مبنی تھا کیونکہ اس میں جبر و تعدی کو دخل تھا مگر تمدنی اثر بہت ہی کم ہوا سوائے اُن مقامات کے جہاں انھوں نے قیام کیا وہاں وہ نہ اپنے مذہب کو جاری کر سکے اور نہ ہی اپنی زبان کو نہ اپنے علوم و فنون اور حرفت کو اور نہ ہی اپنے معاشرتی تمدن کو۔ جس نتیجے اور کامیابی کو ایرانی و یونانی اور نہ رومی مشرق میں حاصل کر سکے تھے وہ، عربوں نے بہ سرعت اور بلا جبر و اکراہ حاصل کر لیا۔ بظاہر مصر وہ ملک معلوم ہوتا تھا جس میں ایک غیر قوم کے خیالات کا قایم ہو جانا نہایت دشوار تھا۔ تاہم حضرت عمرو بن العاصؓ کی فتح مصر سے ایک صدی کے اندر ہی مصر کا ملک، جس نے سات ہزار برس کے تمدن کو فراموش کر دیا اور اس نے ایک نیا مذہب (اسلام) اور ایک نئی زبان (عربی) اور ایک نئی صنعت و تہذیب و تمدن اس استحکام کے ساتھ اختیار کر لیا کہ یہ چیزیں ان ملک گیروں (مسلمانوں) کے بعد بھی، جنھوں نے ان کو جاری کیا تھا آج بھی قایم اور سلامت ہیں۔ مصریوں نے عربوں سے قبل ایک ہی بار اپنے مذہب کی تبدیلی کو قبول کیا تھا اور وہ اس زمانے میں جب کہ قسطنطنیہ کے شہنشاہوں نے ملک میں غارت گری برپا کی تھی اور تمام پرانی یادگاروں کو برباد اور تہس نہس کر دیا تھا اور پرانے مصری معبودوں کی پرستش کو جرم، سزائے موت قرار دے دیا تھا۔ مصریوں نے اس جبر و ظلم کے تحت عیسائیت کو جبراً منظور کر لیا تھا مگر دل سے اس کو کبھی قبول نہیں کیا اور پھر جب اسلام سامنے آیا تو انھیں مصریوں نے بڑی سرعت سے عیسائیت

▽ غازی پور لاج، سر سید نگر، علی گڑھ

سے کنارہ کشی اختیار کر کے حلقہ بگوش اسلام ہونا بہ رضا و رغبت قبول کر لیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جابرانہ مذہب (عیسائیت) کا تسلط، ان کے قلوب پر کس قدر کمزور تھا۔ جو اثر عربوں نے مصر پر ڈالا وہی انھوں نے افریقہ، شام، ایران اور افغانستان وغیرہ پر بھی ڈالا اور ان مفتوحہ ممالک میں اُس نے اسلام بھی پھیلایا جس کو وہاں کے باشندوں نے بلا جبر و اکراہ، بہ رضا و رغبت قبول کیا۔ ان کا یہ تسلط نہ فقط ہندوستان تک پہنچا بلکہ چین تک پھیل گیا۔ جہاں صرف مسلم تاجروں کا گزر ہوا تھا۔ تاریخ عالم میں کسی قوم کے تسلط کی اس سے زیادہ صاف اور واضح مثال موجود نہیں ہے اُن تمام اقوام نے جن سے عربوں کا سابقہ پڑا خواہ وہ چند روز کے لیے ہی کیوں نہ ہو، انھوں نے ان کے تمدن کو قبول کر لیا اور جب وہ صفحۂ روزگار سے گزر گئے تو خود ان کے فاتحین (ترک و مغل وغیرہ) نے اسلام اور تمدن کو اختیار کر لیا اور دنیا میں اس کے فروغ و اشاعت کا ذریعہ بن گئے۔ یعنی ع

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اگرچہ کئی صدیوں سے تمدن عربی، کمزور و مضمحل ہو چکا ہے لیکن اس وقت بھی بحر اٹلانٹک سے دریائے سندھ اور پھر بحر متوسط سے ریگستان اور افریقہ تک، ایک ہی مذہب اسلام اور ایک ہی زبان عربی جاری ہے۔ ایران میں اگرچہ فارسی زبان نے فروغ حاصل کر لیا اس کے باوجود یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ آج بھی ایرانی ان ہی کتابوں سے اکتساب فیض کرتے ہیں جو عربی زبان میں ہیں اور اسی زبان عربی میں علمی تصنیفات کا سلسلہ جاری ہے اور یہی حال تقریباً تمام ممالک مشرقی میں بھی ہے۔ مثلاً افغانستان، پاکستان، ہندوستان، انڈونیشیا اور ملائشیا وغیرہ۔

## عربوں کا اثر مغرب پر

بقول فاضل موسیو لی بان:

" تقریباً مشرق ہی کی طرح مغرب بھی عربوں سے متاثر ہوا اور ان ہی کی بدولت یورپ نے تمدن حاصل کیا۔ مشرق اور مغرب کے اثر کی نوعیت میں ایک فرق ضرور ہے۔ مشرق میں یہ اثر زیادہ تر مذہب و زبان اور فنون و حرفت پر ہوا۔ برخلاف اس کے مغرب میں مذہبی اثر بالکل نہیں ہوا مگر علوم و فنون و ادب اور حرفت کا اثر بے انتہا ہوا۔ عربوں نے مغرب پر جو اثر ڈالا اس کا صحیح اندازہ اس بات سے ہوگا کہ اس وقت مغرب کا کیا حال و مقام تھا جس وقت کہ عربوں کا تمدن وہاں پہنچا تھا۔ اگر ہم یورپ کی نویں دسویں صدی عیسوی کی حالت کو، جس وقت مسلمانوں کا تمدن اندلس میں اعلیٰ درجے کی ترقی و عروج پر تھا، دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مغرب کے علمی مراکز، گویا بڑے بڑے بے ڈھنگے قید خانے تھے جہاں ان ملکوں کے امرا، اپنی نیم وحشی حالت میں زندگی گزار رہے تھے اور اس پر فخر و ناز کرتے تھے کہ انھیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔"

یہ ایک مغربی فاضل کا اعتراف حقیقت ہے یعنی وہ اپنی جہالت پر نازاں اور مسرور تھے۔ اہل یورپ میں یہ وحشیانہ حالت ایک زمانۂ دراز تک ایسی شدید رہی کہ خود ان کو اس کا احساس تک نہ تھا۔ البتہ گیارہویں صدی عیسوی میں اور زیادہ تر بارہویں صدی عیسوی میں کسی قدر علمی امنگ پیدا ہونے لگی تھی جس وقت چند روشن خیال اشخاص کو اس جہالت کے کفن کو پھاڑنے کا احساس

ہوا اور اس احساس کے تحت انھوں نے عربوں کی جانب
جو اس دور کے اساتذہ تھے، رجوع کیا۔ یورپ کے اس
دور کو عموماً "دورِ جہالت اور دورِ مظلمہ" کہا گیا ہے۔
پورا براعظم جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیارے میں غرق تھا
بار بار یہ کہا جاتا رہا ہے کہ یورپ میں عربوں کے علوم
جنگِ صلیبی کے ذریعے نہیں پہنچے بلکہ اندلس اور جزیرۂ صقلیہ
اور اطالیہ کے ذریعے پھیلے۔ ۱۱۳۰ء میں طلیطلہ میں اسقف
اعظم ریمانڈ کی سرپرستی میں ایک مدرسۂ مترجمین قائم ہوا۔
اور اس نے تمام مشہور عربی تصانیف کا لاطینی میں ترجمہ
شروع کیا۔ ان ترجموں نے بے حد کامیابی اور قبولیت کا
حاصل کی۔ یورپ کی آنکھوں کے آگے ایک نئی دنیا نظر آنے
لگی۔ یعنی جہالت اور تاریکی کے گھنے بادل چھٹنے لگے اور
علم کی روشنی سے فضائے مغرب منور ہونے لگی۔ ان علوم و
فنون کی فہرست طویل ہے جس کو مغرب نے عربوں سے
حاصل کیا اور سیکھا۔ ان میں رازی، زہراوی، ابن سینا
ابن رشد اور ابن الہیثم وغیرہ کتنے ہی عظیم فضلا ہیں جن کی
تصانیف سرفہرست ہیں۔ بقول موسیو لی بیری:

"اگر عربوں کا نام تاریخ میں سے نکال دیا
جاتا تو یورپ کی علمی نشاۃ ثانیہ کئی صدیوں
تک پیچھے ہٹ جاتی۔"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف عربوں کے اندلس میں
دسویں صدی عیسوی میں ہونے کی وجہ سے یورپ کے
ایک گوشے میں علم و ادب کا چرچا باقی رہا۔ جو ہر جگہ یہاں
تک کہ قسطنطنیہ میں متروک ہو چکا تھا۔ اس دور میں بجز
اسلامی مشرق کے، اور مغرب میں، علاوہ عربی سرزمین
اندلس کے، اور کوئی مقام نہ تھا، جہاں علوم کی تحصیل
کرنا ممکن ہو اور یہیں وہ خاص اور معدودے چند
اشخاص جن کو علم کا شوق تھا، تحصیل علم کے لیے آتے تھے
ایک اختلافی مگر دلچسپ روایت کی رو سے، جس کا غلط
ہونا اس وقت تک ثابت نہیں ہوا ہے، یہ واقعہ بیان
کیا گیا ہے کہ

"گربرٹ نامی ایک شخص ۹۹۹ء میں
سلوسٹر دوم کے نام سے پوپ بن
گیا تھا اور اس نے کچھ علم حاصل کیا اور
جب اس نے اپنے علم کی یورپ میں
اشاعت کرنی چاہی تو لوگوں کو یہ بات
اس قدر خلافِ عقل و فطرت معلوم ہوئی
کہ انھوں نے اس پر شیطان مسلط کرنے
کا الزام لگایا۔"

پندرھویں صدی عیسوی تک کسی ایسے مصنف کا حوالہ نہیں
دیا جاتا تھا جس نے محض عربوں سے نقل نہ کیا ہو۔ راجر
بیکن، پیسا کا لیونارڈ، ویل نووا کا آرنو، ریمانڈ لل، سینٹ
ٹامس، البرٹ اعظم اور الفانسو یازدھم وغیرہ یہ سب کے
سب یا تو عربوں کے شاگرد تھے یا اُن کی تصنیفات کے
ناقل اور خوشہ چیں۔ موسیو رینان کے بقول:

"البرٹ اعظم نے جو کچھ پایا ابن سینا سے پایا۔
اور سینٹ ٹامس کو سارا فلسفہ ابن رشد سے
ملا۔"

الغرض ان ہی عربوں کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں پر علی الخصوص علمی
کتابوں پر پانچ چھ صدیوں تک یورپ کے کل دارالعلوموں
میں تعلیم کا دارومدار رہا۔ مثلاً طب میں یہ کہا جا سکتا ہے
کہ عربوں کا علمی تسلط خود ہمارے فاضل موسیو لی بان کے
زمانے ۱۹۰۰ء تک رہا ہے۔ کیونکہ ۱۸۰۰ء کے آخر تک فرانس
میں ابن سینا کی تصانیف کی شرحیں لکھی جاتی تھیں۔ خاص طور
پر ابن سینا کی القانون جس کے متعلق بقول سر ولیم اوسلر:

"القانون کو یورپ میں صدیوں "طبی انجیل"
کا مرتبہ و مقام حاصل رہا ہے۔ یہاں کے
دارالعلوموں میں تصانیف عرب کی وقعت وہی

تھی جو بعد میں نشاۃ ثانیہ کے یونان و روم کی تصانیف کی ہو گئی۔

بقول فاضل موسیولی بان:

"ایک مشہور مغربی پیٹرارک کی پُرجوش شکایتوں سے ہمیں علوم عرب کے تسلط اور فوقیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ڈیماس تھینز سے سسرو فصیح نکلا۔ ہومر کے بعد ورجل ہوا مگر کہا جاتا ہے عربوں کا کوئی مقابلہ تحریر (تصانیف) میں نہیں کر سکتا۔ حالانکہ ہم اکثر یونانیوں کے برابر ہیں اور بعض باتوں میں ان سے بڑھ گئے ہیں یعنی تمام اقوام عالم پر فوقیت لے گئے، لیکن تم کہتے ہو کہ باستثنائے عرب واے ہماری حماقت۔ واے ہمارا جنون۔ اور فطرت اطالیہ! کیا تو سو گئی؟ کیا تو مر گئی ہے؟

الغرض! جب عربوں کا تسلط یورپ کے ان حصوں میں جہاں ان کی تصانیف پہنچی تھیں اس قدر تھا تو ہم بہ آسانی یہ خیال کر سکتے ہیں کہ ان حصوں میں جہاں عرب حکمراں تھے یعنی اندلس کے حصوں میں کس قدر زیادہ اثر رہا ہو گا۔ عربوں کا اثر اگرچہ یورپ کے مذہب پر زیادہ نہیں ہوا لیکن ان کے تمدن اور رسم و رواج پر ضرور رہا۔ مزید برآں ان کے وحشیانہ اعمال کے بمقابل عربوں کے اثر نے ان میں شائستگی، بہادرانہ اخلاق اصناف اور عمدہ برتاؤ پیدا کیا، جس سے وہ بالکل تہی دامن تھے۔ اگرچہ عربوں نے یورپ میں بھی قیام کیا ہوتا تو لازماً ان کے مذہب (عیسائیت) پر بھی براہِ راست ضرور اثر انداز ہوتے۔ لیکن عربوں نے وہاں قیام نہیں کیا بلکہ فوجی مہم کے سلسلے میں وہ ان علاقوں میں جاتے اور جو فوجی مقاصد تھے ان میں کامیابی حاصل کر کے واپس لوٹ آتے تھے۔ برعکس اس کے مشرقی ممالک میں انھوں نے قیام کیا اور اس لیے ان کے مذاہب بھی مثل تمدن، عربوں سے پوری طرح اثر پذیر ہوئے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے!

فاضل موسیولی بان کا یہ قول، جس کا ذکر آ چکا ہے کہ "(عربوں کا) مغرب میں مذہبی اثر بالکل نہیں ہوا" پوری طرح سچ نہیں ہے۔ برعکس اس کے حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں بھی مذہبی اثر ہوا مگر اس قدر نہیں جتنا کہ مشرق میں ہوا۔

اسلام کی دعوتِ توحید اور بت پرستی اور شرک (جس میں مغرب کا عیسائی بھی مبتلا تھا) کی ایسی مدلل اور پرزور مذمت اور ہجو کی کہ بت پرستی اور شرک ہمیشہ کے لیے بے وقعت اور ذلیل ہو گیا۔ لوگوں کو اس سے وابستگی اور انتساب پر شرم آنے لگی اور اس سے وہ اپنے کو غلط تاویلیں کر کے بری ثابت کرنے لگے یا تو وہ بڑی جرأت اور بلند آہنگی کے ساتھ اس عقیدے (بت پرستی) کا اقرار کرتے اور اس کے پیرو اور مبلغ تھے یا اب اپنے مذہب کے مشرکانہ اجزاء و اعمال کی تاویل اور اس کی تشریح کی ایسی کوشش کرنے لگے کہ وہ توحید سے ملتی جلتی نظر آنے لگے۔ چنانچہ عیسائیوں میں ایسے گروہ پیدا ہو گئے، جو حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا انکار اور عقیدۂ تثلیث کی توحید نما تشریح کرنے لگے اور ان میں ایسے مبلغ بھی پیدا ہوئے جو عیسائیوں کے مذہبی گروہ اور اہل کلیسا کے، اللہ اور بندے کے درمیان وساطت کے منکر تھے اور اس کی سخت تنقیدیں کرتے تھے اور اہل کلیسا کے ان خود ساختہ

حقوق و اجارہ داری کو نہیں مانتے تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں یورپ میں ایک ایسا گروہ ظاہر ہوا جو پادریوں کے سامنے اپنے گناہوں کے اقرار کرنے کی مخالفت کرتا تھا اور جس کی دعوت تھی کہ

"صرف اللہ کے سامنے، دعاء استغفار
اور اپنے گناہوں کا اعتراف و اقرار کرنا چاہیے
اور اس میں کسی انسانی وساطت کی
ضرورت نہیں۔"

یہ اسلام کے بنیادی اصولوں اور تعلیمات کا اثر اور بازگشت تھی جس کو انھوں نے محسوس کیا اور اس کے برملا مبلغ بن گئے۔ اسی طرح آٹھویں سے نویں صدی عیسوی تک یورپ میں اس تحریک کا طرۂ امتیاز رہا کہ:

"تصاویر اور بت ایک خلاف مذہب
اور قبیح فعل ہے اور اس میں کوئی تقدیس
نہیں ہے۔"

اور اس مخالفانہ تحریک نے اس قدر زور پکڑا اور اتنا اثر و اقتدار حاصل کر لیا کہ لیو سوم و قسطنطین اعظم اور لیو چہارم جیسے عظیم الشان، شہنشاہان روما نے اس کی حمایت اور پشت پناہی کی۔ اول الذکر نے ۷۲۶ء میں ایک فرمان صادر کیا جس میں سرکاری طور پر تصویروں اور بتوں (حضرت مریمؑ و حضرت عیسیٰؑ) کی تقدیس کی ممانعت کی گئی تھی اور اس کے تھوڑے عرصے کے بعد ۷۳۰ء میں ایک دوسرے فرمان میں اس کو بت پرستی قرار دیا تھا۔ مسیحی اور بت پرست یورپ، یونانی تمدن (جس کی تصویر نوازی اور بت تراشی شہرہ آفاق ہے) میں تصویروں اور بتوں کے خلاف یہ انکار و جہاد یقیناً اسلام کی بت شکنی اور اعلان توحید کی صدائے بازگشت تھی جو مغرب میں اندلس، اسلامی اور اسلامی تبلیغ و اثرات کے تحت وہاں پہنچی تھی۔ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کلاڈیس جو تورین کالاٹ پادری تھا اور اس تحریک و دعوت کا پرجوش علمبردار تھا، یہاں تک کہ وہ اپنے حلقۂ اثر میں تصویروں اور صلیبوں کو جلا دیا کرتا تھا۔ اس کے متعلق تاریخی طور پر معلوم ہے کہ اس کی ولادت اور نشو و نما اندلس میں ہوئی تھی اور یہ آٹھویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے جب اندلس میں امویوں کی ایک شاخ کی وہاں حکومت قائم ہو چکی تھی اور وہاں مسلمانوں کا تمدن اپنے عروج پر تھا۔

یورپ کی مذہبی تاریخ اور مسیحی کلیسا کی سرگزشت کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اسلام کے ذہنی اثرات کے اور بہت سے شواہد اور نظیریں ملیں گی۔ خود لوتھر کی مشہور اصلاحی تحریک اپنے نقائص کے باوجود اسلام سے متاثر تھی اور مورخین کو اعتراف ہے کہ لوتھر پر اسلامی تعلیمات کے گہرے اثرات پڑے تھے۔

منطقی اور فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مغرب کے عیسائی اسلام سے کیوں نہ متاثر ہوئے؟ کیا وہ آنکھوں اور شعور سے محروم تھے کہ وہ دیکھتے اور سوچتے کہ ان کا جن اسلامیوں سے سابقہ پڑ رہا ہے وہ کیسے لوگ ہیں؟ اور کیا ان کا ذہن اور دماغ جو کچھ آنکھیں دیکھتی تھیں ان کے متعلق تجسس و تفتیش اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت سے عاری تھے؟ ظاہر ہے ایسی کوئی بات نہ تھی۔ عام طور پر فوجیوں کی اخلاقی حالت بہت ناگفتہ اور اخلاق سوز ہوا کرتی ہے لیکن جب عیسائی فوجوں کا مسلمان مجاہدوں سے میدان جنگ میں سابقہ پڑا تو انھوں نے جو کچھ دیکھا اور پایا وہ ان کے لیے بے حد عجیب اور حیرت ناک تجربہ تھا۔ چنانچہ ایک رومی سردار یوں بیان کرتا ہے:

"رات کو تم ان (مجاہدوں) کو عبادت گزار

پاؤ گے اور اُن میں روزہ دار اور عہد وفا کرنے والے۔ بھلائیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور آپس میں پورا پورا انصاف اور مساوات برتتے ہیں۔"

ایک دوسرے رومی کے الفاظ میں،

"وہ دن کو شہسوار ہوتے ہیں اور رات کو عبادت گزار اور اپنے مفتوحہ علاقے میں بھی قیمت دے کر کھاتے ہیں۔"

نیز ایک تیسرے شخص نے ان کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا:

"رات کو دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ ان کو دنیا سے کچھ تعلق نہیں اور عبادت کے سوا کوئی کام نہیں اور دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اس طرح نظر آئیں گے کہ گویا ان کا صرف یہی مشغلہ ہے۔ بڑے تیرانداز بڑے نیزہ باز اور خدا کی یاد میں مشغول۔"

بھلا ان صفات اور خوبیوں کے مالک لوگوں کو کوئی دیکھے اور اس کے ذہن و دماغ میں ہلچل پیدا نہ ہوگی اور ان سے وہ اثر پذیر نہ ہوگا۔

تاریخ گواہ ہے کہ مغرب عربوں کے مذہب، اخلاق اور تمدن سے خوب متاثر ہوا۔

"غور کیجیے! یہ غفلت زدہ، ستم رسیدہ بچے جب زندگی میں قدم رکھیں گے اور اختیار و طاقت ان کے ہاتھ میں آئے گی تو یہ کیا قیامت ڈھائیں گے اندھی جدیدیت اور مغرب سے مرعوبیت کا جو چلن ہمارے روشن خیالوں کے ذہنوں پر چھا گیا ہے وہ صاف کہہ رہا ہے کہ اکیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں ہندوستان کے نوجوانوں کا وہی حال ہوگا جو امریکہ اور ایک حد تک یورپ کے نوجوانوں کا بیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں ہوا ہے۔"

سید حامد

# شور خطرناک ہے

محمد اسلم پرویز ▽

آوازوں کا ہمارا دن رات ساتھ ہے۔ ہم جہاں بھی ہوں کسی نہ کسی قسم کی آوازوں سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے۔ یہ آوازیں ہماری زندگی اور ہمارے نظام پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ کچھ آوازیں بامعنی ہوتی ہیں تو کچھ بے معنی۔ کچھ ہم کو بھلی لگتی ہیں تو کچھ ہم کو تکلیف پہنچاتی ہیں۔ تکلیف دہ آوازیں دو قسم کی ہو سکتی ہیں۔ ایک تو ایسی آواز جو معنوی اعتبار سے آپ کو تکلیف دے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی آپ کو بُرا کہے یا کوئی ایسی بات کہے جسے آپ سننا پسند نہ کرتے ہوں ایسی آوازیں آپ کے جذبات اور احساسات کو ٹھیس پہنچاتی ہیں۔ تکلیف دہ آوازوں کی دوسری قسم وہ ہے جسے ہم شور کہتے ہیں۔ آوازیں بھلے ہی پسندیدہ ہوں لیکن اگر وہ بہت بلند ہوں تو ہماری سماعت پر گراں گزرتی ہیں۔ یہی آوازیں ہمارے لیے بہت مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ چونکہ آوازیں بھی ماحول کا ایک حصہ ہیں اور ماحول میں ہونے والی کسی بھی ایسی تبدیلی کو جو ہمیں کسی بھی طرح نقصان پہنچائے کثافت کہتے ہیں اس لیے شور کو بھی کثافت کی ایک قسم تسلیم کیا گیا ہے۔

## ہم کیسے سنتے ہیں

اگر آپ کسی ساکت پانی پر کوئی پتھر یا کنکری پھینکیں تو جس جگہ وہ پتھر گرے گا اس مرکز سے چاروں طرف پانی میں گول دائرے کی شکل میں لہریں چلیں گی یہ دائرے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ معدوم ہوتے جاتے ہیں اور کچھ دیر بعد ختم ہو جاتے ہیں۔ پانی پھر ساکت ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب ہم کوئی لفظ منھ سے نکالتے ہیں تو ہمارے منھ کے باہر موجود ہوا میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے جو لہروں کی شکل میں ہوتا ہے۔ ان لہروں کو آواز کی لہریں کہا جاتا ہے آواز کو چلنے کے لیے کسی ذریعے یا میڈیم کی ضرورت ہے۔ جب ہم بات کرتے ہیں تو ہوا کے ذریعے یہ لہریں چلتی ہیں (یہی وجہ ہے کہ خلاء میں آواز کی لہریں نہیں چل پاتیں) آواز کی رفتار کا انحصار اسی میڈیم پر ہوتا ہے۔ مثلاً ہوا میں آواز کی لہریں ۱۰۸۸ فیٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہیں۔ پانی میں آواز کے چلنے کی رفتار اس سے پانچ گنا زیادہ ہے جب کہ لوہے میں آواز کی لہر بہ نسبت ہوا کے پندرہ گنا زیادہ تیز چلتی ہے

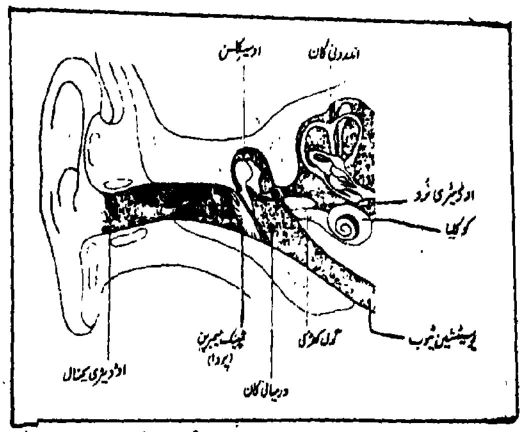
---

▽ لکچرر، ڈپارٹمنٹ آف باٹنی، ذاکر حسین کالج، (دہلی یونیورسٹی)

آواز کی شدّت یا تیزی کو ناپنے کے لیے ڈیسی بیل (Decibel) پیمائشی پیمانہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت "بیل" کا دسواں حصہ ہے۔ اس پیمانے کا نام الیگزینڈر گراہم بیل کے اعزاز میں رکھا گیا ہے جو کہ ٹیلی فون کا موجد تھا۔ ایک ڈیسی بیل اس کم از کم آواز کو مانا گیا ہے جس کو ہمارا کان سن سکے۔ اس پیمانے کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ہر دس ڈیسی بیل کے اضافے کا مطلب ہے کہ آواز دس گنا زیادہ ہو گئی۔ مثال کے طور پر سانس لینے کی مدھم آواز دس ڈیسی بیل کی ہوتی ہے جب کہ درختوں میں سے گزرتے ہوئے ہوا جو سنسناہٹ پیدا کرتی ہے وہ بیس ڈیسی بیل مانی جاتی ہے۔ ان دونوں آوازوں میں دس گنا فرق ہوا (دوگنا نہیں ہوا) گھڑی کی ٹک ٹک تیس ڈیسی بیل کے برابر ہوتی ہے جو کہ سانس لینے کی آواز سے بیس ڈیسی بیل یعنی سو گنا زیادہ ہے۔ اسی طرح اگر فرق ۳۰ ڈیسی بیل کا ہوگا تو آواز ایک ہزار گنا زیادہ ہوگی۔ آج کل ایمپلی فائر کی مدد سے جو ڈسکو میوزک بجایا جاتا ہے وہ انسانی سرگوشیوں سے ایک ارب گنا تیز ہوتا ہے۔ اس سے آپ ان آوازوں کی شدت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ بین الاقوامی صحت اداروں کے معیار کے مطابق انسانی صحت کے لیے ۸۰ ڈیسی بیل سے زیادہ کی آوازیں خطرناک ہوتی ہیں۔

کوئی بھی چیز جب ہوا میں کسی قسم کا ارتعاش پیدا کرتی ہے تو اس سے لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ اگر ہمارے دائرۂ سماعت کے اندر ہوتی ہیں تو ہم ان کو آوازوں کی لہریں کہتے ہیں۔ ان آوازوں کو سننے کے لیے قدرت نے ہم کو کان دیے ہیں جن کے تین حصے ہوتے ہیں؛ بیرونی، درمیانی اور اندرونی۔ بیرونی کان جو کہ ہم کو نظر آتا ہے اس کا کام آواز کی لہروں کو یکجا کر کے اندر پہنچانا ہے جس طرح محدب شیشہ سورج کی کرنوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیتا ہے، اسی طرح ہمارا بیرونی کان موصولہ آواز کی لہروں کو جمع کر کے ایک سرنگ سے گزارتا ہے جس کو آڈیٹری کینال (Auditory Canal) کہتے ہیں۔ اس سرنگ سے گزر کر آواز کی لہریں کان کے پردے سے ٹکراتی ہیں جس کو ٹمپینک میمبرین (Tempa-nic Membrane) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہمارے کان کا درمیانی حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں سے آواز کی لہریں تین بہت نازک اور آپس میں ملی ہوئی ہڈیوں سے گزر کر جاتی ہیں جن کو اوسیکلس (Ossicles) کہا جاتا ہے۔ یہ ہڈیاں آواز کی لہروں کو مزید یکجا کرتی ہیں ہمارے درمیانی کان میں ہوا بھری رہتی ہے اور اس کا تعلق ایک خاص نلی (یوسٹیشین ٹیوب) کے ذریعے حلق سے ہوتا ہے۔ اکثر اباسی لیتے وقت یا کچھ نگلتے وقت یہ نلیاں کھل جاتی ہیں تو ہمارے کان "گم" ہو جاتے ہیں۔ یعنی ان میں ایک عجیب طرح کی گوں گوں کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ ان نالیوں کی مدد سے کان کے پردے پر دباؤ یکساں رکھا جاتا ہے اگر کوئی بہت زور کی آواز ہمارے کانوں سے ٹکراتی ہے تو اس کے لہروں کی قوت ہمارے کان کے پردے کو پھاڑ سکتی ہے۔ ایسے میں قدرتاً حلق میں موجود یہ نالی کھل جاتی ہے جس کی وجہ سے حلق کی طرف سے بھی کان کے پردے پر دباؤ پڑتا ہے۔ دوسری سمت سے پڑنے والا یہ دباؤ کان کے پردے پر دباؤ کو بہت حد تک کم کر دیتا ہے اور اس طرح کان کا پردہ بچ جاتا ہے۔ اوسیکلس سے آواز کا ارتعاش ایک گول کھڑکی کی مدد سے اندرونی کان تک پہنچتا ہے۔ اندرونی کان میں گھونگھے کی شکل سے ملتی جلتی ایک ٹیوب ہوتی ہے جس کو کوکلیا (Cochlea) کہتے ہیں۔ اس کے اندر ایک رقیق مادہ بھرا رہتا ہے۔ آواز کی لہریں اس رقیق مادے

(لمف) میں ارتعاش پیدا کرتی ہیں۔ کوکلیا کے اندرونی حصے میں کچھ حساس قسم کے بال ہوتے ہیں۔ جب ان تک یہ ارتعاش پہنچتا ہے تو یہ بال اس ارتعاش کو بہت خفیف قسم کی برقی رَو میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ برقی رَو ایک خاص اعصابی نس (اوڈیٹری نرو) کے ذریعے دماغ تک پہنچتی ہے اور اس طرح ہم آواز کو سمجھ پاتے ہیں۔ آواز کا یہ لمبا سفر بہت کم عرصے میں طے ہوتا ہے جیسا کہ ہم روزمرہ کی زندگی میں خود تجربہ کرتے ہیں کہ ادھر کوئی آواز ہوئی اور ادھر ہم نے سنا لیکن اس دوران ہمارا سماعتی نظام کتنا سارا کام کتنی سرعت سے کر دیتا ہے۔




## شور ایک کثافت

ہمارے شہر بہت تیزی سے پُر شور ہوتے جا رہے ہیں اور اب تو گاؤں، قصبوں میں بھی سکون نایاب ہو چلا ہے۔ ہر طرف آپ کو لاؤڈ اسپیکر، ٹیلی وژن، ریڈیو، ٹریفک یا کارخانوں کا شور ملے گا۔ چند ہی بارا تیں ایسی سجتی ہوں گی جن میں ڈھول تاشے بینڈ باجے نہ ہوں یا جہاں لاؤڈ اسپیکر اپنی پوری طاقت کے ساتھ وہی پرانے گھسے پٹے گانے نہ الاپ رہا ہو۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ان سب شدید آوازوں کا ہمارے نظام پر بہت مہلک اثر پڑتا ہے۔ جن علاقوں میں شور زیادہ ہوتا ہے وہاں کے لوگوں میں ذہنی بیماریاں زیادہ پائی گئی ہیں۔ کارخانوں کے جائزے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ جن کارخانوں میں شور زیادہ ہوتا ہے وہاں کاریگروں میں دل اور پھیپھڑے کے امراض نیز سر درد کی شکایت زیادہ پائی جاتی ہے۔ انگلینڈ کے ایک ایئرپورٹ کے نزدیک رہنے والوں کے جائزے کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ ان علاقوں میں رہنے والوں میں اعصابی امراض کے شکار لوگوں کی تعداد بہ نسبت اور علاقوں کے ۳۱ فی صد زیادہ ہے۔ لاس اینجلز ایئرپورٹ کے اردگرد رہنے والے ۸۰ ہزار افراد کے جائزے سے پتہ لگا کہ ایئرپورٹ کے ۳ میل کے دائرے میں رہنے والے لوگوں کی اموات کی شرح ۲۹ فی صد زائد ہے۔ نیز ان لوگوں کو دل کے دورے بھی زیادہ پڑتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا تھا۔ آواز دراصل ہوا کے تفریقی دباؤ کا نام ہے جب ہوا میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے تو اسے ہم آواز کہتے ہیں اور اس کو ہمارے کان کے نہایت نازک حصے خفیف قسم کی برقی رو میں تبدیل کر کے دماغ کی طرف روانہ کر دیتے ہیں۔ اگر آواز تیز ہو تو اول تو اس سے کان کے نازک حصے براہ راست متاثر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی صلاحیت اثر انداز ہوتی ہے۔ جس طرح ایک تیز دھار چھری غلط استعمال یا غلط چوٹ سے کند ہو جاتی ہے، اسی طرح کان کے پردے پر شدید ضربات اس کو بے حس اور کند کر دیتی ہیں، اس کے باعث قوت سماعت کم بھی ہو سکتی ہے اور ایک دم ختم بھی ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں تیز آواز کی لہریں جب برقی رو میں تبدیل ہوتی ہیں تو یہ رو بھی شدید ہوتی ہے جس سے دماغ کا نہ صرف متعلقہ بلکہ دیگر حصے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے دماغ میں مختلف کاموں کو کنٹرول کرنے کے لیے

الگ الگ حصے ہیں لیکن یہ آپس میں بھی تعلق رکھتے ہیں۔ تیز قسم کی آوازیں نہ صرف یہ کہ سماعت سے متعلق دماغی حصوں کو متاثر کرتی ہیں بلکہ دیگر حصے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ان وجوہات کے باعث تیز شور میں رہنے والے لوگوں میں کوئی نہ کوئی اعصابی یا نفسیاتی مرض پایا جانا لازمی ہے۔ اس کی آسان ترین مثال برتاؤ ہے۔ شور وغل کے کام سے وابستہ کاریگر یا پر شور علاقوں میں رہنے والے لوگ زیادہ غصہ آور اور پُر تشدد پائے گئے ہیں۔ ان پر جھنجھلاہٹ جلدی طاری ہوتی ہے۔ لہٰذا معمولی معمولی باتوں پر ان میں جھگڑا عام بات ہے۔ شور کے باعث انسان ایک قسم کے اعصابی تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ ذہنی تناؤ اور کشمکش جسم کے کئی افعال کو متاثر کرتی ہے۔ سب سے پہلے نظام ہاضمہ متاثر ہوتا ہے۔ آج کل بدہضمی جلن، گیس اور تیزابیت کی شکایت عام پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ خوراک سے کہیں زیادہ دماغی تناؤ ہے جس کی ایک وجہ شور وغل بھی ہے۔ معدے کے علاوہ شور سے نظام خون بھی متاثر ہوتا ہے امریکہ کے مشہور ادارے ایم۔ آئی۔ ٹی کے ڈاکٹر ڈیلی کی تحقیقات کے مطابق شور کی وجہ سے خون میں موجود پلیٹی لیٹس (ایک قسم کے ذرات جو بیماریوں سے دفاع میں مدد کرتے ہیں، تفصیلات کے لیے دیکھیں انقلاب ۱۲ اگست ۱۹۸۷ء) آپس میں چپک جاتے ہیں جس کی وجہ سے خون کی نالیاں سخت ہو جاتی ہیں۔ اس بیماری کو ارٹیریو اسکلیروسس (Arteriosclerosis) کہتے ہیں۔ نیویارک کے ڈاکٹر روسین کا کہنا ہے کہ جب ہم شور سے ہم آہنگ ہوتے ہیں تو ہمارے جسم میں اس کا رد عمل ہوتا ہے جو صرف اعضائے سماعت تک محدود نہیں رہتا بلکہ دوران خون کو بھی متاثر کرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شور سننے پر ہماری خون کی نسیں سکڑ جاتی ہیں جس کی وجہ سے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے جو کہ دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے اقوام متحدہ کے عالمی صحت ادارے کی ایک رپورٹ کے مطابق اگر شور کو کم نہ کیا گیا تو یہ عوام میں جسمانی اور ذہنی بیماریاں پھیلا دے گا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ صحت کو متاثر کرنے کے علاوہ شور وغل انسانی برتاؤ اور عمل کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس کے دباؤ میں آکر انسان جرائم بھی کر سکتا ہے۔ اس سے انسان کی زندگی بھی کم ہوتی ہے اور بڑھاپا جلدی آتا ہے۔ متواتر دباؤ میں رہنے کی وجہ سے دماغ تھکاوٹ کا شکار جلدی ہوتا ہے اور دماغی تھکاوٹ سے ہی بڑھاپے کا آغاز ہوتا ہے۔

## شور — کچھ پیمانے

| | | | |
|---|---|---|---|
| سانس لینے کی آواز | ۱۰ ڈیسی بیل (ڈب) | ٹریفک کا شور | ۶۰-۹۰ ڈب |
| درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ | ۲۰ ڈب | بھاری ٹریفک | ۹۰-۱۰۰ ڈب |
| گھڑی کی ٹک ٹک | ۳۰ ڈب | موٹر سائیکل | ۱۰۵ ڈب |
| ریڈیو | ۵۰ ڈب | بادل کی گرج | ۱۱۰ ڈب |
| زور سے بولنا | ۶۰ ڈب | ڈسکو میوزک | ۱۲۰ ڈب |
| بچوں کے کھیل کا شور | ۶۰-۸۰ ڈب | ہوائی جہاز کی اڑان | ۱۲۰ ڈب |

## ہم کیا کریں

اس وقت ہمارے ہر بڑے شہر میں شور عالمی حد انتہا سے زیادہ ہے نئی دہلی کے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس کے ایک جائزے کے مطابق دہلی، بمبئی اور کلکتہ میں کبھی بھی شور ۹۵ ڈی بی سے کم نہیں ہوتا ہے جبکہ بین الاقوامی حد انتہا کے مطابق پچاس ڈیبا سے اوپر کا شور مضر ہوتا ہے۔ ہمارے شعبۂ ماحولیات کے

مطابق دہلی کے ۸۶ فیصد شہری شور سے خطرناک حد تک متاثر ہیں ۔ ۶۵ فیصد کارخانوں میں ۹۰ سے ۱۰۵ ڈب کا شور پایا جاتا ہے جو کہ حد انتہا سے دوگنے سے بھی زیادہ ہے۔ نیز دہلی کے گرد و نواح میں رہنے والے لوگوں کے مقابلے دہلی کے شہریوں کی قوتِ سماعت نسبتاً کم ہے۔ یہ تمام مشاہدات اشارہ کرتے ہیں کہ خاص طور سے شہروں میں شور کم کرنا بہت ضروری ہے۔ افسوس یہ ہے کہ حکومت کے پاس کوئی مناسب قانون نہیں ہے جو کہ کارخانوں، فیکٹریوں یا شور مچانے والی گاڑیوں کے خلاف موثر طریقے سے استعمال کیا جا سکے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اس سے متعلق جامع قانون تشکیل دے جس کی مدد سے لاؤڈ اسپیکر کا بے جا یا حد سے زیادہ استعمال نہ ہو۔ گھروں میں ریڈیو، ٹی وی کی آوازیں گھروں تک ہی محدود رہیں۔ کارخانوں، فیکٹریوں میں شور کم کرنے والے آلات (silencers) لگائے جائیں۔ جہاں یہ ممکن نہ ہو وہاں کم از کم کاریگروں کو کان بند رکھنے کی ترغیب دی جائے۔ اس طرح گاڑیوں میں بھی انجن کے شور اور ہارن پر پابندی ہو۔ ہلکے قسم کے ہارن استعمال کیے جائیں اور پریشر ہارن کا استعمال قطعاً بند ہو۔ اس طرف حکومت کو جلدی غور کرنا ہوگا۔ کیونکہ نہ تو یہ سیاسی مسئلہ ہے اور نہ مذہبی، سیدھا انسانی بقا و صحت کا معاملہ ہے لیکن ایسے مسائل پر غور کرنا نہ تو حکومتِ وقت اور نہ ہی کسی مخالف جماعت کے منشور میں ہے۔ بطور ایک شہری کے ہمارے بھی کچھ فرائض ہیں۔ چونکہ شور ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے ہم سب ہی تھوڑے بہت ذمہ دار ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے ہمیں اپنے آپ کو کنٹرول کرنا ہوگا۔ یہ ہماری ذمہ داری (بلکہ اب فرض ہے) کہ ہم خیال رکھیں کہ ہمارے استعمال میں رہنے والی مشین یا گاڑیاں شور تو نہیں کرتیں۔ گھروں میں ریڈیو، ٹی۔ وی وغیرہ ہلکی آواز میں بجائیں۔ اس سے آپ کو ہر طرح کا فائدہ ہوگا۔ اول تو آپ کی سماعت متاثر نہیں ہوگی۔ دوسرے آپ شور کے مضر اثرات سے محفوظ رہیں گے۔ علاوہ ازیں گھروں میں تیز آواز سے موسیقی وغیرہ بجانے پر سبھی کو تیز آواز میں بولنا پڑتا ہے جس سے توانائی ضایع ہوتی ہے اور دماغ پر بھی دباؤ پڑتا ہے۔ اگر آپ اپنے گھر میں شور کم رکھیں گے تو فائدہ بھی آپ ہی اٹھائیں گے۔ یہ بھی کوشش کرنی چاہیے کہ آرام کے وقت پُرسکون جگہ پر ہوں۔ کیونکہ اگر آرام یا نیند کے وقت بھی آپ کے ارد گرد شور رہے تو چاہے آپ سوتے بھی رہیں لیکن یہ نیند مکمل اور پُرسکون نہیں ہوگی اور اس سے آپ کے جسم کو آرام اور سکون نہیں ملے گا، جتنا کہ ملنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوتے میں کان تو کھلے ہی رہتے ہیں، وہ کام بھی کرتے رہتے ہیں اور آوازیں آپ کے دماغ کو متاثر کرتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے آپ کا ذہن آرام نہیں کر پاتا جب کہ شاید ذہنی آرام کے لیے ہی آپ سونے لیٹے تھے۔ گفتگو میں بھی کوشش کرنی چاہیے کہ آواز نیچی رہے تاکہ مخاطب بھی مدھم آواز اختیار کرے۔ ایسا کرنے سے آپ شور سے تو بچیں گے ہی، اپنے جسم کی توانائی بھی بچائیں گے اور نرم گفتار بھی کہلائیں گے۔

(از سائنس پارے)

# جمال الدین افغانی اور العروۃ الوثقیٰ

ابوسفیان اصلاحی ▽

جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ء ۔ ۱۸۹۷ء) کی شخصیت دنیا کی تمام قوموں کے درمیان یکساں طور پر جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ وہ پیدا تو افغانستان میں ہوئے لیکن زندگی بھر دنیا کا طواف کرتے رہے۔ وہ ایک سچے اور پکے مسلمان تھے۔ قرآن وحدیث نیز اسلام کی امہات الکتب سے براہِ راست واقف تھے۔ انھیں اس چیز کا کامل یقین تھا کہ اسلام ایک سچا مذہب ہے۔ دین اسلام نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر تسلی بخش روشنی ڈالی ہے اور فروغ علم کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔ اسلام کی حقانیت کی روشنی میں جمال الدین افغانی کو ہر لمحہ یہ احساس دامن گیر رہا کہ حق کبھی مغلوب نہیں رہتا۔ یہ چیز اس کی فطرت میں ہے کہ غالب رہے۔ اسی نظریے کے تحت انھوں نے زندگی بھر یہ کوشش اور جدوجہد کی کہ چار دانگ عالم میں اسلام اور ملت اسلامیہ ایک سربراہ کی حیثیت سے زندگی گزاریں۔ قیادت وسیادت کی باگ ڈور ملت اسلامیہ کے ہاتھ میں ہو۔ اپنے اس مقصد کے لیے افغانی نے تحریر وتقریر دونوں سے کام لیا۔ جہاں پہنچے ایک حلقہ آپ کے افکار وخیالات کا شیدائی بن گیا۔

علامہ افغانی کے احسانات تو دنیا کے تمام مسلمانوں پر ہیں لیکن مصر آپ کی توجہ کا خصوصی مرکز رہا۔ مصر آپ دوبار گئے ایک بار (۱۸۶۹ء) چالیس دن قیام رہا اور دوسری بار مسلسل آٹھ سال (۱۸۷۱ء ۔ ۷۹) قیام رہا۔ آٹھ سالہ قیام کے دوران آپ نے علما ومفکرین اور جامعۂ ازہر کے اساتذہ و طلبا کے درمیان اسلام کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اسلام کے کیا تقاضے اور مطالبات ہیں؟ اپنے درس میں جامعۂ ازہر کے شیوخ پر آپ نے خصوصی روشنی ڈالی اور ازہر کے فرسودہ تعلیمی نظام پر تنقیدیں کیں کہ ازہر ملت اسلامیہ کے نونہالوں کے مستقبل کو تاریکیوں سے ہم کنار کر رہا ہے۔ چنانچہ بہت سے ازہری شیوخ نہ صرف افغانی کے مخالف ہو گئے بلکہ انھیں دائرۂ اسلام سے خارج بھی قرار دیا لیکن طلبا کی ایک اچھی خاصی تعداد آپ کی ہم نوا بن گئی اور اسی طرح مصر کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال حلقے نے بھی آپ کی آواز پر لبیک کہا۔ آپ کے مشن کو

---

▽ عربک ڈپارٹمنٹ، اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ

آگے بڑھانے والوں میں سے چند نمایاں نام اس طرح ہیں۔ محمد عبدہ (۱۸۴۹ – ۱۹۰۵ء) سید محمد یوسف سید عبداللہ ندیم (۱۸۵۴ – ۱۸۹۶ء) محمود سامی البارودی (۱۸۳۹ – ۱۹۰۴ء) عبدالسلام المویلحی (۱۸۴۶ – ۱۹۰۶ء) سعد زغلول (۱۸۵۷ – ۱۹۲۷ء) سلیم نقاش (۱۸۸۴ – ؟ ء) اور ادیب اسحاق (۱۸۵۶ – ۱۸۸۵ء) وغیرہ۔ آپ کے تلامذہ بھی تحریک وحدت اسلامی کے مقاصد کے حصول کے لیے تگ و دو کرتے رہے۔ اس سلسلے کے نمایاں نام رشید رضا مصری (۱۸۵۶ – ۱۹۳۵ء) عبدالرحمٰن الکواکبی (۱۸۵۴ – ۱۹۰۲ء) اور مصطفیٰ کامل وغیرہ کے ہیں۔ یہ تمام حضرات ایک تو مختلف اخبارات و رسایل میں معاشرتی، مذہبی اور سیاسی مضامین لکھ رہے تھے اور دوسری طرف اپنی تقاریر میں انگریزی نیز دوسری استعماری قوتوں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ مصر میں جتنی بھی تحریکیں برپا ہوئیں۔ وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر افغانی کے افکار و خیالات سے متاثر ہوئیں۔ چنانچہ حزب الامہ، الحزب الوطنی۔ عربی تحریک، الجامعۃ المصریہ اور الجامعۃ العربیہ سب کی سب آپ کی مرہون منت ہیں۔ آپ نے اپنے تلامذہ کو اس بات پر بھی اکسایا کہ وہ صحافت پر خصوصی توجہ دیں۔ نیز زبان ایسی استعمال کریں کہ عوام ان کے بیانات کو بآسانی سمجھ سکیں۔ آپ کی ان کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ سرزمین مصر سے اخبارات و رسایل کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ چند اہم اخبارات و رسایل کے نام ملاحظہ کریں :

۱۔ الوقایع المصریہ، روضۃ المدارس، روضۃ الاخبار، الکوکب الشرقی، مصباح الشرق، المقطم، الوطن، المویدٗ، اللواء، مراۃ الشرق، التجارہ، الاہرام، الجریدہ، البلاغ، الہلال، المنار، الرسالہ، الکتاب، الثقافہ، نجلہ اور علم النفس وغیرہ۔ اس

اس مختصر فہرست میں اٹھارہویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک کے اخبارات و مجلات شامل ہیں۔ ان میں کچھ روزنامے، کچھ ہفتہ وار، کچھ پندرہ روزہ اور کچھ ماہنامے ہیں۔ ان میں ادب، سیاست، مذہب، معاشرت اور سائنس وغیرہ پر مقالات شایع ہوئے۔ ان اخبارات و مجلات کا تجزیہ کیا جائے تو ان کے پیچھے افغانی کی روح کارفرما ہے۔ آپ نے تمام میدانوں میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ افغانی نے اسلامیات پر لکھنے کے ساتھ ساتھ کئی مضامین سائنس کی اہمیت پر بھی لکھے اور مستشرقین کے اس دعوے کی سختی سے تردید کی کہ اسلام سائنس کا مخالف ہے۔ افغانی بیک وقت کئی زبانوں سے واقف تھے انھوں نے عربی، اردو، فارسی اور انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے افغانستان سے ضیاء الخافقین نامی رسالہ فارسی میں نکالا۔ ہندوستان سے نکلنے والے اردو رسالے معلم شفیق اور معلم کی ادارت میں معاونت کی۔ لندن میں قیام کے دوران انگریزی رسالے ژورنل دی با اور ریویو سائنٹفک میں کئی مضامین مستشرق رینان کا جواب دینے کے لیے تحریر کیے اور مصری رسالے مصر، الاہرام اور التجارہ میں آپ کے عربی مضامین منظر عام پر آئے۔

علم و تحقیق اور رسایل کی دنیا میں آپ نے سب سے اہم جو کارنامہ انجام دیا وہ پیرس سے "العروۃ الوثقیٰ" کا اجراء ہے۔ جب مصر کی سرزمین آپ کے لیے تنگ ہو گئی اور وہاں سے آپ کو شہر بدر ہونا پڑا تو آپ نے ۱۸۸۳ء میں وہاں سے پیرس کا

رخ کیا اور وہاں سے پندرہ روزہ رسالہ العروۃ الوثقیٰ جاری کیا۔ مصر سے وہ چلے تو گئے تھے لیکن مصر کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ اس رسالہ میں بہت سے ایسے مضامین شایع کرتے جس کا تعلق مصر کے احوال و کوائف سے ہوتا۔ دوسرے اس رسالے کے ذریعے پورے عالم اسلام پر تبصرہ کرتے اور جہاں کہیں بھی امت مسلمہ پر ظلم و تشدد کا بازار گرم دیکھتے اس پر چیخ اٹھتے۔ چونکہ آپ وحدتِ اسلامی ۔ (Pan Islamism یا الجامعۃ الاسلامیہ) کے علمبردار تھے تمام مسلمانوں کو العروۃ الوثقیٰ میں متحد و متفق ہونے کی تلقین و تاکید کرتے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ جب خدا، قرآن اور اسلام ایک ہے تو ہم ایک کیوں نہیں ہوتے۔ امتِ مسلمہ کو وقار اور قدر و منزلت اسی وقت مل سکتی ہے جب کہ وہ قرآن اور فرمان رسول کو حرز جاں بنائے۔ اس رسالے کے ذریعے وہ مغرب کی چیرہ دستیوں اور استحصال کا پردہ چاک کرنا چاہتے تھے۔

العروۃ الوثقیٰ کو نکالنے سے پہلے اپنے محبوب شاگرد محمد عبدہ کو خط لکھا کہ

"تم پیرس چلے آؤ تاکہ ہم دونوں
مل کر اس رسالے کو چلا سکیں۔"

چنانچہ عبدہٗ نے اپنے استاد گرامی کی آواز پر لبیک کہا اور معاونت کے لیے پیرس پہنچ گئے۔ کہنے کو تو یہ ایک رسالہ تھا لیکن دراصل یہ ایک خفیہ تنظیم تھی جس کی شاخیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ رسالہ ۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء کو منظر عام پر آیا اور ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو بند ہو گیا۔ اس قلیل مدت میں العروۃ الوثقیٰ کے کل اٹھارہ شمارے منظر عام پر آسکے لیکن اٹھارہ شماروں کے مصر اور پورے عالم اسلام پر زبردست اثرات مرتب ہوئے۔ اس رسالے نے امت مسلمہ کے اندر ایک روح پھونک دی۔ اس رسالے میں دنیا کی تمام جابر و قاہر اقوام بالخصوص انگریزوں کے خلاف بڑا شدید لب و لہجہ اختیار کیا جاتا دنیا کی تمام ظالم قوموں کی چولیں اس رسالے نے ہلا کر رکھ دیں۔ انگریز اس رسالے کے اسلوب و انداز سے بوکھلا گئے۔ رسالے کی جرات مندی اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے تمام اعدائے اسلام اس رسالے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر ممکن کوشش کی کہ رسالہ بند ہو جائے۔ حکومت ہند اور مصر نے اس کے رجحانات اور جرات مندانہ اقدامات کو دیکھتے ہوئے اپنے ملک میں اس کی آمد پر پابندی عاید کر دی ۔ نور پاشا کی حکومت نے بھی اس پر سخت پہرہ بٹھایا کیونکہ عوام کے اندر ایسے جذبات و عواطف بڑی تیزی سے بڑھ رہے تھے جو ان کے اقتدار کے لیے مہلک ثابت ہو سکتے تھے اور ہوئے۔ مصر کے اندر جمہوریت کی جو لہر آئی اور بڑے بڑے لیڈران جو جمہوریت نواز ہوئے وہ اسی رسالے کی دین ہے۔

العروۃ الوثقیٰ رسالہ افغانی نے ایک ایسے وقت میں نکالا جب کہ ان کی مالی حالت بہت ناگفتہ بہ تھی۔ پیرس میں ان کی کوئی یاوری کرنے والا نہ تھا لیکن ان حالات میں مصائب و مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے صرف اس لیے نکالا کہ انھیں امتِ مسلمہ سے محبت تھی۔ وہ انھیں مستقل مظلوم و مقہور دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ استاد و شاگرد تن تنہا عالمِ اسلام کے مسایل پر غور کرتے۔ یہ رسالہ ڈھائی گز لمبے اور ڈھائی گز چوڑے کمرے میں ترتیب پاتا۔ حد تو یہ ہے کہ یہ کمرہ بھی آخری منزل پر واقع تھا۔

العروۃ الوثقیٰ چونکہ وحدت اسلامی کا ترجمان تھا۔ اسی لیے اپنے مشن کی تبلیغ کے لیے افغانی بہت سے شمارے اعزازی طور پر لوگوں اور سربراہوں کے مابین تقسیم کرتے۔ اس کی دس کاپیاں قاہرہ میں خدیو کو، ۳۸ کاپیاں پاشاؤں اور ریاض و شریف کو، ۲۷ کاپیاں بنک کو، ۵ کاپیاں آفندیوں کو، ۱۶ کاپیاں مختلف دینی لوگوں کو، ۸ کاپیاں مختلف رسایل کو اور اس کے علاوہ مصر کے بہت سے شہروں میں ارسال کی جاتیں۔ سربراہان مملکت اور امرا، شرفا، کو اس نقطہ نظر سے بھیجی کی جاتی تھیں کہ اگر وہ افغانی کے افکار و خیالات کے معین و مددگار ہو گئے تو ان کے حوالے سے عوام کے ذہنوں میں بآسانی وحدت اسلامی کا نظریہ جاگزیں ہو سکتا ہے۔

علامہ افغانی کی زندگی اور العروۃ الوثقیٰ کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات بڑے واضح انداز میں سامنے آئے گی کہ انھوں نے اصلاحات کے سلسلے میں چار طریقے اپنائے۔ یہ بات پیچھے آچکی ہے کہ مصر سے اٹھنے والی تمام تحریکات خواہ ادبی ہوں، سیاسی ہوں، عوامی اور دینی ہوں وہ سب کی سب افغانی کے اصلاحی اقدامات کے زیر اثر رہیں۔ افغانی کے ان چاروں طریقوں کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جمال الدین افغانی نے مصر میں جو درس دیے اس کے دور رس اثرات دیکھنے میں آئے۔

۲۔ جمال الدین افغانی کی محفلوں میں آنے والی شخصیات مصری معاشرے پر اثر انداز ہوئیں۔

۳۔ افغانی نے اپنے تلامذہ کو حکم دیا کہ وہ ظلم و استبداد کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں۔

۴۔ عوام کے اندر کی جانے والی تقاریر نے بھی انقلاب کا راستہ ہموار کیا۔

مذکورہ بالا خطوط پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ علامہ ملت اسلامیہ کے تئیں کس قدر مخلص تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی ظلم و استبداد کا بازار گرم دیکھتے اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے زبان و قلم حرکت میں آجاتے۔ وہ العروۃ الوثقیٰ میں دنیا کے تمام مسلمانوں کو ظالموں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی دعوت دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایران میں ہوں یا ترکی میں، یورپ میں ہوں یا ہندوستان میں ظالموں پر ارتعاش طاری ہو جاتا۔ انھیں نکل جانے کا حکم ملتا یا نظر بند کر دیا جاتا۔ ہندوستان آنے پر انگریزوں نے انھیں اسی اندیشے سے نظر بند کر دیا تھا کہ کہیں یہاں بھی عرابی تحریک نہ اٹھ کھڑی ہو۔ انھی ایام نظر بندی میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب "الرد علی الدھریین" فارسی زبان میں تصنیف کی جس میں انھوں نے سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ـ۱۸۹۸ء) پر بھی تنقیدیں کیں۔ جب کہ یہ تنقیدیں انھوں نے سر سید کے خلاف لوگوں کی سنی سنائی باتوں پر کی تھیں۔

العروۃ الوثقیٰ میں لکھے جانے والے مضامین کے سلسلے میں مضمون نگار کی کوئی صراحت نہیں ہوتی، کچھ محققین کا خیال ہے کہ سیاسی مضامین علامہ افغانی کے آتش فشاں اور شعلہ بار قلم سے ہوتے۔ سید مبارز الدین نے اپنی کتاب "مقالات جمال الدین افغانی (ص ۸ـ۹) میں صراحت کر دی ہے کہ اسلوب کی شدت اور لب و لہجے میں پائے جانے والے اشتعال سے یہ بات عیاں ہے کہ العروۃ الوثقیٰ "کے تمام مضامین علامہ افغانی کے قلم سے منظر عام پر آئے۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ علامہ افغانی محمد عبدہ کو مضامین کی املا کراتے

تھے۔ یہی بات قرین قیاس بھی ہے۔ کیونکہ افغانی اور عبدہٗ کے اسلوب تحریر اور طرز بیان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ افغانی کی تحریریں شدت جذبات اور عواطف سے گراں بار ہوتیں اور عبدہ کی تحریر میں دھیماپن ہوتا وہ تدریجی انقلاب واصلاح کے قایل تھے۔ عبدہ ہر بات ٹھہر ٹھہر کر کہتے لیکن افغانی دشمنوں کی مخالفت میں کسی مداہنت اور ڈپلومیسی کے قایل نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عبدہ اور افغانی کے سیاسی موقف میں فرق ہے۔

علامہ افغانی کے انگریزی، اردو، فارسی اور عربی مقالات کا خلاصہ نکالا جائے تو یہی بات سامنے آئے گی کہ وہ مسلمانوں کو متحد کرنا چاہتے تھے اور دنیا کے تمام گوشوں سے جبر واستبداد کو ختم کر دینے کے درپے تھے۔ اپنے مقالات "الجبن" ماضی الامۃ و حاضرھا وعلاج عللھا" "الوحدۃ الاسلامیہ" اور "الوحم" میں اپنے انہی خیالات کو پیش کیا ہے — العروۃ الوثقی کے پہلے مقالے میں انگریزوں کے مظالم کی داستان بیان کی اور ملت اسلامیہ سے متحد ہو جانے کی اپیل کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ انگریز اپنے ارادوں میں ہرگز مخلص نہیں۔ ایک عرصے تک ان کا اصلی روپ منظر عام پر نہ آسکا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان حریصوں کی فطرت منکشف ہوکر رہی۔ غرباء اور ضعفا پر کوہ الم توڑنے میں قبائلی لوگوں کو مات کر دیا وہ معریوں پر اس طرح عیاری سے اثر انداز ہوئے کہ اُن کی شناخت اور تشخص خطرے میں پڑ گیا اور اُن پر پوری طرح قابض ہو جانے کے بعد وہ ظلم وستم کیے کہ عام انسانی ذہن کے تصور سے پرے ہے۔ (تاریخ الاستاذ ۲/۲۱۵)

ایک طرف ظلم کے خلاف یہ جرات واستقامت اور دوسری طرف امت مسلمہ کو یہ مخلصانہ درس۔

امت مسلمہ کی تمام بیماریوں اور نقائص کا علاج یہ ہے کہ وہ مذہب اسلام کے بتائے ہوئے راستوں پر گامزن ہو جائیں۔ دین اسلام کے احکامات پر سلف صالحین کی طرح کاربند رہنے کی کوشش کریں نیز اسلام کے پیغامات سے دنیائے انسانیت کو روشناس کریں کیونکہ اسی کے ذریعے قلوب کی تطہیر اور اخلاق کی تحسین ممکن ہے۔ غیرت وحمیت کا سودا نہ کیا جائے، اپنے تشخص اور وجود کو برقرار رکھنے کے لیے عظیم سے عظیم تر قربانی دی جائے، اسلام کی چنگاریاں آج بھی دلوں میں موجود ہیں صرف ایک پھونک کی ضرورت ہے (تاریخ الاستاذ ۲/۲۳۵)

مقالہ الجبن میں علامہ افغانی امت مسلمہ کی حقیقت کی طرف یوں رقم طراز ہیں کہ امت مسلمہ دنیا کی کسی طاقت کے سامنے بزدلی کا ثبوت نہیں دیتی، کسی باوقار اور صاحب حیثیت قوم کو جبن یعنی بزدلی کا مرض لاحق ہوگیا تو اسے خوف وہراس کی وجہ سے ذلت و نکبت کا سامنا کرنا پڑے گا — یہ مرض قوم کو کھوکھلا بنا دیتا ہے۔ آج ملت اسلامیہ مختلف ذلتوں سے صرف اس لیے دوچار ہے کہ وہ اسلام کو چھوڑنے کے بعد جبن کا شکار ہوگئی ہے۔ افغانی کا خیال ہے کہ جبن تمام امراض کی جڑ ہے۔ قوم کے اندر تمام فواحش اور کمزوریاں اسی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ افغانی فرماتے ہیں کہ اسلام میں جبن کا کوئی تصور نہیں۔ ایمان اور جبن ایک دل میں مجتمع نہیں ہو سکتے۔ دونوں میں تضاد ہے۔

(تاریخ الاستاذ ۲/۳۴۴)

افغانی ایک طرف جہاں وحدت اسلامی پر زور دیتے اور ظلم وتشدد کے خلاف آواز بلند کرتے وہیں انھوں نے مستشرقین کے خلاف بھی مضامین لکھے۔ مستشرقین یہ بات بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ اسلام نئے علوم مثلاً

سائنس وغیرہ کا مخالف ہے اور اسلام کی تعلیمات تعصب کی دعوت دیتی ہیں۔ علامہ افغانی نے دلائل کی روشنی میں بتایا کہ اسلام علوم وفنون کا ہرگز مخالف نہیں ہے بلکہ علم وتحقیق کی دنیا میں اس کی پیش امام کی حیثیت ہے اسی طرح انھوں نے تعصب کے بارے میں بتایا کہ اسلام پر تعصب کا الزام سراسر کذب وافترا پر مبنی ہے۔ افغانی کا خیال ہے کہ انگریزوں کے ذہن میں تعصب کا مفہوم درست نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تعصب کی ایک خاص حد ہے اگر اس سے تجاوز کرے تو یہ تعصب ظلم میں تبدیل ہوجائے گا۔ تعصب کی حدود کو توڑنے کے بعد انسان اندھا ہوجاتا ہے۔ وہ جائز و ناجائز تمام مواقع پر اپنے اعزہ واقارب اور اپنی قوم کی طرف داری کرتا ہے۔ وہ صرف اپنی قوم کو شان و شوکت کا مستحق قرار دیتا ہے۔ عدل و انصاف کو فراموش کر دیتا ہے۔ یہ تعصب دین اسلام میں جائز نہیں ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا ہے

لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا إِلَى عَصَبِيَّةٍ

[ جو عصبیت کی دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں ]

(تاریخ الاستاذ ۲/۲۵۱-۲۵۲)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے بعد مذہب اسلام پر تعصب کا الزام لایعنی ہے۔

العروۃ الوثقیٰ ہی میں افغانی گویا ہیں کہ:

"انگریزوں نے دین اسلام پر جو الزامات لگائے ہیں اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اس سے ان کی طبیعت کی سطحیت، خفت اور دنائت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ دین اسلام کے مبلغین و داعین پر یہ الزام عاید کرتے ہیں کہ انھوں نے لوگوں کو بالجبر دائرہ اسلام میں داخل کیا جب کہ انھوں نے تمام قوت وشوکت کے باوجود کسی کو کلمۂ اسلام پڑھنے پر مجبور نہیں کیا۔ وہ بہت سے ممالک کو فتح کر کے عظیم شخصیتوں پر غالب آگئے تھے لیکن انھوں نے ہرگز قبول اسلام کے لیے مجبور نہیں کیا بلکہ ان کے سامنے اسلام کو پیش کیا۔ اگر انھوں نے قبول کرلیا تو فبہا ورنہ ان کے حال پر چھوڑ دیا اور مخصوص شرائط کے ساتھ وہ انھیں تمام شہری مراعات مہیا کرتے روم و یونان میں نصرانیت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے جو کچھ کیا گیا اسلام اس کے بالکل برعکس ہے۔ روم اور یونان کے لوگوں کو نصرانیت کے قبول کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ مصر اور شام میں بھی نصرانیت کی تبلیغ کے سلسلے میں یہی طرز اپنایا گیا۔ (تاریخ الاستاذ ۲/۲۵۴)

العروۃ الوثقیٰ کے اسی مقالے میں افغانی آگے فرماتے ہیں کہ

" اسلام میں قومیت و وطنیت کا کوئی گزر نہیں۔ اس فتنے کو ہوا دینے والے بھی انگریز ہی ہیں۔ اسلام میں کسی ملک اور حد کا تصور نہیں ہے۔ اسلام حدود اور خطوں سے بالاتر ہے۔ اسلام کے نزدیک تمام انسان عیال اللہ ہیں اور ساری زمین خداوند قدوس کی ہے۔ اس کی وراثت صرف نیک بندوں کا حق ہے۔ دنیا کے سارے انسان اسلام کے نقطۂ نظر سے بھائی بھائی ہیں۔"

انگریزوں کی وطنیت جیسی منافقت سے ہر لمحہ افغانی نے
ت مسلمہ کو متنبہ کیا اور بتایا کہ وطنیت کا گھن لگنے کے بعد
ت مسلمہ صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی۔ اس مرض
سے بچانے کے لیے علامہ افغانی نے اپنے رسالے میں دنیا
کے تمام مسلمانوں سے اپیل کی کہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر
شمنانِ اسلام کا مقابلہ کریں۔ ان کی یہ اپیل انہی کے
لفاظ میں ملاحظہ کریں۔

فیا ایتها المرحومه هذه حیاتکم
فاحفظوها ودمائکم فلا تریقوها
وارواحکم فلا تزهقوها وسعادتکم
فلا تبیعوها بثمن دون الموت هذه
هی روابطکم الدینیه لا تغرنکم الوساوس
ولا تستهوینکم الترهات ولا تدهشنکم
زخارف الباطل۔ ارفعوا غطاء
الوهم عن باصرة الفهم واعتصموا
بحبال الرابطة الدینیة التی هی احکم
رابطة اجتمع فیها الترکی بالعربی و
الفرسی بالهندی والمصری بالمغربی
وقامت لهم مقام الرابطة النسبیه
حتی ان الرجل منهم لیالم لما یصیب
اخاه من عادیات الدهر وان تناءت
دیاره وتقاصت اقطاره"

(تاریخ الاستاذ ۲/۲۵۸)

مذکورہ بالا اقتباس کے ایک ایک لفظ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں ملت اسلامیہ سے کس قدر جذباتی لگاؤ تھا اور دینی عصبیت کے ترک کر دینے پر کس قدر قلق اور صدمہ تھا۔ آج کی ملت اسلامیہ قومیت و وطنیت کے دلدل میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ اسلام انہی غلط عقاید کو مٹانے کے لیے آیا تھا۔ اس نے عربوں کے اس دائمی مرض کو ختم کر کے ان کے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا تھا۔ لیکن آج عرب اور دنیا کے تمام مسلمان اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ افغانی کے یہی تمام خیالات العروۃ الوثقیٰ میں منظر عام پر آتے رہے۔ بعد میں افغانی کی اس روایت کو رشید رضا مصری (۱۸۵۶ — ۱۹۳۵ء) نے اپنے مشہور رسالہ المنار میں باقی رکھا اور بہت سے رسایل اور مصری تنظیمیں بھی افغانی ہی کے خطوط پر چل کر امت مسلمہ کی بہتری کے لیے تگ و دو کر رہی تھیں اور آج تک مصر کے اندر افغانی کے اثرات دیکھنے میں آ رہے ہیں اور تا قیامت افغانی کے افکار و خیالات سے ہمدردانِ ملت استفادہ کرتے رہیں گے۔ جمہوریت کا یہ علم بردار، وحدت اسلامی کا روح رواں اور العروۃ الوثقیٰ کا بانی سرطان کے مرض میں مبتلا ہو کر ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو رب حقیقی سے جا ملا۔

---

بقیہ متعلقہ صفحہ نمبر ۳۷

قرآن ہے یعنی ہر سورہ بجائے خود ایک مستقل اور مرتب کلام ہے۔ اور پھر اس طرح اپنے مضمون کے لحاظ سے اپنی قبل والی سورہ سے مربوط ہے۔ لکھے جانے کی جتنی ضرورت تھی اس کے [illegible]

وہ بھی اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ خدمت قرآن کے مدعی تو بہت ہیں لیکن مولانا اپنی دقت نظر، عمیق فکر، حکیمانہ ژرف نگاہی، علم و فضل، تبحر ادبی اور تقویٰ و طہارت میں اپنی نظیر آپ تھے۔"

# زندہ پانی

ریاض الدین احمد ▽

عام طور پر اجسام گرمی پاکر پھیلتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ متعلقہ شئے کے سالمہ مادے Molecules گرمی کی وجہ سے تیز رفتار ہو جاتے ہیں۔ مگر چونکہ ان کی حرکت کا دائرہ محدود ہوتا ہے اس لیے وہ آپس میں ٹکرانے لگتے ہیں۔ اس عمل سے مادہ پھیل جاتا ہے۔ مگر پانی کے ساتھ معاملہ الٹا ہے۔ بات یہ ہے کہ پانی کا ایک سالمہ آکسیجن (Oxygen) کے ایک ایٹم اور ہائیڈروجن (Hydrogen) کے دو ایٹموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ تینوں ایٹموں کی ترتیب ایک مثلث کی شکل بناتی ہے۔ اس طرح کہ آکسیجن ایٹم ایک کونے پر اور ہائیڈروجن کے دو ایٹم باقی دو کونوں پر ہوتے ہیں اور اس کے جداشدہ برقیہ (Electron) کا محور سمت مخالف میں کافی جھکا ہوا ہوتا ہے۔

جب پانی کا ٹمپریچر گر جاتا ہے اور حرارت پذیر رفتار میں سستی نمایاں ہونے لگتی ہے تو آبی مالیکول کے برقیہ مقناطیسی اجزا - Electro-magnetic (properties) مذکورہ بالا رفتار سے زیادہ طاقتور ہو جاتے ہیں ایسی صورت میں منفرد مالیکول ایک دوسرے سے چپٹنے لگتے ہیں اور دو سالمہ مراکز (Protons) اپنے پڑوسی مالیکول کے ایک ایک برقیے کو کھینچ لیتے ہیں اور ایک آبی مالیکول چار دوسروں کے ساتھ منسلک ہو کر ایک حسین بلوری جالی دار پل کی تعمیر کرتا ہے جس کے سوراخ ایک مالیکول کو اپنے اندر داخل کرنے کے لیے کافی وسیع ہوتے ہیں۔

دوسری طرف جب ٹمپریچر بڑھ جاتا ہے تو مالیکول کی حرارتی رفتار میں گہرا پن آجاتا ہے اور مالیکول کا آپسی اتحاد منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے برف پگھلنے لگتی ہے، مالیکول ٹوٹ ٹوٹ کر سوراخوں میں چلے جاتے ہیں اور پانی کا حجم گھٹا دیتے ہیں۔

مالیکولوں کا یہ رویہ منجمد پانی سے متعلق تھا سوال یہ ہے کہ رقیق پانی کے ساتھ اس کا کردار کیا شکل اختیار کرتا ہے۔ اس مسئلہ پر حالیہ ماہرین سائنس نے کافی توجہ مبذول کی ہے۔ اگرچہ علم طبعیات (Physics) اور حیاتیات (Biology) کی روشنی میں پانی ایک نیم فراموش شدہ مسئلہ بن چکا تھا۔ بہرحال یہ بات ذرا بھی حیرت ناک نہیں کہ اس

▽ نور اللہ روڈ، الہ آباد - یوپی

ستجو میں نئے دور کے ماہرین سائنس کا پہلا تاثر الجھن در پریشانی کا تھا، مگر جستجو نئی کروٹ لے رہی ہے۔ پتہ چلا ہے کہ پگھلے ہوئے برف سے حاصل شدہ پانی یتی پانی کے مقابلے میں اپنے فطری خواص کو زیادہ عرصے ک برقرار رکھ سکتا ہے۔ حالانکہ ہر پانی کی خاصیت یکساں نہیں ہوتی۔ پگھلے ہوئے پانی میں لاتعداد باریک آبی جزیرے بکھرے ہوئے ہیں جن میں برف کے تمام خواص موجود ہیں۔ برف کے یہ ٹکڑے جلدی پگھلتے نہیں۔ پانی کو ۳۰ ڈگری سیلسیس تک گرم کرنے سے ان کے پگھلنے کی رفتار کافی سست رہتی ہے۔ ۴۰ ڈگری اور اس کے اوپر پگھلنے کی رفتار تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ غیر مرئی برف کے ٹکڑے اجسام حیوانی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ماہرین سائنس کو بہت سے وہ پرانے اسباق دہرانا پڑ گئے جو داستان پارینہ ہو چکے تھے اور مبہم اور غیر واضح شکل میں پڑے تھے تجدید اسباق نے بہت سے ضمنی سوالات ابھار دیے مثلاً کیا وجہ ہے کہ خورد سال اجسام — Micro Organism کی تعداد اس منطقہ میں جہاں برف پگھل رہی ہو بڑی تیزی سے بڑھتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اکثر کیڑے جو معتدل عرض البلد میں جنم لیتے ہیں اپنے انڈوں کو بغیر سردی کے بار آور نہیں کرا سکتے؟ کیا وجہ ہے کہ وہ پرند اور چرند جن کی غذا برف یا برف کا پگھلا ہوا پانی ہے بڑی تیزی سے نشوونما پاتے ہیں اور بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ کوئی اتفاق نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ بیشتر پرند موسم سرما میں بچے نکالتے ہیں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بچے نکالنے کے وقت پرند افریقہ اور ہندوستان کے گرم حصوں سے ہجرت کرکے سرد منطقوں میں چلے جاتے ہیں۔ ان سب ہی معموں میں ایک امر متفقہ یہ ہے کہ سب کا تعلق پانی سے ہے۔ چاہے عام پانی ہو یا ٹھنڈا پانی ہو یا برف ہو یا پگھلی ہوئی برف کا پانی ہو۔

ان معموں کا حل نکالنے کے لیے اہل سائنس بھرپور تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ لوگ وسط سفر میں جانے کے قایل نہیں ہوتے۔ اگلے سفر کی راہ میں یہ دیرینہ نظریہ کہ پانی کا کام صرف مالیکولس کے خلا کو پُر کرنا ہے مسترد ہو گیا۔ اب نئی دریافت اس طرف مائل بہ تحقیق ہے کہ زندہ اجسام میں پانی کی صورت حال کیا ہے۔ پتہ یہ چلا ہے کہ اکثر اجسام میں خلیوں کی جھلیاں (Membranes) اور عظیم زندہ مالیکولس پانی کے مالیکولس کو جو ان کے مقابلے میں حقیر ترین ہیں اپنی طرف کھینچتے ہیں اور ان کو اپنی سطح پر اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ برف نما جالی کا ایک بلورین نیل وجود میں آجائے۔ نیز خلیوں کے پروٹوپلازم اور جالے خالی کے رقیق مادے میں بہ کثرت برفانی ٹکڑے پھرتے نظر آتے ہیں۔ درحقیقت جسم حیوانی اپنے پانی کا بڑا حصہ منجمد کر دیتا ہے۔ پگھلے ہوئے برف سے حاصل شدہ ٹھنڈا پانی اجسام پر بہتر اثر اس لیے مرتب کرتا ہے کہ برف زندگی کے لیے ایک لازمہ ہے۔ منجمد پانی کو ہی اصطلاحاً زندہ پانی کہتے ہیں۔

"زندہ پانی" کی دوسری صفت یہ ہے کہ انجماد کی حالت میں یہ خراب نہیں ہوتا۔ کیونکہ پروٹین (لحمیہ) چربی اور کاربوہائیڈریٹ (Carbohydrate) کے مالیکولس برف کے ترتیبی نظام میں خود بخود فٹ ہوتے چلے جاتے ہیں اور برفانی ٹیل کے سوراخوں میں بہ آسانی داخل ہو سکتے ہیں لیکن وہ مالیکولس برف کے نظام میں فٹ نہیں ہوتے ان کا مسئلہ کچھ دوسرا

ہی ہے۔ بحالت انجماد یہ بڑے مالیکولس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور چھوٹے مالیکولس کو نکال کر باہر پھینک دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آرکٹک سمندر کا پانی نمکین نہیں ہوتا۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اجسام حیوانی بہ تقاضائے عمر اس لیے کمزور ہوتے جاتے ہیں کہ ان میں مجروح مالیکولس کا اجتماع کثیر وجود میں آتا ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو جسم کا ٹمپریچر اتنا گھٹانے سے کہ برف کے ٹکڑے معقول تعداد میں تیار ہو جائیں یا تیار شدہ برف جسم کے اندر داخل کر دی جائے تو اعضائے حیوانی میں جوانی کے آثار ابھرنا شروع ہو سکتے ہیں مگر یہ نظریہ ابھی زیر تجربہ ہے اور جانوروں کی حد تک کامیاب ثابت ہوا ہے۔

اس نظریے کے مطابق ابلے ہوئے پانی کے مقابلے میں بے ابلا ہوا پانی جسمانی ساخت کے لیے زیادہ مفید ہے۔ اونچے ٹمپریچر کی حالت میں برفانی بل ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور مالیکولس کو نئے رشتوں سے منسلک ہونا پڑتا ہے۔ ابلے ہوئے پانی کو منجمد کرنے کے لیے ان نئے رشتوں کو توڑنا ہوگا جو کہ آسان کام نہیں ہے۔ اگر آپ تازہ پانی اُبال کر رکھ دیں پھر منجمد کرنا چاہیں تو صفر ڈگری (س) پر اسے منجمد نہ کر پائیں گے اس کے لیے آپ کو سات ڈگری اور نچلی سطح پر لے جانا ہوگا۔ اس سطح پر پانی کول (cool) کے بجائے اوورکول (Over cool) ہو جائے گا۔ یہ زائد از ضرورت ٹھنڈک جسم حیوانی میں مادۂ حیات کے مضر اثرات کو تحلیل ہونے سے روک دیتی ہے۔ اس کے برخلاف صفر ڈگری کی ٹھنڈک پانی کے مضر اثرات والے مرکبات کو باہر نکال دیتی ہے۔ گرم چائے یا اُبلا ہوا پانی اس لحاظ سے عام صحت مندی کے منافی ہے۔

زندہ پانی کی ایک اور اہم خاصیت یہ ہے کہ اس کے برفانی ٹکڑے پٹھوں کے تناؤ کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سبھی لوگ جانتے ہیں کہ جو توانائی پٹھوں کے سکڑنے کے لیے درکار ہے وہ ایک مخصوص تیزاب اڈینو سائن ٹری فوسفورک ایسڈ (Adeno-Sinethi-Phosphoric Acid) کے ٹوٹ پھوٹ سے حاصل ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ کس طرح ہو رہا ہے ایسا راز ہے جو ابھی تک وا نہیں ہو سکا ہے۔ ممکن ہے کہ جسم حیوانی پر پانی کے تاثرات کے متعلق حالیہ جستجو اس مسئلے پر کوئی نئی روشنی ڈال سکے۔

---

# اصطلاحات

| | |
|---|---|
| سالمہ مادے | 1 Molecules |
| حرارت پذیر رفتار | 2 |
| | 3-Crystal Lathic |
| | 4. Photo plasm |
| لحمیہ | 5. Protene |
| مادۂ حیات کا تحلیل ہونا | 6. Metabolism |

# مولانا حمید الدین فراہیؒ

ابو سعد اصلاحی ▽

مولانا حمید الدین فراہیؒ کی شخصیت محتاج تعارف
ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مولانا فراہی جس بلند پایہ
کے مفسر اور ماہر قرآنیات تھے اس کے اعتبار سے
ان کی شخصیت کے گوناگوں پہلو ابھی تک پوری طرح نمایاں
نہیں ہو پائے ہیں۔ مکتب فراہی کے وابستگان جمود و
تعطل کے حصار سے نکل کر مولانا کی علمی خدمات اور ان
کی فکری و تحقیقی کاوشوں کو عام کرنے کی کوششوں میں
مصروف ہیں۔

مولانا جیسی یگانۂ روزگار شخصیت کے مسقط الراس
ہونے کا شرف اعظم گڑھ کے ایک معروف گاؤں پھریہا
کو حاصل ہے۔ آپ کی تاریخ پیدائش ایک خاندانی
دستاویز کے مطابق ۶ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ بمطابق
۱۸ نومبر ۱۸۶۳ء ہے۔

تعلیم و تعلم سے دلچسپی بچپن ہی سے تھی۔ شرفا
کے گھرانوں کے دستور کے مطابق تعلیم کا سلسلہ گھر ہی
سے شروع ہوا۔ صرف دس سال کی عمر میں حفظ قرآن
پورا کر لیا جسے مولانا پر قرآن کی برکتوں کے نزول کا
پہلا اشارہ یہ سمجھنا چاہیے۔ اس کے بعد صرف آٹھ نو ماہ
کی مدت میں فارسی زبان کی تحصیل کی تکمیل سے مولانا
کی فطانت طبع اور جودت ذہن کا بخوبی اندازہ لگایا
جا سکتا ہے۔ بعد ازاں اس زمانے کے مروجہ نصاب
تعلیم کے حصول کے لیے اپنے ماموں زاد بھائی علامہ شبلی
نعمانی سے رجوع کیا اور انہیں کی زیر نگرانی درس نظامی
کی بیشتر کتابوں سے استفادہ مکمل کر لیا۔ فارسی زبان و
ادب پر عبور اور شستگیٔ ذوق کا عالم یہ تھا کہ محض ۱۶ سال
کی عمر میں فارسی زبان کے سب سے مشکل گو شاعر خاقانی
شیروانی کے تتبع میں ایسا قصیدہ کہا ہے جسے سن کر
علامہ شبلی کے استاد مولانا فاروق چریاکوٹی انگشت
بدنداں رہ گئے۔ قصیدے کا مطلع تھا:

بے جلوۂ رخ تو بود مضطر آئینہ
خار افگند بہ پیرہن از جوہر آئینہ

فقہ اسلامی میں دستگاہ حاصل کرنے کے لیے
لکھنؤ جا کر مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی کے درس میں شرکت
کی اور آخر میں ادبیات عربی میں درک حاصل کرنے

---

▽ ایم۔ ڈی (معالجات)، اجمل خاں طبیہ کالج، اے ایم یو علی گڑھ

کے لیے لاہور جاکر مولانا فیض الحسن سہارن پوری سے کسب فیض کیا۔ مولانا سہارن پوری اس وقت عربی زبان و ادب میں استاذ کا درجہ رکھتے تھے۔

زمانے کے مروجہ نصاب درسیات کی تکمیل اور عربی و فارسی زبان و ادب میں مہارت کے بعد مولانا نے جدید تعلیم کی تحصیل کی طرف توجہ دی۔ اس زمانے میں علوم جدیدہ سے بیگانگی اور انگریزی سے نفرت کی جو لہر مسلمانوں کے اندر تھی مولانا کا اس طرف متوجہ ہونا اُن کے مجتہدانہ انداز فکر کی غمازی کرتا ہے۔ ہمارے یہاں مغرب سے مرعوبیت کا ایک بڑا سبب علوم جدیدہ سے عدم واقفیت بھی تھی۔ مولانا پوری ملت کو اس حصار سے باہر نکالنا چاہتے تھے، اسی لیے انگریزی زبان میں تھوڑی سی شدھ بدھ پیدا کرکے جدید تعلیم کی مرحلہ وار اسناد کے حصول کی خاطر پہلے مڈل پھر انٹرنس پاس کیا۔ یہ مرحلہ کرنل گنج اسکول الہ آباد سے پورا کیا۔ مزید عصری تعلیم کے حصول کے لیے انھوں نے ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا اور ۱۸۹۵ء میں اسی کالج سے بی۔اے کا کورس مکمل کرلیا۔ مولانا نے یہاں قیام کے دوران انگریزی زبان و ادب اور فلسفہ میں مہارت حاصل کرنے میں خاصی دلچسپی لی۔ اس وقت کے فلسفے کے استاذ پروفیسر آرنلڈ سے مولانا نے اس میدان میں بھرپور استفادہ کیا۔ مولانا کے اندر فلسفہ کا ذوق بھی انہی کی علمی صحبت و رفاقت سے پیدا ہوا۔ لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ وہ گوناگوں اسباب کی بنا پر پروفیسر موصوف کی تصنیف ـ Preaching of Islam کو سخت ناپسند کرتے تھے جب کہ مسلمانوں کا خاصا بڑا طبقہ اس کے سحر کا اسیر تھا۔

بی۔اے کرنے کے بعد مولانا ایم اے ایل ایل بی کا کورس بھی مکمل کرنا چاہتے تھے لیکن تیاری کے باوجود وہ اُن میں سے کوئی کورس پورا نہ کر سکے۔ اس لیے کہ ان کی دلچسپی کا اصل میدان قرآن کریم تھا اور وہ اپنی تمام تر توجہات اسی میں صرف کرنا چاہتے تھے۔ البتہ انھوں نے اپنے طور پر ایسے علوم و فنون کی تحصیل جاری رکھی جو قرآن میں تدبر و تفکر کی راہ میں معاون بن سکتے تھے۔ چنانچہ ایم۔اے۔او کالج سے ۱۹۰۷ء-۱۹۰۸ء عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے انسلاک کے دوران انھوں نے شعبہ کے سربراہ پروفیسر یوسف ہارویز سے عبرانی زبان میں اتنا درک حاصل کرلیا کہ عبرانی کتابوں سے براہ راست اخذ و استفادہ آپ کے لیے آسان ہوگیا۔ اس کا اندازہ مولانا کی تفسیر اور قرآنی علوم سے متعلق ان کی تحقیقات سے لگایا جاسکتا ہے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد مولانا فراہی نے اس زمانے کے مختلف معروف تعلیمی اداروں میں تدریسی و انتظامی خدمات انجام دیں۔ محض ذریعۂ معاش کے لیے ان خدمات کی انجام دہی بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ مولانا کے گھریلو حالات اس قدر بہتر تھے کہ ملازمت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ دوسری بہت ساری وجوہات ہوسکتی ہیں مگر شاید ایک وجہ یہ رہی ہو کہ تعلیم و تعلم کی دنیا میں رہ کر سررشتۂ علم سے رابطہ بھی تازہ رہتا ہے اور تصنیف و تالیف کے لیے آسانیاں بھی فراہم ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ تعلیم سے فراغت کے بعد سب سے پہلے مولانا نے مدرسۃ الاسلام کراچی میں تدریسی خدمت انجام دی۔ یہاں کئی سال بسر کرنے کے بعد مولانا علی گڑھ کے شعبۂ عربی میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر منسلک ہوئے۔ ایک سال سے کچھ زائد علی گڑھ میں قیام کے بعد مولانا میور کالج الہ آباد میں عربی۔

پروفیسر مقرر ہوئے۔ یہیں سے آپ کی خدمات دارالعلوم حیدر آباد کی پرنسپلی کے لیے حاصل کی گئیں۔ مشہور روایت کے مطابق جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے تعلیمی نقشہ کی تیاری مولانا ہی کے تخیل پر مبنی ہے۔ مولانا نے نہایت ٹھوس دلائل سے یہ ثابت کیا کہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنا کر ہی مسلمانوں کی تہذیبی شناخت اور اس کا تشخص قایم رکھا جا سکتا ہے اور بالآخر ریاست کے تعلیمی کارفرماؤں کو اپنے نظریے کا قایل بنا لیا۔ مولانا بہت ساری وجوہات کی بنا پر قیامِ حیدر آباد سے خوش نہیں تھے اور بالآخر ۱۹۱۹ء میں ملازمت سے استعفا دے کر اپنے وطن واپس آگئے اور عمر کا باقی حصہ اپنے مخصوص تخیل کے مطابق مدرسۃ الاصلاح کی تعمیر و ترقی میں بسر کیا۔

قدیم و جدید علوم کی تحصیل کا واحد مقصد مولانا کے نزدیک کلامِ الٰہی کی انہام و تفہیم کو آسان بنانا تھا۔ قرآن مجید پر تفکر و تدبر اور دماغ سوزی مولانا کا وظیفۂ زندگی تھا۔ اس میدان میں مولانا نے جو کارنامے انجام دیے ہیں اور جو علمی یادگار چھوڑی ہے اس کی نظیر متقدمین کے یہاں بھی ملنی مشکل ہے۔ افادیت کی غرض سے مولانا کی تصانیف کا سرسری تذکرہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ تفسیر نظام القرآن و تاویل الفرقان

اس کے چند اجزا عربی میں شایع ہو چکے ہیں اور مولانا امین احسن اصلاحی کے اردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔ مولانا نے جو اصول تفسیر اور قرآن کریم کے مطالعے کے جو آداب متعین کیے ہیں یہ تفسیری اجزا انہیں کی روشنی میں لکھے گئے ہیں۔ تفسیر سورۂ آل عمران و بقرہ کا کچھ حصہ مسودات کی صورت میں موجود ہے۔

۲۔ فاتحۃ نظام القرآن

اس میں سترہ اصول تفسیر سے بحث کی گئی ہے۔ ان اصول سے واقفیت کے بغیر کوئی مفسر یا محقق تفسیر قرآن سے صحیح معنوں میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ یہ اصول و ضوابط درج ذیل ہیں:

۱۔ تفسیر آیات بالآیات۔ ۲۔ شانِ نزول ۳۔ تفسیر کے خبری ماخذ۔ ۴۔ تفسیر کے لسانی ماخذ ۵۔ آسمانی کتابوں کی شرح ایک دوسرے کی مدد سے۔ ۶۔ قرآن قطعی الدلالت ہے۔ ۷۔ مناسبتِ ترتیب۔ ۸۔ ہر سورہ میں ایک خاص نظام ہے۔ ۹۔ احکام و حقائق کے باب میں قرآن اور کتب سابقہ کا تعلق۔ ۱۰۔ سورتوں کی مقدار۔ ۱۱۔ قرآنی تعلیم کے اصول مسائل۔ ۱۲۔ معروف و منکر۔ ۱۳۔ نظم کی دلالت ۱۴۔ اجزائے نظم۔ ۱۵۔ سورتوں کے نام اور عمود۔ ۱۶۔ تعین خطاب ۱۷۔ کیفیت۔

درج بالا اصول سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ یہ اصول تفسیر کس قدر محکم اور تفسیر قرآن کے لیے کتنی اہمیت کے حامل ہیں۔ نیز یہ بھی کہ مولانا کا معیار و اندازِ تحقیق کتنا بلند اور مجتہدانہ تھا۔

۳۔ مفردات القرآن

اس میں ۷۷ مشکل قرآنی الفاظ کی تحقیق و تشریح کی گئی ہے۔ ان کی تحقیق میں مولانا

نے عام مفسرین اور اہل لغت سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی بات کو کلام عرب سے مدلل کیا ہے۔ اس کتاب میں الفاظ کی تحقیق سے متعلق کچھ رہنما اصول سے بھی بحث کی گئی ہے اگر ان اصول وضوابط کو مد نظر رکھا جائے تو صحیح مفہوم تک رسائی مشکل ہو جائے گی۔

۴۔ امعان فی اقسام القرآن

اس میں قسم کی حقیقت پر اصولی بحث کی گئی ہے۔ مولانا نے اس میں نہایت ٹھوس دلایل کی روشنی میں پورے جزم و یقین کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی قسمیں آئی ہیں استدلال و استشہاد کے لیے آئی ہیں وہ دراصل نظری دلیل اور تاریخی شہادتیں ہیں جو قسموں کی صورت میں پیش کی گئی ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی شایع ہو چکا ہے۔ یہ رسالہ اس معنی میں بے حد اہم ہے کہ قرآن کریم میں وارد قسموں کے سلسلے میں اس انداز سے کسی تحقیق کا سراغ متقدمین کے یہاں نہیں ملتا۔

۵۔ الرای الصحیح فی من ھو الذبیح

اس کتاب میں تیرہ دلائل تورات سے اور تیرہ دلایل قرآن مجید سے اخذ کرکے اس دعویٰ کو نہایت محققانہ اور ناقدانہ انداز سے مولانا نے ثابت کیا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل ہیں نہ کہ حضرت اسحاق ہیں جیسا کہ یہود کا خیال ہے۔ علامہ شبلی کی سیرۃ النبی کی ساری بحث اسی رسالہ پر مبنی ہے

۶۔ جمہرۃ البلاغۃ ——— یہ محققانہ تصنیف یہ بحث کرتی ہے کہ قرآن کے بلاغی نکتوں کو یونان کے وضع کردہ اصول ضوابط سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ مولانا نے ارسطو کے نقطۂ نظر پر تنقید کرتے ہوئے ایسے اصول وضع کیے ہیں جو قرآن کے لغوی اعجاز کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

۷۔ دلائل النظام

اس کتاب میں مولانا نے نظم قرآن کی بحث نہایت مدلل انداز میں کی ہے اور ایسے مضبوط دلائل دیے ہیں کہ ان سے انکار ممکن نہیں۔ نظم قرآن کی تلاش میں مولانا کو جو تفرد و امتیاز حاصل ہے اس سلسلے میں مولانا خود فرماتے ہیں کہ

"میں پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نظم کی تلاش میں میں نے کسی شخص کی پیروی نہیں کی ہے۔ بلکہ اللہ کی بخشی ہوئی بصیرت میری رہنما رہی ہے۔"

متقدمین نے قرآن کی راہ میں کوشش ضرور کی ہیں مثلاً شیخ برہان الدین بقاعی نے اپنی کتاب نظم الدرر فی تناسب الآی والسور میں نظم کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔ امام فخر الدین رازی نے اس طرف سب سے زیادہ توجہ کی ہے مگر جتنی منظم اور مربوط کوشش مولانا کے یہاں ملتی ہے، اس کا سراغ متقدمین کے یہاں نہیں ملتا۔

۸۔ اسالیب القرآن۔

قرآن کے اسالیب کا تعلق عربی زبان و ادب سے ہے کہ اگر ان کی صحیح تفہیم نہ ہو تو مفہوم حقیقی تک رسائی دشوار ہو جائے۔ ان کو کلام عرب

سے واضح کہ کے مولانا نے ایک اہم کارنامہ
انجام دیا ہے۔

۹۔ التکمیل فی اصول التاویل۔

قرآن مجید کی تاویل کے وقت کیا اصول پیش نظر ہونے چاہییں۔ اس کتاب میں اسی پر اصولی بحث کی گئی ہے اور مولانا نے انہیں اصول تاویل کو اپنی تفسیری تحقیق کے دوران برتا ہے۔

۱۰۔ القائد الی عیون العقائد:

اس میں مولانا نے علم کلام کی تدوین نو پر زور دیتے ہوئے توحید، رسالت اور معاد پر قرآنی دلائل کی وضاحت کی ہے۔

۱۱۔ فی ملکوت اللہ۔

قوموں کے عروج و زوال، حق کی فتح اور باطل کی شکست کے متعلق قرآن میں بیان کردہ قوانین کی مولانا نے اس کتاب میں وضاحت کی ہے اور انہیں کی روشنی میں اسلامی نظام سیاست کی بھی وضاحت کی ہے۔

۱۲۔ عربی و فارسی دواوین

مولانا کا شعری ذوق بھی بڑا نکھرا ہوا تھا۔ ان دواوین میں مولانا نے اپنے تخیلات کی تجلی شعری قالب عطا کیا ہے۔

مولانا کے علمی سرمایہ کا ایک حصہ ابھی مسودات کی صورت میں محفوظ ہے۔ اس کی قدر و قیمت پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس کی ایک ... مختصر فہرست اس طور پر پیش کی جا سکتی ہے اور محض اسی پر نظر ڈالنے سے مولانا کے علمی افق کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مجج القرآن، کتاب الحکمۃ، کتاب الرسوخ فی معرفۃ الناسخ والمنسوخ، الرائع فی اصول الشرائع، احکام الاصول باحکام الرسول۔ الاکلیل فی شرح الانجیل۔ اسباب النزول کتاب العقل وما فوق العقل، تاریخ القرآن، اوصاف القرآن، فقہ القرآن، النحو الجدید، فلسفۃ البدائع وغیرہ مولانا امین اصلاحی کے بقول:

"اس فہرست پر نظر ڈال کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ مولانا قرآن حکیم کو مرکز بنا کر تمام اسلامی علوم کو از سر نو مرتب کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ آدمی پر جو دروازہ بھی کھلے وہ قرآن کی راہ سے کھلے اور وہ جس راہ میں بھی چلے قرآن کی روشنی اس کی رہنمائی کرے۔ یہ ساری جدوجہد مولانا مسلمانوں خصوصاً علماء کے اندر ایک صحیح قسم کا فکری انقلاب پیدا کرنے کے لیے کر رہے تھے تاکہ یہ فکری انقلاب ایک صحیح قسم کے عملی سیاسی انقلاب کے لیے محرک کا کام دے۔"

مولانا کی تصانیف سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی تحریروں میں ایسی ہمہ جہتی ہے۔ جس کے اندر وحدت فکر پوشیدہ ہے۔ یعنی یہ کہ تمام علوم و فنون کا مطالعہ اس مقصد کے تحت ہو کہ اس سے قرآن فہمی کی راہیں ہموار ہوں اور قرآن ہی کی روشنی میں ان کو از سر نو مرتب کرنے کا اہتمام کیا جائے مولانا دراصل اس انقلابی تصور کے داعی تھے کہ قرآن مجید کو مرکز و محور بنا کر دیگر علوم رشتہ اصل منبع سے جوڑ دیا جائے۔ وہ اس تصور کو مکمل طور سے عملی جامہ نہ پہنا سکے لیکن ان کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف اور بالخصوص فی تفسیر سے اس منہج فکر کی بھرپور ترجمانی ملتی

ہے اور اس سمت میں مزید پیش قدمی کے لیے رہنما خطوط واضح ہوتے ہیں۔

یہاں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ مولانا فراہی اس فکر کو نہ صرف تصنیف و تالیف کی دنیا میں رچانا و بسانا چاہتے تھے بلکہ نظام تعلیم کو بھی اسی نہج پر تشکیل دینے کے لیے کوشاں تھے۔ وہ اس وقت کے مروجہ نظام تعلیم درسِ نظامی سے خاص طور سے اس لیے مطمئن نہیں تھے کہ اس میں منطق، فلسفہ، علم کلام اور تقلیدی انداز میں فقہ کی تعلیم و تدریس کو غیر ضروری اہمیت حاصل تھی اور اس کے تحت کسی قدر تفسیر کی مدد سے قرآن کریم کو پڑھنے پڑھانے کا رواج تھا۔ دوسری جانب مولانا فراہی یہ چاہتے تھے کہ مدارس میں قرآن پر تدبر و تفکر کا ماحول قائم کیا جائے اور طلبا میں فہم قرآن کی صلاحیت کو پروان چڑھایا جائے اور اس سے اہم یہ کہ جتنے علوم بھی پڑھائے جائیں سب قرآن ہی کی روشنی میں۔ تاکہ نہ صرف قرآن کی افہام و تفہیم کو فروغ حاصل ہو بلکہ قرآن ہی بزم علم کا صدر نشین بن جائے۔ اسی تخیل کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے آخر عمر میں اپنی خدمات مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کے لیے وقف کیں اور اسی کے مطابق انھوں نے مدرسہ کا نصاب مرتب کیا۔ زندگی کے آخری ١٢ سال مدرسۃ الاصلاح پر صرف کرکے لمحہ لمحہ ذہنی و فکری انقلاب کے ذریعے مولانا جن مقاصد کا حصول چاہتے تھے اس کے متعلق خود رقم طراز ہیں کہ:

" مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ اس نے مذہبی تعلیم کی صراط مستقیم کو پالیا ہے۔ اس نے اسے اپنا مقصد اساسی قرار دیا ہے۔ وہ مقصد اساسی اور وہ صراط مستقیم کیا ہے؟ وہی ہے جس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو چھوڑا تھا اور جس کے آخری خطبے میں وصیت فرمائی تھی کہ میں تمہارے لیے کتاب اللہ چھوڑے جاتا ہوں جب تک اسے مضبوط پکڑے رہوگے، ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط اور تنزل کا اصلی سبب یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تعلیم کو آہستہ آہستہ کم کرتے گئے اور وہ علوم جو قرآن کے لیے آلہ و وسیلہ ہوسکتے تھے ان کی تحصیل میں اس قدر مصروف ہوگئے کہ وہ مقصود بالذات بن گئے۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے قرآن مجید کے درس و تدریس کے لیے انھوں نے بالکل جگہ نہ چھوڑی اور اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ محض تلاوت و حفظ الفاظ پر اکتفا کرلیا گیا اور ہم پر رسول خدا کی یہ شکایت منطبق ہونے لگی (یارب اِنّ قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً) [اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو ایک چھوڑی ہوئی چیز سمجھ لیا ہے] لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مدرسۃ الاصلاح نے یہ راز پالیا ہے اور قرآن مجید کو سرچشمہ ہدایت و ترقی تسلیم کرکے جملہ علوم کی تعلیم اس کی تعلیم کے ماتحت کردی۔ وہ ادب، فقہ، حدیث، تاریخ، سیر، منطق اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے لیکن اس طور پر کہ جس علم کی طرف قدم بڑھے قرآن کی روشنی میں اور جو دروازے کھلے قرآن ہی کے اندر سے کھلے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، کہ مولانا فراہی کی فکر کاوش آشنا کا محور صرف اور صرف کلام الٰہی تھا، اسی پر غور و خوض اور اس کے صحیح مفہوم تک رسائی ان کا مطمح نظر تھا۔ علوم قدیمہ کی تجدید و تدوین ہو یا علوم جدیدہ کی تطہیر و تحصیل۔ ان سب سے مولانا صرف قرآن فہمی کی راہیں ہموار کرنا چاہتے تھے۔

مولانا کے یہاں جو تحقیقی و تنقیدی انداز بحث، جو مجتہدانہ بصیرت اور جو محققانہ اسلوب ملتا ہے وہ کسی تقلید سے عاری ہے۔ قرآن پر تدبر و تفکر کا جو اعلیٰ تحقیقی معیار مولانا فراہی نے قائم کیا ہے اور اپنی فکر کو کسی نتیجے تک لے جانے میں ایک مفسر کو آداب مطالعہ کے کون کون سے پہلو مدنظر رکھنا چاہیے اس کے جو منازل مولانا نے طے کیے ہیں پورے تفسیری لٹریچر میں ایک اضافہ ہے۔ مشہور مفسر قرآن مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے مولانا فراہی کے اسی معیار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"علامہ فراہی ایک بڑے درجے کے محقق تھے۔ انھوں نے اپنی تفسیروں میں تحقیق کا ایسا خاص مجتہدانہ اسلوب اختیار کیا ہے جو دوسرے مفسرین کے اسالیب سے بہت کچھ مختلف ہے۔ اس اسلوب خاص سے انھوں نے جو مطالب اخذ کیے ہیں اور آیات کے جو معانی متعین کیے ہیں، ان میں اختلاف کی ایسی گنجائش ہے جیسی دوسرے مفسرین کے نتائج تحقیق میں ـــــ لیکن ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ناظر کے زاویۂ نظر کو وسیع کرتا ہے اور قرآن مجید کے معانی و مطالب کو سمجھنے کے لیے تحقیق و تفحص اور موادِ علمی کے وسیع تر میدانوں کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواہ کوئی شخص ان کے نتائج تحقیق سے کلی اتفاق نہ رکھتا ہو مگر وہ اُن کی تحقیقات میں ایسے بیش بہا علمی خزانے پاتا ہے جن سے کوئی طالب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔"

مزید برآں علم جغرافیہ کی مدد سے اور پھر اشعار عرب کے توسط سے قرآن میں بیان کردہ تاریخی مقامات کی تعیین جس تجزیاتی انداز سے مولانا کے یہاں ملتی ہے، دوسری تفسیروں میں اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ سید سلیمان ندوی نے اعتراف کیا ہے کہ شاید ہی خطبائے عرب اور جاہلی شعرا کا کوئی شعر جو قرآن فہمی میں مدد دیتا ہو مولانا کی نگاہ میں نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے قرآن فہمی کے لیے جس امر کو سب سے زیادہ اہمیت دی وہ فلسفۂ نظم قرآن ہے۔ مولانا کو اس تلاش میں جو تفرد و امتیاز حاصل ہے اس کے متعلق مولانا دریابادی رقم طراز ہیں:

"علامہ حمید الدین فراہی اس دور میں علوم قرآنی کے لحاظ سے امام وقت تھے۔ وہ تفسیر قرآن میں ایک امتیازی درجہ رکھنے والے نہ صرف اپنے معاصرین اور متاخرین میں تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ تاریخ امت میں انھوں نے تفسیر کے بعض نئے اصول دریافت کیے۔ ان میں سب سے بڑا اُن کا فلسفۂ نظم

باقی صفحہ ۲۷ پر ملاحظہ فرمایئے)

# سائنس، حرفت، تجارت اور معاشیات

سعید الظفر چغتائی ▽

چاکری کی تنخواہ سے ہمارے ملکوں میں دن تو اچھے برے کٹ جاتے ہیں، لیکن فی زمانہ دولت جمع ہوتی اور بڑھتی ہے تجارت سے۔ نوکرشاہی اقتدار کی آمد بالائی کا شمار بھی اسی میں ہونا چاہیے۔ کیونکہ تجارت کا اپنا اقتدار بھی ہوتا ہے جس کے ڈانڈے نوکرشاہی کے اقتدار سے مل جاتے ہیں۔ یہ تجارت انفرادی سطح پر بھی ہوتی ہے، ملکی سطح پر بھی، جسے "ریاستی بیوپار" State Trading کہتے ہیں، جس سے عوام زیادہ تر واقف نہیں ہیں اور جس کے ذریعے حکومتیں دوسرے ملکوں سے خرید و فروخت کرتی اور اپنے ملک کے باشندوں کو سامان بیچتی ہیں۔

اس تجارت کی گرفت کا کچھ اندازہ ایک ہندوستانی صنعت کار کے حالیہ تجربے سے ہوا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس سے زیادہ قابل اعتبار اور سستا بجلی کا سامان کوئی بنا کے دے نہیں سکتا۔ بنگلہ دیش کے اشتہار پر اس نے ٹینڈر داخل کیے۔ کھلے تو معلوم ہوا جس چیز کے اس نے ساڑھے چار ہزار مانگے ہیں کوریا والے اس کے صرف اٹھارہ سو لے رہے ہیں۔ تفصیل سے چھان بین کرنے پر معلوم ہوا، کوریا میں برآمدات کے لیے خریداری پر سیدھے یا پیچ دار کوئی ٹیکس نہیں پڑتے اور اسی کا یہ فرق ہے۔ نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ روزمرہ کی بہت سی چیزوں پر ہم اسی فیصد بالواسطہ (یا پیچ دار) ٹیکس دیتے ہیں۔

تجارت کے لیے اب کوڑیوں کے دام خام مال حاصل کر لینا کافی نہیں رہا ہے۔ اسے کسی گل حکمت سے کندن بنا کے بامول بیچا جاتا ہے اور یہ گل حکمت دست کاری، ہنرمندی، کیمیاگری یا حرفت آج اونچی حرفت (High Tech) بن چکی ہے۔ حرفت بڑے پیمانے پر ہونے لگے تو صنعت بن جاتی ہے۔

حرفت ہو یا صنعت بجائے خود نہ کافی ہے نہ فائدہ مند۔ اس کے ذریعے وہ چیز بنانی چاہیے جس کے لیے فن تجارت نے خریدار پیدا کر لیے ہوں اور ان میں مال کی کبھی سیر نہ ہونے والی ہوسناک بھوک جگائی ہو۔ ورنہ آپ چاہے جتنی محنت سے چاہے جتنے خوب صورت اور نایاب موتیوں کی مالا بنا ڈالیں، تاجر کے سایۂ پرورش کے بغیر، مقامات حر

▽ پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف فزکس، اے ایم یو۔ علی گڑھ۔

کے ابوزیان السرد جی کی طرح ننگے بھوکے ہی رہیں گے۔ سامانِ تجارت کی ریل پیل سے معیشت بڑھتی ہے اور فراغت، حکومت، نجابت، شرافت سبھی لونڈیاں ایک ایک کر کے ہاتھ باندھے خدمت کے لیے حاضر ہوجاتی ہیں۔

ایک عرصے تک حرفت صرف تجربے Experience کی احسان مند رہی اور آدمی کام کر کے ہی سیکھتا تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے تجربوں Experiments نے علم اور سائنس کے نام سے علم جدید کو جنم دیا تو سائنس نر کے تجربے پر اس طرح غالب آگیا جیسے عقل دھیرے دھیرے ہمارے بچپن کی موٹی تازی بھینس سے دیکھتے ہی دیکھتے بڑی ہوتی چلی گئی۔ اب سائنس اور حرفت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی یا ہم کسی اور طرح جو محسوس کرتے ہیں وہ ریاضی میں لکھا جاتا ہے۔ ریاضی کی تصدیق نئے تجربوں سے ہوتی ہے۔ تجربہ حرفت کی مدد سے ہوتا ہے اور کامیاب ہوجائے تو اپنا احسان مع سود در سود حرفت کو چکا دیتا ہے۔

ہمارے بچپن تک سائنس کو حرفت بننے اور پھر عام زندگی میں کار آمد ہوتے ہوتے دس بیس برس لگ جاتے تھے۔ اتنے عرصے میں پرانے سائنس داں رخصت ہوجاتے تھے یا اُن کا دھیان کسی اور طرف لگ جاتا تھا۔ اب لوگ اُن سے کوئی تفصیل پوچھتے یا امداد مانگتے تو عام طور پر نہ ملتی۔ اس لیے آج کل اُن ہی سائنسی دریافتوں، ایجادوں وغیرہ کے لیے سرمایہ کاری ہوتی ہے جن کا فوری استعمال ہو سکے بنگلہ دیش کے ڈاکٹر عبدالاوّل نے ابھی حال میں اس موضوع پر بڑی صاف روشنی ڈالی۔ موصوف امریکہ کی بل (Bell) تجربہ گاہ میں کام کرتے ہیں، اور ٹھوس مادّے کی طبیعیات کے ماہر ہیں۔ ہمارے انجینئرنگ کالج اور شعبۂ طبیعیات میں انھوں نے بتایا کہ مرحوم سوویت یونین یعنی آج کے روسی جمہوریہ وغیرہ میں سائنس بہت بڑے پیمانے پر ہوتا ہے، مگر وہ اسے حرفت میں بہت کم منتقل کرتے ہیں۔ اسی لیے مات کھا گئے۔ امریکہ اس کام میں بہت آگے ہے اور جاپان دنیا میں سب سے آگے۔ جہاں اولیت ہی حرفت اور حرفت سازی کو حاصل ہے۔ سائنس کی باری دوسرے نمبر پر آتی ہے۔

مگر یہ تصویر کا نہیں، مورتی کا صرف ایک رخ ہے۔ علم معاشیات ملکی ہو یا بین الاقوامی، سمجھ میں نہیں آتی اور ملک نے کچھ دن ہوئے جنوبی امریکہ کے تعارف میں جھنجلا کے اسے فریب کاری کہا تھا۔ ہمارے ایک تیونسی دوست احمد سویڈن میں برسوں سے یہ علم پڑھا رہے تھے۔ ایک دن کہنے لگے۔ میں نے یہ مطالعے اس لیے شروع کیے تھے کہ سمجھوں یہ گورکھ دھندا ہے کیا۔ لیکن برسوں سے صرف مساواتیں حل کر رہا ہوں تعریفوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا ہوں۔ سرمایہ داری کی مشین کا ایک اندھا پرزہ ہوں اور بس۔ مجھے یاد آیا، برطانوی راج میں کانپور کی گن فیکٹری میں مزدوری کرنے والوں کا بھی یہی کہنا تھا۔ ان سے کوئی اتنا معمولی پرزہ بنوایا جاتا اور وہ بھی جزوی طور پر کہ وہم بھی نہ ہوتا بندوق بنا رہے ہیں، جس سے چل کر گولیاں کسی دن ہمارے ہی سینوں میں داخل ہوں گی ـــــــ یوں تو بڑی حقیقت یہ ہے کہ سائنس داں ہوں یا انجینئر سب ایک بڑی مشین کے کل پرزے ہیں اور سرمایہ دار کے کارخانے میں مزدوری کر کے ٹکے کماتے ہیں۔ وہ سرمایہ دار کوئی شخص ہو یا حکومت۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں میرے ایک دوست معاشیات

کے طالب علم تھے، ان کے بقول برطانیہ کے ماہروں نے جواہر لال نہرو کو یہ نیک صلاح دی تھی کہ ملکی ترقی کا بھگتان غریب عوام سے وصول کرو، جس کا ذریعہ گھاٹے پر سرمایہ کاری (Deficit Financing) ہے۔ نہرو نے رائے ایک حد سے زیادہ نہ مانی۔ یعنی بجٹ تو ہر سال گھاٹے کا بنوایا مگر مال دار ملکوں سے قرض لے کر خسارہ پورا کیا کیے اور غیر ملکی سرمایہ داروں کے رٹائے طوطے لاکھ ٹیں ٹیں کرتے رہے، انھوں نے روپے کی قیمت گھٹا کے عوام کی کمر نہیں توڑی مگر جب شاطروں نے ہمیں چین سے لڑا دیا تو باندھ ہی ٹوٹ گیا اور پھر مجبوری میں کہنا ہی کیا تھا، مگر اس ہنر کو صحیح معنی میں مسز گاندھی کی حکومت نے ۱۹۷۱ء سے استعمال کیا۔ آج روپے کی قیمت شاید سن ۶۰ء کے پانچ پیسے کے برابر ہو، کیونکہ حکومت کے پاس جتنا مال تال ہے اُس نے اس کے بیس گنے نوٹ چھاپ رکھے ہیں۔

نئے نوٹ چھاپتے رہنا ضروری بھی ہے۔ ایک زمانے تک پرانے نوٹ چھانٹ کے ہر سال جلا دیے جاتے تھے اور اُن کی جگہ نئے نوٹ جاری ہو جاتے تھے۔ پھر خبر ملی کہ بینک ملازمین انھیں جلاتے نہیں، چلاتے رہنے لگے ہیں۔ پھر لگا کہ عرصے تک وہ رسم ہی ترک ہو گئی اور گندے نوٹوں کا جو عالمی ریکارڈ ایک وقت تائی وان نے قائم کیا تھا ہندوستان اسے توڑنا چاہتا ہے۔ آج نہ جانے کیا ہو رہا ہے۔ پارلیمنٹ میں جیسے جیسے نئے خرچ بڑھائے اور منظور کیے جاتے رہتے ہیں اور الیکشن کے موقع پر برسر اقتدار پارٹی جیسی جیسی جو منائیں بنا بنا کے ملک کا خزانہ خالی کرتی ہے جیسے حلوائی کی دکان پر دادا جی کا فاتحہ ہو رہا ہو، وہ کہاں سے آتے ہیں؟ خرچ بڑھا کے اور فضول خرچی کر کے ہم روپے کی قیمت گھٹاتے اور اپنی آمدنی کم کرتے ہیں، کیا یہ بھولنے کی بات ہے؟

فضول خرچی یہ یاد آتا ہے کہ بجلی ہی کو لے لیں گرمیوں کے تپتے چلچلاتے دنوں میں خود ہندوستان کے اندر اب کروڑوں راڈیں اور بلب سورج کو چراغ دکھاتے ہیں۔ لاکھوں خالی کمرے گرمیوں میں ٹھنڈے اور جاڑوں میں گرم کیے جاتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ عمارتوں کے نقشے جغرافیہ اور موسم کے لحاظ سے بنیں۔ ضرورت کے مطابق کھڑکیاں کھولی بند کی جا سکیں اور پردے ڈالے اور اُٹھائے جاتے رہیں۔ مگر اتراہٹ ہے کہ چھائی جا رہی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ خرچ سرکار پر پڑتا ہے۔ ہمیں کیا سمجھنا چاہیے کہ سارا خرچ ٹیکسوں اور نئے نوٹوں پر چل رہا ہے ہمارے سکے کی خریداری کی طاقت صفر کی طرف گھٹتی چلی جا رہی ہے اور ہم اپنے ہاتھوں اپنی کمر توڑ رہے ہیں۔

دس پندرہ برس ہوئے میرے ایک عزیز ہمارے تنہا ہوائی جہاز بردار جنگی جہاز وکرانت پر ملازم تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک دن کمانڈر کا حکم ملا کہ اتنے ہزار پیپے پٹرول جو جہاز میں بھرا ہے اسے فوراً سمندر میں خالی کر دو، ورنہ اگلے سال کے خرچ میں کٹوتی ہو جائے گی اور ملکی دفاع کے مقدس نام پر اس طرح کے شاہ خرچوں کے بعد عوام پر "وکاس کر" نہ لگتا تو اور کیا ہوتا، جسے والد صاحب مرحوم "وناش کر" کہتے تھے۔

بینک سے قرض لینا بھی ایک پیشہ ورانہ ہنر ہے۔ قرض لینا ہمارے سماج میں اچھا نہیں سمجھا جاتا ریاستوں کی ریاستیں ہماری آنکھوں تلے قرض منڈی کی دلدل میں دھنس بھی گئی ہیں لیکن آج کی دنیا میں دوسری طرح کے تجربے ہو رہے ہیں۔ رومانیہ کے صدر چاؤ چسکو اُس وقت معزول اور قتل کیے گئے جب انھوں نے مغربی دنیا کا قرض پائی پائی ادا کر دیا تھا اور اُن کے ملک پر سیاسی دباؤ ڈالنے کا یہ شیطانی حربہ باطل ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں کہ چالاک قرض لینے والا ادا کرتا ہی نہیں اور نہ اصل واپس لینے کے لیے قرض دیا ہی جاتا ہے۔ سود

لیتے ہیں، سرمائے میں بھی اور طرح طرح کی بدعنوانیوں میں بھی۔ مشتاق یوسفی نے بھی تو اپنے اسکاٹ استاد کے حوالے سے لکھا ہے:

"ہم اصل معاف کر دیتے ہیں، مگر سود کبھی نہیں چھوڑتے۔"

ملک میں بھی صنعت کاری بینکوں سے لیے قرض پر چل رہی ہے اور تجربہ کار صنعت گر قرض واپس نہیں کرتا۔ حکمرانی کرنا باتوں کے لیے تجربہ بھی چاہیے اور کلیجہ بھی۔

نوبل انعام یافتہ عبد السلام نے نہ صرف خود بہت اچھی فزکس کی ہے اور ہم غریبوں کو جدید سائنس سکھانے کے لیے عمر عزیز کی مشعل دونوں طرف سے جلا ڈالی ہے بلکہ اس موضوع پر بھی مسلسل دل سوزی سے سوچا ہے کہ ہم غریب کیوں ہیں اور غریبی کے موذی اژدہے کی گرفت سے باہر کیسے نکل سکتے ہیں۔ انھوں نے بجا طور پر یہ اونچی حرفت کی طرف ہمیں ترغیب دلائی ہے اور لینے سکھانے کی تری راستے میں جان توڑ کوشش کی اور کر رہے ہیں۔ اس کام میں نئے مادوں (New Materials) الیکٹرانکس اور کمپیوٹروں کا ہر سطح پر استعمال پیش آتا ہے۔ آج چھوٹے چھوٹے دکاندار تک کمپیوٹر پی سی استعمال کر رہے ہیں۔ جو یہ کام نہیں جانتا، جاہل ہے۔ لیکن خاکسار کا کہنا یہ بھی ہے کہ ابھی انیسویں صدی تک کی کلاسیکی طبیعیات کے استعمال کی بھی بہت گنجائش ہے۔ انجنیری میں علاج معالجے میں، حیاتیات میں زراعت میں، صنعت و حرفت میں روزمرہ کے کاموں میں۔ اس لیے جو اتنا ہی جانتا ہے وہ بھی دل جان سے اور اعتماد کے ساتھ اس سے بہت سارے نئے کام لے سکتا ہے۔ کوشش شرط ہے اور توجہ!

ع کارِ رداں روشنی و گمرز است

"اعلیٰ و ارفع روایات کی پاسبانی و تحفظ ہماری اخلاقی ذمہ داری ہے جس پر سختی سے کاربند رہنا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ زمانے کی خوش گوار تبدیلیوں کا کھلے دل سے استقبال بھی کرنا چاہیے۔"

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

# ریڈ کراس، اور اس کا آغاز

ابو وارث سہیل

ریڈ کراس سوسائٹی کے موجد کا نام ژان ہنری ڈونان تھا۔ ریڈ کراس سفید پس منظر میں لال چلیپا (ریڈ کراس) کا نشان ہے جو کہ غیر جانب داری کی علامت ظاہر کرتا ہے اس نشان کے انتخاب کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ سفید پس منظر میں یہ لال نشان دور سے باآسانی نظر آجاتا ہے کیونکہ علم طبعیات کے مطابق لال رنگ سے نکلنے والی شعاعوں کی ویو لینتھ (Wave Length) کم ہونے سے ان کی طاقت (میگنیٹیوڈ) بڑھ جاتی ہے۔ لہذا یہ رنگ دیکھنے والوں کو دور سے صاف نظر آجاتا ہے جس سے ریڈ کراس اور اس کے عملے کی دور سے دیکھ کر نشاندہی ہو جاتی ہے اور کسی سانحے کے وقت ریڈ کراس کے ڈاکٹر، نرسیں اور دیگر عملے کے لوگ مجروحین تک باآسانی پہنچ سکتے ہیں۔ لال چلیپا کے اس نشان کو بطور علامت لگانے والے اس تنظیم کے پہلی پانچ رکنی کمیٹی کے ایک رکن ڈاکٹر لوئی اپیا تھے۔

ریڈ کراس نے پہلا اہم کارنامہ ۱۸۷۰-۷۱ء کی فرانکو پرشین جنگ میں انجام دیا جس میں ریڈ کراس کارکنوں نے پچاس لاکھ بیماروں اور زخمیوں کی دیکھ بھال کی اور یہ تنظیم بلا لحاظ مذہب وملت بحیثیت ایک ایک مضبوط خدمت گار تنظیم کی صورت میں متعارف ہوئی۔ شروع میں اس سوسائٹی کا نام "زخمی سپاہیوں کی امدادی سوسائٹی" تھا جو کہ ۱۸۶۷ء میں ریڈ کراس سوسائٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس سوسائٹی نے Interna Amacaritas کو مقولے کے طور پر اپنایا جس کا مطلب "جنگ کے دوران انسانی ہمدردی" ہے۔

ریڈ کراس کے وجود میں آنے کے پہلے جنگی قیدیوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا جاتا تھا اور اکثر انھیں ہلاک کر دیا جاتا تھا اور ان کے خاندان کے افراد کو یہ سہولت نہ تھی کہ ان سے رابطہ قایم کر سکیں۔ کوئی انھیں یا ان کے عزیزوں کو ایک دوسرے کے بارے میں نہ بتاتا کہ ان پر کیا گزری لہذا دونوں فریقوں سے گفت وشنید کے بعد ریڈ کراس نے یہ خدمت بھی اپنے ذمے لی اور پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران ریڈ کراس نے اطلاعات کی خدمات، امدادی سامان، مریضوں اور زخمیوں کی دیکھ بھال اور جنگ کے اختتام پر ان کے تبادلے وغیرہ

---

مطب دارالشفا۔ دودھ پور، علی گڑھ۔

کے سلسلے میں اہم کارنامہ انجام دیا۔

## ریڈ کراس سوسائٹیاں

ریڈ کراس آج ایک اہم بڑی امدادی سوسائٹی ہے اور ایک خاندان کے مانند ہے جو مختلف ممالک کی قومی ریڈ کراس سوسائٹیوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۴ء میں اس کے ۲۳۰،۰۰۰،۰۰۰ سے زائد ارکان تھے۔
قدرتی تباہیوں مثلاً زلزلہ، سیلاب، بیماریوں یا جنگ کی صورت میں اگر کوئی مقامی سوسائٹی کسی صورت حال کا مقابلہ نہیں کر سکتی تو دوسری سوسائٹیاں مل کر اس کی مدد کرتی ہیں جیسا کہ ابھی حال کی امریکہ عراق جنگ اور بنگلہ دیش کے طوفان اور سیلاب کے دوران دیکھنے اور سننے میں آیا جس کی بابت بانی سوسائٹی ژان ہنری نے کہا تھا:

> "میں ایک ایسی تنظیم چاہتا ہوں جو نہ تو انگلینڈ تک نہ کسی اور ملک کی سرحد تک محدود رہے بلکہ یہ تنظیم ایسی ہونی چاہیے کہ جہاں کہیں بھی کوئی تصادم ہو یہ خود بخود حرکت میں آجائے۔"

## انڈین ریڈ کراس:

بھارت میں ریڈ کراس سوسائٹی ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی جب کہ ریڈ کراس کا جذبہ صدیوں پہلے سے یہاں موجود تھا جس کے باعث شاہراہوں پر آج بھی عبادت گاہیں، شفاخانے، دھرم شالائیں اور سرائیں کچے اور پکے کنویں اور ان کے پاس آرام کرنے کے لیے درخت اور لنگر خانوں کی موجودگی کے آثار ابھی تک موجود تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ خدمت کا جذبہ کسی منظم طریقے سے نہیں تھا بلکہ خواص اور رحم دل لوگوں تک محدود تھا۔ ریڈ کراس تنظیم نے اس جذبے کو خواص کے علاوہ عوام اور حکومت وقت تک کے دلوں میں پیدا کیا اور اس طرح انڈین لیجسلیٹو کونسل کے ایک قانون کے ذریعے اس کا قیام عمل میں آیا۔ انڈین ریڈ کراس نے ۱۹۲۷ء میں پہلی بار پنجاب کے سیلاب کے زمانے میں متاثرین کے لیے ایک بڑی رقم روانہ کر کے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس سوسائٹی کا صدر دفتر ریڈ کراس روڈ نئی دہلی میں ہے جہاں پر لال چلیپا کے ساتھ ہر وقت سفید پرچم لہراتے رہتے ہیں۔
۲۲ فروری ۷۲ء کو انڈین ریڈ کراس نے واگھا کی سرحد پر ہند و پاک جنگ کے قیدیوں کے خطوط، پارسلوں کا تبادلہ، بین الاقوامی سوسائٹی کے سوئٹزرلینڈ سے تعلق رکھنے والے نمائندوں کی موجودگی میں کیا اسی طرح یو۔ ایس۔ ایس۔ آر کے زلزلے کے دوران اور ابھی حال کے بنگلہ دیش کے سیلاب کے دوران بڑی مقدار میں خوردنی اشیا، ادویات اور دیگر اشیاء روانہ کیں۔
آیئے اب ہم بانی ریڈ کراس کی زندگی اور اس کے آغازِ تنظیم پر ایک نظر ڈالیں۔
بانی ریڈ کراس ژان ہنری دونان کی پیدائش ۱۸۳۱ء میں ہوئی اس کے اندر غیر معمولی خدمت کا جذبہ ورثہ میں ملا تھا۔ کیونکہ اس کے والدین بیماروں، یتیموں کی خبر گیری رکھتے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ چنانچہ دونان نے بھی بڑے ہو کر اپنے ملک کے ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے غریبوں اور ناداروں کی مدد کرنا اپنا فرض اولین بنا لیا۔ دونان کی زندگی میں کئی ایسے مواقع آئے جہاں پر اس نے انسانوں پر انسانوں کے ذریعے ہونے والے مظالم کو دیکھا جس سے اس کے اندر انسانیت پر رحم کا جذبہ اور بھی بیدار ہوا اور پھر اس کے اس جذبے کو دنیا کی دیگر اہم شخصیات اور ان کی تصنیفات نے اور بھی تقویت پہنچائی جن میں

فلورنس نائٹ انگیل، ایلزبتھ فرے کی تصنیف انکل ٹامس کیبن سرفہرست ہیں۔

ژان ہنری دونان کو پہلی بار سولفرینوں میں فرانسیسی اور آسٹریلیائی فوجوں کے درمیان ہونے والی جنگ کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا جہاں پر ۵ گھنٹہ میں ۴۰ ہزار سے زائد افراد ہلاک ہوئے اور زخمیوں کے تیماردار بھی بہت کم تھے جس کی بنا پر زخمی تکلیف سے تڑپ رہے تھے۔ لہذا وہ وہاں کے گرجا گھر جاکر جہاں زخمی داخل تھے ڈاکٹروں اور دوسرے رضاکاروں کی ایک کثیر تعداد لے کر زخمیوں کی خدمت میں لگ گیا۔ جہاں زخمیوں نے اس کا نام "سفید پوش" رکھا۔ ایک بار جب وہ ایک آسٹریلیائی سپاہی کی دیکھ بھال کے لیے جھکا تو کسی نے حیرت سے کہا: یہ تو دشمن ہے۔ جس پر دونان نے کہا "دشمن بھی انسان ہے"۔

آگے چل کر دونان نے اپنے اس جذبۂ خدمت کو ایک تنظیم کی صورت میں لانے کے لیے جدوجہد کو تیز کر دیا اور ایک کتاب "مرقع سولفرینو" تصنیف کی جو کہ ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی یہ تصنیف بربریت کے خلاف ایک دردمندانہ اپیل تھی اور اس کے تدارک کے لیے بہترین تجویز۔ اسی کے ساتھ ساتھ دونان نے ملک گیر سطح پر اپنے مجوزہ منصوبے کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ایک مہم شروع کر دی جس کا مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں میں جنگ کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہونے لگا اور عوام اس کے ہم نوا بن گئے۔ یہاں تک کہ سربراہانِ مملکت بھی اسے محسوس کرنے لگے۔

۱۸۶۳ء میں جنیوا پبلک ویلفیر سوسائٹی کے جلسے سے اس تنظیم کو کافی تقویت پہنچی جہاں پر اس تنظیم کے لیے ایک ۵ رکنی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی جس کے صدر کمانڈر جنرل گیولامے اور سکریٹری دونان خود ہی تھے۔ کمیٹی نے دوسری کانفرنس ۲۶ اگست ۱۸۶۴ء کو سوئٹزرلینڈ میں کرائی جس میں جنیوا کنونشن کا پہلا مسودہ تیار کیا جس کے چند اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

۱- سفید پس منظر میں لال چلیپا (کراس) کا نشان غیر جانب داری کی علامت ہوگا۔

۲- کنونشن پر دستخط کرنے والی حکومتوں پر یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ جنگ کے زمانے میں بیمار اور فوجی عہدے داروں کی دیکھ بھال کریں گی

۳- زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے والے افراد کی حفاظت کی جائے گی

۴- دواخانوں اور ان کے ساز و سامان اور امبولینس گاڑیوں پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔

۵- جب بھی ممکن ہوگا قیدیوں کا تبادلہ شروع کر دیا جائے گا۔

اپنے خیالات اور افکار کو پروان چڑھانے کے لیے دونان نے اپنی ساری دولت اور وقت اس پر خرچ کیا جس کی وجہ سے وہ مفلس ہو گئے۔ انھوں نے اپنی تنظیم کی سکریٹری شپ سے بھی استعفیٰ دے دیا اور گمنامی اور مفلسی میں زندگی گزارنے لگے لیکن پھر بھی شہرت نے ان کا دامن پکڑے رکھا اور ۱۹۰۱ء میں پہلا نوبل پرائز ژان دونان اور فرانس کی امن تنظیم کے بانی فریڈرک پاسی کو مشترکہ طور پر دیا گیا جس کو دونان نے ریڈ کراس کو دے دیا اور اپنی زندگی اسی طرح سادگی سے گزارتے ہوئے ۱۹۱۰ء میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے چنانچہ آج بھی دنیا دونان کی یاد میں ہر سال ۸ مئی کو انٹرنیشنل ریڈ کراس ڈے مناتی ہے۔

# شعبۂ دینیات شیعہ

عنایت علی خاں ▽

۱۸۷۲ء میں سر سید احمد خاں نے اپنے ایک مضمون
تحریر فرمایا تھا کہ:

"مذہبی تعلیم مسلمان طلبا کے لیے لازمی
ہوگی۔"

فنڈ کمیٹی کی ایک نشست میں سید محمود نے دینی
ی ضرورت پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"کالج کے اندر مسلمان طلبا کو جو تعلیم دی
جائے وہ ایسی ہو جو ان کے خیالات کو اس
طرح سے پروان چڑھائے جس سے قوم کی
ترقی میں زیادہ سے زیادہ مدد مل
سکے۔"

سر سید کے ذہن میں جو بات مذہبی تعلیم کے بارے
ی وہ صرف خانہ پُری تک محدود نہ تھی بلکہ ایک ایسی
لامک آکسفورڈ جو سائنس اور آرٹس کے ساتھ
فکر اور اسلامی تہذیب سے مزین ہو۔
چنانچہ لازمی دینیات کے لیے ۱۸۷۵ء میں دو
ں بنائی گئیں، جن کے ممبر وہی لوگ قرار پائے جو
اپنے فرقے کے دینی اور عقیدے پر مبنی رجحانات و
خیالات سے پوری طرح باخبر تھے۔ نیز ان کمیٹیوں کے
معاملات میں سر سید نے کسی قسم کی مداخلت پسند
نہیں کی۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے حیات جاوید
میں تحریر فرمایا ہے:

"..... دو مذہبی کمیٹیاں جو شیعہ اور
سنی دونوں کی مذہبی تعلیم کی نگرانی اور
انتظام کے لیے جدا جدا مقرر ہوئی تھیں اور
جن سے سر سید نے لوگوں کی بدگمانی
کے خیال سے خود علیحدگی اختیار کر لی
تھی....."

کمیٹی برائے شیعہ دینیات کے ممبران کے چند نام
جو مل سکے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ تاج العلماء مولوی سید علی محمد طاب ثراہ
۲۔ خان بہادر خلیفہ سید محمد حسن
۳۔ میر سید تراب علی
۴۔ مولوی سید حسن رضا
۵۔ مولوی تفضل حسین
۶۔ مولوی محمد عباس

---

▽ شعبۂ دینیات شیعہ۔ اے ایم یو علی گڑھ

یہ امر کسی حد تک قابل غور ہے کہ جب ہندوستان
کے دینی حلقوں میں سرسید کی تحریک کی شدت سے
مخالفت کی جاری تھی تو لازمی دینیات کی تعلیم کے لیے
بنائی جانے والی دو کمیٹیوں میں سے ایک کی سربراہی کے
لیے تاج العلماء مولانا سید علی محمد طاب ثراہ کو منتخب کیا
جانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ شیعہ فرقے نے سرسید کی
تحریک کی کھل کر موافقت کی، جس میں علماء کے علاوہ شیعہ
عوام، دانشور اور روسا بھی شامل تھے [تفصیل کے
لیے دیکھیے راقم الحروف کا مضمون "مسلم یونیورسٹی کی تعمیر
میں شیعوں کی اقتصادی خدمات"۔ مطبوعہ "جریدۂ جعفری
علی گڑھ" علی گڑھ ۷۵-۱۹۷۴ء]

چنانچہ جون ۱۸۷۵ء سے دیگر مضامین کی تعلیم
کے آغاز کے ساتھ دینیات کی تعلیم بھی شروع ہوئی۔
ابتدا میں دینیات کی تعلیم دو حصوں میں تقسیم تھی،
ایک میں اصول دین، بنیادی عقاید کی تعلیم اور
دوسرے حصے میں فروع دین، جیسے نماز، روزہ
احکام شرعیہ کی تعلیم۔ جس کے لیے کوئی علیحدہ سے مدرس
نہیں تھا بلکہ عربی و فارسی شعبوں سے متعلق استاد دینیات
بھی پڑھا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں مولانا
سید جعفر علی صاحب عربی مضمون پڑھانے کے ساتھ
شیعہ لڑکوں کو دینیات کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ۱۸۹۹ء
تک شیعہ دینیات کا کوئی کورس باقاعدہ مرتب نہیں
ہوا تھا۔

ایک عرصے تک یوں ہی سلسلۂ تعلیم جاری رہا بعدہ
مولانا سید عباس حسین صاحب کا تقرر شیعہ دینیات
کے مدرس کی حیثیت سے عمل میں آیا اور یہ سلسلہ
تا ایں دم جاری ہے۔

سابقہ مدرسین میں جو نام ریکارڈ میں ملے
وہ یہ ہیں:

۱- جناب مولانا قاری سید عباس حسین صاحب
۱۸۷۶ء میں مدرس ہوئے
۱۹۲۵ء عربک پروفیسر
۱۹۲۵ء لغایت ۱۹۲۷ء عربی،
فارسی اور شیعہ دینیات کے
چیرمین ہوئے۔

۲- جناب مولانا سید جعفر علی صاحب
۱۸۸۳ء میں مدرس مقرر ہوئے

۳- جناب مولانا سید احمد صاحب
۱۹۲۵ء میں مدرس مقرر ہوئے

۴- جناب مولانا سید یوسف حسین صاحب نجفی
۱۹۲۶ء لغایت ۱۹۲۹ء لکچرر،
پروفیسر، ڈین رہے۔

۵- جناب مولانا حسن عسکری صاحب
۱۹۵۱ء میں مدرس مقرر ہوئے

۶- جناب مولانا سید احمد ظہیر عباس صاحب
۱۹۳۳ء میں مدرس مقرر ہوئے۔

۷- جناب مولانا باقر علی خاں صاحب
آپ کے بارے میں رسالہ
"مرتضوی" میں تحریر ہے کہ:
آپ صوبہ متحدہ کے ایک فاضل ہیں
کچھ دنوں عراق میں بھی تحصیل علم میں
مشغول رہے۔ پھر ہندوستان
آکر علی گڑھ کالج میں دینیات
شیعہ کے مدرس مقرر ہوئے تھے۔"

۸- جناب مولانا سید سبط نبی صاحب
۱۹۳۴ء میں لکچرر مقرر ہوئے۔

۹- جناب مولانا سید شبر صاحب
۳۹ء لغایت ۵ ہو ناظم دینیات شیعہ اور ڈین

۱۹۲۰ء میں جب محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا تو اس کے چھ سال بعد ۱۹۲۶ء میں سنی اور شیعہ، دو شعبے قائم ہوئے اور اب لازمی دینیات کے علاوہ بی ٹی ایچ اور ۱۹۳۶ء میں ایم ٹی ایچ کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ پھر ۴۵-۱۹۴۴ء میں دونوں شعبوں کی ایک مشترک فیکلٹی قائم ہو گئی۔

شعبۂ دینیات شیعہ کی تشکیل جدید کے بعد اساتذہ میں درس و تدریس کا ایک نیا جذبہ پیدا ہوا اور انھوں نے شعبہ کی علمی اور انتظامی ترقی میں گہری دلچسپی دکھائی چنانچہ دور حاضر کے جدید مسایل اور تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے دینی موضوعات پر ریسرچ کا کام بھی شروع ہوا۔ اس کے لیے ماسٹر آف فلاسفی (ایم فل) اور ڈاکٹر آف فلاسفی (پی ایچ ڈی) کی ڈگریوں کا اضافہ ہوا۔ تحقیقی موضوعات پر کام سے جڑے ہوئے ریسرچ اسکالروں کو وضائف بھی دیے جانے لگے۔ چنانچہ اب تک چودہ اسکالروں کو شعبہ کی طرف سے ایم فل اور پی ایچ ڈی اور ڈی ٹی ایچ کی سندیں دی جا چکی ہیں۔

۱- جناب ڈاکٹر سید ارتضیٰ حسین صاحب
عقیدۂ حجۃ المنتظر۔ ۱۹۶۸ء

۲- جناب ڈاکٹر محمد عنایت علی خاں صاحب
علامہ سید علی جواد بناری حیات و خدمات ۱۹۷۶ء

۳- جناب ڈاکٹر حکیم کمال الدین حسین صاحب
علامہ کنتوری۔ حیات اور خدمات ۱۹۸۲ء

۴- محترمہ ڈاکٹر رضیہ جعفری صاحبہ
(پی ایچ ڈی) اسلامی فرقوں بالخصوص شیعہ فرقوں کا مطالعہ ۱۹۸۰ء

۵ جناب ڈاکٹر سید ضیاء حیدر نسیم صاحب
اودھ کے شیعہ علما کی خدمات، ۱۳ ویں صدی ہجری میں شیعیت کی ترقی

۶- جناب ڈاکٹر مولانا سید فرمان حسین صاحب
قرآن اخلاقیات کا معروضی مطالعہ ۱۹۸۶ء

۷- جناب ڈاکٹر علی محمد محسن العصفور صاحب
تاریخ الفقہ وفقہاء الشیعہ فی البحرین (آل عصفور)

۸- جناب ڈاکٹر شمس الدین حسینی صاحب
فلسفۂ دعا اور ادعیۂ اسلامی کا تقابلی مطالعہ

۹ جناب ڈاکٹر حضیر موسیٰ جعفر صاحب
تفسیر القرآن بالقرآن و العلامہ الطباطبائی

۱۰- محترمہ ڈاکٹر شاہدہ شاہین وسیع صاحبہ
(ایم فل) اسلام کی نشر و اشاعت میں شیعہ خواتین کا حصہ۔

۱۱- جناب ڈاکٹر عبد الرسول صاحب۔
(ایم۔ فل) بحث فی علم الرجال

۱۲ جناب سید جلال سادات گوشہ صاحب
(ایم۔ فل) تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں علمائے قم کے حالات

۱۳- محترمہ رانی بانو صاحبہ۔ (تحقیق حال میں جمع کی گئی ہے)
قرآن اور حدیث کی روشنی میں مسلم خواتین کی حیثیت

۱۴- جناب مولانا سید سعید اختر کاظمی صاحب
قرآن کریم اور اہل بیت
(کام جاری ہے)

شعبہ میں تحقیق کرنے والے طلبا اور اساتذہ کے لیے ایک لائبریری ہے جس میں چار ہزار سے زائد علوم اسلامیہ اور جدید علمی موضوعات پر عربی فارسی

اردو اور انگریزی میں کتب موجود ہیں۔ پہلے یہ کتب خانہ سنی تھیالوجی کے سیمینار کے ساتھ منسلک تھا بعدہ چیرمین شعبۂ دینیات شیعہ کی کوششوں سے فیکلٹی سے ملحق ایک بڑے کوارٹر میں منتقل ہو گیا ہے۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی شعبہ نے ترقی کی ہے۔ سابق و موجودہ اساتذہ مذہبی موضوعات پر جدید فکر و دانش کے ساتھ کتابیں تحریر فرماتے رہے ہیں؛ چنانچہ مولانا سید یوسف حسین صاحب نجفی کا ایک کتابچہ اصول دین و فروع دین اور احادیث نبوی پر مشتمل دیکھنے کو ملا جو شیعہ طلبا کے لیے کورس میں داخل تھا۔ ان کے علاوہ سابق مدرسین میں سے کسی کی بھی تصنیفات و تالیفات کا فی الحال کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔ زمانۂ قریب میں جن حضرات نے تحریری دستاویزیں چھوڑی ہیں، ذیل میں مختصراً بیان کی جاتی ہیں؛

۱۔ مورخ اسلام ڈاکٹر علامہ سید مجتبیٰ حسن کاموں پوری طاب ثراہ [۱۹۵۲ء لغایت ۱۹۷۴ء]

آپ پہلے لکچرر ہوئے اور ناظم دینیات شیعہ سید العلما مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ کے رٹائرمنٹ کے بعد شعبہ میں ریڈر ہوئے اور صدر شعبہ کا عہدہ سنبھالا۔ نیز ناظم دینیات شیعہ کے فرائض بھی آخر وقت تک آپ ہی سے متعلق تھے۔

آپ کی علمی شخصیت سے کون واقف نہیں ہے۔ علی گڑھ اور بیرون علی گڑھ کے تمام ہی علمی حلقوں میں آپ کے مضامین پڑھے جاتے تھے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی اسلامیات اور تاریخ اسلامی کے مطالعے میں صرف کر دی۔ بہت سی کتابیں تحریر فرمائیں جن میں بعض مطبوعہ بھی ہیں۔ آپ کے تمام قلمی آثار علمیہ طبع نہیں ہوئے جو ایک عمومی علمی سانحہ ہے۔

۲ سید العلما مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ [۱۹۵۹ء لغایت ۱۹۶۸ء]

آپ کا تقرر پہلے پہل بحیثیت ریڈر کے ہوا، اس وقت سے صدر شعبۂ دینیات شیعہ کے فرائض بھی انجام دیے، بعدہٗ پروفیسر منتخب ہوئے اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی کے منصب پر بھی فائز ہوئے۔

یوں تو آپ نے چھوٹی بڑی تین سو سے بھی زیادہ کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔

" شہید انسانیت ۔ تاریخ اسلام
مقدمۂ تفسیر قرآن (مستقل کتابی صورت
میں) اور خود " تفسیر قرآن سات
جلدوں میں؛ نیز کثیر التعداد مضامین۔

ان دونوں عظیم دانش وروں کے علمی اور تصنیفی خدمات اس درجہ وسیع، عمیق اور منفرد ہیں کہ ان پر ریسرچ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ تمام منتشر علمی سرمایہ اور ان حضرات کے آثار علمیہ کو مزید تشریح و تفسیر اور صحت مندانہ تنقید و تبصرے کے ساتھ یکجا کیا جا سکے۔

۳۔ مولانا سید کلب عابد صاحب مرحوم (۱۹۷۴ء لغایت ۱۹۸۳ء)

پروفیسر، صدر شعبۂ دینیات شیعہ اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی۔

آپ کی شخصیت ملت اسلامیہ میں جانی پہچانی تھی۔ آپ نے شعبہ کو اپنی بے مثال ذاکری سے شہرت دی، ایک کتاب "عماد التحقیق" لکھی جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے اور شعبہ کے ایم فل کے کورس میں داخل ہے

۴۔ محترمہ ڈاکٹر رضیہ جعفری صاحبہ

آپ کا تقرر ویمنس کالج مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ میں شیعہ دینیات کی تدریس کے لیے بحیثیت
لکچرر ہوا مگر بعد میں جب آپ کا انتخاب اسی کالج میں
اسلامک اسٹڈیز کی ریڈر کی جگہ پر ہوا تو آپ نے
شعبۂ دینیات کو چھوڑ دیا۔ آپ کے مضامین دینی رسایل
میں برابر شایع ہوتے رہتے ہیں۔

۵۔ ڈاکٹر سید ارتضیٰ حسین صاحب
(۱۹۶۷ء میں لکچرر ہوئے۔ پھر ریڈر)

آپ علمی ذوق و شوق کے حامل ہیں، متعدد مضامین
شایع ہو چکے ہیں۔ عقیدۂ امام مہدیؑ پر ایک مختصر کتاب
انگریزی میں

PARALLEL FAITHS AND
MESSIANIC HOPE

اور ایک کتاب "اسلام کا اودے" کے عنوان سے
ہندی زبان میں طبع ہو چکی ہے۔

۶۔ مولانا سید منظور محسن صاحب رضوی
(۱۹۷۱ء میں لکچرر، بعدہٗ ریڈر)

آپ کی ایک کتاب "ترجمہ تبصرۃ المتعلمین" چھپ
کر شایع ہو چکی ہے۔

۷۔ رئیس العلما مولانا پروفیسر سید کاظم نقوی صاحب
(۱۹۷۸ء میں ریڈر، ۱۹۸۵ء میں پروفیسر و
صدر شعبہ اور ۱۹۸۶ء میں ڈین فیکلٹی دینیات)

آپ کی شخصیت ارباب علم و دانش کے لیے محتاج
تعارف نہیں۔ آپ کے متعدد تحقیقی مضامین ملک کے انتہائی
معیاری جراید میں شایع ہو چکے ہیں۔ انہی سے متاثر
ہو کر آپ کی جانب سے مسلسل اور شدید انکار کے باوجود
ممدوح کو گویا زبردستی پروفیسر اور پھر ڈین بنایا گیا جس
کی نظیر یونیورسٹی کی تاریخ میں بہت ہی کم مل سکے گی جو آفر
کیے جانے سے بھی بالاتر ہے۔ آپ کے چند عالمانہ
آثار درج ذیل ہیں:

۱۔ حاشیہ کفایۃ الاصول۔
۲۔ حاشیۂ رسائل
۳۔ حاشیۂ مکاسب (عربی میں)
۴۔ پیغمبر اور پیغمبری
۵۔ انجام کائنات
۶۔ عورت اور اسلام

ضخیم کتابیں اور بیسیوں کتابچے (اردو زبان میں) غیر مط
موجود ہیں۔ آپ کا ممتاز علمی کارنامہ "فکر اسلا
کی تشکیل جدید" ہے۔ نیز آپ کے متعدد کتابچے ہندا
بیرون ہند میں طبع ہو رہے ہیں۔ فیکلٹی نے آپ کی
ضخیم کتاب "من و اہرمن" طبع کی ہے جو اسی ف
اسلامی کی تشکیل جدید کی پہلی کڑی ہے۔

آپ نے ضروری دینیات کا نصاب اونچے
کلاسوں کے لیے پہلے پہل مرتب کیا۔ جس میں عصری
تقاضوں کا بھرپور لحاظ کیا گیا ہے۔ بعض کانفرنس
میں مولانا نے شرکت اور ان کی صدارت فرمائی، نیز
مقالہ پیش کیا: مثلاً کل ہند قرآت کانفرنس،
علی گڑھ وغیرہ

اگرچہ ممدوح عموماً ذاکری نہیں فرماتے لیکن علی گڑھ
میں جو چند مجلسیں پڑھیں اور تقریریں فرمائیں۔ ان کی
گونج نے دوام حاصل کر لیا اور ان کا طرز انفرادیت
کا حامل سمجھا گیا۔ افسوس کہ موصوف اپنی نقاہت کی
وجہ سے اس کار خیر کو برقرار نہیں رکھ سکے۔

آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علوم اسلامیہ
سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو روشناس کرنے کا متفکرانہ
کام شروع کرتے ہوئے اس سلسلہ میں عملی اقدام
فرمایا:

۸۔ ڈاکٹر سید فرمان حسین صاحب
(پہلے لکچرر، بعدہٗ ریڈر رہے)۔

آپ کی دو کتابیں "ہادیان دین" اور "عقاید و عبادات" لازمی دینیات شیعہ کے کورس میں داخل ہے۔ نیز آپ کے متعدد مضامین بھی شایع ہو چکے ہیں ہند و بیرون ہند آپ برابر کامیاب مجلسیں پڑھتے رہتے ہیں۔

۹۔ مولانا سید ابراہیم علی رضوی صاحب کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ آپ نے ایک کتاب "ناصر رسول اسلام جناب ابو طالبؑ" پر تصنیف کی ہے جو ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ آپ بھی ایک کامیاب ذاکر اور مقرر ہیں۔

۱۰ مولانا سید سعید اختر کاظمی صاحب (ریسرچ اسکالر) کے کچھ مضامین شایع ہو چکے ہیں۔

۱۱۔ راقم الحروف کے متعدد مضامین رسایل و جراید میں برابر شایع ہوتے رہتے ہیں نیز "اسلام اور فن موسیقی" کے موضوع پر ایک مختصر کتاب مرتب کی ہے اور دوسری ضخیم کتاب "مغل دور حکومت میں شیعہ اور شیعیت۔ اکبر سے شاہ جہاں تک" کے موضوع پر پی ڈی ایف کے لیے تھیسس تیار کی ہے۔

شعبہ کی طرف سے سال میں کئی بار مقالہ پڑھنے کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے، جس سے شعبہ اور اساتذہ کی علمی مصروفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ لوگوں کو اپنے مسایل سمجھنے اور ان کو قریب لانے میں مدد ملتی ہے۔ چنانچہ اب تک جن حضرات نے مقالے پڑھے ہیں وہ یہ ہیں:

مقالہ نگار اور عناوین

۱۔ رئیس العلما پروفیسر مولانا سید کاظم نقوی صاحب

(الف) سرمایہ داری، مارکسیت اور اسلام

(ب) مسئلہ معاد اور فطرت انسانی

(ج) اعجاز قرآن

۲۔ ڈاکٹر سید فرمان حسین صاحب۔

اسلام میں عقل کی اہمیت

اسلام میں علم کا تصور

اخلاق اور قرآن

۳۔ ڈاکٹر محمد عنایت علی خاں۔

فن موسیقی کے بارے میں قرآنی نقطہ نظر

۴۔ ڈاکٹر نسیم زہرا صاحبہ

سریۂ عبداللہ بن جحش کا پس منظر و ابو بصیر سے متعلق واقعہ۔

# حواشی

۱؎ سردست جس مدرس کے نام کے ساتھ جو عہدہ یا عہدے، رکارڈس اور رسالوں میں تحریر ملے ویسے ہی نقل کر دیے گئے ہیں۔ ع

۲؎ رسالہ "مرتضوی" ماہنامہ۔ جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۳، ص ۴۸، بابت جولائی ۱۹۲۱ء

### پٹنہ کے مسلم ہائی اسکولوں میں دسویں کلاس کے بورڈ امتحان کی سطح پر گزشتہ پندرہ سال میں

# مسلم لڑکیاں بہت آگے بڑھیں مگر...

بیگم نصرت شیروانی ▽

پٹنہ کے چار مسلم ہائی اسکولوں میں مسلم لڑکیوں اور مسلم لڑکوں کے دسویں کلاس کے بورڈ امتحان کے نتائج کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۹۱ء میں ان اسکولوں سے نواسی فی صد مسلم لڑکیاں پاس ہوئیں اور بالکل اتنے ہی مسلم لڑکے پاس ہوئے یعنی دونوں کا پاس فیصد برابر ہے۔ البتہ فرسٹ ڈویژن کے تناسب کے معاملے میں مسلم لڑکے کافی آگے ہیں۔ چوّن فیصد مسلم لڑکے فرسٹ ڈویژن لائے جبکہ صرف اٹھائیس فی صد مسلم لڑکیاں فرسٹ ڈویژن لائیں۔ چارٹ ملاحظہ فرمائیں کتنی ترقی ہوئی۔

آیے اب یہ دیکھیں کہ ۱۹۷۶ء سے (یعنی جب سے ایک منظم اسکیم کے تحت ہم نے شمالی ہندوستان کے مسلم ہائی اسکولوں کے نتائج کا جائزہ لینا شروع کیا تب سے) اب تک ان اسکولوں میں مسلم طلبا و طالبات کی تعلیم کو دسویں کلاس کے بورڈ امتحان کی سطح پر کتنا فروغ حاصل ہوا۔ ۱۹۷۶ء میں ایوب گرلز ہائی اسکول سے چودہ مسلم لڑکیاں بورڈ امتحان میں شریک ہوئی تھیں جن میں سے گیارہ یعنی ۷۹ فیصد پاس ہوئی تھیں اور ایک یعنی سات فی صد فرسٹ ڈویژن لائی تھیں۔ ۱۹۹۱ء میں ایوب اردو گرلز ہائی اسکول سے ایک سو گیارہ مسلم لڑکیاں بورڈ امتحان میں شریک ہوئیں۔ چھیانوے یعنی چھیاسی فی صد پاس ہوئیں اور تیس یعنی ستائیس فی صد فرسٹ ڈویژن لائیں۔ یعنی بورڈ امتحان میں شریک ہونے والی مسلم لڑکیوں کی تعداد نو گنی ہو گئی اور فرسٹ ڈویژن لانے والی مسلم لڑکیوں کی تعداد قریباً تیس گنی ہو گئی۔ کسی بھی معیار سے کسی بھی اعتبار سے اس ترقی کو نہ صرف خاطر خواہ بلکہ بہت حوصلہ افروز کہا جائے گا۔

اسی دوران ایک اور یعنی سرسیا گرلز ہائی اسکول کا قیام پٹنہ میں ہوا اور وہاں سے تیس مسلم لڑکیاں ۱۹۹۱ء کے بورڈ امتحان میں شریک ہوئیں۔ سب کی سب یعنی سو فیصد پاس ہوئیں اور چھ یعنی بیس فیصد فرسٹ ڈویژن لائیں۔ محمڈن اینگلو عربک اسکول لڑکوں کا ہے پھر بھی اس اسکول سے ۱۹۹۱ء کا جو فارم آیا ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ دو مسلم لڑکیاں بھی اس سال بورڈ امتحان میں شریک ہوئیں، دونوں پاس ہوئیں اور ایک یعنی پچاس فی صد فرسٹ ڈویژن لائیں۔

اگر ہم تینوں اسکولوں میں ملا کر دیکھیں تو

---

▽ سکریٹری مسلم گرلز ایجوکیشن کمیٹی، کناٹ پلیس، نئی دہلی۔

# دسویں کلاس کا بورڈ امتحان

| ۱۹۷۶ء شریک امتحان | پاس تعداد | پاس فی صد | فرسٹ ڈویژن | ہائی اسکول کا نام | ۱۹۹۱ء شریک امتحان | پاس تعداد | پاس فی صد | فرسٹ ڈویژن تعداد | فرسٹ ڈویژن فی صد |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| – | – | – | – | **مسلم لڑکیاں** | | | | | |
| – | – | – | – | محمڈن اینگلو عربک | ۲ | ۲ | سو | ۱ | پچاس |
| – | – | – | – | سرسید گرلز | ۲۰ | ۲۰ | سو | ۶ | تیس |
| ۱۴ | ۱۱ | اناسی | ۱ | ایوب گرلز | ۱۱۱ | ۹۶ | چھیاسی | ۳۰ | ستائیس |
| ۱۴ | ۱۱ | اناسی | ۱ | مسلم لڑکیاں | ۱۳۳ | ۱۱۸ | نواسی | ۳۷ | اٹھائیس |
| | | | | **مسلم لڑکے** | | | | | |
| ۷۷ | ۳۵ | پینتالیس | ۵ | پٹنہ مسلم | ۷۲ | ۷۲ | سو | ۴۷ | پینسٹھ |
| ۶۲ | ۱۱ | اٹھارہ | ۳ | محمڈن اینگلو عربک | ۴۷ | ۳۴ | بہتر | ۱۷ | چھتیس |
| ۱۳۹ | ۴۶ | تینتیس | ۸ | مسلم لڑکے | ۱۱۹ | ۱۰۶ | نواسی | ۶۴ | چون |
| ۱۵۳ | ۵۷ | سینتیس | ۹ | مسلم لڑکے و لڑکیاں | ۲۵۲ | ۲۲۴ | نواسی | ۱۰۱ | چالیس |

ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ۱۹۷۶ء کی چودہ کی بہ نسبت ۱۹۹۱ء میں ان تینوں اداروں سے بورڈ امتحان میں شریک ہونے والی مسلم لڑکیوں کی تعداد ۱۳۳ ہو گئی یعنی ساڑھے نو گنی۔ پاس ہونے والی مسلم لڑکیوں کی تعداد گیارہ سے بڑھ کر ۱۱۸ ہو گئی یعنی قریب گیارہ گنی اور فرسٹ ڈویژن کی تعداد ایک سے بڑھ کر ۳۷ ہو گئی۔

## مگر اب بھی پیچھے

مسلم لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ اور ان کے رزلٹ میں بہتری لائق ستائش ہے لیکن اب بھی مسلم لڑکیوں کا فرسٹ ڈویژن کا تناسب مسلم لڑکوں سے کم تر ہے۔ بہر حال یہ بات کافی اطمینان بخش ہے کہ کم از کم ان چار اسکولوں سے ملا کر بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے کل دو سو باون ۲۵۲ مسلم اسٹوڈنٹس میں سے ایک سو تینتیس ۱۳۳ یعنی قریب ترپن ۵۳ فی صد مسلم لڑکیاں ہیں اور ایک سو انیس ۱۱۹ یعنی سینتالیس فی صد مسلم لڑکے ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں اسی سطح پر کل ایک سو ترپن ۱۵۳ میں سے صرف چودہ ۱۴ یعنی قریب نو فیصد مسلم لڑکیاں تھیں اور باقی ایک سو انتالیس ۱۳۹ یعنی قریب اکیانوے ۹۱ فی صد مسلم لڑکے تھے۔ یعنی مسلم لڑکیوں نے مسلم لڑکوں کے برابر آنے کی طرف خاصی تیزی سے پیش قدمی کی ہے۔

establishment alongwith their tenders. Contractors registered as Class--I in Building Department, C.P.W.D., P.W.D, M.E.S. Railways or other Government Department as well as other reputed firms and organisations who have carried out equivalent works are eligible for issue of tender forms

---

(Lt. Col. Hasan Muzaffar)
UNIVERSITY ENGINEER

No. PA/287/ 1496/PRO

BUILDING DEPARTMENT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH.

D. No................/Bldg. Dated.....................

# TENDER NOTICE

Sealed tenders on item rate basis are invited to be received on 30-1-92 upto 1.00 P. M. The tender will be opened on the same date at 3-30 P. M. Tender documents can be obtained from the office of the University Engineer on any working day during office hours

Sale of tender forms will be stopped 2 days before the time for receiving the tenders.

| S.No. | Name of work | Amount put to tender | Earnest Money. | Cost of tender | Time of Comple-tion |
|---|---|---|---|---|---|
| | Construction of balance work of 'C' type quarters 16 Nos at Medical College Colony under P. F. Housing Scheme. | | | | |
| | i ) Civil work | 14,49,496.00 | | | |
| | ii) Int. W.S. & sanitary Inst. Ext. W.S. & sewerage. | 2,22, 14.00 | | | |
| | | 16,72,010.00 | 20,000.00 | 150 00 | 14 mths |

Notes : Tenderers are required to submit Income tax Clearance Certificate, details of works executed with proof and details of

BUILDING DEPARTMENT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH.

No................/Bldg. Dated..................

# TENDER NOTICE

Sealed tenders on item rate basis are invited to be received ı 21-1-92 upto 1.00 P. M. The tender will be opened on the same ıte at 3-30 P. M. Tender documents can be obtained from the office f the University Engineer on any wotking day during office hours

Sale of tender forms will be stopped 2 days before the time ›r receiving the tenders.

| .No. | Name of work | Amount put to tender | Earnest Money. | Cost of tender | Time of Completion |
|---|---|---|---|---|---|
| | Replacement of damaged/missing doors & windows shutters at Emadul Mulk Road of 14 Minto Circle staff Qtrs. 24F+24F+36F & 20+24 F type Qtrs. | 1,04,090/- | Rs. 2605/- | Rs. 20/- | six months |

Estimates based on DSR 1985

No. PA/245, 1406/PRO

UNIVERSITY ENGINEER

Stamps worth Rs. 10/- should be affixed on a self-addressed envelope of 28 X 12 cms size. The request for Examination Forms should clearly indicate the name of the Examination at which the candidate wishes to appear, mentioning the Category, such as "Ex-Student" or "Teacher Candidate" or "Women Private Candidate" or University Empoyee" as the the case may be. Examination Forms receivad after the last date will not be considered and no further correspondence will be entertained in this ragard.

( NAJMA AKHTAR )
Controller of Exams & Adms.

No. PA/235/1327/PRO

| S. No | Name of the examination | Last date for the receipt of the examination Forms and Fee | |
|---|---|---|---|
| | | Without late fee | With late fee |
| 1 | 2 | 3 | 4 |
| 32. | D.B.A./D.S.W. | 28.02.92 | 15.03.92 |
| 33. | B. Ed./M. Ed. | 28.02.92 | 15.03.92 |
| 34. | B. Lib. Sc./M Lib. Sc. | 28.02.92 | 15.03.92 |
| 35. | Diploma in Statistics | 01.05.92 | 15.05.92 |
| 36. | Diploma in West Asian Studies | 01.05.92 | 15.05.92 |
| 37. | Diploma in Languages/Certificates of Proficiency in Language | 01.05.92 | 15.05.92 |
| 38. | Diploma in Linguistics | 01.05.92 | 15.05.92 |
| 39. | Diploma in Steno-typing | 01.05.92 | 15.05.92 |
| 40. | Diploma/Certificate in Qirat | 01.05.92 | 15.05.92 |
| 41. | Post. M. Sc. Diploma in Museology/ Post. M. Sc. Diploma in Applicable Mathematics/Post. M. A. Diploma in Teaching English | 01.05.92 | 15.05.92 |
| 42. | Diploma/Certificate in Urdu Caligraphy | 01.0 .92 | 15.05.92 |
| 43. | B.E. I/II/III/Final Year | 01.05.92 | 15.05.92 |

Examination Forms and relevant information may be obtained, free of cost, from the Office of the Controller of Examinations and Admissions, Aligarh Muslim University, Aligarh-202002. In case the Examination form is required to be sent by registered post,

| S. No. | Name of the examination | Last date for the receipt of the examination Forms and Fee | |
|---|---|---|---|
| | | Without late fee | With late fee |
| 1 | 2 | 3 | 4 |
| 13. | P. G. Diploma in Petroleum Processing I semester | 01.01.92 | 15.01.92 |
| 14. | M·Sc. Engg. I & II Semester | 01.01.92 | 15.01.92 |
| 15. | Certificate in Professional Skills | 15.01.92 | 31.01.92 |
| 16. | Diploma courses in Women's Polytechnic I/II/III Year | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 17. | M.B,A. Part—I & II | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 18. | P.D.C.A. | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 19. | M.C.A. II Year | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 20. | P.G. Diploma in Hydrogeology | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 21. | Pre-Tib part I & II | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 22. | B.U.M.S. I/II/III/IV/V prof. | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 23. | Diploma in Engg. I/II/III Year | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 2 . | B.Sc. (Engg.) I/II/III Final Year | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 25. | LL. B. I/II/III Year | 15.02.92 | 28.02.92 |
| 26 | LL. M. (Previous & Final) | 15.02.92 | 28.02.92 |
| 27. | P. G. Diploma in Marketing Management/Personnel Managament | 28.02.92 | 15.03.92 |
| 28. | Diplomas in the Centre of Professional Courses | 28.02.92 | 15.03.92 |
| 29 | Post M. A. Diploma in Urdu Translation | 28.02.92 | 15.03.92 |
| 30. | Diploma of Teaching (Urdu Medium) Part-I & II | 28.02.92 | 15.03.92 |
| 31. | P. G. Diploma in Portfolio Management Diploma in Cooperation & Rural Development/Diploma in Entrepreneurship | 28.02.92 | 15.03.92 |

| S.No. | Name of the examination | Last date for the receipt of the examination Forms and Fee | |
|---|---|---|---|
| | | Without late fee | With late fee |
| 1 | 2 | 3 | 4 |

FOR PRIVATE CANDIDATES EX-STUDENTS

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1. | Secondary School Certificate Course Part-I (Class-IX) and Part-II (Class-X) | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 2. | Senior Secondary School Certificate Course Part – I & II (Class–IX & XII) | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 3. | B.A./B.Sc./B. Com. (Hons) Part—I/II/III | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 4. | Pre-Master's Course (Bridge Course) | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 5. | M.A./M.Sc./M. Com. (Previous & Final) | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 6. | B. Th. (Previous & Final) | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 7. | M. Th. (Previous & Final) | 31.01.92 | 15.02.92 |
| 8. | High School (For Women Private Candidates) | 31.03.92 | 15.04.92 |
| 9. | (a) Secondary School Certificate ) (b) Senior Secondary School Certificate (Class–XI & XII) ) English only (c) B.A. Part I/II ) | 31.03.92 | 15.04.92 |

FOR EX-STUDENTS ONLY

| | | | |
|---|---|---|---|
| 10. | P. G. Diploma course in the Faculty of Medicine ) January Batch | 20.12.91 | 04.01.92 |
| 11. | M.D./M.S. (January Batch) | 20.12.91 | 04.01.92 |
| 12. | M.C.A. III Year | 20.12.91 | 04.01.92 |

# ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
# ALIGARH.

# NOTICE

All eligible WOMEN PRIVATE CANDIDATES / TEACHER CANDIDATES/UNIVERSITY EMPLOYES/EX-STUDENTS who wish to appear at the following examinations of 1992 of this University may submit their applieations in the prescribed forms alongwith the requisite fees and documents to the office of the Controller of Examinations, Aligarh Muslim University, Aligarh on or before the dates indicated against each course. The applications may be accepted till the dates mentioned in column No. 4 with the penalty of Rs 10/-

NOTE : 1. Teacher candidates means—those who have continuously been teachers in a recognised institution for a period of at least two academic years prior to their appearence at the examination, and they must be teachers at the time of appearing at the examination.

2. Ex-Students means :—Candidates who having studied as regular students of this University had failed at the examination concerned or were unable to appear at the examination, after having undergone a regular course of study; or the candidates belonging to categories (b) to (h) of Clause 5 of Chapter XVII of the Ordinances (Academic).

بانی سید احمد خاں

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

# تہذیب الاخلاق

شمارہ ۲

جلد ۱۱

فروری ۱۹۹۲ء


سرپرست

## پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

## کبیر احمد جائسی

انچارج سرکولیشن
شفیق احمد

تزئین
سرفراز

نائب مدیر

شباب الدین


مقالہ وغیرہ بھیجنے کا پتہ:
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ، انڈیا
(202002)

| | | |
|---|---|---|
| زرسالانہ: | انڈیا | Rs.45.00 |
| * | بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک | |
| * | عام ڈاک US $ 8.00 | |

ترسیل زر کا پتہ:
منیجر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

EDITOR,
TAHZIBUL AKHLAQ
NISHANT,
ALIGARH MUSLIM
UNIVERSITY, ALIGA


24827

# مندرجات



تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو

---


مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد ۔ مقام اشاعت ادارہ تہذیب الاخلاق
اینڈ نشانات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ پریس: اے ایم یو پریس ۔ علی گڑھ

# اداریہ

سلیقہ کسی قوم یا فرد کے انداز زندگی اور اس کے رویّے کا غمّاز ہوتا ہے۔ آج جی چاہتا ہے کہ خود احتسابی کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اپنی ہی "سلیقہ شعاری" کو موضوع گفتگو بنایا جائے۔ ہم اس کا آغاز ایک چھوٹی سی بات سے کرتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کے دفتر میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے ڈاک آیا کرتی ہے۔ اس ڈاک میں خطوط کے علاوہ روزانہ اخبارات، ہفتہ وار اور ماہانہ جریدے اور کبھی کبھی کتابوں کے پیکٹ بھی ہوتے ہیں۔ ملفوف خطوط کا عالم تو یہ ہوتا ہے کہ اسّی فی صد لفافے اس طرح چپکائے جاتے ہیں کہ اُسی کے ساتھ خط کا کاغذ بھی چپک جاتا ہے اور جب اس کو بزور کھولا جاتا ہے تو "نامۂ مبارک" کے پُرزے ہاتھ آتے ہیں جن کو مرتب کرکے بدقت پڑھنا پڑتا ہے۔ اخبارات اور رسالوں کا عالم اس سے بھی دگرگوں ہے۔ بیشتر اخبارات شاید مالی تنگی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے غالب کے چار گرہ کپڑے کے برابر استعمال شدہ کاغذ پر پتے چسپاں کرکے اپنے اخبارات اور رسائل ڈاک خانے کے سپرد کرتے ہیں اس روش پر صبر کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اخبار یا رسالے کا پہلا صفحہ کھولتے وقت سالم رہ جائے۔ پتے کی چپیاں لگانے کا ہمارے یہاں یہ دستور ہے کہ آدھی چپی سرورق پر چسپاں کر دی جاتی ہے۔ جب ان اخباروں اور رسالوں کو کھولا جاتا ہے تو رسالوں کا سرورق تو بغیر پھٹے نہیں کھلتا۔ اخباروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ پہلے صفحے کے مضمون کی چند سطروں پر چپی اس طرح سے لگا دی جاتی ہے کہ دنیا کا کوئی علم اس چھوٹی سی بے ضرر چپی کو نکالنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کے برعکس بیرونی ممالک سے ہم کو جو خطوط، اخبارات اور رسالے ملتے ہیں وہ صاف ستھرے، مناسب سائز کے ایسے کاغذ سے ڈھکے ہوتے ہیں کہ دور دراز کی مسافت طے کرنے کے باوجود اخبار یا رسالے کا کوئی حصّہ خراب نہیں ہوتا۔ اسی ایک چھوٹی سی مثال سے ہم ہندوستانیوں کی "سلیقہ شعاری" کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہی اندازہ اس بات کا بھی غمّاز ہوگا کہ چیزوں کو برتنے اور ذمّہ داری کو محسوس کرنے کے سلسلے میں ہمارا رویہ کیا ہے۔

ہماری زندگی کے ہر گوشے میں "سلیقہ شعاری" کا یہی فقدان نمایاں نظر آتا ہے۔ صفائی ہی سے شروع کر لیجیے۔ کون نہیں چاہتا کہ وہ صاف ستھرے ماحول میں رہے، اس کا گھر صاف ستھرا ہو، قرب و جوار کی فضا صاف ستھری ہو۔ جب وہ سفر کرے تو جس سواری پر راستہ طے کرے صاف ستھری ہو۔ یہ خواہش تو

سب ہی کرتے ہیں مگر "سلیقہ" کا فقدان اس چھوٹی سی خواہش کو بھی پورا نہیں ہونے دیتا۔ اپنا اپنا گھر تو ہم جھاڑ پونچھ کر صاف کر لیتے ہیں مگر گھر کی ساری گندگی اپنی چہار دیواری کے باہر اس طرح پھینک دیتے ہیں کہ آوارہ جانور اس سے "شغل" کرتے رہیں اور گندگی کو کھینچ کھینچ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے رہیں۔ ہمارے اس عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے گھر اندر سے صاف ستھرے اور سجے سجائے رہنے کے باوجود انتہائی مضر فضا میں بسے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے طرح طرح کے امراض سر اُٹھا رہے ہیں اور ہم لوگ اپنی کمائی کی اچھی خاصی رقم "سلیقہ" نہ ہونے کی وجہ سے علاج معالجے پر خرچ کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں جھگی جھونپڑیاں حشرات الارض کی طرح زمین کے سینہ چیرتے ہوئے نکلی چلی آرہی ہیں اور ان کی تعداد میں حیرت انگیز حد تک اضافہ ہوتا جاتا رہا ہے ان جھگی جھونپڑیوں سے نکلنے والے کوڑے کچرے نے ماحول کو یوں ہی آلودہ کر رکھا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہم بھی ان ہی جھگی جھونپڑی والوں کی "تقلید" کرتے ہوئے ماحول کو اور زیادہ آلودہ کر رہے ہیں۔

سفر کے دوران بھی ہمارا یہی رویہ برقرار رہتا ہے۔ پھلوں کے چھلکے، پوری کچوری اور بھاجی کے دونے، دودھ اور چائے پینے کے مٹی کے برتن، ہر طرح کے کاغذ کے پیکٹ وہ کون سی چیز ہے جو ہر بس اور ریل گاڑی کے ہر ڈبے میں ہمارا استقبال نہیں کرتی؟ بیرونی ممالک کے برعکس ہندوستان میں نہ تو پھلوں کی کثرت ہے اور نہ ہی ہر شخص کی اُن تک دست رس ہے، اس کے باوجود جہاں دیکھیے کولھے کی ہڈی توڑنے کے لیے کیلے کے چھلکے پڑے رہتے ہیں۔ اگر ہندوستان میں پھلوں کی بہتات ہو جائے اور ہر کس و ناکس کی اُن تک دسترس ہو تو شاید ہماری آبادی کا بیشتر حصہ لولے لنگڑے اشخاص پر مشتمل دکھائی دے گا۔ اگر پھلوں کے چھلکوں، پتوں کے دونوں، کاغذ کے پیکٹوں کو "سلیقہ" کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو نہ صرف ہمارے گرد و پیش کا ماحول صاف ستھرا رہے گا بلکہ ان ہی چیزوں سے وہ کھاد بھی مہیا کی جا سکے گی جو ہماری پیداوار کو بڑھا دے مگر ان باتوں پر دھیان دے تو کون؟ ہمارا مطمحِ نظر تو اب یہ بن گیا ہے کہ پیٹ بھرو اور اُس کام میں لگ جاؤ جس کے کرنے سے پیٹ بھرنے کا سامان بہم پہنچے۔ اس کے علاوہ نہ کسی چیز کی طرف دیکھو نہ کچھ سوچو نہ ہی بہتری کے کسی کام پر عمل کرو۔ صرف یہ چلاتے رہو کہ ماحول آلودہ ہو رہا ہے۔ پینے کا پانی زہریلا ہوتا جا رہا ہے۔ فضا ایسی ہو گئی ہے کہ سانس لینی دشوار ہو گئی ہے۔ اس قسم کا شور و غوغا کرنے کے باوجود جب جب موقع ہاتھ آئے تو ہم خود ماحول کی آلودگی میں اضافہ کرنے کا سامان بہم کریں۔ اپنی غیر سلیقہ شعاری سے پانی میں کثافت کا اضافہ کرتے رہیں اور اپنے بچھائے ہوئے دام میں خود ہی گرفتار ہوتے رہیں۔

سلیقہ کہنے کو تو ایک پانچ حرفی چھوٹا سا لفظ ہے مگر اسی ایک چھوٹے سے لفظ میں جہانِ معانی آباد ہے۔ کاش ہماری آنکھیں اس قابل ہو سکیں کہ اس چھوٹے سے لفظ کے پس پشت جو جہانِ معانی آباد ہے اس کو دیکھ سکیں۔

# آزادی

سید احمد خاں

آزادی اور غلامی آپس میں ایسی نقیض ہیں کہ نہ دونوں کا اجتماع ہوسکتا ہے، نہ دونوں کا ارتفاع۔ اور اس لیے یہ دونوں داخل مرضی پروردگار نہیں ہوسکتیں؛ ورنہ خود پروردگار کی مرضی میں تناقض لازم آوے گا، جو اس کی حکمت بالغہ کے شایان نہیں ہے۔ بس کچھ شبہ نہیں ہے کہ ان دونوں میں سے صرف ایک ہی پروردگار کی مرضی کے مطابق ہوگی؛ یا یوں کہو کہ قانون قدرت دو نقیضوں کا متقاضی نہیں ہوسکتا اور اس لیے ان میں سے ایک ہی مقتضائے قانون قدرت ہوگی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ایک ایسی ہستی بنایا گیا ہے جس کی فطرت میں آزادی اور خودمختاری رکھی گئی ہے۔ وہ ذی عقل اور ذی شعور ہے۔ اس کو تمام قوائے ظاہری و باطنی دیے گئے ہیں۔ اُن کے استعمال پر، جس طرح وہ چاہے، قادر ہے۔ تمام کاموں کے شروع کرنے کی سمجھ اور ان کے انجام کی سوچ، اس کو دی گئی ہے؛ تاکہ ہر کام کا آغاز اور انجام سوچ لے۔ اس کی فطرت ایسی ہے کہ اپنے لیے آپ تمام چیزیں مہیا کرنے کے لیے حاجت مند ہے۔ پس یہ تمام چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس پتلے کے صانع کی مرضی یہی تھی کہ یہ پتلا خود اپنا آپ مالک رہے۔

صانع نے یہ تمام قویٰ جو انسان کو عطا فرمائے ہیں اُن سے اس کی مرضی یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ تمام قویٰ انسان میں اس طرح پُرشگفتہ اور شاداب رہیں کہ اعتدال سے خارج نہ ہونے پاویں، اور ایک دوسرے کی نقیض نہ ہوجاویں۔ انسان کی ذاتی محنت اسی کے لیے سودمند ہو۔ غلامی کی حالت میں انسان کے بہت سے قویٰ، بعوض شگفتہ و تروتازہ رہنے کے، پژمردہ، بلکہ محض معطل و بے کار ہوجاتے ہیں؛ اس کی محنت اس کی سودمندی کے لیے نہیں رہتی؛ پس کسی طرح ایسی حالت صانع کی مرضی نہیں ہوسکتی۔

انسان کی وہ چیز جس سے انسان انسان کہلاتا ہے اور جس کا نام لوگ روح لیتے ہیں مگر اس کی حقیقت کچھ نہیں بتلا سکتے، ایسی شریف چیز ہے کہ کسی کی مملوک ہونے کی لیاقت ہی نہیں رکھتی۔ کیا نتائج قانون قدرت، یا خدا کی روح، یا امر رب، کسی کی ملکیت ہوسکتی ہے؟ کیا ہم سی ہی ایک مخلوق ہماری ملکیت میں آسکتی ہے؟ حاشا و کلّا!

پس صاف عیاں ہے کہ غلامی اس قادر مطلق کی مرضی اور قانون قدرت دونوں کے برخلاف ہے۔ تمام انسان آزاد اور یکساں پیدا ہوئے ہیں؛ اور

کچھ شبہ نہیں کہ زندگی اور آزادی اور خوشی حاصل کرنے میں یکساں اور غیر قابل انتقال، استحقاق رکھتے ہیں۔

مگر انسان کی بدبختی سے کوئی نسل اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا کہ غلامی کی مصیبت انسانوں میں نہ رہی ہو بہت عقل مند اور دانا اور حکیم گزرے، بہت سے صاحب شریعت گزرے، مگر بجز ایک (محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے اور کسی نے اس قانون قدرت کے مخالف کا کچھ تدارک نہ کیا۔ موسیٰ صلوٰۃ اللہ علیہ نے اس کو جائز رکھا عیسیٰ علیہ السلام نے اس کی نسبت ایک حرف بھی نہیں کہا۔ یونانی حکیموں نے از روئے اصول اخلاق کے حالت غلامی کی نسبت کوئی اعتراض ہی نہیں سمجھا۔ ارسطو، باوصف اس دانائی کے، یہ سمجھا کہ خود خدا نے انسان کو آزادی اور غلامی میں تقسیم کیا ہے۔ اول تو یہ سمجھ ہی اس بڑے حکیم کی، جو ہر طرح ہمارے ادب کے لائق ہے، غلطی تھی اور سوائے اس کے، اس نے یہ خیال نہ کیا کہ غلامی کسی خاص قوم پر مخصوص نہیں رہ سکتی۔ افلاطون اس سے بھی زیادہ غلطی میں گرا۔ جب اس نے یہ کہا کہ صرف یونانی غلام نہ ہونے چاہئیں!

زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس ایک فیاض شخص (محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کا اصول مقررہ، جس نے آئندہ غلامی کی جڑ کو کاٹنا اور غلاموں کی حالت کو سنوارا اور جہاں تک ممکن ہوا اُن کو آزادی کا خلعت پہنانا، ایسا غفلت میں پڑا رہا کہ بہت ہی کم اس پر خیال ہوا۔

---

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے
روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا:
"آدمی کے اسلام کی ایک بڑی خوبی
یہ بھی ہے کہ اس چیز کو چھوڑ دے جو اس کے
مطلب کی نہ ہو۔"

ترمذی

# ظاہر و باطن

سید حامد ○

انسان کو ناپنے کے لیے مختلف پیمانے مختلف زمانوں میں وضع ہوئے ہیں ۔ ابتدا میں تو وہی انسان بڑا مانا جاتا تھا جس کے بازوؤں میں طاقت اور جس کے دل میں حوصلہ ہوتا تھا ۔ تہذیب آگے بڑھی تو ذہن نے جسم پر اپنی بالادستی منوانی شروع کر دی ۔ اب وہی آدمی ناپنے پر زیادہ نکلتا تھا جو عقل کو کام میں لے کر سماج میں طاقت اور اثر حاصل کر لیتا تھا ۔ علم کو اور فروغ ہوا تو وہ زمانہ بھی آگیا جب علم اختیار کا پیش خیمہ بن گیا اور جہاں یہ دونوں الگ الگ بھی رہے وہاں علم کو اختیار اور اقتدار کے مساوی درجہ دیا گیا ۔ ان ایام میں عالموں اور استادوں، مصنفوں اور شاعروں کی بڑی قدر ہوئی ۔

ان سارے زمانوں میں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، ان لوگوں کی عزت برابر ہوتی رہی جو سچے اور ایمان دار تھے ۔ ان کا افلاس ان کے احترام کی راہ میں حائل نہیں ہوا ۔ علاوہ بریں جو لوگ سوجھ بوجھ رکھتے تھے اور ہمہ وقت انسانوں کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے ۔ وہ اپنے چھوٹے سے مقامی حلقہ میں ہمیشہ مقبول و محترم رہے، گو انھیں شہرت حاصل نہیں ہوئی ۔

صنعتی انقلاب نے انسان کو جانچنے کے سبھی پیمانوں کو بدل ڈالا ۔ دنیا کی کایا پلٹ ہو گئی تو قدریں بھی بدلیں لوگوں کو ناپنے اور آنکنے کے طریقے بھی بدل گئے ۔ تامل اور تکلف کے بجائے مینا کو خود بڑھ کر ہاتھ میں اٹھا لینے کے طریقے نے رواج پایا ۔ ادب اور لحاظ کو رکاوٹ سمجھ کر راستے سے ہٹا دیا گیا ۔

خاموشی ختم ہوئی ۔ شور برپا ہو گیا ۔ جو زیادہ چلائے گا، داد زیادہ وہی پائے گا ۔ جو جھپٹا مارے گا انعام اسی کو ملے گا ۔ جو اپنا ڈنکا بجائے گا شہرت اسی کو حاصل ہوگی ۔ صنعتی انقلاب اور اس کے جلو میں آنے والے ٹیکنولوجی کے انقلاب اور رسل و رسائل کے انقلاب نے دنیا کی طنابیں کھینچ کر رکھ دیں ؛ چھوٹے چھوٹے عافیت کے گوشے بھی شور و زور کے سیلاب کی زد میں آگئے ۔ انسان اپنی فرصت اور اپنے وقت کا مالک نہیں رہا ۔ نجی زندگی اور خلوت اور عزلت پر ہر طرف سے یورشیں ہونے لگیں ۔ اچھائیاں کون قبول کرتا ہے ؟ برائیاں بجلی کی رفتار سے سارے عالم کا احاطہ کرنے لگیں ۔

ٹیکنولوجی کے سائے میں پھیلتی ہوئی برائیوں

---

○ سابق وائس چانسلر اے ۔ ایم ۔ یو ۔ علی گڑھ ۔ ہمدرد نگر ۔ نئی دہلی ۔

بشہ، گزشتہ دو صدیوں کے دوران، سیاست کی زمتی اور پھیلتی ہوئی طاقت سے ملی۔ سیاست کھیل ہی طاقت کا ہے۔ قدروں کا تذکرہ کیجیے تو اُس کے کان پک جاتے ہیں۔ سیاست طاقت کے ننگے تماشے پر مسکراتی ہے، اُس کی کھیتی ایسی ہی فضا میں لہلہاتی ہے۔ سچائی، بھلائی، ہمدردی اور انسانی خیر خواہی کے لیے سیاست کے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ سیاست حلم، سنجیدگی، راستی اور وقار کو اپنے قریب آنے ہی نہیں دیتی۔ سیاست میں کردار باختہ لوگوں کو ہی ٹھکانا ملتا ہے۔ ہمارے عہد میں معاشرے میں حکومت کا نفوذ اور اقتدار بہت بڑھ گیا ہے اور اسی کے بقدر اہل سیاست کی طاقت اور عوامی زندگی میں ان کا عمل دخل، سماج میں فتنہ و فساد سیاست کی راہ سے آیا اور اب تک کوئی اسے پھیلنے سے روک نہیں پایا۔

اب ہم آغاز داستان کی طرف واپس آتے ہیں

جس زمانے میں سیاست کے زیر اثر برائیاں عام ہو جاتی ہیں تو وہ برائیاں خود ایک بہت بڑی بُرائی کو جنم دیتی ہیں جس کا نام ہے ریاکاری۔ بُرے لوگ اثر پیدا کرنے کے لیے بُرائی کو چھپاتے ہیں اور اچھائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کج نہاد لوگ اس کا اہتمام کر لیتے ہیں کہ جریدہ اور منبر سے ان کی راست روی اور پاک بازی کے چرچے ہوتے رہیں۔ ایسی حالت میں نیک و بد کی تمیز دشوار ہو جاتی ہے۔ آدمی خود کو وہ ظاہر کرتے ہیں جو وہ نہیں ہیں۔ وہ دوسروں کو دھوکا دیتے دیتے خود کو بھی دھوکہ دینے لگتے ہیں۔

مضمون پایاں کو پہنچ رہا ہے۔ چلتے چلتے بڑے آدمی اور اچھے آدمی کی تعریف کر دی جائے اور انھیں ناپنے کا ڈھنگ بھی بتا دیا جائے۔ بڑا آدمی وہ نہیں ہے جو صاحب زر یا صاحب اقتدار ہو۔ بڑا آدمی وہ ہے جس کی کوششوں ایجادات، عزائم اور مشاغل سے انسانوں کو دور رس اور دیرپا فائدہ پہنچے۔ اچھا آدمی وہ ہے جس کے ظاہر و باطن میں فاصلہ کم سے کم ہو۔ اگر کسی فرد کی اچھائی ناپنا ہے تو جان لیجیے کہ وہ ظاہر و باطن کے درمیان فاصلے کے برعکس ہوگی۔ جس انسان کے ظاہر و باطن میں فاصلہ کم ہوگا اچھائی کے لحاظ سے وہی قدآور ہوگا اور اگر یہ فاصلہ زیادہ ہوا تو سمجھ لیجیے کہ وہ انسان اخلاق اور کردار کے اعتبار سے بونا ہے۔ کھرا انسان وہ ہے جو اندر اور باہر یکساں ہو۔ کہاں ملتے ہیں ایسے آدمی؟ اگر مل جائیں تو ان کے پاؤں کی خاک کو آنکھوں میں سرمہ کی طرح جگہ دیجیے۔ سماج میں ان کی کچھ ہی حیثیت کیوں نہ ہو، ان کے ہاتھ پر بیعت کیجیے کہ یہی لوگ دراصل نیک و بد کی کسوٹی ہیں۔ اخلاقی جرأت ان ہی کے پاس ہے۔ ڈر ان کو چھو کر نہیں گیا۔ یہ سماج سے کیوں ڈرنے لگے۔ خود سماج ان سے ڈرتا ہے۔

خردہ بیں لوگ شاید یہاں یہ کہیں کہ جو کچھ دل میں آتا ہے، اسے زبان پر لے آیا جائے تو نہ معلوم کتنوں کی دل شکنی ہو اور صاف گوئی سے پیدا ہونے والی کدورتوں اور عداوتوں کا حساب لگانا دشوار ہو جائے انسان اتنا خود پسند واقع ہوا ہے کہ اپنی بُرائی گوارا کر ہی نہیں سکتا۔ بُرائی تو پھر برائی ہے۔ اگر اس کی تعریف میں احتیاط اور اعتدال برتئے تو یہ طرز عمل بھی اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ لیکن سچائی یہ تقاضا تو کبھی نہیں کرتی کہ جو کچھ کسی انسان کے بارے میں آپ کی رائے ہے آپ اس کا اظہار کر ہی دیں۔ اظہار کرنے سے سوائے تلخی کے کیا حاصل ہوگا۔ اتنا ضرور دیکھیے کہ جس شخص کے بارے میں آپ کی رائے اچھی نہیں ہے اس کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے نہ ملائیے۔ جس کسی کی تعریف آپ اس کے منھ پر کر رہے ہیں، پیٹھ پیچھے اس کی بُرائی نہ کیجیے۔

سامنے بُرائی کرنے سے تلخی اور بدمزگی ہوتی ہے' پیچھے برائی کرنا بڑی مذموم حرکت ہے۔ البتہ اس شخص کو جس کی تربیت یا اصلاح کی ذمہ داری ایک حد تک آپ پر ہے' خوبصورتی کے ساتھ اس کی کمیوں یا کوتاہیوں سے آگاہ کر دینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ شرط یہ ہے کہ انداز سے محبت و خیرخواہی ٹپکتی ہو۔ آپ کی ہدایت میں نفرت یا حقارت کا شائبہ بھی نہ ملے۔ ورنہ نتیجہ آپ کے ارادہ اور مقصد کے برعکس نکلے گا۔ اسی طرح ایسے موقعے بھی آسکتے ہیں جب کسی کے پیٹھ پیچھے اُس کی بُرائی کرنا جائز ہوگا۔ شرط یہ ہے کہ آپ کسی دوسرے شخص کو جو پہلے شخص سے ناواقف ہے اور اس کے ساتھ معاملہ کرنا یا تعلقات قایم کرنا چاہتا ہے راہ کے خطرے کے بارے میں متنبہ کر رہے ہوں بتا رہے ہوں کہ اس شخص نے غلط بیانی کی ہے' یا وہ دھوکا دے سکتا ہے' یا اس کے قول پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا پیٹھ پیچھے برائی جائز ہے تو صرف انتباہ کی شکل میں۔ جو لوگ زبان کے چٹخارے کے لیے ایسا کرتے ہیں وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ظاہر اور باطن میں تفاوت' ابتدائے آفرینش سے آج تک ہزار ہا فتنہ و فساد برپا کرتا چلا آیا ہے۔ انسان کو اسی تفاوت نے اسفل سافلین بنا دیا ہے۔ ریاکاری دراصل سیکڑوں برائیوں کی جڑ اور بے شمار عیوب کی ماں ہے۔ ہندوستان میں یہ خوب پھولی پھلی ہے۔ کچھ تو اس جھوٹے اخلاق کی بدولت جسے تکلف اور دوسری اقدار کا نام دیا جاتا ہے اور جو نہ جانے کیوں مشرقی تہذیب اور شائستگی کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے' کچھ ان لوگوں کے منصوبوں کی بنا پر جو خلق ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ دنیا کو دھوکا دیتے رہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمارے ملک میں ریاکاری کی سرحدیں اجتماعی فریب دہی سے مل جاتی ہیں۔ تقریر اور تحریر میں اہلِ سیاست بسا اوقات اپنے بارے میں اُن اوصاف کا اعلان اور دوسروں کو ان باتوں کی تلقین کرتے ہیں جن سے اُنھیں دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ ظاہر پہ باطن کا عکس بھی نہ پڑنے پائے' یہ ہنر کوئی ہمارے رہبروں سے سیکھے۔ ہوسِ جاہ اور ہوسِ زر دونوں نے ریاکاری کی آبیاری کی ہے۔ اس ریاکاری کی آبیاری نے جس نے انسانیت کی جڑوں اور اس کے برگ و بار کو جلا دیا ہے۔

---

حضرت شدّاد بن اوسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کا جائزہ لے اور آخرت کے دن کے لیے عمل کرے' پیچھے رہ جانا وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشوں کے پیچھے ڈال دے۔ اور اللہ سے بڑی بڑی امیدیں لگائے بیٹھا رہے۔ (ترمذی)

# اسلامی سائنس کی نشاۃ ثانیہ
## اور
## طب یونانی میں تحقیق

کنور محمد یوسف امین

مغربی طب جسے عرفِ عام میں جدید طب کہا جاتا ہے جدید سائنس کا گل سرسبد ہے اور اس لحاظ سے خود اعتمادی اور فخر و مباہات سے سرشار ہے۔ یہ احساس بے بنیاد نہیں ہے۔ مغربی طب نے علاج بالادویہ اور جراحت کی اعلیٰ منزلیں طے کرکے انسان کے کرب و الم کا بہت حد تک مداوا کیا ہے لیکن میڈیکل کالج کی او۔ پی۔ ڈی میں مریضوں سے اپنے اولین سابقے میں ہی مغربی طب کے بعض اعتبار سے بے بس اور تہی دامن ہونے کا احساس پیدا ہو گیا تھا عمومی کمزوری، دائمی بدہضمی، دائمی نزلہ، مختلف جنسی مسائل جوڑوں کے درد اور ان جیسے دیگر امراض میں مغربی طب کو یا تو بہت کم موثر پایا یا بالکل بے بس۔ بعد ازاں طب یونانی کے ہندوستان میں پہلے پوسٹ گریجویٹ تحقیقی شعبہ یعنی مسلم یونیورسٹی کے اجمل خاں طبیہ کالج کے شعبۂ علم الادویہ • میں جدید علم الادویہ ۔Modern Pharmacology کی تدریس اور جدید بنیادوں پر طب یونانی کی ادویہ نیز کلیات ادویہ پر تحقیق کا موقع ملا۔ ان تجربات کی بدولت مغربی طب کے بعض نقائص کے ابتدائی ادراک نے نسبتاً تفصیلی شکل اختیار کر لی۔

علامہ اقبالؒ، مولانا مودودیؒ اور پروفیسر اسماعیل فاروقیؒ جیسے اساطینِ علم و فکر اس حقیقت سے پردہ اٹھا چکے ہیں کہ ہر تمدن اور اس کے علوم اپنی مخصوص جہاں بینی اور نظامِ اقدار پر استوار ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کے علم کی اساس ان کی جہاں بینی اور نظامِ اقدار یعنی اسلام پر ہونی چاہیے۔ ان حضرات نے اس کلیہ کی روشنی میں اسلامی فلسفہ، اسلامی نفسیات، اسلامی عمرانیات اسلامی تاریخ، اسلامی ادب اور اسلامی آرٹ وغیرہ کو جدید انداز میں ترقی دینے کا مطالبہ کیا اور مسلم تمدن کے احیا کے لیے اسے ناگزیر ٹھہرایا۔ ضیاء الدین سردار اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ان کے ہم مشربوں نے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ واضح کیا کہ انسانی علوم (Human - Sciences) کی طرح کائناتی علوم (Natural - Sciences) بھی پوری طرح معروضی نہ ہو کر کسی تمدن کے نقطۂ نظر سے متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی انسانی علوم کی طرح اسلامی کائناتی علوم کو بھی بحال ہونا چاہیے سردار کا یہ دعویٰ اور مطالبہ بالکل حق بجانب ہے۔ سائنس کے جدید مغربی فلسفی مثلاً تھامس کونؒ وغیرہ بھی اس

---

• ریڈر ڈپارٹمنٹ آف علم الادویہ، اجمل خاں طبیہ کالج، اے ایم یو علی گڑھ

نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ نیچرل سائنس، جیسا کہ عوام سمجھتے ہیں، اس طرح معروضی نہیں ہے بلکہ جملہ علوم میں سائنس کے مقام، موضوعات تحقیق کے انتخاب، مشاہدات کے حدود اربعہ کے تعین، مفروضوں (Hypotheses) کی تشکیل، تجربات کے انتخاب اور سائنسی دریافتوں کے عملی استعمال (Application) ان تمام معاملات میں سائنس دانوں کی جہانبینی اور نظام اقدار کا شعوری اور تحت الشعوری اثر ہوتا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ قرآن و سنت گویا کائنات کے سینے سے پھوٹنے والا نغمہ ہے۔ چنانچہ اسلامی علوم بشمول انسانی علوم کائنات کی بحالی نہ صرف اسلامی تمدن کو اس کی یگانہ و مانوس علمی روایت بخشے گی جو ہمارے حالات سے مناسبت رکھے گی اور جس کی معروف فضاؤں میں ہم دوبارہ علمی تحقیق و ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں گے بلکہ سائنس کو صحیح ترین فکری اور اخلاقی بنیادیں بھی عطا کریں گے اور اسلامی سائنس ساری انسانیت کے لیے سائنس کا صحیح ترین ماڈل بن کر ابھرے گی جس کی پیروی سائنس کو اس کے موجودہ نقائص سے پاک کرے گی اور موجودہ سائنس جو کہ خیر کے ساتھ ساتھ شر کے بھی جراثیم لیے ہوئے ہے خیر کامل بن کر ابھر سکے گی۔

جملہ اسلامی علوم کے جز کے طور پر اسلامی کائناتی علوم (Natural Sciences) کو بحال کرنے کی ضرورت کہنا گو مشکل امر ہے لیکن اس کام کو انجام دینا اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اب تک اس کے لیے جو طریقہ کار تجویز کیے گئے ہیں ان میں قرآن و سنت اور قرون وسطی کے اسلامی کائناتی علوم کا تجزیاتی مطالعہ، اس کے ساتھ مغربی سائنس کا تقابلی مطالعہ اور اس کی روشنی میں اسلامی کائناتی علوم کی فلسفیانہ اور عملی بنیادوں کا تعین، سائنسدان کی شخصیت کو کاملاً اسلامی بنانا وغیرہ شامل ہیں لیکن ان حضرات نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے ایک انتہائی اہم طریقے کو نظرانداز کر دیا ہے۔ یعنی ایسے اسلامی کائناتی علوم کو جدید سطح پر لانے کی کوشش کرنا جو زندہ ہوں۔ اس فروگذاشت کی وجہ بہت واضح ہے وہ یہ کہ بیشتر اسلامی کائناتی علوم و فنون مثلاً فلکیات (Astronomy) علم المعدن (Metallurgy) فن تعمیر (Architecture) وغیرہ کو مغربی استعمار نے منظم انداز میں تباہ و برباد کر دیا لیکن ایک اسلامی کائناتی علم یعنی طب یونانی غیر منفک تسلسل کے ساتھ برقرار ہے اور خصوصاً ہندوستان میں آج بھی ایک زندہ طب کی صورت میں برتا جا رہا ہے۔ چنانچہ طب یونانی کو جدید سطح پر لانے کا عمل دیگر فائدوں کے ساتھ ساتھ اسلامی کائناتی علوم کو بحال کرنے کے ہمارے عظیم دینی اور تمدنی فریضے کی ادائیگی کا ایک اہم وسیلہ بھی ہے۔

طب یونانی پر تحقیق کے لیے جدید سائنس کے تصورات اور طریقہ کار سے استفادہ کرنے کی ضرورت کو سمجھا جا چکا ہے۔ تقریباً ۵۰ سال سے یہ کاوشیں جاری ہیں ان کے نتیجے میں طب یونانی کی بہت حد تک توثیق و تشریح بھی ہوئی ہے اور توسیع و تصحیح بھی ہوئی ہے لیکن بعض نقصانات بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً علم الادویہ میں جدید فارماکولوجی کی پیروی محض کرتے ہوئے گیاہی ادویہ (Herbal drugs) سے ان کے فعال اجزا (Active Principles) کو نکالنے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ اس اصول کو کلیہ کے طور پر اختیار کرنا، خصوصاً طب یونانی کے معاملے میں حق بجانب نہ تھا۔ یہ سوچا جانا چاہیے تھا کہ مسلم اطباء نے اپنے ترقی یافتہ سائنسی شعور اور صلاحیت کے باوجود گیاہی ادویہ کو سالم بوٹیوں کی شکل ہی میں کیوں استعمال کیا۔ اس کی گنجائش تھی بلکہ ضرورت تو تھی کہ یونانی گیاہی ادویہ پر سالم حیثیت میں تحقیق کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے فعال اجزا نکال کر ان کا اثر بھی دیکھا جائے لیکن...

...وانہ تھا کہ یونانی ادویہ کی تحقیق پر جدید فارماکالوجی کے تجرباتی طریقے کو آنکھ بند کرکے مسلط کر دیا جائے لیکن جدید سائنس کی تقلید جامد کی وجہ سے ایسا ہی کیا گیا جس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ گراں بہا وسائل خرچ کرکے کی گئی ریسیرچ سے زیادہ فائدہ حاصل نہ ہوا بلکہ بہت سی گیاہی ادویہ کو بے کار سمجھ کر متروک کر دیا گیا۔

سری مال نے ایک جائزے میں بتلایا کہ لکھنؤ میں واقع سی۔ ڈی۔ آر۔ ای میں ۱۵۲ سالم گیاہی نمونوں میں قابل ذکر طبی اثرات منکشف کیے گئے لیکن جب ان کے فعال اجزا کو مستخرج کیا گیا تو صرف ۸۶ نمونوں میں طبی اثرات دیکھے جا سکے۔ اس لیے کا سب سے زیادہ کرب ناک پہلو یہ ہے کہ ۶۶ باقی نمونوں کو بے کار سمجھ کر مسترد کر دیا گیا۔ اس تجربے کی روشنی میں سری مال نے یہ سفارش کی کہ گیاہی ادویہ سے فعال اجزا نکالنے پر اصرار نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ اگر سالم شکل میں طبی فوائد زیادہ ہوں تو انھی کو استعمال کرنا چاہیے۔

جدید فارماکالوجی کو آخر اس پر اصرار کیوں ہے کہ گیاہی ادویہ کے فعال اجزا ہی نکال کر استعمال کیے جائیں ورنہ طبی اثرات رکھنے والی سالم بوٹیوں کو مسترد کر دیا جائے؟ یہ سوال دلچسپ ہے اور اس کا جواب راقم السطور نے کہیں اور دیا ہے۔ وہ جواب اس دعوے کے لیے ایک چھوٹا لیکن مضبوط ثبوت بھی فراہم کرتا ہے کہ سائنس کلیتًا معروضی نہ ہو کر سائنس داں کے عقاید و جہاں بینی سے متاثر ہوتی ہے لیکن موجودہ بحث میں ان تفصیلات کو لانا ضروری نہیں ہے۔ مقصد یہ تھا کہ ایک ٹھوس مثال کے ذریعے یہ ثابت کیا جائے کہ جدید سائنس کو آنکھ بند کرکے طب یونانی پر مسلط کرنے سے مسلمانوں کے اس واحد زندہ سائنسی شعبے کو نقصان ہو سکتا ہے۔

طب یونانی کی تحقیق میں مصروف جدید سائنس کے محققین میں راقم السطور نے غالبًا پہلی مرتبہ یہ اصول پیش کیا ہے کہ جدید سائنس کے تمام تصورات اور تکنیکوں کو آنکھ بند کرکے طب یونانی پر مسلط نہیں کیا جانا چاہیے، بلکہ یہ بھی دیکھا جانا چاہیے کہ ان میں سے کون سی چیزیں طب یونانی کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہیں اور کون سی عدم مطابقت۔ مطابق اصولوں کو اختیار کیا جانا چاہیے اور مخالف چیزوں کو ترک کر دیا جانا چاہیے۔ مزید برآں جدید سائنس اور طب یونانی سے واقف محققین کو تخلیقی سوچ کے ذریعے ایسے تصورات اور تکنیکوں کو وضع کرنا چاہیے جن کی مدد سے طب یونانی اپنے ان مخصوص اوصاف و صفات کے ساتھ جن کو کہ باطل ثابت نہ کیا جا سکے، دوبارہ ایک جدید سطح کی زندہ اور نمو پذیر سائنسی روایت بن سکے۔ اس مقصد کے حصول میں کامیابی نہ صرف طب یونانی کے طبی فواید میں انتہائی اضافہ کرے گی بلکہ اسلامی سائنس نیز جملہ اسلامی علوم کی نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم وسیلہ بھی بنے گی۔

کسی اصول کو محض وضع کر لینا ہی کافی نہیں ہوتا ہے۔ اس کے بعد اصول کے عملی انطباق کا مسئلہ آتا ہے۔ یہ انطباق آزاد اور تخلیقی فکر کے ساتھ مسئلے کے مختلف پہلوؤں سے گہری واقفیت چاہتا ہے۔ اس انطباق سے حاصل ہونے والے عملی تجربات اصول کی صحت یا عدم صحت کو ثابت کرتے ہیں، یا پھر اصول میں کسی ترمیم کی ضرورت کی طرف نشاندہی کرتے ہیں، نیز اصول کے آئندہ انطباق کے لیے ذیلی ضوابط متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ راقم السطور کو جدید فارماکالوجی Modern Pharmacology میں تخصص کرنے کے بعد علم الادویہ (Unani Pharmacology) میں تحقیق کا موقع ملا ہے۔ کار تحقیق میں یہ اصول ملحوظ رکھا گیا کہ جدید سائنس کے صرف مناسب حال تصورات

اور تکنیکوں کو اختیار کیا جائے۔ نیز نئے تصورات اور تکنیکیں بھی وضع کی جائیں۔ ابھی اس کا موقع تو نہیں ملا ہے کہ نئی چیزیں بنائی جائیں لیکن علم الادویہ کے اوصاف اور تقاضوں کی روشنی میں موجود تصورات اور تکنیکوں کے رد و انتخاب کا محدود تجربہ حاصل ہوا ہے۔ تحقیق کے موضوع اور طریقہ سے متعلق ایک ایک تجربہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے:

مغربی طب کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران یہ بات دھیرے دھیرے سامنے آئی کہ یہ طب عمومی (Generalised) نوعیت کے امراض کو نظر انداز کرتی ہے مثلاً نزلہ، بدہضمی، جگر کی کمزوری اور ضعف باہ وغیرہ۔ اب اس کا سبب بھی سامنے آچکا ہے۔ یعنی مغربی طب کا مادہ زدہ (Materialist) اور انتہائی تجزیاتی (Reductionist) ہونا جس کے نتیجے میں عمومی قسم کی بیماریاں، جن کی جسمانی بنیادیں (Structural Bases) بہت واضح نہیں ہوتی ہیں اور جن کا تعلق بہت سے اجزا، بلکہ ان اجزا کے ربط و ارتباط (Inter Relation) سے ہوتا ہے۔ وہ امراض مغربی طب میں خود بخود نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے مغربی فارماکالوجی گویا یہ ان کہا مفروضہ بھی رکھتی ہے کہ عمومی نوعیت کے امراض (Generalised Diseases) میں مخصوص درپیش (Specific) فائدہ پہنچانے والی ادویہ وجود نہیں رکھتی ہیں لیکن طب یونانی، جو کہ مادہ اور جز سے عراق کی حد تک وابستگی نہیں رکھتی بلکہ روح اور ل کو بھی اہمیت دیتی ہے، اس میں ایسے امراض کا مطالعہ اور ان کا علاج موجود ہے لیکن جدید طبی اسلوب کو بے چوں و چرا اختیار کر لینے کے نتیجے میں ب یونانی کے جدید محققین نے بھی ان امراض اور ان کے علاج کو نظر انداز کر دیا ہے ـــ چنانچہ ایسے امراض کی ادویہ کو قصداً تحقیق کے لیے منتخب کیا گیا۔ عام کمزوری، جگر کی کمزوری اور ضعف باہ کی بعض ادویہ پر تحقیق کی جا چکی ہے۔ ان تمام ادویہ کے اندر بہت نمایاں اثرات دیکھے گئے۔ مثلاً ثعلب مصری (Orchis latifolia) نے چوہوں کے جنسی رویہ (Sexual Behaviour) میں اضافہ کیا ـــ اسی طرح گل غافت ـــ (Agrimonia Eupatoria) نے چوہوں کے جگر کی کمزوری کو دور کیا۔ ایک یونانی دواساز ادارہ کے مقوی عام شربت نے چوہوں کی عمومی طاقت میں اضافہ کیا۔ ان تجربات سے ہمارے اس مفروضہ کو تقویت حاصل ہوئی کہ عمومی نوعیت کے امراض میں فائدہ بخشنے والی ادویہ وجود رکھتی ہیں اور ان ادویہ کو تلاش کرنے کے لیے تحقیق کی جانی چاہیے اور اس طرح تحقیق کے موضوع کے تعلق سے، جدید فارماکالوجی کے تصورات سے ہٹ کر ایک نیا اصول بنا جو طب یونانی کو بہتر انداز میں نمو بخشے گا۔

اسی طرح تحقیق کے طریقے کے تعلق سے بھی ایک اہم ترمیم کی گئی۔ عمومی نوعیت کے امراض چونکہ مغربی طب میں نظر انداز ہو گئے ہیں۔ اس لیے وہاں ان امراض میں فائدہ کرنے والی ادویہ کے مطالعے کے طریقوں کو بھی اہمیت حاصل نہیں ہے، لیکن زیادہ کد و کاوش کرنے سے ایسے تجربات (Tests) کا سراغ مل سکتا ہے جنھیں کچھ ترمیم کے بعد استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ تجربات یا تو کسی اور ضمن میں استعمال کیے جاتے ہیں یا پھر کم اہمیت کے حامل لٹریچر (Fringe-Literature) میں ملتے ہیں۔ مثلاً جنسی رویہ Sexual Behaviour کے مطالعہ کے لیے

استعمال کیے جانے والے ٹیسٹ مقوی باہ (Sexual stimulant) ادویہ کی دریافت کے ٹیسٹ کے طور پر تو نہیں ملے لیکن جنسی فزیالوجی کے ٹیسٹ پیریا پھر ان تصنیفات میں ملے جنھیں طبی برادری میں زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ اس طرح یہ بات سامنے آئی کہ جن گوشوں کو مغربی طب نظرانداز کر دیتی ہے ان کو اختیار کیا جانا ضروری ہو تو طریقہ تحقیق اور ٹیسٹ کیسے حاصل کیے جائیں۔

چنانچہ عملی تجربات کی روشنی میں اس بات کی تصدیق ہوئی کہ مغربی فارماکالوجی کے علی الرغم علم الادویہ (یونانی فارماکالوجی) کے ان گوشوں میں بھی تحقیق کی جانی چاہیے جو عمومی نوعیت کے امراض کے علاج پر مشتمل ہیں۔ نیز اس مقصد کے لیے مغربی طب میں ٹیسٹ دستیاب ہو سکتے ہیں، لیکن یہ ٹیسٹ کسی اور ضمن میں بیان کیے گئے ہوں گے، یا پھر ایسے لٹریچر میں ملیں گے جسے مغربی طب میں مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

مزید براں اس بحث سے یہ بھی محدود طور پر ثابت ہوا کہ اسلامی سائنس اور اسلامی طب (طب یونانی) کے ارتقاء کے لیے مغربی طب کے اصولوں کو من و عن استعمال نہیں کیا جانا چاہیے، بلکہ ردّ و انتخاب (Pick and Chose) سے کام لیتے ہوئے اُن میں سے صرف وہ چیزیں لی جانی چاہئیں جو طب یونانی کے ارتقا میں معاون ہوں اور اُن چیزوں کو مسترد کر دینا چاہیے جو اس طب کو مسخ کر دیں۔ نیز مغربی طب کے تحقیقی اصولوں میں مناسب ترمیم بھی کی جانی چاہیے اور نئے طریقوں کو وضع بھی کرنا چاہیے۔

## حوالے


۱ رحیم بخش شاہین: اوراقِ گم گشتہ، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۳ء

۲ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: "علمی تحقیقات کیوں اور کس طرح" مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۷۹ء

۳ اسماعیل الراجی الفاروقی: علوم کی اسلامی تشکیل جدید" سینٹر فار اسٹڈیز آن سائنس، علی گڑھ

4 Ziauddin Sardar: Arguments for Islamic Science, Aligarh, Centre for S. on Sc. 1984

5 Thomas Kuhn 'Structure of Scientific Revolution''

6. Srimal, R.C. "Experience of Research_ 1989.

7- K.M.Y Amin. Research in Ilmul Advia. 1991. P. 0—16

8 K.M.Y Amin, N A Khan. 'The Effect of Unani Drug . 1991

9. K.M.Y Amin, S. J. Rizvi 'The Hepato Protective of Gul-e-Ghafis (1991)

10. A.A. Ansari, K.M.Y Amin. 'Pharmacological Study of Sankara as a

# انجانے عقیدے

علی عباس ازل ▽

کچھ عقیدے ہم سوچ سمجھ کے، عقل سے پرکھ کے مانتے ہیں اور کچھ کو قبول کرتے وقت ہم اپنی فکر کو طاق پر رکھ دیتے ہیں۔ آخرالذکر کو انجانے، نامعلوم، مخفی یا جبلی عقیدے کہتے ہیں کیونکہ ان کو مانتے ہوئے بھی ہم ان کے بارے میں بالکل لاعلم یا انجان ہوتے ہیں۔ یہ عقیدے کیا ہیں، کیسے بنتے ہیں اور وہ کون سے محرکات ہیں جن کی وجہ سے آج کل انجانے عقیدوں اور اُن کے ماننے والوں میں اضافہ ہوا ہے۔ یہاں ان سوالوں سے مختصراً بحث کی گئی ہے۔

انجانے عقیدوں کا تعین کرنے والے عناصر عقلی نہیں ہوتے نفسیاتی اور سماجی ہوتے ہیں اسی لیے ان عقاید کی ابتدا اور ان کے ترکیبی محرکات یعنی میکانیت (Mechanism) کو سمجھنے میں نفسیات سے بہت مدد ملتی ہے۔ عمرانیات یا سماجیات میں بھی مخفی عقیدہ ایک دلچسپ وقوعہ (Phenomenon) ہے۔ کیونکہ مذہبی عقاید اور سماج کے ادھر اُدھر سرکنے میں جو کھلبلی ہوتی ہے یہ وقوعہ اس کو ظاہر کرنے کے لیے ایک اشاریے کا کام کرتا ہے۔ معروضی نقطۂ نظر سے انجانے عقیدے فی الحال غیر مدلل عقاید سے لے کر ان عقیدوں تک پھیلے نظر آتے ہیں جو بالکل ہی لغو ثابت کیے جا سکتے ہیں۔

ایسے مخفی عقاید جو کسی ادارے کی شکل میں منظم ہو جاتے ہیں، اپنے ماننے والوں کے لیے وہی کام کرتے ہیں جو روایتی مذہب کا ہے۔ یہ عقیدے کاذب عملیات یعنی جھوٹے اور مصنوعی علوم اور نام نہاد سائنس (Demonology) علم کشف، شیطانیات یا سفلیات سے منسلک ہیں اور عام توہمات کے برعکس بظاہر مذہب سے زیادہ مماثل ہیں اور ایسی ضروریات پوری کرتے ہیں جو عام طور پر مذہب کے ساتھ وابستہ سمجھی جاتی ہیں۔ اس طرح کے عقایدی نظام اپنے عقیدت مندوں سے اکثر و بیشتر مکمل وابستگی چاہتے ہیں خواہ یہ عارضی ہو یا مستقل۔

بعض عقیدے فراری تفریح (Escapist Entertainment) مثلاً خیالی سائنسی ادب یا تخیلاتی پروازوں (Fantasy) میں دلچسپی لینے

A/6 اسٹاف مینشن، کرائسٹ چرچ، علی گڑھ

کی وجہ سے بھی بنتے ہیں۔ بعض غیر اہم ذاتی عقیدے
ہوتے ہیں جو ادھر ادھر سے حاصل کی ہوئی غلط معلومات
کی وجہ سے بن جاتے ہیں۔ عقیدوں کو معین کرنے والے
یہ عناصر کسی مخصوص عقیدے میں یقین کی مختلف سطحوں
پر الگ الگ ڈھنگ سے اثر انداز ہوتے ہیں اور ایسے
عقیدوں کے ماننے کی وجوہ بھی لوگوں کے مختلف گروہوں
میں مختلف ہوتی ہیں۔

انجانے عقیدوں کی تشکیل میں عام ابلاغی ذرایع
بھی آج ایک اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ لوگ ریڈیو،
فلم اور ٹی۔وی سے متاثر ضرور ہوتے ہیں مگر اخبار اور
رسالے ان سے کہیں زیادہ موثر اور مقبول ذریعے
ہیں جو جعلی عقاید اور نام نہاد سائنسی موضوعات کی
تنقید کرنے کے بجائے انھیں سراہتے رہتے ہیں۔ ایک
عام آدمی جب معتبر اخباروں میں اڑن طشتریوں یا نامعلوم
طائری اشیا - Unidentified Flying
(objects) وغیرہ کے بارے میں پڑھتا ہے جب
موقر جریدے اسے باباؤں، یوگیوں اور سوامیوں کے
متعلق بتاتے ہیں اور جب اس کو "روحانی علاج" کی
نئی سرحدیں دکھائی جاتی ہیں تو اُن پر یقین کرنے کے
لیے اسے جواز مل جاتا ہے۔ پھر وہ اسے افواہ نہیں
سمجھتا اخبار میں چھپی ہوئی خبر مانتا ہے۔ ابلاغی ذرایع
میں اس طرح کی رپورٹنگ ایک حد تک تو سائنسی خبر نگاری
موجود نہ ہونے کی وجہ سے ہوسکتی ہے مگر اخبارات و
رسالے مخفی واقعات کے سلسلے میں عموماً غلط بیانی سے
اس لیے کام لیتے ہیں کہ ان کی بکری زیادہ ہو اور زیادہ
پیسہ کمایا جائے۔ عام ابلاغی ذرایع سے جب ان عقیدوں
کا پرچار ہوتا ہے تو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ گو اس طرح کے
خیال سمجھ میں نہیں آتے مگر معاشرے میں ان کی حیثیت
ایسی ضرور ہے کہ انھیں غیر معمولی یا معمول ماورائے

(Paranormal) سمجھا جاسکتا ہے۔ حالانکہ جن
حیران کن وقوعوں کو ہمارے ترسیلی ذرایع مصلحتاً
ماورائے معمول بتاتے ہیں اُن میں سے بیشتر کی تشریح
کسی سائنسی سبب یا فریب نظری (Illusion)
سے کی جاسکتی ہے۔ ابلاغی وسایل اور دوسرے
خارجی اثرات کے علاوہ خود ہماری نفسیاتی ساخت میں
بھی بعض ایسی کمزوریاں ہیں جو اُن عقیدوں کی پرورش
کرتی ہیں۔ ادراکی نفسیات - (Cog Psychology
(nitive یہ بتاتی ہے کہ نتیجہ اخذ کرنے کے عمل میں
انسانی ذہن خود اپنی ایسی کمزوریوں سے متاثر ہوسکتا
ہے جو انجانے عقیدوں کے علاوہ دوسرے غلط عقاید
کی تہہ میں ہوتی ہیں۔ یہ کمزوریاں آفاقی ہیں۔ فیصلہ اور
مسایل حل کرنے کے ذہنی عمل پر سائنسی تحقیق و تجزیے
کے بعد انسان کی وجدانی یا کشفی قوت تمیز - (Intuitive
reasoning) کی کوئی اچھی تصویر سامنے نہیں آئی
یہ رُخ نظر آیا کہ اگر ہمارے ذہن میں پہلے سے کچھ تعصبات
موجود ہیں تو اُن کی شہ پاکر نئے ان جانے عقیدوں کی
تشکیل آسانی سے ہوتی ہے۔ مثلاً ہم نے کوئی ایسا
خواب دیکھا جس سے ملتا جلتا حادثہ یا واقعہ حقیقی زندگی
میں پیش آیا تو ہم اپنے قیاسی جھکاو یا رجحان - (Cogni
tive Quirk) کی بنیاد پر ان دونوں میں
مماثلت کے بارے میں سوچتے بھی ہیں اور متاثر بھی
ہوتے ہیں اور ایسی مثالوں کو رد کر دیتے ہیں جو خواب و
حقیقت کے درمیان کوئی مطابقت ظاہر نہیں کرتیں اور
نہ ہی ہم یہ ماننے کے لیے تیار ہوتے ہیں کہ اس طرح
کے واقعات محض اتفاق ہیں۔ کیونکہ ہمارے خیال کے
مطابق خواب و خارج میں مماثلت کا امکان جب ہی
ہوسکتا ہے جب وجہ فوق فطری - (Supernat
ural) ہو۔

ادراکی یا ادراکی تعصب (Cognitive Bias) کی دوسری مثال یہ ہے کہ جب کسی واقعے کی توجیہ ہمارے جانے پہچانے اسباب سے نہیں ہو پاتی تو ہم اس کے لیے کوئی پُراسرار وجہ تلاش کر لیتے ہیں۔ مثلاً کئی رہائشی یا غیر رہائشی مقام منحوس و آسیب زدہ مشہور ہو جاتے ہیں۔ کوئیں باوڑیاں، حویلیاں، سنسان راستے اور پرانے قلعے وغیرہ فوق فطری شخصیتوں کا مسکن سمجھ لیے جاتے ہیں اور ان مقامات پر ہونے والے حادثات و واقعات کے لیے فطری اسباب (جیسے کسی زہریلی گیس کی موجودگی یا کچھ لوگوں کے اپنے مفاد کی خاطر ایسی حرکتیں جن سے خوف و دہشت پیدا ہو) کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے لیکن ان کے لیے کسی فوق بشری طاقت کو ذمے دار قرار دیا جائے تو ہم وجدانی طور سے فوراً مان لیتے ہیں کیونکہ اس قسم کے خیالات جیسے "خالی گھر دیو کا گھر" ذہن میں پہلے سے ڈیرا جمائے ہوئے ہیں۔ یہ کشفی میلان ان بہت سے قدرتی یا انسانی اسباب کو جو کسی نادر واقعے یا انہونی کو جنم دیتے ہیں تلاش کرنے کے بجائے یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔

جبلی عقیدوں میں یہ سختی اور اعتقاد کی پختگی ایک عام وقوعہ ہے۔ اس کٹرپن کے کئی سبب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ہماری وجدانی قوت تمیز کی غلطیاں دکھائی دینے والے واہموں کی طرح ہو سکتی ہیں۔ جیسے ریل کی پٹریاں متوازی ہوتے ہوئے بھی ہمیں کسی نقطے پر ملتی دکھائی دیتی ہیں ہمیں یہ شک ہو بھی کہ ہمارا ادراک غلطی کر رہا ہے، تب بھی وجدانی حیثیت سے غلطی ہمیں دبائے رہتی ہے اور اس وجہ سے کسی ذہنی مسئلے کا عقلی تجزیہ مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے ماحول کی بناوٹ اور اس میں ہونے والے وقوعوں کے متعلق اپنے وجدان سے کچھ نظریے قائم کر لیتے ہیں (جن کی کچھ مثالیں ہم ابھی دے چکے ہیں) اب اگر ایسے حقائق سامنے آئیں جو اُن عقیدوں کو جھٹلا رہے ہوں تو ہم اُن شہادتوں کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ جو بُت خود ہم نے بنا لیے ہیں ان پر ضرب لگے تو اپنی شخصیت بھی ٹوٹتی نظر آتی ہے۔

نفسیات کے عالموں نے تجربوں اور مشاہدوں سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہماری روزمرہ زندگی میں عام انجانے عقیدے جن میں توہمات بھی شامل ہیں دو وجوہ سے اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ اول ماحول کی غیر یقینی صورت جو ہم میں یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ صورتِ حال پر ہمارا کوئی زور و اختیار نہیں ہے۔ دوئم انجانے عقیدے یا توہم کی آسانی سے دستیابی یعنی اس کی سستی قیمت حالات کی غیر یقینی صورت بے بسی و بے چارگی کا جو احساس ہم میں پیدا کر دیتی ہے۔ انجانے عقیدے اس احساس کی نفی کرتے ہیں کیونکہ ان کو اپنا کر ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب جو بھی ہوگا ہماری بہتری کے لیے ہوگا ہماری خواہش کے مطابق ہوگا۔ اس طرح یہ عقیدے ہماری ایک شدید ذہنی و جذباتی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ ان کو ڈھونڈنے کے لیے کہیں دور نہیں جانا پڑتا اور نہ ہی یہ ہم سے تسلّی و تشفی کی کوئی خاص قیمت طلب کرتے ہیں۔

یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ ہم ایسے تمام کاموں کے لیے جن کی نوعیت خطرناک یا حاصل غیر یقینی ہے کوئی نہ کوئی توہماتی رسم ضرور ادا کرتے ہیں مثلاً ہمارے بچے روزانہ اسکول یا کالج کے لیے جاتے ہیں تو ہم اس طرف دھیان بھی نہیں دیتے کیوں کہ یہ ایک معمول ہے لیکن یہی بچے اگر وہ پڑھائی کے لیے جا رہے ہوں تو ہم فکر مند ہو جاتے ہیں اور ان کی خیر و سلامتی کے لیے کوئی نہ کوئی رسم ادا کرتے ہیں۔ کوکن کی پٹی میں رہنے والے مچھیروں کی عورتیں اکثر ایک ہاتھ میں کنگن پہنتی ہیں۔ دوسرا کنگن یعنی آدھا

سہاگ انھوں نے سمندر دیوتا کی نذر کر دیا ہے۔ کیونکہ کھلے سمندر میں ماہی گیری آج بھی خطرناک اور حاصل غیر یقینی ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس طرح کی صورتوں میں ہم کسی عقیدے کو اپنا کر اور اس کے اظہار کے لیے کوئی رسم ادا کر کے اپنے خوف اور وسوسوں سے کتنی سستی قیمت پر چھٹکارا پا لیتے ہیں! نامعلوم عقیدوں کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ روحانی علاج جیسے ٹونے ٹوٹکے، جھاڑ پھونک منتر پڑھی ہوئی کھانے پینے کی چیزیں، بدروحوں کو بھگانے کے لیے جسم کی زد و کوب وغیرہ میں سخت عقیدہ رکھنے والے بھی کسی اوجھا یا شمان یا سیانے کے پاس عموماً اس وقت جاتے ہیں، جب یا تو مادّی یعنی طبی علاج دستیاب نہیں ہوتا یا کامیاب نہیں ہوتا۔ تیر تکوں وغیرہ پر بھی زیادہ تر اسی طرح کے کیس نظر آتے ہیں۔

انجانے عقیدوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو اپنے ماننے والوں سے عقیدت کی بھاری قیمت وصول کرتی ہے۔ یہ عقیدے شیطانی، سفلی یا تانترک عملیات سے متعلق ہیں اور ان کا مقصد دوسروں کو زیر کرنا ہوتا ہے۔ یعنی یہ عقیدے بنیادی حیثیت سے مطلب پرستی اور خود غرضی پر مبنی ہیں۔ ان کے ماننے والوں کو نہ صرف جذباتی ہیجان اور خوف سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ مالی اور کبھی کبھی جانی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ مہاراشٹر کے ایک ضلع پربھنی کا ایک نہایت بھیانک واقعہ کوئی آٹھ دس سال پہلے اخباروں میں آیا تھا۔ ایک عورت نے اپنا بانجھ پن دور کرنے کے لیے تانترک عقیدوں کا سہارا لیا اور یکے بعد دیگرے گیارہ کنواری اور کم سن لڑکیوں کو مختلف مقامات سے اغوا کر کے ان کے خون کی بلی دی۔ خوش قسمتی سے پولس سراغ لگانے میں کامیاب ہوگئی اور جرم میں ملوث کئی اشخاص کو سزا ملی۔ کچھ کو عمر قید ہوئی اور غالباً دو آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ عام آدمی اس طرح کے عقیدوں کی سچائی میں یقین بھلے ہی کر لے مگر عملی حیثیت سے جہاں تک ممکن ہو وہ اُن سے دور رہتا ہے کہ انجانے عقیدوں کو ماننے کی جتنی ضرورت ہے قیمت اس سے زیادہ دینا پڑے تو وہ انھیں بھاری پتھر کی طرح چوم کر چھوڑ دیتا ہے۔

جہاں آزمائے ہوئے طریقے کام آسکتے ہیں وہاں لوگ توہمات کو بہت ہی کم مداخلت کرنے دیتے ہیں۔ مثلاً جوتش وغیرہ سے ہم اپنے لیے موزوں شریک حیات، راس آنے والا مکان، انگوٹھی کے لیے کوئی بھاگوان قیمتی پتھر جیسے ہیرا پنّا وغیرہ تو ڈھونڈتے ہیں اور کسی کام کی شروعات یا بیوپار کے لیے مناسب وقت یعنی مہورت بھی نکالتے ہیں کیونکہ ان تمام غیر یقینی صورتوں میں ہمیں کوئی اور طریقہ مطمئن نہیں کرتا مگر ہم اس وقت ستاروں پر بالکل بھروسہ نہیں کرتے جب لوگوں سے ان ہی اشیاء کے لیے مالی یا قانونی معاملہ کرتے ہیں یعنی تجرباتی عمل اور عقلی رسائی سے جہاں نتائج برآمد ہوں وہاں ہم انجانے عقیدوں کو بیچ میں نہیں لاتے۔ کیونکہ ہم سائنسی طریقۂ کار کو جس میں متبادل مفروضوں کو ٹھیک سے تولنا اور پرکھنا بھی شامل ہے اصولی اور قانونی بنا لیتے ہیں جیسے پولس کے تفتیشی کام قانون جرم و سزا اور امراض کی طبی تشخیص وغیرہ میں۔ مگر غیر یقینی یا مشتبہ حالات میں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں انجانے عقیدے پیدا ہوتے ہیں اور پھلتے پھولتے ہیں۔ ایسے ہی نامعتبر حالات کی ایک نہایت تشویش ناک صورت گذشتہ تیس پینتیس سال سے ہم اپنے اطراف بنتے اور بڑھتے دیکھ رہے ہیں۔ نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ ساری دنیا میں

ناقابل اعتبار سیاسی، معاشی اور سماجی حالات ۱۹۶۰ء سے بہت نمایاں ہو گئے ہیں۔ بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں اور سازشیں، کمزور ملکوں پر ہر طرح کے بے جا دباؤ، ایشیا میں ہر طرف جنگیں، یورپ میں اشتراکی ریاستوں کا زوال، ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک میں اپنے اندرونی تضادات اور تناؤ اور تیسری دنیا کے ممالک میں سامراج سے نجات کے بعد بھی مسائل سلجھنے کے بجائے اور الجھ جانے سے بے چینی، پراگندگی، جھنجھلاہٹ اور مایوسی نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

غیر محفوظیت کا احساس بہت زیادہ ہو جانے سے انفرادی زندگی کی اقدار بہت اہم بن گئی ہیں۔ دولت کی اہمیت یوں تو ہمیشہ سے ہے مگر آج کی قدر یہ ہے کہ اسے ناجائز طریقوں سے حاصل کرنا بھی اتنا ہی جائز ہے۔ اب امریکہ کی طرح ہمارے یہاں بھی یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ جو دولت مند ہے بس وہی عقلمند ہے۔ نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی بیکاری، نسل، ذات پات اور فرقوں کے فسادات، تشدد کی ہر طبقے میں مقبولیت، بھیانک جرائم میں بے تحاشا اضافہ اور زندگی کو ہیچ سمجھنے کا رویہ بھی وہ اسباب ہیں جو سماجی تبدیلیوں کو ہوا دے رہے ہیں۔

نفسا نفسی کے اس ماحول نے نوجوانوں میں اپنے تمدن سے بے زاری اور انحراف کی تحریکیں پیدا کر دی ہیں جو نہ صرف انفرادی فکر و عمل میں بلکہ سماجی بندھنوں سے بھی مکمل آزادی چاہتی ہیں۔ ہپی، پنک (Punk) اور اس قماش کے دوسرے رنگوں میں رنگے ہوئے لوگ مثلاً رجنیشیے، آنند مارگیے، ستیہ سائیں بابا کے چیلے وغیرہ دنیا کے بیشتر ممالک میں بڑی تعداد میں پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ نشہ آور زہریلی اشیا کے استعمال کا اپنا ہی ایک کلچر بن گیا ہے جو ہر جگہ کالجوں اور کلبوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مذکورہ حالات نے بیک وقت جمع ہو کر جس غیر یقینی ماحول کو جنم دیا ہے اس سے آفاقی سطح پر مذہبی احیاء، بنیاد پرستی، اصنام پرستی، پادری، پروہت پیر پرستی اور کرشماتی عقیدوں کو بہت فروغ ملا ہے۔ یہ تمام تحریکیں اور رجحان انجانے عقاید کے ساتھ نہ صرف زمانی اعتبار سے بلکہ اپنی ساختی خصوصیات میں بھی یکساں نظر آتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ معاشرے کے رجحانات یا تو انجانے عقیدوں کو پیدا کرتے ہیں یا اُن کی افزائش میں سب سے زیادہ مدد کرتے ہیں۔

> اِتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُومِنِ فَانَّہٗ یَنْظُرُ بِنُورِ اللّٰہِ۔
>
> مومن کی فراست سے ڈرتے رہو۔ یہ اللہ کے نور سے سب کچھ دیکھ اور سمجھ لیتا ہے۔
>
> حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

# حاملِ قرآن کی ذمہ داریاں

محمد بدیع الزماں ○

حامل قرآن ہونے کی ذمہ داریوں سے بے فکری اور بے توجہی برتنے پر ایک موقع پر تمثیلی پیرایۂ بیان میں خدا تعالیٰ نے اس طرح اظہار تاسف کیا ہے:-

"اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جارہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ (اپنی حالت پر) غور کریں۔"

[سورۃ الحشر ۵۹ - آیت ۲۱]

اس تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ قرآن جس طرح خدا کی کبریائی اور اس کے حضور بندے کی ذمہ داری و جواب دہی کو صاف صاف بیان کرتا ہے، اس کا فہم اگر پہاڑ جیسی عظیم مخلوق کو بھی نصیب ہوتا اور اسے معلوم ہوجاتا کہ اس کو کس رب قدیر کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے تو وہ بھی خوف سے کانپ اٹھتا، لیکن حیرت کے لائق ہے اس انسان کی بے حسی اور بے فکری جو قرآن کو سمجھتا ہے اور اس کے ذریعے سے حقیقتِ حال جان چکا ہے اور پھر بھی اس پر نہ کوئی خوف طاری ہوتا ہے، نہ کبھی اسے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ جو ذمہ داریاں اس پر حاملِ قرآن ہونے کی وجہ سے ڈالی گئی ہیں ان کے بارے میں وہ اپنے خدا کو کیا جواب دے گا۔

اس عظیم المرتبت کتاب کے متحمل ہونے کی ذمہ داریوں کا احساس خدا نے ایک موقع پر ان الفاظ میں بھی دلایا ہے کہ:

"پھر ہم نے اس کتاب (قرآن) کا وارث بنا دیا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے (اس وراثت کے لیے) اپنے بندوں میں سے چن لیا۔"

(سورہ فاطر ۳۵ - آیت ۳۲)

اس آیت میں "اپنے بندوں" سے مراد مسلمان ہیں جو پوری نوعِ انسانی میں اس کتاب کے وارث بننے کے مستحق پائے گئے۔ اگرچہ کتاب پیش تو کی گئی ہے سارے انسانوں کے سامنے مگر جنھوں نے آگے بڑھ کر اسے قبول کرلیا وہی اس شرف کے لیے منتخب کرلیے گئے کہ قرآن جیسی کتاب عظیم کے وارث اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے رسول عظیم کی تعلیم و ہدایت کے امین بنیں۔

○ ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، ہارون نگر، فرسٹ سیکٹر، پھلواری شریف، پٹنہ، بہار

"اپنے بندوں" میں مسلمانوں کے گروہ کو اس وراثت کا مستحق پائے جانے کی وجہ بھی خدا تعالیٰ نے فرمادی ہے۔ فرمایا گیا:

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایمان دار بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔"

[سورہ آل عمران ۳ آیت ۱۱۰]

"خیر امت" کے لقب سے نواز کر خدائے تعالیٰ نے مسلمانوں کو حامل قرآن ہونے کی ذمہ داریوں کے احساس میں اور بھی شدت پیدا کر دی ہے جس کی رو سے ان پر لازم آتا ہے کہ یہ امت محمدیؐ جسے قرآن کی وراثت سونپی گئی ہے اُن غلطیوں سے بچے جن غلطیوں کی بنا پر بنی اسرائیل کو دنیا کی امامت اور رہنمائی سے معزول کر کے اِس امت کو اس منصب پر فائز کیا گیا ہے جس کی طرف اشارہ متذکرہ بالا آیت کے آخری فقرے میں کیا گیا ہے۔

مسلمانوں کو اس عظیم کتاب کی وراثت بطور امانت سونپے جانے پر حاملِ قرآن ہونے کے باوجود سورہ "الحشر" کی آیت میں، ان کی اس ذمہ داریوں سے بعض کی بے توجہی اور غفلت برتنے کی باتوں اور "خیر امت" کے لقب سے نوازے جانے کے باوجود اپنی فضیلتوں کو نہ سمجھنے کی باتوں ہی کی طرف اقبال نے اپنے مجموعۂ کلام "بانگِ درا" کی نظم "شمع اور شاعر" میں اس امتِ مسلمہ کا دھیان مبذول کرایا ہے۔ کیونکہ ایسی باتوں کی تلقین ہر زمانے میں صاحبِ عقل و فہم کو کرتے رہنے کی تاکید خدا نے خود قرآن میں لازم قرار دی ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی
قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی! کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو
بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے
اپنی اصلیت سے ہو آگاہ، اے غافل، کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے، پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں میں مسلمانوں کو اس قرآن کا وارث تو بنا دیا مگر اس وراثت کو سونپتے وقت اسے یہ احساس تھا کہ سب کے سب مسلمان ایک ہی طرح کے نہیں ہیں۔ اس لیے سورہ فاطر ۳۵ کی آیت ۳۲ (جس کا پہلا فقرہ اس مضمون کے شروع میں گزر چکا ہے) میں مزید فرمایا گیا ہے کہ:

"اب کوئی تو ان میں سے (یعنی اپنے

بندوں میں جنہیں قرآن کی وراثت سونپی گئی
ہے) اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے اور کوئی
بیچ کی راس اور کوئی اللہ کے اذن سے
نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے' یہی
بہت بڑا فضل ہے۔"

اس آیت میں روز حشر کو پیش نظر رکھ کر ہی خدا تعالیٰ نے اس وراثت کے صحیح محاسبہ کے لیے قبل ہی سے علم النفس کے تحت حامل قرآن ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کو تین ذیلی طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔

اس آیت کی رو سے پہلا گروہ تو اُن مسلمانوں کا ہے جو اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سچے دل سے اللہ کی کتاب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان داری کے ساتھ اللہ کا رسول تو مانتے ہیں مگر عملاً دنیا میں اُن کا رویہ زندگی کی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی پیروی کا صرف یہی نہیں کہ حق ادا نہیں کرتا' بہت سے معنوں میں نفی کرتا ہے۔ ایسے لوگ خدائی نگاہ میں مومن ضرور ہیں مگر گناہ گار ہیں۔ مجرم ہیں مگر باغی نہیں۔ ضعیف الایمان ہیں مگر منافق اور دل و دماغ سے کافر نہیں ہیں۔ تینوں درجات میں سے اس درجے کے اہل ایمان کا ذکر سب سے پہلے اس لیے کیا گیا ہے کہ تعداد کے لحاظ سے اُمت میں کثرت انہی کی ہے۔

دوسرا گروہ "بیچ کی راس" والوں کا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کی وراثت کا حق کم و بیش ادا کرتے ہیں مگر پوری طرح نہیں۔ فرماں بردار ہیں اور خطاکار بھی۔ اُن کی زندگی اچھے اور برے اعمال دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہ تعداد میں پہلے گروہ سے کم مگر تیسرے گروہ سے زیادہ ہیں۔ اس لیے اُن کو دوسرے نمبر پر رکھا گیا ہے۔

تیسرا گروہ اُن کا ہے جو نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں۔ یہ وارثین کتاب میں صف اول کے لوگ ہیں۔ یہی دراصل اس وراثت کا حق ادا کرنے والے ہیں یہ اتباع کتاب و سنت میں بھی پیش پیش ہیں۔ خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں بھی آگے ہیں۔ دین حق کی خاطر قربانیاں کرنے میں بھی پیش قدمی کرتے اور بھلائی کے کاموں میں بھی۔ ان کو وراثت کا حق ادا کرنے کے معاملہ میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔

سورہ فاطر ۳۵ کی اس آیت ۳۲ کی تفسیر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ

"جو لوگ نیکیوں میں سبقت لے گئے
ہیں وہ جنت میں کسی حساب کے بغیر داخل
ہوں گے اور جو بیچ کی راس رہے ہیں اُن
سے محاسبہ ہوگا مگر ہلکا محاسبہ۔ رہے
وہ لوگ جنہوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا
ہے تو وہ محشر کے پورے طویل عرصے میں
روک رکھے جائیں گے۔ پھر انہی کو اللہ اپنی
رحمت میں لے لے گا اور یہی لوگ کہیں
گے کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم
سے غم دور کر دیا۔"

(امام احمدؒ، ابن جریرؒ، ابن ابی حاتمؒ،
طبرانی، بیہقی)

خدا کی نظر میں "مصلح" صرف وہ ہے جو قرآن اور نماز کو اپنی زندگی میں شامل کر چکا ہو۔ ایمان کی علامت کے معاملے میں ان دونوں چیزوں کی بنیادی اہمیت خود قرآن سے ثابت ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

"جو لوگ کتاب کی پابندی کرتے ہیں
اور جنہوں نے نماز قائم کر رکھی ہے یقیناً
ایسے نیک کردار لوگوں کا اجر ہم ضائع

نہیں کریں گے۔"

(سورۃ الاعراف، ۔ آیت ۱۷۰)

ـسرے مقام پر یہی بات حکم کے انداز میں کہی گئی ہے:

" (اے نبیؐ) تلاوت کرو اس کتاب کی
جو تمہاری طرف وحی کے ذریعے سے بھیجی
گئی ہے اور نماز قایم کرو۔"

(سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۴۵)

مگر قرآن اور نماز کو پانے کا مطلب کسی لفظی مجموعے ـی ظاہری ڈھانچے کو پالینا نہیں، بلکہ اس سے مراد ایک ـم حقیقت کو پانا ہے جو آدمی کے وجود پر چھا جاتی ہے ـ جو اس کی پوری زندگی بن جاتی ہے۔ حامل قرآن بنانے ـ اللہ تعالیٰ کو جو چیز مطلوب ہے وہ محض الفاظِ قرآن کی ـت نہیں بلکہ "تلاوتِ حق" ہے۔ جیسا کہ ارشاد ـے:

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے،
وہ اُسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے
کا حق ہے۔ وہ اس (قرآن) پر سچے دل
سے ایمان لے آتے ہیں اور جو اس کے ساتھ
کفر کا رویہ اختیار کریں، وہی اصل میں نقصان
اٹھانے والے ہیں۔"

(سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۲۱)

یہ "تلاوتِ حق" جس کو حاصل ہو گئی، وہی دراصل ـا قرآن ہے اور وہی صحیح معنوں میں ایمان لانے ـہے۔ حقیقت کو پانے والا صرف وہ ہے جس ـپنے دل کی کتاب پر اس کو لکھا ہوا پایا ہے۔ جس ـرف لفظی تشریحات کے ذریعے جانا ہے، اس ـقیقت کو نہیں پایا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

" دراصل یہ روشن نشانیاں (قرآنی
آیات) ہیں اُن لوگوں کے دلوں میں جنہیں
علم بخشا گیا ہے اور ہماری آیات کا انکار
نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں۔"

(سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۴۹)

اقبال نے ان ہی سارے معنوں میں "تلاوتِ قرآن" کو "تلاوتِ حق" کے معنوں میں پڑھنے کی تاکید اس شعر میں کی ہے ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازیؔ نہ صاحبِ کشّاف

(بالِ جبریل : غزل ۶۰)

قرآن اپنی دعوت سے انسان کے گروہ میں سے اُن لوگوں کو نہیں سمیٹتا جو دنیا پرست اور خواہش نفس کے بندے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو اپنے گرد جمع کرتا ہے جن کی نظرِ حیات دنیا کی تنگ سرحدوں سے آگے تک جاتی ہے اور حامل قرآن ہونے کی وجہ سے جو انقلاب اُن کی زندگی میں رونما ہوتا ہے اس کی سب سے زیادہ نمایاں علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان اپنی خدا پرستی کے اعتبار سے ممتاز رہتے ہیں۔

حاملِ قرآن بن کر اس پر عامل بہ عمل ہونے والوں اور اس سے منہ موڑنے والوں کو علی الترتیب اس کے فوائد اور نقصانات کی بھی آگاہی ایک موقع پر اس طرح دی گئی ہے:

"ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں
وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں
کے لیے تو شفا اور رحمت ہے مگر ظالموں
کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں
اضافہ نہیں کرتا۔"

(سورہ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۸۲)

یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت مختصر سے بلیغ جملے میں بیان فرمائی ہے کہ:

"قرآن یا تو تیرے حق میں حجت ہے یا پھر
تیرے خلاف حجت۔"

حامل قرآن ہونے کی ذمہ داریاں صرف اپنی ذات کے قرآن پا لینے پر ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے واجبات کو دوسروں کو بھی بتائے جانے کی ذمہ داری ان پر عاید کی گئی ہے۔ فرمایا:

"تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے، وہی فلاح پائیں گے۔"
(سورہ آل عمران ۳۔ آیت ۱۰۴)

حجۃ الوداع ۱۰ھ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میدان عرفات میں فرمایا:

"اے لوگو! میں تم میں وہ چیز چھوڑ جاتا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوط پکڑ لوگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ وہ قران ہے اللہ کی کتاب ....."

مومن کی پہچان صرف "حامل قرآن" ہونے ہی میں مضمر ہے۔ "حامل قرآن" کسے کہتے ہیں، اس کی تفسیر ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں ملتی ہے:

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس طریقے کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔"

حامل قرآن ہونے کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ شیطان جس چیز کے درپے رہتا ہے وہ یہی ہے کہ ابن آدم قرآن سے ہدایت حاصل نہ کر سکے۔ اسی لیے سورۃ النحل ۱۶ کی آیت ۹۸ میں قرآن پڑھتے وقت "نعوذ" پڑھ کر شیطان رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لینے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ کیونکہ ابلیس کو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں خدا کے حضور سے جب نکل جانے کا حکم ہوا تو اس نے قسم کھائی کہ وہ کبھی انسان کو "صراط مستقیم" پر نہ چلنے دے گا اور یہ "صراط مستقیم" صرف "تلاوت حق" سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ جن کی مادری زبان عربی نہیں انہیں بغیر ترجمہ کے ساتھ پڑھے صرف لفظی مجموعوں کو پڑھ لینے سے کبھی حاصل نہیں ہوتی

شیطان کے اسی عزم راسخ کے پیش نظر اقبال نے اپنے مجموعہ کلام "ارمغان حجاز" کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں "حامل قرآن" کو متنبہ کیا ہے کہ وہ اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہر وقت اس کے اس عزم کو سامنے رکھیں۔ کیونکہ اس نے خدا سے قیامت تک کے لیے لوگوں کو "صراط مستقیم" سے ہٹائے رکھنے کی مہلت لے لی ہے اور وہ ابھی تک پُر امید ہے۔ چنانچہ جب اس مجلس میں اس کے مشیروں نے اپنی گرفت ڈھیلی پڑتی جانے کی بات کہی تو ابلیس نے پورے اعتماد سے ان کے تفکر کو یہ کہہ کر دور کیا کہ

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں
عصر حاضر کے تقاضوں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں
الحذر آئین پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

# دیو پیکر ایٹم شکن

عظیم قدوائی ○

آپ کا کیا خیال ہے۔ ایک غیر سائنسی ذہن کسی ایسی مشین کی جسامت کا کیا اندازہ قایم کر سکتا ہے جو تجربات کے لیے استعمال ہو؟ اس کے خیال میں ایسی مشین کتنی بڑی ہو سکتی ہے؟ دو سو میٹر لمبی؟ ایک ہزار میٹر چوڑی خیر وہ جتنی بڑی مشین کا بھی خیال قایم کر سکتا ہے کر لے آج کی حقیقی مشین پھر بھی اس کی خیالی مشین کے سامنے ایک دیو پیکر عفریت ہی لگے گی، اس لیے کہ زیادہ عرصے پہلے نہیں پچھلے ہی سال کیلی فورنیا امریکہ میں "سٹین فورڈ فلٹی اسرا ئیپے" نے کام شروع کیا ہے جو چار ہزار آٹھ سو میٹر طویل مشین ہے۔ یہ بھی تعجب کی بات نہیں کہ اس پر دو سو کروڑ یعنی دو ارب روپیے خرچ کیے گئے ہیں۔

یورپی مراکز برائے نیوکلیائی تحقیق "سرن" نے ایسی ہی ایک مشین جنیوا کے پاس نصب کر رکھی ہے۔ اس مشین میں استعمال ہونے والے مقناطیسی گھیرے کی لمبائی سات ہزار میٹر ہے۔ مشین کا نام "سپر پروٹون شکن" ہے اور اس پر سولہ کروڑ ڈالر خرچ ہوئے ہیں۔ اس مشین نے ۱۹۷۷ء میں کام کرنا شروع کیا اور اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے اس بات کا براہ راست ثبوت فراہم کیا کہ پروفیسر عبدالسلام کا پیش کردہ نظریۂ وحدانیت درست ہے۔

اسی پر بس نہیں اس سے بھی بڑی ایک مشین "سرن" میں قایم کی جا رہی ہے جس کا گھیرا ۲۷ ہزار میٹر ہوگا اور قطر دس ہزار میٹر۔ اس کے اخراجات کا تخمینہ ایک ارب ڈالر لگایا گیا ہے اور اسے فرانسیسی گرڈ سے دو سو پچاس میگا واٹ بجلی فراہم کی جائے گی۔ امریکی طبیعات دانوں کے خیالات یورپیوں سے بھی اونچے ہیں۔ وہ ایک ایسا "سپر کنڈکٹر سپر کولائیڈر" بنا رہے ہیں جس کا گھیرا تو ایک لاکھ ساٹھ ہزار میٹر ہوگا اور اس پر کوئی چار تا چھ ارب ڈالر کا خرچہ آئے گا۔

مستقبل کی ان دیو پیکر ایٹم شکن مشینوں میں وسعت کا مقابلہ جاری رہے گا۔ موجودہ وقت میں بھی اس قسم کی کئی بہت بڑی بڑی مشینیں دنیا کے مختلف حصوں میں کام کر رہی ہیں، جن میں روس، مغربی جرمنی، امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے ممالک شامل ہیں۔ ان سب مشینوں کا بنیادی مقصد بہرحال بڑائی کا مقابلہ نہیں بلکہ مادے کی اصل ساخت کو دریافت کرنا ہے۔

---

○ معرفت ماہنامہ طالب علم۔ کراچی

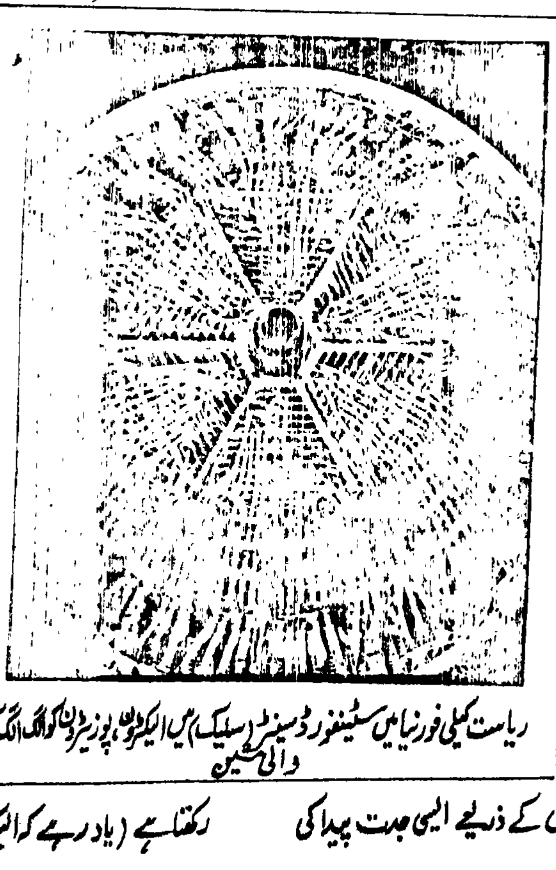
یقیناً آپ کے ذہن میں یہ سوال اُبھرا ہوگا کہ ٹھیک ہے یہ مشینیں بہت بڑی بڑی ہیں مگر ہیں کیا بلا؟ اور ان کی ضرورت کیا ہے۔

ان مشینوں کو اسراعیے کہا جاتا ہے اور یہ کسی بھی نیوکلیائی یا ایٹمی ذرے میں اتنا زیادہ اسراع پیدا کر سکتی ہیں کہ وہ تقریباً روشنی کی رفتار سے حرکت کرنے لگتا ہے۔ ایسا کوئی ذرہ جب بہت زیادہ معیار قوت کے ساتھ حرکت کرتا ہوا اپنے نشانے سے جا ٹکراتا ہے تو مختلف قسم کے ذرّات کی ایسی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں جن کا مطالعہ مادے کی بنیادی ساخت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ذرّات کو اتنا زیادہ اسراع ان جھٹکوں سے ملتا ہے جو اسراعیے کی ہزاروں میٹر طویل سرنگوں میں مقناطیسی میدان کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

اسراعیے کے عمل کو مزید وضاحت سے سمجھنے کے لیے آپ اس مثال سے مدد لیجیے کہ سرن کا سات ہزار میٹر کا مقناطیسی حلقہ ہزاروں مقناطیسی نظاموں پر مشتمل ہے۔ ان مقناطیسی نظاموں کی وجہ سے پروٹان ذرّات لمحہ بہ لمحہ زیادہ سے زیادہ رفتار حاصل کرتے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ ایک ایسی رفتار حاصل کر لیتے ہیں، کی رفتار کا ۹۹.۹۹۹ فی صد ہے۔ دو تجرباتی سائنسدانوں کی ٹیم نے تو انہی مشینوں کے ذریعے ایسی جدت پیدا کی

کہ ان کو ۱۹۸۴ء میں طبیعیات کا نوبل انعام مل گیا۔ ان کے نام کارلو روبیا اٹلی اور وان میر ہالینڈ ہیں۔ انھوں نے اسراعیے کی مدد سے ضد پروٹان ذرّات کو توانائی کی یکساں مقدار کے ساتھ سفر کرایا۔ ضد پروٹان ایک سمت سے اور پروٹان دوسری سمت سے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ روانہ ہوئے اور باہم ٹکرا گئے۔ اس تصادم کے بہت سے نتائج میں سے اہم ترین یہ ہے کہ ڈبلیو اور زیڈ ذرّات جن کی موجودگی مشکوک تھی دریافت ہو گئے اور اس سے پروفیسر عبدالسلام کے نظریۂ وحدانیت پر ایک تصدیقی مہر ثبت ہو گئی۔ پروفیسر عبدالسلام کے نظریہ وحدانیت میں ان ذرّات کی موجودگی کا انکشاف کیا گیا تھا۔

سرن کے اسراعیے میں پروٹان کی توانائی چار سو پچاس گیگا الیکٹرون وولٹ تک پہنچ سکتی ہے (ایک گیگا الیکٹرون وولٹ، ایک ارب الیکٹرون وولٹ) لیکن اس مشین کی مدد سے ڈبلیو اور زیڈ ذرّات کی توانائی پیدا نہیں ہو سکتی جب کہ پروٹان کی ضد پروٹان کے ساتھ تصادم کے دوران یہ ممکن ہے۔ ضد پروٹان ایک ایسا ذرہ ہوتا ہے جو پروٹان جتنی کمیت رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ پروٹان کے مثبت بار جتنا منفی بار بھی رکھتا ہے (یاد رہے کہ الیکٹرون بھی منفی بار تو رکھتا ہے لیکن



ریاست کیلی فورنیا میں سٹینفورڈ سینٹر (سلیک) میں الیکٹرون، پوزیٹرون کو الگ الگ کرنے والی مشین

اس کی کمیت پروٹان کے مقابلے میں بے حد کم ہوتی ہے)
۱۹۸۷ء میں چار ہزار آٹھ سو میٹر طویل جس اسراعی مشین نے کام شروع کیا ہے وہ اب تک بننے والی ایٹم شکن مشینوں سے قدرے مختلف ہے۔ اس میں پروٹان کے بجائے الیکٹرون کو اسراع دیا جاتا ہے اور جس طرح پروٹان کو اس کے ضد پروٹان سے ٹکرایا گیا تھا اب وہاں الیکٹران اور اس کے ضد پوزیٹران کا تصادم کرایا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ کیلی فورنیا امریکہ میں نصب یہ مشین جو دیکھنے میں ٹینس کورٹ جیسا دیو لگتی ہے، زیڈ ذرّات کو کثرت سے پیدا کر سکے گی اس طرح امریکی طبیعات دان یورپی طبیعات دانوں سے آگے بڑھ جائیں گے۔

یورپی بھی امریکیوں سے ہار ماننے والے نہیں ہیں چنانچہ سرن یورپ میں ایک طاقت ور ایٹم شکن مشین بنا رہا ہے جس میں الیکٹرون پوزیٹران کا تصادم انجام پائے گا۔ یہ مشین زیر زمین ہوگی اور کوئی تیس ہزار میٹر رقبے پر محیط ہوگی۔ امید ہے کہ یہ اگلے سال تک مکمل ہو جائے گی۔ اس کے اندر موجود ایک شعاع کی توانائی ایک سو تیس گیگا الیکٹرون وولٹ ہوگی جب کہ دو شعاعوں کے ملنے پر مجموعی توانائی دو سو ساٹھ گیگا الیکٹرون وولٹ ہو جائے گی کارکردگی کے لحاظ سے یہ امریکہ کی ایسی مشین سے کئی گنا طاقت ور ہوگی۔

ہمبرگ میں جرمنی کی ایسی ہی مشین کا نام ہیرا ہے اور اس میں ایک شعاع کی توانائی تقریباً ستر گیگا الیکٹرون وولٹ ہوتی ہے۔ یہ مشین اب اپنی کارکردگی کے لحاظ سے کوسوں پیچھے رہ گئی ہے حالانکہ ابھی چند برس پہلے تک اسے ایٹم شکن مشینوں میں مرکزی مقام حاصل تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ قوموں یا طاقتوں کے گروپوں میں انفرادی اجتماعی ہر سطح پر ایک ایسی دوڑ جاری ہے جس میں شامل ہر ملک اپنے طبیعات دانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ طاقت ور ایٹم شکن مشین بنانا چاہتا ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں یہ اعزاز روس کے ڈبنا مرکز کو حاصل تھا۔ پھر یہ اعزاز امریکہ کی فرمی لیب نے حاصل کر لیا اور یوں یہ ایک دوسرے کو منتقل ہوتا جا رہا ہے۔ دوڑ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ یورپ نے بطور خاص اسی مقصد کے لیے سرن کا ادارہ قائم کیا ہے جس کا بجٹ ہر سال بڑھ رہا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر دنیا بھر کے طبیعات دانوں میں زیادہ سے زیادہ توانائی کے ایٹمی ذرات حاصل کرنے کا جنون کیوں بڑھ رہا ہے؟ اس کا ایک سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ ایٹمی ذرّے کی توانائی جتنی زیادہ ہوگی اس کی مدد سے مادے کی اتنی زیادہ باریکی دریافت ہو سکے گی۔ مثال کے طور پر پروٹان اور ضد پروٹان کو ٹکرانے کے لیے پہلے موجود شدہ توانائی کو دوگنا کرنا درکار تھا۔ اگر توانائی کو دوگنا نہیں کیا جا سکتا تو یہ تصادم ممکن نہ ہوتا اور تصادم ممکن نہ ہوتا تو نظریۂ وحدانیت کی تصدیق و تردید کا معاملہ ششوپنج میں ہی پڑا رہتا۔ سرن ہی کی ایٹم شکن مشین کی مدد سے چھوٹا کوارک ذرہ بھی دریافت کیا گیا ہے۔ کوئی دو دہائی پہلے پروٹان کو بنیادی ذرّہ سمجھا جاتا تھا۔ خیال تھا کہ ایٹم کے اندر یہی سب سے چھوٹی اکائی ہے اور ناقابلِ تقسیم ہے لیکن پھر یکے بعد دیگرے تجرباتی نتائج آنے لگے کہ پروٹان اور نیوٹران خود بھی بنیاد نہیں ہیں بلکہ یہ بھی اور بنیادی ذرّوں سے تشکیل پاتے ہیں۔ ان ذیلی نیوکلیائی ذرّات کو کوارک کا نام دیا گیا ہے۔

کوارک کی موجودگی کی ایک اور دلیل بھی ہے کہ ایٹم شکن مشینوں میں مشاہدہ ہونے والے کچھ مظاہر کی وضاحت کوارک کی بنیاد پر ہی ہو سکی۔

چنانچہ کوارک تحقیق کا موضوع بن گئے۔ اس تحقیق کے نتیجہ میں ۱۹۸۳ء تک پانچ کوارک دریافت ہو چکے تھے۔ جب کہ ایک چھٹا کوارک پروفیسر عبدالسلام اور بعض دیگر نظریاتی طبیعات داں اپنی ذہنی صلاحیت اور ریاضیاتی نتائج کی بنا پر تو سامنے لا رہے تھے لیکن تجربات خاموش تھے۔ ۱۹۸۴ء میں اسے بھی دریافت کر لیا گیا اور سمجھا گیا کہ بات مکمل ہو گئی ہے (بعد میں کوارک کے بھی دو بنیادی اجزا ٹاپ کوارک اور بوٹم کوارک دریافت کر لیے گئے۔

کوارک کے ضمن میں ایک دشواری یہ ہے کہ یہ ذرات پروٹان اور نیوٹران کے اندر مستقل قید رہتے ہیں۔ اس لیے ان کو الگ حیثیت میں شناخت کرنا کافی مشکل ہے۔ ان کے وجود کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جاسکتا ہے اس کی بنیاد وہ عملیات فراہم کرتے ہیں جو ایٹم شکن مشینوں میں ہوتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ طبیعات پچھلی تین صدیوں سے بار بار نئے سرے سے لکھی جا رہی ہے۔ کیونکہ ہر دہائی میں ایٹم شکن مشینیں یعنی اسراعیے کوئی نہ کوئی انوکھی دریافت سامنے لا رہے ہیں۔ کسی پیاز کی طرح مادے کو مسلسل تہہ بہ تہہ چھیلا جا رہا ہے۔ پھر بھی اس کا گودا اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے کہ ۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ہماری تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ تعلیمی پسماندگی اور خصوصیت سے غلط اور ناقص تعلیم ساری قوم کا مسئلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قوم اس وقت جس بحران سے گزر رہی ہے اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ قوم نے اپنے تعلیمی نظام کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔

پروفیسر عبدالسلام

# ضیق النفس

الوسعد ★

دنیا کی علمی تاریخ کا اگر دیانت داری اور غیر جانب داری سے مطالعہ کیا جائے تو اس اعتراف میں کسی قسم کا تکلف نہیں کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کا حصہ بھی علمی افق کے وسیع کرنے میں کم نہیں ہے۔ بلکہ بعض میدان میں مسلمانوں کو اولیت و امتیاز کا درجہ بھی حاصل ہے۔ میڈیکل سائنس میں مسلم اطبا کے کارناموں کو علم کی دنیا بڑی قدر و فخر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس سلسلہ کی بہت ساری کتابیں یورپ میں داخل نصاب رہی ہیں۔ مثلاً ابوالقاسم زہراوی کی "کتاب التصریف" فن جراحت پر ایک مستند و معتبر تصنیف ہے جس میں اس نے پہلی مرتبہ آلات جراحت کے سلسلہ میں بالتصویر معلومات فراہم کی ہیں۔ قدما میں زکریا رازی کی عبقریت اور دقتِ نظر بے حد متاثر کرتی ہے۔ اس نے فنِ طب کو کیلئے جتنا Contribution کیا ہے اس کی نظیر طب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ رازی کو بعض اعتبار سے جو مرتبہ فنِ طب کی ترویج و ترقی میں حاصل ہے شاید وہ مقام قدما میں کسی کو حاصل نہیں ہے۔ معالجاتی اور فنی نقطۂ نظر سے رازی نے طب کے رازہائے بستہ کی عقدہ کشائی جس ذوق نظر اور نظریاتی بصیرت کے ساتھ کی ہے۔ اس کی مثال پورے ذخیرے میں نہیں ملتی۔ دور جدید میں اسپتال کے جو معروف طریقے .O.P.D. I.P.D وغیرہ رائج ہیں۔ وہ سب رازی کے متعین کردہ اصولوں ہی سے مستنبط ہیں۔ الحاوی فی الطب کو انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب بہر حال اتنی جامع کمالات ہے کہ اس پر تحقیق و ترجمہ و ترتیب اور تہذیب کی سخت ضرورت تھی۔ متاخرین میں جو ناقدین فن ہیں انھوں نے الحاوی پر تحقیق کی طرف توجہ اب تک نہیں فرمائی ہے۔ یہ ایک فنی اور علمی زوال کی علامت ہے کہ ایسی تصنیف سے اغماض برتا جا رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ معتبر نسخہ دستیاب نہیں ہے لیکن تنقید و تنقیح کی دنیا میں ایسے کاموں کے لیے ایک ٹیم تو کیا ایک ادارہ قایم کرکے کام ہونا چاہیے تھا۔ اسی کتاب میں رازی نے امراض دمہ کے بیان میں ضیق النفس اور دمہ پر بھی ماہیت، تعریف، اسباب، علامات اور علاج و معالجہ پر بڑی محققانہ بحث کی ہے۔ یہ بحث غیر مدون ہے۔ ذیل میں اس کی ترتیب و تہذیب کی ایک معمولی سی کوشش کی جا رہی ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ رازی نے اپنے مآخذ و مصادر کی بڑے واضح لفظوں میں نشان دہی کی ہے اور اپنی رائے کو غالباً "ولی" کہہ کر محفوظ کر دیا ہے۔ یہ

---

★ ریسرچ اسکالر شعبۂ معالجات، اجمل خاں طبیہ کالج، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

المیہ ضرور ہے کہ رازی کے حوالہ جات دستیاب نہیں ہیں جس سے فن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے ۔

## ماہیت و تعریف

رازی کا بیان ہے کہ جو شخص حالت سکون میں ہو اور اسے بخار بھی نہ ہو اور اسے نفس متواتر کا عارضہ ہو تو اسے دمہ کا مریض سمجھنا چاہیے ۔ اس میں حالت سکون اور جسم کی طبعی حالت کی قید کے ساتھ نفس متواتر کی کیفیت کو ربو یا دمہ سے رازی تعبیر کرتا ہے ۔

"ومن عرض له ان یتنفس تنفسا
متواترا من غیر حرکۃ ولا حمی فان
بہ ربو"[1]

نفس متواتر کی تعریف میں رازی نے مزید وضاحت نہیں کی ہے ۔ البتہ ابن رشد نے کلیات طب میں اسے بالکل واضح کر دیا ہے کہ

"سانس یعنی دخول و خروج ہوا کے درمیان
اگر وقفہ کم ہو جائے تو اسے نفس متواتر کہتے
ہیں اور یہی وقفہ طویل ہو جائے تو نفس
متفاوت کہتے ہیں"[2]

ظاہر ہے تواتر و سرعت کی کیفیت ہمیشہ دمہ کے مریض میں پائی جاتی ہے ۔ رازی کے بعد جن اطباء نے بھی دمہ کی تعریف میں خامہ فرسائی فرمائی ہے، اس مذکورہ بحث کے حصار سے نکل نہیں سکے ہیں ۔ مثلاً ابن سینا جب یہ لکھتا ہے کہ

"الربو علۃ ردیئۃ لا یبعد الوداع
معہا ابداً من تنفس متواتر مثل
النفس الذی یحدث له المخنوق او
المکدود"[3]

تو وہ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ اسی بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اس طرح کا مریض نفس متواتر کے لیے حالت استراحت میں بھی مجبور ہوتا ہے جیسے کہ مخنوق یا تھکا ہوا شخص ۔ کامل الصناعہ میں مجوسی اور فردوس الحکمۃ میں ابو الحسن طبری بھی رازی کا تتبع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

## اسباب

۱۔ انصباب نزلہ ۔ سینہ میں گرانی کے ساتھ اگر سینہ کی طرف یکبارگی نزلے کا کثرت سے انصباب ہو یا اعضائے مجاورہ سے انصباب ہو تو یہ تنگی تنفس پیدا کرتا ہے ۔

۲۔ قصبۃ الریہ کی شاخوں کا اخلاط سے پُر ہونا ۔

۳۔ پھیپھڑے کے گرد قیح (پیپ) کا اجتماع یا خون کا امتلاء ان دونوں اسباب کی وجہ سے تنگی تنفس اس لیے پیدا ہو جاتی ہے کہ ریہ بقدر ضرورت کشادہ نہیں ہو پاتا ہے ۔ اگر یہ دونوں اسباب کارفرما نہیں ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ تنگی و دمہ کا سبب اخلاط بلغمیہ ہیں ۔

۴۔ ورم ریہ جو کہ دبیلہ و پھوڑے کی جنس سے ہو ۔

۵۔ قصبۃ الریہ میں کوئی ورم آ جائے جس سے گزرگاہ ہوا میں تنگی پیدا ہو جائے ۔

۶۔ ورم کو آگے ایک جگہ رازی اسی بحث میں سمیٹتے ہوئے رقم طراز ہے کہ:

"ضیق النفس یدل علی ثلاث
علل اما علی ورم حار حادث
من الدم . وا ما لضیق مجاری
النفس وا ما لضعف القوۃ
النفسیہ"[4]

(ضیق النفس تین اسباب میں منحصر کر دیا جاتا تھے ۔ خون کی وجہ سے ورم حار

پیدا ہو جائے یا سانس کی نالیاں تنگ ہو جائیں
یا سانس لینے میں معاون قوت کمزور
ہو جائے]۔

اسباب کی یہ درجہ بندی اس قدر جامع ومانع ہے کہ خود رازی بھی جب تنگیٔ تنفس کی بحث کو آگے بڑھاتا ہے تو اسی درجہ بندی کے لحاظ سے اس کا سمجھنا بڑا آسان ہو جاتا ہے۔

۷۔ وہ تنگیٔ تنفس جس میں پوری شعوری کوشش ([illegible]) کے ساتھ سانس لینے کی ضرورت پڑتی ہے اس کا تذکرہ بھی بڑے واضح انداز میں رازی کرتا ہے

ا۔ انسان کو شدید محنت کرنی پڑے
ب قلب پر حرارت کا غلبہ ہو جائے۔
ج مجاری تنفس میں سدہ پیدا ہو جائے
د۔ مجاری تنفس میں ورم پیدا ہو جائے۔
ہ۔ عضلات کی قوت کمزور ہو جائے۔

ان اسباب کو مدنظر رکھنے کے بعد متاخرین کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو رازی کی دقت نظر اور وسعت مطالعہ کی داد دینی پڑتی ہے۔

**علامات:**

رازی نے علامات کو بلحاظ اسباب تقسیم کر دیا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ اگر قصبۃ الرئیہ میں ورم کی وجہ سے تنگی پیدا ہو گئی ہے تو ہوا کا دخول فوری طور پر (فطری مدت میں) نہیں ہوگا نتیجہ کے طور پر استنشاق ہوا کے وقت زفرات (زفیر صوتی) پائی جائیں گی۔

۲۔ اور اگر خراج کی وجہ سے ضیق ہوگی تو بخار کا پایا جانا لازمی ہوگا۔

۳۔ سبب اگر قصبۃ الرئیہ میں ہے تو اس کے ساتھ نفث بھی ہوگا جو سعال پر منتج ہوگا۔ اور اگر سینہ میں خراج سبب ہے تو دبلانے سے سینے میں درد ہوگا۔

۴۔ رئہ کے ارد گرد اگر اخلاط کا اجتماع ہو جائے تو ایک مدت کے بعد نفث کی ابتدا ہوگی مریض پہلو بدلنے میں گرانی محسوس کرے گا۔

۵۔ اگر ورم حار سبب ہے تو نبض کا کیرکٹر بدل جائے گا۔ تنفس میں عظم، سینہ وغیرہ پر سرخی شدت عطش اور ہوائے بارد کی طرف میلان بڑھ جائے گا۔

۶۔ آلات تنفس میں تنگی پیدا ہونے کی صورتوں میں علامات کی تفصیل رازی نے بڑی باریک بینی سے بیان کی ہے۔ لکھتا ہے کہ:

ا۔ اگر ضیق حلق میں ہو تو مقامات پر حرارت پائی جائے گی۔
ب اگر حنجرہ میں تنگی ہے تو یہ خناق پر دلالت کرے گی۔
ج اگر سینے میں ضیق ہے تو ہلکا سا درد ہوگا۔
د۔ اگر رئیہ کے لحم میں ضیق ہے تو گرانی اور تناؤ ہوگا اور اگر اس کے غضاریف میں ہے تو ہلکا سا درد ہوگا جس کے بعد کھانسی ہوگی۔
ہ۔ اگر نفس ریہ میں تنگی ہے تو بذریعہ سانس ہوائے حار کے خروج کی وجہ سے تنفس سریع متواتر ہوگا۔

**اصول علاج:** رازی چونکہ معالجات کا آدمی

ہے اس لیے اس نے علاج پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ اپنے ماخذ کے حوالے سے وہ جالینوس وغیرہ کے اقوال کی نقل کرنے کے بعد اپنی رائے کو قلم بند کرتا ہے۔ اس کے بیان کردہ علاج (مرکبات و مفردات) کی تفصیل تو ممکن نہیں ہے البتہ اصول علاج کی طرف اشارے کی ادنیٰ سی کوشش کی جا رہی ہے۔

۱۔ ادویہ مقطعہ:
اگر ربو کا سبب خلط لزج ہے تو ایسی دوائیں دی جائیں جو اس کو کاٹنے اور اس کو ختم کرنے والی ہوں۔

۲۔ ادویہ ملطفہ و مجففہ
اگر ضیق کا سبب خراجات ہوں تو ملطف ادویہ دیں اور جن میں خشک کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ اس لیے کہ خراجات میں اسی کی ضرورت پڑتی ہے۔

۳۔ جالینوس کے قول کی تائید کرتے ہوئے رازی کہتا ہے کہ اخلاط خلا کے اخراج کی جو تدبیر جالینوس نے بیان کی ہے اس پر عمل کیا جانا چاہیے۔ یعنی یہ کہ خلط غلیظ کو رقیق اور خلط رقیق کو غلیظ بنا کر (نضج) اسے قابل اخراج بنایا جائے۔ اخراج کے لیے ضروری ہے کہ کھانسی بھی آئے۔ اسی لیے رازی بوقت ضرورت (expectoration) کے لیے کھانسی پیدا کرنا (تہیج سعال) کا بھی مشورہ دیتا ہے۔

۴ مملل اور رام و مسہل ادویہ کا بھی مشورہ رازی نسخہ کی ترتیب و ترکیب استعمال کے ساتھ دیتا ہے۔ ان نسخوں کی ترتیب و تدوین ایک الگ اور اہم کام ہے جسے پوری دقت نظر سے کیا جانا چاہیے۔

# حوالہ جات


۱۔ ابوبکر محمد بن زکریا رازی الطبیب۔ کتاب الحاوی فی الطب جزو رابع فی امراض الریہ۔ طبع اول ۱۹۵۷ء۔ ص ۲

۲۔ ابن رشد۔ کتاب الکلیات۔ سی۔ سی۔ آر۔ یو۔ ایم۔ اردو ترجمہ ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۶

۳۔ ابن سینا۔ القانون فی الطب۔ مطبع نامی، لکھنؤ، جون ۱۹۰۶ء، ص ۱۷۷

۴۔ علی بن عباس مجوسی۔ کامل الصناعۃ۔ بدون التاریخ ص ۳۵۲

۵۔ ابوالحسن طبری۔ فردوس الحکمۃ مطبعہ آفتاب برلن، ۱۹۲۸ء

۶۔ رازی سے متعلق تمام بحث جزو رابع کے پورے حصے سے ماخوذ ہے۔


"بات کا سمجھ لینا ہی اسطائل کی ابتداء اور انتہا ہے۔"
برنارڈ شا۔

# بینائی بچائیے

محمد اسلم پرویز ×

یوں تو قدرت کی عطا کردہ ہر چیز ایک نعمت ہے لیکن بینائی اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اگر کسی عضو یا جسم میں نقص ہو تو انسان کسی طرح کام چلا لیتا ہے لیکن آنکھوں کے بغیر دنیا صحیح معنوں میں تاریک ہوتی ہے۔ انسانی زندگی میں یہ تاریکی قدرتی اسباب کے مقابلے خود اس کی کوتاہیوں کی وجہ سے زیادہ آتی ہے۔ یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ دنیا کے ہر پانچ نابینا اشخاص میں سے ایک ہندوستانی ہے۔ یعنی تمام دنیا میں پائے جانے والے نابینا حضرات میں سے ۲۰ فی صد صرف ہندوستان میں ہی ملتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ہمارے ملک میں ۹۰ لاکھ سے زائد نابینا لوگ ہیں۔ ان میں سے ایک فیصد سے بھی کم لوگ کسی حادثے کی وجہ سے نابینا ہوئے ہیں۔ خطرناک بیماریوں مثلاً چیچک وغیرہ سے بینائی کھونے والوں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو بچپن سے ہی نابینا ہیں۔ ان بیچاروں نے آنکھوں کا موتی کہاں کھو دیا؟ اس کا جواب شاید آپ کو معمولی یا غیر اہم لگے لیکن بہرحال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بچپن میں ان کو ملنے والی غذا نامکمل تھی یعنی یا تو ماں کا دودھ ہی نصیب نہیں ہوا یا پھر ماں کے دودھ میں بھی اس اہم چیز کی کمی تھی جو ان کی آنکھوں کو پرنور بنا سکتی اور وہ چیز ایک خاص قسم کا وٹامن ہے جس کو 'وٹامن اے' کہتے ہیں۔

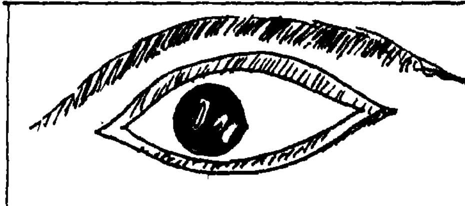
## وٹامن اے کیا ہے

ہمارے جسم کو ایسے بہت سے مادوں کی ضرورت ہوتی ہے جو بہت کم مقدار میں درکار ہوتے ہوئے بھی جسم کے لیے اشد ضروری ہوتے ہیں جن کے بغیر ہمارے اعضاء اپنا کام ٹھیک سے نہیں کر پاتے، ان کو وٹامن کہا جاتا ہے ان وٹامنوں کو بنانے کی صلاحیت ہمارے جسم میں نہیں ہوتی (وٹامن ڈی دھوپ کی موجودگی میں کھال میں اور وٹامن بی کمپلکس آنتوں میں موجود بیکٹیریا کی مدد سے بنایا جاسکتا ہے) پودے اور کچھ اقسام کے جانور مختلف قسم کے وٹامن بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وٹامن کی کتنی کم مقدار ہمیں درکار ہوتی ہے اس کا اندازہ آپ یوں لگا سکتے ہیں کہ کوئی بھی وٹامن ایسا نہیں ہے کہ جس کی ایک گرام سے زیادہ مقدار ضروری ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ وٹامن عموماً ایک گرام سے بھی بہت کم مقدار میں ہی اپنے جوہر دکھا دیتے ہیں لیکن اگر وٹامن کی کمی واقع ہو جائے تو پورا نظام متاثر ہوتا ہے اور

× لیکچرر ڈپارٹمنٹ آف باٹنی ۔ ذاکر حسین کالج ۔ نئی دہلی ۔

خطرناک بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

بیسویں صدی کے شروع میں ہی سائنس داں اس بات سے واقف ہوگئے تھے کہ غذا میں موجود کچھ نامعلوم اجزا، جانوروں کی صحت کے لیے بہت ضروری ہیں۔ ایسے ہی ایک تجربے کے دوران ۱۹۱۲ء میں ہوپکنس نے یہ بات نوٹ کی کہ اگر چوہوں کو خالص اور کشیدہ غذا پر رکھا جائے تو ان کی نشوونما کافی حد تک متاثر ہوتی ہے۔ اگر اس غذا میں دودھ کی کچھ مقدار شامل کر دی جائے تو چوہے صحت مند ہوجاتے ہیں۔ ایک اور تجربے کے دوران یہ دیکھا گیا کہ اگر ایسے چوہوں کو مکھن یا انڈے کی زردی دی جائے تو اُن کی سرخ



وٹامن اے کی کمی شروعات میں آنکھوں کی کیفیت

اور سوجی ہوئی آنکھیں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ ان تجربات کی بنیاد پر ۱۹۱۷ء میں میک کولم نے وٹامن اے کی اہمیت کو ثابت کیا۔ وٹامن" اے کا کیمیائی نام ریٹی نول ہے" اگرچہ یہ صرف چند جانوروں کے جسم میں پایا جاتا ہے لیکن اس کو بنانے والے مادے پودوں میں وافر مقدار میں ملتے ہیں۔ ان مادوں کو بھی ہمارا جسم بآسانی وٹامن اے میں تبدیل کر لیتا ہے۔

## وٹامن اے کی اہمیت

وٹامن اے (ریٹی نول) دیکھنے کے عمل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہماری آنکھ میں روشنی کو پہچاننے اور تصویر بنانے کے لیے دو قسم کے اعصابی خلیے ہوتے ہیں جن کو راڈ (سلاخ نما) اور کون (مخروطی) کہتے ہیں۔ ہر آنکھ میں اوسطاً اکرور راڈس ہوتی ہیں، جن کی مدد سے ہم کم روشنی میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ راڈ چونکہ روشنی کے تئیں بہت حساس ہوتی ہیں اس لیے اندھیرے میں دیکھنے کے لیے ان کا ہی استعمال ہوتا ہے۔ کوئی بھی چیز روشنی کے تئیں حساس جب ہی ہوسکتی ہے جب اس میں روشنی کو جذب کرنے والا کوئی مادہ ہو۔ راڈ میں بھی روشنی کو جذب کرنے والا ایک مادہ ہوتا ہے جس کو روڈوپسن (Rhodopsin) کہتے ہیں۔ روڈوپسن دو مختلف مادوں سے مل کر بنتا ہے جن میں سے اوپسن تو ایک قسم کا پروٹین ہے اور ریٹی نال ریٹی نول کی ہی ایک کیمیائی قسم ہوتی ہے۔ جب روڈوپسن پر روشنی پڑتی ہے تو پروٹین ریٹی نال سے الگ ہوجاتا ہے اور اس عمل کے دوران ایک اعصابی تحریک پیدا ہوتی ہے جو کہ ایک خاص اعصابی نس کے ذریعے ہمارے دماغ کو روشنی کا احساس کراتی ہے۔ اس طرح ہر لمحے روڈوپسن استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اس کی سپلائی برقرار رکھنے کے دو طریقے ہیں۔ اول تو اس عمل کے بعد ریٹی نال پھر سے روڈوپسن بنا دیتا ہے یا پھر وٹامن' اے' کی مدد سے نیا ریٹی نال بنتا ہے جو کہ روڈوپسن تیار کرتا ہے۔

کون (مخروطی) قسم کے خلیے تیز روشنی میں ہر چیز کی واضح شکل بنانے میں مدد کرتے ہیں اور ساتھ ہی مختلف رنگوں کی پہچان بھی کراتے ہیں۔ یعنی راڈ کی مدد سے کم روشنی یا اندھیرے میں کسی چیز کا دھندلا سا یہ نظر آتا ہے۔ تیز روشنی میں اسی چیز کے خدوخال اور رنگ و روپ کو کون کی مدد سے نظر پہچانتی ہے۔ رنگوں کو پہچاننے میں کون نما اعصابی خلیے اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ ایک صحت مند اور تربیت یافتہ آنکھ ۔۔۔۔ ۲۰ اقسام کے مختلف رنگ اور عکس پہچان سکتی ہے۔ "کون" میں بھی روشنی کو جذب کرنے والے مادوں کی موجودگی ضروری ہے ان میں تین اقسام کے حساس مادّے پائے جاتے ہیں اور تینوں میں ہی ریٹی نال ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ریٹی نال یا وٹامن اے بصارت کے کل عملات کے لیے لازمی ہے لیکن چونکہ کم روشنی میں بصارت قایم رکھنے والے اعصابی خلیوں (راڈس) سے اس کا تعلق زیادہ ہے۔ اس لیے وٹامن اے کی کمی سے سب سے پہلے مذکورہ بصارت ہی زیادہ متاثر ہوتی ہے۔

## کمی کے اثرات اور وجوہات

وٹامن اے کی کمی کی سب سے پہلی علامت یہ ہے کہ مریض کو رات کے وقت (یعنی کم روشنی میں) نظر نہیں آتا۔ عرف عام میں اس روگ کو رتوندی کہا جاتا ہے۔ عموماً اس بیماری سے بچے ہی زیادہ متاثر ہوتے ہیں (کیونکہ ان کے نوزائدہ جسم میں وٹامن اے کا ذخیرہ نہیں ہوتا) کم عمر بچوں میں اس علامت کو پہچاننا بہت مشکل کام ہے جس کی وجہ سے ان کے جسم میں وٹامن اے کی مقدار کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ کمی ان کے نظام میں گھر کر جاتی ہے اور رفتہ رفتہ آنکھ کو متاثر کرتی ہے۔ آنکھ کا سفید حصہ خشک اور کانچ کی طرح چمکیلا ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کی جھلی خشک اور کھردری دکھائی دیتی ہے۔ اس بیماری کو زیروپتھالمیا (xerophthalmia) کہتے ہیں۔ وٹامن اے کی مزید کمی سے آنکھ کی سفیدی پر سکڑے ہوئے سرمئی رنگ کے گول گول یا تکونے ابھرے ہوئے نشانات آجاتے ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے کہ سفیدی اُبل کر اوپر آگئی ہو۔ اگر اس وقت بھی اس طرف فوری دھیان نہ دیا جائے تو پھر مریض کی بصارت واپس نہیں لائی جا سکتی۔

وٹامن اے کی کمی کی وجہ سے ہمارے ملک میں ہر سال ۲۰۰۰۰ سے ۵۰۰۰۰ بچے بینائی سے محروم ہو جاتے ہیں یا تو ان کی خوراک میں وٹامن اے شامل نہیں ہوتا یا ان کی غذا میں پروٹین کی کمی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وٹامن اے تیار نہیں ہو پاتا۔ ان بچوں کی اکثریت ان علاقوں سے تعلق رکھتی ہے، جہاں غربت عام ہے۔ دودھ، انڈا، پنیر، گوشت اور دالیں ان بچوں کے لیے غیر مرئی اور عنقا شئے ہیں لیکن یہی چیزیں جسم کو پروٹین مہیا کرتی ہیں۔ اگر جسم میں پروٹین کی کمی ہو تو وٹامن اے کو بنانے والے مادوں کے موجود ہونے کے باوجود جسم وٹامن اے نہیں بنا پاتا جس کی وجہ سے ہر سال ہزاروں بچے تمام عمر کے لیے محتاج ہو جاتے ہیں۔



وٹامن اے کی کمی کے باعث ایک نابینا بچہ

## مقابلہ کیسے کریں

وٹامن اے، دودھ سے بنی چیزوں مثلاً دہی پنیر، مکھن، گھی وغیرہ میں گوشت اور کلیجی میں اور مچھلی کی کلیجی کے تیل میں وافر مقدار میں پایا جاتا ہے لیکن جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں، پودوں میں موجود دو قسم کے مادوں سے بھی وٹامن اے تیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ مادے کیروٹی نوائیڈ کہلاتے ہیں اور رنگ دار مادوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان میں سے ایک مادہ کیروٹین

ہوتا ہے جب کہ دوسرے کو زینتھوفل کہتے ہیں۔ ان کی رنگت
زرد، سنتری یا سرخ ہوتی ہے۔ چونکہ یہ پودوں کی خوراک
بنانے کے عمل میں کام آتے ہیں۔ اس لیے ہر سبز پودے کی
پتیوں میں یہ اچھی خاصی مقدار میں موجود ہوتے ہیں (پودے
اپنی غذا دھوپ اور ہوا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ
گیس کی مدد سے پتیوں میں تیار کرتے ہیں) ہری سبزیوں
کے علاوہ زرد یا سرخ پھلوں اور سبزیوں (ٹماٹر کے
علاوہ) میں بھی یہ مادے پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور
پر گاجر میں ان کا کافی ذخیرہ ہوتا ہے۔ اسی لیے کچی گاجر
کا استعمال بینائی کو قایم رکھنے اور سدھارنے کے لیے
نہایت مفید ہے۔ ہرے پتے والی سبزیاں اتنی عام اور
سستی ہوتی ہیں کہ اگر ان کا پابندی سے استعمال کیا
جائے تو وٹامن اے کی کمی سے بڑی حد تک بچا جا سکتا
ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ان کے ساتھ پروٹین کی بھی کچھ مقدار
جسم میں ضرور جائے۔ پروٹین ہم کو دودھ، انڈے، گوشت اور دالوں
میں ملتے ہیں۔ خاص طور سے چنا، پروٹین کا کافی خزانہ
رکھتا ہے۔ کچے چنے کو پانی میں رات بھر بھگو کر صبح کھانا مفید
ہے۔ کسی بھی شکل میں لیا گیا، پروٹین جسم میں جا کر کیروٹی
نوائیڈ مادوں کو وٹامن اے میں تبدیل کرنے میں مددگار
ہوتا ہے۔ اگر پروٹین کی کمی ہو تو کیروٹی نوائیڈ مادوں
کے موجود ہوتے ہوئے بھی وٹامن 'اے' نہیں بنے گا۔

دیگر وٹامنوں کی طرح اب وٹامن اے کو بھی
مصنوعی طریقے سے تیار کر لیا گیا ہے۔ چونکہ یہ چکنائی میں
گھلتا ہے اس لیے اس کو کسی مناسب چکنائی میں گھول
کر رقیق شکل میں مارکیٹ میں لایا گیا ہے۔ اس رقیق
کی بوندیں وٹامن اے کی خوراک بطور استعمال ہوتی
ہیں۔ ۱۲ سال تک کی عمر کے بچوں کو روزانہ ۳۰۰ سے ۶۰۰
مائیکروگرام (ایک گرام کے دس لاکھویں حصے کو مائیکروگرام
کہتے ہیں) وٹامن 'اے' درکار ہوتا ہے جب کہ بالغوں
کے لیے یہ مقدار تقریباً ۷۵۰ مائیکروگرام اور دودھ پلانے
والی ماؤں کے لیے ۱۲۰۰ مائیکروگرام ہوتی ہے۔ آج سے
تقریباً ۱۶ سال قبل حیدرآباد میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف
نیوٹریشن (N.I.N) قایم ہوا تھا، جس کا مقصد خوراک
کے اجزا کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقات کرنا ہے۔ اس
ادارے نے وٹامن اے کی ضروریات پر بھی کافی کام
کیا ہے۔ ان تحقیقات کی روشنی میں یہ بات سامنے
آئی ہے کہ انسان کے جگر میں وٹامن اے کی بڑی مقدار
کو جمع کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ کیروٹی نوائیڈ مادوں
کو وٹامن اے میں تبدیل کرنے کا عمل بھی جگر میں ہی
ہوتا ہے۔ اگر وہاں وٹامن اے کی زیادہ مقدار تیار
ہو جائے تو وہ آڑے وقت کے لیے جمع کر لی جاتی ہے۔
اس ادارے کی تحقیقات سے پتہ لگا کہ اگر بچوں کو
وٹامن اے کی کافی بڑی مقدار بھی دے دی جائے تو
یہ بغیر کسی نقصان کے جگر میں جمع رہتی ہے۔ ان لوگوں نے
۲ لاکھ انٹرنیشنل یونٹ (کسی بھی چیز کی کم سے کم مقدار
جو کہ ہمارے جسم کو درکار ہوتی ہے' اس کو ایک
انٹرنیشنل یونٹ کہا جاتا ہے اس کا نشان (I.U ہے)
بچوں کو دیے جو کہ تقریباً ۶ ماہ تک جگر میں محفوظ رہے
اور بوقت ضرورت استعمال ہوتے رہے۔ ان تحقیقات
کی بنیاد پر ہی ۱۹۷۰ء میں بچوں کو وٹامن اے کے قطرے
دینے کا پروگرام شروع کیا گیا جس کو آج کل ٹیلی ویژن
اور ریڈیو پر بھی کافی مشتہر کیا جا رہا ہے۔ اس اسکیم
کے تحت ایک سے پانچ سال کی عمر کے درمیان بچوں
کو ہر چھ ماہ کے وقفے سے ۲ لاکھ آئی یو (I.U) وٹامن
اے کی خوراک دی جاتی ہے۔ یہ خوراک ایک چکنے
رقیق کی شکل میں ہوتی ہے جو منھ کے ذریعے دی جاتی ہے۔
شروع میں یہ پروگرام صرف سات ریاستوں
میں چلایا گیا تھا لیکن اب اس کو تمام ریاستوں میں پھیلا

گیا ہے اور تقریباً ڈھائی کروڑ بچے اس سے فیضیاب ہو رہے تھے۔

ان کوششوں کو محض دواؤں تک محدود رکھنا بیکار ہوگا۔ ہم سب کی کوشش ہونی چاہیے کہ ہم اور ہمارے بچے متوازن غذا لیں جس میں سب طرح کے اجزا شامل ہوں۔ وٹامن اے کے نقطۂ نظر سے خاص طور پر ہم کو ہرے پتے والی سبزیوں اور پروٹین کی مناسب مقدار کا استعمال رکھنا چاہیے۔ سبزی خوب اچھی طرح دھو کر بطور سلاد کچی بھی کھائی جا سکتی ہے۔ اگر پکائیں تو کوشش یہ کریں کہ دھیمی آنچ پر جلدی پکالیں۔ بھنی اور گھٹی ہوئی سبزی میں غذائیت تقریباً ختم ہو جاتی ہے (یہ بات محض سبزی تک محدود نہیں ہے۔ ہر قسم کی غذا بھننے پر اپنی غذائیت کھو دیتی ہے چاہے وہ گوشت ہو، سبزی ہو یا دالیں) حاملہ عورتیں اور دودھ پلانے والی ماؤں کو خاص طور سے اپنی غذا میں ان اشیا کو شامل رکھنا چاہیے۔ کیونکہ ان کے جسم کی تیار شدہ غذا ہی بچے کو ملتی ہے۔ اگر اس میں وٹامن اے کی کمی ہوئی تو وہ لازماً بچے کو بھی متاثر کرے گی۔

سب سے آخری اور اہم بات یہ ہے کہ اگر بچے کی آنکھ میں کسی قسم کی غیر قدرتی بات نظر آئے تو فوراً ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ تاکہ مرض کو بڑھنے سے پہلے ہی قابو میں کیا جا سکے۔

(از سائنس پارے)

"اے میری قوم کے لوگو! اپنے عزیز اور پیارے بچوں کو غارت نہ کرو۔ اُن کی آئندہ زندگی بسر ہونے کا سامان کرو۔ مجھ کو تم کچھ بھی کہو۔ میری بات سنو یا نہ سنو مگر یاد رکھو کہ تم ایک قومی تعلیم کے طور پر اُن کو تعلیم نہ دوگے تو وہ آوارہ اور خراب ہوں گے۔ تم ان کی ابتر حالت دیکھوگے تو بے چین ہوگے، روؤگے اور کچھ نہ کر سکوگے۔ تم اگر مر جاؤ گے تو اپنی اولاد کی خراب زندگی دیکھ کر تمہاری روحیں قبروں میں تڑپیں گی اور تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔"

سرسید"

# سرسید کی تعلیمی پالیسی
## جدید نظام تعلیم کی روشنی میں

شاہدہ بیگم ▽

سرسیّد جس دور میں پیدا ہوے وہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی اعتبار سے بحرانی دور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ حکومت کا چراغ لال قلعہ کی چہار دیواری میں ٹمٹما رہا تھا اور برطانوی سامراج کا آفتاب اقبال بلندیوں کی طرف مائل تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا کیونکہ وہ حاکم وقت سے کسی قسم کی مفاہمت کے لیے تیار نہیں تھے۔ برادران وطن مدراس اور بنگال میں انگریزی تعلیم سے استفادہ کر رہے تھے لیکن مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف اِس قدر شدید ردّ عمل شروع ہوا کہ وہ برطانوی حکومت، انگریزی زبان اور مغربی تہذیب سے متنفر ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان نہ صرف سرکاری ملازمتوں سے محروم رہے بلکہ جدید تعلیم میں بھی اپنے ہم وطنوں سے بہت پیچھے رہ گئے۔ بقول خواجہ الطاف حسین حالی ؎

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا
ہم محونالۂ جرسِ کارواں رہے

علمی میدان میں اِس پستی کا احساس سب سے پہلے میحائے قوم سرسید نے دلایا۔ اگرچہ سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین اور اُن کے والد سید محمد تقی مغلیہ دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے لیکن سرسید نے زمانے کا رُخ دیکھ کر سرکار برطانیہ کی ملازمت کو ترجیح دی اور آگرہ کمشنری میں نائب منشی مقرر ہوے۔ پھر وہ منصف صدر امین اور صدر الصدور کے عہدے تک پہنچے۔

مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھانے کے لیے سرسید نے غازی پور میں پہلا قدم اُٹھایا اور پھر آگے ہی بڑھتے رہے۔ ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی ابتدا ہوئی اور برصغیر کے طول و عرض میں علی گڑھ تحریک کے چرچے ہونے لگے۔ اپنی زندگی کے آخری بیس پچیس سال سرسید نے تعلیم و تربیت اور مذہبی و اخلاقی اصلاح پر غور و فکر میں گزار دیے۔

زیر نظر مضمون میں سرسیّد کے تعلیمی نظریات کا سرسری جائزہ اُن کے مضامین و اقوال کی روشنی میں لیا گیا ہے تاکہ اُن کی اہمیت اور معنویت کو آزاد ہندوستان کے تعلیمی سیاق و سباق میں نمایاں کیا جاسکے۔

---

▽ امیر نشاں، دودھ پور، علی گڑھ۔

سرسید نے اپنے مضمون "تعلیم وتربیت" میں تعلیم وتربیت کو جُدا جُدا بتایا ہے:

"جو قوتیں کہ خدا تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں، اُن کو تحریک دینا اور شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے اور اُس کو کسی بات کا مخزن بنانا اُس کی تربیت ہے..... انسان کو تعلیم دینا درحقیقت کسی چیز کا باہر سے اس میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ اُس کے دل کے سوتوں کا کھولنا اور اندر کے سرچشمے کے پانی کو باہر نکالنا ہے جو صرف اندرونی قویٰ کو حرکت میں لانے اور شگفتہ و شاداب کرنے سے نکلتا ہے۔"[1]

سرسید کا قول ہے کہ بغیر تعلیم کے انسان کی صلاحیتیں نہیں اُبھر سکتیں۔ تمام ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ ہر بچے کے اندر قدرت نے ایسی ذہنی روحانی اور اخلاقی صلاحیتیں پوشیدہ کر رکھی ہیں جنھیں موزوں تعلیم سے ہی بروے کار لایا جا سکتا ہے۔ کہیں کہیں سرسید نے ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو ہم معنی قرار دے دیا ہے۔

"انسان کا دل کیسا ہی نیک ہو مگر جب تک اس پر تعلیم کا اثر نہیں ہوتا اُس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں اس میں چھپی ہوئی ہیں اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہو سکتیں ظاہر نہیں ہوتیں۔"[2]

سرسید کے نظریاتِ تعلیم پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ خود مغربی تعلیم سے محروم رہنے کے باوجود انھوں نے ترجموں اور ثانوی ذرائع سے مغربی افکار سے استفادہ کیا۔ اُن کے مضامین اور خطبات میں اکثر نظریات مغربی مصنفین سے ماخوذ ہیں لیکن وہ انھیں ہندوستانی سیاق و سباق میں پیش کرتے ہیں، جس سے اُن کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔ کبھی کبھی سرسید معاشرتی اصلاح کا مجموعی جائزہ لے کر تعلیم، تہذیب، تربیت، اخلاقیات، معاشیات اور رسومات کو ہی ایک مضمون میں سمو لیتے ہیں۔ چنانچہ اپنے مضمون "کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیے" میں انھوں نے جن موضوعات کی نشاندہی کی ہے وہ قابلِ غور ہیں:

اول: آزادیٔ رائے۔ دوم۔ درستی عقائد مذہبی۔ سوئم۔ خیالات و افعال مذہبی۔ چہارم۔ تدقیق بعض مسائل مذہبی۔ پنجم۔ تصحیح بعض مسائل مذہبی۔ ششم۔ تعلیم اطفال۔ ہفتم۔ سامان تعلیم۔ ہشتم۔ عورتوں کی تعلیم۔ نہم۔ ہنر و فن و حرفہ۔ دہم۔ خود غرضی۔ یازدہم۔ عزت و غیرت۔ دوازدہم ضبطِ اوقات۔ سیزدہم۔ اخلاق۔ چہاردہم۔ صدق مقال۔ پانزدہم۔ دوستوں سے راہ و رسم۔ شانزدہم۔ کلام۔ ہفدہم۔ لہجہ۔ ہیژدہم۔ طریق زندگی۔ نوازدہم۔ صفائی۔ بستم۔ طرز لباس۔ بست و یکم طریق اکل و شرب۔ بست و دوم۔ تدبیر منزل۔ بست و سوم۔ رفاہِ عام کی حالت میں۔ بست و چہارم۔ کثرت ازدواج۔ بست و پنجم۔ غلامی۔ بست و ششم۔ رسومات شادی۔ بست و ہفتم۔ رسوماتِ غمی۔ بست و ہشتم۔ ترقی زراعت۔ بست و نہم۔ تجارت۔"[3]

سرسید جس زمانے کی پیداوار ہیں اُس عہد کے مصلحین کے افکار میں تعلیم و تربیت،

تہذیب و تمدن، سیاسیات و معاشیات اور رسوم و روایات کو الگ الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے چند بنیادی مسایل کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی۔ مثلاً "تعلیم اطفال" "سامان تعلیم"، "عورتوں کی تعلیم" اور "ہنر وفن و حرفہ"۔

"تعلیم اطفال" کے سلسلے میں سرسید کا نظریہ یہ ہے کہ بچوں کو ابتدا سے ہی ایسا ماحول ملنا چاہیے جہاں اُن کی فطری صلاحیتیں ابھر سکیں۔ اپنے مضمون "تربیت اطفال" میں اُس کی وضاحت کرتے ہوے رقم طراز ہیں کہ :

"لڑکپن کے زمانے میں جو عمر کہ سات برس سے پندرہ برس تک ہے، وہی ایسا زمانہ زندگی کا ہے جنھیں آئندہ کی بہبودی کے لیے زیادہ تر کوشش ہو سکتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ زمانہ لڑکوں کے لیے ذہنی و عقلی اور اخلاقی تخم ریزی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت تعلیم کو دل نہایت جلد قبول کرتا ہے اور اس کے تخم کو جس میں آئندہ نہایت عمدہ عمدہ پھل پھول پیدا ہوں گے بہت جلد اُگا دیتا ہے۔" [4]

نئی تعلیمی پالیسی (۱۹۸۶ء) کے تحت "لازمی ابتدائی تعلیم" (Universal Primary Education) کا یہی مقصد ہے۔ اس کے لیے ہم کو زمانہ گزشتہ اور حال پر نظر کر کے ایک ایسا طریقۂ تعلیم متعین کرنا چاہیے جس سے علوم دینی و دنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجے تک ہم کو قابو ملے۔" [5]

سرسید کو اس کا شدت سے احساس تھا کہ بغیر عورتوں کی تعلیم کے معاشرے میں کسی قسم کی اصلاح ممکن نہیں۔ کیونکہ بچوں کی تربیت کا گہوارہ گھر ہی ہے اور جب ماں خود جاہل ہوگی تو وہ اپنی اولاد کو کیا تربیت دے گی۔ سرسید نے لڑکیوں کی عام تعلیم کے ساتھ دست کاری کی طرف توجہ دلائی :

"کوئی شبہ نہیں ہے کہ قومی تہذیب و شائستگی کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضرور ہے۔ پس ہم کو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اور ان کو دست کاری سکھانے کے لیے کوئی عمدہ بندوبست کرنا چاہیے۔" [6]

بیسویں صدی میں فلسفۂ تعلیم کے ہندوستانی مفکروں بالخصوص گاندھی جی، ذاکر صاحب اور ڈاکٹر رادھا کرشنن نے بھی عورتوں کی تعلیم پر زور دیا ہے۔ سرسید کے ایک سچے پیرو شیخ عبداللہ نے علی گڑھ میں کچھ علماء کی مخالفت کے باوجود گرلس اسکول کی بنیاد رکھی جو اب ترقی کر کے ویمنس کالج بن گیا ہے اور جہاں گریجویشن سطح تک ہر مضمون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نیز دستکاری اور حرفت سکھانے کے بھی انتظامات کیے جا رہے ہیں۔

سرسید کے نظام تعلیم میں ذریعۂ تعلیم ۔ (Medium of Introduction) کی بڑی اہمیت ہے اس سلسلے میں سب سے وقیع مضمون "آرٹیکل اوپر تعلیم و تربیت اہل ہند کے" ہے جس میں انھوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ :

"اس ملک میں انگریزی زبان کی تعلیم مقدم ہونی چاہیے۔ یا دیسی زبان کی تعلیم مقدم ہونا لازم ہے۔ مدت ہوئی کہ انگریزی مقدم ہونے کی نسبت تصفیہ ہو چکا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ہم کو اس بات کا دل سے یقین ہے کہ انگریزی علم کی تعلیم سے ملک کو بہت سا فائدہ حاصل ہوا ہے اور آئندہ ہو سکے گا [7]

ظاہر ہے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی نہ صرف اس دور میں بلکہ آج بھی ناگزیر ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مشرقی زبانیں نہ سیکھی جائیں۔ سرسید نے صاف صاف لکھا کہ:

"مشرقی زبانوں اور عادتوں اور طور طریقوں کا شوق اور اُن کی رعایت بطور خود عمدہ اور مفید ہے۔ سنسکرت اور عربی زبان کا تحصیل کرنا ہندوستان میں ایسا ہی مفید ہے۔ جیسا کہ یونانی اور لیٹن زبانوں کا یورپ میں سیکھنا فائدہ سے خالی نہیں ہے۔" ؎

ابتدائی لازمی تعلیم اور ہائی اسکول تک عام تعلیم اگر مادری زبان کے ذریعے دی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

"ہم ایک ایسا سررشتہ تعلیم چاہتے ہیں جس سے تھوڑے ہی نہیں بلکہ بہت سے فائدے اُٹھا سکیں اور اس کے باعث سے تھوڑے لوگ نہیں بلکہ کل قوم مغربی علم و ہنر کو بخوبی تمام حاصل کر سکے۔

یہ سب باتیں صرف دیسی زبانوں میں تعلیم ہونے سے جو لوگوں کی خاص زبانیں ہیں حاصل ہو سکتی ہیں۔......
وہ ہندوستانی لڑکے کی طبیعت کے موافق اس طرح پر ہے جیسی کہ انگریزی انگریز لڑکے کے واسطے ہے......
انگریزی کی تعلیم اپنی انتہا تک پہنچ گئی ہے لیکن اردو کی تعلیم ہنوز کامل نہیں ہوئی ہے۔ ابھی صرف اس کا آغاز ہے

اور اگر وہ بھی اپنے کمال تک پہنچائی جاوے تو بعید از انصاف نہ ہوگا۔" ؎

سرسیّد کا خیال ہے کہ ابتدائی مراحل میں مستند انگریزی کتابوں سے ترجموں پر انحصار ناگزیر ہے لیکن رفتہ رفتہ دیسی زبانوں میں مختلف مضامین کے اساتذہ اعلیٰ اور معیاری درسی کتابیں تصنیف کر سکتے ہیں۔

سرسیّد نے قومی تعلیمی مسائل پر غور کرتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کے حال زار پر نہ صرف ماتم گساری کی بلکہ ان کی اصلاح و ترقی کے لیے عملی تجاویز بھی پیش کیں۔ اپنے مضمون "ہندوستان کے معزز خاندان" میں انھوں نے "پدرم سلطان بود" کے حلیفوں کا خوب خاکہ اُڑایا ہے:

"مسلمانوں کی قوم میں کوئی صرف اس بات پر نازاں ہے کہ ہم سیّد ہیں آلِ رسول ہیں اور ناز نے اُن کو دین و دنیا دونوں قسم کی عزت حاصل کرنے سے روک رکھا ہے.........
اگر کسی سے کہو کہ آپ کا لڑکا کچھ ریاضی حساب پڑھا ہے تو کہتے ہیں کہ لاحول و لا قوۃ الا باللہ اور اگر کہیں کہ صاحب قرآن حدیث پڑھا ہے تو کہیں کہ اجی صاحب ہم کیا اس کو مولوی بنالتے پھر اب اُن سے پوچھو کہ تم نے کیا بنایا ہے؟ مولوی تم نے نہیں بنایا۔ دنیادار تم نے نہیں بنایا۔ کیا گدھا بنایا ہے جو ہمیشہ دوسروں کا بوجھ اُٹھاوے گا۔" ؎

افسوس کہ آج اس تحریک کے سو اسو سال گزر جانے کے بعد بھی مسلمان تعلیمی پستی کے باعث دوسروں

کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہیں۔ معمارِ قوم سرسیّد نے ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی و تعلیمی ترقی کے لیے انھیں جدوجہد کی تلقین کی۔ وہ دراصل مشرقی طرزِ تعلیم کو مغربی طرزِ تعلیم سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے لیکن زمانے کا تقاضا تھا کہ انگریزی کو فوقیت حاصل رہے۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں جب یو۔پی کے لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور نے الٰہ آباد یونیورسٹی کے لیے مشرقی تعلیم کی ایک اسکیم تجویز کی تو سرسیّد نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ حکومت کا اصلی مقصد مشرقی علوم کے فروغ کے پردے میں مغربی علوم کی ترقی کو روکنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غدر کے بعد انگریز ہندوستان میں نئے تعلیمی نظام نافذ کرنے میں کافی محتاط تھے۔ لہٰذا وہ میکالے کی تجاویز کو پوری طرح عملی صورت نہیں دینا چاہتے تھے۔ سرسیّد اپنی تعلیمی پالیسی کے ذریعے برطانوی حکومت کے لیے کلرک یا ڈپٹی کلکٹر نہیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کا اصل مقصد قومی بیداری، ذہنی نشوونما اور کردار سازی تھا۔ اپنے مضامین اور تقاریر میں انھوں نے ملازمت کے مقابلے میں صنعت و حرفت اور تجارت کو بہتر ذریعۂ معاش قرار دیا ہے۔

سرسیّد کی تعلیمی پالیسی کے پانچ اہم اجزاء ہیں:

۱۔ جدید علوم کی ترویج و اشاعت

۲۔ اسلامی اصولوں کی پابندی۔

۳۔ مسلم عوام کی رائے کو اپنی رائے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش۔

۴۔ دوسری غیر مسلم اقوام کے ساتھ تعاون۔

۵۔ حکومت برطانیہ سے وفاداری۔

دراصل یہ سیکولر اور مذہبی تعلیم کے درمیان ہم آہنگی کی کوشش تھی۔ آزادی کے بعد حکومت برطانیہ سے وفاداری کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ مغربی دنیا سے سائنس، ٹکنالوجی اور علوم و فنون سے استفادہ کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔

اگرچہ سرسیّد کے تمام نظریات موجودہ زمانے کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتے لیکن اُن کی اہمیت اور معنویت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ "نئی تعلیمی پالیسی" میں لازمی ابتدائی تعلیم، عورتوں کی تعلیم، صنعت و حرفت، قومی ترقی اور جذباتی ہم آہنگی اہم نکات ہیں۔ سرسیّد نے نہ صرف اُن موضوعات پر تحریر و تقریر کے ذریعے لوگوں کو آشنا کیا بلکہ کٹر اور رجعت پسند ہم قوموں اور فرقہ پرست ہم وطنوں سے بھی انھوں نے ٹکر لی اور بالآخر اپنے مشن میں بہت حد تک کامیاب ہوئے۔ اس میں کلام نہیں کہ محسنِ اعظم، بابائے قوم سرسیّد احمد خاں نے مسلم یونیورسٹی (ایم۔ اے۔ او کالج) قائم کرکے برصغیر میں مسلمانوں کو اُن اقدار سے روشناس اور اُن علوم سے بہرہ ور کیا جن کا تصور علی گڑھ تحریک کے بغیر محال تھا۔ "دو مدرستہ العلوم کی ضرورت" ایسا مضمون ہے جس میں سرسید کے پروگرام کے مقاصد موجود ہے:

> حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اپنے غصّہ کو ایسے وقت میں پی جائے کہ وہ عمل میں لا سکتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو مخلوق کے روبرو قیامت کے دن بلائے گا، یہاں تک کہ اس کو اختیار دے گا کہ فراخ چشم حوروں میں سے جس کو چاہے پسند کرے۔
>
> بخاری و مسلم

"قومی ترقی صرف تعلیم پر منحصر ہے۔
مذہبی تعلیم عقبیٰ کی تعلیم کے لیے ہے،
دنیوی تعلیم دنیوی ترقی کے لیے.....
قومی ہمدردی اور قومی رفاہ عام کا کام
وہ ہے جو نہ صرف اپنے لیے
کیا جائے نہ خدا کے لیے بلکہ خاص
قوم کے لیے۔ جس چیز کی قوم کو حاجت
اس کو پورا کرے اور میری رائے
میں یہی اصل ثواب کا کام
ہے۔" [11]

اس مضمون میں سرسید فرقہ وارانہ میل جول اور قومی یکجہتی پر زور دیتے ہوئے ہندو مسلمانوں کو مادر وطن ہندوستان (جو دلہن کی مانند ہے) کی دو خوب صورت اور رسیلی آنکھوں سے تشبیہ دی ہے۔ کاش ہمارا جدید تعلیمی نظام اس عظیم مقصد کی تکمیل میں معاون ہوتا تو آج ملک میں وہ مسائل نہ پیدا ہوتے جن کے باعث ہماری آزادی اور سالمیت خطرے میں پڑ گئی ہے۔

## حواشی

۱۔ تہذیب الاخلاق - جلد سوم بابت ۱۰ محرم ۱۲۸۹ھ
۲۔ "انسان میں تمام خوبیاں تعلیم سے پیدا ہوتی ہیں۔" [تہذیب الاخلاق بابت یکم شوال ۱۲۸۹ھ]
۳۔ تہذیب الاخلاق - جلد ۱، نمبر ۶ - بابت یکم ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ
۴۔ تہذیب الاخلاق جلد اول نمبر ۷ - بابت ۱۶ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ
۵۔ تہذیب الاخلاق - یکم ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ "کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیے۔"
۶۔ ایضاً
۷۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ، یکم مارچ ۱۸۶۷ء
۸۔ ایضاً
۹۔ ایضاً
۱۰۔ ایضاً
۱۱۔ "مدرسۃ العلوم کی ضرورت" ۷ اپریل ۱۸۷۶ء منتخب مضامین سرسید۔"
مرتبہ پروفیسر عتیق احمد صدیقی - سرسید اکادمی، علی گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۱

بقیہ صفحہ ۵۲

دوچار ہوئی جس سے بنی نوع انسانی کا کوئی فرد مستثنیٰ نہیں۔ مختصر علالت کے بعد محرم کی آخری تاریخ کو ۶۲ سال کی عمر میں اس دار فانی کو خیر باد کہا اور جان جان آفریں کے سپرد کی لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ نوع بشری آپ کے اس عظیم احسان کو فراموش نہیں کر سکے گی۔ فخر الرحمٰن المصفیٰ حجۃ اللہ البالغہ، تفہیمات الٰہیہ، ازالۃ الخفاء، انفاس العارفین اور آپ کے سیاسی مکتوبات کی بنا پر انسانیت تا قیامت آپ کی ممنون رہے گی۔

# عورتوں کی تعلیم ــــــ ماضی اور حال

○ مظفر حسین غزالی

انسانی آبادی کا نصف حصہ عورتوں پر مشتمل ہے ہر زمانے میں عورت گھر کی مالکن اور بنیاد رہی ہے۔ اسی لیے عورت کو سماج میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کسی کی ماں ہے تو کسی کی بہن، کسی کی بیوی ہے تو کسی کی دادی یا نانی ہے۔ لیکن دنیا میں ہر آنے والا بچہ اسی عورت کی آغوش میں آنکھیں کھولتا ہے۔ اسے سب سے پہلی محبت بھی ماں کی ہی ملتی ہے اور بچے کا سب سے پہلا مدرسہ بھی ماں کی گود ہی ہوتا ہے۔ بچے کی سیرت و کردار، علم و فہم عادت و اطوار اور اخلاق پر یہی مدرسہ سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اور یہیں اس کی زندگی کی عمارت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ دنیا میں جتنے لوگ گزرے ہیں ان کے بناؤ بگاڑ میں ماں کا سب سے اہم کردار رہا ہے۔ ماں کے قدموں میں جنت ہے۔ ماں اور باپ کے بیک وقت پکارنے پر ماں کے پاس پہلے جانے کی ہدایت ہے۔ یہ بھی عورت کے کاموں اور بچے کے ساتھ اس کی خدمت کا اجر ہے اور اس کے بدلے میں اسے یہ بلند مقام دیا گیا ہے۔

اگر عورت ہی جاہل ہو تو عالم اور فاضل اولاد کی تمنا صرف ایک خواب ہی ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم میں علم حاصل کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہر مسلمان عورت مرد کا اسلامی فریضہ قرار دیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

> سوائے دو آدمیوں کے دنیا کا کوئی انسان بھی ایسا نہیں ہے جس پہ رشک کیا جا سکے ایک تو وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے دولت عطا کی ہو اور وہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہو۔ اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دین عطا کیا اور وہ اس کے مطابق عمل کرتا ہو اور دوسرے لوگوں کو بھی علم و حکمت سکھاتا ہو۔

چنانچہ عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ بلکہ اس کا نظام خود آں حضرتؐ نے ہی قایم فرمادیا۔ آپؐ ہفتے میں ایک دن عورتوں کے خصوصی مجمع میں تشریف لے جاتے، ان کو تعلیم دیتے اور ان کے سوالات کے جواب دیا کرتے۔

ایک حدیث میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ آنحضرتؐ

○ ۷۔ جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

نے ایک خاتون سے خواہش فرمائی کہ وہ آپ کی ایک بی بی
کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں۔ آپ کی زوجۂ مطہرہ حضرت
عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو فقہ اور دیگر اسلامی علوم، نیز
ادب، شاعری اور طب میں بڑا دخل تھا۔ عہد نبوی سے
عہد عباسیہ تک بے شمار ایسی خواتین کی مثالیں ملتی ہیں
جو اپنے فن میں یکتا تھیں۔ بعض مدرسوں میں لڑکوں
کے ساتھ درس سنتی تھیں اور بعض خود اپنے مدرسے
چلاتی تھیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے
اگرچہ تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری تھا لیکن اس کی اجارہ داری
اعلیٰ ذاتوں تک تھی۔ مسلمانوں نے یہاں تعلیم کو عام
کرنے کے لیے مدارس قایم کیے۔ ابن بطوطہ نے اپنے
سفرنامے میں جنوبی ہند کے ساحل پر ایک اسلامی ریاست
(ہنور) میں لڑکیوں کے تیرہ مدرسوں کا تذکرہ تعجب
سے کیا ہے۔ وہاں کی عورتوں کی یہ خصوصیت ظاہر کی
ہے کہ وہ سب حافظ قرآن ہوتی ہیں۔ ان پڑھی لکھی
خواتین میں جزائر مالدیپ کی ملکہ خدیجہ کا ذکر کرتے
ہوئے لکھتا ہے:

"اے خدا! اپنی کنیز کی مدد کر جس کو
تو نے اس علم کے سبب سے تمام عالم
کے لوگوں میں برگزیدہ کیا ہے۔"

آگے وہ بادشاہ التتمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ کا ذکر کرتا
ہے کہ:

"رضیہ ایک تعلیم یافتہ شہزادی تھی جو
تخت حکومت پر بھی بیٹھی۔ اس کو پبلک
تعلیم کا بڑا شوق تھا۔ اس نے دو مدرسے
"معزی" اور "ناصریہ" جاری کیے۔"

[illegible]ی میں ایک جانب [illegible] اور ناصریہ تھا منہاج سراج
[illegible]ف طبقات ناصری تھے۔ ۶۳۵ھ میں شیراز سے ہند

جون پور میں بی بی راجہ بیگم نے ایک مدرسہ قایم کیا۔ سلطان
غیاث الدین کی مالوہ پر ۱۴۶۹ء سے ۱۵۰۰ء حکمرانی کے
زمانے میں اس کی حرم سرا میں پندرہ ہزار عورتیں تھیں
جن میں استانیاں، واعظات، مغنیہ اور ہر قسم کا پیشہ
جاننے والی تھیں۔ وہ محل کی دوسری عورتوں کو تعلیم
دیتی تھیں۔ بابر کی لڑکی گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ تصنیف
کیا تھا۔ ہمایوں کی بھتیجی گلرخ کی لڑکی سلیمہ سلطان بھی
تعلیم یافتہ اور فارسی کی شاعرہ تھی۔ اس نے 'مخفی'
تخلص سے بہت سی نظمیں کہیں۔ اکبر کے عہد حکومت
میں محل کی تمام عورتوں کو باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔
شہنشاہ جہانگیر کی بیگم نور جہاں فارسی اور عربی ادب
میں پوری مہارت رکھتی تھی۔ شاہ جہاں کی بیگم ممتاز
محل بھی فارسی کی اچھی خاصی قابلیت رکھتی تھی اور شعر
بھی کہتی تھی۔ اس کی بڑی لڑکی جہاں آرا بیگم تعلیم یافتہ
ہونے کے باوجود ہمیشہ علماء کی بہت قدر کرتی تھی۔
بیگم جہاں آرا کی معلمہ تھی۔ اورنگ زیب کی سب سے
بڑی لڑکی زیب النسا بیگم نے اپنے والد سے تعلیم پائی۔
وہ قرآن کے مطالب سمجھنے کی قابلیت رکھتی تھی۔ فارسی
عربی کے علاوہ فن خطاطی میں عبور کامل تھا۔ متعدد کتابیں
اس نے تصنیف و ترجمہ کروائیں۔ تفسیر کبیر کا فارسی ترجمہ
اسی کی فرمائش سے ہوا۔

ہمایوں نامہ سے عورتوں کے متعلق بہت
سی نئی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ مثلاً عورتیں لکھنے پڑھنے
کے علاوہ فنونِ سپہ گری سے بھی خوب واقف ہوتی
تھیں۔ سفر اور شکار میں عموماً گھوڑے پر سوار ہوتی
تھیں ـــــ انہی صلاحیتوں نے ان کا مقام
اتنا بلند کر دیا تھا کہ بابر کی بیوی ماہم بیگم جب کابل سے
ہندوستان آئی تو بابر دو کوس تک استقبال کو گیا۔ جہانگیر
کی سلطنت کے کاروبار کی خوش اسلوبی کا سہرا اس کی بیوی

کہا جاتا ہے ، شاہ جہاں بھی اپنے حکومت کے کاروبار میں اپنی بیگم سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ ملکی معاملات میں عورتوں سے صرف مشورہ ہی نہیں لیا جاتا تھا بلکہ ہر قسم کے امور میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی۔

انیسویں صدی میں عورتوں کی تعلیم کی وضاحت شہادت سرسید احمد خاںؒ (۱۸۱۷ء — ۱۸۹۸ء) کی اس تقریر سے ملتی ہے جو انھوں نے بجواب سپاسنامہ خاتونانِ پنجاب" میں کی تھی۔ انھوں نے کہا:

" میں نے اپنے خاندان میں تین قسم کی عورتوں کو دیکھا ہے۔ ایک وہ جو ہماری ماؤں اور خالاؤں کی ساتھی تھیں۔ میں نے ان کو دیکھا کہ وہ سب پڑھنا جانتی تھیں اور چند اُن میں سے ایسی تھیں جو فارسی کتابیں بھی پڑھ سکتی تھیں۔ میں نے خود گلستان کے چند سبق اپنی والدہ سے پڑھے ہیں اور اکثر ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق ان کو سنائے ہیں۔

دوسرا گروہ میری ہم عصر بہنوں کا تھا جو گھروں میں تعلیم پاتی تھیں۔ ان کی تعلیم کا طریقہ میں نے یہ دیکھا کہ رشتہ داران قریب میں سے کوئی معزز اور آسودہ گھر لڑکیوں کی تعلیم کے لیے منتخب کیا جاتا تھا اور خاندان کی لڑکیاں اس گھر میں پڑھنے کے لیے جمع ہوتی تھیں اور اس گھر کی بزرگ عورت جو اُن لڑکیوں میں سے کسی کی ماں، کسی کی نانی، کسی کی خالہ کسی کی ممانی اور کسی کی پھوپھی ہوتی تھیں ان سب لڑکیوں کی نگراں ہوتی تھیں۔ ان کی تربیت کے لیے متعدد استانیاں بھی نوکر ہوتی تھیں اس وقت ان عورتوں میں سے ایسی عورتیں بھی زندہ موجود ہیں جو عربی زبان سے بھی کسی قدر واقف ہیں اور مشکوٰۃ شریف، حصن حصین، چہل حدیث اور متعدد کتابوں کو نہایت خوبی سے پڑھا سکتی ہیں۔

تیسری قسم کی وہ لڑکیاں جو میرے سامنے بچہ تھیں اور اب بڑی ہو گئی ہیں ان کی تربیت بھی اسی طرز پر میری آنکھوں کے سامنے ہوئی ہے۔ پہلے زمانے میں عورتوں کو لکھنے کا کچھ خیال نہ تھا مگر تیسرے گروہ کی لڑکیوں میں سے کسی کسی کو لکھنے کا بھی شوق ہوا۔"

لڑکیوں کے پڑھنے کا وقت عام طور پر صبح سے کھانے کے وقت تک تھا۔ جمعہ کے دن سب لڑکیاں بدستور صبح سے آتی تھیں اور سب مل کر چھوٹی چھوٹی پتیلیوں میں مختلف قسم کے کھانے پکاتی تھیں جو "ہنڈ کلیا" کہلاتی تھی۔ اس طرح انھیں کھانا پکانے کی بھی تربیت دی جاتی تھی۔

زمانۂ قدیم میں عورتیں نہ صرف مردوں کا علمی مقابلہ کرتی رہیں بلکہ بعض حالات میں ان سے بازی بھی لے گئیں مگر ایک دور انحطاط ایسا آیا کہ وہ سلسلہ منقطع اور نظام درہم برہم ہو گیا اور عورتوں کی تعلیم ختم ہو گئی یا بہت ہی معمولی برائے نام رہ گئی۔ لڑکیاں محلہ کی کسی معمر خاتون کے پاس قرآن پڑھنے جاتیں وہیں زیادہ سے زیادہ ایک دو اردو کی کتابیں بھی پڑھا دی جاتیں۔ زمانۂ قدیم میں تو دولت مند اور درمیانی طبقہ کی عورتوں نے تعلیم کے حصول میں دلچسپی لی یا یہ کہا جائے کہ انھیں کے لیے تعلیم کا نظم تھا، تو بے جا نہ ہوگا۔ عام خواتین کے لیے تعلیم کا آج کی طرح نظم نہ تھا۔ البتہ محلہ میں کوئی عورت اگر لڑکیوں کو پڑھاتی تو اُن سے وہ اپنے گھر کا پورا کام کاج کرواتی۔ اس طرح لڑکی کا زیادہ وقت پڑھنے کے بجائے دوسرے کاموں میں صرف ہو جاتا۔ اس سے بھی سماج کی تعلیمی ضرورت پوری نہ ہو سکی۔

جب لڑکیوں کی تعلیم کا احساس ہوا اور ہوش آیا تو مغربی طرز و نظام مردوں کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ اسی پر تعلیم نسواں کی جد و جہد اور تبلیغ شروع ہوئی۔ چونکہ اس طرز و نظام میں مذہب کی جگہ نہ تھی اس لیے عورتیں بھی مذہب سے بیگانہ ہو گئیں۔ ۱۸۱۹ء میں تعلیم نسواں کا پہلا اسکول کلکتہ میں جاری ہوا۔ ۱۸۵۴ و ۱۸۴۴ء میں گورنمنٹ نے ایک مراسلے کے ذریعے اس قسم کے پرجوش لوگوں کو سرکاری امداد دینے کی تجویز کی جو اس کار خیر میں کوشاں تھے۔ ۱۸۴۴ء میں سرکاری امداد کا باقاعدہ نظم ہو گیا۔ ساتھ ہی باقاعدہ نصاب تعلیم مقرر ہوا۔

سرسید احمد خاں، مولانا اشرف علی تھانوی اور دوسرے علمائے کرام نے لڑکیوں کی تعلیم کے اس نئے نظام کی مخالفت کی۔ ان کے خیال میں لڑکیوں کو لکھنا سکھانا، جغرافیہ کی تعلیم دینا، گھر کے باہر کے ماحول سے متعارف کرانا انھیں آزاد خیال بنانا تھا۔ مشنریوں نے لڑکیوں میں تعلیم کو بہت فروغ دیا۔ ۱۸۵۰ء میں میونسپل مدرسے قائم ہوئے ۱۸۵۲ء میں کلکتہ میں ایک نارمل اسکول قائم ہوا جس میں عیسائیوں کو استانی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ گورنمنٹ کی طرف سے تعلیمات کے محکمے قائم ہوئے۔ نصاب تعلیم کے باقاعدہ طریقے جاری ہوئے۔ سرسید نے ان مدرسوں سے اپنی نفرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

> "سب یقین جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں اسکول میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہو جائیں۔ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی۔ بعض اضلاع میں اس کا نمونہ قائم ہو گیا تھا۔"

۱۸۵۷ء کے بعد تعلیم نسواں کی طرف مشنری سوسائٹیوں کی خصوصی توجہ نظر آتی ہے۔ تعلیم نسواں کے پیچھے مشنریوں کا مقصد اپنے خیالات و نظریات کی ترویج تھی۔ وہ ہندوستان کے معاشرے کو یورپ کی تہذیب و تمدن میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ اس لیے تاریخ کو غلط انداز میں پیش کیا گیا اور لڑکیوں میں مردوں سے آزادی و برابری کے تصور کو فروغ دیا گیا۔ اسی وجہ سے اس زمانے کے تمام اکابرین نے دنیاوی تعلیم کے علاوہ مذہبی تعلیم کو اشد ضروری بتایا۔ دینی تعلیم پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔ مشنریوں کی کوشش سے تعلیم نسواں گھروں کی چار دیواری سے نکل کر سڑکوں پر آ گئی۔ یہ ایسی بہتی گنگا بن گئی کہ جو چاہے اس سے فیض یاب ہو۔ حامیان تعلیم نسواں کو مولانا حالی کی نظم "چپ کی داد" سے بہت مدد ملی۔

مسلمانوں نے لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت محسوس کی اور ۱۹۲۰ء کے بعد ڈگری کلاسوں میں بھی مسلمان طالبات کے نام نظر آنے لگے۔ ۱۹۲۳ء میں نور النساء نامی خاتون نے بی اے اور انگریزی مضمون نگاری میں انعام حاصل کیا۔ ۱۹۲۴ء میں نور جہاں اور مس یوسف جہاں نے ایم اے کی ڈگری لی، پنجاب میں خدیجہ بیگم نے پردے کی پابندی کے ساتھ ایم اے اور مس محبوب عالم اور مس فیروز الدین نے بی اے کیا۔ کلکتہ میں فرخ سلطان نے فارسی میں ایم اے اور رقادہ سلطان نے بی اے کیا اور تاریخ کے مضمون میں اوّل رہیں۔ عصمت خانم نے لندن میں سی۔ ایم۔ بی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ یہ صرف پہلی مسلمان بلکہ پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جو اس امتحان میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی۔ شائستہ خاتون نے اردو کے مضمون میں لندن یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری لی۔ عثمانیہ، میسور، مدراس یونیورسٹیوں اور دیگر مقامات سے متعدد خواتین نے کامیابیاں حاصل کیں۔

شیخ عبد اللہ کی کوششوں سے مسلم یونیورسٹی میں گرلز کالج کا قیام عمل میں آیا۔ شروع میں یہ نارمل

سکول تھا جس کا مقصد استانیوں کی تعلیم و تربیت تھا ن چونکہ مسلمان طالبات نارمل اسکول کے لیے مہیا نہ سکیں۔ لہذا عام تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اسکول ندہی سالوں میں ہائی اسکول کے درجے کو پہنچ گیا ر ۱۹۴۰ء میں مسلم یونیورسٹی سے الحاق کر دیا گیا۔

خواتین کی تعلیم کا جائزہ لیتے وقت یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ عورت کی اولین منزل اس کا گھر ہے اور بچوں کی تعلیم و تربیت میں عورت کو خاوند کا شریک ہونا چاہیے۔ بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت عورت کی توجہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے اسے خود بھی تعلیم یافتہ ہونا چاہیے۔ تعلیم کے حصول کا مقصد مردوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ نوکری کرنا نہیں بلکہ کل کے سماج کی تعمیر ہے۔ نوکری عورتوں کے لیے بری چیز تو نہیں لیکن وہ اپنے گھر کے حقوق ادا نہیں کر سکتیں جو اُن کا اولین فرض ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر میں بدمزگی کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے شوہر جب باہر سے آتا ہے تو اسے گھر میں سکون کی تلاش ہوتی ہے لیکن عورت خود آٹھ دس گھنٹے کے بعد گھر اسی غرض سے واپس آتی ہے۔ ایسی حالت میں کون کس کو سکون پہنچا سکتا ہے۔ عورت مرد کا لباس ہے۔ لباس کا کام جسم کو ڈھکنا اور اس کی زینت کو برقرار رکھنا ہوتا ہے لیکن لباس میں جب یہ صلاحیت موجود نہ ہو تو پھر ایسا لباس مرد کے کس کام کا۔

موجودہ ترقی یافتہ مادی زمانے میں عورتیں تعلیم یافتہ ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے کامیاب ہونے کا تناسب مردوں کے مقابلے زیادہ ہوتا ہے لیکن مخلوط تعلیم نے ان کے اندر اخلاقی پستی ہی پیدا نہیں کی بلکہ شرم و حیا کے زیور کو بھی ان سے چھین لیا ہے۔ نیز اُن کے فرض منصبی سے بھی اُن کو آزاد کر دیا ہے۔ پھر تعلیمی نظام نے اس مادی دوڑ میں انھیں مردوں کے مدمقابل لا کھڑا کیا ہے جس سے ان کی زنانہ صفات اور ان کے حقوق مجروح ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کی تعلیم کا صحیح نظم ہو۔ نیز ان کا نظام تعلیم ایسا مرتب کیا جائے جس سے انھیں علوم دین و دنیا کے علاوہ اپنی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کا بھی احساس ہو، سماج کی تعمیر کا خیال ہو، اس لیے ضروری ہے کہ ان کے اسکول کالج الگ ہوں۔ ان کے اندر یہ جذبہ بھی پیدا کیا جائے کہ لڑکیوں میں تعلیم کے فروغ کی وہ خود بھی ذمہ دار ہیں اور خاندان کو چلانے کی ذمہ داری بھی انھیں پر ہے۔ اسی لحاظ سے کارخانۂ زندگی کے ان مختلف شعبوں کی بھی وہی ذمہ دار ہوں جن کا تعلق خواتین سے ہے۔ جدید زمانے میں بھی کتنی ہی خواتین ایسی ہیں جو اپنے حقوق و فرائض سے واقف نہیں۔ بیدار مغز خواتین کو چاہیے کہ انھیں بیدار کریں اور تبلیغ و اشاعت دین میں مصروف ہوں۔ میرا خیال ہے کہ خواتین کو اپنے کاموں کے ادا کرنے کی پہلی فکر ہونی چاہیے نہ کہ دوسرے دائروں میں دخل اندازی۔

---

**تصحیح**

جنوری ۹۲ء کے شمارہ میں صفحہ ۴۷ پر ڈاکٹر حکیم سید کمال الدین حسین (ہمدانی) کا نام، تحقیقی مقالے کا عنوان اور ڈگری ملنے کا سال غلط شائع ہو گیا ہے۔ صحیح یوں ہے۔

ڈاکٹر سید محمد کمال الدین حسین ۔ علامہ سید غلام حسنین کنتوری کی حیات اور کارنامے ۔ ۱۹۷۵ء (ادارہ)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱، شمارہ ۲ (فروری ۱۹۹۲ء)

# حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

محمد صہیب صدیقی ○

یوں تو ہر صدی و ہر دور میں حکومتوں اور سلطنتوں کا عروج و زوال ہوتا رہا مگر اٹھارویں صدی عیسوی تاریخ میں عروج وارتقا، انتشار و ابتری کے لحاظ سے پر آشوب و پُر انقلاب صدی کی حیثیت سے جانی جاتی ہے کیونکہ اس صدی کے آغاز میں ایک سلطنت کی شان و شوکت کا چراغ تقریباً بجھ جاتا ہے اور ایک گمنام قوم گوشۂ ظلمات سے ہمت و اولوالعزمی کی ضیا پاش کرنوں کے ساتھ طلوع ہوتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جب سلطنت مغلیہ ترقی کرتے کرتے عروج و کمال کی بلندی تک پہنچی تو دہلی کے تخت پر حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ جلوہ افروز ہوئے جو فراست ذہنی علم و کمال نیز زہد و تقویٰ میں نادر و یکتا تھے۔ انھوں نے پورے ہندوستان پر مرکزیت کا قانون لاگو کیا اور حکومت میں مرکزیت پیدا کی۔ پھر اس کے بعد رفتہ رفتہ سنّی شیعی فرقہ پرستی کی وجہ سے جو پہلے ہی سے چل رہی تھی۔ دو گروہ مقابلے پر آتر آئے اور ملک میں فسادات کی صورت پیدا ہونے لگی، ابتری پھیلنے لگی۔ اکثر فرقوں میں ملک گیری کی ہوس پیدا ہو گئی۔ ایسے حالات میں نادر شاہ کے حملے اور ہندوستان سے ستّر کروڑ روپیے مال غنیمت میں لے جانے کے واقعے نے جلتے پر تیل کا کام کیا اور عوام کے دل سے پوری مغلیہ حکومت کا رعب داب ہی ختم ہو گیا اور ملک کا شیرازہ بکھرنے لگا۔

ایسے حالات میں جب کہ پورے ہندوستان میں خلفشار برپا تھا۔ ہندوستانی سماج میں خصوصاً مسلمان تباہی کے دہانے پر تھے۔ مسلمانوں میں رسوم و بدعات زوروں پر تھیں۔ علم و عمل کا فقدان ہونے لگا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے مغلیہ سلطنت کی بجھتی ہوئی لو کو سہارا دینے اور مسلمانان ہند کو پھر سے علم و عمل کی روشنی سے سرفراز کرنے کے لیے ایک ایسی بزرگ شخصیت کو بھیجا جو ہر علم و فن میں ماہر ہونے کے علاوہ داعی و مبلغ بھی تھی جنھوں نے اپنے زمانے کی سیاسی و معاشرتی حالات کے اصلاح کی حتی الامکان کوشش کی ——— میری مراد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

آپ کی ولادت بدھ کے دن ۱۷۰۳ء طلوع آفتاب کے وقت مغلیہ سلطنت کے سیاسی مرکز دہلی میں ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں آپ کی تعلیم شروع ہوئی۔ آپ کی

○ ریسرچ اسکالر شعبہ عربی، اے ایم یو علی گڑھ

تعلیم و تربیت میں آپ کے والد محترم شاہ عبدالرحیم رح
نے بے انتہا محنت کی جس کی وجہ سے شاہ صاحب نے
پندرہ سال کی کم عمری ہی میں اس زمانہ میں رائج علوم
متداولہ سے فراغت حاصل کر لی تھی اور اس سے قبل
چودہ سال کی عمر میں ہی آپ کی شادی ہو گئی تھی اور اسی
چودہ سال کی عمر میں آپ نے اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت
کر لی اور اشتغال صوفیہ میں مشغول ہو کر توجہ و تلقین حاصل
کی۔ جب سولہ سال کی عمر ہوئی تو اپنے آبائی مدرسہ
رحیمیہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ سترہ سال کی عمر میں
آپ کے والد بزرگوار نے مرض الموت میں بیعت وارشاد
کی اجازت دیتے ہوئے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ آپ
کا دوسرا عقد پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد سید ثناء اللہ
سونی پتی کی صاحب زادی سے ہوا۔ والد صاحب کی وفات
کے بعد آپ بارہ سال تک درس و تدریس کے منصب
پر قائم رہے اور تیس سال کی عمر میں حجاز مقدس کے
سفر کا ارادہ کیا اور حرمین شریفین تشریف لے گئے۔ اس
زیارت کے دوران آپ نے ابن تیمیہ کے افکار کا بغور
مطالعہ کیا اور اس وقت کے نامور محدثین سے سماعت
حدیث کی اور طاہر مدنی شافعی سے خرقۂ جامعہ حاصل کیا پھر
ایک سال تک وہاں رہ کر علوم دینیہ سے مستفیض ہوتے
رہے۔ اس کے بعد ہندوستان واپس تشریف لائے۔ اس
میں شبہ نہیں کہ آپ سے قبل صدیوں میں بکثرت ایسے
ائمہ دین اور علمائے اسلام گزرے ہیں جنھوں نے
اسلام کو شعبۂ ہائے زندگی کے ایک قانون و رہنما کی
حیثیت دی ہے لیکن شاہ صاحب ان تمام ائمہ اور علمائے
کرام کی صفوں میں اس طور پر بزرگ و برتر نظر آتے
ہیں کہ تمام اسلامی معاملات کو مرتب کر کے ایک انسائیکلوپیڈیا
کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ شاہ صاحب یگانۂ زمانہ
محدث، بلند پایہ مفسر، بے مثال حکیم فلسفی، ایک
نادر المثال مدبر و فقیہ، ایک قابل تقلید صوفی و راہنما ہونے
کے علاوہ واعظ اور خطیب بھی تھے۔ ان کی اس ہمہ جہت
روشن شخصیت کی شہادت آپ کی زندگی کے واقعات
اور فقید المثال تصنیفات فراہم کرتی ہیں۔

آپ نے ایک طرف تو مروجہ برائیوں اور خرابیوں
پر تنقید کی اور عوام الناس کے ذہن و فکر سے غلاظت
کو دور کرنے کی جدوجہد کرتے ہوئے نئی روشنی پیدا کرنے
کی کوشش کی اور دوسری طرف تعمیری زندگی کا ایک
ایسا نقشہ پیش کیا جس کا بنی نوع انسان میں سے ہر فرد
تخریب فاسد کے مرحلے کو سر کرنے کے بعد محتاج ہوتا ہے۔
آپ کا روئے سخن تمام عالم کی طرف تھا۔ آپ نے جس
قدر قواعد و کلیہ بیان کیے ہیں وہ عمومی حیثیت رکھتے ہیں
اور تمام اقوام عالم کے لیے قابل قبول ہیں۔ یہ الگ بات
ہے کہ ان کے اولین مخاطب مسلمان ہیں۔ اس لیے انھوں
نے مسائل کی مثالیں شریعت اسلامی سے دی ہیں یہ
تخصیص اس لیے کی کہ اگر قرآن کو ماننے والے صاحب
فکر و عمل حصہ کو دنیا کے سامنے عملی نمونہ بنا کر پیش کر دیا
جائے تو پھر اس کے ذریعے باشندگان ملک اور
اس کے بعد عالم انسانی میں عمومی انقلاب پیدا کیا جائے
اصلاح و تجدید کا فریضہ انجام دینے سے متعلق
آپ کا نظریہ یہ تھا کہ جب تک انسان کا مادی ماحول
درست نہ ہو جائے اس وقت تک فکر و روح کی دنیا
میں اصلاح ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سوسائٹی
کے نظام حکومت کے دستور، معاشی تنظیم اور ان تمام معاملات
کے اندر انقلاب آفرینی کے خواہاں تھے۔

آپ کے زمانے میں مسلمانوں کے اندر مختلف
اسباب کی بنا پر مشرکانہ عقائد و رسوم کا رواج کافی
حد تک تھا۔ بہت سے مسلمان اولیاء و صالحین کے بارے
میں اس طرح کے غالیانہ و مشرکانہ عقائد رکھنے

تھے جس طرح یہود و نصاریٰ عزیر و مسیح اور اپنے رہبان کے متعلق رکھتے تھے۔ اہل قبور سے صاف صاف استعانت کا معاملہ ہونے لگا۔ یہ حال عرب کے شہر مصر، شام اور عراق کا تھا۔ اب اس کے مقابلے میں ہندوستان کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اس کے علاج کے لیے قرآن کریم کے مطالعہ و تدبر اور اس کے فہم کو سب سے موثر علاج سمجھا۔ چنانچہ آپ نے حجاز سے واپسی پر قرآن کریم کا فارسی میں ترجمہ کیا جس نے پہلے فتح الرحمٰن کے نام سے تکمیل پائی۔ فارسی زبان اس زمانے کی حکومتِ اسلامیہ کے بعد سے ملک کی دفتری، علمی، تصنیفی اور خط وکتابت کی زبان تھی اور ہر پڑھا لکھا انسان اس کو اگر بول نہیں سکتا تھا تو سمجھتا ضرور تھا۔

شاہ صاحب نے حدیث کی ترویج و اشاعت درس حدیث کے احیائے فن حدیث کے ساتھ اعتنا اور اس موضوع پر اپنی محققانہ و مبصرانہ تصنیفات کے ذریعہ ایسا عظیم تجدیدی کارنامہ انجام دیا جو آج بھی ہمیں ان کے تجدیدی کاموں میں ایک تابندہ و درخشاں باب کی حیثیت سے نظر آتا ہے آپ کی کوششوں سے ہندوستان میں حدیث کا چلن عام ہوگیا۔ وہ نصاب درس کا ضروری جزو اور معیار فضیلت قرار پائی اور عام طور پر لوگوں میں اس کی وجہ سے عمل کی تحریک اور اتباع سنت کا شوق پیدا ہوا۔ فقہ و حدیث عرصے عالم اسلام میں دو ایسے مسافروں کی حیثیت سے اپنا سفر طے کر رہے تھے جو ایک دوسرے سے بے نیاز ہو کر کسی ایک نکتہ پر ہمکنار نہیں ہوتے تھے۔ مذاہب فقہیہ کے کچھ ایسے ڈھانچے بن گئے تھے جن کا ٹوٹ جانا تو ممکن تھا مگر وسیع ہونا ممکن نہ تھا۔ ہر مسلک کا پیروکار دوسرے مسلک والوں کے خلاف تھا اور اس کو برملا غلط کہتا تھا۔ اسی طرز فکر کے نتیجے کی وجہ سے مذاہب اربعہ کے درمیان روز بروز خلیج وسیع و عمیق ہوتی جا رہی تھی۔ بحث و مباحثہ کبھی مجادلہ و مقاتلہ تک پہنچ جاتا۔ ان تشویش ناک حالات میں شاہ صاحبؒ نے فقہ و حدیث میں تطبیق کی اور مذاہب اربعہ میں جمع و تالیف کی کوشش کی۔ اس طرح گویا آپ نے امت کی شیرازہ بندی کا عظیم الشان کام سرانجام دیا۔ آپؒ سے قبل اس نوعیت کی جدوجہد کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔

پھر آپ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب حجۃ اللہ البالغۃ، تصنیف فرما کر نظام شریعت کا ایک ایسا مربوط اور مدلل نقشہ پیش کیا ہے کہ وہ سب ایک ہی ہار کے موتی معلوم ہوتے ہیں اور ان میں اصول و فروع، مقاصد و وسائل اور اعلیٰ و موقت کا فرق نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتا۔ اس طرح سے یہ کتاب اس دور عقلیت کے لیے ایک نیا علم بن گئی جس میں ایک حق پسند، سلیم الطبع انسان کے لیے تشفی کا وافر سامان ہے۔ اس کے بعد آپ نے ازالۃ الخفاء تصنیف کی اس میں آپ کی جلالت علمی دقیق نظری پوری آن بان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ کتاب بھی معرکۃ الآرا ہے۔ پھر "التفہیمات الٰہیہ" نام کی کتاب تصنیف کی جس میں اپنے زمانے کے مسلم معاشرے اور ملت اسلامیہ کے مختلف طبقات کی بیماریوں اور کمزوریوں کی اس طرح نشان دہی کی ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی عوامی زندگی، معاشرے کے مختلف طبقات، سلاطین اسلام و ارکان دولت، فوجی سپاہیوں و اہل صنعت و حرفت، مشائخ کی اولاد، غلط کار علماء، تارک الدنیا و عزلت گزیں زاہدوں کے حالات سے پوری طرح واقف ہیں۔ آپ نے ان کی بیماریوں اور کمزوریوں کو بیان کر کے ان کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھی ہے ان سب کے علاوہ پوری ملت اسلامیہ سے عمومی اور جامع خطاب فرمایا ہے جس میں امراض کی تشخیص کے ساتھ ان کا علاج بھی بتایا ہے۔ ان تمام خطابات میں شاہ صاحب کا سوز دروں، حمیت دینی، جذبۂ دعوت اور بلند قلم پوری

آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

شاہ صاحب کے زمانے میں مغلیہ سلطنت جس دور سے گزر رہی تھی اسے اس کا دم واپسیں کہنا بے جا نہ ہوگا سلطنت کا سارا نظام کھوکھلا ہو چکا تھا۔ مرکز کے کمزور ہونے کی وجہ سے پورے ملک میں انتشار و بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ جہاں و اورنگ زیب کی دہلی اپنی عظمت دیرینہ کو خیرباد کہہ چکی تھی۔ ان حالات کو دیکھ کر آپ پریشان ہو گئے اور اپنی طرف سے کوششیں شروع کیں۔ آپ نے ہر اس موقع پر قسمت آزمائی کی جہاں کامیابی کی موہوم امید بھی تھی۔ چنانچہ اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ خط و کتابت کے ذریعے مغل فرماں رواؤں اور ان کے امرائے دربار سے رابطہ قائم کر کے ان میں حمیت ملی و غیرت دینی پیدا کی جائے اور بگڑے ہوئے حالات و انتشار انگیز طاقتوں سے انھیں پنجہ آزمائی پر آمادہ کیا جائے۔ بلکہ انھوں نے درباری امرا کے حلقہ سے باہر نکل کر ان امرائے سلطنت آزمودہ کار قائدین افواج اور عالی حوصلہ سرداروں سے خط و کتابت کی جن کی خاکستر میں ان کو دینی حمیت اور قومی عزت کی کوئی دبی ہوئی چنگاری نظر آئی۔ ان میں یہ امرائے سلطنت اور قائدین تھے۔ وزیر آصف جاہ، نواب فیروز جنگ، عماد الملک وزیر تاج محمد خاں بلوچ، نواب مجد الدولہ بہادر، نواب عبد اللہ خاں کشمیری، میاں ناز گل خاں، سعید احمد روہیلہ ان کے علاوہ آپ کی خصوصی نگاہ اس عہد کی دو عظیم شخصیتوں پر تھی جن میں سے ایک اندرون ہند نجیب الدولہ تھے اور بیرون ہند احمد شاہ ابدالی والئ افغانستان تھے۔ نواب نجیب الدولہ میں وہ تمام صفات و خصائص پائے جاتے تھے جو عہد قدیم میں بانیان سلطنت کی خصوصیتیں ہیں مگر ان کو ایسا فاسد ماحول ملا جس میں غداری دھوکہ بازی وغیرہ رذائل معیار شرافت بن گئے تھے اس لیے ان کو حکومت میں کامیابی نہ ملی۔ آپ نے خط و کتابت کے ذریعے ان کی دینی حمیت کو بیدار کیا اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا۔

اس خطرے کو فرو کرنے کے لیے کسی ایسے تجربہ کار عسکری قائد اور منظم سپاہ کی ضرورت تھی جو جدید جنگی طاقت سے مزین ہو۔ اس میں سپاہ گری و شجاعت کے علاوہ غیرت ایمانی و دینی حمیت بھی ہو۔ جو اتنا بڑا ظرف رکھتا ہو کہ ملک کو خطرات سے دور کر کے یہیں کے قدیم حکمراں خاندان کے کسی باصلاحیت فرد کو زمام حکومت واپس کر کے چلا جائے۔ یہ تمام صفات احمد شاہ ابدالی والئ افغانستان میں تھیں۔ آپ نے خود کئی مرتبہ خطوط تحریر کیے اور نواب نجیب الدولہ سے بھی خطوط لکھوائے اور مدد طلب کرتے رہے۔ بالآخر شاہ صاحب کی محنت کارگر ثابت ہوئی اور احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۵۹ء میں ہندوستان کا قصد کیا۔ آخر کار اس نے شاہ عالم کو بادشاہ کی حیثیت سے تسلیم کرانے کے بعد اس کی غیر موجودگی میں اس کے بیٹے جواں بخت کو اس کا نائب مقرر کیا اور واپس قندھار چلا گیا۔

شاہ صاحب نے بے انتہا کتابیں تصنیف کیں اور تمام کی تمام بلند پایہ ثابت ہوئیں۔ آپ کی پہلی اہلیہ سے شیخ محمد پیدا ہوئے جنھوں نے آپ ہی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور دوسری اہلیہ سے چار صاحب زادے پیدا ہوئے۔ یہ چاروں شاہ عبد العزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبد القادر اور شاہ عبد الغنی بہت نامور ہوئے اور جنھوں نے آگے چل کر دین کی نشاۃ ثانیہ میں اہم رول ادا کیا۔

بالآخر شاہ صاحب کی عظیم شخصیت بھی جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے وقف تھا اس حقیقت سے

باقی صفحہ نمبر ۴۳ پر

بانی
سرسید احمد خاں

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

# تہذیب الاخلاق

جلد ۱۱ — شمارہ ۳

مارچ ۱۹۹۲ء

سرپرست

## پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

## کبیر احمد جائسی

شفیق احمد

نائب مدیر

شباب الدین

زر سالانہ : [illegible]

[illegible]

ترسیل زر کا پتہ :
ادارہ تہذیب الاخلاق [illegible]
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

EDITOR,
TAHZEEB-UL-AKHLAQ
[illegible]
ALIGARH MUSLIM
UNIVERSITY, ALIGARH

# مندرجات



[تہذیب الاخلاق میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو۔]


مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ پرنٹر پبلشر، اسرار احمد ۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق
بینڈ لنشانت ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۔ پریس: اے ایم یو پریس، علی گڑھ

# اداریہ

احتیاط ایک ایسا لفظ ہے جس کو ہم روزانہ متعدد بار استعمال کرتے ہیں۔ کبھی سمجھ بوجھ کر کبھی بے سمجھے بوجھے کبھی کسی پس منظر میں تو کبھی کسی پس منظر میں۔ یہ لفظ ہے تو ایک ہی مگر اس کے عکس بدلتے رہتے ہیں۔ کچھ نافہم اس کو دنایت، بزدلی، کم ہمتی کا مترادف سمجھتے ہیں اور ارباب عقل و دانش اس کو تدبر، عالی ظرفی اور معاملہ شناسی کا غماز گردانتے ہیں۔ اس لفظ کو دنایت، بزدلی اور کم ہمتی کے معنوں کا مترادف وہ لوگ سمجھتے ہیں جو اصلاً تو احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں مگر اس پر بناوٹی انانیت کا پردہ ڈال کر اس کو احساسِ برتری کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو جو لوگ احساسِ برتری کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں وہ اصلاً کسی نہ کسی نوع کی احساسِ کمتری میں مبتلا رہتے ہیں چاہے اس احساسِ کمتری کا تعلق جسمانی وضع قطع اور رنگ روپ سے ہو چاہے کسب کمالات سے۔ ایسے ہی لوگوں کے نزدیک احتیاط کا لفظ دنایت بزدلی اور کم ہمتی کا مترادف ہے۔ ایسے لوگوں کا مطالعہ تو ہم علمائے نفسیات پر چھوڑتے ہیں اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک ذرا سی احتیاط کس کس طرح ہم کو فتنہ و فساد سے بچا سکتی ہے

سوچیے تو انسانی زندگی اظہار خیال ہی سے عبارت ہے۔ اس میں عالم و عامی کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ یہ اظہارِ خیال اجتماعی مسائل سے بھی متعلق ہو سکتا ہے اور انفرادی مسائل سے بھی، علمی بھی ہو سکتا ہے اور ادبی بھی۔ مذہبی بھی ہو سکتا ہے اور خالص دنیوی بھی۔ ہم کو شب و روز کسی نہ کسی مسئلے، واقعے اور حادثے پر اظہار خیال کرنا ہی ہوتا ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو انسانی زندگی کی ساری ہماہمی یک قلم موقوف ہو کر رہ جائے۔ احتیاط اور اظہار خیال کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چولی اگر مسک گئی تو دامن پھٹنے سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔ اس لیے کسی بھی چیز پر اظہار خیال کرتے وقت ہم کو تدبر، عالی ظرفی اور معاملہ شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتہائی احتیاط کے ساتھ اظہار خیال کرنا چاہیے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ہم الفاظ کا استعمال بڑی بے احتیاطی کے ساتھ کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا اظہار خیال دل آزاری اور دشنام طرازی کا ملغوبہ بن کر رہ جاتا ہے اور ایک معمولی سا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بسا اوقات یہ سنگینی اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ افراد ہوں یا جماعتیں دونوں میں سر پھٹول کی نوبت آ جاتی ہے۔

گفتگو میں الفاظ کا انتخاب ہمارے محتاط رویے کی غمازی کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انتخاب الفاظ کا دوسرا نام احتیاط ہے۔ فرض کر لیجیے کہ آپ کھانا کھا رہے ہیں اور آپ سے ملنے کوئی صاحب تشریف لاتے ہیں اگر وہ آپ کے برابر کے ہیں اور ان سے آپ کی بے تکلفی بھی ہے تو آپ کہیں گے کہ آ دھمکے کھانا

کھالو۔ اگر آنے دانے سے آپ کا معاملہ تکلف کا ہے تو آپ کی زبان سے نکلے گا "ماحضر نوش فرمالیں"۔ ان دونوں جملوں پر کسی کو کسی طرح کا کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن اگر آپ مزاحاً بھی کسی بہت ہی بے تکلف دوست سے یہ کہہ دیں کہ "آؤ ٹھونس لو" تو آپ کا دسترخوان میدان کارزار بنے بغیر نہ رہے گا۔

بے احتیاطی کی ایک دوسری مثال یاد آگئی وہ بھی سنتے چلیے۔ بہت سے بظاہر پڑھے لکھے، مہذب، گنی اور سیلانے جب خود اختیاری "ہیضۂ حق گوئی" کا مظاہرہ کرتے ہیں تو کف دردہاں چیخ چیخ کر اعلان کرنے لگتے ہیں کہ "حرام زادوں نے یہ کر دیا"۔ اب ایسے "ہیضۂ حق گوئی" کے مریضوں کو کس طرح سمجھایا جائے کہ اگر کوئی شخص واقعتاً اور حقیقتاً حرام زادہ ہے تو وہ بے چارہ اس قصور سے بری الذمہ ہے۔ اگر وہ مستحق ہے تو ہمدردی کا پردہ پوشی کا اور دلدہی کا نہ کہ اس بات کا کہ جس عمل کا وہ ذمّہ دار نہیں ہے اس کے لیے اس کو دوسروں کی نظروں سے گرایا جائے اور ذلیل کیا جائے اور اگر جس کو 'ہیضۂ حق گوئی' کا مریض حرام زادہ قرار دے رہا ہے وہ حرام زادہ نہیں ہے تو معاملہ اور سنگین ہو جاتا ہے۔ اب وہ انسانوں ہی کو نہیں اللہ کو بھی جواب دہ ہے کہ اس نے کسی پر زنا کی تہمت کیوں اور کیسے لگائی؟ اگر کوئی شخص زنا کا مرتکب نہیں ہوا ہے اور اس پر کوئی شخص زنا کی تہمت لگاتا ہے تو بندے چاہے اس کو بخش دیں مگر اللہ کے یہاں تو ایسے شخص یا اشخاص کے لیے وہ آتشیں درّے ہیں جن کی چوٹ کا اندازہ لگانا ذہن انسانی کے بس کی بات نہیں۔ ایک ذرا سی بے احتیاطی انسان کو کس عذاب میں مبتلا کر سکتی ہے اس کا اندازہ صرف اسی ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔

احتیاط ہے تو ایک چھوٹا سا لفظ لیکن دنیا اور عقبیٰ دونوں ہی کے حصول کی شاہ کلید یہی ہے۔ احتیاط سے اظہار خیال کرنا، احتیاط سے قدم اٹھانا، احتیاط سے قلم کو جنبش دینا، احتیاط سے زندگی گزارنا نہ پست ہمتی کی دلیل ہے نہ دنائیت کی اور نہ ہی کسی قسم کی کمزوری کی۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ فریب مسلسل کا شکار ہیں اُن کے نزدیک جارحانہ رویہ اختیار کرنا، بے اصل اور بے بنیاد الزامات لگانا، اپنی زبان دوسروں کے منہ میں ڈالتے رہنے کی کوشش کرتے رہنا ہی جادۂ حق پر گامزن ہونے کی علامت ہے حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ جادۂ حق پر گامزن صرف وہی ہو پاتا ہے جو احتیاط کو اس کے صحیح معنیٰ و مفہوم میں سمجھ بوجھ اور غور و فکر کر کے اختیار کرتا ہے اور جب اس دشوار گذار راہ پر ایک بار چل پڑتا ہے تو کوئی آندھی کوئی طوفان، راستے کی کوئی رکاوٹ یا نفسانیت اس کے قدم کو جادۂ احتیاط سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ کامیاب و کامران اور اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرنے کا نسخۂ کیمیا احتیاط اور صرف احتیاط ہے۔ نسخۂ کیمیا تو ہماری نگاہوں کے سامنے ہے جس سے ہم سب ہی واقف ہیں۔ بات صرف اس کو استعمال کرنے کی ہے۔ افسوس کہ ہم اس نسخۂ کیمیا سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے اور اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی کو بھی جہنم بنانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔

کبیر عباسی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۱۱ شمارہ ۳ (مارچ ۱۹۹۲ء)

# اِن شاء اللّٰہ

سید احمد خاں

"کافر۔ کافر"

"کیوں حضرت کافر کیوں؟"

"تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا ' انا مومن ان شاء اللّٰہ"
[ ان شاء اللّٰہ میں مومن ہوں ]۔

"کافر کافر! یوں کہو " انا مومن حقا [میں یقیناً مومن ہوں ] اس جگہ ان شاء اللّٰہ کا لفظ نہیں کہتے۔ ایسے موقع پر یوں بولنا کفر ہے"۔

"پھر حضرت کس جگہ کہتے ہیں؟"

"قسم سے بچنے وعدہ نہ کرنے، بے گناہ کو دھوکا دینے، جھوٹ بولنے اور جھوٹا نہ ہونے میں۔"

"حضرت! پھر تو ان شاء اللّٰہ خوب اوزار ہے کیا مسلمانوں کا برتاؤ اسی مسئلے پر ہے؟"

"ہاں جو پرہیزگار، مولوی، عالم، شرع پر چلنے والے ہیں، اللہ لوگوں کے بچانے کو ہیں وہ ہمیشہ اس پر خیال رکھتے ہیں۔"

"حضرت! میں تو نہیں سمجھا۔"

"تم کیا جانو، اصول فقہ کو جانا ہو، عالموں کی صحبت [illegible]

نہ کبھی، جانو تو کیا جانو!"

"حضرت آپ ہی سمجھا دیجیے۔"

"ارے میاں! "ان" کے معنی " اگر"، "شاء" کے معنی "چاہا"، اللّٰہ کے معنی تو اللّٰہ کے ہیں ہی مگر وہ فاعل واقع ہوا ہے جس نے معنی "نے" کے ہوتے ہیں۔ ان سب کو ملاؤ تو یہ معنی ہوئے " اگر چاہا اللّٰہ نے" اب دو مسئلے فقہ کے اور سمجھ لو۔ اگر کوئی امر کسی پر مشروط ہو اور بہ سبب نہ پورے ہونے شرط کے ادا نہ کیا جائے تو کچھ گناہ لازم نہیں آتا۔ " اذا فات الشرط فات المشروط" ایک مسئلہ ہوا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خالق جمیع افعال عباد کا خدا ہے۔ پس جب ان دونوں مسئلوں کو ملا کر ان شاء اللّٰہ کے معنوں کو دیکھو تو ان شاء اللّٰہ کہنے کے بعد کچھ گناہ نہیں رہتا۔"

"حضرت میں مسئلے کو تو بخوبی سمجھ گیا، مگر اب تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ گناہ کیوں کر نہیں رہتا؟ کیا وہ لفظوں کے الٹ پھیر سے اڑ جاتا ہے؟"

"جاہل! اور کیا؟ ہمارے جیب میں ایک گھڑی ہے۔ ہمارے دوست کو اس کی ضرورت ہے۔ جب اس نے ہم سے مانگی ہم نے کہا کہ ہم ارے [illegible]

کوئی گھڑی ہی نہیں۔ اُس نے کہا "قسم تو کھاؤ" ہم نے کہا "خدا کی قسم! ہمارے گھر میں کوئی گھڑی نہیں۔" ہمارے گھر میں ایک اشرفی رکھی ہے، ہمارے دوست نے ہم سے اشرفی مانگی۔ ہم نے کہا "ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں۔" اُس نے کہا "قسم تو کھاؤ" ہم نے کہا "خدا کی قسم! ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں۔" کیوں سچ بات ہوئی کہ نہیں؟ بات ہی بات میں گناہ الٹ گیا کہ نہیں؟ یہ تو باتیں ہی باتیں ہوئیں؟ روپے پیسے، سود بٹے کے معاملے میں بھی لفظوں ہی کے الٹ پھیر سے گناہ الٹ جاتا ہے۔ تولہ بھر سونا سولہ روپے کی قیمت کا ہم سے قرض لے لو۔ سود سے بچنے کو کہہ لو کہ بیس تولے چاندی لیں گے۔ سولہ تولے چاندی میں دیے تولہ بھر سونا آیا اور چار تولے چاندی سود میں بچ رہی اور سود نہ ہوا۔ کھوٹا سونا جس میں ذرا سا تانبے کا میل ہو قرض دو اور اسی وزن کے برابر کھرا سونا لے لو۔ مال تو زیادہ کا ہاتھ لگ گیا اور سود نہ ہوا۔ مکان گروی رکھو، راہن سے کہلوا لو کہ سکونت میں نے محل کی۔ کرایے کا فائدہ ہوا اور سود نہ ہوا۔ گاؤں گروی لو۔ مثلاً ہزار روپے کو جس میں دو سو روپے سالانہ کا فائدہ ہو۔ راہن سے اسی روپے سال دینے کے اقرار پر پٹا لکھوا لو اور گاؤں پر قبضہ کر لو۔ کل منافع تحصیل کرو۔ ایک سو بیس روپے سال سود کے پٹے کے نام سے بچے کہ نہیں؟ اور سود نہ ہوا۔"

"حضرت کیا یہ ہوتا ہے؟"

"خدا کی قسم! سب کرتے ہیں۔ جتنے مقدس، خدا پرست، وہابی، نیم وہابی، مقلد حنفی، زمین دار، تعلقہ دار ہیں سب کرتے ہیں۔ بڑے بڑے مولویوں نے فتوے دے دیے ہیں۔ اب سمجھے کہ لفظوں کے الٹ پھیر سے گناہ پلٹ گیا کہ نہیں۔ کوئی ہمارے پاس زکوٰۃ کا روپیہ لائے اور ہم مستحق ہوں ابھی گھر میں جا کر بیوی سے کہہ آویں کہ ہم نے اپنا کل مال تم کو ہبہ کیا۔ اب مفلس ہو گئے کہ نہیں؟ باہر آویں اور زکوٰۃ کا روپیہ لے لیں۔ باتیں ہی تو ہیں۔ ان باریکیوں کو سمجھنے کے لیے علم درکار ہے۔"

"بھلا حضرت! یہ تو ہوا زکوٰۃ کا۔ ان شاء اللہ والی بات رہ گئی۔ اس کو بھی کسی مثال سے سمجھا دو۔"

"ارے میاں یوں سمجھو کہ ہم نے تمہارا دل خوش کرنے کے لیے تم سے کہہ دیا کہ ہم کل تمہارے ہاں آویں گے ان شاء اللہ۔ ہمارا ارادہ آنے ونے کا کچھ نہ تھا۔ یوں ہی کہہ دیا تھا۔ جب نہ گئے تو معلوم ہوا کہ خدا نے نہیں چاہا۔ اسی لیے وعدے کو مشروط کیا تھا "اذا فات الشرط فات المشروط۔" بات کی بات میں گناہ پلٹ گیا۔ کبھی تم عدالت میں گواہی دینے بھی گئے ہو؟"

"ہاں صاحب! ایک دفعہ گیا تھا، میں نے تو جو سچ کہا تھا کہہ دیا مگر میرا بھائی مقدمہ ہار گیا۔ میں کیا کرتا۔ وہاں ایک کالی مخمل کی گول چنٹ دار ٹوپی پہنے ہوئے گوری رنگت کا مسلمان مولوی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس نے قسم دی کہ سچ کہنا۔ میں جھوٹ بولتے سے ڈر گیا، سچ کہہ دیا۔"

"ہاں فقہ نہ جاننے سے، عالموں کی صحبت نہ اٹھانے سے یہی تو نتیجہ ہوتا ہے۔ ارے! جب اس مولوی جج نے قسم دی تھی کہ سچ بولنا، تو نے کہا ہوتا کہ خدا کی قسم سچ بولوں گا ان شاء اللہ۔ اگر وہ جج نام کا مولوی تھا اور فقہ نہ جانتا تھا تو پکار کر ہی انشاء اللہ کہہ دیا ہوتا اور اگر وہ مولوی تھا اور تجھے [illegible] پڑی تھی تو پکار کر کہا ہوتا کہ خدا کی قسم سچ بولوں گا اور جھٹ پٹ دل میں کہہ لیا ہوتا ان شاء اللہ، مگر یہ خیال رکھا ہوتا کہ سانس نہ ٹوٹنے پائے ورنہ [illegible]

کا جوڑ ٹوٹ جاتا۔ پھر جو چاہتے وہ کہہ دیتے۔ ذرا بھی جھوٹی قسم کھانے کا گناہ نہ ہوتا۔"

"حضرت باتیں تو آپ نے خوب بتائیں، مگر میں حیرت میں ہو گیا۔ اب تو رخصت ہوتا ہوں اور کسی سے بھی تحقیق کروں گا۔ میرا دل دھکڑ پکڑ کر رہا ہے۔"

"تم جس مولوی سے چاہنا پوچھنا، یہی بتا دے گا۔ کہو تو میں ابھی ھدایہ، شرح وقایہ، درمختار، بحرالرائق، نہرالفائق اور بڑے بڑے معتبر فتاووں سے ہر ایک جزئی کی روایت نکال دوں اور تم نے وہ فتاویٰ بھی دیکھا ہے جو پرانے خاندانی مولویوں اور قاضیوں کے ہاں ہوتا ہے؟ میں اس وقت اس کا نام بھول گیا ہوں، یاد آجاوے گا تو بتا دوں گا۔ اس میں ہر ایک مسئلے کی نسبت دو روایتیں لکھی ہیں۔ ایک میں جائز حلال اور دوسری میں ناجائز حرام لکھ رکھا ہے۔ پھر جون سی روایت کے مطابق چاہا فتویٰ لے لیا۔ بہت ہوا روپیہ دو روپیے، فتوے کے نام سے نہیں اور کسی نام سے کبھی کبھی دیتے رہے۔ کیوں؟ بات کی بات میں گناہ پلٹ گیا کہ نہیں؟ مگر اس زمانے میں جو کم بخت نئے مقلدین لامذہب ملاحدہ نکلے ہیں وہ تو مذہب اسلام کی جڑ کاٹتے ہیں۔ یا اللہ کیا مشکل پڑی ہے۔"

تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک پیر مرد متبرک صورت سفید ریش ملے؛ جانا کہ یہ بھی کوئی مولوی ہیں۔ پکار کر کہنے لگے کہ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بھائی کیا کوئی مذہبی مسئلہ ہے؟ بولے "حضرت! ہاں مذہب کا مسئلہ ہے۔" انھوں نے کہا کہ بھائی نہ میں مولوی نہ مولوی کی دم۔ مجھ سے اور مذہبی مسئلوں کے پوچھنے سے کیا واسطہ؟ کسی مولوی صاحب سے جا کر پوچھو۔ اس شہر میں بہت سے مولوی ہیں۔ یہاں سے ... [illegible]

کے ڈھیر کے ڈھیر ہیں، وہاں جا کر پوچھو۔"

"نہیں حضرت میں آپ ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کا نام بھی تو مشہور ہے۔"

"ارے میاں! شیطان کا نام تو مجھ سے بھی زیادہ مشہور ہے۔ ابھی ویسی شہرت تو مجھ کو ہوئی بھی نہیں۔ میں نیچری مشہور ہوں، ملا مولوی نہیں ہوں، مجھ سے مت پوچھو۔"

"حضرت! اگر مولوی ملاؤں سے دل کو تسکین ہوتی تو آپ تک کیوں آتے؟ جب دل ہی کو تسکین نہ ہو تو مولوی ملاؤں کو کیا کریں؟ پھر آپ نیچری ہوں یا بینچری، بے پوچھے تو دل مانتا نہیں۔ خدا کے واسطے بتا بھی دو۔"

"اچھا صاحب پوچھو کیا پوچھتے ہو۔ مگر میں کسی فتاوی وتاوی کو نہیں جانتا۔ خدا کی کتاب اور خدا کے فتاوی کو جو سب کی آنکھوں کے سامنے کھلا ہوا ہے جانتا ہوں؛ جو کہوں گا اسی سے کہوں گا۔"

"بہت اچھا! آپ اسی سے فرمایئے گا! میں پوچھتا ہوں کہ آپ "ان شاء اللہ" کو جانتے ہیں؟"

"خوب جانتا ہوں، ہماری دلی کے رہنے والے تھے بڑے شاعر تھے، ذرا مزاج میں ظرافت تھی۔ ان کے یہ اشعار مجھے یاد ہیں۔ پہلے مصرعے میں شاید کچھ لفظ ادل بدل ہو گئے ہیں:

مولوی کہتے ہیں ہم کو تو نے کیوں رسوا کیا
کیا گنہ، کیا جرم، کیا تقصیر ہم نے کیا کیا

واسطہ، باعث، سبب، موجب، جہت، کچھ بات بھی
راز وہ کم بخت کیا تھا میں نے جو افشا کیا

کیا کہا کس سے کہا، کس نے سنا، کب کس گھڑی
کس جگہ، کس وقت، کس دم آپ کا چرچا کیا

"حضرت میں آپ سے انشاء اللہ خان کا حال نہیں ... [illegible]

پوچھتا ہوں کہ کس مراد اور کس مطلب سے اور کس مقام پر اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔"

"یہ کہو! ذرا مجھ کو خدائی فتاویٰ نیچر دیکھ لینے دو۔ اس میں تو یہ لکھا ہے کہ تم کو کسی کام کی نسبت یہ نہ کہنا چاہیے کہ میں کل کروں گا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اگر خدا چاہے تو میں کل کروں گا۔ خدا بسبب علۃ العلل ہونے کے ہر کام کو خواہ انسان کرے یا حیوان، اپنی طرف منسوب کرتا ہے اس لیے انسان کو بھی لازم ہے کہ ہر چیز کو خدا سے متعلق کرے۔ پس جس بات پر ان شاء اللہ کا لفظ کہا جاتا ہے تو ان شاء اللہ کے لفظ سے اس بات پر تعلیق ہوتی ہے اور وعدہ کو زیادہ استحکام ہوتا ہے۔ سننے والے کو کامل یقین ہو جاتا ہے کہ وعدہ کرنے والے نے خدا پر اس وعدے کی تعلیق کی ہے تو ضرور اس کو پورا کرے گا۔ اگر ہم نے کسی سے وعدہ کیا کہ میں کل تمہارے گھر آؤں گا اور اس کے ساتھ ان شاء اللہ نہیں کہا اور نہیں گئے تو صرف وعدہ خلافی کا گناہ ہوا اور اگر اس کے ساتھ ان شاء اللہ بھی کہا اور پھر نہ گئے تو تین گناہ ہوئے ایک وعدہ کا، دوسرا اس بات کا کہ جس سے وعدہ کیا تھا اس کو وعدہ پورا کرنے کا زیادہ یقین دلایا اور وعدہ پورا نہ کیا۔ تیسرا اس بات کا کہ خدا کو ضامن دیا اور اس کے نام کی عزت کا بھی کچھ ادب نہ کیا۔ اگر کسی بات پر قسم کھا کر ان شاء اللہ کہا تو قسم توڑنے پر گناہ سے نہیں بچتے بلکہ دگنا گناہ ہوتا ہے۔ قسم توڑنے کا، خدا کے ساتھ تعلیق کر کے اس کا ادب نہ کرنے کا۔ جب قسم کھائی کہ سچ کہوں گا اور ظاہر میں یا دل میں ان شاء اللہ کہہ لیا اور پھر جھوٹ بولے تو تین گناہ ہوئے؛ جھوٹ بولنے کا، قسم توڑنے کا، خدا پر تعلیق کر کے اس کا ادب نہ کرنے کا۔ جس بات کا وعدہ کیا جاتا ہے جب مصمم اور نہایت مضبوطی اور سچی نیت سے اس کے پورا کرنے کا ارادہ ہوتا ہے، اس وقت اس کے ساتھ ان شاء اللہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ تم نے ایک مولوی سے کہا کہ میں تم کو ان شاء اللہ دس روپیے دوں گا تو اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ ضرور بے شک تم کو دس روپیے دوں گا۔

حضرت! اپنے وعدوں کی نسبت تو مولوی بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ وعدہ لغو نہیں رہتا بلکہ بحکم نصوص صریحہ مثل زکوٰۃ اور نذر معین کے واجب ہو جاتا ہے، مگر اور جگہ کہتے ہیں کہ نہ وعدہ خلافی کا گناہ ہوتا ہے، نہ قسم ٹوٹنے کا گناہ ہوتا ہے اور ان شاء اللہ کو ایک سپر بناتے ہیں جو ہر ایک حربے سے بچا لیتی ہے۔ حضرت خدا مارے یا چھوڑے ان مولویوں نے جو اسلام بنا رکھا ہے اگر وہی اسلام ہے تو میرا سلام۔ اس سے نیچریہ ہی اچھے جو سچائی کو اسلام بتلاتے ہیں۔"

## تصحیح

فروری ۱۹۹۲ء کے شمارے میں قومی کتاب گھر، ذاکر نگر، دہلی کا جو اشتہار شائع ہوا ہے اس میں مولانا فرید الوحیدی کی کتاب "شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ" کی قیمت غلط شائع ہو گئی ہے۔ اس کتاب کی قیمت ۲۵۰/ (دو سو پچاس) روپیے ہے۔ قارئین تصحیح فرما لیں۔

ادارہ

# اردو کا استحصال

سید حامد ▽

پادش بخیر، اردو کے سلسلے میں ہمارا انداز مجاورانہ ہوگیا ہے۔ اردو کا نام لے کر ہم نام کما لیتے ہیں، پیسے کما لیتے ہیں، خود اردو پر کیا گزرتی ہے ہماری بلا جانے۔ اردو جیسی جیتی جاگتی، سانس لیتی ہوئی، زندہ ارضی، عوامی زبان کے استاد، ادیب انشاپرداز اور نقاد سیمیناروں، کانفرنسوں، ورکشاپوں کی مصنوعی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ ان کی عمر بے مصرف سیمیناروں اور جلسوں میں گزرتی ہے۔ ان حضرات کو زندگی کے موجیں مارتے ہوئے سمندر سے کوئی سروکار نہیں۔ زبان کو انھوں نے آئینہ خانے میں بند کر دیا ہے۔ گویا تازہ ہوا کا جھونکا آیا اور یہ مرجھا جائے گی۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر بہت سے اساتذہ جو اردو پڑھانے کے لیے مامور ہوئے اتنا بھی نہ کر سکے کہ اپنے اسکول میں طالب علموں کی ضروری تعداد کو بھرتی کر لیتے۔ ایسی مثالیں کم نہیں کہ انھوں نے پڑھانے کے لیے اردو پر دوسرے مضامین کو ترجیح دی اور جن اسکولوں میں اردو کے استاد کی ضرورت تھی وہاں سے تبادلہ کرا کے ایسے اسکولوں میں چلے گئے جہاں اردو پڑھانے کے امکانات بہت کم اور دوسرے مضامین پڑھانے کے امکانات روشن تھے۔ اساتذہ کی اس بے حسی اور [illegible] حکومت کے تعاون اور [illegible] کے ساتھ مل کر اتر پردیش کے اسکولوں سے اردو کو بے دخل کر دیا۔

یونیورسٹیوں کی حالت اور بھی عبرت ناک ہے یہاں بھی بعض استادوں کو اس کا سرے سے احساس ہی نہیں کہ ان کا فریضہ تدریس و تحقیق کے علاوہ اردو زبان کی اشاعت اور فروغ بھی ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں سمجھتے کہ انھیں طالب علموں میں اردو کا ذوق پیدا کرنا ہے۔ متن پڑھانے میں انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔ چنانچہ طلبا اردو کے منتہی ہو جاتے ہیں اور متن سمجھنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔ وہ ادب کو ناقدوں کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ سطحی سی تنقید یاد کر لیتے ہیں، رٹ لیتے ہیں، اسی طرح ایم۔ اے کی سند انھیں حاصل ہو جاتی ہے۔ ان ہی طالب علموں کی کھیپ پی ایچ۔ ڈی تک پہنچتی ہے کہ فی زمانہ تحقیق بے صلاحیت طالب علموں کی آخری جائے پناہ بن گئی ہے۔ تحقیق کے موضوعات، ادنیٰ اور حاشیائی ترمیم کے ساتھ بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ تازگی اور معنی خیزی سے انھیں ہمیشہ دور رکھا جاتا ہے۔ موضوع کے انتخاب میں ریسرچ اسکالر کے ذوق، رجحان اور پسند کو دخل شاذ ہی ہوتا ہے۔ یہ انتخاب اکثر سپروائزر یا نگراں کی سہولت اور صلاحیت سے مشروط ہوتا ہے۔ لوگ فخریہ کہتے ہیں کہ ہم نے اتنی بڑی تعداد میں پی ایچ۔ ڈی

---

▽ سابق وائس چانسلر اے ایم یو علی گڑھ ۔ ہمدرد نگر ۔ نئی دہلی

پیدا کر دیے، زور سراسر مقدار پر ہے، معیار غریب تو گنتی میں آتا ہی نہیں۔ اردو ادب کے یہ منتہی جب ڈاکٹریٹ کر کے نکلیں گے اور اس کے نتیجے میں یونیورسٹیوں میں جگہ پائیں گے تو یہ ادب کو کیا سمجھیں گے اور کیا سمجھائیں گے۔

اردو (اور ہندی) کے اساتذہ کو جب سلکشن کمیٹی کے روبرو پیش کیا جاتا ہے تو وہ اکثر اپنی تصنیفات و تالیفات ایک سوٹ کیس میں بھر کر لاتے ہیں۔ ان پر نہ تحقیق کا گمان ہوتا ہے نہ دانش مندی کا۔ ان کی تخلیقات یا تالیفات کے پنّوں میں نہ ہوا کا گزر ہوتا ہے نہ روشنی کا، ان سے نہ کوئی نئی بات نکلتی ہے نہ کسی نئے زاویہ کی نقاب کشائی ہوتی ہے، نہ کوئی بصیرتیں دستیاب ہوتی ہیں۔

پھر یہ اہلِ تحقیق و تدریس صرف ادب کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور زبان کو جو بہرکیف زیادہ اہم ہے فراموش کر دیتے ہیں، لہٰذا ان کی کوششوں سے زبان کو کوئی فروغ نہیں ملتا، نہ وہ زندگی کو سنوار پاتے ہیں، نہ شائستگی کے ابواب میں اضافہ کرتے ہیں۔ زبان سے جی لگائیں تو تحقیق کے کاروبار میں تازگی آئے، مٹّی کی سگندھ آئے توانائی آئے اور زبان کی وسعت اور صلاحیت بڑھے۔

تنخواہ کو حلال کرنے کا تصوّر زندگی کے بیشتر شعبوں سے اٹھ گیا ہے، یونیورسٹیوں میں بھی باقی نہیں رہا۔ یہاں تو احتساب کو مداخلت بے جا سمجھا جاتا ہے اور جواب دہی سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ بہت سے استاد کلاس میں پابندی کے ساتھ جانے یا لیکچر دینے کو کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات ہفتوں گزر جاتے ہیں یہ کلاس کا رُخ نہیں کرتے۔ سیمیناروں، کانفرنسوں سے فرصت ملے تو منتظر طالب علموں کی طرف ملتفت ہوں۔ ان میں سے اگر کسی نے بہ حیثیت شاعر کے نام پیدا کر لیا تو اس کی تنخواہ ملا کر یونیورسٹی سے ملا کرے زندگی مشاعروں میں کٹ جاتی ہے تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ شاعروں کا ملکۂ تخیل ہے

انھیں ضمیر سے کیا سروکار۔ وہ کبھی سوچتے بھی نہیں کہ ملازمت جس کے سہارے وہ جی رہے ہیں، اس کے بھی کچھ فرائض ہیں کچھ تقاضے ہیں۔ حلال اور حرام کا امتیاز اٹھ جائے تو باقی کیا رہا، فرضِ منصبی کو جس نے نظر انداز کر دیا عبادات اور عقاید اس کے کام نہیں آئیں گے۔

استادوں، شاعروں اور نقادوں میں ایک گروہ اپنی لیاقت، خودنمائی، روابط، ذہانت اور خوشامد نوازی کے طفیل ملک کی سرحدوں سے باہر جان لیا، پہچان لیا جاتا ہے۔ جیسے ایسے موقعے مل گئے، وہ نہال ہو گیا۔ اسے اردو کے سفیر کا منصب مل جاتا ہے۔ جب سے اردو بولنے والوں اور اردو کے قدر دانوں کی ایک معقول تعداد مشرقِ وسطیٰ اور برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ اور کنیڈا میں آباد ہو گئی ہے اردو کے ان ترجمانوں کا بول بالا ہو گیا ہے، ان کے وارے نیارے ہو گئے ہیں۔ وہ دنیا کی سیاحت کے لیے بار بار جاتے ہیں۔ دوسروں کے صرفے پر دنیا دیکھتے ہیں بظاہر یہ خوشی کا مقام ہے، ہمیں اعتراض نہیں کہ دنیا کے دور دراز ملکوں میں اردو کی چاہت اور ہمارے اردو شعرا کی عزت ہوتی ہے لیکن جو لوگ اپنے فرائضِ منصبی چھوڑ کر شعرخوانی کے لیے نکل جاتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے اس کے علاوہ شرکت میں بنے رہنے کے لیے جو کوششیں کی جاتی ہیں ان کی متحمل نہ عزتِ نفس ہو سکتی ہے، نہ راست روی۔ خود کو قائم رکھنا اور دوسروں کے لیے دروازہ بند کر دینا، چالاکیوں اور سازشوں کا طالب ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جو اندر سے کھوکھلے ہوں نہ ادبِ عالیہ کی تخلیق کر سکتے ہیں، نہ تحقیق یا تنقید کی شکل میں ادب اور زندگی کو پرکھ سکتے ہیں۔

ایک مسئلہ وہ کھا رہا ہے مجھے جس سے آج کل بہت سے لوگ اداروں کی رکنیت یا اُن کے مناصب یا انعام یا ایوارڈ یا اعزاز کی تلاش میں رہتے ہیں جہاں جائز و ناجائز،

ٹھیکہ داری، دہشت زنی، سازش اور مافیا کا دور دورہ ہوتا ہے اجارہ داروں اور ملحقہ مافیا کے سربراہوں کا طواف اہل اور نااہل دونوں کرتے ہیں۔ پہلے اپنی اہلیت کو منوانے کی خاطر، دوسرے نااہلیت کو اہلیت میں بدلوانے کی خاطر۔ تازہ ترین مثال جس کی طرف شجاع خاور نے دھیان دلایا صلاح الدین پرویز نامی ایک غیر مستحق اور غیر معروف اہل قلم کی ہے جنھیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اکیڈمی میں اردو کے حضرات جو مشیر ہیں، اُن پر لوگ لیے عمر اسلوں میں انگلیاں اُٹھا رہے ہیں، لیکن انگلیاں اُٹھانے سے ان کا کچھ بگڑے گا نہیں۔ ہم ایک مصائب اور غیرت مند رائے عامہ اور اجتماعی ضمیر سے محروم ہیں۔ اور اردو ادب اور اس کی تنقید، تصنیف اور تالیف، اہلِ قلم کی جن ذاتی خواہشوں، لالچوں اور اندیشوں میں جکڑی ہوئی ہے وہ انھیں سچی بات کہنے سے روکتی ہیں۔ اردو میں ایسے اہل قلم موجود ہیں جو اپنی لیاقت، سلامت روی، سنجیدگی اور کہن کے لحاظ سے سب کی نگاہوں میں محترم ہیں۔ لیکن ان میں سے کچھ تو وابستگیوں میں پھنس گئے ہیں، کچھ عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ ان خوردوں کے خلاف جن کے ہاتھ میں قلم اور رفاقت اور نفوذ واثر ہے اعتراض و احتجاج کے کلمات زبان پر نہ لائیں۔ اس عافیت طلب خاموشی کو جرأت تو ہرگز نہیں کہہ سکتے؛ اسے دیانت کہنا بھی شاید مناسب نہ ہو۔ یہ پالیسی اور طرزِ عمل جب یہ سمجھ کر 'تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو' ذہنیت مند ادب اور صالح معاشرہ دونوں کی جان کے لالے پڑ جائیں گے اور زبان بیچاری سسکنے لگے گی۔

"دو چیز تیرہ عقلست دم فرو بستن، بہ وقت گفتن
گفتن بہ وقت خاموشی"

وہ لوگ جو بولنے کی ضرورت کے وقت خاموش رہتے ہیں، معاشرے کے ساتھ نا انصافی کرتے ہیں۔ ایسی مصلحت آمیز خاموشی جو زبان کی شخصیت کو توڑ کر رکھ دیتی ہے

ایک اور مثال سن لیجیے۔ موریشس میں عالمی اردو کانفرنس ہوئی۔ بڑا اہتمام کیا ان لوگوں نے۔ وہاں کچھ لوگ اردو پر جان دیتے ہیں اور وہاں کی حکومت بلیغ نظر اور فراخ دل ہے۔ کچھ نمائندوں نے سوچا کہ یہ اچھا موقع ہے اردو کی خدمت کا اور موریشس کو ہمیشہ کے لیے اردو سے وابستہ کر دینے کا۔ اراکین کے مشورے سے قراردادیں تیار کی گئیں:

۱۔ اردو زبان کے لیے ایک عالمی تنظیم قایم کی جائے جو اردو زبان اور ادب کے بارے میں تمام ضروری اور معنی خیز معلومات فراہم کر کے انھیں الیکٹرانک ذرائع سے سہل الحصول بنا دے۔ یہ تنظیم پانچ مراکز پر مشتمل ہو: کنیڈا ـ برطانیہ ـ موریشس ہندوستان اور پاکستان

۲۔ دنیا میں اردو بولنے والوں اور خاص طور پر اردو سمجھنے والوں کی کثیر تعداد کو دیکھتے ہوئے ان زبانوں میں جو یو۔ این۔ او کے کام کے لیے استعمال ہوتی ہیں، اردو کو شامل کیا جائے۔

۳۔ موریشس کے نظامِ تعلیم میں پہلا سرکاری امتحان چھٹی جماعت کا ہوتا ہے۔ اس امتحان میں انگریزی اور فرانسیسی کے علاوہ تامل، تیلگو، ہندی یا اردو کے پرچوں میں بھی طالب علم بیٹھ سکتے ہیں، لیکن دیا تق یہ ہوتا ہے کہ فرانسیسی اور انگریزی کے نمبر ڈویژن اور پوزیشن کے لیے شمار کیے جاتے ہیں۔ ہندوستانی زبانوں کے نمبروں کا اس مقصد کے لیے شمار نہیں ہوتا کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ ہندوستانی زبانوں کے پرچوں کے نمبروں کو ڈویژن اور

ممبر ملکوں کے بیچ شمار کیا جاسکے۔

۴۔ ہندوستان، پاکستان اور اردو کے فروغ میں دلچسپی لینے والے دوسرے ممالک اور اداروں سے اپیل کی جاتی ہے کہ موریشس میں فروغ اردو کے لیے تعاون کا ہاتھ بڑھائیں۔

۵۔ اسلامک کلچر سینٹر جو کہ عربی اور اردو کی تعلیم کا اہتمام کرتا ہے اور جسے حکومت نے قانونی طور پر تسلیم کیا ہے اور جس کی عمارت کے لیے ایک گراں قدر عطیہ موصول ہو چکا ہے، اس کے لیے جلد عمارت تعمیر کی جائے۔

مندرجہ بالا قراردادوں سے ماریشس میں اردو کو بالخصوص اور دوسری ہندوستانی زبانوں کو بالعموم مدد ملتی لیکن کانفرنس میں شریک ہونے والے ششدر رہ گئے ریزولیوشن سیشن میں ہندوستانی وفد کے رہنما نے اچانک اٹھ کر یہ تجویز پیش کر دی کہ ریزولیوشن پیش کرنا مناسب نہ ہوگا بلکہ حکومت موریشس کے شکریے کی قرارداد کافی ہوگی۔ چنانچہ سہ روزہ کانفرنس کی ساری کارروائی مٹی میں مل گئی اور وہ بھی ایک ایسے صاحب کے ہاتھوں جو اردو کا دم بھرتے ہیں اور اردو کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی بہ حیثیت سربراہ کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اردو کی بدولت سیاحت اور ضیافت مل گئی اور کیا چاہیے۔

مثالوں کے انبار لگانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اغیار اور ارباب اقتدار نے اردو کے ساتھ جو ناانصافی کی ہے اس سے زیادہ ظلم خود اردو والے کر رہے ہیں اور کرتے چلے آرہے ہیں۔

---

حضرت شیخ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میرے شیخ حضرت سری سقطی فرماتے تھے کہ میں ایک مرتبہ طوس میں اسہال کی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ کچھ لوگ میرے پاس عیادت کے لیے آئے اور ایسے بیٹھ گئے کہ اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ مجھے ان لوگوں کے بیٹھنے سے تکلیف ہو رہی تھی۔ کیونکہ بیماری کے سبب مجھے بار بار رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ آپ اللہ سے دعا کیجیے۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ اے اللہ ہمیں عیادت (بیمار پرسی) کا ادب سکھا دے۔

# غذا اور انفرادی و قومی سیرت

عبدالماجد دریابادیؒ | مرسلہ | عبدالقوی دریابادی▽

مدت بہت گزری لکھنؤ یونیورسٹی کے وجود میں آنے سے کہیں قبل سنہ ۱۹۰۹ء میں کیننگ کالج لکھنؤ کے ایک جونیر طالب علم نے اس وقت کے مشہور اخبار وکیل (امرتسر) میں ایک سلسلۂ مضامین "غذائے انسانی" کے عنوان سے لکھا تھا خلاصہ یہ تھا کہ انسان کے دانت کی ساخت، آنت کی ساخت، آلات ہضم کی ساخت سب اس پر دلیل قاطع ہیں کہ انسان کی طبعی غذا محض پھل اور ترکاریاں نہیں بلکہ گوشت بھی ہے اور پھر مختلف غذاوں کی کیمیائی ترکیب اس دعوے پر شاہد عادل ہے۔

سبزی خور (ویجی ٹیرین) اور پھل خور (فروٹیرین) پارٹی کا کالج میں زور تھا اور اس پروپیگنڈا کا شور، کہ گوشت بطور غذا کے "ان سائنٹفک" ہے۔ اسی مناقشے کے رد میں یہ مضامین محض جذباتی جوش کے ساتھ نہیں، کسی قدر علمی ہوش کے ساتھ بھی سپرد قلم ہوئے تھے۔ وکیل والوں نے سترہ سال کے ایک نوعمر لڑکے کی اس کوشش کی اتنی ہمت افزائی کی کہ مضامین کو مستقل رسالہ کی صورت میں اسی عنوان کے ساتھ چھاپ دیا ——— پچاس برس کا بوڑھا آج وہ سترہ سال والے نوجوان کی فرصت کہاں سے لائے! آج جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت، لیجیے پورا شعر کیا معنی، مصرع بھی پورا پڑھنے کی اب کہاں ہمت!

### ماھذا الرقاع البیض؟

[یہ سفید سفید ٹکڑے کیسے ہیں؟]

یہ عرب کے ان شہریوں اور دیہاتیوں نے کہا، جس کی نظر سے میدہ کی چپاتیاں پہلی بار گزری تھیں! ملک ایران اپنے زمانہ کا سب سے زیادہ متمدن ملک فتح کر چکے۔ کسریٰ اور شوکت کسریٰ، تہذیب کسریٰ، کا تختہ الٹ چکے اور سادگی کا یہ کیفیت کہ میدہ کی روٹیاں کھانا اور چبانا الگ رہا، شکل تک ان کی نہیں دیکھی۔ اب دیکھتے ہیں اور اپنے مفتوح ایرانیوں سے تعجب کے ساتھ دریافت کرتے ہیں کہ یہ سفید سفید ٹکڑے ہیں کیا چیز؟ ——— اللہ اکبر! ملک کے فاتحوں کی، اقبال مندوں کی، کشورکشاوں کی غذائیں میوے یا قرمانیاں اور روغنی پراٹھے نہیں ہوتے کھجوریں ہوتی ہیں اور جو کا آٹا، وہ بھی بے چھنا!

ایک مختصر سے فقرہ میں سارا فلسفہ آگیا۔ غذا کیا غذا کے اثرات کا، فرد و قوم کی سیرت پر۔ اعرب کی فتوحات پر سب حیرت زدہ ہیں۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ وہ کھاتے کیا تھے! اول تو کھانا ہی کیا۔ فاقہ پر فاقہ کر ڈالتے اور نیم فاقہ کشی

تھے گویا عادی ہی ہو چکے تھے۔ پھر جب کھلتے ہیں تو ضرورتاً، کھانا ضرورت کی چیز تھی نہ کہ شوق کی۔ ــــــ معتقد تھے "خوردن برائے زیستن" کے نہ کہ "زیستن برائے خوردن" کے۔ صبح سے لے کر رات تک چا، اور ناشتہ اور لنچ اور ڈنر کا مسلسل چکر تو بیچارے دل کے وہم میں کبھی نہ تھا! فن طب کی اتنی "ترقیوں" تک غریبوں کا دماغ کہاں پہنچا تھا کہ دوڑیں لگا لگا کر بھوک بڑھائی جائے اور بلا بھوک کھانا ٹھونس ٹھونس کر لے دواؤں کے زور سے ہضم کیا جائے۔

ایک منظر یہ تھا۔ دوسرا منظر صدیوں بعد کا یہ ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے دسترخوانوں پر ایک ایک وقت میں صرف پلاؤ پندرہ پندرہ قسم کے موجود ہیں، کباب دس دس قسموں کے، قورمے بارہ بارہ طرح کے ہیں۔ روٹیوں کی قسمیں، چٹنی، اچار، مربہ، حلوے وغیرہ وغیرہ کا کوئی شمار ہی نہیں۔ یہ سب کچھ "تھا" بہ صیغہ ماضی نہیں "ہے" ایک بڑی حد تک اب بھی، بہ صیغہ حال!

دونوں قسم کی غذاؤں اور دونوں قسم کی سیرتوں کے اتنے صریح، واضح اور نمایاں فرق کے بعد بھی ضرورت کسی طویل گفتگو کی، کسی مبسوط مقالے کی باقی رہ جاتی ہے؟

گیا شیخ سعدی کا وہ دور جب کہا گیا تھا کہ معدہ کو خالی رکھا کرو کہ نور معرفت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اب یہاں نور معرفت ہی کی تلاش کس کو؟ اور اس کی طلب ہی کیوں؟ وہ پرانا گلستان مدت ہوئی نذر خزاں ہو چکی۔ اب پُر تکلف کھانوں کے نئے نئے گل کھل رہے ہیں اور نئے نئے "خوان نعمت" لگ رہے ہیں۔

صوفیوں کی ہدایت "قلت طعام، قلت منام، قلت کلام" کو خانقاہوں کے لیے رہنے دیجیے اور ان نصیحتوں پر اب فاتحہ خیر پڑھیے ــــــ شروع کیا تھا اس معروضہ کو بابسم اللہ سے۔ اب ختم ہو جانے دیجیے تا تمت پر نہ سہی، آپ کی تا، دعوت پر۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:
"جب کوئی مرد اپنی بیوی کو رات میں جگاتا ہے اور وہ دونوں مل کر دو رکعت نماز پڑھتے ہیں تو شوہر کا نام ذکر کرنے والوں میں اور بیوی کا نام ذکر کرنے والیوں میں لکھ دیا جاتا ہے۔"

[ ابوداؤد ]

# حیاتین کی دریافت

عظیم شیخ ▽

جنگ عظیم کے بعد یورپ کے تھکے ہارے اور بھوکے پیلے باشندوں کو غذا پہنچانے کا کام بے شمار جہاز کر رہے تھے لیکن غذا سے بھرا ہوا ایک جہاز جتنی جانیں بچاتا تھا اتنی ہی جانیں صرف ایک پونڈ خالص حیاتین کی مدد سے بچ جاتی تھیں۔

حیاتین بڑی پُراسرار اور حیرت انگیز چیز ہیں۔ یہ ایک قسم کے کیمیاوی جوہر ہیں جو ہماری قدرتی غذا کے اندر نہایت خفیف مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ ہماری روزانہ خوراک میں ہر قسم کی حیاتین کا بحیثیت مجموعی صرف ۱/۱۰۰۰ اونس بقدر پایا جانا ضروری ہے۔ تاہم یہ حقیر سی مقدار ہمارے لیے انتہائی اہم ہے۔

ہمارے جسم کو اپنی صحت کے لیے مختلف قسم کی حیاتین کی یہ معینہ مقدار درکار ہوتی ہے اگر ہمارے بدن میں زیادہ اہم حیاتین بالکل نہ ہوں تو ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ حیاتین میں سے بعض ہمارے عصبی نظام کو مضبوط اور متوازن رکھتی ہیں کچھ ہماری آنکھوں پر اثر ڈالتی ہیں۔

حیاتین بچوں کو ان کے نشو و نما میں اور بڑوں کو ان کی تمام جسمانی عمالی میں مدد دیتی ہیں۔ کچھ ہماری ہڈیوں کو مضبوط بناتی ہیں کچھ ہمارے رگ پٹھوں اور شریانوں کو طاقت دیتی ہیں۔

جو سبزی، ترکاری، پھل، اناج اور گوشت ہم کھاتے ہیں۔ اگرچہ ان میں حیاتین پائی جاتی ہیں تاہم اس کی کچھ مقدار ہم تک نہیں پہنچ پاتی۔ کچھ پھلوں اور سبزیوں سے اسی وقت خارج ہو جاتی ہیں جب ہم انھیں صاف کرتے اور ڈبوں میں بھرتے ہیں۔ ہمارے باورچی خانوں میں کھانا پکنے کے دوران بھی حیاتین کا کچھ فیصد عنصر برباد ہو جاتا ہے۔

انہیں وجوہ سے بہت سے لوگ جو بظاہر خوش خوراک نظر آتے ہیں انھیں اپنی ضرورت کے مطابق حیاتین کی پوری مقدار نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ بعض لوگ ایسی مخصوص جسمانی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں جن کے باعث وہ اپنی غذا سے حیاتین کی کافی مقدار ہضم نہیں کر پاتے۔ ایسے تمام لوگوں کی تندرستی برقرار رکھنے کے لیے مصنوعی حیاتین کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہی حال دنیا کے ان لاتعداد لوگوں کا ہے جن کی غذائیں غربت کی وجہ سے محدود نوعیت کی ہوتی ہیں اور ان میں تمام اہم غذائی عناصر نہیں ہوتے۔

گزشتہ صدیوں میں بے شمار لوگ حیاتین کی کمی سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار بنے ہیں یا اس طرح مرکھپ گئے ہیں کہ ان کے مرض کا سبب تک کسی کو

---

▽ معرفت ماہنامہ طب عالم کراچی

معلوم ہو سکتا۔

بادبانی جہازوں کے زمانے میں بحری سفر کا ایک بڑا خطرہ اسقربوط (SCURVY) کا مرض تھا۔ لمبے تجارتی سفر میں جہازوں کو آہستہ آہستہ چلنا پڑتا تھا۔ تجارتی سفر سے زیادہ طویل اور پُرخطر وہ سمندری سیاحتیں ہوتی تھیں جن کے ذریعے نئے نئے براعظم دریافت ہوئے۔ ان سیاحتوں میں کچھ نہ کچھ لوگ ہمیشہ ہی اس مرض میں مبتلا ہوتے تھے اور کبھی کبھی تو اتنے آدمی مر جاتے تھے کہ جہازوں کو واپس لانے کے لیے کافی عملہ نہ بچتا تھا۔

ان بحری جہازوں پر مسافروں کی غذا عموماً بسکٹوں اور نمکین گوشت پر مشتمل ہوتی تھی۔ غذا کی کمی کو کبھی کبھی لیموں یا چکوترے کی رسد سے پورا کیا جاتا تھا اور یہ بات محض اتفاقاً معلوم ہو گئی کہ لیموں یا چکوترے کے استعمال سے اسقربوط کی بیماری کم پیدا ہوتی تھی اور کبھی سرے سے ہوتی ہی نہ تھی۔ نہ تو جہازوں کے کپتان ہی اس رمز سے آشنا تھے اور نہ ان کی حکومتیں ہی یہ جانتی تھیں کہ ان ترش پھلوں میں ایسی کون سی بات ہے جو انسانوں کی صحت کی ضامن ہے لیکن اس طرح بہت زمانہ گزر جانے کے بعد آخرکار محض مفید نتائج کے پیش نظر کبھی کبھی جہازوں میں لیموؤں اور چکوتروں کا ذخیرہ رکھا جانے لگا۔ دراصل ان پھلوں میں حیاتین ج وہ چیز تھی جس کی ان لوگوں کو سخت ضرورت تھی مگر دوسرے حیاتین کی طرح یہ حیاتین بھی انسان کے علم سے چھپا ہوا راز ہی رہا۔

سب سے پہلا شخص جس نے حیاتین کا وجود دریافت کیا اور صحت کے لیے اس کی قدر و قیمت ثابت کی وہ ایک نوجوان ولندیزی کرسچن ایجک مین (Christian Eijkman) تھا۔ اسے (۱۸۹۰) کے لگ بھگ ولندیزی جزائر شرق الہند کے طبی محکمہ میں کام کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا وہاں ایک مرض بیری بیری کتنے ہی ولندیزی فوجیوں کو ناکارہ کر رہا تھا اور ولندیزی حکومت نے ڈاکٹروں کو یہ پتہ لگانے کا حکم دیا تھا کہ یہ مرض کن وجوہ سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟

ایک دن نوعمر ڈاکٹر ایجک مین نے ایک معمولی سی بات دیکھی۔ یہ بات شاید اس سے پہلے بھی بہت سے لوگ دیکھ چکے تھے مگر اس پر غور کیے بغیر گزر جاتے تھے۔ ایجک مین کے ہوشیار ذہن نے اس بات میں سے ایک اہم نکتہ لوٹ کیا۔

ہوا یہ کہ چند چوزے بیمار پڑ گئے۔ ڈاکٹر ایجک مین نے دیکھا کہ ان کی بیماری انسانوں کے مرض بیری بیری سے ملتی جلتی تھی۔ اسے اپنی تحقیق سے معلوم ہوا کہ مرغوں کو جو کھانا عام طور سے دیا جاتا ہے اس کی قلت کے باعث چوزوں کو صاف کیا ہوا چاول کھلایا گیا تھا اور وہ بیمار پڑ گئے۔ ان کے کھانے پر کئی تجربے کیے اور پتہ چلایا کہ جب انھیں بھورا چاول دیا جاتا ہے تو وہ اچھے ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ تندرست رہنے کے لیے چوزوں کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ چاول کے ہلکے بھورے چھلکے میں پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر ایجک مین نے اس پر بھی غور کیا کہ چونکہ عام سپاہیوں کو محدود غذا دی جاتی ہے اور ان کی غذا میں سب سے زیادہ حصہ صاف کیے ہوئے چاولوں کا ہوتا ہے لہٰذا ممکن ہے کہ اسی وجہ سے اتنے بہت سے سپاہی مرض "بیری بیری" کا شکار ہوتے ہوں لیکن اس زمانے کے ڈاکٹروں کے کچھ اور ہی خیالات تھے۔

یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس بارے میں ان کا کوئی قطعی خیال نہ تھا۔ اس لیے ایجک مین کو انھیں اپنی تحقیقات کا قائل کرنے میں بڑی دقت پیش آئی حتیٰ کہ ان پر تنقید بھی کی گئی کہ وہ اپنا اور حکومت کا وقت چوزوں اور بھورے چاولوں پر تجربے کرنے میں ضائع کر رہے ہیں۔ بہرحال نہیں

اپنی جگہ یہ یقین تھا کہ وہ کوئی اہم بات دریافت کرنے والے ہیں
اور وہ اپنی تحقیقات جاری رکھنے پر تلے رہے۔

آخر کار وہ طبی محکمہ کے افسرانِ بالا میں سے ایک افسر
کے اندر دلچسپی پیدا کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ ان دونوں
نے ساتھ ساتھ اس علاقے کی کئی جیلوں کا دورہ کیا اور قید خانے
کی غذا اور حالاتِ صحت کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ کئی
مہینے کی دوڑ دھوپ کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ صاف کیے
ہوئے چاول کھانے والے ڈیڑھ لاکھ قیدیوں میں سے چار کو
بیری بیری" کی بیماری ہوئی تھی۔ اس کے برخلاف غیر صاف
شدہ بھورا چاول کھانے والے ۹۶۵۰ قیدیوں میں سے کل
نو پر یہ مرض حملہ آور ہوا تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر ایجک مین نے چاول کے چھلکوں
کی دوا تیار کی اور روزانہ اس موذی بیماری میں مبتلا لوگوں
کو پلانی شروع کی۔ نتائج ویسے نکلے جن کی اسے توقع تھی۔ وہ
سب اچھے ہو گئے۔

اب ڈاکٹر ایجک مین کو اور بھی پختہ یقین ہو گیا کہ
چاول کے چھلکوں میں کوئی نامعلوم جوہر ایسا موجود ہے جو
صحت کی بحالی بلکہ زندگی قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے
لیکن اس وقت وہ اسے علیحدہ کرنے اور اس کی جانچ
کرنے سے قاصر رہے۔ لہٰذا انھوں نے اس جوہر کو کوئی نام
نہیں دیا۔ انھوں نے ایک حیاتین دریافت کر لی تھی، اگرچہ
ابھی اس کا کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ اس دریافت کے بارے
میں ایجک مین کی رپورٹ نے رفتہ رفتہ ہر قسم کی حیاتین
کا مزید تحقیقات کے دروازے کھول دیے۔

بھورے اور غیر صاف شدہ چاول کے بارے میں
ڈاکٹر ایجک مین کی تحقیق سے جو نتائج برآمد ہوئے ان
سے دوسرے ڈاکٹروں میں تحقیقی کام کی تحریک پیدا ہوئی
[illegible] ڈاکٹر عوام کی غذائی عادتوں کو [illegible]
[illegible]

ترکاریوں اور پھلوں کی متوازن خوراکیں تیار کرنے کی جانب
قدم اٹھایا۔ ان کوششوں کا مقصد انسانی غذا میں ان تمام
غذائی عناصر کو شامل کرنا تھا جن کی انسان کو ضرورت ہے
ڈاکٹروں کو ایسے ہزاروں آدمیوں کے مسائل کا مقابلہ کرنا پڑا
جو افلاس کے سبب ان بیماریوں میں مبتلا تھے یا جنھیں ایسی
مخصوص بیماریاں لاحق تھیں جو ابھی تک سمجھی بھی نہ جا سکی تھیں۔

پولش سائنس دان ڈاکٹر کیسیمر فنک Casimir
Funk نے نامعلوم جوہروں کی تلاش میں اگلا قدم اٹھایا
لسٹر انسٹی ٹیوٹ لندن کی تجربہ گاہوں میں کام کرتے ہوئے
انھوں نے ۱۹۱۱ء میں کیمیاوی جوہر کی تھوڑی سی مقدار علیحدہ
کر لی۔ یہ ان جانچوں میں مفید ثابت ہوئی جن میں اس جوہر
کی چھوٹی چھوٹی خوراکیں پیلیگرا (Pellegra) اور اسقربوط
(Scurvy) میں مبتلا حیوانوں کو کھلائی گئی تھیں لیکن اس
کیمیاوی جوہر کو علیحدہ کرنے کا عمل حد درجہ مشکل تھا اور
اس طریقے سے جو مقدار حاصل ہوتی تھی وہ اتنی کم ہوتی کہ
اس سے کوئی مزید کام نکالنا ناقابلِ عمل خیال کیا
گیا۔

ڈاکٹر فنک نے اپنے نکالے ہوئے شفاف جوہر
کا نام وٹامن (VITAMIN) یعنی حیاتین رکھا۔ کیونکہ ان
کی رائے میں یہ جوہر ایک حیات بخش قوت کے مالک
تھے۔ نام کا پہلا جز وٹا (Vita) لاطینی زبان سے لیا
گیا تھا اس کے معنی حیات کے ہیں۔

ابھی تک نوعِ انسان کو بحیثیت مجموعی حیاتین
کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا لیکن مختلف مقامات کے
سائنس دان اس سے اتنی دلچسپی ضرور لینے لگے تھے کہ
انھوں نے اپنی اپنی جگہ تجربات شروع کر دیے اور ۱۹۱۸ء
میں پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے سے پہلے یہ تجرباتی کام کچھ
نہ کچھ آگے بڑھ چکا تھا۔
[illegible]

کے ڈاکٹر ایلمر میک کالم (Elmer McCollum) نے چند خذاؤں پر سے پردے اٹھانے شروع کیے۔ انھوں نے غذائی چیزوں پر تجربات کیے اور ان تجربات سے انھیں معلوم ہوا کہ مکھن کی چربی میں اور انڈے کی زردی میں پائی جانے والی چربی کی تھوڑی سی مقدار میں ایک حیاتین شامل ہوتی ہے۔ اسے بعد میں حیاتین الف (Vitamin A) کا نام دیا گیا۔

ادھر یورپ کے سائنس دانوں کو تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہیلی بٹ، سا ڈا اور ایسی ہی دوسری مچھلیوں کے تیل میں ایک اور حیاتین خاصی بڑی مقدار میں موجود ہوتی ہے اس حیاتین کا نام انھوں نے حیاتین "د" (Vitamin-D) رکھا۔

ان تمام کوششوں کو حیاتین کی تحقیق کی ابتدا ہی کہا جا سکتا تھا کیونکہ ابھی مناسب قیمت پر اچھی مصنوعی حیاتین تیار کرنے کا کوئی طریق عمل دریافت نہیں ہوا تھا۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان سائنس دانوں کی دو جماعتوں کو جو ایک ہی ڈھنگ پر کام کر رہی تھیں ایک بہت اہم دریافت میں کامیابی ہوئی۔ ڈاکٹر الفریڈ ہیس (Alfred Hess) اور ان کے رفقائے کار نے کولمبیا یونیورسٹی نیویارک کی تجربہ گاہوں میں تجربے کیے اسی اثنا میں ڈاکٹر ہیری اسٹین بوک ڈاکٹر آرچی بلیک (Archi Black) اور دوسرے مددگاروں کے ساتھ وسکانسن یونیورسٹی میں مصروف تحقیق تھے۔

ان دونوں جماعتوں نے قریب قریب ایک ہی وقت یہ بات دریافت کی کہ دھوپ میں جو حیات بخش بالائے بنفشی (Ultra Violet) روشنی پائی جاتی ہے وہ بعض غذاؤں میں حیاتین کی صورت اختیار کر لیتی ہے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ وہی حیاتین تھی جو مچھلی کے تیل میں پائی گئی تھی۔

اب چند پیداواروں میں بالائے بنفشی شعاعوں کو مرتکز کر کے ان میں یہ حیاتین پیدا کی جا سکتی تھی۔ ڈاکٹر اسٹین بوک نے سور کی چربی اور زیتون کے تیل پر بالائے بنفشی شعاعوں کا تجربہ کیا۔ ڈاکٹر ہیس نے یہی عمل بنولے اور السی کے بیجوں پر کیا۔

سائنس دانوں کی یہ دونوں جماعتیں یہ جانتی تھیں کہ یہ دریافت بڑی انوکھی اور اہم ہے۔ اس سے ڈاکٹروں کو ایک چیز حاصل ہو گئی جس سے غذائی کمی اور نقص سے پیدا شدہ کئی ایک بیماریوں کا علاج کیا جا سکتا تھا۔ ان میں سے بعض بیماریاں بدترین نوعیت کی ہوتی ہیں خصوصاً سوکھے کی بیماری جو ہڈیوں کو گداز اور سست کر دیتی ہے اس سے بچے کمانی جیسے ٹانگوں والے اور لنگڑے ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر اسٹین بوک اور ڈاکٹر ہیس دونوں نے اپنے نتائج کا عوام میں اعلان کیا لیکن ڈاکٹر اسٹین بوک کی رپورٹ ایک سائنسی جریدے کو پہلے بھیجی جا چکی تھی اس کے دو ماہ بعد ڈاکٹر ہیس نے امریکن پیڈیاٹرک سوسائٹی کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اپنے نتائج کا انکشاف کیا۔

اب حیاتین کی تلاش ایک بڑے پیمانے پر شروع ہو چکی تھی۔ چند سائنس داں اس حیاتین کو علیحدہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے جس کا وجود ڈاکٹر ایک مین نے چاول کے چھلکوں میں ثابت کیا تھا لیکن یہ لوگ اسے کیمیائی جوہر کی حیثیت سے علیحدہ نکالنے میں ۱۹۲۷ء سے پہلے کامیاب نہ ہو سکے۔ اگرچہ اسے "حیاتین ب" (Vitamin-B) کا نام کچھ عرصے پہلے ہی دیا جا چکا تھا۔

اب یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ متعدد حیاتین کا جو باہم مربوط ہیں ایک ہی گروہ سے تعلق ہے۔ اس لیے گروہ کو مرکب حیاتین ب (Vitamin B Complex)

کہہ کر پکارا گیا۔ دس سال اور گزر گئے۔ تب کہیں اس گروہ کی ایک حیاتین کو عمل ترکیب کے ذریعے پیدا کرنے کا طریقہ معلوم ہوا۔ سب سے پہلے حیاتین جو اس طریقے سے تیار کی گئی "حیاتین ب (Vitamin B)" یا "تھایامین" تھی۔ اس کام میں جو طریقے استعمال کیے گئے ان کی مدد سے سائنس داں چند ہی دن کے اندر دو دیگر حیاتین ربوفلاوین اور نکوٹینک ایسڈ کو علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن سائنسداں جانتے تھے کہ "حیاتین ب" سے متعلق ابھی کئی راز ایسے ہیں جو منکشف نہیں ہوئے ہیں۔ بوسٹن کے جارج مائنٹ کی کوشش سے سائنس دانوں کو ان میں سے ایک راز کا سراغ ملا اور یہ سراغ نہایت اہم ہے۔ اس ڈاکٹر نے پتہ چلایا تھا کہ کلیجی کے اندر ایک ایسی چیز موجود ہے جو خون کی کمی (Anemia) کے مختلف نوعیتوں کے بیماروں کے واسطے مفید ہے۔ اس نے اپنے مریضوں کا علاج کلیجی کی خاص مقدار کھلا کر کیا اور صحت بخشی کی شرح کافی رہی۔ یہ شرح ان ڈاکٹروں کی بہ نسبت بہت تھی جو ان انیما کے مریضوں پر کئی دوسرے علاج آزما رہے تھے۔

"انیمیا" یا "قلت الدم" میں ہوتا یہ ہے کہ ہڈیوں کے گودے میں پائے جانے والے خلیے میں سے شریانیں بنتی ہیں جتنے فعال ہونے چاہییں اتنے نہیں رہتے۔ ڈاکٹر مائنٹ نے پتہ چلایا کہ کلیجی میں کوئی ایسی چیز ہے جو ہڈی کے گودے میں کچھ اس طرح اصلاح کر دیتی ہے کہ وہ پھر سے اپنا کام کرنے لگتا ہے لیکن یہ علاج نامکمل تھا کیونکہ اس میں مریضوں کو کلیجی بڑی مقدار میں استعمال کرنی پڑتی تھی۔

دوسرے طبیب اور سائنس داں ڈاکٹر مائنٹ کے کام کا مطالعہ غور کرکے رہے۔ آخر انھوں نے کلیجی کے ان اجزاء اور جوہر کی تلاش کرنا شروع کیا جو اتنا مفید کام انجام دیتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر خاص طور پر یہ جوہر علیحدہ کر لیے [illegible]

آسان اور بہتر ہوگا۔ یہ تلاش بیس سال تک جاری رہی راز بہت سربستہ تھے اور ایک مدت تک تلاش کرنے والوں کی نظر سے چھپے رہے۔

آخر کار ان تھک کوششوں سے "عرق کلیجی" (Liver-extract) دریافت ہوا۔ جو نیا خون بنانے اور تازہ زندگی بخشنے کی قیمتی صفات کا حامل ہے ساتھ ہی اس کوشش نے ایک اہم حیاتین کو علیحدہ کرکے استعمال میں لانا بھی آسان کر دیا۔

۱۹۴۰ء میں ٹیکساس یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے اسپنلج کی پتیوں سے ایک کیمیاوی جوہر علیحدہ کیا جس میں بظاہر وہی مفید خصوصیات پائی جاتی تھیں جو کلیجی کے پراسرار جزو میں دریافت ہوئی تھیں۔ سائنس دانوں نے تجربہ گاہوں کے جانوروں پر اسے آزما کر دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان جانوروں میں زندگی کی بقا کے لیے اس کی موجودگی ضروری ہے۔ بیماروں کے واسطے کلیجی کی صحیح قدر و قیمت کے راز دریافت کرنے کی جانب یہ نہایت اہم قدم تھا اس یونیورسٹی کے ڈاکٹر روجر ولیمز (Roger Williams) نے اس نئی حیاتین کو ان پتوں کی نسبت سے جن سے یہ نکلی تھی (Folic Acid) کا نام دیا۔ کام کو جاری رکھا گیا جس سے مزید پتہ چلا کہ یہ حیاتین کلیجی اور گردوں کے علاوہ آٹے کے خمیر، سیم، باقلا، لوبیا وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہے۔

اب سائنس دانوں نے فولک ایسڈ کا کیمیاوی تجزیہ شروع کیا تاکہ اسے مصنوعی طور پر پیدا کیا جا سکے اور ڈاکٹروں کے استعمال کے لیے اس کی گولیاں اور کیپسول کیسے بنائے جا سکیں لیکن یہ کام بہت مشکل ثابت ہوا اور جب یہ سائنس داں ایک مرکب فولک ایسڈ بنانے میں کامیاب ہو گئے تو معلوم ہوا کہ تیار شدہ چیز ایسی ہے جسے "قلت الدم" کے مریضوں کی صحت یابی کے لیے استعمال [illegible] کیا جا سکتا ہے۔

اب ایک اور بڑی دواساز کمپنی ۔ [illegible] [illegible] کو اس کام سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس کمپنی کے ڈائرکٹروں نے پختہ عزم کر لیا کہ "حیاتین ب کے مرکب اس کیمیاوی جوہر کو جو نگاہوں سے اب تک چھپا ہوا ہے معلوم کر کے رہیں گے۔ انھیں یقین تھا کہ اگر استقلال سے کام لیا گیا تو کامیابی یقیناً ان کے قدم چومے گی۔ کمپنی نے اپنی لیباریٹری میں ۲۴ ماہرین کو جو اس کام کے اہل اور اعلیٰ تربیت یافتہ تھے، اس خدمت پر مامور کیا اور ان کے تجربات کی تکمیل کے لیے کئی لاکھ ڈالر کی رقم منظور کی۔

سائنس داں خالص فولک ایسڈ کا منبع معلوم کرنے کے درپے تھے تاکہ اسے قابل استعمال مصنوعات کی بنیاد پر بنایا جاسکے۔ انھوں نے ہر ایسے جوہر کی چھان بین کی جس کے بارے میں یقین تھا کہ اس میں کیمیاوی عنصر اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے اجزا شامل ہیں۔ جس چیز کی انھیں تلاش تھی وہ بالآخر مل ہی گئی مگر اس کے ملنے کی جگہ بڑی حیرت انگیز تھی۔ تتلی کے پروں کا زردی آمیز مادہ۔

وہ اس فولک ایسڈ کی تحلیل کرنے پھر اسے مصنوعی طور پر بنانے یعنی اس کا مرکب تیار کرنے میں کامیاب رہے اور تجربہ گاہوں میں تجربات سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ نئی دوا خون کی کمی کے کئی امراض کے علاج میں ان توقعات کو پورا کرتی ہے جو اس سے وابستہ کی گئی تھیں لیکن ابھی تک ایک مرحلہ باقی تھا انسانوں پر اس نئی دوا کی آزمائش۔

ڈاکٹر ٹوم اسپائز [illegible] Tom پہلا شخص تھا جس نے اسے ہسپتال میں آزمایا۔ تین ماہ کی آزمائش کے بعد اس نے یہ رپورٹ دی کہ اس دوا سے بڑے مفید نتائج برآمد ہوئے۔ اب معلوم ہوا کہ ہڈیوں کے گودے سے "سرخ خون" کے ذرات پیدا کرنے میں فولک ایسڈ جو خود حیاتین ب کے مرکب کا محض ایک جزو ہے پوری ٹیکی کھلینے سے بھی کہیں زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی حیاتین کی تلاش مکمل ہو گئی۔ دواساز کمپنی نے اپنے سائنس دانوں کی ذہنی صلاحیتوں کے سہارے ایک مہنگا جوا کھیلا تھا اور کمپنی بازی جیت گئی۔ سائنس دانوں نے قابل استعمال فولک ایسڈ بنا کر نوع انسانی کی عظیم خدمت انجام دی۔ اب انھوں نے خون کی قلت اور غذائی کمی کی خاص خاص بیماریوں ڈاکٹروں کے استعمال کے لیے رقیق مرکب اور دوا فروشوں کے لیے کیپسول اور ٹکیاں بنانی شروع کر دیں۔ آخر کار کمپنی کو وہ بھاری رقمیں واپس ملنے لگیں جو اس تلاش میں صرف ہوئی تھیں۔

کئی ایک حیاتین کی تجارتی پیداوار کامیاب مرکب فولک ایسڈ کی دریافت سے بھی بہت پہلے سے اسی پیمانے پر جاری تھی۔ اکثر دواساز حیاتین کے کیپسول اور ٹکیاں ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی عرصے میں بڑے پیمانے پر تیار کرنے لگے تھے اور لوگ انھیں زیادہ تر عام تندرستی کی بحالی کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر لوگوں کو حیاتین کی ضرورت تھی۔ بعض ایسے بھی تھے جنھیں کوئی ضرورت نہ تھی باقی لوگوں کو خاص خاص نقائص دور کرنے کے لیے مخصوص حیاتین درکار تھیں مگر وہ ڈاکٹروں سے مشورہ نہ کرتے تھے۔

حیاتین کا ان سے بھی اہم استعمال ڈاکٹر اپنے نجی شفاخانوں اور ہسپتالوں میں کر رہے تھے۔ وہ مختلف قسم کی خاص خاص بیماریوں یا کمزوریوں کے مریضوں کو مخصوص حیاتین تجویز کرتے تھے جو نتائج نکلے ان سے ڈاکٹروں کو ہر سال نئی معلومات حاصل ہوتی گئیں۔ جب وہ اپنی نئی معلومات کو یکجا کرنے لگے تو ان کے علاج زیادہ کامیاب اور ان کے مریضوں کی شفایابی زیادہ یقینی ہو گئی اور حیاتین کے استعمال کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔

۱۹۴۴ء تک حیاتین کی عام مقبولیت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ صرف ایک سال میں دواسازوں نے [illegible]

ڈالر کی حیاتین فروخت کیں۔ اس کے کئی وجوہ تھے۔ ڈاکٹروں نے حیاتین کا استعمال پہلے سے زیادہ کر دیا تھا اور عوام نے انھیں زیادہ سے زیادہ خریدا۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ زمانۂ جنگ نے حیات بخش دواؤں کی اہمیت اور ضرورت کو پہلے سے کہیں زیادہ بڑھا دیا۔ امریکہ کی بحری اور بری فوجیں انتہائی شمالی علاقوں یا گرم منطقوں میں جنگی خدمات انجام دے رہی تھیں ان کی حفاظت کے لیے ان کی حکومت نے حیاتین بھاری مقدار میں خریدیں کیونکہ ان مقامات پر امریکی فوجوں میں جو ایسی انتہائی سرد یا گرم آب و ہوا کے عادی نہ تھے حیاتین کی کمی کے عارضے پیدا ہو جانے کے قوی امکانات تھے۔

ریڈ کراس سوسائٹی نے بھی حیاتین خریدیں اور جنگ زدہ ملکوں کے ان بیمار فوجیوں اور شہریوں کے لیے بھیجیں جو قلت اور نقص کے امراض میں مبتلا تھے۔ اس ادارے نے دس کروڑ تیس لاکھ ڈالر کی قیمت کی حیاتین اس مقصد کے لیے خریدیں۔

یہی وہ سال بھی تھا جب امریکی حکومت کو خود اپنے شہریوں کی صحت پر بطور خاص توجہ دینی پڑی۔ لاکھوں آدمی جنگی صنعتوں میں کام کر رہے تھے اور ان کی خدمات جنگ کو جاری رکھنے اور جمہوری نظام حکومت کی بقا کے لیے ضروری تھیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ڈاکٹر فوجوں میں بھرتی ہو کر چلے گئے تھے جس سے اندرون ملک میں ڈاکٹروں کی کمی ہو گئی تھی۔ حکومت جانتی تھی کہ عوام کو حتی الامکان صحت مند رکھنا بہت ضروری ہے تاکہ امراض کو ان پر حملہ کرنے کا کم سے کم موقع حاصل ہو سکے۔ لہٰذا حکومت نے غذا تیار کرنے والوں کو ہدایت کی کہ جو غذائیں تیار کی جاتی ہیں ان میں مصنوعی حیاتین کی مناسب مقدار شامل کی جائے تاکہ وہ غذائیت اور اہم غذائی اجزا برقرار رکھیں جو غذاؤں کو ذخیرہ کرنے ڈبوں میں بھرنے، چھاننے اور صاف کرنے سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ غذا تیار کرنے والوں نے یہ مشورہ جلد ہی قبول کر لیا۔ آٹا پیسنے والوں اور ڈبل روٹی بنانے والوں نے "مرکب ب" کی حیاتین بھاری مقدار میں خریدیں اور ان سے اپنے آٹے اور روٹیوں میں تازہ قوت داخل کی۔ چھلکے مشروب میں حیاتین "ج" کا اضافہ کیا گیا۔ مصنوعی مکھن بنانے والوں نے اپنی مصنوعات میں حیاتین "الف" شامل کی۔ خمیر خانوں میں حیاتین "د" کی مدد سے دودھ کی قوت بخشی بڑھائی گئی۔

اس اثنا میں مزید تحقیق جاری رہی جس سے ڈاکٹر نئے تحقیقی میدانوں میں داخل ہوئے۔ آج کل وہ تجربے کر رہے ہیں کہ حیاتین کو قوت کی کمی سے پیدا ہونے والی بیماریوں کے علاوہ دوسرے امراض کا علاج کرنے یا علاج میں مدد دینے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

ایک کم عمر لڑکے کا واقعہ ہمارے سامنے ہے یہ ایک قطعی انوکھی بیماری کا شکار تھا جو عموماً کسی کو نہیں ہوا کرتی جب یہ لڑکا پانچ سال کا تھا تو اس کی ٹانگوں کے رگ اور پٹھے دھیرے دھیرے سخت ہونے لگے۔ کسی وجہ سے اس کا جسم ضرورت سے زیادہ کیلشیم پیدا کر کے جمع کر رہا تھا۔ ڈاکٹر اس انوکھی بیماری کو سمجھ تو گئے مگر اس کا کوئی علاج انھیں معلوم نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے یہ بیماری خود بخود اپنا دورہ مکمل کر لے گی اور پھر پورا جسم پتھر ہو جائے گا اور لڑکا مر جائے گا۔ پھر بھی انھوں نے اس لڑکے کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۴۳ء میں جب اس لڑکے کی بیماری اتنی شدت اختیار کر گئی کہ چلنا پھرنا قطعی ممکن نہ رہا تو اس کے والدین اسے شکاگو کے بچوں کے یادگاری ہسپتال (چلڈرنز میموریل ہاسپٹل) میں لے گئے۔

"کیا ہسپتال کے ڈاکٹر مجھے پھر اچھا کر دیں گے؟" چھوٹے لڑکے نے اپنی ماں سے پوچھا۔ اس کی کتنی تمنا تھی کہ وہ بھی دوسرے لڑکوں کی طرح چلے پھرے دوڑے اور کھیلے کودے۔

اس کی ماں نے کہا "بیٹے مجھے امید تو ہے اس خیال سے ہم تمہیں ہسپتال لے جا رہے ہیں"۔ وہ اسے یہ بتانے کی قوت نہیں رکھتی تھی کہ اس کے بارے میں کوئی اور امید باقی نہیں رہی۔

ہسپتال میں ڈاکٹروں نے پوری کوشش کی۔ انھوں نے اس کی ٹانگوں کا آپریشن کیا۔ اس کے رگ پٹھوں کو پھیلایا۔ ان میں جمع شدہ کیلشیم کو الگ کیا جو اُن کے اکڑنے کا باعث تھا انھوں نے اس کا عکس ریزی علاج کیا لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ کئی سال کے مسلسل علاج کے بعد بھی لڑکے کی حالت بد سے بدتر ہوتی رہی۔

تب ڈاکٹروں نے "حیاتین ای (Vitamin E) کو آزمانے کا فیصلہ کیا جو ہڈیوں سے ملے ہوئے رگ پٹھوں پر اثر ڈالنے کے لیے مشہور ہے۔ ڈاکٹروں نے سوچا ممکن ہے یہ حیاتین اس لڑکے کی بیماری میں کچھ فائدہ پہنچائے اور اگر اس سے برائے نام مدد بھی ملے جب بھی اسے آزمانا مناسب ہے۔

انھوں نے لڑکے کو "حیاتین ی" کی خوراکیں پوری توجہ اور باقاعدگی سے دینی شروع کیں۔ چند ہفتوں کے بعد اس کی حالت میں خفیف سی تبدیلی دکھائی دی۔ انھوں نے یہ علاج جاری رکھا۔ بالآخر حیرت انگیز افاقہ نظر آنے لگا۔ چھوٹا لڑکا صحت یاب نظر آنے لگا۔ اس کے پٹھوں کا کیلشیم دھیرے دھیرے اپنی جگہ چھوڑنے لگا۔ کئی مہینے کی مسلسل کوشش سے اس کی ٹانگوں کی پتھر جیسی کیفیت رفتہ رفتہ ختم ہونے لگی اور پھر اس دن ڈاکٹروں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی جب کہ لڑکے نے بتایا کہ وہ اپنی ٹانگوں کے پٹھوں کو موڑ سکتا ہے۔

ایک صبح جب ایک ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا تو بچے نے دریافت کیا، "کیا آج میں چلنے کی کوشش کر سکتا ہوں؟" ڈاکٹر نے کہا "یقیناً آؤ کوشش کر دیکھیں۔"

ڈاکٹر اور نرس نے بچے کو اوپر اٹھنے میں مدد دی۔ ان کے اوپر جھکے جھکے اس نے اپنی ٹانگیں بڑے چاؤ کے ساتھ آگے بڑھائیں۔ وہ تھوڑا سا چلنے میں کامیاب ہو گیا۔ چار سال میں پہلی بار وہ اتنا چل پایا تھا۔

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں "کسی دن میں پھر دوسرے لڑکوں کی طرح ہو جاؤں گا"۔ وہ خوشی سے چلانے لگا۔

ڈاکٹر نے کہا "ہاں ہاں۔ ضرور، کیوں نہیں"۔

ڈاکٹر اور نرس شگفتگی سے مسکرا رہے تھے۔ انھوں نے اس لڑکے پر اتنے دن تک شبانہ روز محنت کی تھی۔ کتنی توجہ صرف کرنی پڑی تھی اور اب ان کے سامنے ان کے نتائج سے بھی کہیں بہتر نتائج تھے۔

میرا خیال ہے کہ اب سے تقریباً دو سال کے اندر تم گیند کھیلو گے، دوڑو گے اور ہر وہ کام کرو گے جو دوسرے لڑکے کرتے ہیں"۔ ڈاکٹر نے کہا "اور اس سے بھی بہت پہلے تم بغیر سہارے کے چلنے لگو گے۔ لیکن تمہیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ تمہیں یہ بیماری کئی سال تک رہی ہے اور اس پر پورا قابو پانے میں ابھی کئی سال لگیں گے"۔

"حیاتین ی" نے مرض کو مسخر کر لیا تھا۔ اس لڑکے کا علاج کرکے اور جسم کے اندر کیلشیم کے غیر ضروری ذخیروں پر اس کا اثر دیکھ کر ڈاکٹروں نے غیر معمولی قوتوں والی حیاتین کے متعلق بہت کچھ نیا علم حاصل کر لیا اور انھیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کس طرح لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں؟"

حیاتین کی دوسری قسموں کی تلاش ابھی جاری ہے "حیاتین ب" اس وقت کی "قلت الدم" کی چند ایسی مہلک بیماریوں کے علاج میں مدد کر رہی ہے جنھیں پہلے ناممکن العلاج تصور کیا جاتا تھا۔

مستقبل میں بہت سی محیر العقول چیزیں ہیں جنھیں انسان دریافت کرے گا۔ حیران کن حیاتین کے بارے میں اور زیادہ معلومات کی تلاش جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ حیاتین کے متعلق مکمل تفصیل عیاں نہیں ہو جاتی۔

# میڈیا کا نیا ذوق

ریاض الدین احمد

کچھ دنوں سے یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ میڈیا خواتین کی مبینہ بے حرمتی کے واقعات کو بڑے شدّ و مدّ اور ڈرامائی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ اس دور میں یا تو خواتین کے ساتھ تشدد اور بے حرمتی کے واقعات میں انقلاب انگیز اضافہ ہو گیا ہے۔ یا اخفائے راز کی رسم میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور پھوڑا ایک کر بہنے لگا ہے۔ خواتین عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں۔ عدالتی کارروائی کھلی عدالتوں میں شروع ہوتی ہے۔ وکلاء نسائیت کی دھجیاں اڑاتے ہیں۔ عدالتیں کوک شاستر کا پردۂ سیمیں بن جاتی ہیں۔ اہل ذوق عدالتی ڈراما بلا ٹکٹ دیکھنے کے لیے جوق در جوق اکٹھا ہوتے ہیں۔ اخباروں کے اوراق حیا سوز شاہ سرخیوں سے رنگین ہو جاتے ہیں۔ رسائل و جرائد کا تجارتی پیمانہ خوب اونچا ہو جاتا ہے۔ معزز مرد اور خواتین تقاضائے فطرت کا ایک نیا باب کھولنے میں توفیق حاصل کرتے ہیں۔ یہ مشہور خاندان کنیڈی کے ایک فرد کے خلاف ایک خاتون کا مقدمہ ہے۔ یہ ایک اہم مسلم سیاسی شخصیت کی بیٹی کا معاملہ ہے۔ یہ ایک سیاہ ملکۂ حسن اور عالمی مکہ باز کی داستان ہے۔ یہ ایک برطانوی لیڈر قوم کا رومانی تجربہ ہے۔ یہ ایک فرانسیسی بے حیا ہے جو سزائے جرم بھگتنے کے بعد پھر اسی دلدل میں جا پھنسا ہے اور یہ کوریائی خواتین کا ایک پورا قافلہ ہے جنھیں جاپان نے راحت افواج (Comfort Girls) بنا کر بھیجا تھا۔ ان کی داستان غم اب اخباروں کی پھلجھڑیاں بن کر چھوٹ رہی ہیں۔

مہذب مجرموں کا ایک نیا رخ یہ سامنے آیا ہے کہ ارتکاب جرم کے بعد مجرم اپنے مقتول کو اور ممکنہ شہادت کو ختم کرنے کے لیے پورے کے پورے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

ایک ننگ انسانیت جفرے ڈھمیر باشندہ وسکانسن (Wisconsin) عدالت کے سامنے اقبال کر رہا ہے کہ اس نے ۱۷ نوجوانوں کو قتل کیا ہے اور کم سے کم تین نوجوانوں اور لڑکوں کے ساتھ ملوث رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعد قتل بھی ارتکاب جرم جاری رکھا ہے اور مقتول کا مردہ گوشت بھی کھایا ہے۔ (بہ حوالہ رائٹر خلیج ٹائمس ۱۰ فروری ۱۹۹۲ء)

ہر چند کہ یورپی معاشرے میں قبل نکاح جنسی تجربہ عام ہے مگر ایک شاہی خاندان کی دلہن کے لیے بہر حال جنسی پاکبازی ایک لازمہ قرار دی گئی اور ہونے والی دلہن کا طبی معائنہ ضروری سمجھا گیا۔ ایک مشاہد کا بیان ہے کہ

لندن اور نیویارک جیسے شہروں میں رات گئے سڑکوں پر نکلنا خطرے سے خالی نہیں، کیونکہ خواتین کی طرف سے مجرمانہ پیش قدمی کا رواج عام ہوتا جارہا ہے۔

اب میڈیا کے سر پر سرخاب کا ایک اور پر لگ گیا ہے کہ اس نے گڑے مردوں اور سیاسی مجرموں کی نقاب کشائی شروع کر دی ہے۔ یہ صدر امریکہ جان ایف کنیڈی ہیں۔ ان کی غیر منکوحہ دلچسپیاں اب اخباروں کے اوراق سیاہ کر رہی ہیں۔ یہ برطانیہ کے وزیر دفاع جان پروفیومو (۱۹۶۳ء) کی فردِ جرم ایک خاتون کے معاملے میں ہے۔ یہ حکمراں پارٹی کے چیرمین سیل پارکنس (۱۹۸۳ء) کے تعلق سے ان کی سکریٹری کی ناجائز اولاد کی داستان ہے اور یہ امریکہ کی ڈیماکریٹک پارٹی کے سینیٹر گیری ہارٹ (۱۹۸۷ء) کی ایک ماڈل سے تعلق کی وجہ سے صدارتی الیکشن میں پسپائی کی کہانی ہے۔ سچ کہہ رہا ہے کہ برطانیہ کا ایک مشہور روزنامہ دی سن (The Sun) کہ:

"کوئی شخص جو اپنی منکوحہ بیوی کے لیے وفادار نہیں ہے، وہ قوم کی سربراہی کے لیے قابل اعتماد نہیں ہوسکتا۔

(بہ حوالہ رائٹر۔ خلیج ٹائمز ۸ر فروری ۹۲ء)

مگر مسئلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اس پر بھی غور کرنا چاہیے۔ "مغرب میں خاتون مشرق" بی بی سی پروگرام میں ایک مشرقی خاتون اپنی تشویش کا اظہار یوں کر رہی ہیں:

"لندن میں بچیوں کے لیے الگ تعلیمی ادارے نہیں ہیں۔ مخلوط اداروں میں ہر لڑکی کے ساتھ ایک بوائے فرینڈ (Boy-Friend) کا ہونا فیشن میں داخل ہے مشرقی طالبات جو اپنا دامن بچا کر رہتی ہیں ان کو طعنوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ نہ ان میں حسن ہے نہ کشش اس لیے وہ طلبا کی توجہ کا مرکز نہیں بن پاتیں۔"

بے حیائی کے تقاضے یہیں سے سر اٹھاتے ہیں۔ پھر جھلکیاں نظر آتی ہیں اور پھر حادثات اُبھرتے ہیں۔ ایک مشہور انگریزی ماہنامے نے نیوجرسی کا ایک واقعہ بڑے حسرت ناک تاثر کے ساتھ پیش کیا ہے کہ:

"ابتدائی درجات کے پانچ نوخیز طلبا نے ایک ۷ اسالہ لڑکی کو آٹھ ساتھیوں کی موجودگی میں اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔"

یہ ہے ہمارے میڈیا کا وہ پیغام جو فلموں کی بے حیائی نغمہ سرود کے کیسٹ۔ اخباروں کی شاہ سرخیوں اور مجلات کے باتصویر مقالات کے ذریعے سے نئی سوسائٹی کی شریانوں میں پیوست کیا جارہا ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے ایک حالیہ قومی سروے کے مطابق ہر پانچ میں ایک طالبہ مجرمانہ ہوس کا شکار ہوجاتی ہے۔ ریڈرز ڈائجسٹ کے مقالہ نگار چارلس الگزنڈر نے ڈائجسٹ کے شمارہ نومبر ۱۹۹۰ء میں میڈیا کی تاجرانہ ہوس پرستی کے خلاف زبردست احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ:

"میڈیا جو کھیل کھیل رہا ہے اب اس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایسی سوسائٹی جس کا مزاج یہ ہو کہ جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دو اپنا وجود عرصے تک قائم نہیں رکھ سکے گی۔ وقت آگیا ہے کہ رقص و سرود اور جنسی آزادی کے ان پیشواؤں پر کڑی نظر رکھی جائے۔"

ورنہ جلد ہی یہ تہذیب خود اپنا گلا گھونٹ لے گی اور

اور برگشتہ ایمان ضابطۂ حیات کو فطرت کا مضبوط ہاتھ صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا۔

مقالہ نگار نے میڈیا کو سخت انتباہ دیتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ میڈیا تفریح کے حدود سے آگے بڑھ چکے ہیں اور ان کی موجودہ سرگرمیاں تاجرانہ مقاصد کے لیے آنے والی نسلوں کو تباہی کے پیمانوں میں ڈھال رہی ہیں۔ پانی اب سر سے اتنا اونچا ہو چکا ہے کہ والدین کی یہ نسل انھیں برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لیے اگر میڈیا نے خود اپنی اصلاح کا بیڑا نہیں اٹھایا تو حکومت وقت پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ واضح کردار ادا کرے اور میڈیا کی فتنہ گری کا سدّباب کرے۔

مگر حکومت تو وہی ہے جس کی قبا خود چاک چاک ہے۔ اسی حکومت کے زیرِ سایہ حیا اور شرم کے انسانی جوہر مٹائے جا رہے ہیں۔ منشیات کا بازار گرم ہو رہا ہے قتل و غارت گری بازیچۂ اطفال بن گئے ہیں۔ عالمی قیادت کا تاج پہننے والے ملک امریکہ میں گزشتہ سال واردات قتل کی تعداد صرف ۴۲ ہزار رہی (بی۔بی۔سی) اور منشیات کی ہیرا پھیری عربوں ڈالر میں۔

دراصل کامیابی کا راستہ ایک ہی ہے۔ قوانین فطرت کے ساتھ تعاون۔ کیا فطرت کے راستے سے بال برابر بھی ہٹ کر انسان فضا میں داخل ہو سکتا تھا؟ انسانی مشین فطرت کا شاہکار ہے۔ کیا اس کے پُرپیچ راستوں کو بدل کر کوئی انسان زندہ رہ سکتا ہے؟ ہماری کھیتیاں قوانین فطرت سے جڑی ہوئی ہیں۔ ہماری رات کی نیندیں اور دن کے کاروبار شب و روز کے الٹ پھیر سے وابستہ ہیں۔ غرض کہ ہماری کامیابیاں فطرت کے مضبوط قوانین کے تابع ہیں۔

مگر ایک دائرۂ اخلاق ہے کہ اس نے فطرت کے اٹل قانون ایمان کا راستہ ترک کر دیا ہے برگشتہ ایمان

فتنوں کی آماج گاہ اور خواہشات کا محل ہے۔ اللہ جل شانہٗ اپنے برگزیدہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرماتے ہیں کہ آپ لوگوں کو بتا دیجیے کہ

"بیشک میرے رب نے حرام کیا ہے تمام فحش باتوں کو۔ ان میں جو علانیہ ہوں وہ بھی اور جو پوشیدہ ہوں وہ بھی۔ اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اور کسی کو اللہ کا شریک بنانے کو اور اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہنے کو جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔"

(الاعراف ۔ ۷ ۔ ۳۳)

"اور یہ کہ (جاہِ دنیا پر) اتراؤ نہیں۔ اللہ اس قسم کی تفریح کو پسند نہیں کرتا۔"

[القصص ۲۸ ۔ ۷۶]

اور وہ لوگ جو تنبیہات کے باوجود ہوش میں نہیں آتے ان پر اللہ تعالیٰ کا شدید غصّہ ہے۔

"اچھا! تو پھر انھیں اپنے باطل خیالات میں غرق اور اپنے کھیل کود میں منہمک رہنے دیجیے۔ یہاں تک کہ یہ اپنا وہ دن دیکھ لیں جس کا انھیں خوف دلایا جا رہا ہے۔"

[الزخرف ۴۳ ۔ ۸۳]

مزید فرمایا گیا:

"اچھا! تو اب ان لوگوں کو اسی کھیل و تفریح میں رہنے دیجیے۔ یہاں تک کہ ان کو اپنے اس دن سے سابقہ پڑے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ اس دن یہ قبروں سے نکل کر اسی طرح بھاگے پھریں گے جیسے کہ کسی عبادت گاہ کی طرف

چلے جا رہے ہوں اور اُن کی آنکھیں مارے شرم کے جھکی ہوئی ہوں گی اور ان پر شدید ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔ یہ ہے ان کا وہ دن جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔"

[المعارج ۷۰۔ ۴۲ تا ۴۴]

مگر جو ہوائے نفس کے بندے ہوگئے ہیں وہ کسی تنبیہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے:

"پھر کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔ اس لیے اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔"

[الجاثیہ ۴۵ — ۲۳]

اب سے ۱۴ سو برس پہلے قدرت کی دوربین آنکھیں اس سلگتی ہوئی تہذیب کا نظارہ کر رہی تھیں آج جس کی بے بیباک شعاؤں نے خرمن انسانیت کو تاک لیا ہے اور علم کی حیرت انگیز پرواز کے باوجود انسان کو درندگی کی آگ میں جھونک دیا ہے۔ اس کا واحد علاج قانون فطرت کی طرف مڑ جانا ہے۔

"پس اے لوگو! یک سو ہو کر دین حنیف کے اوپر قدم جما لو کیوں کہ یہی دین فطرت ہے اور اسی پر اللہ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی یہی بالکل راست اور درست دین ہے لیکن اکثر لوگ اس سے ناواقف ہیں۔"

[الروم ۳۰ — ۳۰]


# اعلان ملکیت

| | |
|---|---|
| مالک: | علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ |
| ایڈیٹر: | پروفیسر کبیر احمد جائسی |
| قومیت: | ہندوستانی |
| پرنٹر پبلشر: | پروفیسر اسرار احمد |
| قومیت: | ہندوستانی |
| اشاعت کی مدت: | ماہانہ |
| پریس: | اے ایم یو پریس، علی گڑھ |
| مقام اشاعت | ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشاننا۔ اے۔ ایم یو علی گڑھ |

میں اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے یقین کی حد تک درست ہیں۔

کبیر احمد جائسی

# دیو پیکر درندے

محمد اسلم پرویز ▽

ایک اندازے کے مطابق ہماری زمین آج سے پانچ ارب سال پرانی ہے۔ اس پر زندگی کی شروعات لگ بھگ ڈھائی ارب سال قبل ہوئی تھی اور جبھی سے مختلف دوروں میں زمین پر مختلف قسم کے جانوروں اور پیڑ پودوں کی حکمرانی رہی ہے۔ زندگی کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ لگتا ہے کہ جانوروں اور پیڑ پودوں کی جو نسلیں کسی بھی وقت میں سب سے زیادہ کامیاب اور اعلیٰ ہوگئیں انہی نے زمین کو آباد کیا۔ آج یہ سہرا انسان اور پھول والے پیڑ پودوں کے سر ہے۔ اس وقت کل عالم میں پائے جانے والے جانوروں میں سب سے افضل اور کامیاب جانور انسان ہے اسی طرح پودوں میں بھی پھول والے پیڑ پودے سب سے کامیاب ہیں۔ اسی لیے تمام زمین اور اس کے نواحی آبی علاقوں پر ان دونوں کا مکمل قبضہ ہے لیکن آج سے ۱۹ کروڑ ۵۰ لاکھ سال قبل حضرت انسان کا دور دور پتہ نہ تھا۔ اس وقت اس زمین پر بڑے بڑے جانوروں کی حکمرانی تھی جو کہ آج پائی جانے والی چھپکلیوں اور مگرمچھ کے خاندان کے دیو نژاد افراد تھے۔ اس خاندان کو ریپٹائلز (Reptiles) کے نام سے جانا جاتا ہے اور ارتقائی درجات کے مطابق انسان کا خاندان یعنی میمل Mammal اسی خاندان کے فنا ہونے کے بعد ہی ابھرا تھا۔ ان دیو زاد جانوروں کو عرف عام میں ڈائنوسورس (Dinosaurs) کہا جاتا ہے۔ کل ملا کر ان دیو زادوں نے زمین پر لگ بھگ ساڑھے بارہ کروڑ سال حکومت کی۔ جیسا کہ میں نے اوپر تحریر کیا ہے کہ آج سے ۱۹ کروڑ ۵۰ لاکھ سال قبل یہ زمین پر ظاہر ہوئے تھے اور ان کے خاندان کا آخری دیو زاد آج سے لگ بھگ، کروڑ سال قبل فنا ہوا ہے۔ لفظ ڈائنوسورس دو یونانی الفاظ سے مل کر بنا ہے جن کے اجتماعی معنی خوفناک دیو زاد چھپکلی کے ہیں۔ یہ نام ان دیو زادوں کی بخوبی عکاسی کرتا ہے۔ اگرچہ ان میں سے زیادہ تر جانور بہت بڑے بڑے تھے لیکن کچھ بہت چھوٹے بھی تھے جن کی لمبائی ایک میٹر کے اندر ہی ہوتی تھی لیکن چونکہ ایسے جانوروں کی تعداد بہت کم تھی اس لیے یہ خاندان دیو زادوں کا ہی کہلاتا ہے۔ اپنے عروج کے زمانے میں ان دیو زادوں نے زمین اور پانی دونوں پر ہی حکمرانی کی ہے۔ ان میں سے کچھ تو محض سبزی خور تھے یعنی پیڑ پودوں پر گزر کیا کرتے تھے جب کہ کچھ گوشت خور تھے۔ گوشت خور ڈائنوسورس سبزی خوروں پر اکثر حملہ کر کے انھیں بھی

▽ لیکچرر ڈپارٹمنٹ آف باٹنی، ذاکر حسین کالج - نئی دہلی

کھاتے تھے۔ ان کی خوراک اور بناوٹ کی بنیاد پر ڈائنوسورس کو چار خاندانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اول قسم وہ ہے جو جانوروں کا شکار کر کے کھاتی تھی اور دو پیروں پر چلتی تھی، اس خاندان کو تھیرو پوڈا (Threopoda) کہتے ہیں۔ دوسرے خاندان کے جانور اگرچہ پہلے خاندان سے ملتے جلتے ہوئے تھے لیکن یہ سبزی خور تھے اور اپنا زیادہ وقت پانی میں گزارتے تھے چلنے کے لیے یہ چار پیروں پیروں کا استعمال کرتے تھے۔ اس خاندان کو سوروپوڈا (Souro poda) کہتے ہیں۔ جو سبزی خور دیوزاد دو پیروں پر چلتے تھے ان کو اورنتھوپوڈا (Ornithopoda) کہتے ہیں۔ ان کے چار پیروں پر چلنے والے کچھ ایسے رشتہ دار بھی تھے جنھوں نے گوشت خور جانوروں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اپنے جسم پر مختلف قسم کے حفاظتی انتظامات کر لیے تھے۔ ان کو آرمرڈ ڈائنوسورس Armoured Dinosaurs یعنی بکتربند ڈائنوسورس کہتے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے میں ان خاندانوں کے کچھ دیوزادوں کا مختصر حال بیان کر رہا ہوں۔

**میگالوسورس (MEGALOSAURUS)**

دیو پیکر درندہ گوشت خور تھا۔ امریکہ اور انگلینڈ کے علاقوں میں کھدائی کے دوران اس کی ہڈیاں برآمد ہوئی تھیں، جن کو ترتیب دے کر اس کی بناوٹ اور جسامت کا کا اندازہ کیا گیا۔ اس کا ڈھانچہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے میوزیم میں موجود ہے۔ اس جسامت کی بنیاد پر پروفیسر بکلینڈ نے اس کا نام میگالوسورس رکھا تھا۔ اس کی لمبائی تک بھگ ۳۰ فٹ تھی اور جب یہ اپنے دونوں پچھلے پیروں پر کھڑا ہوتا تھا تو اس کا سر زمین سے تقریباً ۱۲ فٹ اوپر رہتا تھا۔ اس کے اگلے دونوں پیر (یا ہاتھ) بہت مختصر تھے۔ پچھلے پیروں پر چلتے وقت یہ اپنی دم اٹھا لیا کرتا تھا۔ اس کے بھاری جبڑوں میں لائن سے کافی تیز دانت تھے۔ اس کی بناوٹ کافی حد تک مگرمچھ سے ملتی ہے۔ لیکن دانتوں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ تیز بھی تھے۔



میگالوسورس

**ٹائیرینوسورس (TYRANOSAURUS)**

یہ اور میگالوسورس دونوں ہی تھیرو پوڈا خاندان کے افراد ہیں۔ اس کی ہڈیاں منگولیا میں برآمد ہوئی تھیں اس کی کل لمبائی پچاس فٹ تھی۔ صرف اس کا سر اور جبڑا ہی ۴ فٹ لمبے تھے اس کے جبڑے واضح اور مضبوط تھے جن میں دانتوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ ہر دانت اوسطاً ۴ انچ لمبا تھا۔ ان کے اگلے پیر بے حد مختصر اور بے مصرف تھے۔ پچھلے پیروں میں تین انگلیاں بڑی اور ایک چھوٹی سی ایڑی کی مانند تھیں جن پر کافی مضبوط اور لمبے ناخن پائے جاتے تھے۔ ان کی دم کافی موٹی اور مضبوط تھی جس کو موڑ کر یہ بطور سہارے کے استعمال کرتے تھے۔ یہ بھی گوشت خور تھے اور دیگر درندوں کا شکار کرتے تھے۔ اپنی جسامت کی وجہ سے یہ تھوڑی دور ہی دوڑ سکتے تھے۔ کچھ دوڑنے کے بعد ہی ان کو آرام کی ضرورت ہوتی تھی۔

**سیٹیوسورس (CETIOSAURUS)**

یہ سوروپوڈا خاندان کے ممبر تھے جن کا سا

وقت پانی میں گزرتا تھا۔ اس کی لمبائی اوسطاً ۵۰ فٹ تھی۔ لیکن کچھ درندوں میں یہ ۹۰ فٹ تک پائی گئی ہے۔ ان کی گردن بہت لمبی اور سر بہت چھوٹا ہوتا تھا۔ ان کے پیر بہت بھاری ٹھوس اور ستون کی مانند ہوتے تھے چونکہ ان کا جسم بہت لمبا اور بھاری تھا (اوسطاً اس کا وزن ۲۰ سے ۳۰ ٹن کے درمیان تھا) اس لیے ان کی ریڑھ کی ہڈی بہت لچکیلی تھی — سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انھوں نے پانی میں رہنا بھی اسی لیے پسند کیا تاکہ پانی میں ان کا جسم کچھ ہلکا رہے اور ان کو حرکت کرنے میں کچھ آسانی ہو۔ دوسرے چونکہ یہ سبزی خور تھے اور زیادہ بڑے اور مضبوط دانت نہیں رکھتے تھے اس لیے زمین پر پائے جانے والے گوشت خور دیوپیکروں کا یہ مقابلہ نہیں کر سکتے تھے ان سے جان بچانے کے لیے انھوں نے پانی میں پناہ لینا ہی مناسب سمجھا۔



ٹائیٹنوسورس

کرتے تھے۔ یہ دونوں جانور سمندری پودوں پر گزارہ کرتے تھے۔ ان کے جبڑوں میں صرف آگے کی طرف دانت تھے جن سے یہ پودے اکھاڑ لیتے تھے۔ ان کے ایک وقت کی خوراک کے لیے تقریباً ایک ٹن سبزی یا پودے درکار ہوتے تھے۔ ان کی مادائیں انڈے دینے کے لیے خشکی پر آتی تھیں بچے تیر کر خود پانی میں پہنچ جاتے تھے۔ ان کی جسامت کے لحاظ سے ان کا ذہن بہت چھوٹا اور ناکارہ تھا۔ اسی وجہ سے یہ اپنے لیے خوراک کا اور کچھ انتظام نہ کر سکے ان کی نسلوں کی افزائش کے ساتھ سمندری خوراک ختم ہونے لگی اور مختلف زمینی تبدیلیوں کی وجہ سے سمندروں اور دریاؤں نے بھی رُخ بدلے ان تبدیلیوں کا شکار ہو کر یہ جانور اپنے لیے دوسری جائے پناہ نہ تلاش کر سکے اور بالآخر مفقود ہو گئے۔ ان کے ساتھ ایک اور دلچسپ بات تھی جو کہ آج تک کسی اور جانور میں نہیں ملتی وہ یہ کہ ان کے دو دماغ تھے ایک تو عام جگہ پر جب کہ دوسرا دماغ دُم کے آخری سرے پر تھا۔ دوسرے دماغ کا کام صرف پچھلی ٹانگوں اور دُم کی حرکت کو کنٹرول کرنا تھا۔ یہ ایک ایسی انوکھی دریافت تھی کہ جب بیسویں صدی کے شروع میں یہ بات ثابت ہوئی تو لوگ حیرت زدہ

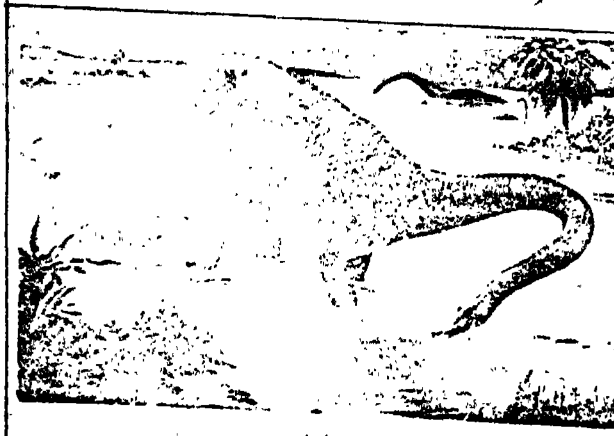


سیٹیوسورس

## ڈپلوڈوکس
## (DIPLODOCUS)

سیٹیوسورس کی طرح یہ بھی سوروپوڈ خاندان میں آتا ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً ۹۰ فٹ تھی۔ بہ نسبت سیٹیوسورس کے اس کے اگلے پیر چھوٹے تھے۔ دُم لمبی تھی جو کہ پانی میں [illegible] کا کام کرتی تھی اور اس کی مدد سے یہ جانور سمندری دشمنوں سے اپنی حفاظت

ہو گئے۔ اس وقت کے مشہور شاعر برٹ ٹیلر نے اس موضوع پر ایک نظم بھی لکھ ڈالی جو ۱۹۱۲ء کے شکاگو ٹریبیون میں شایع ہوئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ دوسرا دماغ محض فضلہ کام ہی کرتا تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آج تک کسی اور جانور میں یہ چیز دیکھنے کو نہیں ملی۔



ڈپلوڈوکس

## اگوانوڈون (IGUANODON)

اس کا شمار اورنتھوپوڈا خاندان میں ہوتا ہے ان کے پیر بہت حد تک چڑیوں کے پیروں سے مماثلت رکھتے تھے۔ اس لیے اس خاندان کو اورنتھوپوڈا کہتے ہیں۔ (اورنتھو معنی چڑیا اور پوڈا معنی پیر) ان کی ہڈیاں انگلینڈ بیلجیم اور جنوبی افریقہ کے علاقوں سے دریافت ہوئی ہیں۔ ان کے پچھلے پیر بہت مضبوط ہوتے تھے۔ دُم کافی موٹی لیکن نسبتاً چھوٹی ہوتی تھی۔ دم اور پچھلے پیروں کے سہارے یہ بیٹھتے تھے۔ یہ سبزی خور تھے اور زمین پر پائے جانے والے پیڑ پودوں سے اپنی بھوک مٹاتے تھے ان کی لمبائی تقریباً ۳۱ فٹ تھی اور کھڑے ہونے پر ان کا سر زمین سے ۱۶ فٹ اونچا رہتا تھا۔ ان کے لمبے جبڑے میں آگے دانت نہیں تھے لیکن پیچھے دانتوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ ان کا وزن اوسطاً ۷ ٹن کے آس پاس تھا۔ اگلے ہاتھوں سے یہ پیڑ گرانے کا کام کرتے تھے۔ تاکہ اپنی خوراک آسانی سے کھا سکیں۔

## سیلیڈوسورس (SCELIDOSAURUS)

یہ بکتر بند دیوزادوں کے خاندان میں آتے ہیں ان کی لمبائی تقریباً ۱۲ فٹ تھی۔ ان کی کمر پر ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ ساتھ موٹی موٹی ہڈیوں کی ڈھالیں اور بھالے نما کانٹے تھے جن کا مقصد دیگر دیوزادوں سے بچنا تھا۔ چونکہ یہ دیوپیکر ندہ زمین پر نیچا چلتا تھا یعنی اس کا سر بھی نیچا رہتا تھا اس لیے ونچے اونچے دیوزادوں کا شدید حملہ کمر پر ہی ممکن تھا جس سے بچنے کے لیے انھوں نے یہ انتظام کیا تھا۔ یہ اپنے چاروں پیروں پر چلتے تھے ان کے پیٹ کی نچلی سطح سپاٹ اور غیر محفوظ ہوتی تھی۔ اس لیے لڑائی کے دوران اگر یہ الٹے ہو جاتے تھے تو ان کے پیٹ کو پھاڑ دشمن درندے کے لیے بہت آسان ہوتا تھا۔ یہ بھی سبزی خور تھے۔

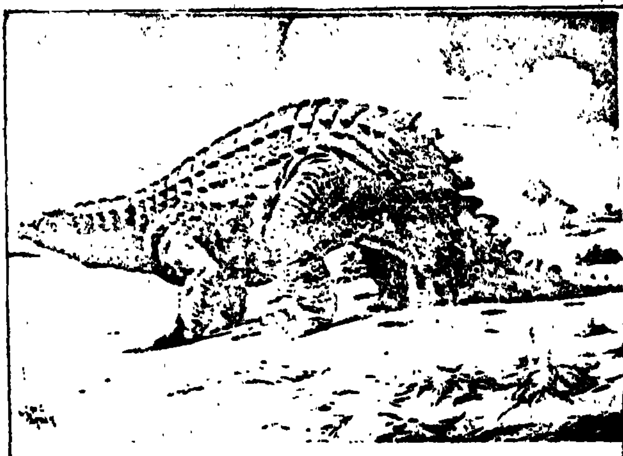


اگوانوڈون

## زوال کیسے آیا۔

ایک عرصے تک سائنس دانوں نے اس موضوع پر بحث کی کہ یہ دیوپیکر درندے کن وجوہ کی بنا پر دنیا سے کوچ کر مختلف مشاہدوں، تحقیقوں اور ثبوتوں سے تین وجہ سامنے آئی ہیں۔ اول یہ کہ جسم کے اعتبار سے ان ذہن تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا جس کی وجہ سے

ن میں براے نام تھی۔ جب ان کے گرد کا ماحول بدلنے لگا تو اس وقت اپنے آپ کو اس کے مطابق نہ ڈھال سکے جیسا میں نے اوپر لکھا ہے کہ یہ لگ بھگ ساڑھے بارہ کروڑ سال دنیا میں رہے۔ اس لمبے عرصے میں زمین کی شکل میں بڑی تبدیلی آئی جہاں سمندر تھے، وہاں خشکی آ گئی اور نئی نئی جگہوں پر سمندر بہنے لگے۔ جب پانی خشک ہوا تو پانی میں رہنے والے دیوزاد دوسری جگہ نہ جا سکے اور ہلاک ہو گئے۔ دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ ان کی بڑی تعداد کا انحصار پیڑ پودوں پر تھا۔ اس لیے ان کے زیادہ استعمال سے پیڑ پودے ختم ہونے لگے چونکہ یہ قوی الجثہ تھے اس لیے دور دراز کے علاقوں میں سبزے کی تلاش میں نہ جا سکے اور آخر ہلاک ہوئے۔ ان کے ہلاک ہونے کی ایک وجہ آپسی مقابلہ آرائی اور لڑائی بھی بتائی جاتی ہے۔ لیکن اس مقابلہ آرائی کے بعد جو جانور بچے ہوں گے وہ ان وجوہ کا شکار ہوئے ہوں گے جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ ان کے مفقود ہونے کی ایک تیسری تھیوری ابھی حال ہی میں امریکا کے ایک سائنس داں میک گلی نے پیش کی ہے۔ ان کی تحقیقات کے مطابق آج سے ساڑھے چھ کروڑ سال قبل ایک بہت بڑا سیارہ زمین پر آ گرا تھا۔ اس سیارے کی چوڑائی لگ بھگ سات میل تھی۔ اس کی ٹکر سے زمین ہل گئی اور اتنا گرد و غبار اٹھا کہ فضا سیاہ ہو گئی۔ سورج کی روشنی زمین پر آنا بند ہو گئی جس کی وجہ سے زمین ٹھنڈی ہو گئی ان تمام تباہیوں اور تبدیلیوں نے ان تمام دیوزادوں کو ہلاک کر دیا۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس لمبائی چوڑائی کے ایک سیارے نے زمین کو ہلایا تھا اور اس کے نشان کیلی فورنیا کے پاس ڈھونڈے جا چکے ہیں لیکن اسی وجہ سے یہ دیوزاد ختم ہوئے یہ محض ایک قیاس ہے۔



سیلیڈوسورس

لیکن یہ بہرحال ایک طے شدہ بات ہے کہ بدلتے موسم دریاؤں اور سمندروں کے بدلتے رخ اور سبزے اور جنگلات کی کمی نے ان دیوزادوں کو رخت سفر باندھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آج ہم بھی اس زمین پر اتنے ہی حاوی ہیں جتنے وہ دیوزاد تھے۔ وہ جسمانی دیو تھے تو انسان ذہانت میں دیوزاد ہے۔ آج ہم بھی قدرت کے خزانوں یعنی دریاؤں اور جنگلات کو بہت تیزی سے اپنے تصرف میں لا رہے ہیں۔ کیا ہمارا حشر بھی ان دیوزاد جیسا نہیں ہوگا؟ یقیناً اس سوال کا جواب تو آنے والا وقت ہی دے گا لیکن یہ بات طے ہے کہ ہم ان آفات کو آواز ضرور دے رہے ہیں۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۱۱، شمارہ ۳ (مارچ ۹۲ء)

# تعلیماتِ نبوی میں تربیتِ اطفال

محمد جنید خان ▽

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں جو باتیں نمایاں نظر آتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد انسانی معاشرے کی تربیت کے سلسلے میں ہیں۔ آپؐ نے حقوق العباد کی طرف جس قدر توجہ دی ہے اور انسان کو دوسرے انسان کے لیے جو ضابطۂ حیات ترتیب دیا ہے اس سے انسانی عظمت کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کی تمام زندگی میں اخلاقی تعلیم، معاشرے کی اصلاح اور تزکیۂ نفس کے بے شمار واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں بچوں کی تربیت کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اسلام میں بھی تربیت اطفال پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ

"باپ کا اپنے بچے کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقے سے بہتر ہے۔"

[مسلم]

ایک دوسری جگہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز پڑھنے کا حکم دو اور جب دس برس کا ہو جائے اور نماز نہ پڑھے تو اسے مار کر نماز پڑھاؤ اور اسے الگ سلایا کرو۔"

[ابو داؤد - کتاب الصلوٰۃ]

اصلاح معاشرہ کی ایک اور مثال ہمیں احادیث نبی کریمؐ میں ملتی ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

"جو شخص اپنے چھوٹوں سے شفقت اور رحم سے پیش نہ آئے اور جو چھوٹا اپنے بزرگوں کا احترام نہ کرے اس کے طور طریق ہمارے جیسے نہیں ہیں۔"

آج دنیا میں تربیتِ اطفال پر بے انتہا توجہ دی جاتی ہے، بے شمار کتابیں اس موضوع پر تحریر کی جا چکی ہیں لیکن جن بنیادی باتوں کی طرف اسلام نے لوگوں کی توجہ مبذول کرائی ہے اس کی برابری نہیں کی جا سکتی دنیا میں بچوں کے حقوق کی طرف توجہ دینے کے لیے سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں، دنیا کے مختلف ممالک اپنے یہاں بچوں کی اصلاح و تربیت کے سلسلے میں قوانین بناتے ہیں، خصوصی کمیٹیاں قائم کی جاتی ہیں، یونیسکو کی جانب سے "چلڈرن ڈے" منایا جاتا ہے لیکن نہ تو

▽ ۱۸۷ عثمانیہ آر - ایس ایس (نارتھ) اے ایم یو علی گڑھ

اس سے معاشرے میں کوئی نمایاں سدھار دیکھنے میں آتا ہے اور نہ ہی بچوں کے حالات میں کوئی تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ ان تمام تر کوششوں کے باوجود ان کی حالت پہلے سے بھی زیادہ بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ بچوں کے بگاڑ میں میڈیا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ٹی وی پر بعض ایسے مخرب اخلاق پروگرام پیش کیے جاتے ہیں کہ ان کو دیکھنے کے بعد تربیت اطفال اور اصلاح معاشرہ کی تمام مساعی بیکار ہو جاتی ہیں۔

اسلام نے تربیت اطفال پر بہت زیادہ زور اس لیے دیا ہے کہ بچے قوم اور مذہب کی امانت ہوتے ہیں۔ ان کی اصلاح کے بعد معاشرے میں جو بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ دیرپا اور انقلابی ہوتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ کا معمول تھا کہ جب بچوں کے پاس سے گزرتے تو "السلام علیکم" کہتے۔ اور ہمیشہ بچوں کو سلام کرنے میں پہل فرماتے۔ کبھی کبھی حضور اکرمؐ بچوں کی اصلاح کے لیے ہلکا پھلکا مذاق بھی فرماتے تاکہ بچوں میں آپؐ سے انس و محبت کا جذبہ برقرار رہے۔

حضور کے ایک صحابی تھے جن کے بچے کا نام تھا ابو عمیر۔ جب حضورؐ ان صحابی کے یہاں تشریف لے جاتے تو ابو عمیر بہت خوش ہوتے۔ ایک دن ابو عمیر نے حضور کو بتایا کہ انھوں نے ایک پرندہ پالا ہے۔ اس کے بعد جب کبھی حضورؐ ابو عمیر کو دیکھتے تو معلوم فرماتے۔ اے ابو عمیر! تمہارے پرندے کا کیا حال ہے۔ کافی دنوں تک حضور ابو عمیر سے ان کے پرندے کا حال پوچھتے رہے۔ اور ابو عمیر اپنی توتلی زبان سے اس پرندے کا حال بڑے معصوم انداز سے بیان کرتے رہے۔

مدینے منورہ میں حضورؐ جب ہجرت کرکے تشریف لائے تو حضورؐ کا استقبال بچے بڑے پرجوش انداز میں اشعار گا گا کر کر رہے تھے۔

تربیت اطفال کی ایک بہترین مثال ہمیں حضرت زید رضی اللہ عنہ کے واقعے سے ملتی ہے۔ حضرت زید ایک جنگ میں غلام بن کر مکہ کے بازار میں فروخت ہونے کے لیے آئے۔ حضرت خدیجہؓ نے ان کو خرید کر حضورؐ کی خدمت میں پیش فرما دیا۔ حضرت زید اس وقت بچے تھے۔ حضورؐ کی خدمت کرتے۔ ان کے والدین کو معلوم ہوا کہ ان کا بچہ مکہ میں فروخت ہوا ہے اور وہاں حضور کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ حضرت زید کے والد مکہ میں آئے۔ حضور سے ملاقات کی اور زید کے بارے میں تفصیلاً بتایا کہ کس طرح وہ دشمن قبیلے کے ہاتھ لگا اور غلام بن کر فروخت ہوا۔ انھوں نے حضورؐ کو پیشکش کی کہ جس رقم میں آپؐ نے اس کو خریدا ہے اس سے زیادہ رقم لے لیں اور میرے لڑکے کو مجھے واپس فرما دیں۔

حضورؐ نے فرمایا میں اس کا فیصلہ زید پر چھوڑتا ہوں کہ وہ اگر آپ کے ساتھ جانا چاہے تو چلا جائے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اور نہ ہی رقم کی ضرورت ہے۔ حضرت زید کے والد اس بات سے بہت خوش ہوئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کو بلایا اور ان سے ان کے والد کا مدعا بیان کیا۔ اپنے والد کو پا کر حضرت زید کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا لیکن جب والد نے ان سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا اور حضورؐ سے جدائی گوارا نہیں کی۔ ان کے والد نے ماں کی محبت، بھائیوں کی [illegible]

بات بھی کہ وہ اس دامن سے جدا نہیں ہوں گے جہاں
غلام ہوتے ہوئے بھی وہ آزاد ہیں جہاں ان کے ساتھ
انسانیت کا وہ برتاؤ کیا جاتا ہے جس پر انسانیت ناز کرتی
ہے۔ حضرت زید کے والد نے انھیں بہت سمجھایا، زمانے
کی اونچ نیچ سے آگاہ کیا کہ کل جوان ہونے پر ان کو
غلام کے لقب سے پکارا جائے گا، معاشرے میں
ان کا کیا مقام رہے گا اور قبیلے سے کس طرح ان کا
ناطہ ٹوٹ جائے گا لیکن اس بچے کی ایک ہی ضد تھی
کہ وہ دامن مصطفیٰ نہیں چھوڑے گا۔

ان کی حضورؐ سے اس محبت کے ناتے نے حضورؐ
کو ان کو منہ بولا بیٹا بنانے پر مجبور کر دیا۔

یہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کہ بچے
اپنے والدین سے زیادہ حضورؐ سے محبت کرتے۔

ایسے ہی ایک اور نوعمر لڑکے کا واقعہ تاریخ
کی کتابوں میں ملتا ہے کہ جنگ بدر کے موقع پر اپنی
کم عمری کے باوجود اس بات پر حضورؐ سے اصرار کرتے
رہے کہ حضورؐ ان کو اپنے ساتھ میدان جنگ میں
لے چلیں اور وہ نبی کریمؐ کی طرف سے جنگ کریں
اور حضورؐ کی دشمنوں سے حفاظت کے لیے اپنی جان
قربان کر دیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف
لائے تو ایک بار اپنے بچپن کے واقعہ کو یاد کیا۔ ایک
مکان کی طرف اشارہ کرتے فرمایا

"یہی وہ مکان ہے جہاں میں اپنی والدہ
کے ہمراہ ٹھہرا تھا۔"

پھر آپؐ نے ایک تالاب اور میدان کی طرف اشارہ
فرمایا اور فرمایا کہ

"یہی وہ تالاب ہے جس میں میں نے
تیرنا سیکھا تھا اور یہی وہ میدان ہے
جہاں بچپن میں میں ایک بچی انیسہ کے
ساتھ کھیلا کرتا تھا۔"

حضورؐ کی آمد کے سلسلے میں بنی نجار کی معصوم بچیاں
دف بجا بجا کر آمدِ رسول کی خوشیاں منا رہی تھیں
اور گیت گا رہی تھیں:

نحن جوار من بنی النجار
یا حبذا محمد من جار

[ ہم بنو نجار کی لڑکیاں ہیں۔ محمدؐ کیا
ہی اچھے ہمسایہ ہیں ]۔

حضورؐ ان بچیوں کے پاس آئے تو مسکرا کر ان
سے فرمایا:

"بچیو! کیا تم مجھ سے الفت
رکھتی ہو؟"

سب بچیوں نے یک زباں ہو کر بڑے پرجوش
انداز میں جواب دیا:

"ہاں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)
ہم آپؐ سے الفت رکھتے ہیں، آپ
ہمیں بہت عزیز ہیں اے اللہ کے
رسولؐ۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد
فرمایا:

"تم بھی مجھ کو بہت عزیز ہو۔"

یہ تربیت تھی جناب نبی اکرمؐ کی کہ بچے آپؐ کو
بے پناہ عزیز رکھتے۔ اپنی جانیں آپؐ پر نچھاور کرنے
کو تیار رہتے۔

# ناقص الخلقت بچے

ابو وارث جمیل ▽

اس قسم کے جڑواں جڑے ہوئے بچے دوران حمل مادرِ رحم کے اندر بیضہ میں غیر طبعی تبدیلیوں کے باعث وجود میں آتے ہیں۔ بیضہ کے ذریعے تولد ہونے والے جڑواں جنین کے بعض حصے یا اعضا آپس میں ایک دوسرے سے ملحق ہو جاتے ہیں۔ اس کے اسباب کی بابت ماہرین علم الجنین کا خیال ہے کہ اس کا اصل محرک وہ نسیج جمنی (امبریونک ٹیشو) ہے جو کہ ابتدائی دھاریوں (پریمٹو اسٹریک) کے مقدم جانب موجود ہوتے ہیں اور اس عمل کے مبدا ہوتے ہیں اور حرکت استحالۂ کثیر کے مرکز شمار ہوتے ہیں۔ اگر کسی مضر سبب جیسے برودت یا شعاعوں کے باعث یہ حرکات استحالہ شکست ہو جائیں تو حمل وجود میں نہیں آتا اور صرف غشا بن کر رک جاتی ہے جس کو قطعہ دودیہ (مول) کہتے ہیں۔

اگر مرکز تحریک (آرگنائزنگ سینٹر) تباہ ہو جاتا ہے تو ابتدائی دھاریوں کے مقدم حصے پر دو دوسرے تحریکی مرکز وجود میں آجاتے ہیں جو کہ حمل کو دو غیر طبعی حصوں میں منقسم کر دیتے ہیں جن کا آپسی اتصال مختلف الخلقت توام کا باعث ہوتا ہے جو کہ ناقص الخلقت بچے کے تولد کا ذریعہ بنتے ہیں جو کہ دو سر اور ایک جسم والا ہوتا ہے [دیکھیے خاکہ نمبر ایک (الف)]

اگر ابتدائی دھاریوں (پریمٹو اسٹریک) کا موخر حصہ دو سروں میں منقسم ہو جاتا ہے تو ایک سر اور دو جسم والا بچہ وجود میں آتا ہے۔ [دیکھیے خاکہ نمبر ۲]



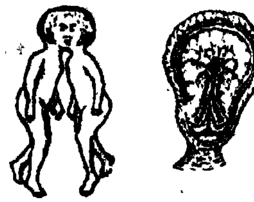
خاکہ نمبر ایک (الف)



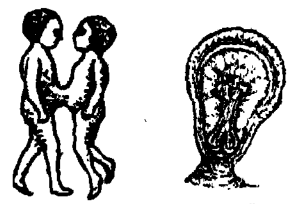
خاکہ نمبر ایک (ب)

اگر ابتدائی دھاریاں (پریمٹو اسٹریک) مقدم اور موخر دونوں جانب وسط کو چھوڑ کر منقسم ہو جائیں تو دو جسم

کی دیواریں آپس میں ملی ہوں گی اور سرۃ (امبلائکس) اور حبل سری (امبلائکل سارڈ) ایک ہی ہوگا (خاکہ نمبر ۲)



خاکہ نمبر ۲



خاکہ نمبر ۳

عموماً مندرجہ ذیل اقسام کے توام کثرت سے وجود میں آتے ہیں جیسے:

۱- توام الحاق جسمی
۲- توام الحاق راسی وصدری
۳- توام الحاق صدری
۴- توام الحاق بالائے صدری
۵- توام الحاق وریکی
۶- توام الحاق عجزی

۱- توام الحاق جسمی

اس میں سر آپس میں جڑے رہتے ہیں (خاکہ نمبر) جب ابتدائی دھاریوں کے مقام جانب دو مرکز تحریک کا وجود ہوتا ہے تو دو سر اور ایک جسم والا جنین وجود پاتا ہے (دیکھیے خاکہ نمبر ۱ (الف) اور (ب) ) اور جب موخر جانب دو مرکز تحریک وجود میں آتے ہیں تو ایک سر اور دو جسم والا توام وجود میں آتا ہے (خاکہ نمبر ۲)



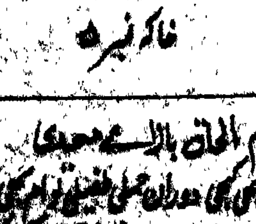
خاکہ نمبر ۴

۲- توام الحاق راسی وصدری

اسی طرح کے توام میں سر اور سینہ آپس میں جڑے رہتے ہیں۔

۳- توام الحاق صدری

اس میں صرف سینہ آپس میں جڑے رہتے ہیں۔



خاکہ نمبر ۵

۴- توام الحاق بالائے صدری

کبھی کبھی دوران عمل تخلیق توام بھی وجود میں آجاتے ہیں جن میں خیال غالب کری جنین ہوتا کہ یہ شریان سرۃ کے ذریعے میزبان توام کے دوران

خون پر منحصر ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی اس طرح کے توام میں پورا طفیلی جسم یا اس کا صرف ایک حصہ میزبان جنین کے جسم سے جڑا رہتا ہے (دیکھیے خاکہ نمبر۶)



خاکہ نمبر ۶

۵- توام الحاق درکی

اس طرح کے توام میں سرین آپس میں جڑے رہتے ہیں۔

۶- توام الحاق عجزی

کبھی کبھی توام عجز (سیکرم) کے پاس سے آپس میں جڑے رہتے ہیں (خاکہ ۷)



خاکہ نمبر ۷

کبھی کبھی ولادت میں دشواری کے باعث بہت سے طفلی بچے زندہ نہیں رہ پاتے لیکن ایسے توام کی فہرست بھی طویل ہے جو کہ جراحت کے بعد بھی زندہ رہے۔

---

حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

تین آدمی ہیں جن کی نماز قبول نہیں ہوتی۔

- ایک وہ آدمی جو لوگوں پر سرداری کرے اور وہ لوگ اس سے ناراض ہوں۔
- دوسرے وہ عورت جس کا شوہر اس سے ناراض ہو اور وہ آرام سے پڑی سو رہی ہو۔ اور
- تیسرے وہ آدمی جو اپنے بھائی سے قطع تعلق کرے۔

[الترغیب والترہیب]

# مال و زر کی بے قدری

حکیم محمد اسلم صدیقی ○

پچھلی جنگ عظیم میں جاپانیوں نے برما پر گولے برسائے تو ان علاقوں میں جہاں مدتوں سے ہندوستانی آباد تھے اور وہیں شادی بیاہ کر کے رہنے لگے تھے جاپانیوں نے وہاں بھی بمباری کی تھی۔ ہندوستانی اس بمباری کی تباہی اور بربادی سے ہراساں ہو کر وہاں سے بھاگ کر اپنے قدیم وطن میں پناہ لینے کے لیے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ جو کچھ بن پڑا سامان کے ساتھ آ رہے تھے۔ ان میں کچھ بہت زیادہ دولت مند اور خوش حال بھی تھے۔ ان کی وہاں بڑی بڑی جایدادیں، کاروبار، باغات اور شاندار عمارتیں تھیں۔ جہاں وہ بڑے آرام وعیش کی زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن اس مصیبت اور پریشانی میں وہ لوگ بھی بہت کچھ چھوڑ کر اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے تھے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے ساتھ کافی زر و مال لے کر نکلے تھے جو زیادہ تر نوٹوں اور سونے کی شکل میں تھا۔ وہ قیمتی سامان کو راستے کی اذیت کی وجہ سے جگہ جگہ چھوڑ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ کوئی اُن کا خریدار تھا نہ طلب گار۔ انگریزی حکومت نے ان لوگوں کے لیے آسام سے اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کیا تھا، جس میں یہ مفت سفر کر رہے تھے۔ ان کی منزلِ مقصود مختلف تھی۔ ان میں اکثر بستی، گونڈہ، بہرائچ، سلطان پور، فیض آباد، سیتاپور اور کچھ لکھنؤ سے آگے کے تھے۔ اسپیشل ٹرین گورکھپور سے گزرتی تھی۔ ان میں ہر طبقے کے ہندو مسلمان، دیسی عیسائی اور یوریشین بھی تھے۔ اس گاڑی کے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں یوریشین مسافر ہوتے تھے۔ ایک بوڑھا مسافر مسلمان پشاور کا بھی تھا۔

راقم ان دنوں گورکھپور میں مطب کرتا تھا۔ ان مصیبت زدوں کا حال معلوم ہوا تو چند ہم خیال لوگوں نے ان کی خدمت کا فیصلہ کیا۔ اس میں ہندو مسلمان سب شامل تھے۔ چنانچہ مشورے سے طے پایا کہ ان بے خانماں برباد لوگوں کے کھانے پینے، دوا وغیرہ کا انتظام کیا جائے اس کے لیے بڑی آسانی سے سامان اور کام کرنے والے والنٹیر فراہم ہو گئے۔ لیکن سب سے بڑی دشواری اور پریشانی یہ تھی کہ اسپیشل ٹرینوں کے گورکھپور پہنچنے کا کوئی وقت متعین نہ تھا۔ بعض مرتبہ گھنٹوں انتظار میں وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ اس دشواری کے حل کے لیے ہم لوگوں نے ایک ونفک کی صورت میں وہاں کے ٹکٹ ماسٹر ماس ہوبہت

ہی سینئر آئی سی ایس تھا، اس سے ملے اور ان کو اس
پروگرام سے آگاہ کیا اور ٹرین کے متعلق جو دشواری تھی، وہ
بتلائی۔ جنگ پورے شباب پر تھی۔ اس نے اس تجویز
سے پوری طرح اتفاق اور ہر قسم کی آسانی اور امداد کا وعدہ
کیا اور ریلوے افسران سے بات کر کے طے کرایا کہ اسپیشل
ٹرین کے آنے کے تین چار گھنٹے پہلے کوتوالی میں فون کر دیا جائے
گا وہاں سے ہم لوگوں تک اطلاع پہنچ جائے گی۔ اس
وقفہ میں کھانے وغیرہ کا انتظام کر کے بہ آسانی اسٹیشن پہنچا
جا سکتا ہے۔ اسٹیشن پر ایک محفوظ جگہ کا بھی انتظام
ہو گیا جہاں پانی اور کھانے کا برتن دوا مرہم پٹی کا سامان
رکھا جا سکتا تھا۔ اس انتظام سے بڑی آسانی ہو گئی۔
آٹھ دس والنٹیر ایک نگراں کے تحت اسٹیشن پہنچ کر کھانا
پانی اور دوا وغیرہ کے ساتھ ڈبوں میں داخل ہو کر لوگوں
کو تقسیم کرتے تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ برف فیکٹری سے
حسب ضرورت برف بلا قیمت ملتی تھی۔ اس لیے ٹھنڈا
پانی مہیا کیا جاتا تھا۔ شروع میں تو ہندوؤں کو کھانا پانی
ہندو والنٹیر اور مسلمانوں کے لیے مسلمان والنٹیر تقسیم
کرتے رہے۔ لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ان مصیبت زدوں
کی نظر میں یہ تقسیم بے کار ہے۔ بلا تفریق جس کا جی چاہتا
ہندو یا مسلمان سے کھانا پانی مانگ لیتا تھا۔ چنانچہ چند
دنوں میں یہ تفریق ختم ہو گئی اور کسی نے اس پر اصرار بھی
نہیں کیا۔ ان مصیبت زدوں کی خدمت میں ہندو مسلم
والنٹیر اچھے رفیق و معاون تھے۔ ان کے تعلقات آپس
میں ہمیشہ خوشگوار اور پُر لطف رہے۔ اس وجہ سے
یہ کام نہایت خوش اسلوبی اور دل سوزی کے ساتھ انجام
پاتا رہا۔ کچھ مسافر ایسے بھی تھے جو اس طرح کھانا لینا
پسند نہیں کرتے تھے وہ قیمتاً لینا چاہتے۔ جو ہمارے
اصول کے خلاف تھا اس لیے اسٹیشن کی دکانوں پر ایسے
لوگوں کے [illegible]

اپنی مرضی کا کھانا خرید کر کھاتے تھے۔ ٹھنڈا پانی اور ضرورت کی
دوا ضرور قبول کر لیتے تھے۔ فرسٹ کلاس ڈبے میں ایک
یوروپین معمر لیڈی سفر کر رہی تھی وہ پیاس سے بے تاب تھی۔
گھنٹوں کے لمبے لمبے فاصلے طے کر کے ٹرین کہیں کہیں رکتی تھی
وہ بھی کوئلہ، پانی اور مسافروں کی خاطر تھوڑی دیر کے لیے
ٹھہرتی تھی۔ گورکھپور کے بعد اس کی منزل لکھنؤ تھی۔ ایک والنٹیر
نے اس لیڈی کو برف کا ٹھنڈا پانی دیا۔ اس نے مزید ساتھ
لے جانے کے لیے چاہا۔ اسٹیشن سے صراحی خرید کر ٹھنڈا پانی
اس کے ساتھ کر دیا گیا۔ اس نے بے حد خوشی اور تشکر کا
اظہار کرتے ہوئے اس والنٹیر کو سو روپیے کا ایک نوٹ دینا
چاہا۔ اس نے معذرت کے ساتھ انکار کر دیا۔ اس کو
حیرت ہوئی۔ ایسے اکثر مواقع آئے مگر کبھی بھی کسی والنٹیر
نے کسی سے کوئی رقم قبول نہیں کی۔ ان مسافروں سے معلوم
ہوا جس کی برابر تصدیق بھی ہوئی کہ گورکھپور سے پہلے راستے
میں ایسی خدمت کا کہیں بھی کوئی بندوبست نہیں تھا۔ کہیں
کہیں صرف پانی، چند بسکٹ کسی کسی مسافر کو مل جاتے تھے
ریلوے کی طرف سے صرف پانی کا انتظام ضرور تھا۔ کھانے
کے لیے خود انتظام کرنا ہوتا تھا۔ دوکان دار من مانی قیمت
وصول کر لیتے تھے۔ جو بالکل ہی خالی جیب تھے وہ ساتھی
مسافر جو خوش حال تھے ان کی امداد اور چند ٹکڑوں پر گذارہ
کرتے تھے۔ لکھنؤ کے متعلق اطلاع ملی تھی کہ وہاں اصحاب خیر
نے بھی معقول بندوبست خدمت کا کر رکھا تھا۔ ان ٹرینوں میں
بیشتر ایسے ہوتے جو طویل فاصلہ پیدل طے کر کے آسام میں
داخل ہوئے تھے۔ ان کے پیر سوجے ہوئے تھے۔ ان مسافروں
نے بتایا کہ کچھ لوگوں نے جن کے پاس وافر نوٹ تھے سیکڑوں
کے نوٹ جلا کر چاول پکائے۔ آگے چلنے کے لائق ہوئے لیکن
نوٹ جلانے کے لیے بھی ایک ڈبیہ دیا سلائی جو ایک پیسے کی
عام طور پر ملتی تھی پانچ روپے [illegible]
[illegible]

ایک مسافر پشاور کا پٹھان تھا۔ سو برس کی عمر تھی۔ بیماری اور ضعف سے لاچار مگر بڑی ہمت اور حوصلہ والا تھا۔ اس نے یہ خدمت دیکھی تو کہا کہ میں اکیلا پشاور کا مسافر ہوں۔ کچھ دنوں کے لیے گورکھپور میں اتار لو۔ پھر دم لے کر چلا جاؤں ورنہ راستے میں ختم ہو جاؤں گا۔ اس نے ایسی لاچاری سے یہ بات کہی کہ ہم لوگ رضامند ہو گئے اور اس کو وہیں اتار لیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک پوٹلی کپڑوں کی اور ایک لوٹا تھا۔ اس کے لیے اسٹیشن ماسٹر اور ریلوے گارڈ سے اجازت لینی پڑی۔ راقم کے علاوہ ایک نیک اور مخلص بزرگ نے ان کے قیام و طعام کی ذمّہ داری لی۔

اس پٹھان نے بتایا کہ میں سو برس پہلے اپنے والدین کے ساتھ پشاور سے برما گیا تھا۔ اس وقت برما ہندوستان کا ایک حصّہ تھا۔ وہیں ہم لوگ رہ بس گئے۔ کتنے ہی خاندان تلاش معاش میں وہاں آباد ہو گئے تھے اب جو سب تتر بتر ہو گئے۔ ہم لوگوں کا اپنے وطنی قبیلے سے تعلق باقی ہے۔ برابر آمد و رفت کا سلسلہ قایم رہا ہے اس نے اپنے عزیزوں کا پتہ بتلایا۔ ان کو خطوط لکھے گئے کچھ دنوں بعد ان کے ایک عزیز پشاور سے آ کر اس کو اپنے ساتھ لے گئے۔ چلتے وقت کام کرنے والوں کو بہت دعائیں دیں اور چشم پُرنم رخصت ہوئے۔

ایک دن اسپیشل ٹرین آئی تو اس میں ایک عورت اور چند بچے رو رہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ چند گھنٹے ہوئے راستے میں اس عورت کا شوہر وفات پا گیا ہے۔ اسی ڈبے میں اس کی میت تھی۔ اسٹیشن ماسٹر، ریلوے گارڈ اور پولیس کی موجودگی میں اس کی لاش، بیوی بچوں کے ساتھ اتار لی گئی اور لکھا پڑھی کے بعد میت اور بیوی بچے شہر کی انجمن اسلامیہ جو اسٹیشن سے کافی فاصلے پر ہے، پہنچا دیے گئے۔ وہاں اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام ہوا۔ اس کی بیوی برمی تھی۔ مرحوم گونڈہ ضلع کے کسی گاؤں کا قدیم باشندہ تھا۔ وہ عورت معمولی اردو بول اور سمجھ سکتی تھی۔ اس قافلہ کی منزل گونڈہ کے دیہات میں تھی۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ اُن لوگوں کو وہاں پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ اس کے بتلائے ہوئے پتے پر خط لکھا گیا۔ کافی دنوں کے انتظار کے باوجود کسی نے کوئی خبر نہ لی۔ عدت پوری ہونے پر مشورہ کر کے اس کی رضامندی سے وہیں ایک بھلے مانس سے عقد کر دیا گیا۔ جس کے ساتھ وہ اپنے بچوں کو لے کر بہتر زندگی بسر کرنے لگی۔

ایک صاحب جو برما ریلوے میں کسی اچھے عہدے سے رٹائر ہوئے تھے وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ گورکھپور اتر گئے تھے اور کرایے کا مکان لے کر رہنے لگے۔ انھوں نے اپنے کاغذات دکھلا کر ریلوے میں اپنے بھتیجے کی ملازمت کی کوشش کی۔ گورکھپور ریلوے کا ہیڈکوارٹر تھا۔ اس میں اونچے عہدوں پر اچھے خاصے مسلمان تھے۔ ان لوگوں نے ان کو ملازمت دلوا دی اور بڑے میاں نے اپنے بھتیجے کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ وہ کافی خوش حال تھے۔ وہ اپنے ساتھ بڑی مقدار میں سونا لائے تھے۔ ایک مکان خرید لیا اور آٹا پیسنے کی چکّی لگا کر اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔ وہ پڑھے لکھے اور نیک آدمی تھے ان کی بیوی بھی برمی تھیں۔ ان کے یہاں پردہ اور نماز روزہ کی پابندی تھی۔

"ہر ہندوستانی ایک دوسرے کو بلاتفریق مذہب و ملت، انسان و مکان برابر سمجھے اور اس پر اعتماد کرے اور اس پر کسی قسم کا لیبل نہ لگائے۔"

سید ہاشم علی

اکثر ملاقات ہوتی تو پہلے کے اطمینان والے زمانہ اور پھر اس سفر میں مصائب اور اذیتوں کا ذکر کرتے تھے لیکن ہر حال میں اللہ کے شکر گذار تھے کہتے تھے کہ مال و زر کی ایسی ناقدری تھی کہ اُن کا ہونا بھی وبال تھا اور نہ ہونا بھی ۔ ہزاروں روپے نقد اور سونا ہوتے ہوئے طویل فاصلہ پیدل طے کرنا پڑا ۔ بھوک و پیاس نے کئی بار موت سے ہم کنار کر دیا تھا ۔ چند گھونٹ پانی اور چند دانے چنے نعمت غیر مترقبہ تھے ۔ لوگ عجیب و غریب اور درد انگیز داستان سفر سناتے تھے جن کو سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے اور اس عالم رنگ و بو کی بے رونقی اور بے ثباتی آشکار ہوتی تھی ۔ اس میں بہت کچھ سامان عبرت بھی تھا ۔ اللہ بس ۔ باقی ہوس ۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

" سات چیزوں سے پہلے اچھے اعمال میں جلدی کرو ۔ اگر ایسا نہیں کرتے تو

فقر کا انتظار کرو یا

ایسی دولت کا جو سرکش بنا دینے والی ہو یا

ایسی موت کا جو کام تمام کر دینے والی ہو یا

ایسے مرض کا جو بگاڑ دینے والا ہو یا

ایسے بڑھاپے کا جو سٹھیا دینے والا ہو یا

دجال کا جو نہایت بُری غیر موجود چیز ہے جس کا انتظار کیا جائے یا

قیامت کا

لیں قیامت بہت سخت اور نہایت کڑوی چیز ہے ۔

ترمذی

# الرسالہ — ایک مشہور عربی مجلہ

ابو سفیان اصلاحی ▽

دنیائے عربی ادب میں بیسویں صدی کے مصر کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، بالخصوص قاہرہ علم وادب کا مرکز تھا۔ ادبا ومفکرین اپنی اپنی بساط بچھائے ہوئے تھے اور مختلف افکار وخیالات کی نمائندگی شباب پر تھی کچھ ادبا ادب میں آزادی کے نعرے لگا رہے تھے جو ایک اچھی بات تھی لیکن اس آزادی نے بہت سے اسلامی شعائر کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ طٰہٰ حسین، عقاد اور احمد امین کے بہت سے خیالات اسلامی اقدار کے منافی ہیں لیکن انہی کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے ادبا ومفکرین بھی تھے جو نہ صرف غیر اسلامی افکار کا تعاقب کرتے بلکہ مختلف ادبی موضوعات پر اسلامی نقطۂ نظر پیش کرتے۔ اس وقت مصر میں جرائد اور رسائل کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا۔ یہ جرائد و رسائل مختلف حلقوں کے نقیب تھے۔ اس وقت کے مصر کے نمائندہ رسالوں میں ایک نمایاں رسالہ "الرسالہ" تھا اس رسالے کے مدیر عربی ادب کے نامور مقالہ نگار ادیب اور صحافی احمد حسن الزیات (۱۹۶۸ء - ۱۸۸۵ء) تھے۔ "الرسالہ" کے علاوہ انھوں نے دو مجلات کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ ایک الراویہ اور دوسرا الازہر ایک ایسا رسالہ ہے کہ جس کی ادارت کے فرائض بڑی بڑی شخصیات نے انجام دیں۔

۱۹۳۳ء میں جب الزیات عراق سے واپس آئے تو وہ ایک مجلہ نکالنے کے لیے کمربستہ ہوئے۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں ان کی کوششیں بارآور ہوئیں اور مجلۂ الرسالہ منظر عام پر آگیا اور ۱۹۵۵ء تک صالح ادب کی نمائندگی کرتا رہا۔ اس رسالے میں وہی چیزیں شایع کی جاتیں جو اقدار اسلامی کے مخالف نہ ہوں یا وہ اسلامی اقدار کی نمائندگی کر رہی ہوں۔ الرسالہ پر ایک طرف تو مذہبی رنگ غالب تھا اور دوسری طرف سیاسی معرکہ آرائیوں سے بھی پاک تھا۔ اکیس سال تک یہ رسالہ ادبی، معاشرتی اور مذہبی خدمت انجام دیتا رہا۔ الزیات کو علمی دنیا میں اس مجلہ کی وجہ سے بڑی پذیرائی ملی اور علوم وفنون کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے

لوگوں کے اذہان میں اس سوال کا اٹھنا بجا ہے کہ یہ رسالہ الزیات نے کیوں اور کن مقاصد کے پیش نظر جاری کیا۔ الزیات جب ۱۹۳۳ء میں قاہرہ واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ اس وقت مصر کے اندر کوئی کوئی ایسا مجلہ نہیں ہے جو صالح ادب کی بھی نمائندگی کرتا ہو اور عرب قومیت نیز مذہبیات پر خصوصی توجہ کہ

---

▽ شعبۂ عربی ۔ اے ایم یو ۔ علی گڑھ

کرتا ہو۔ چنانچہ انہی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے الرسالہ کا اجرا کیا۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جس وقت الزیات اس مجلہ کا اجرا کرنے جا رہے تھے اس وقت طٰہٰ حسین وزیر تعلیم تھے۔ چنانچہ الزیات کی درخواست پر طٰہٰ حسین نے ان کا قلمی و مالی تعاون کیا۔

الرسالہ نے ہمیشہ قومی اور فرعونی ادب پر کھل کر تنقید کی۔ طٰہٰ حسین سے تعلقات کے باوجود کبھی بھی اس میں ان کی مختلف فیہ تخلیقات شائع نہیں ہوئیں۔ طٰہٰ حسین کی "علی ہامش السیرۃ" اور "عبقریۃ محمد" جیسی تحریریں اس مجلہ کی زینت بنیں۔ صرف اس لیے کہ ان پر اسلامی رنگ غالب تھا اور ان سے قارئین پر اچھے اثرات مترتب ہوئے۔ الزیات نے مصطفیٰ صادق الرافعی (۱۹۳۷ء — ۱۸۸۰ء) کی تحریروں کو اس مجلہ میں ہمیشہ بڑی نمایاں حیثیت سے شائع کیا۔ چوں کہ مصطفیٰ صادق الرافعی کا شمار اسلامی ادبا میں سرفہرست ہوتا ہے۔ مصطفیٰ صادق الرافعی قرآن حکیم کو ادب کا شاہکار مانتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ معیاری ادب صرف قرآن حکیم اور احادیث نبوی کی روشنی میں تخلیق کیا جا سکتا ہے رافعی کے نظریات کو معلوم کرنے کے لیے ان کے مقالات کے مجموعے "وحی القلم" اور دو کتابیں "تحت رایۃ القرآن" اور "اعجاز القرآن" دیکھی جا سکتی ہیں چنانچہ ان میں مجلہ اسلام بالخصوص طٰہٰ حسین کی اچھی خبر لی ہے یہی وجہ ہے کہ الرافعی کی اسلام پسندی کو دیکھتے ہوئے الزیات انھیں الرسالہ میں بڑی فراخ دلی سے جگہ دیتے۔ الزیات الرسالہ میں الرافعی سے متاثر ہونے والے ادبا کو بھی جگہ دیتے مثلاً محمود محمد شاکر، عبد المنعم اور سید [illegible] کے مضامین کثرت سے شائع ہوئے الرسالہ نے [illegible] بڑی [illegible]۔ عرب قومیت کی [illegible] الرسالہ نے [illegible] مضامین شائع

کیے اور وضاحت کے ساتھ بتایا کہ یہ چیز اسلام کے خلاف ہے۔ اسلام نے علاقائیت اور قومیت پر ہمیشہ تنقید کی ہے۔ اسی لیے محسن انسانیت نے بھی فرمایا کہ عصبیت کا علمبردار ہم میں سے نہیں ہے۔

الرسالہ میں قدیم و جدید دونوں ادب کی نمائندگی ہوتی۔ البتہ الرسالہ کا موقف یہ تھا کہ جدید ادب کی ان ہی چیزوں کو قبول کیا جائے جو صالح روایات سے نہ ٹکرا رہی ہوں۔ وہ مشرق و مغرب میں غور و خوض کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ الرسالہ میں تاریخی ادبی اور ثقافتی چیزیں کثرت سے شائع ہوتیں۔ عقاد، عبد الرحمان شکری اور عبد الوہاب مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرتے۔ زکی مبارک نے 'وحدت الوجود' اور بہت سے گمراہ کن فلسفیانہ نظریات کے خلاف مضامین سپرد قرطاس کیے۔ بہت سی کتابیں الرسالہ میں بالاقساط شائع ہوئیں۔

مدیر الرسالہ نے جہاں اپنے مجلہ کے علمی وقار کو برقرار رکھنے کے لیے عظیم علمی شخصیات سے وقیع مضامین حاصل کیے وہیں خود بھی ہر شمارہ میں بڑی پابندی سے مختلف علمی موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے رہے بعد میں الزیات کے یہ مضامین چار جلدوں میں ترتیب دے کر شائع کر دیے گئے۔ مجلہ الرسالہ کی مناسبت سے ان مجموعوں کا نام بھی "وحی الرسالہ" رکھا گیا۔ وحی الرسالہ کے فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات پوری طرح سامنے آجاتی ہے کہ الزیات خالص اسلامی نظریات کے حامل تھے۔ انھیں سیاست سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ صرف معاشرتی، دینی اور ادبی مقالات لکھتے وہ اسلام کے ایک بے شیدائی تھے۔ جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کے افکار کی روح ان کے اندر جاگزیں [illegible] یہی وجہ ہے کہ وہ وحدت اسلامی کے ایک

بھی ثابت ہوئے۔ الرسالہ میں ہمیشہ یہ آواز بلند کی کہ ملت اسلامیہ کو اتحاد و اتفاق کے دامن سے وابستہ رہنا چاہیے۔ صرف وحدت ہی انھیں ان کے کھوئے ہوئے وقار کی ضمانت دے سکتی ہے۔ وہ مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے فکر مند رہے۔ ان کے مقالات میں یہ فکر پوری طرح نمایاں ہے کہ وہ دنیا کے مسلمانوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد تصور کرتے۔ اپنے ان ہی رجحانات کی بنا پر وہ خلافت عثمانیہ کے زبردست حامی تھے۔ ان کی اسلام سے سچی وابستگی کا ہی نتیجہ تھا کہ انھوں نے طٰہٰ حسین، عقاد اور احمد امین کی طرح یورپین ادب کی اندھی تقلید نہیں کی۔ مغربی علوم کی کوئی چیز تجزیہ و تحلیل کے بعد قبول کرتے۔ الرسالہ میں بارہا یہ آواز اٹھائی کہ ہمارے ادبا، مغربی ادب کی آغوش میں جا بیٹھے ہیں اور مغربی ادب کی ہر چیز کو عربی ادب پر چسپاں کرنا چاہتے ہیں جب کہ دونوں کے مزاج میں بعد مشرقین ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہمارے ادبا، عربی ادب کی روح سے ناواقف ہیں۔ الرسالہ میں انھوں نے جدید ادب کی بے لغو اور ضلالتوں کا نوٹس لیا اور کلاسیکی ادب کے نمائندہ الرافعی کی تحریروں کو سراہا بھی۔

الرسالہ میں الزیات نے عربی زبان کی ترویج و اشاعت پر بھی زور دیا۔ وہ ہمیشہ قوم کے اندر اس احساس کو جگاتے رہے کہ عربی زبان سے ہمارا تہذیبی اور ثقافتی رشتہ ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ قرآن حکیم اور احادیث نبوی اسی زبان میں ہیں اس لیے ہمارا فریضہ ہے کہ ہم عربی زبان و ادب کو ترقی دینے کے لیے سارے جتن کریں اور اسے دنیا کی زبانوں میں اول درجہ دینے کے لیے ہر ممکن کدوکاوش کریں۔ یہ الہامی زبان ہر حیثیت سے دنیا کی تمام زبانوں سے بہتر اور مال دار ہے۔ علمی اعتبار سے ایک نمایاں مقام حاصل ہے لیکن ہماری تن آسانیوں اور علمی کساد بازاریوں نے آج اس کے وقار کو مجروح کیا ہے۔ الزیات نے یہ بات بھی کہی کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کی مادری زبان عربی ہو۔ الرسالہ میں الزیات نے اس بات پر بھی زور دیا کہ صحافیوں کو زبان کے اصول و قواعد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں عبدالقادر مازنی اور عباس محمود عقاد نے الزیات کے خلاف مضامین لکھے کہ عصری تقاضوں کے پیش نظر زبان میں تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔ الرسالہ میں الزیات نے بہت سی کتب پر تبصرے بھی کیے اور بہت سی شخصیات مثلاً ابن سینا، عبدالعزیز فہمی، قاسم امین، محمد عبدہ، العقاد، مصطفیٰ الرازق، منفلوطی اور مصطفیٰ صادق الرافعی وغیرہ پر مقالات تحریر کیے۔

الرسالہ کی خدمات ناقابل بیان ہیں۔ مقالہ نگاری قصیدہ گوئی، قصہ نویسی مباحثہ، تنقید نگاری اور سیرت نگاری کے ارتقا میں الرسالہ کا اہم رول ہے۔ الزیات نے اس رسالے کے ذریعے ہمیشہ دو ٹوک انداز میں اپنے خیالات کو پیش کیا۔ اس رسالے کا آغاز انھوں نے ایک ایسے وقت میں

اے لوگو!
اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان
سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا
بنایا اور ان دونوں سے بہت سے
مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔

[النساء : ۱]

جب قارئین علمی و ادبی رسالے سے محروم ہو چکے تھے۔ الرسالہ اور الزیات کے علمی دنیا پر بے شمار احسانات ہیں۔ ۱۲ جون ۱۹۶۸ء کو ہمیشہ کے لیے یہ آواز خاموش ہو گئی۔ ۱۳ جون کو قاہرہ میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ نماز جنازہ میں ادبا، شعرا، علما اور رؤسا وغیرہ نے شرکت کی عربی ادب ایک اچھے ناقد، ادیب اور مدیر سے محروم تو ضرور ہو گیا لیکن الرسالہ کے صفحات میں الزیات ہمیشہ زندہ رہیں گے اور تا قیامت شائقین علم و ادب الرسالہ سے فیض یاب ہوتے رہیں گے اور اس کے نتیجے میں الزیات کی زیب اللسانی، مدح سرائی اور قصیدہ خوانی ہوتی رہے گی۔

# نیک بیوی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:
"مومن کے لیے خوفِ خدا کے بعد سب سے زیادہ مفید اور باعث خیر نعمت نیک بیوی ہے کہ جب وہ اس سے کسی کام کو کہے تو وہ خوش دلی سے انجام دے اور جب وہ اس پر نگاہ ڈالے تو وہ اس کو خوش کر دے اور جب وہ اس کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھے تو وہ اس کی قسم پوری کر دے اور جب وہ کہیں چلا جائے تو وہ اس کے پیچھے اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرے اور شوہر کے مال و اسباب کی نگرانی میں شوہر کی خیر خواہ اور وفادار رہے۔"

ابن ماجہ الادب المفرد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۱۱، شمارہ ۳ (مارچ ۹۲ء)

# اطبا اور ان کی مسیحائی — ایک تاثر

ابو سعد ▽

اطباء اور ان کی مسیحائی ایک ایسی تصنیف ہے جو طب و سائنس جیسے خشک موضوع کو بھی دلچسپ بنا کر قاری کے ذوق مطالعہ کو مہمیز کرتی ہے۔ انداز بیان میں سلاستؔ شستگی کے ساتھ ساتھ فنی و معالجاتی سطح پر یہ تصنیف طب کے طالب علم کو جو افادیت بہم پہنچاتی ہے اس سے اس کتاب کی اہمیت میں کافی حد تک اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز ہے جس میں اطبائے قدیم و جدید کے مختصر حالات زندگی کے اندراج کے ساتھ ان کے طریق مطب کا تذکرہ بھی ہے۔ ہر طبیب کے اختصاص کا بطور خاص ذکر ہے اور ان کے مطب میں مستعمل نسخہ جات کی ترتیب سے ہی کتاب کے معالجاتی پہلو کی افادیت طالب علم کا سرمایۂ مطالعہ ہے۔ کتاب ۴۷، ۳ صفحات پر مشتمل ہے اور تقریباً ۵۶ اطبا کے حالات اور ان کی "مسیحائی" کا بڑے دل نشیں انداز میں بیان ہے۔ حکیم بقراط سے لے کر حکیم سعید صاحب تک کے طبی و فنی انکشافات کا یہ تصنیف احاطہ کرتی ہے۔ خود مصنف حکیم مختار احمد صاحب اصلاحی ایک مستند و معتبر طبیب ہیں ان کا شمار موجودہ زمانے میں فن کے شناوروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے دست معجز نما اور اپنی فنی مذاقت کا ذکر بلا خوف ملامت کیا ہے جو بجائے خود اہمیت و افادیت کا حامل ہے۔ اس کتاب میں ایسے اطبا کا بھی ذکر ہے جس سے عموماً تاریخ طب کی کتابیں خالی نظر آتی ہیں۔ مثلاً حکیم نورالدین انصاری، حکیم غلام کبریا خاں، حکیم حافظ عبد العلی، حکیم نورالدین بھیروی، حکیم مولانا برکات احمد ٹونکی، حکیم سید کرم حسین قادری اور حکیم سید فرید احمد عباسی وغیرہ۔

یہ کتاب مصنف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو بمبئی کے مشہور ہفتہ وار اردو بلٹز میں اخبار کے مدیر حسن کمال کے اصرار پر لکھے گئے تھے، ان مضامین کی شان نزول کے بارے میں مصنف رقم طراز ہیں کہ:

> "اگست ۷۳ء سے ہفتہ وار اردو بلٹز بمبئی میں اس کے مدیر شہیر حسن کمال صاحب کی تحریک پر 'اطباء اور ان کی مسیحائی' کے عنوان سے طبی مضامین کا ایک سلسلہ میں نے شروع کیا تھا جو اکتوبر ۷۵ء تک جاری رہا۔ اس طویل سلسلے کا اصل منشا و مقصد یہ تھا کہ موجودہ نسل جو اپنے نامی گرامی اطبا کی گراں قدر خدمات اور ان کے عظیم کارناموں

▽ ایم۔ ڈی اسکالر، اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کو رفتہ رفتہ فراموش کرتی جا رہی ہے، ان
مضامین کو پڑھ کر ان سے واقف ہو سکے
اور طب کے طلبا جو بدلے ہوئے حالات اور
موجودہ آلات کی چمک دمک سے مرعوب
اور احساس کمتری میں مبتلا ہیں ان میں
خود اعتمادی اور وسعت نظر پیدا ہو۔"
کتاب کے معالجاتی حصے اور کسی طبیب کے کارناموں
[illegible]یک قصہ و واقعہ کی شکل میں ترتیب دینے میں مصنف
[illegible]بڑی جاں فشانی سے کام لیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ
ہے کہ قاری ایک تو مطالعے سے اکتاتا نہیں ہے،
[illegible]سرے نسخہ بھی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ یہ نسخے قرابادینوں
[illegible]جس نام سے درج ہیں اس کا تذکرہ بھی کر دیا گیا
[illegible]۔ مزید برآں بعد کے ادوار میں اگر کسی مفرد دوا کی
[illegible]بی یا عدم شناخت کی وجہ سے کوئی تبدیلی کر دی گئی ہے
[illegible]س کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے۔ مثلاً "بقراط اور
[illegible]س کے طبی کارنامے" کے عنوان سے بقراط کے حالاتِ
[illegible]رگی اور اس کے کارنامہ ذکر کرتے ہوئے مصنف
[illegible]طراز ہے:

"یونان سے ملی ہوئی ریاست مقدونیہ
کا بادشاہ جب ضعف معدہ و گردہ میں
مبتلا ہو کر بہت سخت بیمار ہوا اور ہر طرح کے
علاج کے باوجود اچھا نہ ہو سکا تو بقراط نے
بعد معائنہ اس کے لیے حسب ذیل نسخہ
تجویز کیا اور اسی سے اس نے صحت
پائی۔

نسخہ

[illegible] [illegible] قرنفل (کالی مرچ)
[illegible] [illegible] ہر ایک ماشہ
[illegible] [illegible] [illegible] ہر ایک

حب الغار ہر ایک تین ماشہ، وج ترکی
زعفران۔ ہر ایک ایک تولہ کوٹ چھان
کر سپید شہد کے قوام میں تیار کریں۔
خوراک تین ماشہ سے ۶ ماشہ تک۔"
قرابادینوں میں یہ نسخہ امروسیا کے نام سے
مشہور ہے۔ دو قو دستیاب نہیں ہے اس کی جگہ
پر تخم گندر مستعمل ہے۔ اسی طرح جوارش جالینوس
کی شانِ نزول بھی ایک واقعہ کے ضمن میں بیان ہوئی ہے
کہ شاہِ وقت "مارکس آریلیس" کے ہضم کی اصلاح
کے لیے جالینوس نے ایک نسخہ ترتیب دیا تھا جو بعد
میں "جوارش جالینوس" کے نام سے موسوم ہوا۔ اس
دوا کی افادیت کا تذکرہ مصنف نے بڑے افتخار کے
ساتھ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:
"سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ
اس جوارش کو اٹھارہ سو برسوں سے
بھی زیادہ ہو گئے، لاکھوں نہیں کروڑوں
بلکہ اربوں انسانوں نے اس کو استعمال
کیا اور فائدہ اٹھایا اور اب بھی اٹھا رہے ہیں
اور انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی اٹھاتے رہیں
گے، لیکن آج تک یہ کوئی نہ کہہ سکا کہ اس
دوا کا کبھی کوئی خطرناک رد عمل ظاہر ہوا
ہے۔"
اس کے بعد مصنف نے انگریزی دواؤں کی خبر لی ہے جو
کسی بھی طبیب و حکیم کی تحریر و تقریر کا طرۂ امتیاز ہے
اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی دواؤں کا رد عمل
شدید اور کبھی کبھی جان لیوا بھی ہوتا ہے مگر کیا کیا جائے
کہ ان کی فوری اثر افادیت ہی انسانوں کو ان کے استعمال
پر مجبور کرتی ہے۔ انسان فطرتاً عجلت پسند واقع ہوا ہے
آخر فوری افاقہ کی چاہت سے پہلے کیا تدبیر [illegible] یہ سوال [illegible]

[illegible] ہے، مشہور حکیم زکریا رازی نے "کتاب الساعۃ" میں تعدد اثر دواؤں کو جمع ضرور کر دیا ہے [illegible] گزر جانے کے بعد نہ تو اس پر مزید کچھ کام ہوا اور نہ یہ کتاب عموماً دستیاب ہے۔

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ نہ صرف اس میں مصنف نے اطبا کی سوانح عمری بیان کی ہے بلکہ اطبا کی تصانیف کا بڑے ناقدانہ و منصفانہ انداز سے تعارف بھی کرایا ہے اور طب کے میدان میں اطبا کرام کی تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کو سراہا ہے۔ جس حکیم کا جو کارنامہ مصنف کے نزدیک زیادہ اہمیت کا حامل ہے وہ اسی کارنامے کے اعتبار سے عنوان کی ذیلی سرخیوں کو سجاتے ہیں۔ مثلاً حکیم دمقراط۔ ایٹمی نظریات کا بانی اور نئے علاج کا بانی یا حکیم علی بن ربن طبری عربی کی پہلی طبی انسائیکلو پیڈیا کا مصنف وغیرہ۔ حکیم ابوالقاسم زہراوی۔ علم الجراحت کا موجد اور پہلا باکمال سرجن وغیرہ۔ میں نے ابھی عرض کیا کہ اطبا کی تصانیف کا تعارف مصنف بڑے مختصر مگر جامع انداز میں کراتے ہیں۔ تاکہ طب کے طالب علم کو اس کے مطالعے کی رغبت دلائیں۔ دراصل یہ مصنف کا فن اور کمال ہے۔ انھوں نے اطبا کا تعارف جس انداز سے اس کتاب میں کرایا ہے۔ ان سے پہلے کی تصانیف میں یہ دلچسپی مفقود نظر آتی ہے۔ حکیم علی بن ربن الطبری کی کتاب "فردوس الحکمۃ" کے بارے میں لکھتے ہیں:

" علی بن ربن طبری نے درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ اس نے مامون رشید، معتصم، واثق اور متوکل سب کا عہد خلافت دیکھا۔ معتصم کے دور میں کچھ دنوں بغداد میں میر منشی کی حیثیت سے سرکاری ملازم بھی رہا۔ متوکل کے زمانے میں اس نے اسلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور بخوشی اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح وہ نامور مسلم حکما کی صف میں شامل ہو گیا۔ اسی زمانے میں اس نے اپنی شاہکار تصنیف "فردوس الحکمۃ" جو عربی کی پہلی طبی انسائیکلو پیڈیا ہے مکمل کیا۔ اس نے تقریباً پندرہ سال اس کام میں صرف کیے۔ کچھ اور کتابیں بھی لکھیں جن میں صرف دو کتابیں "دین و دولت" اور "حفظ صحت" محفوظ ہیں۔ فردوس الحکمۃ اس نے عربی زبان میں لکھی اور ساتھ ساتھ اس کا سریانی زبان میں بھی ترجمہ کرتا گیا۔ دنیا بھر میں اس کتاب کے صرف پانچ قلمی نسخے تھے لیکن خدا بھلا کرے ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کا جنھوں نے ان تمام قلمی نسخوں کا موازنہ کر کے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا اور ابتدا میں کتاب و مصنف کے متعلق اہم معلومات بھی اکٹھا کیں۔ مشہور مستشرق مسٹر براؤن کی مساعی جمیلہ سے انگلستان کے ایک تحقیقی ادارے نے اس کی طباعت کے اخراجات برداشت کیے اور جرمنی کے مطبع کاویانی نے ساڑھے پانچ سو صفحات کی اس ضخیم کتاب کو بڑے سائز پر زیور طبع سے آراستہ کیا۔

علی بن ربن طبری نے فردوس الحکمۃ کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا حصہ: کلیات طب سے متعلق ہے۔

دوسرا حصہ: جسم کے مختلف [illegible] کا بیان

[illegible] ہے

تیسرا حصہ :- غذا کی تفصیلات پر مبنی ہے
چوتھا حصہ : علم الامراض اور اصول علاج کے ساتھ سر سے پاؤں تک کے تمام امراض کے بیان پر مشتمل ہے۔ یہ تمام بیماریاں گیارہ مقالے کے تحت جمع کر دی گئی ہیں۔ بارہویں مقالے میں فصد اور قارورے وغیرہ کا تفصیلی بیان ہے۔ یہ چوتھا حصہ سب سے اہم بھی ہے اور تقریباً نصف کتاب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔
پانچواں حصہ :- ذائقہ، بو اور رنگ کے بارے میں ہے۔
چھٹا حصہ : دواؤں کے تفصیلی بیان پر ہے جس میں زہروں کا تذکرہ بھی شامل ہے۔
ساتواں حصہ : متفرق موضوعات پر ہے۔ مثلاً آب و ہوا، موسمیات حیوانیات، علم تولید، نفسیات اور فلکیات وغیرہ۔
اسی حصے میں ہندی طب یعنی آیورویدک پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مصنف نے فردوس الحکمۃ کا تاریخی جائزہ کس انداز سے پیش کر کے اس کا ایک جامع تعارف طلبہ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

اس کتاب کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف نے جابجا کسی حکیم کی حذاقت و مہارت کو اجاگر کرنے کے لیے ایسے واقعہ کو ڈھونڈھ نکالا ہے جس میں پڑھنے کی حد تک دلچسپی بھی ہے اور بلحاظ کے معمولات مطب میں ان واقعات کی عملی افادیت بھی ہے۔ اس لیے کہ یہ واقعات ذہن کو غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں۔ البتہ کچھ واقعات محض دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی حیثیت اصلاحی افسانوی [illegible] سے زیادہ کی نہیں ہے۔ مثلاً [illegible] ڈاکٹر کی فنی حذاقت کے ضمن میں کسی شخص کے حلق نکل کر آ جانے کا واقعہ اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔

اخبار میں شائع شدہ مضامین کو مجموعہ یا کتاب کی شکل دیتے وقت یقیناً از سر نو ترتیب و تزئین کی گئی ہے۔ جابجا حکیمانہ اقوال سے صفحات کو مزین کیا گیا ہے۔ حکیم اور حکمت سے متعلق آغاز کتاب میں ہی مشہور مفسر قرآن اور حکمت قرآنی کے شناور مولانا حمید الدین فراہیؒ کا اقتباس بھی کتاب کی زینت ہے۔ علمی اعتبار سے ندرت و اہمیت کے پیش نظر اس اقتباس کو یہاں نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا :

"اہل عرب "حکمت" کا لفظ اس قوت اور صلاحیت کے لیے بھی جو رائے کی پختگی جس سے انسان معاملات کا فیصلہ حق کے مطابق کرتا ہے اور اس قوت و صلاحیت کے لیے بھی جو رائے کی پختگی اور شرافت اخلاق کی جامع ہوتی ہے، اسی لیے صادق عقل مند اور مہذب آدمی کو "حکیم" کہا جاتا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ حکمت کے لفظ کے معنی و مفہوم کا تعین قرآن مجید کے تناظر میں کیا گیا ہے لیکن غالباً پیشے کے تقدس اور اس لفظ کی معنویت کی بنا پر ہی طبیب کو بھی حکیم کہا جانے لگا اور اس معنی میں کسی طب کی کتاب میں یہ اقتباس بڑا اہم اور لائق تحسین ہے

مصنف موصوف نے غالباً ۱۹۵۷ء میں طب سے متعلق "مسیحا" نامی ایک رسالہ جاری کیا تھا جو ۱۹۶۰ء تک طب کی خدمت انجام دیتا رہا۔ مسیحا کے زمانۂ ادارت میں مدیر موصوف مختار احمد اصلاحی صاحب کو جتنے بھی توصیفی و تعریفی خطوط موصول ہوئے ہیں، سب اس کتاب کے آخر میں شامل ہیں جس سے ایک طبیب کے لیے طبیعت پر گراں باری اور اکتاہٹ [illegible]

احساس ہوتا ہے۔ جہاں تک شہرت کی خواہش کا تعلق ہے موصوف اپنی فنی حذاقت کی بنا پر کم شہرت کے مالک نہیں ہیں اس لیے "مصنف طبی خدمات کے آئینے میں" والا حصہ شامل کتاب نہ ہوتا تو غالباً بہتر ہوتا۔

کتابت و طباعت کے لحاظ سے کتاب انتہائی معیاری ہے اور فن پر مضبوط گرفت کی بنا پر مصنف نے اسے جس طرح تحریر کیا ہے قاری کے لیے بے حد مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

ایک دن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع، میں شمع توحید کے چند پروانوں کے ساتھ رونق افروز تھے اور یوم حشر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اثنائے گفتگو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قیامت کے دن اس قبرستان کے ستر ہزار آدمی کسی حساب کتاب کے بغیر بخش دیے جائیں گے۔"

حضورؐ کا ارشاد سن کر حاضرین میں سے ایک صاحب نے بڑے اشتیاق اور معصومانہ سادگی کے ساتھ کہا:

"اے اللہ کے رسول! آپؐ میرے لیے دعا کیجیے کہ اللہ مجھے ان میں سے کر دے۔"

حضورؐ نے فرمایا:

"تم بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے۔"

یہ سن کر وہ صاحب فرطِ مسرت سے بے خود ہو گئے اور بے اختیار ان کی زبان پر تحمید و تہلیل جاری ہو گئی۔

# سر سید کا تعلیمی و قومی نظریہ

سید مشرف علی ▽

سر سید احمد خاں مختلف اوصاف کے حامل تھے
ہ ایک مصنف، نثر نگار، نقاد کے علاوہ مفکر اور جدید
لیم کے مبلغ تھے۔ ان کو دینی علوم پر بھی دسترس حاصل
ی۔ یہ اوصاف ان کی زندگی کے مختلف شعبوں اور
ری کاوشوں میں اپنے موقع و محل کے اعتبار سے عیاں
تے رہے ہیں جس کا فیض ان کی حیات اور ان کے
عد اب تک جاری اور قائم ہے۔

سر سید کا تعلیمی اور قومی نظریہ انتہائی اہم ہے
گرچہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر اس
کے باوجود اس پر لکھا جانا اور اس کی وضاحت کرتے رہنا
ہر دور کا تقاضہ ہے اور تشریح کا طالب ہے۔

سر سید کا ایک مفکر کی حیثیت سے زمانہ غدر
۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ہندوستان
کی تاریخ کا ایسا موڑ تھا جب معاشی، تہذیبی، سیاسی،
ثقافتی دھارے نئے رخ اختیار کر رہے تھے اور نئی
قدروں اور حالات کے قائم کرنے کے فکری دور کا آغاز
تھا۔ غدر اور ابھرتی ہوئی انگریز سامراجیت کے خلاف
مختلف مذہبی طبقوں کے مفکرین اصلاح و استحکام کی
حالات پیدا کرنے کے لیے آمادہ تھا جس میں سر سید
کے علاوہ مولانا قاسم نانوتوی اور پنڈت مدن موہن
مالویہ اس صدی کی درخشاں شخصیات میں سے ہیں۔

سر سید کا انگریزوں سے تعلق بحیثیت ملازم
رہا۔ ان کی وابستگی ایسٹ انڈیا کمپنی سے بطور ملازم
رہی۔ سر سید نے اس تعلق سے انگریزوں اور ان
کے معاشرے کو قریب سے دیکھا اور اس کے اثرات
اور نقصان کا انتہائی گہرائی سے جائزہ لیا۔ انگریزی معاشرہ
اور تعلیم کا سب سے پہلے فائدہ بنگال کے تعلیمی و قومی
مفکروں نے اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ لہذا بنگال کے
لیڈروں میں کیشب چندر سین اور دیویندر ٹھاکر کی
کوششوں سے ۱۸۱۷ء میں کلکتہ میں ہندو کالج قائم
ہوا۔ یہ سال سر سید کی پیدائش کا سال ہے مگر سر سید
نے اپنی قومی و تعلیمی شعور کے زمانے میں بنگال میں انگریزی
تعلیم و تربیت کے اثرات سے بدلتے ہوئے مفید اور
جامع حالات کا بخوبی جائزہ لیا۔ دوسری طرف اپنی
ملازمت کے دور میں ان کو عام ہندوستانیوں کی
انگریزی تعلیم سے نااہلی اور ملازمت میں ان کی
انتہائی قلیل تعداد کا گہرا تاثر تھا۔ اس اعتبار سے
ان کا فکر قومی سطح پر ہندو اور مسلمان دونوں پر تھا۔

▽ شعبۂ قانون، اے ایم یو، علی گڑھ

سرسید کے جائزے کے مطابق یہ دونوں قومیں انگریز سامراجیت اور اس کی پالیسیوں کی گرفت میں تھیں مگر مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو قوم زیادہ بیدار تھی اور تہذیبی، تعلیمی اور ثقافتی اعتبار سے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ مستحکم ہو رہی تھی۔ اس کی خاص وجہ یہ رہی کہ ہندو قوم نے انگریزی تعلیم کی افادیت کو پہلے محسوس کیا اور اس کے معاشرے سے وابستگی کے مفید اثرات کو جلد قبول کیا۔ مسلمانوں کی حالت مختلف تھی اور وہ اپنی فرسودہ خیالی، مذہبی تشدد اور انگریزی تعلیم سے متعصبانہ خیالات میں مقید تھے اور ان کو مذہبی حصاروں سے نکل کر معاشرے کے مفید اثرات یا نئی تہذیب گوارہ نہ تھی۔ سرسید کا یقین تھا اور حالات بھی ایسے ترتیب پا رہے تھے کہ بیسویں صدی کے ہندوستان کے معاشرے کی قدریں انگریزوں کے معاشرے اور تہذیب پر قائم ہونا لازمی تھیں۔ سرسید کو ان حالات نے متوجہ کیا اور ان کی نظر پورے ہندوستان کی قوموں کے ساتھ بالخصوص مسلمان قوم پر زیادہ گہرائی اور وسعت کے ساتھ تھی۔ مسلمانوں کی اس وقت کی حالت کے اعتبار سے دو پہلو انتہائی اہمیت سے سامنے تھے۔ ایک تو یہ کہ مسلمان قوم کو اس کی فرسودہ خیالی سے آزاد کرا کر جدید تعلیم اور معاشرے کے لیے آمادہ کرانا تھا۔ دوسرے ان میں سیاسی شعور لانا ضروری تھا۔ سرسید کا یہ تجزیہ سخت حالات کے اعتبار سے انتہائی برمحل ہی نہیں تھا بلکہ تعلیمی بیداری اور معاشرے سے وابستگی کے ساتھ قومی یک جہتی اور سیکولرزم کی بنیاد تھا۔ سرسید کی ہندو مسلمان قوموں کے باہمی تعلقات، ہندو مسلم دوستی اور ہم خیالی کی کوشش اتنی نمایاں رہی جس کی مثال اس عصر کے کسی اور مفکر کے یہاں نہیں ملتی۔ اُن کا اپنی تقریروں میں بار بار یہ کہنا کہ ہندو اور مسلمان ہندوستان جو ایک خوب صورت دلہن کی مانند ہے، اس کی یہ دو آنکھیں ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی مجروح ہو گئی تو دلہن کی خوب صورتی پامال ہو جائے گی اور اس طرح ہندوستان میں رہ کر ہندو مسلمان قوموں میں خوشگوار تعلقات کا رہنا ممکن نہیں۔ یہ تقریر اور خیالات اس وقت کے لحاظ سے انگریزوں کے خلاف اور دونوں قوموں کو متحد رکھنے کے اعتبار سے انتہائی پُراثر تھی مگر آج بھی اس کا اثر اور افادیت میں ذرا بھی کمی نہیں بلکہ ہمارے سماج اور قومی یک جہتی national integration کے تصور کو مضبوط کرنے کے لیے انتہائی ضروری اور مفید ہے۔

سرسید نے اپنی قومی خدمات میں دو محاذ پر خصوصی توجہ کی۔ پہلا قومی محاذ اور دوسرا تعلیمی۔ ان دونوں محاذوں پر مسلمان قوم کو لانا اور تیار کرنا آسان کام نہ تھا۔ ایک ایسی قوم جو کہ مذہبی جذبات کی شدت میں مبتلا ہو اور اپنے معاشرے کے علاوہ سارے دیگر معاشروں سے گریزاں رہتی ہو، اس کو ان حصاروں سے نکال کر نئے ماحول، تعلیم و تہذیب سے روشناس کرا کر آگے بڑھانا سرسید کا آہنی عزم تھا۔ مولوی عبدالحق نے سرسید کے اسی عزم کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "سرسید مسلمان قوم کے عقیدوں، جذبات اور فرسودہ خیالی سے اس طرح مقابلہ کر رہے تھے جیسے سمندر کے طوفان میں ایک جہاز طوفانی لہروں کو چیرتا چلا جا رہا ہو" یہ بیان مسلمانوں کی اصل صورت کی عکاسی کرتا ہے۔ کیونکہ پوری قوم اپنی فرسودہ خیالی اور ثقافتی پامالی کے باعث دوسری قوموں سے زیادہ پستی میں جا چکی تھی۔ تعلیمی، سیاسی ذہن کا فقدان

تھا نہ اس کی فکر تھی اور نہ جدید تعلیم حاصل کرنے کی جدوجہد۔ بس جو قدم اٹھتا تھا وہ پستی کی طرف مائل تھا پوری قوم فرسودہ اور کسی حد تک مذہبی کوتاہ نظری کے ساتھ سانس لے رہی تھی۔ مسلمان قوم کے لیے تاریخ کا یہ وہ انتہائی مقام تھا جہاں اگر قومیں سنبھل کر متحرک ہو گئیں تو زندہ رہ گئیں ورنہ اپنے خیالات اور حالات کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئیں۔ قومیں وہی زندہ اور متحرک رہتی ہیں جن میں فکر و حوصلہ ایثار قربانی اور دوسری قوموں کے شانہ بشانہ رہنے کی آمادگی پوری اجتماعی قوت کے ساتھ اس طرح ہو جیسے دریا کی لہریں ہمہ وقت موجزن رہتی ہیں۔ سرسید نے مسلمانوں کے مرض کی تشخیص کر لی تھی اور ان کا ہاتھ قوم کی نبض پر تھا۔ اس کا واحد علاج انھوں نے اس کو تعلیمی شعور کو بیدار کرانا تھا اپنا نصب العین مقرر کر کے جدوجہد شروع کی۔ اس کے ساتھ سرسید کا غالب خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بہتر اور خوشگوار تعلقات کا قائم رہنا دونوں کی سیاسی آزادی، تعلیمی ترقی اور ثقافتی مضبوطی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ یہی خیال اور یقین سرسید کی کاوشوں اور جدوجہد کا محور رہا۔

سرسید کی فکر و توجہ ہندوستان کی خوشحالی قومی اتحاد کے ساتھ مسلمانوں کے مستقبل کی تشکیل پر مرکوز تھی۔ ان کی کوشش اور خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کی فرسودہ خیالی کا رنگ بھی اتر سکتا ہے جب ان کی تعلیم انگریزوں کی تربیت میں ہو جس کی مثال بنگال کے ہندو سماج کے قیام اور انگریزوں کے ساتھ تعلیم و تربیت جیسے چلنے کی موجود تھی۔ اس طرح مسلمان نہ صرف جدید تعلیم سے آراستہ ہوں گے بلکہ آنے والے معاشرے میں اپنا اعلیٰ مقام پیدا کر سکیں گے

جدید تعلیم کا دوسرا مفید پہلو یہ بھی تھا کہ ذہنی اعتبار سے فرسودہ خیالی کی تہیں جو پوری قوم پر تیزی سے چڑھتی جا رہی تھیں ان کی رفتار کمزور ہو کر کشادہ خیالی پیدا ہو گی سرسید نے مسلمانوں کو سائنس اور جدید علوم سے آراستہ ہونے کے لیے علی گڑھ میں محمڈن اورینٹل کالج کی بنیاد ڈالی جو بعد میں مسلم یونیورسٹی کے نام سے معروف ہوئی۔

قومی محاذ پر سرسید نے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کیا اور آسانیاں فراہم کیں مگر اس کے ساتھ ساتھ سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے نظریات کو زائل کرنے کے لیے پہلے تعلیم پر قائم رہنا ضروری ہے تاکہ اپنی صلاحیت اور اعلیٰ تعلیم سے استعمال۔ اور انگریزوں کی گہری پالیسیوں کو سمجھ کر ان کا حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اس خیال سے سرسید نے مسلمانوں کو تعلیم پر قائم رہنے پر زیادہ زور دیا تعلیم کے فقدان یا کم تعلیم سے سیاسی شعور نہ ممکن ہے اور نہ اس کا حل تلاش کرنے میں کامیابی ہو سکتی ہے مگر سرسید کی کوشش اس بات کی مظہر ہے کہ انھوں نے تعلیم پر زور دینے کے ساتھ ساتھ جذبۂ قومیت کو مسلمانوں کے تعلیمی جذبے اور کاوشوں کے ساتھ جوڑے رکھا۔ یہ کہنا کہ سرسید سیکولر نہیں تھے یا ان کی فکر و کوشش میں جانب دارانہ تخیلات تھے یا قومی جذبات کی کمی تھی یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔

سرسید نے سیاست میں صرف تعلیم یافتہ باشعور اور اقتصادی اعتبار سے مضبوط و مستحکم لوگوں کا دخل مناسب سمجھا۔ اس اعتبار سے مسلمان جو اقتصادی اعتبار سے کمزور، تعلیمی اعتبار سے پرانے

اور فکری اعتبار سے بہت تھا اس کا سیاست میں پوری طرح شامل ہونا مع اقتصادات کے اعتبار سے ہر عمل نہ سمجھا۔ ہندوستانیت شعور اور تعلیم اقتصادی اعتبار سے مضبوطی کسی سیاسی تحریک میں شامل ہونے کے لیے ضروری اجزا ہیں۔ ان کے امتزاج سے کسی تحریک کا کامیاب ہونا لازمی نتیجہ ہوگا اور ان کی عدم موجودگی تحریک کو کمزور ہی نہیں بلکہ بالکل ختم بھی کر سکتی ہے اگرچہ بیسویں صدی کے شروع ہی سے مسلمانوں کا ہندوستان کی سیاست اور آزادی کی جنگ میں شریک ہونا اور کارہائے نمایاں انجام دینے کا سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ ان مسلمانوں میں نامور شخصیات مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی اور مولانا محمد علی جوہر زیادہ نمایاں ہیں۔

سرسید کا تعلیمی نظریہ قومی نظریے میں سمویا ہوا تھا۔ تعلیم، قومی جذبات اور اتحاد کو مضبوط کرنے اور قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ تعلیم کی کمی سے کوئی نظریہ چاہے وہ قومی ہو، سیاسی ہو، اقتصادی ہو پُر اثر نہیں ہو سکتا۔ جذبات کا اظہار نظریات سے اور نظریات تعلیم کے محتاج ہوتے ہیں۔ لہٰذا سرسید نے انتہائی احتیاط اور یقین کے ساتھ تعلیم اور قومی نظریات کو بیدار کیا اور اسی کا شعور زندگی کی کامیابی کا لازمی جزو قرار دیا۔ تعلیم اور قومی شعور اور اتحاد کے نتیجے میں انگریزی سامراجیت کی جڑیں کمزور ہونا شروع ہو کر پامال ہوئیں۔

سرسید کا تعلیمی اور قومی نظریہ ہندوستان کی ساری قوموں میں تعلیمی رجحان کے ساتھ قومی جذبات کو مضبوط اور مستحکم کرنا تھا —— اس اعتبار سے سرسید انیسویں صدی اور پوری بیسویں صدی کے مسلمانوں میں واحد شخصیت ہیں جن کی فکر و دور بینی موجودہ ہندوستان کی تشکیل و تعمیر میں معاون ہوئی

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔"

شیخ الہند مولانا محمود الحسن

کتاب نما۔ ۱۹۷۰ء

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱ شمارہ ۳ (مارچ ۱۹۹۲ء)

# مسلم بچے تیزی سے پیچھے گئے

احمد رشید شروانی ○

پچھلی رپورٹ میں ہم نے ضلع بدایوں کے پانچ مسلم جونیر ہائی اسکولوں کے نتائج کے ساتھ یہ تجزیہ پیش کیا تھا کہ گزشتہ ایک سال میں آٹھویں کلاس کے بورڈ امتحان کی سطح پر مسلم لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کو کتنا فروغ حاصل ہوا - آیئے اب بدایوں سے چلتے ہیں شاہ جہاں پور، جہاں کے دو مسلم جونیر ہائی اسکولوں کے ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۱ء کے نتائج چارٹ میں پیش ہیں - ملاحظہ فرمایئے۔

ان دو اسکولوں سے ملا کر بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے مسلم بچوں (یعنی لڑکے اور لڑکیوں) کی تعداد اناسی سے گھٹ کر تریسٹھ رہ گئی - سو لہ عدد کی یہ کمی قریب بیس فی صد ہے - یعنی اس اعتبار سے ان دو اسکولوں میں اس سطح پر مسلم بچے ایک سال میں مزید بیس فی صد پیچھے چلے گئے - جیسا کہ سب جانتے ہیں پہلے ہی مسلمان اغیار سے قریب پانچ گنا پیچھے تھے اور شاہ جہاں پور شریف میں تو کوئی تعجب نہیں کہ مسلمان اغیار سے اور بھی زیادہ پیچھے رہے ہوں - تا ممکن نہیں کہ دس گنا پیچھے رہے ہوں - بہر حال جتنے بھی پیچھے تھے اس سے) بیس فی صد اور زیادہ پیچھے ہو گئے - یعنی اگر پہلے پانچ گنا پیچھے تھے تو اب چھ گنا پیچھے ہو گئے اور اگر پہلے دس گنا پیچھے تھے تو اب بارہ گنا پیچھے ہو گئے کیوں؟ ایسا کیوں ہوا؟ ظاہر ہے اس سوال کا جواب شاہ جہاں پور کے کوئی دانش ورِ ملت ہی دے سکتے ہیں اور خصوصاً اور سب سے پہلے اس سوال پر ان دو اسکولوں کے عہدے داران گرامی کو غور فرمانا چاہیے اور انہی کو جواب دینا چاہیے۔

## ابھی پاس تو دیکھیے

امتحان میں پاس ہونے والے مسلم بچوں کی تعداد اٹھہتر سے گھٹ کر ساٹھ رہ گئی - اٹھارہ عدد کا یہ فرق تو قریب تیئس فی صد ہے - ہم یہ بھی مدِ نظر رکھیں کہ ماشاء اللہ مسلمانوں کی آبادی بھی ہر سال قریب تین فی صد بڑھ جاتی ہے - چنانچہ اگر امتحان پاس کرنے والے مسلم بچوں کی تعداد اٹھہتر سے بڑھ کر قریب اکیاسی ہو جاتی تب ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ مسلمان نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے بلکہ پچھلے سال جہاں تھے وہیں کے وہیں ہیں - اور اگر تعداد اٹھہتر کی اٹھہتر ہی رہ جاتی

# جونیئر ہائی اسکول بورڈ امتحان

| ۱۹۹۰ء شریک امتحان | پاس تعداد | پاس فی صد | فرسٹ ڈویژن تعداد | فرسٹ ڈویژن فی صد | جونیئر ہائی اسکول کا نام | ۱۹۹۱ء شریک امتحان | پاس تعداد | پاس فی صد | فرسٹ ڈویژن تعداد | فرسٹ ڈویژن فی صد |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| | | | | | **مسلم لڑکے** | | | | | |
| ۴۱ | ۴۱ | سو | ۱۵ | سینتیس | احمد اللہ شاہ | ۳۷ | ۳۴ | بانوے | ۳ | آٹھ |
| ۳۳ | ۳۲ | ستانوے | ۱ | تین | مسلم رحمانیہ | ۲۶ | ۲۶ | سو | - | صفر |
| ۷۴ | ۷۳ | ننانوے | ۱۶ | بائیس | دو میں مسلم لڑکے | ۶۳ | ۶۰ | پچانوے | ۳ | پانچ |
| | | | | | **مسلم لڑکیاں** | | | | | |
| ۵ | ۵ | سو | - | صفر | مسلم رحمانیہ | - | - | - | - | - |
| ۷۹ | ۷۸ | ننانوے | - | صفر | مسلم لڑکے اور لڑکیاں | ۶۳ | ۶۰ | پچانوے | ۳ | پانچ |

تب ہم کہہ سکتے تھے کہ مسلمان تین فیصد پیچھے چلے گئے، اور تعداد گھٹ کر صرف ساٹھ رہ جانے کے معنیٰ ہیں کہ مسلمان کم از کم چھبیس فیصد پیچھے چلے گئے ہیں۔ یعنی اگر پچھلے سال اغیار سے پانچ گنا پیچھے تھے تو اب کم از کم سوا چھ گنا پیچھے ہو گئے ہیں۔ اور اگر پچھلے سال ہی دس گنا پیچھے تھے تو اب قریب ساڑھے بارہ گنا پیچھے ہو گئے ہیں۔

## اور فرسٹ ڈویژن

مسلم فرسٹ ڈویژنرز کی تعداد سولہ سے گھٹ کر صرف تین رہ گئی یعنی ایک بٹا پانچ سے بھی کم۔ ضلع بدایوں کے ہمارے پانچ جونیئر ہائی اسکولوں میں ۱۹۹۱ء میں تیون فی صد مسلم بچے فرسٹ ڈویژن لائے۔ تقریباً شاہجہانپور کے ان دو اسکولوں میں اسی سال یعنی ۱۹۹۱ء میں اسی بورڈ امتحان میں صرف چار فی صد مسلم بچے فرسٹ ڈویژن لائے۔ کیا ضلع بدایوں اور شاہجہانپور کے مسلم بچوں کی فطری ذہانت میں اتنا فرق ہے؟ اگر نہیں تو پھر اور کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب بھی شاہجہانپور کے ہمارے اسکولوں کے ذمہ داران ہی دے سکتے ہیں۔

اِن دو کے علاوہ شاہجہاں پور میں ایک این. این گرلز جونیئر ہائی اسکول بھی ہے۔ پچھلے سال تینوں مسلم اسکولوں میں اسی کا رزلٹ سب سے اچھا تھا۔ نہ جانے کیوں اس سال ابھی تک اس گرلز اسکول کا نتیجہ نہیں آیا ہے — ہم منتظر ہیں۔

یوپی کے مسلم جونیئر ہائی اسکولوں کے جن ہیڈ صاحبان یا صاحباؤں نے ابھی تک ۱۹۹۱ء کا رزلٹ نہیں بھیجا ہے وہ اب فوراً بھیج دیں اور اگست کے آخر تک ہم کو مل جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جونیئر ہائی اسکولوں میں انعامات کی تقسیم جلد مکمل کر دیں کیونکہ اب ہائی اسکول و انٹر بورڈ امتحانات پر انعامات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

---

BUILDING DEPARTMENT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH

Dated : 4-2-1992

# Tender Notice

Sealed tenders on item rates basis are invited to be received on 5-3-1992 upto 1.00 p.m The tender will be opened on the same date at 3.30 p. m Tender documents can be obtained from the office of the University Engineer on any working day during office hours.

Sale of tender forms will be stopped 2 days before the date for receiving the tenders

| S No. | Name of work | Amount put to tender | Earnest Money | Cost of tender | Time of Completion |
|---|---|---|---|---|---|
| | Construction of balance work of 'C' type quarters 16 Nos. at Medical College Colony under P. F. Housing Schemes. | | | | |
| i ) | Civil work | 14,46,490.00 | | | |
| ii) | Int. W. S. & Sanitary Inst. Ext. W. S. & Sewerage | 2,22,514.00 | | | |
| | | 16,72,010.00 | 20,000.00 | 150.00 | 14 months |

Note : Tenderers are required to submit Income Tax Clearence certificate, details of work executed with proof and details of establishment alongwith their tenders. Contractors registered as class-I in Building Department, C.P.W D, P.W.D., M.E.S. Railways or other Government Departments as well as other reputed firms and organizations who have carried out equivalent works are eligible *for issue of tender forms.*

*(Lt. Col. Hasan Muzaffar)*
University Engineer

). PA/282/1801/PRO

جلد ۱۱

شمارہ ۴

# THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

# تہذیب الاخلاق

اپریل ۱۹۹۲ء

سرپرست

## پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

## کبیر احمد جائسی

نائب مدیر

شباب الدین

انچارج کمپوزنگ

شفیق احمد

تزئین

سرفراز

ناشر، طابع [illegible] کا پتہ:
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارہ تہذیب الاخلاق
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ، انڈیا
([illegible])

زر سالانہ: انڈیا Rs.45.00
* بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک
* عام ڈاک US $ [illegible]

PHONE 24827

ترسیل زر کا پتہ:
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق [illegible]
[illegible] مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

EDITOR,
TAHZIBUL AKHLAQ
[illegible]
ALIGARH MUSLIM
UNIVERSITY, ALIGARH.

# مندرجات




[ تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہر حال ان سے متفق

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ - پرنٹر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ

تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت اے ایم یو علی گڑھ - پریس: اے ایم یو پریس علی گڑھ

# اداریہ

اب تو اکثر ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ ہم ایک "جنونی" کی سی زندگی بسر کرنے لگے ہیں۔ جس طرف نظر اٹھا کر دیکھیے کسی نہ کسی جنون کا عالم طاری ہے۔ ایک جنون پیسہ کمانے کا ہے۔ اس جنون نے ایسے ایسے شکنجوں کو جنم دیا ہے جن میں بیشتر خود ہماری ہی گردن پھنستی رہتی ہے مگر ہم اپنے جنون میں اس قدر مدہوش ہیں کہ ہم کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا، اِسی جنون کے ہاتھوں ہر چیز میں ملاوٹ ہو رہی ہے۔ انسانی زندگی بچانے والی ادویات تک ہمارے اس جنون سے محفوظ نہیں ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیشتر نقلی ادویات بنانے والوں کے افرادِ خانہ بھی اس جنون کا شکار ہو کر زندگی سے ہاتھ دھوتے رہتے ہیں مگر پیسہ کمانے کا جنون ہم کو اس زیاں کا احساس تک نہیں ہونے دیتا اور ہم پیسہ کمانے کی دھن میں خود اپنے ہاتھوں سے موت کو گلے لگاتے رہتے ہیں۔

ایک جنون مکانات بنوانے کا ہے۔ یہ مکانات نہ تو سر چھپانے کے لیے بنائے جا رہے ہیں اور نہ ہی اپنے آرام و آسائش کے لیے۔ بلکہ اِن کی تعمیر میں وہ جنونی جذبۂ مسابقت کارفرما ہے جس کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔ اس جذبۂ مسابقت نے انسان کو ایک ایسے جنون میں مبتلا کر رکھا ہے جس نے پورے سماج کو زہر آلود کر دیا ہے۔ ہر شخص اس جنون میں مبتلا ہے کہ اس کی دیوار ہمسایے کی دیوار سے اونچی رہے، اس کے بام و در تزئین و آرائش میں ہمسایے کے بام و در سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہوں۔ اگر ایک شخص اپنے عالمِ جنون میں اپنے مکان میں شیشے کا استعمال کرتا ہے تو یہی جذبۂ مسابقت دوسرے کو اس طرح پاگل کر دیتا ہے کہ وہ اپنے گھر کو شیش محل بنا دیتا ہے۔ اب چاہے جاڑا، گرمی، برسات تینوں موسموں میں یہ شیش محل ایک آزار بنے اور سر چھپانے کی جگہ جہنم کا منظر پیش کرے مگر جذبۂ مسابقت کا جنون انسان کو دلاسا دلاتا رہتا ہے کہ اس مکان میں اگرچہ ہر موسم گزارنے میں بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے مگر یہی کیا کم ہے کہ ہمارے مکان میں ہمسائے کے مکان سے دس یا بیس گنا زیادہ شیشوں کا استعمال ہوا ہے۔

ایک جنون اپنے ہم چشموں اور ہم عصروں سے اختلاف کرنے کا ہے۔ بات کتنی ہی بھلی، کارآمد اور دور رس نتائج کی حامل کیوں نہ ہو، ہم کو تو بس اختلاف کرنا ہے۔ گویا کہ ہماری پیدائش ہی اس لیے ہوئی ہے کہ ہم حزبِ اختلاف کا کردار انجام دیتے رہیں۔ کوئی دینی مسئلہ ہو یا دنیوی، ہم کو تو دوسروں سے اختلاف کر کے اپنے جنون کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اختلاف کا یہ جنون عام طور سے پڑھے لکھے اور اونچی اونچی سندیں رکھنے والے اور دانشور کہلانے والوں میں افراط کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اسی جنونِ اختلاف نے علم و ادب کی ہر شاخ کو رُو بہ زوال کر دیا ہے۔ ہماری تخلیقی صلاحیتوں کے سوتے خشک ہو رہے ہیں

اور تنقیدی صلاحیت تخریب کاری کی نذر ہو رہی ہے۔

ایک جنون اپنی آواز سے محبت کرنے کا ہے۔ جو لوگ پڑھے لکھوں کے سیمیناروں اور سیمپوزیم میں کثرت سے شرکت کرتے رہے ہیں وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ ہر سیمینار اور ہر سیمپوزیم میں بہت سے ایسے افراد ضرور مل جاتے ہیں جو ہر تحریر یا تقریر پر سوالات "داغنے" کے عادی ہوتے ہیں۔ چاہے ان کو سیمینار کے موضوع کا علم ہو یا نہ ہو، اُن کو اپنی آواز سے اتنی محبت ہوتی ہے کہ وہ ہر ہر مقالے اور تقریر پر سوال کے نام سے دخل در معقولات کرتے ہوئے بے ربط تقریریں کیا کرتے ہیں اور جب ان کو کرسیٔ صدارت سے ٹوکا جاتا ہے کہ آپ بہت بول چکے مگر اب تک آپ کا سوال سامنے نہیں آیا تو عالمِ جنون میں انگریزی کے ایک لفظ کا سہارا لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ Observation ہے۔ سیمینار ختم ہو جاتا ہے اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں مگر اپنی آواز کی محبت کے اسیر جنونی کے Observation ختم نہیں ہوتے۔

ان تمام جنونوں سے بڑھ چڑھ کر ہمارے دور میں ایک نئے جنون نے سر اُٹھایا ہے جس کا شکار تقریباً ہر عمر کے لوگ ہیں اس جنون کا نام جنسی جنون ہے۔ اس جنون نے ہمارے دور کے انسان کو بھیڑیا بلکہ اس سے بدتر بنا کر رکھ دیا ہے۔ بھیڑیا وہ کچھ نہیں کرتا جو آج کے دور کا انسان اپنے جنسی جنون میں کر رہا ہے۔ اجتماعی عصمت دری کے واقعات تو روز کا معمول ہو ہی چکے ہیں۔ اب تو اخبارات اِس بات کی بھی خبر دینے لگے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں معصوم بچیوں اور بچوں سے بھی جنسی جنونیوں نے کھیلنا شروع کر دیا ہے۔ شاید ہی کسی دن کا اخبار اس خبر سے خالی ہوتا ہو۔ ایک تین سالہ اور چار سالہ بچی کے ساتھ کسی جنسی جنونی نے اپنی پیاس بجھائی اور بعد میں اس کو قتل کر کے کتے بلی کی طرح کسی میدان یا کھیت میں پھینک دیا۔ اب تو اس میدان میں بڑے بڑے "سورما" پیدا ہو چکے ہیں۔ ابھی گزشتہ ماہ ہی دو ایسے سورماؤں کی کہانی اخبارات میں آچکی ہے۔ ایک صاحب ایسے جنونی نکلے جنہوں نے آٹھ سال سے لے کر بارہ سال تک کے لڑکوں کے ساتھ بدفعلی کی۔ اس پر بھی ان کے جنوں کی آگ نہ بجھی تو ان سب کے سب معصوموں کو قتل کر دیا۔ انہی سورما نے یہ کارنامہ بھی انجام دیا کہ اپنی حقیقی ماں کے ساتھ وہ فعل کیا جس کا تصور مہذب تو کیا وحشی انسان بھی نہیں کر سکتا۔ دوسرے سورما نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ پہلے تو پیشہ کرنے والی عورتوں کو اپنے ام ہوس میں گرفتار کیا اور جب ہوس کا چڑھا ہوا دریا اتر گیا تو ان سب کو قتل کر دیا۔ یہ وہ جنسی جنونی ہیں جو کسی نہ کسی طرح منظرِ عام پر آگئے، پولیس نے ان کو پکڑ لیا اور ان کی "کہانیاں" اخبارات میں شایع ہو گئیں۔ خدا جانے ہمارے معاشرے میں کتنے جنسی جنونی ایسے ہوں گے جو اب تک گرفت میں نہیں آسکے ہیں اور ان کی "کہانی" اب تک "ان کہی" ہے، جب نگاہوں کے سامنے ہر طرف یہ مناظر ہوں تو اپنے معاشرے کو جنونیوں کا معاشرہ نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟

کبیر احمد عباسی

# انسان کے خیالات

سر سید احمد خاںؒ

جہاں اور بہت سے عجائبات قدرت الٰہی میں انہی میں سے انسان کے خیالات بھی نہایت عجیب ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک قسم کی مخلوق ایک ہی سا خیال رکھتی ہے۔ جانوروں کی وہ حرکات اور افعال جو جاندار ہونے کے سبب سے ہیں اور وہ چیز جو محرک اُن افعال یا حرکات کی بواسطہ یا بلاواسطہ ہے اس کا کچھ ہی نام رکھو مگر وہ وہی چیز ہے جس کو انسانی حالت میں خیال کہتے ہیں۔

تمام افعال و حرکات جانوروں کی بلاشبہ ارادی ہیں اور کچھ شک نہیں کہ وہ متحرک بالارادہ ہیں۔ اُن کی تمام حرکتوں کا باعث بواسطہ یا بلاواسطہ ایک خیال جلب منفعت مادی جیسے غذا اور مسکن وغیرہ یا غیر مادی جیسے فرحت و انبساط اور بشاشت یا خیال دفع مضرت مادی و غیر مادی کا ہوتا ہے۔ ہم نہیں پاتے کہ انسان میں اور کوئی چیز اس سے زیادہ ہے۔ بلاشبہ اتنا فرق پاتے ہیں کہ جانوروں میں وہ خیالات محدود اور انسان میں نامحدود ہیں۔

مگر تعجب تو ہم کو اس بات سے ہوتا ہے کہ ہر گاہ ایک قسم کے جانداروں میں ایک ہی سے خیالات ہیں اور ان پر وہ سب ایک ہی سا یقین کامل رکھتے ہیں، تو تمام انسان ہی باوجودیکہ ایک قسم کے جاندار ہیں ایک ہی سے خیالات اور ایک ہی یقین کیوں نہیں رکھتے ہیں۔

کبھی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جانوروں کے خیالات محدود ہونے کے سبب متفق ہیں اور انسان کے خیالات میں نامحدود ہونے کے سبب وہ صفت نہیں ہے، مگر یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی، اس لیے کہ نامحدود ہونے کے لیے مختلف ہونا ضرور نہیں ہے پس انسانوں کے خیالات سے جہاں تک ہم کو واقفیت ہے اسی قدر عجائباتِ قدرت الٰہی سے ہم کو زیادہ واقفیت ہوتی ہے اور ان خیالات کا صحیح ہونا یا غیر صحیح ہونا ہمارے اس فائدے میں کچھ نقصان نہیں پہنچاتا، بلکہ درصورت مختلف ہونے کے اور بھی زیادہ فائدہ دیتا ہے، اس لیے ہم اپنے اس آرٹیکل میں ایسے خیالات بیان کرتے ہیں جن کو وہ اس طرح پر کہتا ہے۔

مجھ کو خیال آیا کہ جس قدر اور جانداروں کو کرنا ہے اتنا ہی مجھ کو بھی کرنا ہے یا اس سے زیادہ۔

مگر میرے خیال میں یہ آیا کہ انسان کے سوا تمام جاندار مخلوقات کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ ان کے بنانے والے کاریگر نے سب کچھ ان کے ساتھ بنا دی ہیں۔ ان کو ان چیزوں کے بہم پہنچانے یا پیدا کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ تمام جانوروں کی خوراک بغیر ان کی سعی و تدبیر کے پیدا ہوتی ہے۔ سرد ملک کے جانوروں کے لیے

نہایت عمدہ پشمینے کا گرم لباس ان کے بدلوں پر پیدا کیا ہے۔ پرند جانوروں کے لیے مینہ سے بچنے کا باراں کوٹ انھی کے بدلوں پر سیا ہے۔ گرم ملک کے جانوروں کے لیے انھی آب و ہوا کے مناسب ان کا جامہ قطع کیا ہے مگر انسان کے لیے کچھ نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو یہ سب کچھ خود کرنا ہے۔

پھر میں نے خیال کیا کہ حیوان اپنے کاموں کے کرنے کے لیے کسی سے کچھ سیکھنے یا تعلیم پانے کے محتاج نہیں ہوتے، خود بے سیکھے سکھائے ہی بینا ہوتے ہیں۔ شہد کی مکھی کو رس چوسنے کے لیے عمدہ قسم کے ماخذوں کی شناخت کوئی نہیں بتاتا اور اپنے گھروں کو ایسی عمدہ تقسیم سے نکالنا جس میں ایک بڑا مہندس بھی حیران ہو جاوے کوئی نہیں پڑھاتا۔ بئے کو ایسا عمدہ اور محفوظ کاشانہ بنانا کوئی نہیں سکھاتا، مگر انسان کو بغیر سیکھے کچھ بھی نہیں آتا۔

پھر میں نے خیال کیا کہ حیوان کے کام خواہ وہ افعال جوارح سے ہوں یا دوسری قسم سے اور وہ از خود ان کو آتے ہوں یا تعلیم سے، نہایت محدود ہیں۔ مگر انسان کے ہر قسم کے کام نامحدود ہیں۔ ان سب باتوں سے میں نے خیال کیا کہ انسان کو اور جانوروں سے بہت کچھ زیادہ کرنا ہے۔

پھر میں نے خیال کیا کہ ایسے بڑے کاریگر نے جو انسان کو اور جانوروں سے بھی زیادہ درماندہ بتایا ہے اور طرح طرح کی مشکلات میں ڈالا ہے تو کیا چیز اس کو دی ہے جس سے وہ یہ سب چیزیں کر سکتا ہے اور تمام مشکلوں پر فتح پا سکتا ہے، اتنے میں میرا دل بول اٹھا کہ عقل۔

میں یہ بات سن کر سوچ میں پڑ گیا یہ بات سچ ہے، مگر میں نے خیال کیا کہ عقل سے تو یہ کام نہیں نکل سکتا۔ نہ تو وہ خود یہ کام نکال سکتی ہے اور نہ اس کے بغیر یہ مشکل حل ہو سکتی ہے۔ یہ تو صرف دوسری چیز کے حاصل کرنے کو بطور آلہ کے ہے۔ جیسے کہ سونا چاندی ہماری بھوک نہیں کھو سکتا، مگر اس چیز کو بہم پہنچا دیتا ہے جو ہماری بھوک کھو دیتی ہے۔

بہت سی تلاش اور جستجو میں نے کی اور خیال دوڑایا کہ وہ کیا چیز ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے عقل بھی صرف آلہ ہے تو خیال میں آیا کہ وہ چیز علم ہے جس کے معنی دانستن ہیں۔ تب میں سمجھا کہ مجھ کو اور جانوروں سے زیادہ جو کچھ کرنا ہے وہ صرف تمام باتوں کی اصلیت دریافت کرنا ہے۔

میں نے خیال کیا کہ علم اور یقین یہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں جس چیز کا مجھ کو علم ہو گا بلاشبہ اس کا یقین بھی ہو گا اور جس کا یقین ہو گا اس کا علم بھی ہو گا پس میں نے خیال کیا کہ مثلاً مجھ کو اعداد کے حساب میں تین کا اور دس کا علم ہے اور اس لیے یقین ہے کہ دس بہ نسبت تین کے زیادہ ہوتے ہیں، تو اگر کوئی شخص اس کے برخلاف کہے اور اپنے بیان کے ثبوت کے لیے یہ بات کہے کہ میں اس لکڑی کو سانپ بنا دیتا ہوں اور وہ اس کو سانپ بنا بھی دے، تو کچھ عجب نہیں کہ اس کا ایسا کرنا مجھ کو حیرت میں ڈال دے مگر کسی طرح اس بات کے یقین میں کہ دس بہ نسبت تین کے زیادہ ہوتے ہیں شک نہیں لانے کا۔

میں نے یہ خیال کیا کہ مسلمانوں کے مذہب کا یہ ایمانی مسئلہ کہ اقرار باللسان و تصدیق بالقلب بے شک سچا مسئلہ ہے۔ اس کا پہلا جزو تو دنیاوی باتوں سے متعلق ہے مگر جو اصل مطلب ہے وہ دوسرے جزو میں ہے۔ تصدیق قلبی اور یقین اگرچہ ایک ہی چیز ہے مگر الفاظ تصدیق قلبی زیادہ

شاندار اور مطلب کو زیادہ تر دل پر نقش کرنے والے ہیں
اس لیے میں نے خیال کیا کہ ایمان بے یقین کے اور
یقین بغیر علم کے نہیں ہو سکتا۔

میں نے یہ بھی خیال کیا کہ علم یا یقین جس کے
بغیر ایمان نہیں حاصل ہو سکتا، ایسا ہی ہونا چاہیے جیسے
کہ دس اور تین کی زیادتی و کمی کا یقین ہے، تاکہ کسی
طرح زائل نہ ہو سکے. کیونکہ اگر وہ کسی طرح زائل ہو گیا
تو وہ حقیقت میں علم یا یقین نہ تھا بلکہ محض ایک دھوکہ
تھا۔

ان تمام خیالات نے مجھ کو گھبرا لیا اور میں چاروں
طرف ڈھونڈنے لگا کہ علم یا یقین، بلکہ یوں کہو کہ
ایمان حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے۔

میں نے دیکھا کہ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں
آدمی بہت سی باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور ان کو کچھ
بھی مشکل نہیں ہوتی۔ میں کیوں ایسی مشکلات میں
پڑا ہوں۔ بہتر ہے کہ ان لوگوں سے پوچھوں کہ تم نے
ان سب باتوں پر کس طرح سے یقین حاصل کیا۔

یہودی نے کہا کہ مجھے اس بات پر یقین کامل ہے
کہ خدا ایک ہے۔ اس لیے کہ موسیٰ نے کہا ہے۔

عیسائی بولا کہ غلط، خدا تین ہیں اور مجھ کو اس
پر کامل یقین ہے، اس لیے کہ یوحنا نے یوں ہی بتایا
ہے۔

ایسے اختلاف سے میں اور بھی گھبرایا، میں نے
خیال کیا کہ جس شے کے علم یا یقین میں اختلاف ہے تو وہ
یقین ہی نہیں۔ پھر کیونکہ ان کو ایسا مختلف یقین ہوا جب
میں نے غور کیا تو سمجھا کہ ان کو تو نہ خدا کے ایک ہونے پر
یقین ہے نہ خدا کے تین ہونے پر بلکہ ان کو تو اس بات
پر یقین ہے کہ موسیٰ اور یوحنا نے ایسا کہا ہے۔

یہودی بولا کہ موسیٰ نے خدا سے باتیں کیں، لکڑی
کو سانپ بنایا پھر اس نے جو کہا اس میں کیا شک ہے؟

عیسائی بولا کہ عیسیٰ نے مردوں کو جلایا، مارنے
سے بھی نہ مرا۔ بلکہ قبر میں سے اُٹھ کر آسمان پر چلا گیا
پھر اس کے خدا ہونے میں کیا شک ہے؟

پہلے تو میں شک میں پڑا کہ دلیلیں تو اچھی ہیں مگر
پھر مجھے خیال ہوا کہ ان کو تو خدا سے موسیٰ کے باتیں کرنے
پر اور لکڑی کو سانپ بنانے پر اور عیسیٰ کے مردوں کو
جلانے پر اور خود جی اٹھنے پر یقین ہے، خدا کے ایک یا
تین ہونے پر یقین نہیں۔

ان سب مباحثوں کے بعد میں نے یقین کیا
کہ علم یا یقین یا ایمان حاصل کرنے کا وسیلہ صرف
عقل ہے۔ جو ان چیزوں کے حاصل کرنے کے لیے آلہ
اور نہایت عمدہ رہنما ہے۔

پھر میں نے خیال کیا کہ عقل پر غلطی سے محفوظ
رہنے کا کیونکر یقین ہو۔ میں نے اقرار کیا کہ حقیقت میں
اس پر یقین نہیں ہو سکتا، مگر جب عقل ہمیشہ کام میں
لائی جاتی ہے تو ایک شخص کی عقل کی غلطی دوسرے شخص
کی عقل سے اور ایک زمانے کی عقلوں کی غلطی دوسرے
زمانے کی عقلوں سے صحیح ہو جاتی ہے، مگر جب کہ علم یا
یقین یا ایمان کا مدار عقل پر نہ رکھا جاوے تو اس کا
حاصل ہونا کسی زمانے اور کسی وقت میں بھی ممکن
نہیں۔

میرے دل میں شبہ اُٹھا کہ عقل کو جو میں نے
سب سے بڑا رہنما سمجھا کیوں سمجھا۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے
کہ عقل سے بڑا کوئی اور رہنما ہو جو عقل کو بھی شکست
دے دے، ہم کو اس سے واقفیت نہ ہوئی اس کے
معدوم ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

مگر میں نے خیال کیا کہ ایسے رہنما کے موجود
ہونے کے احتمال سے ہمارا کام نہیں چلتا۔ اس کے

جو بہ ہونے کا ہم کو علم اور یقین چاہیے، جب یہ نہیں ہے عقل کے سوا اور کوئی رستہ بھی نہیں ہے۔

مجھے خواب کا خیال آیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ سونے کے وقت ہم خواب دیکھتے ہیں اور اس حالت میں ہم اس کو واقعی اور اصلی سمجھتے ہیں اور اس کے سچے ہونے میں ہم کو کچھ شبہ بھی نہیں ہوتا مگر جب جاگتے ہیں تو جانتے ہیں کہ وہ اصلی نہ تھا، بلکہ صرف خواب و خیال تھا تو کس وجہ سے ہم کو یقین ہے کہ جو کچھ ہم حالتِ بیداری میں جانتے اور سمجھتے ہیں وہ دراصل صحیح اور واقعی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے اس وقت کی حالت کے مطابق صحیح ہو مگر ایک دوسری حالت پیش آوے جو ہماری بیداری کی حالت کے ساتھ ایسی ہی مناسبت رکھتی ہو جیسا کہ ہماری بیداری کی حالت خواب کے ساتھ ہے اور اس وقت ہم کو معلوم ہو کہ ہماری حالت بیداری کی درحقیقت خواب کی حالت تھی۔

مگر پھر مجھے خیال آیا کہ ایسی حالت کا احتمال ہمارے یقین کو کافی نہیں، ہم کو یقین ہونا چاہیے کہ درحقیقت ایسی بھی کوئی حالت ہے اور احتمال اور یقین میں بڑا فرق ہے۔ پھر عقل کے سوا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔

میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے کہ ورائے عقل کے اور کوئی طریقہ بھی ہو جس سے صورت یا کیفیت روح کی تبدیل ہو جاوے اور وہی تبدل یا ترقی آئے حصول علم یا یقین یا ایمان کی ہو اور اس کیفیت میں اور اس کے پہلی کیفیت میں ایسا ہی فرق ہو جیسا کہ ایک تندرست شخص میں اور اس شخص میں جو صرف تندرستی کے حال سے واقف ہو فرق ہے۔

پھر مجھ کو خیال آیا کہ تندرستی کے حال سے واقف ہوتا بغیر تندرست رہے ممکن نہیں اور صورت یا کیفیت روح کی تبدل کی حالت میں اس بات کی تمیز کرنے کے لیے کہ دونوں حالتوں میں سے ہماری کی حالت کون سی ہے، کیا چیز ہے وہی تبدل صورت یا کیفیت روح تو اس کی تمیز ہو نہیں سکتی۔ لامحالہ دوسری چیز چاہیے اور وہ دوسری چیز بجز عقل کے اور کوئی نہیں ہے۔ اس لیے کسی طرف جاؤ اور کہیں سے پھر کھاکر آؤ، علم یا یقین یا ایمان کا مدار صرف عقل ہی پر رہتا ہے۔

ان تمام خیالوں نے مجھے یہ ہدایت کی کہ عام لوگوں میں جو یہ مسئلہ ہے کہ ایمان اور مذہب کو عقل سے کچھ علاقہ نہیں ہے یقینی غلط ہے اور جب میں نے مذہب اسلام کو بالکل عقل کے مطابق پایا تو اس کی سچائی پر اور اس مسئلہ کی غلطی پر اور بھی کامل یقین ہوا۔

---

حضرت سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ظلم بدترین گناہ ہے، قیامت کے دن ظالم پر سخت وحشت طاری ہو جائے گی"۔

(بخاری)

# مسلمانوں کی ہواخیزی

سید حامد*

ایسی بھی کسی قوم کی ہواخیزی شاید کبھی نہ ہوئی ہو گی جیسی ہندوستانی مسلمانوں کی گزشتہ سات آٹھ سال میں ہوئی ہے۔ جواہر لعل نہرو نے مسلمانوں کے لیے وہ سب کچھ کیا یا نہیں کیا جو وہ کر سکتے تھے، اس پر سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ آزادی سے پہلے اُن سے دو بڑے سہو ہوئے جن کی بنا پر تقسیم ہند کا سانحہ ناگزیر ہو گیا۔ بہ حیثیت وزیر اعظم کے انھوں نے مسلمانوں کی خیر اندیشی کے اعلانوں سے دریغ نہیں کیا لیکن عملاً وہ اُن کے برق رفتار انحطاط کو روک نہ سکے۔ نہ انھوں نے اسے روکنے کی کوئی سنجیدہ یا موثر کوشش کی۔ لال بہادر شاستری جی کا دور مختصر تھا اور اقلیت کی بست سے یا لیسی جیسی چلی آ رہی تھی چلتی رہی۔ زوال پذیری گویا مسلمانوں کے نامۂ اعمال میں لکھ دی گئی تھی۔ شریمتی اندرا گاندھی جواہر لال نہرو کی چہیتی بیٹی تھیں جنھیں خود انھوں نے پالا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنے باپ کے روابط دیکھے اور برتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے مسایل کی اہمیت کو سمجھتی تھیں اور ان تک بہت سے مسلمانوں کی پہنچ تھی۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو سنجیدہ اور مخلص تھے اور جو انھیں مسلمانوں کی بابت صحیح مشورہ دے سکتے تھے۔ اپنی پرائم منسٹری کے دوسرے دور کے آخری دو سالوں میں اندرا گاندھی نے مسلمانوں کی طرف سے رُخ پھیر لیا تھا؛ انھیں محسوس ہونے لگا تھا کہ مسلمانوں کو اب "اہلِ وفا" میں شمار نہ کرنا اور انتہا پسند ہندو جماعتوں کے ساتھ پینگ بڑھانا ان کی سیاسی بقا کے حق میں ہو گا لیکن ان کے جو ذاتی روابط مسلمانوں کے ساتھ تھے انھیں نقطۂ نظر کی اس تبدیلی سے کوئی جراحت نہیں پہنچی۔ مسلم شخصیتوں اور اداروں اور ان کی اہمیت سے وہ آگاہ تھیں۔

اندرا گاندھی کے اقتدار کے دو ادوار کے درمیان جنتا پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے مرارجی ڈیسائی وزیر اعظم بنے۔ وہ ایک کھرے اور صاف گو اور تلخ نوا انسان تھے۔ مسلمانوں سے انھیں کوئی خاص انسیت نہیں تھی لیکن انھوں نے نہ تو مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچایا، نہ کسی فریب میں رکھا۔ ایک جہاندیدہ اور سن رسیدہ کانگریسی رہنما کی حیثیت سے وہ بھی اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ مسلمانوں میں کون کیا ہے؟

مسلمان افراد اور اداروں سے واقفیت کا یہ سلسلہ راجیو گاندھی کے برسرِ اقتدار آنے پر ٹوٹ گیا

---

* سابق وائس چانسلر، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ ____ ہمدرد نگر۔ نئی دہلی

اور اب کوئی جہاندیدہ، سنجیدہ اور ہوشمند مسلمان رہنما بھی باقی نہیں رہے جو وزیراعظم کو مسلمانوں کی صورت حالات اور امیدوں مسئلوں اور آرزوؤں سے آگاہ کرتے۔ دو ایک لیڈر جو بچے بھی ان کو ہمارے نوخیز وزیراعظم نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اپنے چھوٹے بھائی کے مسلک کی نادانستہ پیروی کرتے ہوئے انھوں نے اپنے گرد نوعمر مسلم رہنماؤں اور مشیروں اور صحافیوں کو جمع کیا۔ یہ سب کے سب مسلمانوں کی فلاح سے بے نیاز تھے۔ انھیں سیاسی زینہ پر تیزی کے ساتھ چڑھنے کی آرزو تھی۔ اب مسلمانوں کے لیے اپنی بات وزیراعظم تک پہنچانا مشکل ہو گیا۔ دہشت گردوں کے خوف نے بھی وزیراعظم کو ہندو اور مسلم دونوں عوام سے دور کر دیا۔ راجیو گاندھی میں آخر تک وہ پختگی اور بیدار مغزی نہیں آئی جس کی توقع ایک بڑے ملک کے وزیراعظم سے کی جاتی ہے۔ ان کی والدہ ماجدہ نے اقلیتوں کی فلاح کے لیے پندرہ نکاتی پروگرام بنایا تھا، راجیو گاندھی نے اس کی توثیق کی۔ عمل کسی حد تک ہوا، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

وشوناتھ پرتاپ سنگھ سے بڑی امیدیں تھیں ان کے پاس تخیل ہے یعنی وہ دوسروں کی صورت حالات اور جذبات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک براق ذہن بھی رکھتے ہیں جو بات کی تہ تک پہنچ جاتا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو موہ لینے کی کوششیں بھی کیں لیکن ان کے پاس وہی چیز نہیں تھی سربراہ حکومت کو جس کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے یعنی فیصلہ کرنے اور اس پر اڑ جانے کی قوت۔ ان کی ذہنی چابک دستیوں اور زبانی موشگافیوں سے لوگ جلد اکتا گئے اور نہ صرف عوام بلکہ ان کے بہت سے رفقاء نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مسلمانوں کو ان سے بھی کوئی فیض نہیں پہنچا۔ ان کے ارد گرد جو مسلمان جمع ہوئے وہ اپنی بساط اور بضاعت، اخلاص اور دور اندیشی میں ان کے پیشرو کے یاران وفادار سے کچھ بہتر نہ تھے۔ ان دونوں وزرائے اعظم کے ادوار میں مسلمانوں کی نمائندگی طالع آزما خود نگر اور کم اندیش یا کج اندیش افراد کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ ایودھیا کے تنازعہ کے باعث جابجا فسادات ہوئے جن میں مسلمانوں کی جان مال اور (ان سے بھی زیادہ) حوصلہ کا بڑا زیاں ہوا۔ ان فسادات کا سلسلۂ نسب راجیو گاندھی اور وی پی سنگھ دونوں تک پہنچتا ہے۔ حالانکہ ذمہ داری سب سے زیادہ بھاجپا کی ہے۔ آگ کو بھڑکانے میں بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے رہنماؤں کی حقیقت فراموشی، انتہا پسندی اور گل افشانیٔ گفتار کو بھی دخل رہا ہے۔

نرسمہا راؤ تجربہ کار، دور اندیش اور ٹھنڈے مزاج کے وزیراعظم ہیں لیکن ابھی تک انھوں نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جس سے یہ اندازہ ہو کہ ان کا گوشۂ خاطر اقلیتوں کی طرف ہے۔ ان کے بارے میں یہ رائے زور پکڑتی جا رہی ہے کہ وہ بھی پہلے دو وزرائے اعظموں کی طرح بھاجپا کے دست نگر ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کے پاس نہ اب آوازہ رہ گئی ہے نہ رسائی۔ طالع آزماؤں اور خود افرازوں کی بن آئی ہے۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ملک امریکہ کا تابع فرمان بن گیا ہے اور ہماری مالی اور خارجہ پالیسی کا سرچشمہ نئی دنیا کے اشارے اور ارشادات ہیں۔ ہندوستان نے حال ہی میں پے در پے اسرائیل کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ اسے اب یہ فکر بھی نہیں رہی کہ ہندوستانی مسلمان ہماری خارجہ پالیسی کی اس قلابازی کو پسند نہیں کریں گے اور بیشتر عرب ممالک ہند کی یہود نوازی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔ بش صاحب کا جادو ساری دنیا کے سر پہ

ڑہ کر بول رہا ہے۔ ہندوستانی مسلمان اور عرب ممالک
ں شمار و قطار میں ہیں ؟

سرکاری پالیسی کے نتیجہ میں اردو زبان کا چلن
گھٹتا جا رہا ہے۔ یوپی سے، اپنے گھر سے یہ زبان بے دخل
ہو گئی ہے۔ بہلانے پھسلانے کے لیے ایک جعفری کمیٹی
ری سرکار نے بنادی جس کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ
ڑال کمیٹی کی رپورٹ پر جسے ۱۵ سال ہو چکے تھے، اپنی
پورٹ پیش کرے۔ گجرال کمیٹی کی رپورٹ کوئی دیوان غالب
تھی نہیں کہ اس کی شرح درکار ہو۔ چونکہ مطالبہ اردو
لوں کا تھا بیشتر جن میں سے مسلمان ہیں، اس لیے اس
بہ لطائف الحیل، ۱۵ سال سے کھٹائی میں ڈال رکھا
ہے۔ جعفری کمیٹی کی غیر ضروری رپورٹ جب تیار ہو گئی
اسے ایک سرکاری کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا، ابھی تک
کی فیصلہ نہیں ہوا۔ لاکھ فریاد کیجیے سرکار کے کانوں
ر جوں نہیں رینگتی۔ اگر ارباب اختیار سے ملنا چاہیے
جواب ندارد۔ اردو کے بارے میں اتر پردیش کی
رکار کا رویہ اور زیادہ حقارت آمیز ہے۔ اردو
سب سے بڑا ادارہ انٹرویو چاہا کرے، کبھی نہیں ملے
۔ ان حکومتوں کو تناسب کا احساس نہیں رہا، یا وہ
دو والوں کو ان کی اوقات جتانا چاہتی ہیں۔ جب
ں پارٹی کے کسی آدمی کو بیچ میں نہ ڈالیے، ملاقات
یں ہو سکے گی۔ اردو والوں کی اب یہ حیثیت رہ
تی ہے۔

مرکزی حکومت نے اقلیتوں کے بارے
ں پالیسی کی عمل آوری کا جائزہ لینے کے لیے ایک
ٹی بنائی۔ روئے سخن خاص طور پر پندرہ نکاتی
روگرام اور نئی تعلیمی پالیسی کے عملی پروگرام کی طرف
تھا۔ کمیٹی معائنہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ جہاں تک
می پالیسی کا تعلق ہے سرے سے اس پر عمل ہی نہیں

ہوا۔ لیکن پالیسی بنانے اور اسے بجا لانے والوں نے
نہ تو پشیمانی کا اظہار کیا نہ تلافی کا سر و سامان۔ اس
کی رپورٹ بھی ہوا میں لٹکی ہوئی ہے۔

یوپی میں اب بھاجپا کی حکومت ہے۔ خود
کانگریسی سرکاروں نے وہاں اردو کے لیے کیا کیا تھا جو
بھاجپا کی سرکار کچھ کرتی۔ وہ بھی جانتی ہے کہ اردو والوں
اور مسلمانوں کی کوئی آواز نہیں ہے اور یہ لوگ یعنی ان
کے بیشتر ترجمان بے حس یا بکاؤ ہیں۔ سرکار جب چاہے
ان کا منھ بند کر سکتی ہے یا ان کی قیمت لگا سکتی ہے۔
ان کو یہ شعور بھی نہیں کہ مطالبے میں وزن اتحاد اور
تنظیم سے پیدا ہوتا ہے۔ انھیں سیاسی پارٹیوں اور
حکومتوں پر اثر انداز ہونے کے گر بھی نہیں آتے۔
خانہ جنگیوں اور عاقبت نااندیشیوں نے انھیں ٹکڑے
ٹکڑے کر دیا ہے ان کی ہوا اکھاڑ دی ہے۔

بھاجپا کے صدر شری مرلی منوہر جوشی نے یاترا
نکالی جو کیرالا سے شروع ہوئی۔ اس کا ہدف یہ تھا کہ
سری نگر کے لال چوک میں جا کر قومی پرچم لہرایا جائے۔
اس پرچم کشائی کے پیچھے آرٹیکل ۳۷۰ کی منسوخی کی مانگ
تھی، تاکہ ساری وادی کشمیر کے ہاتھوں سے نکل جائے
اور وہ شان امتیاز جو ان کے لیے سرمایۂ افتخار تھا
مٹ جائے۔ یاترا ابھی کشمیر سے بہت دور ہی تھی کہ
سب کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یاترا وادی میں داخل نہ
ہو سکے گی، لیکن بھاجپا کا بھرم رکھنا سرکار پر واجب
تھا کیونکہ بھاجپا کی مدد اسے درکار تھی اور کشمیر کے
سرکشوں کو بھی پیغام پہنچانا تھا۔ چنانچہ جوشی جی اور ان
کے کچھ ساتھیوں کو طیارہ سے سری نگر پہنچایا گیا۔ انھوں
نے فوج اور پولس کی حفاظت میں جھنڈا لہرایا۔ فوج
اور پولس نے بھی اس سے ضروری نتائج اخذ کر لیے
ہوں گے۔ ہوا کا رُخ ہوا میں بل کھاتے ہوئے تنکوں

سے دریافت کرلیا جاتا ہے۔ بھاجپا کو ہوا خیزی سے صاف بچا دیا اس کے لکشیہ کو بھی پورا کرا دیا۔

کیا ہندوستانی مسلمان اپنے خلاف تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کو سمجھنے سے انکار کرتے رہیں گے کیا وہ اتنی کثیر آبادی میں ہوتے ہوئے بھی خود کو حقیر اور بے وقعت بن جانے پر راضی ہو جائیں گے۔ ہوا کا رُخ بہت سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے، ہماری ناو ہچکولے لے رہی ہے، ڈگمگا رہی ہے۔

نہیں لیتے کروٹ مگر اہلِ کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہلِ کشتی

اب ہماری بات سرکار تک پہنچے تو کیوں کر، اور وہ اسے سن کر اس پر غور کرے تو کیوں۔ ہوا ایک بار اکھڑ جائے تو بڑی مشکل سے بحال ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ ہوش و گوش اور دردمندی رکھتے ہیں ان کی کوئی سنتا نہیں۔ جو اشخاص ارباب اقتدار کے پاس پہنچ گئے ہیں ان کے پلہ میں نہ خلوص ہے نہ ہمدردی نہ سوجھ بوجھ۔

سارے قرائن یہ کہہ رہے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان تیز رو ادبار سے دوچار ہیں۔ ان کے روبہ زوال ہونے کی کہانی اعداد و شمار کی زبانی سنیئے اور ان کی کم اعتباری اہل وطن کی نگاہوں سے دیکھیے۔ ان کی بے بضاعتی پہ ارباب اقتدار کو خندہ زن پایئے۔ جب قوا میں اضمحلال آجائے گا، جب ہمت ٹوٹ جائے گی، جب احساس تناسب گرفت سے نکل جائے گا، جب اچھے اور برے، اہم اور غیر اہم کا امتیاز باقی نہ رہے گا، جب اتحاد کا دامن پارہ پارہ ہو جائے گا، جب ملت کا شیرازہ بکھر جائے گا تو اسے عزت کی نگاہ سے کون دیکھے گا۔ اسے کون وقعت دے گا، کون اسے اپنے پاس بٹھائے گا۔ ہم اہلِ وطن کی نگاہوں میں جو سبک ہوئے ہیں یہ بے وجہ نہیں ہے۔

"جب کوئی شخص صدق و اخلاص کے ساتھ اچھے کام کرتا ہے اور دفعتاً بیمار پڑ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ بیماری کے زمانے میں بھی اسے اتنا ہی اجر و ثواب عطا فرماتا ہے جتنا کہ صحت میں اسے دیا جاتا ہے۔"

(مشارق)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۱۱ شمارہ ۴ (اپریل ۹۲ء)

# گھوڑوں کی نفسیات

ظفر علی ★

اس دنیائے رنگ و بو میں ہوش سنبھالنے کے بعد
ہں نے جس چوپائے کو سب سے پہلے اپنے سامنے دیکھا
ہ گھوڑا تھا - وہ دن اور آج کا دن گھوڑا میری آنکھوں سے
جھل نہیں ہوا - اور اب تو میں اپنے پیشے کی بدولت ایک
یسے مقام پر ہوں کہ گونگے کی طرح جانوروں کی رمز شناسی
گاہوں کی زبان اور حرکات و سکنات سے ان کی ذہنی
رح کا صحیح تجربہ کرنا ہی میرا کام ٹھہر چکا ہے۔

گھوڑے کے بارے میں سب سے متنازعہ مسئلہ
ن کے سوچنے کی صلاحیت کا ہے ۔ کچھ لوگ گھوڑے کو
ب عام سا جانور تصور کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ گھوڑا
دی کی نعمت سے قطعاً بہرہ ور نہیں بلکہ صرف ڈنڈے کی
نمائی اُسے انسان کے لیے مفید بناتی ہے ۔ اس کے
لکس بہت سے ماہرین اسپاں اس بات پر متفق ہیں
گھوڑا مختلف چیزوں کے بارے میں باقاعدہ طور پر سوچ
ار کر لیتا ہے ۔ یہ استدلال اگر سو فیصد نہیں تو بڑی حد
ضرور صحیح ہے ۔ اگر آپ کا گھوڑے سے کچھ تعلق رہا
ے تو آپ ضرور جانتے ہوں گے کہ کوئی گھوڑا ایک دن
ئی کام یا ورزش احسن طریقے سے نہیں کرتا لیکن دوسرے

یا تیسرے دن جب اسے پھر اسی کام پر لگایا جائے تو وہ
پورا کام بغیر کسی خاص راہنمائی کے نہایت کامیابی اور خوش
اسلوبی سے سرانجام دے ڈالتا ہے۔ گھوڑے کو علم ہوتا
ہے کہ آپ کے ہاتھ میں چھڑی ہے یا نہیں۔ آپ نے نوکیلی
کیلوں والے جوتے پہن رکھے ہیں یا نہیں۔ یا پھر اگر آپ
باقاعدگی سے مختلف موقعوں پر مختلف لباس پہنتے ہیں
تو گھوڑا آپ کو دیکھتے ہی اندازہ لگالے گا کہ آپ آج اسے
شکار کے لیے لے جا رہے ہیں یا صرف سواری کے لیے۔

دراصل گھوڑوں کے ذہین اور کند ذہن ہونے
کا دارومدار اس کے مالک کی ذہانت پر ہوتا ہے ۔
گھوڑا اپنے مالک یا سائیس سے بہت جلد مانوس ہو جاتا
ہے اور اس کی بہت سی عادتوں کو سمجھ کر ان کے مطابق
عمل شروع کر دیتا ہے ۔ ایک عقل مند مالک کا گھوڑا
بہت جلد اپنی مدد آپ کے اصول پر تربیت حاصل کر لیتا
ہے جب کہ ایک کم عقل آدمی کا گھوڑا مسلسل زیر تربیت
رہنے کے باوجود گاؤدی رہتا ہے ۔

ناپسندیدہ افراد کو موقع تاک کر زخمی کر دینا، اپنے
مالک کی عزت و تکریم کرنا، کھانے کا وقت قریب ہونے

★ سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی۔

ہر کام کو جلد از جلد نبٹانے کی کوشش کرنا۔ برے اور غیر تجربہ کار سوار کو زمین پر پچھاڑ دینا، گھڑ دوڑ میں شکست اور فتح کا احساس وغیرہ روزمرہ کے مشاہدات ہیں جو گھوڑے کی عقل و دانش کی گواہی دیتے ہیں اس کے باوجود بھی اگر آپ اس سلسلے میں کسی شک میں مبتلا ہیں تو ذیل کے واقعات پر ایک نظر ڈالیے اور دل پر ہاتھ رکھ کر فیصلہ دیجیے۔

راقم کے والد راجہ فوجدار خاں پاکستان بھر میں گھڑ دوڑ میں جانے پہچانے ہیں اور گزشتہ باون برس سے ان کا تعلق گھوڑوں سے استوار ہے۔ موصوف کی ایک گھوڑی "الفت" کی یادیں انمٹ ہیں۔ اس گھوڑی کو علم ہوا کرتا تھا کہ آج میرا مالک مجھے ریس میں جیتنے کے لیے بھیج رہا ہے یا نہیں۔ جس روز یہ حساس گھوڑی اتفاق سے ریس میں ہار جاتی اس شام کا کھانا اپنے اوپر حرام کر لیا کرتی تھی اور دوسری صبح تک مکمل بھوک ہڑتال پر رہتی۔ یہاں تک کہ راجہ صاحب اسے پیار کرتے، پچکارتے اور اپنے ہاتھ سے راشن دیتے تب کہیں اس کے جی سے صدمے کا بخار اترتا اور وہ کھانا شروع کرتی۔

ایک گھوڑی باقی جانوروں سے پہلے ہی چرنی (پانی پینے کا مقام) پر پہنچ جایا کرتی تھی۔ چرنی کے ایک سرے پر ہینڈ پمپ نصب تھا جس کے ذریعے اس چرنی کو بھر دیا جاتا تھا۔ مذکورہ گھوڑی نے نہ جانے یہ عادت کس طرح سیکھی کہ وہ ہینڈ پمپ کا دستہ اپنے ہونٹوں میں دبا کر اسے چلانا شروع کر دیتی۔ پمپ کا والو ہوا کے اخراج کے بعد پانی کھینچنا شروع کرے تو زیادہ زور لگوانا ہے۔ جوں ہی یہ صورت حال پیش آتی تو گھوڑی نہایت مہارت سے دستہ ہونٹوں کی بجائے دانتوں میں دبا لیتی اور اسے خاصی تیزی سے حرکت دیتے ہوئے پانی نکالنے لگتی جب سارے جانور پانی سے سیر ہو چکتے تو چرنی کو لبالب بھرنے کے بعد خود پانی پیتی اور یہ جا وہ جا۔ گھوڑی کے اس عمل کے دوران اگر کوئی تماشائی آنکلتا تو وہ اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف دیکھتی اور زمین پر زور زور سے پاؤں مارنے لگتی جیسے کہہ رہی ہو کہ "براہِ مہربانی آیئے اور ذرا یوں پانی نکال کر تو دکھایئے۔"

انگلستان کے ایک کرنل رجی نالڈ کے گھوڑے کا قصہ بھی حیران کن ہے۔ انھوں نے چرنی میں پیتل کی ٹونٹی والے دو نلکے لگا رکھے تھے۔ ایک نلکا گرم اور دوسرا ٹھنڈے پانی کے لیے مخصوص تھا۔ انگلینڈ کے مخصوص موسمی حالات کے مطابق گرم یا ٹھنڈا پانی ملا کر چرنی میں بھر دیا جاتا تھا۔ یہ گھوڑا دو گھونٹ پانی پی کر دیکھتا اور اگر پانی کو اپنی پسند سے زیادہ گرم پاتا تو اپنے منہ سے ٹھنڈے نل کی ٹونٹی کھول دیتا اور جہاں پانی کی دھار گرتی اس کے قریب ہی منہ ڈبو کر پیاس بجھانے لگتا۔ کرنل صاحب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک روز گھوڑے نے بھولے سے گرم پانی کی ٹونٹی کھول دی لیکن منہ لگاتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے فوراً وہ ٹونٹی بند کی، ٹھنڈے پانی کی ٹونٹی آخری چوڑی تک کھولی اور جی بھر کر پانی پیا۔ کرنل صاحب کئی بار اپنے مہمانوں کو دکھانے کے لیے پانی پلائی کے دوران ٹونٹی بند کر دیتے تھے اور مہمان یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے کہ گھوڑا پانی چھوڑ کر ایک نظر بند ٹونٹی پر ڈالتا اور پھر بڑے اطمینان کے ساتھ دانتوں کی مدد سے نلکا کھولتا اور سر جھکا کر آب نوشی شروع کر دیتا۔

کرنل صاحب ہی کے دو اور گھوڑوں نے خاصی شہرت حاصل کی۔ ایک گھوڑا کرنل صاحب کے حکم پر کتے کی طرح بھونکتا اور جب وہ دوسرا حکم دیتے تو عام گھوڑوں کی طرح ہنہنا کر دکھایا کرتا تھا — ایک اور گھوڑی خواہش ظاہر کرنے پر کرنل کا بوسہ لیا کرتی تھی۔ کرنل کے بیان کے مطابق وہ اس حکم کے ایک ایک لفظ کو پوری طرح سمجھتی تھی کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کرنل کے کہنے پر اس نے کوتاہی برتی ہو

دوسری باتوں کے دوران کہے گئے اس جملے کو سمجھ نہ پائی ہو۔

اردو زبان کا محاورہ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے گھوڑے پر پوری طرح صادق آتا ہے گھوڑا زندگی میں ایک بار اتفاقاً بھی آگ کی لپیٹ میں آجائے تو اس واقعے کو عمر بھر یاد رکھتا ہے۔ وہ جلتے ہوئے چند تنکوں سے بھی دامن بچا کر گزرتا ہے۔ بعض اوقات تو اس جگہ سے خاصا چکر کاٹ کر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک سائیس منہ میں سگریٹ دبائے ایک گھوڑی کی مالش کر رہا تھا۔ اچانک وہ جھک کر گھوڑی کی ناک پر یک معمولی خراش کا جائزہ لینے لگا تو اس کی سگریٹ گھوڑی کی تھوتھن سے چھو گئی۔ وہ دن اور آج کا دن ادھر تھان کے ریب کوئی شخص سگریٹ پیتا ہوا آیا یا سگریٹ سلگایا ادھر گھوڑی نے اچھل کود شروع کی۔

ہسپتال میں گھوڑوں کا طرز عمل خاصا مدبرانہ ہوتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ طریقۂ علاج کو سمجھ لینے کے بعد ڈاکٹر سے پورا پورا تعاون کرتے ہیں۔ بھینسوں کی طرح انجکشن یکھ کر اچھل کود نہیں مچاتے بلکہ سکون سے ٹیکہ لگوا لیتے ہیں۔ گھوڑے کا اعتماد بحال کر دیا جائے تو خاصے آپریشن ل اطمینان کروا لیتا ہے۔ راقم نے ایک ایسا گھوڑا دیکھا سے نزلے کا پرانا مرض تھا۔ نزلہ کثیف ہونے کی وجہ سے ل سے خارج نہیں ہو پاتا تھا۔ ناک کی نالیوں میں اس ے جماؤ کی وجہ سے سانس کی آمد و رفت دشوار ہو جاتی تھی۔ سال میں تقریباً دو مرتبہ اس کی ناک کی ہڈی میں سوراخ بنا کر جما ہوا مواد کھرچ کر نکالنا پڑتا تھا۔ اصطبل ے نکل کر یہ گھوڑا خود چلے آپریشن تک آجاتا اور جراحی کے یل عمل کے دوران ایک ایسے انداز سے ساکت کھڑا رہتا ڈاکٹر پورے اطمینان اور آزادی کے ساتھ اپنا کام مکمل رسکے۔

گھوڑے کے منہ میں چھیالیس دانت ہوتے ہیں

جن میں داڑھوں کی تعداد چوبیس ہے۔ گھوڑا جبڑوں کو دائرہ نما دائیں بائیں گھماتے ہوئے خوراک چباتا ہے جس کے نتیجے میں داڑھیں تیزی سے گھستی چلی جاتی ہیں۔ بالائی جبڑا نچلے جبڑے کی نسبت زیادہ کشادہ ہوتا ہے۔ اس لیے بالائی داڑھیں یکساں طور پر نہیں گھس پاتیں بلکہ بتدریج ان کی نوکیں باریک اور تیز ہوتی چلی جاتی ہیں اور گھوڑے کے نچلے مسوڑھوں میں متواتر چبھن پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اس صورت میں انھیں رگڑ کر ہموار کیا جاتا ہے۔ کھاریاں میں راقم کے پاس ایک ایسا گھوڑا آیا جو کچھ اس طرح جبڑا چلاتا تھا کہ داڑھیں تقریباً ہر تین ماہ بعد نوک دار ہو کر مسوڑھوں میں زخم پیدا کرنے لگتی تھیں۔ جب اس گھوڑے کو اسپتال لایا جاتا تو وہ کافی دیر تک اطمینان سے منہ کھولے دانت رگڑ واتا رہتا تھا۔ حالانکہ اس عمل کے لیے ایک آدھ بار آنے والے گھوڑے بڑی اچھل کود مچاتے ہیں اور اگر کبھی آپ اس تجربے سے گزرے ہیں تو آپ جانتے ہوں گے کہ یہ کتنا صبر آزما کام ہے۔

گھوڑے اپنے گھر سے بڑی محبت رکھتے ہیں اور گھر جانے کے لیے بالکل اسی طرح بے تاب رہتے ہیں جیسے کوئی محبوب اپنے محب کے لیے۔ وہ بغیر کسی کی مدد کے میلوں دور اپنے گھر تک عام طور پر چلے جاتے ہیں۔

شکار پر جانے والے گھوڑے جب گھر کی طرف لوٹتے ہیں تو تھکن سے چور ہونے کے باوجود راستے میں جابجا خوشی سے ناچنے لگتے ہیں۔ گھر سے محبت تقریباً سو فیصد گھوڑوں میں دیکھی گئی ہے۔ گھڑ سوار، تانگہ بان، ریڑھ بان اور باربرداری کا کام لینے والے مزدور اس سلسلے میں آپ کو ہزاروں قصے سنا سکتے ہیں۔

۱۹۶۰ء میں راقم کے ایک دوست کے پاس ایک گھوڑا تھا جو جیمخانہ کراس لاہور سے گالف روڈ تک جانے والے تقریباً تمام راستوں سے واقف تھا گھوڑے

کا مالک چیئرنگ کراس پر باگیں تانگے کے ساتھ باندھ کر سگریٹ سلگایا کرتا تھا اور گھوڑا ٹریفک بھری سڑکوں سے گزرتا گالٹ روڈ پر واقع اپنے گھر جاکر دم لیتا۔ فوج کا ایک گھوڑا فروخت ہوا تو اس کا نیا مالک اسے مقام فروخت سے پچیس میل دور ایک دوسرے شہر میں لے گیا۔ ابھی اس نیلامی کو ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ یہ گھوڑا ایک دن نہایت خستہ حالت میں اپنی فوجی یونٹ میں آپہنچا۔ ایک گھوڑے کو بوڑھا ہوجانے کی وجہ سے اس کے مالک نے واپس گاؤں بھیج دیا تاکہ چراہ گاہ میں گھوم پھر کر اپنی زندگی کے باقی ایام پورے کرسکے۔ گاؤں سولہ میل دور تھا اور گھوڑا اس سے قبل کبھی وہاں نہیں گیا تھا۔ گھوڑے کو چند ہی دن بعد اپنے مالک اور گھر کی یاد نے اس قدر ستایا کہ وہ نہ صرف گاؤں سے نکل بھاگا بلکہ راستے میں آنے والے تین ریلوے پھاٹکوں اور ایک دریا کے ٹول ٹیکس والے پل سے گزرتا ہوا شام ڈھلے پرانے گھر آپہنچا اور کھڑکی کے قریب بڑی زور سے ہنہنا کر مالک کو اپنی واپسی کی اطلاع دی۔ ایک اور ایسی ہی بوڑھی گھوڑی کی گھر واپسی کی کہانی اس وجہ سے اور بھی زیادہ حیران کن ہے کہ یہ گھوڑی ایک آنکھ سے اندھی اور دوسری سے شدید قسم کے ضعف نظر کا شکار تھی۔

بعض اوقات گھوڑے گھر کے ساتھ ساتھ اپنے کام کی نوعیت اور مالک پر بھی فخر کرتے ہیں اور ان سے علیحدہ ہونا انھیں شاق گزرتا ہے۔ ایک گھوڑا دس سال تک فائر بریگیڈ میں خدمات سرانجام دیتا رہا اور آخرکار ایک ریڑھ بان کے ہاتھ فروخت کردیا گیا۔ اس ذلت پر گھوڑے کا دل ٹوٹ گیا۔ ایک دن اتفاقاً ریڑھ بان فائر بریگیڈ کی عمارت کے سامنے گزرا۔ جونہی گھوڑے کی نظر اپنے پرانے گھر پر پڑی۔ اس نے زبردست دولتیاں چلائیں اور ریڑھ توڑ پھوڑ کر اس کی قید سے آزاد ہوگیا۔ ایک لمحہ رک کر فائر بریگیڈ کی عمارت پر حسرت بھری نگاہ ڈالی اور ہنہنایا اور ناک کی سیدھ میں سرپٹ بھاگتا ہوا عمارت کی مضبوط دیوار سے جاٹکرایا۔ اس کے سر پر شدید چوٹ آئی اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑ دیا۔ اس خودکشی نے گھوڑوں کی نفسیات میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

ایک اور گھوڑے کو جب سواری سے ہٹا کر ریڑھے میں جوتا گیا تو اس نے احتجاج کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ ریڑھ کھینچتے ہوئے موقع ملنے پر اپنے ایک ٹخنے کو بری طرح زخمی کرلیتا تھا اور اس طرح دس پندرہ دن کے لیے خود کو کام کے ناقابل بنالیتا تھا۔ مہینے میں وہ کم از کم دو مرتبہ ایسا ضرور کرتا۔ یعنی صرف چار یا چھ دن کام اور باقی مہینہ آرام۔ تین ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد اس نے اس رسمِ احتجاج کو خیرباد کہا اور ریڑھے میں جی لگا کر کام شروع کیا۔

بیکاری اور فروخت کے دنوں میں گھوڑے عجیب عاداتِ بد کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اگر وہ کافی دنوں تک بغیر نگہداشت کے بندھے رہیں تو "بیکار مباش کچھ کیا کر" کے مصداق اپنا سر اصطبل سے باہر نکال کر قوس نما انداز میں گھمانے لگتے ہیں اور یہ شغل گھنٹوں تک جاری و ساری رہتا ہے یا پھر فلسفیانہ انداز میں آسمان کی طرف مسلسل گھورنا شروع کردیتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو تو کسی بانس یا کمرے کے کسی کونے میں دانت گاڑ کر بیک وقت بہت سی ہوا ایک خاص قسم کی آواز کے ساتھ نگل جاتے ہیں۔ اگر کوئی روکنے والا نہ ہو تو سارا سارا دن ہوا پینے کا عمل جاری رہتا ہے۔ شام ڈھلتے ڈھلتے ان کا بدن پھول کر کپا ہوجاتا ہے اور مالک کو لاپرواہی کی سزا کے طور پر ویٹرنری ڈاکٹر کے پیچھے بھاگنا پڑتا ہے۔

گھوڑوں میں کام اور کرتب سیکھنے کی صلا

بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ عام سرکسوں کے گھوڑے اپنی پسند یا ناپسند یعنی ہاں اور نا کا اظہار انسانوں کی طرح یعنی اپنے سر کی جنبش سے کر سکتے ہیں۔ بھرے پنڈال میں سے سیاہ یا سفید رنگ کی ٹوپیوں، بیٹ اور پگڑیوں والے اشخاص کو بازو سے پکڑ کر علیحدہ کر سکتے ہیں پاؤں اٹھا کر سلام کرنا اور زمین پر گرا ہوا رومال اٹھا کر مالک کو دینا گھوڑے نہایت آسانی سے سیکھ سکتے ہیں لاہور میں ہر سال ہونے والے گھوڑوں کے چند کرتب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اس میلے کا ٹینٹ شو ساری دنیا میں مشہور ہے۔ اس شو میں سارے کے سارے نظم و ضبط سلیقے اور خوبصورتی کا انحصار گھوڑے کی سوجھ بوجھ اور ذہن انسانی تک رسائی کا ثمر ہے۔

اگر گھوڑے پر یکسوئی سے توجہ دی جائے تو یہ اپنے غیر معمولی نظام جس کی وجہ سے مالک کی مزاج شناسی میں محیر العقول حد تک بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دور کھڑے ہوئے مالک کے اشارے پر ابرو یا آنکھوں کی حرکت ہی سے اس کا مدعا سمجھ جاتا ہے اور اس کے دل میں پنہاں خواہش کے مطابق عمل کرتا ہے۔ ایک شخص پیڈرو کا قصہ انتہائی دردناک ہے۔ اس نے ایک چھوٹے قد کاٹھ کے گھوڑے "مراکو" کے طلسماتی نظام جس سے پورا فائدہ اٹھایا اور اسے ایسے ایسے کرتب سکھائے کہ عقل دنگ رہ جائے۔ ان کی تربیت کی انتہا یہ تھی کہ وہ احکامات اتنے خفیف اشاروں میں دیا کرتا تھا کہ پورے مجمع میں سے ایک شخص بھی اسے کوئی حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک روز اس نے اپنا شو ایک ایسے مجمع میں پیش کیا جس میں بڑے بڑے روسا، امراء، راہب اور معزز لوگ شامل تھے۔ پورا مجمع معمہ سمجھنے سے قاصر رہا۔ جب پیڈرو اور مراکو کے درمیان کسی ظاہری رابطے کا سراغ نہ مل سکا تو یہ فتویٰ دے دیا گیا کہ گھوڑے اور اس کے مالک میں کسی شیطان کی روح حلول کر گئی ہے۔ اس ناکردہ گناہ کی سزا کے طور پر ایک پُر رونق بازار میں پیڈرو اور اس کے گھوڑے کو زندہ جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔

۱۷۰۸ء میں شائع ہونے والی ایک کتاب میں ایک ایسے انگلش گھوڑے کا پتہ ملتا ہے جو تاش کے مختلف پتے شناخت کر کے علیحدہ کر لیا کرتا تھا۔ لوگ گھوڑے کے اس کرتب سے اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ ۱۷۰۷ء میں اس بے چارے کو بھی مراکو اور پیڈرو کی طرح نذر آتش ہونا پڑا۔

گھوڑا موسیقی سے بھی خاصا لگاؤ رکھتا ہے۔ بعض ملکوں میں فوج کے گھوڑوں کو موسیقی کی مختلف دھنوں پر مختلف چالوں میں بھاگنے یا آہستہ خرامی کا درس دیا جاتا اور وہ بڑی کامیابی سے موسیقی کی دھنوں پر مختلف چالیں چلنا سیکھ لیتے ہیں۔ اس طریقے میں ایک خرابی دیکھنے میں آتی ہے۔ اگر کہیں دوسری جگہ کسی لاؤڈ اسپیکر پر کوئی تیز دھن بج رہی ہو تو گھوڑا اسے حکم سمجھتے ہوئے رسہ تڑا کر اس دھن سے وابستہ سبق کے مطابق بھاگ نکلے گا۔

موسیقی کی دھن پر گھوڑوں کو ناچتے ہوئے تو آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ ہمارے ملک میں گھوڑوں کو رقص کی تربیت دینے کا رواج عام ہے۔ گھوڑے بڑی خوبصورتی سے رقص کرتے ہیں۔ کیا مجال کہ ایک پاؤں بھی ڈھول کی تھاپ سے الگ پڑے۔ اپنے پاؤں سے بندھی ہوئی پازیبوں اور گھنگروؤں کو ڈھول کی لے پر چھنکانے میں رقاص گھوڑوں کو خاص ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ گھوڑوں کا یہ کرتب دیکھ کر طوائفیں تک اپنی انگلیاں دانتوں میں دبا لیتی ہیں۔

گھوڑے مختلف تاثرات کا اظہار اپنی آواز کے ذریعے بھی کرتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ گھوڑے تمام

پالتو جانور زبان بیان تک کہنے سے بھی زیادہ موثر اور جامع طور پر گفتگو کرسکتے ہیں تو یقیناً بجا ہوگا۔ ساتھ ساتھ رہنے والے گھوڑوں کو علیحدہ یا کسی اور اصطبل میں منتقل کیا جا رہا ہو تو وہ روانگی کے وقت ایک خاص آواز میں بول کر اپنے پڑوسی گھوڑوں کو الوداع کہتے ہیں۔ ماں اپنے بچے کو بلانے کے لیے ایک خاص انداز میں بولتی ہے۔ اسی طرح نوجوان گھوڑے اپنے نوجوان ساتھیوں سے اور نر گھوڑے مادہ گھوڑیوں سے مخصوص لہجوں میں ہم کلام ہوتے ہیں۔ ایک ساتھ رہنے والے گھوڑے کام کے دوران تیز دوڑتے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے سے گزریں تو آپس میں ایک باریک اور مختصر ہنہناہٹ کی مدد سے باقاعدہ "سلام دعا" کا تبادلہ کرنا نہیں بھولتے۔

بھرے اصطبل میں سے ایک گھوڑا نکال کر لے جایا جائے تو اس کے ساتھ والا گھوڑا اسے الوداع کہتا ہے لیکن واپسی پر آنے والا گھوڑا سلام میں پہل کرتا ہے اور پہلا گھوڑا سلام کا جواب دیتا ہے۔ گو کہ اصطبل میں اور بہت سے گھوڑے موجود ہوتے ہیں لیکن یہ نامہ و پیام صرف دو ساتھی گھوڑوں ہی کے درمیان چلتا ہے۔

کھانا سامنے آنے پر گھوڑے ایک ہلکی لیکن حلقوم سے نکلنے والی ہنہناہٹ میں خوشی کا نعرہ بلند کرتے ہیں کھانے میں دیر ہو جانے پر حلقوم سے نکلنے والی آواز کرخت ہو جاتی ہے اور اس میں ناگوری کا عنصر نمایاں ہوتا ہے گھوڑے گو کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں لیکن ڈر کی وجہ سے انسانوں کی طرح چیخنے لگنا کسر شان سمجھتے ہیں۔ جنگوں کے گھمسان میں البتہ گھوڑوں کو چیختے سنا گیا ہے لیکن یہ چیخیں خوف کے برعکس ان آوازوں سے زیادہ مشابہ ہوتی ہیں جو سپاہی دشمن پر حملہ آور ہوتے ہوئے اپنے منہ سے نکالتے ہیں۔

ایک ماہر حیوانات نے تقریباً ایک درجن گھوڑے ریل کے نیچے کچل کر ہلاک ہوتے دیکھے۔ اس کا بیان ہے کہ حادثے میں مرتے وقت گھوڑوں نے جو آوازیں نکالیں وہ ان کی عام آوازوں سے بہت مختلف تھیں۔ گھوڑے درد کا احساس رکھتے ہیں۔ پیٹ کے درد میں باقاعدہ انسانوں کی طرح کراہتے اور ہائے وہ کرتے ہیں اور منہ گھما گھما کر مقام درد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی ڈاکٹر انھیں باقاعدہ بے ہوش یا کم از کم متعلقہ جگہ کو بے حس کیے بغیر آپریشن شروع کر دے تو ایک سیٹی نما چیخ سے درد اور ناگواری کا اظہار کرتے ہیں۔ جنگ کے دوران بمباری کے موقع پر گھوڑے بے ہنگم طریقے پر چیخنے چلاتے ہیں۔ خصوصاً وہ جو کبھی پہلے بھی اس خوفناک تجربے سے گزر چکے ہوں لیکن شدید طور پر زخمی ہو جانے کے بعد نہایت خاموشی اور صبر کے ساتھ موت کا انتظار کرتے ہیں۔

اگر آپ کسی گھوڑے کو سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا سنیں یا وہ تیز غرّاہٹ نما آواز میں چیخے تو فوراً سمجھ جائیں کہ سامنے کھڑے ہوئے لوگوں میں سے گھوڑے نے اپنے کسی دشمن کو شناخت کر لیا ہے اور اس پر حملہ کرنے ہی والا ہے۔ اس کے بعد گھوڑے کے سامنے ٹھہرنے سے قبل یقین کر لیجیے کہ کہیں اس کی ناپسندیدہ افراد کی فہرست میں آپ کا اسم گرامی بھی تو شامل نہیں۔

گھوڑے آپس میں تبادلہ خیال کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری گفتگو کا بھی کچھ نہ کچھ حصّہ سمجھ لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں گھوڑے انسانی بول چال اور لب و لہجہ کا مشاہدہ بہت غور اور عرق ریزی سے کرتے ہیں۔ دراصل یہ لب و لہجہ ہی ہے جس سے گھوڑے انسانوں کے مطالب سمجھ جاتے ہیں۔ کیونکہ آپ ایک خوش کن بات بھی غصّے کے لہجے میں ادا کریں تو گھوڑے کا ردّ عمل وہی ہوگا جو آپ کے عام غصّے کی حالت میں ہوتا ہے۔ گھوڑا محبت بھرے دوستانہ احکام کو بارعب انداز میں بلند آواز احکامات کی نسبتاً زیادہ خوش دلی

ے قبول کرتا اور ان پر عمل کرتا ہے۔ گھوڑے کی سماعت
نی عمدہ ہوتی ہے کہ وہ دور سے کی گئی سرگوشی تک سن
سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شور و شغب سے نفرت کرتا
ہے۔ گھوڑا آپ کی پیار بھری پچکار کا بھوکا ہوتا ہے۔ انتہائی
امساعد اور خوف ناک صورت حال میں بھی جب وہ سر پر پاؤں
رکھ کر بھاگ رہا ہو مالک کی ایک پیار بھری آواز اسے
روکنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے برعکس جن گھوڑوں
کی تربیت خام ہو ان پر کلام نرم و نازک بالکل بے اثر
ثابت ہوتا ہے۔

گھوڑوں میں انتقام کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہوتا
ہے لیکن وہ اسے صرف بدترین دشمنوں کے خلاف ہی
استعمال کرتے ہیں یا پھر رقابت کی وجہ سے تشدد پر
اتر آتے ہیں۔

ایک صاحبہ بچپن
سے ایک پستہ قد گھوڑے
پر سواری کر رہی تھیں جب
وہ بلوغت کے قریب پہنچیں
تو قد میں اضافے کے باعث
پستہ قد گھوڑا ناقابل استعمال
ہو گیا۔ انھوں نے ایک نیا
گھوڑا خرید لیا۔ نئے گھوڑے
پر لطف و کرم ہوا تو پستہ
قد کے دل میں رقابت
کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ
نئے گھوڑے کو دیکھ کر سخت مشتعل ہو جاتا...... زمین پر
پاؤں پٹختا اور رسہ تڑانے کی کوشش کرتا۔ ایک روز
رسہ ٹوٹ گیا۔ پستہ قد گھوڑا نئے گھوڑے پر بجلی بن کر
گرا اور بوڑھا ہونے کے باوجود اسے شدید زخمی کر دیا۔
ایک وٹرنری سرجن نے ایک گھوڑے کو پوری طرح بے ہوش

اور متاثرہ حصہ بے حس کیے بغیر ایک آپریشن کر دیا جس
کی وجہ سے اسے سخت تکلیف برداشت کرنا پڑی۔ اس
واقعہ کے تین برس بعد گھوڑے نے ایک روز سرجن
کو گھڑ دوڑ کے میدان میں دیکھ لیا اور غصے میں پھنکارتا
ہوا اس پر ٹوٹ پڑا۔ اگر بہت سے لوگ فوراً امداد کو
نہ دوڑ پڑتے تو سرجن صاحب کا زندہ بچنا سخت مشکل
تھا۔

بہت سی جنگوں میں ایسے واقعات پیش آئے
کہ گھڑ سوار ہلاک ہو کر گھوڑے سے گر پڑا تو گھوڑے نے
غضب ناک ہو کر اپنے مالک کے قاتل پر حملہ کر دیا۔ تاریخ
کے اوراق اس قسم کے واقعات کے گواہ ہیں۔ انگلستان
کے ایک بادشاہ ولیم سوئم نے اپنے خلاف سازش کے
الزام میں ایک درباری
سر جان لینزک کو پھانسی پر
چڑھا دیا۔ مرنے سے قبل
سر جان نے بادشاہ سے
کئی بار رحم کی اپیل کی جسے
مسترد کر دیا گیا۔ بالآخر
اس نے پرانی دوستی
کی یادگار کے طور پر اپنا
خوب صورت اور وفادار
گھوڑا بادشاہ کو تحفے میں
دے دیا...... انگلستان
بھر میں یہ گھوڑا اپنی قوت
برداشت اور تیز رفتاری کے سبب اپنا ثانی نہیں رکھتا
تھا...... جلد ہی بادشاہ کو اس گھوڑے سے اس حد تک
محبت ہو گئی کہ وہ ہر جگہ جانے کے لیے اسے ہی استعمال
کرنے لگا۔ اسی طرح پانچ برس گزر گئے۔ ایک دن بادشاہ
اپنے محل کے قریب گھوڑے پر سواری کر رہا تھا کہ اچانک

---

آج ساری زندگی اور اقتدار کا زمانہ مجھے خواب و خیال
معلوم ہو رہا ہے۔ کاش میں ایک با اختیار حکمران ہونے
کے بجائے ایک معمولی انسان ہوتا۔ آج میں اپنے اعمال
پر پچھتا رہا ہوں۔ خداوندا تو مجھے بخش دے کیونکہ لوگ
کہتے ہیں کہ میں جہنم کا ایندھن بنایا جاؤں گا۔ میں
اپنے گناہوں اور زیادتیوں سے توبہ کرتا ہوں
اگرچہ مجھے یہ امید نہیں کہ میں بخش دیا جاؤں گا
مگر تیرے اختیار میں سب کچھ ہے۔

حجاج بن یوسف

---

اچھا اور اپنے سوار کو زمین پر دے مارا۔ ولیم کی
ن ٹوٹ گئی اور وہ ۸ مارچ ۱۹۰۲ء کو اسی سبب
انتقال کر گیا۔ اس طرح سر جان کے گھوڑے نے
سال بعد اپنے مالک کے قاتل سے انتقام لے لیا۔

گھوڑے آسانی سے نشے کے عادی ہو جاتے ہیں اور
تقریباً تمام ہی معروف نشہ آور اشیاء کا اثر قبول کرتے ہیں
اللہ صاحب مکرمی راجہ فرج دار خاں کی ایک گھوڑی "شفقت"
اس کے پٹھان سائیس نے چائے کی لت ڈال دی
تھی وہ چائے کی اس قدر عادی ہو گئی تھی کہ ادھر چائے
کا وقت ہوا ادھر اس نے اصطبل میں اچھل کود مچائی
یا مجال جو سائیس اکیلا چائے پی جائے۔ وہ دولتیاں
مار مار کر اصطبل کی دیواروں کا پلاستر اکھیڑ دیا کرتی
تھی۔ راقم نے ایک کوچوان کو دیکھا جو سگریٹ کا کش
لے کر دھواں گھوڑے کے نتھنوں میں چھوڑا کرتا تھا۔ گھوڑا
سگریٹ نوشی کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ تمام کا تمام
دھواں اپنے پھیپھڑوں میں اتار لیا کرتا تھا۔ اگر کوچوان
الگ بیٹھ کر سگریٹ سے اکیلے لطف اندوز ہوتا رہے تو یہ
زور سے زمین پر پاؤں مار مار کر گرد کا ایک طوفان اٹھا
دیا کرتا تھا۔

ریس کے گھوڑوں کے بعض مالکان گھوڑوں کو شراب کا عادی بنا دیتے
ہیں اور مقابلے کے روز نشہ پلا کر ریس کے لیے بھیجتے ہیں۔ نشہ کی
کی حالت میں گھوڑے اپنی تمام استطاعت سے بڑھ کر اپنے جوہر دکھاتے
ہیں اور وہ رند بلانوش انسانوں کی آزمائش کے وقت ہرگز
یہ نہیں کہتے کہ ؎ یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں۔

---

ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

"ہمیشہ خدا کے احکام امر و نہی کو محفوظ رکھنا
خداوند تعالیٰ تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے گا اور جب
تم سوال کا ارادہ کرو تو اللہ سے سوال کرو اور جب
تم مدد چاہو تو صرف اللہ سے مدد چاہو اور یہ
بات یاد رکھو کہ اگر ساری مخلوق بھی جمع ہو کر تمہیں
کچھ نفع پہنچانا چاہے تو ہرگز نفع نہ پہنچا سکے گی تمہیں
صرف اتنا ہی نفع پہنچ سکے گا جتنا کہ تمہارے مقدر
میں لکھ دیا گیا ہے۔"

(ترمذی)

# جنوبی ہند کے سرسیّد

محمد اسلم صدیقی ★

افضل العلماء، ڈاکٹر عبدالحق جیسی ہمہ صفت اور گوناگوں خصوصیات کی حامل شخصیت کے متعلق کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں مگر سرا ہاتھ نہیں آتا۔ افکار و خیالات کا ایک ہجوم ہے۔ ہر بات ایسی کہ پہلے اسے بیان کیا جائے

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

ڈاکٹر عبدالحق کرنول کے ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا گھرانا مولویوں کا گھرانا تھا مگر ایسے نہیں جو دو روٹی کے واسطے در بدر کی ذلت اٹھاتے ہیں گھر میں دولت تو نہیں تھی لیکن دین و اخلاق کی لازوال دولت گراں مایہ سے ان کا گھر مالا مال تھا۔ ان کے والد شمس العلماء مولانا محمد عمر بہت فاضل اور عالم دین اور بڑے باوقار اور صاحبِ استغنیٰ اور درویش صفت بزرگ تھے، شہر کے ہر طبقے میں احترام اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ نماز فجر کے بعد درسِ حدیث دیا کرتے تھے جو بہت مقبول تھا۔ بہت سے لوگوں نے ان سے اکتساب علم کیا اور فیض پایا۔ انھیں کی تعلیم و تربیت میں ڈاکٹر عبدالحق پروان چڑھے۔ علم دین سے فراغت کے بعد عربی میں دستگاہ کامل حاصل کی اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے سند فضیلت حاصل کی۔

باوجود اس علمی فضیلت کے، مزاج میں بڑی سادگی، اور بنہایت انکسار تھا۔ نماز صبح کے بعد مسجد امیر النساء بیگم میں تفسیر کا درس دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد گھریلو کاموں میں گھر والوں کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ علمی مسائل میں اپنے خردوں اور شاگردوں سے مشورہ لیتے اور ان کی درست بات کو قبول کرکے مسرت کا اظہار کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ وہ امیر نہیں "فقیر" تھے۔ فقیری میں امیرانہ ٹھاٹ سبھی دکھاتے ہیں مگر امیری میں فقیری کا انداز، موجودہ زمانہ میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ جو رنگ اور طور لباس و رہائش کا طالب علمی کے زمانے میں تھا وہی آخر زمانہ تک جب کہ فارغ البالی کا دور تھا، بدستور قائم رہا۔ کھانے پینے میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ سامنے جو کچھ آتا بہ رغبت کھا لیتے۔ اپنے لیے کوئی فرمائش نہیں کرتے تھے۔ لیکن مہمان نوازی اور حاجت مندوں کی حاجت روائی میں ان کی اولوالعزمی اور حوصلہ و سیر چشمی قابلِ دید تھی۔ رشید احمد صدیقی نے "ہم نفسان رفتہ" میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ

"میری لڑکی اور داماد ایک طویل سیاحت سے فارغ ہو کر جاپان سے سیلون پہنچے

★ غازی پور لاج، سرسید نگر، اے ایم یو علی گڑھ

خط بھیج کر مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ کوئی ایسا انتظام کر دوں کہ ایک دو روز مدراس میں قیام کرکے وہاں کی سیر کریں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو لکھا سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا شمار مدراس کے مصروف ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ پبلک سروس کمیشن کی ذمہ داریوں کے علاوہ اپنے یا دوسروں کے معلوم نہیں کتنے اور کام اپنے ذمے رکھے تھے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کی کوٹھی پر چھوٹے بڑے طرح طرح کے لوگ، طرح طرح کے کاموں سے صبح سے رات تک برابر آتے جاتے رہتے اور ڈاکٹر صاحب ان سب سے بڑی توجہ اور تلطف سے پیش آتے، جیسے کسی ایسے معالج کا مطب ہو جہاں ہر مریض کا علاج مفت کیا جاتا ہو اور مطب صبح سے رات گئے تک مسلسل کھلا رہتا ہو۔ یہی نہیں بلکہ علاج کی نوعیت بھی جداگانہ ہو۔ مثلاً دوا، دعا، گنڈا، تعویذ، دان پن، سعی سفارش، رشتہ ناطہ اتنا ہی نہیں بلکہ بیچ بیچ میں "آوٹ ڈور ریکٹس" بھی نکل جاتے۔ کسی سے چندہ مانگنے کے لیے، کسی کی سفارش کرنے، کہیں تقریر کرنے، کہیں شادی غمی میں شریک ہونے، کبھی کبھی مہمان کو مدراس کی سیر کرانے۔ ڈاکٹر صاحب کسی ضروری کام سے مدراس سے باہر جانے والے تھے خط ملا تو پروگرام ملتوی کر دیا۔ ہوائی اڈے پر پہنچے اور دونوں کو گھر لائے۔"

مزید "اخلاص اور اخلاق برتنے کا ڈاکٹر صاحب کا تکنیک جداگانہ تھا۔ وہ اپنے الطاف و کرم کا پورا اندوختہ کامل اعتماد اور افتخار سے پہلی ہی بار ہر اس شخص پر لگا دیتے تھے جس کو اس کی ضرورت ہوتی۔"

رشید احمد صدیقی صاحب آگے لکھتے ہیں کہ

"کم لوگ ایسے ہوں گے جن کا علم اور اخلاق طلبہ کو اس طرح اثر کرتا ہو جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کا تھا۔"

ان کا یہ کہنا کسی ثبوت کا محتاج نہیں۔ رشید صاحب مزید لکھتے ہیں کہ

"کسی آدمی کے بڑے ہونے کی پہچان یہ بھی ہے کہ اس کو غریبوں اور بچوں سے کتنی محبت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ان دونوں سے بڑا انس تھا۔ صاحب زادی کی شادی کی تو اسی دن اور اسی وقت بستی کی سات لڑکیوں کی بھی شادی کرائی۔ ہر طرح کی مالی امداد بہم پہنچائی اور ان کی برابر خبر گیری کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب دولت مند نہ تھے لیکن اچھے کاموں میں روپیہ صرف کرنے کا بڑا حوصلہ رکھتے تھے۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا دردمند دل عطا کیا تھا۔ ان کے صحیفۂ زندگی میں ایسے واقعات کا شمار مشکل ہے۔ خاندان کے غریب اور مستحقین کی خدمت اور نادار طلبا کی بلا تفریق مذہب مسلمان، ہندو اور عیسائی سب کے لیے فکر مند ہوتے۔ اپنی ذات اور اہل ثروت سے ان کی تعلیم کے لیے ہر قسم کی امداد اور ضروریات کا بندوبست کرنا اپنے لیے واجب جانتے تھے۔ اکثر نادار و ہونہار طالب علموں کو اپنے ساتھ رکھتے اور ان کی جملہ ضروریات کے کفیل ہوتے صرف اسی قدر نہیں بلکہ اپنے اہل تعلق اور صاحب ثروت لوگوں کو بھی بہ اصرار اس پر آمادہ کرتے تھے اور ان کی اس بے لوث خواہش کو وہ لوگ پورا کرنے میں فخر و مسرت محسوس کرتے تھے۔ اس طرح انھوں نے بلا مبالغہ بے شمار نادار و ہونہار

لبا کو اپنی سعی و کوشش سے زیورِ علم سے آراستہ اور بہتیروں کو ان کی استعداد و قابلیت کے مطابق خود اور اپنے اثرات و تعلقات سے برسرِ روزگار کرکے اپنے خاندانوں کی خدمت کے لائق بنایا۔ ڈاکٹر عبدالحق کی ان بے لوث خدمات کی بنا پر کرنول کے عام و خاص، چھوٹے بڑے، امیر و غریب سب کی نگاہوں میں آپ کی بڑی قدر اور احترام تھا اور لوگ آپ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ راقم نے اس کا خود مشاہدہ کیا ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

آپ کی تعلیمی خدمات کا کچھ اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے بے شمار دینی مدرسے، اسکول اور کالج قائم کیے اردو کے فروغ کے لیے اردو کے اساتذہ کا ٹریننگ اسکول اور اس سے اونچے درجے کا کالج قائم کرایا جس کا خوش گوار نتیجہ یہ نکلا کہ آندھرا پردیش میں اردو اساتذہ کی جو کمی تھی وہ ختم ہوگئی جس زمانے میں وہ مدراس میں گورنمنٹ محمڈن کالج (جواب گورنمنٹ آرٹس ڈگری کالج کے نام سے موسوم ہے) اور اس کے بعد پریسیڈنسی کالج کے پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے تو کرنول کے طلبہ ان کے پاس پہنچتے اور مثل اولاد ان پر اپنا حق جتاتے اور وہ بڑی فراخ دلی اور خوشی کے ساتھ اس کو پورا کرتے تھے۔ اپنے ان دونوں کالجوں میں خود جو کچھ کرسکتے تھے وہ تو کرتے ہی تھے لیکن اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں وہ دوسرے کالجوں کے پرنسپلوں اور سربراہوں سے بھی کام لیتے تھے اور وہ لوگ آپ کے احترام میں ان کی خواہش پوری کرتے تھے۔ کرنول میں انٹرنس کے بعد تعلیم کے لیے کوئی کالج نہیں تھا۔ بہت سے لڑکے باوجود شوق مگر ناداری کے سبب، دوسرے مقامات پر جاکر اپنے شوق حصول علم کو پورا کرنے سے مجبور تھے۔ ڈاکٹر صاحب اس صورت حال سے بے حد متفکر تھے اور کوشاں تھے کہ کرنول میں بھی اونچی تعلیم کی آسائشیں میسر ہوں تاکہ یہاں کے لڑکے بھی گھر کی دال روٹی کھا کر تعلیم حاصل کرسکیں۔ ان کی خواہش تھی کہ کرنول کے گھر گھر میں گریجویٹ ہوں اور بالآخر آپ کی سعی و کوشش بار آور ہوئی اور ۱۹۴۷ء میں کرنول میں پہلا عثمانیہ کالج کے نام سے ایک فرسٹ گریڈ کالج کھولا اور اس کا الحاق مدراس یونیورسٹی سے کرایا۔ جس سے ہزاروں طلبا فارغ ہوکر نکل چکے ہیں اور یہ کالج ناموری کے ساتھ برابر ترقی پذیر ہے۔ اسی کے ساتھ آپ نے ۱۹۵۲ء میں ٹیچر ٹریننگ کالج اور ۱۹۵۳ء میں طبیہ کالج کھول کر اس علاقے کی ایک بڑی اہم طبی ضروریات کو پورا کیا یہاں سے فارغین کی کھیپ کی کھیپ نکل کر انسانوں کی طبی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ کالج سے متعلق ایک یونانی دواخانہ بھی کھولا تھا جہاں سے نادار مریضوں کو مفت دوائیں دی جاتی ہیں۔ حکومت مدراس کی جانب سے ایک تعلیمی نصاب مرتب ہوا جس میں علوم شرقیہ کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی تعلیم بھی لازمی تھی۔ اس نصاب کی تیاری میں ڈاکٹر صاحب نے بڑی دلچسپی لی اور خود شریک ہوکر اس میں بہت سے ضروری مفید مضامین شامل کرائے۔ اس کے لیے نئے نئے مدارس 'اورینٹل ہائی اسکول' قائم کرنے ضروری تھے۔ چنانچہ آپ کی کوشش سے سب سے پہلا اورینٹل ہائی اسکول، کرنول میں کھولا گیا۔ جس میں عربی، فارسی اور اردو کو فرسٹ لینگویج بنا کر اس کے ساتھ کورس کے مطابق، انگریزی، حساب، سائنس اور سوشل اسٹڈیز وغیرہ مضامین کو شامل نصاب کرکے تعلیم کو فروغ دیا جارہا ہے اور اس کو یہ حیثیت دی گئی کہ اس کے فارغین کو دوسرے ہائی اسکول کے فارغ طلبا کی طرح کالجوں میں نشستیں ملتی ہیں۔ حتیٰ کہ پبلک سروس کمیشن کے امتحانوں میں شرکت کا بھی استحقاق حاصل ہے۔ اس کے علاوہ کرنول میں میڈیکل کالج اور گرلز کالج بھی ہے اور اس میں اردو کا شعبہ بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کوشش

ے مدراس میں نیو کالج، جمال محمد کالج ترچناپلی میں اور بادشاہ انڈیا ایجوکیشنل ٹرسٹ کے تحت مدراس میں ایک عظیم الشان گرلز کالج بھی ہے۔ اول الذکر اور آخر الذکر کالجوں کے قیام میں ڈاکٹر عبدالحق کو جسٹس بشیر سعید کا قیمتی تعاون حاصل تھا۔ اس ایجوکیشنل ٹرسٹ کی چیرمین اور کالج کی سکریٹری بیگم جسٹس بشیر سعید تھیں۔ راقم سے جسٹس بشیر سعید نے فرمایا تھا کہ گرلز کالج میں کئی ہزار طالبات زیر تعلیم ہیں۔ موصوف نے یہ کالج بھی راقم کو دکھلایا تھا اور نیو کالج بھی۔ ڈاکٹر عبدالحق عرصہ تک مدراس یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے بڑے فعال اور موثر ممبر بھی تھے چنانچہ ان کی دلچسپی اور کوششوں سے پریسیڈنسی کالج مدراس میں اسلامک ہسٹری کا آنرز کورس جاری ہوا۔ اس کورس کی افادیت کی بنا پر بہت سے طلبا نے اس کورس کو اختیار کیا۔ ملک کی آزادی کے بعد اس کورس کی اہمیت ظاہر ہے کتنی قابل قدر ہے۔ اس کورس کو جاری کراکے ڈاکٹر صاحب نے بڑی دانش مندی کا ثبوت دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی نیک نامی، بے لوث خدمت، خوش خلقی اور تعلیمی میدان میں ان کی کامیاب سرگرمیوں کے اعتراف میں کرنول کے عثمانیہ کالج میں، ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی عظیم شخصیتیں پہنچیں اور ڈاکٹر صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ۱۸۹۶ء میں ان کے والد گرامی نے کرنول میں دینی اور عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ اسلامیہ عربیہ قائم کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی کوشش سے بعد میں اس کا مدراس یونیورسٹی سے الحاق ہوگیا۔ چنانچہ اس کے فارغین کو مدراس یونیورسٹی سے افضل العلما، منشی فاضل اور ادیب فاضل کی سندیں ملنے لگیں۔ اس تعلیمی چشمے سے سیراب افراد جنوبی ہند کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے اور اطراف واکناف میں دور دور علم کی روشنی پھیلانے میں مصروف ہیں۔ اس درس گاہ کی وجہ سے بھی کرنول کو جنوبی ہند میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے اصرار اور خواہش پر یہاں مولانا حسین احمد مدنیؒ تشریف لائے اور تین دن تک اس درس گاہ میں بخاری شریف کا درس دیا۔ مولانا مدنیؒ کے علاوہ مولانا عبدالسلام دریابادی اور مصری علما نے بھی اس درس گاہ میں آکر اس کو رونق بخشی اور آپ کی خدمات جلیلہ کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور خراج عقیدت پیش کیا۔ ۱۹۴۳ء میں گورنمنٹ محمڈن کالج کا جشن سیمیں منانے کا ڈاکٹر صاحب نے اہتمام کیا۔ اس میں اسلامی ثقافت کی ایک نمائش بھی تھی۔ یہ نمائش نہ صرف مدراس بلکہ قرب وجوار کے علاقوں کے لیے بالکل انوکھی تھی۔ اس نمائش کی وجہ سے اسلام کے متعلق جو فاسد خیالات لوگوں کے ذہنوں میں تھے وہ دور ہوئے۔ قدیم مسلمان فضلا کی حکمت ان کا تبحر ان کی تحقیق وانکشافات اور ایجادات، تصاویر چارٹ اور ماڈل کے ذریعے نمایاں کیے گئے تھے۔ اس سائنٹفک انداز اپروچ نے بڑا اثر کیا اور ان کے ذریعے عوام اور پڑھے لکھے لوگوں پر یہ ظاہر ہوا کہ وہ قوم جس کو مطعون کرنے کے لیے پوری دنیا خصوصاً مغرب اور اہل ہند) کوشاں اور پیش پیش رہے۔ اس قوم کے کتنے احسانات عظیم دنیا والوں پر ہیں۔ جس سے کوئی منصف مزاج انکار نہیں کرسکتا مگر ہٹ دھرمی کی بات دوسری ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق کا طالب علمی کے زمانے سے یہ خیال تھا کہ وہ معلمی کا قابل احترام پیشہ اختیار کریں گے اور اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے اپنی پوری صلاحیت اور توانائی صرف کی۔ اس سلسلے میں خود ان کا بیان کردہ ایک واقعہ لائق ذکر ہے۔ ان کی طالب علمی کے زمانے میں ملک کی آزادی کا چرچا زبان زد عام تھا

وہ انگریزوں کے خلاف زوردار تقریر کرتے تھے۔ گریجویٹ ہونے کے بعد کرنول میں مقیم تھے۔ انگریز کلکٹر نے ان کی زباں بندی کے لیے یہ ترکیب نکالی کہ ان کو بلا کر دو سو روپے ماہوار کی ایک ملازمت کی پیش کش کی۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ ملازمت اور تنخواہ معقول سمجھی جاتی تھی۔ لیکن انھوں نے اس پیش کش کا شکریہ ادا کیا اور صاف لفظوں میں اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ "میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ معلم بنوں گا"۔ انگریز کلکٹر نے طنزاً کہا کہ "چالیس روپے ماہوار کی ملازمت کروگے؟" اس وقت گریجویٹ استاد کی یہی تنخواہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "خدا معلمی میں جو بھی دے گا لے لوں گا"۔ چنانچہ اپنے عزم و حوصلے کے مطابق انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس میں عربی کے پروفیسر ہو گئے۔ وہ بہترین مقرر بھی تھے۔ ان کی تقریر بڑی پرمغز مربوط، موثر اور دلنشیں ہوتی تھی۔ تقریر میں ذرا بھی الجھاو اور انتشار نہیں ہوتا تھا۔ موضوع ہمیشہ ان کی گرفت میں رہتا تھا۔ ان کو قدیم اساتذۂ فن کے بے شمار اشعار ورد زباں تھے جن کو برمحل استعمال کرنے پر قادر تھے تقریر کے وقت ایک دلآویز مسکراہٹ نمایاں رہتی تھی۔ ڈاکٹر عبدالحق کو ذاکر صاحب نے بحیثیت پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی میں بلا لیا تھا۔ ذاکر صاحب ان کے علم و فضل کے حقیقت آشنا اور بے حد قدردان تھے اور جب ذاکر صاحب امریکہ گئے تو عبدالحق نے وائس چانسلری کی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے والد مرحوم کے قائم کردہ اسلامیہ عربی کالج کرنول کے جشن الماسی منانے کی طرح ڈالی اور دسمبر ۱۹۵۵ء میں اس جشن میں رنگا رنگ تقریبات کا اہتمام کیا۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس انجمن ترقی اردو ہند کانفرنس، دینی تعلیم کانفرنس، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، قرأت کا جلسہ اور آل انڈیا مشاعرہ وغیرہ منعقد کیا۔ ان کے اثر و رسوخ اور تعلق کی وجہ سے علما، ادبا، اطبا اور شعرا اس جشن کی تقریبات میں شریک ہوئے اور خاص بات یہ تھی کہ ہر کانفرنس سے متعلق برگزیدہ شخصیتوں نے اس تقریب میں شرکت کی تھی جس سے ان کانفرنسوں کی اہمیت اور وقار مجموعی طور پر بہت بلند ہو گیا اور یہ کانفرنسیں اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے بے حد کامیاب ہوئیں۔ ہز ہولی نس ملّا طاہر سیف الدین چانسلر مسلم یونیورسٹی نے اس جشن الماسی کے جلسۂ افتتاحیہ کی صدارت کی اور صوبے کے گورنر نے اس کا افتتاح کیا۔ ڈاکٹر صاحب ہر کانفرنس کے جلسوں کی مناسبت سے برمحل اور فی البدیہہ استقبالیہ تقریر فرماتے تھے۔ خطبۂ استقبالیہ لکھا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ ان کی یہ تقریریں حشو و زوائد سے پاک اور موثر ہوتی تھیں۔ اس سے ان کی وسعت معلومات و ذوق لطیف اور فاضلانہ علمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر موضوع سے متعلق انداز بیان بالکل جداگانہ اور اتنا دلکش کہ سننے والوں پر بار کیا، لطف و سرور حاصل ہوتا۔ راقم خود ان کی تقریروں کا سامع ہے اور جو منظر اس نے دیکھا ہے اس کے بیان سے قلم عاجز ہے۔ اس جشن کے موقع پر انھوں نے ایک نمایش کا بھی اہتمام کیا۔ اس میں میسور، حیدرآباد، گلبرگہ، بیدر اور کرنول کے نوادرات کا ایک بڑا دلکش شعبہ تھا۔ ایک مخصوص ہال میں اسلامی تاریخ اور ثقافت کی سبق آموز جھلکیاں، خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے چوبی حسین و نازک ماڈل جس میں بے شمار برقی قمقمے چکا چوند پیدا کرتے تھے۔ اس کو ایک وسیع ہال میں بلند و بالا پلیٹ فارم پر جگہ دی گئی تھی تاکہ دیکھنے والوں کو دشواری نہ ہو۔ اس کو دیکھنے والوں کا ہر وقت بے پناہ ازدحام رہتا تھا۔ دور دراز علاقوں کے لوگ اس

کو دیکھنے آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس انوکھے تخیل نے نمائش کو ایک طرح سے مذہبی عنوان دے دیا تھا۔ لوگ ایامِ گزشتہ کے کارناموں کو دیکھ کر مسرور و متاثر ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے اصرار اور خواہش کی تعمیل میں اس نمائش میں شرکت کے لیے راقم بھی دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی کی ہزاروں روپیے کی مصنوعات کے ساتھ چند دن پہلے کرنول پہنچ گیا اور اپنی حقیر خدمات موصوف کی خدمت میں پیش کر دیں۔ علی گڑھ کی وجہ سے راقم سے موصوف مانوس تھے۔ اس لیے بخوشی میری درخواست قبول فرمائی۔ اس جشن الماسی کی پوری روئیداد کا راقم بچشمِ خود نیز شریک کار شاہد ہے۔ نوادرات کی نمائش پروفیسر آغا حیدر حسین دہلوی کی زیرِ نگرانی تھی۔ جناب خیر بہو روی ان کے دست راست تھے جن سے راقم کی قدیم و دیرینہ شناسائی تھی۔ آغا صاحب سے یہاں پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ عجیب باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے ان کی گفتگو کا انداز اس درجہ دلچسپ اور دلنشیں ہوتا تھا کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ بلا مبالغہ منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ اس جشن کا پروگرام ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ تقریباً پانچ سو مہمان آئے تھے جن کے قیام و طعام اور ہر طرح کے آرام و راحت کا ڈاکٹر صاحب نے بہت منظم اور معقول انتظام کیا تھا۔ ہر شخص خوش اور مطمئن تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے شفاء الملک حکیم عبد اللطیف مرحوم کو خاص طور پر اصرار کر کے مدعو کیا تھا اور علی گڑھ کے تعلق سے ان کے آرام و آسائش کا خاص انتظام کیا تھا۔ جشن کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے شفاء الملک سے فرمایا تھا کہ "میں نے آپ کو مدعو کر کے آپ سے تعلق اور اعتماد کی بنا پر پریشان حال مریضوں کے معالجہ کے لیے دور دراز اطلاع کرائی تھی کہ ان تمام کانفرنسوں کا ماحصل صرف یہی ایک خدمتِ خلق تھی جو آپ کی دلچسپی اور بے لوث انہماک سے بحمد اللہ پوری ہوئی"۔ اس گفتگو سے ڈاکٹر صاحب کے دردمند دل اور خلق کے لیے شفقت اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے بڑے انکسار اور بے تکلفی سے فرمایا "میں ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اس لیے اس طبقہ کے دکھ درد اور محرومی سے اچھی طرح آشنا ہوں"۔ شفاء الملک نے بھی آرام و راحت سے بے پروا، مریضوں کی طرف پوری توجہ دی اور مشغولیت و انہماک کے باعث کئی اہم جلسوں میں شریک بھی نہیں ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب ان کی مشغولیت کو دیکھتے تو خوشی سے ان کا چہرہ دمک اٹھتا اور نہال ہو جاتے تھے۔ حکیم صاحب مطمئن اور مسرور ہوتے کہ ان کی سعی و کاوش نیک لگی۔

[ باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے ]

"سب یقین جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں اسکول میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہو جائیں۔ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی۔ بعض اضلاع میں اس کا نمونہ قائم ہو گیا تھا"۔

سر سید رحمہ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۔ جلد ۱۱، شمارہ ۴ (اپریل ۹۲)

# دلّی کی بدلتی فضا

محمد اسلم پرویز*

اگر ہم دلّی کے عروج و زوال اور تاریخ کا مطالعہ
ریں تو دلّی ہم کو مختلف ادوار میں نت نئے رنگوں
یں نظر آتی ہے۔ مختلف بادشاہوں نے اسے
ت نئے ناموں سے آباد کیا۔ دلّی کا نام سب سے
ہلے بکرماجیت کے زمانے میں سننے میں آتا ہے۔ اس
رح دیکھیں تو دلّی نام کا شہر تقریباً دو ہزار سال پرانا
ہے اور اگر اندرپرستھ کو سب سے پہلی دلّی مان لیں
اس شہر کی عمر ساڑھے تین ہزار برس ہو جاتی ہے
ن تمام برسوں میں دلّی نے بہت سے دورِ حکومت دیکھے
ہت سی قومیں یہاں آباد ہوئیں۔ کچھ ہجرت کرکے آئ
یں تو کچھ حملہ آور بن کر آئیں اور یہیں کی ہو گئیں۔ اس
قت کی دلّی آج کی دلّی سے بہت چھوٹی تھی اور جب کی
ت تو کیا انیسویں صدی تک دلّی بہت مختصر تھی۔ شاہجہاں آباد
ی فصیلوں کے اندر کل شہر آباد تھا اور یہ شاہجہاں آباد
یری گیٹ، ترکمان گیٹ، کشمیری گیٹ اور لاہوری
یٹ کے اندر واقع تھا۔ اس کے برخلاف اگر ہم آج
ی دلّی دیکھیں تو شاہ جہاں آباد کے عین وسط سے آپ
ی بھی سمت میں تیس کلومیٹر تک چلے جائیں، آپ دلّی
کی حدود سے باہر نہ نکل سکیں گے۔

دلّی کی آبادی میں اضافے کی شروعات اگرچہ بیسویں صدی کے اوائل سے ہوئی تھی لیکن آزادی کے بعد اس میں بے پناہ اضافہ ہوا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ کچھ تو اس کے نام کا جادو اور کچھ اس کے راجدھانی ہونے کی اہمیت۔ دونوں باتیں ملک کے کونے کونے سے لوگوں کو کھینچ کر یہاں لاتی ہیں اور یہ شہر نگاراں اپنی باہیں وا کیے سبھی کو خوش آمدید کہتا ہے، لیکن آبادی میں لگاتار ہونے والے اس اضافے نے آج کچھ ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ ایک مرتبہ پھر دلّی والے ایک بڑے خطرے سے دوچار ہیں۔ تاریخ دلّی ہم کو بتلاتے ہیں کہ دلّی کئی مرتبہ بسی اور اجڑی۔ ہر مرتبہ حملہ آور بیرونی تھے جنھوں نے لشکر کے ساتھ چڑھائی کی۔ آج دلّی والوں کو خطرہ کسی بیرونی حملہ آور کا نہیں ہے۔ قاتل تو ہر شہری کے اردگرد نہ صرف موجود ہے بلکہ اس کی سانسوں میں سمایا ہوا ہے۔ دور کی بات نہیں ہے ہم نے اپنے بزرگوں سے ہی سنا ہے کہ ادھر کشمیری گیٹ کے باہر اور ادھر نظام الدین اولیا سے

آگے مغرب کے بعد جانے میں خوف آتا تھا کہ گھنے جنگلوں میں نہ جانے کیا ہو۔ ان ہرے بھرے علاقوں کی جگہ آج کنکریٹ کی عمارتیں اور ڈی۔ ڈی۔ اے کے راہنما نقشے نظر آتے ہیں۔ نئی آبادیوں کو روزگار اور ملک کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے نئے نئے کارخانے اور فیکٹریاں قائم ہوئیں۔ جنھوں نے روزگار کے علاوہ دلی کے عوام کو مقررہ وقت پر سائرن کی آواز اور چمنیوں سے دن رات نکلتا ہوا کالا دھواں عطا کیا۔ دور دراز کے علاقوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے لیے ہزاروں بسیں اور دیگر ذرائع آمد و رفت رائج ہوئے جن سے خارج ہونے والے دھوئیں نے اس شہر کی فضا کو مزید بوجھل کر دیا۔ ان تمام سرگرمیوں کے نتیجے میں جو خوشحالی آئی کچھ اس نے اور کچھ وقت کی کمی اور بڑھتی ہوئی مصروفیات نے دلی کے شہریوں کو کاروں اور اسکوٹروں سے نواز دیا۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ تقریباً دس لاکھ پچھتر ہزار گاڑیاں دلی کی سڑکوں پر دوڑتی ہیں اور ان میں ہر سال اوسطاً پچاس ہزار گاڑیوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان گاڑیوں سے نکلنے والے دھوئیں اور کارخانوں اور ہمارے بجلی گھروں سے خارج ہونے والی گیسوں نے دلی کی فضا کو آج اس حد تک مکدّر کر دیا ہے کہ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے ایک تازہ جائزہ کے مطابق دلی دنیا کا تیسرا ایسا شہر ہے جس کی فضا سب سے زیادہ آلودہ اور غیر صحت مند ہے۔

انکم ٹیکس آفس (I.T.O.) کے چوراہے پر کھڑا ایک ٹریفک کانسٹیبل اپنی چار گھنٹے کی ڈیوٹی کے دوران پچاس ہزار گاڑیوں سے زائد خارج شدہ گیس اور دھوئیں کو اپنے سانس میں سموتا ہے۔ اس عرصے میں اس کو سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے، اس کی بصارت متاثر ہوتی ہے اور وہ آنکھوں اور سینے میں جلن کی شکایت کرتا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر دلی کے بیشتر شہری ان تکالیف کا شکار ہیں۔ پورے ملک کی اوسط کے مقابلے میں دلی میں سانس کی تکالیف بارہ گنا زیادہ پائی جاتی ہیں۔ ان تکالیف کی وجہ یہ ہے کہ گاڑیوں سے خارج ہونے والے دھوئیں میں کاربن کے باریک ذرّات کے علاوہ کئی دیگر زہریلی گیسوں کی آمیزش بھی ہوتی ہے کاربن مونو آکسائیڈ اور نائٹروجن آکسائیڈ جیسی زہریلی گیسیں، جست کے زہریلے مرکبات کے ساتھ اس میں شامل رہتی ہیں۔ صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دہلی انتظامیہ نے گزشتہ سال سے اس مسئلے پر تحقیقات کی ابتدا کرائی تھی۔ اس سال ان تحقیقات سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں ان سے کئی نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اوّل یہ کہ اگرچہ بسوں اور ٹرکوں سے کافی کالا دھواں خارج ہوتا ہے لیکن اس میں زہریلی گیسوں کی مقدار اتنی نہیں ہوتی جتنی پٹرول سے چلنے والی گاڑیوں خاص طور سے دو پہیے اور تین پہیے والے اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں سے نکلنے والے دھوئیں میں ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ دلی کی فضا کو مکدّر کرنے میں بڑا ہاتھ ٹریفک کا ہے اگرچہ کارخانے اور بجلی گھر فضا کو کافی آلودہ کرتے ہیں۔ لیکن اس آلودگی کا اوسط گاڑیوں کے مقابلے میں کم ہے اوسطاً روزانہ گاڑیوں سے ۷۰ ٹن ہائیڈروکاربائن ۸۰ ٹن نائٹروجن آکسائیڈ اور دو ٹن سلفر ڈائی آکسائیڈ خارج ہوتی ہے۔ ان تحقیقات سے ایک اور اہم بات یہ سامنے آئی ہے کہ گاڑیوں سے پیدا ہونے والی کثافت کے لیے بڑی حد تک ان کے ڈرائیور ذمہ دار ہیں۔ اگر وہ صحیح طریقے سے گاڑی چلائیں اور انجن کو ٹھیک حالت میں رکھیں تو کافی حد تک صاف دھواں خارج ہو سکتا ہے۔ گاڑی کو ایک دم ریس دینے اور ایک دم روکنے سے انجن پر زور پڑتا ہے جس کی وجہ سے اس میں پٹرول زیادہ

مقدار میں آجاتا ہے۔ یہ زیادہ مقدار پوری طرح جل نہیں پاتی اور اس طرح آدھا جلا پٹرول اپنی پوری کثافت کے ساتھ فضا میں خارج ہو جاتا ہے۔ اگر ڈرائیور گاڑی ایکسلریٹر روکنے اور ایک دم تیز رفتار سے چلانے سے باز آجائیں تو نہ صرف یہ کہ ان کے پٹرول کی بچت ہوگی بلکہ دھواں بھی صاف نکلے گا۔ اس کے علاوہ اگر گاڑی کے انجن کو اور خاص طور سے اس کے کاربوریٹر اور ایر فلٹر کو صاف اور ٹھیک رکھا جائے تو بھی دھواں صاف نکلتا ہے اور پٹرول کی بھی بچت ہوتی ہے۔ عوام کے علاوہ گاڑیاں بنانے والی کمپنیوں کی بھی ذمّہ داری ہے کہ وہ ایسے انجن بنائیں جن سے کم اور صاف دھواں خارج ہو۔ اس وقت عالمی مارکیٹ میں ایسی تکنیک موجود ہے جو اس سلسلے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ گاڑیوں کے لیے اس قسم کے آلے ہیں جن میں سے اگر دھوئیں کو گزارا جائے تو یہ کافی صاف ہو جاتا ہے لیکن اس آلے میں استعمال ہونے والی دو دھاتیں پلاٹینم (PLATINUM) اور پلیڈیم (PALLADIUM) کافی مہنگی ہیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے دہلی کے آئی۔ آئی۔ ٹی میں تحقیقات جاری ہیں، جن میں ان دھاتوں کی جگہ لوہے کی ایک خاص قسم کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں حکومت کو بھی تبلیغ و تشہیر کے ذریعے عوام کو واقف کرانا چاہیے اور ساتھ ہی ایسے قوانین کی ترتیب دینا چاہئیں جن سے ضرورت پڑنے پر مدد لی جا سکے۔ انتظامیہ کے رخ سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ فی الحال حکومت شہریوں کو واقفیت بہم پہنچانے پر ہی اکتفا کرے گی۔ قانونی کارروائی اور جرمانوں کا دور ابتدا ابھی دور ہے۔ توقع ہے کہ اگلے تین ماہ کے اندر ملک کے کچھ اہم پٹرول پمپوں پر ایسی مشینیں لگائی جائیں گی جو گاڑیوں سے نکلنے والے دھوئیں کا فوری تجزیہ کر کے رپورٹ دے سکیں گی ایسی رپورٹ کی بنیاد پر گاڑی کو چھ ماہ کے لیے سرٹیفیکیٹ دیا جائے گا۔ جن گاڑیوں کے انجنوں کو سدھار کی ضرورت ہوگی انھیں ٹھیک کرانے کا حکم دیا جائے گا۔ یہ جانچ بلا معاوضہ ہوگی۔

دلی کی فضا کو آلودہ کرنے میں کارخانوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ڈی۔ ڈی۔ اے کے ایک جائزے کے مطابق دلی میں ۵۴ ہزار کارخانے ہیں جن میں سے ۵ ہزار عین آبادیوں میں واقع ہونے کی وجہ سے خطرناک ہیں ان میں کیمیکل، پلاسٹک، تیزاب بنانے والے اور نکل پالش کے کارخانے شامل ہیں۔ ان تمام کارخانوں سے کلورین اور سلفر ڈائی آکسائیڈ جیسی خطرناک گیسیں خارج ہوتی ہیں جو نہ صرف ان جگہوں پر کام کرنے والے مزدوروں کے لیے بلکہ آس پاس کی آبادیوں کے لیے بھی خطرناک ہیں اور کسی حادثے کی صورت میں بڑی تباہی لا سکتی ہیں پرانی دلی میں واقع ۲ ہزار کارخانوں میں سے دس فیصد کارخانے ایسے ہیں جن کو آبادی سے باہر ہونا چاہیے۔

آنند پربت کے علاقے میں (جو کہ پہلے ماسٹر پلان میں ہریالی والا علاقہ تھا) اس وقت دس ہزار کارخانے ہیں، جن میں سے ایک ہزار کارخانے خطرناک کارخانوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ نجف گڑھ نالے کے گرد و نواح میں سب سے زیادہ کثافت پیدا کرنے والے کارخانے قائم ہیں۔ جراثیم کش دوائیں بنانے والا کارخانہ اور ایک کھاد بنانے والا کارخانہ بھی یہیں پایا جاتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ جراثیم کش دوائیں بنانے والے کارخانے میں ایسی ہی زہریلی گیسیں استعمال ہوتی ہیں جیسی کہ بھوپال حادثے میں یونین کاربائیڈ کے کارخانے سے خارج ہوئی تھیں۔ کیمیاوی کھاد بنانے والے کارخانے سے تو تھوڑے عرصے قبل گیس خارج بھی ہوئی تھی جس سے اس علاقے کے عوام میں کافی خوف و ہراس پھیل

گیا تھا ۔ آج سے ۲۵ سال جب ماسٹر پلان بنا تھا تبھی کارخانوں کو آبادی سے باہر لے جانے کا پروگرام تھا لیکن آج بھی یہ اپنی جگہ قایم ہیں۔

کوئلے سے چلنے والے بجلی گھر بھی فضا میں کثافت پھیلاتے ہیں۔ دلّی میں راج گھاٹ، اندرپرستھ اور بدرپور میں واقع تینوں بجلی گھر کوئلے پر ہی منحصر ہیں۔ ان میں سے ہر بجلی گھر میں ۲۰۰۰ سے ۲۵۰۰ ٹن کوئلہ جلتا ہے، جس کے نتیجے میں روزانہ تقریباً چھ سو ٹن راکھ فضا میں منتشر ہوتی ہے۔ اندرپرستھ بجلی گھر جو کہ آبادی سے نسبتاً قریب ہے روزانہ ۳۵۰ ٹن راکھ اور دھواں خارج کرتا ہے۔ اس کثیف دھوئیں کے پیدا ہونے کی دو وجوہ ہیں، ایک تو یہ کہ جو کوئلہ ان کو فراہم کیا جاتا ہے اس میں راکھ کا تناسب زیادہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ ۴۵ فی صد تک جا پہنچتا ہے۔ اس کوئلے کے جلنے میں سلفر ڈائی آکسائیڈ گیس زیادہ نکلتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دھوئیں کو پوری طرح صاف کر کے خارج کرنے میں ابھی تک کامیابی نہیں ہوتی ہے۔ دھوئیں سے کوئلے اور راکھ کے ذرّات الگ الگ کرنے کے لیے جو آلے اندرپرستھ بجلی گھر میں لگائے بھی گئے تھے وہ پوری طرح کام نہیں کر رہے ہیں۔

آلودگی اور کثافت پیدا کرنے والی ان تمام وجوہ کی بنا پر دلّی کی فضا میں زہریلی گیسوں اور کوئلے کے ذرّات کی مقدار کافی بڑھ گئی ہے۔ زہریلی گیسیں اور مادّے انسانی صحت کے لیے نہایت مضر ہیں۔ اس کی وجہ سے آنکھوں اور سانس کی بیماریوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ایک جائزے کے مطابق اندرپرستھ کے بجلی گھر کے اردگرد ۱ کیلو میٹر کے دائرے میں رہنے والے لوگ سانس کے امراض کے زیادہ تر شکار ہیں۔ ان کے علاوہ ان ذرائع سے خارج ہونے والی سلفر ڈائی آکسائیڈ گیس فضا میں اگر ایک مقررہ مقدار سے زیادہ جمع ہو جائے تو یہ بارش کے پانی کے ساتھ گھل کر تیزاب بناتی ہے۔ ایسی بارش کو تیزابی بارش کہا جاتا ہے جو کہ پیڑوں اور سبھی جانداروں کے لیے نہایت نقصان دہ ہے۔ ان تیزابی بارشوں کا تجربہ سب سے پہلے جاپان کو ہوا تھا۔ ان زہریلی گیسوں کے فضا میں اکٹھا ہونے سے کبھی کبھی گھٹن بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ عمل سردیوں کے دوران خاص طور سے ہوتا ہے۔ کیونکہ سورج کی تپش سے ہوا گرم ہو کر ہلکی ہوتی ہے اور اوپر اٹھتی ہے۔ اگر فضا میں گرماؤ نہیں تو یہ ہوا بھاری ہو کر نیچے ہی رہتی ہے۔ اب اگر اس ہوا میں زہریلی گیسیں بھی شامل ہیں تو یہ آبادیوں کو ایک غلاف کی مانند لپیٹ لیں گی۔ یہ سب واقعات صنعتی سرگرمی کے نتیجے میں ہوتے ہیں۔ آج کے سبھی صنعتی ممالک اپنے ابتدائی دور میں سے گزرے ہیں۔ لند[ن] میں ۱۹۵۲ کی سردی[وں] میں ایسی ہی زہریلی گیس سے بھری دھند نے [...] ہزار افراد کو ہلاک کر [دیا] تھا۔ یہ سب حادثات [ہمیں] کو سبق دیتے ہیں [اور] ایک راہ دکھاتے ہیں۔

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو انھی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگ ایمان دار بھی پائے جاتے ہیں، مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں"

(سورہ آل عمران ۳ - آیت ۱۱)

احتیاط اور بچاؤ کی راہ ۔ کثافت کو قابو میں کرنے کی

ذمہ داری حکومت کی ہے کم از کم اتنی ہی عوام کی بھی ہے۔ عوام کی کثرت اور ان کے افعال کی وجہ سے ہی یہ آلودگی پیدا ہوتی ہے اور یہ سیدھا عوام کی بقا کا ہی مسئلہ ہے۔ دلی میں گاڑیوں کی بڑی تعداد عوام کے پاس ہے۔ وہ دیکھیں کہ ان کی گاڑی فضا کو خراب تو نہیں کرتی۔ جہاں تک کارخانوں کا تعلق ہے تو ان میں سے بھی کافی کارخانے لوگوں کی ذاتی ملکیت ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی فیکٹریوں میں آلودگی کو روکنے والے آلات لگائیں اور ایسے اسباب پیدا کریں کہ فضا کثیف نہ ہو۔ اس سے ان کے مزدوروں نیز اور خود ان کی زندگی بھی محفوظ رہے گی۔ عوام کی طرف سے اس قسم کی پیش رفت نہ ہو تو حکومت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ سخت قوانین بنائے اور ان کو صحیح انداز سے لاگو کرے تاکہ ہم اور آپ سب ہی جس ہوا میں سانس لیتے ہیں، اس میں گھٹ کر نہ رہ جائیں۔

" دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو دنیا میں تنخواہ دار مبلغوں اور تبلیغی مشنوں کے بغیر محض عام لوگوں کے ذریعے پھیلا ہے۔ مسلم تاجر دنیا بھر میں سب سے زیادہ کامیاب مبلغ ثابت ہوئے ہیں۔ اسلام کی تبلیغ کا کام زیادہ تر افریقہ میں عرب تاجروں نے کیا ہے۔ چین میں بھی افریقہ کی طرح اسلام کا ابتدائی داخلہ محض تاجروں کے ذریعے ہوا ہے۔"

سر تھامس
پریچنگ آف اسلام

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱ شمارہ ۴ (اپریل ۹۲ء)

# منڈل کمیشن، سفارشات اور مسلمان

محمد یسین ★

ہندوستان جنت نظیر دنیا کے تمام ممالک میں تاریخی، جغرافیائی، مذہبی اور تہذیبی اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ابتدائی اساطیری و قبائلی دور کے بعد گزشتہ دو ڈھائی ہزار برسوں سے یہاں مختلف ادوار میں شہنشاہیت، جاگیرداری اور نوآبادیاتی نظام حکومت کا چلن رہا ہے۔ انگریزوں سے آزادی کے بعد یہاں جمہوری نظام نافذ ہے اور مقننہ انتظامیہ، عدلیہ، فوج، صنعت و حرفت غرض یہ کہ زندگی کے ہر شعبے میں دستور ہند کی عمل داری ہے۔ آئین کے مطابق ہندوستان میں تمام فرقوں، ذیلی قوموں، زبانوں لسانی و تہذیبی اقلیتوں کو نہ صرف زندہ رہنے کا حق حاصل ہے بلکہ ان کی ترقی و بہبود کے لیے واضح یقین دہانیاں بھی موجود ہیں۔ منڈل کمیشن کی سفارشات دستور ہند کی روشنی میں تعلیم باہم اور سماجی انصاف کے اصول پر مشتمل ہیں۔

یہ بات تو مسلم ہے کہ ملک میں صدیوں تک مختلف تاریخی اور تہذیبی دھاراؤں کے عمل و ردعمل کے باوجود مخصوص مذہبی و سیاسی نظام کے باعث کچھ ذاتوں کو دوسروں پر برتری حاصل رہی ہے۔ ہندو دیو مالا اور اساطیری عقیدے کے مطابق برہما کائنات کے خالق ہیں اور برہمن، چھتری، ویشیہ اور شودر علی الترتیب ان کے سر، بازو، ٹانگ اور پیر کے نچلے حصے ہیں۔ منوجی مہاراج نے "منوسمرتی" میں ورن کے تصور کو مذہبی و سماجی حیثیت دے کر ہر طبقہ کی خصوصیات اور ان کے حقوق و فرائض کی نشاندہی کر دی۔ برہمنی تسلط نے "کرم" (عمل) کے فلسفہ کے مطابق اس تصور کو تقویت پہنچائی کہ آج جو برہمن ہے وہ پچھلے جنم میں اچھے کرموں کی بدولت ہے اور جو شودر ہے وہ اپنے گزشتہ جنم کے کرموں کا پھل بھگتتا ہے۔ اسی عقیدے کے مطابق اعلیٰ طبقہ ہندو اقلیت میں ہونے کے باوجود صدیوں تک درمیانی اور چھوٹی ذات کے لوگوں کا نہ صرف استحصال کرتے رہے بلکہ ان کے حکمراں بھی بنے رہے۔ انگریزی راج میں مغربی تعلیم اور طرز حکومت کے باوجود ہندو کے سماجی ڈھانچہ میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی۔ البتہ آزادی کے بعد دستور ہند میں درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کو تعلیمی، معاشی اور سماجی اعتبار

---

★ پروفیسر، شعبہ انگریزی، اے ایم یو علی گڑھ

سے اوپر اٹھانے کے لیے 22.5% ریزرویشن دیا گیا۔ یہ صد فی صد ریزرویشن کی پہلی قسط تھی جو ہر دس سال کے بعد توسیع پاکر اب بھی نافذ ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ درج فہرست قوموں کے علاوہ ہمارے سماج میں "دیگر پسماندہ طبقے" Other backward classes بھی ہیں جن کی مجموعی حالت تعلیمی، سماجی یا معاشی اعتبار سے بہتر نہیں ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر ۱۹۷۷ء میں جنتا پارٹی کی حکومت نے اپنے دور اقتدار میں چار افراد پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا جس کا مقصد اس بات کی نشان دہی کرنا تھا کہ پورے ملک میں کون کون سے فرقے / طبقے سماجی، تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے پسماندہ ہیں اور انھیں انصاف دلانے کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جاسکتا ہے۔ منڈل کمیشن نے اپنی رپورٹ میں سماجی اور تعلیمی بنیادوں پر زیادہ زور دیا اور اپنے جائزے میں بہت حد تک اقتصادی پہلو کو نظر انداز کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی بنیاد پر "ذات" (caste) کو ہی قانونی اعتبار سے پسماندگی کا معیار تسلیم کر لیا گیا۔ تقریباً دس سال تک مرکزی سرکار نے رپورٹ کے دوررس اثرات کے پیش نظر اسے سرد خانے میں ڈال دیا۔ ۱۹۸۹ء کے الیکشن میں جنتا دل منشور میں منڈل رپورٹ کو شامل کیا گیا تھا اور اسی کے تحت، ۷ اگست ۱۹۹۰ء کو مرکزی حکومت نے سفارشات پر عمل درآمد کے لیے سرکاری اعلان کر دیا۔

## منڈل سفارشات: چند اہم نکات

۱۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں میں دیگر پسماندہ قوموں (O.B.C.) کو ان کی مجموعی 53% آبادی کے نصف یعنی 27% ریزرویشن دی جائے۔

۲۔ ریزرویشن محض ملازمت کے ابتدائی مرحلہ پر ہی نہیں بلکہ آئندہ "ترقی" (Promotion) کے لیے بھی ہونا چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے علاوہ "عوامی زمرہ (Public Sector) صنعتوں"، قومی بینکوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی پسماندہ طبقوں کو متناسب نمائندگی دی جانی چاہیے۔

۳۔ سائنسی و ٹیکنیکی اداروں اور تجارتی تنظیموں میں بھی 27% ریزرویشن ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے تحت ان مخصوص طبقوں کے لیے کوچنگ کلاسز کا اہتمام ضروری ہے۔

۴۔ پسماندہ طبقوں کی معاشی حالت سدھارنے کے لیے الگ مالی ادارے - Financial Institutions قائم کیے جائیں تاکہ ان کو تجارت اور صنعت میں حصہ لینے کا موقع مل سکے۔

۵۔ ریاستی سرکاروں کو زمین کی ملکیت کے بارے میں اصلاحی قوانین - Land Reforms وضع کرنا چاہیے تاکہ زمین جوتنے والوں کو کاشت کاری کے حقوق مل سکیں اور کھیتوں میں کام کرنے والے بغیر زمین کے مزدوروں کو بھی کچھ آراضی دی جاسکے۔

منڈل کمیشن نے پسماندہ طبقوں کے سماجی، تعلیمی اور معاشی معیار متعین کرنے کے لیے گیارہ "اشاریے" (Indicators) مقرر کیے:

الف۔ سماجی اعتبار سے پسماندہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے اعلیٰ طبقے کے لوگ انھیں "نیچ" سمجھیں۔ دیہاتوں میں ان کی کم سے کم 25% عورتیں اور 10% مرد سترہ سال کی عمر سے پہلے شادیاں کرلیں اور شہروں میں کم سے کم 10% عورتیں اور 5% مرد رشتۂ ازدواج

میں منسلک ہوجائیں۔ جس زمرے میں عورتوں کے کام کرنے کی شرح فیصد ملکی اوسط سے ۲۵٪ زیادہ ہو وہ بھی اس خانہ میں شامل ہوسکتا ہے۔

ب) تعلیمی اعتبار سے وہ طبقہ پسماندہ سمجھا جا سکتا ہے جس میں پانچ سے پندرہ سال کی عمر کے بچوں کے اسکول جانے کا اوسط قومی اوسط سے ۲۵٪ کم ہو اور اس عمر کے بچوں کے اسکول چھوڑ دینے کا اوسط ریاستی اوسط سے ۲۵٪ زیادہ ہو۔

(ج) معاشی اعتبار سے پسماندگی ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس ذات/خاندان/فرقہ کی جائیدادوں کی قیمت ریاست کی اوسط سے 25٪ کم ہو یا ان میں کچے گھروں میں رہنے والوں کی تعداد قومی اوسط سے 25٪ زیادہ ہو یا انھیں گھریلو خرچ کے لیے قومی اوسط سے 25٪ زیادہ قرض لینا پڑے۔ ان معیاروں کا تناسب ۳ : ۲ : ۱ ہے۔ یعنی سماجی پسماندگی کے لیے ۳، تعلیمی پسماندگی کے لیے ۲ اور معاشی پسماندگی کے لیے ۱ اشاریہ مقرر ہے۔ کل ۲۲ نمبروں میں جن طبقوں/ذاتوں کو ۱۱ نمبر مل جائیں تو وہ "دیگر پسماندہ طبقوں" میں شامل ہوسکتے ہیں۔

جنتا دل حکومت نے جب منڈل سفارشات کو نافذ کرنے کا اعلان کیا تو شمالی ہند کے طول و عرض میں زبردست ہنگامے برپا ہوئے۔ اگرچہ یہ اعلان بھی خالص سیاسی نوعیت کا تھا مگر اس کے خلاف ردِّ عمل اس پیمانہ پر ہوا کہ خانہ جنگی کے حالات پیدا ہوگئے اور مخالف پارٹیوں کی اشتعال انگیزیوں کے باعث ہڑتال، گھیراؤ، املاک کی بربادی کے علاوہ نوجوان طالب علموں نے خودسوزی کو بھی عین سعادت سمجھا۔ یہ حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد کانگریسی حکومتوں نے گاندھی جی کے تصورات کا "رام راج" قائم کرنے کے بجائے ملک میں ایسا سیاسی و معاشی نظام نافذ کیا جس سے معاشی نابرابری اور سماجی عدم مساوات میں مستقل اضافہ ہوتا رہا۔ مقننہ، انتظامیہ، عدلیہ اور منصوبہ بندی میں اعلیٰ ذات کے انگریزی خواں ہندو افسروں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے دستورِ ہند کے بیشتر دفعات کو قانونی موشگافیوں سے مبہم بنا دیا۔ چنانچہ ملک میں زرعی صنعتی اور تجارتی ترقی سے جو دولت پیدا ہوئی اس پر ان کی اجارہ داری برقرار ہے۔ اگست ۱۹۹۰ء میں جنتا دل کے خلاف کانگریس اور بھارتیہ جنتا پارٹی نے زبردست محاذ آرائی کی مگر سال بھر بعد انھوں نے مرکز اور یوپی میں اپنی سرکار بنا لینے کے بعد پسماندہ طبقوں کے لیے 27٪ اور اعلیٰ ذات کے کمزور لوگوں کے لیے 10٪ ریزرویشن کے اصول کو تسلیم کر لیا۔ منڈل سفارشات کے خلاف سپریم کورٹ میں قانونی جنگ جاری ہے اور مرکز میں موجودہ حکومت "ریڈی رپورٹ" کے باوجود اپنا موقف واضح کرنے میں پس و پیش کر رہی ہے:

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

(۲)

## منڈل سفارشات کے خلاف اعتراضات کی صحیح نوعیت

اکثریتی فرقہ میں اعلیٰ ذات افسروں، وکیلوں، ممبران اسمبلی و پارلیمنٹ، تاجروں، صنعت کاروں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو پسماندہ طبقوں کو دل سے کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں۔ منڈل سفارشات کے خلاف ان کے خاص اعتراضات حسب ذیل ہیں:

منڈل سفارشات کے نفاذ سے ہندوستانی سماج ذات پات کی بنیاد پر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور یہ تقسیم در تقسیم "ورن" (برہمن، چھتری، ویشیہ، شودر) نظام سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو گا۔ اس سے نہ صرف ملک میں انتشار پھیلنے کا اندیشہ ہے بلکہ دستور ہند کی دفعات (4) 16 اور 335 کا تضاد ابھر کر سامنے آ سکتا ہے۔

۱- ریزرویشن پالیسی سے باصلاحیت امیدواروں کی جگہ کم لائق امیدواروں کی بحالی ہو گی۔ اس پالیسی سے چند افراد کو کچھ فائدہ ہو سکتا ہے مگر مجموعی طور پر سماج اور ملک کو نقصان پہنچے گا۔

۲- ملک میں بڑھتی ہوئی بیروزگاری کا شکار تمام فرقے اور طبقے ہیں۔ "سماجی انصاف" کے اصول کو سیاسی مصلحتوں کے تحت چند ذاتوں تک محدود رکھنے سے خانہ جنگی شروع ہو سکتی ہے۔

۴- اسکولوں اور کالجوں میں اس پالیسی سے تعلیمی معیار پر اثر پڑے گا اور طبقاتی کشمکش کے امکانات بڑھ جائیں گے۔

۵- ریزرویشن سے "دیگر پسماندہ طبقوں" کا کوئی خاص بھلا نہیں ہو گا۔ کیونکہ درج فہرست قوموں اور قبیلوں کی طرح وہ بھی حکومت کے طفیلی بن جائیں گے اور ان کے اندر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا جذبہ ختم ہو جائے گا۔

۶- منڈل [illegible] مرحوم قرار

پر مشتمل ہے جس میں تین ہزار دیگر پسماندہ طبقوں (O.B.C) کی صحیح نشان دہی ناممکن ہے۔ غیر سائنسی اعداد و شمار کی بنیاد پر قومی و فلاحی منصوبہ بندی بے سود ثابت ہو گی۔ نیز اس پر عمل درآمد میں کئی طرح کی عملی دشواریاں بھی حائل ہو سکتی ہیں۔

ملک میں سماجی اصلاح کی خواہاں تنظیموں اور سیاسی جماعتوں نے ان تمام اعتراضات کے مدلل جوابات دیے ہیں:

۱- ہندوستان صدیوں سے ذات پات کے خانوں میں تقسیم رہا ہے اور آزادی کے بیتالیس سال بعد بھی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اس حقیقت کو مانتے ہوئے ہمیں "سماجی انصاف" کی خاطر کمزور، پسماندہ اور مفلوک الحال طبقوں کو خصوصی رعایات دینی ہیں۔

۲- باصلاحیت امیدوار محض اعلیٰ ذات کے لوگوں سے ہی نہیں نکلتے بلکہ موقع دیا جائے تو پسماندہ فرقوں اور طبقوں سے بھی باصلاحیت اور قابل طالب علم منتخب ہو کر اعلیٰ ذمہ داریاں سنبھال سکتے ہیں۔ اگر پچھڑی ذاتوں کو کچھ زائد مراعات نہیں حاصل ہوتیں تو "برہمنی اجارہ داری" قیامت تک ختم نہیں ہو گی۔

۳- ملک میں بیروزگاری عام ہے لیکن موجودہ نظام کے تحت مرکزی اور ریاستی سرکاروں مقننہ، انتظامیہ، عدلیہ، پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر اور صنعتی و تجارتی اداروں میں اونچی ذات کے لوگ حاوی ہیں۔ موجودہ [illegible] کے لیے مناسب [illegible]

کے لیے ریزرویشن کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

۴ تعلیمی اداروں میں ریزرویشن پالیسی کو "صلاحیت و قابلیت" کے کم سے کم میاروں کو سامنے رکھ کر ہی نافذ کیا جا سکتا ہے۔ کسی نہ کسی مرحلے پر اگر سلسلۂ جنبانی نہ ہوئی تو ملک میں اندھیرے اجالے کے درمیان تفاوت ناگزیر ہو جائے گا۔

۵۔ درج فہرست اقوام و قبائل کی چالیس سالہ ریزرویشن سے مستفید نہ ہونے کی دلیل ایک حد تک صحیح ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں غلطی انتظامیہ کی ہے۔ کمزور طبقوں کو ابتدائی مرحلے میں داخلے کے لیے ہمت افزائی ضروری ہے۔

۶۔ منڈل رپورٹ کی سفارشات صحیفۂ آسمانی نہیں کہ ان پر غور و خوض یا بحث و مباحثہ ممکن نہیں توسیع تو یہ ہے کہ ان کے نفاذ میں عملی دشواریاں اعلیٰ ذات افسر شاہی اور قانونی موشگافیوں کے ذریعہ پیدا کی جا رہی ہیں۔

۷۔ ریڈی رپورٹ (Reddy Report) جو ۱۹۹۰ء میں مرکزی سرکار کو پیش کی جا چکی ہے، بہت حد تک ان اعتراضات کا ازالہ کر دیتی ہے جن کی بنا پر "سماجی انصاف" کے اصول سے انحراف کا اندیشہ ہے۔ مذکورہ رپورٹ میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ جن امیدواروں کے والدین درجہ اول و دوم ملازمتوں میں ہیں یا جو والدین ڈاکٹری، انجینئری، وکالت، منیجری جیسے اعلیٰ پیشوں میں اپنا مقام بنا چکے ہیں ان کی اولاد کو ریزرویشن نہیں دیا جانا چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ جو والدین انکم ٹیکس یا سیلز ٹیکس ادا کرتے ہیں ان کی اولاد بھی ریزرویشن کی مستحق نہیں۔

(۳)

منڈل رپورٹ اور مسلمان: آزادی کے بعد مجلس دستور ساز نے پسماندہ ذاتوں اور قبیلوں کی سماجی اور معاشی حالت سدھارنے کے لیے دستور میں دفعات 15، 16 اور 46 شامل کیے اور ۱۹۵۱ء میں ترمیم کے ذریعہ 22.5٪ ریزرویشن کو قانونی حیثیت دے دی۔ ان دفعات کے تحت جب ریاستی سرکاروں اور مرکزی حکومت نے عمل درآمد شروع کیا تو اس سے محض ذات کی بنا پر "ہندو" پسماندہ طبقوں کو ہی فائدہ پہنچا۔ اقلیتوں کے لیے اس خانہ میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اگرچہ مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں اور نیو بدھسٹوں میں لاکھوں افراد ریزرویشن کے مستحق تھے۔ سکھوں اور نیو بدھسٹوں نے تو کسی نہ کسی طرح اپنا حصہ لے لیا ہے مگر مسلمان اور عیسائی اب بھی اس حق سے محروم ہیں۔ آزادی کے بعد تقسیم ہند کے جذباتی ردّ عمل کی گونج دستور ساز اسمبلی میں بھی سنائی دیتی رہی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمزور اقلیتوں کے متعلق کوئی واضح قانون نہیں بن سکا۔ افسوس کا مقام ہے کہ تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد بھی اکثریتی طبقے کے نام نہاد دانشوروں کا مسلمانوں کی طرف سے دل صاف نہیں ہوا ہے۔ مشہور ماہر قانون جسٹس ایچ۔ آر کھنہ نے ۱۳/۱۴ ستمبر ۱۹۹۰ء کے "ہندوستان ٹائمز" میں اپنے مضمون (Weakening the Roots) میں اس ذہنیت کی ترجمانی کی جس کے مطابق مسلمانوں کے ساتھ انصاف ہندوستانی قومیت کے لیے خطرہ ہے:

" ریزرویشن کے سلسلے میں پسماندہ طبقوں کے علاوہ کچھ مذہبی اقلیتوں کو بھی ریزرویشن دیے جانے کا چرچا ہو رہا ہے لیکن یہ اقدام خودکشی کے مترادف ہوگا ہمارے قومی لیڈروں نے ذات پات کو ختم کرنے کے لیے مردم شماری کے کاغذات

میں اس خانہ کا اندراج بند کرادیا اور
مجالس قانون ساز میں نمائندگی کے لیے
الگ حلقۂ انتخاب کو بھی ختم کرادیا۔ اب
جنتادل سرکار کے نئے اقدامات سے
سارے کیے کرائے پر پانی پھر جانے کا
اندیشہ ہے۔"

فاضل مضمون نگار سے ہمیں کوئی خاص شکایت نہیں لیکن وہ اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے کہ آزادی کے بعد آج تک اسمبلی یا پارلیمنٹ کے لیے ممبروں کے انتخاب میں "ذات پات" کی ہی اہمیت رہی ہے کانگریس جو کبھی متناسب نمائندگی Proportional representation کی مخالف تھی ذات اور ذاتوں کی بنا پر قانون ساز ایوانوں کو سجا رہی ہے۔ مسلمانوں کو ریزرویشن سے محروم رکھنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کی حیثیت متعین کرنے کے لیے تعلیمی، سماجی اور معاشی عوامل کے علاوہ "دوسرے معیار" ہیں۔

مسلمانوں کی پسماندگی ثابت کرنے کے لیے ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار اور ۱۹۸۶ء کی نئی تعلیمی پالیسی کے نکات کافی ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ اگرچہ ملک میں ان کی آبادی ۱۲٪ ہے مگر تعلیمی اعتبار سے وہ درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں اور نیو بدھوں سے بھی پیچھے ہیں۔ "قومی آواز" (۲۱ ستمبر ۱۹۹۰ء) کے ایک مضمون "منڈل کمیشن رپورٹ" میں مسلمان مردوں کی شرح خواندگی ۲۸٪ اور عورتوں کی ۴٪ بتائی گئی تھی۔ اس طرح مسلمان اپنے دوسرے ہم وطنوں کے مقابلہ میں دس گنا پیچھے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد مال دار، تعلیم یافتہ اور ممتاز پیشوں کے مسلمان پاکستان ہجرت کر گئے اور زمین داری خاتمہ اور سرکاری ملازمتوں میں مناسب نمائندگی نہ ملنے سے ان کی معاشی حالت ابتر ہوتی گئی۔ جمہوری نظام کے باوجود لوک سبھا اور ریاستی اسمبلیوں میں مسلمانوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے بہت کم ہے۔ لہٰذا ان کے حق میں آواز اٹھانے والے کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔

منڈل کمیشن رپورٹ کے مطابق "دیگر پسماندہ طبقوں" میں مسلمان بھی شامل کیے جا سکتے ہیں لیکن ان طبقوں کی طویل فہرست کے مطابق ریزرویشن میں ان کا حصہ عشر عشیر بھی نظر آتا ہے۔ ایک طرف دستور کی دفعات ۱۵ اور ۱۶ کا اطلاق ان پر نہیں ہوا تو دوسری طرف "منڈل رپورٹ" کے باوجود انہیں کچھ ملنے کی امید نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ارباب حل و عقد نے مصلحتاً مسلمانوں کو "اونچی ذات" میں شامل کر لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت مزدور اور پیشہ ور طبقوں ـــ جولاہا، دھنیاں، قصاب، بڑھئی، سنار، حلوائی، موچی، درزی، بھشتی، کنجڑا وغیرہ میں منقسم ہے۔ موجودہ ہندوستانی معیار سے بھی یہ خواندہ یا خوش حال نہیں کہے جا سکتے۔ نام نہاد اونچی ذات کے مسلمانوں میں چند مستثنیات کے علاوہ بیشتر لوگ پس ماندہ ذاتوں میں ہی شمار ہو سکتے ہیں۔

راقم الحروف کے خیال میں اب تک مسلمانوں کو ریزرویشن نہ ملنے کے حسب ذیل اسباب ہیں:

۱۔ سابقہ مرکزی سرکاروں کی دو عملی جس کے تحت مسلمانوں کو ان کے آئینی حقوق سے محروم رکھا گیا مگر فرقہ پرست پارٹیوں کا ہوا کھڑا کر کے انہیں ووٹ بینک کے طور پر استعمال کیا گیا۔

۲۔ مسلم لیڈروں کی گمراہ کن قیادت جو فروعی معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتی

رہی ہے مگر روٹی روزی کے مسائل سے بے نیاز رہی۔

۳۔ ریاستی اسمبلیوں اور پارلی منٹ میں مسلمان نمائندوں نے بے عملی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے نزدیک ملی ہمدردی کے مقابلے میں پارٹی وفاداری زیادہ اہم ہے

۴۔ ہمارا اپنا نہ کوئی اخبار ہے جو ایمانداری اور معروضی طور پر مسلمانوں کی سفارش کرے اور نہ مسلمان صحافیوں کی آواز کوئی اہمیت رکھتی ہے۔

۵۔ اکثریتی طبقہ میں فسطائی عناصر کے نزدیک ریزرویشن کی مانگ "راشٹر وردھی" تحریک کا پیش خیمہ ہے۔ شدید مخالفت کے پیش نظر مسلمان "خاموشی" میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔

۶۔ یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں کہ مسلمانوں کو اپنی خستہ حالی کا علم نہیں۔ روزگار دفتروں سے مایوس لوٹنے والے مسلمان امیدواروں کا فیصد اوسط غالباً سب سے زیادہ ہے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں کوچنگ کلاسز سے بھی خاطر خواہ نتائج نہیں برآمد ہوئے ہیں مسلم یونیورسٹی میں گزشتہ دس سال کے اندر کوچنگ سنٹر کا ریکارڈ ناگفتنی رہا ہے۔ اس کی خاص وجہ افسر شاہی اور دفتری نظام ہے۔ البتہ شعبۂ قانون میں منصفی عہدوں کے لیے "ذیلی مرکز" نسبتاً زیادہ فعال ہے۔

ہم ان نام نہاد مسلم دانش وروں کے بلند بانگ دعووں سے اتفاق نہیں کرتے کہ مسلمان اگر محنت کرے تو میدان مسابقت کا ضیغم بن سکتا ہے اور اگر اس میں یہ صلاحیت نہیں تو اسے نا اہلی کی سزا ملنی چاہیے حقیقت یہ ہے کہ سرکاری ملازمتوں میں مقابلہ برابر کے لوگوں میں نہیں بلکہ مضبوط گھوڑوں اور کمزور بکروں کے درمیان نظر آتا ہے۔ مسلم دانش وروں میں معروف ماہر اقتصادیات پروفیسر علی محمد خسرو سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انڈین ایکسپریس (۱۰ ستمبر ۹۰ء) میں منڈل کمیشن کے سیاق میں یہ اہم سوال اٹھایا تھا کہ

> سماجی انصاف کے لیے جو اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ان کا فائدہ صرف منتخب اور درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کو ہی کیوں ہو، اقلیتوں کو کیوں نہیں؟

فاضل مصنف نے "ذات" کی بجائے معاشی بنیاد پر ریزرویشن کی سفارش کی تھی۔

سید شہاب الدین ممبر پارلی منٹ نے ریڈینس (Radiance) میں شائع مضمون Universal Reservation میں حکومت پر الزام لگایا کہ منڈل کمیشن سفارشات کو نافذ کرنے کے سلسلے میں ان تمام ترمیمات کو نظر انداز کر دیا گیا جنھیں "National union of Backward class Scheduled-Castes & Scheduled Tribes" نے پیش کی تھیں۔

مصنف نے خود حسب ذیل تجاویز پیش کیں:

اول یہ کہ مسلمان، سکھ، عیسائی، بدھ اور پارسی وغیرہ تمام مذہبی اقلیتوں کے پسماندہ طبقوں کو متعین معیاروں کے مطابق ریزرویشن دیا جائے۔ اس اعتبار سے مسلمان کئی ریاستوں میں ترجیحی سلوک کے مستحق ہوں گے۔ NUBC نے مسلمانوں کو ملک میں ان کی ۱۲% آبادی کے نصف ۶% ملازمتوں

کا کوٹہ مقرر کیا ہے۔

دوم یہ کہ حکومت اعلیٰ ذات کے لوگوں کے لیے ۷½٪ (۱۵٪ آبادی کے نصف) کوٹہ مقرر کرے۔ عورتوں کے لیے مخصوص طبقوں میں مناسب نمائندگی دی جائے۔

سوم یہ کہ ریزرویشن سب کے لیے مخصوص معیاروں کی روشنی میں کیا جائے مگر یہ ۶۰٪ سے زیادہ نہ ہو۔ بقیہ ۴۰٪ ملازمتوں کے لیے مقابلے کے امتحان ہوں۔

چہارم یہ کہ تمام کوٹہ سالانہ بنیاد پر دیے جائیں اور یہ معاشی بنیاد پر طے کیے جائیں۔

حسب بالا تجاویز کا مطالعہ اگر "منڈل کمیشن" رپورٹ کی روشنی میں کیا جائے اور ان پر ایمان داری سے عمل ہو تو مسلمانوں کے ساتھ بھی انصاف ہو سکتا ہے۔

حکومت کیا کرتی ہے اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا مشکل ہے مگر اس سلسلے میں ہمارے لیے چند اقدامات ضروری ہیں :-

۱- ہمیں مختلف سیاسی پارٹیوں کے سیکولر لیڈروں سے رابطہ کرکے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنا چاہیے اور اپنے حق کے لیے ان کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ مسلمان ممبران اسمبلی و پارلیمنٹ دیگر ہم خیال اور وسیع النظر نمائندوں سے مل کر کچھ کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

۲- اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی اخبارات میں بھی ہمیں اعداد و شمار کی بنا پر ریزرویشن کے لیے اپنی آواز اٹھانی چاہیے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے بھی مسلم دانشور اپنے موقف کو واضح کر سکتے ہیں۔

۳- ظاہر ہے ہم دائمی ریزرویشن کے کچھ زیادہ حق میں نہیں ہیں۔ اگر ہمیں آئندہ بیس پچیس برسوں تک سنبھلنے کا موقع دیا جائے تو شاید ہم خود کوٹے کے بجائے مقابلے کو ترجیح دیں گے۔ اس کے لیے ہمیں سرکاری اور غیر سرکاری مراکز سے استفادہ کرنے کے لیے نوجوانوں کو آمادہ کرنا پڑے گا۔

ہندوستان میں جمہوریت کی ترقی کے لیے آئینی تحفظات کی پاسداری اور بلا امتیاز نسل، ذات و قبیلہ، مذہب و عقیدہ انصاف پسندی لازم ہے کوئی فلاحی ریاست (welfare state) اپنی سب سے بڑی اقلیت کے حقوق کو نظر انداز کرکے "سماجی انصاف" کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

"میری یہ رائے ہے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانے کی یادگاری کے لیے کھود دی جائے کہ اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی کی زبان میں نہ دیے جائیں گے تو کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہ ہوگا۔"

سر سید رحمۃ اللہ علیہ

# خلا میں ہماری پیشرفت

اقبال الدین *

خالق نے مخلوق کو خلا میں پیش رفت کی اجازت دی۔ نہ صرف اجازت بلکہ راستہ بھی بتلایا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ
اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ
اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا
بِسُلْطٰنٍ ۝

نوعِ انسانی کو چودہ سو سال قبل حدود الارض سے نکلنے کا راستہ بتلا دیا گیا تھا مگر اس پر عمل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ ۱۱،۲ کلومیٹر فی سیکنڈ کی Escape Velocity کو حاصل کرنے کے لیے جو Hardware درکار تھا اس کے بنانے میں کئی صدیاں لگ گئیں۔ بیسویں صدی میں نسل آدم نے خلائی تحقیقات میں لامتناہی وسائل صرف کیے۔ مختلف ممالک نے جن میں سوویت یونین، امریکہ، برطانیہ، فرانس، جاپان، چین اور ہندوستان سرفہرست ہیں، کل ملا کر تقریباً انیس سو مصنوعی سیارے خلا میں بھیجے —— اس خلائی مہم میں انسان کا مقصد حدود الارض سے نکلنا صرف ہیجان کے لیے نہیں تھا۔ جب نوعِ انسانی نے لامتناہی دولت حدود الارض سے نکلنے پر صرف کی تب ضروری تھا کہ اس کا فائدہ اس کرے۔ اس لیے اس نے Sensors، Platforms اور آلات کی راہ میں ایجادات کیں۔ نتیجے کے طور پر Remote Sensing Application کی تکنیک (Technology) وجود میں آئی۔

خلا میں ہماری پیش رفت کے لیے ایک ایسا دل خواہ دور رسی سیارہ ہوتا جس کا مدار بہت اونچا بہت اونچا ایسا کہ ساری دنیا کی پوشش کر لیتی اور تکرارِ سلسل چند گھنٹوں کی ہوتی۔ صرف ایسی ہوتی کہ دنیا کے بڑے حصے کی ایک مرتبہ میں قابلِ رویت سے امواجِ رقیقہ کے فول امواج میں منظر کشی ہو جاتی۔ ہماری موجودہ ٹکنالوجی میں ایسا سیارہ ممکن نہیں۔ اس لیے

* ڈائرکٹر ریموٹ سینسنگ ایپلی کیشنز سینٹر، اے ایم یو، علی گڑھ

مختلف کاموں کے لیے متعدد سیارے بنائے گئے
اگر ہم دور سنجی سیاروں کی مرغیبت پر نظر ڈالیں، تب یہ معلوم ہوگا کہ اس خلائی پیش رفت کو نہ صرف ارتقا کے لیے استعمال کیا گیا ہے بلکہ دفاعی اغراض کے لیے بھی۔

اب آیئے ہم اپنے ملک کی خلائی پیش رفت پر نظر ڈالیں۔ ہندوستان نے اپنے خلائی پروگرام کو سائنس اور ترقی کے کاموں پر ہی مبنی رکھا اور دوسرے مغربی ممالک کی طرح دفاعی پروگرام ہماری منزل نہ تھے۔ ہم نے خلائی پیش رفت دنیا کے سامنے تو اپریل ۱۹۷۵ میں پیش کی جب ہمارا پہلا سیارہ آریہ بھٹ (Aryabhata) خلا میں گیا، مگر دراصل کام بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔ اس پیش قدمی کے بعد ملک نے یکے بعد دیگرے خلائی تحقیق میں سنگ میل (Land marks) بنائے۔ بھاسکر ایک اور دو خلائی تحقیق میں ہمارا دوسرا قدم تھے جو جون ۱۹۷۹ اور نومبر ۱۹۸۱ میں خلا میں بھیجے گئے۔ ان سیاروں میں Visible اور Near Infrared طول امواج کے Sensors لگائے گئے جو ٹی وی کیمروں اور تین امواج دقیقہ (Micro Wave) کے Radiometers پر مشتمل تھے۔ ان تجربات سے ہمارے خلائی دوڑ میں میں خود کفیل ہونے کی بنیاد پڑی۔ ہمارا اگلا قدم روہنی (RSD2 اور RSD, Rohini) کے تجربات تھے جو مئی ۱۹۸۱ اور اپریل ۱۹۸۳ میں کیے گئے۔ ان تجربات کا مقصد Satellite Launch Vehicle اور Pay Loads کی جانچ کرنا تھا جو آئندہ مختلف Sensors میں استعمال ہونے تھے۔ ہندوستان نے جب SLV راکٹ شری ہری کوٹا Sriharikota سے داغا تب اس نے ایک تاریخ بنائی۔ ہندوستان اس وقت Power Blocks کے باہر پہلا ملک ہوا جس نے سیارے خلا میں داغنے کی صلاحیت حاصل کی اور اس طاقت کو پا لیا جس سے نوع انسانی حدود ارض سے نکل سکے۔

اس پیش قدمی کے بعد ضروری تھا خلائی تحقیق کو عام ہندوستانی تک پہنچایا جائے اس لیے ہم نے سیارہ ارتباطات Communication Satellite کے لیے کام شروع کیا جس کے نتیجہ ہمارے انسیٹ سیریز (INSAT Series) کے سیارے ہیں ان کا استعمال ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں جیسے ملک میں ... لمبی دوری کے Telephone Circuits نظام موسمیات کی تصاویر، طوفان، برف باری، بارش کی پیشین گوئی سمندر اور بادلوں وغیرہ کا درجۂ حرارت اور دوسری بحری اور بری اطلاعات۔

انسیٹ سیریز INSAT Series کا پہلا سیارہ اپریل ۱۹۸۲ میں خلا میں گیا اس کے بعد سے اب تک تین سیارے ارتباطات کے لیے ہندوستان نے خلا میں پہنچائے ہیں۔ ان سیاروں کو خلا میں داغنے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ ملک اس راہ میں خلائی تجربہ کرلے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۸۱ میں ایک تجرباتی سیارہ ارتباطات خلا میں بھیجا گیا جس کو ہم Apple کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ دراصل Ariana Passenger Pay Load Experiment (APPLE) تھا جو ہندوستان کی ٹکنالوجی سے بنا ہوا ایک ارتباطاتی سیارہ Geo-Stationary Satellite تھا جس کو Ariana کے European Space Agency پروگرام کے ساتھ خلا میں بھیجا گیا۔ ملک اس میں

کامیاب رہا۔ اس کے بعد ہمارے استعمالی سیارے خلا میں پہنچے۔ ان کی بدولت اب ملک میں متوسط دوری کی موسمیاتی پیش گوئی ممکن ہو گی، جو ہندوستان جیسے زراعتی ملک کے لیے ازحد ضروری چیز ہے۔

کسی ملک کی ترقی اس کے قدرتی وسائل کے صحیح استعمال پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لیے ملکی قدرتی نظام کی تنظیم ضروری ہے۔ خلائی تجربات نے قدرتی وسائل کی فہرست اور حساب مہیا کرنے کے لیے نئی راہیں کھولیں۔ خلائی تحقیق اور پروگرام سے ہم اپنے زراعتی وسائل جنگلات زمین کی ساخت، معدنیاتی وسایل ( Glaciers ) پانی جیسے اہم قدرتی وسائل کا صحیح پتہ لگا سکتے ہیں اور وسائل میں وقت کے ساتھ جو تبدیلیاں آتی ہیں ان کی فوری معلومات مل جاتی ہے۔ مثلاً فصل میں اگر کوئی بیماری لگ گئی ہے تو اس کی اطلاع خلائی اعداد و شمار سے لگ جاتی ہے اور بروقت علاج سے فصل ٹھیک کی جا سکتی ہے ہندوستان نے ملکی قدرتی نظام کی تنظیم کے لیے IRS Series شروع کی ہے جس کے تحت کئی سیارے خلا میں بھیجے جائیں گے IRS-1A اور IRS1B، ۱۷ مارچ ۱۹۸۸ء اور ۲۸ اگست ۱۹۹۱ء کو خلا میں داخل ہوئے IRS-1B ہماری خلا میں ۱۴ سال کے اندر بارہویں کامیابی ہے۔

آپ پوچھیں گے کہ وہ ملک جو اپنے آپ کو ترقی پذیر کہتا ہے اور جہاں ایک بڑی تعداد غریبی کی سطح سے نیچے ہے۔ خلائی تحقیق میں کیوں؟ ہم سائنس اور تکنالوجی کو چھوڑ کر غریب بنے اور اب اس کو پکڑ کر ہی غربت کی گہرائیوں سے باہر آ سکتے ہیں۔

> " انسان کی وہ چیز جس سے انسان انسان کہلاتا ہے اور جس کا نام لوگ روح لیتے ہیں مگر اس کی حقیقت کچھ نہیں بتلا سکتے، ایسی شریف چیز ہے کہ کسی کی مملوک ہونے کی لیاقت ہی نہیں رکھتی کیا نتائج قانون قدرت، یا خدا کی روح، یا امر رب، کسی کی ملکیت ہو سکتی ہے؟ کیا ہم سی ہی ایک مخلوق ہماری ملکیت میں آ سکتی ہے، حاشا و کلا! "
>
> سرسید

# انجانے عقیدے اور سائنس

علی عباس ازل ★

آدمی کی تاریخ میں بیسویں صدی اپنے نمایاں تضادات کی وجہ سے ایک دلچسپ باب رہے گی جس میں وہ ستاروں تک اُڑان بھرنے کے لیے پر بھی تول رہا ہے اور جہلی عقیدوں کی بھاری بیڑیاں بھی اپنے پیروں میں ڈالے ہوئے ہے اقبال کا یہ شعر اس کیفیت کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود
نگاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

آج توہمات اور انجانے عقیدے یعنی بے پرکھے مخفی اعتقادات نہ صرف زور پکڑ رہے ہیں بلکہ سائنس کو اب اونچی سطح سے چنوتی بھی دینے لگے ہیں جس کی وجہ سے سائنس کو اس طرف توجہ دینا پڑ رہی ہے۔ یہ اچھی بات ہے۔ اس طرح توہمات اور انجانے عقیدوں کا نفسیاتی اور سماجی وقوعے (Phenomenon) کی حیثیت سے سائنسی مطالعہ ہو رہا ہے۔

مخفی یا انجانے عقیدوں میں جو نفسی محرکات کام کرتے ہیں وہ ہماری قوت تمیز و دلیل یعنی عقل کی بعض بیماریوں کی نمائندگی ذرا ڈراما‌ئی انداز میں کرتے ہیں۔ وہمی عقاید کی تشکیل جن محرکات سے ہوتی ہے وہ عقل کی کمزوریوں سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے عام ذہنی امراض اور ان عقاید کو معین کرنے والے عناصر جتنے مشترک ہوتے ہیں۔ انجانے عقیدوں کے مطالعے سے ان ذہنی بیماریوں کی اتنی ہی وضاحت ہوتی ہے۔ مثلاً ہسٹیریا (Hysteria) اور ہلوسوں (Hallucinations) کے بارے میں جو وہمی اعتقادات ہیں ان کا معروضی مشاہدہ کریں تو ان نفسیاتی امراض کے عناصر یا اسباب کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اس کے علاوہ یہ مطالعہ خود سائنسی عقیدوں کے نظام کو سمجھنے میں مددگار ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ نظام واضح طور پر علم و یقین کی ان کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے ہی بنائے گئے ہیں جو انجانے عقیدوں کی خصوصیت ہیں۔

جہلی عقائد سب سے پہلے تو ان تصورات و خیالات سے بنتے ہیں جو ہمارے گرد و پیش ہیں۔ ہم مقبول عام ذرائع ابلاغ کو بھی مستند مان لیتے ہیں۔ مثلاً آج کل طالب علموں میں ان عقائد کی تشکیل کے جو ماخذ ہیں ان میں "سائنسی میڈیا" بھی ہے جس پر نوجوانوں نے اپنے ذاتی تجربوں اور منطقی دلائل کے بہ نسبت کہیں زیادہ بھروسہ کر رکھا ہے مگر یہ لوگ کسی ایسے ذریعے کا نام

---

★ 6/A، استار مینشن، کرائسٹ چرچ روڈ، بمبئی۔

نہیں بنا پاتے جو واقعی سائنسی ہو۔ مُلّا کی دوڑ مسجد کے مثل یہ لوگ عموماً اس طرح کے غیر ملکی یا ملکی رسالوں مثلاً ریڈرس ڈائجسٹ وغیرہ میں ہی اٹکے رہتے ہیں یا اخباروں میں شائع ہوتے والے ایسے مضامین کا حوالہ دیتے ہیں جو سائنس دانوں کے بجائے نوسکھیے صحافیوں نے سنسنی خیزی یا سائنس کو جان بوجھ کر لوگوں کی نظر میں مشکوک بنانے کے لیے لکھے ہوتے ہیں کہ اب صحافت میں بھی یہ فیشن ہوتا جا رہا ہے۔ سائنس کو حقیر اور "روحانیت" کو اعلیٰ و ارفع بتانے کی بات حالانکہ اب پرانی ہو چکی ہے مگر مذہبی احیا کے ساتھ اس خیال کو پھر سے زندہ کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

عام آدمی کو یہ احساس تو ہے کہ سائنس زیادہ تر انجانے عقیدوں کو سختی سے رد کر دیتی ہے اور وہ خود بھی سائنسی حقائق کو عام طور پر قبول کر لیتا ہے خواہ یہ اس کی وجدانی معلومات کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ مثلاً چاند اور سورج گرہن کے وقوعے یا سیاروں کی سائنسی ہیئت (Astronomy) یا مادے کی ایٹمی ساخت کو وہ مان لیتا ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف وہ سائنس کے حکم و سند کو رواجی عزت بھی دیتا ہے اور دوسری طرف اپنے مخفی عقاید کو برقرار بھی رکھتا ہے۔ اس دوغلی کیفیت کا ایک جواز تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ان میل، بے جوڑ، ناموافق عقیدوں کو بڑی آسانی سے ذہنی خانوں میں بانٹ دیتے ہیں اور مختلف عقیدوں کے بارے میں ایسے سائنسی، مذہبی اور عام عقلی رویے اختیار کرتے ہیں جو آپس میں بالکل اختلافی اور متضاد ہوتے ہیں۔ وقت کی ضرورت کے حساب سے ان میں ہم اسی رویے کو چنتے ہیں جو سب سے زیادہ موزوں و مناسب ہوتا ہے۔

ضرورتیں شخصی یا نجی بھی ہو سکتی ہیں جو ہم کو انجانے عقیدے اپنانے یا ان کی تائید کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مثلاً اپنی عقل سلیم سے کیے ہوئے فیصلے کو سائنس کی سند کے مقابل جائز اور قطعی بتلانے کی ضرورت۔ کسی شخص یا شئے کو قابو میں کرنے کی ضرورت۔ کسی مذہبی گروہ یا جماعت میں شامل ہونے کی احتیاج وغیرہ وغیرہ۔ ایک نہایت دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی غیر عقلی اعتقاد کو برقرار رکھنے کی ضرورت اس قیمت سے زیادہ ہے جو اس عقیدے کو باقی رکھنے کے لیے دینا پڑے گی جو معتقد کے لیے یہ سچائی کہ وہ عقیدہ نامعقول ہے اور اسے سائنس کی کوئی تائید حاصل نہیں ہے بے معنی ہو جاتی ہے تو ایسے انجانے عقیدے قائم رکھنے کے لیے اگر ہمارے ایقان میں اختلاف پیدا ہوتا بھی ہے تو ہم اس کے لیے ایسی کتنی ہی تاویلیں ڈھونڈ لیتے ہیں کہ "سائنس داں تو پہلے سے ہی معمولی متجاوز (Para Normal) وقوعوں کی طرف سے بدگمان ہیں"۔ یعنی سائنس کی آنکھوں پر تعصب کی عینک کا الزام لگا کے ہم جس عقیدے کو ماننا چاہتے ہیں مان لیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرح کی تاویلیں اور جواز اس تناؤ کو بڑی حد تک کم کر دیتے ہیں جو اعتقاد میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس بات کی تشریح مشکل نہیں کہ سائنسی طور پر بہت ترقی یافتہ سماجوں میں بھی انجانے عقیدے ہر طرف کیوں نظر آتے ہیں۔

مذہبی موضوعات کے علاوہ انجانے عقیدوں پر داخلی اور غیر تنقیدی نوعیت کے لکچر اب یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں عام ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سے عام پڑھے لکھے لوگوں پر یہ تاثر ہوتا ہے کہ تعلیم کے مرکزوں نے بھی ان عقیدوں پر اپنی مہر تصدیق

لگادی ہے۔ ہماری ایک پرانی اور مشہور یونیورسٹی میں (کوئی بیس بائیس سال پہلے ہی متجاوز نفسیات (Para-Psychology) کا شعبہ قائم کیا گیا تھا۔ یہ موضوع سماجی حیثیت سے اہم ہے اور اس پر تحقیق و تفتیش ضروری ہے بشرطیکہ کام کا طریقہ سائنسی یعنی معروضی ہو اور جو نتائج برآمد ہوں انھیں ایمان داری کے ساتھ پیش کیا جائے لیکن اگر کوشش یہ ہو کہ پہلے سے مانے ہوئے تصورات اور خیالات کو ہی صحیح بتایا جائے تو یہ علمی بد دیانتی کے سوا کیا ہے۔

جو سائنس داں معمول متجاوز یا ماورائے معمول تصورات و اعتقادات کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں ان کی رسائی عموماً ذرائع ابلاغ تک نہیں ہوتی اور وہ چند سائنس داں جو ان وسیلوں کا سہارا لے کر نمایاں طور پر توہمات کی تردید کرتے ہیں ان پر مخفی عقاید کے خلاف متعصب ہونے اور "روحانی" برادری کے رتھ پر ابھی تک سوار نہ ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے اور انھیں پریشان کیا جاتا ہے۔ مثلاً سائنس داں ڈاکٹر نرسمہا راو (Dr. H. Narasimha Rao) کو بنگلور یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے صرف اس لیے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا کہ انھوں نے جنوب کے "ستیہ سائیں بابا (جو اپنے آپ کو شرڈی۔ مہاراشٹر کے سائیں بابا کا اوتار کہتے ہیں) سے یہ کہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو سائنسی جانچ اور تحقیق کے لیے پیش کریں۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ کسی سائنس داں نے نرسمہا راو کی حمایت میں آواز بلند نہیں کی۔

کچھ سائنس داں خود ہی ترسیل کے ذرائع تک نہیں پہنچنا چاہتے اور نہ ہی پبلک کے سامنے مخفی عقیدوں کے دعووں کو غلط بتانا چاہتے ہیں جیسا کہ نرسمہا راو کے معاملے میں ان دانش وروں نے کیا

مگر کئی سائنس داں خود بھی ان خرافات میں عقیدہ رکھتے ہیں اور باباؤں، سوامیوں اور خود ساختہ بھگوانوں کے عقیدت مندوں کی پہلی صف میں ہاتھ جوڑے نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک دلچسپ مثال کے راوی ڈاکٹر کووُر مرحوم (Dr. A.T. Kuvoor) ہیں جنھوں نے توہمات اور روحانی ریاکاروں کا بھانڈا پھوڑنا اور انھیں بے نقاب کرنا اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا۔ ان موضوعات پر انھوں نے کئی اچھی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ سرکار ہند کے ایک سابق سائنسی مشیر ڈاکٹر بھگونتم (Dr. S. Bhagvantam) کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ وہ مذکورہ بالا سائیں بابا کے مرید تھے اور اکثر اپنے بابا کی روحانی کرامات و معجزات کا ذکر کرتے رہتے تھے کہ کس طرح سائیں بابا ہوا میں سے چیزیں برآمد کر دیتے ہیں۔ کس طرح ان کی تصویر خود بخود بھگتوں کی گود میں آجاتی ہے اور دھونی (راکھ) اپنے آپ ہی سب کو کیسے مل جاتی ہے۔ بھگونتم نے ایک مرتبہ کا قصہ یہ سنایا کہ جاپانی گھڑی ساز کمپنی سیکو کا مالک عظیم سائیں بابا کا یہ معجزہ دیکھ کر کہ انھوں نے ہوا میں سے دو خاص گھڑی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی جو جاپان میں اس کی ذاتی تجوری میں بند تھی بابا کے قدموں میں گر پڑا۔ کووُر نے جب بھگونتم سے اس کرشمے کی تفصیل چاہی تو وہ ٹال مٹول کرنے لگے۔ آخر کار کووُر نے خود سیکو کمپنی کے چیرمین مسٹر حاتوری (Mr. S. Hattori) کو خط لکھ کر دریافت کیا۔ حاتوری نے جواب دیا کہ میں یا میرے اسٹاف کا کوئی ممبر کبھی سائیں بابا سے نہیں ملا اور نہ ہی میرے سامنے ایسا کوئی واقعہ ہوا۔

یہ شری ستیہ سائیں بابا ابھی زندہ ہیں اور ملک کے بڑے بڑے اخباروں اور رسالوں میں ان کی مدح و ثنا میں مضامین لکھے یا لکھوائے جاتے ہیں۔ ویسے سائیں بابا

اب یہ اعتراف تو کرنے لگے ہیں کہ بڑھاپے کی وجہ سے ان کی کراماتی قوتیں سلب ہو چکی ہیں۔ چہ خوب۔ گویا روحانی طاقتوں کے کرشمے دکھانے کے لیے جسم کا جوان ہونا ضروری ہے۔

انجانے عقیدے محض یقین و اعتبار کے طبعی نقائص اور جذباتی ضروریات سے ہی نہیں پیدا ہوتے بلکہ آج سائنس اور تعلیم میں موجودہ رویے اور میلان بھی اعتقادات کو معقول بنانے اور ان کی درجہ بندی کرنے میں مدد دیتے رہتے ہیں۔ اس مسئلے کے کچھ بنیادی پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اول تو یہ کہ ابتدائی مدرسے سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک سائنس کو کبھی ایسا ذریعہ نہیں بنایا جاتا جس کی مدد سے ہم اپنے گرد و پیش کو گہرائی سے سمجھنے کی عادت ڈالیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم اپنی وجدانی فہم کے سامنے سائنسی رویے کو درست نہیں سمجھتا۔ وہ صرف نصابی دباؤ اور سماج کے بعض اثرات کی وجہ سے کچھ ایسے وجدان مخالف اصداق تو قبول کر لیتا ہے جیسے زمین گول ہے اور گھومتی ہے، زلزلے گائے کے سینگ بدلنے سے نہیں آتے بلکہ زیر زمین مادے کی حرکات سے پیدا ہوتے ہیں۔ مادہ ایٹموں سے بنا ہے وغیرہ وغیرہ مگر سائنس چونکہ کسی ایک مخصوص اور اکثر تکنیکی موضوع جیسے طبعیات کیمیا اور حیاتیات وغیرہ کے حوالے سے پڑھائی جاتی ہے اور مذہبی دعوے، انجانے عقیدوں کے دعوے توہمات وغیرہ یا روزمرہ کے مسائل سائنس کی کلاس میں کبھی زیر بحث آتے نہیں اس لیے طالب علم غیر شعوری طور سے سائنس کو یا تو اصداق (Facts) کا مجموعہ سمجھ لیتے ہیں یا ایسا خشک طریقہ کار مان لیتے ہیں جو چند چھوٹے دائروں میں تو استعمال ہو سکتا ہے مگر زندگی کے بڑے پھیلاؤ میں اپنے وجدان پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں ذہنی اور مخفی عقاید کو سائنس کے پلڑے سے باہر مان کر ان کو وہ صرف وجدانی طریقے سے سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے طلبا میں جو یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ

"سائنس بالکل داخلی (subjective) علم ہے نہ تصورات کو پرکھ سکتی ہے نہ ہی ان کے مستند ہونے کی پیش گوئی کر سکتی ہے"

اس کے لیے بھی ہمارے اساتذہ بڑی حد تک ذمہ دار ہیں یا تو وہ سائنس کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے یا اس میں کامیاب نہیں ہو پاتے اور اس طرح طالب علم متضاد فکر اور ژولیدگی (confusion) کے تسلسل کی وجہ فلسفے کو سائنس کے مقابلے میں تجرباتی طور پر (empirically) زیادہ مستند ماننے لگتا ہے۔ یہ سچائی کہ 'سائنس اپنا خیال بدل دیتی ہے'، سائنس کی برائی اور کمزوری سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ دماغ کا کھلا رکھنا اور حقائق کو برابر پرکھتے جانچتے رہنا اور اگر وہ غلط پائے جائیں تو انھیں چھوڑ کر نئی حقیقتوں کی تلاش و جستجو کرنا ہی سائنس کی خوبی اور توانائی ہے اور یہی اس کی تاریخ بھی ہے۔

انجانے عقیدوں کی میکانیت یا عمل (Mechanism) کے مطالعے کا یہ فائدہ بھی ہے کہ ہم سائنس کی خصوصیات کو پہچاننے لگتے ہیں اور سائنس علم حاصل کرنے کا ایسا نظام معلوم ہونے لگتی ہے، جو آزادی طور پر بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ انجانے یا مخفی عقاید کی میکانیت سے گریز یا ان کی تلافی کر سکے۔ مثلاً سائنس نظریاتی طور پر اعداد و شمار

کو اور حقایق کے مواد (Data) کو تو مانتی ہے مگر وجدان (Intuition) کو نہیں مانتی۔ متبادل مفروضے پیدا کرتی ہے اور مقبول مفروضوں کو توڑنے کے لیے باقاعدہ کوشش کرتی ہے، ریاضی کے مطابق شمار کیے ہوئے امکانات کا استعمال کرتی ہے اور سنجیدگی سے خود اپنا امتحان لیتی رہتی ہے تاکہ یہ معلوم ہوتا رہے کہ اقدار و مقاصد اعتقادات یا نظریات کو متاثر کر رہے ہیں یا نہیں۔ یہ سائنس کا بڑا پن ہے اور انسانی ذہن کی حرکیت (Dynamism) کی علامت ہے۔ یہ بات عقیدوں کی نفسیات اور نظام کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی کیوں کہ وہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ کے پاس موجود تھے آپؐ نے ایک مدعی اسلام کے بارے میں فرمایا "یہ جہنمی ہے"۔

جب جنگ ہوئی تو وہ آدمی بڑی بہادری سے لڑا اور زخمی ہوگیا تو آپؐ کو اطلاع دی گئی کہ اے اللہ کے رسولؐ! جس شخص کے بارے میں آپؐ نے جہنمی ہونے کی بات کہی تھی وہ اس جنگ میں بڑی بہادری سے لڑا یہاں تک کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ تو آپؐ نے فرمایا: وہ جہنم رسید ہوا یہ سن کر بعض لوگوں کو تعجب ہوا اور ابھی لوگ اسی گفتگو میں تھے کہ معلوم ہوا کہ اس شخص کو موت نہیں آئی بلکہ اس کو شدید زخم لگا جس کی تاب نہ لا کر رات میں اس نے خودکشی کر لی۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر اس کی خبر دی گئی" تو آپؐ نے فرمایا: اللہ اکبر! اشہد انی عبداللہ و رسولہ! "میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں"۔ فوراً حضرت بلالؓ کو آپؐ نے حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کردو "جنت میں صرف مسلمان داخل ہوگا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ بدکار آدمی کے ذریعے بھی اپنے دین کی مدد کرتا ہے"۔

بخاری۔ حدیث نمبر ۳۰۶۳

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱ شمارہ ۴ (اپریل ۹۲ء)

# تجزیاتی کیمیا

راجہ سلیم انور★

**تعارف:**

مختلف اشیاء کی ہیئتی اور مقداری ساخت معلوم کرنے کے فن اور سائنس کو تجزیاتی کیمیا کہتے ہیں۔ تجزیاتی کیمیا کا تعلق مختلف مرکبات اور آمیزوں کے تجزیے سے ہے کیمیائی تجزیات مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں۔ مرکبات کے نمونوں کو ان کے اجزاء میں تقسیم کرنے کے بعد ان کی شناخت کی جاتی ہے اسے کیفی تجزیہ ۔ (Qualitative analysis) کہتے ہیں۔ پھر ان اجزائے ترکیبی کی مقدار معلوم کی جاتی ہے۔ اس قسم کے تجزیے کو مقداری تجزیہ (Quantitative analysis) کہتے ہیں۔ اس کے بعد اجزائے ترکیبی کی ترتیب اور اصل حالت معلوم کی جاتی ہے۔ اس کو ساختی تجزیہ ۔ (Structural analysis) کہتے ہیں۔

تجزیاتی کیمیا کی دسترس

ٹیکنالوجی کے بنیادی مسائل کو جانچنے کے لیے منصوبہ بندی کرنا اور اُن کی پیمائش کی وضاحت کرنا تجزیہ دان کا کام ہے۔

تجزیاتی کیمیا دان کو علم کیمیا پر دسترس حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ وہ موزوں کیمیائی طریقوں کے انتخاب کے ذریعے بہترین نتائج پیش کر سکے اسے مختلف قسم کے آلات سے واقفیت ہونی چاہیے۔ تاکہ نتائج اور پیمائش کا شماریاتی جائزہ لے سکے۔ آج کل پوری دنیا میں ہزاروں مرد اور خواتین اس میدان میں تحقیق میں مصروف ہیں اور اس طرح عام روزمرہ زندگی کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ تجزیاتی کیمیا داں مٹی اور کچی دھاتوں کی ساخت معلوم کرنے کے علاوہ، خوراک، کھادوں، فولاد، شیشہ سازی، ایندھن، ادویات اور روزمرہ کی بے شمار اشیا کی پاکیزگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کیمیائی ساخت یا پاکیزگی میں معمولی نوعیت کی تبدیلیاں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ مثلاً ادویات کی تیاری کے دوران اجزائے ترکیبی میں کمی بیشی معالجاتی صلاحیت کو متاثر کر سکتی ہیں۔ اس لیے تجزیاتی کیمیا ادویات کی تیاری میں کیفی یا ہیئتی کنٹرول (Quality Control) کرنے میں مدد دیتی ہے اس لیے دوا سازی کے طلبا کا تجزیاتی کیمیا کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی صنعتی اشیاء کا کیفی کنٹرول بھی کیا جاتا ہے۔ مثلاً شکر سازی، کھاد بنانے کے دوران، فولاد کی تیاری، مشروبات سازی سیمنٹ، شیشہ، کاغذ، دیاسلائی، پلاسٹک، مصنوعی

★ شاہراہ لیاقت۔ لاہور۔ پاکستان

ریشوں، پیٹرولیم اور پیٹرولیم کی مصنوعات، دھماکہ خیز مواد کاسمیٹکس وغیرہ۔

## تجزیاتی کیمیا کی وسعت

۱۔ بنیادی تحقیقات: بنیادی کیفی تجزیے کی مدد سے مختلف اشیاء کے اشیائے ترکیبی کی ماہیت معلوم کی جاتی ہے یہ تجزیاتی کیمیا میں بنیادی تحقیقات کا پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرے مرحلے میں مقداری تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ساختی تجزیے کے ذریعے کسی مرکب میں پائے جانے والے ایٹموں کی ساخت یا بناوٹ معلوم کی جاتی ہے۔ اس کی مدد سے نئی ادویات اور دوسرے کیمیائی مرکبات کی تیاری ممکن ہوتی ہے۔ اس طرح تحقیقات کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہوتا ہے۔

۲۔ مصنوعات کا ارتقا۔

مصنوعات کے ارتقا کا انحصار اس کی کیمیائی ساخت اور طبعی خواص کے مابین تعلق پر ہوتا ہے۔ کیمیائی ترکیب کے معلوم کرنے کے بعد ایک نئی چیز تیار کی جاسکتی ہے۔ مثلاً بھرتوں کی تیاری اور رنگتیر سالموں کا ارتقا۔

۳۔ مصنوعات کا کیفی کنٹرول

صنعتی معیار کو برقرار رکھنے کے لیے مصنوعات کا کیفی کنٹرول یکساں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے خام مواد اور مصنوعات کا کیمیائی تجزیہ کیا جاتا ہے اور اس طرح ضرورت کے مطابق مصنوعات میں تبدیلی لائی جاتی ہے اور غیر خالص اجزاء اور ملاوٹ کو کم سے کم کر دیا جاتا ہے یوں ایک خالص اور پاکیزہ چیز تیار ہوتی ہے۔

۴۔ آلودگی کا پھیلاؤ اور کنٹرول

کائنات میں آلودگی پیدا کرنے والے عناصر کی ترسیل اور ان کی مقدار کا تجزیہ ضروری ہوتا ہے اس لیے اُن کا مطالعہ کرنے کے لیے حساس اور درست کیمیائی تجزیہ کیا جاتا ہے۔ تاکہ ماحول کی علیدگی کم کی جاسکے اس طرح کیمیائی تجزیہ اس بین الاقوامی مسئلے کو حل کرنے میں بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

۵۔ تجزیاتی کسوٹی

درست اور قابل عمل تجزیہ مصنوعات کی قیمت اور پاکیزگی قائم رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔

۶۔ طبی مطالعہ

انسانی جسم میں پائے جانے والے سیال مادوں کا تجزیہ کاشف کی اہمیت رکھتا ہے اور اس طرح بہت سی بیماریوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ مثلاً پیشاب میں شکر کی مقدار زیادہ ہوجانے سے ذیابیطس اور خون میں سرخ جسیموں کی کمی سے انیمیا کی بیماری لاحق ہوتی ہے اس طرح حساس ترین تجزیاتی آلات کی مدد سے بیماریوں کی تشخیص بآسانی کی جاتی ہے۔

## تجزیاتی مسایل کا حل

کیفی اور مقداری تجزیات کا تعلق ایک جیسے بنیادی اصولوں پر ہوتا ہے۔

۱۔ طریقۂ کار کا انتخاب

کسی تجزیہ کے لیے یہ ایک بنیادی مرحلہ ہوتا ہے اس کے لیے تجزیاتی مسئلے کا تفصیلاً جائزہ لیا جاتا ہے اس کے بعد طریقہ کار کا انتخاب ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں نتائج کی احساسیت، صحت یا درستگی کے علاوہ اصل اخراجات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً ٹریس عناصر (Trace Elements) کا مقداری تجزیہ ایکسرے فلوریسنس طیف بینی کی مدد سے فوراً کیا جاسکتا ہے لیکن یہ غیر تسلی بخش ہوتا ہے جب کہ جوہری انجذابی طیف نمائی بہت درست نتائج فراہم کرتی ہے لیکن وقت کافی لگتا ہوتا ہے۔

## نمونہ سازی

تجزیہ کرنے کے لیے نمونہ حاصل کیا جاتا ہے اور نمونہ سازی میں اس کے حاصل کرنے کا وقت اور جگہ کا معلوم ہونا ضروری ہے اور یہ بات بھی قابلِ غور ہونا چاہیے کہ وہ نمونہ باقی تمام مقدار کی نمائندگی کر سکتا ہو۔ اس کے علاوہ نمونہ سازی میں عمومی معیار اور طریقہ کار کا واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔

### ۳- ابتدائی عوامل

نمونہ سازی کے بعد مقدار کی پیمائش کی جاتی ہے۔ یہ پیمائش عموماً کمیت یا حجم کی صورت میں کی جاتی ہے۔ اس کے لیے نمونہ پر مختلف عوامل کیے جاتے ہیں۔ مثلاً نمونے کو خشک کرنا، آگ لگانا، حل کرنے اور اسے پاؤڈر بنانے کا عمل وغیرہ

### ۴- انفعالیت

تجزیاتی پیمائش کا تعلق اجزاء کا آپس میں باہمی مداخلت پر ہوتا ہے۔ اس مداخلت کو روکنے کے لیے نمونے کے اجزاء کو الگ الگ کر دیا جاتا ہے اسے انفعالیت کہتے ہیں۔

### ۵- قطعی پیمائش

یہ سب سے تیز اور آسان مرحلہ ہوتا ہے۔ اس میں پیمائش کی قیمت اور کسی نمونہ کی مقدار کے باہمی تعلق کا معلوم ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یعنی اس مرحلے میں نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔

## تجزیاتی اسلوب

۱- حجمی تجزیہ : کسی معیاری متعامل شے اور نمونے کے درمیان عمل کرایا جاتا ہے اور اس میں حجم کی مقدار معلوم کی جاتی ہے۔ مثلاً تیزاب اور اساس کے باہمی کیمیائی تعامل کی مدد سے ان کی حجمی مقداریں معلوم کی جا سکتی ہیں اور اسے تعدیلی عمل کہا جاتا ہے اور اس طریقہ کار کو تیزابی اساسی معائرہ یا ٹائٹریشن کہتے ہیں۔

۲- ثقلی تجزیہ :

اس میں نمونے کو ایک ناحل پذیر رسوب کی شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کا وزن معلوم کر لیا جاتا ہے۔

### ۳- طیف پیمائی

اس میں کسی نامعلوم شے یا نمونہ کی جذب یا خارج شدہ برقی مقناطیسی اشعاعوں کی شدت ناپی جاتی ہے مثلاً الٹرا وائلٹ طیف پیمائی، انفراریڈ طیف پیمائی، مرکزی مقناطیسی گونج طیف پیمائی وغیرہ۔

### ۴- برقی کیمیائی تجزیہ

کسی محلول میں موجود آئنز بارداں کے ارتکاز کے حوالے سے برقی رَو کی پوٹینشل یا مزاحمت کی پیمائش کی جاتی ہے اس میں فیراڈے کے قوانین کا استعمال ہوتا ہے۔

### ۵- ریڈیو کیمیائی تجزیہ

کسی نمونہ سے خارج ہونے والی نیوکلیر اشعاعوں کی شدت کی پیمائش کی جاتی ہے۔ اس لیے اسے ریڈیو کیمیائی تجزیہ کہتے ہیں۔

### ۶- کمیتی طیف پیمائی

کسی مرکب یا نمونے سے حاصل شدہ سالمی حصوں کی فراوانی یا بہتات کی پیمائی کی جاتی ہے۔ اس طرح اس مرکب کا مالیکیول وزن معلوم کیا جا سکتا ہے۔

### ۷- لون نگاری

یہ ایک طبعی کیمیائی عوامل پر مشتمل تجزیاتی طریقہ ہے۔ اس میں کسی دیے گئے آمیزہ کے اجزاء کو علیحدہ علیحدہ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد ان کے خواص کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

تجزیاتی کیمیا میں تحقیقات جدید دور کی اہم ضرورت ہے اور انشاءاللہ نئے طریقوں اور آلات کی دریافت اور ان میں تبدیلی یقیناً انسانی زندگی کے لیے ممد و معاون ثابت ہوگی۔

# جذام

## LEPROSY

محمد طاہر *

جذام کو داء السبع، داء الاسد، سرطان عام، مرض کبریٰ وغیرہ ناموں سے جانا جاتا ہے۔

### وجہِ تسمیہ

جذام کے معنی قطع یعنی کاٹنے کے ہیں چونکہ اس مرض میں مریض کے اعضا یا اس کی نسل یا اس کی عمر منقطع ہوجاتی ہے۔ داء السبع و داء الاسد کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس مرض میں مریض کا چہرہ شیر کے چہرے کی طرح کشادہ ہوجاتا ہے۔ سرطان عام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ مرض تمام بدن پر پھیل جاتا ہے۔ نیز اس کا قرحہ سرطان کی شکل کا ہوتا ہے۔ کوڑھ ہندی زبان میں گندگی و متعفن کو کہتے ہیں۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ اس کے زخموں سے متعفن مواد نکلتا ہے۔

### تعریف و اسباب:

جذام ایک مزمن متعدی مرض ہے جو جرثومۂ جذام (Mycobacterium - Laprae) کے جسم میں سرایت کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور انسان کے ساتھ مخصوص ہے یعنی سوائے انسان کے اور کسی حیوان میں نہیں پایا جاتا ہے۔ جرثومۂ جذام جس کو ڈاکٹر ہینسن نے ۱۸۷۳ء میں دریافت کیا تھا، شکل و شباہت میں جرثومۂ سل کے مشابہ ہوتا ہے اور اس کی طرح یہ بھی تیزاب پختہ ہوتا ہے یعنی جب اس کو ازہیل نیلسن کے طریق پر رنگا جاتا ہے تو پھر اس پر ایسا پختہ رنگ چڑھتا ہے کہ وہ تیزاب گندھک وغیرہ سے بھی نہیں اُڑتا۔ اس لیے اس جرثومہ کو ایسڈ فاسٹ (Acid Fast) یا تیزاب پختہ کہتے ہیں۔ طب یونانی میں اس کا سبب سودا غیر طبعی کو قرار دیا جاتا ہے۔ یہ غیر طبعی خلط خون پر غالب ہوکر اسے اس قابل نہیں چھوڑتا کہ وہ اعضا کے تغذیہ میں صرف ہوسکے اور نہ طبیعت کو اس کی قدرت ہوتی ہے کہ وہ اس مادے کو دفع کرسکے۔ اس لیے کہ یہ نہایت خبیث، مقدار میں زیادہ اور ناقابل دفاع ہوتا ہے اور اپنی ردائیت اور غلبۂ خشکی کے باعث اعضا کے مزاج اور شکل کو بگاڑ دیتا ہے۔ اعضا میں کہیں تشنج اور کہیں گانٹھیں پڑجاتی ہیں نیز ان کی صورتیں بگڑ جاتی ہیں۔ لگتا ہے یہ مرض اعضا کے اتصالات کو فاسد کردیتا ہے جس سے اعضا روح حیوانی کو قبول

---

* ایم۔ ڈی (معالجات) شعبۂ معالجات، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن۔ اے ایم یو علی گڑھ۔

کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ سیاہ ہوکر ٹکڑے ہوجاتے ہیں اور ان سے بدبودار پانی بہتا ہے۔ کبھی یہ وراثتاً ماں باپ سے اولاد میں منتقل ہوجاتا ہے۔ آتشک زدہ مریض اس مرض میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ بدبودار خشک مچھلی کے کثرت استعمال، ناقص و ردی غذاؤں کے کھانے سے حفظ ماتقدم کو صحیح طور پر بروئے کار نہ لانے کی وجہ سے یہ مرض پیدا ہوجاتا ہے۔

جائے وقوع

اس کا تعدیہ عام طور پر دنیا کے اکثر ممالک مثلاً یورپ، افریقہ، ایشیا کے ممالک میں پایا جاتا ہے اور ہندوستان چین، جنوبی افریقہ اور بعض دیگر گرم ممالک میں یہ مرض زیادہ ہوتا ہے۔ دنیا میں اس مرض سے متاثر افراد کی تعداد تقریباً ۲ کروڑ شمار کی جاتی ہے۔

مدت حضانت Incubation Period

تعدیہ لگنے کے بعد فوراً ہی اس مرض کی علامات ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ ۵-۲ سال کے بعد اس مرض کا ظہور ہوتا ہے۔

اقسام:

جذام کی درج ذیل قسمیں ہیں۔

۱۔ جذام درنی یا عقدی
Tuberculoid Leprosy

۲۔ جذام غدری
Lepromatous - Leprosy

۳۔ جذام مشترک یا مرکب
Borderline or Dimorphous - Leprosy

علامات:

۱۔ جذام درنی یا عقدی:

اس قسم کے جذام کا اثر صرف جلد اور غشاءِ مخاطی پر ہوتا ہے۔ ابتدائے عدوی کے بعد مہینوں یا برسوں کوئی علامت ظاہر نہیں ہوتی۔ پھر کچھ عرصے تک محض تکدرِ طبع، سوءِ ہضم، اسہال اور غنودگی کے بعد نمایاں بخار ظاہر ہوتا ہے۔ بخار کے بعد یا بخار کے ساتھ ہی جلد پر سرخ چمکدار، ابھرے ہوئے چٹے (طفحات) ظاہر ہوتے ہیں جو عموماً پیشانی، بازو یا رانوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد ان سرخ چٹوں کے مقام پر چھوٹے چھوٹے سرخ دانے پیدا ہوجاتے ہیں جو آپس میں مل کر اور حجم میں بڑھ کر گانٹھیں اور ابھار بنا دیتے ہیں جو بیضۂ مرغ کے برابر ہوسکتے ہیں۔ پھر ان کا رنگ زردی مائل بھورا ہوجاتا ہے۔ یہ گانٹھیں تحلیل ہوجاتی ہیں اور ان کی جگہ گہرے رنگین نشان رہ جاتے ہیں یا ان میں پیپ پڑ جاتی ہے اور یہ ابھار پھوٹ جاتے ہیں۔ سر اور چہرے کے بال اکثر سفید ہوکر گر جاتے ہیں۔ آنکھیں سرخ اور شکل گول ہوجاتی ہے۔ اس میں اعصاب کے آخری حصے زیادہ تر متاثر ہوتے ہیں۔ کسی کے جسم پر سرخ داغ پڑنے کے بعد اس جگہ گلٹیاں نمودار ہوجانے بجائے جلد کی رنگت سفید ہوجاتی ہے اور وہ مقام بے حس ہوجاتا ہے جسے جذام ابیض کہتے ہیں۔ یہ برص سے زیادہ مشابہ ہوتا ہے۔ آواز بھاری ہوجاتی ہے اور کبھی بیٹھ جاتی ہے جلد بے حس ہوجاتی ہے جسم کے مختلف مقامات پر عضلی تشنج اور عصبی درد ہوتا ہے۔ چہرہ بہت خوفناک ہوجاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں متورم اور بے ڈول ہوجاتے ہیں اگرچہ اس کا مریض سالہا سال تک زندہ رہ سکتا ہے لیکن خون کے متعفن و مسموم ہوجانے کے باعث مریض ہلاک ہوجاتا ہے۔

۲۔ جذام غدری

اس میں مرض کا اثر اعصاب اور مرکز اعصاب پر ہوتا ہے۔ اعصاب کے بعد عضلات متاثر ہوتے ہیں اور عضلات کی کمزوری و لاغری کے بعد نمایاں

استرخا پیدا ہوجاتا ہے جس سے قوت احساس میں فرق آجاتا ہے۔ جلد، عظام اور مفاصل کا تغذیہ بگڑ جاتا ہے اور جلد میں گول سفید زردی مائل دھبے نمودار ہوتے ہیں۔ اکثر ان کا حاشیہ ابھرا ہوا اور ذکی الحس ہوتا ہے لیکن مرکزی حصّہ سوکھ کر سفید اور بے حس ہوجاتا ہے ناک، منہ، تالو کی غشاء مخاطی سرخ و نرم ہوجاتی ہیں جس پر کہیں کہیں گانٹھیں اور ان کے پھوٹنے سے زخم ہوجاتے ہیں۔ تھوک بکثرت نکلتا ہے۔ عضو ماؤف کریہہ المنظر اور بدوضع ہوجاتا ہے۔ اعصاب ماؤف ہوتے ہوکر رسی کی طرح محسوس ہوتے ہیں لیکن ان میں درد بالکل نہیں ہوتا۔ یہ مرض بیس سال یا اس سے زیادہ عرصہ تک قائم رہتا ہے۔ بالآخر عام جسمانی نقاہت یا دیگر عوارض کے باعث مریض ہلاک ہوجاتا ہے۔

### ۳۔ جذام مشترک یا مرکب

اس قسم کا جذام بہت کم واقع ہوتا ہے اس میں دونوں قسم کے جذام کی ملی جلی علامات پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ پہلے کبھی تو جذامی ابھار پیدا ہوکر اعصاب کو متاثر کرتے ہیں اور کبھی پہلے اعصاب ماؤف ہوتے ہیں بعد میں ابھار (ٹیوبرکلز) نمودار ہوتے ہیں اور کبھی دونوں قسم کی علامات ایک ساتھ شروع ہوتی ہیں۔

### تشخیص مرض

ابتدا میں اس مرض کو سورائیسس (Psoriasis) (Eczema) لیوکوڈرما یا برص (Leucoderma) (Eczema) سے تشخیص کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ سورائیسس کے دھبے مثل جذام کے دھبوں کے بے حس نہیں ہوتے اور نہ زیادہ ابھرے ہوئے ہوتے ہیں اور ان پر سے چھلکے اترتے رہتے ہیں۔ برص کے داغوں کے کنارے صاف ہوتے ہیں ابھرے ہوئے نہیں ہوتے اور داغوں کے مقام کی جلد بے حس نہیں ہوتی۔

### اصول علاج

۱۔ جذامی کو تندرست آدمی سے دور کھلی ہوا میں رکھیں۔

۲۔ جب کسی شخص کو یہ مرض ہوجائے تو اس کے مرض کا اعلان کردینا چاہیے اور رہائش کے لیے الگ جذامی بستیوں میں ڈال دینا چاہیے۔

۳۔ زخموں پر پٹی باندھ دیں۔ زخموں سے خارج شدہ مواد، بول و براز میں راکھ وچونا ڈلوا کر دفن کرا دیں۔

۴۔ پاک و صاف رکھیں۔ ہر روز سلفر صابن یا نیم صابن سے غسل دیں۔ صاف کپڑے پہنائیں۔

۵۔ ہلکی اور زود ہضم غذائیں دیں۔

۶۔ ظہور مرض کی ابتدا سے صبح کے وقت نقوع شاہترہ پلایا جائے اور شام کے وقت معجون عشبہ ۷م، عرق مصفی خون (۶ تولہ)، شربت عناب (۲ تولہ) ملا کر دیا جائے۔ بیس اکیس یوم پلا کر ہفت روزہ کا مسہل دیا جائے مسہل کے بعد تبرید کا استعمال کرائیں۔

۷۔ ترطیب مزاج کے لیے ماء الجبن نافع ترین چیز ہے۔

### حفظ ماتقدم

جذامی کو کوئی ایسا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہ دیں جس سے تندرست اشخاص سے میل ملاپ ہونے کا اتفاق ہو۔

### انجام مرض:

اس مرض کا خصوصاً جب کہ ابتدائی علامات کا ظہور ہو مناسب علاج کیا جائے نیز خون کو غلیظ مواد سے پاک و صاف کرلیا جائے تو شفا کی امید ہوسکتی

ہے۔ اکثر حالات میں اس کا انجام خراب ہوتا ہے اور مریض سخت تکلیف کی حالت میں داعیِ اجل کو لبیک کہتا ہے۔

نوٹ

جذامی سے پرہیز کرنے کے متعلق متعدد احادیث موجود ہیں۔ چنانچہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اشخاص سے فرمایا کہ:

"جذامی سے ایسے بھاگو جیسے کوئی شیر سے بھاگتا ہے۔"

نیز ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ پیغمبر آخر الزماں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

"جذامی سے جب بات کی جائے تو درمیان میں ایک یا دو نیزہ کا فاصلہ ہونا چاہیے۔"

# حوالہ جات


۱۔ ترجمہ قانون شیخ بوعلی ابن سینا۔ مترجم حکیم سید غلام حسین کنتوری۔ مطبع نول کشور۔ جلد ۴۔ ۱۲۹۶ھ۔ ص ۹۹-۱۹۶۔

۲۔ مصباح الحکمت، موسومہ بہ دستور العلاج۔ مولفہ حکیم محمد فیروز الدین دار الکتب رفیق الاطبا، اندرون لوہاری دروازہ۔ لاہور، ص ۱۱۴۲

۳۔ مخزن حکمت۔ از ڈاکٹر غلام جیلانی خان جلد اول، طبع ہفتم۔ مفید عام پریس، چٹرجی روڈ، لاہور، ۱۹۳۱ء ص ۱۰۷۶

۴۔ ترجمہ کبیر از حکیم محمد کبیر الدین۔ جلد چہارم دفتر المسیح قرول باغ، نئی دہلی ۱۹۳۶ء ص ۷۷۲

۵- Davidsons: Principles and Practice of Medicine ELBS 15th edition. Printed in Hong kong. 1987.

Medicine for students Golwalla A.F

6. India Printing works 9. Nagindas Master Road Extention Fort. Bombay. 12th edition Page 747.

7. Text book of medicine cecil Loeb 12th Asian Edition Saunders. I.G. Aku. Shoin Ltd. Tokyo.

786

# The future of a self reliant community is in education and MADINA is determined to attain it

MAJLIS-E-SHURA DASTI PARCHA BAFI HERMAIN SHARIFAIN - the parent body of

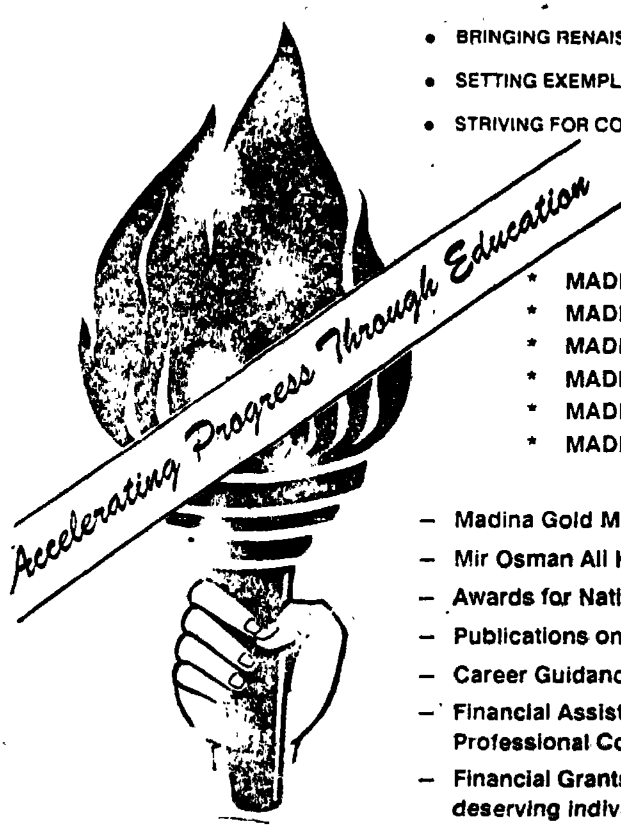
## MADINA GROUP OF INSTITUTIONS, HYDERABAD

proudly celebrate their

## DIAMOND JUBILEE YEAR, 1992

by rededicating themselves to achieve their objectives of :

- BRINGING RENAISSANCE IN THE COMMUNITY
- SETTING EXEMPLARY TRENDS IN THE FIELD OF EDUCATION
- STRIVING FOR COMMUNAL HARMONY




- * MADINA EDUCATION CENTRE
- * MADINA JR. COLLEGE FOR BOYS
- * MADINA JR. COLLEGE FOR GIRLS
- * MADINA PUBLIC SCHOOL
- * MADINA STUDENTS' HOSTEL
- * MADINA I.A.S. HOSTEL

- Madina Gold Medals for Meritorious Students
- Mir Osman Ali Khan Memorial Lectures
- Awards for National Integration
- Publications on Historical Muslim Personalities
- Career Guidance Cell
- Financial Assistance to Students of Professional Courses
- Financial Grants to Charitable Organisations and deserving individuals
- Madina Talent Search Scholarships

**Inauguration of New Projects during Diamond Jubilee Year:**
*Nehru Auditorium, Sir Syed Conference Hall, Madina Medical Centre, Madina Library, Seminars on Education among Minorities and National Integration.*

Madina Education Centre, Public Garden Road, Hyderabad - 500 001. Ph. 237184, 242350

# NOTICE

## ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
## ALIGARH

**Registration of Building Contractors**
**Pre-Qualification for their continuing projects at Aligarh**

---

Leading building contractor having construction experience of of multi storeyed buildings of more than Rs. one crore of civil work of single project construction cost with experience of quality control concrete and are in a position to under take the construction of various hostels, community hall, etc. for Aligarh Muslim University having an estimated cost of approx. Rs. 4.00 crores for different units put together may collect pre-qualification forms from M/s. Bali & Associates, Architects, 10, Jorbagh Market, New Delhi or from University Engineer, Aligarh Muslim University, Aligarh and submit the same duly completed to M/s Bali & Associates Architect latest by April 23, 1992.

The contractors shall visit the site and equip themselves about the existing site conditions, after contacting the University Engineer, Aligarh Muslim University. Aligarh.

The work will be taken up under the direct supervision of M/s. Bali & Associates Architects.

University Project Engineer

No. PA/329/2060/PRO

بانی
سید احمد خاں

THE
MOHAMMEDAN
SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق

جلد ۱۱

شمارہ ۵

مئی ۱۹۹۲ء

سرپرست
پروفیسر محمد نسیم فاروقی
وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر
کبیر احمد جائسی

نائب مدیر
شباب الدین

انچارج سرکولیشن
شفیق احمد

تزئین
مفوانی

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ :
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارہ تہذیب الاخلاق بیت ثقافت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ ، انڈیا
(202002)

ترسیل زر کا پتہ :
مینیجر تہذیب الاخلاق بیت ثقافت
…و مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ

EDITOR,
TAHZIBUL AKHLAQ &
NISHANT,
ALIGARH MUSLIM
UNIVERSITY, ALIGARH.

زر سالانہ : انڈیا Rs.45.00
* بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک
* US $ 8.00 عام ڈاک

PHONE. 24328

# مندرجات






مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد ۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ ۔ پریس: اے ایم یو پریس ۔ علی گڑھ

# اداریہ

**اگر غور سے دیکھا جائے تو دنیا کی تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کا انحصار صرف تائید و توفیق الٰہی پر ہے** ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی عمومی نعمتیں جیسے ہوا، پانی، چاند اور سورج کی روشنی وغیرہ سب کے لیے ہیں اُسی طرح تائید و توفیق الٰہی کی بھی نعمت ایسی ہے جو سب کے حصے میں آسکتی ہے۔ بشرطیکہ انسان سنت اللہ کی پابندی کرتے ہوئے اپنے آپ کو تائید و توفیق الٰہی کا اہل ثابت کر دے۔ اس نعمت الٰہی سے مومن و غیر مومن سب ہی یکساں طور پر فیض پاتے رہتے ہیں جس کا مشاہدہ ہم ہر آن اور ہر لمحہ کرتے رہتے ہیں مگر ہماری کور نگاری اس فیضان الٰہی کو دیکھ نہیں پاتی۔

ہم میں سے کتنے ایسے لوگ ہیں جو گجر دم بیدار ہو جاتے ہیں اور طلوع آفتاب سے پہلے کسی نہ کسی کام کا آغاز کر دیتے ہیں اور اس میں لگ جاتے ہیں، جن لوگوں کو تائید و توفیق الٰہی حاصل ہوتی ہے وہ اپنے رب کی حمد و ثنا کرنے کے لیے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے عبادت گاہوں میں پہنچ جاتے ہیں اور اپنے دن کا آغاز اُس ہستی کی تسبیح و تمجید سے کرتے ہیں جو اس کارگاہ حیات ہی کا نہیں بلکہ پوری کائنات کا خالق و مالک ہے مگر جن لوگوں کو تائید و توفیق الٰہی حاصل نہیں ہوتی اُن کے قدم کبھی بھولے سے بھی عبادت گاہ کی طرف نہیں اُٹھتے۔ اگر ایسے لوگ گھر سے باہر نکلتے بھی ہیں تو کوئی لمبی سیر کے لیے نکل جاتا ہے کوئی کسی میدان میں ورزش کرنے لگتا ہے، کوئی اپنی دکان کھول کر بیٹھ جاتا ہے تو کوئی سنسان جگہ میں دوڑنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ صبح صادق کے وقت آنکھ تو بہتوں کی کھلی، اپنے بستروں کو فوراً چھوڑ دینے والے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں افراد ہیں مگر اپنے رب کی حمد و ثنا صرف ان لوگوں کے حصے میں آئی جن کو اس کی تائید و توفیق حاصل ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ جن لوگوں کو تائید و توفیق الٰہی کی نعمت عظمیٰ حاصل ہے ان لوگوں کو اس بات کی خاص طور سے احتیاط کرنی چاہیے کہ اُن کے اندر کبر، عُجب و غرور اور انانیت جیسے امراض خبیثہ نہ پیدا ہونے پائیں اگر خدانخواستہ تائید و توفیق الٰہی یافتہ لوگوں میں سے کسی کو بھی مذکورہ امراض خبیثہ میں سے ایک مرض بھی لاحق ہو گیا تو تائید و توفیق الٰہی اس شخص سے منہ موڑ لے گی اور وہ شخص زندگی کے تپتے صحرا میں بے یار و مددگار سایے کے لیے

نرستا رہے گا۔

چشمِ بینا کو وا کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت بلا تفریق مذہب و ملت کروڑوں نوجوان حصولِ علم میں مشغول ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے نوجوان ہیں جن کے والدین اپنے افلاس کی وجہ سے ان کو مناسب غذا تک فراہم نہیں کر پاتے۔ مگر یہ نوجوان اپنی فروتنی، انتھک محنت، لگن اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنے کی وجہ سے اس کی تائید و توفیق کے حق دار ہو گئے ہیں اور حصولِ علم کے میدان میں درجہ بہ درجہ آگے بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے ایسے نوجوان بھی ملیں گے جن کے والدین کی مالی حالت قابلِ رشک ہے اور وہ اپنی اولادوں کے لیے روپے پیسے کا فرش بچھا سکتے ہیں مگر چونکہ اپنے باپ کی دولت و ثروت نے ان نوجوانوں کو عجب و غرور اور ہیکڑی کا پیکرِ مجسم بنا رکھا ہے اور وہ اللہ پر نہیں اپنی پارٹی بازی اور قوتِ بازو پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس لیے علم کی دیوی ان سے بہت دور رہتی ہے اور وہ اپنی ثروت و جاہ و شوروہ پشتی کے باوجود جاہل ہی رہ جاتے ہیں۔ ان کا یہ جہل صرف اور صرف اس لیے ہے کہ انھوں نے اپنی کسرِ نفسی، فروتنی اور ایمان بالغیب کے ذریعے اپنے آپ کو اس قابل نہیں بنایا کہ ان کو تائید و توفیقِ الٰہی حاصل ہو۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص تائید و توفیقِ الٰہی سے ہی محروم ہو تو زندگی کے کٹھرے کو بس اس کو زود بھر ہو کر رہ جائیں گے

ہمارے وطنِ عزیز میں اس وقت علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کی تعداد خاصی ہے۔ یہاں بھی روز ہی تائید و توفیقِ الٰہی کے مناظر آنکھوں کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ایک طرف اگر ایک علامۂ دہر، عالمِ بے بدل، افلاطونِ زماں جس کو اپنی ذہنی استعداد، طبیعت کی اختراع، ماخذ تک دسترس کا غرّہ ہوتا ہے مدتوں حاطب اللیل کی طرح زندگی بسر کرتا ہے مگر اس کے ہاتھ وقت کے زیاں کے علاوہ کچھ نہیں آتا تو دوسری طرف ایک اوسط درجے کی استعداد رکھنے والا مگر فروتن، منکسر المزاج اور تائید و توفیقِ الٰہی پر بھروسہ کرنے والا شخص اس کتاب خانے سے ایسی ایسی نادر معلومات ڈھونڈھ نکالتا ہے جن پر کسی اور کی نظر کبھی نہیں پڑی ہوتی حالانکہ اس کتاب خانے میں روزانہ بلا مبالغہ ہزاروں افراد مطالعے کے لیے آتے رہتے ہیں۔ ایسا صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ جو عالم اور جو محقق اپنے آپ کو تائید و توفیقِ الٰہی کا سزاوار بنا لیتا ہے علمی فتوحات اس کا قدم چومتی ہیں اور آنے والی نسلیں اس کی تحریروں کو اپنی آنکھ کا سرمہ بناتی ہیں اور جو علامۂ دہر، عالمِ بے بدل اور افلاطونِ وقت اپنی جولانیِ طبع اور قوتِ بازو پر بھروسہ کرتا ہے، اس کے ہاتھ سوائے وقت ضائع کرنے کے اور کچھ نہیں آتا۔ وہ نامرادی کی زندگی جیتا ہے اور مرنے کے بعد بھی نامراد رہتا ہے اسی لیے ہمارا خیال ہے کہ دنیا کی ساری کامیابیاں اور کامرانیاں صرف اور صرف تائید و توفیقِ الٰہی کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ ہم کو من حیث القوم اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہم اپنی زندگی میں وہ کسرِ نفسی، عجز اور فروتنی داخل کر لیں جو ہم کو تائید و توفیقِ الٰہی کی سزاوار بنا دے اور اس عجب، غرور، نخوت اور قوتِ بازو پر اعتماد کو اپنی زندگی میں نہ داخل ہونے دیں جو ہم کو تائید و توفیقِ الٰہی سے دور کر کے رکھ دے۔

کبیر احمد جائسی

# دین اور دنیا کا رشتہ

سر سید احمد خاں

نجات ابدی جو نتیجہ سچے مذہب یا سچے دین کا ہے وہ دنیا کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں ہے۔ ایک شخص جس نے تمام عمر عسرت و تنگی میں بسر کی ہو اور لباسِ برہنگی کے سوا اور کوئی لباس زیبِ تن نہ کیا ہو اور بناسپتی کے سوا جو کے بن چھنے آٹے کی روٹی کبھی نصیب نہ ہوئی ہو وہ بھی سچے مذہب کی بدولت نجات ابدی حاصل کر سکتا ہے اور جس شخص نے لاکھوں کروڑوں روپیے بطور جائز پیدا اور خرچ کیے ہوں اور محمودی و تن زیب زیبِ تن کیا ہو اور محلوں میں سویا ہو اور باغوں کی ٹھنڈی ہوائیں پھرا ہو، پری تمثال عربی گھوڑوں پر چڑھا ہو وہ بھی سچے دین و مذہب کی بدولت نجات ابدی پا سکتا ہے۔ ہم دنیا میں بے انتہا مذاہب مختلفہ کے لوگ دیکھتے ہیں جن میں بلا شبہ کوئی سچے اصول پر اور کوئی غلط بنیاد اور جھوٹے اصول پر مبنی ہوگا اور ہر مذہب کے لوگوں میں تنگی و فراخی، دولت و مفلسی کو پاتے ہیں، اس لیے یقین کرتے ہیں کہ دنیا کسی کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں ہے مسلمانوں کو اس مضمون پر یقین کرنے کے لیے حضرت ابوذر غفاری رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا حال جاننا کافی ہے جو علانیہ او حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سے فقیہ کے مقابلے میں فرماتے تھے کہ

"واللہ صاحب المال کافر"

مگر دنیا اور دین سے ایسا مستحکم رشتہ ہے جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔ جس طرح کہ بدبختی سے کبھی دنیا دین کو غارت بھی کر دیتی ہے، اسی طرح خوش قسمتی سے دنیا دین کو سنوار بھی دیتی ہے۔ مشہور مقولہ ہے:

پراگندہ روزی پراگندہ دل

اب ان عقلی باتوں کو جانے دو، اس پر تو یقینی سب مسلمان یقین کرتے ہوں گے کہ کسی بندے پر خدا کا غضب دنیاوی امور کے سبب نہیں ہوتا، بلکہ دینی قصور اور نافرمانی اور گناہ و معصیت کے سبب ہوتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ دنیا دار جزا نہیں ہے اور جو گناہ اور معصیت بندوں کی ہے اس کی سزا کے لیے دنیا نہیں باایں ہمہ ہم قرآن مجید میں دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے دینی تقصیرات پر یہودیوں کے ساتھ دنیا میں کیا معاملہ کیا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ قرآن مجید میں یہ فرماتا ہے:

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَ

بَاءُو بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ
النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا
وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ

پس اگر دنیا کو دین کے ساتھ کوئی مستحکم رشتہ نہ تھا تو خدا تعالیٰ نے ہمارے یہودیوں کو دنیا میں ذلیل اور مسکین کیوں کیا؟

اب دوسری طرح پر غور کرو اور ایک خیالی دنیا بناؤ اور یہ تصور کرو کہ ہندوستان میں تمام مسلمانوں کے پاس دولت و حکومت اور منصب نہ رہے، سب مفلس اور نان شبینہ کو محتاج ہوں (جیسا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اُن بدعقلیوں اور بدفہمیوں اور بدنصیبیوں کے سبب جو زمانہ حال میں اُن کے خطوط پیشانی سے پڑھی جاتی ہیں، عنقریب ہونے والا ہے) اور دربدر بھیک مانگتے پھریں۔ ان کی اولاد جاہل اور نالائق، چور اور بدمعاش ہو، واعظین کو جو محض ریاکاری اور مکاری سے دنیا کماتے پھرتے ہیں، کوئی ٹکا دینے والا یا حرام کا لقمہ تر کھلانے والا نہ رہے، جناب پیرجی صاحب جو لوگوں کو مرید کر کر اپنا لشکر بناتے پھرتے ہیں اور سالانہ ٹیکس یا جزیہ اُن پر مقرر کرتے ہیں اور ہر سال اس کی تحصیل میں مصروف ہیں۔ ان کو کوئی دینے والا نہ رہے، یا جناب مولوی صاحب قبلہ جو حدیث و تفسیر یا صدرا و شمس بازغہ طالب علموں کو پڑھاتے ہیں، ان کو کوئی چار پیسے کو نوکر رکھنے والا نہ رہے۔ جیسا کہ اب بھی یہی حال موجود ہے کہ اچھے اچھے مولوی ٹکے ٹکے کو مارے پھرتے ہیں اور نہیں پوچھتا تو اس وقت دین کا حال کیا ہوگا؟

مگر اس کے ساتھ یہ بھی تصور کرنا چاہیے کہ پیٹ ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جاوے خدا ملے یا نہ ملے اس کو بھرنا چاہیے تو ایسی حالت میں مسلمانوں کو پیٹ بھرنے کی تو کچھ فکر کرنی چاہیے گی اور فکر کیا ہوگی، اس کا خیال بڑے دین داروں کی نسبت تو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے گھر چھپری ڈھو رہے ہیں، کسی جنگل میں گھانس چھیل رہے ہیں، کسی پہاڑ پر لکڑیاں چن رہے ہوں گے، کسی کا ٹھوڑا مل رہے ہوں گے اور جو ایسے پکے دین دار نہیں ہیں ان کی نسبت کچھ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ کیا کیا کریں گے۔ معلوم نہیں کہ ان سے جیل خانے اور جزائر تو آباد بھریں گے یا یتیم خانے اور کلیسا رونق پاویں گے۔ پس ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیے کہ دین اسلام کی کیا شان ہوگی اور اس وقت ہم سلام کریں گے اور پوچھیں گے کہ کیوں جناب قبلہ و کعبہ ہم جو مسلمانوں میں دنیوی ترقی و تہذیب، تربیت شائستگی میں کوشش کرتے تھے وہ ہمارا امر معاش میں منہمک ہونا اور ترغیب دینا اور امر معاد کی طرف سے بالکل ذہول اور غفلت کا پردہ ڈالنا تھا یا یہ کام خاص خدا کا اور بالکل دین کا اور سر تا سر معاد کا تھا؟

خدا تعالیٰ نے مذہب اسلام کو عین حکمت بنایا ہے، اس کی بھلائی چاہنے والے کو ضرور ہے کہ وہ بھی حکیم ہو، نہ مکار اور دغاباز، اور حکیم کا یہ کام ہے کہ جو مرض دیکھتا ہے اس کی دوا کرتا ہے۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ امور معاش و تمدن و حسن معاشرت اور علم کی ابتری و خرابی کے سبب روز بروز خراب و ذلیل و حقیر و برباد ہوتے جاتے ہیں اور یہ واعظ و مولوی و پیرجی خدا و رسولؐ کے دشمن اُن کو روز بروز برباد و تباہ کرتے جاتے ہیں۔ پس ایسی حالت میں کہ ہم بخوبی یقین کرتے ہیں کہ وہ، یعنی مسلمان یقینی اپنے مذہب پر پختہ ہیں، خدا کو ایک جانتے ہیں، رسولؐ کو برحق سمجھتے ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو فرض جانتے ہیں، ایک ایک جولاہا بھی ضروری نماز روزے کے مسئلے جانتا

ہے یا ہر طرح پر اس کے جاننے کا سامان یا موقع موجود ہے، مذہب اسلام کے دوست دار کا یہ کام ہے کہ پنے تئیں پیر جی یا حضرت صاحب یا مولوی صاحب کہلانے ور دغا بازی سے دنیا کمانے کے لیے انھیں باتوں کا ن کی ضرورت نہیں ہے بیٹھا ہوا وعظ کہا کرے یا جن کی ضرورت درحقیقت مسلمانوں کو اور خود اسلام کو ہے س کی تدبیر اور کوشش کرے۔

افسوس خدا ہاتھ نہیں آتا، جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں موجود نہیں ہیں ورنہ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر ان کے سامنے لے جاتا اور کہتا:

"او خدا! اور اے جناب رسولؐ خدا!
تم مجھ میں اور ان میں محاکمہ کرو اور بتاؤ
کہ کون تمہارا دوست دار ہے؟ میں
گنہگار یا یہ دین دار"

اور ان شاء اللہ تعالیٰ اگر خدا سچ ہے اور قیامت درست ہے تو یہ معرکہ ہونا ہے، لیکن با ایں ہمہ اگر کوئی مباہلہ پر آمادہ ہو تو میں مباہلہ کو موجود ہوں۔

تعجب کی بات ہے کہ اس بات پر کوشش کرنا کہ مسلمانوں میں قومی ترقی ہو، علوم دینی قایم رہیں، علوم دنیاوی جو مفید و بکار آمد ہیں ان کا رواج اور ترقی ہو، لوگ معاش سے فارغ البال ہوں، اکل حلال پیدا کرنے کے وسیلے ہاتھ آویں، حسن معاشرت میں جو نقص ہیں وہ رفع ہوں، جن بد رسموں اور خراب عادتوں سے غیر قومیں مسلمانوں کو اور اسلام کو حقیر و ذلیل سمجھتی ہیں وہ موقوف کی جاویں، جو خلاف شرع تعصبات و توہمات ہیں اور ہر طرح کی ترقی کے مانع ہیں وہ دور کیے جاویں، ان تمام باتوں کو محض دین داری اور حب قومی سے نہ سمجھنا اور انہماک دنیا کا الزام دینا کس طرح خدا کے نزدیک درست ہوگا۔

باقی رہا اختلاف بعض مسائل میں وہ ایک جدا بات ہے۔ میں جس مسئلے کو حق اور سچ سمجھتا ہوں بلا خوف اس کو کہتا ہوں۔ بقول شخصے

"از خدا شرم دار و شرم مدار"

ان مسائل میں سے جب کوئی مسئلہ کسی صاحب کی تحریر یا تقریر سے غلط ثابت ہوگا مجھ کو اس کا اقرار کرنے اور توبہ کرنے میں ایک لمحے کی بھی خدا نے چاہا تو دیر نہ ہوگی واللہ ولی التوفیق۔

یہ امور جو میں نے لکھے، مجھ کو لکھنے زیبا نہ تھے مگر بہ مجبوری جو کچھ اپنی نیت اور اپنا ارادہ اور قصد ہے، اس کا عام طرح پر ظاہر کرنا ضروری تھا، اس لیے دو چار حرف اس سختی سے جو میرے دل میں ہے لکھے گئے ہیں، تاکہ میرے مخالف اور موافق سب اس پر غور کریں۔

"اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے جو دین کے معاملے میں تم سے نہیں لڑتے، بھلائی کرنے اور انصاف برتنے سے منع نہیں کرتا۔"

(ممتحنہ۔ آیت ۸)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱، شمارہ ۵ (مئی ۱۹۹۲ء)

# ہندوستان میں اردو کا مستقبل

سید حامد ○

اردو ہندوستان تک محدود نہیں ہے۔ زبان پر چڑھی ہوئی اردو اپنے بولنے والوں کے ساتھ دنیا کے بہت سے کونوں میں پہنچ گئی ہے۔ افغانستان، ایران، دوبئی ابوظبی، شارجہ، سعودی عرب، مسقط، عمان، انگلستان، کنیڈا، یونائیٹڈ اسٹیٹس میں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی ایک بڑی آبادی اردو بولتی ہے اور اس پر جان دیتی ہے اور بے تاب ہے کہ کس طرح اس کی نئی نسل کا رشتہ اردو کے ساتھ بنا رہے۔ حالانکہ:

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر<br>
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

ہمارے لیے یہ خیال خوش آئند ہے کہ ہندوستان کی شیرازہ بندی کا کام جو زبان خاموشی سے کرتی رہی ہے اس کا جادو دوسرے ملکوں میں بھی چلنے لگا ہے۔ اس خیال سے ہم دل ضرور بہلا سکتے ہیں لیکن اگر اس سے زیادہ اہمیت اسے دی گئی تو اس کا شمار سادہ لوحی میں کیا جائے گا۔ اردو کے مستقبل کے بارے میں جو تخمینہ اور حکم لگایا جائے گا وہ صرف اردو کے سوادِ اعظم یعنی ہندوستان اور پاکستان سے تعلق رکھے گا۔

یہ حقیقت بس ہے باقی ہوس -

ہمارے لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ پاکستان میں اردو کی سرگزشت پر غور کرنے بیٹھ جائیں۔ نظریاتی بحث چھیڑنے اور خیالی گھوڑے دوڑانے سے کیا حاصل خصوصاً جب ہمارے ملک میں اردو درد سے کراہ رہی ہے اس پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے اردو والے پاکستان پر نگاہ غلط انداز ڈالتے رہتے ہیں ہمارے ادیب اور شاعر جب وہاں ہو آتے ہیں تو بیٹھ تھپکنے کے انداز میں یہ کہتے ہیں کہ وہاں اردو غریب کی حالت ہندوستان سے بھی ابتر ہے۔ وہ علاقائی عداوت اور لسانی دشمنی کے ہاتھوں جاں بلب ہے۔ آپ انہیں زنہار باور نہ کیجیے۔ لسانی دشمنیاں اور نسلی بیر اپنی جگہ پر لیکن ان کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ نظامِ تعلیم، صحافت، ریڈیو، ٹی۔ وی کے ذریعے اردو بچے بچے کی رگِ جاں میں پیوست ہو گئی ہے اور خون کی گردش کے ساتھ ساتھ رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ جو لوگ اس بنیادی حقیقت سے آنکھیں موند لیتے ہیں، انھیں احساس تناسب یا ژرف نگاہی سے کوئی متہم نہیں کر سکتا۔ اس موٹی سی بات کو مان لیجیے

○ سابق وائس چانسلر اے ایم یو - علی گڑھ - ہمدرد نگر - نئی دہلی -

کہ ہم آگے بڑھیں۔ یوں بھی ہمیں پاکستان سے کیا لینا دینا
اور اس کی لسانی پالیسی سے کیا سروکار۔

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اتنی ہی ناپسندیدہ دو ایک باتیں اور سن لیجیے کہ ذہن کے جالے جھاڑنے کے لیے صاف گوئی اور تلخ نوائی سے زیادہ کارگر اور کوئی حربہ نہیں ہے۔ میں یہ کہنے جا رہا ہوں کہ دنیا میں کسی جمہوریت نے اپنی ایک قومی زبان کے ساتھ ایسا ناروا سلوک نہیں کیا جیسا کہ ہندوستانی جمہوریت اردو زبان کے ساتھ کرتی چلی آئی ہے لیکن یہ بیان جوڑ واں بیان ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا میں کسی آبادی نے اپنی مادری زبان کے ساتھ اتنی شدید غفلت نہیں برتی اور اس کا اس قدر استحصال نہیں کیا جتنا ہندوستان کے اردو والوں نے اس کے ساتھ کیا ہے اور کر رہے ہیں۔

پہلے بیان پر آپ برہم ہوں گے اور کہیں گے کہ ہندوستانی سرکاروں نے اردو کے تحفظ اور ترقی کے لیے گاہ گاہ اتنی پالیسیاں بنائیں، اتنے بیانات شائع کیے اتنی ہدایتیں جاری کیں کہ ان کا شمار رکھنا مشکل ہو گیا ہے بالکل اسی طرح جیسے ہندوستان کے دستور اور یو۔ پی کے زمین داری خاتمہ ایکٹ کی ترمیموں کا سراغ رکھنا' اور یہ بات بھی دہرانے کے لائق ہے کہ سرکاروں نے اردو اکیڈمیاں کھولیں، اردو انجمنوں کو امداد دی' اردو کی ترقی کے لیے بورڈ بنایا اور بیورو کو سانچے میں ڈھالا۔ اردو کے مشاہیر اہل قلم کو وہ سمان دیتی چلی آئی ہے۔ ان سب امدادوں اور احکام کو جوڑ لیے اور نچوڑ دیے تو نتائج کی شکل میں ایک قطرہ بھی نہ نکلے گا۔ مختلف سیاقوں میں لوگ کہتے چلے گئے ہیں کہ جڑوں کے بجائے پتوں کو سینچا جا رہا ہے۔ یہ سارے اقدامات اردو کی جڑ کو چھو تک نہیں گئے' بلکہ پتیاں بھی خشک رہ گئیں کہ مدعا یہاں آبیاری نہیں تھا نہ جڑوں کی نہ پتیوں کی؛ مقصد صرف التفات کی نمائش تھا اور منصفی کی مشتہری۔ یہ مقصد بخوبی حاصل ہو گیا' کہ مذکورہ اقدامات کا روئے سخن ان لوگوں کی طرف تھا جو عارضی اور دیرپا میں امتیاز نہیں کر سکتے جو دیدہ زیب کو دور رس سمجھ بیٹھتے ہیں. بات کی تہہ تک پہنچنے اور ضروری اور غیر ضروری میں تفریق کرنے کا ہنر جنھیں آتا ہی نہیں اور جو اس گراں قدر شے سے ناآشنا ہیں جس کے بغیر جمہوریت میں گاڑی چل ہی نہیں پاتی۔ وہ شے ہے رائے عامہ۔ صحت مند یا صائب رائے عامہ بنتی ہے سوجھ بوجھ' احساس تناسب' اتحاد اور تنظیم سے۔

یہاں حکومت کی ناانصافی اور تغافل شعاری کی داستان کو دہرانے کا موقع نہیں ہے۔ موٹی سی ایک مثال گجرال کمیٹی کی رپورٹ کو لے لیجیے۔ اس کی شان نزول خود اندر کمار گجرال صاحب کی زبان سے سنیے:

> " یہ محسوس کیا گیا کہ ان مسائل کا جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے دیرپا حل جب ہی نکل سکے گا جب ان کا گہرا مطالعہ کیا جائے۔ ان مشکلات سے عہدہ برا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مل کر ان پر غور کیا جائے اور ان سارے عناصر سے گفتگو ہو جنھیں ان میں دلچسپی ہے۔ کمیٹی برائے ترقی اردو (گجرال کمیٹی) اس مقصد سے بنائی گئی ہے۔"

---

> " اس رپورٹ میں ہم نے جو سفارشیں کی ہیں وہ اس محکم عقیدہ کی بنا پر کہ ایک ایسی زبان کی حفاظت اور ترقی جو اتنی متمول روایات کی حامل ہے اور جسے لازوال حسن عطا ہوا ہے۔ قوم کی فکر اور توجہ کی مستحق ہے

ان سب لوگوں کے لیے جنہیں ہماری ثقافتی زندگی کے استحکام میں گہری دلچسپی ہے اور جن کا مدعا ہے کہ ہم آہنگی اور یک جہتی کے رجحانات کو مضبوط کیا جائے۔ ان سب کے لیے اس زبان کی نشو و نما اور ترقی بے حد اہم ہے۔ اس بات کا احساس عام ہو چلا ہے کہ مختلف لسانی اقلیتوں کی جائز تفاوت کی تکمیل فوری ترجیح کی مستحق ہے۔"

گجرال کمیٹی آگے چل کر کہتی ہے کہ:

" ان سفارشوں کے ذریعے اس نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ جو تحفظات منظور کیے گئے ہیں ان کی تعمیل پورے طور پر ہو اور وہ کجی اور انحراف جو انتظامیہ کی نچلی سطح پر رو نما ہوئے ہیں، یک قلم مٹا دیے جائیں۔ ان قومی پالیسیوں کا جن پر اتفاق ہو چکا ہے۔ عدم نفاذ، بے یقینی اور عدم اعتماد کی فضا پیدا کر دیتا ہے جس سے نظر ہٹائی نہیں جا سکتی؛ اور اس کا اثر عوام کے حوصلہ پر براہ راست پڑا ہے (لہٰذا) ان کا نفاذ جلد سے جلد اور پوری طرح ہونا چاہیئے۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے جو کمیٹی اتنے اہم کام کے لیے حکومت کی طرف سے بٹھائی گئی تھی اور جس کی سفارشات پر ایک بڑی لسانی اقلیت کے اطمینان، اعتماد اور خوشی کا انحصار تھا جسے ملک کے جمہوری مزاج کی لاج رکھنی تھی اور جس کی سفارشات کی بجا آوری تاخیر کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اُسے حکومت نے طاق نسیاں میں رکھ دیا۔ اگر اس کی رپورٹ کو سزاوارِ تعمیل سمجھنے کے بجائے لائق تدفین سمجھنا تھا تو آخر اس کی تشکیل ہی کیوں کی گئی۔ کیا مقصود اردو والوں کے زخموں پر نمک پاشی کرنا تھا اور انہیں ان کی اوقات یاد دلانا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اندر کمار گجرال کی قیادت کے زیر اثر اس کمیٹی نے ان توقعات کو پورا نہیں کیا جو حکومت سرکاری کمیٹیوں سے بالعموم کیا کرتی ہے۔ وجہ جو کچھ بھی ہو زمانے نے یہ انوکھا سماں دیکھا کہ رپورٹ ۱۹۷۵ء میں حکومت کو پیش کی گئی اور ابھی تک حکومت نے اس پر کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ یہ رپورٹ کوئی دیوان غالب تو تھی نہیں کہ اس کی شرحیں لکھوائی گئیں۔ پہلی شرح جناب آل احمد سرور اور اُن کے رفقا نے لکھی وہ بھی پردۂ خفا میں چلی گئی دوسری شرح جناب علی سردار جعفری اور ان کے ہم انجمن نے لکھی۔ یہ شرح بھی حکومت کی سمجھ میں نہیں آئی حالانکہ اقلیتوں کے ساتھ برتاؤ میں وہ غیر معمولی فراست کا ثبوت دیتی رہی ہے۔ اس فراست کا جو فریب کی ہم نشین ہے اس کم مایہ انسان کو جو آپ سے خطاب کر رہا ہے موقع ملا کہ جعفری کمیٹی کے سامنے اور اس کے بعد افسروں کی مختار کمیٹی کے سامنے دادرسی کے لیے آخر الذکر کا وہی رخ تھا۔ اصول پر پردہ ڈالو اور فرد کو اچھالو۔ تم بھی خوش ہم بھی خوش۔ اس سے پہلے تو پر نظر ثانی کرنے کے لیے ایک رامامورتی کمیٹی بیٹھی تھی آچاریہ رامامورتی شہلوں کی بناوٹوں سے دور سادہ لوح اور گاندھیائی وضع کے انسان ہیں۔ میں ان کے شہادت کے لیے گیا۔ باتیں ہمدردی کے ساتھ سنیں اس ہمدردی کا انعکاس رپورٹ لکھتے وقت نہ سہ لسانی فارمولے میں اردو کے شمول کی بابت ہمارے بنیادی مطالبے کو آچاریہ جی کی کمیٹی نے بھی نظر انداز کر اور نہ وہ فرقہ وار خواندگی کے اعداد و شمار کو شائع کرنے کے لیے ہمارے ہمنوا ہو سکے۔ حالانکہ ان اطلاعات کو منظر عام پر نہ لانے کا کوئی جواز نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے انصاف سے انحراف، حق سے انحراف

نتیجہ یہ ہوا کہ اس ریاست سے جو ایک عنوان اردو کا گہوارہ ہے اور جہاں اردو والوں کی سب سے بڑی آبادی زندگی بسر کر رہی ہے، اردو بے دخل ہو گئی۔ قول اور فعل، اعلان و عمل آئین اور اقدام کے درمیان اتنی بڑی کھائی چشمِ فلک نے کاہے کو دیکھی ہوگی۔ لطف یہ ہے کہ آپ کوئی گرفت بھی نہیں کر سکتے۔ ہدایات جاری کر دی جائیں اور کوئی ان پر عمل نہ کرے تو سرکار کا کیا قصور۔ بعض لوگ البتہ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ وہ سرکار کس کام کی جو اپنا حکم نہ منوا سکے۔

ابتدائی تعلیم کے بارے میں یہ حکم نامہ جاری کیا تھا کہ اگر دس لڑکے ایک جماعت میں اور چالیس ایک اسکول میں اردو پڑھنے کی خواہش ظاہر کریں تو اسکول ان کے لیے ایسا انتظام کر دے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ اعداد کے اس کھیل میں اردو والے برابر مات کھاتے رہے۔ ثانوی تعلیم میں یہ اعداد بالترتیب ۱۵ اور ۶۰ ہو گئے حاصل جمع وہاں بھی صفر۔

سہ لسانی فارمولے سے جس طرح اردو کو بے دخل کیا گیا، اس کا داغ ہر اردو والے کے دل میں ہے لیکن اس غریب کو انقباض ہو کہ انشراح، ارباب اختیار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اتر پردیش سرکار نے اردو کو اس قلمرو سے نکالنے کے لیے سنسکرت کو جدید ہندوستانی زبان قرار دے کر سہ لسانی فارمولے میں جو جگہ اردو کو ملتی اس قدیم زبان کو دے دی ہے

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اس ہرزہ سرائی سے دو باتیں نکلتی ہیں۔ جہاں تک ہندی کے علاقے میں اردو کے ساتھ سرکاری پالیسی کا تعلق ہے اس میں تبدیلی راہ پا ہی نہیں سکتی خواہ کسی پارٹی کی حکومت ہو۔ فرق صرف لب و لہجہ کا ہوتا ہے۔ گویا حکومت کی اردو پالیسی اس کی خارجہ پالیسی کی طرح ہے لیکن اس لمحہ خارجہ پالیسی تک کو عالمی حوادث کے سائے میں بدلنا پڑ رہا ہے مگر اردو کے بارے میں حکومت نے گزشتہ بیتالیس سال میں کوئی کروٹ نہیں بدلی۔ سیاست میں استقامت کی یہ ایک درخشاں مثال ہے، جس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ مجھے ڈر ہے کہ مغرب میں اشتراکیت کے انہدام کے بعد سرمایہ داری اور استعمار نے نام نہاد بنیاد پرستی کو جس طرح نشانہ بنا لیا ہے، کج منطقی کہیں ہندوستان میں اردو کو بھی اس کی زد میں نہ لے لے۔ اب آپ لاکھ چلّاتے رہیے کہ بھائی صاحب اردو کا خمیر ہی سنگم کے پانی سے اٹھایا گیا ہے۔ یہ زبان کٹرپن اور تنگ نظری کی ازلی دشمن ہے۔ یہ وسعت، کشادگی، فراخ دلی بھائی چارہ، مساوات اور دردمندی کی زبان ہے؛ کوئی سن کر نہیں دے گا۔

اب ہم اس کڑی عداوت کا ذکر کریں گے جو اردو والوں سے اردو کو ملتی رہی ہے لیکن یہاں بھی پہلے ایک عالم غلط فہمی کا ازالہ کر دیا جائے۔ وہ غلط فہمی یہ ہے اور اسے آپ بڑے بڑوں اور سوجھ بوجھ والوں کی زبان سنتے چلے آئے ہیں کہ:

- "اردو کو کوئی مٹا نہیں سکتا"۔
- "اردو کی اشاعت سنیما، ٹی۔وی، ریڈیو، مشاعرے اور موسیقی کر رہے ہیں"۔
- "اردو کشمیر سے کنیا کماری تک عوام کی زبان ہے"۔
- "مردم شماری کے آنکڑوں کو دیکھیے۔ ۱۹۷۱ء میں اردو بولنے والوں کی تعداد دو کروڑ چھیالیس لاکھ تھی، ۱۹۸۱ء میں یہ تعداد بڑھ کر تین کروڑ ترپن لاکھ ہو گئی"۔

یہ ساری باتیں دل کے بہلانے کے لیے ہیں۔ ان میں کوئی

ن نہیں، نہ ان سے اردو کے مستقبل کے بارے میں
ی امید باندھی جاسکتی ہے۔ ان سب سے صرف ایک
ت ثابت ہوتی ہے کہ آبادی کے ساتھ ساتھ اردو بولنے
لوں اور اردو سمجھنے والوں کی تعداد بڑھی ہے۔ یعنی ایک
ولی کی حیثیت سے اردو کو فروغ ہوا ہے۔ اردو کے
مخالفین بھی سدا سے اسے ایک بولی اور ایک طرزِ ادا کی
حیثیت دینے کے لیے مستعد رہے ہیں۔ دشمن کا می
پر ہماری یہ شادمانی حیرت انگیز ہے۔

زبان کی ثبات، بقا اور وقار اس کے رسم خط
اور اس کے ادب پر مبنی ہوتا ہے۔ ابھی دیکھ لیجیے کہ
اردو شاہ کاروں کو سمجھنے والے اب کتنے باقی رہ گئے ہیں
عوام وخواص میں جب اعلیٰ تخلیقات کو سمجھنے اور ان
سے لطف اٹھانے کی صلاحیت نہیں رہے گی تو تخلیقات
کا معیار گرتا چلا جائے گا۔ اردو کے ساتھ یہی ہو رہا ہے
اس کے علاوہ اردو لکھنے والوں کی آزادیٔ فکر و اظہار سلب
ہوتی جارہی ہے کیونکہ ادب کی صحت مند سرپرستی صرف
پڑھنے والے ہی کرسکتے ہیں؛ اور اردو رسالوں اور کتابوں
کے پڑھنے والے کم ہوتے جارہے ہیں۔ اردو اہلِ قلم بڑی
حد تک حکومت اور اس کے نشر و اشاعت کے اداروں کے
دست نگر ہو گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آزادی کے بعد
بہت سی علاقائی زبانوں نے اردو سے زیادہ ثبوت
زندگی اور مسائل سے نبرد آزما ہونے اور انھیں اظہار
میں لانے کا دیا ہے۔ اردو کے لکھنے والوں کا ناتہ زندگی
کی زیریں لہروں سے، کہ وہی سرچشمہ ہوتی ہیں سمندر
کے تموّج کا، ٹوٹتا جارہا ہے۔

انگریزی میں ایک لفظ ہے مومینٹم جسے ہم حرکت
تسلسل کہہ سکتے ہیں۔ مومینٹم بن جائے تو پیش رفت
کے لیے کوئی خارجی کوشش درکار نہیں ہوتی۔ وہ اپنی
طاقت سے خود چلتا رہتا ہے۔ بہت سی کلیں کارخانے
ایسے ہوتے ہیں کہ ایک دفعہ بند ہو جائیں اور مومینٹم یا سٹیم
(بھاپ) ٹوٹ جائے تو انھیں دوبارہ چلانے کے لیے
بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ آزادی کے بعد اردو پر
یہی بیتا پڑی۔ اس کی حرکت تسلسل توڑ دی گئی۔ ایک
عرصے کے بعد نیم دلی کے ساتھ کچھ کوششیں ضرور ہوئیں
رکی ہوئی اس کل کو چلانے کی۔ تعطّل کے بعد جفا سے
توبہ کی گئی، برملا کی گئی بار بار کی گئی لیکن یہ کوششیں اردو
کی گاڑی کو آگے ڈھکیل نہ سکیں۔ ماں باپ نے دیکھا
کہ اردو کا سکہ اب رائج نہیں رہا اس لیے انھوں نے
بچوں کو اردو پڑھانے کی زیادہ کوشش نہیں کی کہ اردو
پڑھانا بچوں کے لیے ایک تابناک مستقبل کی بشارت
نہیں دے رہا تھا۔ ان میں جو اہلِ وفا تھے انھوں نے
بچوں کو مجبور کیا کہ اردو ضرور لیں، لیکن اربابِ تعلیم
نے یہ سروسامان کر دیا کہ اردو پڑھنے والوں کی مقررہ
تعداد جمع نہ ہو سکے۔ یہ سنکھیا کہ ایک جماعت میں اردو
کے طلب گار دس بچے ضرور ہونے چاہییں' اردو تعلیم
کے لیے سنکھیا یا زہر ہلاہل بن گئی جس کا تریاق نہ اردو
والوں سے بن پڑا، نہ اربابِ اختیار سے۔ گجرال کمیٹی نے
البتہ یہ سفارش کی کہ اسکول کی آبادی کے بجائے علاقے
کی آبادی کو ملحوظ رکھ کر اردو پڑھانے کا اہتمام کیا جائے
لیکن حکومت نے سنی ان سنی کر دی اور اردو والے
آہستہ آہستہ بلکہ تیزی کے ساتھ، اپنی مادری زبان
سے بیگانہ ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ ہندوستان میں اردو
جو کچھ بھی زمانہ باقی ہے وہ اردو میڈیم یا اقلیتی اداروں
اور مکتبوں اور مدرسوں کی وجہ سے ہے۔ اوّل الذکر
دونوں کو وجود میں لانے اور قایم رکھنے کے لیے ہفت خواں
طے کرنے پڑتے ہیں۔ اردو میڈیم یا اقلیتی ادارے کو
تسلیم کرالینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ یو۔پی
میں تو کوئی اردو میڈیم اسکول ہے ہی نہیں۔ اقلیتی

اداروں کی انتظامیہ سالہا سال سرکار اور ڈائرکٹریٹ کے دروازوں پر دستک دیتی ہے تب ریکگنیشن کی بھیک اس کی جھولی میں ڈالی جاتی ہے۔ بسا اوقات امتیازی حیثیت تسلیم کر لنے کے لیے ان اداروں کو عدالت سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے لوگ تو تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ نقصان اردو والوں کا تو ہوتا ہی ہے اس سے بڑا نقصان ملک اور قوم کا ہوتا ہے۔

اردو والوں کا ایک اچھا خاصا طبقہ ان پڑھ رہ جاتا ہے اگر کوئی سرپھرے والدین اپنے بچوں کو اردو لینے پر مجبور کر ہی دیتے ہیں تو انھیں دو مشکلوں سے سابقہ ہوتا ہے اردو کی نصابی کتابیں یا تو ملتی نہیں یا ملتی ہیں تو مہینوں اور کبھی کبھار سالوں کی تاخیر کے بعد۔ دوسری مشکل تربیت یافتہ (ٹریننگ پائے ہوئے) استادوں کی فراہمی ہے۔ اس کا اہتمام بالالتزام کیا گیا ہے کہ زنجیرِ تعلیم کی ایک یا ایک سے زیادہ کڑیاں بیچ سے ٹوٹی رہیں۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر اگر اردو کو بحیثیت مضمون کے نصاب میں جگہ ملی ہے تو اس انداز سے کہ اگر اردو لی جاتی ہے تو کوئی دوسرا مضمون چھوڑنا پڑتا ہے جو طالب علم کے مستقبل اور مقابلے کی صلاحیت کے لیے ضروری ہے۔ عالم یہ ہو گیا ہے کہ اردو کا اگر تعاقب کرو تو زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاؤ۔

اردو زبان کی کس مپرسی اور "بے مصرفی" کو دیکھ کر اردو والوں نے بھی اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ وہ بھول گئے کہ ان کا آنول نال اس زبان کی زمین میں گڑا ہے آہستہ آہستہ اردو کے ساتھ انھیں آنکھوں دیکھے کی مروت بھی نہیں رہی اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ اردو کو شکایات حکومت سے اتنی نہیں رہی جتنی خود اردو بولنے والوں سے ہو گئی۔ شکایت کا نام درمیان میں آگیا ہے تو سن لیجیے کہ شکوہ سنجی اور خود کو مظلوم سمجھنے اور اپنے پر ترس کھانے [illegible]

قبیح عادت کے تحت انسان اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈال لگتا ہے۔ اس کا ارادہ اور حوصلہ اور اعتماد مفلوج ہو ج ہے۔ شکوہ سنجی کی منطق گویا یہ ٹھہری کہ جس کے ساتھ ناان اور ظلم ہو وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے اور وقت عزی آہیں بھرنے اور فریاد کرنے میں گنواتا ہے۔ حالانکہ حکو اور اس کے اہل کاروں سے اگر ناانصافی سرزد ہو رہی تو اس کا دوہرا جواب دینا چاہیے۔ پہلا جواب یہ کہ ناانص کے خلاف رائے عامہ بنا کر آئینی اور استدلالی ڈھنگ احتجاج کیجیے، متواتر کیجیے اور اپنے حق کا مطالبہ کیجیے اور اس وقت تک دم نہ لیجیے جب تک کہ آپ کی جائز مانگ منظ نہیں کی جاتی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جو زبان آپ کو اس قدر پیاری ہے، اس کے لیے خود بھی تو کچھ کیجیے۔ یہاں اس وقت یہ عالم ہے کہ حکومت نے اردو سے کیا تغافل بر ہوگا جتنا خود اردو والے برت رہے ہیں۔ اول تو ہمار وہ بچے جو ماحول اور اچھی تعلیم کی بدولت صلاحیتوں سے مالا مال ہو گئے ہیں اردو کی نسبت سے کنگال ہیں۔ انہ گھر پر مادری زبان پڑھا دینا کچھ دشوار نہ تھا لیکن والد کی ناقابلِ لحاظ تعداد نے ہی ایسا کیا۔ اس بے رخی کا کوئی ج نہیں ہے۔ اردو والوں نے اردو میں خط و کتابت ترک کرد اس کا بھی کوئی جواز نہ تھا۔ اردو کے استادوں نے اپنی زبان کی توسیع و ترویج کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ حالا کہ یہ ان پر فرض تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ جو لوگ اردو کے نام پر استاد رکھے گئے، انھوں نے کوشش یہ کی کہ اولین فرصت میں اردو کے دھبے کو اپنے دامنِ تدریس سے چھڑوا دیں۔ اقلیتی تعلیمی اداروں میں اردو کو پناہ ملی ہو ہے لیکن بعض ریاستوں میں ان اداروں کے استادوں نے سر جوڑ کر یہ کوشش کی کہ ان اداروں کو اقلیتی اداروں کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جائے۔ یہ کوششیں رو

حکومت نے نئی تعلیمی پالیسی میں مادری زبان اور تعلیمی اداروں کے بارے کچھ اہم فیصلے کیے لیکن ان میں سے کوئی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔

شریمتی اندرا گاندھی کے پندرہ نکاتی پروگرام میں بھی تعلیم کے بارے میں کوئی نکتہ نہیں ہے۔

اردو والوں نے اردو کے ساتھ جس بے حسی کا برتاو کیا ہے اس کی تفصیلات آپ کے سامنے رکھی جائیں تو آپ کے کان پک جائیں گے۔ اس داستان کو اس جملے پر ختم کر رہا ہوں کہ اردو کو مٹانے میں حکومت اور اردو والوں نے بے مثال باہمی تعاون کا ثبوت دیا ہے۔

سوچنا یہ ہے کہ اردو کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلانے بلکہ اردو کی بازیابی کے لیے ہمیں کیا کیا قدم اٹھانے چاہیں۔

سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اردو کے بارے میں ایک آواز ہو کہ حکومت سے مطالبات کیے جائیں اور اس وقت تک ہم چین نہ لیں جب تک جمہوری حکومت جمہور کی رائے کے آگے سر تسلیم خم نہیں کر دیتی۔

دوسری ضرورت رابطے کی ہے تاکہ اردو کے بارے میں دوسری زبانوں کو جو غلط فہمیاں ہیں انھیں دور کیا جائے اردو والوں کو چاہیے کہ تنہا روی کے بجائے دوسری زبان بولنے والوں کے ساتھ تعلقات کو شگفتہ اور استوار کریں کیوں کہ اگر یہ تعلقات شگفتہ نہ ہو سکے تو حکومت کی پالیسیاں کاغذ کی چار دیواری سے باہر نہ نکل سکیں گی، وہ کبھی عمل کی شکل نہ دیکھ پائیں گی۔

حکومت سے التماس کی جائے بلکہ اصرار کہ وہ جو پالیسی اردو کے تعلق سے اختیار کرے اس کی شرح آخری عملی تفصیل تک کرے اور سابقہ پالیسیوں کی بجا آوری میں جو دشواریاں ہوئیں اُن کو ملحوظ رکھتے ہوئے مستقبل کے پروگرام عمل کو ڈھالے۔

ایسا کبھی نہ ہو کہ پالیسیوں کے اعلان پر جب ایک مدت مدید گزر جائے تب لوگ بیدار ہوں اور دریافت کریں کہ وقت گزر گیا اور کچھ نہ ہوا، گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا اور دنیا اب اتنی تیز رفتار ہو گئی ہے کہ جس نے وقت کو گنوایا اس نے زندگی سے کچھ نہ پایا اور جو زبان پچھڑ گئی وہ پنپ چکی۔ فیصلے کیجیے منصوبے بنائیے تو رواں احتساب یا پیہم نگرانی کے بنا کام نہیں چلتا۔ سرکار نے اردو کی بابت جو بھلے یا بُرے فیصلے یا اعلان مختلف اوقات میں کیے ہیں ان پر نظر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ رواں دواں مانیٹرنگ کا انتظام کیا جائے اور مختلف سطحوں پر جو کمیٹیاں اس کام کے لیے بنائی جائیں ان میں آزاد رائے اردو والوں کو ضرور شامل کیا جائے۔ اس طرح ایک طرف اردو والوں میں اعتماد کی فضا پیدا ہوگی۔ دوسری طرف غفلت اور لغزش کو وہیں کا وہیں ٹھیک کر دیا جائے گا۔

اردو کے تئیں حکومت کی پالیسیاں دلفر[یبی] اور دلکشی کے درمیان گرم سفر رہی ہیں۔ ہمیں اس انداز سے کہ ہماری بات سنی جائے، اپنے جمہوری لسا[نی] حقوق کی بازیابی کی مانگ کرنی چاہیے۔ باسی کڑھ[ی] میں اُبال کی وضع پر نہیں بلکہ برابر، لگاتار متواتر گجرا[ل] کمیٹی کی سفارشات اور ان کی جو شرح علی سردار جعفر[ی] نے کی، ان کے بارے میں حکومت سے پرزور مطا[لبہ] کی جائے کہ بلا تاخیر ان پر فیصلہ کیا جائے۔ اس با[ت کی] ضرورت ہوگا کہ اس فیصلے کے بارے میں تفصیلی لا[ئحہ] عمل ابھی سے متعین کر دیا جائے تاکہ گریز کی سا[ری] راہیں بند ہو جائیں۔ اپنی مادری زبان کو پروان چڑ[ھانا] ہمارا جمہوری حق ہے۔ ہم اس حق سے کبھی دست بر[دار] نہیں ہوں گے۔ وعدے کتنے ہی پُر فریب اور دل[کش ہوں]

دل شکن کیوں نہ ہوں ہمیں بات سلیقہ سے اور
ر کہنے اور اسے منوانے کا ہنر کبھی نہ کبھی تو آئے
ور کسی وقت تو ارباب اقتدار کی نظر بدلے گی
عاف کے ساتھ اس کا ناطہ جڑ کر رہے گا۔

ن امید پر جی رہے ہیں۔ پینتالیس برس کا
ایک لحاظ سے طویل ہے. لیکن قوموں کی زندگی
ڈالیے تو یہ مدت کچھ ایسی طویل بھی نہیں۔ ہم نے
تہ چند سالوں میں ہی دنیا میں بڑے بڑے
ب دیکھے ہیں جو تصور میں بھی آنے والے نہیں تھے۔
ے ملک میں بھی انقلاب آسکتا ہے، یہاں بھی
ن بدل سکتے ہیں۔ لسانی اقلیتوں کے دن یہاں بھی
لتے ہیں۔ انصاف کا بول بالا یہاں بھی ہو سکتا
ہیں ایسا نہ ہو کہ جب نظام کہن بدلے تو نیا دور بیرون
ت لے جائے اور ہماری افسردہ خاطری
یوسی سے ہماری زبان کو نقصان پہنچ جائے
ہیں کہتے رہنا چاہیے، اس کی لے کو تیز کرتے
چاہیے۔ انصاف کے بغیر کوئی نظام قائم نہیں
سکتا۔ انصاف بالآخر ہو کر رہے گا بشرطیکہ ہم
س ہو کر ہتھیار نہ ڈال دیں، پسپا نہ
ہیں.

لیکن مطالبے کو برقرار
اور اسے دوام دینے
یں زیادہ اہم اردو
نے پسینے سے سینچنا
نی قوت بازو سے
اٹھانا ہے۔ یہ کام
ں ہو سکتا ہے اور
چاہیے۔ اگر ہم اتنا
ہیں کر سکتے تو اپنے بچوں کو گھر [illegible]

کام چلاؤ اردو سکھا دیں تو ہم پر اور ہمارے عزائم پر آفریں
اردو والوں میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اردو
پڑھانے کے لیے یہ سہولت ہے کہ کلام پاک پڑھاؤ
ساتھ ہی ساتھ اردو بھی سکھا دو۔ اتنی سکھا دو کہ
بچہ اخبار پڑھ سکے، خط لکھ سکے۔ اس کام کے لیے
ملک گیر مہم درکار ہوگی۔ پڑھے لکھے والدین اپنے بچوں
کو اردو خود پڑھائیں۔ جو پڑھے لکھے نہیں ہیں، ان کے
پڑوسی ان کی مدد کو آئیں۔

غور کیجیے تو سارے مطالبات اور دادرسی
ایک طرف اور اپنی مدد آپ کرنے کا یہ طریقہ ایک طرف.
یہ ایک نسخۂ کیمیا ہے۔ خود اس پر کوئی لاگت نہ آئے
گی۔ شرط یہ ہے کہ ہم سب اس کام میں لگ جائیں
کہ اس میں ہی ہماری پہچان ہے، ہماری بقا ہے،
ہماری سرخروئی ہے۔

اردو کو لے کر سیمینار اور کانفرنسیں بہت
ہو گئی ہیں. ان میں دل کی بھڑاس نکالی گئی ہے بھڑاس
نکلنی تو چاہیے لیکن بھڑاس نکالنے کا صحت مند
طریقہ نہ شکوے شکایت ہیں، نہ شعلہ بار تقریریں،
نہ مایوسی کی باتیں۔ صحت مند طریقہ یہ ہے کہ لائحہ
عمل مرتب کرنا اور اس کو عرق ریزی اور دل انگیزی
کے ساتھ عملی جامہ پہنانا
یہی کام اس سمینار کو
کرنا چاہیے۔ اس کے
علاوہ ایک مستقل کمیٹی
بنا دیجیے جو ماہ بہ ماہ
پیش رفت کا جائزہ
لیتی رہے اور اس
کے مطابق پروگرام میں
[illegible] تو سیع یا تقویت کرتا رہے

"جس کسی نے سوا اس حالت کے کہ قصاص لینا ہے
(یعنی قتل کی سزا دینی ہو) یا ملک میں فساد پھیلانے
والوں کو سزا دینی ہو، کسی انسان کو قتل کر ڈالا تو
گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کر دیا۔"
(سورۂ مائدہ آیت ۳۲)

جہاں تک تعلیمی اداروں کا تعلق ہے ہمیں اردو اداروں کی تنگ معیاری پر رضامند یا اُن کا خوگر نہیں ہو جانا چاہیے۔ باوجود بے شمار رکاوٹوں اور خرابیوں کے اصلاح اور بہتری کا راہ کھلی رہتی ہے۔ اس مسئلے پر غور و فکر کے بعد اردو میڈیم اسکولوں اور مکتبوں اور مدرسوں کے معیار کو اونچا کرنے کی کوششیں کرنی چاہیں۔ کیا ہم طمانیت کے ساتھ اپنی آنے والی نسلوں کو اچھی تعلیم سے محروم رکھنے کا فیصلہ کر بیٹھے ہیں۔ خود بڑھائیں اور اس انداز سے گویا یہ ان کا دینی فریضہ اِن کی غیرت کا تقاضہ ہے۔ نیم دلی کے ساتھ ہفت خواں آج تک کسی نے طے نہ کیا۔ خطرے کے لمحے میں الکسانا، ڈھیل ڈالنا آسائش ڈھونڈنا خودکشی کے مترادف ہے زندہ وہی رہتے ہیں، عزت انہیں کو ملتی ہے جو انفرادی خود غرضی سے اوپر اُٹھ کر اجتماعی کاز کے لیے قربانی دینے کو تیار رہو جاتے ہیں۔

"اے فرزند! سلطنت اور حکومت کی مالک صرف اللہ ہے وہ جب چاہتا ہے سلطنت عطا کر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے چھین لیتا ہے بادشاہ ایک امین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر وہ اس امانت میں خیانت کرے گا تو اسے روز قیامت جواب دینا ہوگا۔ تیرا باپ نادم اور شرمندہ ہو کر دنیا سے جا رہا ہے۔ وہ صحیح طریقے پر اللہ کی دی ہوئی امانت کو نہ سنبھال سکا اور برابر اس میں تصرف کرتا رہا لیکن اس کے باوجود دنیا کا کوئی عیش حاصل نہ کر سکا۔ یہ دنیا اور اس کی حکومتیں فانی ہیں، اس بات کو کبھی نہ بھولنا۔"

عبدالرحمٰن اول والی اندلس

# قاضی جلال الدین

جلیل قدوائی ○

پاس تو وہ میٹرک بھی نہ تھے مگر ایف آر جی ایس (فیلو آف دی رائل جیاگریفکل سوسائٹی) تھے اور بہ حیثیت لکچرر یونیورسٹی کی جماعتوں کو جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان میں پہلی یونیورسٹی تھی جہاں جغرافیہ کا باقاعدہ شعبہ تھا۔ انٹرمیڈیٹ کالج ٹوٹنے پر اس کے پرنسپل میجر ڈین شعبے کے ریڈر اور صدر ہوئے مگر اس کی اصل ترقی ڈین صاحب کے چلے جانے کے بعد شروع ہوئی۔ جب ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں کا ان کی جگہ پر تقرر ہوا۔ اس شعبہ کی ترقی کی دیکھا دیکھی برصغیر کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی جغرافیہ کی اعلیٰ تعلیم کی ابتدا ہوئی۔

قاضی جلال صاحب K. M. Jalaluddin لکھنے کی وجہ سے کلنے ماسٹر جلال الدین بھی کہلاتے تھے (چوں کہ یک چشم تھے)۔ ایف آر جی ایس کس طرح ہوے یہ مجھے معلوم نہیں۔ نہ میں ان کا شاگرد رہا کہ جغرافیہ کے سلسلے میں ان کے بارے میں کچھ کہہ سکوں مگر ان کی زبان سے "سیروا فی الارض" بارہا سنا جیسے وہ جغرافیہ کے مضمون سے اپنی دلچسپی کی بنیاد بتاتے تھے

وہ ایس ایس ہال (ایسٹ) یعنی یکی بارک (مشرقی حصہ) کے وارڈن بھی تھے اور طلبا و اساتذہ میں اپنی ذہانت اور ذوق ظرافت کے باعث یکساں مقبول و محترم تھے بلکہ اس لحاظ سے وہ ایک مستقل ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ سونے کی کمانیوں والی عینک لگاتے تھے جس کے نچلے حصے میں آدھے شیشے لگے ہوتے ہر یعنی ان کی پڑھائی کی بصارت کمزور تھی۔ کوٹ، پتلون، ٹائی استعمال کرتے تھے مگر اس طرح جیسے لباس کے اہتمام سے بے نیاز ہوں۔ مسکراہٹ ہر وقت خاص طور پر بروقت ملاقات ان کے چہرے پر کھیلتی رہتی تھی۔ جہاں تک یاد آتا ہے وہ ۱۹۳۶ء میں میرے علی گڑھ چھوڑنے سے قبل ملازمت ختم کر کے چلے گئے تھے۔

میں نے "علی گڑھ منتھلی" کے، جو یونیورسٹی کے طلبا کے رسالہ "علی گڑھ میگزین" کا پرانا نام تھا اور جسے رشید احمد صدیقی صاحب اور ان کے بعد میرے نہایت محترم، قابل دوست خواجہ منظور حسین نے آپ

وارتی ادوار میں ملک کا ایک مستند ادبی و علمی پرچہ بنا دیا تھا، کچھ پرانے پرچے دیکھے تھے معلوم ہوا قاضی صاحب کسی زمانے میں اس کے اڈیٹر رہ چکے تھے۔ اُن کے ذوقِ ادب کے نمائندہ یہ اشعار "منتھلی" کی کسی اشاعت میں چھپے تھے جنھیں لطف سے خالی کیوں کر کہوں جب کہ وہ غزل کی پرانی اور اعلیٰ تعریف "سخن با زنان کردن" پر پورے اترتے ہیں۔ آخر مولانا حسرت نے کبھی تو فاسقانہ شاعری کی تھی شد و مد سے اس کی حمایت کبھی کی ہے۔ ہمارے اساتذہ نے غزل کا ایک مخصوص مقصد و مصرف مقرر کیا تھا۔ دوسرے مضامین کے لیے ہماری شاعری میں کتنی ہی اور اصناف مشہور تھیں اور ہیں مگر یار لوگ ہاتھ دھو کر غزل ہی کے پیچھے پڑ گئے اور اس کی گردن پر کند چھری پھیر دی۔ دوسرے الفاظ میں ہرن پر گھاس لادنے کے درپے ہو گئے۔ اکبر کے الفاظ میں ؎

ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

نتیجہ یہ ہوا کہ غزل اِدھر کی رہی نہ اُدھر کی۔ مزا یہ ہے کہ اس قسم کی چیزیں جن کا ذکر ہماری روایتی غزل میں ہوتا ہے، اور جو غزل کی جان ہیں مغرب سے آتی ہیں تو ہم ان پر سر دھنتے ہیں بلکہ انگلستان پلٹ احباب مست ہو کر انھیں گلانے ہی نہیں ناچنے لگتے ہیں۔ خیر تو قاضی صاحب کے وہ اشعار یہ ہیں ؎

جب کہا رحم کے قابل ہے دلِ زار، کہا
جی دلِ زار! دلِ زار کے ٹکڑے کر دے
وعدۂ وصل کو پوچھا تو یہ شرما کے کہا
تم بڑے وہ ہو تمہیں مار کے ٹکڑے کر دے

زبان کا لطف ملاحظہ ہو مگر زبان اور محاورے کی بات پر ہمارے احباب چڑنے اور ناک بھنویں سکیڑنے لگتے ہیں۔ کیوں کہ زبان تو اُن کے گھر کی لونڈی ہے اس کے ساتھ جیسا چاہو برتاؤ کرو۔ حالانکہ ہمارے ہاں لونڈی کے ساتھ بھی شائستہ برتاؤ کی تاکید تھی۔

قاضی صاحب کا خیال تھا کہ انگریزی زبان کے بہت سے الفاظ اصل میں اردو کے الفاظ یا فقروں کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ فرماتے تھے کہ جب انگریز ہندوستان میں نئے نئے آئے تھے تو گھروں میں پردہ دار خواتین سے انھیں دور رکھنے کے لیے ان سے کہا جاتا تھا:

"اُدھر نہ جائیں خواتین ہیں جو پردہ کرتی ہیں"

پردہ کرتی ہیں کا فقرہ کثرتِ استعمال سے مختلف ہو کر صرف "کرتی ہیں" رہ گیا۔ بعد میں یہ انگریزوں کی زبان پر چڑھ کر "کرٹین" (curtain) ہو گیا جو انگریزی میں اس نے پردہ کی جگہ لے لی۔ اس طرح اردو کا فقرہ "دیکھ رے شان" انگریزی میں تبدیل ہو کر ڈیکوریشن (Decoration) ہو گیا۔ ایسے ہی نہ جانے کتنے الفاظ پر مشتمل قاضی جلال صاحب نے ایک لغت مرتب کی تھی۔

بڑے خوش اوقات انسان تھے۔ راس مسعود صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ مسٹر ای۔ اے ہورن ہیڈ آف دی انڈین ایجوکیشنل سروس کو پرو وائس چانسلر کے طور پر لائے تھے۔

یونیورسٹی بڑی چھٹیوں کے بعد کھلی تھی اور داخلے کے لیے طلبا کا اژدہام تھا۔ ایک بار رات کے دس بج گئے۔ دفتر کھلا رہا اور داخلے ہوتے رہے۔ اتنے سخت اور طویل انٹرویو شاید ہی اس سے پہلے کبھی ہوئے ہوں۔ ہورن صاحب دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے ذرا دیر کو اٹھنے کے سوا برابر ڈٹ کر کام کرتے رہے سارا عملہ تھک گیا۔ جب کام ختم ہوا اور وہ چلے گئے تو ہم لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے کے لیے نیچے

اترے۔ جیسا کہ معلوم ہے یونیورسٹی کے دفاتر وکٹوریہ گیٹ کے اوپر تھے اور نیچے ایس ایس ہال (یکی بالک) ہے۔ وہاں قاضی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ ہم لوگ ہورن صاحب کے احساس ذمہ داری اور جم کر بیٹھنے کی صلاحیت پر عش عش کرنے لگے۔ ایک صاحب نے کہا:

"کیوں نہ ہو آخر تین ہزار روپے ماہوار تنخواہ بھی تو لیتے ہیں"!

قاضی صاحب کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی جھٹ ان کی بات کاٹ کر بولے:

"بھئی، نہیں دو روپے کم دے کر دیکھ لو"!

---

# حواشی

۱ فاسقانہ شاعری کو بدمذاقی پر محمول کرنا، سوقیانہ ومبتذل قرار دینا انصاف کا خون کرنا ہے حقیقت حال یہ ہے کہ جب شاعری کا مقصد صحیح جذبات کی مصوری مسلّم ہو تو پھر اس کے دائرے صرف پاک جذبۂ عشق تک محدود کر دینے اور عامۂ خلائق کے ۹۹ فی صد جذبات ہوس کو اس سے خارج کر دینے کی کوشش خود مخالفین ہوس نگاری کی انتہائی بدمذاقی اور بے شعوری کے سوا کسی اور چیز پر دلالت نہیں کرتی۔ (مولانا حسرت)

۲ موقع تو نہیں مگر اکبر کا دلچسپ قطعہ جس سے یہ مصرعہ مستعار لیا گیا ہے، سنائے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا ؎

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر — مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
سناؤں تم کو ایک فرضی لطیفہ — کیا ہے جس کو میں نے زیب قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے — کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے — بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی — کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کہاں وہ فطرتی جوش طبیعت — کہاں ٹھونسی ہوئی چیزوں کا آماس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے — ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی — مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ — تو استعفا مرا باحسرت و یاس

۳ واضح ہو کہ یہ وہی مسٹر ہورن تھے جنھوں نے مسعود صاحب کے دوست ای ایم فوسٹر کی مشہور کتاب سفرِ ہند (A Passage to India) کے بعض بیانات پر ایک خط کی شکل میں تنقید کی تھی اور آسے نیو اسٹیٹس مین (New Statesman) میں چھپوایا تھا۔ فوسٹر

نے اپنی اس کتاب میں ہندوستان میں انگریزوں کی جو تصویر کھینچی تھی ہورن صاحب نے اسے غلط قرار دیا تھا۔ اس کتاب میں ایک کردار عزیز ہے جو مسعود صاحب کا چربہ ہے۔ اسے مصنف نے مسعود صاحب کے ڈیڈیکیٹ کیا ہے جنھوں نے فوسٹر کو ہندوستان بلا کر صورت حال کے مطالعے کا موقع دیا اور بہت سا مسالہ خود فراہم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں اور ان کی حکومت کو ہندوستان میں غیر مقبول بنانے میں فوسٹر کی کتاب کا بھی بڑا حصّہ ہے۔ A passage to India پر فلم بھی بن چکی ہے اور ٹی-وی (T.V) پر بہت مقبول ہے۔ اس کتاب کو انگریز حکام انگلستان جاتے وقت سمندر میں پھینک دیتے تھے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"ہمیشہ خدا کے احکام امر و نہی کو محفوظ رکھنا، خدا تعالیٰ تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے گا اور جب تم سوال کا ارادہ کرو تو اللہ سے سوال کرو اور جب تم مدد چاہو تو صرف خدا سے مدد چاہو اور یہ بات یاد رکھو کہ اگر ساری مخلوق بھی جمع ہو کر تمہیں کچھ نفع پہنچانا چاہے تو ہرگز نفع نہ پہنچا سکے گی تمہیں صرف اتنا ہی نفع پہنچ سکے گا جتنا کہ تمہارے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔"

ترمذی

# سینما، ٹی وی اور ویڈیو وغیرہ کی تباہ کاریاں

محمد مختار اصلاحی ○

سینما اور اس سے پیدا ہونے والے تباہ کن نقصانات کا صحیح اندازہ لگا کر ابتدا ہی میں حکیم مشرق علامہ اقبال نے اس کو صنعت آذری، تہذیب حاضر کی سوداگری اور شیوۂ ساحری فرمایا تھا، دیکھتے دیکھتے نہایت تیزی کے ساتھ اس صنعت و تجارت کو جو غیر معمولی شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی، اس نے کسی ایک طبقے یا ملک کی نہیں بلکہ ساری دنیا کی کایا پلٹ کر دی۔ یہ ساحری اور جادوگری ہی کا کرشمہ تو ہے کہ ایک معمولی سی تعداد کو چھوڑ کر آج پوری نسل اسی فلمی رنگ میں رنگی ہوئی ہے عادات و اطوار، چال ڈھال، رنگ ڈھنگ، بود و باش رہن سہن، لباس و پوشاک، آرائش و زیبائش اور بات چیت، غرض کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اور کونا ایسا نہیں ہے جس پر سینما کی چھاپ نہ لگی ہو۔ سینما ہی کی طرح اس کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے۔ تقریباً انیسویں صدی کے وسط میں انگلستان اور فرانس کے چند سائنس دانوں کو تصویر کھینچنے کا شوق پیدا ہوا، وہ اپنی اپنی جگہ برابر اسی دھن میں لگے رہے۔ بالآخر ۱۸۳۵ء میں ایک انگریز فاکس ٹالبوٹ نے اپنے کیمرے سے صاف تصویریں اُتارنے میں کامیابی حاصل کی۔ انہیں دنوں فرانس کے سائنس داں داگوترے کو بھی صاف ستھری تصویریں کھینچنے میں خاصی شہرت ملی۔ اس طرح فوٹوگرافی کی اسی ایجاد سے سینما اور اس کے خاندان کی بنیاد پڑی۔ بیچارے سائنس دانوں کو کیا خبر تھی کہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب ان کی اس ایجاد کے سہارے انسانیت و شرافت کو رسوا اور تباہ کرنے کا بھی کام لیا جائے گا فوٹوگرافی درجہ بدرجہ ترقی کے قدم آگے بڑھاتی رہی ۱۸۸۴ء میں سلولائڈ کی فلم ایجاد ہوئی۔ اس کے بعد انگلستان کے ولیم فریسے گرین امریکہ کے ایڈیسن اور فرانس کے لومیرے کی مزید کوششوں کے نتیجے میں چلتی پھرتی تصویریں اتارنے والے "مووی کیمرے" وجود میں آئے۔ ۱۸۹۳ء میں ایڈیسن نے سینما کی مشین ایجاد کی جس سے دیکھنے والے کو تصویریں اصل سائز سے بڑی نظر آ رہی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ اس میں مختلف قسم کی تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ پہلے کچھ عرصہ تک خاموش تصویریں دکھائی

---

چیرمین محمدیہ طبیہ کالج، مالیگاؤں۔

جاتی رہی۔ پھر تصویریں بولنے لگیں اور آج سینما اپنی ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے۔ اس کو اگر ابتدا ہی سے صحیح مصرف میں لایا جاتا اور صرف بوالہوسوں اور شہوت پرستوں کے حوالے نہ کر دیا گیا ہوتا تو سماج میں اتنے زہریلے اثرات نہ پیدا ہوتے۔ سیہ کاری و بدبختی کا کوئی ڈرامہ ایسا نہیں ہے جو سینما کے پردے پر نہ کھیلا گیا ہو جیسے اس دنیا میں اس کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں سینما بینی کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ طلبہ تعلیم چھوڑ کر سینما کے ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے گھنٹوں قطار میں کھڑے ہونے لگے۔ عورتوں نے گھر کا ضروری کام کاج بند کر کے سینما دیکھنا سب سے زیادہ ضروری سمجھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پورا معاشرہ بے حیائی، تن آسانی اور نکمے پن کا شکار ہو گیا۔ سینما ہی کی تباہ کاریاں کیا کچھ کم تھیں کہ ان کے پیٹ سے نکلے ہوئے بچے ٹی وی اور ویڈیو وغیرہ نے تو قیامت ہی ڈھا دی۔ سینما کے محل سرا تک پہنچنے کے لیے بڑی مشکل سے رسائی حاصل ہوتی تھی لیکن اس کی فتنہ خیز اولاد کی پہنچ تو گھر گھر ہے۔ ان کا پیدا کردہ یہ انقلاب کتنا روح فرسا اور دردناک ہے کہ ایک طرف گھر میں ماں کا جنازہ رکھا ہوا ہے اور دوسری طرف بہو بیٹیاں ٹی۔وی اور ویڈیو سے لطف اندوز ہو رہی ہیں۔

ٹی۔وی کی ایجاد کا سہرا اسکاٹ لینڈ کے سائنس داں جان لاگی بیرڈ John Logie Baird کے سر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن وہ سمندر کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ اس کے کانوں میں گانے کی آواز آئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تو پتہ چلا کہ کچھ فاصلے پر کسی ہوٹل میں ریڈیو بج رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ لہروں پر آواز کتنی دور سے چلی آتی ہے کیا ان لہروں پر تصویر ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں آجا سکتی؟ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنی کوشش شروع کر دی۔ کچھ عرصے کے بعد اس کی یہ کوشش بار آور ہوئی اور ۱۹۲۶ء میں ایک مکمل ٹیلی وژن بن کر تیار ہو گیا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۲۹ء کو بی بی سی لندن سے بیرڈ کے طریقۂ ایجاد کے مطابق پروگرام پیش کیا گیا۔ اس کے ۳۰ سال کے بعد ہندوستان میں ٹی وی اور دوردرشن کا آغاز ۱۹۵۹ء میں ہوا اور تھوڑی سی مدت میں گھر گھر پہنچ گیا۔ سینما ہو یا ٹی وی یا کیبل ٹی وی اور ویڈیو وغیرہ کم و بیش سب کے نقصانات مشترک ہیں۔ ان نقصانات کی ایک لمبی فہرست ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۔ ان سبھی تفریحات میں انسان کا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے اور وہ اسے اپنی تعمیر و ترقی میں صرف نہیں کر سکتا۔ سینما سے بہت زیادہ وقت ٹی۔وی اور ویڈیو وغیرہ میں صرف ہو جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ٹی وی دیکھنے والا دن بھر میں اوسطاً چار گھنٹے خرچ کرتا ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی پڑھائی اور عورتوں کے کام کاج کا زبردست نقصان ہوتا ہے عبادت میں خلل پڑتا ہے اور نہایت ضروری کام بھی وقت پر انجام نہیں پاتے۔

۲۔ جن گھروں میں ٹی وی اور ویڈیو وغیرہ ہیں وہاں بچوں کے امتحانات کے نتیجے اچھے نہیں ہوتے

۳۔ ٹی وی ایک الیکٹرانک مشین ہے اس کی کرنیں نازک اعضاء و جوارح کے لیے نہایت نقصان دہ ہیں۔ امریکہ کے بوسٹن نامی شہر کے صرف ایک ہسپتال

کے جائزے کے مطابق چھ سو لڑکے لڑکیاں خونی کینسر میں مبتلا پائے گئے۔

۴۔ جرمنی کے ایک ماہر صحت کے خیال کے مطابق دل و دماغ اور اعصاب کے لیے یہ آہستہ آہستہ اثر کرنے والا زہر (سلو پوائزن) ہے۔

۵۔ امریکہ کی بصارت پیمائی (اپٹومیٹری) کی انجمن کی رپورٹ میں درج ہے کہ ٹیلی ویژن دیکھنے سے آنکھوں پر نہایت برا اثر پڑتا ہے اور وہ انسان کو وقت سے پہلے اندھا بنا دیتی ہے۔

۶۔ تیز آواز میں اگر ٹی وی وغیرہ کا مسلسل استعمال کیا جائے تو اس سے قوت سماعت متاثر ہوتی ہے اور بہرہ پن بھی لاحق ہو سکتا ہے۔

۷۔ اعصاب پر ٹی وی شعاعوں کا خاص طور سے اثر پڑتا ہے۔ دو طوطے جن کا پنجرہ ٹی وی سیٹ کے سامنے رکھا تھا، ان کے دونوں پر بیکار ہو گئے۔

۸۔ جو لوگ کھانا کھاتے وقت بھی اپنا ٹی وی کھلا رکھتے ہیں، ان کا نظام ہضم اس سے متاثر ہوتا ہے اور ہاضمہ میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔

۹۔ حاملہ عورتیں بھی ٹی وی کی شعاعوں سے متاثر ہو جاتی ہیں۔ تجربے کے طور پر ڈاکٹر ایچ پی شوین نے ایک حاملہ کتیا پر دو ماہ تک ٹیلی ویژن کی شعاعیں پڑنے دیں۔ کتیا نے چار بچے دیے اور چاروں بچے فالج زدہ تھے۔ ان میں تین اندھے بھی تھے۔

۱۰۔ ٹی وی کی مسلسل شعاعیں کبھی جنسی تبدیلیاں بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ ڈاکٹر جان میکڈونالڈ نے ایک نر طوطے کو اس کمرے میں رکھا جہاں گھنٹوں ٹیلی ویژن چلتا رہتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد طوطے کی چونچ پر نیلے رنگ کا ایک نقطہ نمودار ہوا۔ اس کے بعد اس نر طوطے نے تین انڈے دیے۔ گویا ٹی وی کی ایکسرے شعاعوں نے نر کو مادہ میں تبدیل کر دیا۔

۱۱۔ جرمنی کے ماہر نفسیات کے تجربات کی روشنی میں بچوں اور عورتوں پر ٹی وی کا سب سے زیادہ برا اثر پڑتا ہے۔ بچوں سے یہ ان کی معصومیت اور بھولاپن چھین لیتا ہے اور وہ وقت سے پہلے بالغ ہو جاتے ہیں۔ عورتیں اپنی ذمہ داریاں بھول جاتی ہیں۔ باورچی خانہ اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ان کو وقت نہیں ملتا۔ کسی نہ کسی بیماری کا بہانہ بنا کر وہ زیادہ تر اسی بیماری میں مبتلا رہتی ہیں۔

۱۲۔ ٹی وی پر جو جرم ناک مناظر پیش کیے جاتے ہیں، بچے بہت جلد متاثر ہو کر ان کی نقل شروع کر دیتے ہیں۔

۱۳۔ ہمارے ممتاز ادیبوں اور صحافیوں کا کہنا ہے کہ ٹی وی اور ویڈیو وغیرہ ادب کے بھی دشمن ہیں۔ ادب کی کسی کتاب کا مطالعہ کیجیے تو اس میں ٹھہراؤ اور جگہ جگہ غور و فکر کے مقامات بھی

آتے ہیں لیکن ٹی وی میں ایسا نہیں ہوتا
اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ بغیر ہضم
کیے کھاتے چلے جا رہے ہیں۔

۱۴۔ مسلسل ویڈیو دیکھنے کا شوق
کسی "نشے" سے کم نہیں اور اس نشے سے
پھر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو
زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

۱۵۔ اب تو فحش فلموں کے دکھانے کے
لیے باقاعدہ جا بجا بے شمار اڈے بن گئے
ہیں جہاں منہ مانگی رقمیں دے کر لوگ
گندی فلمیں دیکھتے ہیں۔ دو چار مہینے
میں دکھاوے کے لیے پولس کے ایک
دو چھاپے بھی پڑ جاتے ہیں اور ان کا
یہ کارنامہ اخبار میں بھی چھپ جاتا ہے لیکن
اس کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر نئی
نسل کا یہ شوق اور فحاشی کے سینٹر
اسی طرح قائم رہے تو کچھ ہی دن کے بعد
بدمست و بدکردار جوانوں کی ایک بہت
بڑی فوج تیار ہو جائے گی۔

## تدارک

ٹی وی اور ویڈیو وغیرہ کی بے پناہ مقبولیت
کو دیکھتے ہوئے فی زمانہ ان پر پہرا بٹھانا تو ہمارے
لیے ممکن نظر نہیں آتا لیکن اگر ہم سب مل کر اس بات
کی کوشش کریں کہ ان میں جو فائدے ہیں انھیں
باقی رکھا جائے اور جو نقصانات ہیں ان کو ختم کیا جائے
تو اس طرح ہم ان کے فتنے سے ایک حد تک محفوظ
رہ سکتے ہیں۔

سینما اور ٹی وی میں حسب ذیل فائدے بھی ہیں

۱۔ اصلاحی اور معلوماتی فلمیں عوام کے
لیے مفید ہیں۔

۲۔ ٹی وی پر روزانہ کی خبریں، روزمرہ
کے مسائل، سیاسی و معاشی حالات، ان
پر جائزے و تبصرے ان سب کی افادیت
سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ بچوں کے لیے دلچسپ انداز میں
جو تعلیمی و تربیتی پروگرام پیش کیے جاتے
ہیں وہ بچوں کی ذہنی صلاحیت کو
بڑھاتے ہیں۔

۴۔ سائنسی معلومات اور نت نئے
انکشافات سے آگاہی حاصل ہوتی
ہے۔

۵۔ مشاعرے اور کوی سمیلن کے
ذریعے ایک طرف شعر و ادب فروغ
پاتا ہے تو دوسری طرف شاعروں اور
ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

۶۔ ماضی کی اہم شخصیتوں سے واقفیت
حاصل کر کے پرانے دور کی یاد تازہ ہو جاتی
ہے۔

۷۔ کسانوں کے لیے فصلوں کو نئے
طریقوں سے اگانے، درختوں کی قلمیں
لگانے اور ان کی حفاظت کرنے، نیز
حیوانات کی پرورش اور ان کو مختلف
بیماریوں سے بچا لے کے جو نئے نئے
ڈھنگ بتائے جاتے ہیں وہ بلاشبہ
نفع بخش ہیں۔

۸۔ کھلاڑیوں کے ملک اور بیرون
ملک ہونے والے کھیل کے مقابلوں
کا آنکھوں دیکھا حال اور ورزش کے

جو مختلف طریقے سکھائے جاتے ہیں وہ
یقیناً سودمند ہیں۔

۹۔ گھر بیٹھے ہر جگہ کے موسمی حالات و
تغیرات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔
اوپر کے نقصانات اور فائدوں کو سامنے
رکھ کر اگر حکومت وقت، با اثر جماعتیں ادارے اور
باشعور عوام سب ہی مل کر فائدوں کو بڑھانے
اور نقصانات کو ختم کرنے کی مخلصانہ جدوجہد کریں
تو یقیناً اس کے بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔
آج کل امریکہ، برطانیہ اور دیگر ترقی یافتہ ملکوں
میں کیبل ٹی وی کو تعلیمی و تربیتی مقاصد کے لیے
استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمیں بھی اس کی طرف
توجہ دینی چاہیئے۔

---

"دین کے معاملے میں کسی طرح کا جبر نہ کرو کیونکہ
ہدایت کی راہ گمراہی کے راستے سے بالکل الگ
اور نمایاں ہے۔"

(سورۃ بقرہ۔ آیت ۲۵۶)

---

حضرت سعید بن زید راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا:
"ظلم بدترین گناہ ہے، قیامت کے دن ظالم
پر سخت وحشت طاری ہو جائے گی۔"
(بخاری)

# صابن سازی

سید عاصم محمود ○

صابن کو گھروں میں ہمارے رکنِ خاندان کی حیثیت حاصل ہے۔ مرد، عورت، بچے بوڑھے سب ہی اس کو استعمال کرتے نظر آتے ہیں لیکن اکثر لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ صابن کیسے تیار ہوتا ہے۔

جب چربی یا نباتی تیل کاسٹک سوڈے کے ساتھ چند گھنٹوں کے لیے کسی بڑے برتن میں گرم کیا جائے تو اس سے صابن وجود میں آتا ہے۔ صابن سازی میں گلیسرین کے مرکب کو ریزہ ریزہ کرکے سیال کی شکل میں لایا جاتا ہے: تاکہ چربی اور کاسٹک سوڈے کے مرکب میں شامل ہو سکے۔ اس طرح کیمیائی طور پر صابن سوڈا پوٹاش (عموماً سوڈیم) اور چکنائی کا مرکب ہوتا ہے۔

صابن کی تیاری میں عموماً جانوروں کی چربی استعمال نہیں ہوتی۔ خاص طور پر بڑے صابن ساز ادارے جانور کی چربی بالکل استعمال نہیں کرتے۔ یہ ادارے صابن بنانے میں مختلف قسم کے نباتی تیل ملا کر صابن تیار کرتے ہیں۔ یعنی جس قسم کا صابن ہوگا اسی قسم کا تیل استعمال ہوگا۔ صابن کی تیاری میں جو تیل استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ پام آئل، ناریل کا تیل، سرسوں کا تیل، نیم کا تیل، زیرہ کا تیل۔ یہ تیل نہ صرف انسانی جلد کے لیے کارآمد ہوتے ہیں۔ بلکہ کم لاگت سے بھی استعمال کے قابل ہو جاتے ہیں۔

صابن کے معیار کا اندازہ آپ اس تیل کے ذریعے لگا سکتے ہیں جس سے وہ بنایا جاتا ہے مثال کے طور پر جب ہم ایک صابن جس میں ناریل کا تیل ملا ہو استعمال کریں تو ہماری جلد نرم و نازک اور ملائم ہو جاتی ہے۔ اس طرح اگر ہم چاول کے بھوسے سے بنے ہوئے تیل کا صابن استعمال کریں تو ہمیں اپنے جسم سے خوشبو پھوٹتی ہوئی محسوس ہوگی۔ اس طرح اگر ہم وہ صابن استعمال کریں جس میں کسی جانور کی چربی ملی ہوئی ہو تو ہماری جلد سخت اور کھردری ہو جائے گی۔ عام طور پر منہ ہاتھ یا نہانے کا صابن، کپڑے دھونے کے صابن سے زیادہ بہتر کارآمد لیکن مہنگے ہوتے ہیں۔

## صابن کی تیاری

سب سے پہلے مختلف تیلوں کا مرکب کاسٹک سوڈے کے ساتھ (اگر مائع صابن بنانا ہو تو پوٹاشیم ہائیڈرو آکسائیڈ) ایک بڑے دیگچے میں جسے پان

○ ۶۱/۷ - سیٹلائٹ ٹاؤن - راولپنڈی

(Pan) کہتے ہیں گرم کیا جاتا ہے۔ پان کا نچلا حصہ مخروطی ہوتا ہے۔ اس مخروطی حصہ کو گرم کیا جاتا ہے جس سے پان میں بھاپ جمع ہو جاتی ہے جو مرکب کو متحرک کرنے کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہے۔ صابن بنانے کے لیے بڑے پان میں تیل کا کچھ حصہ شروع میں ڈالا جاتا ہے۔ ان کو آہستہ آہستہ گرم کیا جاتا ہے۔ جوں جوں وہ گرم ہوتا ہے اس میں کاسٹک سوڈا شامل کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ سارا تیل اور کاسٹک سوڈا پان میں ڈال دیا جاتا ہے اور اس طرح صابن تیار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جب یہ عمل پورا ہو جاتا ہے تو اس مرکب میں سمندری نمک ملایا جاتا ہے۔ صابن اس نمک کے محلول میں جلدی حل نہیں ہوتا لیکن گلیسرین نمک کے پانی میں جلد حل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لہٰذا پان کے اندر صابن کا مرکب دو تہوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اوپر والی تہہ دار صابن اور نیچے والی تہہ گلیسرین پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے نیچے والی تہہ یعنی گلیسرین نکال لی جاتی ہے اور صرف صابن والی تہہ رہ جاتی ہے۔

یہ صابن دانے دار ہوتا ہے لیکن گلیسرین نکلے جانے کے باوجود اس صابن میں گلیسرین کی کچھ مقدار شامل رہتی ہے جس کو دور کرنے کے لیے اسے نمک کے پانی میں کئی بار دھویا جاتا ہے۔

صابن کو کیونکہ نمک ملے پانی سے دھویا جاتا ہے اس لیے اس میں نمک کی تھوڑی سی مقدار شامل ہو جاتی ہے۔ آخری بار دھونے کے بعد اس دانے دار شکل والے صابن کو چند دنوں کے لیے رکھ دیا جاتا ہے تاکہ وہ مکمل طور پر خشک اور جم جائے۔

جمنے کے بعد صابن کے مرکب کو دوبارہ پان میں ڈالا جاتا ہے جہاں اس مرکب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایک حصہ جو سیاہی مائل ہوتا ہے وہ "گھٹیا صابن" اور جو حصہ صاف ہوتا ہے وہ "بڑھیا" صابن کہلاتا ہے۔

سیاہی مائل حصہ گھٹیا درجے کے صابن ... [illegible]

صاف بڑھیا حصہ بڑھیا قسم کے صابن بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔ صاف قسم کے صابن میں تیس فیصد نمی ہوتی ہے جو انسانی جلد کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے ایک خاص قسم کے پان میں ڈال کر خشک کیا جاتا ہے جس سے نمی صرف دس فی صد رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد اس صابن کے مرکب میں کچھ کیمیائی اشیا جو صابن کے مضر اثرات کو کم کرتی ہیں، ڈالی جاتی ہیں اور اس کے صابن کو خوشبودار بنانے کے لیے خوشبو اور رنگین بنانے کے لیے رنگ شامل کیے جاتے ہیں۔

اس کے بعد اس صابن کے مرکب کو "رولرمل" میں ڈال کر ہموار کیا جاتا ہے جس سے یہ لمبی پٹی کی شکل میں آ جاتا ہے۔

یہ پٹیاں بعد میں پلوڈر (Plodders) میں ڈال دی جاتی ہیں، جہاں وہ صابن کی شکل میں تیار ہوتی ہیں۔ پلوڈر کے باہر والے حصے میں کاٹنے والی مشین لگی ہوتی ہے جو باہر نکلنے والی پٹی کو صابن کے سائز میں کاٹتی جاتی ہے اور اس طرح ایک صابن عالم وجود میں آتا ہے۔ مائع صابن بنانے کا طریقہ تھوڑا سا مختلف ہے۔ مائع صابن کاربولک ایسڈ اور کریزلک ایسڈ Cresylic acid کا مرکب ہوتا ہے۔ اس طرح شیمپو میں پوٹاشیم اور امونیم شامل کیا جاتا ہے۔ جو اس کو چکنائی سے پر کر دیتے ہیں جو شیمپو کا لازمی جزو ہے۔

جب سے ڈیٹرجنٹ صابن وجود میں آئے ہیں عام کپڑے دھونے کے صابن کی مانگ روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ آئندہ شاید صرف "صاف" صابن یعنی منہ ہاتھ دھونے کے صابن ہی باقی رہ جائیں گے۔

---

# نیوکلیائی توانائی ـــــ بطور معالج

محمد اسلم پرویز ○

نیوکلیائی توانائی کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں ایک خطرناک بم کا تصور ابھرتا ہے اور آنکھوں کے سامنے ہیروشیما اور ناگاساکی کے کھنڈرات گھومنے لگتے ہیں دراصل یہ نیوکلیائی توانائی کا وہ بھیانک رخ ہے جس کے متعلق ہم عام طور سے سنتے رہتے ہیں لیکن اس توانائی کے کئی تابناک پہلو بھی ہیں جن سے لوگ نسبتاً کم واقف ہیں کیونکہ انھیں اس ڈھنگ سے شہرت حاصل نہیں ہے۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو ہمارے عام استعمال میں آتی ہیں، ہمارے اردگرد رہتی ہیں لیکن ہم نہیں جانتے کہ ان کا کوئی تعلق نیوکلیائی توانائی سے ہوگا۔ ہماری بہت سی فصلیں، بہت سی دوائیں کئی قسم کے پھل اور کیمیائی مادے اسی توانائی کے استعمال کی وجہ سے آج ہمارے تصرف میں ہیں۔ توانائی کے متبادل وسیلے کے طور پر تو اس سے ہم سب واقف ہی ہیں۔ آپ کسی نہ کسی مرحلے میں ایکسرے مشین سے ضرور دوچار ہوئے ہوں گے لیکن شاید آپ نے سوچا بھی نہ ہو کہ ایکسرے میں کام آنے والی وہ شعاعیں جن کو ہم نہیں دیکھ سکتے لیکن جو ہمارے نہاں خانوں کو افشا کر دیتی ہیں، اسی توانائی سے متعلق ہیں۔

زندگی کی ابتداء سے ہی انسان کا تعلق شعاعوں سے ر ہے جن شعاعوں سے اس کا پہلا تعلق قائم ہوا وہ شمسی توانا تھی۔ سورج کی روشنی سے انسان ازل سے ہی مستفید ہو رہا ہے اور ان کے فیض سے متاثر ہو کر ایک دو میں انسانوں نے سورج کی پوجا بھی کی ہے اور محدو پیمانے پر یہ رسم کچھ فرقوں میں آج بھی جاری ہے۔ سورج روشنی دراصل بہت ساری شعاعوں کا مجموعہ ہے میں سے کچھ کو ہماری آنکھ دیکھ پاتی ہے جب کہ کچھ ہ دائرۂ بصارت سے باہر واقع ہوتی ہیں۔ جن شعاعو ہم دیکھ نہیں پاتے وہی مختلف طریقوں سے ہمار علاج میں مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔ اس مید میں ہونے والی ترقیات کے نتیجے میں ان شعاعو اب مصنوعی طریقے سے بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ہما اردگرد پائی جانے والی ہر چیز ایٹم سے بنی ہے جس ہر چیز کی بنیادی اکائی کہہ سکتے ہیں، یہ ایٹم جو کہ بذات نہایت چھوٹے ہوتے ہیں (ایک ایٹم کا نصف قطر ملی میٹر کا ایک کروڑواں حصہ ہوتا ہے) تین بنیادی

○ لکچرار باٹنی ڈپارٹمنٹ، ذاکر حسین کالج (دہلی یونیورسٹی)، اجمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

سے مل کر بنتے ہیں۔ جن کو الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون کہتے ہیں، یہ ذرات ایٹم کے مقابلے میں بہت چھوٹے ہوتے ہیں (اُن کا قطر ایٹم سے دس ہزار گنا کم ہوتا ہے) ایٹم کی بناوٹ بڑی حد تک نظامِ شمسی سے ملتی ہے۔ جس طرح نظامِ شمسی کے مرکز میں سورج ہے، اسی طرح ایٹم کے مرکز میں نیوکلیس ہوتا ہے جو کہ پروٹون اور نیوٹرون سے مل کر بنتا ہے پروٹون پر مثبت برقی چارج ہوتا ہے جب کہ نیوٹرون پر کوئی چارج نہیں ہوتا۔ جس طرح سورج کے گرد مختلف مقررہ جگہوں پر سیارے گردش کرتے ہیں، بالکل اسی طرح نیوکلیس کے گرد الیکٹرون گردش کرتے ہیں کہ منفی برقی چارج رکھتے ہیں۔ ان پر منفی چارج نیوکلیس میں موجود پروٹون پر پائے جانے والے مثبت چارج کے برابر ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی ایٹم کے نیوکلیس میں ۸ پروٹون ہیں یعنی آٹھ مثبت چارج ہیں) تو اس کے چاروں طرف آٹھ الیکٹرون گردش کریں گے۔ جن پر کل ملا کر آٹھ منفی چارج ہوں گے۔ درحقیقت نیوکلیس کی بناوٹ اتنی سادہ نہیں ہوتی، اس پر پروٹون اور نیوٹرون کے علاوہ تیس سے بھی زیادہ دیگر ذرات پائے جاتے ہیں لیکن اس موضوع کو پیچیدگی سے بچانے کے لیے صرف اہم ذرات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

نیوکلیس کے گرد چکر لگانے والا ہر الیکٹرون ایک خاص مقام پر گردش کرتا ہے جو کہ اس کی توانائی کا مظہر ہوتا ہے۔ اگر کسی الیکٹرون کو اس کی توانائی کی سطح سے ہٹا دیا جائے تو اس میں بے چینی اور قوتِ عمل بڑھ جاتی ہے۔ جب وہ اپنی بنیادی جگہ پر واپس آتا ہے تو اس میں سے توانائی خارج ہوتی ہے۔

۱۸۹۵ء میں ایک جرمن سائنس داں رونٹجن نے ایک خاص عمل کے ذریعے ایک نئی قسم کی شعاع مصنوعی طور سے پیدا کی جس کا نام اس نے ایکسرے رکھا۔ ان نظر نہ آنے والی شعاعوں [illegible]

میں سرایت کرنے کی یا اُن سے پار نکل جانے کی صلاحیت رکھتی تھیں اور فوٹوگرافک فلم پر یہ نشان بھی چھوڑتی تھیں۔ یعنی جس طرح روشنی فوٹوگرافک فلم کو متاثر کرتی ہے اسی طرح یہ شعاعیں بھی فوٹو بنا سکتی ہیں۔ بعد ازاں ان دونوں خصوصیات کو استعمال کرتے ہوئے سائنس دانوں نے ایکسرے مشین ایجاد کی۔ ایکسرے میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ یہ ہلکے قسم کے مادے سے گزر جاتی ہیں جب کہ بھاری اور ثقیل مادے ان کو روک لیتے ہیں۔ جب جسم کے کسی حصے کا ایکسرے لیا جاتا ہے تو یہ شعاعیں اس جگہ کے گوشت میں سے آسانی سے گزر جاتی ہیں لیکن ہڈیاں چونکہ ثقیل مادے سے بنی ہوتی ہیں اس لیے وہاں یہ رک جاتی ہیں اور اسی فرق کی بنیاد پر جو فوٹو حاصل ہوتا ہے اس میں ہڈیوں کی واضح شکل موجود ہوتی ہیں۔ اسی بنیاد پر آج ایکسرے کی مدد سے اور بھی بہت سی مختلف چیزوں کی جانچ کی جاتی ہے۔

ایکسرے کے کچھ مضر اثرات بھی ہیں جن پر سے پردہ ۱۹۲۷ء میں اُٹھا۔ یہ شعاعیں کافی توانائی رکھتی ہیں اس لیے جب یہ کسی مادے پر ڈالی جاتی ہیں تو یہ اس کے ایٹمی ڈھانچے میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہیں۔

نیوکلیائی عملات کے نتیجے میں ایک اور خاص قسم کے ذرات بنتے ہیں جن کو ریڈیو آئسوٹوپ (Radio - Isotope) کہا جاتا ہے۔ اگر کسی طریقۂ کار سے ایٹم کے نیوکلیس کو ناپائیدار کر دیا جائے تو اس عدمِ استحکام کی وجہ سے ان میں کچھ خاص قسم کے ذرات اور شعاعیں نکلتی ہیں جن میں بیٹا اور ایلفا ذرات اور گاما شعاعیں قابلِ ذکر ہیں۔ یہ شعاعیں بھی فوٹوگرافک فلم پر ایکسرے کی طرح اپنا اثر چھوڑتی ہیں جو کہ فوٹو کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان شعاعوں کو ایکسرے [illegible]

ستعمال کیا جاتا ہے اور اس طریقۂ علاج کو ریڈیو تھیریپی
کہتے ہیں۔ یعنی ریڈیائی شعاعوں کے ذریعے علاج۔ اس
طریقۂ علاج کے پیچھے بھی ان کی یہ خاصیت پوشیدہ ہے
کہ ثقیل مادے ان کو روکتے ہیں اور ہلکے مادوں
سے یہ گزر جاتی ہیں۔ جب جسم کے کسی حصے میں کینسر ہوتا
ہے تو وہاں ان شعاعوں کو ڈالا جاتا ہے۔ کینسر بھی ایک
قسم کے سیل (خلیے) ہوتے ہیں جو جسم کے دیگر صحت مند
سیلوں کے ساتھ ہی موجود رہتے ہیں لیکن کینسر کے سیل
بڑے ہوتے ہیں اور عموماً ان میں ثقیل مادہ کچھ زیادہ
ہوتا ہے، اس لیے ان پر یہ شعاعیں زیادہ کارگر ہوتی
ہیں اور ان کو ہلاک کر دیتی ہیں۔ اگرچہ اس جگہ کے
صحت مند سیل بھی متاثر رہتے ہیں لیکن اس حد
تک نہیں۔

اگرچہ نیوکلیائی توانائی کے میدان میں ہم کچھ
ترقی یافتہ ممالک سے ضرور پیچھے ہیں لیکن نیوکلیائی
علاج کے میدان میں ہندوستان کا مقام کافی آگے
ہے۔ ہم میں سے بہت کم لوگ اس بات سے واقف
ہوں گے کہ دہلی کے تیمارپور
کے علاقے میں نیوکلیائی
دواؤں و متعلقہ سائنس
کا ایک انسٹی ٹیوٹ ہے
جو کہ اس میدان میں
اتنی مہارت رکھتا ہے کہ
اس کی رائے حرف
آخر بھی جاتی ہے۔ یہ
ادارہ ۱۹۶۱ء میں قائم
ہوا تھا اور ۱۹۶۲ء میں
یہ دنیا کا ایسا پہلا ادارہ
بن گیا تھا جس میں کہ اعلیٰ سطح پر نیوکلیائی دواؤں سے
متعلق تعلیم کا انتظام تھا۔ اس اسپتال کے دو اہم
شعبے ہیں ایک میں تھائی رائڈ گلینڈ (Thyroid
Gland) سے متعلق ریسرچ ہوتی ہے اور یہ دنیا
کے دس بہترین تحقیقی اداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔
دوسرے شعبے میں مختلف اعضا کی عکاسی کی جاتی
ہے۔ ان دونوں شعبوں میں روزانہ ڈیڑھ سو سے
زائد مریضوں کا علاج ہوتا ہے جو کہ ملک کے کونے
کونے سے آتے ہیں۔

بھوپال گیس حادثے کے شکار لوگوں
کے علاج میں بھی اس ادارے نے بڑا اہم کردار
ادا کیا ہے۔ اس حادثے سے کافی عرصے قبل
اس ادارے نے خون اور پیشاب میں تھائیوسائنیٹ
(Thiocyanate) نامی زہر کی آمیزش
دریافت کرنے کے طریقے دریافت کر لیے تھے۔ اس
دریافت کی روشنی میں بھوپال حادثے کے مریضوں
کے پیشاب کے نمونے یہاں لائے گئے اور یہاں
یہ بات ثابت ہوئی کہ وہ جس زہریلی گیس کا شکار ہوئے
ہیں، اس میں سائنائیڈ
بھی شامل تھی۔ اس
گیس کے توڑ کے لیے
ان متاثرین کو تھائیوسلفیٹ
(Thiosulphate)
کے انجکشن لگانے کا مشورہ
بھی اسی ادارے سے
دیا گیا تھا۔
اعضا کی عکاسی
کرنے والے شعبے میں
بھی ایسی اعلیٰ ترین سہولتیں
موجود ہیں، جن کی مدد سے بغیر آپریشن کے کینسر اور

> "صفوان بن سہیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ
> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
> "جب کوئی شخص صدق و اخلاص کے ساتھ اچھے
> کام کرتا ہے اور دفعتاً بیمار پڑ جاتا ہے تو اللہ
> تعالیٰ بیماری کے زمانے میں بھی اسے اتنا ہی اجر و
> ثواب عطا فرماتا ہے جتنا کہ صحت میں اسے دیا
> جاتا ہے۔"
>
> مشارق

رسولی وغیرہ کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں پر ابھی حال ہی میں سینے کے کینسر کو جانچنے کا بھی بڑا اچھا انتظام ہوا ہے۔ اس ادارے کے علاوہ ہر چھوٹے بڑے اسپتال میں نیوکلیائی علاج کی بڑے پیمانے پر سہولتیں موجود ہیں جن سے لاکھوں افراد فائدہ اُٹھا رہے ہیں —
نیوکلیائی توانائی سے خطرات تو محض اندیشوں پر منحصر ہیں لیکن اس سے پہنچنے والے فائدے تو ٹھوس حقیقت کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں، جن کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نیوکلیائی توانائی کے پُرامن استعمال کے لیے ہماری حکومت ہمیشہ سے کوشاں رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

(از سائنس پارے)

اِسلام میں جیسی توحید پرستی میں نے پائی ہے وہ کسی دوسرے مذہب میں موجود نہیں اور اسلام کی اسی توحید پرستی نے مجھے سب سے پہلے اس مذہب کی جانب رجوع کیا۔ اِسلام میں جو سب سے بڑی خوبی میں نے پائی وہ یہ ہے کہ وہ صرف روحانی ترقی ہی کا حامی نہیں ہے بلکہ وہ دنیاوی ترقی میں بھی بہت بڑا ممد و معاون ہے۔ وہ انسان کو گوشہ نشینی اور راہبانہ زندگی گزارنے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہ انسان کو کارگاہِ حیات میں آگے بڑھنے کی بھی ترغیب دیتا ہے۔ وہ دینی معاملات ہی میں انسان کی رہنمائی نہیں کرتا بلکہ دنیا کے ہر معاملے میں انسان کو راستہ بتاتا ہے اور قدم قدم پر انسان کو روشنی دکھاتا ہے اسلام نے دنیا کو عاقبت کی کھیتی قرار دیا ہے اور اسے حکم دیا ہے کہ وہ دینی فرائض ادا کرنے کے ساتھ دنیاوی فرائض سے بھی غافل نہ رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ سائنسی دور میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ دے سکتا ہے۔

(قسط ۲)

# جنوبی ہند کے سرسیّد

محمد اسلم صدیقی ○

**ایک عجیب منظر:**

جشنِ الماسی میں ان کے عقیدت مندوں اور پرستاروں کی کثرت دیکھ کر ششدر و حیران تھا۔ گمان ہوتا تھا کہ شاید انھیں دینی مرشد کا مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ مدراس، حیدر آباد، بنگلور وغیرہ کے علاوہ سری لنکا ملیشیا، سنگاپور، ہانگ کانگ اور کہاں کہاں کے صاحبِ حیثیت و ثروت ان کی خدمت میں پروانہ وار حاضر ہوتے اور بصد عجز و نیاز خاموشی سے نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ڈاکٹر صاحب کمالِ استغنیٰ و انکسار کے ساتھ پیش کردہ ہزاروں کی رقمیں کالج کے پرنسپل کی طرف بڑھا دیتے تھے اور وہ ان لوگوں کو اپنے دفتر میں لے جا کر رقم شمار کرتے اور رسید عطیہ حوالہ کر دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بہت رات گئے تھکے ماندے پلنگ پر آتے تو بتلاتے کہ آج اتنی رقم آئی ہے۔ اس سے کالج کا فلاں بلاک بنے گا۔ طبیہ کالج اور اسلامیہ عربی کالج کے لیے اتنی رقم مختص کر رہا ہوں۔ حکیم صاحب اور راقم انھیں کے یہاں مقیم تھے۔ ان کی باتیں سنتے، دیکھتے اور حیرت زدہ ہوتے

اسی موقعہ پر وہاں شفاء الملک حکیم عبد اللطیف مرحوم نے موصوف کے متعلق راقم سے فرمایا کہ "اس زمانے میں ایسے لوگ نایاب ہیں۔ افسوس کہ علی گڑھ والوں نے یہ جشن اور منظر نہیں دیکھا باستثنائے چند۔ اور آپ کی جیسی قدر کی جانی چاہیئے تھی، نہیں کی اور تنگ نظری کا شکار ہوگئے علی گڑھ کے لوگوں کو اندازہ نہیں کہ وہ جنوب کے سرسیّد ہیں اور سرسیّد کے تو بہت سے ہم عصر مخالف بھی تھے اور یہاں صرف ان کے پرستاروں کا ہجوم ہے اور پرستش ہو رہی ہے۔" شفاء الملک کا یہ فرمانا عین حقیقت پر مبنی تھا۔ بالکل یہی تاثر رشید احمد صدیقی نے بھی ڈاکٹر عبد الحق کے متعلق 'ہم نفسان رفتہ' میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جب جشن الماسی سے فارغ ہو کر علی گڑھ تشریف لائے تو اپنے ساتھ اس جشن کی فلم بھی ساتھ لائے اور اس کو اسٹریچی ہال میں دکھلایا گیا۔ یونیورسٹی کے لوگوں نے دیکھا تو ششدر رہ گئے۔ اس لیے نہیں کہ یہ جشن عظیم الشان تھا۔ یہاں یونیورسٹی میں بڑے بڑے جشن منائے گئے ہیں مگر وہاں کے جشن میں

---

○ غ ۱۱/۴، ۱۰، لاج، سرسید نگر، علی گڑھ

جو خاص بات تھی، جس کا اوپر ذکر گزر چکا ہے وہ اپنی نوعیت اور اثرات کے لحاظ سے یقیناً فقید المثال تھا۔ اس کو دیکھ کر لوگوں نے بے ساختہ ان کی خدمات کی تعریف و توصیف کی۔ راقم کے مرتبہ خطوط میں موصوف کا ایک خط محفوظ ہے جو انھوں نے اس جشن کے بعد لکھا تھا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

" مدراس

مکرم بندہ۔ سلام مسنون

آپ کے دونوں کارڈ ملے لیکن لفافہ اب تک نہیں ملا (لفافہ والے خط میں، راقم نے اس جشن کی کامیابی پر مبارک باد اور اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا) بہرحال تفصیلات کا انتظار ہے، اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی۔ یوں بھی واپسی کے بعد میں بہت سے کام رہ گئے تھے، انھیں نپٹانا تھا۔ آج جواب لکھ رہا ہوں۔"

آگے لکھتے ہیں:

" آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ واپسی میں تکلیف سفر مزید زحمت ہے لیکن سوائے اس کے میں کیا کر سکتا تھا۔ زحمت دینا ضروری تھا۔ ورنہ کار برآری نہ ہوتی۔ حکیم صاحب کو سلام مسنون۔ ہمارے دواخانہ کی رسم افتتاح شاید ۱۵ر جنوری (۵۶ء) کو ہو۔ ایک ہفتہ میں شاید کرنول جانے کا موقع ہو۔ جو کچھ پھیلا یا گیا ہے انھیں اب سمیٹنا ہے۔

والسلام

۱۰ر جنوری ۵۶ء

اور یہ خط اردو میں تحریر فرمایا تھا۔ اس سے ان کی اردو پرستی کا ثبوت ملتا ہے۔ کچھ ہی عرصہ بعد وہ علی گڑھ چھوڑ کر چلے گئے اور مدراس پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہو گئے، اور بعد میں اس کے چیئرمین بھی رہے۔

سیٹھ حاجی جمال محمد، جن کے گراں قدر عطیہ سے منٹو سرکل مسلم یونیورسٹی میں "جمالیہ ہوسٹل" یادگار ہے، ان کی خواہش اور ڈاکٹر صاحب کے مشورہ اور رہنمائی میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے مثل، مدراس میں اسلامی ثقافت و افکار پر علمی خطبات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کے واسطے حاجی جمال محمد نے سالانہ علمی توسیعی خطبات کے اخراجات کی کفالت کی ذمہ داری لی۔ چنانچہ علامہ محمد اقبال، محمد مارماڈیوک پکتھال، علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے فضلا اور دانشوروں نے خطبات دیے جو چھپ کر بعد مقبول ہوئے اور ان خطبات نے بڑی شہرت پائی۔

انھیں حاجی جمال محمد کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا ہے کہ:

"میری خواہش تھی کہ مدراس کے مختلف کالجوں میں زیر تعلیم طالب علموں کے واسطے ایک ایسا ہوسٹل ہو جس میں مقیم طالب علموں کو دینی تعلیم اور قرآن و حدیث کا بھی درس دیا جائے۔ ایک مجلس میں اس کا ذکر حاجی جمال محمد سے کیا تو انھوں نے اس خیال کو اس درجہ پسند کیا گویا یہ ان کے دل کی بات تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بنگلہ کے سامنے ایک بہت بڑا وسیع اور عظیم الشان بنگلہ کرایہ پر تین سال کے لیے لے لیا اور اس میں مدراس کے مختلف کالجوں کے تقریباً ڈیڑھ سو طلبا کے رہنے کا صرف انتظام ہی نہیں کیا بلکہ ان کو اپنے کالجوں تک جانے کے لیے موٹر بسوں کا کرایہ بھی بطور وظیفہ ماہانہ مقرر کیا۔ اس ہوسٹل کا نام ...

اور معاون نگراں مولانا ابوظفر ندوی اور مولانا ابوالجلال ندوی کو مقرر کیا گیا۔ کئی سال تک یہ ہوسٹل نہایت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ کہنے کو تو یہ ایک ہوسٹل تھا مگر عملی حیثیت سے یہ ایک دینی درس گاہ بھی تھی جس سے ان طلبا کو بڑا فیض پہونچا اور جنوبی ہند کے بعض مشہور افسر، وکلا، ڈاکٹر، کالجوں کے پرنسپل اور سیاست داں اسی ہوسٹل اور دینی درس گاہ کے فیض یافتہ تھے۔"

اپنی نوعیت اور افادیت و اثرات کے لحاظ سے پورے ملک میں یہ ہوسٹل اپنی مثال آپ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ جمال محمد بے حد مخیر اور دل درد مند رکھتے تھے۔ اور اس سلسلے میں یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی جب شدید اقتصادی بحران میں مبتلا ہوا تو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مدراس پہنچے اور وہیں پہلی مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق کی ان سے ملاقات ہوئی۔ آمد کی غرض معلوم ہوئی تو ان کو ساتھ لے کر حاجی جمال محمد کے یہاں پہنچے۔ ان کو صورت حال سے واقف کرایا تو انھوں نے دوسرے دن ذاکر صاحب کو چائے پر مدعو کیا اور ان کے ساتھ مدراس کے اکثر معزز تاجروں کو بھی مدعو کیا اور سب کے سامنے انھوں نے جامعہ کی امداد کی تحریک پیش کی خود اپنے افراد خاندان کی طرف سے سترہ ہزار کا عطیہ پیش کیا اور دوسرے تاجروں سے بھی عطیہ دلایا۔ اس طرح دو تین دن کے اندر تقریباً چالیس ہزار کا گراں قدر عطیہ حاصل ہو گیا اور جامعہ کی مشکلات رفع ہونے کا وسیلہ ہوا۔ چوں کہ ان تمام حسنات اور نیک کاموں میں ڈاکٹر عبدالحق کا بہت اہم حصہ اور رول تھا اس لیے یہاں اس کا مختصراً ذکر کر دیا گیا ہے۔ حاجی جمال محمد کے آبائی وطن ترچناپلی میں ان کے گراں قدر عطیہ اور ڈاکٹر عبدالحق کی کوشش سے "جمال محمد کالج" قایم ہوا جو آج بھی مشہور اور معروف ہے اس کا ذکر ضمناً اوپر گزر چکا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق کے زمانۂ قیام علی گڑھ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی کوٹھی آفتاب منزل میں صاحبزادہ شہزاد احمد خاں کے یہاں ہر ہفتہ باقاعدہ ادبی مجلس منعقد ہوا کرتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب ہی ان مجلسوں کے صدر نشیں ہوتے تھے۔ آپ کے مدراس لوٹنے پر یہ بساطِ ادب ویران اور نوحہ خواں ہو گئی اور جب آپ کی وفات کی المناک خبر پہنچی تو تشنگانِ علم و ادب کی صف میں ماتم غم بچھ گئی گویا:

ویران میکدہ ہے خُم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

ڈاکٹر صاحب کی مدراس واپسی کے موقع پر آفتاب منزل کی محفل ادب میں محمد احمد اللہ نے اپنے اور دوسرے احباب کے تاثرات ایک نظم کی شکل میں پیش کیے تھے۔ یہ نظم آٹھ بند پر مشتمل ہے۔ صفحہ قرطاس کی تنگ دامانی کے باعث صرف تین بند ہدیۂ ناظرین ہیں۔

اے چراغ علم و حکمت، شمع تہذیب متیں
اے سراج معرفت، اے مشعل راہ یقیں
اے کہ روشن ہے تری نور عبادت سے جبیں
اے کہ مسلک ہے ترا ایمائے ختم المرسلیں
زندگی کو تو نے بخشا وہ شعور زندگی
بندگی پر کھل گیا باب کمال زندگی

فصل گل جانے لگی دور خزاں آنے لگا
ناشگفتہ غنچۂ امید کمھلانے لگا
چرخ گرداں بے کسوں پر پھر ستم ڈھانے لگا
جس پہ نازاں تھا چمن وہ باغباں جانے لگا
میکدہ کو ناز تھا جس پر وہ اٹھانے کو ہے
بزم ہے، پر رونق بزم طرب جانے کو ہے

آج کچھ بدلی ہوئی سی ہے بساطِ انجمن
کہہ رہی ہے اور کچھ سب کی جبینوں کی شکن
مضمحل ہے شاعرِ رنگیں بیاں شیریں سخن
ایک جانب مطربِ غم دیدہ ہے یوں نغمہ زن
آج اپنا مایۂ تاب و تواں جانے کو ہے
میکدہ کی خیر ہو، پیرِ مغاں جانے کو ہے

کرنل بسم اللہ بیگ حیدرآبادی بیان کرتے ہیں کہ:

"میں کئی بار کرنول جا چکا تھا۔ اب جو دسمبر ۵۵ء میں کرنول پہنچا تو عربک کالج کی عمارت بن چکی تھی۔ جون ۱۹۵۴ء میں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ سائنس کالج کی عمارت بھی قریب الختم تھی۔ لاکھوں کی عمارت دیکھتے دیکھتے بنتی چلی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس علاء الدین کا چراغ ہے جس کی مدد سے اتنی بڑی بڑی عمارتیں بنتے دیر نہیں لگتی۔ اب پھر ملاّ سیف الدین طاہر نے سیفی ہوسٹل کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔ یہ عمارت بھی دیکھتے دیکھتے پوری ہو جائے گی۔ یہ کام عام انسانوں کے بس کے تو نظر نہیں آتے۔"

غرض وہاں جو بھی پہنچا وہاں کی ترقیاں دیکھ کر حیران ضرور ہوا اور ڈاکٹر صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہوا۔ مولانا عبدالوہاب بخاری (پرنسپل گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایکزکٹیو کونسل کے ممبر رہے ہیں) نے ایک عجیب واقعہ کا ذکر کیا ہے:

"انتقال سے تقریباً دو ماہ قبل مرحوم (ڈاکٹر عبدالحق) نے اپنے مالیات کا جائزہ لیا تھا اور اس حساب کتاب پر اپنے دستخط ثبت فرمائے اور اپنے فرزند اکبر الحاج انوار الحق سلمہٗ (جو مدراس یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے) کے بھی دستخط حاصل کیے اور مجھ کو بھی اس پر گواہ بنایا۔ اس وقت وہ بالکل تندرست تھے۔ رات بہت گزر چکی تھی۔ جب دستخط ہو چکے تو مرحوم پر ایک غیر معمولی طمانیت اور سکون طاری ہوا۔ انھوں نے اپنا حساب کتاب پورا کر دیا تھا۔ کس کو معلوم تھا کہ اس رات میں وہ اس آنے والے دن کی تیاری کر رہے ہیں جو سب پر آنے والا ہے۔"

اس کے کچھ دنوں بعد وہ عثمانیہ کالج کرنول کے ایک ضروری کام سے وہاں پہنچے۔ وہیں ان کو دل کا پہلا اور شدید دورہ پڑا۔ مگر وہ برابر اپنے اور سرکاری فرائض کو پوری تندہی اور انہماک سے انجام دیتے رہے۔ مدراس کے مشہور قلب کے معالجین نے ان کا بار بار معائنہ اور ٹیسٹ کیا اور ہر بار قلب کو اچھی حالت اور اطمینان بخش پایا لیکن آرام کی شرط اور تاکید کرتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ چند ضروری کاموں سے فارغ ہولیں تو لمبی رخصت لے کر آرام کریں گے مگر اس سے پیشتر ہی وہ وقت موعود آن پہنچا جس سے کسی ذی حیات کو مفر نہیں اور اسی دل کے شدید دورے میں ۱۴ مارچ ۱۹۵۸ء کی شب میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی اور ع

"عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا"

انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ان کی وفات کے سلسلے میں مدراس اور کرنول وغیرہ میں مسلسل مختلف اداروں کی جانب سے، بلا تفریق مذہب و ملت، ہفتوں تعزیتی مجلسوں کا سلسلہ جاری رہا اور ہر طبقۂ خیال و حلقہ کے [illegible]

دخیل ہے۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر کراچی سے بابلے دو مولوی عبدالحق نے لکھا تھا:

"افضل العلماء مولوی عبدالحق کے انتقال کی خبر سن کر مجھے ذاتی طور پر تو صدمہ ہوا ہی لیکن ان کی وفات ایک قومی سانحہ ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں عالم اور علم دوست تھے۔"

پھر آگے لکھتے ہیں:

"ان کا اصلی ذوق تعلیم تھا اور اسی سلسلے میں انھوں نے بڑے بڑے کام کیے۔ خاص کر مسلمانوں میں تعلیم کی ترغیب و اشاعت کا جو کام انھوں نے انجام دیا وہ بے نظیر تھا۔"

مزید لکھتے ہیں:

"انھیں اردو زبان سے بڑی محبت تھی اور اس کی اشاعت و ترقی کے لیے دامے قدمے ہر طرح حاضر تھے۔ میرے ساتھ انھوں نے برسات کے موسم میں ملیبار کا دورہ کیا جہاں ہم نے وہاں کے عربی مدارس میں اردو کی تعلیم رائج کرنے کا ڈول ڈالا۔ اسی طرح وہ کبھی کبھی مدراس کے دوسرے علاقوں میں بھی میرے ساتھ تھے۔ میرا تو صرف یہی ایک کام تھا اور ان کے ذمہ بہت سے کام تھے لیکن باوجود اس کے جب کبھی صوبہ مدراس کے دورے پر جاتا تو وہ کسی نہ کسی صورت سے وقت نکال کر میرے ساتھ آوارہ گردی کے لیے تیار ہو جاتے۔"

ور آخر میں لکھتے ہیں:

"وہ میرے خاص اور شفیق دوست تھے افسوس! میرے ساتھی اور دوست ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے ہیں درازیٔ عمر کی ایک سزا یہ بھی ہے۔ میری حالت اب یہ ہے کہ

اتنے جیسے کہ جاننے والے گزر گئے
پرساں رہا نہ کوئی تو چپ چاپ مر گئے"

شری شری پرکاش گورنر بمبئی نے ان کی تعزیت میں لکھا تھا کہ:

"ڈاکٹر عبدالحق کی رحلت کی خبر سن کر میں بعید غمگین ہوا۔ جن دنوں میں مدراس کا گورنر تھا، میں مرحوم سے اچھی طرح واقف تھا۔ اور آپ کی قابلیت اور تبحّر کو بنظرِ استحسان دیکھا کرتا تھا۔" (بمبئی۔ ۲۱ مارچ ۱۹۵۸ء)

ڈاکٹر ذاکر حسین سے ایک رسالہ کے ایڈیٹر نے مرحوم پر تعزیتی مضمون کی فرمائش کی تھی۔ ذاکر صاحب اس وقت بہار کے گورنر تھے۔ انھوں نے ۲۸ رمارچ ۱۹۵۸ء کو انھیں جو جواب لکھا اس سے ان کے درد و غم اور مرحوم سے جو دلی تعلق تھا اس کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ موصوف نے لکھا تھا:

"عبدالحق مرحوم کا یوں ہم سب کو چھوڑ کر چلا جانا بڑا ہی سخت سانحہ ہے۔ ایسا سخت کہ اس پر کچھ کہتے نہیں بنتا۔ آپ کا خط ملے تین روز ہوئے ہیں، برابر کوشش کی کہ کچھ لکھ کر آپ کو بھیجوں مگر کچھ نہ لکھ سکا ایسا معلوم ہوا کہ خود اپنی موت پر کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری معذوری کا یقین فرمائیں اور مجھے معاف کر دیں۔
شریکِ غم۔"

ڈاکٹر عبدالحق فرمایا کرتے تھے کہ

"زمانۂ حال میں صرف دو بزرگ تھے جن کی علمی قابلیت سے میں مرعوب تھا۔ ایک

مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے علامہ سید سلیمان ندوی"۔

خصوصاً علامہ ندوی سے ان کے تعلقات والہانہ تھے علامہ ندوی نے ان کے ایک خط کے جواب میں ۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء کو ایک خط لکھا تھا۔

مکرم دام سعدکم۔ السلام علیکم

یادآوری اور تہنیتِ صحت کا دلی شکریہ آپ نے جن لفظوں میں میری توصیف فرمائی ہے وہ آپ کے اخلاص محبت کے شاہد عادل ہیں۔ مدراس آنے اور آپ لوگوں سے ملنے کو کئی دفعہ جی چاہا مگر یہ خیال مانع رہا کہ بے ضرورت سفر "مولویانہ مرید آباد کی گشتی" کے مرادف نہ ہو جائے۔ گو صحت ہو چکی ہے مگر جسم کا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔

والسلام"

ایک لطیفہ

مولوی عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی کے نام پر آپ کا والد نے آپ کا نام عبدالحق رکھا تھا۔ تفسیر حقانی کی بڑی شہرت تھی۔ لفظ "حقانی" سے لوگوں کے کان آشنا تھے۔ لہذا آپ کو بھی کرنول کے لوگ "حقانی مولوی" کے نام سے پکارنے لگے اور آپ کی وفات تک وہاں کے بڑے بوڑھے بھی آپ کو اسی نام سے یاد کرتے تھے۔ پھر آپ سے اہالیان کرنول کو جو دلی تعلق و شیفتگی تھی اس نے یہ اثر ڈالا کہ اکثر و بیشتر لوگوں نے بھی اپنے لڑکوں کے نام "عبدالحق" رکھے۔ چنانچہ کرنول کے ہر کوچہ و محلہ میں اس نام کے کئی لوگ پائے جاتے ہیں۔ یہ تھی آپ کی محبوبیت کی نرالی شان۔

ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بہت عرصہ بعد، راقم آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے سلسلے میں مدراس گیا تو وہاں مرحوم کی شفقت و عنایات کی بھولی بسری یادیں تازہ ہو گئیں۔ کانفرنس کی مشغولیات سے وقت نکال کر مسجد والاجاہی حاضر ہوا، جہاں آپ مدفون ہیں ایصال ثواب کیا۔ عزیزی پروفیسر حکیم سید ظل الرحمن ساتھ تھے۔ دیر تک مرحوم کا ذکر کر کے دل کا بوجھ ہلکا کیا۔ بے شک ایسے لوگ اگر نایاب نہیں تو کم سے کم کمیاب ضرور ہیں۔ کیا ہی خوب انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگار رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

اس مختصر مضمون میں ڈاکٹر عبدالحق کی شخصیت اور خدمات کا بہت مجمل تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ کوئی صاحب ذوق دانش ور موصوف کی شخصیت و خدمات کا بھرپور جائزہ لے اور اس کا حق ادا کرے اور کیا عجب کہ کسی نے یہ خدمت انجام بھی دی ہو اور وہ راقم کے علم میں نہ ہو۔

(ختم)

اس مغالطہ میں نہ رہو کہ خوش قسمتی تمہیں تلاش کر رہی ہے، سچ یہ ہے کہ تم خود قسمت کی تلاش میں ہو۔ اگر تم وہ تمام شرطیں پوری کر دو جو خوش قسمتی کے لیے ضروری ہیں، پھر قسمت کی دیوی ضرور تم پر مہربان ہوگی۔

# ایکسرے اور حیاتیات

ناصر بشیر مومنال ○

ایکس ریز کو مادے کی ساخت ظاہر کرنے والا اہم ترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور یہ غلط نہیں ہے۔ ایکس ریز کے ذریعے کسی بھی قلم یا شے کی انکساری ترتیب حاصل ہوتی ہے۔ اس ترتیب کو دیکھ کر بتایا جا سکتا ہے کہ اس قلم یا قنے میں سالموں کی بناوٹ کیسی ہے۔ اسی لیے ایکس ریز کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ پروٹین سالموں کی بناوٹ یا ڈی این اے کی ساخت دیکھی جا سکے۔

ایکس ریز کے ذریعے ٹھوس قلموں کا مطالعہ طبیعات کی ایک نئی شاخ ہے۔ ہر سائنسی شاخ کی طرح اس کی بھی حدود ہے۔ اچھی اور کارآمد انکساری ترتیب حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ زیر مطالعہ قنے کا قلمی نمونہ موجود ہو۔

حیاتیات میں جب ہم ایکس ریز سالماتی تحقیق کرتے ہیں تو بہت سی اشیا قلمی نہیں ہوتیں۔ حیاتیاتی لحاظ سے اہم بہت سے سالمے آسانی سے قلم نہیں بنتے۔ ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہوتا ہے کہ یہ سالمے کسی محلول میں کس طرز عمل کا مظاہرہ کریں گے۔ ان وجوہات کے باعث ہم حیاتیاتی لحاظ سے اپنے نقطۂ عمل کو بدلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہم اس حقیقت کو اہمیت دینے لگتے ہیں کہ ایٹم سے ٹکرا کر ایکس ریز منکسر ( [illegible] ) ہی نہیں ہوتیں بلکہ جذب بھی ہو جاتی ہیں۔ ایکس ریز کا یوں جذب ہونا ہر ایٹم کے لیے منفرد ہوتا ہے کسی خاص سالماتی ماحول کے لیے بھی یہ انجذاب مخصوص ہوتا ہے۔ چنانچہ موجودہ عشرے میں ایکس ریز کے جذب ہو جانے سے متعلق ایک نئی طبیعاتی اور حیاتیاتی شاخ قائم ہو گئی ہے۔ اس شاخ میں پیچیدہ سالماتی ساختوں کے اندر ایٹموں کی ترتیب اور متامیت پر تحقیق کی صلاحیت بھی ہے اور ولولہ بھی۔ بعض پروٹینی سالموں میں دھاتی ایٹموں کے طرز عمل کو دریافت کرنے میں اس شاخ نے ابھی سے کامیابی حاصل کر لی ہے۔ بہت سے خامرے جو زندہ نظاموں میں فیصلہ کن کام کرتے ہیں ایسے سالمے ثابت ہوئے ہیں جن کے دل میں دھاتی ایٹم ہے۔

جب بھی ایکس ریز کسی مادے میں سے گزرتی ہیں تو وہ کچھ اشعاع جذب کر لیتی ہیں۔ ان اشعاع کی طیف بنائی جائے تو ایکس ریز کی توانائی میں اضافے

---

○ معرفت ماہنامہ طالب علم کراچی۔

سے درجۂ انجذاب کم ہوتا جاتا ہے۔ بعض منفرد توانائیوں پر جا کر انجذاب میں نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس درجے کو انجذابی دھار کہتے ہیں اور اس کی نسبت اس طول موج سے ہوتی ہے جس پر ایکس ریز اتنی توانا ہوں کہ نمونے کے ایٹموں میں سے ایک الیکٹرون نکال سکیں۔

طیف داں (اسپیکٹرو۔سکوپسٹ) یہ سمجھتے ہیں کہ ایٹموں میں الیکٹرونوں کے یک مرکزی شیلز ہوتے ہیں ان شیلز کے نام بالترتیب کے۔ ایل۔ ایم وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ کے شیل وہ ہوتا ہے کہ جو مرکزے سے نزدیک ہو۔ اس لیے کے شیل کے الیکٹرون مرکزی کشش کو زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ اسی لیے انھیں خول کے الیکٹرون (core electrons) بھی کہا جاتا ہے۔ ان الیکٹرونوں کو مرکزے قربت کے باعث اُس وقت زیادہ توانائی کی ضرورت ہوتی ہے جب انہیں بلند درجہ توانائی والے شیل میں جانا ہو۔ توانائی کی اصل مقدار کا انحصار مرکزے کے بار پر ہوتا ہے۔ اس لیے ہر عنصر کے اعتبار سے یہ مختلف ہوتی ہے۔ کے شیل کے درجۂ انجذابی دھار پر توانائی کو الیکٹرون وولٹ میں ناپا جاتا ہے اور یہ بھی کسی عنصر کی منفرد خصوصیت ہے۔

انجذابی دھار سے کوئی یکساں شکل نہیں بن پاتی۔ ایکس رے کی طیف میں وہ علاقہ جہاں توانائیاں انجذابی دھار سے ذرا نیچے ہوں یا دھار پر ہوں ایسے آثار نظر آتے ہیں جو کے شیل سے بیرونی سطحوں کی جانب الیکٹرونی تبادلہ ظاہر کرتے ہیں۔ یہ سطحیں کیمیائی بندشوں میں حصہ لیتی ہیں ویلنس سطح کہلاتی ہیں۔ نتیجے کے طور پر ان آثار سے معلومات ملتی ہیں کہ زیر مطالعہ قلم، نئے سالمے یا ایٹم میں الیکٹرونی ساخت کیسی ہے۔

الگ تھلگ ایٹموں میں یعنی ان ایٹموں میں جو انجذابی دھار سے بلند حصے میں ہونے ہوں ایکسا ... کر انتشار

ملتے ہیں لیکن جب کوئی ایٹم کسی سالمے کا حصہ ہو تو اس حصے میں پیچیدہ اور نفیس ساخت نظر آتی ہے جس کی توانائی کئی سو الیکٹرون وولٹ سے زیادہ ہوتی ہے اس حصے میں سالماتی ساخت سے متعلق معلومات بھی ہوتی ہیں۔ سائنس داں ان باتوں کو پچھلے پچاس سال سے جانتے ہیں لیکن یہ صرف پچھلے دس سالوں میں معلوم ہوا ہے کہ انجذابی دھار سے بلند حصے سے مفید معلومات مل سکتی ہیں۔ اتنی دیر سے یہ بات معلوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انجذابی دھار سے بلند حصے کی ایسی طیف بنانے کے لیے جو باریک تفصیل ظاہر کرے۔ ایکس ریز کی شدید شعاع درکار ہے یہ شعاع سائنکروٹون مشین سے فراہم ہوتی ہے جو حال ہی میں بنی ہے۔

طیف دان انجذابی دھار سے بلند حصے کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ وہ حصہ جس میں ایکس ریز کا انجذاب، دھار سے قریب ہے۔

۲۔ وہ حصہ جس میں ایکس ریز کا انجذاب نفیس ہے۔

طبیعات دانوں نے دوسرے حصے کو سمجھنے میں کامیابی پہلے حاصل کی ہے اور یہ وہی حصہ ہے جس میں قیمتی معلومات موجود ہیں۔

یہ سمجھنے کے لیے کہ وہ حصہ کیسے بنتا ہے جس میں ایکس ریز کا انجذاب نفیس ہوتا ہے۔ سائنس داں اس بات پر یقین کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ الیکٹرون ذرّات نہیں ہوتے بلکہ موجیں ہوتے ہیں۔ بحیثیت موج، الیکٹرون تداخل کرتے ہیں اس دوران وہ ہم ہیئت ہوں تو ایک دوسرے کو توانا کرتے ہیں۔ ہم ہیئت نہ ہوں تو ایک دوسرے کو کمزور کرتے ہیں۔ جب ایکس ریز کسی ایٹم کے خولی الیکٹرونوں پر پڑتی ...

تالاب کی سطح آب پر گول دائرے پھیلتے ہیں۔ یہ پھیلتا ہوا محاذ جلد ہی کسی اور ایٹم سے ٹکرا جاتا ہے جو موج کے کچھ حصہ کو منعکس کرتا ہے۔ اس مظہر کو معکوسی پھیلاؤ کہتے ہیں یہ منعکس شدہ موج اصل موج کے جاتے ہوئے حصے سے ٹکراتی ہے۔ اب اگر یہ تداخل ہم ہیئت ہو تو ایکس ریز کا انجذاب بڑھ جاتا ہے۔ اگر تداخل ہم ہیئت نہ ہو تو ایکس ریز کا انجذاب گھٹ جاتا ہے۔ اس لیے سائنس داں اس حصے کی شدت اور تعدد کا بیان، ان ایٹموں کی تعداد، ماہیت اور فاصلے کی اصطلاحوں میں کر سکتے ہیں جو معکوسی پھیلاؤ میں مبتلا ہوں اور انجذابی ایٹموں سے پیوست ہوں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس حصے میں ایسی معلومات ہیں جو انجذابی ایٹموں کے سالماتی ماحول کے متعلق بتاتی ہیں۔

ایکس ریز کا نفیس انجذاب کرنے والے اس حصے سے حاصل ہونے والی معلومات ان معلومات کی نسبت محدود ہوتی ہیں جو سائنس داں قلموں کے ایکس رے مطالعے سے حاصل کرتے ہیں لیکن قلموں کے ایکسرے سے پروٹین کی جو تصویریں بنائی جاتی ہیں وہ بہت صاف اور واضح نہیں ہوتیں، اس لیے نفیس انجذابی حصے کی معلومات ان تصویروں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے، خاص طور پر ایسے پروٹینی سالموں کے لیے جن میں دھاتی ایٹم ہوں۔ دھاتی ایٹموں میں شدید قسم کی "رکے۔ انجذابی دھاریں" موجود ہوتی ہیں۔ اس لیے ان پر انجذابی



ٹوٹی ہوئی ہڈی ایکسرے میں صاف نظر آ رہی ہے۔

تحقیق کی خاصی گنجائش ہوتی ہے۔ سائنس داں محلول میں موجود پروٹین کے لیے بھی ساختی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ نظام کی مختلف کیمیائی حالتوں کے لیے بھی ایسا ممکن ہے مذکورہ بالا نوعیت کی معلومات کیمیا دانوں کے لیے فیصلہ کن ہیں تاکہ وہ ان سالموں کی ساخت معلوم کر سکیں جو پروٹین کے اہم گروپ۔ خامرے بناتے ہیں۔ یہی سالمے بہت سے حیاتیاتی تعاملات میں عمل انگیز کا کام کرتے ہیں۔

عشرۂ ستر کے اواخر میں پیٹر آئزن برجر (Eisenberger) اور برائن اور کن کیڈ (Kincaid) نے کیلی فورنیا کی سٹین فورڈ سینکروٹون ریڈی ایشن لیبارٹری میں پہلے انجذابی اعداد و شمار جمع کیے۔ یہ پہلے انجذابی اعداد و شمار تھے جو کسی سینکروٹون کے ذریعے جمع کیے گئے۔ کیمیا دانوں نے ان اعداد و شمار سے خامروں پر تحقیق میں بہت مدد لی۔



ایکس رے وہ سیفٹی پن اور ناخن ظاہر کر دیتے ہیں جو بچے نے کھا لیے تھے۔

انجذابی تحقیق کی ایک کامیابی اس جگہ کو معلوم کرنا ہے جو بعض خامروں میں حیاتیاتی سرگرمی کا باعث بنتی ہے۔ زیادہ تر خامروں میں دھاتی ایٹم ان "سرگرم جگہوں" کے اوپر یا قریب موجود ہوتے ہیں۔

اس طریقہ کار کے تحت جو خامرے سب سے پہلے زیر تحقیق آئے ان میں نائٹروجینائس (Nitrogenase) شامل ہیں۔ بعض بکٹیریا (جراثیم) جو مٹی

میں اور بعض پودوں کی جڑوں میں رہتے ہیں۔ فضا کی نائٹروجن کو امونیا میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ان کے اندر بنیادی خامرے نائٹروجیناس ہوتے ہیں۔ ابھی سائنسدان نہیں جانتے کہ نائٹروجناس کی پوری ساخت کیسی ہوتی ہے لیکن انھیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ان میں دھاتی مولیبڈم (Molybdenum) ہوتا ہے۔

سٹین فورڈ یونیورسٹی میں کیتھ ہوجن اور اسٹیو کرین نے انجذابی طریقۂ کار سے یہ ظاہر کیا ہے کہ مولیبڈم، خامرے کے اندر ایک غیر معمولی ساخت کا حصہ ہوتا ہے۔ اس ساخت میں لوہے اور گندھک کے ایٹم بھی ہوتے ہیں۔ یہی ساخت وہ جگہ لگتی ہے جو نائٹروجن کے لیے عمل انگیز ہے۔ اس دریافت کے بعد کیمیا دانوں نے بڑی تیزی سے ایسی ہی ساختوں کا امتزاج اس امید پر کیا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی نائٹروجناس کی طرح عمل کرے گی۔

برطانوی علاقے چیشائر کی ڈیری لیبارٹری میں سینکلوٹون اسٹوریج رنگ استعمال کر کے ڈیوڈ گارنر سمار جنین اور ریوڈ تھ آربر نے یہ ظاہر کیا کہ نائٹروجناس میں لوہے پر تحقیق کر کے بھی اہم معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ انھوں نے معلوم کیا ہے کہ ایک مولیبڈم کے مقابلے میں چھ تا آٹھ ایٹم موجود ہوتے ہیں۔ انجذابی طریقۂ کار سے لوہے کے ایٹموں کی صرف اوسط مقامیت معلوم ہو سکتی ہے۔ تاہم ان کے یہ سمجھنے میں بڑی مدد ملی ہے کہ نائٹروجناس میں سالماتی بناوٹ کا اس کی کارکردگی سے کیا تعلق ہے۔

۱۹۸۷ء کے دوران حیاتی کیمیا دانوں (بایو کیمسٹوں) نے یہ بھی دریافت کر لیا ہے کہ نائٹروجناس میں ونیڈیم (Vanadium) بھی ہوتا ہے۔ مولیبڈم اور ونیڈیم پر مشتمل الگ الگ نائٹروجناس کے موازنے سے سائنس دانوں کو توقع ہے کہ نائٹروجن سے امونیا میں حیاتیاتی تبدیلی کے متعلق معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ اسی دوران سائنس دان یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ ونیڈیم والی نائٹروجناس ساختیں جس بکٹیریا (Azotobacter chroococcum) میں پائی گئی ہیں اس کی سالماتی ساخت تقریباً ویسی ہی ہے جیسی کہ مولیبڈم والے بکٹیریا کی۔ ونیڈیم اور مولیبڈم ایٹموں کا گندھک آکسیجن اور لوہے کے ایٹموں سے فاصلہ بھی ایک سا ہے۔

اس تحقیق سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ ایکس رے کے قلمی طریقۂ کار کے بغیر کسی حد تک معلومات حاصل ہو سکتی ہیں اس وقت تک کہ جب ایکس رے کا قلمی طریقۂ کار اتنی ترقی کرے گا کہ نائٹروجناس کی قلمی تصویر پیش کر سکے۔ انجذابی طریقہ کوئی نہ کوئی نئی بات سامنے لاتا رہے گا۔ اسی طریقے کی مدد سے کیمیا دان، حیاتیات دان اور حیاتی کیمیا دان اس قابل ہوتے رہیں گے کہ عناصر کے تبادلے میں خامری کردار کا علم حاصل کریں۔

انجذابی طریقہ کار یہ بھی بتا سکتا ہے کہ اکثر دھاتیں خامروں میں کیا کردار ادا کرتی ہیں۔ بہت سے پروٹین ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں جست موجود ہے لیکن سائنس دان ہر پروٹین کے متعلق نہیں

> "ایسا نہ ہو کہ ایک قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر ابھار دے کہ تم اس کے ساتھ زیادتی کرنے لگو۔"
>
> (سورہ مائدہ - آیت ۱)

بلانتے کہ اس میں جست کا کردار کیا ہے۔ جست کے مرکبات بے رنگ ہوتے ہیں۔ اس لیے طیف کے ذریعے سبھی تحقیق نہیں ہو سکتی۔ جست کی اس طیفی خاموشی نے کیمیا دانوں کو راغب کیا ہے کہ وہ خامروں میں اس کی جگہ رنگ دار عناصر (مثلاً کوبالٹ) شامل کریں۔ ان عناصر کے آئن رنگ دار ہوتے ہیں۔

سائنس دانوں کو امید ہے کہ انجذابی طریقۂ کار کو بہتر بنا کر ایکس ریز سے نہ صرف پروٹین کا بلکہ دیگر حیاتیاتی اکائیوں کا بھی مطالعہ ہو سکے گا۔ فی الحال وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ طریقۂ کار بلوغت کا محتاج ہے۔ اسے ترقی دینے کے لیے 'کیمیا دانوں' طبعیات دانوں اور حیاتیاتی کیمیا دانوں کو مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

"عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے زبردستی ہندوؤں کو مسلمان بنایا ہے لیکن یہ ایک بے بنیاد الزام ہے۔ اس کی طبیعت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ شاہ جہاں نے آندھرا کے راجہ اندرمان کو اس کی متواتر حکم عدولیوں کی بنا پر قید کر دیا تھا۔ اس زمانے میں جب اورنگ زیب دکن کا صوبے دار ہو کر گیا تھا تو اس نے اپنے باپ شاہ جہاں سے اندرمان کی رہائی کی سفارش کی لیکن شاہ جہاں کچھ ایسا ناراض تھا کہ اس نے اورنگ زیب کی سفارش کو رد کرتے ہوئے لکھ بھیجا کہ اندرمان ما بدولت کو سخت ناراض کیا ہے۔ تاہم اگر وہ مسلمان ہو جائے تو اسے رہائی مل سکتی ہے۔ اورنگ زیب نے شاہ جہاں کے اس مطالبے کو ناپسند کرتے ہوئے لکھا کہ "مسلمان ہونے کی شرط پر کسی طرح بھی عمل درآمد نہیں ہو سکتا کیوں کہ ہم کسی کو بھی دباؤ ڈال کر شریعت اسلامیہ کی رو سے مسلمان نہیں کر سکتے"۔ اورنگ زیب کے اس جواب ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس طبیعت کا انسان تھا"

ڈاکٹر راجندر پرشاد

(ہندوستان کا مستقبل)

# کلیاتِ اکلِ طعام اور حفظِ صحت

ابو وارث جمیل

لفظ کلیات کے لغوی معنی عام اصول یا بڑے قواعد کے ہیں جس کو انگریزی میں لاز ( [illegible] ) کہا جاتا ہے۔ حکماء نے اصول تغذیہ اور طعام کو فطری قانون پر بیان کیا ہے جو باعث صحت ہے۔ لہٰذا یہاں کلیات کو بحیثیت ایک مقالے کے بیان کیا جاتا ہے جس کا حصول صحت ہے جس سے یہ باور ہوتا ہے کہ صحت کے حصول کے لیے کلیات کا جاننا ضروری ہے تاکہ شرائطِ تغذیہ کے ساتھ تناول غذا کے قوانین کا لحاظ رکھتے ہوئے نقص تغذیہ اور اس کے سبب ہونے والے دیگر جسمانی عوارض سے بچا جا سکے۔

غذا کے بارے میں ابو الطب بقراط (۶۰ ق م) کے چند اقوال مندرجہ ذیل ہیں:

"اتنا نہ کھاؤ کہ وہ تم کو کھا جائے۔"

"معدے کو کھانے پینے سے نہ بھرنے سے صحت قایم رہتی ہے۔"

"ہم زندہ رہنے کے لیے کھاتے ہیں نہ کہ کھانے کے لیے زندہ ہیں۔"

"جس مریض کو بھوک لگتی ہے وہ اس مریض سے بہتر ہے جس کو بھوک نہیں لگتی۔"

"لوگوں نے تندرستی کی حالت میں درندوں کی طرح کھا کر اپنے کو بیمار کر ڈالا۔ میں نے ان کو پرندوں کی غذا دے کر صحت یاب کر دیا۔"

"جسم کے اندر ایک قوت ہے جس کو قوتِ غاذیہ کہتے ہیں جو غذا کو بدل کر عضو مغتذی (غذا حاصل کرنے والے عضو) کے مانند بنا دیتی ہے، تاکہ بدن کا جو حصہ تحلیل ہو گیا ہے اس کے عوض

میں اس عمل سے بدل مہیا ہو سکے۔"

(القانون فی الطب)

جسم کے تغذیہ کے لیے حکمانے مندرجہ ذیل دو جامع شرائط بیان کی ہیں:

۱۔ غذا حاصل کرنے والے عضو کے مزاج اور ترکیب کا اعتدال پر ہونا۔

۲۔ غذائے وارد کا بہ لحاظ مقدار اور کیفیت بہتر اور مناسب ہونا۔

مذکورہ دونوں شرائط اسی وقت پوری ہو سکتی ہیں جب کہ سارے اعضائے رئیسہ یعنی قلب، جگر اور دماغ اعتدال پر ہوں۔

حصولِ صحت کے لیے مقدار ترتیب و ترکیب غذا کا علم نہایت ضروری ہے تاکہ فساد غذا اور اس سے پیدا ہونے والے عوارض سے محفوظ رہ سکیں۔ اس ضمن میں علی بن ربن الطبری بقراط کا قول نقل کرتا ہے۔

"لوگوں نے ہمارے زمانے میں اپنی طاقت سے زیادہ کھانا شروع کر دیا ہے (جس کے نتیجے میں) اکثر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ لوگ ضعیف نرم اور سخت غذائیں (لطیف اور غلیظ) کو ایک ساتھ کھاتے ہیں۔ اب جب یہ غذا ان کے معدے میں جا کر ٹھہرتی ہے تو نرم غذا ہضم ہو جاتی ہے اور سخت غذا باقی رہتی ہے اس سے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ پھر یہ لوگ جانوروں کی طرح کھانا شروع کر دیتے ہیں اور جب ان میں امراض کی کثرت ہوتی ہے تو پھر یہ لوگ غلیظ غذاؤں کی کثرت سے جن کا نام ہم نے درندوں کی خوراک رکھا ہے اجتناب کرتے اور جب کثرت خوری کو ترک کر دیتے ہیں تو انہیں منفعت حاصل ہوتی ہے۔"

(فردوس الحکمۃ، ص ۳۲۷)

اسی ضمن میں علامہ علاء الدین قرشی فرماتے ہیں کہ:

"زیادہ کھانے والا شخص جب یک لخت ہلکی غذائیں کھانے لگے گا اور پھر اس عادت کے بعد یک لخت سخت غذائیں بکثرت کھانے لگے گا تو سدّے پیدا ہو جائیں گے۔ کیونکہ لطیف غذاؤں کی عادت کے بعد غلیظ غذاؤں کا ہضم ہونا دشوار ہے اور جب غذا اچھی طرح ہضم نہ ہوگی تو سدّے پیدا ہونے کا امکان زیادہ ہوگا۔"

ترتیب تناول غذا کی بابت علی بن ربن طبری، جالینوس کا قول نقل کرتا ہے کہ:

"سب سے پہلے نرم غذا کھائی جائے۔ کیونکہ نرم غذا جلد ہضم ہوتی ہے اور باسانی خارج بھی ہو جاتی ہے۔ سخت غذا کا اخراج اس کے بعد ہوتا ہے۔"

(فردوس الحکمۃ)

انواع و اقسام کی غذاؤں کے بارے میں ابوبکر محمد بن زکریا رازی تحریر کرتے ہیں:

"اگر دو طرح کے کھانے ہوں اور اس میں ایک جلد ہضم ہونے والا ہو تو دیر والے کو جلدی ہضم ہونے والے کے بعد کھانا چاہیے۔"

(الحاوی جلد ۲۳: ص ۶۸)

رازی آگے لکھتا ہے:

"جو چاہے کہ اس کی غذا باقی رہے اور ہضم بھی اچھا ہو تو وہ ایک ہی طرح کی غذا لے اور تھوڑی تھوڑی لے۔"

(الحاوی جلد ۲۳)

چنانچہ شیخ الرئیس ابن سینا اس ضمن میں اپنا نظریہ تحریر کرتا ہے کہ:

"مختلف غذائیں ایک ساتھ اکٹھا کر کے کھانا بہت ہی بُری بات ہے۔ اس کے بعد بُرائی میں اس کا درجہ ہے کہ زیادہ دیر تک بیٹھے کھاتے رہیں کیونکہ آخری کھانا معدے میں اس وقت پہنچتا ہے جب کہ پہلے کھانے میں ہضم شروع ہو چکتا ہے۔ اس لیے غذا کے سارے اجزا میں ایک جیسا اور ہموار ہضم نہیں ہونے پاتا۔"

غذائے واحد ہی بہترین غذا ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ تحریر کرتا ہے:

"مختلف غذائیں مختلف اوقات میں ہضم ہوا کرتی ہیں، اس لیے معدے میں) غذا کے منہضم اور غیر منہضم دونوں قسم کے اجزا مخلوط ہو جاتے ہیں" (اور اسی حالت میں بہت سے غیر منہضم اجزا کا انجذاب ہو جاتا ہے)۔

اشتہائے غذا کی بابت کہ غذا کب تناول کی جائے اور بھوک کا اندازہ کس طرح کیا جائے، اس ضمن میں حکما کے مختلف نظریات اور اقوال ہیں۔ چنانچہ ربن الطبری بقراط کا قول نقل کرتا ہے کہ:

"جو شخص اپنی صحت کی حفاظت کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اس وقت تک کھانا نہ کھائے جب تک کہ وہ کام یا ورزش کی وجہ سے تھکن نہ محسوس کرے (یعنی جب تک بھوک نہ لگے) اسی طرح کھانا پوری طرح شکم سیر ہو کر نہ کھانا چاہیے۔ نیز کھانا کھانے کے بعد آرام کرنا چاہیے۔"

(فردوس الحکمۃ)

آگے ربن الطبری اپنا نظریہ تحریر کرتا ہے کہ:

"جب بھوک لگے تو (اپنے مزاج کے) موافق (پسندیدہ) غذا کھائے اور اس بات کا لحاظ رکھے کہ) گرمیوں کے زمانے میں گرم اور سردیوں کے زمانے میں ٹھنڈا کھانا نہ کھائے۔"

(فردوس الحکمۃ)

ابو سہل مسیحی اس کی مزید وضاحت کرتا ہے کہ:

"غذا اس وقت لینی چاہیے جب اشتہائے طعام متحرک ہو جائے اور نفس کھانے کا تقاضا کرے اور اس کا مشتاق ہو تو اس کیفیت کے پیدا ہونے کے ½ گھنٹہ یا ایک گھنٹہ کے بعد غذا لینی چاہیے۔"

(المئۃ)

ابن سینا اس ضمن میں تحریر کرتا ہے کہ:

"جب تک سچی بھوک نہ لگے اور معدہ اور بالائی آنتیں پہلی غذا سے خالی نہ ہو جائیں اس وقت تک یہ شخص بلکہ ہر وہ شخص جس کو صحت کی طلب ہو ہرگز

نہ کھائے کیونکہ ہاضمہ کے لیے اس سے
زیادہ بری کوئی بات نہیں کہ غیر منہضم غذا
(شکم میں) پہلے سے موجود ہو اور اس پر
دوسری غذا کھائی جائے۔"

چنانچہ علامہ حکیم کبیر الدین مذکورہ اقوال کی صراحت میں تحریر کرتے ہیں کہ اس حالت کو جب کہ ایک غذا کی موجودگی میں دوسری غذا کھائی جائے ادخال اور تداخل کہا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ہضم بگڑ جاتا ہے اور اس فسادِ ہضم سے فاسد اخلاط اور موذی رطوبات پیدا ہو جاتی ہیں۔

تدابیر تغذیہ کا حفظ ماتقدم اور تدارک امراض میں ایک خاص مقام ہے جس کے ذریعے صحت کو قائم رکھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ تدابیر اغذیہ کی بابت محمد بن زکریا رازی تحریر کرتے ہیں کہ:

"جو شخص کھانے پینے کی تدابیر کا لحاظ
کرنا چاہے اسے دو چیزوں کی ضرورت
ہوتی ہے:
۱۔ ان کی طبیعت اور خصوصیات
کی جانکاری۔
۲۔ ان کے حسن ترتیب اور وقت
کا خیال۔"

(الحاوی۔ جلد ۲۳)

غذاؤں کی حسن ترتیب کے متعلق شیخ الرئیس ابن سینا نے بڑی وضاحت سے تحریر کیا ہے:

"غذاؤں کے استعمال کرنے میں ایک
خاص ترتیب اور باقاعدگی ہوا کرتی ہے
جس کی رعایت ہر حافظ صحت پر
واجب ہے۔ چنانچہ کسی قوی اور سخت
غذا کو کھانے کے بعد کوئی رقیق اور زود ہضم
غذا نہ کھائی جائے۔ کیونکہ زود ہضم غذا
پہلے ہضم ہو کر اس کے اوپر تیرتی رہتی ہے
اور اسے نفوذ کرنے کا راستہ نہیں ملتا
جس سے وہ خود بھی متعفن ہو کر بگڑ جاتی
ہے اور جس غذا سے مخلوط ہوتی ہے اسے
بھی بگاڑ دیتی ہے۔"

آگے اوقات غذا کے بارے میں شیخ تحریر کرتا ہے کہ:

"کھانے کا بہترین وقت موسم گرما میں وہ
ہے جو دوسرے وقتوں سے ٹھنڈا ہو۔"
(یہی وجہ ہے کہ گرمی کی شدت کے وقت
کھانا کھانے سے اکثر ہضم نہیں ہوتا)۔

رات دن میں غذا کتنی بار تناول کرنی چاہیے۔ اس میں شیخ اپنا نظریہ بیان کرتا ہے:

"بہترین صورت تو یہ ہے کہ پیٹ بھر کر
کھانے والا (اکل متتبع) ایک دن (دن
اور رات) میں ایک دفعہ کھائے اور
دوسرے دن دو دفعہ صبح کے وقت
اور رات کے وقت (ہر روز ایک ہی
بار یا ہر روز دو بار نہ کھائے) لیکن اس
بارے میں عادت ہی کا دیکھنا زیادہ
مناسب ہے۔"

بے وقت اور خلاف عادت تناول غذا کے متعلق لکھتا ہے کہ:

"اسی طرح جو لوگ (دن اور رات میں
دوپہر کے قریب) ایک بار کھانے کے عادی
ہوا کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ دو مرتبہ کھانے
لگتے ہیں تو انہیں ضعف کسل اور استرخاء
(اعضا کی سستی اور کاہلی) لاحق ہو جاتی
ہے۔۔۔ پھر اگر ایسے لوگ (اپنا وقت

بدل لیں اور صبح کی غذا (کھا کر اسی) پر قناعت
کر لیں، تو انھیں رات کے وقت کمزوری لاحق
ہو جاتی ہے اور اگر صرف رات کے وقت
کھائیں تو انھیں کھانا ہضم نہیں ہوتا کیونکہ غذا
ایسے وقت معدے میں وارد ہوتی ہے
جس وقت وہ ہضم کرنے کا عادی نہیں ہوتا
کھٹی ڈکاریں آتی ہیں، طبیعت بدمزہ ہو جاتی
ہے، متلی آتی ہے، منہ کڑوا ہو جاتا ہے،
پائخانہ نرم ہو جاتا ہے (یعنی دستوں کی
صورت اختیار کر لیتا ہے) ان سب باتوں
کی وجہ یہ ہے کہ (بے وقت اور خلاف
عادت غذا کا کھانا گویا) یہ ایسی چیز کا
معدے میں داخل کرنا ہے جس سے الفت و
رغبت نہیں۔"

چنانچہ اسی ضمن میں جالینوس مندرجہ ذیل بیان
جاری کرتا ہے:

"جو لوگ دن میں (دن اور رات) دو مرتبہ
کھانے کے عادی ہوتے ہیں جب وہ ایک
مرتبہ کھانے لگتے ہیں تو ان کا بدن سست
اور ضعیف ہو جاتا ہے۔ وہ ہر کام سے
ڈرنے لگتے ہیں۔ ان کے فم معدہ میں
درد لاحق ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انھیں یہ
وہم ہوتا ہے کہ ان کے احشاء لٹکے ہوئے
ہیں۔ پیشاب گرم اور پائخانہ جلتا ہوا
آتا ہے۔ نیز ان کے منہ میں تلخی محسوس
ہوتی ہے اور لگتا ہے متلی کا احساس
ہوتا ہے۔ آنکھیں اور کنپٹیاں اندر گھس
جاتی ہیں، (ان میں) اختلاج عارض ہوتا
ہے، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں

علی الخصوص جبکہ ان کا مزاج صفراوی ہو
ایسے لوگ اگر صبح کے وقت کھانا کھاتے
ہیں تو رات کا کھانا پورے طور پر نہیں کھا سکتے
اور اگر رات کا کھانا کھاتے ہیں تو معدہ
بوجھل ہو جاتا ہے اور سونا دشوار ہو جاتا
ہے۔"

## بھوک اور پیاس کی ضبط:

بھوک اور پیاس کو ضبط کر کے سو رہنا ان لوگوں
کو جنھیں تیزابیت (Hyperacidity) کی شکایت ہوتی ہے یعنی
صفراوی مزاج والوں کے لیے مضر ہے۔ کیونکہ جب صفرا
خالی معدہ پر گرتا ہے تو نیند میں بے قراری اچاٹ
کھٹی ڈکاریں، متلی اور بدمزگی جیسے عوارضات کے علاوہ
بھوک بھی بگڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ہلکے ملینات
(Mild laxatives) کے ذریعے غذا کو معدے سے
آنتوں کی طرف اتارنے کی کوشش کی جائے اور پھر
بھوک لگنے پر کھانا کھائیں اور بھوک کو زیادہ ضبط نہ
کریں کیونکہ ان لوگوں میں دیر تک فاقہ کرنا مضر ہے
اس کے برخلاف بھوک اور پیاس کو سرد اور تر
مزاج والوں کے لیے ضبط کرنا مفید ہے۔

## بھوک اور غذائے لطیف و غلیظ۔

جن لوگوں کا معدہ خالی ہو، بھوک کی شدت ہو
لیکن ابھی معدے میں صفرا کا گرنا شروع نہ ہوا ہو ایسے
لوگوں کو اگر ایک وقت میں دو قسم کی لطیف و غلیظ
غذائیں کھانی پڑیں تو دونوں کو ایک ساتھ نہ کھانا
چاہیے بلکہ دونوں کے درمیان مہلت دینی چاہیے
کیونکہ معدے کے خالی ہونے کی صورت میں غذائے
لطیف کھانے سے معدہ اسے اچھی طرح ہضم کرنے میں
لگ جاتا ہے اور اگر اس کے بعد کوئی غلیظ غذا کھا لیتا
ہے تو معدہ اس سے نفرت کرتا ہے اور ہضم نہیں کرتا۔

جس سے ہضم بگڑ جاتا ہے۔ اس لیے دونوں قسم کی غذاؤں کے درمیان وقفہ ضروری ہے کہ معدے کے اندر وہ غذائے لطیف ہضم ہو جائے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ غلیظ غذا کچھ قبل کھائی جائے تاکہ تھوڑی دیر کے بعد جب لطیف غذا وارد معدہ ہو تو دونوں ایک ساتھ ہضم ہو جائیں۔

## تناول غذا اور تغیر کیفیت جسمانی

تناول غذا کے بعد حرارت جسمانی میں ہونے والی تبدیلیوں کی بابت شیخ تحریر کرتا ہے۔

"کھانا کھانے کے بعد جن لوگوں کے بدن میں کسی قسم کی حرارت اور گرمی (تبخیر) لاحق ہو جایا کرتی ہو، ایسے لوگوں کو چاہیے کہ پورا کھانا ایک دفعہ ہی میں نہ کھائیں بلکہ تھوڑا تھوڑا (متعدد اوقات میں) کھائیں تاکہ امتلاء کی وجہ سے لرزہ کی سی کیفیت نہ عارض ہو اور جب غذا معدے میں (عمل ہضم سے) گرم ہو جائے تو اس وقت اچھے خاصے بخار کی مانند بدن میں حرارت نہ لاحق ہو جائے۔"

چنانچہ علامہ قرشی، شیخ کی تائید میں اپنا ذاتی واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

"روزوں میں رات کے وقت کھانے کے بعد اس قسم کی حالت پیدا ہو جایا کرتی تھی یعنی لرزہ اور بخار کی سی کیفیت پیدا ہو جایا کرتی تھی۔"

## تناول غذا اور پانی کے احکام

تناول غذا کے دوران یا کھانا کھانے کے فوراً بعد ہی پانی پینا بارد المزاج لوگوں کے لیے منع ہے۔ حار مزاج والے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ چنانچہ شیخ لکھتا ہے:

"غذا کے فوراً بعد اتنا زیادہ پانی نہ پیا جائے کہ غذا کو جرم معدہ سے جدا کر دے اور غذا اس پانی میں تیرتی پھرے۔ بلکہ پانی پینے کے لیے اتنا صبر کیا جائے کہ غذا معدے سے آنتوں میں اتر جائے۔ اس کا پتہ اس طرح چلے گا کہ شکم کا بالائی حصہ ہلکا محسوس ہو گا لیکن پیاس کی وجہ سے اگر پانی پینا ہی پڑے تو ٹھنڈا پانی تھوڑی مقدار میں چوسنے کی شکل میں پیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ اگر کوئی شخص (پیاس کی وجہ سے) کھانا کھانے کے بعد نہ کہ کھانے کے اثنا میں محض اتنا پانی پی لے جس سے غذا بھیگ جائے تو یہ فعل ناجائز نہیں۔"

## تناول غذا اور سونے جاگنے کے احکام

اس ضمن میں صاحب فردوس الحکمت (ربن الطبری) تحریر کرتے ہیں:

"کھانا کھانے کے پہلے سونا مضر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے رطوبت اور بدن کی حرارت غریزی خشک ہو جاتی ہے"

اور شیخ کا قول ہے کہ

"کھانا کھانے کے فوراً بعد نہ سونا چاہیے کہ غذا معدے میں تیر رہی ہو۔ ...... کھانا کھانے کے بعد اگر نیند سے ہضم غذا میں امداد لینی چاہیں تو مناسب ہے کہ پہلے داہنی کروٹ پر سوئیں پھر (دیر تک) بائیں کروٹ، اس کے بعد دائیں کروٹ پر لوٹ آئیں۔"

## تناول غذا و حرکت و سکون بدنی و نفسانی

کھانے کے قبل و بعد حرکت کے احکام کے سلسلے میں ربن الطبری لکھتا ہے کہ :

"کھانے سے قبل حرکت معدے کی آگ کو مشتعل کر دیتی ہے (بھوک بڑھا دیتی ہے) لیکن اگر کھانا کھانے کے بعد کسی قسم کی ورزش کی جائے تو یہ مضر ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے غیر منہضم غذا (معدے سے امعاء کی طرف) نیچے چلی جائے گی جس سے جگر اور عروق میں سدّے لاحق ہوں گے۔"

چنانچہ شیخ لکھتا ہے کہ :

"جس طرح یہ ضروری ہے کہ کھانے سے قبل ریاضت ہلکی اور کمزور نہ ہو، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ کھانے کے بعد کی ریاضت نرم اور ہلکی ہو (کیونکہ کھانے کے بعد اگر سخت اور قوی ریاضت کی جاتی ہے تو ناواجب طور پر غذا معدے میں ہلتی ہے اور ہضم خراب ہو جاتا ہے)۔"

## تناول غذا اور استفراغ

بدن سے مواد خارج کرنے کا نام استفراغ ہے۔ غذا جب کسی وجہ سے معدے میں فاسد ہو جاتی ہے تو باعث مضرت صحت ہوتی ہے۔ اس صورت میں استفراغ ہی امراض سے نجات دلا سکتا ہے چنانچہ ابوسہل مسیحی اس ضمن میں تحریر کرتا ہے :

"کھانا جب معدے میں فاسد ہو جائے تو اسے قے کے ذریعے نکالنا چاہیے۔"

[illegible]

ہوئے لکھتا ہے :

"اگر قے کا وقت گزر جائے یا کسی وجہ سے قے کرانا دشوار ہو تو تھوڑا تھوڑا گرم پانی پلانا چاہیے۔ کیونکہ گرم پانی امتلاء کو نیچے اتار دیتا ہے اور نیند لاتا ہے۔ چنانچہ جب نیند آنے لگے تو بستر پر لیٹ جائے اور نیند کو نہ بھگائے) اور جتنا جی چاہے سوتا رہے۔"

## مختلف اغذیہ کی زیادتی کے نتائج

خشک غذاؤں کی زیادتی سے بھوک مر جاتی ہے بدن کا رنگ بگڑ جاتا ہے اور پاخانہ خشک ہو کر قبض رہتا ہے۔ چکنی اور روغنی اشیا کی زیادتی سے بھوک جاتی رہتی ہے۔ بدن میں سستی اور کاہلی پیدا ہو جاتی ٹھنڈی اغذیہ کا استعمال بھی سستی اور کاہلی پیدا کرتا ہے۔ ترش اور چٹ پٹی غذاؤں کی زیادتی سے بڑھاپا جلد آتا ہے۔ نمکین غذاؤں کی زیادتی حلق اور آنکھ کے لیے مضر ہے۔

نمکین اشیا کی زیادتی کا معدے کے لیے مضر ہونے کا سبب حکماء یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ رطوبات معدی کے ترشح کو غیر معمولی طور پر بڑھا کر رطوبت معدہ کو کم کر دیتی ہیں اور آنکھ کے لیے ان کی مضر ہونے کا سبب تجربہ اور قیاس پر مبنی ہے۔

## مختلف غذاؤں کو ملانے کے احکام

شیخ اس ضمن میں مجربین ہند وغیرہ کا مقولہ بیان کرتا ہے کہ :

"ترشیوں کے ساتھ دودھ کا استعمال جائز نہیں اور نہ مچھلی کا دودھ کے ساتھ

[illegible]

ہے کہ اس سے امراض مزمنہ (Chronic diseases) پیدا ہوتی ہیں جن میں سے ایک جذام (اور دوسرا برص) ہے"۔

"اہلِ تجارب کا یہ بھی کہنا ہے کہ مولی کے ساتھ پنیر یا دہی یا پرندوں کا گوشت استعمال کیا جائے اور نہ ستو کو دودھ چاول کے ساتھ کھایا جائے اور نہ کھانے میں ایسا روغن استعمال کیا جائے جو تانبے کے برتن میں رکھا ہو۔ کیوں کہ یہ زہریلا ہوجاتا ہے اور ایسا کباب نہ استعمال کیا جائے جو ارنڈ کے کوئلوں پر بھونا گیا ہو۔ اسی طرح سرکہ چاول، گوشت اور سبزی و دودھ کے ساتھ استعمال ممنوع ہے

کھانا کھانے کے بعد درج ذیل باتوں کی رعایت ضروری ہے اس ضمن میں قدرے تفصیل سے تذکرہ آچکا ہے

لیکن اس کے فوائد کے تحت ذہن نشین کرنے کے لیے مختصراً چند نکات بیان کیے جاتے ہیں؛

۱۔ کھانے کے بعد فوراً نہ سونا چاہیے کہ غذا معدے میں تیر رہی ہو۔

۲۔ کھانا کھانے کے بعد سخت حرکت سے بچنا چاہیے۔

۳۔ غذا کھانے کے فوراً بعد پانی نہ پینا چاہیے بلکہ اتنا صبر کرنا چاہیے کہ غذا معدے سے اتر جائے۔

اس میں استثنائی شکلیں بھی ہیں جیسے تیز یا چٹ پٹی چیزوں کا استعمال پر کم مقدار میں پانی لے سکتے ہیں بہرحال احتیاط ضروری ہے۔

# حوالہ جات


۱۔ فردوس الحکمت از علی بن ربن الطبری۔ ترجمہ۔ کراچی، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس پاکستان

۲۔ کتاب المئۃ (مخطوطہ) از ابو سہل مسیحی۔ مخزونہ علی گڑھ، مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو

۳ افادۂ کبیر از حکیم کبیر الدین۔ جلد دوم۔ حیدرآباد دکن، نور الامراء، ۱۹۱۶ء

۴۔ ترجمہ و تشریح کلیات قانون از حکیم کبیر الدین جلد دوم حیدرآباد، مطبع تاج پریس، ۱۹۵۴ء

۵۔ الحاوی از ابوبکر محمد بن زکریا رازی۔ جلد ۲۳ حیدرآباد، دائرۃ المعارف العثمانیہ، ۱۹۵۸ء

۶۔ کتاب القانون فی الطب از شیخ الرئیس ابوعلی الحسین المعروف ابن سینا۔ لکھنؤ، نامی پریس، ۱۳۰۸ھ

۷۔ تحقیقی مقالہ (ایم۔ ڈی) "انسانی صحت کے لیے اسباب ستہ ضروریہ کی اہمیت" از ڈاکٹر ابو وارث جمیل۔ علی گڑھ، اجمل خاں طبیہ کالج، شعبۂ کلیات، ۱۹۹۰ء

# ڈاکٹر بی آر امبیڈکر ـــــ ایک نامور شخصیت

سید مشرف علی ○

ہندوستان کا سماج عرصۂ دراز سے مختلف بنیادوں اور مذہبی نظریات کے اعتبار سے ایک طبقاتی سماج رہا ہے۔ ہندو سماج میں تقسیم اور طبقاتی پہلو پر زیادہ شدت اور سماجی تعلقات قائم رہے ہیں اور بہت حد تک خاص طور پر قصباتی زندگی میں آج بھی پوری طاقت سے قائم ہیں جو اکثر و بیشتر ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اس واضح حقیقت کے باوجود کہ ہمارے سماج نے گذشتہ بیسویں صدی کے وسط سے کچھ تبدیلیاں اختیار کرنا شروع کر دی تھیں اور فرسودہ خیالات میں مفید سماج کشادہ خیالی، عورت و مرد کے برابری کے درجہ کو قبول کرنا، قومیت کے جذبے کو اپنانا شروع کر دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود سماج کا سالوں پرانا تصور جو تقسیم اور سماجی تہوں پر قائم تھا قصباتی زندگی میں جاری رہا۔ سماج کی اس ساخت اور مزاج نے جو تفریق، ایک دوسرے سے دوری، چھوت چھات کا تصور اور نفرت کے جذبے پر قائم تھا ہندوستان کو ہمیشہ سے اتنا کمزور اور غیر متحد رکھا کہ تقریباً تاریخ کے ہر دور میں ہندوستان پر بیرونی قوموں کے حملے ہوتے رہے اور حکومتیں قائم رہیں اور بیشتر پورا ملک غیر قوموں کے زیر اثر رہا۔ یہ ایک المیہ ہے کہ سماج کے اس مزاج کو بدلنے کے لیے کم لوگوں نے ہمت کی مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ سماج کی یہ روش نظر انداز رہی۔ سماجی اصلاح کی مہم اور نئے سماج کی تعمیر کا سلسلہ انیسویں صدی کے وسط شروع ہونے لگا تھا جس کے اثرات بتدریج ظاہر ہونے لگے تھے۔ سماجی اصلاح کے علمبردار اگرچہ کم ہی رہے ہیں مگر جو شخصیتیں اس مہم کو لے کر سامنے آئیں ان میں سوامی دویکانند، ایشور چندر ودیا ساگر، راجہ رام موہن رائے، مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر کے نام زیادہ معروف اور مشہور ہوئے۔

ڈاکٹر امبیڈکر ہندو سماج کی سب سے نچلی سطح اور پچھڑے ہوئے سماجی طبقے کی شخصیت

○ شعبۂ قانون ۔ اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ

۱۴ اپریل ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے جس کو ایک سو سال گزر گئے۔ یہ وہ دور تھا جب انگریز حکومت پوری طاقت کے ساتھ ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے اور حکومت کر رہے تھے۔ انگریز یورپ کی دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ دور اندیش، وقت شناس اور سیاسی اعتبار سے زیادہ لائق اور صلاحیت تھے۔ حکومت کرنے کے رموز سے بخوبی واقف تھے۔ اسی لیے یہ تاریخی حقیقت ہے کہ انگریزوں نے تقریباً دنیا کے ہر حصہ پر حکومت کی اور یہ کہا جاتا رہا کہ انگریزوں کی حکومت میں سورج نہیں ڈوبتا۔ ہندوستان میں انگریزوں نے سماجی ساخت اور اس کی اندرونی نقل و حرکت کا بخوبی اندازہ لے کر سیاسی پالیسیاں مرتب کیں تاکہ ہندوستان کے سماج میں آپسی نفرت، استحصال کے جذبات قائم رہیں اور اس طرح ان کی حکومت کو طاقت اور استحکام حاصل رہے۔ سماج کے اوپری اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کو انگریزوں کی خاص مراعات حاصل رہیں۔ اعلیٰ عہدے اور مرتبے حاصل رہے اور اس کے برعکس نچلے طبقے کے افراد کو نہ تعلیمی آسانیاں حاصل تھیں اور نہ زندگی کی ضروریات۔ تعلیم سے محروم رہنے کے نتیجے میں ملازمتوں میں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ پورا طبقہ استحصال ظلم اور تشدد کی گرفت میں تھا اور کمزور اور پچھڑتا جا رہا تھا۔ معمولی اور اہم ضروریات زندگی کے حاصل کرنے میں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ سماج کا یہی طبقہ تھا جس کا پیدائشی تعلق ڈاکٹر امبیڈکر سے تھا مگر ڈاکٹر امبیڈکر نے ایسے غیر مساعد حالات اور دشواریوں میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور احساس و نظریات کی طاقت سے نہ صرف انھوں نے اپنے کو دوسرے سماجی طبقوں کے شانہ بشانہ ہوتے بلکہ اپنے پچھڑے طبقے کو تعلیم اور حقوق کا احساس دلانے کا عزم کیا اور ان کو ظلم و تشدد، غربت، مفلسی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے پوری زندگی وقف کر دی اور اس طبقے کے سربراہ کی حیثیت سے ہندوستان کی سیاست اور جہاد جنگ آزادی میں شامل ہو گئے۔ گاندھی جی جو جنگ آزادی کی قیادت کر رہے تھے۔ انھوں نے بھی ڈاکٹر امبیڈکر کے ہم خیال ہو کر معاون ہوئے۔

جنگ آزادی کا آغاز انیسویں صدی کے آخر سے ہو گیا تھا مگر بیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان کے لیڈروں کے سیاسی دباؤ اتنے پر اثر ہوئے کہ انگریزوں کو ہندوستان میں حکومت کرنا دشوار محسوس ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہی انگریزوں کو "ہندوستان چھوڑنے" کی مہم کھل کر سامنے آگئی۔ سیاسی مطالبات کو دبانے اور ہندوستان کے لوگوں اور لیڈروں میں تفریق ڈالنے کے لیے انگریزوں نے مختلف پالیسیاں اختیار کیں اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنسیں کیں۔ اس سلسلے میں انگریزوں کی اہم پالیسی "جدا کرو اور حکومت کرو" (Divide and Rule) کی پالیسی انتہائی اہم اور کامیاب رہی۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس جو ۱۹۳۱ء میں انگلینڈ میں ہوئی۔ اس میں گاندھی جی اور ڈاکٹر امبیڈکر شریک ہونے کے لیے گئے۔ یہ کانفرنس اس امر پر ناکام رہی کہ گاندھی جی نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ پورے ہندوستان کے لوگوں کے نمائندے ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر کو اس سے اختلاف ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے صاف ظاہر کیا کہ گاندھی جی صرف ہندوستانی قومی کانگریس (Indian National Congress)

کے نمائندے ہیں نہ کہ پورے ہندوستان کے لوگوں کے۔ اس اختلاف کو حل کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ بعد میں یہی طے پایا کہ گاندھی جی صرف ہندوستانی قومی کانگریس کی نمائندگی کریں گے اور ڈاکٹر امبیڈکر سماج کے پچھلے طبقے کے نمائندے ہوں گے۔ یہ اختلاف انتہائی خوش گوار طریقے پر ختم ہونے کے بعد ہندوستان کے دیگر سیاسی سربراہوں نے ڈاکٹر امبیڈکر کی ذہانت، اعلیٰ قابلیت تحریری وتقریری صلاحیتوں کا اعتراف کرلیا اور اتنے متاثر ہوئے کہ جب ۱۹۴۶ء کے بعد یہ واضح ہونے لگا کہ ہندوستان کو جلد آزادی مل جائے گی تو اس وقت متفقہ رائے سے ہندوستان کے دستور لکھنے اور ترتیب کے واسطے ڈاکٹر امبیڈکر کو اس کام کے لیے انتہائی موزوں تصور کرکے یہ ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی۔ دستور ساز اسمبلی اور دستور دفاعی تحریر کمیٹی (Constitution drafting Committee) کی تشکیل ہوئی۔ دستور دفاعی تحریر و ترتیب کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے ڈاکٹر امبیڈکر نے دستور کی مختلف دفعوں کی تحریر اور ساخت کا کام انجام دیا۔ یہ کام اہم ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی سماجی تاریخ کے پس منظر اور نشوونما کے اعتبار سے انتہائی مشکل تھا۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے ہزاروں سال کی سماجی تہوں کی جڑوں کو اکھاڑنے اور پورے سماج کو برابری کا درجہ اور بھائی چارگی کے جذبات کو قایم کرنے اور انسان کو انسان کے ظلم سے محفوظ کرنے کے ساتھ پرانی ریت و رواج جو چھوٹ اور نفرت پر قایم تھیں، کو ختم کرنے کے لیے دستور میں متعدد دفعات شامل کیں تاکہ ہندوستان کا سماج نئے خیالات، ہمدردی اور قومی جذبات کی بنیادوں پر تعمیر ہوسکے اور اتحاد قایم ہوکر ایک قوم بن سکے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے دستور مرتب کرنے کے بعد جب دستور ساز اسمبلی میں دستور پیش کیا اور ایسی تقریر کی جو ایک پارۂ ادب تصور کی گئی اور پوری اسمبلی انتہائی متاثر ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے ہندوستانی سماج کے مزاج کے متعلق کہا کہ ہمارا سماج طبقاتی سماج کے ساتھ ساتھ علیحدگی اور ایک دوسرے سے غیر تعلق کی بنیادوں پر قایم رہا ہے، جس کے نتیجے میں آپسی بھائی چارگی، اتحاد اور ایک دوسرے کے لیے ایثار اور قومی جذبہ کا فقدان رہا ہے جس کا لازمی نتیجہ ہمیشہ سے یہ رہا کہ دوسری بیرونی قوموں کو ہندوستان پر حملہ کرنے اور بغیر کسی دشواری کے آگے بڑھتے جانے کی آسانیاں فراہم رہیں جس کی مثال یہ ہے کہ جب کسی بیرونی قوم نے ہندوستان پر حملہ کیا تو دیہات کے لوگوں نے فوراً اپنے مویشی اپنے گھر کے اندر کرکے دروازے بند کرلیے اور اندر اپنے اور اپنے مویشیوں کو محفوظ کرکے بیٹھ گئے۔ اس طرح بغیر کسی دشواری کا سامنا کیے بغیر دوسری قوموں کو حملہ کرنے اور آگے بڑھتے جانے کے راستے ہموار ملے۔ یہ طریقۂ کار اتحاد قومی جذبے کے منافی رہا جس کے حل اور قومی جذبات کو ابھارنے اور قایم کرنے کے لیے دستور میں کئی دفعات شامل کی گئی ہیں۔

دوسری اہم بات اسی سلسلے میں ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی تقریر میں یہ واضح کی کہ:

> "اب یہ دستور اسمبلی میں پیش ہے
> یہ انتہائی لایق عمل ہے۔ اس میں
> لچک بھی ہے اور مستحکم بھی۔ یہ انتہائی
> مضبوط اور آسان ہے۔ زمانہ جنگ
> ہو یا امن دونوں میں ملکی سالمیت
> کے لیے یہ ایک انتہائی کامیاب دستور
> ہے اور اگر یہ دستور غلط ثابت ہورہا

ہے تو میں کہوں گا کہ اس کی وجہ یہ نہیں کہ دستور کمزور یا ناقابلِ عمل ہوگیا بلکہ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ انسان کا ذہن بدل کر کوتاہ ہوگیا۔"

ڈاکٹر امبیڈکر کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ موصوف نے دستور مرتب کیا اور ایسی دفعات شامل کیں تاکہ پچھڑے طبقے کے ساتھ اقلیتوں کا بھی تحفظ ہو اور ہر شخص کو قانون کی نظر میں برابری کا درجہ حاصل رہے۔ ہر شخص کو ملازمت اور تعلیم کے مواقع مساوی طور پر حاصل رہیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی پوری زندگی سماج کے تفریقی جذبے کو توڑنے اور پچھڑے طبقہ کو سماج میں اعلیٰ مقام فراہم کرنے میں صرف کر دی۔ آج کے سماج میں جتنی کشادہ نظری، اتحاد اور قومی جذبات کا احساس ہے۔ اس میں ڈاکٹر امبیڈکر کی کوششوں اور کاوشیں بالخصوص شامل ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر سماجی مصلح اور دستور سازی کی حیثیت سے ہندوستان کی ایک نامور شخصیت کے حامل ہیں۔

# ایجنسیاں

○ میسرز بک ایمپوریم
سبزی باغ - پٹنہ - بہار

○ میسرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ -
پرنس بلڈنگ - ای آر روڈ - بمبئی (مہاراشٹر)

○ میسرز محمد الیاس نیوز پیپر ایجنٹ
۹۱ کالو ٹولہ اسٹریٹ - کلکتہ -

○ میسرز سکریٹری غالب لائبریری
محلہ لخیبہ - فیروز آباد - اتر پردیش -

○ میسرز مکتبہ معارف الاسلام
ریاض الدین ایر کمر، جمعیت کالونی، انصار محلہ
روم نمبر ۶۸ - فور کتھ نظام پورہ بھیونڈی - تھانے

○ میسرز جنتا بک ڈپو
مین روڈ - رانچی بہار

○ میسرز آزاد کتاب گھر -
ساکچی بازار - جمشید پور - بہار

○ میسرز ثنائی بک ڈپو
پرانہ قلعہ سیوان بہار

○ میسرز طالب حسین
ایف ڈی ہائر سکنڈری اسکول - ساٹھ دروازہ - مراد آباد

○ میسرز ایجوکیشنل بک ہاوس
شمشاد مارکیٹ - علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

○ میسرز صدیق اختر انصاری
اردو نیوز پیپر ایجنٹ - وارث پورہ - کامٹی (ایم - ایس)

○ میسرز کتاب سینٹر
شمشاد مارکیٹ - علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

○ میسرز احمد حسین
جمال بک ڈپو - باری روڈ - گیا - بہار

○ میسرز فردوسی کتاب گھر
بک سیلرز اینڈ پبلشرز - بھوسپا چوک - دھرواڈ

○ میسرز مکتبہ عمر
بک سیلر اینڈ نیوز پیپرس - مدینہ مسجد کمپلکس
میناکشی سرکل -
بیجاپور -

○ میسرز عبدالقیوم
اردو لائبریری، تحصیل گیٹ، گھنٹہ گھر - بدایوں

○ میسرز کتاب محل
تکیہ - اعظم گڑھ - اتر پردیش -

○ اسلامک بک سینٹر
جامعہ کمپلکس۔ ایم آر۔ روڈ بنگلور

○ میسرز آزاد بک ڈپو
مین روڈ۔ مدھوبنی
مدھوبنی۔ بہار۔

○ میسرز محمد شمع
معرفت خورشید بک اسٹال
پار نوادا۔ رانچی روڈ۔ نوادا۔ بہار

○ میسرز انور بک ایجنسی
ایچ۔ ایس ۱۔ ۱۱۔ ۱۱۷۔ مستان پورہ
تانڈیلہ

○ میسرز کریسنٹ بک
اردو بازار دربھنگہ بہار

○ میسرز سب رنگ بک۔
انجمن پلازہ۔ مین روڈ۔
رانچی۔ بہار

○ میسرز مکتبہ اسلامیہ
اپوزٹ بنے میاں درگاہ۔ شاہ گنج۔ اورنگ آباد۔

○ میسرز شمی بک سینٹر
چھوٹی مسجد۔ اسٹیشن روڈ
سمستی پور بہار

○ میسرز ایم۔ راشد حمیدی
محلہ محل سرائے۔ دھام پور۔ بجنور۔

○ میسرز ایم۔ ایچ بک سیلر
ہول سیلر اینڈ ریٹیلر
رحم گنج۔
دربھنگہ۔ بہار۔

○ میسرز روشن درسی کتب خانہ
۱۵۵۔ موتی نالہ۔ جبل پور۔ (ایم۔ پی)

○ میسرز شاہد متین
واحد پبلشرز گولڈن کیو ایس آئی
سیدا پور۔ دھرواد

○ میسرز زینت اردو نیوز ایجنسی
اردو اسکول روڈ۔
اولڈ ڈنڈیلی۔
کرناٹک۔

○ میسرز اسلامیہ بک ڈپو
بک سیلرز اینڈ نیوز پیپر ایجنٹ
نیو مارکیٹ
تاتارپور چوک۔ بھاگلپور سٹی۔ (بہار)

MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

# تہذیب الاخلاق

جلد ۱۱ — شمارہ ۶

جون ۱۹۹۲ء

سرپرست

## پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

## کبیر احمد جائسی

نائب مدیر

**شہاب الدین**

انچارج کمپوزنگ
شفیق احمد

تزئین
[illegible]


ناشر، طابع، مالک کا پتہ :
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ ۔ انڈیا
(۲۰۲۰۰۲)

| | | |
|---|---|---|
| زرِ سالانہ : | انڈیا | Rs.45.00 |
| * | بیرونی ممالک US $ 20.00 | ہوائی ڈاک |
| * | US $ 8.00 | عام ڈاک |

PHONE. 24827

ترسیلِ زر کا پتہ :
بنام تہذیب الاخلاق نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

EDITOR,
TAHZIBUL AKHLAQ
NISHANT,
ALIGARH MUSLIM
UNIVERSITY, ALIGARH.

# مندرجات



تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہر حال ان سے متفق ہو۔


مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد ۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ
نشانات، اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ ۔ پریس ۔ اے ایم یو پریس۔ علی گڑھ

# اداریہ

ہم وابستگان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے درمیان انیسویں صدی عیسوی کے اواخر کی دو ایسی مایۂ ناز ہستیاں موجود تھیں جن کو دیکھ کر ہم اپنی عظمتِ گزشتہ کا کچھ اندازہ کرلیا کرتے تھے، افسوس ہے کہ کچھ دنوں کے وقفے سے یہ دونوں ہستیاں ہم سے جدا ہو کر اپنے خالقِ حقیقی سے جاملیں اور ہمارے درمیان ایک خلا چھوڑ گئیں۔ رحمتِ خداوندی سے بعید نہیں کہ یہ خلا پُر ہو جائے لیکن قانونِ قدرت کے مطابق اب ہم انیسویں صدی عیسوی کی کسی یادگار کو دیکھنے سے قاصر رہیں گے۔ ہمارا اشارہ کرنل بشیر حسین صاحب زیدی اور الحاج عبیدالرحمٰن خاں صاحب شیروانی کی وفات کی طرف ہے جن کو دیکھنے کے لیے ہماری آنکھیں عمر بھر ترستی رہیں گی۔ جانے والے جا چکے لیکن اُن کی خوبیاں زندہ اور ان کی نیکیاں باقی ہیں اور ان کے کیے ہوئے کام بلا تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل جس طرح فیض بخش و فیض رساں تھے وہ ان شاء اللہ اس وقت تک جاری و ساری رہیں گے جب تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ باقی رہے گی۔

کرنل بشیر حسین صاحب زیدی کا تعلق ساداتِ بارہہ کے اس خاندان سے ہے جس کے کارنامے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ ایک زمانے میں اس خاندان کے دو بھائیوں کو "بادشاہ گر" کہا جاتا تھا۔ زیدی صاحب مرحوم اُس خاندان کے چشم و چراغ ہونے کے باوجود "بادشاہ گر" تو نہیں بنے لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کو "انسان گر" بننے کا موقع ضرور عطا فرمایا اور انھوں نے اس عطیۂ خداوندی کی مدد سے ایک طویل مدت تک جو کام انجام دیا وہ ہماری تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

ان سطور کے لکھنے والے نے جب مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو کرنل بشیر حسین صاحب زیدی وائس چانسلر تھے اور بیجز تحقیقی کمیٹی کا طوفان یونیورسٹی میں آیا ہوا تھا۔ اُس بحرانی دور کو جن لوگوں نے دیکھا ہے ان کو خوب اچھی طرح یاد ہوگا کہ بشیر حسین صاحب زیدی کے حسن تدبیر اور معاملہ فہمی نے کس طرح اس بحران کو ختم کیا اور جب بیجز کمیٹی رپورٹ مکمل ہو کر پارلیمنٹ میں پیش کی گئی تو تمام اراکین

پارلیمنٹ نے اس پر اپنی مہر تصدیق ثبت کی جس سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دامن سے تمام مینڈ داغ دھل گئے اور اس کا صاف اور روشن چہرہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سب کی نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو گیا۔

اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں زیدی صاحب کو ایک اور سنگین بحران سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں اس زمانے کے ضیاء الدین ہوسٹل (آج کے شبلی ہوسٹل) میں دو طلباء کے درمیان الیکشنی جنگ ہو گئی تھی چونکہ دونوں طلباء کا تعلق دو الگ الگ فرقوں سے تھا اس لیے اس جنگ نے فرقہ وارانہ فساد کی صورت اختیار کر لی تھی جس کے نتیجے میں شہر میں کرفیو بھی لگایا گیا تھا اور یونیورسٹی کو غیر معینہ مدت کے لیے بند بھی کرنا پڑا تھا۔ میں اس زمانے میں ضیاء الدین ہوسٹل میں تھا، اس ہنگامے کے سلسلے میں ملکھان سنگھ کے ساتھ سی۔ بی۔ گپتا بھی ضیاء الدین ہوسٹل آئے تھے اور انھوں نے طلبا سے خطاب کیا تھا۔ اُن کے بعد حالات کا جائزہ لینے کے لیے مس مردولا سارا بائی بھی تشریف لائی تھیں اور ہم لوگوں کے درمیان کافی دیر تک رہی تھیں، زیدی صاحب نے اس بحران کا جس صبر و تحمل اور دانشمندی سے سامنا کیا اور یونیورسٹی کے وقار کو مجروح نہ ہونے دیا اس بات کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھوں نے وہ زہر آلود فضا دیکھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زیدی صاحب کو دنیاوی وجاہت اور دولت دونوں سے نوازا تھا مگر ان چیزوں کی بہتات نے ان کو نہ تو مذہب بیزار بنایا اور نہ ہی سرکش۔ وہ اکثر بر سر عام مسلم یونیورسٹی کی اس جامع مسجد میں جس کو رشید صاحب نے علی گڑھ کی مسجد قرطبہ کہا ہے، اپنے رب کے سامنے سر بسجود دیکھے گئے ہیں، امید ہے کہ ان کے یہی سجدے ان کی نجات اُخروی کا سبب ہوں گے۔ زیدی صاحب ۲۹ مارچ ۱۹۹۲ء کو اس جہان فانی میں ۹۴ برس گزار کر عالم جاودانی کو کوچ کر گئے اور آج جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے اس قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں جہاں ڈاکٹر سید عابد حسین، غلام السیدین، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور دوسرے اکابرین محو خواب ابدی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔

---

الحاج عبید الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کا تعلق شیروانیوں کے مشہور و معروف خاندان سے ہے وہ صحیح معنوں میں اپنے منہ میں سونے کا چمچہ لیے ہوئے ۱۵ اگست، ۱۸۹۰ء کو پیدا ہوئے، اُن کے والد ماجد صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی مرحوم اپنے وقت کے صرف ایک باتدبیر صاحب اقتدار فرد ہی نہ تھے بلکہ ایک بڑے عالم اور دین داری کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ انھی کے دامن تربیت میں الحاج عبید الرحمٰن خاں صاحب شیروانی پلے بڑھے اور اُن کی تمام اچھائیوں کو اپنے اندر جذب کرتے رہے۔ ان کو بیس سال ہی کی عمر سے اپنے والد کی ریاست کے انتظام و انصرام میں مصروف ہونا پڑا اس لیے وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے مگر ذاتی مطالعے سے اپنی علمی استعداد بڑھاتے رہے۔

ریاست کے انتظام و انصرام کے ساتھ ساتھ وہ برابر قومی کاموں میں مصروف رہے۔ ۱۹۱۹ء میں

نیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے ممبر نامزد ہوئے اور جب تک یونیورسٹی قائم نہیں ہوگئی اس کے قیام کی کوششوں میں شب و روز مشغ
ہے۔ یونیورسٹی کے قیام کے بعد وہ ایک طویل مدت تک یونیورسٹی کے آنریری ٹریژرار، قائم مقام وائس چانسلر اور کورٹ
بر رہے اور اپنی نیک نفسی اور انتظامی صلاحیتوں سے یونیورسٹی کو فائدہ پہنچاتے رہے۔ انتقال کے وقت وہ یونیورسٹ
کے پرو چانسلر کی حیثیت سے اپنی مادر علمی کی خدمت انجام دے رہے تھے۔

عبیدالرحمٰن خاں صاحب شیروانی کو اللہ تعالیٰ نے جتنی دولت، شہرت اور عزت دی تھی اتنی ہی دولت فروتنی ا
سر نفسی کی بھی دی تھی۔ یہ وہ وصف ہے جو انگشت شمار افراد ہی کو عطا ہوتا ہے جو لوگ مرحوم سے مل چکے ہیں وہ میری ا
ت کی تصدیق کریں گے۔ ان میں کبر، غرور اور نخوت کا شائبہ تک نہ تھا۔ ذاتی زندگی میں ان کو کئی صدمات کو برداشت کرنا
لگر وہ ہمیشہ پیکر صبر و رضا ہی بنے نظر آئے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستانیوں پر جو قیامت گزری تھی اس کے اثر سے مرحوم
یک صاحبزادے اپنا ہوش و حواس کھو بیٹھے اور تقریباً ۴۵ برسوں تک ایک دیوانے کی طرح زندگی بسر کرنے کے بعد اپنے وا
کے انتقال سے کچھ ماہ پہلے اس دنیا سے سدھار گئے۔ جو لوگ اپنے سینے میں باپ کا دل رکھتے ہیں وہی اس بات کا اندازہ کر
ہیں کہ ۴۵ برسوں تک شیروانی صاحب کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ اس جاں سوز حقیقت سے مقابل ہونے کے باوجود وہ فلاحی کا
میں ہمہ تن مصروف رہے اور کبھی بھی حرف شکایت اپنی زبان پر نہ لائے۔

فروری ۱۹۷۳ء سے ستمبر ۱۹۷۴ء تک مجھ کو بھی شیروانی صاحب کی نیابت کا شرف حاصل رہا ہے۔ پچیس بر
کے وقفے کے بعد شیروانی صاحب نے جب کانفرنس گزٹ نکالنے کا ارادہ کیا تو اس کی ترتیب کا کام انھوں نے میرے سپرد کیا
کے ساتھ کام کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ نہ تو سخت باتوں کو پسند کرتے ہیں اور نہ ہی تیز و تند انداز بیان کو۔ عام مضامی
کے ترتیب و انتخاب میں تو ان کی طرف سے مجھے کھلی آزادی حاصل تھی مگر میرے اداریوں کو وہ بڑے غور سے پڑھتے
ور سخت جملوں، فقروں اور الفاظ کو نکال دینے کا مشورہ دیتے۔ ان کا مشورہ صائب اور برمحل ہوتا۔ اس لیے ا
سے اختلاف کی گنجائش نہ تھی۔ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا کہ میرے اور ان کے درمیان سخت اختلاف ہوا اور میں
کام کرنے سے انکار کر دیا۔ میرے انکار کرنے پر مرحوم نے فرمایا کہ وہ نہ تو مجھ کو چھوڑیں گے اور نہ ہی مجھ کو سخت با
لکھنے دیں گے۔ میں جو چاہوں لکھوں مگر انداز بیان ایسا ہو کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ یہ اختلاف اس اداریہ پر
تھا جو میں نے پروفیسر عبدالعلیم صاحب مرحوم کی وائس چانسلری ختم ہونے پر لکھا تھا۔ شیروانی صاحب مرحوم
ارشاد پر دو بار تو میں نے اپنے اداریہ کو "نرم" کر دیا مگر وہ پھر بھی مطمئن نہ ہوئے تو میں نے کام چھوڑنے کی
لی لیکن شیروانی صاحب اس کے لیے راضی نہ ہوئے اور میرا اداریہ پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں صاحب شیر
کے سپرد کیا گیا جنھوں نے میرے سخت جملوں کو نکال کر میری تحریر کی "جارحیت" کو ختم کیا۔ اس مرحلے سے گز
کے بعد جب وہ اداریہ شائع ہوا تو لوگوں، بالخصوص قائم مقام شیخ الجامعہ نے شیروانی صاحب سے اداریہ
لہجے کی شکایت کی۔ اس واقعہ کو نقل کرنے کا مقصد صرف یہ بتلانا ہے کہ شیروانی صاحب مرحوم کام کرنا ہی نہ
کام لینا بھی جانتے تھے۔

وہ اپنی ذاتی زندگی میں انتہائی وضع شریف اور عبادت گزار انسان تھے، ۶ مئی ۱۹۹۲ء کو
۹۵ سال کی طویل زندگی گزار کر وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور علی گڑھ کے مشہور قبرستان شاہ جما

ا سپرد خاک کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

---

تیسرا حادثہ محمد مجتبیٰ صاحب صدیقی سابق رجسٹرار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سانحۂ ارتحال کا ہے
بدرالدین طیب جی (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) صدیقی صاحب کو رجسٹرار بنا کر لائے تھے اور انھوں
دل و جان سے مادر علمی کی خدمت کی مگر ۱۹۶۵ء کے واقعہ میں حکومت نے ان کو مشکوک قرار دے کر جسٹس بشیر
سعید صاحب، پروفیسر عبد البصیر خاں صاحب وغیرہ کے ساتھ ان کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔ اس دورِ ابتلاء
گزرنے کے بعد وہ علی گڑھ میں رہنے لگے تھے اور ایک طویل عمر پا کر انھوں نے علی گڑھ ہی میں انتقال کیا اور
یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ دعا ہے کہ خدائے عز و جل ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۱۱، شمارہ ۶ (جون ۱۹۹۲)

# ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت پر انسان کی ترقی

سر سید احمد خاں

کائنات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس میں مختلف قسم کی چیزوں کو پاتے ہیں جن کو ہم تین قسم پر تقسیم کرتے ہیں۔ حجر، شجر، حیوان۔ ان تین قسموں میں اسباب داخلی یعنی طبعی اور اسباب خارجی سے تغیر اور تبدیل ہوتا ہوا پاتے ہیں۔

اشجار کو دیکھتے ہیں کہ پہلے وہ ایک چھوٹے سے دانے کی صورت میں ہوتے ہیں پھر اس میں سے ایک نہایت ضعیف نکوا نکلتا ہے۔ پھر وہ بڑا ہوتا جاتا ہے۔ ٹہنیاں اور پتے نکلتے آتے ہیں۔ پھر پھول نکلتے ہیں اور انواع و اقسام کے پھل لگتے ہیں اور اس اعلیٰ درجے پر ترقی کر جاتا ہے جس درجے تک بالطبع وہ درخت ترقی کر سکتا ہے پھر اس سے زیادہ ترقی نہیں کر سکتا۔

اسی طرح حیوانات کو ان کے نطفے کی حالت سے جوان ہونے تک دیکھتے ہیں کہ برابر ترقی کرتا جاتا ہے۔ پہلے نطفہ تھا، پھر مضغہ ہوا، پھر سانس لینے لگا، پھر ایک کامل صورت ہوئی پھر زیادہ قوت آئی، اپنی جگہ سے باہر نکلا، قد بڑھتا گیا، ہاتھ پاؤں میں طاقت آنے لگی پھر بیٹھنے لگا، چلنے پھرنے لگا، گال جو نہایت صاف تھے ان پر داڑھی نکلی، کسی کی لمبی کسی کی چھوٹی، کسی کا گھنی اور کسی کے دو تین بال۔ وہ سیاہ تھی، پھر سفید ہو گئی

غرض کہ جس حد تک وہ بالطبع ترقی کر سکتا تھا، ترقی کر گیا پھر اس سے زیادہ ترقی نہیں کر سکتا۔

حجر کا حال اس سے کسی قدر مختلف ہے اس میں کوئی علامت طبعی ترقی کی نہیں پائی جاتی۔ اس میں جس قدر ترقی ہوتی ہے وہ خارجی امور سے ہوتی ہے۔

اشجار کی جدا جدا نوعیں ہیں۔ مثلاً ایک ساق والے درخت جیسے کھجور مع اس کے اقسام کے، تاڑ مع اس کے اقسام کے۔ اس قسم کے تمام درخت جو دنیا میں پائے جاتے ہیں اگر ایک جگہ جمع کر کے بترتیب رکھے جاویں تو پہلا دوسرے کے اور دوسرا تیسرے کے اور تیسرا چوتھے کے ایسے مماثل ہوں گے کہ ایک دوسرے سے میز نہیں ہو سکے مگر جب پہلے کو پانچویں یا دسویں سے ملا کر دیکھا جاوے تو ایک دوسرے بخوبی میز ہو سکے گی۔

نارنجی، سنگترا، میٹھا، کھٹا، چکوترہ وغیرہ کے درخت آپس میں نہایت مماثل ہیں ان میں نامحسوس تفاوت ہے اور ایک کا پیوند دوسرے میں لگ جاتا ہے مگر یہ کبھی نہیں ہوتا کہ نارنجی کا درخت چکوترہ ہو جائے اسی حالت کو ہم مماثلت سے تعبیر کرتے ہیں۔

اسی طرح حیوانات کی بھی جدا جدا نوعیں ہیں۔ مثلاً کتا اور بھیڑیا، شیر، تیندوا، بگھرا، چیتا ایک نوع ہیں۔ گھوڑا، گدھا ایک ہی نوع میں داخل ہیں۔ کبوتر، فاختہ ٹوٹرو سب ہی ایک نوع کے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اسی نوع کا نر اسی قسم کے مادہ سے ملے اور ایک تیسری قسم کا حیوان انہی کی مماثل پیدا ہو جاوے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ شیر کتا اور کتا شیر ہو جاوے۔

اگر اس نوع کے تمام حیوانات ایک جگہ جمع کیے جاویں اور بترتیب رکھے جاویں تو پہلا دوسرے سے اور دوسرا تیسرے سے اور تیسرا چوتھے سے اور چوتھا پانچویں سے ایسے مماثل ہوں گے جن میں تمیز مشکل ہوگی لیکن جب پہلے کو پانچویں یا دسویں سے مقابلہ کیا جاوے تو دونوں میں فرق بین معلوم ہوگا۔

انسان کو ہم اسی نوع کے حیوانات میں داخل کرتے ہیں جس نوع میں بندر داخل ہیں۔ اگر تمام قسم کے بندروں کو جن کی بے انتہا قسمیں معلوم ہوئی ہیں، ایک جگہ جمع کیا جاوے تو ان کی بھی یہی حالت ہوگی کہ پہلے کو دوسرے سے اور دوسرے کو تیسرے سے اور تیسرے کو چوتھے سے اور چوتھے کو پانچویں سے ایسی ہی مماثلت ہوگی جن میں تمیز مشکل ہے مگر جب پہلے کو پانچویں یا دسویں یا پچاسویں سے مقابلہ کیا جاوے تو دونوں میں تفاوت علانیہ ظاہر ہو جاوے گا۔

وہ بندر جو اب پائے جاتے ہیں اور جن کو اوران اوتان اور ابیشیکوس کہتے ہیں بہت سی چیزوں میں انسان کے مماثل ہیں اور مسٹر ڈارون جن کی نسبت کہتے ہیں کہ چند بیچ کی کڑیاں ناپید ہو گئی ہیں یا دستیاب نہیں ہوئیں، اگر دستیاب بھی ہو جاتیں تو بھی مماثلت کے اور کوئی نیا امر ان سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ ہم خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان بھی اسی نوع حیوان میں سے ہے جس نوع میں بندر داخل ہیں، مگر انسان اس نوع کا سب سے اعلیٰ جانور ہے جس سے اوپر اس کا نوع کا کوئی جانور نہیں۔ اس وقت میرے دل نے کہا کہ کیا اسی سے اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔

یہ امر کہ یہ مماثلت کیوں کر پیدا ہوئی، اس کی نسبت کوئی ایسی دلیل جو بطور برہان کے یا اولیات کے ہو ہمارے پاس نہیں ہے، صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ مادہ جو سالمات یعنی اجزائے لایتجزیٰ کی صورت میں موجود تھا، ان سالمات کی ایک مقدار کے باہم ملنے سے تمام اشیائے کائنات ظہور میں آئی ہیں۔ وہی اجزا جب ایک معین مقدار سے اور ایک مخصوص ہیئت سے آپس میں ملے تو ایک شئے موجود ہوگی اور اس کی دوسری وضع اور ہیئت سے ملنے میں دوسری شئے پیدا ہوگی اور جس قدر سالمات کے ملنے سے وہ چیزیں پیدا ہوئی تھیں جب اس مقدار سے زیادہ یا کم سالمات آپس میں ملے تو ایک اور شئے کا ظہور ہوا۔ چوں کہ قدرت نے تمام چیزوں کو ایک سلسلہ سے پیدا کیا ہے کہ ایک کی کڑی دوسرے سے ملی ہوئی ہے اور تمام ضروریات ہر ایک مخلوق کی جو اس کے لیے ضروری تھیں اس کی فطرت میں رکھ دی ہیں، اس لیے تمام مخلوق کا مماثلت پر پیدا ہونا تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

ہم اس کے دعوے دار نہیں کہ تمام اشجار اور حیوانات مع اپنی انواع و اقسام کے دفعۃً واحدۃً ایک ساتھ پیدا ہو گئے ہیں بلکہ ہم کو معلوم نہیں کہ کس قدر زمانے میں یہ سلسلہ مماثلت ظہور میں آیا ہے مگر ہم اس بات کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اس سلسلۂ مماثلت میں جو سب سے اول ہے وہ پہلے وجود میں آیا ہے اور اس کے بعد دوسرا اور اس کے بعد تیسرا اور علیٰ ہذا القیاس۔

یہی مماثلت ہم تمام دنیا کے انسانوں میں بھی پاتے ہیں۔ اگر تمام دنیا کی مختلف قومیں جو افریقہ اور امریکہ اور ایشیا اور جزائر اور جبال میں موجود ہیں، ایک جگہ جمع کی جاویں اور بترتیب بٹھائی جاویں یا اُن کے چہروں کی تصویریں بنا کر بترتیب رکھی جاویں تو پہلا دوسرے سے اور دوسرا تیسرے سے اور تیسرا چوتھے سے اور چوتھا پانچویں سے ایسا ہی مماثل ہوگا کہ ایک دوسرے میں بہت ہی غیر محسوس فرق ہوگا مگر جب پہلے کو پانچویں اور دسویں سے مقابلہ کیا جاوے تو فرق بیّن ظاہر ہوگا۔

ہم اس انقلاب جسمی اور ذہنی سے جو مختلف ملک اور مختلف قوم کے لوگوں میں پاتے ہیں یا جو ایک ملک کے مرد اور عورت دوسرے ملک کے مرد اور عورت کے ملنے سے ان کی اولاد میں ظاہر ہوتا ہے اور اُن اسباب کے موثر ہونے سے جو جسمانی اور ذہنی امور پر مختلف ملکوں کے موسم سے ہوتا ہے انکار نہیں کرتے اور ہم اس بات کو بھی نہ مذہباً اور نہ علماً ضروری سمجھتے ہیں کہ تمام دنیا کی مختلف قومیں ایک ہی آدم کی نسل سے ہیں اور اس لیے مسئلہ مماثلت میں جو ہم نے اختیار کیا ہے کچھ تزلزل لازم نہیں آتا۔

اس زمانے میں کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں ہر ایک نوع حیوان کے پیدا کرنے کے لیے نیچر نے ایک ہی کیڑے جاندار پیدا کی تھی جو دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ پھر اُن ضروریات کے سبب جو اس کو لاحق ہوتی تھیں اور موثرات خارجی کے کے سبب ایک ممتد زمانے میں اس نے ترقی کی اور اس کی جسمانی اور ذہنی حالت نے ایک ترقی یافتہ حالت پیدا کی۔ رفتہ رفتہ وہ اعلیٰ درجے پر پہنچ گئی۔ مثلاً حیوانات میں سے جس نوع میں بندر کو داخل کیا وہ ترقی کرتے کرتے انسان کی حالت میں پہنچ گئی۔ اسی طرح پر اس مسئلے کے قایم کرنے کا سبب طبیعت کا وہ رجحان ہے جو کثرت کو وحدت کی طرف رجوع کرتا ہے اور نیچر کو ترقی کی طرف مائل قرار دیتا ہے اور پھر نیچر کے باقاعدہ اثرات سے اس کو متفرع کرنا چاہتا ہے۔ اس مسئلے کے لیے برہان لمّی یا اولیات کے دلائل ہونے کی نسبت زیادہ تر قیاسی اور خیالی دلیلیں ہیں۔ اس مسئلے کو ہم انقلاب کے مسئلے سے تعبیر کرتے ہیں اور اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ پہلی قسم کا بندر اور اس کی نسل رفتہ رفتہ ایک ممتد زمانے میں دوسری قسم کی ہو گئی اور اسی طرح دوسری قسم تیسری قسم کی اور اخیر قسم کا جو بندر تھا رفتہ رفتہ ترقی پا کر ایک ممتد زمانے میں انسان یا آدم بن گیا۔ اگر ہم اس مسئلے کو بھی مان لیں تو ہمارے اصول مذہبی میں جو ہم قرآن مجید سے پاتے ہیں کچھ نقصان نہیں آتا۔ کیونکہ قرآن مجید میں وہ حیوان مخاطب ہے جو انسان کی صورت میں آیا تھا گو کہ وہ کسی طرح پر آیا ہو۔

اب ہم کو بیان کرنا ہے کہ انسان نے ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت پر کیونکر ترقی کی۔ قدرت نے بہت سے حیوانات میں ایک حد تک تربیت کا مادہ رکھا ہے جس سے جسمانی اور ذہنی حالت کو ترقی ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان میں بھی ایک مادہ ہے جس سے اس کی ذہنی قوت روز بروز ترقی پاتی جاتی ہے اور یہ بات کہ اس کی ترقی کی حد کہاں تک ہے ابھی تک تحقیق نہیں ہوئی اور معلوم نہیں کہ کہاں تک اس کی ترقی کی حد ہوگی۔ اس لیے کہ انسان کی ذہنی قوت برابر ترقی کرتی چلی جاتی ہے مگر اس بات کو ہم تسلیم کرتے ہیں اور تسلیم بھی کرنا چاہیے کہ وہ حیوان جب انسان کی صورت میں آیا تھا تو اس نے ایک بے انتہا ذہنی ترقی کا مادہ موجود تھا اور اس کی ترقی تربیت پر منحصر تھی جو بلاشبہ ایک ممتد زمانے میں حاصل ہو سکتی ہے۔

تربیت سے اس مقام پر ہماری مراد ان معلومات
کے حاصل کرنے سے ہے جو ایک نسل سے آئندہ آنے
والی نسل کو پہنچتی ہیں۔ اس پچھلی نسل کے پاس اگلی نسل
کی معلومات کا ذخیرہ موجود ہوتا ہے اور یہ پچھلی نسل اس
ذخیرے میں کچھ ترقی دیتی ہے اور یہ ترقی یافتہ ذخیرہ اس
سے آگے آنے والی نسل کو پہنچتا ہے اور وہ اس میں کچھ
ترقی دیتی ہے اور یہ ترقی یافتہ گنجینہ اس سے آگے آنے
والی نسل کو پہنچتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس اور اسی طرح آئندہ
نسلیں ترقی پاتی جاتی ہیں اور اسی طرح تمام علوم نے جو اب
ترقی یافتہ ہیں رفتہ رفتہ پائی ہے۔

انسان ابتدا میں نہایت ادنیٰ حالت میں
تھا، مگر ترقی کا مادہ جو خدا نے اس قسم کے حیوان
یا اس قسم کے بندر یا آدم کو دیا تھا اس میں موجود
تھا اور اس کی نسل میں بھی موجود ہے (اگر امور
خارجہ اس کے مخالف نہ ہوں) پھر رفتہ رفتہ
اسی تربیت سے جس کا ہم نے ذکر کیا ترقی ہوتی
گئی یہاں تک کہ وہ اس درجۂ ترقی پر پہنچا ہے
جس پر وہ آج ہے اور معلوم نہیں کہ ابھی کس حد تک
ترقی کرنا باقی ہے۔ اس پر قیاس ہو سکتا ہے
کہ آدم سے کس قدر طویل زمانہ گزرنے کے بعد
حضرت نوح کو کشتی بنانے کا فن آیا ہوگا۔ توریت
میں تو ۱۶۵۷ برس کا زمانہ قرار دیا ہے، وہ
ایک ہنسی کی بات ہے۔

زندگی خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔ پیکر بناتی
ہے اور انھیں توڑتی ہے۔ روح ایک ایسی
شمشیر ہے جس کے لیے بقول اقبال جسم کے نیام
سنگ فساں کا کام کرتی ہے۔ شاہ آرتھر
کی تو تلوار ہی سمندر میں ڈال دی گئی تھی، ہم نیام
لے کر گھومتے ہیں۔ چڑیا اڑ گئی اور پنجرے کی
نمائش ہو رہی ہے۔ چمکتا ہوا دمکتا ہوا، خوش
خرام، خاموش تیز رو، لچک دار، سانچے میں
ڈھلا ہوا خوب صورت سانپ کینچلی اتار کر آگے
بڑھ گیا۔ ہم ملگجی کینچلی کو سینے سے لگائے
ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ سانپ یہی ہے۔

سید حامد

# بچوں کی تربیت

○ سید حامد

بچوں کو بڑی تعداد میں ایک جگہ دیکھیے ؛ رنگارنگ پھولوں کا چمن کھلا ہوا ملے گا۔ رنگ ہی نہیں بناوٹ، قامت خوشبو، عادت، طبیعت، طور طریقے سب کچھ ایک دوسرے سے مختلف اور اس کے ساتھ ساتھ بے شمار باتیں مشترک ایک دوسرے سے ملتی ہوئی۔ ان کو پالنا پوسنا پروان چڑھانا بظاہر بہت آسان، سبھی بچے ہی تو ہیں ؛ بچوں کی تربیت کے چند اصول ہیں ؛ انھیں پر انھیں اٹھایئے یہیں پر ماں باپ سے غلطی ہوتی ہے۔ ہر بچہ ایک علیحدہ طرز تربیت کا طالب ہوتا ہے، وہ اسے نہ ملے تو اس کی نشو ونما میں خلل پڑ جائے گا، وہ تربیت کی کوتاہی کی بنا پر اپنے امکانات کو نہ پہنچ پائے گا ؛ جس قد و قامت کے عناصر اس کی سرشت میں ہیں اس سے وہ محروم رہ جائے گا۔ ایک ہی نسخہ ہر بچے کی تربیت میں کام نہیں آتا ماں باپ نے اگر مصروفیت یا لاعلمی یا بے فکری کے سبب اپنے بچوں کو پڑھنے، انھیں جاننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی، ان کی افتاد طبع کو نہیں پہچانا، ان کے چھپے ہوئے رجحانات اور دبے ہوئے امکانات کو نہیں ٹٹولا تو وہ ان کی تربیت کا حق ادا نہیں کر سکیں گے۔

مشرق میں عام طور پر زیادہ زور بچوں کو باادب اٹھانے پر صرف کیا جاتا ہے۔ شروع سے ہی انھیں ایک نظم کا پابند کر دینے سے تربیت کی راہ سہل ہو جاتی ہے نظم وضبط کو نافذ کر دیجیے تو پھر انفرادی اوصاف کی رعایت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ بعض بچے خوشی خوشی مؤدب بن جاتے ہیں، سعادت مندی کا جامہ پہن لیتے ہیں، جو کچھ کہا جائے وہ کرتے ہیں، ماں باپ اور بڑے بھائی بہنوں کے اشارے پر چلتے ہیں، بغیر اجازت کے اپنی جگہ سے نہیں ہلتے، ہر چیز اپنی جگہ پر رکھتے ہیں۔ باقاعدگی ان کی رگ وپے میں سرایت کر جاتی ہے۔ والدین کے لیے وہ مسایل پیدا نہیں کرتے۔ ہمسائے اور ماں باپ ایسے والدین کو مبارک باد دیتے ہیں، ان پر رشک کرتے ہیں۔

دوسرے سرے پر وہ بچے ہیں جو شرارت پر تلے رہتے ہیں اور موقع پڑ جائے اور تادیب کا پانی سر سے گزرنے لگے تو سرکشی پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کوئی چیز جگہ پر نہیں رکھتے، کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتے بھائی بہن کو ستاتے ہیں، ان سے لڑتے ہیں، اسکول

---

○ سابق وائس چانسلر اے ایم یو علی گڑھ ـــــ ہمدرد نگر - نئی دہلی -

سے ان کی شکایتیں آتی ہیں کہ یہ ہوم ورک کرکے نہیں لاتے کلاس میں ان کا ذہن بھٹکتا رہتا ہے کبھی کسی لڑکے کو نوچ لیا کبھی کسی کو منہ چڑا دیا۔ ان بچوں سے والدین عاجز رہتے ہیں اور سوچتے رہتے ہیں کہ الٰہی بڑے ہوکر یہ کیا کریں گے، خاندان کی ناک کٹوائیں گے۔ والدین کے لیے ان کے بڑھاپے میں وبال دوش بن جائیں گے بہسائے ان سے چڑھتے ہیں، ان کے والدین پر ترس کھاتے ہیں۔

دراصل نہ پہلا ردّ عمل صحیح تھا، نہ دوسرا۔ بچوں کو ایک روایتی سانچے میں ڈھالنے اور بے ضرر بنا دینے کی روش والدین کے لیے آسانیاں پیدا کرتی ہے لیکن بچوں کی انفرادیت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ ان کی شخصیت کو سپاٹ بنا دیتی ہے اور ان کے بہت سے جوہروں کو دبا دیتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ کارروائی ان کے اعتماد کو کچل دیتی ہے، ان کے حوصلے کو نڈھال کر دیتی ہے۔ وہ پیش قدمی سے محروم ہو جاتے ہیں، اُپج اور اختراع اور سرفرازی سینہ تانی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ زندگی دراصل کھیل ہی ہے حوصلہ کا۔ حوصلہ نہ رہا تو بچا کیا۔ لہٰذا والدین کو کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے کہ بچوں کا حوصلہ ٹوٹے وہ شرارت کریں گے، ضرور کریں گے، مناسب حدود کے اندر شرارت کرنے کی اجازت دیجیے کہ شرارت میں ذہانت اور اختراع اور پیش قدمی کے لیے راہیں نکلتی ہیں یہ بات شروع سے ہی ان کے دل میں بٹھا دی جائے کہ ایسی شرارت جو دوسروں کو نقصان پہنچائے یا ان کا دل دکھائے شرارت نہیں رہتی، بُرائی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بُرائی اس گھر میں گوارا نہیں کی جائے گی۔ بچے توڑ پھوڑ بھی کریں گے، کرنے دیجیے البتہ قیمتی چیزوں کو ان کی دسترس سے دور رکھیے۔ کون سی بات زیادہ اہم ہے: گھر آراستہ رہے، یا ان کی شخصیت سنورے، نکھرے نت نئے تجربوں کی روشنی میں چمکے؟ پورے گھر کو ان کی جولانگاہ بننے دیجیے۔ یہ کیا کہ ایک کمرے میں مقید کرکے رکھ دیا۔ عمر بڑھے گی، جستجو پروان چڑھے گی تو کل پرندوں کو اس لیے کھولیں گے کہ پھر سے انھیں جوڑ دیں۔ یہ عمل کچھ مہنگا پڑے گا۔ پڑنے دیجیے۔ آدمی پیدا ہی جستجو کے لیے ہوا ہے۔ اس دنیا میں اسے اتارا بھی گیا ہے ایک ابتدائی جستجو کی پاداش میں۔ جستجو کا گلا گھونٹ دیا گیا تو شخصیت کا ارتقا، اس کا کس بل سب ختم ہو جائے گا۔ کپڑے اچھے اچھے پہنا دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، پھر تو یہ فکر دامن گیر ہو جاتی ہے کہ کہیں یہ میلے نہ ہو جائیں کہیں یہ پھٹ نہ جائیں، اور یہ فکر بچوں کو زمین پر کھیلنے سے محروم کر دیتی ہے۔ انسان کا آغاز مٹی سے ہے اور مٹی سے ہی وہ طاقت حاصل کرتا ہے۔ یونانی دیوتا کی کہانی آپ نے پڑھی ہوگی۔ اس کا جو قدم زمین پر پڑتا تھا اس کی طاقت میں اضافہ کرتا تھا۔ اس کا حریف اسے ہرا جب ہی سکا جب اس نے اُسے ایک پل کے لیے زمین سے اوپر اٹھا لیا؛ ہمارے پہلوان اکھاڑے میں کسرت کرتے ہیں اور جسم پر مٹی مل لیتے ہیں۔ سفید کالر نے انسان کو بڑا نقصان پہنچایا ہے، اسے زمین سے دور کر دیا ہے۔ اسے ہوا میں لٹکا دیا ہے۔ نہ بازوؤں میں طاقت رہی نہ ٹانگوں میں جانگر۔ اور پھر زعم باطل بھی پیدا ہوگیا کہ ہم ان لوگوں سے بہتر ہیں جو زمین کا سینہ چیرتے ہیں اور مٹی سے دست و گریبان رہتے ہیں۔

مباش درپے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

[لوگوں کو ستانے کے علاوہ جو جی چاہے کرو کہ ہمارے مذہب میں اس کے علاوہ کوئی گناہ ہے ہی نہیں]

۱۵ مارچ کے اسٹیٹسمین میں ایک مضمون موہوبتا موجمدار صاحبہ کا شائع ہوا ہے جس میں انھوں

نے لکھا ہے کہ بچپن میں وہ ضدی تھیں اور ان کو سنبھالنا آسان نہیں تھا ماں باپ کی اکلوتی بیٹی

"میرے ماں باپ اپنے طریق تربیت پر فخر کرتے تھے۔ میری ماں نے ٹھان لی تھی کہ وہ مجھے درست کر کے چھوڑیں گی۔ ان کی زبان کے تیر جن میں اکثر میرا مقابلہ اچھے بچوں سے ہوتا تھا مجھے تلملاتا چھوڑ جاتے تھے۔ ماں اور بیٹی کا یہ ٹکراو جاری رہا۔ ہر بار مجھے مات کھانی پڑی لیکن جب جب میں نے ماں کے آگے ہتھیار ڈالے میری شخصیت کا کوئی نہ کوئی بیش قیمت حصہ ٹوٹ کر گر گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھے بجلی کے دہکتے ہوئے چولھے (الیکٹرک ریڈ) میں جھونک دیا گیا ہے۔ میں سمجھنے لگی کہ وہ میری سوتیلی ماں ہیں، میں نے انھیں ماں کہنا بھی چھوڑ دیا۔ طنز کے نہ رکنے والے تیروں سے "یہ بہتر ہوتا کہ وہ مجھے ایک آدھ بار پیٹ دیتیں تاکہ ہوا صاف ہو جاتی، گھٹا برس جاتی، غبار چھٹ جاتا۔"

مودھو متا کی سرگزشت میں والدین کے لیے سبق ہے۔ ان کا مقصد ہونا چاہیے بچوں کی شخصیت کو نشوونما دینا۔ اس کے بجائے اگر وہ اسے کچلنے میں لگ گئے تو گھر میں ان کا "وقار" تو قائم رہا، ان کی ضد تو پوری ہو گئی لیکن ان کے بچے سہم کر سکڑ کر، سمٹ کر رہ گئے۔

دوسرے سرے پر وہ والدین ہیں جو دفع شر اور عافیت کے لیے اپنے بچوں کی ہر ضد کو پورا کرتے ہیں۔ والدین بچوں کی طبیعت کو شاید دیر میں سمجھتے ہوں، بچے والدین کی کمزوریوں کو جلد پہچان جاتے ہیں ان کا استعمال کرتے ہیں، انھیں بلیک میل کرنے لگتے ہیں۔ اگر ماں باپ دونوں کام کرتے ہوں تو بچوں میں یہ رجحان اور بڑھ جاتا ہے۔ وہ تلافیٔ مافات کے لیے چوکولیٹ، آئس کریم اور فرمائش کی ہوئی دوسری چیزوں سے بچوں کا منہ بھر دیتے ہیں، بند کر دیتے ہیں ایسے بچے بُری طرح بگڑ جاتے ہیں۔

درمیانی راہ بہرحال صحیح ثابت ہوتی ہے والدین کو یہ خیال ہمیشہ رہنا چاہیے کہ ہر بچہ اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ اس خالق بے ہمتا کے اہتمام آفرینش کے صدقے آج تک دو بچے ایک شخصیت کے ساتھ پیدا نہیں ہوئے۔ ہمیں ہر بچے کی منفرد شخصیت کا احترام کرنا چاہیے۔ ہر بچہ تخلیق کا شاہکار ہے۔ اس شاہکار کو دیکھنے، پڑھنے، پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش اس کے والدین پر واجب ہے۔ بچے مٹی کے ڈھیلے نہیں ہیں کہ ان پر بیلچہ چلا دیا جائے اور سارا کھیت ہموار ہو جائے۔

آپ سوال کریں گے کہ ہندوستان کی آبادی کے تناسب میں کتنے ماں باپ اس حیثیت میں ہوں گے کہ بچوں کی شخصیت کو آنک سکیں، ان کی نفسیات کو سمجھ سکیں اور پھر اس کے مطابق ان کی تربیت کو ڈھال سکیں۔ جواب میں دبی زبان سے صرف یہی کہا جا سکتا ہے جو اس حیثیت میں ہوں وہ ایسا ضرور کریں، اپنے بچوں کو وقت دیں، انھیں سمجھیں، ان کے خوابوں، آرزوؤں، تمناؤں اور ان کے طرز فکر کو پہچانیں۔ اتنا تو سبھی کر سکتے ہیں کہ نہ تو بچوں کی شخصیت پر اسٹیم رولر چلائیں نہ ان کی شرارتوں سے بدکیں اور نہ بے جا لاڈ سے بچوں کے مقدر کو بگاڑیں۔

# کرنل بشیر حسین زیدی

ریاض الرحمٰن خاں شیروانی ○

۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معرض وجود میں آنے سے اب تک یونیورسٹی کے مستقل وائس چانسلر سترہ ہوئے ہیں۔ میں ۱۹۳۸ء میں (یونیورسٹی کے قیام کے ۱۸ سال کے بعد) مسلم یونیورسٹی (حال سیف الدین طاہر ہائی اسکول میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت تک پانچ وائس چانسلروں کا دور گزر چکا تھا اور سر شاہ محمد سلیمان وائس چانسلر تھے جو اسی سال اس عہدے پر فائز ہوئے تھے اور ۱۹۴۱ء تک رہے۔ (اس وقت تک وائس چانسلر کی مدت تین سال ہوتی تھی) بدقسمتی سے اپنی مدت پوری کرنے سے قبل ہی ان کی وفات ہوگئی۔ اب تک وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے واحد وائس چانسلر ہوئے ہیں جن کا انتقال وائس چانسلر کی حیثیت سے ہوا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ان سے قبل وائس چانسلری کا ایک دور پورا کر چکے تھے اور ان کی وفات کے بعد پھر وائس چانسلر ہوگئے اور مسلسل دو ٹرم (۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء) اس عہدے پر متمکن رہے۔ اس طرح میری یونیورسٹی کی طالب علمی کا تقریباً پورا دوران کی وائس چانسلری میں بسر ہوا بالکل آخر میں مسٹر زاہد حسین کا تقرر اس عہدے پر ہوا لیکن وہ برائے نام ہی وائس چانسلر رہے۔ مارچ میں آئے اور جون میں تقسیم ہند کا اعلان ہونے کے بعد چلے گئے اور پھر جب اکتوبر میں نواب محمد اسماعیل خاں کا وائس چانسلر کی حیثیت سے تقرر ہوا اس وقت تک والد ماجد الحاج عبید الرحمٰن خاں شروانی وائس چانسلری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ نواب اسماعیل خاں کا دور وائس چانسلری ایک سال رہا اور اس پوری مدت میں میں علی گڑھ سے باہر رہا۔ ۱۹۴۸ء کے آخر میں ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ تشریف لائے اور ۱۹۴۹ء کے آخر میں میں نے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے دوبارہ مسلم یونیورسٹی میں تعلیمی دور کا آغاز کیا اور پھر ان ہی کی وائس چانسلری کے دور میں لکچرر ہوگیا۔ اس طول بیانی کا مقصد یہ ہے میرا واسطہ طالب علم کی حیثیت سے اصل معنی میں تین مستقل وائس چانسلروں سے رہا۔ سر شاہ

---

○ پروفیسر و سابق صدر شعبۂ عربی، اے ایم یو علی گڑھ ـــــ حبیب منزل، میرس روڈ علی گڑھ

سلیمان، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد اور ڈاکٹر ذاکر حسین۔ زاہد حسین صاحب برائے نام وائس چانسلر رہے اور نواب اسماعیل کے دور وائس چانسلری میں میں علی گڑھ سے باہر رہا۔ اس لیے طالب علم کی حیثیت سے وائس چانسلروں سے متعلق میرا جو کچھ تجربہ ہے وہ سر شاہ محمد سلیمان، سر ضیاء الدین احمد اور ڈاکٹر ذاکر حسین تک محدود ہے۔ ذاکر صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے دور میں میں طالب علم سے مدرس بنا۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران ذاکر صاحب کے علاوہ کرنل بشیر حسین زیدی، مسٹر بدرالدین طیب جی، نواب علی یاور جنگ، پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر علی محمد خسرو اور جناب سید حامد میرے وائس چانسلر رہے۔ سید حامد صاحب کے دور وائس چانسلری میں میں پہلے علی گڑھ سے کشمیر چلا گیا اور پھر مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ سید ہاشم علی صاحب سے خصوصی تعلق یہ رہا کہ ان کے زمانے میں میں ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۸ء تک فیکلٹی آف آرٹس اور فیکلٹی آف تھیالوجی کے بعض شعبوں کے اساتذہ کی سلیکشن کمیٹیوں میں وزیٹر کا نمائندہ رہا اور اس اعتبار سے ہاشم علی صاحب کو قریب سے دیکھنے اور برتنے کا موقع ملتا رہا۔ بہر حال طالب علم، مدرس یا بعض مضامین کے ماہر کی حیثیت سے میری مسلم یونیورسٹی کے دس وائس چانسلروں کے ساتھ اچھی بری، شیریں یا تلخ یادیں وابستہ ہیں اور ان کے بارے میں میرے اپنے کچھ تاثرات ہیں جو ضروری نہیں کہ یک رنگی ہوں بلکہ ان میں سے بیشتر میں سفیدی اور سیاہی کی آمیزش ہے۔ اب تک میں ڈاکٹر ذاکر حسین سے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کر چکا ہوں جو پہلے ماہنامہ "جامعہ" نئی دہلی اور پھر بعض اضافوں کے ساتھ خدابخش لائبریری جرنل، پٹنہ میں شائع ہوئے ہیں۔ حال میں کرنل بشیر حسین زیدی نے ۹۴ سال کی عمر میں دہلی میں وفات پائی ہے اور ذیل میں مختصراً ان کے بارے میں کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔

کرنل بشیر حسین زیدی ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ذاکر صاحب نے اپنی وائس چانسلری کی میعاد ختم ہونے سے پہلے ہی یونیورسٹی کے بعض اساتذہ اور کارکنوں کے نظریاتی اختلافات سے متاثر ہو کر استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس دوران یونیورسٹی میں بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے تھے جن کے باعث انتظامیہ کو چند طلبا کے خلاف تادیبی کارروائی کرنی پڑی تھی اور یونیورسٹی میں ایک گونہ انتشار تھا۔ زیدی صاحب کے وائس چانسلر مقرر ہونے کے سلسلے میں حال ہی میں نے ایک مضمون میں پڑھا کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ایما پر وائس چانسلر ہوئے تھے۔ میرے علم و اطلاع کے مطابق یہ بات درست نہیں ہے بلکہ ان کی وائس چانسلری میں پورا دخل ذاکر صاحب کو تھا۔ کہا جاتا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد ایک اور صاحب کو، جن کی مذہبیت، علمیت اور قوت کارکردگی مسلّم تھی، وائس چانسلر بنانے کے خواہش مند تھے لیکن ذاکر صاحب علی گڑھ کے مخصوص حالات میں زیدی صاحب کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ بالآخر ذاکر صاحب نے اس وقت کے نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن کو درمیان میں ڈال کر مولانا آزاد کو اس پر راضی کیا تھا۔ یہ روایت جس حد تک بھی درست ہو، ہمارا خیال ہے کہ اس معاملے میں ذاکر صاحب کی رائے زیادہ صائب تھی۔ مولانا آزاد باہر سے دیکھ کر فیصلہ فرما رہے تھے اور ذاکر صاحب اندرونی

سے واقف ہونے کی بنا پر رائے قائم کر رہے تھے۔
میں ۱۹۵۶ء میں حکومت ہند کے ایک تعلیمی وظیفے پر ایک سال کے لیے قاہرہ چلا گیا تھا۔ زیدی صاحب وائس چانسلر کی حیثیت سے میری عدم موجودگی میں علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ وہ علی گڑھ کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء تک اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے اور ذاکر صاحب کے دورِ وائس چانسلری میں مسلم یونیورسٹی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر رہے تھے۔ مجھے زیدی صاحب سے سب سے پہلے ۱۹۵۷ء میں اس وقت نیاز حاصل ہوا جب میری قاہرہ سے اور میرے دوست اکمل ایوبی صاحب کی انقرہ سے واپسی پر عربک سوسائٹی، شعبۂ عربی و اسلامیات نے ہمیں استقبالیہ دیا۔ اس استقبالیے کا اہتمام صدر شعبہ پروفیسر عبدالعلیم نے بہت ذوق و شوق سے فرمایا تھا اور اس میں زیدی صاحب کے علاوہ اتفاق سے متعدد عمائد جمع ہو گئے تھے جن میں اس وقت مجھے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، والد ماجد الحاج عبیدالرحمٰن خاں شروانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر مسعود حسین خاں کے نام خاص طور سے یاد آ رہے ہیں
اس استقبالیے میں میں نے اپنے قیام قاہرہ کے تاثرات پر ایک مضمون بھی پڑھا تھا جس کی زیدی صاحب نے بہت ہمت افزائی فرمائی تھی بلکہ مشورہ دیا تھا کہ اسے بڑھا کر کتابی صورت میں شائع کرانا چاہیے۔
زیدی صاحب کی وائس چانسلری کے شروع دور میں میں یونیورسٹی کا ایک جونیئر لکچرار تھا لیکن ان کی شفقت اور ان کے اخلاق کریمانہ کے ثمرات سے بہرہ ور ہونے کا موقع اس وقت بھی ملتا رہا تھا۔ ان سے بڑی سے بڑی بات کہنے میں باک نہیں ہوتا تھا۔ وہ بات سنتے اور مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں تھا کہ آدمی مطمئن ہو ہی جاتا۔ اس کے باوجود ان کی پروقار شخصیت کسی کو حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت مشکل ہی سے دیتی تھی۔ ایک شکایت البتہ عام تھی کہ وہ مختلف کونسلوں اور کمیٹیوں میں ممبروں کو اظہار خیال کی آزادی ضرورت سے زیادہ دیتے تھے جس سے وقت ضائع ہوتا تھا اور کام کم ہوتا تھا بلکہ اکثر فیصلے ملتوی ہو جاتے تھے۔

زیدی صاحب پڑھے لکھے آدمی تھے۔ انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے تاریخ میں ٹرائی پوس کیا تھا اور لنکنز ان سے بیرسٹری کی سند حاصل کی تھی۔ تاہم انھوں نے اپنے لیے بجائے علمی کے عملی میدان منتخب کیا تھا اور اسی میں ان کی فطرت کے جوہر نمایاں ہوئے تھے۔ علی گڑھ آنے سے قبل ریاست رام پور میں انھوں نے جو عملی کارنامے انجام دیے تھے وہ ہمارے موجودہ موضوع سے ماوراء ہیں۔ پھر بھی ہم ان سے واقف تھے اور ان کی بنا پر ہماری نظر میں زیدی صاحب کی وقعت تھی۔ علی گڑھ میں انھوں نے علمی معاملات میں بہت کم دخل دیا، بلکہ یہ معاملات شعبوں کے سربراہوں اور دیگر متعلقہ افراد پر چھوڑ دیے اور اپنی توجہ کا مرکز عملی مسائل کو بنایا۔ اس سلسلے میں ان کے کارنامے گوناگوں ہیں جن کی فہرست مرتب کرنا مقصود نہیں ہے۔ اگر ذاکر صاحب نے علی گڑھ کے بیابان میں بہار کھلائی اور اسے گل و گلزار بنایا تو زیدی صاحب نے عالی شان عمارتیں بنوائیں اور کسی سے معمار اور کسی سے شاہجہاں کا لقب حاصل کیا۔ ذاکر صاحب کے دور وائس چانسلری سے بیان جن ملکی اور بیرونی (بالخصوص بیرونی) عمائد

کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تھا وہ زیدی صاحب کے عہد میں جاری رہا۔ بیرونی ممتاز شخصیتوں میں، جو اُن دنوں یہاں تشریف لائیں، کنگ ظاہر شاہ والیٔ افغانستان مغربی جرمنی کے ڈپٹی چانسلر پروفیسر لڈوگ ایرہارڈ مصر کے صدر جناب جمال عبدالناصر، فزکس کے نوبل انعام یافتہ عالم سر الیگزنڈر ٹاڈ اور ملیشیا کے وزیراعظم تنکو عبدالرحمٰن شامل ہیں۔ زیدی صاحب نے ان سب کی پذیرائی کی مدارات میں وہی معیار قائم رکھنے کی کوشش کی جس طرح ذاکر صاحب نے ڈالی تھی۔ ان کی علی گڑھ سے تشریف لے جانے کے بعد یہ سلسلہ بڑی حد تک ختم ہوگیا۔ زیدی صاحب نے ان لوگوں کی قدردانی اور عزت افزائی میں بھی کمی نہیں کی جن کا مسلم یونیورسٹی سے خصوصی تعلق رہا تھا اور جنھوں نے اس کی قابل لحاظ خدمات انجام دی تھیں۔ وائس چانسلر ہونے کے بعد انھوں نے سب سے پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین کو علی گڑھ میں زحمتِ قدوم دی اور ان کی خدمت میں ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی۔ ذاکر صاحب کے علاوہ پروفیسر محمد حبیب پروفیسر خواجہ غلام السیدین اور جناب عبدالمجید خواجہ جیسے اکابر کو بھی ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں تفویض کی گئیں۔

ذاکر صاحب کے دورِ وائس چانسلری میں ایک بڑا مسئلہ جو لاینحل رہا تھا میڈیکل کالج کے قیام کا تھا۔ اس کے سامنے یو۔پی سرکار کی ضد کی بھاری سی چٹان ہمیشہ حائل ہوجاتی تھی اور اس مخالفت کے سرغنہ یو۔پی کے اس وقت کے وزیر صحت اور بعد میں وزیراعلیٰ شری سمپورن آنند تھے۔ علی گڑھ میں میڈیکل کالج کا قیام جس شخصیت کا سب سے زیادہ ممنون احسان ہے وہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی شخصیت ہے لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد اس کی ذمہ داری ذاکر صاحب کے شانوں پر آگئی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو اس معاملے میں اُن کے پورے حامی اور مددگار تھے لیکن سمپورن آنند جی کی ہٹ دھرمی کے آگے ان کی کچھ چل نہیں پاتی تھی۔ بالآخر زیدی صاحب نے اپنی وائس چانسلری کے آخری دور میں کسی نہ کسی طرح یہ مسئلہ حل کیا اور یہاں سے جانے سے قبل پروفیسر ہادی حسن، جو اس کام میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے خاص معاون رہے تھے، کے ہاتھوں اس کا افتتاح کرایا۔

زیدی صاحب کے دوران وائس چانسلری مسلم یونیورسٹی کو ایک پریشان کن مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت کے مرکزی وزیر تعلیم شری ایل۔ کے۔ شریمالی کسی وجہ سے زیدی صاحب سے ناراض ہوگئے تھے اور ان کا الزام تھا کہ زیدی صاحب نے اپنے خاندان کے بہت سے افراد کو مسلم یونیورسٹی میں ملازم رکھ چھوڑا ہے۔ نیز بعض دوسرے خاندانوں کے متعدد افراد یونیورسٹی میں گھسے ہوئے ہیں چنانچہ ان کے ایما پر یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل نے اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کی کہ وہ ان الزامات کی جانچ کرے۔ یہ کمیٹی اپنے چیرمین کے نام کی مناسبت سے چٹرجی کمیٹی کہلائی۔ اس کے سپرد بعض مبینہ مالیاتی بے عنوانیوں کی تفتیش بھی کی گئی۔ اس کمیٹی سے زیدی صاحب نے جو معاملت رکھی اور جس طرح عہدہ برآ ہوئے وہ اُن کا بڑا کارنامہ ہے۔ یونیورسٹی پر کسی اعتبار سے ذرا آنچ نہیں آئی بلکہ کمیٹی کی رپورٹ کے نتیجے میں یونیورسٹی کی ساکھ اور نیک نامی میں اضافہ ہوا۔

زیدی صاحب تعلیم کے وسیع تر مفہوم کے قائل تھے۔ وہ یونیورسٹی سے ایسے طالب علم نکالنا چاہتے

تھے جو کتابی علم کے ساتھ زندگی کے لطیف جذبات سے لطف اندوز ہونے اور ان کے حسن میں اضافہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ وہ ایک ایسے کل کو فروغ دینا چاہتے تھے جس کے اجزاء زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوں۔ وہ بنیادی طور پر لبرل اور سیکولر مزاج کے حامل تھے اور ان کی رفیقۂ حیات محترمہ قدسیہ زیدی جن کی وفات ۴۴ سال کی مختصر عمر میں زیدی صاحب کی وائس چانسلری کے دوران علی گڑھ میں ہوئی، ان مشاغل میں نہ صرف ان کی شریک کار بلکہ شریک غالب تھیں۔ چنانچہ زیدی صاحب نے علی گڑھ میں ثقافتی مشاغل کو طلبا میں رائج کرنے کے لیے بڑا کام کیا۔ اس کی مخالفت بھی مختلف گوشوں ـــــ اور بعض غیر متوقع گوشوں ـــــ سے ہوئی لیکن انھوں نے اس مخالفت کو پوری ہمت اور دانش مندی سے انگیز فرمایا اور اپنا کام جاری رکھا۔ اس زمانے میں یہ مشاغل روز افزوں ترقی پذیر رہے اور ان کے مفید نتائج نکلے۔

زیدی صاحب طلبا کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرتے تھے اور جو طلبا جس میدان میں آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتے تھے، اس میں ہر طرح ان کی اعانت کرتے تھے لیکن ضبط و نظم کی پابندی کرانے میں کبھی کوتاہی سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ اساتذہ کا احترام خود بھی کرتے تھے اور دوسروں سے بھی کراتے تھے انھیں اساتذہ کی فلاح و بہبود کا پورا خیال رہتا تھا۔ رانی کھیت میں آر۔ ڈی اسٹیٹ خرید کر موسم گرما کی تعطیلات میں وہاں اساتذہ کے قیام اور راحت کا انتظام ان کا ایسا عمل ہے جس کا تصور ان سے پہلے کسی کے ذہن میں نہیں آیا تھا اور ان کے بعد بھی کسی اور نے اور کوئی ایسا اقدام آج تک نہیں کیا ہے۔ وہ علمی کے ساتھ کاروباری ذہن بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی میں کئی ایسے کاموں کی بنیاد ڈالی یا انھیں فروغ دیا جس سے ایک طرف یونیورسٹی کی برادری کو کئی معاملات میں سہولیات حاصل ہوئیں اور دوسری طرف یونیورسٹی کے ذرائع میں اضافے کے امکانات پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی پریس، دواخانہ حکیم اجمل خاں طبیہ کالج، ایلی کیٹنز ڈویژن اور اسٹوڈنٹس اسٹیشنری مارٹ اس کی چند مثالیں ہیں۔

زیدی صاحب کی وائس چانسلری کے آخری دور میں ۱۹۶۱ء میں علی گڑھ میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکی جس کی لپٹیں یونیورسٹی تک پہنچیں بلکہ کہنا چاہیے کہ اس فساد کا نقطۂ آغاز مسلم یونیورسٹی ہی کو بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ زیدی صاحب اس دوران جتنے پریشان رہے، انھوں نے اس آگ کو بجھانے کی جتنی کوشش کی اس کے لیے جس تدبر اور دور اندیشی سے کام لیا اور جتنے اور جیسے جتن کیے ہم میں سے بہت سے اس کے عینی شاہد ہیں اور بعض ایسے لوگ خدا کے فضل سے اب بھی موجود ہیں جنھوں نے اس کام میں ان کا ہاتھ بٹایا تھا۔ یہ شاید اپنی وائس چانسلری کے دوران مسلم یونیورسٹی کے تعلق سے ان کا آخری بڑا کارنامہ تھا۔

ان کے دور میں اساتذہ اور انتظامیہ میں بعض مسائل و معاملات میں اختلافات ضرور رونما ہوئے اور بعض اوقات ان اختلافات نے ناخوش گوار صورت بھی اختیار کی۔ ان اختلافات کی نوعیت تھی تو نظریاتی لیکن وہ کبھی کبھی ذاتی رنگ بھی اختیار کر لیتے تھے۔ دراصل ان کا آغاز ڈاکٹر صاحب ہی کے

دور وائس چانسلری سے ہو گیا تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا، ذاکر صاحب نے ان ہی سے متاثر ہو کر اپنے منصب سے وقت سے پہلے سبکدوشی حاصل کر لی تھی۔ زیدی صاحب کو ان اختلافات کا احساس اور ملال تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ میں نے مختلف میدانوں کے مردان کار سے مسلم یونیورسٹی کے مختلف معاملات میں تعاون حاصل کرنے کی غرض سے انھیں مختلف کونسلوں اور کمیٹیوں میں شریک کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے کئی حضرات میرے ہی مخالف ہو گئے۔ ان "مخالفین" میں یونیورسٹی کے اندرونی اور بیرونی دونوں عناصر مختلف وجوہ سے شامل ہو گئے تھے۔ مسلم یونیورسٹی میں اس دور میں جو گروہ بندیاں ہوئی بلاشبہ خود زیدی صاحب اس کا ایک حصہ بنے یا کہنا چاہیئے کہ انھیں اس کا حصہ بنا دیا گیا۔ زیدی صاحب کی ہمدردیاں یقیناً لبرل اور سیکولر خیالات کے لوگوں کے ساتھ رہیں کیونکہ خود ان کا یہی مزاج تھا۔ تاہم اس گروہ بندی کا اثر طلبا تک بالکل نہیں پہنچا اور اگر کسی قدر پہنچا بھی تو اس کا عملی اظہار ہرگز نہیں ہوا۔ میرے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہے کیونکہ حصول آزادی سے قبل کی ایک ایسی ہی گروہ بندی (جس کی بنیاد نظریات پر بالکل نہیں تھی بلکہ خالص شخصیات پر تھی) اور نسبتاً زمانۂ حال کی بعض گروہ بندیوں میں طلبا کو بھی ملوث کیا جا چکا ہے جن کے افسوسناک نتائج سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔

"ہم سر سیدؒ کے کارناموں کی تسبیح صرف تقدس کے طور پر نہ پڑھتے رہیں بلکہ ان کے مشن کو ان کے پیغام کی روح کو بروئے کار لانے نیز یونیورسٹی کے تعلیمی ماحول کو بہتر بنانے اور تہذیبی مزاج کو پروان چڑھانے کے لیے متحد ہو کر عملی جد و جہد کریں۔"

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

اپنی وائس چانسلری کے زمانہ میں زیدی صاحب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر رہے اور دونوں کے معاملات میں خصوصی دلچسپی لیتے رہے۔ کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے آنریری سکریٹری الحاج عبیدالرحمن خاں شروانی اور بعض دوسرے حضرات کی معیت میں یو۔پی کے کئی اضلاع کا دورہ کر کے اسلامیہ کالجوں کے مسائل کا جائزہ لیا اور ان میں تال میل پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر کی حیثیت سے غالباً ان کا سب سے بڑا کارنامہ نئی دہلی میں انجمن کے صدر دفتر "اردو گھر" کی تعمیر ہے۔

علی گڑھ سے جا کر بھی ان کا علی گڑھ والوں سے تعلق، بلکہ تعلق خاطر برابر قایم رہا اور وہ ان کے ساتھ ہمیشہ تلطف اور مروت سے پیش آتے رہے اور یونیورسٹی کے معاملات میں بھی مختلف حیثیتوں سے دلچسپی لیتے رہے۔ مسلم یونیورسٹی نے بھی انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نواز کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ وہ تقریباً آخر عمر تک فعال رہے۔ علی گڑھ آنے سے قبل کانگریس کے ٹکٹ پر لوک سبھا کے ممبر رہ چکے تھے۔ یہاں سے جا کر ایک ٹرم اسی کے ٹکٹ پر راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔ کچھ مدت انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے آنریری ٹریژرر کے فرائض بھی انجام دیے۔ نیز طویل عرصے تک نیشنل ٹرسٹ

کے صدر رہے۔ ان کا تعلق نظام چیریٹ ایبل ٹرسٹ حیدرآباد سے بھی مدت العمر رہا۔ نیز بعض دوسرے فلاحی اور کاروباری اداروں سے۔ حکومت ہند نے انھیں "پدم بھوشن" کا اعزاز عطا کیا اور برطانوی دورِ حکومت میں انھیں سی۔ آئی۔ ای کا خطاب مل چکا تھا۔ جب متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ نے ایک پلاننگ کمیٹی قائم کی تھی تو زیدی صاحب اس سے بھی وابستہ رہے تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے کی سسرال کشمیر میں ہے۔ سری نگر سے دہلی آتے ہوئے کئی مرتبہ ان کا ہوائی جہاز میں ساتھ ہوا۔ انھیں ہمیشہ چاق و چوبند پایا اور اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہوئے دیکھا جو اس عمر میں بڑی بات تھی۔ ایسا آخری ساتھ غالباً ۱۹۸۸ء میں ہوا تھا اور وہی غالباً خاکسار مضمون نگار کی ان سے آخری ملاقات تھی۔ اس وقت ان کی عمر نوّے سال تھی۔ انھوں نے دہلی ایرپورٹ پر ہوائی جہاز کی سیڑھی سے اپنا سامان خود اپنے ہاتھ سے اتار کر ٹرالی میں رکھا اور اسے لے کر ایرپورٹ سے باہر نکلے۔ اس پورے عمل میں کمزوری یا معذوری کا شائبہ بہت کم تھا جتنی دیر ساتھ رہا حسبِ معمول شفقت سے پیش آتے اور دلچسپ باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری اور مجموعی اعتبار سے دوسروں کے لیے اپنے نقوشِ قدم بطورِ نمونہ و مثال کے چھوڑے۔

"جاپان کے امتحان کا موسم خودکشی کا موسم کہلاتا ہے۔ اس امتحان کے نتائج پر آئندہ داخلے ملتے ہیں لیکن اس کا معیار اس قدر بلند ہوتا ہے کہ اس عمر کے بچے دنیا کے کسی اور ملک میں ریاضیات، فزکس اور کیمسٹری میں اس سے اعلیٰ سطح پر امتحان نہیں دیتے۔ ان امتحانوں کے دوران میں پرچوں کے راز افشا نہیں ہوتے اسٹرائکیں نہیں ہوتیں اور امتحان کے مراکز کے دروازے اور شیشے نہیں توڑے جاتے۔"

پروفیسر عبدالسلام

# نیوکلیائی پاور کارپوریشن — ایک اہم قدم

محمد اسلم پرویز ○

توانائی آج کے دور کی اہم ترین ضروریات میں سے ایک ہے۔ کسی بھی ملک کی ترقی کا اندازہ وہاں استعمال ہونے والی توانائی کی مقدار سے لگایا جاتا ہے۔ توانائی کے جدید ذرائع میں نیوکلیائی یا ایٹمی توانائی کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ اس جدید توانائی کے میدان میں ہندوستان نے کافی ترقی کی ہے۔ آزادی کے وقت ہمارے پاس اس کا تصور اور خاکہ بھی نہ تھا جب کہ آج ہم نیوکلیائی میدان میں بڑی حد تک خود کفیل ہیں۔ محض چالیس سال کے عرصے میں نہ صرف ہمارے سائنس دانوں نے ایٹمی بجلی گھر قائم کرکے بجلی کی تیاری شروع کردی بلکہ آج اس تمام کارروائی کو خود مختارانہ انداز سے انجام دینے کی صلاحیت بھی حاصل کرلی ہے۔ نیوکلیائی توانائی ہمارے لیے کتنی ضروری ہے، ضروری ہے بھی یا نہیں یا اس سے کیا فائدے اور کیا ممکنہ خطرات ہیں یہ ایک الگ بحث ہے لیکن جہاں تک بطور ایک تیکنالوجی اس کو سیکھنے، اپنانے اور استعمال کرنے کا تعلق ہے، ہم دنیا کے چند ترقی یافتہ ممالک کی صف میں آتے ہیں۔ گزشتہ ماہ نیوکلیائی پاور کارپوریشن کا قیام اس سمت میں ایک اہم قدم ہے جو کہ اس تکنالوجی کو پہنچنے کا ایک اور وسیلہ مہیا کرے گا۔

اس وقت دنیا کے ۲۶ ممالک میں ۴۰۶ ایٹمی بھٹیاں کام کر رہی ہیں جو کہ کل توانائی کا ۱۶ فیصد حصہ مہیا کرتی ہیں۔ امریکہ میں سب سے زیادہ (۱۰۳) ایٹمی بھٹیاں ہیں جب کہ روس کا مقام (۵۳) دوسرا ہے۔ اگست ۱۹۸۷ء تک کے جائزے کے مطابق پاکستان، یوگوسلاویہ اور برازیل میں ایک ایک ایٹمی بھٹی قائم ہے جو کہ بالترتیب ۱۲۵، ۶۳۲ اور ۶۲۶ میگاواٹ بجلی مہیا کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں اس وقت چھ ایٹمی بھٹیاں چل رہی ہیں جو کہ ۱۱۵۴ میگاواٹ بجلی تیار کرتی ہیں۔ یہ ہماری کل ضرورت کا ۲،۷ فی صد حصہ ہے۔ اس میدان میں ہونے والی عالمی ترقی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۶۰ء میں تمام دنیا میں استعمال ہونے والی بجلی کا صرف ۱،۵ فی صد حصہ ایٹمی توانائی سے حاصل ہوتا تھا جب کہ آج ۱۵،۵ فی صد حصہ ایٹمی بجلی گھر مہیا

○ لیکچرر ڈپارٹمنٹ آف باٹنی، ذاکر حسین کالج - نئی دہلی

رتے ہیں۔ ۲۰۰۰ء تک اس حصے کے ۲۰ فی صد تک پہنچ جانے کی امید ہے۔ اس عالمی پس منظر اور حکومت کے نیوکلیائی توانائی پروگرام کو ترقی دینے کے فیصلے کی روشنی میں نیوکلیائی پاور کارپوریشن کے قیام کا مقصد واضح ہوجاتا ہے۔

ہمارے ملک میں نیوکلیائی پروگرام آزادی کے فوراً بعد ہی شروع کر دیے گئے تھے۔ آزادی کے صرف ایک سال بعد ہی ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر ہومی بھابھا کی سرپرستی میں ایٹمی توانائی کمیشن قائم کر دیا گیا تھا۔ ان کی پلاننگ اور دور اندیشی کی بدولت آج ہمارا نیوکلیائی پروگرام کافی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ ڈاکٹر بھابھا کی زیرِ نگرانی بمبئی میں ٹرامبے کے مقام پر ایک تحقیقی اور تربیتی مرکز قائم کیا گیا جہاں نیوکلیائی توانائی سے متعلق اعلا معیار کی تحقیقات کی تمام تر سہولیات میسر تھیں۔ اسی دوران ایٹمی توانائی کمیشن کو حکومت کے ایک باقاعدہ شعبے کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر بھابھا اس کے سکریٹری مقرر کیے گئے تھے۔ حکومت نے اسی وقت سے اس شعبے کو کتنی اہمیت دی تھی اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہوتا ہے کہ وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو نے اس شعبے کو براہِ راست اپنی نگرانی میں رکھا تھا اور یہ روایت آج تک چلی آرہی ہے۔ ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر ہومی بھابھا کے ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہونے کے بعد اس تحقیقی مرکز کو ان کے نام سے منسوب کر دیا گیا اور آج اسے ہم بھابھا ایٹمی تحقیقاتی مرکز (BARC) کے نام سے جانتے ہیں۔ ہماری سب سے پہلی تحقیقاتی بھٹیاں یہیں قائم کی گئیں جن میں اپسرا، سائرس، زرلینا اور پورنیما قابلِ ذکر ہیں۔ ابھی حال ہی میں اس فہرست میں دھروو نامی ایٹمی بھٹی کا اضافہ ہوا ہے جو کہ پوری طرح سے ہندوستانی سائنس دانوں نے تیار کی ہے۔ نیوکلیائی تحقیقات کی رفتار کو مدِّنظر رکھتے ہوئے مدراس کے نزدیک کلپکم کے مقام پر ایک اور تحقیقی ادارہ قائم کیا گیا، جس میں ایک نئی قسم کی بھٹی پر تحقیقات شروع ہوئیں۔ گزشتہ سال ۱۹ اکتوبر کو اس بھٹی نے اپنا کام شروع کر دیا۔ مدراس ایٹمی بجلی گھر کے دوسرے یونٹ کے ساتھ وزیراعظم راجیو گاندھی نے ۱۶ دسمبر ۱۹۸۶ء کو اس بھٹی کو قوم کے نام وقف کر دیا۔ کلپکم کی ایٹمی بھٹی کی تخلیق کے بعد ہندوستان دنیا کا ایسا ساتواں ملک بن گیا ہے جو کہ ایٹمی توانائی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ امریکہ، روس، برطانیہ فرانس، جاپان اور مغربی جرمنی اس "نیوکلیائی کلب" کے دیگر ممبران ہیں۔ اس وقت ہمارے ملک میں تین بڑے بجلی گھر کام کر رہے ہیں۔ بمبئی کے نزدیک تاراپور کے مقام پر واقع ایٹمی بجلی گھر سب سے پرانا ہے جو کہ ۱۹۵۹ء میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ چونکہ ہمارا پہلا قدم تھا اس لیے اس میں دیگر ترقی یافتہ ممالک کی مدد لی گئی تھی، لیکن بعد میں جب ہمارے سائنس دانوں نے اس میدان میں مہارت حاصل کر لی تو تاراپور کی باگ ڈور بھی انھوں نے ہی سنبھال لی۔ اس بجلی گھر کے ڈیزائن میں اب تک ۳۰۰ سے زائد تبدیلیاں کر کے اس کو زیادہ سے زیادہ ہندوستانی اور جدید بنا دیا گیا ہے۔ راجستھان میں کوٹہ کے مقام پر رانا پرتاپ ساگر اسٹیشن ایک غیر ملکی نقشے کے مطابق، لیکن ہندوستانی مہارت سے بنایا گیا تھا۔ مدراس میں کلپکم کے مقام پر قائم کیا گیا ایٹمی بجلی گھر پوری طرح سے ہندوستانی ماہرین نے تیار کیا تھا۔ مدراس ایٹمی بجلی گھر کے دوسرے یونٹ کو کامیابی سے تیار کر کے ہندوستانی سائنس دانوں نے اپنی تکنیک کی کامیابی کو دہرایا ہے۔ اتر پردیش میں نرورا کے مقام پر بننے والا ایٹمی بجلی گھر صد فی صد ہندوستانی ڈیزائن، مہارت اور سامان سے تیار کیا جا رہا ہے۔ نرورا بجلی گھر کے

بیلا یونٹ قایم ہوچکا ہے۔ گجرات میں ککراپار کے مقام پر ایک اور بجلی گھر قایم ہوچکا ہے۔ علاوہ ازیں کئی بجلی گھر ابھی پلاننگ کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔ کرناٹک اور جنوبی راجستھان میں بننے والے دو ایٹمی بجلی گھروں کی تعمیر شروع ہوچکی ہے۔ ۱۹۹۵ء تک ان کے تیار ہوجانے کی توقع ہے۔ ۱۹۹۵ء کے بعد حکومت ۱۲ ایٹمی بجلی گھر ۲۳۵ میگاواٹ صلاحیت کے اور ۱۰ بجلی گھر ۵۰۰ میگاواٹ صلاحیت کے بنانے کا پلان رکھتی ہے۔

ایٹمی بجلی گھر میں استعمال ہونے والا ایندھن ہمارے ملک میں وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ یورینیم نامی دھات جو کہ ایٹمی توانائی پیدا کرنے میں استعمال ہوتی ہے اس کے ذخائر کا اندازہ ۰۰۰ر۷۰ ٹن لگایا جاتا ہے۔ یورینیم کی اس مقدار سے اتنی بجلی بنائی جا سکتی ہے جتنی کہ روایتی بجلی گھر میں ۱۹ ارب ٹن کوئلہ جلا کر حاصل کی جاتی۔ ان اعداد کی روشنی میں یورینیم کے یہ خزانے ایک طرح سے لامحدود لگتے ہیں جو کہ سیکڑوں سال تک ہمارے لیے کافی ہوں گے۔ مستقبل میں قایم ہونے والے ایٹمی بجلی گھروں میں تھوریم نامی دھات کا استعمال ہوگا۔ سرکاری تخمینے کے مطابق ہمارے ملک میں ۰۰۰ر۶۰ر۳ ٹن تھوریم کے ذخائر موجود ہیں جو کہ کافی سے بھی کچھ زیادہ ہی ہیں۔ اگر دونوں اقسام کے اس ایندھن کو ہم بخوبی استعمال کرنے میں کامیاب ہوگئے تو ہمارے ملک میں توانائی کی قلت کا تصور بھی باقی نہیں بچے گا۔ ایٹمی ایندھن کو قابل استعمال بنانے کے لیے حیدرآباد میں ایک بڑا کارخانہ قایم ہے جو کہ ایندھن کو صاف کرکے تیار کرتا ہے۔ ایٹمی بجلی گھر کی دوسری اہم ضرورت بھاری پانی کی ہوتی ہے۔ یہ خاص قسم کا پانی گجرات میں بڑودہ، پنجاب میں ننگل، اڑیسہ میں تلچر، راجستھان میں کوٹہ اور تامل ناڈو میں ٹیوٹی کورین کے مقام پر تیار کیا جاتا ہے۔ مہاراشٹر اور آندھرا پردیش میں بھاری پانی کے دو اور کارخانے زیر تعمیر ہیں۔

ہمارے ملک کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور اس کی صنعتی سرگرمیوں کو ہر روز زیادہ سے زیادہ توانائی کی ضرورت پیش آرہی ہے۔ اگرچہ ہمارے ملک میں توانائی کی پیداوار دیگر بہت سے ترقی یافتہ ممالک سے کہیں زیادہ ہے لیکن چونکہ اس کو استعمال کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لیے فی کس سطح پر اس کی مقدار بہت کم ہے ایک اندازے کے مطابق آنے والی صدی میں توانائی کی ضرورت پانچ گنا ہوجائے گی۔ اس پس منظر میں حکومت کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہر قیمت پر توانائی کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ توانائی حاصل کرنے کے روایتی طریقوں میں کوئلہ، پٹرولیم اور پانی سرفہرست تھے لیکن کوئلے اور پٹرولیم کے ذخائر نہ صرف مقدار کے لحاظ سے محدود ہیں بلکہ جغرافیائی اعتبار سے بھی کچھ خاص علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ اگر ان کی بازیابی اور استعمال تیز کیا جائے تو یہ ذخائر جلدی ختم ہوجائیں گے اور اس وقت صورت حال مزید خراب ہوجائے گی۔ پانی سے بجلی پیدا کرنے کے لیے دریاؤں پر باندھ بنانے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے بڑے بڑے علاقے زیر آب آتے ہیں اور کافی آبادیاں بے گھر ہوجاتی ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ کوئلے، پٹرول اور پانی کے ذریعے بجلی پیدا کرنے کا سلسلہ تو یوں ہی برقرار رکھا جائے لیکن نئے اور ایک طرح سے لامحدود ذریعے کے طور پر ایٹمی طاقت کو استعمال میں لایا جائے۔ اسی مقصد کے تحت ہمارا نیوکلیائی پروگرام شروع ہوا تھا۔

ایٹمی طاقت کے اس پرامن استعمال کا جو خاکہ پنڈت نہرو اور ڈاکٹر بھابھا کے زمانے میں تیار ہوا تھا، وہی آج ہماری پلاننگ کی بنیاد ہے۔ پورے ملک کے نیوکلیائی پروگرام پر نظر رکھنے اور آپسی تعلق قائم رکھنے کی غرض سے ۱۹۶۷ء میں پاور پروجیکٹس انجینئرنگ ڈویژن قائم کی گئی۔ بعد ازاں نیوکلیائی پروگرام میں توسیع کے بعد اس ڈویژن کو نیوکلیائی پاور بورڈ میں تبدیل کر دیا گیا جس کی رہنمائی کے واسطے ایک پندرہ سالہ پلان دیا گیا۔ ابھی تک ہماری تمام تر نیوکلیائی سرگرمیاں اسی بورڈ کی نگرانی میں انجام پائی ہیں۔ نیوکلیائی تحقیقات کے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کے ہر شعبے میں ہندوستانی سائنس دانوں کو مہارت حاصل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دیگر ممالک میں ایٹمی بھٹی قائم کرنے میں دس سال سے بارہ سال کا وقت لگتا ہے جب کہ ہمارے سائنس داں آٹھ یا نو سال کے عرصے میں ایٹمی بھٹی تیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک ایندھن اور دوسری ضروریات کا سوال ہے وہ سبھی ہمارے ملک میں وافر مقدار میں موجود ہیں۔ ہمارے نیوکلیائی پروگرام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سرمایے کی کمی تھی۔ سرمایے کی قلت کی وجہ سے بہت سے پروگرام بے عمل پڑے ہوئے ہیں۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے اور نیوکلیائی پروگرام کو مزید توسیع دینے کی غرض سے ہی نیوکلیائی پاور کارپوریشن کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اب نیوکلیائی توانائی کی تیاری اور استعمال تجارتی انداز سے کیا جائے گا۔ جہاں تک ایٹمی بجلی گھر سے بجلی بنانے میں خرچے کا سوال ہے، یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایٹمی بجلی گھر سے بنی بجلی نسبتاً سستی ہوتی ہے۔ ۱۹۸۴ء میں

حکومت نے اس کام کے واسطے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس میں پلاننگ کمیشن سینٹرل الیکٹریسٹی اتھارٹی اور نیوکلیائی پاور بورڈ کے ماہرین شامل تھے۔ اس کمیٹی کے جائزے کے مطابق ایٹمی بجلی گھر میں تیار شدہ بجلی بہ نسبت کوئلے کے بجلی گھروں کے ۸ سے ۱۰ پیسے فی یونٹ سستی ہوتی ہے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ایٹمی بجلی گھر قائم کرنے میں تقریباً دس فی صد لاگت کم آتی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات طے ہے کہ نیوکلیائی پاور کارپوریشن کم لاگت سے بجلی تیار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اگر اسی محنت، لگن اور توجہ سے کام ہوا تو یہ کارپوریشن یقیناً نفع کمایا کرے گی۔ اس کا صدر مقام بمبئی میں ہوگا اور اس کے اختیارات نیوکلیائی پاور بورڈ سے وسیع ہوں گے۔ تجارتی وجوہات اور دباؤ کے تحت یہ آزادانہ طور پر فیصلے کر سکے گی اور لائحہ عمل طے کرے گی۔ اس کارپوریشن کا اوّل ترین کام ۲۰۰۰ء تک دس ہزار میگا واٹ بجلی تیار کرنا ہوگا۔ بھابھا ایٹمی تحقیقی مرکز اور ریاستی بجلی بورڈوں کے درمیان تعلق قائم کرنا اس کا دوسرا کام ہوگا۔ یہ کارپوریشن ٹیکس سے مبرا بانڈ جاری کر کے عوام سے سرمایہ اکٹھا کرے گی۔ اس سرمایہ پر ان کو مناسب منافع دیا جائے گا۔ حکومت کے اندازے کے مطابق ۱۹۹۵ء تک یہ کارپوریشن مالی اعتبار سے خود کفیل ہو جائے گی۔ تازہ تخمینے کے مطابق ۱۹۹۵ء تک یہ کارپوریشن مالی اعتبار سے خود کفیل ہو جائے گی۔ تازہ تخمینے کے مطابق دس ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کے واسطے اس کارپوریشن کو ۳۰،۰۰۰ کروڑ روپے کی ضرورت ہوگی۔ یہ کارپوریشن ۲،۵۰۰ کروڑ روپے کے سرمایے سے شروع کی جا رہی ہے۔ بقیہ سرمایہ تیار شدہ بجلی کی فروخت اور بانڈ جاری

کرکے حاصل کیا جائے گا۔
کارپوریشن کے قیام سے جہاں نیوکلیائی پروگرام کو وسعت ملے گی وہاں اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ جائیں گی۔ اب نہ صرف یہ کہ پلان کے مطابق اس کو اپنا ٹارگٹ پورا کرنا ہوگا بلکہ ایٹمی بجلی سازی کو منافع بخش بھی بنانا ہوگا۔ نیوکلیائی پروگرام کو ایک تجارتی صنعت کی شکل دینے کے بعد کچھ پیچیدگیاں بھی پیدا ہوں گی جن کے لیے احتیاطی اقدامات کی ضرورت ہے۔ نیوکلیائی پروگراموں کو سب سے بڑا خطرہ حادثات سے ہے۔ ہم کو نہ صرف اپنے تمام بجلی گھروں میں قدرتی یا اتفاقی حادثات سے بچاو کے پورے انتظام کرنے ہوں گے۔ بلکہ ایسے حادثے کی صورت میں متاثرین کی مدد کی نوعیت کیا ہوگی یہ بھی طے کرنا ہوگا۔ کیمیائی صنعتوں سے ہونے والے حادثات سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ بھوپال کا حادثہ ابھی بھی تازہ ہے ۔ نیوکلیائی حادثات کی پیچیدگیاں کیمیائی حادثات کے مقابلے زیادہ شدید اور دیرپا ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک کی ترقی کے لیے جتنی اہمیت نیوکلیائی پروگرام کی ہے اتنی ہی شہریوں اور ایٹمی بجلی گھر میں کام کرنے والے لوگوں کی صحت کی بھی ہے حکومت کو چاہیے کہ وہ نیوکلیائی حادثات یا کثافت سے متعلق ایک مفصل اور جامع قانون بنائے تاکہ ایک طرف تو کارپوریشن کو اندازہ رہے کہ احتیاطی تدابیر کی کمی یا ناکامی سے اسے کیا بھگتان دینا ہوگا دوسری طرف عوام میں بھی یہ اطمینان پیدا ہو کہ نیوکلیائی توانائی کے پروگرام اگر توسیع پذیر ہیں تو اس سے انھیں خطرہ نہیں ہے نیز کسی حادثے کی صورت میں حکومت کس طرح ان کو معاوضہ دلا سکتی ہے۔

(از سائنسی پارے)

"مذہبی تعصبات سے اپنے دماغ کو متاثر نہ ہونے دینا۔
ہر قوم و مذہب کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے انصاف سے اور غیر جانب داری کے ساتھ حکومت کرنا۔
کبھی بھی کسی قوم کے عبادت خانوں کو منہدم نہ کرنا۔"

ظہیر الدین محمد بابر

ماہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ۔ جلد ۱۱، شمارہ ۶ (جون ۹۲ء)

# الحاج مولوی عبید الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم

## ایک مرد باصفات

امان اللہ خاں شیروانی ○

سرزمین علی گڑھ کی آبیاری اور گل کاری میں جن مخصوص خاندانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے ان میں شیروانی خاندان کا نام سر بلند ہے۔ شیروانی خاندان میں کچھ شخصیتیں بڑی قد آور، بلند اور اعلیٰ ہوئی ہیں ان ہی میں سے ایک شخصیت اخلاق اور سماجی اوصاف کا ایک ایسا نمونہ تھی جس پر نہ صرف اہل خاندان اور باشندگان علی گڑھ کو فخر ہے بلکہ جس پر انسانیت بھی ناز کر سکتی ہے۔ یہ شخصیت سابق خان بہادر الحاج مولوی عبید الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم و مغفور پرو چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تھی۔

کچھ شخصیتیں اپنی گوناگوں صفات کا ایک ایسا مجموعہ ہوتی ہیں جن کی بدولت وہ عام لوگوں سے امتیاز حاصل کر لیتی ہیں اور ان پر افسانہ اک ہو جاتی ہیں۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم:

"ان میں کچھ شخصیتیں کھری ہوتی ہیں اور کچھ مصنوعی۔ زیادہ تر مصنوعی شخصیتیں عوام میں جلد مشہور ہو جاتی ہیں، لیکن یہ شہرت دیرپا نہیں ہوتی"۔

کھری شخصیتیں ماحول پر ذرا دیر میں اثر انداز ہوتی ہیں اور ان ہی کھری شخصیتوں میں جناب شیروانی صاحب مرحوم و مغفور کی شخصیت تھی۔

قبلۂ محترم الحاج عبید الرحمٰن خاں شیروانی پرانی تہذیب و تمدن کی یادگار تھے۔ وہ متانت اور وقار کے پیکر، وسیع اور پرکشش اخلاق کے مالک اور نیکی اور دین داری کے مکمل مجسمہ تھے۔ وضع داری اور صاف بیانی آپ کی امتیازی خصوصیات تھیں۔

قبلہ شیروانی صاحب ملک کی ایک نامور علمی اور ادبی ہستی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم، سابق صدر الصدور ریاست حیدرآباد کے منجھلے صاحبزادے تھے اور اسی لیے خاندان میں منجھلے میاں کے نام سے معروف تھے۔ نواب صدر یار جنگ کا شمار اپنے دور کے عظیم علما اور مشاہیر میں تھا اور وہ اس دور کی ایک ایسی باکمال اور فاضل ہستیوں میں تھے جن کے علمی اور ادبی کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ الحاج مولوی عبید الرحمٰن خاں شیروانی کو بھی بہت سے

---

○ آنچل، گلمرگ کالونی، ڈگی روڈ، علی گڑھ

ماف اپنے والد بزرگوار سے وراثت میں ملے تھے بکی و پرہیزگاری، وضع داری، دوسروں سے محبت و فقت سے پیش آنا اور مطالعہ کا ذوق جیسے اعلیٰ ساف موصوف نے نواب صاحب مرحوم سے ہی اصل کیے تھے۔

محترم شیروانی صاحب کی پیدائش ۱۵ اگست، ۱۸۹۷ء طابق ۱۴ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ کو حبیب گنج میں ہوئی ئی۔ ابتدائی تعلیم مدرسۃ العلوم کے اسکول میں ہوئی ور ۱۹۱۷ء میں عربک کالج دہلی سے انٹرینس پاس کے پھر ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ اس ملنے میں موصوف نہ صرف ایک ہونہار طالب علم تھے بلکہ اسکول اور کالج کی علمی اور مجلسی زندگی میں بھی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ کالج میں آپ جونیئر ڈبیٹنگ سوسائٹی کے صدر اور کالج یونین کی مجلس عاملہ کے ممبر بھی رہے حالانکہ آپ کو علمی مشاغل اور تعلیم سے بڑا لگاؤ تھا لیکن پنے والد بزرگوار نواب صدر یار جنگ مرحوم کے صدر الصدور ہو کر حیدرآباد تشریف لے جانے کی وجہ سے آپ کو اپنی ریاست حبیب گنج کا انتظام سنبھالنے کے لیے گریجویشن سے پہلے ہی تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ تعلیم چھوٹنے کے سلسلے میں موصوف نے خود یہ واقعہ سنایا تھا:

"ایک روز شام کے وقت قبلہ ابا میاں مرحوم (نواب صدر یار جنگ) اپنی ٹم ٹم میں ملا احمد مرحوم مصاحب خاص کے ساتھ ہوسٹل تشریف لائے اور مجھے اپنے ساتھ ایک پرسکون جگہ قلعہ کی طرف لے گئے۔ وہاں جا کر فرمایا کہ موصوف صدر الصدور کے عہدے پر حیدرآباد تشریف لے جا رہے ہیں اور اس لیے مجھے تعلیم چھوڑ کر حبیب گنج چلا جانا چاہیے تاکہ ریاست کا انتظام سنبھال سکوں۔"

اس وقت شیروانی صاحب کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی اس کم عمری میں ہی موصوف کو اپنی طبیعت کے خلاف والد صاحب کے حکم پر تعلیم چھوڑنا پڑی۔ اسی بات پر مجھے یاد آیا کہ جب شیروانی صاحب مرحوم کے صاحبزادے پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی شعبۂ عربی اور اسلامیات کے صدر ہو کر کشمیر یونیورسٹی میں ۱۹۸۲ء میں تشریف لے گئے، تو تاریخ ایک مرتبہ پھر دوسرے انداز سے دہرائی گئی۔ اس مرتبہ شیروانی صاحب کو پیرانہ سالی میں گھر کا انتظام صاحبزادہ موصوف سے اپنے ہاتھوں میں لینا پڑا۔

بہرحال ریاست حبیب گنج کے انتظام و انصرام نے یہ ثابت کر دیا کہ شیروانی صاحب مرحوم میں انتظامی صلاحیت بے پایاں تھی۔ آپ نے جس طرح ریاست کا انتظام فرمایا وہ اظہر من الشمس ہے۔ موصوف نے خاندانی روایتوں اور وراثتی اوصاف کو قائم رکھتے ہوئے اس زمانے کے سیاسی اور مجلسی کاموں میں بھی بھرپور حصہ لیا۔

موصوف میں سب سے نادر وصف 'کام کی لگن' کا تھا۔ زمین داری اور خاندان کے انتظام کے علاوہ آپ ہمیشہ پبلک کاموں میں اتنے مصروف رہتے تھے کہ دیکھنے اور سننے والوں کو حیرت ہوتی تھی اور کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ جسمانی طور پر ایک منحنی اور نحیف سی شخصیت اتنا کام کر سکتی ہے۔ انتظامی زندگی کے ابتدائی دور میں آپ کئی سال اسپیشل مجسٹریٹ بھی رہے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں صوبہ کی آئین ساز کونسل اور پھر اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۹۵۲ء تک برابر ایم۔ ایل۔ سی اور ایم۔ ایل۔ اے رہے۔ اسمبلی میں آپ کا شمار ممتاز، ہر دل عزیز اور قابل احترام رکن

حیثیت سے معروف رہا ۔ مختلف کمیٹیوں میں آپ نے ں لیاقت سمجھ بوجھ اور ذہانت کا ثبوت دیا۔ اور آپ ، رائے ہمیشہ قابل احترام سمجھی جاتی تھی، چاہے وہ بورڈ ف سالٹ انکوائری کے صدر کی حیثیت سے ہو یا اسلامی دقاف کی تحقیقاتی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے ۔ صوبے ی 'ہند الیکٹرک کمیٹی' کے ممبر کی حیثیت سے ہو یا فائننس لیٹی کے اہم رکن کی حیثیت سے آپ نے اپنی اہلیت صلاحیت اور ذہانت کا ایسا سکہ جمایا تھا کہ آپ کی رائے کا ہمیشہ احترام کیا گیا اور باوزن سمجھا گیا۔ اس دور کے مشہور سیاست داں اور صوبے کی سیاست کے بلند ترین ستون آنجہانی پنڈت گووند بلبھ پنت ہمیشہ آپ کو قابل احترام سمجھتے تھے اور آپ کی لیاقت، شرافت اور نیکی کے بڑے معترف تھے۔ پنت جی کے خاندان سے آپ کے تعلقات اتنے قریبی تھے کہ پنت جی کے صاحبزادے جناب کے۔ سی۔ پنت سابق وزیر حکومت ہند نے ہمیشہ آپ کو اپنا بزرگ سمجھا اور جب بھی انتخابات میں کامیاب ہوئے یا کوئی عہدہ پایا تو ہمیشہ آپ سے آشیرواد لینے کے خواہش مند رہے ۔ پنت جی کے علاوہ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی کے تمام قومی اور ملی رہنما موصوف کی پاکیزہ شخصیت، تنظیمی قابلیت اور نیکی و شرافت کے ہمیشہ قابل رہے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم رفیع احمد قدوائی مرحوم، آنجہانی پنڈت کملاپتی ترپاٹھی ہوں یا آنجہانی کیلاش ناتھ کاٹجو نواب صاحب چھتاری مرحوم ہوں یا سر ضیاء الدین مرحوم غرض کہ ہر طبقہ اور مکتب خیال کے رہنما مدبرین اور اہل فکر نے آپ کی شخصیت کو سراہا اور آپ کی رائے کو باوزن سمجھا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں تو آپ کی خدمات کو تاحشر نہیں بھلایا جاسکتا۔ مرحوم نے اپنی زندگی کے ۹۵ سالوں میں سرسید رحمۃ اللہ علیہ سے اب تک مدرسۃ العلوم، ایم۔ اے او کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا پورا دور دیکھا تھا اور آخر دم تک اس کی ترویج و ترقی میں مسلسل اور بھرپور حصہ لیا۔ علی گڑھ کی تاریخ میں سرسید رحمۃ اللہ علیہ کے بعد جہاں نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور بہت سے نام سرفہرست نظر آتے ہیں وہاں آپ کا نام نامی بھی صف اول میں شامل ہے۔ ۱۹۱۹ء میں یونیورسٹی کی فاونڈیشن کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے آپ کا شمار بانیان یونیورسٹی میں ہوتا تھا ۱۹۲۳ء سے اپنے آخر دم تک آپ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر رہے جو خود ایک ریکارڈ ہے۔ ۲۲ سال تک یونیورسٹی کے اعزازی خزانچی اور کئی مرتبہ قائم مقام وائس چانسلر رہے۔ اپنی ٹریژررشپ کے دور میں آپ نے مسلم یونیورسٹی کے مالیات کو جس طرح سنبھالا، مضبوط بنایا اور ضابطہ کی پابندی میں رکھا اس کی تعریف و توصیف ہر طرف سے کی گئی۔

قائم مقام وائس چانسلری کے دور میں بھی آپ نے اپنی انتظامی صلاحیت اور مقبولیت کا لوہا منوایا۔ اس دوران طلبا میں خاص طور پر بڑا اطمینان رہتا تھا۔ اس لیے کہ آپ میں ایک بڑا وصف یہ بھی تھا کہ آپ اپنی پاکیزہ شخصیت اور پرکشش گفتار و کردار سے نوجوان نسل کو بہت جلد متاثر کر لیتے تھے اور ان کے مسائل کو نہ صرف ہمدردی سے سنتے تھے بلکہ بڑے مشفقانہ انداز سے انھیں سلجھانے کی کوشش بھی فرماتے تھے۔ موصوف کی شخصیت کی اس گراں قدر خوبی نے ہمیشہ آپ کو طلبا میں ہر دل عزیز بنائے رکھا۔ اب بھی زندگی کے آخری دور تک یونیورسٹی کے طلبا آپ کی عزت و احترام اسی طرح کرتے رہے ہیں جس طرح اب سے تیس چالیس سال قبل کے طلبا کیا کرتے تھے۔ جب بھی طلبا کا کوئی مسئلہ ارباب یونیورسٹی سے

حل نہیں ہوتا تھا تو طلبا بے خوف اور بے جھجک موصوف کے پاس چلے آتے تھے اور اپنے خیالات، شکایات اور حکایات کو آپ کے سامنے اس طرح بیان کر دیتے تھے جس طرح چھوٹے بچے اپنے بزرگ دادا یا بابا کے سامنے اپنے ماں باپ کی باتیں بیان کر دیتے ہیں۔

اپنی مادر درس گاہ مسلم یونیورسٹی کے لیے آپ کی محبت، عقیدت اور ذوق خدمت قدرت کا ایک ایسا عطیہ تھا جس نے ایک طرف آپ کی شخصیت کو نکھارا تو دوسری طرف یونیورسٹی کی مشکلات دور کرنے میں ہمیشہ معاون ثابت ہوا۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک اس مرکز علم و ادب پر کئی مرتبہ برے وقت بھی آئے ہیں اور ہر ایسے وقت میں موصوف کی گراں قدر شخصیت اور پرخلوص دعاؤں نے اسے گرنے سے بچایا اور محفوظ رکھا۔ کبھی کبھی تو سینہ سپر ہو کر اس مرد مومن نے اپنی مادر درس گاہ کے دفاع کے لیے میدان میں اترنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ جب بھی کوئی موقع آیا چاہے حکومت کا عتاب ہو یا طلبا کا غم و غصہ، چاہے اپنوں کی خود غرضی ہو یا فرقہ پرستوں کا حملہ آپ نے ہمیشہ یونیورسٹی کی ساکھ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ہر افراتفری میں اپنے کردار و گفتار سے توازن قایم رکھنے کی سعی فرمائی۔ آپ کے یہ خاموش کارنامے ہی آپ کو مادر درس گاہ کے عظیم فرزندوں کی صف اول میں لے آتے ہیں۔

کورٹ کے ممبر، مجلس منتظمہ کے رکن، آنریری ٹریژرار اور قایم مقام وائس چانسلر ہونے کے علاوہ بھی موصوف نے ہمیشہ اور بھی مختلف طریقوں سے یونیورسٹی کی خدمت کرنے میں اپنی تمام عمر گزاری۔ یونیورسٹی کے چاروں اسکولوں کے منیجر، ڈیوٹی سوسائٹی کے چیرمین تعلیم نسواں کمیٹی کے چیرمین اور یونیورسٹی لائبریری کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے بھی آپ کی خدمات کا کوئی جواب نہیں

یونیورسٹی انتظامیہ سے باہر بھی آپ نے قوم و ملت کے کار ہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانان ہند کا ایک بہت ہی اہم اور سود مند ادارہ ہے اس کی آبیاری میں قوم و ملت کے کتنے ہی عظیم رہنماؤں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ ان ہی اہم شخصیتوں میں قبلہ شیروانی صاحب مرحوم کے والد بزرگوار نواب صدر یار جنگ مرحوم بھی تھے۔ مرحوم اپنی زندگی کے آخری دور تک اس کانفرنس کے آنریری سکریٹری رہے۔ کانفرنس کا یہ دور مسلمانان ہند کی علمی تاریخ کا ایک درخشاں دور رہا ہے۔ اسی دور سے الحاج شیروانی صاحب مرحوم بھی اسی کانفرنس کی مجلس منتظمہ کے ایک اہم رکن رہے اور اس کی مختلف کمیٹیوں میں رہ کر بڑے مفید کام انجام دیتے رہے اور پھر نواب صدر یار جنگ مرحوم کی پیرانہ سالی اور علالت کی وجہ سے کانفرنس کی آنریری سکریٹری شپ آپ نے سنبھال لی اور چالیس سال تک (درمیان میں دو ٹرمس چھوڑ کر) آپ نے اپنی پوری صلاحیتوں اور خلوص کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیا۔ پچھلے دس پندرہ سال کانفرنس کی تاریخ میں بڑے اتار چڑھاو کے گزرے ہیں۔ اس دور میں موصوف کی شخصیت ہی تھی جس نے کانفرنس کی ساکھ کو بنائے رکھا اور اس ادارے کی بقا کے لیے اپنا قیمتی وقت، سرمایہ اور جسمانی طاقت صرف کی۔ اسی طرح جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں بھی افراتفری کی شکل پیدا ہوئی تو موصوف نے کچھ عرصے کے لیے اس کی بھی آنریری سکریٹری شپ قبول فرما کر اس ادارہ کو بھی جلا بخشی۔

غرضیکہ مختلف عہدوں پر رہ کر اور مختلف طریقوں سے خدمات انجام دے کر مرحوم نے ہمیشہ اپنی مادر درس گاہ کو وہ سب کچھ عطا فرمایا جو ایک ہونہار سپوت اپنی

مال کو عطا کرتا ہے۔ اسی سلسلے میں مرحوم کا عظیم ترین کارنامہ اپنے والد بزرگوار کے انمول اور بیش قیمت کتاب خانہ کو مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو عطا فرمانا ہے یہ کروڑوں روپے کی ملکیت کا کتاب خانہ نہ صرف مولانا آزاد لائبریری کی زینت ہے بلکہ اس کے لیے باعث فخر بھی۔ کتاب خانہ کے سلسلے میں ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔

کچھ عرصہ ہوا موصوف بحیثیت اعزازی خزانچی مسلم یونیورسٹی کے دفتر میں تشریف فرما تھے۔ راجستھان کے ایک مال دار تاجر آپ سے ملنے وہاں آئے۔ انھوں نے کتاب خانہ حبیب گنج کی ایک نادر اور انمول قلمی تصویر کو خریدنے کی پیش کش کی اور اس کی قیمت لاکھوں میں لگائی۔ یہ تصویر نہ صرف مشہور مصور منصور کا شاہکار ہے بلکہ پوری دنیا میں یکتا ہے۔ شیروانی صاحب مرحوم نے ان تاجر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا:

"جناب! میں پورا کتاب خانہ، جس میں یہ نادر شاہکار بھی شامل ہے، مسلم یونیورسٹی کی نذر کر چکا ہوں۔ اب وہی اس کتاب خانہ کی مالک و مختار ہے۔

دوسرے حضور! یہ نادر کتابیں اور اشیا میرے بزرگوں نے فروخت کرنے کے لیے جمع نہیں کی تھیں۔ تجارت اور نفع حاصل کرنا ان کا کبھی مقصد نہیں تھا۔"

وہ تاجر اپنا سا منہ لے کر واپس ہو گئے۔

تعلیمی امور میں آپ کی دلچسپی صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ ملک کے مختلف تعلیمی اداروں سے آپ کی وابستگی آخر دم تک قائم رہی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی انتظامیہ کے رکن کی حیثیت ہو یا دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر کی حیثیت دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رکن کی حیثیت ہو یا اسلامیہ کالج اٹاوہ کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے صدر کی حیثیت آپ نے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت ان معروف قومی اداروں کو بھی دیا اور ان سب اداروں کی میٹنگوں میں شرکت فرمانے کے لیے آپ ہمیشہ باوجود اپنی پیرانہ سالی کے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا بلاناغہ ان میں شرکت فرماتے تھے۔

تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ آپ کا تعلق بہت سے فلاحی اداروں سے بھی تھا۔ علی گڑھ کے بہت سے ایسے اداروں کو آپ کی سرپرستی کا فخر حاصل تھا ان میں گاندھی آئی ہاسپٹل جس کے آپ برسوں اعزازی خزانچی رہے۔ جامعہ اردو کے بھی آپ کئی سال آنریری خزانچی رہے۔ مسلم مسافر خانہ کی انتظامی کمیٹی کے صدر لطفیہ ہائی اسکول جامع مسجد علی گڑھ کے صدر اور نواب عظمت علی خاں وقف بورڈ مظفر نگر کے آنریری سکریٹری آپ زندگی کے آخری لمحات تک رہے۔ حیرت اس بات پر تھی کہ اپنی ضعیفی، کبرسنی اور بزرگی کے باوجود کچھ اداروں کے تو ایسے عہدے سنبھالے ہوئے تھے جو صرف نمائشی اور باعث زینت نہیں تھے بلکہ جن کے لیے روزانہ باقاعدگی سے کام کرنا پڑتا تھا اور جن پر وقت کے ساتھ ساتھ ذہنی اور جسمانی توانائی بھی صرف کرنا ہوتی تھی۔ مرحوم کا سب سے نادر وصف یہی کام کی لگن تھا کام کوئی بھی وہ جس میں خدمت خلق کا پہلو نمایاں ہو۔ یہ لگن اور یہ خدمت خلق کا جذبہ آپ کی عظیم شخصیت کا وہ نمایاں پہلو تھا جس نے آپ کو قابل احترام، قابل عقیدت اور قابل فخر بنا دیا تھا۔

اتنے تعلیمی اور غیر تعلیمی اداروں سے وابستگی کے باوجود آپ نے صوبہ کی سیاسی، سماجی

اور تنظیمی کاموں میں برابر حصہ لیا۔ یو.پی زمین دار ایسوسی ایشن کے نائب صدر، صوبائی حج کمیٹی کے رکن، اسلامیہ اوقاف کمیٹی، بھوانی سینی ٹوریم ٹرسٹ کمیٹی، کورٹ آف وارڈ کمیٹی کے ممبر اور نہ معلوم کتنی کمیٹیوں اور اداروں کے بورڈ آف ٹرسٹیز سے اپنا تعلق رکھ کر مرحوم نے اپنی تنظیمی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور پھر ان سب پبلک کاموں کے ساتھ آپ نے اپنی زمین داری کا انتظام بھی جس خوبی اور صلاحیت سے انجام دیا وہ بھی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

محترم الحاج عبیدالرحمٰن خاں شیروانی مرحوم کے ان ہی سارے نمایاں اور قومی و ملی خدمات، جذبۂ خلوص لگن اور اپنی مادر درسگاہ کے لیے عظیم قربانیوں اور خدمات کی بنا پر آپ کو ۱۹۸۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا پرو چانسلر منتخب کیا گیا۔ آپ کے اس انتخاب پر بجا طور پر نہ صرف یونیورسٹی کے طلبا، اساتذہ اور دیگر کارکنان نے مسرت و شادمانی کا اظہار کیا بلکہ تمام مسلمانان ہند اور ملک کے عوام نے اطمینان ظاہر کیا۔

شیروانی صاحب مرحوم انسانی صفات کا ایک ایسا انمول نمونہ تھے جو آج کے زمانے میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔ ایک اچھے اور نیک انسان کا سب سے بڑا وصف یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے ساتھی انسانوں سے بلا تفریق مذہب و ملت، نسل و ذات، امیری اور غریبی اور بزرگی اور خوردگی محبت ہو۔ موصوف نہ صرف بنی نوع انسان کے ہمدرد تھے اور سب سے محبت و شفقت سے پیش آتے تھے بلکہ ہر وقت اور ہر موقع پر مستحق لوگوں کی امداد پر کمر بستہ بھی رہتے تھے آپ روزانہ صبح چہل قدمی کے لیے شہر کی مختلف سڑکوں پر نکلتے تھے اور اکثر واپسی میں کسی نہ کسی شناسا کی مزاج پرسی کے لیے ان کے مکان پر تشریف لے جاتے تھے۔ ان حضرات میں زیادہ تر وہ غریب اور نادار لوگ ہوتے تھے جن کی مزاج پرسی کے لیے اتنی عظیم اور اہم شخصیت کا ان کے مکان پر پہنچنا ہی ان کے لیے قابل فخر ہوتا ہے۔ ایسے حضرات میں زیادہ تر رکشہ والے، پھل بیچنے والے، چھوٹے موٹے دکان دار یونیورسٹی کے ادنیٰ ملازمین اور اسی قسم کے دیگر لوگ شامل تھے۔

آپ کی کوٹھی حبیب منزل پر اکثر صبح کے وقت ناشتہ کی میز پر شہر اور بیرون شہر سے آئے ہوئے حاجت مند لوگوں، طلبا اور ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ان میں سے کسی کو یونیورسٹی میں اپنے بچے کا داخلہ کرانا ہوتا تھا کسی کو آنکھوں کے اسپتال میں کسی مخصوص ڈاکٹر کو خط لکھوانا ہوتا تھا۔ کسی کو حکمرانوں تک رسائی مقصود ہوتی تھی اور کسی کو کچھ مالی امداد درکار ہوتی تھی۔ غرضیکہ مرحوم ان سب کی باتیں بڑے غور سے سنتے تھے اور جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا مدد کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔

> "پرماتما کی شان ہے کہ اورنگ زیب جتنا اپنی رعایا کا خیر خواہ تھا، اتنا ہی اسے بدنام کیا گیا ہے۔ کوئی اسے ظالم کہتا ہے اور کوئی خونی لکھتا ہے لیکن حقیقت میں وہ عالمگیر کے لقب کا بجا طور پر مستحق تھا۔"
>
> ڈاکٹر ایشوری پرشاد

اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو اپنی نوازشوں سے بہت کچھ نوازا تھا۔ علی گڑھ کی سب سے عظیم الشان کوٹھی حبیب منزل میں بفضل خدا مرحوم کی خدمت میں بہت سے ملازمین خدمت کے لیے تھے لیکن مرحوم اپنا کام خود ہی کرنا پسند کرتے تھے۔ ضعیفی اور جسمانی کمزوری کے باوجود اپنے نجی کام کے لیے ملازمین کی مدد بہت ہی کم لیتے تھے مہمانوں کے لیے کرسی اُٹھا کر لانا، انھیں خود ناشتہ پیش کرنا اور انھیں کوٹھی سے نیچے تک چھوڑ کر آنا آپ کے اخلاق اور محبت کے کچھ نادر نمونے تھے۔ روزانہ کے مشاغل، لباس اور خوراک میں انتہائی سادگی تھی اور جہاں تک ممکن ہوتا شہر میں کہیں جانے کے لیے کسی سواری کے بجائے پیدل قدمی کرنا پسند کرتے تھے۔ زندگی میں یہ سادگی، اپنا کام خود کرنے کی لگن، دوسروں کی خدمت کا جذبہ اور انسانی ہمدردی نیکی اور بزرگی کی ایسی علامتیں ہیں جو صرف اللہ کے نیک بندوں میں پائی جاتی ہیں۔

ان دنیوی اوصاف کے ساتھ مرحوم کی دین داری، پرہیزگاری اور عبادت گزاری اور کئی قابل تعظیم اوصاف تھے جن کی وجہ سے انھیں عوام میں قابل احترام تو بنایا ہی تھا یہ احساس بھی دلایا تھا کہ آپ کو اپنے معبود حقیقی اور سرکار دو عالم سے قربت بھی حاصل ہے۔ اسی لیے بہت سے لوگ آپ کی دعاؤں اور نیک خواہشات کے طالب رہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت عطا فرمائے۔ آمین ـــ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

---

"دنیا کی تاریخ میں کوئی مذہب اتنی جلدی اور اس قدر وسعت کے ساتھ نہیں پھیلا جتنا کہ مذہب اسلام پھیلا ہے۔ یہ تھوڑے سے عرصے میں کوہ الٹائی سے لے کر بحر اٹلانٹک تک اور ایشیا کے مرکز سے افریقہ کے مغربی کناروں تک جا پہنچا۔"

ڈاکٹر ڈریپر

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۱۱ شمارہ ۶ (جون ۹۲ء)

# سر سیّد احمد خاں اور علوم مشرقیہ

یہ مقالہ سر سید اکیڈمی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے زیر اہتمام "سر سیّد کا فلسفۂ تعلیم: موجودہ دور میں اس کی معنویت" کے موضوع پر ۲۰-۲۱ اپریل ۹۲ء کو منعقدہ سیمینار میں پیش کیا گیا تھا۔ اسے یہاں کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

ظفر الاسلام اصلاحی ○

ایک سماجی مصلح اور تعلیمی مفکر کی حیثیت سے سر سیّد احمد خاںؒ نے ۱۹ویں صدی میں جو گراں قدر خدمات انجام دیں مختلف پہلوؤں سے ان کی معنویت و افادیت آج بھی مسلم محقق ہے۔ اس کا ایک اہم پہلو ان کا وہ بلند تصورِ علم اور وسیع نظریہ تعلیم ہے جس میں قدیم و جدید دونوں کا امتزاج اور مشرق و مغرب دونوں کی روایات کا پرتو پایا جاتا ہے یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی بدحالی اور سماجی پسماندگی کے ازالہ کے لیے سر سید احمد خاںؒ نے ان میں تعلیم کی ترویج اور علوم و فنون کی اشاعت پر خاص زور دیا اور اس کے لیے ایک وسیع پروگرام بنایا جو مختلف انجمنوں، سوسائٹیوں اور تعلیمی اداروں بالخصوص مدرسۃ العلوم یا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (ایم۔ اے۔ او کالج) کی صورت میں برگ و بار لایا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وقت کے تقاضوں اور نئے زمانے کی ضروریات کے تحت سر سیّد کے تعلیمی تصورات میں جدید تعلیم کو خصوصی حیثیت حاصل تھی لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ کیا جدید تعلیم کے حصول پر زور دینے سے ان کا مطلب قدیم علوم و فنون کو پس پشت ڈال دینا اور ماضی کے علمی و ثقافتی ورثہ سے قطع تعلق اختیار کر لینا تھا۔ سر سیّد کے افکار تعلیمی مشن کے مختلف مراحل اور ان کی تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کا غائرانہ مطالعہ اس

○ لکچرر، ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، اے ایم یو علی گڑھ

ں کی نفی کرتا ہے۔ سرسید کے تعلیمی تصورات سے بحث
تے ہوئے کبھی کبھی یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ مشرقی تعلیم اور ان کے
لوم کے تئیں سرسید کا رویہ بے نیازانہ بلکہ منافرانہ تھا۔ یہ
ل صحیح نہیں ہے جیسا کہ ذیل کی تفصیلات سے واضح ہوگا

قدیم علوم وفنون کے تئیں سرسید کے نقطۂ نظر کو
سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ انھوں نے
ن کی تحصیل میں بڑی دلچسپی ولگن کا ثبوت دیا۔ اس کا اندازہ
س سے لگایا جاسکتا ہے کہ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں عربی و
فارسی زبان کی مروجہ درسیات کی تکمیل اور ریاضی، ہیئت و
طب کے میدان میں اپنے ماموں نواب سید زین العابدین
خاں وغیرہ سے خصوصی استفادہ کے بعد انھوں نے سرکاری
ملازمت اختیار کرلی اور تقریباً سات آٹھ سال تک عدالت
سے متعلق مختلف ذمہ داریاں انجام دینے کے بعد جب ۱۸۴۶ء
میں منصف کی حیثیت سے ان کا تبادلہ فتح پور سے دہلی
ہوا تو انھیں یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے تعلیمی مراحل میں اسلامی
علوم اور عربی ادب کے مضامین میں خصوصی توجہ نہیں دے
پائے ہیں اس لیے انھوں نے دہلی میں ممتاز علماء و ماہرین
فن کی موجودگی کو غنیمت جانتے ہوئے اس کمی کو پورا کرنے
کا فیصلہ کیا اور تفسیر، حدیث، فقہ وعربی ادب کے میدان
میں مختلف اساتذۂ فن سے استفادہ کیا جن میں مترجم
قرآن شاہ رفیع الدینؒ کے صاحبزادے مولانا مخصوص اللہ
فقہ کے مشہور استاد مولوی نوازش علی، عربی زبان وادب
کے ممتاز عالم مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور ماہر منقولات و
معقولات و دہلی کالج کے معروف استاد مولانا مملوک علی
نانوتوی شامل تھے۔ ان حضرات سے سرسید نے جن
کتابوں کا درس لیا ان میں حدیث کی مشکوٰۃ، جامع ترمذی،
صحیح مسلم، فقہ واصول فقہ کی قدوری، شرح وقایہ، شاشی،
نور الانوار، عربی ادب کی مقامات حریری وسبع معلقہ قابلِ
ذکر ہیں۔ یہ رسمًا یا روایۃً نہیں بلکہ ذاتی توجہ و دلچسپی سے

اسلام کے اساسی علوم کی تحصیل میں سرسید کی یہ کوشش
ان کی نگاہ میں ان علوم کی اہمیت و وقعت کا کھلا ہوا ثبوت
پیش کرتی ہیں۔ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ سرسید کے
تعلیمی تصورات کی تشکیل میں ان علمی رجحانات کا کوئی رول نہ رہا ہو۔

سرسید کے تصور تعلیم کو صحیح منہاج میں سمجھنے کے
لیے یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت
سے ان کا اصل مقصود قومی زندگی کی تعمیر اور ان کی سماجی و
ثقافتی ترقی کا حصول تھا۔ یہ نقطۂ نظر ان کے اس قول سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔

"اے دوستو! مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش
کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے
بی۔اے یا ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرلی
ہے، بلکہ میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے"۔

مزید براں انھوں نے بار بار اس خیال کی تردید کی کہ مدرسۃ
العلوم کے قیام کا مقصد مسلمانوں کو سرکاری ملازمت کے
اہل بنانا ہے اور یہ وضاحت کی کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ قدیم و
جدید دونوں علوم میں مہارت حاصل کرکے مسلمان زندگی
کے مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کو نمایاں کریں اور سماج و معاشر
میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کریں۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کا حصول اس
بات کا متقاضی تھا کہ ایک جامع نظام تعلیم تشکیل دیا جائے اور اس کے
تحت مختلف میدانوں میں تعلیم وتربیت کی سہولتیں فراہم کی جائیں
سرسید نے اپنے تعلیمی پروگرام کا جو خاکہ اسلامک کمیٹی خواستگار ترقی
تعلیم مسلمانان کے سامنے پیش کیا تھا وہ یہ تھا کہ ایک ایسا عظیم مدرسہ
قائم کیا جائے جو تین مدرسوں پر مشتمل ہو۔

۱۔ پہلا وہ جس میں انگریزی زبان پر خاص زور دیا
جائے گا اور تمام علوم وفنون انگریزی زبان میں
پڑھائے جائیں گے

۲۔ دوسرا وہ جس میں تمام علوم وفنون کے لیے اردو
ذریعہ تعلیم ہوگا۔ البتہ ہر طالب علم کو تین زبانوں (انگریزی
عربی وفارسی) میں سے ایک بطور ثانوی زبان اختیا

کرنی ہوگی۔

۳- تیسرا عربی و فارسی مدرسہ ہوگا۔ یہ اول الذکر دونوں مدارس کے ان فارغ التحصیل طلبا کے لیے ہوگا جو عربی و فارسی اور متعلقہ علوم و فنون میں اختصاص حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

اس سے یہ بخوبی اندازہ ہوگا کہ سر سید ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے جس سے مختلف صلاحیت کے لیے افراد پیدا ہوں جو جدید تقاضوں کو پورا کر سکیں اور قدیم علمی و ثقافتی ورثہ کو نہ صرف محفوظ رکھ سکیں بلکہ عصری اسلوب میں انھیں دنیا کے سامنے پیش بھی کر سکیں۔ اس کی مزید وضاحت مولف تفسیر حقانی مولوی عبد الحق دہلوی کے نام سر سید کے اس خط سے ملتی ہے:

"آپ جو یہ استفسار فرماتے ہیں کہ مدرستہ العلوم مسلمانان میں کون سے علوم ہوں گے جن سے اہل اسلام ترقی دنیا حاصل کریں گے، تو اگر آپ از راہ عنایت اس طریقۂ تعلیم مسلمانان پر غور فرمائیں گے جو کمیٹی میں پیش ہوا ہے اور ہمراہ پرچہ تہذیب الاخلاق مطبوعہ ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ میں تقسیم ہوا ہے تو آپ کو ان سب علوم کا جو مدرستہ العلوم مسلمانان میں پڑھانے تجویز ہوئے ہیں بخوبی حال معلوم ہو جائے گا اور اس وقت آپ رائے فرما سکیں گے کہ ان علوم کے پڑھنے سے دین و دنیا دونوں میں ترقی ہونے کی امید ہے یا نہیں"

تعلیم کے میدان میں سر سید بھی قدیم و جدید کے امتزاج کے قائل تھے اور یہ تصور رکھتے تھے کہ اس کے بغیر کوئی جامع نظام تعلیم تشکیل نہیں پا سکتا اور نہ مسلمانوں کی سماجی اصلاح و ثقافتی ترقی کا مقصد صحیح معنوں میں پورا ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے ایک خطبے میں جدید علوم و فنون کے ساتھ مشرقی علوم کی اہمیت و افادیت کو واضح طور پر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"اسی کے ساتھ ہم کو عربی کی بھی تعلیم دینی ضرور ہے جو قطع نظر اس کے کہ وہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ ایک ایسی اعلیٰ درجے کی زبان ہے جس کی قدر کی جا سکتی ہے اور کس طرح علمی زبان کے دائرے سے علیحدہ بھی رہ سکتی اور مسلمانوں کی ضروریات سے خارج نہیں رہ سکتی اور اگر مذہبی خدمت کا بھی لحاظ ہو تو عربی کے ساتھ عبری زبان سے بھی واقفیت پیدا کرنی لازم آ جاتی ہے... فارسی کو بھی ہم نہیں چھوڑ سکتے جس کا بہت کچھ تعلق مسلمانوں کی تربیت اور مذاق کے ساتھ ہو گیا ہے اور وہ فی نفسہ خود بھی نہایت لطیف و بامذاق زبان ہے اور مسلمانوں کے علوم و تواریخ کا اس قدر سرمایہ اس میں موجود ہے کہ جس سے مسلمان قطع نظر نہیں کر سکتے ... مسلمانوں کو مذہبی تعلیم دینا بھی ادنیٰ درجہ کی یا اوسط درجہ کی یا اعلیٰ درجے کی ہم پر فرض ہے کیوں کہ مختلف اقوام کو جس چیز نے ایک قوم بنا دیا ہے وہ صرف اسلام ہے۔ اگر ہم اس کا فکر نہ رکھیں تو قومیت قائم نہیں رہ سکتی۔ ان سب باتوں کے ساتھ ہمیں ان کو مختلف علوم میں اور بالتخصیص علوم جدیدہ میں تعلیم دینا ہے جو ایک بہت بڑا امر اہم ہے اور فی الواقع جو اس کی ضرورت اور عظمت

ہے وہ مافوق بیان ہے۔"

بڑی اہم بات ہے کہ سرسید دینی علوم و مشرقی زبانوں کو ہی مسلم قومیت کی اساس قرار دیتے ہیں۔ وہ صاف صاف لکھتے ہیں:

"اسی کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہوں کہ
علوم عربیہ اور درسی کتب مذہبی جو معدوم
ہوتا جاتا ہے کسی طرح قایم رہے۔ اگر عربی و
فارسی ہم سے معدوم ہو جائے تو اسی کے
ساتھ ہماری قومیت بھی معدوم ہو جائے
گی۔"

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مسئلہ پر علامہ شبلی کے خیالات بھی کم و بیش انہی الفاظ میں ملتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

"میں اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور
دل سے پسند کرتا ہوں تاہم پرانی تعلیم کا
سخت حامی ہوں اور میرا خیال یہ ہے کہ
مسلمانوں کی قومیت قایم رکھنے کے لیے
پرانی تعلیم ضروری و سخت ضروری ہے۔"

سرسید نے اپنی تعلیمی تحریک کے ابتدائی دور میں مراد آباد و غازی پور میں (۱۸۵۹ء و ۱۸۶۴ء میں بالترتیب) دو مدرسے قایم کیے جن میں عربی و فارسی تعلیم کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ پہلا مدرسہ اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے فارسی مدرسے کے نام سے مشہور ہوا اور دوسرا جسے مشرقی و مغربی تعلیم کے امتزاج کا ابتدائی نمونہ کہا جا سکتا ہے بیک وقت پانچ زبانوں کی تعلیم کا اہتمام کرتا تھا۔

سرسید کے تعلیمی مشن کا اصل مظہر مدرستہ العلوم تھا جو ۱۸۷۵ء میں وجود میں آیا۔ ۱۸۷۷ء میں ایم۔ اے او کالج کی شکل اختیار کیا اور ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کی صورت میں نمایاں ہوا۔ گرچہ یہ پوری طرح اس خاکہ کے مطابق نہیں تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ تاہم اس میں شروع ہی سے جدید علوم کے ساتھ عربی و فارسی زبان و ادب منطق و فلسفہ، دینیات و اسلامی تاریخ و تمدن جیسے مضامین شامل کیے گئے۔ مشرقی زبانوں اور متعلقہ مضامین کی تعلیم پر توجہ دینے کے لیے اورینٹل ڈپارٹمنٹ (شعبہ علوم مشرقیہ) قایم ہوا۔ کالج کا نام (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) خود اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس کے مزاج میں مغربی و مشرقی دونوں عناصر شامل تھے۔ سرسید کے ذہن میں کالج کی تعلیم کا جو جامع تصور تھا اس کا اندازہ ان تجاویز سے ہوتا ہے جنھیں انھوں نے مذہبی تعلیم کمیٹی کے سامنے پیش کیا تھا اس کا ایک خاص حصہ یہ تھا:

"دینیات میں علوم مفصلہ ذیل داخل
ہیں: فقہ، حدیث، تفسیر، اصول فقہ،
اصول حدیث، اصول تفسیر، علم عقائد و
علم کلام۔ پس انہی علوم کی کتابیں سلسلہ
تعلیم علوم مذہبی ہیں، جس طرح کی مناسب
ہوں داخل کی جائیں۔"

سرسید نے اسی ضمن میں یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ تعلیم کے مختلف مراحل میں ہر مرحلے کے معیار کے مطابق دینیات کا نصاب تیار کیا جائے اور خواہش مند طلبا کو اس مضمون میں اختصاص کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ دینیات کی تعلیم میں سرسید کا خصوصی اہتمام اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ علما و فضلا کی ایک کمیٹی کے ذریعہ اس کا نصاب تیار کرایا اور ناظم دینیات کی تقرری کے سلسلے میں دیوبند تحریک کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے مراسلت کی اور ان سے یہ درخواست کی کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک یا ان کا کوئی معتمد نمائندہ کالج میں شعبۂ دینیات کی سربراہی قبول کر لے۔ ان حضرات

کی اظہار معذوری کے بعد اس منصب کے لیے ان کی نظر انتخاب انہی کے حلقے کے ایک عالم (مولانا عبداللہ انصاری) پر پڑی جو دارالعلوم دیوبند کے اولین فارغین میں سے تھے اور مولانا مملوک علی کے نواسے و بانی دیوبند کے خویش تھے۔[۱۲]

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سرسید قدیم علوم یا مشرقی تعلیم کے حامی و مؤید ضرور ہے لیکن زمانے کے تقاضوں سے انھیں ہم آہنگ کرنے اور ان کی افادیت بڑھانے کے لیے وہ ان میں نیا رنگ دینے کے قائل تھے اس کا واضح ثبوت علم کلام (جو دینیات کی تعلیم کا حصہ تھا) کی درسیات سے متعلق ان کے نقطۂ نظر سے ملتا ہے۔ انھوں نے مختلف انداز میں بار بار اس خیال کو پیش کیا کہ یونانی فلسفہ و منطق کے زیر اثر عقاید میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کے ازالے کے لیے جو علم کلام عباسی دور میں ایجاد کیا گیا تھا وہ اس خلل و فساد کو دفع کرنے کے لیے ناکافی ہے جو عصر حاضر میں جدید فلسفہ و سائنس کی تعلیم سے عقاید میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس لیے نئے علم کلام کی ایجاد اور اس کے مطابق نئی کتابوں کی تیاری کی ضرورت ہے[۱۳] مزید براں انھیں جب بھی علما سے رابطہ کا موقع ملا ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی اور ایک بار دو ٹوک انداز میں ان سے ان الفاظ میں مخاطب ہوئے:

> " اب میں نہایت ادب سے پوچھتا ہوں
> کہ جو کتب مذہبی اب تک ہمارے یہاں
> موجود ہیں اور پڑھنے پڑھانے میں آتی ہیں
> ان میں سے کون سی کتاب ہے جس میں فلسفہ
> مغربیہ اور علوم جدیدہ کے مسائل کی تردید
> یا تطبیق مسائل مذہبیہ سے کی ہو۔"[۱۴]

آخر میں انھوں نے یہ شکوہ بھی ظاہر کیا کہ انگریزی تعلیم سے عقاید کے متزلزل ہونے کے شکوک بڑے زور و شور سے پیش کیے جاتے ہیں لیکن اس تعلیم کے نقصانات کے ازالے کے لیے نئے علم کلام کے ایجاد کی جانب توجہ نہیں دی جاتی۔ وہ صاف صاف لکھتے ہیں:

> " یہ آفت کچھ نئی نہیں ہے بلکہ جب
> فلسفہ یونان مسلمانوں میں پھیلا تھا اس
> وقت بھی یہ مشکل پیش آئی جس کے سبب
> اس زمانے کے علمائے علم کلام ایجاد
> کیا تھا۔ پس ہم جو اس کا الزام اپنے نوجوان
> انگریزی خواں طالب علموں کو دیتے ہیں وہ
> ٹھیک نہیں بلکہ دراصل وہ الزام اس
> زمانے کے علما پر ہے جو فلسفہ جدیدہ کے
> مقابلے میں کوئی علم کلام پیدا نہیں کرتے۔"[۱۵]

دینیات کی درسیات میں نیا پن لانے کا احساس کالج میں سرسید کے جانشیں نواب محسن الملک کے زمانے میں بھی باقی رہا۔ انھوں نے ۱۸۹۸ء میں دینیات کی تعلیم کے جائزے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کی رپورٹ ملنے پر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کالج میں جو طلبا جدید فلسفہ و جدید سائنس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں انھیں دینیات کی مروجہ کتب سے تسکین نہیں ہوتی۔ انھوں نے اس کے لیے علمائے مصر کی تیار کردہ کتابیں منگوانے کی تجویز پیش کی جو خاص طور سے ایسے طلبا کے لیے ہی تیار کی گئی تھیں لیکن بعض وجوہ سے اس تجویز کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔[۱۶]

اسی طرح عربی و فارسی زبان و ادب کی درسیات سے سرسید کا مقصود طلبا کو محض مختلف زبانوں کی واقفیت بہم پہنچانا نہیں تھا بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ان مضامین کے تحت اس نوع کی تعلیم دی جائے کہ طلبا میں زبان کی اصلیت، اس کی نشو و نما اور ادب کے ارتقا کے محققانہ و ناقدانہ مطالعہ کا ذوق پروان چڑھے۔ اسی لیے اس مضمون کے لیے ایسے اساتذہ کی تقرری کو ترجیح دی جاتی تھی جو قدیم کلاسیکی ادب کے ساتھ جدید زبانوں، ان کے اسلوب و مزاج اور مطالعہ

تحقیق کے نئے طریقوں سے بخوبی واقف ہوں۔ سر سید کے زمانے میں السنۂ مشرقیہ کے اساتذہ میں علامہ شبلی نعمانی اور بعد کے دور میں پروفیسر یوسف ہارویز[۴۱] و مولانا حمید الدین فراہی[۴۲] انہی خصوصیات کے حامل تھے۔ کالج کے طلبا میں عربی کا ذوق پروان چڑھانے بالخصوص جدید عربی میں بول چال و بحث و مباحثہ کی استعداد پیدا کرنے کے لیے لجنۃ الادب کے نام سے ایک انجمن سر سید کے زمانے ہی میں قایم ہوئی۔ اس کے زیر اہتمام مصر سے عربی اخبار بھی آتے تھے اور اس کے پروگراموں میں طلبا و اساتذہ دونوں شریک ہوتے تھے۔ مذہبی تعلیم کمیٹی کے مثل مشرقی زبانوں کی درسیات سے متعلق بھی سر سید نے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جو کمیٹی مدبرانِ السنہ مشرقیہ کے نام سے معروف ہوئی۔[۴۳]

ایم۔اے۔او کالج کے اساتذہ کے سلسلے میں اس بات کو اکثر ذکر کیا جاتا ہے کہ جدید علوم و فنون کی بہتر تعلیم اور نئے طرز تدریس کی ترویج کے لیے سر سید نے بالخصوص یوروپین اساتذہ کی خدمات حاصل کیں اور کالج کی پرنسپل کی ذمہ داری بھی زیادہ تر انھیں کے سپرد کی لیکن یہاں یہ پہلو بھی اوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ دینیات و مشرقی علوم کے مضامین کے پڑھانے اور دار الاقامہ میں طلبا کی تربیت و نگرانی کے لیے جن اساتذہ کا تقرر عمل میں آتا تھا وہ بھی اپنے اپنے فن کے ماہر ہوتے تھے اور مشرقی تعلیم کے میدان میں خصوصی دستگاہ رکھتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان مضامین کے لیے بھی اساتذہ کے انتخاب میں سر سید بڑی توجہ و دلچسپی سے کام لیتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے بعض مذہبی تصورات اور کچھ مخصوص تفسیری نکات کی وجہ سے اس ضمن میں انھیں علماے وقت کا بھرپور تعاون نہ مل سکا۔

سر سید کے فلسفۂ تعلیم سے بحث کرتے ہوئے بعض اوقات یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ سر سید مشرقی تعلیم کے خلاف تھے اور وہ دینی مدارس کو غیر مفید تصور کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فی نفسہ اس تعلیم یا اس کے مراکز کے مخالف نہیں تھے بلکہ ان کا اختلاف ان کے قدیم طرز تعلیم اور ان میں مروجہ بعض ایسی درسیات سے تھا جو جدید تقاضوں سے میل نہیں کھاتی تھیں اور موجودہ معاشرے کی ضروریات پوری کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے مفید نہیں تھیں۔ سر سید یہ چاہتے تھے کہ عصری تقاضوں کی روشنی میں مسلمانوں کے پورے تعلیمی نظام (بشمول درسیات و درس و تدریس کے طریقے) کا جائزہ لیا جائے اور اسی کے مطابق اس نظام میں مفید تبدیلی پیدا کی جائے۔ انھوں نے اپنی تقریروں و تحریروں میں جا بجا مدارس کی حالتِ زار پر افسوس ظاہر کیا ہے اور ان کی اصلاح و ترقی کے لیے ہمدردانِ قوم و اہل علم بالخصوص علما سے پُر زور اپیل کی ہے۔[۴۴] مزید براں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے توسط سے وہ خود بھی اس کے لیے بدستور کوشاں رہے۔ یہ کانفرنس سر سید ہی کی تحریک پر ۱۸۸۶ء میں قایم ہوئی تھی۔ وہ اس کے روح رواں تھے اور سکریٹری کی حیثیت سے تاحیات اس کی نمایاں خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کانفرنس کے خاص خاص اغراض و مقاصد یہ تھے:

۱۔ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ سطح تک رواج دینا۔

۲۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے جاری ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تا بمقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔

۳۔ علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علماے اسلام بطور خود دیتے ہیں اس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قایم و جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔

۴۔ قدیم طرز پر جو تعلیم دیسی مکتبوں میں جاری ہے
اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان کی توسیع و
ترقی کی تدبیریں اختیار کرنا۔

اس کانفرنس کی مختلف رودادوں سے یہ بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ مشرقی علوم وفنون کی اشاعت میں اس کانفرنس نے بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں جن کی تفصیلات پیش کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مشرقی علوم میں سر سید کی دلچسپی اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے "تنزل علوم دینیہ" کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا اور اس میں خاص طور سے ان اسباب وعوامل پر روشنی ڈالی جن کی وجہ سے پہلے زمانے میں علوم دینیہ وعلوم عربیہ کو ترقی حاصل ہوئی تھی اور اب وہ تنزل کا شکار ہو گئے ہیں۔ مزید یہ کہ سر سید نے علامہ شبلی کے مضمون "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" کو نہ صرف پسند فرمایا اور اس کی برملا تحسین کی بلکہ اس پر زور دیا کہ اس موضوع پر اور علمی و مفید مضامین لکھے جائیں اور انھیں ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام شائع کیا جائے۔ ان سب سے اہم یہ کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وفات پر سر سید نے جو تعزیت نامہ تحریر کیا تھا اس میں نہ صرف یہ کہ دینی تعلیم کی اشاعت کے لیے ان کی کوششوں کو سراہا اور دارالعلوم دیوبند کو ایک مفید مدرسہ اور ان کی ایک عمدہ یادگار قرار دیا بلکہ یہ بھی اپیل کی کہ

"سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش
کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم و مستقل رہے
اور اس کے ذریعے تمام قوم کے دل پر ان
کی یادگاری کا نقش جمارہے۔"

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ کہنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا کہ مشرقی علوم یا ان کے مراکز سے سر سید متنفر تھے۔ اس ضمن میں پروفیسر خلیق احمد نظامی کی یہ رائے بہت متوازن نظر آتی ہے:

"وہ (سر سید) چاہتے تھے کہ مشرق کی
ہر عمدہ چیز کو باقی رکھا جائے لیکن مغرب کی
بھی کسی اچھی چیز کے حاصل کرنے سے گریز
نہ کیا جائے۔"

اس بات کے بھی واضح ثبوت ملتے ہیں کہ سر سید نے قدیم علوم وفنون کے ترجمان علماء وقت سے تعلقات روابط قائم کیے اور اس ضمن میں اپنے شدید ترین مخالف سے بھی گریز نہیں کیا اور انھوں نے اس کی بھی کوشش کی کہ ایم۔ اے۔ او کالج اور معاصر دینی اداروں میں تعاون کی فضا قائم ہو۔ یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ دیوبند علی گڑھ دو الگ الگ تعلیمی تحریکیں تھیں جن کے رہنماؤں نے مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کے لیے جدا جدا طور طریقے اختیار کیے اور بعض اوقات ان دونوں کے بانیوں کو ایک دوسرے کا شدید مخالف بتایا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ فکری اختلاف کے باوجود دونوں میں روابط قائم رہے اور مراسلت جاری رہی۔ ان کے خطوط واضح طور پر ایک دوسرے کے احترام وقدردانی کے جذبات ظاہر کرتے ہیں۔ سر سید کو بانی دیوبند سے جو عقیدت ومحبت تھی اس پر تعزیت نامہ کے الفاظ بھی شاہد ہیں جسے انھوں نے مولانا کی وفات پر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اپریل ۱۸۸۰ کے شمارے میں شائع کیا تھا۔ اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب کالج میں دینیات کی تعلیم کے بہتر نظم اور اس شعبہ کی سربراہی کا مسئلہ درپیش ہوا تو سر سید نے سب سے پہلے مولانا قاسم نانوتوی اور ان کے بعض قریبی رفقاء سے مراسلت کی اور آخر میں اس منصب پر انھیں کے حلقہ کے ایک عالم کی تقرری عمل میں آئی۔ ان کی جانب سے اس ذمہ داری کو قبول کرنا بجائے خود علی گڑھ و دیوبند میں تعاون کا ایک مظہر تھا۔ یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی

ہوگا کہ نواب وقار الملک نے اپنی سکریٹری شپ کے زمانے (۱۹۰۷ء۔ ۱۹۱۷ء) میں کالج کی انتظامیہ سے یہ تجویز منظور رائی کہ جو گریجویٹ دینیات کی تعلیم میں اختصاص پیدا رنا چاہیں انھیں وظیفہ دے کر کسی دینی ادارے میں بھیجا جائے۔ اس کے لیے دارالعلوم دیوبند کو منتخب کیا لیا اور ایم۔ اے۔ او کالج کے ایک گریجویٹ کو تین سال کے لیے پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ دے کر وہاں بھیجا گیا گرچہ بعد میں یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔[۳۰]

دیوبند کے ساتھ ساتھ مظاہر العلوم کی نسبت سے بھی ایک واقعہ کا ذکر برمحل معلوم ہوتا ہے جس سے مذکورہ مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ سرسیّد کے ایک قریبی رفیق نواب محسن الملک دسمبر ۱۸۹۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں میرٹھ دورے پر تشریف لے گئے۔ وہاں انھیں مدرسہ مظاہر العلوم (سہارنپور) کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ نواب صاحب کو اس پر حیرت سی ہوئی۔ بہرحال انھوں نے بخوشی دعوت نامہ قبول فرمایا اور وہ اس جلسے میں شریک ہوئے۔ وہاں علمائے سہارنپور کے علاوہ علمائے دیوبند بھی موجود تھے۔ نہ صرف یہ کہ نواب صاحب کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا بلکہ انھیں جلسے کی صدارت سے بھی نوازا گیا۔ اس موقع پر ارکان مدرسہ کی جانب سے ان کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں نواب صاحب کی شان میں تہنیتی الفاظ استعمال کرنے اور مدرسے کے احوال و کوائف بیان کرنے کے علاوہ اس خیال کی بھی سختی سے تردید کی گئی کہ

"ارباب مدرسہ انگریزی تعلیم کو برا سمجھتے ہیں۔"[۳۱]

ندوۃ العلما کے قیام کے ابتدائی مراحل ہی سے اس معروف ادارے سے سرسیّد، ایم۔ اے۔ او کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے روابط کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ ۱۸۹۴ء میں مدرسہ فیض عام کانپور میں منعقد ہونے والا علما کا جلسہ ندوۃ العلما لکھنؤ کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوا تھا۔ اس کے انعقاد سے قبل مہتمم جلسہ مولانا محمد علی مونگیری کی جانب سے سرسید کو اس کی اطلاع مع تفصیلات پروگرام بھیجی گئی۔ سرسید اس جلسہ میں شریک نہیں ہوئے لیکن انھوں نے اس موقع پر اپنا ایک تحریری پیغام ارسال کیا اس میں جلسہ کے اہم مقاصد (علوم اسلامیہ کے احیا کی تدبیر اور علما کے باہمی اختلاف کے ازالہ پر غور وفکر) کو کافی سراہا اور اس کی کامیابی کے لیے نیک خواہشات ظاہر کیں اور بڑی دردمندی کے ساتھ علما کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ جدید فلسفہ و سائنس کی تعلیم کے ممکنہ خطرات سے ازالہ کے لیے نئے علم کلام کے ایجاد کی سخت ضرورت ہے۔ انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس جلسے میں علما اس اہم مسئلہ پر بھی غور کریں اور اس کے حل کے لیے اپنی خدمات پیش کریں۔[۳۲] بعد میں ناظم مجلس ندوۃ العلما مولانا محمد علی مونگیری نے اس جلسہ کی مفصل روداد اس پر ریویو لکھنے کی درخواست کے ساتھ سرسید کو بھجوائی۔ اس کے جواب میں سرسیّد نے اجلاس کی کارروائی پر پسندیدگی ظاہر کی اور یہ دعا کی کہ خدا کرے کہ اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں۔ مزید براں یہ یقین دہانی کرائی کہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس کا ذکر کیا جائے گا اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں اس کی تائید میں رزولوشن پیش ہوگا۔[۳۳] اسی کے مطابق کانفرنس کے نویں اجلاس (منعقدہ ۲۷ دسمبر ۱۸۹۴ء بمقام علی گڑھ) میں صدر اجلاس نواب محسن الملک کی جانب سے مجلس ندوۃ العلما کی تائید میں تجویز پیش کی گئی جو باتفاق آرا

درہوئی۔ اس تجویز کے الفاظ یہ تھے:

" اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ جلسہ ندوۃ العلماء جو بمقام کانپور منعقد ہوا تھا اور جس میں علماء اور اکابرین جمع ہوئے تھے تمام مسلمانوں کی توجہ کے لائق ہے اور اس کے مقاصد یعنی اصلاح طریقۂ تعلیم اور رفع نزاع باہمی نہایت عمدہ اور مفید ہے اور تمام مسلمانوں کو ایسی عمدہ اور مفید مجلس کی جس سے مسلمانوں کی دینی و دنیوی بہبود مقصود ہے بہ دل و جان قلم سے قدم سے درم سے مدد کرنی چاہیے۔"[34]

دلواب صاحب نے بھی ندوہ کی تائید میں متعدد مضامین کر شائع کر لیے[35]

ندوۃ العلماء کے دوسرے ناظم مولانا حکیم سید عبدالحی و سرسید کے مابین بھی مراسلت جاری رہی۔ ان حالات میں جب کہ سرسید پر اعتراضات و الزامات کا سلسلہ دوروں پر تھا مولانا نے پند و نصائح سے بھرپور اُن کو خط لکھا جس میں خاص طور سے مذہبی عقائد کے باب میں وہ اُن سے ہم کلام ہوئے۔ سرسید نے جواب میں ان کے جذبۂ خیرخواہی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب میں لکھا کر خود اپنے لیے اور سب کے لیے میری یہی دعا ہے "اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین (آمین)"[36]

سرسید کے بعد کے زمانے میں بھی کالج کے سربراہان اور ندوۃ العلماء کے مابین روابط بدستور قائم رہے۔ کالج کے تیسرے سکریٹری نواب وقارالملک ۱۹۰۷ء میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن منتخب کیے گئے۔ نواب صاحب نے اس کے کاموں میں بڑی دلچسپی لی اور اس کے فائدے کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے "وقف کرنا ل" کے

متعدد مواقع میں نواب صاحب کی پیروی و کوششوں سے ندوہ کو کامیابی ملی اور کافی مالی فائدہ ہوا۔ اسی طرح جب صوبجات متحدہ کے گورنر سر انٹونی میکڈانل کو ندوہ سے کچھ بدگمانی ہوئی تو انھوں نے اسے دور کرنے کے لیے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کیا۔ مزید براں نواب صاحب نے اپنے صاحبزادے مشتاق احمد کو تعلیم کی غرض سے ندوہ میں داخل کر دیا۔ گرچہ بیماری کی وجہ سے ان کی تعلیم وہاں مکمل نہ ہو سکی[38]۔ دوسری جانب ارباب ندوہ نے بھی کالج کے ذمہ داروں اور اساتذہ سے رابطہ قائم رکھا اور بعض امور میں ان کا تعاون بھی حاصل کیا۔ علامہ شبلی نعمانی نے ندوہ میں اپنی معتمدی کے دوران (۱۹۰۵–۱۹۱۳ء) پروفیسر یوسف ہارویز (صدر شعبۂ عربی ایم۔ اے۔ او کالج) سے تکمیل ادب کے نصاب کے سلسلہ میں صلاح و مشورہ کیا۔ اسی کورس کے تقریری امتحان کے لیے انھیں ندوہ بلایا[39]۔ مشرقی تعلیم کی اصلاح و ترقی کے لیے گورنمنٹ نے ۱۹۱۱ء میں ایک مشرقی کمیٹی تشکیل دی۔ اس کے ممبران میں علامہ شبلی اور پروفیسر ہارویز دونوں شامل تھے اور دونوں ہی نے اسے اپنا اپنا تعاون پیش کیا۔ اس کمیٹی کے خاص مقاصد یہ تھے:

۱۔ مشرقی و مغربی تعلیم میں اتحاد پیدا کرنا۔

۲۔ اعلیٰ مشرقی تعلیم کے لیے بیش قرار وظائف مقرر کرنا۔

۳۔ مدارس کو مالی امداد فراہم کرنا۔[40]

ندوہ و علی گڑھ کے باہمی تعاون پر یہ واقعہ بھی شاہد ہے کہ علامہ شبلی نے ندوہ کے دو طالب علموں کو وظیفہ دے کر اس مقصد سے علی گڑھ بھیجا کہ وہ عربی شعبہ کے ایک دوسرے ممتاز استاد اور نامور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی سے فلسفہ

علومِ طبیعیہ کی جدید کتاب (الدروس الاولیہ فی العلوم الطبیعیہ) کا درس لیں اور ساتھ ہی کالج کے بیت الآلات کی مدد سے علمِ ہیئت کے میدان میں عملی تجربہ حاصل کریں[۱۴۴] یہاں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ نواب وقار الملک کے زمانے ہی میں جب مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے تحریک شروع ہوئی تو علمار کے دیگر طبقوں کے علاوہ مجلس ندوۃ العلمار نے نہ صرف اس کی تائید کی بلکہ اس کے لیے مالی اعانت بھی پیش کی[۱۴۵]

سرسید اور ان کے رفقار نے دینی مدارس کے علاوہ ایسی انجمنوں اور اداروں سے بھی گہری وابستگی قائم رکھی جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں مذہبی اقدار کی اشاعت، علومِ اسلامیہ کی ترویج اور مسلمانوں کے اجتماعی فلاح وبہبود کے کاموں میں مصروف تھیں۔ سرسید وقتاً فوقتاً ان انجمنوں و اداروں سے خط وکتابت کرنے، اپنے قائم کردہ اداروں وسوسائٹیوں کی کارکردگی سے انھیں واقف کرانے اور مسلمانوں کے اجتماعی مسائل پر اپنے خیالات سے انھیں روشناس بھی کراتے۔ بعض اوقات وہ ان کے جلسوں وپروگراموں میں شریک بھی ہوتے۔ اس نوع کی انجمنوں میں انجمن حمایت اسلام لاہور، انجمن اسلام بمبئی، انجمن اسلامیہ دہلی، انجمن اسلامیہ بریلی، انجمن مذاکرہ علمیہ کلکتہ، انجمن مذاکرہ علمیہ آرہ اور انجمن حمایت اردو پنجاب قابلِ ذکر ہیں[۱۴۶]

قدیم علوم وفنون میں سرسید کی دلچسپی ایک اور پہلو سے دیکھی جا سکتی ہے اور وہ ہے ان کی علمی مصروفیات اور تصنیفی وتالیفی سرگرمیوں کی روشنی میں سرسید نہ صرف یہ کہ جدید علوم وفنون کی اشاعت چاہتے تھے بلکہ وہ اس کے بھی خواہاں وکوشاں تھے کہ ایشیا کے لوگ بالخصوص اہلِ ہند اپنے قدیم علمی ورثہ سے غافل نہ ہونے پائیں اور ان کی حفاظت واشاعت کے لیے اپنی تحقیق وتصنیفی صلاحیتوں کو استعمال کریں تاکہ ان سے استفادہ کا موقع ملتا رہے۔ مختلف علوم وفنون کی اشاعت کے لیے سرسید کی اولین سرگرمیوں میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام شامل ہے جو اصلاً ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں قائم ہوئی تھی اور ایک سال بعد علی گڑھ منتقل ہوئی۔ اس سوسائٹی کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ ایشیا کے قدیم مصنفین کی عمدہ ونایاب کتابوں کا پتہ لگایا جائے اور ان کی تدوین واشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پانچویں اجلاس (منعقدہ ۲۹ر دسمبر ۱۸۹۱ء بمقام الہ آباد) میں بھی اس نوع کی ایک تجویز پاس ہوئی جس کا مفہوم یہ تھا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں جو نایاب کتابیں، قدیم کتبے اور پرانے سکے دستیاب ہیں انھیں اکٹھا کرکے کانفرنس کی زیرِ نگرانی کتب خانہ عجائب گھر میں محفوظ کیے جائیں۔ اس موقع پر سرسید نے اس کی تائید میں جو تقریر کی تھی اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ عمدہ ونایاب کتابوں سے ان کی کیا مراد تھی۔ ان کی تقریر کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"عمدہ ونایاب کتابوں سے میری مراد مثلاً ومذہب عمدہ ملاؤں کی کام کی کتابوں سے نہیں ہے بلکہ ان علمی وتاریخانہ کتابوں سے ہے جو بہت کم یاب ہیں اور جن کے میسر آنے سے تاریخ میں یا علم کی شاخوں میں یا علمائے قدیم کے خیالات معلوم ہونے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے[۱۴۷]"

ظاہر ہے کہ قدیم کتابوں کی حفاظت واشاعت سے پہلے مصنفین کی علمی خدمات سے آنے والی نسلوں کو روشناس کرانے کے علاوہ عربی وفارسی زبان کی ترویج بھی مقصود تھی جن میں زیادہ تر قدیم کتابیں ملتی تھیں۔ مذکورہ

کا دوسرا اہم مقصد مختلف موضوعات پر مغربی مفکرین و دانشوروں کی مفید کتابوں کے اردو ترجمے کا اہتمام تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ کام اہلِ ہند کے لیے جدید علوم و فنون کے میدان میں یورپ کی خدمات سے واقفیت اور ان سے استفادہ کا ذریعہ بنا لیکن اسی کے ساتھ اس سے معروف و مقبول مشرقی زبان اردو کی یہ اہم خدمت انجام پائی کہ یہ مختلف قسم کے علمی و سائنٹفک لٹریچر سے مالا مال ہوئی اور تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، طبیعیات، علم فلاحت، علم مساحت، علم آلات، موسیقیات و سیاست مدن کی کتابیں اردو ادبیات کا حصہ بنیں ہے[۱۴۴]

یہاں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ سرسید فارسی و اردو کی حمایت میں بھی ہمیشہ سینہ سپر رہے اور ہندوستان میں ان کے بقاء و تحفظ کے لیے سرگرمی دکھلاتے رہے ۔ ۱۸۶۷ء میں جب بنارس میں ہندوؤں کے ایک با اثر طبقہ کی جانب سے یہ تحریک شروع ہوئی کہ سرکاری دفتروں و عدالتوں سے اردو زبان و فارسی رسم الخط کو ختم کیا جائے اور اس کی جگہ ہندی بھاشا و دیوناگری رسم الخط کو جاری کیا جائے تو سرسیّد نے اردو کی حمایت میں متعدد مضامین و خطوط لکھے جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے علاوہ دوسرے اخبارات و رسائل میں بھی شایع ہوئے[۱۴۵] انھوں نے بڑے محقق و مدلل انداز میں اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر مخالفین اردو کو خاموش کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۷۳ء میں الہ آباد میں اردو کی حمایت میں ایک بڑا جلسہ ہوا اور مخالفین کی سرگرمیوں کے دفاع کے لیے ایک صدر کمیٹی تشکیل دی گئی اور سرسیّد اس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ سرسید ہی کے مشورہ پر ان کے کچھ دوستوں نے ۱۸۸۲ء میں پنجاب میں "انجمن حمایت اردو" قایم کی تاکہ اردو کی حمایت میں جد و جہد کو اور تیز کیا جا سکے۔ سرسید اس کے پروگراموں میں بھی برابر شریک ہوتے رہے[۱۴۶] اسی طرح جب ۱۸۹۰ء میں حکومت ہند نے فارسی تعلیم کو یونیورسٹی درسیات سے خارج کرنا چاہا تو مختلف حلقوں سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی اور حکومت سے اس فیصلے کی تبدیلی کا مطالبہ کیا گیا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پانچویں اجلاس (منعقدہ ۲۸ دسمبر ۱۸۹۰ء بمقام الہ آباد) میں بھی اس کے خلاف تجویز پاس ہوئی۔ سرسید نے اس موقع پر ایک پر زور تقریر کی اور ان حضرات کو دندان شکن جواب دیا جو حکومت کے موقف کے حامی تھے۔[۱۴۷]

سرسید نے اپنی تحریری صلاحیتوں کو بھی فارسی و اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں صرف کیا۔ سرسید کے علمی تبرکات میں چند فارسی رسائل کے اردو ترجمے کے علاوہ فارسی کی مستقل تصانیف بھی شامل ہیں۔ ان سب سے اہم یہ کہ انھوں نے عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ سے متعلق بعض اہم فارسی مخطوطات (تاریخ فیروز شاہی، آئین اکبری و تزکِ جہانگیری) کی تلاش و جستجو کر کے ان کی تصحیح و تدوین کی اور ان کی اشاعت کا اہتمام فرمایا۔ اس کام میں انھوں نے جس جاں فشانی، لگن و انہماک کا ثبوت دیا اس سے فن تاریخ سے دلچسپی کے علاوہ مسلمانوں کے قدیم علمی سرمائے سے ان کی گہری وابستگی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں سرسید کی معرکۃ الآرا تصنیف آثار الصنادید کا ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا۔ یہ کتاب بنیادی طور پر دہلی کے آثارِ قدیمہ سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس میں دہلی کے مشہور تاریخی مقامات و عمارات کے ساتھ مختلف علوم و فنون کے ماہرین (علما، مشائخ، قرا، شعرا، اطبا، موسیقاران، خطاطان، مصوران وغیرہم) کے بارے میں جو قیمتی معلومات تحقیقی انداز میں فراہم کی گئی ہیں، ان کی روشنی میں اسے بجا طور پر دہلی کی قدیم علمی و تمدنی تاریخ کا مرقع کہا جا سکتا ہے۔[۱۴۸] یہ کتاب بھی سرسید کے تحقیقی ذوق کے علاوہ مسلمانوں کے قدیم علمی، فنی و تاریخی

ورثہ میں ان کی گہری دلچسپی کی غماز ہے۔

اوپر کی تفصیلات کی روشنی میں بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرسید نہ تو مشرقی علوم و ان کے مراکز کے مخالف تھے اور نہ ہی ان کے ترجمانوں و رہنماؤں کے تئیں ان کا رویہ معاندانہ تھا بلکہ انھوں نے ان سب سے تعلق اور میل جول قایم رکھا۔ اس لیے کہ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے مختلف حلقوں سے کوششیں جاری ہوں اور ان سب میں آپس میں نہ صرف تال میل ہو بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا جذبہ بھی فروغ پائے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اہل علم کے مختلف طبقوں اور قدیم و جدید دونوں طرز تعلیم کے ترجمانوں اور دینی مدارس و عصری تعلیم گاہوں سب سے رابطہ قایم رکھا اور اپنے تعلیمی مشن میں ان سے تعاون کے خواستگار ہوئے۔ سرسید کے خطوط و خطبات کے مطالعے سے یہ حقایق بھی سامنے آتے ہیں کہ انھوں نے ان تمام حضرات سے جو ان سے فکری و نظریاتی اختلاف رکھتے تھے بار بار یہ اپیل کی کہ ایم۔ اے او کالج کی توسیع و ترقی اور مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ میں ان کے ساتھ تعاون کریں اور اجتماعی مفاد کے اس کام میں کسی فکری و نظریاتی اختلاف کو آڑے نہ آنے دیں۔ انھوں نے اس ضمن میں بار بار یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ نہ تو وہ اپنے (متنازع فیہ) عقاید و نظریات کو کالج کے اساتذہ و طلباء پر تھوپنا چاہتے ہیں اور نہ ہی دینیات کی درسیات میں انھیں شامل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں[۵۹]۔

واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے میں جس وسیع النظری، کشادہ ظرفی اور صبر و استقلال کا ثبوت دیا وہ یقیناً قابل قدر و لایق اتباع ہے۔ ان کی یہ کشادہ ذہنی علوم و فنون کے باب میں ان کے نقطۂ نظر میں بھی جاری و ساری تھی جیسا کہ معروضاتِ بالا سے واضح ہوتا ہے۔ جدید علوم و فنون کی اشاعت پر زور دینے کے ساتھ وہ قدیم علوم و فنون کے بھی قدر دان تھے اور ان کے تحفظ و بقا کے لیے کوشاں رہے اور بار بار اس حقیقت کو ذہن نشین کراتے رہے کہ مسلمانوں کی ملی شناخت قومی فلاح اور تمدنی و ثقافتی ترقی کے لیے مشرقی علوم و فنون سے رشتہ استوار رکھنا ضروری ہے۔ مزید براں سرسید کے افکار و خیالات اور ان کے تعلیمی مشن کے مختلف مظاہر سے یہ بھی شہادت ملتی ہے کہ وہ قدیم و جدید تعلیم میں امتزاج کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کرتے تھے اور انھیں بخوبی یہ احساس تھا کہ قدیم و جدید دونوں راہوں کو اختیار کیے بغیر مسلمانوں کا کوئی تعلیمی کارواں نہ تو آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ خاطر خواہ کامیابی سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔

## حواشی و مراجع

۱۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید۔ اکادمی پنجاب ٹرسٹ، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۸۳، ۱۰۴، ۱۱۳!!
راجہ طارق محمود، سرسید احمد خاں۔ بک کارنر، اسلم پریس، لاہور، ۱۹۸۸ء ص ۱۹۵ - ۱۹۰، ۲۱۳ - ۲۱۵،
نیز دیکھیے ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی کا مضمون "سرسید کی درسی تعلیم" تہذیب الاخلاق، ج ۹، ش ۱۰، اکتوبر ۱۹۹۰ء
ص ۲۸ - ۳۸

۲۔ سرسید احمد خاں، لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ منشی سراج الدین) لاہور، ۱۸۹۲ء ص ۲۵، خطبات سرسید۔

(مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب، لاہور (بدون تاریخ) ۲/ ۳۶۰ - ۶۱

۳؎ مکاتیب سر سید احمد خاں (مرتبہ مشتاق حسین) فرینڈ بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۶۰ء، ص ۳۱۵-۳۱۶
تہذیب الاخلاق (مضمون سر سید بعنوان "مذہب اور عام تعلیم") ۱/ ۲ - ۱۵ شوال ۱۲۸۷ھ، ص ۹-۱۲

۴؎ علی گڑھ تحریک - آغاز تا امروز (مرتبہ نسیم قریشی) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۶۰ء، ص ۱۱-۱۲ -

۵؎ مکتوبات سر سیّد (مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۲۲۵-۲۲۶

۶؎ خطبات سر سیّد ۲/ ۲۴۹ - ۲۵۰

۷؎ خطوط سر سید (مرتبہ سید راس مسعود) نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۱ء، ص ۱۳۶، نیز دیکھیے خطبات سر سیّد ۲/ ۲۶۴ -

۸؎ مولانا شبلی نعمانی، سفرنامہ روم و مصر و شام، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۴۰ء، ص ۷۷

۹؎ حیات جاوید - ص ۱۴۲ - ۱۴۳، ۱۷۷ - ۱۷۸، خطبات سر سیّد - ۲/ ۸۸ - ۸۹ (تقریر متعلق تاریخ مدرسۃ العلوم مسلمانان) -

۱۰؎ مکاتیب سر سید، ص ۳۲۵ - ۳۲۶. مکتوبہ بہ نام ممبران کمیٹی تعلیم مذہبی) -

۱۱؎ مکاتیب سر سید، ص ۳۲۰ - ۳۲۷ (نیز دیکھیے، ص ۱۰۴ - ۱۰۵)

۱۲؎ تفصیلات کے لیے دیکھیے مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب کا مضمون "مولانا عبداللہ انبیٹھوی" ناموران علی گڑھ (دوسرا کارواں) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۸۶ء، ص ۴۰۶ - ۴۰۷

۱۳؎ خطوط سر سیّد ص ۱۷۳ - ۱۷۴

۱۴؎ خطبات سر سیّد ۲/ ۲۹۷ - ۲۹۸ - مکاتیب سر سیّد، ص ۲۳۱ - ۲۳۳، خطوط سر سید ص ۱۳۶ - ۱۳۷
سید احمد خاں بہادر، تنزل علوم دینیہ، اسٹیم پریس امرت سر ۱۹۱۰ء، ص ۱۵، تہذیب الاخلاق ۲/ ۲۰ ۱۲۸۸ھ ص ۱۸۵ - ۱۸۶

۱۵؎ تہذیب الاخلاق (مضمون سر سیّد احمد بعنوان "تعلیم مذہبی") ۲/ ۲۰ یکم ذی الحجہ ۱۲۸۸ھ، ص ۱۸۶

۱۶؎ خطبات سر سیّد ۲/ ۲۹۴

۱۷؎ محمد امین زبیری، حیات محسن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۳۴ء، ص ۱۰۳ - ۱۰۴

۱۸؎ پروفیسر ہارویز پر تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون "پروفیسر یوسف ہارویز" ناموران علی گڑھ (تیسرا کارواں - دوسرا حصہ) (فکر و نظر کا خصوصی شمارہ) مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۳۱ - ۴۲

۱۹؎ تفصیلات کے لیے ملاحظہ کریں راقم کا مضمون "مولانا فراہی اور علوم جدیدہ" تہذیب الاخلاق ۱۰/ ۵ مئی ۱۹۹۱ء، ص ۲۰ - ۲۸

۲۰؎ خطوط سر سیّد ص ۱۴۲ - ۱۴۳ سید سلیمان ندوی حیات شبلی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء، ص ۱۵۰، ۲۳۸، ۲۴۳ - ۲۴۴، ۲۴۹

۲۱؎ خطوط سر سید، ص ۲۲ - ۲۳ - خطبات سر سید ۲/ ۹۹

ے۲۲ لکچروں کا مجموعہ۔ ص ۱۷۵، ۲۰۸، خطبات سرسید ۲/۳۵۱-۳۵۲، ۳۵۷-۳۵۸-۳۵۹

ے۲۳ حیات جاوید۔ ص ۳۰۱-۳۰۲- مرقع کانفرنس (مرتبہ انوار احمد مارہروی) علی گڑھ ۱۹۳۵ء ص ۷

ے۲۴ مذہبی و مشرقی تعلیم کی اشاعت کے لیے کانفرنس کی سرگرمیوں اور اس سے متعلق مختلف اجلاس کی روداد کے خلاصے کے لیے ملاحظہ فرمائیں پروفیسر افتخار الواسع صاحب کی کتاب "سرسید کی تعلیمی تحریک (آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک اجمالی مطالعہ)" مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۳۱-۴۳، ۶۳-۶۵، ۷۰-۷۳-

ے۲۵ مطبوعہ اردو بازار، اسٹیم پریس، امرتسر، ۱۹۱۰ء

ے۲۶ خطوط سرسید ص ۱۳۶

ے۲۷ سرسید کی تعزیتی تحریریں (مرتبہ اصغر عباس) ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء، ص ۱۶

ے۲۸ پروفیسر خلیق احمد نظامی، سرسید اور علی گڑھ تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۲ء، ص ۴۷

ے۲۹ سرسید اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تعلقات و روابط پر تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں، ڈاکٹر محمد اعظم قاسمی، سرسید اور مولانا قاسم نانوتوی۔ تہذیب الاخلاق ۹/۱۰- اکتوبر ۱۹۹۰ء ص ۱۵-۲۰

ے۳۰ وقار حیات (زیر نگرانی محمد مقتدیٰ خاں شروانی) مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۲۵ء ص ۵۰۸

ے۳۱ حیات محسن ص ۷۳

ے۳۲ مکاتیب سرسید، ص ۲۳۱-۲۳۳- خطبات سرسید ۲/۲۹۷-۲۹۸

ے۳۳ خطوط سرسید، ص ۱۷۱، مکتوبات سرسید، ص ۶۵۱

ے۳۴ محمد اسحاق جلیس ندوی، "تاریخ ندوۃ العلماء"، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، ۱/۱۰۸

ے۳۵ حیات محسن، ص ۱۰۲-۱۰۳

ے۳۶ مکتوبات سرسید، ص ۶۳۹-۶۴۰

ے۳۷ وقار حیات، ص ۶۰۸-۶۰۹

ے۳۸ مکاتیب شبلی، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۲۷ء، ۲/۳۶، ۱۴۴

ے۳۹ حیات شبلی ص ۵۱۶

ے۴۰ مکاتیب شبلی ۲/۲۹، حیات شبلی ص ۳۲۴

ے۴۱ وقار حیات ص ۵۵۳

ے۴۲ مکاتیب سرسید ص ۲۰۵-۲۰۸، خطوط سرسید، ص ۹۰، ۱۶۷-۱۶۸، مکتوبات سرسید، ص ۶۴۶-۶۴۷، خطبات سرسید ۲/۱۴۱

ے۴۳ خطبات سرسید ۲/۲۰۶-۲۰۷

ے۴۴ تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک، محولہ بالا، ص ۱۴۳-۱۶۴

عبد الحق، مطالعۂ سر سید احمد خاں۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۵۹ء، ص ۱۴۴-۱۵۱

۵۱؎ حیاتِ جاوید۔ ص ۱۹۲ - ۱۹۷، مکتوباتِ سر سید ص ۲۹ - ۳۴

۵۲؎ راجہ طارق محمود، سر سید احمد خاں ص ۲۵۶ - ۲۵۹، ۳۰۱ - ۳۰۲

۵۳؎ خطباتِ سر سید، ۲/ ۱۷۳ - ۱۸۳

۵۴؎ ملاحظہ فرمائیں آثار الصنادید کا نیا ایڈیشن (مرتبہ خلیق انجم) جلد دوم۔ اردو اکادمی دلی نئی دہلی، ۱۹۹۰ء

۵۵؎ مثال کے طور پر دیکھیے مکاتیبِ سر سید۔ ص ۹۱ - ۹۴، ۱۰۳ - ۱۰۵، ۳۱۸، ۳۳۱ - ۳۳۴ خطباتِ سر سید، ۲/ ۲۵۴ - ۲۵۶، ۲۹۰ - ۳۰۱۔

"شیریں زبانی بھی انسان کے واسطے ایک نہایت عمدہ صفت ہے اور تہذیبِ انسان کا ایک بڑا رکن۔ یہ وہ جوہر ہے جس کے ذریعے سے انسان بغیر استعانت زور اور زر کے دوسرے انسانوں کی طبیعت پر غالب آسکتا ہے اور اپنے خیالات کو دوسروں کے ذہن میں بٹھلا سکتا ہے۔ فصاحت اور بلاغت بلکہ ہر قسم کے صنایع اور بدایع جو انسان کے کلام کے بڑے بڑے رکن ہیں اور جن کے سبب سے آدمی بڑا قابل اور فصیح اور ادیب یا ایک بہت بڑا شاعر مشہور ہو سکتا ہے۔ ان سب کمالات کا صلہ اکثر اوقات صرف زبانی مدح و ثنا سے کافی طور پر ادا ہو جاتا ہے لیکن وہ کلام جس سے انسان کسی قدر کچھ کام نکال سکتا ہے اور دوسروں کو اس کے ذریعے سے اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے وہ درحقیقت اس قسم کا کلام ہوتا ہے جس میں شیرینی ہو۔ میٹھا بول ناد شمنوں کو بھی دوست بنا لیتا ہے اور برخلاف اس کے تلخی سے اپنے بھی بیگانے ہو جاتے ہیں اور بہت سے کیے کرائے کام ملیا میٹ اور سگے بگڑے ہو جاتے ہیں۔"

**وقار الملک**

# شرائط ایجنسی

## ماہنامہ تہذیب الاخلاق اور نشانت

مئی ۱۹۹۲ء سے شرائط ایجنسی حسبِ ذیل ہیں۔

۱- ۵ رسالہ سے کم کی خریداری پر ایجنسی نہیں دی جائے گی۔

۲- ۵ سے ۲۰ عدد تک رسالہ منگانے پر کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔

۳- ۲۱ سے ۴۰ عدد تک رسالہ منگانے پر کمیشن ۳۰٪ ہوگا۔

۴- ۴۱ یا ۴۱ سے زیادہ رسالہ منگانے پر کمیشن ۳۵٪ ہوگا۔

۵- ڈاک خرچ ادارہ ادا کرے گا۔

۶- ہر ماہ کا رسالہ بذریعہ وی پی ارسال کیا جائے گا۔ وی پی واپس آنے کی صورت میں ایجنسی منسوخ کر دی جائے گی اور دوبارہ شروع کرانے پر پچھلے شمارے اور ڈاک خرچ کی رقم دینی ہوگی۔

۷- اگر کسی وجہ سے آپ اپنی ایجنسی چند ماہ یا ہمیشہ کے لیے بند کرانا چاہتے ہیں تو وقت پر ادارہ کو اطلاع دیں۔

شکریہ
انچارج سرکولیشن
تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۱۱، شمارہ ۶ (جون ۱۹۹۲)

## بیسویں صدی کی آخری دہائی میں

# مسلم قیادت — مسایل اور ذمّہ داریاں

محمد جنید خان ○

بیسویں صدی تاریخی اعتبار سے دنیا کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس صدی نے اپنی ترقی میں وہ عروج حاصل کیا جو پیشتر ذہن کے نہاں خانے میں جگہ بھی نہیں پاسکتا تھا۔ انسان نے زمین سے چھلانگ لگائی تو چاند پر کمندیں ڈال دیں اور دوسرے سیاروں کی کھوج کے لیے نئے ولولے، تازہ حوصلے اور عزم صمیم کے ساتھ اپنی مہمات روانہ کردیں۔ ذہن نے نئی کروٹ لی تو کمپیوٹر اور ٹیوب بے بی جیسی اشیاء دنیا کے لیے پیش کردیں اور جب تخریب کاری کی طرف اس کا ذہن متوجہ ہوا تو نت نئے تباہ کن ہتھیار ایجاد کرلیے اور دو عظیم جنگیں برپا کرکے کروڑوں لوگوں کی جانوں کا ضیاع کیا اور ابھی مزید کتنی تباہ کاریاں اس کی تخریبانہ ذہنیت دنیا کے لیے لائے گی اس کے تصور سے بھی انسانی ذہن کانپ جاتا ہے۔

بیسویں صدی ہندوستان کے لیے بھی کئی اعتبار سے اہم ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال کے جبر و استبداد کے بعد سلطنت برطانیہ کے اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ ہمیں آزادی ملی۔ بہت سے حسین خواب دیکھے تھے اس آزادی کے لیے، ہزاروں لوگوں نے قربانی دی تھی، لاکھوں بچوں نے یتیمی کا لباس پہنا تھا بے شمار عورتوں نے اس عظیم آزادی کے لیے اپنا سہاگ قربان کردیا تھا لیکن یہ آزادی اپنے ساتھ تباہی اور بربادی کا وہ عظیم سیلاب لائی جس میں ایک بار پھر لاکھوں انسانوں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا۔ لاکھوں بچے یتیم اور لاتعداد ماؤں کی گودیں سونی ہوگئیں۔ رواداری، خلوص اور اخلاق کی پاسداری کے تمام رشتے مٹ گئے۔ بھائی بھائی کا دشمن ہوگیا۔ کل تک جو ہاتھ برطانوی سامراج کی اینٹ سے اینٹ بجانے اور اس کو دیس سے نکال باہر کرنے کے لیے اٹھے تھے وہ اب اپنے ہی ہم وطنوں اپنے ہی ہمسایوں کو خاک و خون میں ملانے کے لیے مصروف عمل ہوگئے۔ مہاجرت کے طویل اور تھکا دینے والے سلسلے نے لاکھوں لوگوں کو اپنا وطن، گھربار، زمین، اعزہ و اقارب کو چھوڑ کر دیار غیر میں پناہ لینے پر مجبور کردیا۔ اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کی انتہا یہ ہوئی کہ چند جنونی اور حواس باختہ افراد کی سازشوں نے ہم سے وہ عظیم رہنما

○ محمد مشاہد آبیر، ایس ایس ہال (نارتھ)، اے ایم یو علی گڑھ

بھی چھین لیا جس نے ہمیشہ اہنسا کو اپنا ہتھیار بنایا جس
نے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بھی تشدد سے گریز کیا
جن کے عدم تشدد کا یہ عالم تھا کہ آزادی کے حصول کے
بعد اس ملک نے ان سرکاری لوگوں سے بھی کوئی انتقام نہیں
لیا جنھوں نے اپنے غیر ملکی آقاؤں کے حکم پر ان پر
جبر و تشدد کیا تھا۔ لیکن مہاتما گاندھی بھی چند جنونی افراد
کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ اس ملک
میں رہنے والے ہر فرقے، مذہب اور عقائد و نظریات
کے لوگ آپس میں میل و محبت سے رہیں، مذہب
اور فرقے کے نام پر کوئی گھر نہ اجاڑا جائے اور
لوگ جس طرح حصول آزادی سے قبل رہتے چلے آرہے
تھے اسی سکون و اطمینان کے ساتھ رہتے رہیں۔

مسلم قیادت کے عاجلانہ اور غیر دانش مندانہ
فیصلوں اور اکثریت کے بعض فرقہ پرستانہ ذہنوں نے
جہاں ملک کو دو لخت کیا تھا وہیں اس ذہنیت
نے نفرت کی دیواروں کو بلند تر کرنا شروع کر دیا مسلم
قیادت میں وہ رہنما جو اس تقسیم کے سخت مخالف
تھے اور جو چاہتے تھے کہ فرقہ پرست ذہنوں کو یک و تنہا
کرنے کے لیے عوامی بیداری پیدا کی جائے اور اپنے حق
میں رائے عامہ کو ہموار کیا جائے وہ اپنی کوششوں
میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس ناکامی کے اسباب کا
پتہ لگانے کے لیے ایک طویل مقالہ درکار ہے۔ مختصراً
یہ عرض کرنا کافی ہے کہ مسلم قیادت کے غیر دانش مندانہ
فیصلے اور اکثریت کے بعض افراد کی ہٹ دھرمی نے ملک
کے جغرافیے کو تبدیل کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

آزادی کے بعد سے آج تک مسلم قائدین
اور مسلم عوام کے درمیان ایک کشاکش رہی ہے۔
آزادی کے رہبران اول میں مولانا آزاد سے مسلمانوں
کو یہ شکایت رہی ہے کہ انھوں نے حکومت ہند
کے ایک ذمہ دار اور با اختیار وزیر ہونے کے باوجود
مسلمانوں کے عام مسائل کی طرف توجہ نہیں دی۔ اگر
وہ چاہتے تو بہت سے عوامی مسائل کی طرف توجہ کر کے
ان کو حل کر سکتے اور کرا سکتے تھے۔ انھوں نے عام
آدمی سے اپنا رابطہ نہیں رکھا صرف مخصوص لوگوں کے
ساتھ ان کے رابطے نے ان کو عوامی مسائل سمجھنے کی مہلت
ہی نہیں دی۔ دہلی ہی میں مسلمان آلام و مصائب
میں مبتلا رہے لیکن مولانا آزاد ان کے لیے کچھ زیادہ
نہ کر سکے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے مسلمان اس بات کے
شاکی رہے کہ انھوں نے ہندوستان کے اعلیٰ ترین
عہدے 'صدر جمہوریہ' پر فائز ہونے کے باوجود اردو
زبان کے لیے کچھ نہیں کیا جب کہ وہ پہلے اس کے
لیے بہت فکر مند رہا کرتے تھے۔

اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں:

اس صدی کے آخری دہے میں مسلم قیادت
کا رخ کیا ہونا چاہیے، اس پر نظر ڈالنے کی ضرورت
ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اس وقت ملک
جس نازک دور سے گزر رہا ہے اور جس مقام پر
آج ہم کھڑے ہیں وہ ہماری بقا اور فنا دونوں کے
لیے ایک سوالیہ نشان ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمیں
اس ملک میں عزت و آبرو کے ساتھ رہنا ہے یا
ذلیل و خوار ہو کر زندگی گزارنا ہے۔ ہمیں اپنی پہچان
اور شناخت باقی رکھنا ہے یا زمانے کی ٹھوکروں،
حالات کے تھپیڑوں اور مصائب و آلام کے طوفانوں
کی زد پر رہنا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا
جواب ہمیں ہی دینا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مسلم قیادت
اتنی ناکارہ ہے کہ اس میں مسائل کو حل کرنے کی
صلاحیت نہیں ہے یا وہ حالات سے نبرد آزما

کی اہلیت نہیں رکھتی ۔ بلکہ اس میں بعض ایسے مخلص
لوگ ہیں جن کے دل قوم کی ہمدردی سے معمور ہیں جو
قوم کی زبوں حالی، افلاس، غربت اور تعلیم کے میدان
میں ان کی ناگفتہ بہ حالت پر متفکر رہتے ہیں اور قوم
کو قعر مذلت سے نکالنے کے لیے تدابیر سوچتے رہتے
ہیں ۔ اپنے مضامین میں قوم کو اچھی چیزوں کے اختیار
کرنے، تعلیمی عمل کو آگے بڑھانے، زبان کو فروغ دینے
اور صالح روایات کو فروغ دینے کے لیے ابھارتے
رہتے ہیں ۔ لیکن ایسے مخلص لوگ بہت کم ہیں ۔ مسلم
قوم میں جذباتیت غالب اور سوجھ بوجھ مغلوب ہو رہی
ہے ۔ آپس کی چپقلش، فکری اختلافات اور نظریاتی
جھگڑے اس قدر شدت اختیار کر چکے ہیں کہ ہر گروہ
ذاتی اغراض و مفاد کو ملت کے مسائل پر مقدم رکھتا
ہے اور نتیجۃً اس سے مخالفین کو فوائد حاصل
ہوتے ہیں ۔

ملک کے حالات جس قدر تیزی سے بدل
رہے ہیں اور ووٹ کی سیاست جو بہت سے نئے
مسائل کو جنم دے کر ملک میں فرقہ وارانہ منافرت
کا سبب بن رہی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں
ہے ۔ مندر مسجد کے مسئلے نے اقلیت اور اکثریت
کے درمیان جو خلیج پیدا کر دی ہے وہ برابر وسیع ہوتی
جا رہی ہے ۔ مخصوص نقطۂ نظر اور انداز فکر کی
پارٹیاں ذاتی مفاد اور اقتدار کے حصول کے لیے ہی
اس مسئلہ کو بڑے منظم طور پر ابھارا دے رہی ہیں
دوسری جانب مسلم قائدین اجتماعی مسائل پر بھی
فروعی اور نظریاتی اختلافات میں پھنسے ہوئے ہیں ۔
ہر قائد اپنے کو قوم کا سچا ہمدرد جانتا ہے، دوسرے
کو ضمیر فروش، ملت فروش اور ایمان فروش
جیسے القابات سے نوازتا ہے ۔ اور یہ ہمدردیاں

کی خرید اور ضمیروں کے فروخت میں ملت کے بہت
سے مسائل پر دبیز چادر چڑھ جاتی ہے اور ملت اپنے
ساتھ کیے گئے وعدوں کے وفا کرنے کے انتظار میں
بے یار و مددگار امداد غیبی کی منتظر رہتی ہے ۔

پچھلے دنوں یاتراؤں کے ذریعے اقلیت اور
اکثریت کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کی کوشش
کی گئی، ریزرویشن کے نام پر ہزاروں طلبا طالبات
کی زندگیوں کو داؤں پر لگا دیا گیا ۔ نسلی، صوبائی
اور علاقائی عصبیت کو ہوا دی گئی جس کا سلسلہ
ختم نہیں ہوا ہے ۔ اربوں روپے کا سرکاری نقصان
کیا گیا تاکہ ملک کے حالات کو اپنے موافق کیا جا سکے ۔

مسلمانوں کے لیے اردو کا مسئلہ بھی بہت
اہمیت کا حامل ہے ۔ اس کے لیے حکومت کی جانب
سے وقتاً فوقتاً وعدے کیے جاتے رہے ہیں لیکن
یہ مسئلہ کا حل نہیں ہے ۔ مسئلہ کا حل صرف یہ ہے
کہ مسلمانوں کو اس کے لیے عملی اقدامات کرنے چاہییں
وہ اقدامات یہ ہیں کہ گھر میں اپنے بچوں کو اردو زبان
کی تعلیم دیں ۔ اردو کے رسائل اور اخبارات خریدیں
ہر شہر اور قصبے میں اردو میڈیم اسکول قائم کریں اور
جہاں اسکول پہلے سے موجود ہیں ان کے تعلیمی نظام
کو بہتر بنائیں ۔ اچھے ادیبوں اور نثر نگاروں کو انعامات
سے نوازیں ۔

تعلیم کے میدان میں مسلمان دیگر قوموں
سے بہت پیچھے ہیں ۔ مقابلے اور مسابقت کا جذبہ ان
میں کم ہوتا جا رہا ہے ۔ جہاں مسلم ادارے قائم
ہیں ان کا تعلیمی معیار زیادہ اچھا نہیں رہتا ۔ آپس
میں مینیجنگ کمیٹی اور پرنسپل کے درمیان اختلافات
عام ہیں ۔ اسکول کے دیگر اساتذہ پر بھی اس کا منفی
اثر مرتب ہوتا ہے جس کی وجہ سے تعلیم متاثر ہوتی ہے

ساتھ ساتھ طلبا بھی اس سیاست اور اختلافات کا شکار ہوتے ہیں۔ ہمیں تعلیمی اداروں کی طرف توجہ دینا ہوگی۔ آپس کے اختلافات کو مٹا کر اداروں کی بھلائی اور فروغ کے لیے کام کرنا ہوگا۔ مینیجنگ کمیٹی اس کا خیال رکھے کہ اساتذہ دلچسپی اور دل جمعی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کریں۔ اساتذہ اس بات پر دھیان دیں کہ ان کے اور طلبا کے درمیان رشتہ باپ اور بیٹے کی طرح ہو۔ جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کی تعلیم کی طرف سے متفکر رہتا ہے اور اس کے لیے تعلیمی مواقع کو بہتر بنانے پر متوجہ رہتا ہے اسی طرح کا رویہ اساتذہ اور طلبا میں ہونا چاہیے۔ طلبا کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کی عزت اسی طرح کریں جس طرح وہ اپنے والدین کی عزت کرتے ہیں۔

قائدین اور ملت کے رہنماؤں کی بھی بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ آپس کے اختلافات، چاہے وہ نظریاتی ہوں یا مسلکی، عوام کے سامنے ان کا برملا اظہار نہ کریں۔ آپ کا تعلق کسی بھی جماعت، کسی بھی پارٹی، کسی بھی صوبے یا علاقے سے ہو، ملت کے مسائل کے حل کرنے کے لیے آپ تمام اختلافات اور نظریات کو بالائے طاق رکھ دیں اور الگ الگ راگ اور جدا جدا سُر میں گانے کے بجائے صرف ایک ہی نظریہ رکھیں کہ انھیں ملت، قوم اور ملک کی خدمت کرنا ہے۔ ہمارے بعض رہنما ایسے ہیں جنھوں نے سیاست اور مذہب کو اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ بہت سی سیاسی برائیاں مذہب کا ایک جزو معلوم ہونے لگتی ہیں جن کے سبب مذہب کی تصویر اقوام غیر میں کچھ بھلی نہیں لگتی۔ جذباتی اور غیر ذمہ دارانہ بیانات بھی ہمارے مسائل کو مزید الجھا دیتے ہیں جس سے بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان سب سے پرہیز کیا جانا چاہیے تاکہ صالح روایات ہماری قوم کا جزو بن جائیں اور ہم فخر کے ساتھ کہہ سکیں کہ مذہب اور سیاست کوئی جداگانہ چیزیں نہیں ہیں۔

پچھلے دنوں ملت میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے ایک اچھی شروعات کی گئی کہ تعلیمی کارواں جس کی قیادت قوم و ملت کا درد رکھنے والے شخص جناب سید حامد نے کی۔ یوپی میں اس قافلے نے جس طرح بیداری قوم کا کام کیا ہے اس سے یہ توقعات بندھی ہیں کہ آئندہ مسلم قوم میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے لیے مزید کوششیں شروع کی جائیں گی۔ سید حامد صاحب کی یہ کوششیں کہ ملت میں تعلیم کی بیداری ہو، مقابلہ جاتی امتحانات کی اور اردو کے تحفظ اور بقا کی روح پھونک دی جائے ایک فال نیک ہے جس پر ہم سب کو لبیک کہنا چاہیے۔ آج سے تقریباً سو سال قبل جس سید احمد نے قوم میں بیداری پیدا کی تھی آج ایک سید حامد اس میں روح پھونکے۔

> "انسان اپنے لیے سب سے بڑا استاد ہے۔ دنیا کے تمام واقعات اس پر گزرتے ہیں اور ان کے اثرات سے جیسا وہ واقف ہوتا ہے دوسرا کوئی واقف نہیں ہوتا اور انسان سے اس کو عبرت پکڑنے کا سب سے زیادہ موقع ہوتا ہے"
>
> سرسید

اترپردیش کے ایک سو چالیس اداروں میں بورڈ امتحانات کے نتائج پر

# پانچ سو ننانوے ہونہار بچوں کو شیروانی انعامات ۱۹۹۱ء

احمد رشید شیروانی ▽

اترپردیش کے مندرجۂ ذیل ہائی اسکولوں سے بورڈ امتحان ۱۹۹۱ء کے رزلٹ آنے پر ان اسکولوں کے ہونہار ترین طلبا و طالبات کے لیے الحاجہ بیگم تارا رشید شیروانی صاحبہ (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ و جیب انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے دلی دعاؤں کے ساتھ انعامات بھیجے گئے۔

ایم آر شیروانی ہائر سکنڈری اسکول
گنج ڈنڈوارا - ضلع ایٹہ

۱- محمد نسیم خاں سلمہٗ ۲- سکلبان سنگھ سلمہ ۳- نسیم عالم خاں سلمہ ۴- مبارک علی بیگ سلمہ ۵- مقدس علی خاں سلمہ ۶- سلطان عالم سلمہٗ ۷- اودھیش کمار سنگھ سلمہٗ۔

میونسپل ہائر سکنڈری اسکول مبر مد

۱- خلیق احمد سلمہٗ۔ ۲- محمد عامر خاں سلمہٗ۔ ۳- عظیم احمد خاں سلمہ۔

سرسید احمد ہائر سکنڈری اسکول مبر مد ضلع مونپور

۱- ابرار احمد سلمہٗ۔ ۲- بسلطان احمد سلمہٗ۔

۳- احتشام النور سلمہٗ۔

منگر الوائی ہائر سکنڈری اسکول ضلع اعظم گڑھ

۱- امر جیت یادو سلمہٗ۔ ۲- کنٹوار وورام سلمہٗ۔ ۳- منی لال سلمہٗ۔

گاندھی فیض عام ٹیکنیکل ہائر سکنڈری اسکول، شاہجہاں پور دیہات

۱- محمد یونس خاں سلمہٗ۔ ۲- پردیپ کمار سلمہٗ ۳- سنیل کمار سلمہ

فضل رحمانیہ ہائر سکنڈری اسکول پچپیڑوا - ضلع گونڈا

۱- ارشد حبیب خاں سلمہٗ ۲- محمود احمد سلمہٗ۔ ۳- کماری شبینہ بانو سلمہا۔

حافظ صدیق نیشنل ہائر سکنڈری اسکول۔ جھانسی

۱- ظہیر الدین خاں سلمہٗ۔ ۲- عظیم حسین سلمہٗ۔ ۳- نوشاد خاں سلمہٗ

قدوائی بالکا ہائر سکنڈری اسکول۔ البان شہید ضلع اعظم گڑھ

۱- کماری تنویر جہاں سلمہا ۲- کماری عاذیہ بانو سلمہا ۳- کماری تحسین فاطمہ سلمہا

رفیع میموریل گرلز ہائر سکنڈری اسکول سیمل ضلع بارہ بنکی

۱- کماری پرتبھا شرما سلمہا۔ ۲- کماری سرلتی دیوی سلمہا

کماری سنیتا دیوی سلمہا

قدسیہ عظمیٰ بیگم گرلز ہائر سکنڈری اسکول

فیروز آباد ۔ آگرہ

۱۔ کماری تبسم سلمہا ۔ ۲۔ کماری دانش سلمہا

۳۔ کماری گلناز سلمہا

قاسمیہ ہائر سکنڈری اسکول

نجیب آباد ۔ ضلع بجنور ۔

۱۔ خالد اقبال سلمۂ ۔ ۲۔ سیوارام سلمۂ

اینگلو اورینٹل کالج ہائر سکنڈری اسکول

وارانسی ۔

۱۔ شمس الدین سلمۂ

اے ۔ ڈبلیو فیض عام ہائر سکنڈری اسکول

امروہہ ۔ ضلع مراد آباد

۱۔ آصف خاں سلمۂ

ہائر سکنڈری اسکول

رسول آباد ۔ ضلع سلطان پور

۱۔ مقصود احمد خاں سلمۂ

اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول

لکھیم پور کھیری

۱۔ محمد سلیم خاں سلمۂ

مولانا آزاد ہائر سکنڈری اسکول

گورکھپور ۔

۱۔ اجمل حسین سلمۂ

اے وحید خاں ہائر سکنڈری اسکول

شاہجہاں پور

۱۔ فراست علی سلمۂ

ایچ آر گرلز ہائی اسکول ۔

خورجہ ۔ ضلع بلند شہر

۱۔ کماری خدیجہ تحسین سلمہا ۔

ہائر سکنڈری اسکول چک بھٹو

ضلع شاہجہاں پور

۱۔ مہندر پال سنگھ سلمۂ ۔

ترکی ہائر سکنڈری اسکول

پلوا ۔ ضلع مراد آباد

خالد حسین سلمۂ ۔

ہر ایک اسکول میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ اوّل پوزیشن حاصل کرنے والے نمبر ۱ کو ڈھائی سو روپیہ، دوسری پوزیشن نمبر ۲ کو ڈیڑھ سو روپیہ اور تیسری پوزیشن نمبر ۳ کو سو روپیہ بطور انعام بھیجا گیا آخری دو اداروں میں کوئی فرسٹ ڈویژن نہیں لایا اس لیے سکنڈ ڈویژن میں فرسٹ پوزیشن لانے والے طالب علم کو دو سو روپیہ بطور انعام بھیجا گیا۔

اس طرح مندرجہ بالا بیس اسکولوں میں پینتالیس ۴۵ ہونہار ترین طلباء و طالبات کے لیے انعامات بھیجے گئے۔ اس سے پہلے (بہنوں میں ایک سو پانچ ۱۰۵ انعامات پھر بیس میں نواسی۔ پھر بتیس میں ستانوے پھر پندرہ میں سینتالیس ۴۷ پھر پندرہ میں اڑتالیس۔ پھر دس میں اٹھتر، پھر بیس میں ننانوے یعنی کل) ایک سو بیس اداروں کے پانچ سو چون ہونہار ترین طلباء و طالبات کے انعامات کی بابت رپورٹیں پیش کی جا چکی ہیں۔ لہٰذا اب تک اس رپورٹ سمیت اتر پردیش کے ایک سو چالیس اداروں میں پانچ سو ننانوے ہونہار ترین بچوں کو انعامات کی بابت رپورٹیں اخبارات کو بھیجی جا چکی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اتر پردیش کے ہمارے جن اداروں کے پرنسپل صاحبان یا صاحباؤں نے ابھی تک سنہ ۱۹۹۱ء کا نتیجہ نہیں بھیجا وہ آخر کون سی شبھ گھڑی کے انتظار میں ہیں۔ ان اداروں کے منیجر، سکریٹری، صدر

اور نائب صدر صاحبان وغیرہ بھی براے کرم فوراً توجہ عنایت فرمائیں۔

چند ایک ادارے ایسے بھی ہیں جہاں سے ۱۹۹۱ء کا نتیجہ آگیا ہے لیکن ابھی تک انعامات نہیں بھیجے گئے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ کچھ معلومات نامکمل یا ناقص تھیں اور اس بابت پرنسپل صاحب یا صاحبہ کو خط لکھا گیا تو انھوں نے ابھی تک توجہ نہیں فرمائی۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کچھ اور کاغذات (مثلاً گزشتہ انعامات کی رسید) کے لیے پرنسپل صاحب یا صاحبہ کو لکھا گیا اور انھوں نے ابھی تک توجہ عنایت نہیں فرمائی۔ اگر ایسی کوئی وجہ نہیں اور پھر بھی کسی ایسے موقر ادارے کے ہونہار ترین طلبا یا طالبات کے لیے انعامات نہیں پہنچے جہاں سے رزلٹ بھیجا گیا تھا تو اس ادارے کے پرنسپل صاحب یا صاحبہ براے کرم فوراً یاد دہانی فرمادیں

" سرسید مرحوم اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قایم نہیں کیا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس حلقے کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور اس کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے کسی موقت الشیوع رسالہ نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں گے جیسے کہ "تہذیب الاخلاق" سے مرتب ہوے۔ یہ رسالہ انھوں نے انگلستان کی سیاحت کے بعد نکالا تھا اور اس میں ان کے حلقے کے رفیقوں کے مضامین نکلا کرتے تھے۔ فی الحقیقت جدید اردو علم و ادب کی بنیادیں اسی رسالے نے استوار کیں اور اس قابل بنا دیا کہ آج ہر طرح کے علمی اور ادبی مطلب ادا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو گئی ہے اس عہد کا شاید ہی کوئی قابل ذکر اہل قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقے کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔"

مولانا آزاد


"میری اصلی پسند!
رُوح افزا مِلک شیک!"
روح افزا مِلک شیک بے شبہ انتہائی مزے دار اور
تازگی بخش ہے، اس کے ساتھ یہ صحت افزا بھی ہے۔
جب بھی آپ کا بچہ دودھ پیئے، اس میں چینی کے بجائے
روح افزا ڈالیے اور دیکھیے، دودھ کیا سے کیا بن جاتا ہے!
مِلک شیک کے علاوہ دہی کی لسی، آئس کریم، فالودہ،
کسٹرڈ اور لیموپانی میں بھی ہمیشہ روح افزا ڈالیے!
جڑی بوٹیوں، زندگی بخش عناصر اور قدرتی وٹامنوں کا نادر مرکب
رُوح افزا
۸۵ سال سے زیادہ مدت سے سب کا من پسند شربت
ہمدرد

بانی
سرسید احمد خان

MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER
# تہذیب الاخلاق

جلد ۱۱ — شمارہ ۷

جولائی ۱۹۹۲ء

سرپرست
**پروفیسر محمد نسیم فاروقی**
وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر
**کبیر احمد جائسی**

انچارج کمپوزنگ
شفیق احمد

تزئین
سرفرازی

نائب مدیر
شباب الدین

مقالہ وغیرہ بھیجنے کا پتہ:
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق [illegible]
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ، انڈیا
(202002)

| | | |
|---|---|---|
| زر سالانہ: | انڈیا | Rs. 45.00 |
| * | بیرونی ممالک | US $ 20.00 ہوائی ڈاک |
| * | | US $ 8.00 عام ڈاک |

PHONE. 24827

ترسیل زر کا پتہ:
ناظم تہذیب الاخلاق [illegible]
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

EDITOR,
TAHZIBUL AKHLAQ [illegible]
[illegible],
ALIGARH MUSLIM
UNIVERSITY, ALIGARH.

# مندرجات



[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]


مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، پریس: اے ایم یو پریس علی گڑھ

# اداریہ

ایک دوسرے سے ملنا ملانا، دید و باز دید، خوشی و غم کے موقع پر ایک دوسرے کا شریک و پرسانِ حال ہونا، یہی وہ انسانی اعمال ہیں جو حیوانِ ناطق کو حیوانِ مطلق سے ممتاز و متمائز کرتے ہیں اور انہی اعمال کے مجموعے کو آدابِ معاشرت کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر غائر نظروں سے دیکھا جائے تو ہماری زندگی کے بیشتر لمحات آدابِ معاشرت کے گرد گھومتے نظر آئیں گے۔ جس سماج میں آدابِ معاشرت کا احترام کیا جاتا ہے اور اس سے روگردانی کو ایک جرم سمجھا جاتا ہے، اس سماج میں فرد کی انفرادیت محفوظ رہنے کے ساتھ ساتھ فرد و جماعت کا رشتہ مستحکم اور استوار ہوتا ہے لیکن جس میں آدابِ معاشرت کا احترام نہیں کیا جاتا اس میں نفسا نفسی عام ہو جاتی ہے اور فرد کا جماعت سے سارا رشتہ کاروباری ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہم کو اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اب اپنی کاروباری رشتوں میں بندھے اپنی زندگی کے دن جیسے تیسے پورے کر رہے ہیں۔

اجتماعی دعوتوں کا رواج دنیا کی تقریباً ہر قوم میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ ان دعوتوں میں شرکت کے کچھ آداب ہیں جو آدابِ معاشرت ہی کا ایک جزو ہیں اور ہر قوم اپنے اپنے آدابِ معاشرت کے مطابق ان پر عمل پیرا ہو کر اجتماعی دعوتوں سے لطف اندوز ہوا کرتی ہے مگر آدابِ معاشرت کی گرفت کمزور ہونے کی وجہ سے ہم ہندوستانیوں کے لیے یہی اجتماعی دعوتیں ایک عذاب بنتی جا رہی ہیں۔ جہاں آج بھی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے کا رواج ہے وہاں بھی آدابِ معاشرت کی گرفت کی کمزوری سے دسترخوان میدانِ کارزار بن جاتا ہے۔ جس کے سامنے جو ڈونگا آیا اس نے اس پر قبضہ کر لیا اور اپنی پلیٹ میں اتنا سالن نکال لیا جس کو وہ اپنے گھر میں چار وقتوں کھاتا۔ ابھی کچھ لوگوں تک کھانا پہنچا بھی نہیں ہے کہ ایک طرف کے لوگوں کی منہ کی چکی اس تیزی سے چلنی شروع ہو جاتی ہے کہ برقی مشین بھی اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔ چکی کے دونوں پاٹوں کے درمیان جو ہڈیاں آتی ہیں ان کو برقی رفتاری کے ساتھ منہ سے نکال نکال کر سفید دھلے دھلائے بچھے دسترخوان پر رکھ کر دسترخوان کو دوسری مجلس کے لیے ناقابلِ استعمال بنا دیا جاتا ہے۔ اگر منہ میں آنے والی ہڈیوں کو اپنی ہی پلیٹ میں ایک طرف رکھ لیا جائے تو یہ کریہہ منظر نگاہوں کے سامنے نہ آئے لیکن اتنا سوچنے کا موقع کسے ہے۔ دیدنی عالم تو اس وقت ہوتا ہے جب کوئی میٹھی چیز ایک ہی برتن میں رکھ کر بہت سے لوگوں کے درمیان رکھ

ہو جاتی ہے۔ آداب معاشرت سے بیگانہ لوگ نہ تو اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ دسترخوان کے شرکا کتنے ہیں اور نہ ہی اس بات کا کہ شیرینی کتنی ہے۔ اس شیرینی کو زیادہ سے زیادہ اپنی پلیٹ میں انڈیل لیتے ہیں۔ چاہے بعد میں اس کو چھوڑ ہی کیوں نہ دیں۔ شیرینی کچھ لوگوں تک پہنچی اور زیادہ لوگوں تک نہیں پہنچی تو دسترخوان پر اس کو مزید لانے کے لیے شور ہوا۔ صاحب خانہ اپنی جگہ خجل کھڑا ہے کہ اس کی "ناک کٹ گئی" اور بہت سے شریک دعوت حضرات اس لیے بدحظ ہیں کہ شیرینی ان تک نہیں پہنچی۔ روپیہ پیسہ صرف ہوا، خاصہ وقت لگا کر کھانا تیار کروایا گیا، کھانا کھلانے کے لیے ہر طرح کا ممکن اہتمام کیا گیا مگر آداب معاشرت سے بیگانگی نے اچھے خاصے خوشی کے موقع کو تکدر میں بدل کر رکھ دیا۔

آج کل دسترخوان کے ایک ہم زاد بھی پیدا ہو گئے ہیں جن کا نام "بوفے" ہے۔ یہ بوفے صاحب بھی خوب چیز ہیں۔ خوب چیز یوں کہ "امیروں اور چونچلے بازوں" کے منظور نظر ہیں۔ ان کی پیدائش سنا ہے سات سمندر پار کے کسی دیس میں ہوئی تھی لیکن اب انھوں نے ہندوستان کو ایسا مغلوب کر لیا ہے جیسے کہ ان کی زاد بوم یہی ہے۔ یہ بوفے صاحب جس دیس کی پیداوار ہیں وہاں ان سے عہدہ برآ ہونے کے آداب یہ ہیں، میز پر چنے ہوئے کھانوں میں سے جو کچھ آپ کو پسند ہے، اپنی پلیٹ میں نکال لیجیے اور میز کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیجیے۔ مگر ہم لوگ ہر چیز میں جدت پسند واقع ہوئے ہیں، ہم نے بوفے میں یہ جدت کی ہے جو "مرد میدان" میز تک پہنچ گیا وہ میز چھوڑنے کا نام نہیں لیتا۔ وہ میز سے مل کر اس طرح جم کر کھڑا ہو جاتا ہے گویا اس میز کے ساتھ ہی اس کا تولد ہوا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ لوگ میز سے کھانا اپنی پلیٹ میں لے کر باہر آجائیں اور دوسرے لوگوں کے لیے جگہ خالی کرتے جائیں تاکہ مہمان اور میزبان میں سے کسی کو بھی کبیدگی نہ ہو اور خوشی کا موقع، غم و غصہ کا موقع بن کر نہ رہ جائے مگر بوفے صاحب کو اپنانے اور ان کے برتنے کے آداب کو نہ اپنانے کی وجہ سے اکثر "بوفے ڈنر" یا "بوفے لنچ"، "بوچڑ ڈنر" یا "لنچ" بن کر رہ جاتے ہیں۔ اگر آداب معاشرت کی گرفت ہم پر مضبوط ہوتی تو یہ بوفے صاحب بھی کچھ زیادہ برے نہ تھے۔

خوشی کے موقع پر ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا بڑی اچھی بات ہے۔ مگر بیرے کا پرا بنا کر چلنا اور اپنے کسی شناسا کے گھر پر "دھاوا" بولنا آداب معاشرت کے بالکل خلاف ہے۔ عید یا بقرعید کے دن لوگوں کو ایک دوسرے کے گھروں پر ضرور جانا چاہیے، اس طرح کی دید و باز دید سے تعلقات میں استواری آتی ہے مگر آداب معاشرت سے بیگانگی یہاں بھی بہت سے مسائل پیدا کر دیتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ صاحب خانہ کے مکان کی گنجائش اور دیگر چیزوں کو ذہن میں رکھے بغیر آٹھ دس افراد کی ایک ٹولی عید کی مبارک باد دینے پہنچ جاتی ہے۔ اب صاحب خانہ پر چاہے جو کچھ گزر جائے اس کو تو مہمانوں کی پذیرائی کرنی ہی ہے۔ کسی نہ کسی طرح صاحب خانہ یہ فرض تو پورا کر لیتا ہے لیکن اس کو خوشی اس بات میں زیادہ ہوتی جب دو دو چار چار کر کے لوگ آتے۔ وہ ان کی خاطر تواضع کرتا۔ نہ جگہ کی تنگی محسوس ہوتی نہ کرسیوں کی اور نہ ہی برتنوں کی۔ لیکن ان باتوں کا خیال رکھے تو کون؟ یہاں تو ہم سب ہی آداب معاشرت سے بیگانہ ہیں۔ دین تو ہم پہلے ہی سے گنوائے بیٹھے ہیں، دنیا کا ایک گوشہ جو ہمارے ہاتھوں میں تھا اب وہ بھی چکنی مچھلی کی طرح سرکا جا رہا ہے۔

کبیر احمد عباسی

# تہذیب اور اس کی تاریخ

سر سید احمد خاںؒ

ہم نے دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن کیا چیز ہے اور کن کن چیزوں میں علاقہ رکھتی ہے۔ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں۔ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے۔ یا یہ ایسی چیز ہے کہ اس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے، قانون قدرت میں پایا جاتا ہے؟ اس کے تصفیے کے لیے انسان کے حالات پر ہم کو نظر کرنی چاہیئے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطری چیز ہے تو وحشیوں میں، شہریوں میں، سب میں اس کا نشان ملے گا گو اس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں۔ الاّ سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔

انسان میں یہ ایک فطری بات ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند۔ یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے اور کسی چیز کو بُرا۔ اور اس کی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اس بُری چیز کی حالت کو ایسی حالت سے تبدیل کرلے جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے یہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے جو انسانوں کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اسی تبادلے کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہش تبادلہ انسان میں قدرتی اور فطرتی ہے۔

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے دو اصول ٹھہرے۔ اچھا اور بُرا۔ اور بُرے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھہری، مگر اچھا اور بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب خلقی اور خلقی، ملکی اور تمدنی ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب اچھا اور بُرا ٹھہرانے میں، یا یوں کہو کہ قوموں کی سولزیشن میں اختلاف پڑجاتا ہے۔ ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخلِ تہذیب جانتی ہے دوسری قوم اسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے۔ یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں کے باہم ہوتا ہے، جب کہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہوکر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں اور ان کی حاجتیں، ان کی غذائیں اور ان کی پوشاکیں، ان کی معلومات اور ان کے خیالات، ان کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لیے بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب میں یکساں پیدا ہوتے ہیں اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے، مگر جب کہ مختلف گروہ مختلف مقامات میں بستے ہیں تو

ان کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہوگی کہ جو سولزیشن کی ان مختلف حالتوں کا تصفیہ کر سکے۔

ملکی حالتیں، جہاں تک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں نہ فکر اور خیال اور دماغ سے، ان کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں بلکہ صرف انسان کے خیال کو اس سے تعلق ہے جس کے سبب وہ اچھا اور بُرا ٹھہراتا ہے اور جس باعث سے خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے اور وہ تبادلہ واقع ہوتا ہے جو سولزیشن کہلاتا ہے۔ پس سولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کر سکتے ہیں جن کے سبب سے اچھے اور بُرے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے۔

اچھے اور بُرے کی جگہ میں اور لفظ کا استعمال کروں گا یعنی پسند اور ناپسند۔ انگریزی میں ایک لفظ "ٹیسٹ" ہے جو نہایت وسیع معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں بھی اس قسم کے لفظ ہیں جیسے کہ مزا یا مذاق، مگر وہ استعمال میں ایسے خاص ہو گئے ہیں کہ ان سے وہ عام اور وسیع معنی خیال میں نہیں آتے۔ اس واسطے میں اس لفظ کا ترجمہ "پسند" کرتا ہوں۔ پس پسند کا صحیح ہونا، جو خیال کے صحیح ہونے کی فرع ہے، بہت بڑا وسیلہ سولزیشن کی مختلف حالتوں کے تصفیے کا ہے۔

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرت معلومات پر اور علم طبیعیات کے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آوے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانے کی تہذیب کو بھی وہ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنے سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے، مگر مودب دل سے دیکھتے ہیں۔

تہذیب یا یوں کہو کہ بُری حالت سے اچھی حالت میں لانا دنیا کی تمام چیزوں سے، اخلاقی ہوں یا مادی، یکساں تعلق رکھتا ہے اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہنر اور اس کو ترقی دینا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زر و جواہر (یاقوت و الماس) سے نہایت نفیس نفیس خوب صورت زیور بناتی ہے، ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور گھونگھوں سے اپنی آرائش کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں سونے چاندی مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوب صورت اور رنگین پروں کو تیلیوں پر سے چھلے ہوئے سنہری پوست اور زمرد کے سے رنگ کی باریک اور خوشنما گھانس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے، ناتربیت یافتہ قومیں بھی اس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات نہایت عمدہ اور عالی شان بنتے ہیں اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور ان کے رہنے کے گھونسلے، درختوں پر باندھے ہوئے ٹانڈ، زمین میں کھودی ہوئی کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزیں، تمدن کے قاعدے عیش و عشرت کی مجلسیں، خاطر اور مدارات کے کام اور اخلاق و محبت کی علامتیں دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں خالی نہیں، بلکہ بعض چیزیں ان میں زیادہ اصلی اور قدرتی

طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے، ناتربیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی و خوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے اور وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے، مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے ان کی ادا اور آواز کی پھرت، اس کا گھٹاؤ اور اس کا بڑھاؤ، اس کا ٹھہراؤ اور اس کی اونچ، ہاتھوں کا بھاؤ اور پاؤں کی دھمک، زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں یہ سب چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں۔ وہ لَے اور تال، راگ و راگنی کو نہیں جانتے مگر دل کی لہر اُن کی لَے اور دل کی پھڑک ان کا تال ہے۔ ان کا غول باندھ کر کھڑا ہونا، طبعی حرکت کے ساتھ اچھلنا، دل کی بیتابی سے جھکنا اور پھر جوش میں آ کر سیدھا ہو جانا گو نزاکت اور فن غنیاگری سے خالی ہو، مگر قدرتی جذبوں کی ضرور تصویر ہے۔ دلی جذبوں کا روکنا اور ان کو عمدہ حالت میں رکھنا تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے۔ پس جس طرح کہ ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں اسی طرح اس کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں جس چیز میں کہ ترقی، یعنی برائی سے اچھائی کی طرف رجوع یا ادنیٰ درجے سے اعلیٰ درجے کی طرف تحریک ہو سکتی ہے اسی سے تہذیب بھی متعلق ہے۔ پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر رکھنا، وقت کو عزیز سمجھنا، واقعات کے اسباب کو ڈھونڈنا اور ان کو ایک سلسلے میں لانا۔ اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور طریق تمدن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہنچانا اور ان سب کو خوش اسلوبی سے برتنا اور اس کا نتیجہ کیا ہے روحانی خوشی اور جسمانی خوبی اور اصلی تمکین اور حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت اور در حقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت، تمیز ہوتی ہے۔

اس تہذیب کے حاصل ہونے کے بقول مسٹر ایچ۔ ٹی۔ بکل صاحب چار اصول ہیں:

اوّل: "جو چیزیں ہم کو دکھائی دیتی ہیں اور جن کا سبب ہم کو معلوم نہیں ہوتا ان کے سببوں اور قاعدوں کو دریافت کرنا اور ان کے علوم کو پھیلانا۔ پس جس قدر کامیابی اس میں ہوگی اُسی قدر انسان کی ترقی ہوگی۔"

دوم: "اس تحقیقات سے پہلے تجسس کا خیال پیدا ہونا چاہیے جس کی ابتدا میں تحقیقات کو مدد ملتی ہے اور بعد کو تحقیقات سے اس کی استقامت ہوتی ہے۔"

سوم: "جو باتیں اس طرح پر دریافت ہوتی ہیں وہ عقلی باتوں کے اثر کو زیادہ کرتی ہیں اور اخلاقی باتوں کو کسی قدر کم، مگر اخلاقی باتیں بہ نسبت عقلی باتوں کے زیادہ مستقل ہیں اور ان میں کمی بیشی بہت کم ہوتی ہے۔"

چہارم: "اس تحریک کا بڑا دشمن جو در حقیقت سولزیشن کا بھی سخت دشمن ہے یہ خیال ہے کہ جب تک زندگی کے امورات کی نگرانی ہر طرح پر سلطنت اور مذہب سے نہ ہو تب تک انسان کے گروہ ترقی نہیں ہو سکتی، یعنی سلطنت رعایا کو یہ سکھلائے کہ ان کو کیا کرنا چاہیے اور مذہب یہ سکھلائے کہ کس بات پر یقین کرنا چاہیے۔"

پچھلی بات میں مسٹر بجل سے مجھ کو کسی قدر اختلاف ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ خیال کہ بادشاہِ وقت ہم کو بتاوے کہ ہم کو کیا کیا کرنا چاہیے۔ انسان کی ترقی اور تہذیب کا نہایت قوی مانع ہے اور جس قدر کہ ہندوستان میں، بلکہ تمام ایشیا میں اور ٹرکی اور ایجپٹ میں بھی ناشائستگی اور ناتہذیبی ہے اس کا بڑا سبب یہی خیال ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی خیال نے غارت اور برباد کیا ہے اور یہی خیال ہے جو ہندوستان کی رعایا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً گورنمنٹ سے ناراض رکھتا ہے۔ پس جب تک یہ خیال نہ جائے گا اور یہ خیال نہ آوے گا کہ ہم خود سوچیں کہ ہم کو اپنے لیے کیا کرنا چاہیے، اس وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کو نہ دولت ہوگی نہ حشمت، نہ عزت ہوگی نہ منزلت اور نہ تہذیب ہوگی اور نہ شائستگی، مگر دوسرا جملہ جو مذہب سے متعلق ہے وہ کسی قدر صحیح ہے اور کسی قدر غلط۔ یعنی غلط مذہب بلاشبہ تہذیب کا بڑا مانع ہے اور اگر سچے مذہب میں غلط خیالات اور بے جا تعصبات اور مسائل اجتہادیہ اور قیاسیہ اس طرح پر مل جاویں کہ عملاً اور اعتقاداً اصلی احکامِ مذہبی میں اور ان میں کچھ تفرقہ و تمیز نہ رہے، جیسا کہ مذہب اسلام کی موجودہ حالت ہے اور جو تقلید کی تاریکی میں آنکھوں سے بالکل چھپ گیا ہے تو بلاشبہ وہ بھی انسان کی ترقی اور تہذیب کا مثل مذہب غلط کے مخل قوی ہے۔ اگر سچا مذہب جیسا کہ ٹھیٹ مذہب اسلام ہے وہ کبھی حارج ترقی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس مذہب کے احکام اور تہذیب و شائستگی کے کام دونوں متحد ہوتے ہیں۔ والسلام علی من اتبع الہدیٰ

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک عابد و زاہد اور شب بیدار شخص کئی سیر غذا کھاتا اور ہر شب میں ایک قرآن کریم ختم کیا کرتا تھا

کسی دانا نے سنا تو کہا
کاش وہ آدمی آدھی روٹی کھایا کرتا اور ساری رات سویا کرتا ''

# تعلیمی کارواں

سیّد حامد ○

تعلیمی کارواں ۱۰ اپریل ۹۲ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد سے جمعہ کی نماز کے بعد جادہ پیما ہوا - اسے علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد نسیم فاروقی اور اساتذہ اور طلبا کی ایک بڑی تعداد نے رخصت کیا - اس مسجد کے پہلو میں وہ شخص سو رہا ہے جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو جگا کر دم لیا - جو کچھ ساکھ ان کی اور جو کچھ سوجھ بوجھ ان میں اس وقت ہے وہ اُن ہی بڑے میاں کی بدولت ہے انھیں آنکھ موندے ہوئے چار اوپر نوّے سال ہو گئے!

ہندوستان اس دوران میں نشیب و فراز سے گزرا سر سیّد کا سحر تھا کہ مسلمان تعلیم کے میدان میں تیزی سے آگے بڑھے - افسوس ہے کہ وہ کچھ دور جا کر رک گئے اور پھر پچھڑتے چلے گئے - آزادی کے بعد اُن کے زوال کی ایک بڑی وجہ ان کی تعلیمی پسماندگی بن گئی - خانہ جنگیوں نے انھیں اور تباہ کر دیا؛ وہ زبان جس میں ان کا سارا سرمایہ تھا، ان کے گھروں سے نکال دی گئی - جدید تعلیم سے انھوں نے منہ موڑنا شروع کر دیا اور پھر وہ وقت آگیا کہ تعلیمی پسماندگی میں وہ اپنے تمام اہلِ وطن سے آگے نکل گئے - جن لوگوں کے دل میں درد تھا انھوں نے فریاد کی، شور مچایا کہ خدا را اب پڑھائی سے لو لگا لو - نقار خانہ میں طوطیوں کی فریاد کو کون سنتا حالات اور بگڑے تو کچھ لوگ باہم رابطہ کر کے مل بیٹھے - انھوں نے طے کیا کہ گھر گھر جائیں اور دروازوں پر دستک دیں ہندوستان بٹ بٹا کر بھی ایک برّاعظم کے برابر رہ گیا ہے ہندوستان بھر میں جا جا کر دروازوں پر دستک دینے کا بوتہ کس میں ہے؟ چنانچہ طے پایا کہ جو کچھ محدود (افرادی اور مالی) وسائل دستیاب ہو سکیں، وہ سب اس ریاست یعنی یو پی میں لگا دیے جائیں جو تعلیمی اعتبار سے زیادہ پسماندہ ہے اور جہاں مسلمان بڑی تعداد میں بستے اور اپنی جہالت کی طرف سے غافل ہیں چنانچہ اہلِ فکر اور اہلِ علم کو ملک کی مختلف ریاستوں سے جمع کیا گیا - کارواں میں بوڑھے بھی تھے، جوان بھی استاد بھی شاگرد بھی؛ انجینیر بھی اور سائنس داں بھی! زبان و ادب کے منتہی بھی اور ذمّہ دار بھی اور وہ بھی جنھیں دینیات پر عبور تھا، تعلیم و تدریس کے ماہرین اور صحافی اور اہلِ رابطہ بھی - ایک سرے پر طالب علموں اور نوجوانوں کی نمائندگی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین کے صدر اور سکریٹری

---

○ سابق وائس چانسلر، اے ایم یو علی گڑھ ——— ہمدرد نگر، نئی دہلی -

سے پیر نائب صدر اور کابینہ کے رکن نے کی۔ دینی مدارس کو بھی نمائندگی ملتی گئی۔ غرضیکہ اگر کوئی دہشت گرد کارواں کے رتھ میں بم رکھ دیتا یا بس کسی حادثہ کا شکار ہو جاتی تو بہت سے گھروں میں صف ماتم تو بچھ ہی جاتی ملت بھی نقصان سے تڑپ اٹھتی۔ آخری پل کی رکاوٹوں کی وجہ سے بنگلور سے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نہ آسکے، نہ حیدرآباد سے جناب عارف الدین خاں، نہ ممبئی سے ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے لکھنؤ میں شرکت کی لیکن وہ کارواں کا جزو نہ بن سکے؛ انھوں نے اس اثنا میں ایک بڑے اور اہم ادارے جامعۃ النسواں کی بنیاد ڈال دی۔

امان اللہ خاں صاحب نے اہل فکر اور اہل درد کو جمع تو کرلیا۔ اب سوال زادِ راہ کا اٹھا۔ کارواں التماس اور فریاد کرے گا تو کس برتے پر۔ تعلیم کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں انھیں کون دور کرے گا۔ کارواں کو معاشرے کی اصلاح کی دھن بھی سوار تھی ان رسموں کے خلاف جو پکی ہو گئی تھیں۔ اہل کارواں کی آواز سماج کیوں سننے لگا؟ ایسے آڑے وقت میں علمائے دین یاد آئے لیکن مسلمان تو فرقوں اور مسالک میں بٹے ہوئے ہیں، اس طرح کہ ایک کے لیے جو زہر ہے وہ دوسرے کے لیے تریاق۔ پھر خیال آیا کہ اختلافات نے کتنی ہی عبرت ناک شکل کیوں نہ اختیار کرلی ہو، ہیں تو وہ فروعی اور حاشیائی ہی۔ اس دکھتی رگ کو ہم چھیڑیں ہی کیوں۔ چند موٹی موٹی باتیں ہیں جن پر کاربند رہنا ہے ہمارا کام چل جائے گا اگر سارے مسلکوں کے بڑے بڑے عالم ان چند باتوں کو اپنی حمایت کا سہارا دے دیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے عالموں نے ہماری التماس کو منظور فرمایا اور تعلیم اور سماج سدھار کی بابت ایک اپیل شائع کر دی۔ اپیل اخباروں میں جلی حروف میں چھپی اور یوں بھی بانٹی گئی۔ دیکھیے کہ اس اپیل میں، جسے کارواں زادِ راہ کے طور پر اپنے ساتھ لے گیا تھا، کیا تھا:

۱۔ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اور اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی آخرت میں جواب دہی کا باعث ہوگی۔ اس لیے ہر مسلمان کو لازم ہے کہ اس پر عمل کرے۔

۲۔ حصول علم کا بنیادی مقصد انسان کی سیرت و کردار کی تشکیل، اللہ کی عبادت اور مخلوق کی خدمت ہے۔ معیشت کا حصول ایک ضمنی بات ہے۔

۳۔ اسلام میں دینی علم اور دنیاوی علم کی کوئی تقسیم نہیں ہے۔ ہر وہ علم جو مذکورہ (بالا) مقصد کو پورا کرے اس کا اختیار کرنا لازمی ہے۔

۴۔ مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ دینی اور عصری تعلیم میں فرق کیے بغیر ہر مفید علم کو ممکن حد تک حاصل کریں۔ انگریزی اسکولوں میں تعلیم پانے والے بچوں کی دینی تعلیم کا گھروں پر، مسجد یا خود اسکول میں انتظام کریں۔ اسی طرح دینی درسگاہوں میں پڑھنے والے بچوں کو جدید علوم سے واقف کرانے کا انتظام کریں۔

۵۔ مسلمانوں کے جس محلہ میں مسجد، مکتب، مدرسہ یا اسکول نہیں ہے، وہاں اس کے قیام کی کوشش ہونی چاہیے۔

۶ مسجدوں کو اقامت صلوٰۃ کے ساتھ

ابتدائی تعلیم کا مرکز بنایا جائے؛ ناظرہ قرآن
کے ساتھ دینی تعلیم اور اردو اور حساب کی
تعلیم دی جائے۔

۷- والدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ
روپیے کے لالچ میں اپنے بچوں کو تعلیم سے
پہلے کام پر نہ لگائیں۔ ایسا کرنا ان کے
ساتھ ظلم ہے۔

۸- جگہ جگہ تعلیم بالغان کے مراکز قائم
کیے جائیں اور عمومی خواندگی کی تحریک
چلائی جائے۔

۹- جن آبادیوں میں یا ان کے قریب
اسکول نہ ہو، وہاں حکومت کے متعلقہ
دفتر سے اسکول کھولنے کا مطالبہ کیا جائے۔

۱۰- لڑکیوں کی تعلیم کی طرف بے توجہی
زیادہ عام ہے۔ اس لیے ان کی تعلیم پر
خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ ان کے لیے
اسکول اور بورڈنگ کھولے جائیں اور
گھروں میں بھی ان کی تعلیم کا نظم کیا جائے۔

۱۱- عام مسلمان حکومت کے ان
پروگراموں سے ناواقف رہتے ہیں جو
وہ تعلیم کے فروغ کے لیے کرتی ہے نتیجہ
میں مسلمان اس سے فائدہ نہیں اٹھاپاتے
اس لیے ہر شہر اور ہر قصبے میں کچھ باخبر
اور باشعور افراد اس کام کو اپنے ذمہ
لیں اور حکومت کے پروگراموں اور
مراعات کی اطلاع حاصل کرکے مقامی
لوگوں تک پہنچائیں۔

۱۲- نئی نسل میں تعلیم، محنت، مقابلہ
اور جفاکشی کے رجحانات عام کرنے کے لیے
مختلف قسم کے پروگرام کیے جائیں اور ہونہار
طلباء کی ہمت افزائی کی جائے۔

۱۳- مسلمانوں کے بہت سے تعلیمی
اداروں میں انتظامی معاملات سے متعلق
جو اختلافات عام طور پر پیدا ہوگئے ہیں
ان کو کم اور ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ بہتر
ہوگا کہ مسلمان جلد از جلد اس مصیبت
سے نجات حاصل کریں۔

جن باتوں کی طرف اس اپیل میں علمائے کرام نے ملت کا دھیان وضاحت اور زور کے ساتھ دلایا ہے وہ یقیناً اہم ہیں، لیکن اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اس اپیل پر کن علما نے دستخط کیے ہیں۔ یہ اپیل ہمارے بیشتر ممتاز علما کی طرف سے ان کے دستخطوں کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس میں ہمارے جملہ مسالک کو نمائندگی دی گئی ہے۔ چند اسمائے گرامی ملاحظہ ہوں:

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا سید کلب صادق صاحب۔ مولانا کاظم نقوی صاحب، مولانا توصیف رضا صاحب۔ مفتی محبوب اشرفی صاحب، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب، مولانا مقتدیٰ حسن ازہری صاحب، مفتی محمد عبدالقیوم صاحب، مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب، مولانا محمد سالم قاسمی صاحب، مولانا محمد مجیب اللہ ندوی صاحب۔

مذکورہ اپیل تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ اسے ہم ملت اسلامیۂ ہند کے لیے ایک منشور اور لائحہ عمل قرار دے سکتے ہیں۔ اس منشور میں ان رکاوٹوں کو رفع کیا گیا ہے جو مسلمانوں میں تعلیم کے چلن کو

ـ رہی تھیں۔ اس میں علما نے پہلی بار دینی اور دنیاوی
ہم دونوں کو فرض قرار دیا ہے اور حکومت کی اسکیموں
ے فائدہ اٹھانے کا ایک مرتب پروگرام ملت کے
امنے رکھا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہندوستانی
سلمان علمائے کبار کی اس اپیل کو عمل میں لائیں گے
یسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کارواں اگر صرف یہ منشور
ہی حاصل کر لیتا تو بھی اس نے بہت کچھ کر لیا ہوتا۔
ب ہمیں یہ شکایت نہیں ہو سکتی کہ عصری تعلیم کو ہمارے
علما نظر انداز کرتے ہیں۔ جہاں تک کارواں کے بارہ
روزہ سفر کا تعلق ہے اس نے اس منشور کو حرز جاں
بنا لیا اور تقریروں اور بات چیت کو اس نہج پر ڈھالا۔
ان موضوعات میں اس نے اصلاح معاشرہ کا اضافہ
ضرور کیا کہ یہ تحریک بھی تعلیم و تربیت کے ساتھ گتھی ہوئی
ہے۔ خواہ تقریر ہو خواہ گفتگو، کارواں نے ہر جگہ طریقہ
استدلال کا اختیار کیا، اس نے سدا عقل سے اپیل
کی۔

کارواں کے پاس دینے کے لیے کچھ نہ تھا ٹھیک
اسی طرح جیسے ملت کے پاس کھونے کے سوائے جہالت
اور نا اتفاقی کے کچھ نہیں ہے۔ پھر بھی ہر شہر، ہر قریہ اور
قصبہ میں جدھر سے وہ گزرا یا جہاں وہ ٹھہرا اس کا خیر مقدم
بڑے جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا۔ ہم نے اپنی تقریروں
میں کہا بھی کہ یہ پذیرائی اُن لوگوں کی نہیں ہے کارواں
جن سے بنا ہے، بلکہ اُن مقاصد کی ہے کارواں جنھیں
لے کر آیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ لوگ بُری طرح
پیاسے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ یہ کارواں آب حیات
لے کر آیا ہے۔ علم کیا ہے آب حیات سے بھی کم تر
ہے؟ لوگ اب تھک گئے ہیں کھوکھلی، جذباتی، شعلہ بار،
نفاق انگیز اور بھڑکانے والی تقریریں سنتے سنتے۔ ان
تقریروں کا خمیازہ وہ بُری طرح بھگت چکے ہیں۔ ان کے
چلتے ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کا نقصان ہوا اور
اس سے بھی ایک بڑا نقصان ہوا: حوصلہ اور اعتماد اور
ذوق زندگی کا نقصان۔ اب ان میں اس کی تاب
نہیں رہی کہ وہ حقارت سے دیکھے جائیں، ان پڑھ اور
جاہل اور پسماندہ کہلائیں۔ اب وہ انھیں کو سننا چاہتے
ہیں جو انھیں تعلیم، اصلاح اور تعمیر کا مشورہ دیں۔ عادت
اور جذبات سے مجبور ہو کر وہ سنیں گے ان کو بھی جو
زور بیان میں انھیں سولی پر چڑھا دیتے ہیں لیکن ان
کی آواز پر وہ کان نہیں دھریں گے۔ ضرورت ہے کہ
ملت کی اس بدلتی ہوئی افتادِ طبع اور سنجیدہ طرز فکر کو
ہوا دی جائے، بڑھاوا دیا جائے کہ نجات اور تعمیر کی
راہ یہی ہے۔ جن شہروں میں کارواں کو داخل ہونا تھا
ان سے کوسوں آگے ہم نے اہل شہر کو اپنے لیے چشم براہ
پایا۔ نعروں اور مالاؤں سے اہل کارواں کا سواگت
کیا گیا۔ ان کی باتیں کان دھر کر سنی گئیں، ان کی راہ
میں آنکھیں بچھائی گئیں۔ کہیں انہیں کھلی جیپ میں بٹھا کر
پچاس موٹر سائیکل سواروں کے عقب میں لے جایا گیا
گویا دیارِ علم کے یہ غریب مسافر اصحاب سیاست اور
ارباب اقتدار کی ردیف میں آ گئے بلکہ جہاں تک
خلوص پذیرائی کا تعلق ہے ان سے بہت آگے بڑھ گئے۔

کہنے کی باتیں وہی چند تھیں جو جا بجا دہرائی گئیں
یعنی ہماری شرح خواندگی شرمناک ہے۔ سو فیصد خواندگی
کے قومی پروگرام میں ہمیں پورے جوش و خروش کے
ساتھ شریک ہونا چاہیے۔ جہالت کا کلنک جبیں سے
چھڑانے کے لیے سو جتن کیجیے کہ جاہل رہ کر کوئی ترقی نہیں
کر سکتا۔ گھر میں پڑھائیے، پڑوس میں پڑھوائیے،
مسجد میں درس دلوائیے۔ جہاں کہیں تعلیم دی جا سکے
دلوائیے۔ پیٹ کاٹیے اور بچوں کو پڑھائیے۔ دنیاوی
تعلیم حاصل کرنے والوں کو ضمنی طور پر دین کی تعلیم

دیجیے۔ گھر پر یا پڑوس میں۔ ہر مسجد کو مکتب یا مدرسہ سے لیس کیجیے۔ دینی علوم کے طالبوں کو عصری علوم سے روشناس کرانے کا اہتمام دینی نصاب تعلیم میں کیجیے لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں کی تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ اس طرح گھر میں علمی ماحول پیدا ہوتا ہے اور بچوں کو تعلیمی امداد مل جاتی ہے جس پر ان کی ذہنی پیش رفت اور اعتماد اور حوصلے اور ان کے زیر سایہ صلاحیتوں کے ابھرنے اور نکھرنے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ جہاں جہاں ضروری ہو مدرسے اور اسکول کھولیے لیکن ضروریات کی تشفی کا انحصار ایک عنوان حکومت کی منصفانہ توجہ پر ہوگا۔ مانگ کیجیے کہ تلافی کے طور پر نئے اسکول کھولتے وقت مسلمانوں کی بستیوں یا ان کے گرد و پیش کو ترجیح دینی چاہیے۔ حکومت اور پارلیمنٹ نے جو وعدے اقلیتوں کے ساتھ نئی تعلیمی پالیسی اور اس کے عملی پروگرام میں کیے ہیں، ان کے ایفا پر اصرار کیجیے تنظیم ترتیب اور استقامت کے ساتھ۔ اپنی کوششوں سے اس کھائی کو پاٹیے جس نے دینی تعلیم کے فارغین کو عصری تعلیم حاصل کرنے والوں سے الگ کر دیا ہے۔ پڑھائی، پڑھائی، پڑھائی۔ ہمارے لیے اب نسخۂ کیمیا اور تدبیر بقا یہی ہے۔

ہمارے دین کی ہدایت ہے کہ ہم جہاں رہیں سرمایۂ حیات بن کر رہیں۔ اس لیے ہمارے تعلقات اپنے اہل وطن کے ساتھ اچھے ہونے چاہییں۔ خوش گواری اور خوش اندیشی کی پہل ہم نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟ کر ہم اس کے مکلف ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ عزت نفس اور وطنی اور ملی مفادات کی حفاظت کی جائے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اقلیت کے لیے اور زیادہ ضروری ہے۔ اگر امن [illegible] اور بلوے اور خونریزیاں ہوتی رہیں [illegible] زندگی دور کیسے ہو گی۔ اس کے علاوہ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ قومی پالیسی کا فائدہ مسلمانوں تک نہیں پہنچ پاتا۔ اکثریت کے افراد جن کے ہاتھ میں اقتدار اور جن کے قبضہ میں سرکاری دفتر ہیں، اگر ہمیں انصاف دینا نہ چاہیں تو حکومت کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ تو پالیسی بنا کر بیٹھ جائے گی۔ ملک سمجھے گا کہ اقلیتوں کے ساتھ انصاف بلکہ فراخ دلی کا برتاؤ کیا گیا لیکن یہ خواہشات اور تاثرات اس کاغذ یا دستاویز سے باہر نہ نکل پائیں گے جس میں وہ قلم بند ہوئے ہیں ہمیں قریب آ کر اکثریت کے افراد کی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہیے۔

تیسری بات اتحاد کی تھی۔ فرقوں اور مسلکوں کے اختلافات سے اوپر اٹھ کر چند بنیادی اور ضروری باتوں پر عملاً متحد ہو جانے کی۔ ہمارے یہودی اور عیسائی بھائیوں کے درمیان شدید اختلافات سے انسانی تہذیب کے ۲۰۰۰ سال داغ دار رہے۔ یورپ میں عیسائیوں نے یہودیوں پر ان گنت مظالم توڑے۔ عیسائی حکمرانوں کے مظالم سے تنگ آ کر اسپین کے یہودیوں نے مسلمانوں سے فریاد کی کہ خدارا آؤ اور ہمیں عیسائیوں کے ظلم سے بچاؤ۔ چنانچہ مسلمانوں نے اسپین فتح کیا اور ۸۰۰ سال تک وہاں یہودیوں کو لگاتار مراعات اور افضل مناصب سے نوازا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ازلی عداوتوں اور ناانصافیوں کے باوصف پہلے سیاسی اور بعد میں مذہبی طور پر یہ دونوں متحد ہو گئے، اور مسلمان چھوٹے چھوٹے فروعی مسائل پر خانہ جنگی کا شکار ہو گئے۔

چوتھی بات کا تعلق اردو زبان سے تھا۔ اتر پردیش میں جو کہ اردو کا گہوارہ رہا ہے، آزادی کے بعد چالیس سال کے اندر مسلمانوں نے اردو کو اپنے گھروں سے رسوا کر کے نکال دیا۔ اب وہ ہندوستان کی قومی زبان ہے، اسے سب مانتے ہیں؛ اس بات کو بھی منصف مزاج تسلیم کرتے ہیں

کرا رہو زبان رواداری اور قومی یک جہتی اور کثرت میں وحدت کی سب سے اچھی نشانی ہے لیکن ایک بد نصیب رقابت اور ایک بے بنیاد غلط فہمی کی وجہ سے اردو ہندوستان میں نکو بن گئی ہے۔ یہ آئینی زبان دستور ہند کی دہائی دیتی رہے گی، حکومت سے فریاد کرتی رہے گی، لیکن حاصل کچھ نہ ہوگا خصوصاً اتر پردیش میں۔ لہٰذا اب مسلمانوں کو چاہیے کہ (کاروان تعلیم کا دوسرا نام کاروان اردو بھی تھا اردو کی نمائندگی انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر اور جنرل سکریٹری کر رہے تھے) اردو کی حفاظت اور اشاعت ایسی زبان کی حیثیت سے کریں جس میں ان کے مذہب، ثقافت، روایات، ادب اور تاریخ کا سرمایہ ہے۔ گھر گھر اردو پڑھائی جائے تو اردو عزت کے ساتھ گھروں میں واپس آسکتی ہے۔ اردو پڑھانا سہل ہے۔ کلام پاک پڑھاتے وقت بچے کو اردو رسم خط سے پڑھا اور لکھا کر، آشنا کر دیجیے۔ اردو اپنے رسم خط کے ساتھ اگر نہ بچی تو ہندوستان میں اسلام کا باقی رہنا بھی مشتبہ ہو جائے گا اور قومی یک جہتی بھی پارہ پارہ ہو جائے گی۔

اس پنچایت کا پانچواں پنچ اصلاح معاشرہ یا سماج سدھار ہے۔ فضول خرچی پر جو لوگ فخر کرتے ہوں، کیا وہ تعمیری کاموں کے لیے وسائل پس انداز کر سکتے ہیں؟ اسراف کے لیے بڑی سخت وعید ہے جو بخل تک کے لیے بھی نہیں۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ

[ فضول خرچ، شیطانوں کے بھائی ہیں ]

اسراف میں مال و زر کا زیاں تو ہے ہی، اپنے غریب اور نادار بھائیوں کے تئیں بے دردی اور بے حسی کا اعلان اور اظہار بھی ہے۔

معاشرے میں اور بہت سی برائیاں درآئی ہیں مثلاً لڑکے یا لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی والوں سے بطور جہیز کثیر رقوم اور قیمتی اشیا کی مانگ۔ یہ بڑی بے شرمی کی بات ہے۔ اس وبا کو پھیلنے سے پہلے جڑ سے اکھاڑ دیجیے۔

طلاق کو جس طرح سہل اور سرسری بنا دیا گیا ہے، نکاح کے پاک رشتے کو بعض افراد کے ہاتھوں جس بے تکلفی اور بے دردی کے ساتھ ایک پل میں توڑ کر رکھ دیا جاتا ہے، شریک حیات کو جس ظلم اور ناانصافی کے ساتھ رسوا کر کے گھر سے نکال دیا جاتا ہے، وہ کتاب و سنت کے صریحاً خلاف ہے۔ یہ طریقہ غیر اسلامی ہے۔ طلاق، ان افعال میں سے جنھیں غیر معمولی حالات اور شدید مجبوری کی صورت ہی میں جائز قرار دیا گیا ہے، سب سے زیادہ ناپسندیدہ فعل ہے۔ وہ لوگ اتھلے اور کم وزن اور کم ظرف اور بے حلم ہیں جو غصہ میں آکر شریک حیات کو سامان کی طرح کھڑکی سے باہر پھینک دیتے ہیں؛ اور پھر ان لوگوں کو کیا کہیے جو ایک بیٹھک میں تین بار طلاق کے لفظ کو ادا کر کے زندگی بھر کے پاکیزہ رشتے کو قطع کر دیتے ہیں۔ ایک سے زیادہ بار طلاق کہلوانے کی منطق ہی یہ ہے کہ انسان کو وقفوں کی بدولت غصہ کی باڑھ اتر جانے کے بعد پشیمانی اور نظر ثانی کا موقع ملے اور احباب، ہمسایوں اور خیر خواہوں کو بھی۔ امارت شرعیہ بہار نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس نوع کی طلاق سراسر ناجائز اور ناکافی ہے۔

کارواں علی گڑھ سے سکندرہ راؤ گیا وہاں سے ایٹہ ضلع کی تین بستیوں میں گیا اور رات کو وہیں ٹھہرا۔ لائحہ عمل یہ مقرر ہوا تھا کہ جہاں رات کو ٹھہرنے کا موقع ملے وہاں ایک میٹنگ قصبہ یا شہر کے اہل تعلیم اور اہل خیر حضرات کے ساتھ ہو اور عشا کی نماز کے بعد ایک پبلک میٹنگ کی جائے۔ ایٹہ ضلع میں یہ تین بستیاں، گنج دوارہ، سہاور اور کاس گنج تھیں۔ کارواں اسی مقصد کے لیے تین ٹولیوں میں بٹ گیا۔ سہاور میں ایک جونیر ہائی اسکول ہے جو عرصہ دراز

ہے اسی طرح عالم انفعال میں پڑا ہوا ہے۔ طے پایا کہ اسے سینیر سیکنڈری اسکول بنانے کے لیے کوشش تیز کر دینا چاہیے۔ فتح گڑھ ضلع پہنچتے پہنچتے رود بار کارواں کی تینوں دھارائیں پھر باہم مل گئیں۔ کارواں قایم گنج، فرخ آباد، فتح گڑھ رُکتا ہوا، اپنی باتیں سناتا ہوا، دوسروں کی سنتا ہوا، آگے بڑھا۔ قایم گنج والوں کو یہ شکایت ہے کہ اس مردم خیز بستی سے جو بڑے بڑے آدمی (ان سب میں بڑے ذاکر صاحب) اُٹھے، ان میں سے کسی نے مڑ کر اپنے وطن کی طرف نہیں دیکھا۔ یہ انتقال اذہان (یہ برین ڈرین) نہ صرف ملک کی سطح پر کار فرما ہے بلکہ دیہات سے شہروں کی طرف بھی۔ مجذوب کی بڑ کی طرح ہم تو یہاں بھی اپنا پیغام دہرانے چلے گئے۔ صحبت ناصح کا اتنا تو اثر ہے۔ سچ پوچھیے تو لوگوں نے سنا بھی۔ کچھ جھرجھری سی آئی بھی۔ اُن لوگوں سے جو ادارہ سازی میں دلچسپی دکھا رہے تھے کہا گیا کہ زمین ابھی سے خرید کر ڈال دیجیے۔ مبادا آگے چل کر زمین کی نادستیابی تعمیری کاموں میں سدِّ راہ ہو جائے۔ مشورہ اور حوصلہ دیتا ہوا اور فضا تیار کرتا ہوا کارواں آگے بڑھ گیا۔ ضلع ایٹہ میں بھرکیں کا نو کا تذکرہ تو چھوٹ ہی گیا۔ یہ قصبہ مسلمانوں سے آباد ہے۔ اس کو غفلت سے کسی لمحہ میں ایک نو دے دیا لیہ عنایت ہوا تھا۔ کچھ دنوں بعد بغیر کسی وجہ کے وہاں سے اُسے ہٹا لیا گیا۔ مسلمان سمجھتے ہیں کہ قصور سارا ان کے ناموں کا ہے۔ نام تو وہ بدلنے سے رہے لیکن کیا یہ ارباب اختیار پر واجب نہیں کہ وہ ایسی کوئی بات نہ کریں جس سے اقلیتوں کو جراحت پہنچے یا اُن کے دلوں میں بدگمانی سر اُٹھائے؟ کارواں نے وعدہ کیا کہ وہ اس بات کو چھیڑے گا، دادرسی کی کوشش کی جائے گی۔

جو مسایل ہمارے سامنے رکھے گئے، ان کے تذکرے کو دفتر درکار ہوگا۔ کارواں کئی بستیوں میں اپنے چاہنے والوں سے خطاب کرتا ہوا قنوج پہنچا اور پھر کانپور۔ یہاں بھی دو ٹکڑے ہو گئے تو کام چلا۔ اس طرح سامعین کے لیے زحمت انتظار کم ہو گئی۔ قنوج میں بہت بڑا جلسہ بڑے سلیقے سے آراستہ ہوا۔ ذی علم ہندو حضرات نے بھی شرکت کی۔ اس کارواں کا فیضان یہ بھی ہے کہ اس نے ہمارے بعض ہندو سامعین کو مسلمانوں کے تئیں اپنے نقطۂ نظر کو بدلنے پر مجبور کیا وہ سوچنے لگے کہ یہ مسلمان انتہا پسند نہیں ہیں، یہ تو انصاف کی بات کرتے ہیں۔

کانپور میں دو جلسے ہوئے۔ ایک حلیم ڈگری کالج میں بعد عشا، دوسرا، ادارہ سازوں کا دوسرے دن۔ کانپور نے ایک عرصے سے بے حسی کو ڈھال بنا لیا تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ دو ڈاکٹر اُٹھے (ڈاکٹر رحمانی اور ڈاکٹر جمیل) اور مسیحائی پر مستعد ہو گئے۔ انھوں نے تعلیمی تحریک جاری کی (Movement for education) شہر میں پانچ جگہ اصلاحی کلاس (Remidial classes) کھولے اور غریب طالب علموں کے لیے ایک بک بینک قایم کیا ہمارے ایما پر ان ڈاکٹروں نے فتح پور ضلع کو سیارہ کے طور پر اپنی مدار میں لے لیا۔ فتح پور میں ایک جلسہ کو خطاب کر کے ہم الٰہ آباد گئے، جہاں رات میں میٹنگ ہوئی وہاں سے بنارس گئے جہاں کارواں کی پذیرائی ان اداروں نے کی جو شیخ الہند اسیر مالٹا حضرت مولانا محمود حسن علیہ الرحمہ کی یاد میں قایم کیے گئے ہیں۔ کارواں عصری درس گاہوں سے ہوتا ہوا دینی تعلیم گاہ میں پہنچا۔ مقصد دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا ہے۔ بڑی میٹنگ بعد عشا مسلم اسکول میں ہوئی۔ ۱۹۸۳ء میں اسی اسکول میں سید حامد کی آمد کی تقریب میں سرسید سوسائٹی قایم ہوئی تھی جس نے تعلیم کے میدان میں اچھے کام کیے ہیں۔ دوسرے روز صبح بہت پور گئے جہاں سرسید سوسائٹی

نے ایک ہاؤسنگ سوسائٹی قایم کی ہے اور تعلیمی اداروں کا ایک گنجینہ یا کمپلکس قایم کی ہے۔ آخر الذکر کا سنگ بنیاد بحیثیت میر کارواں کے سید حامد سے رکھوایا گیا اس میں عیسائی اور ہندو بھائی بھی شریک تھے۔ ہماری انسان دوستی اور وطن وابستگی کے جذبات سے یہ لوگ متاثر ہوئے۔ قیام مظفر صاحب کے فاران ہوٹل، نئی سڑک میں رہا۔ غازی پور میں دو جگہ خطاب کرتے ہوئے مئو گئے، پھر اعظم گڑھ پہنچے۔ شبلی کالج میں جلسہ ہوا۔ قیام مولانا مجیب اللہ صاحب کی جامعۃ الرشاد میں تھا۔ دوسرے دن صبح دار المصنفین میں حاضری ہوئی۔ شبلی کالج ہنوز مقدمہ بازی اور فرقہ پرستی اور ذات نوازی میں مبتلا ہے۔ ایسے میں پڑھائی کیا خاک ہوگی؟ بہت سی ایسی مثالیں ریاست میں بکھری ہوئی ہیں۔ منہ زور پکڑ لیتی ہے تو انسان انصاف کی بات سن کر نہیں دیتا۔ کارواں کو اعتراف ہے کہ ثالثی اس سے ہو نہ پائی۔ اس کے موقعے آگے چل کر آئیں گے۔

اعظم گڑھ سے مدرستہ الاصلاح سرائے میر گئے اور وہاں سے جامعۃ الفلاح، بلریا گنج۔ اول الذکر کو ایک زمانہ میں مولانا حمید الدین فراہی علیہ الرحمہ کی تابناک سربراہی میسر ہوئی تھی۔ سرائے میر میں کارواں نے لڑکیوں کے ایک اسکول کی شروعات کی۔ بلریا گنج میں جلسہ یونیورسٹی کی فراخ اور خوبصورت مسجد میں ہوا۔ جامعۃ الفلاح ترقی اور توسیع کی منزلیں تیزی کے ساتھ طے کر رہا ہے۔ حضرت مہتمم کو پیکر اعتماد پایا۔ اس جامعہ میں لڑکیاں بھی تعلیم پاتی ہیں۔ موجودہ تعداد ۲۳۰۰ ہے۔ ایک وسیع ہوسٹل زیر تعمیر ہے۔ تعلیمی سروے کے لیے بھی یہ لوگ تیار ہیں۔ ہماری اس درخواست کا بھی انھوں نے مثبت جواب دیا کہ مدارس انگریزی اسکولوں کے طالب علموں کو دین کی مبادیات سے روشناس کرانے کا جز وقتی اہتمام کریں۔

گھاگھرا پار کر کے مغرب کے بعد گورکھپور پہنچے۔ میاں صاحب جاسج اسلامیہ کالج میں جلسہ ہوا۔ کارواں کے دو رکن بیچ سے اٹھ گئے۔ انھیں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے جامعہ نسواں کے افتتاح میں شریک ہونا تھا۔ گونڈہ میں جا کر کارواں کو پھر پکڑا۔ اپنی بات پہنچائی! جلسہ جگر کالج میں تھا۔ یہاں الطاف صاحب نے لڑکیوں کا ایک اسکول چلایا ہے جو جگہ کے لحاظ سے تنگ داماں ہے۔ ملّی بینک نے ہاؤسنگ کی ایک اسکیم شروع کی ہے۔ وہاں ایک پلاٹ اسی اسکول کے لیے رکھا ہے ہم نے منت سماجت کی کہ اس سوسائٹی کا بار سوسائٹی پر ڈالیں اور اسکول کو اسے مفت دے دیں۔ یہاں یہ بات سننے میں آئی کہ ملّی بینک نے جو بہرائچ کے ملّی بینک کی شاخ ہے، اچھا کام کیا ہے اور فلاحی کاموں کے لیے مرکزی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ شب کو بہرائچ میں قیام اور میٹنگ۔ ملّی بینک بہرائچ کے بانی مولوی نعیم اللہ صاحب سے تا دیر گفتگو رہی۔ ہنسور کی تعلیمی سوسائٹی کے نمائندے بہرائچ سے سید حامد کو ایک پرانے وعدے کے مطابق فیض آباد لے گئے۔ بابری مسجد کی زیارت کراتے ہوئے۔ ہنسور ایک قصبہ ہے، اکبر پور، ٹانڈہ اور جلال آباد کے اطراف میں۔ یہ سب لوگ خوش حال ہیں۔ پڑھائی کا کچھ شوق پیدا ہو رہا ہے مشاعرہ تعلیمی مہم کو بڑھاوا دینے کے لیے کیا گیا ہے۔ خوق کریمی صاحب کا تخمینہ تھا کہ مشاعرے میں بیس ہزار افراد نے شرکت کی۔ جلسہ کو تعلیم کے موضوع پر تفصیل کے ساتھ خطاب کیا۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر مشاعرے کی صدارت کی۔ چار بجے لکھنؤ کی راہ لی۔ دس بجے وہاں سے شاہ جہاں پور کے لیے روانہ ہوئے جہاں اظہار الدین صاحب نے اہتمام، انتہائی باقاعدگی کے ساتھ کیا تھا۔ وہاں سے بریلی، جہاں عشا کے بعد ایک بڑی میٹنگ

میٹنگ ہوئی۔ دوسرے دن صبح کو مسایل پر گفتگو ہوئی۔ رام پور میں جامعۃ الصالحات کو دیکھنے کا موقع ملا۔ شہر کی جامع مسجد میں نمازیوں کو خطاب کیا۔ ان میں وہ حضرات دعوتاً شامل تھے جو اداروں سے تعلق رکھتے ہیں یا اُن کے بارے میں خواب دیکھتے ہیں۔ مغرب کے بعد مرادآباد پہنچے۔ عتیق صاحب نے جنت نشان اسکول میں انتظام کیا تھا۔ خواتین کو خطاب کرنے کا موقع بھی ملا۔ صبح کو بجنور کے لیے روانہ ہوے لیکن اس سے پہلے ہیومیٹ مسلم ہائی اِسکول کو ڈگری کالج بنانے کے بارے میں مشورے ہوے اور لائحہ عمل کا ایک خاکہ بھی سامنے آیا۔ کچھ نوجوان اُٹھ کھڑے ہوے ہیں، شاید کام بن جائے۔ بجنور میں تعلیمی سرگرمی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ راستہ میں ایک جلسہ مظفرنگر میں ہوا، راستہ میں دو ایک جگہیں دیکھیں جہاں ایک صاحب انجینئرنگ کالج قایم کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں کاغذات انجینئر نذیر احمد صاحب کے سپرد کیا اور ابتدائی مشورے دیے۔ مقامی اسکول دو گروہوں میں دال کی طرح بٹ رہا ہے۔ ثالثی کی پیش کش فضا میں ہے۔ شاید ہم میں سے کچھ کو دوبارہ وہاں جانا پڑے۔

کارواں اب منزل کے قریب آگیا تھا۔ دیوبند میں قمر کاظمی صاحب نے میزبانی کی۔ دیوبند کی جامع مسجد میں جہاں اب دارالعلوم (وقف) چل رہا ہے، طلبا کے وسیع مجمع کو حضرت مہتمم مولانا محمد سالم صاحب کی صدارت میں خطاب کیا گیا۔ یہاں تمہید سائنس کی ان ایجادات سے اُٹھائی گئی جن سے ہم فیض یاب ہو رہے ہیں اور بار بار پوچھا گیا کہ ان میں سے ایک ایک کی ایجاد میں ہمارا کیا دخل ہے۔ اس کے بعد اس دور کا ذکر کیا گیا جب ہم علوم کے قافلے کے سالار تھے جس کی بدولت یورپ میں سائنس کا احیا اور ٹکنولوجی کی ولادت ہوئی — آخرالذکر کا فیض ہم سب اُٹھا رہے ہیں۔ ہاں اس وقت جہالت کی وجہ سے ہم طفیلی بن گئے ہیں۔ لیں گے سب کچھ، دیں گے کچھ بھی نہیں۔ دوسرے دن کارواں طبیہ کالج گیا۔ وہاں ایک لحاظ سے اس ذیل کے آخری مذاکرات ہوئے۔ یہ کالج خودرو نظر نہیں آتا۔ ان دوسرے چھ طبیہ کالجوں کی طرح جن کی بنیاد اس ضلع میں رکھی گئی ہے اس نے اپنی معقول عمارت بنالی ہے اور کچھ ساز و سامان بھی حاصل کرلیا ہے۔ یہاں ذکر آیا کہ ہم نے شیخ الرئیس ابن سینا کے بعد آیا یونانی طب میں کوئی اضافہ کیا بھی؟ ہم حکیم ہونے پر فخر کیوں نہیں کرتے؟ خود کو ڈاکٹر کہلوانے پر کیوں اصرار کرتے ہیں؟ سہ پہر کو دارالعلوم میں حاضری (اور ضیافت) ہوئی۔ حضرت مہتمم سے رہروان کارواں کا تعارف کرایا۔ ان سے اجازت لے کر ہم نے دیوبند کو خیرباد کہا۔ راستے میں دو گھنٹے سہارن پور میں صرف کیے۔ مظاہرالعلوم (وقف) کی لائبریری دیکھی۔ حضرت مہتمم اور اساتذہ سے گفتگو کی۔ پھر مقامی کالج میں گئے اور اس کے بعد جلسہ گاہ میں۔ یہاں بھی مقامی کالج کو اختلافات نے گھایل کر رکھا ہے۔ تیاری کر کے ایک بار پھر آئیں گے۔ کارواں کی آخری (لیکن غیر رسمی) تقریر یہاں ہوئی اور کارواں دلی کے لیے ہشیار ہوگیا۔

مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے لیکن کارواں کی تصویر ہنوز نامکمل ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ یہ کارواں خشکوں اور متقی لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ ٹورسٹ بس بعض ہمراہیوں کی شگفتگی اور روشنیٔ طبع کی بدولت بعض اوقات زعفران زار بن جاتی تھی۔ عام انداز اور ماحول کشادہ دلی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا تھا۔ چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک کو دعا دیجیے کہ سفر باوجود گہری مقصدیت کے بے کیف نہ ہونے پایا۔ ٹھنڈا پانی اور موسمی پھل، رفیق راہ رہے باوجود گرمی اور رت جگوں، دھوپ اور لو اور اچھال دینے والے دھچکوں اور وقت ناوقت کے مرغن کھانوں اور

نیافتوں کے، ہم میں سے کوئی بیمار نہیں پڑا۔ معدے پر ضیافتوں کے بار اور نیند کے فشار کو جو لوگ برداشت نہیں کر پائے انھوں نے اپنے ساتھیوں کو مسکراہٹیں فراہم کر دیں ہماری بابت لوگ حیرت کرتے تھے کہ ان کے دل کو کیا لگی ہے کہ اس موسم میں در بدر مارے پھر رہے ہیں۔ کارواں کی پذیرائی کا ایک راز اس حیرت میں بھی پنہاں تھا لیکن وجہ اشتعال انگیزی اور انتہا پسندی اور جذبات فروشی سے مسلم عوام کی اکتاہٹ تھی جس نے بیزاری کی شکل اختیار کر لی ہے۔ وہ مرچ مسالے سے عاجز آچکے تھے۔ اب انھیں پرہیزی کھانے کی تلاش تھی تاکہ ذہن کی بگڑی ہوئی صحت سنبھل جائے۔ گفتار کی جگہ کردار لے، بے حسی اور بے نیازی کی جگہ علاقہ مندی، تہذیب کی جگہ تعزیر فتنہ و فساد سے مہلت جائز آچکی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے زخموں پر پھایا رکھا جائے۔ مظلومی کے دور سے نکل کر وہ انصاف اور خیر اندیشی کے عہد میں آنا چاہتی تھی۔ اُسے بھڑکانے والے نہیں چاہیے تھے، سمجھانے والے سیدھی راہ دکھانے والے درکار تھے۔ ایسے ایسے لوگوں کی آہٹ ملی اور وہ بے تابانہ گھروں سے نکل آئی۔ ان کی راہ میں آنکھیں بچھانے کے لیے۔

کارواں نے ایک پہلے سے بھیجے ہوئے خاکے کے مطابق ہر جگہ معلومات جمع کیں۔ تعلیمی سروے کرانے کی تمہید اٹھائی۔ نوجوانوں کو تعمیری کاموں کی طرف راغب کیا۔ کام کرنے والے نوجوانوں اور اداروں کو چن لیا گیا۔ ان کی ایک فہرست بنائی گئی۔ ان سے بہت سے کام نکلیں گے۔ وہ مسایل قلم بند کیے جن کو حل کرنے میں کارواں مدد کر سکتا ہے۔ کمیٹیاں بنوائیں یا بنوانے کی طرح بیل ڈالی جن سے رابطہ کمیٹی خط و کتابت کرے گی اور جن کے لیے ضروری پروگراموں کو عمل میں لائے گی کارواں گزر گیا لیکن نقش پا چھوڑتا ہوا مستقبل کی تعمیر اسی نقش پر ہوگی۔ یو۔ پی والے کارواں کو یاد رکھتے ہیں اس کے نقش قدم پر چلتے ہیں یا اسے بھول جاتے ہیں اس پر انحصار ہوگا۔ ان کے اتحاد، خوش حالی اور پیش رفت کا۔ کارواں ایک چھوٹی سی، حقیر سی کوشش ہے لیکن کیا وہ بیج کبھی جو زمین میں رہ کر انکھوا نکالتا ہے اور تناور درخت بن جاتا ہے، چھوٹا سا نہیں ہوتا۔ یہ تو زمین پر منحصر ہے کہ وہ اسے اپنے بطن میں جگہ دیتی ہے اور پروان چڑھاتی ہے یا اُسے گرد کے ساتھ ہوا کے لیے بار دوش بنا دیتی ہے۔ یہ سادہ سے خطوط، جنھیں کارواں نے نامۂ ہدایت اور لائحہ عمل بنایا، ملک اور ملت کی خوش حالی اور راست روی کی ضمانت دے سکتے ہیں۔ کارواں، یہ چھوٹا سا کارواں، پندار ناشناسی اور انکساری کے باوصف احرار ملت کی طرح بڑے تحمل سے جادہ پیما ہوا۔ انسانیت اور ملنساہت نے ہر قدم پر اس کے پانو چومے۔ عوام اور ان کے ترجمانوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ۱۰ اپریل کو ٹائمز آف انڈیا نے اس کی پذیرائی کی۔ ہندی 'آج' نے جو مسلمانوں کے تئیں گوشۂ خاطر نہیں رکھتا، اپنے اداریے میں اسے خوش آمدید کہا۔ بنارس میں 'آواز مشرق' نے اسے ایک طویل اداریے میں خراج سپاس ادا کیا۔ قنوج میں مقامی کالج کے ہندو پروفیسروں نے کارواں کے لائحہ عمل کو سراہا۔ دیوبند میں ٹھاکر ملکھان سنگھ نے سر منبر اس کی تعریف کی۔ ہندی اردو صحافیوں نے ہر جگہ کارواں کو دوررس تفہیم اور ترقی کی سبیل قرار دیا۔ نکتہ رس لوگوں نے کارواں کی طرز روش میں پُر امن، پُر سکون اور با انصاف ہندوستان کی جھلک دیکھ لی۔ کارواں نے عصری اور دینی اداروں اور انجمنوں کے درمیان فرق نہیں کیا۔ دونوں نے اس کی آؤ بھگت کی، اسے ٹھہرایا، اس کی ضیافت کی، اس کی باتیں سنیں۔ کارواں میں دینی علوم کی ترجمانی ایک

فرد واحد تک محدود تھی۔ آپ نے دیکھا عصری تعلیم کے فارغین پر دینی اداروں کے ارباب اہتمام نے اعتراض یا تامل کی انگلی بھی نہیں اٹھائی۔ انھیں اپنے ادارے، اپنے گھر، اپنے دل میں جگہ دی۔ پھر اہل وطن کو یہ اندیشہ کس لیے کہ مدرسے اپنے طالب علموں کو کٹر پنتھی اور روڑھی وادی اور بنیاد پرست بناتے ہیں۔ مدرسے تو کشادہ دلی کے ساتھ اس بات کے لیے بھی راضی نظر آتے ہیں کہ ان کے نصاب میں بہ تدریج اہم عصری مضامین کو شامل کر لیا جائے لیکن اس کے لیے درکار ہوں گے وسایل، اساتذہ نصاب اور تدریس کے اوقات کی توسیع اور ان میں ترمیم۔ ملک شاید جلد ہی یہ محسوس کرے کہ اگر تشدد دہشت گردی اور بے ایمانی سے نجات حاصل کرنی ہے تو ان اداروں کو عزت کا مقام دینا ہوگا جو اخلاقی تعلیم و تربیت پر زور دیتے ہیں۔ بدگمانی اور نخوت سے مسایل حل نہیں ہوتے اور الجھ جاتے ہیں۔ تہذیبوں کو ان کے مزاج کے مطابق پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے تو کدورت، عداوت اور تنگ نظری سب دُھل جاتی ہیں۔ یہ سارواں صرف تعلیمی سارواں نہیں تھا۔ اس کے سرچشمے سے بہت سے سوتے پھوٹ سکتے ہیں، اتحاد باہمی خیر اندیشی، انسان دوستی، حب وطن، افہام و تفہیم، حسن ظن، جہد و عمل، اصلاح و تعمیر، باب وقت کم ہے مگر کس کس کے میدان جہد میں کودنے کا اور وطن کی ترقی کے لیے دست تعاون بڑھانے کا ہے۔ اگر ہم پسماندہ اور ان پڑھ رہ گئے تو وقت کا تیز رو کارواں ہماری طرف دیکھے گا بھی نہیں۔ ہمیں روندتا ہوا، کچلتا ہوا آگے بڑھ جائے گا۔

ایک عرصے کی غفلت کے بعد یوپی کے مسلمان جابجا تعلیم کی طرف دھیان دیتے ہوئے نظر آ رہے ہیں ان چنگاریوں کو بر وقت ہوا دے دی گئی تو وہ سارے مطلع کو منور اور ملک و ملت کے مقدر کو درخشاں کر دیں گی۔ اگر ان کی طرف دھیان نہیں دیا تو وہ ذرا دیر میں بجھ کر رہ جائیں گی۔ اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟

"تعصب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا اور دیدہ دانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔"

سرسید رح

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۱۱ شمارہ ۷ (جولائی ۹۲ء)

# اردو کو ختم کرنے کی ناپاک سازش

جیوتی سروپ سنگھ ○

آزادی کے ان ۴۴ سالوں میں اردو زبان پر جو ظلم ہوا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اتر پردیش میں تو لوگ اسے ذبح کرنے کے درپے ہیں!

اردو کا مسئلہ کسی مذہبی اقلیت کا مسئلہ نہیں، بلکہ لسانی اقلیت کا مسئلہ ہے۔ اردو زبان کسی فرقے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے۔ دونوں قوموں نے اسے بنایا، سنوارا ہے۔ عروس اردو کو سب نے یکساں پیار کیا ہے، اس کے گیسوؤں کی مشاطگی کی ہے۔ اس کی شیرینی اور لطافت پر ہندو اور مسلمان ہی نہیں، سکھ اور انگریز بھی سو جان سے فدا رہے ہیں!

## ناانصافی

ناظرین کو یہ جان کر سخت افسوس ہوگا کہ اپنے اتر پردیش میں اردو میڈیم کا ایک بھی سرکاری پرائمری اسکول نہیں ہے، جب کہ یہاں ایک کروڑ سے زیادہ لوگ اردو بولتے ہیں۔

بہار میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۷۰ لاکھ سے بھی کم ہے لیکن وہاں ۵۵۰۰ سرکاری پرائمری اسکول اردو میڈیم ہیں۔

کرناٹک میں ۳۵ لاکھ لوگ اردو بولتے ہیں لیکن وہاں اردو میڈیم سرکاری پرائمری اسکول ۲۸۵۳ ہیں۔

مہاراشٹر میں ایسے ۲۱۰۳ پرائمری اسکول ہیں جب کہ ۴۳ لاکھ ہی اردو بولتے ہیں۔

آندھرا میں اردو بولنے والے لوگ ۴۲ لاکھ ہیں اور اسکولوں کی تعداد ۱۱۳۵ ہے۔

مرکزی نظام دہلی کے علاقوں میں ۳ لاکھ ۶۲ ہزار لوگ اردو بولتے ہیں لیکن ۱۹۵ پرائمری اسکولوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔

مغربی بنگال میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۱۲ لاکھ ہے اور اردو میڈیم سرکاری پرائمری اسکول ۲۲۰ ہیں۔ وہاں نجی اداروں اور پرائمری اسکولوں میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے لیکن انھیں سرکار سے مالی امداد ملتی ہے۔

مسلمان دشمنی کے زعم میں اردو زبان کو ختم کرنے کی سازش ایسی ہے جیسے تاریخ کبھی

---

○ محلہ بدرقہ، اعظم گڑھ۔ یو۔پی۔

معاف نہیں کر سکتی ۔ یہ بھی تعصب اور فرقہ واریت کا گھنونا ثبوت ہے !

ہم چین اور روس کی بات نہیں جانتے لیکن ہندوستان کی عام جنتا کسی بھی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتی ۔

غریب، نادار اور فاقہ کش عوام کو مندر مسجد کے بکھیڑے سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ دیر و حرم کے چکر میں بھی نہیں پڑنا چاہتا۔ اسے یہ بھی فکر نہیں کہ صوبہ یا مرکز میں کس کی حکومت ہے ۔ وہ تو محض روزی، روٹی، کپڑا اور مکان کے جھگڑے میں رات دن پریشان ہے ۔

ہندوستان کا عوام اپنے حکمرانوں سے صرف یہی توقع کرتا ہے کہ جب وہ راستہ چلے تو اسے کوئی گالی نہ دے، مارے پیٹے نہیں ۔ اس کی جان و مال اور عزت آبرو محفوظ رہے ۔ اسے بیمار پڑنے پر سرکاری اسپتالوں سے مفت دوا دارو مل جائے۔

ضروریات زندگی کا سامان افراط اور معقول قیمت پر ملے ۔ آپ ہی بتائیں عام آدمی اور کیا چاہتا ہے ؟ کیا ہر آدمی منسٹر یا ایم۔پی اور ایم۔ایل اے بننے کی خواہش کرتا ہے ؟ ہندوستان کی پبلک نہایت سادہ ہے اس کی خواہشات بالکل محدود ہے ۔ افسوس اسے بھی حکومت پورا کرنا نہیں چاہتی ۔

بدقسمتی سے ہمارا ملک اور خاص طور پر اپنے اتر پردیش کے حکمراں عوام کو مندر مسجد کے فتنہ میں الجھا کر ضروری اور اہم مسائل سے دور رکھنا چاہتے ہیں ۔

ہمارے صوبے میں فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ اشتعال انگیزی اب تک ہزاروں بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے باوجود بھی عدالت کے کٹہرے سے باہر ہی رہی ہے ! شاید اس لیے کہ فرقہ واریت پچھلے ۴۴ سالوں میں اتنی قدآور ہو چکی ہے کہ قانون کے ہاتھ اس کے گریبان تک نہیں پہنچ پاتے !!

اس صوبے کی جنتا غنڈوں اور بدمعاشوں سے بے حد خوف زدہ ہے ۔ پہاڑی اور ترائی کے علاقے دہشت پسندوں کے خونی پنجوں میں رفتہ رفتہ جکڑتے جا رہے ہیں ۔ نوکر شاہی ظلم و ستم روز تگڑا ہو رہا ہے !

یارو ! پروردگار نے یہ زندگی خدمت خلق کے لیے بخشی ہے، کرسی پرستی کے لیے نہیں ۔

"اس مغالطے میں نہ رہو کہ قسمت تمہاری تلاش کر رہی ہے سچ یہ ہے کہ تم خود قسمت کی تلاش میں ہو ۔ اگر تم وہ تمام شرطیں پوری کر دو جو خوش قسمتی کے لیے ضروری ہیں، پھر قسمت کی دیوی تم پر ضرور مہربان ہوگی ۔"

گار فیلڈ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۱۱، شمارہ ۷، (جولائی ۹۲ء)

# دنیا بھر میں بیروزگاری

علی ذوالفقار ○

آج کے نوجوانوں کے لیے ان کے پہلے روزگار کے حصول کا مطلب صرف یقینی آمدنی ہی نہیں بلکہ یہ چیز ان کے ذاتی تشخص کا بھی ذریعہ ہوتی ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقی سرگرمی کے ذریعے سے زندہ ہیں۔

نوجوان اس بات سے آگاہ ہوتے ہیں کہ اپنے پہلے روزگار کے حصول کے ساتھ وہ ایک نئی سماجی حیثیت اور ایک ایسا نیا اسلوب زندگی حاصل کر لیتے ہیں جو ایک ایسے طالب علم کے اسلوب زندگی سے جو اپنے خاندان کا دست نگر ہے اور محرومی کا شکار ہے بے روزگار شخص کے اسلوب زندگی سے مختلف ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ برسر روزگار ہو جانا سماج میں داخل ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔

روزگار کی دنیا میں یہ داخلہ کوئی آسان معاملہ نہیں ہوتا۔ نہ صرف یہ کہ روزگار کے مواقع کم یاب ہیں بلکہ اکثر نوجوانوں کے لیے یہ بات عملاً ناممکن ہوتی ہے کہ وہ ایسا کام حاصل کر سکیں جس کی انھوں نے عملاً تربیت حاصل کی ہے اور جس کے وہ متمنی ہوتے ہیں اور وہ نوجوان جنھیں خوش قسمتی سے اپنا پہلا روزگار جلد مل جاتا ہے تو انھیں اس امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ ان میں پیشہ ورانہ تجربے اور مہارت کی کمی ہے خواہ وہ بالکل وہی کام کر رہے ہوں جو پرانے ملازمین کر رہے ہیں۔

چنانچہ روزگار کی تلاش ایک مشکل کام ہے جس میں ہمیشہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اسکولوں یا فنی اداروں سے نکلنے کے بعد جہاں انھیں ایک حیثیت حاصل تھی اور جہاں ان کے پاس کام تھا اور جہاں وہ اپنے ساتھیوں میں اچھی طرح جانے پہچانے جاتے تھے جن نوجوانوں کو روزگار نہیں ملتا ان کا بیروزگاری سے واسطہ پڑتا ہے اور یہ ایک ایسی صورت حال ہوتی ہے جس کا سامنا کرنے کے لیے نہ تو خاندان نے تیار کیا ہوتا ہے اور نہ اسکول نے۔ بیروزگاری اور اس کے ساتھ رہنے والی محرومی بحران کے ایک دور کو جنم دیتی ہے اور سماجی اور ثقافتی اقدار کے بارے میں شکوک پیدا کرتی ہے۔

اس قسم کی جدوجہد مذکورہ ممالک کے لڑکے اور لڑکیوں کا مشترکہ تجربہ ہے۔ اگرچہ ان مشکلات کی

---

معرفت ماہنامہ طالب علم کراچی، پاکستان

نوعیت کے مطابق کہ جو درپیش ہیں متعلقہ سماج اور خاندان کے طرز کے مطابق نیز عمر، جنس اور انفرادی مزاج کے مطابق فرق پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سروے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نوجوانوں میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والی لڑکیاں، کم عمر نوجوان اور ایسے نوجوان ہیں جن کی اسکولوں کی تعلیم یا تو معمولی ہے یا بالکل نہیں ہے۔

بعض صورتوں میں روزگار کے حصول کا انحصار ذاتی خصوصیات کے بجائے اتفاق خاندان کے حالات اور رابطوں پر ہوتا ہے۔ بعض دوسری صورتوں میں ایک ڈپلوما یا عملی تجربے کے باعث روزگار کی کلید ہاتھ میں آسکتی ہے ہنگری کے علاوہ جہاں ایسی تعلیم روزگار کے حصول کا ایک یقینی ذریعہ معلوم ہوتی ہے (اگرچہ ضروری نہیں کہ کام اپنی مرضی اور پسند کا ہو) باقی تمام مذکورہ ممالک میں تعلیم اور روزگار کے درمیان روابط زیادہ تر بالواسطہ اور غیر یقینی ہیں۔

مثال کے طور پر اسپین میں سروے کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیمی نظام اور معیشت اور محنت کی مارکیٹ کے درمیان ایک خلیج موجود ہے۔ پوراگوئے میں اکثر نوجوانوں نے یہ بتایا کہ رسمی تعلیم حصول روزگار میں یا انھیں تفویض کیے جانے والے کاموں کی تکمیل میں یا تو بہت کم مددگار ثابت ہوئی یا بالکل ہی مددگار ثابت نہیں ہوئی۔ تاہم انھوں نے اپنی تعلیم کو ذاتی ترقی، حیثیت اور سماجی روابط کے لحاظ سے مفید پایا اور یہ محسوس کیا کہ بعد میں وہ مزید ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔

سروے کیے جانے والے چھ ممالک میں ہنگری دوسروں سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ ہنگری میں ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا فروغ محنت کی مارکیٹ کے فروغ سے آگے بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اگرچہ یہاں بے روزگاری کا وجود نہیں، تاہم بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اکثر ایسے کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں جو ان کی صلاحیت کے کم درجے کے ہیں۔ اس کے نتیجے میں تعلیم کی دنیا اور محنت کی دنیا میں ایک قسم کی کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔

ہندوستان اور سینیگال میں بھی زیادہ تعلیمی حیثیت کا مسئلہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کے بہت سے نوجوانوں نے بتایا کہ جو تعلیم انھوں نے حاصل کی وہ اس سطح سے کہیں زیادہ ہے جو ان کاموں کے لیے درکار ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ بے روزگار نوجوانوں نے یہ بتایا کہ انھیں اپنے تعلیمی معیار کے مطابق کام نہیں ملا۔ یہ صورت حال بڑے بڑے شہری مراکز میں زیادہ نظر آتی ہے، جہاں تعلیمی نظام بہتر ہے۔

عام تعلیم کے برخلاف کسی کام کی خاص مہارت اور مطلوبہ اہلیتوں کے حصول میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں لڑکے لڑکیوں سے زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوتے۔ مثال کے طور پر ہنگری میں ٹیکنیکل اسکولوں کے زیادہ تر طلبا لڑکے ہیں جب کہ ثانوی اسکولوں میں اکثریت لڑکیوں کی تھی۔ نتیجہ لڑکیاں تعلیم کی اعلیٰ سطح کی حامل ہیں لیکن بہتر ملازمتیں لڑکوں ہی کو ملتی ہیں۔

ٹیکنیکل ٹریننگ کے حصول کی سہولتیں ایک ملک سے دوسرے ملک میں بسا اوقات زیادہ مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر ہنگری میں ٹیکنیکل ٹریننگ صرف خصوصی اسکولوں میں حاصل کی جا سکتی ہے جب کہ پوراگوئے میں بہت سے نوجوان اپنی ٹیکنیکل کام ٹریننگ کے دوران" ان مراکز میں حاصل کرتے ہیں جہاں اپرنٹس کے طور پر داخل ہوتے ہیں یا اپنے خاندان میں حاصل کرتے ہیں جہاں ان کے والدین انھیں کام سکھاتے ہیں۔ یہ اختلافات قانونی نقطۂ نظر اور

[redacted]

روزگار کے نقطۂ نظر سے واضح نتائج کے حامل ہوتے ہیں عام طور پر صنعتی ممالک میں (یہاں ہنگری میں) نوجوانوں کو ترقی پذیر دنیا کے نوجوانوں کے مقابلے میں جو اپنی ٹریننگ تجربے کے ذریعے حاصل کرتے ہیں قانونی اور سماجی لحاظ سے زیادہ بہتر تحفظ حاصل ہے۔

بالغوں کے مقابلے میں کم عمر نوجوان کے لیے مستقل روزگار حاصل کرنا زیادہ مشکل ہے۔ ان نوجوانوں کے مطابق جن کے انٹرویو لیے گئے اس کی کئی وجوہات ہیں بہت سے آجر کم عمر نوجوانوں کو ملازمت دینے سے ہچکچاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ناتجربہ کار ہیں یا یہ کہ وہ پیداوار کی شرح کو گھٹا دیں گے۔ بعض دوسرے آجروں کو یہ خدشہ لاحق رہتا ہے کہ لڑکوں کو فوجی خدمت کے لیے بلا لیا جائے گا۔

ان تعصبات کی بنیاد پر بہت سے کم عمر کارکن مستقل معاہدوں کے بغیر یا سوشل سیکورٹی کے کسی تحفظ کے بغیر کام کرتے ہیں اور عملی طور پر ایک متوازی یا زیر زمین معیشت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسپین میں انھیں اکثر کم اجرت والے جزو وقتی یا موسمی کام ملتے ہیں یا وہ چھوٹے چھوٹے خاندانی کاروباروں میں کام کرتے ہیں جہاں بعض اوقات انھیں کوئی اجرت نہیں ملتی۔

لڑکیوں کی مشکلات تو اور بھی زیادہ ہیں جیسا کہ اسپین اور ہندوستان کے سروے سے ظاہر ہوتا ہے لڑکیوں کے ساتھ لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ امتیاز برتا جاتا ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں نے اپنے جوابات میں اس بات سے اتفاق کیا کہ آجر لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلے میں کم تر صلاحیت کا حامل سمجھتے ہیں۔ خواہ ان کی تعلیمی استعداد بہتر ہی کیوں نہ ہو۔ عملی طور پر لڑکیوں کو سب سے کم درجہ کے کام دیے جاتے ہیں۔ انھیں اجرت بھی کم ملتی ہے اور لڑکوں کے مقابلے میں ان کی ترقی کے امکانات بھی محدود ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں جیسا کہ اسپین کے سروے سے ظاہر ہوا۔ روزگار کے ابتدائی حصول اور ترقی کے امکان دونوں کا انحصار بڑی حد تک کسی لڑکی کی جسمانی کشش پر ہوتا ہے۔

جن نوجوانوں سے انٹرویو لیے گئے ہیں ان میں سے اکثر بلا امتیاز جنس روزگار کی دنیا میں داخلے کے سلسلے میں مثبت رویے کے حامل تھے۔ تاہم اولین روزگار کی تلاش میں دشواری اور پریشانی میں اضافہ روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے۔

بہت سے نوجوانوں نے بتایا کہ حصول روزگار کی کئی ناکام کوششوں کے بعد انھیں (عارضی یا مستقل) بیروزگاری کو اختیار کرنا پڑا۔ سینگال اور الجزائر کے سروے کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی تعلیم کی ایک بہت نچلی سطح اور پیشہ وارانہ ٹریننگ کے فقدان کے نتیجے میں بیروزگاری جنم لیتی ہے۔ مثال کے طور پر الجزائر میں نوجوان بیروزگاروں کی بڑی تعداد کسی پیشہ ورانہ تربیت کی حامل نہیں تھی اور صرف پرائمری کی سطح تک تعلیم یافتہ تھی۔

غیر تعلیم یافتہ (بے روزگار) نوجوان اپنے آپ کو محرومی کا شکار پاتے ہیں۔ ان حالات میں بقا کی جدّ و جہد اور بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ صرف مادّی روزگار نہیں بلکہ آدمی کا تشخص بھی ضروری ہوتا ہے۔ سروے کرنے والوں نے الجزائر کی صورت حال کے بارے میں جو نتائج اخذ کیے ہیں ان میں سے ایک کا یہاں حوالہ دیا جاتا ہے۔ بے روزگاری ابتدائی تعلیم کے فقدان اور نوجوانوں کے عزائم کے درمیان واضح ربط کی تلاش کے بغیر صرف یہ جان لینا کافی ہوگا کہ جیلوں میں بند قیدیوں کی ۶۰ فیصد تعداد نوجوانوں پر مشتمل ہے (جب کہ کام کاج والی آبادی میں نوجوانوں کا تناسب ۲۷ فی صد ہے)

چنانچہ آج نوجوانوں میں تقریباً ہر جگہ بے یقینی اور عدم تحفظ
یا جاتا ہے۔ بہت ہی کم نوجوان ایسے ہیں جنھیں ملازمت کے
زرہ اور طویل المیعاد معاہدوں اور سماجی تحفظ کے فوائد
یقین ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر نامساعد اور
یر منصفانہ شرائط پر ملازمت قبول کرنے کے بجائے
ن میں سے بہت سے نوجوان یا تو نجی قسم کے غیر رسمی
زیر زمین شعبے میں خود اپنا چھوٹا موٹا کاروبار قائم کرنے
کا خطرہ مول لیتے ہیں اور یا پھر وہ بہتری کی امید میں اپنے
طن سے باہر چلے جاتے ہیں۔

سروے کے
تائج سے یہ بھی ظاہر ہوتا
ہے کہ معاشی مشکل
یں خاص طور پر ترقی پذیر
ممالک میں اکثر لڑکیوں
ور نوجوان لڑکوں کو
سب سے پہلے ملازمت
سے عارضی طور پر علیحدہ
کیا جاتا ہے اور انہیں
اس کا کوئی معاوضہ
یا الاؤنس نہیں دیا
جاتا۔

بڑے اور چھوٹے اداروں کے درمیان
ملازمتوں کے استحکام میں بھی واضح فرق موجود ہے۔
بڑی بڑی فرموں میں نوجوان کارکنوں کو عام طور پر
مستقل معاہدے کی سہولت اور سماجی تحفظ حاصل ہوتا
ہے جب کہ چھوٹی فرموں میں کام کرنے والے اکثر نوجوانوں
کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں مذکورہ ممالک
میں سے کئی ایک میں نوجوان عام طور پر اپنے بالغ ساتھیوں
کے مقابلے میں زیادہ وقت تک کام کرتے ہیں۔ کیونکہ

ان کے تحفظ کے قواعد یا تو سرے سے موجود ہی نہیں یا
پھر ان پر عمل نہیں کیا جاتا۔

اجرتیں اس قدر کم ہیں کہ نوجوان کارکن
اچھی زندگی نہیں گزار سکتے۔ معاوضہ عام طور پر اس
سطح سے کم تر ہوتا ہے جس کی وہ اپنی پیشہ وارانہ صلاحیت
کی بنا پر مستحق ہوتے ہیں۔ یہی بات بے اطمینانی کا باعث
ہوتی ہے۔

نوجوانوں کے لیے ترقی کے امکانات
بہت کم ہیں اور وہ خود کو اس پرانے مطلق العنان
ڈھانچے کے نیچے دبا ہوا
محسوس کرتے تھے جو
زیادہ تر کاروباری اداروں
میں موجود ہے اور جو
انھیں ان کے حقوق سے
محروم کرتا اور ان کے وقار
کو مجروح کرتا ہے۔ دیگر
تمام معاملات میں بھی
سب سے زیادہ متاثر
لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔
کیا کافی روزگار موجود ہوگا
نئے روزگار کی ضرورت میں ہر سال اضافہ ہوتا
ہے۔ روزگار کے خواہاں لوگوں کی تعداد کا تعین ہر
سال پندرہ بیس سال پہلے پیدا ہونے والوں کی
تعداد کے مطابق کیا جاتا ہے۔ چنانچہ آج کی شرح
پیدائش ان ملازمتوں کی تعداد کا تعین کرتی ہے
جو ۲۰۰۰ یا ۲۰۰۵ میں درکار ہوں گی۔

۱۹۷۰ سے ۲۰۰۰ تک کے دوران
شہری اور دیہی علاقوں میں نوجوان کی آبادی میں منصوبے
کے مطابق اضافہ

"ایک مدت اسی غم میں پڑا سوچتا رہا کہ کیا
کیجیے جو خیالی تدبیریں کرتا تھا کوئی بن پڑتی معلوم
نہ ہوتی تھیں۔ جتنی امیدیں باندھتا تھا سب ٹوٹ
جاتی تھیں۔ آخر یہ سوچا کہ سوچنے سے کرنا بہتر ہے
کرو جو کچھ کر سکو۔ ہو یا نہ ہو۔ اسی بات پر دل
ٹھہرا۔ ہمت نے ساتھ دیا اور صبر نے سہارا
اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا۔

سر سید احمد خان

| | شہری | دیہی |
|---|---|---|
| تمام ترقی پذیر ممالک | ۲۰۰ فیصد | ۳۴ فی صد |
| افریقہ | ۳۶۴ " | ۸۲۰ " |
| جنوبی ایشیا | ۲۲۳ " | ۵۴ " |
| لاطینی امریکہ | ۱۶۰ " | ۱۳ " |

دنیا کی بیشتر آبادی دیہی اور زرعی ہے۔ اگرچہ نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد دنیا کے شہروں میں رہتی ہے تاہم بہت سے نوجوان روزگار کی تلاش میں زراعت کی جانب رجوع کرتے ہیں لیکن ان کے لیے بھی مستقل کام کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگوں کو خوش قسمتی سے موسمی روزگار مل جاتا ہے۔

مثال کے طور پر بنگلہ دیش میں ۸۰ فیصد آبادی دیہی ہے اور اس میں سے نصف کے پاس کوئی زمین نہیں۔ یہ آبادی روزگار کے لیے مالکان زمین کی موسمی ضروریات پر انحصار کرتی ہے۔ (ماخوذ)

"سارے قرائن یہ کہہ رہے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان تیز رو ادبار سے دوچار ہیں۔ ان کے رو بہ زوال ہونے کی کہانی اعداد و شمار کی زبانی سنیے اور ان کی کم اعتباری اہل وطن کی نگاہوں سے دیکھیے۔ ان کی بے بضاعتی پر ارباب اقتدار کو خندہ زن پائیے۔ جب قوئ میں اضمحلال آجائے گا، جب ہمت ٹوٹ جائے گی، جب احساس تنا گرنت سے نکل جائے گا جب اچھے اور برے اہم اور غیر اہم کا امتیاز باقی نہ رہے گا، جب اتحاد کا دامن پارہ پارہ ہو جائے گا جب ملت کا شیرازہ بکھر جائے گا تو اسے عزت کی نگاہ سے کون دیکھے گا، اسے کون وقعت دے گا، کون اسے اپنے پاس بٹھائے گا۔ ہم اہل وطن کی نگاہوں میں جو سبک ہوئے ہیں یہ بے وجہ نہیں ہے۔"

سید حامد

# ایک جاگیردار خاندان کی باشعور اور روشن خیال لڑکیاں

ریاض الرحمٰن خاں شیروانی ○

نواب سر مزمل اللہ خاں شیروانی رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ (۱۸۶۶–۱۹۴۸ء) اپنی نسل کے ایک روشن خیال بزرگ تھے - وہ والد ماجد کی وفات کے سبب کم عمری میں صاحب حیثیت ہو گئے تھے اور اسی وقت سے سر سید احمد خاں کے زیر اثر آ گئے تھے - انھوں نے علی گڑھ تحریک کے جن پہلوؤں کو قبول کیا تھا ان میں سیاست بھی شامل تھی اوّل تو زمیں دار ہونے کے ناتے ہی وہ غیر ملکی حکومت سے تعاون کرنے پر مجبور تھے اور پھر علی گڑھ تحریک نے اس تعاون کو عقلی اساس بھی مہیا کر دی تھی - وہ جس خاندان اور جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس میں اس وقت تک لڑکیوں کی تعلیم کا رواج بہت کم تھا اور جتنا رواج تھا اس کا دائرہ بہت محدود تھا - نواب صاحب مرحوم کی پہلی اہلیہ سے ان کے ایک بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں - خیر بیٹے کو تو انھوں نے ایم. اے. او کالجیٹ اسکول علی گڑھ میں تعلیم دلائی اور انھوں نے میٹرک کیا لیکن بیٹیوں کی تعلیم کا گھر ہی پر رہ کر پردے کی پابندی کے ساتھ اعلیٰ پیمانے پر انتظام کیا - بالخصوص ایران کے ایک فاضل اور باکمال شاعر آغا حسن تسخیر (جو ضلع علی گڑھ کے شیروانی خاندان کے رؤسا کے یہاں آکر اکثر قیام کرتے تھے) کی ہمشیرہ کو رکھ کر فارسی میں مہارت پیدا کرائی - نواب صاحب مرحوم کی بڑی ہمشیرہ جو خاندان ہی کے ایک موضع دتاولی میں منسوب تھیں، اکثر نواب صاحب کے ساتھ قیام کرتی تھیں - ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں - ایک بیٹا، بیٹی تو اس وقت چھوٹے تھے لیکن بڑے بیٹے اور بیٹی نواب صاحب کی اولاد کے ہم سن تھے اور تعلیم و تربیت میں ان کے ساتھ شریک رہتے تھے - خود ان کے والد ماجد مولوی محمد یونس خاں شیروانی (۱۸۶۸–۱۹۴۸ء) بھی عالم تھے اور انھوں نے بھی اپنے طور پر اپنی اولاد کو مناسب تعلیم دلائی تھی - اس طرح یہ پانچ لڑکے، لڑکی، جو آگے چل کر نوجوان بنے ہم سن ہونے کے علاوہ ہم ذوق بھی ہو گئے اور ذوق کی یہ یک سانیت مختلف شکلوں میں نمایاں ہوئی - مثلاً پانچوں نے شاعری کی، پانچوں کو خاندان کی فلاح و بہبود، بالخصوص تعلیم نسواں کے فروغ سے دل چسپی پیدا ہوئی - پانچوں جاگیردار خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود ملک میں چلنے والی ہوا کے حریت سے

---

○ سابق استاد شعبۂ عربی - اے ایم یو - علی گڑھ - حبیب منزل - میرس روڈ، علی گڑھ

سرشار ہوئے اور پانچوں کے دل عالمِ اسلام کے درد
سے آشنا ہوئے۔ انھیں سودیشی تحریک سے شغف تھا
اور قومی رہنماؤں، بالخصوص حریت پسند مسلم رہنماؤں
سے عقیدت تھی۔ اگرچہ ان میں سے بعض کے ہیرو جُدا
جُدا تھے۔

نواب مزمل اللہ خاں صاحب کی بڑی صاحبزادی
کا نام احمدی بیگم تھا اور وہ نکہت تخلص کرتی تھیں۔ ان
کی ولادت ۱۸۹۳ء میں ہوئی تھی۔ وہ ۱۹۶۲ء تک حیات
رہیں۔ دوسری صاحب زادی کا نام زاہدہ خاتون تھا۔
وہ ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا تخلص نزہت
تھا۔ ۱۹۲۲ء میں ناکتخدائی کی حالت میں وفات
پا گئیں۔ صاحب زادے احمد اللہ خاں ۱۸۹۶ء میں عالمِ
وجود میں آئے اور ۱۹۱۶ء میں راہی ملک بقا ہوئے
یہ بھی شاعر تھے اور ان کا تخلص حیراں تھا۔ نواب صاحب
کے بڑے بھائی محمد انس خاں کی ولادت ۱۸۹۳ء کی
تھی اور وفات ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔ وہ ابرؔ سے متخلص
تھے۔ ان کی بڑی ہمشیرہ انیسہ خاتون کا صحیح سال ولادت
معلوم نہیں ہو سکا لیکن اندازاً وہ ۱۸۹۶ء کے لگ بھگ
پیدا ہوئی تھیں۔ شروع میں پنہاںؔ تخلص کرتی تھیں، پھر
بدل کر انیسہ رکھ لیا تھا۔ ان کی رحلت ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔
مندرجہ بالا حالات سے واضح ہو جاتا ہے کہ زاہدہ خاتون
احمد اللہ خاں اور محمد انس خاں نوجوانی ہی میں وفات
پا گئے۔ زاہدہ خاتون کا انتقال بھائی سے چھ سال کے
بعد ہوا اور اس مدت میں وہ اور انیسہ خاتون (جن
کے بھائی بھی احمد اللہ خاں کے دو ہی سال بعد چل بسے
تھے) مل کر اپنے اپنے بھائیوں کی برابر نوحہ خوانی کرتی
رہیں۔ ان سب میں زاہدہ خاتون سب سے زیادہ
لائق، حساس اور باشعور تھیں۔ شاعری میں بھی ان کا
مقام ان سب سے بلند تھا۔ دراصل وہی دوسروں
کو بھی شاعری پر اکساتی تھیں۔ ان کا دیوان "فردوسِ تخیل"
جو ۱۹۴۱ء میں دار الاشاعت پنجاب، لاہور سے شائع
ہوا، ان کے شاعرانہ کمالات کی دستاویز ہے۔ اس سے
پہلے "آئینۂ حرم" ۱۹۲۱ء میں ان کی حیات میں شائع
ہوا تھا۔ انیسہ خاتون صاحبہ نے بھی ۱۹۲۶ء میں اپنا
کلام "انیسیات" کے نام سے شائع کرا دیا تھا۔ ایک
قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ "آئینۂ حرم"، "فردوسِ تخیل"
اور "انیسیات" کی اشاعت تو بہت بعد کی بات ہے
جس وقت ان لڑکیوں بالخصوص زاہدہ خاتون نے
شاعری کا آغاز کیا اور اپنا کلام رسالوں میں شائع
کرانا شروع کیا اس وقت گھریلو پابندیاں اتنی شدید
تھیں کہ یہ اپنا نام ظاہر کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھیں
چنانچہ زاہدہ خاتون شروانیہ ادبی حلقوں میں ز۔ خ۔
ش کے نام سے متعارف رہیں۔ یہاں ہمیں ان لڑکوں
کی ادبی حیثیت سے بحث مقصود نہیں ہے بلکہ ان کے
سماجی شعور اور سیاسی رجحانات کا جائزہ لینا مطلوب
ہے۔ ایک طرف احمدی بیگم اور زاہدہ خاتون اور دوسری
طرف انیسہ خاتون میں خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ خوش
قسمتی سے احمدی بیگم اور زاہدہ خاتون کے انیسہ خاتون
کے نام خطوط کا ایک ذخیرہ احمدی بیگم صاحبہ کی بڑی
صاحب زادی محترمہ ناجیہ خانم (مقیمہ کراچی) کی عنایت
سے ہمیں دست یاب ہو گیا ہے اور اس مضمون کی اساس
ان ہی خطوط پر ہے۔ افسوس ہے کہ انیسہ خاتون صاحبہ
کے خطوط نہیں مل سکے ورنہ یہ داستان اور زیادہ
پر لطف اور بصیرت افروز ہو جاتی۔

ان خطوط پر نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے
کہ خط و کتابت کا سلسلہ کافی کم عمری سے شروع
ہو گیا تھا۔ اگرچہ تاریخ کا تعین اس لیے ممکن نہیں
ہے کہ یہ سب خطوط نہیں ہیں بلکہ ان کا محض ایک

حصہ ہیں۔ جو خطوط ہمارے پیش نظر ہیں ان میں سے بعض پر تاریخ کا اندراج نہیں ہے۔ تاہم جن خطوط پر تاریخ درج ہے ان سے پتہ لگتا ہے کہ یہ خط و کتابت موجودہ صدی کے دوسرے دہے پر حاوی ہے۔ احمدی بیگم صاحبہ کے چند خطوط تیسرے دہے کے آغاز کے بھی ہیں۔ یہ لڑکیاں اپنے وقت کے سب اہم رسالے خصوصاً عورتوں کے رسالے خریدتی تھیں اور ان کا آپس میں تبادلہ کرتی تھیں۔ ان رسالوں میں لکھنے والی خواتین سے ان کے ذاتی مراسم ہو گئے تھے اور خط و کتابت رہتی تھی اور یہ ان کے احوال سے ایک دوسری کو واقف رکھتی تھیں۔ ۱۹۵۷ء میں مصر سے واپس آتے ہوئے خود مجھے جہاز میں پاکستان کے صوبۂ سرحد کی ایک خاتون ملی تھیں جو انگلستان میں اپنی بیٹی سے مل کر واپس آ رہی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ ز۔ خ۔ ش مرحومہ سے ان کے مراسم رہ چکے تھے۔ نکہت و نزہت ان رسالوں میں خود لکھنے کے علاوہ انیسہ خاتون کو بھی لکھنے پر آمادہ کرتی تھیں۔ علاوہ انیں یہ دونوں بہنیں کبھی کبھی اپنی کوئی نظم یا مضمون انیسہ خاتون سے نقل کرنے کی بھی فرمائش کرتی تھیں۔ انیسہ خاتون ان دونوں سے چھوٹی تھیں۔ غالباً اس لیے وہ اپنے بڑے ہونے کا فائدہ اٹھا کر ان سے یہ کام لیتی تھیں۔ سہولت کی خاطر ہم نکہت و نزہت کے خطوط کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیں گے۔ اس جائزے میں بعض جگہ موضوع اور بعض جگہ زمانۂ تحریر کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک خط کئی کئی موضوعات پر حاوی ہے۔

نکہت شروانیہ ۱۹۱۱ء کے ایک خط میں لکھتی ہیں: "مخزن" اور "ادیب" قبول کرو اور "خاتون" و "تمدن" واپس دو۔" پھر آگے تحریر کرتی ہیں "نظم رسول خدا سے استدعا" ارسال کرتی ہوں۔ ایک صاحب کو بھی ملاحظہ کرا دینا۔ مہربانی ہوگی۔ ڈبل مہربانی ہو اگر اس نظم کی نقل کر کے میرے پاس بھیج دو اور اسے اپنے پاس رکھ لو۔" ۱۹۱۱ء ہی کے ایک دوسرے خط میں رقم طراز ہیں: "اب براہ کرم 'خاتون' روانہ کر دو۔ تمہارا 'زمانہ' ارسال ہے۔۔۔ رابعہ سلطان بیگم کا ایک خط نہایت مزیدار ہے۔ اگر زاہدہ بیگم اجازت دے دیں تو ارسال کر دوں گی۔۔۔ اگر کام ختم ہو گیا ہو تو گزشتہ ماہ کا 'مخزن' اور پرانی مجلد 'خاتون' (جس میں حالی صاحب کی نظم "اے ماؤ، بہنو، بیٹیو" درج ہے) بھیج دو۔" ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں لکھتی ہیں: "زاہدہ بیگم کا کام تو روزانہ (رہتا) ہو۔ آج ایک ہمارا بھی کر دو گی؟ میرے مضمون کی نقل کر کے بذریعۂ رجسٹری دفتر 'پردہ نشین' کو روانہ کر دو۔ ۲۔۰ (ڈھائی آنہ) رجسٹری کے ارسال ہیں (۱۹۱۳ء میں رجسٹری کی فیس ملاحظہ طلب ہے ر۔ ش)۔ میں 'پردہ نشین' ان شاء اللہ پھر خریدوں گی۔ اگر کہو تو یہ لکھ دوں کہ دختر مولوی محمد یونس خاں صاحب کی تحریک پر خریدار ہوئی ہوں ایک خط روانہ کرتی ہوں۔ ایڈیٹرہ (کذا) 'پردہ نشین' کو بھی اس کی نقل جائے گی مضمون کے ساتھ۔" ان لڑکیوں کو تعلیم نسواں سے اس قدر شغف تھا کہ وہ دوسروں میں بھی اس جذبے کی متلاشی رہتی تھیں اور جس کسی میں یہ جذبہ پاتی تھیں اس کی قدر ان کی نظر میں بڑھ جاتی تھی۔ انیسہ خاتون کے چھوٹے بھائی محمد مونس خاں (۱۹۰۰ - ۱۹۴۹ء) علیل ہو گئے تھے۔ ان کی مزاج پرسی کرتے ہوئے نکہت ان کی اس صفت کا خاص طور سے ذکر کرتی ہیں۔ لکھتی ہیں: "مونس کا بخار اتر گیا آہ یہ جملہ

کس قدر تسکین بخش ہے . . . خدا کرے آئندہ کبھی بخار نہ آئے۔ آمین۔ خدا ایسے ہونہار بچے کو (جس کو تعلیم نسواں سے اس قدر دلچسپی ہے) بہت مدت تک زندہ رکھے۔" ۱۹۱۲ء کا ایک خط اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں ادبی اور سیاسی دونوں موضوعوں پر مواد ملتا ہے۔ تحریر کرتی ہیں۔ "کل شام کو رسالہ 'خاتون' بابت جنوری ملا۔ اس میں ا۔ب۔ن (احمدی بیگم نکہت راقم مکتوب) اور ز۔خ۔ش اور رابعہ سلطان بیگم کے مضامین علی الترتیب شایع ہوئے ہیں۔ ز۔خ۔ش کی تو نظم ہے اور سب کی نثر۔ رابعہ سلطان بیگم نے ا۔ب۔ن اور ز۔خ۔ش کا تو تمام مضمون ہی میں ذکر کیا ہے لیکن ا۔خ۔ش (انیسہ خاتون شروانیہ مکتوب الیہا) کو بھی شریک کر لیا ہے اور انھیں بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ ابھی رسالہ میرے زیر مطالعہ ہے۔ ان شاء اللہ بعد میں تمہارے دیکھنے کو بھیج دوں گی۔ پس اب اس میں خیر ہے کہ ا۔خ۔ش فوراً بلا وسواس و توقف "کسب و حرفہ" کی طرح 'خاتون' کے لیے ایک مضمون لکھ ڈالے۔ ورنہ تم تینوں بہنیں مل کر قرار واقعی گوشمالی کر دیں گی۔" یہ زمانہ جنگِ بلقان کا تھا اور ہندوستانی مسلمانوں کو ترکی سے بے پناہ دلچسپی اور ہمدردی تھی۔ اس ضمن میں اسی خط میں رقم طراز ہیں: "پیاری! بڑا ثواب حاصل کرو اگر تم اور چھوٹی منیاں (مکتوب الیہا کی چھوٹی بہن مونسہ خاتون) دتا دلی سے آنہ دو آنہ غربا سے چندہ جمع کر کے ہمارے پاس بھیج دو۔ میں گرل شروانیہ لیگ کے نام سے لاہور بھیج دوں گی۔ وہاں سے انشاء اللہ تعالیٰ ترکی پہنچ جائے گا۔ تم ماشاء اللہ خدا کے فضل سے خود عالمہ اور واقف ہو کہ اس کوشش سے کتنا اجرِ عظیم ملے گا۔"

یہ بہنیں ایک دوسری کو مضمون نگاری اور دیگر علمی و ادبی مشاغل پر کس طرح اکساتی تھیں اس کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے۔ ایک خط میں، جس پر تاریخ درج نہیں ہے لیکن انداز سے ۱۹۱۲ء ہی کے لگ بھگ کا معلوم ہوتا ہے، نکہت تحریر فرماتی ہیں: "کیا بہن تم نے رسالہ مجلّہ طبیہ (کذا) کی خریداری کا جواب نہ دیا؟ آخر کچھ تو کہو۔ پیاری انیسہ! آخر تم کیوں میدان مضمون نگاری میں قدم کیوں نہیں اٹھاتیں (کذا)؟ براہ کرم "تجارت" پر ایک دلچسپ مضمون لکھ کر مجھے روانہ کر دو مگر سادہ مضمون نہ لوں گی۔ احادیث شریفہ سے فضیلت تجارت ثابت کرنا ہوگی۔ پس بالکل اسی قسم کا جس قسم کا "کسب و حرفہ" تھا۔ بس لاؤ، جلدی لاؤ۔ ہماری آنکھیں بند ہیں۔ میری پیاری ا۔خ۔ش جلدی لاؤ تاخیر نہ کرو۔ یہ مضمون 'خاتون' کے لیے درکار ہے۔" ایک اور خط سے ان کے رسالوں سے شدید شغف پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ لکھتی ہیں: "ابھی تک ہمارا 'مخزن' اور 'جام سرور' منغوز نہیں آیا۔ 'جام' کی طرف سے تو اطمینان ہے ممکن نہیں کہ وہ نہ آئے مگر 'مخزن' کی طرف سے یاس کلی ہے۔ تاہم برائے اتمام حجت ایک جوابی کارڈ روانہ کیا ہے۔ شاید زمانہ نیند کے ماتوں کو لائے ہوش میں۔ مگر مجھے اپنی سیاہ بختی سے کسی قسم کی امید نہیں۔"

۱۳۳۴ھ (اس خط پر عیسوی تاریخ درج نہیں ہے) کے ایک خط میں اپنی کسی نظم پر نظر ثانی کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ لکھتی ہیں: "اور میرا غم نامۂ منظوم بنام ابرؔ اپنے پاس کا برادرم ابرؔ شروانی کے پاس سے لے کر بدست ہذا فوراً روانہ کر دو۔ بہت ضروری ہے۔ متعدد جگہ سے اس کی غلطیاں درست کی جائیں

گی... ایک شعر نکال ڈالی جائے گی اور ایک نئی شامل ہوگی۔"

۱۹۱۶ء میں جوان العمر بھائی احمد اللہ خاں حیراںؔ کا حادثۂ وفات نکہتؔ اور نزہتؔ دونوں کے لیے ایسا جاں کاہ صدمہ تھا جس کا زخم ان کے دلوں سے کبھی مندمل نہیں ہو سکا۔ نکہتؔ نے انیسہ خاتون صاحبہ کو ایک منظوم خط........ بلکہ "حزن نامہ" لکھ کر بھیجا جو بدقسمتی سے ایک ملازمہ کی غلطی سے کہیں کھو گیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنے نام کے ساتھ "برباد کردۂ آرزو" لکھا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں حالاں کہ نکہتؔ اور انیسہ خاتون دونوں کی شادی ہو چکی تھی، تاہم نکہتؔ خط کے آخر میں اپنا نام اس طرح لکھتی ہیں: "تمہاری اپنی مگر بے حد غمگین احمدی۔"

۱۹۱۶ء کے ایک خط میں "مظلوم بیگم جنجیرہ کے حالِ زار" کے حوالے سے لکھتی ہیں: "فاطمہ بیگم صاحبہ کا خط ارسال ہے۔ پڑھو اور مظلوم بیگم جنجیرہ کے حالِ زار پر آنسو بہاؤ۔ ہائے سچ ہے کہ فرقۂ نسواں ہر طرح ستم رسیدہ و مظلوم ہے۔ خواہ ایک مفلوک الحال فقیرن ہو یا جلیل القدر بادشاہ بیگم۔ میں نے پیاری فاطمہ کے خط میں نواب جنجیرہ کو بہت سخت سست لکھا ہے۔ خدا ایسے ظالم، ناخدا ترس، بے وفا مردوں کے سایہ سے بھی بچائے۔ جو اپنی پہلی تعلیم یافتہ حسین بیاہتا بی بی کا نہ ہوا وہ یقین مانو دوسری کے ساتھ بھی حسن سلوک کرنے سے رہا۔ یہ بس چند روز کی ہولے ہے مگر رہ رہ کر یہ خیال ضرور آتا ہے کہ کہیں زہرا فیضی وغیرہ (کذا) کے غرور نے تو غریب بیگم کی ناؤ منجدھار میں نہیں ڈبو دی کیوں کہ ع

خدا کو خودی سے بڑا بیر ہے

﴿ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ﴾۔ اگر لوگوں کے جرم میں وہ تکلیف یاب ہوئیں (کذا) ہیں تو ایک روز ضرور نجات پائیں گی۔" معمہ حل ہو جاتا ہے کہ نواب صاحب جنجیرہ نے دوسری شادی کر لی ہے۔ حمایتِ نسواں کا جذبہ راقمۂ مکتوب کو ان کی اس زیادتی پر سرزنش کرنے پر آمادہ کرتا ہے لیکن ساتھ ہی انھیں یہ احساس ہے کہ اس خاندان کی خواتین غرور میں مبتلا ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس کی سزا ہو۔ پھر خیال آتا ہے کہ قرآن تو کہتا ہے کہ کوئی کسی دوسری کا بوجھ نہیں اٹھاتا ہے۔ چناں چہ یہ خط ان متضاد جذبات کا مجموعہ بن جاتا ہے۔

ایک خط سے جس میں تاریخ مذکور نہیں ہے (لیکن اپنے مشمولات کے ایک حصے کی بنا پر ۱۹۱۶ء یا اس کے فوراً بعد کا معلوم ہوتا ہے) ایک طرف ان کے خصوصی مشغلے یعنی مضامین اور نظموں کے تبادلے اور مضمون نویسی پر ایک دوسرے کو آمادہ کرنے پر روشنی پڑتی ہے اور دوسری طرف ۱۹۱۶ء کے حادثۂ فاجعہ کے تاثرات کی نشان دہی ہوتی ہے نکہتؔ لکھتی ہیں: "ابرؔ شروانی سلمہٗ کا لکچر معمول ہوا۔ مسرت ہوئی۔ "غم جاں کاہ" مرسل ہے۔ ملاحظہ کرو۔ چوں کہ یہ اشعار فرطِ غم سے بے اختیار زبان پر آگئے، اور غور و خوض مطلق نہیں کیا گیا، اس لیے خراب ہیں۔ اسی وجہ سے کسی کو دکھاتے ہوئے شرماتی تھی۔" چوں کہ نکہتؔ کا کلام محفوظ نہیں رہ سکا اس لیے افسوس ہے کہ ان کی نظموں کا سراغ ملنا ممکن نہیں۔ مزید تحریر کرتی ہیں: "اگر تم مضمون "زنانہ حاضر جوابیاں"... لکھو تو اس کی کم از کم چار مثال فراہم کر لو۔ چار کچھ زیادہ ہیں؟ مگر ہاں تم سی قابلہ کو ضرور زیادہ ہیں۔ اگر تم نے چار مثال جمع کر کے

روانہ کر دیں تو ایک نہایت لاجواب حاضر جوابی، جو میرے مضمون کے بعد روانگی دست یاب ہوئی، تمہیں دے دوں گی ورنہ ناچار اپنے نام سے پھر روانہ کر دوں گی۔ دیکھو پیاری، اس موقع پر سستی مناسب نہیں ہے۔ میں نہایت خوش ہوں گی اگر تم نے یہ مضمون لکھا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مردوں کے عقدِ ثانی کا مسئلہ سماج میں خاصی اہمیت کا حامل تھا لواب اور بیگم جنجیرہ کی داستان اوپر مرقوم ہوئی۔ ۱۹۱۹ء کے ایک خط میں اپنی مشترکہ دوست فاطمہ کے بارے میں رقم طراز ہیں: "فاطمہ کی قسمت کا فیصلہ تو تم نے سن ہی لیا ہوگا۔ اب ان کا ایک پوسٹ کارڈ ارسال کرتی ہوں (جو ابھی موصول ہوا ہے) دیکھا؟ تو سوچیے کھا کے بیچ حج کو چلیں۔ گھر بگاڑ کے اب حج تشریف کو جاتی ہیں۔ تاکہ سوکن کا رہا سہا تسلط بھی سالوں شوہر کے ساتھ رہ کر جم جائے اور تنہا مالک بلا شرکت غیرے بن بیٹھے۔ واللہ فاطمہ کی عقل پر غصہ تو کیا، رونا آتا ہے۔ خدا آدمی کو بے وقوف بھی بنائے مگر دشمنِ عقل نہ بنائے۔" اس عبارت سے لکھنے والی کے بیدار شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ عقدِ ثانی پر صرف شوہر پہ غصہ نہیں ہے۔ پہلی بیوی کی بے عقلی اور ناعاقبت اندیشی کو زیادہ موردِ الزام قرار دیا ہے۔ اس خط میں اپنی ایک نظم کا ذکر اس طرح کرتی ہیں: "ایک تازہ مسدس روانہ کرتی ہوں۔ دردِ دل کی کشمکش اعلیٰ ہے صرف یہی ایک مسودہ ہے۔ خراب نہ ہو۔ جلد واپس کرنے کی کوشش کرنا مگر بذریعہ ڈاک سرکار نہیں۔" اس آخری جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاک کا نظام اس زمانے میں بھی آج سے کچھ زیادہ بہتر نہیں تھا! اس خط کے لفافے پر جو "ٹکٹ" چسپاں ہے اس پر علی برادران کی تصویر ہے۔ خط دستی بھیجا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ "یہ ٹکٹ" خلافت کمیٹی کے لیے چندے کی غرض سے چھاپا اور فروخت کیا گیا ہوگا۔

ایک خط، جس پر تاریخ درج نہیں ہے، دو لحاظ سے قابلِ توجہ ہے۔ ایک تو وہی مضمونوں اور رسالوں، کتابوں کا ذکر لکھتی ہیں: "عزیزہ! میں مضمون "آثارِ قربِ قیامت" لکھنے کے لیے گھبرا رہی ہوں اور مصالحہ (کذا) تمہارے پاس ہے براہِ کرم بہت جلد کتاب الامرجع دونوں جلد الہدیٰ روانہ کر دو۔ میں "پردہ نشین" کا کیا کروں گی؟ ان شاء اللہ صبح و شام میں میرا وی۔پی بھی وصول ہوتا ہے۔ اگر نہ آیا تو دیکھا جائے گا... تمہاری ناول "تاثیرِ صحبت" اور "ایشیا اور یورپ کی ضرب الامثال" روانہ کرتی ہوں۔" اس خط کی دوسری اہمیت جو پہلی سے زیادہ ہے، اس لحاظ سے ہے کہ اس سے پتہ لگتا ہے کہ اس زمانے کی ان لڑکیوں نے کتنی پابندیوں اور موانعِ کار کے باوجود اپنے علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی ذوق کی آب یاری کی تھی۔ تحریر کرتی ہیں: "ع۔م۔ت کا کارڈ دیکھا، بہت دل دکھا مگر بہن، رونا تو اس پر (کو؟) چاہیے جو اس مصیبت سے بچا ہو! جب ہم خود اس بے جا ظلم (منع خط و کتابت و مضامین نگاری) سے امین ہوتے تو کسی کا رنج کرتے۔ خیر رضائے یار ہم نے سب رضاؤں پر مقدم کی۔" اس "رضائے یار" کو "مقدم" کرنے میں کیسی مجبوری پنہاں ہے!

[جاری ہے]

# ہپناٹزم کیا ہے

محمد اسلم پرویز ○

بکھ سائنسی علوم ایسے ہیں جن کے بارے میں عام
لوں کے ذہن میں عجیب وغریب غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں
بناٹزم (علم تنویم) بھی ایک ایسا ہی عمل ہے جس کا خیال آتے
ی ذہن میں ایک ایسے آدمی کا خاکہ ابھرتا ہے جو اپنے بڑے
سے پُر اثر ہاتھوں کو آپ کے چہرے کے گرد گھما گھما کر آپ
اپنے قابو میں کر رہا ہے۔ ادھر آپ اس کے زیر اثر
ے اور ادھر اس نے آپ سے یا آپ کے ذریعے کوئی
لط کام یا جرم کرا لیا۔ ہپناٹزم کی یہ تصویر تھیٹر یا تماشوں
ا دین ہے۔ سستے قسم کے شعبدے باز اس قسم کی
رکتیں برسوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں جس کے نتیجے
یں یہ کارآمد علم عوام کے لیے باعث خوف بن گیا ہے
چ تو یہ ہے کہ ان غلط فہمیوں کی وجہ سے ہی آج ہم لوگ
س علم سے پوری طرح مستفیض نہیں ہو پا رہے ہیں ورنہ
و سے پوچھیے تو یہ علم ایسا ہے کہ اسے بذات خود
ستعمال کر کے یا کسی ماہر عامل کی مدد لے کر آپ اپنی
ہت سی بیماریوں اور روزمرہ کی پریشانیوں سے پیچھا چھڑا
سکتے ہیں۔ آج کے تناؤ اور افراتفری سے بھری دنیا میں

انسان کی آدھی سے زیادہ پریشانیاں اور بیماریاں ذہنی
وجوہات سے پیدا ہوتی ہیں چونکہ ہپناٹزم کا تعلق بھی
ذہن سے ہی ہے، اس لیے یہ ان تمام امراض کی جڑ پر
حملہ کر کے ان سے راحت دلا سکتا ہے۔ یہاں ایک
اور قابل ذکر بات ہے کہ جو حضرات اس پر یقین نہیں
رکھتے یا اس سے ڈرتے ہیں وہ بھی انجانے میں اپنے
معمولات کے دوران اس کی مدد لیتے ہیں اور فائدہ
اٹھاتے ہیں۔ کسی چیز یا نظارے کو دیکھ کر مسحور یا مبہوت
ہو جانا بھی ہپناٹزم کی ہی ایک قسم ہے یعنی اس منظر نے
آپ کے ذہن پر اتنا اثر ڈالا کہ ذہن سوائے اس چیز
کے دیگر کسی چیز اور عمل سے لاپروا ہو گیا۔
حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر زلیخا کا
انگلیاں تراش لینا، کسی افسوس ناک خبر یا صدمے کے باعث
کسی کا ساکت ہو جانا، کسی دلگداز آواز کے سحر میں کھو جانا
کسی پری پیکر کے جلوے سے مسحور ہو جانا، کسی کی شخصیت
یا آواز کے جادو سے متاثر ہونا، کچھ اثر کلام پر سر دھننا
یہ سب ہپناٹزم کی ہی قسمیں ہیں۔ اسی بنیاد پر تعلیمی

○ لکچرر باٹنی ڈپارٹمنٹ، ذاکر حسین کالج، اجمیری گیٹ، دہلی ۶۔

نصیت، جادو بیانی، سحر انگیز حسن، مسحور کن منظر اور اسی قسم کی دیگر اصطلاحات رائج ہوئی ہیں۔

ہپناٹزم یونانی لفظ "ہپناسس" سے بنا ہے جس کا مطلب ہے نیند یا خمار۔ انیسویں صدی میں ڈاکٹر جیمز بریڈ نے اس لفظ کو موجودہ معنی میں رائج کیا تھا۔ ڈاکٹر جیمز کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہپناٹزم کے عمل کو سمجھنے کے لیے بنیادیں فراہم کی ہیں۔ اگرچہ اس لفظ کے معنی نیند کے ہیں لیکن اس عمل کے دوران معمول پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کو نیند نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ عرصے بعد خود ڈاکٹر جیمز نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا لیکن جب تک یہ نام کافی رائج اور مقبول ہو چکا تھا اس لیے اس کو یونہی رہنے دیا گیا۔ اگرچہ ہپناٹزم اپنی موجودہ شکل میں آج سے دو سو سال قبل ہی وجود میں آیا ہے لیکن یونان میں قدیم کھنڈرات سے برآمد ہونے والی پتھر کی سلیں اپنی قدیم زبانوں میں ایک ایسے علم کا ذکر کرتی ہیں جو کہ ہپناٹزم ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی ہر بڑی تہذیب اور دور میں اس قسم کے ثبوت، دستاویزات اور کہانیاں ملتی ہیں جن میں ہپناٹزم کی مدد سے بیماریوں کا علاج یا دیگر آفات سے مقابلے کا ذکر ہے۔ دورِ جدید میں ہپناٹزم کی شروعات آسٹریا کے ڈاکٹر انٹون میسمر نے انیسویں صدی کے شروع میں کی۔ میسمر ایک ماہر روحانیت تھے۔ ان کے مطابق ہر شخص میں ایک مقناطیسیت ہوتی ہے جو آدمی جتنا اعلیٰ کردار، پاک صاف اور عالم ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ قوت اس میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسی مقناطیسی قوت کو وہ اپنے جسم کے مختلف حصوں سے خارج کر کے اپنے معمول کو متاثر کر سکتا ہے۔ ہاتھ اور آنکھیں اس کام میں خاص طور سے معاون ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر میسمر کا یہ فلسفہ اور طریقہ کار اس وقت اتنا مقبول ہوا کہ اسے باقاعدہ ایک علم تسلیم کر کے اس کا نام میسمرزم رکھ دیا گیا جو آج بھی کہیں کہیں قابلِ عمل سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ اس کی بنیاد سائنسی حقائق پر کم اور مفروضوں پر زیادہ تھی اس لیے یہ ٹھوس بنیاد نہ پا سکا اور روحانی حلقوں تک ہی محدود رہا۔ بعد ازاں ڈاکٹر جیمز بریڈ نے اس عمل کو سائنسی پیرائے میں پیش کیا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس علم کو ڈاکٹر میسمر نے پوری طرح سمجھ لیا تھا لیکن وہ اس کو سائنسی وجوہات نہ دے سکے جب کہ ڈاکٹر جیمز بریڈ نے سائنس کی روشنی میں اس کی وجوہات سے ہم کو روشناس کیا۔ انیسویں صدی میں جن دیگر حضرات نے اس علم کو فروغ دیا، ان میں الیٹس، چارکوٹ اور فرائڈ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب اپنے وقت کی قابل ترین ہستیاں اور مفکر تھے ان کی دلچسپی نے عوام کو مجبور کر دیا کہ وہ اس علم کو بھی سنجیدہ اور سائنسی علوم کے زمرے میں شامل کریں۔

## ہپناٹزم کی بنیاد

سائنسی نقطۂ نظر سے ہپناسس نیند کی ایک ایسی قسم ہے جو کہ مختلف طریقوں سے طاری کی جا سکتی ہے۔ شدت کے اعتبار سے یہ نیند اور بیداری کے درمیان واقع ہوتی ہے۔ یعنی ہپناٹزم کے زیر اثر معمول کو نہ تو آپ بیدار کر سکتے ہیں اور نہ ہی وہ پوری طرح نیند میں ہوتا ہے۔ دراصل ہمارے جسم کے تمام ظاہری اور باطنی افعال دماغ کے ذریعے کنٹرول کیے جاتے ہیں اعصابی ماہرین کے مطابق دماغ کے دو حصے ہوتے ہیں ایک کو شعور اور دوسرے کو تحت الشعور یا لاشعور کہا جاتا ہے۔ ہماری تمام ذہنی کاوشوں کا تعلق شعور سے ہے۔ یعنی ہم جو کچھ سوچتے ہیں، کرتے ہیں یا بولتے ہیں وہ ہمارا شعوری عمل ہے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ عرف عام میں جسے ذہن یا سمجھ کہتے ہیں دراصل وہ شعور ہے لاشعور دماغ کا وہ حصہ ہے جس کا تعلق ہماری یادداشت سے ہے۔ ہم ہر پل جو کچھ دیکھتے ہیں وہ ہمارے لاشعور

میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ شعور ہمہ وقت بیدار رہتا ہے۔ آپ جب بھی جس چیز کے بارے میں سوچنا چاہیں یا جو کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ لاشعور کو بیدار کرنے کے لیے کچھ محنت کرنا پڑتی ہے۔ اسی طرح جیسے کہ کسی پرانی بھولی بسری بات کو یاد کرنے کے لیے آپ کو ذہن پر زور ڈالنا پڑتا ہے اس دوران دراصل آپ اپنے لاشعور کو ٹٹولتے ہیں نیند کے دوران شعور پُرسکون یا کافی حد تک بے عمل ہو جاتا ہے جب کہ لاشعور اس دوران اکثر بیدار ہو جاتا ہے۔ عموماً لاشعور کی بیداری ہی ہم کو خواب دکھاتی ہے جو باتیں ہمارے ذہن کے نہاں خانوں میں یا لاشعور میں محفوظ تھیں وہ شعور کے دبتے ہی ابھر آتی ہیں چونکہ شعور یا ذہن کے مکمل آرام کا نام ہی نیند ہے اس لیے لاشعور کا بیدار ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ شعور آرام یا سکوت کی کیفیت میں جا چکا ہے۔ اسی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ خواب نظر آنا مکمل اور بھرپور نیند کی نشانی ہے لیکن سونے کے دوران انسان کے تمام اعضاء اور اعصاب "جاگتے" رہتے ہیں۔ اگر سونے والا شخص خواب دیکھ رہا ہے تو اس کی آنکھوں کے ڈیلے آپ کو حرکت کرتے نظر آئیں گے جیسے وہ بند آنکھوں کو چاروں طرف گردش دے کر گو البتان میں چہار سُو دیکھ رہا ہو۔ تیز روشنی پڑنے پر سوتے ہوئے آدمی کو آنکھوں میں چمک لگتی ہے اور وہ بے چین ہوتا ہے۔ کسی اور تکلیف کا احساس بھی اسے فوراً ہو جاتا ہے۔ نیند کے علاوہ نشے کی حالت میں بھی انسان کا شعور ساکت ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ نشے کے دوران انسان اپنے لاشعور میں پڑی ہوئی باتوں کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً اگر اسے کسی سے دشمنی ہے تو اس کا اظہار کرے گا۔ اگر کوئی خوف ہے تو اس چیز سے ڈرے گا۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ بچہ اپنی پیدائش کے پہلے دن سے اپنے اطراف ہونے والی باتوں اور حرکات کو لاشعور میں جمع کرتا رہتا ہے چونکہ اس وقت تک اس کا شعور ناپائیدار ہوتا ہے اس لیے لاشعور اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ جوں جوں شعور بیدار ہوتا ہے ویسے ہی یہ حاوی ہوتا جاتا ہے اور لاشعور پس منظر میں کھسکتا جاتا ہے۔ جب بچہ بولنے لگتا ہے تو سمجھیے شعور پوری طرح حاوی اور بیدار ہو گیا شعور ہی انسان کو سوچنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت دیتا ہے۔ ہر قسم کا عمل اور ردعمل شعور کا ہی محتاج ہے۔ اگر آپ کسی سے کچھ کرنے کے لیے کہتے ہیں تو وہ پہلے سوچتا ہے کہ ایسا کرنا اس کے لیے مفید ہے یا نقصان دہ۔ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق فیصلہ کر کے وہ اس پر عمل کرتا ہے یا انکار کر دیتا ہے۔ یہ رضا اور انکار شعور کی ہی دین ہے۔ یہاں لاشعور کی ایک اور خاصیت بیان کرنا عین مناسب ہو گا۔ لاشعور میں اگر کوئی بات جگہ پا جائے تو پھر اس کو وہاں سے نکالنا تقریباً ناممکن ہے [بزرگوں کی یہ نصیحت کہ ہمیشہ اچھی محفل میں بیٹھو یا اچھی باتیں ہی سنو، اس حقیقت کی روشنی میں بڑی گہری اور سچی معلوم ہوتی ہے] چونکہ لاشعور ہر بات کو نوٹ کرتا رہتا ہے اس لیے غلط باتیں، نقصان دہ افعال اور بیانات بھی لاشعور میں جا کر گھر کر لیتے ہیں۔ ایسے میں اگر کسی وجہ سے شعور کمزور ہو جائے یعنی صدمے غصے یا نشے یا بیماری کی وجہ سے تو ایسی حالت میں انسان لاشعور کی بات پر عمل کر سکتا ہے۔ لاشعور کی کارکردگی کو ایک اور مثال سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ عموماً چھوٹے بچوں کو کسی نہ کسی چیز سے ڈرا کر قابو میں کیا جاتا ہے مثلاً یہ کہ سو جاؤ ورنہ بلی آ جائے گی یا بھاگو بلی آ رہی ہے اب اس کم عمری میں بچے کا شعور ناپختہ اور نامکمل ہوتا ہے۔ کیونکہ شعور کا تعلق عمر اور تجربے سے ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کے لاشعور میں یہ بات

رجاتی ہے کہ بلی ڈرنے کی چیز ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا
رہتا ہے نے کے بعد بھی جب کہ اس کا شعور یہ بتاتا
کہ بلی قطعاً ڈرنے کی چیز نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ
کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔ بچپن میں تو خاص طور سے
بلی اس کے پاس آجائے تو اس پر سکتہ یا بے ہوشی
طاری ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس کا ناپختہ شعور بلی
بے ضرر ہونے کی بات اس کو سمجھا نہیں سکتا اور لاشعور
آپ نے خوف بٹھا دیا ہے۔ اسی وجہ سے بچوں
نفسیات کے ماہرین سختی سے منع کرتے ہیں کہ بچپن
میں بچے کو کسی بھی چیز سے ڈرانا نہیں چاہیے۔ بلکہ ہر
چیز کو اس کی اصلی شکل و کردار میں بچے کے سامنے لانا
چاہیے۔ لاشعور میں پڑی بات ایک طرح سے لافانی
ہوتی ہے اور تاعمر انسان کے ساتھ رہتی ہے۔ اگر
کسی باشعور انسان کو کسی بات کا مشورہ دیا جائے تو
اس پر غور کرنے کے بعد ہی وہ عمل کرے گا۔ غور و فکر
کا کام شعور کے ذریعے ممکن ہوگا اگر کسی طرح شعور سے
گزر کر لاشعور میں وہ بات داخل کر دی جائے تو وہی
انسان بلا چوں چرا کیے اس بات پر عمل کرنے لگے گا۔
ہپناٹزم میں یہی کیا جاتا ہے۔ مختلف طریقوں سے معمول
کے شعور کو خاموش کر کے اس کے لاشعور کو بیدار کیا
جاتا ہے۔ شعور کی غفلت کے تین درجات بیان کیے جاتے
ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

**۱۔ خفیف نیند (LIGHT HYPNOSIS)**

اس دوران معمول پوری طرح ہوش میں رہتا ہے اور "جاگنے" کے بعد "نیند" کے دوران ہوئی ہر بات اسے یاد رہتی ہے۔

**۲۔ گہری نیند (DEEP HYPNOSIS)**

اس میں معمول کو گرد و پیش کی بالکل خبر نہیں ہوتی اور نہ ہی جاگنے کے بعد اسے کچھ یاد رہتا ہے

**۳۔ تنویمی سکتہ (HYPNOTIC COMA)**

اس میں معمول بہت گہری نیند سوتا ہے۔ نہ تو اسے کچھ یاد رہتا ہے اور نہ بعد میں اسے کچھ یاد دلایا جا سکتا ہے۔ یہ تینوں کیفیتیں دراصل شعور کی غفلت کے مختلف درجات ہیں۔ شعور جتنا غافل ہوتا ہے اتنی ہی اس کی مدافعت کم ہو جاتی ہے۔

فرانسیسی ماہر اعصاب چارکوٹ نے ہپناسس کی تین اور قسمیں بیان کی ہیں جو کہ کیٹالیپسی، لتھارجی اور سومنامبولزم ہیں۔ کیٹالیپسی (Catalepsy) میں مریض کے جسم کے تمام پٹھے اکڑ جاتے ہیں اور وہ کسی بت کی طرح سخت اور ساکت ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت بغیر کسی تنویمی عمل کے بھی طاری ہو سکتی ہے۔ ایسے میں اس کی وجہ عموماً کوئی ذہنی پریشانی یا نفسیاتی مرض ہوتا ہے۔ عموماً مرگی اور ہسٹریا کے مریضوں میں یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ ایسے میں وقتی طور سے ان کا شعور بے حس ہو جاتا ہے اور لاشعور کا تمام تناؤ اور تنفر جسمانی کیفیت میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسے دورے کسی خاص ذہنی جھٹکے یا صدمے کی وجہ سے بھی پڑ جاتے ہیں۔ لتھارجی (Lethargy) کے دوران معمول پر مردہ ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ دل کی دھڑکن اور سانس کی رفتار اتنی مدھم ہو جاتی ہے کہ محسوس کرنا مشکل ہوتا ہے۔ تمام احساسات ختم ہو جاتے ہیں۔ شدید شور یا ہلانے سے بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اعصابی ہسٹیریا کے مریض کبھی کبھی ایسے دوروں کا شکار ہوتے ہیں۔ سومنامبولزم (Somnambulism) یعنی خواب خرامی میں معمول نیند کے دوران نہ صرف یہ کہ چلتا ہے بلکہ وہ تمام کام کر سکتا ہے جو کہ ایک بیدار آدمی کرتا ہے۔ کام سے فارغ ہو کر معمول بستر پر آ کر سو جاتا ہے۔ بیدار ہونے پر اس

کو کچھ یاد نہیں ہوتا کہ کیا کیا۔ زیادہ سے زیادہ وہ بیان کرتے ہیں کہ آج "خواب" میں ہم نے یہ دیکھا یا یہ کیا۔ اس کیفیت کے دوران معمول کے لاشعور میں دبی کوئی بات یا خواہش اتنی شدت سے ابھرتی ہے کہ وہ معمول کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ مطلوبہ عمل کر ڈالے۔

## کیسے کریں؟

ہپناٹزم کی بنیاد سجیشن (Suggestion) یعنی ایماء پر ہے۔ یہاں ایک بات قابل وضاحت ہے۔ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی عامل کے پاس جائیں تو بس وہ اُن کو قابو میں کر لے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک معمول کی رضا شامل نہ ہو اس کو ہپناٹائز کرنا ناممکن ہے کیونکہ جب تک معمول کا شعور بیدار رہے گا وہ نیند والی کیفیت میں نہیں جائے گا۔ ہپناٹزم کا استعمال مختلف بیماریوں کا علاج کرنے کے لیے کیا گیا تھا اور آج بھی محدود پیمانے پر یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس کو ہپنوتھراپی (Hypnotherapy) کہتے ہیں اور یہ کسی حد تک نفسیاتی علاج سے مشابہ ہے۔ اس عمل کے لیے معمول کو عامل پر مکمل اعتماد اور یقین ہونا چاہیے۔ اسے پوری طرح ذہنی طور سے اپنے آپ کو عامل کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ معمول کو آرام دہ جگہ پر آرام دہ حالت میں رکھ کر عامل اس کے شعور کو غافل کرتا ہے۔ اس کام کے لیے ایماء کا استعمال ہوتا ہے۔ معمول کو بار بار عامل یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ تمہیں نیند آ رہی ہے، تم سونے والے ہو، تمہاری آنکھیں بھاری ہو رہی ہیں، تم سو رہے ہو۔ اسی طرح کے اور بھی طریقے ہیں جن کے نتیجے میں معمول پر سکون ہو جاتا ہے اور نیند کی کیفیت میں چلا جاتا ہے۔ اس کیفیت کو ٹرانس (Trance) کہتے ہیں۔ ایسے میں معمول کے شعور کا بڑا حصہ غفلت میں چلا جاتا ہے۔ اس حالت میں جب اس کو کسی بات کی ترغیب دی جاتی ہے تو اس کا ذہن بلا کسی تردید یا مخالفت کے اسے مان لیتا ہے۔ اس طرح یہ بات اس کے ذہن میں گھر کر جاتی ہے اور بیداری کے بعد بھی وہ اس پر عمل کرتا ہے۔

## ایماء اور خود ایمائی

ہپناٹزم کے پس منظر کو جاننے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا تمام دار و مدار ایماء یعنی سجیشن پر ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ایماء اتنی اہم چیز ہے؟ یقیناً ہے۔ اگر ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی دیکھیں تو ایماء کی بڑی اہمیت ہے۔ ہمارے چاروں طرف جو اشتہارات لگے رہتے ہیں یا اعلانات ہوتے ہیں، ہم ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر جو تشہیر سنتے ہیں وہ بھی ایک طرح کا ایماء ہے کہ آپ فلاں چیز استعمال کریں۔ ہماری سوچ کا ہمارے ذہن پر اور ذہن کے ذریعے تمام جسم پر اثر پڑتا ہے۔ بزرگوں کا یہ قول کہ ہمیشہ اچھا سوچنا چاہیے، بے جا نہیں ہے۔ سائنسی حقائق نے اس کو صحیح ثابت کیا ہے۔ اگر کوئی بات ذہن پر دستک دیتی ہے تو وہ نہ صرف شعور بلکہ لاشعور کو بھی متاثر کرتی ہے اگر کوئی شخص ہر وقت اپنے کسی دشمن کے بارے میں سوچتا رہتا ہے کہ میں اسے ختم کر دوں گا تو یہ بات اس کے لاشعور میں جم جاتی ہے۔ ایسا آدمی اگر کسی لمحاتی دباؤ یا کسی اور وجہ سے وقتی طور سے اپنا شعور کھو بیٹھتا ہے تو لاشعور کی یہ بات اس سے یہ عمل کرا لیتی ہے اگر آپ کسی شخص سے مستقل یہ کہتے ہیں کہ تم بڑے کمزور ہو رہے ہو تو اس بات کا اس پر واقعی اثر ہوگا۔ وہ سوچنے لگے گا اور پھر محسوس کرنے لگے گا کہ وہ کمزور ہو رہا ہے۔ یہاں یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ کہنے والا کون ہے۔ اگر آپ اس شخص کی نظر

میں تقابلِ احترام و اعتماد ہیں تو آپ کی بات اس پر جلدی اثر کرے گی۔ اسی وجہ سے ڈاکٹروں کا کہنا ہے مریض کو مریض یا کمزور کہنا اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ وہ ذہنی طور سے یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ وہ کمزور ہو چکا ہے۔ بیماری میں جب تمام جسم ضعیف ہو جاتا ہے تو اعصاب اور شعور بھی ناتواں ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں بات بہت جلدی متاثر کرتی ہے۔ اسی طرح بچوں کو بے وقوف یا نا اہل کہنا عام بات ہے لیکن اگر کسی بچے کو اس کے گھر والے اور وہ افراد جن پر وہ بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے، جن سے اس کا لگاؤ ہے وہ اگر مستقل اسے ناکارہ اور بے وقوف کہیں گے تو وہ بچہ عموماً ان احساسات کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے بچے کو کارآمد یا عقل مند بننے میں کسی اور بچے کے مقابلے میں زیادہ محنت درکار ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا ذہن یہ بات تسلیم کر چکا ہوتا ہے کہ وہ بے وقوف ہے۔ اگر جسم ہار مان لے یا تھک جائے تو ٹھیک ہو سکتا ہے لیکن اگر ذہن شکست خوردہ ہو جائے تو پھر انسان کے ابھرنے کی موہوم سی امید بھی نہیں رہتی۔ اِس لیے ضروری ہے کہ بچوں اور چھوٹوں کی حوصلہ شکنی نہ کی جائے بلکہ ان کا حوصلہ بڑھایا جائے یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہے۔ ہم میں سے بہت سے افراد ایسا کرتے ہیں۔ یہی نہیں ریس اور کشتی میں حریفوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے یہ بھی ایلا ہے

خود ایمائی Auto Suggestion کی بھی ہماری زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ اس کو ہم تہیہ کرنا یا یقین محکم بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کچھ کرنے کا مصمم ارادہ کر لے تو اٹھتے بیٹھتے اسے یہی دھن سوار رہتی ہے کہ ایسا کرنا ہے۔ اس طرح وہ انجانے میں اپنے شعور سے لاشعور تک یہ بات نقش کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمہ وقت اسی سمت کام کر کے اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ سائنسی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے خود ایمائی کی بڑی اہمیت ہے۔ سردیوں میں اگر ہم یہ احساس کریں کہ بہت سردی ہے تو ہم کو سردی زیادہ لگے گی لیکن اگر ہم ایسا نہ سوچیں یا کسی کام کی طرف مشغول ہو جائیں تو سردی کا احساس کم ہو جائے گا۔ یہ باتیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ احساس کا تعلق سوچ سے ہے اور سوچ کا احساس سے۔ اگر بیماری کے دوران مریض یہ سوچے کہ میں جلدی ٹھیک ہو جاؤں گا، میں زیادہ بیمار رہتا ہی نہیں اور یقین کے ساتھ ایسا سوچے تو اس کے صحت مند ہونے میں کم وقت لگے گا۔ یہ باتیں اگرچہ معمولی لگتی ہیں لیکن بڑا گہرا اثر رکھتی ہیں یقین نہ آئے تو عمل کر کے دیکھیے۔ اس طرح آپ اپنے عامل بھی ہوں گے اور معمول بھی۔

"باپ کا اپنے بچے کو کوئی ادب سکھانا
ایک صاع صدقے سے بہتر ہے۔"

[ مسلم ]

# مولانا امتیاز علی عرشی

## چند یادیں چند باتیں

سید بہاء الحق ○

مجھے یاد نہیں کہ میں نے عرشی صاحب کو سب سے پہلے کب اور کہاں دیکھا اتنا ضرور یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب کو دیدہ زیب لباس پہنے اور سفید صافہ باندھے صوفیانہ رنگ کی شیروانی پہنے رام پور کے شاہی محل "خاص باغ" کی طرف سے آتے دیکھا تھا تو پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ مولوی امتیاز علی خاں عرشی ہیں۔ اس کے بعد میں اکثر ان کو تقریبات و مجالس وغیرہ میں دیکھتا رہا۔ ان سے ملنے کا اتفاق بعد کو ہوا۔ ان کے خاندان سے ہمارے خاندان کا یہ تعلق بھی تھا کہ ان کے بزرگ، میاں حسن شاہ صاحب محدث رام پوری کے شاگرد تھے اور حسن شاہ صاحب ہمارے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔

۴۶-۱۹۴۵ء میں جب میں رضا انٹر کالج کا طالب علم تھا، پروفیسر آل احمد سرور صاحب رضا انٹر کالج کے پرنسپل ہو کر آئے اور پروفیسر غلام السیدین رام پور کے مشیر تعلیمات مقرر ہوئے تو رام پور کے علمی ماحول میں عموماً اور رضا انٹر کالج کی ادبی سرگرمیوں میں خصوصاً اضافہ ہوا۔ کالج میں آئے دن مشاعروں، مباحثوں اور علمی نشستوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ خواجہ غلام السیدین صاحب نے جبلی پارک میں جو اب گاندھی پارک کے نام سے مشہور ہے عوام کے کالج (Peoples College) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس میں ایک دارالمطالعہ بھی تھا۔ ہر ہفتے شہر کے یا بیرون شہر کے کسی عالم یا ادیب کی تقریر ہوتی یا ادبی نشست منعقد ہوتی۔ خواجہ صاحب نے مشاعروں سے زیادہ مخصوص ادبی نشستوں کے اہتمام پر زور دیا۔ اس سلسلے میں رضا انٹر کالج اور عوام کے کالج میں مولوی امتیاز علی خاں عرشی کی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا۔ عرشی صاحب کے بارے میں مجھے یاد ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ ایک مقالہ "اردو زبان پر پشتو کا اثر" پڑھا تھا۔ مقالے میں بہت سے ایسے الفاظ گنائے تھے جو اگرچہ اردو میں استعمال ہوتے ہیں لیکن دراصل وہ پشتو کے ہیں۔ مقالے کے اختتام پر سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ طالب علم ہر بے ڈھنگے لفظ کے بارے میں مقالہ نگار سے دریافت کرتے تھے کہ کیا یہ لفظ پشتو کا ہے؟ اور موصوف مسکرا کر نفی یا اثبات میں جواب دیتے تھے۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا "بیلا" پشتو کا لفظ ہے۔ مولانا نے جواب دیا تھا "بیلا" پشتو کا لفظ نہیں ہے۔ پٹھان بیلے

---

○ ایڈوکیٹ، ڈسٹرکٹ کورٹس رام پور یو۔پی

ب ہوتے ہیں۔" اسی طرح بہت سے لفظوں کے بارے میں
ں صاحب نے اس مجلس میں تشریح و تفسیر کی تھی۔

مولانا عرشی کی آمد و رفت کالج میں رہا کرتی
ں اور طلبا ان کی رفتار و گفتار سے متاثر ہوتے تھے
ں لیے کہ جس طرح ان کی باتیں دلچسپ اور ظرافت کا
ہر لیے ہوتی تھیں ان کی رفتار بھی دیکھنے والوں کو
ثر کرتی تھی۔ ایک مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور صاحب
م لوگوں کو رضا لائبریری دکھانے کے لیے لے گئے۔ رضا
ئبریری اس زمانہ میں قلعہ معلی کے اندرونی حصہ میں تھی
ور اس کے لیے نواب سید رضا علی خاں صاحب والی
ام پور سے خصوصی اجازت حاصل کی گئی تھی۔ ہم سب
طالب علموں کو عرشی صاحب نے مخطوطات و مطبوعات اور
در تحریریں دکھائیں اور قرآن شریف کے ایک نسخے کی
زیارت بھی کرائی جو بخط کوفی تھا اور جس کا رسم الخط پڑھنے
میں نہیں آتا تھا۔ آخری صفحے کو دیکھتے ہوئے ایک ذہین
طالب علم نے کہا کہ صاف پڑھنے میں آرہا ہے یہ توقل ھو
اللہ لکھی ہوئی ہے۔ عرشی صاحب نے برجستہ کہا ارے
آپ تو مجھے حافظ قرآن معلوم ہوتے ہیں۔ اس پر سب
حاضرین ہنس دیے۔

۱۹۴۷ء میں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں
داخل ہوا اور حضرت علامہ پروفیسر عبدالعزیز المیمنی کا
شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہوا تو انھوں نے عرشی
صاحب کا تذکرہ کیا اور ان کو اپنا شاگرد بتایا تو مجھے
تعجب ہوا اور مسرت بھی۔ اس لیے کہ مجھے معلوم تھا
کہ عرشی صاحب علی گڑھ کے طالب علم کبھی نہیں رہے
تھے۔ معلوم ہوا کہ اورینٹل کالج لاہور میں عرشی صاحب
کو علامہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا تھا اس تعارف
کے بعد جب کبھی میں علی گڑھ سے رام پور آتا تو استاد
محترم میمن صاحب اپنا کوئی نہ کوئی پیغام عرشی صاحب
کو بھیجتے اور عرشی صاحب بھی ان کی خیریت معلوم کرتے
اور سلام و پیغام بھجواتے۔ اس طرح سے علی گڑھ
سے جب آتا عرشی صاحب کے پاس ضرور جاتا۔ عرشی
صاحب بہت متواضع شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ہمیشہ
پر تکلف جملے سے تواضع کرتے۔ ان کی باتیں بھی کچھ
کم دلچسپ نہ ہوتیں۔ جہاں تک علامہ میمن صاحب کا
تعلق ہے وہ کسی کی تعریف کرنے میں مبالغہ نہیں
فرماتے تھے بلکہ اگر کہا جائے کہ تعریف کرنے میں بہت
جزرس واقع ہوئے تھے تو غلط نہ ہوگا۔ بہت دنوں
کے بعد مجھے علامہ مرحوم کا ایک خط رازیزدانی رام پوری
مرحوم کے نام پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں میمن صاحب
نے عرشی صاحب کی خاص تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ عرشی
صاحب میرے ارشد تلامذہ میں ہیں اور تحقیقی اور علمی
کاموں میں وہ اونچا درجہ رکھتے ہیں۔

عرشی صاحب علمی موضوعات پر جامع اور
پُر معلومات گفتگو فرماتے اور وہ مخاطب کی سطح پر آکر
اس کے ذوق علمی، قابلیت و صلاحیت کے اعتبار
سے انداز بیان اختیار فرماتے۔ وہ اپنے خیالاتِ علمی
اور دینی معاملات میں ظاہر کرنے میں بے باک اور
بےتاجری تھے۔ بزرگوں کی بزرگی کے قایل تھے لیکن
ان کا تنقیدی شعور رطب و یابس کو قبول کرنے سے
اِبا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ایک صاحب نے ایک
بزرگ کا مجھ سے تذکرہ کیا اور یہ کہا کہ انتقال کے بعد ان
کی آدھی داڑھی کالی ہوگئی۔ کہنے لگے کہ ان کا اگر پورا منہ
بھی کالا ہو جاتا تب بھی میں ان کی بزرگی کا قایل رہتا لیکن
آدھی داڑھی کے کالے ہونے کے واقعے سے مجھے انکار
ہے۔

اُن کا میلان تو ہب کی طرف تھا۔ بدعات کے

ت خلاف تھے اور یہ انداز خاندانی تھا۔ وہ غیر مقلد نہ تھے لیکن جس طرح کہ ایسے لوگوں کو غیر مقلد قرار ے دیا جاتا ہے، ان کے خاندان کو بھی غیر مقلد قرار یا جاتا تھا۔ ان کے دادا مولوی اکبر علی خاں مولانا احسن شاہ محدث رام پوری اور شاہ عالم علی نگینوی (مرادآبادی) کے شاگرد تھے۔ اس طرح ان کا علمی رشتہ حضرت شاہ لی اللہ دہلویؒ کے خاندان سے پیدا ہو جاتا ہے۔

عرشی صاحب ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ جب ہ مطلع العلوم کے طالب علم تھے اور مولانا سید احمد ہزاروی کے شاگرد تو اس زمانے میں یہ قاعدہ تھا شہر کے رؤسا اور صاحبزادگان فاتحہ کے موقعے پر کھانے کی دیگیں مدرسوں کے طالب علموں کے لیے بھیج دیا کرتے تھے اور اس فخر سے کہ مدرسے میں کھانا آیا ہے طلبا خوش ہوتے تھے اور ایک دوسرے کو یہ خوشخبری سناتے تھے کہ آج مدرسے میں کھانا آیا ہے۔ عرشی صاحب نے فرمایا کہ مجھ سے بھی کہتے تھے لیکن میں ایسا کھانا کبھی نہیں کھاتا تھا۔ حالانکہ مقامی اور بیرونی طلبا یہ کھانا کھاتے تھے، میں اس کھانے کو جائز نہیں سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ شہر کے ایک رئیس کے یہاں سے میرے مکان پر حال ہی میں کھانوں کا ایک خوان آیا اور مجھے یہ بتایا گیا کہ چہلم یا برسی کی فاتحہ کا کھانا ہے۔ خوان میں انواع و اقسام کے کھانے تھے میں سوچنے لگا کہ مجھ سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے کہ مجھے یہ فاتحہ کا کھانا بھیجا گیا ہے۔ مجھے یاد آگیا کہ میری یہ غلطی تھی کہ ایک مرتبہ مرحوم کی عیادت کے لیے گیا تھا اور اسی کی سزا میں یہ کھانا مجھے بھیجا گیا ہے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ان سے یہ مسئلہ معلوم کیا گیا کہ اگر کوئی مقلد حنفی کسی مسئلہ خاص میں کسی دوسرے امام کی پیروی کرے تو جائز ہے یا نہیں؟ موصوف کہنے لگے کہ کسی دوسرے امام کی پیروی کرنی جائز ہے اور اس کی ساری ذمہ داری میرے اوپر ہوگی اور اگر غلطی ہے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں گا۔

بیشتر مذہبی اور دینی معاملات میں مجھے ان کی رائے صائب معلوم ہوتی تھی اور میں اس کا قائل ہو جاتا تھا۔ وہ راسخ العقیدہ تھے اور اپنی رائے پر پختگی کے ساتھ قائم رہتے تھے۔ ایک مسئلہ میں مجھے ان سے اختلاف بھی تھا کہ وہ قصص القرآن کو مسلمات قوم قرار دیتے تھے اور میں ان کو حقائق جانتا ہوں۔

عرشی صاحب علمی اور دینی معاملات کے علاوہ تفریح کے طور پر جو باتیں کیا کرتے تھے وہ کبھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ کھنور اسے ظریفانہ انداز میں فرمانے لگے کہ ایک پرانے ڈکیت تھے جو اپنے کام میں بڑے ماہر تھے ساتھ ہی ساتھ وہ نماز کے بڑے پابند تھے۔ لوگ انھیں مسجد میں فجر اور عشا کی نماز باجماعت پڑھتے دیکھتے تھے۔ ان سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا جب کہ وہ بوڑھے ہو گئے تھے کہ "چچا آپ ڈکیتی کس وقت ڈالا کرتے تھے؟" انھوں نے بہت سادگی سے جواب دیا۔

"میاں کبھی تو ہم تہجد کی نماز پڑھ کر ڈاکا ڈالنے جاتے تھے اور کبھی واپس آکر تہجد کی نماز پڑھتے تھے۔"

اس لطیفے پر سننے والے کھل کھلا کر ہنس دیے۔

موصوف فراخ دل اور وسیع النظر تھے۔ فروعی معاملات میں تشدد کے قائل نہ تھے اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور جماعت اسلامی سے متاثر تھے اور جماعت کے افراد سے ان کے خصوصی تعلقات تھے ایک مرتبہ میں نے یہ سنا کہ وہ شہر کے ایک مشہور مزار پر جاکر عرس کے زمانے میں تقریریں کر رہے ہیں

محافل عرس میں جانا اور تقریریں کرنا مجھے ان سے بعید از قیاس معلوم ہوا۔ میں نے اپنے ایک بزرگ دوست سے مزاحاً کہا "لیجیے اب تو آپ کے عرشی صاحب بھی مزاروں پر حاضری دینے لگے"۔ ان صاحب نے عرشی صاحب سے اس کا ذکر کر دیا۔ کچھ دن جب میں ان کے پاس حاضر ہوا تو انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ تو مجھ سے ناراض ہیں کہ میں عرسوں میں جانے لگا ہوں میں نے کہا کہ آپ میرے بزرگ ہیں ناراض کیسے ہو سکتا ہوں۔ لیکن بات عجیب سی ضرور معلوم ہوتی ہے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اگر موقع ملتا رہا تو عرسوں میں جانے والوں کے خیالات اور مزارات پر غلط قسم کے مراسم کرنے والوں کی رفتہ رفتہ اصلاح کروں۔ میں لوگوں کو اپنے خیال پر لانے کی بتدریج کوشش کر رہا ہوں۔

عرشی صاحب اس طرح باتیں کرتے تھے کہ لوگ ان سے متاثر رہتے تھے۔ وہ بہت اچھے سامع بھی تھے اور مخاطب کی باتیں دلچسپی سے سنا کرتے تھے۔ لوگ ان کا قیمتی وقت ضائع کرتے تھے اور وہ کچھ نہیں کہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب آگئے اور انھوں نے اتنی طویل گفتگو کی کہ ان کی ایک صاحب زادی نے کہا کہ

"ابا! آپ ایسے لوگوں سے کیسے اتنی دیر تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔" انھوں نے یہ شعر پڑھا:

شہر میں جس قدر دوانے ہیں
اپنا استاد ہم کو جانے ہیں

عرشی صاحب کی زندگی کے آخری ایام میں میں ان کے پاس گیا اور میں نے ان سے یہ بات دریافت کی کہ بعض کتابوں میں عربوں کا ذکر یک گونہ برائی کے ساتھ ہے۔ ان کی خوبیاں درج نہیں۔ ان کی فراخ دلی فیاضی، بہادری، امانت اور اولوالعزمی نہایت قابل تعریف ہے۔ اس پر انھوں نے ایک کاغذ اٹھایا اور اس پر تاریخ کی چند کتابوں کے نام لکھے جن میں عربوں کے اوصاف حمیدہ کا ذکر تھا۔ ان کے قلم کا لکھا ہوا وہ پرچہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ غالباً یہ میری ان کی آخری ملاقات تھی۔ ان کی باتیں دلچسپ، عالمانہ ہوا کرتی تھیں۔ تہذیب اور شائستگی کا یہ عالم تھا کہ ایک صاحب سے ناراضی کے وقت ان کی باتوں کو غیر عالمانہ کہا۔ وہ کبھی کسی کے لیے جاہلانہ کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ "غیر عالمانہ" ہی کہا کرتے تھے اور ان کی ناگواری کی یہ آخری علامت ہوتی تھی

میں اخیر میں پھر اپنے استاد محترم علامہ عبد العزیز المیمنی کے الفاظ پر اپنے تاثرات ختم کرتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا تھا:

"اگر ہماری قوم کچھ افراد عرشی صاحب کی طرح پیدا کر دیتی تو علمی دنیا کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔"

---

"کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لیوے اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔"

سر سید

# صحتِ نفس اور صحتِ بدن

ابو وارث جمیل ○

نفس اور بدن کا گہرا رشتہ ہے۔ چنانچہ انگریزی کا مشہور مقولہ ہے:

"SOUND MIND IN SOUND BODY."

[ یعنی صحت مند دماغ (نفس) ہی صحت مند بدن رکھتا ہے ]۔

لہٰذا یہ واضح ہوتا ہے کہ بدن کی صحت کا راز نفس کی پاکیزگی اور صحت میں مضمر ہے۔ اسی لیے اسلام میں پاکیزگیٔ نفس اور اخلاقیات پر بہت زور دیا گیا ہے "تاکہ انسان کو رضائے الٰہی کے ساتھ صحت نفس اور صحت بدن بھی حاصل ہو" کیونکہ امراض نفسانی بدن میں غیر طبعی تغیرات پیدا کر کے خرابیٔ صحت کا سبب بنتے ہیں۔ چنانچہ صاحب کامل علی بن عباس مجوسی تحریر کرتے ہیں:

" امراض نفسانی سے بھی بدن میں تغیرات پیدا ہوتے ہیں جس طرح کہ کبھی کبھی کسی مرض سے تغیرات بدنی پیدا ہوتے ہیں یا کبھی کسی مرض سے صحت کا سبب عرض نفسانی ہوتا ہے۔"

چنانچہ اسی ضمن میں شیخ الرئیس ابن سینا کا قول ہے

" جس طرح بدن نفس سے متاثر ہوتا ہے اسی طرح نفس بھی بدن سے متاثر ہوتا ہے کیونکہ جو مزاج اور خلط بدن میں غالب ہوتی ہے وہ اپنے مناسب نفس میں اخلاق پیدا کر دیتی ہے۔"

## نفس کیا ہے؟

فلاسفۂ یونان کی رائے ہے کہ نفس ایک جوہر مجرد ہے وہ کسی مادہ اور جسم کے ساتھ مقید نہیں لیکن حکمائے یونان (اطباء) کا خیال اس کے برعکس ہے ان کے نزدیک:

" نفس ناطقہ - Spirit of Speech ) کا محل دماغ ہے۔"

(فردوس الحکمۃ ص ۱۴۲)

صاحب کامل علی بن عباس مجوسی قویٰ نفسانیہ کی بابت تحریر کرتے ہیں:

" قوائے نفسانیہ وہ ہیں جن کا مقام اور سرچشمہ دماغ ہے۔"

---

○ مطب دار الشفاء، دودھ پور، علی گڑھ۔ یوپی۔

لفظ قویٰ قوت کی جمع ہے۔ لہٰذا قوت نفسانیہ کی بابت حکما تحریر کرتے ہیں کہ یہ وہ قوت ہے جس سے تمام اعضاء میں حس وحرکت پیدا ہوتی ہے۔ جن اعضاء میں یہ قوت رکھی گئی ہے وہ اعضائے نفسانیہ کہلاتے ہیں۔ مثلاً دماغ، نخاع، اعصاب، آلات حواس اور عضلات وغیرہ۔ ان تمام اعضاء میں دماغ کو سردار (رئیس) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرشی نے قوت نفسانیہ کی دو قسمیں بیان کی ہیں؛

۱۔ قوت محرکہ (حرکت دلانے والی قوت)
۲۔ قوت مدرکہ (ادراک/محسوس کرنے والی قوت)

صاحب کامل اور صاحب مئۃ نے قوائے نفسانیہ کی تین جنسیں بیان کی ہیں۔

۱۔ قوتِ مدبرہ: یہ وہ قوتیں ہیں جن سے تدبیر حاصل ہوتی ہے۔ قوائے کی اس جنس کو مجموعی طور پر ذہن اور فکر کہا جاتا ہے۔
۲۔ قوتِ حسّاسہ: (مدرکہ) جن سے حس حاصل ہوتی ہے۔
۳۔ قوتِ محرکہ: جن سے حرکت ارادی حاصل ہوتی ہے۔

فلاسفہ اور اطبائے قدیم کے نزدیک دماغی قویٰ اور ان کے محل وقوع میں اختلاف ہے۔ اطباء قدیم کے نزدیک ان کی تعداد تین ہے۔

۱۔ تخیل ۲۔ تفکّر ۳۔ تذکّر

جب کہ فلاسفہ یونان کے نزدیک ان کی تعداد پانچ ہے۔

۱۔ حِسِّ مشترک ۲۔ خیال ۳۔ واہمہ
۴۔ متصرفہ ۵۔ حافظہ

چنانچہ صاحبِ مئۃ اور صاحب کامل نے اطباء

[illegible]

مسلک پر انھیں پانچ بیان کیا ہے لیکن نفس کی بحث میں یہاں پر ہم اطبائے قدیم کے مسلک کے پابند ہیں کیونکہ نفس کی بحث میں اطباء حسِّ مشترک اور قوت واہمہ سے بحث نہیں کرتے کیوں کہ یہ قوت اعضاء کے کسی خاص حصّے کے ساتھ وابستہ نہیں ہے کہ اس کی آفت سے اس کے افعال میں خرابی آجائے اور اس کی تدبیر کی ضرورت ہو۔ لہٰذا ان ہی تین قوتوں کے پیش نظر حکما، امراض کی بحث بھی کرتے ہیں۔

۱۔ فسادِ تخیل ۲۔ فسادِ فکر ۳۔ فسادِ ذُکر (قوت حافظہ کی خرابی)

اطباء کے نزدیک افعال کے ہر جنس مثلاً افعال حیوانیہ، نفسانیہ اور طبعیہ کے لیے ایک ایک الگ نفس ہے۔ یعنی ہر قوت کے لیے ایک مخصوص نفس ہے جیسے نفس حیوانی، نفس طبعی، نفس نفسانی۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک ہی نفس سے تمام قوتیں پیدا ہوں جیسا کہ فلاسفہ کا خیال ہے کہ ان جملہ قوتوں (حیوانیہ، طبعیہ نفسانیہ) کے مجموعہ کا نام نفس ہے۔

اب ہم ان تینوں کے فساد اور ان کی تدابیر (تدارک) کا الگ الگ جائزہ لیں گے۔

## فسادِ تخیل

تخیلات واحساسات کا صحت انسانی سے گہرا تعلق ہے۔ طبیعت انسانی ان ذہنی تصورات اور تخیلات کی محکوم ہے۔ قوت متخیلہ کا مقام دماغ کے بطن مقدم کا پچھلا حصّہ ہے۔ چنانچہ خیال اور وہم اسی سے وابستہ ہیں جو جسم پر اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ الرئیس ابن سینا تحریر کرتا ہے کہ

"کبھی کبھی تصورات نفسانیہ (خیالی اور وہمی) سے بھی طبعی امور (جسمانی تبدیلیاں) [illegible] جیسے [illegible] کے وقت

بس شخص کی صورت کا خیال کیا جاتا ہے۔ بچہ اسی
کے مشابہ پیدا ہوتا ہے اور انزال کے وقت
جس چیز پر نظر جمائی جاتی ہے اسی رنگ کے
قریب قریب بچہ کا رنگ ہوتا ہے ۔ اسی طرح
تصورات وہمیہ میں ایک یہ بھی ہے کہ جب
کوئی شخص سرخ چیزوں کی طرف دیکھتا ہے
اور غور کرتا ہے تو اس طرف خون کی حرکت
تیز ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نکسیر والوں
کو سرخ چیزوں کی طرف دیکھنے سے منع
کیا جاتا ہے ۔"

اسی طرح کسی ترشی کھانے والے کو دیکھ کر دانتوں
ا ہو جانا یا دوسروں کے درد کو دیکھ کر اسی قسم کا
دیکھنے والے کے عضو میں ہو جانا یہ سب انفعالات
نیہ کے تحت آتے ہیں۔ کبھی کبھی ڈرانے والی یا خوش
والی چیزوں کے تصورات سے بھی صحت بدنی متاثر
ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں علامہ قرشی کی ایک حکایت
یل وضاحت ہوتی ہے :

" ایک شخص کسی مزمن مرض میں گرفتار
تھا۔ اتفاق سے سانپ اسے کاٹنے کے لیے
دوڑا۔ وہ شخص ڈر کر بھاگا جس سے اس
کا دیرینہ مرض یک لخت جاتا رہا۔"

چنانچہ امراض نفسانی کی صورت میں صحت نفس
رابیر نفسانی Psychiatry کے ذریعے بروئے کار لایا جاتا
۔ تاکہ اس کے امراض سے متاثر ہونے والا جسم صحت مند
توانا ہو سکے۔ حکمائے عرب اس علاج میں کافی مہارت
تھے اور آج بھی طبیب حاذق اپنی حذاقت اور ذہانت
مزمن قسم کے نفسانی امراض کا علاج تدابیر نفسانی
ذریعے کر لیتا ہے۔

فسادِ فکر — صحت بدنی نفسیاتی کیفیات اور فکر

ہے مثلاً فرحت اور خوشی، رنج و غم اور وہم (فکر) سے بہت
زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ اسی لیے اطبائے یونان علاج میں اچھی
صحت کے لیے موسیقی، سیاحت اور قدرتی مناظر کے معالجتی
اثرات کو آج بھی اہمیت دیتے ہیں۔

فساد فکر اور صحت بدن کے مابین تعلق کی
وضاحت علی بن عباس مجوسی کے بیان کردہ مندرجہ ذیل
حکایت سے ہوتی ہے، جس کا کہ وہ خود چشم دید راوی
بھی ہے :

" اس نے ایک گروہ کو دیکھا کہ رنج و غم میں
ہمیشہ رہنے سے ان کے بدن گھل گئے اور
وہ کمزور ہو گئے تھے لیکن بعد میں جب
انھیں سرور، خوشی اور آسودگی حاصل ہوئی
تو اُن کی لاغری اور نقاہت دور ہو گئی اور
ان کے بدن کی تازگی اور فربہی ایسی پلٹی کہ
کہ جیسے کبھی آسودہ حالی میں رہی ہو گی۔"

اور اسی طرح کچھ لوگ ایسے بھی دیکھے گئے جو اپنے امراض
لاحقہ سے صرف اس وجہ سے شفایاب ہوئے کہ جس سے
انھیں عشق تھا۔ اس کا انھیں وصال حاصل ہو گیا۔
لہٰذا یہ واضح ہوتا ہے کہ طبیعت انسانی (صحت بدنی) تصورات
اور فکر کی کس قدر محکوم ہے۔

جس طرح سوءِ مزاج کی وجہ سے فساد فکر (بُرے
اخلاق) پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح فکر کے فساد (بُرے
اخلاق) کے باعث سوءِ مزاج بھی پیدا ہو جاتا ہے ۔ اسی
طرح اخلاق (تفکرات) بعض اوقات عادت کے لیکن جب
اخلاق (فکر) عادت بد کے تابع ہوگا تو وہ بھی اپنے نتیجے
کے طور پر سوءِ مزاج پیدا کرے گا جس کی تائید شیخ کے
قول سے بھی ہوتی ہے۔

" چنانچہ غصہ بدن میں غیر معمولی گرمی پیدا
کر دیا کرتا ہے اور غیر معمولی جفاف اور

خشکی اور بلادت (نفس کی کاہلی) قوائے نفسانیہ کو سست کر کے مزاج کو بلغمیت کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ غرضیکہ اخلاق کی تعدیل اور میانہ روی میں صحت نفس اور صحت بدن دونوں کی حفاظت مضمر ہے ؎

### فساد ذکر (قوت حافظہ کی خرابی)

قوت ذکر (ذاکرہ، حافظہ) میں ہر قسم کے امور مخزون و محفوظ رہا کرتے ہیں جو ضرورت کے وقت یاد کیے جاسکتے ہیں۔ یہ وہ قوت ہے جس سے حفظ وابستہ ہے جو فکر یا گمان سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان کو اپنے مقام یادداشت میں چھاپ کر رکھ لیتی ہے جو وہاں اسی طرح طرح محفوظ پڑے رہتے ہیں کہ جب ان کی ضرورت پیش آتی ہے تو قوت حافظہ انھیں قوت سے فعل میں لے آتی ہے جس سے جو چیز بظاہر غائب تھی وہ ذہن کے سامنے حاضر ہو کر موجود ہو جاتی ہے اسی کا نام یاد یعنی ذکر ہے۔

"ذکر (تذکر) کا مقام دماغ کا وہ جزو ہے جس میں بطن موخر واقع ہے۔" (کامل الصناعہ)

نسیان، سہو اور قوت حافظہ کی یہ کمی یہ سب بھی انفعالات نفسانیہ کے تحت آتے ہیں اور انھیں فساد ذکر یعنی یادداشت کے فساد سے تعبیر کرتے ہیں جس کی علامات مالیخولیا کے مریضوں میں کثرت سے دیکھنے میں آتی ہے چنانچہ فساد یادداشت یا حافظہ کی وضاحت شیخ الرئیس ابن سینا کی بیان کردہ حکایت سے بھی ہوتی ہے جیسا کہ شیخ بیان کرتا ہے کہ

"خاندان بویہ کے ایک شہزادہ کے دماغ میں یہ وہم سا گیا کہ میں گائے ہوں۔ لہٰذا وہ گائے کی طرح آوازیں کرتا اور کہتا کہ مجھ کو ذبح کر کے میرے گوشت کا مزیدار قیمہ پکاؤ اور کھانا پینا بھی اس نے ترک کر دیا۔ نقالی الطباء اس کا علاج نہ کر سکے۔ لہٰذا شیخ سے رجوع کیا گیا۔ اس نے پہلے تو مریض کو پیغام بھجوایا کہ قصاب تجھ کو ذبح کرنے آرہا ہے مریض یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد شیخ ایک چھرا لے کر کمرے میں داخل ہوا اور مریض کے ہاتھ پاؤں باندھ کر زمین پر لٹا دیا اور جسم کو ٹٹول کر کہا کہ یہ گائے تو بہت کمزور اور دبلی ہے۔ ابھی ذبح کرنے کے قابل نہیں۔ ذبح کرنے سے پہلے اسے کھلا پلا کر موٹا کرنا چاہیے۔ اس کے بعد مریض کے عزیزوں نے شیخ کی تجویز کی ہوئی بہترین اور مناسب دوائیں اور غذائیں کھلانی شروع کیں جس کے نتیجے میں مریض آہستہ آہستہ تندرست ہوتا گیا اور اس کا وہم دور ہو کر حافظہ لوٹ آیا اور اسے صحت کامل حاصل ہو گئی" ؎

مذکورہ بالا حکایت کے بیان کرنے کا مقصد صرف اس کیفیت نفسانیہ پر روشنی ڈالنی تھی جو کہ فسادِ حافظہ کے باعث ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

اطباء نے امراض نفسانیہ کے باعث پیدا ہونے والے عوارضات اور ان سے ظاہر ہونے والی علامات کو بھی مفصل بیان کیا ہے تاکہ امراض نفسانیہ سے نفس کا تدارک کر کے صحت بدنی کو جلد بروئے کار لایا جاسکے۔

### علامات عوارض نفسانیہ

چنانچہ عوارض نفسانیہ میں کچھ ایسی علامات بھی ہیں جو نفس کی قوتوں کے افعال و تاثرات سے وابستہ ہیں جو کہ مزاج اور نفس کی حرارت پر دلالت کرتی ہیں غصہ کا سخت ہونا، اندوہ و ملال کا زیادہ ہونا، فہم و ادراک کا تیز ہونا، بہادر ہونا، بے پروا ہونا، حسن ظن رکھنا، امید کا وسیع ہونا، سنگدل ہونا، ہوشیار ہونا، باوفا

بامروت، سچا اور رازدار ہونا، کاہلی اور سستی کا کم ہونا خوشی و غم سے کم متاثر ہونا۔ یہ سب چیزیں حرارت کی علامت ہیں۔ اس کے برعکس ہونا برودت مزاج کی دلیل ہے۔

خفگی اور خوشی کا دیرپا رہنا اور دماغ میں صور (شکل) اور معانی کا دیر تک قایم رہنا یبوست کی علامت ہے اور تاثرات کا جلد تر زائل ہوجانا رطوبت کی دلیل ہے۔

نیند میں خواب دیکھنا بھی اسی قبیل سے ہے چنانچہ جس شخص کے مزاج میں حرارت کا غلبہ ہوتا ہے وہ اکثر خواب میں آگ دیکھتا ہے کہ وہ تاپ رہا ہے یا دھوپ کھا رہا ہے اور جس شخص کے مزاج میں برودت کا غلبہ ہوتا ہے وہ اکثر خواب میں دیکھتا ہے کہ پالا کھا رہا ہے یا کہ وہ ٹھنڈے پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسی طرح جب خلط کا غلبہ ہوتا ہے وہ اسی کے مناسب خواب دیکھتا ہے۔

کبھی کبھی بچے نیند میں ایسے خواب دیکھتے ہیں کہ جس سے ڈر جاتے ہیں۔ اس کی زیادہ تر وجہ شکم سیری ہوتی ہے۔ کیونکہ حرص کی وجہ سے وہ غذا سے پیٹ زیادہ بھر لیتے ہیں جس سے غذا فاسد ہوجاتی ہے اور اس کا احساس معدہ کو اعصاب حساسہ کے ذریعے ہوجاتا ہے جو کہ دماغ کی قوت مصورہ یا متخیلہ تک پہنچ جاتی ہے جو اس اذیت کو ڈراؤنے خواب کی صورت پہنا دیتی ہے۔ اسی طرح بند کمروں یا بند ہوا والی جگہوں پر سونے والوں کو اکثر ڈراؤنے خواب آتے ہیں کہ کوئی ان کی گردن دبا رہا ہے یا سینے پر بوجھ رکھا ہوا ہے اس کی بھی وجہ یہی ہے کہ بند کمرے میں نسیم oxygen کی کمی سے دماغ کے مرکز تنفس کو اذیت پہنچتی ہے جس سے اعضاء تنفس کے افعال میں خلل واقع ہوتا ہے اور یہ خلل دماغ کی قوت متخیلہ تک پہنچ کر ڈراونے خواب کی شکل میں بدل جاتا ہے۔ لہذا یہ معلوم ہوا کہ شکم سیری اور بند کمروں میں سونے سے اعراض کرنا چاہیے جو کہ نفس کے ساتھ بدنی صحت کے لیے بھی مہلک ہے۔

## حوالے


۱۔ فردوس الحکمت از علی ربن طبری مترجمہ کراچی، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، پاکستان

۲۔ کتاب المائۃ (مخطوطہ) از ابوسہل مسیحی مخزونہ علی گڑھ مولانا آزاد لائبریری۔ اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ

۳۔ کلیات قانون (ترجمہ و شرح) از حکیم کبیرالدین۔ جلد اول و دوم، حیدرآباد، مطبع تاج پریس ۱۹۵۴ء

۴۔ افادۂ کبیر از حکیم کبیرالدین۔ حیدرآباد، دکن نورالامراء، ۱۹۱۶ء

۵۔ ادویہ قلبیہ از شیخ الرئیس ابن سینا (مترجم حکیم عبداللطیف فلسفی) مطبوعہ کلکتہ ایران سوسائٹی ۱۹۵۹ء

۶۔ کلیات نفیسی (ترجمہ) مصنف علامہ برہان الدین نفیس (مترجم) حکیم کبیرالدین۔ مطبوعہ۔ حیدرآباد تاج پریس۔

۷۔ کامل الصناعۃ۔ (اردو ترجمہ) مصنف ابوالحسن علی بن عباس مجوسی (مترجم) حکیم غلام حسین کنتوری مطبع لکھنؤ، نول کشور، ۱۸۸۹ء

۸۔ طب العرب از حکیم نیر واسطی۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۱، شمارہ ۷، (جولائی ۹۲ء)

# نام و نشاں ہمارا

## زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست

ریاض الدین احمد ○

زمانہ اپنی چال چلتا رہا۔ قومیں ابھریں، بنیں، عروج تک پہنچیں۔ مگر بگڑیں اور مٹ گئیں۔ بعض کے نشانات معدوم ہیں، بعض دفینوں میں چھپے ہیں۔ بعض تاریخ کے اوراق میں مٹ رہے ہیں، بعض قومیں جو زندہ کہلاتی ہیں چرخ کہن کی چکی میں پس رہی ہیں۔ بعض ستاروں کے آگے جہان کی تلاش میں ہیں اور بعض آسمان پر کمند باندھ رہی ہیں مگر تکبّر انھیں کھائے جا رہا ہے۔ تکبّر زوال کا شارٹ کٹ اور ایمان کا قاطع ہے اس کا زہر چپکے چپکے پھیلتا ہے اور تیزی سے ٹیک دیتا ہے۔

لیکن قوموں کے زوال کے آثار اور بھی ہیں اعمال صالحہ سے اعراض۔ اطیعوا اللہ اور اطیعوا الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے برگشتگی، حبل اللہ سے عناد، نفاق سے محبت، توکل علی اللہ سے دوری سعیًا مشکورًا سے بے تعلقی، یقین کامل میں تذبذب غیروں سے الفت، اپنوں سے نفرت۔ صدیق اور ابن الخطاب کا کردار متروک، عائشہ اور فاطمہ کا فیشن مذموم، بتوں سے امیدیں خدا سے نومیدی۔

یہ تمام نشانات زوال کے ہیں اور یہ سب ہمارے کردار میں موجود ہیں۔ پھر بھی ع

"کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری"

اس پر ایک واقعہ یاد آیا۔ کہیں ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ کسی بات پر ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور بھگ دڑ مچ گئی۔ بہت سے لوگ بھاگے، ایک عالم دین تھے وہ بھی بھاگے۔ راستے میں ایک شخص کو دیکھا کہ لاٹھی لیے جلسے ہنگامہ کی طرف بھاگا جا رہا ہے۔ مولانا نے از راہِ ہمدردی اس سے پوچھا کہ

"میاں کہاں جا رہے ہو؟"

اس نے بڑے تیکھے پن سے جواب دیا

"سُنَتُ ناہیں ہو!" (سنتے نہیں ہو)

اللہ اکبر کی آواز گونج رہی ہے

اور تیزی سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ مولانا کو اتنی ندامت محسوس ہوئی کہ خود بھی اس کے پیچھے پیچھے واپس ہو لیے۔ "اللہ اکبر" کی یہ آگ جنگ سلگ رہی ہے۔ اللہ کی نام لیوا قوم زوال کے تمام علامات کے

---

○ ص۔ب۔ ۳۰۵۰ بتوسط ڈاکٹر انور کمال عبداللہ حمد ہسپتال، الدوحہ، قطر۔

باوجود مٹ نہیں سکتی۔ یہ کوئی خوش فہمی کی بات نہیں ہے۔ رب العالمین کا وعدہ ہے اور پکا وعدہ۔ مسلمان قوم کے ساتھ خدا نے وعدہ کر رکھا ہے۔

"ہم نے ہی ذکر یا قرآن نازل کیا ہے
اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"
(الحجر: ۹)

ذکر کی حفاظت کرنے والے کی حفاظت کیے بغیر ممکن نہیں، لہٰذا قرآن کی حفاظت کے وعدے کے اندر مسلمان قوم کی حفاظت کا وعدہ بھی موجود ہے جو قرآن کی حامل ہے پھر اس سے زیادہ واضح الفاظ میں قرآن حکیم کا وعدہ ان آیات میں ہے:

"یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے
منہ سے پھونک مار کر بجھا دیں اور خدا
اپنے نور کو پورا کیے بغیر رہنے کا نہیں
اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔ وہی تو ہے
جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین
حق دے کر بھیجا تاکہ اس دین کو دنیا
کے تمام ادیان اور نظریات زندگی پر
غالب کر دے، اگرچہ کافر ناخوش ہوں۔
(التوبہ، ۳۲، ۳۳)

یہی سبب ہے کہ زمانے کے بڑے بڑے حادثات مسلمان قوم کو مٹا نہیں سکے۔ ہر بڑا حادثہ جو اس قوم کو نیست و نابود کرنے کے لیے کافی تھا، اس کے لیے زندگی کا سامان بن گیا۔ ہر آگ جو کسی نمرود نے اس کے لیے روشن کی وہ ایک گلزار بن گئی۔

خدا کا عشق وہ قانون ہے جس پر کائنات کے وجود کا دارومدار ہے لیکن خدا کا عشق کلمۂ توحید کی صورت میں ایک امانت کے طور پر مسلمان قوم کے پاس ہے۔ اگر یہ قوم مٹ جائے تو خود کائنات باقی نہیں رہتی۔

(حکمت اقبال ڈاکٹر محمد رفیع الدین (حکمت القرآن لاہور نمبر ۹۲))

وقت آگیا ہے کہ اس امانت مقدسہ کی حفاظت کے لیے ہمارے قدم زیادہ تیزی سے اٹھنے لگیں اور "اللہ اکبر" کی گونج دشمنانِ دین و ایمان پر شعلہ بار کر دیں تاکہ قیام ذاکر کے لیے ہمارے تصورات حقیقت کا جامہ پہن لیں۔

مسلمان چاہے کتنی ہی زبوں حالی میں ہو اس کی رگوں میں فطرتِ ابراہیمی کا لہو دوڑ رہا ہے اور ہر گرد آتش اس کے جسم میں نئے شعلے بھر رہی ہے۔ اس وقت مجھے ایک بہت پرانی بات آتی ہے۔ ۱۹۲۰ء کے آس پاس ایک صاحب اسلام مورتی کے نام سے مشہور تھے اور جسمانی طاقت کے عدیم المثال کرتب دکھایا کرتے تھے۔ ایک اسکول کے میدان میں ان کا پنڈال نصب ہوا۔ بچے، بڑے بوڑھے سبھی ان کے کرتب دیکھنے کے لیے اکٹھا تھے۔ ایک رات کے مظاہرے میں یہ دیکھا گیا کہ کئی فٹ لمبی سطح زمین پر انگارے روشن ہیں اسلام مورتی نے اعلان کیا:

"لوگو! میں اس آگ پر ننگے پیر چلتا
ہوں جس کا جی چاہے میرے پیچھے آجائے
اس کا بھی پیر نہیں جلے گا۔"

ایک کیا بیچاسوں بچے کود کر میدان میں اتر گئے اور ان کے ہاتھ کے پیچھے ایک لمبی قطار لگ گئی میں بھی اسی میں جا ملا اور کسی ساتھی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر یہ پوری امت اس آگ پر گزر گئی اور کسی کا بال نہیں ہوا۔ اس وقت یہ سب صرف ایک تماشا تھا مگر اب میں یہ سوچتا ہوں کہ ایک عمومی انسان جس کے ساتھ "اسلام" کا لفظ وابستہ ہے شعلۂ نار سے بے خطر گزر سکتا ہے تو کیا وہ ذاکر جو حامل قرآن ہے اس کو کوئی آگ جلا سکتی ہے اور کیا یہ کوئی عجیب بات ہوگی کہ جو امت ذاکر کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگے اسے دنیا کی ہر طاقت مٹانے سے معذور ہو جائے؟

بجھ رہی ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

یہی بات ہے کہ دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش (ہند) کی طرف سے منصوبہ ترویج القرآن اس امت کے لیے مرتب کیا گیا ہے جو ذاکر کا ہاتھ پکڑ کر آگ سے گزر جانے کا ارادہ رکھتی ہو۔ تاریخ گواہ ہے کہ ذاکروں کا عظیم قافلہ "محبوب خدا" صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑے ہوئے صدیوں سے بھڑکتی ہوئی نار نمرود پہ بے خطر چلا آرہا ہے۔ آج کی بھٹکی ہوئی ملت اسلامیہ کے لیے یہی ہاتھ اور یہی ذکر قرآن ایک آخری سہارا ہے۔

"اور جس شخص نے اللہ اور اس
کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت
کی اس نے اللہ کی اطاعت کی
(پھر اسے سب کچھ مل گیا۔"
(پارہ ۵ - سورۃ النساء ۸۰)

ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک آب و ہوا میں دونوں شریک ہیں، ایک دریا کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں، ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے۔ ایک کو دوسرے سے ملے بغیر چارہ نہیں۔ پس کسی چیز کو جو معاشرت سے علاقہ رکھتی ہے ان دونوں کا علیحدہ علیحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دینا ہے

سر سید احمد خاںؒ

# تعلیم و تربیت کا پہلا گہوارہ

مقبول احمد

بچوں کی تعلیم و تربیت کا پہلا گہوارہ ان کا اپنا گھر ہے۔ یہ تعلیم رحم مادری میں بچے کے اندر قوت حس کے پیدا ہونے کے بعد ہی شروع ہو جاتی ہے۔ پاکی اور صفائی سے رہنا، نیک خیالات کا دل میں لانا، اور اچھے عمل کرنا، ان سب کا اثر شروع ہی سے ہوتا ہے۔ اکثر حاملہ مائیں، مختلف آوازوں، گانوں کو سنتی کا اثر اپنے بچوں پر محسوس کرتی ہیں۔ قرآن شریف کو بلند آواز اور قرأت سے پڑھنے کا بھی کافی اثر ہوتا ہے جس کا اندازہ ان کے ہاتھ پاؤں کی حرکتوں اور رفتار سے ہو جاتا ہے۔

لہٰذا ابتدا میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے صحیح اور صاف ماحول ضروری ہے۔ گھروں کی دیکھ بھال، مذہبی و اخلاقی ماحول پیدا کرنا اور رکھ رکھاؤ گھر کی مالکہ کی ذمہ داری ہے۔ تعلیم نسواں دیگر وجہوں کے علاوہ یوں بھی ضروری ہے کہ ماؤں میں صحیح ذوق اور عمدہ کردار پیدا ہو سکے جس کا لازمی اثر بچوں پر پڑے گا۔ انگریزی کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ:

"وہ ہاتھ جو بچوں کے جھولے ہلاتے ہیں
وہی دنیا پر حکومت کرتے ہیں۔"

اپنے گھر کی نگرانی اور اقتصادی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ باپ کا بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں حصہ لینا ضروری ہے۔ روز تھوڑا سا وقت اس کے لیے دینا ہوگا تاکہ اولاد کی ذہنی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی نشو و نما ہو سکے۔

شفقت کی ایک نظر، سر پر ہاتھ رکھ دینا پیار و محبت سے باتیں کرنا، بچوں کو گود میں لینا اور کھلانا اور یہاں تک کہ اپنے کاندھوں پر سوار کرانا (سنت نبوی) ان سب کی بڑی اہمیت ہے اور نفسیاتی طور پر بڑا اثر۔ شرافت انسانیت، محبت، اخلاق اور والدین کی تعظیم ان سب کی بنیاد یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کتنے اشخاص اپنا وقت اس پر صرف کرتے ہیں۔

کھیل کود اور تفریح کے دوران بھی گھل مل کر باادب طور پر ان کے ساتھ رہنا اور ان کی کھیل میں حصہ لینا بھی ضروری ہے۔ ہوشیار والدین

۹۳، پارک اسٹریٹ، کلکتہ، مغربی بنگال۔

کی باتیں، چاہے وہ کھلی ہوں یا اشارۃً ہوں، چاہے وہ قصے کہانی کے طور پر ہوں ان کے دماغی کمپیوٹر پر نقش ہو جاتی ہیں اور اکثر بڑی پائیدار ہوتی ہیں۔

ہمیں شروع ہی سے اسلامی، انسانی اور اخلاقی بنیاد ڈالنے کا خیال ہونا چاہیے۔ جب بچے ذرا بڑے ہوں تو ہم اپنی تعلیم کا نچوڑ، اپنے تجربوں کا خلاصہ، ملک و ملت کی تواریخ، خاندانی روایتوں کا ذکر ان کی گھٹی میں ڈال سکتے ہیں۔ ہمارے بچوں کا حق ہے کہ ہم ان باتوں سے ان کو مستفیض کریں۔

بچپن سے ہی، ہم کو ان کے سوال وجواب، ہر نئی چیز کو جاننے کی کوشش کو تحسین کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ ان کے سوالوں کا قابل فہم جواب دینا چاہیئے تاکہ ان چیزوں کی رغبت اور بڑھے۔ چھوٹے موٹے کھلونے اور دیگر چیزیں جن سے ان کے ذہن کی پرورش ہو، نئی باتیں پیدا کرنے کی کوشش ہو اور نئی دریافت و ایجاد کی خواہش ہو مہیا کرنا ضروری ہے۔ آج کل بلڈنگ بلوکس، لوگو، اسپرنگ اور بیٹری سے چلنے والے کھلونے اور کمپیوٹر کے کھلونے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ کھاتے پیتے اور خوش حال گھروں میں اتالیق رکھنے کا رواج تھا۔ اقتصادی مجبوریوں کی وجہ سے اب ذرا دشوار سہی مگر ناممکن نہیں ہے۔ اس کو پھر لانے کی کوشش ہونا چاہیے۔

مذہبی، قومی و ملیّ جذبوں کو پروان چڑھانے کے لیے ایسی چھوٹی چھوٹی کتابوں اور رسالوں کی سخت ضرورت ہے جو کم داموں میں فراوانی سے دستیاب ہو سکیں۔ ان کو پڑھ کر سنایا جائے اور ذرا بڑے ہونے پر خود بھی پڑھنے کی کوشش کو سراہا جائے۔ افسوس کہ ایسے لٹریچر کی اردو میں کمی ہے اور انگریزی میں تو تقریباً ناپید ہیں وقت کی پکار ہے کہ ایسے ادارے قائم کیے جائیں [illegible]

اور ملی سطح پر حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام بچوں کو پڑھ کر سنانا اور سمجھانا کافی مفید ہوگا۔

پاکی و ناپاکی، حلال وحرام کا تصور اسلام میں بہت اہم ہے۔ گھروں میں شروع ہی سے اس کی تاکید کرنا، صبح اٹھ کر ہاتھ منہ دھونا، غسل کرنا، صبح صبح قرآن کریم کی تلاوت کرنا اور ان کے مطالب پر غور کرنا، نماز کی پابندی کرنا، آداب سحر گاہی کی اہمیت پر زور دینا اور اپنے کام پر دیر کیے بغیر فوراً لگ جانا ایسی عادتیں ہیں جو ہمیشہ کے لیے مفید ہوں گی۔

آداب زندگی، رہن سہن، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر مہربانی، وقت کی پابندی کرنا، اپنا کام خود کرنا اپنے جوتوں پر خود پالش کرنا، بستر خود ٹھیک کرنا، بٹن خود ٹانکنا وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ ایک دفعہ عادت بن جانے پر ہمیشہ رہے گی۔ وقت ملنے پر صبح وشام باغوں میں اور دریا کے کنارے چلنا پھرنا، شام کو جلد گھر واپس آ جانا، مختلف کھیلوں میں حصہ لینا، جوڈو اور کراٹے تیراکی سیکھنا ایسی چیزیں ہیں جن کا جاننا نہایت ضروری ہے۔

شروع سے ہی وقت کی پابندی اور اس کی قدر مستقل محنت و مشقت، عمل پیہم، استقلال و صبر اور کسی بھی کام کو انجام دینے کے لیے لگن پیدا کرنا کامیابی کی ضامن ہے۔

بچوں کو قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرا دینا بھی ضروری ہیں اور ان کے مطالب بھی ان کے ذہن نشین کر دینے چاہیں۔

بچوں کے لیے تاریخ اسلام اور سیرت نبویؐ سے متعلق کیسٹ بھی سنوائیں تاکہ ان میں اسلامی شعور پروان چڑھے۔ ان سب کے کرنے کے بعد امید ہے کہ ہم منزل مقصود حاصل کر لیں گے۔

تر پردیش کے آٹھ گرلز انٹر کالجوں اور دو گرلز ہائی اسکولوں میں بورڈ امتحانوں میں

# ۶۹ انہتر ممتاز ترین طالبات کو شیروانی انعامات ۱۹۹۱ء

احمد رشید شیروانی ○

پیش ہیں اتر پردیش کے دس گرلز اداروں (آٹھ
ا لجوں اور دو ہائی اسکولوں) میں ۱۹۹۱ء کے بورڈ
متحانات میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ اپنے اپنے ادارے
یں پوزیشن حاصل کرنے والی انہتر ۶۹ ہونہار طالبات کے
ام جن کو الحاجہ بیگم تارا رشید شیروانی صاحبہ (چیرمین
بھارت سیوا ٹرسٹ و جیپ انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ
ور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ)
ی طرف سے دلی دعاؤں کے ساتھ انعامات بھیجے
گئے۔

حمیدیہ گرلز انٹر کالج ۔ الہ آباد

د ہائی اسکول ؏

۱۔ کماری فرینہ نفیس سلمہا۔ ڈھائی سو روپے
۲۔ کماری غزالہ اقبال سلمہا۔ ڈیڑھ سو روپے
۳۔ کماری خدیجہ عظیم اللہ سلمہا۔ سو روپے
۴۔ نشاط انجم سلمہا۔ اسّی روپے
۵۔ کماری فوزیہ سلمہا۔ اسّی روپے
۶ کماری پروین سلمہا۔ اسّی روپے
۷۔ کماری فاطمہ انتظار سلمہا۔ ستّر روپے
۸۔ کماری زیبا مجیب سلمہا۔ ستّر روپے
۹۔ کماری تاجور سلطانہ سلمہا۔ پچاس روپے
۱۰ کماری رضیہ خان سلمہا۔ پچاس روپے
۱۱ کماری نشاط صدیقی سلمہا۔ پچاس روپے
۱۲ کماری شاہینہ پروین سلمہا پچاس روپے
۱۳۔ کماری فوزیہ فاروقی سلمہا پچاس روپے
۱۴۔ کماری شبانہ الطاف سلمہا۔ پچاس روپے

انٹر

۱۔ کماری روحی خاتون سلمہا۔ ڈھائی سو روپے
۲۔ کماری نرگس بیگم سلمہا۔ ڈیڑھ سو روپے
۳۔ کماری رفیعہ انجم سلمہا۔ سو روپے
۴۔ کماری ناصرہ بیگم سلمہا۔ اسّی روپے
۵۔ کماری فرزانہ نعیم سلمہا ستر روپے
۶ کماری نزہت جہاں سلمہا ستر روپے
۷۔ کماری کنیہ سلمہا۔ پچاس روپے
۸۔ کماری نسرین بیگم سلمہا۔ پچاس روپے

○ کناٹ پلیس، نئی دہلی۔

## بیگم خیر گرلز انٹر کالج ۔ گاندھی نگر ۔ بستی

### ہائی اسکول

۱۔ کماری سیدہ کنیز فاطمہ سلمہا۔ ڈھائی سو روپیے
۲۔ کماری فرحت معراج سلمہا۔ ڈیڑھ سو روپیے
۳۔ کماری آکانکشا سری واستو سلمہا۔ سو روپیے

### انٹر

۱۔ کماری زاہدہ پروین سلمہا ڈھائی سو روپیے
۲۔ کماری ملک رخسانہ سلمہا ڈیڑھ سو روپیے
۳۔ کماری ملک ریحانہ سلمہا۔ پچاس روپیے
۴۔ کماری نسرین عائشہ سلمہا۔ پچاس روپیے

## امامباڑہ مسلم گرلز انٹر کالج۔ گورکھپور

### ہائی اسکول

۱۔ کماری ظل ہما سلمہا۔ ڈھائی سو روپیے
۲۔ کماری عرشیہ سلمہا۔ ڈیڑھ سو روپیے
۳۔ کماری مہ ناز حسن سلمہا۔ سو روپیے

### انٹر

۱۔ کماری عرشی عثمانی سلمہا۔ ڈھائی سو روپیے
۲۔ کماری الکا پانڈے سلمہا۔ ڈیڑھ سو روپیے
۳۔ کماری کویتا پانڈے سلمہا۔ سو روپیے

## مسلم جوبلی گرلز انٹر کالج۔ کانپور

### ہائی اسکول

۱۔ کماری شمع پروین سلمہا۔ ڈھائی سو روپیے
۲۔ کماری روبینہ خاتون سلمہا۔ ڈیڑھ سو روپیے
۳۔ کماری شبینہ پروین سلمہا۔ سو روپیے

### انٹر

۱۔ کماری زائرہ فردوس سلمہا۔ ڈھائی سو روپیے
۲۔ کماری قیصر جہاں سلمہا۔ ڈیڑھ سو روپیے
۳۔ کماری ترنم منیر سلمہا۔ سو روپیے

## آل احمد گرلز انٹر کالج۔ امروہہ ضلع مرادآباد

### ہائی اسکول

۱۔ کماری نازیہ رضوی سلمہا۔ ڈھائی سو روپیے
۲۔ کماری شبانہ پروین سلمہا سوا سو روپیے
۳۔ کماری تطہیر فاطمہ سلمہا۔ سوا سو روپیے

### انٹر

۱۔ کماری عتیقہ سلطانہ سلمہا۔ ڈھائی سو روپیے
۲۔ کماری ہاروحی سلمہا ڈیڑھ سو روپیے
۳۔ کماری مہ وش کفیل سلمہا۔ سو روپیے

## مدرسہ نسواں انٹر کالج ۔ پہاڑپور اعظم گڑھ

### ہائی اسکول

۱۔ کماری عارفی سلمہا۔ ڈھائی سو روپیے
۲۔ کماری نغمہ تبسم سلمہا۔ سوا سو روپیے
۳۔ کماری سنبل عارفی سلمہا۔ سوا سو روپیے

### انٹر

۱۔ کماری ثمینہ کبریٰ ڈھائی سو روپیے
۲۔ کماری بے بی تبسم سلمہا۔ ڈیڑھ سو روپیے
۳۔ کماری شاہ دیبا سلمہا۔ سو روپیے

## اسلامیہ گرلز انٹر کالج ۔ بریلی

### ہائی اسکول

۱۔ کماری فرحت راغب سلمہا۔ ڈھائی سو روپیے
۲۔ کماری شاداب زہرا سلمہا۔ ڈیڑھ سو روپیے
۳۔ کماری پرتبھا سنگھ سلمہا۔ سو روپیے

### انٹر

۱۔ کماری نسرین اختر سلمہا۔ ڈھائی سو روپیے
۲۔ کماری پروین اختر سلمہا۔ ڈیڑھ سو روپیے
۳۔ کماری شہریارانی سلمہا۔ سو روپیے

## نیشنل گرلز انٹر کالج ۔ شاہجہاں پور

### ہائی اسکول

کماری عظمیٰ صدیقی سلہا۔ ڈھائی سو روپیے
کماری رومانہ ظفر سلہا۔ ڈیڑھ سو روپیے
کماری نرگس فاطمہ سلہا۔ سو روپیے

اناؤ

کماری حاجرانہ سلہا۔ دو سو روپیے
کماری سیما خان سلہا دو سو روپیے
کماری زیب النساء سلہا سو روپیے

مسلم نسواں ہائر سکنڈری اسکول
اولڈ ٹاؤن۔ ضلع سیتاپور

کماری شبانہ پروین سلہا ڈھائی سو روپیے
کماری شگوفہ خانم سلہا ڈیڑھ سو روپیے

۳۔ کماری سیما سلہا۔ سو روپیے

بیگم لادی مسلم گرلز ہائر سکنڈری اسکول
لکھنؤ۔

۱۔ کماری روحی مرزا سلہا دو سو روپیے

اس سے پہلے چار گرلز انٹر کالجوں اور گیارہ گرلز ہائی اسکولوں میں انعام جیتنے والی اڑتالیس ہونہار طالبات کے نام پیش کیے جا چکے ہیں۔ اس طرح اب تک اتر پردیش کے پچیس گرلز اداروں (بارہ انٹر کالجوں اور تیرہ ہائی اسکولوں میں انعامات جیتنے والی ایک سو سترہ ہونہار طالبات کے نام پیش کیے جا چکے ہیں۔

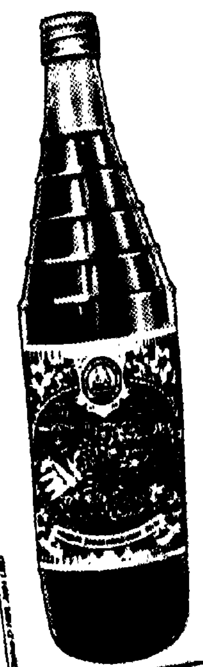
"جو لوگ ملک کی بھلائی چاہتے ہیں ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم و مذہب کے کل باشندگان ملک کی بھلائی پر کوشش کریں۔ کیونکہ جس طرح ایک انسان کی اس کے تمام قویٰ اور اعضا کے صحیح سالم رہے بغیر زندگی یا پوری تندرستی محال ہے اسی طرح ملک کے تمام باشندوں کی خوشحالی اور بہبود ملک کی ترقی کے بغیر ناممکن ہے۔"

سر سید رح

"میری اصلی پسند!



روح افزا ملک شیک!"



روح افزا ملک شیک بے شبہ انتہائی مزے دار اور
تازگی بخش ہے، اس کے ساتھ یہ صحت افزا بھی ہے۔
جب بھی آپ کا بچہ دودھ پیئے، اس میں چینی کے بجائے
روح افزا ڈالیے اور دیکھیے، دودھ کیا سے کیا بن جاتا ہے!

ملک شیک کے علاوہ دہی کی لسی، آئس کریم، فالودہ،
کسٹرڈ اور نیبو پانی میں بھی ہمیشہ روح افزا ڈالیے!

جڑی بوٹیوں، زندگی بخش عناصر اور قدرتی وٹامنوں کا نادر مرکب

# روح افزا

۸۵ سال سے زیادہ مدت سے سب کا من پسند شربت

ہمدرد

# THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

# تہذیب الاخلاق

شمارہ ۸

جلد ۱۱

اگست ۹۲ء


* بانی :
سر سید احمد خاںؒ

* سرپرست :
**پروفیسر محمد نسیم فاروقی**
وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

* مدیر :
کبیر احمد جائسی

* نائب مدیر :
احمد مجتبیٰ قریشی

* انچارج سرکولیشن :
شفیق احمد

* تزئین : سرور


زر سالانہ :

| | | |
|---|---|---|
| انڈیا | ... | Rs. 45.00 |
| بیرونی ممالک | ... | US $ 20.00 ہوائی ڈاک |
| | | US $ 8.00 عام ڈاک |

ترسیل زر کا پتہ :

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

EDITOR,
TAHZIBUL AKHLAQ &
NISHANT,
ALIGARH MUSLIM
UNIVERSITY,
ALIGARH. 202002.

PHONE : 24827

# مندرجات






مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ - پرنٹر پبلشر: اسرار احمد - مقام اشاعت: ماہنامہ تہذیب الاخلاق
ایڈمنسٹریشن - اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ - مطبع: اے۔ ایم۔ یو۔ پریس - علی گڑھ

# اداریہ

تہذیب الاخلاق کے قارئین کو یوم آزادی مبارک ہو۔ آزادی شتر بے مہار ہونے، من مانی کرنے خود اپنے وضع کردہ آئین اور قوانین کی دھجیاں اڑانے کا نام نہیں ہے، اصل آزادی تو وہ ہے جب انسان قواعد و قوانین اور ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھے اور ملکی و ملی مفاد پر اپنے ذاتی مفاد، خواہشوں اور تمناؤں کو قربان بھی کرتا رہے۔ قربانی صرف حصول آزادی ہی کے لیے ضروری نہیں ہے۔ آزادی کو اس کے صحیح اور حقیقی مفہوم میں برقرار رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس کو ترقی یافتہ قوموں نے اپنا لیا ہے اور اس کی مدد سے وہ ساری دنیا پر جہانگیری و جہانداری کا خواب دیکھنے لگی ہیں لیکن ترقی پذیر قوموں نے ابھی اس نقطۂ نظر کا نہ تو فیضان حاصل کیا ہے نہ ہی عرفان۔ اسی لیے وہ اپنے سفر میں ہر ہر گام پر خارزاروں سے الجھتی اور سنگ گراں سے دوچار ہوتی ہوئی آگے کی طرف بڑی ہی سست رفتاری سے گامزن ہیں۔ اگر ان قوموں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی آجائے اور ملکی و ملی مفادات کو سارے دوسرے مفادات پر برتری حاصل ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ترقی پذیر قومیں ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بہ شانہ نہ چل سکیں اور صحیح و حقیقی آزادی سے بہرہ ور نہ ہو سکیں۔

جس وقت یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں وطن عزیز ایک سنگین اضطراب، انتشار اور اضطرار کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایک طرف ملکی قوانین ہیں ان کو نافذ کرانے والے ادارے ہیں اور دوسری طرف آزادی کے صحیح اور حقیقی مفہوم سے ناآشنا اپنی سیاسی دکان سجانے والے وہ افراد ہیں جو من مانی کرنے ہی کو آزادی کا مترادف سمجھتے ہیں۔ قوانین نافذ کرنے والے ادارے کہتے ہیں کہ قانون کو بزور نافذ کیا جائے گا اور من مانی کرنے والوں کا اعلان ہے کہ چاہے خون کے دریا بہہ جائیں اور سارا ملک اس خونی دریا میں غرق ہو جائے ہم تو اپنی زندگی کی آخری سانس تک من مانی کرتے رہیں گے۔ ان دو متحارب قوتوں کے درمیان "خاموش اکثریت" ہے جو عددی اعتبار سے تو بہت ہے مگر عملی اعتبار سے صفر کا بھی درجہ نہیں رکھتی۔ تیرہ و تاریک آسمان پر امید کی ایک ہلکی سی کرن

نظر آئی ہے۔ وزیر اعظم نے من مانی کرنے والوں کو اس حد تک تو آمادہ کر لیا ہے کہ وہ آج سے متنازع زمین پر اپنی سرگرمیوں کو معطل کر کے غیر متنازع زمین پر اپنی انانیت کو تسکین دینے کے لیے کار سیوا جاری کر دیں گے۔ یہ بھی طے ہوا ہے کہ تین ماہ کے اندر اندر اس پرانے ناسور کا جو ۱۹۴۹ء سے بہہ رہا ہے خاتمہ کر دیا جائے گا تاکہ اس کے بعد نہ تو احتجاجی جلسے ہوں نہ جلوس نکلیں، پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کا نہ تو کام کاج رکے اور نہ ہی بے گناہوں کے خون سے زمین لالہ زار ہو۔

امید کی اس چھوٹی سی کرن کو چمکتے دمکتے اور سب کو فیض پہنچاتے ہوئے سورج میں نہ تو کوئی فرد ہی ڈھال سکتا ہے نہ ہی اکیلی کوئی ایک سیاسی پارٹی۔ موجودہ تیرہ و تاریک فضا سے نجات پانے کے لیے سب کو مل جل کر، افہام و تفہیم کے مرحلے سے گزر کر، سود و زیاں کی ملی جلی کیفیت سے دوچار ہو کر ہم شانہ و ہم گام ہونا پڑے گا۔ جذباتیت کو بالائے طاق رکھ کر عقلیت کی مدد سے منزل مقصود کا تعین کرنا ہوگا اور اس کے حصول کے لیے بہت سے ذاتی مفادات کو قربان کر دینا ہوگا خواہ اس سے ہم کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جن قوموں کی تباہی و بربادی نزدیک ہوتی ہے قدرت ان کو بے فہم اور بے ادراک کر دیا کرتی ہے۔ روز روشن کی طرح واضح حقیقتیں اس کو دکھائی نہیں دیتیں اور وہ ان ہی شاخوں کو اپنے ہاتھ سے کاٹنے لگتی ہیں جن پر ان کا بسیرا ہوتا ہے۔ موجودہ انتشار اضطراب اور اضطرار کے باوجود مقام شکر ہے کہ مجموعی حیثیت سے ہندوستانی قوم ابھی بے فہم اور بے ادراک نہیں ہوئی ہے، جس شاخ پر اس کا بسیرا ہے اس کی حفاظت کا جذبہ ابھی اس کے دلوں میں موجزن ہے۔ واضح حقیقتیں اس کی نگاہوں کے سامنے روشن ہیں اس لیے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھٹے گا، سورج اپنی پوری آن بان سے روشن ہوگا اور اس کی حیات بخش و حیات پرور کرنوں سے ہندوستان کا قریہ قریہ، چپہ چپہ، گوشہ گوشہ منور ہو کر اپنی عظمت پارینہ کا نقشہ ایک بار پھر سے پوری دنیا کو دکھلانے لگا۔ موجودہ صورت حال تشویش ناک ضرور ہے لیکن مایوس کن نہیں ہے۔ جس دن یہ صورت حال مایوس کن ہو گئی اس دن ہمارا خدا ہی حافظ۔ اس لیے شاہ و گدا، میر و وزیر سب کو مل جل کر کوشش کرنی چاہیے کہ موجودہ صورت حال مایوس کن نہ ہونے پائے۔

کبیر احمد جائسی

۲۶/۷/۱۹۹۲

# حسب اور نسب

خواجہ الطاف حسین حالی

مسلمانوں میں انسان کے خاندان کے متعلق اکثر یہ دو لفظ مستعمل ہوتے ہیں حسب اور نسب۔

نسب: آدمی کی اصل اور نژاد کو کہتے ہیں۔

حسب: اس شرف اور بزرگی کا نام ہے جو کسی شخص کی علمیت یا نبوت یا سلطنت یا دولت یا درویشی یا کسی اور فضیلت کے سبب اس کے خاندان میں ہمیشہ یا چند پشتوں تک باقی رہے۔

پس نسب کے لحاظ سے جیسا کہ ظاہر ہے تمام بنی نوع انسان ایک درخت کی ڈالیاں یا ایک ڈال کے پتے ہیں۔ ایک کو دوسرے پر کسی طرح کی فوقیت اور ترجیح نہیں ہے۔ امیر المومنین علی مرتضیٰ رضؓ فرماتے ہیں ؎

الناس من جہۃ التمثال اکفاء
ابوہم آدم والام حواء

(انسان باعتبار پیکر عنصری کے ایک دوسرے کے ہمسر ہیں۔ ان کا باپ آدم ہے اور ماں حوا ہے)

پس جو کچھ تفوق اور بڑائی ایک دوسرے پر ہے وہ محض حسب کے لحاظ سے ہے نہ کہ نسب کے لحاظ سے۔

اس بارے میں حسب کی بزرگی کتنے عرصے تک قایم رہتی ہے۔ مشہور مورخ ابن خلدون اپنی تاریخ کے مقدمے میں حسب ذیل رائے ظاہر کرتے ہیں۔

"حسب یعنی خاندانی شرافت اکثر چوتھی نسل میں زائل ہو جاتی ہے کیونکہ جو شخص خاندان کا بانی ہوتا ہے اس کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ میں نے کیسی کیسی مشقتوں سے یہ عزت حاصل کی ہے۔ اس لیے وہ ان محاسن اور خوبیوں کو جن کے ذریعے سے اس کو امتیاز حاصل ہوا ہے کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ پھر اس کا بیٹا جس نے باپ کا طریقہ دیکھا ہے ان محاسن اور خوبیوں کی قدر کرتا ہے جن سے باپ کو یہ مرتبہ حاصل ہوا تھا اور وہ بھی اکثر باپ ہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے مگر باپ اور بیٹے میں ایسا ہی فرق رہتا ہے جیسا دیکھنے والے اور سننے والے میں ہوتا ہے۔ گویا باپ نے جو چیز آنکھوں سے

دیکھی تھی، بیٹے نے اس کو کانوں سے سنا ہے اب تیسری نسل آتی ہے اور وہ محض تقلیداً باپ دادا کی ڈگر اختیار کرتی ہے لیکن ابھی تک خاندانی عظمت کا طلسم ویسا ہی بندھا رہتا ہے اور بظاہر دادا اور پوتے کے طریقے میں کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا مگر چوتھی نسل میں وہ طلسم بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ نسل باپ دادا کی خوبیوں کو ملیا میٹ کر دیتی ہے اور یہ خیال کرتی ہے کہ ہمارے خاندان کی عزت کچھ ہمارے بزرگوں کی کوشش اور اکتساب سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ ابتدائے آفرینش سے یہ خاندان اسی طرح ممتاز چلا آیا ہے اور اس خاندان کا ذاتی خاصہ یہی ہے کہ اوروں سے ممتاز رہے۔ اس خیال خام میں وہ بغیر اس کے کہ تعظیم و تکریم کا استحقاق پیدا کریں آپ کو اپنی قوم یا قبیلے سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اور ان سے اپنی تعظیم و تکریم کے خواہاں ہوتے ہیں اور ان خوبیوں کو فراموش کر دیتے ہیں جن کے سبب سے ان کے خاندان کی تعظیم و تکریم ہوتی تھی۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

"چوتھی پشت کی قید باعتبار اکثر کے لگائی گئی ہے۔ ورنہ بعض گھرانے اس سے بھی پہلے بگڑ جاتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پانچویں یا چھٹی پشت تک خاندان بنا رہتا ہے۔"

جس زمانے میں قاضی ابن خلدون نے یہ رائے قائم کی تھی۔ اس وقت گو مسلمانوں کی طاقتیں متفرق اور پراگندہ ہو گئی تھیں مگر پھر بھی ان میں بہت کچھ جان باقی تھی جو خاندان ابھرتا تھا اس کی ہوا چند پشتوں تک بندھی رہتی تھی۔ اگر کوئی خاندان دینی عظمت کی وجہ سے ممتاز ہوتا تھا تو اس کا احترام لوگوں کی خوش اعتقادی کے سبب کئی کئی پشتوں تک باقی رہتا تھا جو خاندان دنیوی اعتبار سے وجاہت پیدا کرتا تھا خود سلطنت اس کی پشت پناہ ہوتی تھی اور اس کی مراعات اور بزرگ داشت متعدد نسلوں تک جاری رہتی تھی۔ بایں ہمہ دو تین پشت سے زیادہ کوئی خاندان موقر و محترم نہیں رہ سکتا تھا۔

جب اس زمانہ کا یہ حال تھا تو اس زمانے میں ہم مسلمان خاندان کی نسبت خاص کر ہندوستان میں کیا خیال کر سکتے ہیں۔ اول تو آج کل ہماری قوم میں کسی خاندان کا ابھرنا ایسا ہی خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے جیسے سورج کی روشنی میں چھوٹے چھوٹے ستاروں کا نظر آنا لیکن اگر بر سبیل ندرت کسی خاندان کا کوئی ممبر کچھ امتیاز حاصل کر بھی لے تو وہ امتیاز اسی کی ذات تک محدود رہتا ہے دینی عظمت کی وجہ سے تو فی زمانا کسی شخص کا مرجع خلائق بننا نہایت ہی مشکل ہے۔ کیونکہ خوش اعتقادی روز بروز رخصت ہوتی جاتی ہے۔ اور اگر کوئی ایسی مثال پائی بھی جائے تو باپ کی مرجعیت بیٹے تک جب ہی منتقل ہو سکتی ہے جب کہ بیٹا فضل و کمال میں اگر باپ سے برتر و افضل تر ہو تو اس کی برابر ضرور ہو۔ دنیوی امتیاز کا اس زمانے میں یہ حال ہے کہ ہر شخص کی عزت و اعتبار کا اسی کی ذات پر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جس گورنمنٹ کے ہم ماتحت ہیں وہ کسی اعلیٰ خاندان کو ادنیٰ خاندان پر بغیر ذاتی استحقاق کے ترجیح نہیں دیتی۔ خود انگلستان میں ایک لارڈ کا بیٹا مقابلہ کے امتحان میں ایک موچی کے لڑکے کے برابر بٹھایا جاتا ہے اور سوائے اس کے کہ امتحان میں اس سے سبقت لے جائے کسی طرح اس پر ترجیح حاصل نہیں کر سکتا۔ جب انگلستان میں یہ حال ہے تو ایسی حالت میں ہندوستان

کی نسبت کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

پس آج کل کسی خاندان کا امتیاز بجز دین اس کے قائم نہیں رہ سکتا کہ ہر نسل اپنے سے پچھلی نسل کی تعلیم و تربیت میں جہاں تک ممکن ہو کوشش کرے اور اپنے بعد اس کو ایسی حالت میں چھوڑ جائے کہ زمانہ اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھے اور اس کی قدر کرے۔ نہ اس لیے کہ وہ بڑے باپ کی اولاد ہے بلکہ اس لئے کہ وہ خود بڑائی کی مستحق ہے انسانی خوبیوں کو ہمارے مقتداؤں نے ہمیشہ معتبر و ناچیز سمجھا ہے اور انسان کا کمال محض اس کی کسبی اور ذاتی خوبیوں پر منحصر رکھا ہے۔ چنانچہ امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ رض فرماتے ہیں ؂

اِنَّ الْفَتٰی مَنْ یَّقُوْلُ هَا اَنَا ذَا
لَیْسَ الْفَتٰی مَنْ یَّقُوْلُ کَانَ اَبِیْ

یعنی [ مرد وہ ہے جو کہے کہ میں ایسا ہوں نہ وہ جو یہ کہے کہ میرا باپ ایسا تھا ]

اکثر لوگ اس خیال سے کہ ہمارے بعد ہماری اولاد عزت آبرو سے دنیا میں زندگی بسر کرے، اس کے واسطے جائداد چھوڑ خرید کر جاتے ہیں مگر ان کی تعلیم و تربیت کا کچھ خیال نہیں کرتے گویا وہ چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد صرف نالائق ہی نہ رہے بلکہ بدچلنی میں بھی شہرہ آفاق ہو۔ جہل اور جوانی اور دولت کے ساتھ ہے نکری جہاں یہ تینوں چیزیں جمع ہو گئیں پھر خاندان کا اللہ ہی مالک ہے۔

> " زندگی میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے اخلاقیات کا وجود نہایت ضروری ہے اور اخلاقیات میں وزن اور پائیداری پیدا کرنے کے لیے تصور خدا اور حیات بعد الممات نہایت ضروری ہے۔ بلکہ ناگزیر ہے اس لیے کہ بغیر ان تصورات کے ہم اپنے اخلاقی قوانین کا نفاذ مستحکم طریقے پر نہیں کر سکتے "
>
> کانٹ

# وعدہ خلافی یا غفلت کا خمیازہ

سید حامد ○

ہندوستان کے دستور نے اقلیتوں کے ساتھ بہت سے وعدے کیے۔ حکومت کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں آتی رہی انھوں نے ان وعدوں کو نباہا نہیں۔ اس وعدہ خلافی کا نقصان مسلمانوں کو پہنچا جو سب سے زیادہ پسماندہ اقلیت ہیں۔ سرکار بے دھڑک وعدہ خلافی کرتی رہی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ مسلمان اپنی کھال میں مست ہیں اور ان کے رہنماؤں کو خودغرضی اور ذاتی طالع آزمائی سے فرصت کہاں کہ وہ ان باتوں کی جانب دھیان دیں جن سے ملت کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں اور اس کا مستقبل بنتا ہے۔ گویا حکومت کی پیماں شکنی کو ہماری غفلت برابر شہ دیتی رہی۔ اس سے یہ بات الم نشرح ہوتی ہے کہ دستور سازوں کی وسیع القلبی اور بالغ نظری سے ان کے بعد آنے والے ہمارے اہل اختیار محروم رہے اور یہ محرومی دن بہ دن بڑھتی چلی گئی اور نئی زمانہ تو ارباب اقتدار کی بے بصری اور جاہ طلبی اپنے عروج کو پہنچ گئی ہے اور ہمارے سامنے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ہم میں سے کوئی ان کا شمار رکھنے والا بھی نہیں۔

اللہ بدگمانی سے بچائے، مگر لگتا کچھ ایسا ہے کہ ہمارے اہل وطن ہماری جہالت پر مطمئن نہیں۔ اول تو وہ ہمیں بتلاتے ہی نہیں کہ ہماری شرح خواندگی آزادی کے وقت کیا تھی اور اب کیا ہے۔ مردم شماری کے دوران فرقہ وار شرح خواندگی اکٹھا کی جاتی ہے لیکن آزادی کے بعد اسے مقفل کرکے رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مسلمانوں کو اپنی تعلیمی پسماندگی کا پتہ چلتا تو انھیں تکلیف ہوتی اور سرکار کب چاہتی ہے کہ انھیں تکلیف ہو یا وہ آگے بڑھنے کے زہرہ گداز جتن کریں۔ بیچاروں کو چین سے رہنے دیا جائے یہی ان پر سب سے بڑا احسان ہے۔ ہم اس نتیجہ پر اعداد و شمار کی پردہ پوشی کی بنا پر ہی نہیں پہنچے ہیں۔ ہماری تعلیم کی راہ میں روڑے جو اٹکائے گئے ہیں وہ بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مرے پہ سو دُرّے۔ ہم اپنی تعلیم سے غافل؛ حکومت ہماری تعلیم میں حایل۔ اس سے بہتر شرکت کار کی مثال کہاں مل سکتی ہے؟ دیکھیے تو آغاز داستان میں کیا کیا پیماں کیے گئے تھے:

آئین کے آرٹیکل ۲۹ (۱) میں وعدہ کیا گیا ہے کہ شہریوں کے ہر طبقے کو جو ہندوستان یا اس کے

---

○ سابق وائس چانسلر، اے ایم یو علی گڑھ ——— ہمدرد نگر، نئی دہلی

کسی حصے میں رہتا ہے اور جس کی اپنی علیحدہ زبان رسم خط یا ثقافت ہے یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اُن کو محفوظ رکھے۔

آرٹیکل ۳۰ (۱) میں وعدہ کیا گیا ہے کہ:

تمام اقلیتوں کو چاہے وہ مذہب پر مبنی ہوں چاہے زبان پر، یہ حق حاصل ہوگا کہ اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قایم کریں اور انھیں چلائیں۔

آرٹیکل ۳۰ (۲) کا تقاضا ہے کہ

تعلیمی اداروں کو امداد دیتے وقت ریاست کسی تعلیمی ادارے کے خلاف اس بنا پر امتیاز نہیں کرے گی کہ وہ کسی مذہبی یا لسانی اقلیت کے زیر انتظام ہیں۔

آرٹیکل ۳۵۰ (الف) کے تحت ریاست میں ہر مقامی انتظامیہ (لوکل باڈی) یہ کوشش کرے گی کہ:

اقلیتوں کے بچوں کو تعلیم کی ابتدائی منزل میں مادری زبان میں تعلیم کی مکمل سہولتیں فراہم کی جائیں اور ان سہولتوں کو فراہم کرانے کے لیے صدر جمہوریہ کسی ریاست کو وہ ہدایت جنھیں وہ ضروری سمجھتا ہو جاری کرسکتا ہے۔

قارئین غور کریں کہ آرٹیکل ۲۹ (۱) کے باوجود مسلمانوں کو اردو، اس کے رسم خط اور ثقافت کو محفوظ رکھنے میں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ (آرٹیکل ۲۹ (۱) ۔

مسلمانوں اور اردو والوں سے پوچھیے خصوصاً شمالی ہندوستان میں کہ اپنی پسند کے تعلیمی اداروں کو چلانے کے لیے اور اُن کے وجود کو ریاستی سرکار یا نظامت تعلیم سے تسلیم کروانے میں انھیں کیا کیا ہفت خوان طے کرنے پڑتے ہیں۔ انھیں برسوں سرکار کے دروازے پر دستک دینی پڑتی ہے۔ اُن میں سے بہت سے تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مرکزی سرکار اور مرکزی اقلیتی کمیشن اس ضمن میں ریاستی حکومتوں کو رہنما خطوط جاری کرتا رہتا ہے لیکن ریاستی حکومتیں اور ان کے کارپرداز اُن ہدایتوں کو برملا حقارت کے ساتھ ایک طرف کر دیتے ہیں۔

آرٹیکل ۳۵۰ (الف) کو بھی دستور کی زینت بنا کر رکھا گیا ہے۔ بہار کو چھوڑ کر ہندی ریاستوں میں اردو مادری زبان والے بچوں کی اردو میں ابتدائی تعلیم کا سرو سامان ہے ہی نہیں۔ یو۔پی میں حالت سب سے زیادہ ابتر ہے۔ مسلمانوں نے شروع میں ہی ہتھیار ڈال دیے۔ سرکار نے بہ لطائف الحیل اردو کو پردیش نکالا دے دیا اور اردو والے پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے۔ صدر جمہوریہ دستور کی خلاف ورزی کو دیکھتے رہے۔ انھیں بھی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اتر پردیش کی حکومت کو ضروری ہدایتیں دیتے۔ مسلمانوں نے تباہی کا جو سفر طے کیا ہے اس میں ہر موڑ پر سرکار اور اُن کے درمیان حسن تعاون کی دلفریب مثالیں ملتی ہیں۔ تعاون کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دونوں ذمہ داری سے بچ جاتے ہیں اور کوئی کسی کو الزام نہیں دے سکتا اور اگر الزام دے بھی دیے گئے تو دو طرفہ! عرض معاوضہ گلہ ندارد۔ ایک (سرکار) نے توجہ نہیں کی۔ دوسرے (مسلمانوں) نے کوشش نہیں کی، دونوں برابر۔ سرکار کہہ دیتی ہے مسلمان مقابلہ نہیں کرتے۔ مسلمان کہتے ہیں ہم مقابلہ کیوں کریں، جب نتیجہ ظاہر ہے۔ نابرابروں میں مقابلہ کیسا؟

حکومت کے پاس ایک حربہ اور بھی ہے۔ اعلان کرو، فیصلے کرو، وعدے کرو! لیکن کیا تم نے انھیں عمل میں لانے کا بھی ٹھیکہ لیا ہے؟ جس سے وعدے کیے جس کے حق میں اعلان کیے، اس کا جی خوش ہو گیا یہی کیا کم ہے؟ دستور ہند نے اردو اقلیتوں کے ساتھ مسلمانوں

جو وعدے کیے تھے، سرکار نے انھیں کس طرح پورا
کیا یہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں لیکن وہ تو دستور سازوں کے
وعدے تھے، سرکار انھیں ایفا نہ کر پائی تو اسے دوش
نہیں دیا۔ ہم تو ان وعدوں کی کھوج میں نکلیں گے جو
خود حکومت نے کیے تھے:

سنہ ۱۹۸۶ء میں ملک نے نئی تعلیمی پالیسی بنائی
جس پر سنسد نے منظوری کی مہر لگائی "نئی تعلیمی پالیسی
کے عملی پروگرام" میں اقلیتوں کی تعلیم پر پورا ایک باب
ہے، جس میں پسماندہ اقلیتوں یعنی مسلمانوں اور نوبدھوں
(بدھ مت کے جدید ماننے والوں، ڈاکٹر امبیڈکر کے
ہاتھوں بدھ مت قبول کرنے والوں) کے تعلیمی پچھڑے پن
کو دور کرنے کے لیے اہم اقدامات قلم بند کیے گئے۔ ابھی
عملی پروگرام بنایا نہیں گیا تھا کہ ۱۹۸۶ء کی قومی تعلیمی
پالیسی میں صاف صاف لکھ دیا گیا کہ پس ماندہ
اقلیتی جماعتوں "کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دی جائے
گی کہ مساوات اور سماجی انصاف کا یہی تقاضا ہے۔"
اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو ذرائع اختیار کیے
جائیں گے، ان کی تفصیل عملی پروگرام ان میں خاص خاص
یہ ہیں:

۱۔ روایتی اسکولوں (یعنی مدارس) میں
رضاکارانہ ڈھنگ سے سائنس، ریاضی،
اور انگریزی پڑھانے کے لیے اقدامات
کیے جائیں گے۔ جہاں کہیں ممکن ہوا، ان
مدارس میں ابتدائے طفولیت کے تعلیمی
مراکز (Early Childhood Education Centres)
کھولے جائیں گے۔ خصوصاً
ان علاقوں میں جہاں تعلیمی اعتبار سے
پسماندہ اقلیتوں کی گھنی آبادی ہے۔ ان
اداروں میں سماجی اعتبار سے کارآمد
(Socially Useful Productive Work) کام
سکھایا جائے گا۔ شعبۂ
تعلیم اس مقصد کے حصول کے لیے مرکزی
امداد کی ایک اسکیم وضع کرے گا۔

ابتدائی تعلیم:

۲۔ ابتدائی تعلیم کا جہاں تک تعلق ہے اس
کی ان شماریاتی اطلاعات کی فراہمی کے
لیے ایک نظم قائم کیا جائے گا جس کی
ضرورت لسانی اقلیتوں کے کمشنر کو ہوتی
ہے۔ ریاستی حکومتیں اس کو عمل میں
لائیں گی۔

۳۔ لسانی اقلیتوں کے لیے ٹیچروں کی اسامیوں
کی منظوری میں جو تاخیر ہوتی ہے اس کو
دور کرنے کے لیے ضروری اختیارات ضلع
کلکٹر کو دے دیے جائیں گے۔ ریاستی
حکومتیں اس پر عمل کریں گی۔

۴۔ اقلیتی زبانوں میں نصابی کتابوں
کی دستیابی کا سروے کیا جائے گا اور
ان زبانوں میں طباعتی سہولتوں کی فراہمی
کا بندوبست ہوگا۔ اس کی عمل آوری
ریاستی حکومت کے ذمّہ رہے گی۔

۵۔ اقلیتی زبانوں کے لیے اساتذہ کی
تربیت کی سہولتوں کا جائزہ اور جہاں
جہاں ضروری ہو، ان میں اضافہ۔ بازعمل
ریاستی حکومتوں پر۔

۶۔ نصاب کی مدت کا ڈالا فی صد مقامی
صنعتوں اور دھندوں کی تربیت میں
صرف کیا جائے گا اور اہل حرفہ اور کھیتی
مزدوروں کے بچوں کو شام میں کلاس

کھول کر ٹریننگ دینے کی کوشش کی جائے گی۔

### مڈل اور اعلا ثانوی تعلیم

۔ اقلیتی اسکولوں کے ٹیچروں کو ایس سی ای آر ٹی اور دوسرے مراکز اور رہنمائی اداروں کے ذریعہ دوران ملازمت سائنس، ریاضی، سماجی سائنس، انگریزی اور رہنمائی روزگار کی ٹریننگ دی جائے گی۔

۔ ایس سی ای آر ٹی (اسٹیٹ کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ یعنی تعلیمی تحقیق اور تربیت کی ریاستی کونسل) اقلیتوں کے اداروں کے پرنسپلوں اور منتظموں کو جدید اسالیب تدریس کی تربیت دے۔

۹۔ اقلیتی اداروں میں اصلاحی (ریمیڈیل) کوچنگ کی اسکیم۔ بار عمل ریاستی حکومت پر۔

### ووکیشنل اور ٹیکنیکل تعلیم وتربیت

۱۔ ان ہائر سکنڈری (اعلیٰ ثانوی) اسکولوں میں جو پسماندہ اقلیتوں کو تعلیم دیتے ہیں، ووکیشنل کورس کھولے جائیں گے۔

۱۔ ٹیکنکل اور ووکیشنل ٹریننگ کے پروگراموں کا پورا فائدہ اقلیتی اداروں کو پہنچایا جائے گا۔

۱ ان بلاکوں میں جہاں اقلیتوں کی گھنی آبادی ہے کرافٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کھولے جائیں گے جن میں ۸۰ فی صد نشستیں اہل حضرات کے لیے محفوظ (ریزرو)

کی جائیں گی۔

### تعلیم نسواں

۱۳ لڑکیوں کے اسکول کھولتے وقت استانیوں کے تقرر کے سمے، لڑکیوں کے ہوسٹل کھولتے وقت اور تعلیم نسواں کو شہ دینے کے لیے یونیفارم اور دن کا کھانا دینے کی اسکیموں کو روبہ عمل لاتے ہوئے، اقلیتوں کی ضروریات تمام وکمال پوری کی جائیں گی۔

۱۴۔ ان تمام اضلاع میں جہاں اقلیتوں کی گھنی آبادی ہے لڑکیوں کے لیے پروڈکشن مع ٹریننگ مراکز کھولے جائیں گے جہاں تربیت کا کام بالعموم خواتین کو دیا جائے گا۔

### تعلیم بالغاں اور ابتدائے طفولیت کی تعلیم

۱۵۔ تعلیم بالغان اور تعلیم ابتدائے طفولیت میں رضا کارانہ کوششوں کو بیدار کرنے کے لیے پیشہ وروں یا ماہرین کی تربیت

۱۶۔ گھنی اقلیتی آبادیوں میں لائبریریوں، ریڈنگ روموں کے قیام کی ہمت افزائی۔

### ۱۷۔ اقلیتی تعلیمی ادارے

۱۷۔ اقلیتی تعلیمی اداروں کو بلا تاخیر تسلیم کرنے کے لیے واضح ہدایات اور پالیسی۔

۱۸۔ پروگراموں کی بجا آوری پر نگاہ رکھنے کے لیے موثر انتظامات۔

۱۹۔ ہر ریاست میں اقلیتی اداروں کے ایک فیڈریشن کا قیام جس کے ذریعے تعلیم کی ترقی کے اقدامات میں اقلیتی اداروں کا تعاون حاصل کیا جا سکے اور ان اداروں میں ضروری اور نیونتم انفراسٹرکچر مہیا

ہو، تعلیمی معیار اونچا رکھا جائے اور اساتذہ کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ ان تیدرس پیشہ اداروں کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے گا اور انھیں امداد دی جائے گی۔

**وظائف وغیرہ کی اسکیم**

۲۰۔ کمزور طبقات کو صلاحیت اور ضرورت کی بنیاد پر وظائف دیے جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ انھیں اچھے تعلیمی اداروں میں داخلہ دلایا جائے۔ فیس کی معافی، فیس میں رعایت اور اہل حرفہ وغیرہ کو (تعلیم کے لیے روزگار یا پیشہ سے ہٹانے کی) مالی تلافی۔

**تنظیمی اور انتظامی مسائل**

۲۱۔ وقفوں کے ساتھ تحقیقی مطالعات جن کا مقصد یہ ہوگا کہ جو اصلاحی اقدامات (اقلیتوں کی تعلیم کی بابت) کیے گیے ہیں ان کو بہتر اور موثر بنایا جائے، خصوصاً اقلیتوں کی گھنی آبادی کے علاقوں میں اسکولوں کی موجودگی کے تعلق سے۔

۲۲۔ بورڈ آف ایجوکیشن اور صلاح کار کمیٹیوں میں تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کی نمائندگی۔

۲۳۔ مذکورہ بالا اقدامات موثر طور پر عمل میں لائے جاتے ہیں، یہ دیکھنے کے لیے مرکز اور ریاست کے تعلیمی شعبوں میں ایک ایک سیل یا چھوٹا شعبہ کھولا جائے گا۔

یہ سب کے سب اقدامات ایسے تھے جنھیں ملک نے منظور کیا، ریاستی حکومتوں کے متعلقہ وزراء نے تسلیم کیا اور جن پر پارلیمنٹ نے اپنی منظوری کی مہر لگائی لیکن ہوا کیا؟ نہ ریاستوں نے ان پر عمل کیا، نہ مرکز نے پروا کی۔ احتساب یا مانیٹر کرنے کی کسی کو فکر ہی نہیں ہوئی قوم اپنی جگہ مطمئن، مسلمان اپنی جگہ شادمان کہ وطن عزیز ہماری پسماندگی سے پریشان ہے اور اس نے ٹھانی ہے کہ ہمیں ذلت سے نکال کر دم لے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ہمارے اس بیان کو مبالغہ سمجھیں۔ ہم قارئین کا دھیان اس طرف دلانا چاہتے ہیں کہ جولائی ۱۹۹۰ء میں مرکزی سرکار نے ایک گروپ اقلیتوں کی تعلیم کے بارے میں بنایا۔ مقصد یہ تھا کہ نئی تعلیمی پالیسی پر چار سال بیت چکے، دیکھیں تو اس اثنا میں اقلیتوں پر کیا بیتی۔ گروپ کے صدر شروع میں آر کے سید صاحب (جو فی زمانہ لسانی اقلیتوں کے کمشنر ہیں) تھے اراکین میں پروفیسر رئیس احمد، قرۃ العین حیدر صاحبہ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، سید حامد، ڈاکٹر خلیق انجم جی، این مصرا صاحب، شری ماتا پرشاد، پروفیسر مطلب اور شری کھلر شامل تھے۔ گروپ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اقلیتوں کی تعلیم سے متعلق جملہ تجاویز و سفارشات پر غور کرے اور سرکار کو مشورہ دے کہ مستقبل قریب میں اس ضمن میں اسے کیا کیا اقدامات کرنے چاہیں گروپ نے اپنی آخری رپورٹ جنوری ۱۹۹۱ء میں وزیر تعلیم کو پیش کر دی۔

گروپ نے نمونے کے طور پر چند ریاستوں (بہار اور یوپی) اور دہلی کی یونین ٹیری ٹری کی تعلیمی پالیسی کا جائزہ لیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ "عملی پروگرام" کی بیشتر سفارشات صفحات کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ بہت سے متعلقہ افسران سفارشات سے ناواقف تھے۔ وہ اقدامات جو "عملی پروگرام" میں قلم بند

ہوے۔ بیشتر عمل کو ترستے رہے۔ یہ عذر اکثر کیا گیا کہ مرکزی حکومت اگر عمل آوری کی خواہاں تھی تو ریاستوں کو ضروری مالی امداد کیوں نہیں دی۔ چنانچہ اقلیتی بستیوں کو نہ تعلیمی ادارے دیے گئے، نہ لڑکیوں کے لیے ہوسٹل کھولے گئے، نہ اُن کے لیے یونیفارم اور دوپہر کے کھانے کا انتظام ہوا، نہ کرافٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کھلے، نہ کمیونیٹی پالی ٹیکنکوں نے مجوزہ سمت میں کوئی قدم بڑھایا۔ نہ آئی۔ ٹی۔ آئی یا سی۔ ٹی۔ آئی میں اہل حرفہ کے بچوں کے داخلے کا کوئی انتظام ہو سکا (داخلے پہلے کی طرح ہائی اسکول کے نمبروں کے حساب سے ہوتے رہے) نہ اقلیتی تعلیمی اداروں کو منظوری ملنے میں کوئی سہولت ہو پائی، نہ اُن کے فیڈریشن کو حکومت سے منظوری یا مدد ملی، نہ اُتر پردیش میں اردو کو بحال کرنے کے لیے کوئی قدم اُٹھایا گیا۔ سوائے اس اعلان کے کہ اسے بھی بعض مقاصد کے لیے ایک سرکاری زبان کی حیثیت دی جائے گی۔ سہ لسانی فارمولے سے اردو اسی طرح بیرون در رہی۔ بڑی رسوائی کے ساتھ اپنے گھر سے نکالی گئی؛ نہ ہی اقلیتوں کو بورڈ آف ایجوکیشن وغیرہ میں نمائندگی دی گئی۔ نہ نگرانی یا مانیٹرنگ کا کوئی معقول انتظام مرکز یا ریاستوں میں ہو پایا۔ اردو نصابی کتابوں کی دستیابی جوئے شیر لانے کی طرح ضرب المثل بن گئی۔ اردو اساتذہ کی تربیت اسی طرح محروم التفات رہی۔ وظائف کا بھی کوئی اہتمام نہ ہو پایا۔

ستم بالائے ستم جس گروپ کو ہدایت کی گئی تھی کہ ایسی سفارشات کرے جن پر مستقبل قریب میں عمل کیا جا سکے۔ اس کی رپورٹ ڈیڑھ سال ہوا باریاب ہو چکی ہے۔ (عبوری رپورٹ کو دو سال ہونے کو آئے) اس پر کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔

اقلیتوں کی فلاح کے لیے مسز گاندھی نے پندرہ نکاتی پروگرام بنایا تھا۔ انوکھی بات یہ ہے کہ وہ بات جو اقلیتوں کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے یعنی تعلیم اس کا پندرہ نکاتی پروگرام میں سرے سے تذکرہ ہی نہیں۔ گویا جنھیں جہالت راس آ گئی ہو انھیں تعلیم سے جراحت کیوں پہنچائی جائے۔ ٹریننگ کا اہتمام البتہ کیا گیا تھا۔ بارھویں نکتہ میں وعدہ کیا گیا کہ

> "جن علاقوں میں اقلیتوں کے افراد کی کثرت ہے وہاں حکومت یا نجی ایجنسیوں کے ذریعے آئی۔ ٹی۔ آئی (انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ) اور پالی ٹکنیک کھولے جائیں تاکہ اُن اداروں کے داخلوں میں اقلیتوں کی مناسب نمائندگی ہو سکے۔"

بارھویں نکتہ پر عمل کس طرح کیا گیا؟ اول تو اس وضع کے ادارے مسلمانوں کی بستیوں میں یا اُن کے قریب کھولے ہی نہیں گئے اور اگر کھولے بھی گئے تو ان میں مسلمانوں کو داخلہ نہیں ملا۔ کیونکہ داخلہ کی شرطوں میں ترمیم کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے کہ ادارے کے قرب کو صلاحیت میں اضافے کا مترادف سمجھا جا رہا ہے۔ نمبروں کی بنیاد پر داخلے دیے گئے تو مسلمان بچے داخل ہونے سے رہے۔ ہمارے ارباب اختیار کو یہ بات ابھی تک ذہن نشین نہیں ہو سکی کہ اس تیز رفتار زمانے میں ان لوگوں کو جو پیچھے رہ گئے ہیں دھکا دے کر آگے نہ بڑھایا گیا تو وہ اور پچھڑ جائیں گے۔ دھکا دیا جا سکتا ہے اسکولوں کی ہمت افزائی کرکے، داخلوں میں ضروری تحفظات کے ذریعے اور ان مخصوص مسائل کو حل کرکے اور ان رکاوٹوں کو دور کرکے جو مسلمانوں کی تعلیم کی راہ میں حائل ہو گئی ہیں۔

اقلیتی اسکولوں کے ان اساتذہ کی تربیت

کے لیے جو کلیدی مضامین پڑھاتے ہیں این سی ای آر ٹی نے پانچ یونیورسٹیوں کو بطور ریسورس سینٹر کے چنا۔ ان میں سے کشمیر یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی نے یہ "بیگار" اپنے ذمے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ جامعہ ملیہ نے بے دلی کے ساتھ ایک آدھ کورس کرایا۔ علی گڑھ نے البتہ دلچسپی لی لیکن نہ اتنی جس کی توقع تھی اور اب وہ اسکیم کھٹائی میں ڈال دی گئی۔

ہم احتجاج کریں تو کس زبان سے ع

اے بادِ صبا این ہمہ آوردۂ تست

[اے بادِ صبا یہ سب کچھ تیرا ہی لایا ہوا ہے]

پیماں شکنی ضرور ہوئی لیکن اس کے لیے حکومت کے ہاتھ کس نے مضبوط کیے؟ اس پر این سی ای آر ٹی کو آمادہ کس نے کیا؟ یاد رکھیے سرکار کا محبوب مشغلہ سدا پیماں شکنی ہوتا ہے۔ پیماں شکنی کا ہدف وہی بنتا ہے جو سوجھ بوجھ سے بیگانہ، تنظیم سے نا آشنا، اتحاد سے بے بہرہ، اجتماعی بصیرت ملی غیرت، عمل کی قوت سے نابلد ہو۔ یہ کسی جماعت یا طبقہ کی غفلت کا خمیازہ ہوتا ہے جو مدام حکومت کی وعدہ خلافی اور ارباب اختیار کی پیماں شکنی کی شکل اختیار کرتا ہے۔ جس سے پیمان کیا جاتا ہے وہ اگر ہوش و گوش رکھتا ہو، اس میں اگر دم ہو، اسے اپنے نفع نقصان کا شعور ہو، احساسِ تناسب اسے فروعات میں الجھنے سے بچاتا ہو تو پھر کسی حکومت کی مجال نہیں کہ اس سے کیے ہوئے وعدے پورے نہ کرے۔

اس سے بڑی بھول کیا ہو گی کہ ہم چاروں طرف تعلیم کا ظہور دیکھ رہے ہیں اور خود تعلیم حاصل نہیں کرتے۔ ٹکنولوجی جس سے ہم بے غیرتی کے ساتھ فائدہ اُٹھا رہے ہیں علم ہی کی دین ہے۔ جس کے ذہن میں علم ہے اُس کے پاس طاقت ہے، ثروت ہے، دولت ہے، اختیار ہے اور ہم ہیں کہ علم سے منہ موڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ گویا جہالت کو ہم نے اپنی معذوریت کی ڈھال بنا لیا ہے۔ تنظیم، اتحاد اور شعور کسی جماعت کے پاس نہ ہو تو حکومت اس سے صرف وعدے کرتی ہے اور کچھ نہیں کرتی۔ لیکن اس سے بڑی نادانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اپنی جہالت کو دور کرنے کے لیے اور مشکلات کو حل کرنے کے لیے حکومت پر تکیہ کریں اور اس زریں اصول سے جو جلی حروف میں آفاق پر لکھا ہوا ہے یعنی جو اپنی مدد آپ نہیں کرتا خدا بھی اس کی مدد نہیں کرتا، عملاً گریز کرتے رہیں۔ یاد رکھیے حکومت، اس کا رنگ خواہ کچھ بھی ہو، کبھی خود سے ہماری مدد نہیں کرے گی۔ ہم خود اُٹھیں گے تو وہ بھی ہماری مدد کے لیے آئے گی، ہماری مدد پر خود کو مجبور پائے گی۔

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس طریقے کے تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۱۱، شمارہ ۸ (اگست ۱۹۹۲ء)

# علامہ شبلی کے تعلیمی افکار

نظام الدین ایس گوریکر ○

سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ - ۱۸۹۸ء) جیسے دانائے قوم نے مولوی چراغ علی جیسے ہم مزاج ارباب دانش کی معیت میں مغربیت سے متاثر ہو کر انگریزی تعلیم اور مغربی نصابات پر زور دیا اور انگریزوں کی سرپرستی میں ۱۸۷۷ء میں محمڈن اورینٹل کالج جس نے ترقی کے مراحل طے کر کے ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کی شکل اختیار کی اور دوسری طرف علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء) جیسے عالم دین نے مولانا محمد علی مونگیری جیسے ہم خیال اصحاب علم کی رفاقت میں مشرقی اقدار کے پیش نظر مذہبی احساس اور قومی اتحاد کو برقرار رکھنے پر زور دیتے ہوئے مشرقی علوم کے ساتھ انگریزی تعلیم کو بمقتضائے وقت نصابات میں شامل کرنے کی سعیٔ مشکور کی اور آخر ش ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کی نیو ڈالی جو بتدریج ترقی کر کے ۱۸۹۶ء میں دارالعلوم ندوہ کے نام سے ظہور پذیر ہوا۔ علاوہ ازیں جہاں سرسید نے غازی پور میں ۱۸۶۳ء میں سائنٹیفک سوسائٹی قایم کر کے انگریزی کی مستند اور مفید کتابوں کا اردو میں ترجمہ کروایا وہاں علامہ شبلی نے اعظم گڑھ میں ۱۹۱۰ء میں دارالمصنفین کی بنیاد رکھی اور مشرقی علوم کے سرمایے کو اردو میں منتقل کر کے قوم و ملک کی زبردست خدمت انجام دی ہے جو ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے۔

علامہ شبلی بیک وقت ایک ادیب ایک شاعر، ایک مورخ، ایک ناقد، ایک سوانح نگار، ایک محقق، ایک مفکر، ایک مصلح ہی نہیں بلکہ ایک ماہر تعلیم بھی تھے۔ در اصل وہ ایک ہمہ جہت انقلابی تھے اور ان کی رنگا رنگی اور بوقلمونی ان کی شخصیت کی غماز اور ان کی عظمت کی امین ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی شخصیت میں جو حقیقت ہے وہ فسوں بھی ہے، جو خواب ہے وہ تعبیر بھی، جو افسانہ ہے وہ زندگی بھی اور جو غبار ہے وہ آئینہ بھی۔ حقیقت میں ان کا شمار ان علمائے اسلام میں نہ تھا جن کا مشغلہ خانقاہوں میں رشد و ہدایت یا مکتبوں میں درس و تدریس رہا ہو بلکہ وہ عہد قدیم اور عصر جدید کا ایک سنگم تھے جہاں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر باہم ملتے ہیں۔ ایک طرف وہ قدیم طرز کے علماء دین کی صحبت سے فیض یاب ہوئے تو دوسری جانب

---

○ معاون ڈائرکٹر، ہیراس انسٹی ٹیوٹ آف انڈین ہسٹری اینڈ کلچر، سینٹ زیویرس کالج بمبئی ۱

عصرِ جدید کے اربابِ دانش کی رفاقت سے بہرہ اندوز
ہوئے اور اسی لیے ان کے زندگی کی سرگزشت علمائے
ماضی سے نسبتاً مختلف ہونے کے باوجود تمام علوم کا سرچشمہ
ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علامہ شبلی
کی ذات سرسید کی طرح مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کے سلسلہ
میں بہت بلند ہے۔ انھوں نے اپنی تقاریر اور اپنے
مضامین میں اصلاحِ تعلیم پر اظہارِ خیال کیا ہے بلکہ اسلامی
مکاتیب کے نصابِ تعلیم کے نقائص و معائب سے قوم کو
آگاہ کیا اور تعلیمی امراض کے درماں کے طور پر علمائے
اسلام میں زندگی اور مکاتیبِ عربی میں اصلاح کی ہے
وہ اُن کی مساعیٔ مسلسل کا نتیجہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سرسید کا
طریقۂ کار نسبتاً آسان تھا، کیوں کہ اُن کی دعوت وقت کی
پکار تھی اور حکومت وقت بھی اُن کی معاون تھی لیکن علامہ شبلی
کی تعلیمی تحریک کے لیے حالات ناسازگار اور حکومت بدظن
ہی نہیں بلکہ خوف زدہ تھی اور ساتھ ہی برادرانِ وطن مخالف
اور سماجی کارکنوں کا فقدان تھا ع

ہوا مخالف و شبِ تار و بحر طوفاں خیز

علامہ شبلی نے اپنے علی گڑھ کے دورانِ قیام میں
جب انگریزی خواں طبقے کو مذہب سے بے بہرہ اور وسعتِ نظر
اور بلند ہمتی میں تہی مایہ پایا، تو انھوں نے علماء کی طرف توجہ مبذول
کی مگر یہ طبقہ بھی قدامت پرستی کی وجہ سے بددلی و افسردگی اور
پستی و خواری کا شکار تھا لیکن ان کا یہ ایمان واثق تھا کہ علماء
ہی قوم کو قعرِ مذلت سے نکال کر بامِ ترقی پر لے جا سکتے
ہیں اور ماضی میں بھی مذہب کے سہارے قوم نے ترقی
کے مراحل طے کیے ہیں اور آئندہ بھی مذہب کے ذریعے ترقی
کے راستے پر گامزن ہو سکتے ہیں اور مذہب میں یہ صلاحیت
پیدا کرنا علماء ہی کا اولین فرض ہے۔ پس انھوں نے علماء
کی اصلاح کی غرض سے اول ندوۃ العلماء کے نام سے ایک
انجمن کا قیام عمل میں لائے اور بعد میں علماء کی باہمی چشمک
اور فکری جمود کو دیکھ کر دار العلوم ندوہ کی تاسیس کی تاکہ اس
کے ذریعے ایسے افاضل اور قابل علماء تیار ہو جائیں جو بدلتے
ہوئے حالات میں قوم و ملک کے لیے مفید ہی ثابت
نہ ہوں بلکہ عیسائی مشنریوں اور آریہ سماج کے کارکنوں
کی طرح فارغ التحصیل علماء مولویوں کے روپ میں ملک کے
طول و عرض کا دورہ کر کے اسلام کی انسان دوستی
اور وطن پرستی کا پیام عام کر کے غیروں کے اعتراضات
کے معقول جوابات دے کر مذہبی غلط فہمیوں کا ازالہ
کر سکیں۔

ہندوستان کی سرزمین سے جہاں صغانی
اور علی متقی جیسے فقہا، بحر العلوم اور شاہ ولی اللہ جیسے متکلمین
ملا نظام الدین اور ملا محب اللہ جیسے مفکرین، خسرو اور
فیضی جیسے شعرا اور ابو الفضل اور آزاد بلگرامی جیسے مورخین
پیدا ہوئے وہاں سن ستاون کے ہنگامہ خیز حالات میں
علامہ شبلی جیسے وحید العصر اور یگانۂ روزگار ہمہ جہت
علمی و ادبی شخصیت نے جنم لیا جو بیک وقت شاہ ولی اللہ
ملا محمود، ابو الفضل اور آزاد بلگرامی جیسے مفکرین کا مجموعہ
تھے۔ دنیائے اسلام اس وقت ایک عجیب انقلاب کے
خطرناک دور سے گزر رہا تھا۔ قدیم و جدید نظاماتِ علم و
عمل باہم متصادم تھے اور جس طرح دوسری صدی ہجری کی معنویات
یونان و ایران کے تصادم کے نتیجہ میں برآمد ہوئیں۔ اسی
طرح انیسویں صدی عیسوی میں یورپی انکشافات اور مغربی
علوم کے تصادم سے ظہور پذیر ہوئی۔ جدید فلسفہ و ثقافت
کا حملہ متواتر دنیائے اسلام کے اکناف و اطراف میں
محسوس کیا جا رہا تھا۔ لاجرم صدائے حق کے طور پر ہر
گوشہ سے علمائے اسلام لبیک کہہ کر دوڑے، ہر جگہ
مصلحین آمادہ پیکار ہوئے اور ہندوستان میں بھی صدائے
اصلاح میں سرعت و تیزی اور بلند آہنگی کے ساتھ نمودار

ہوئی۔ غالباً دوسرے بلادِ اسلامیہ ہندوستان کی اس تحریک تجدید کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور اس دورِ اصلاح کا سہرا ہندوستان میں علامہ شبلی کے سر تھا۔ اگرچہ اس کارواں کے دیگر ارکان میں سر سید احمد خاں، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، مولانا عنایت رسول، ڈپٹی نذیر احمد، خواجہ الطاف حسین حالی جیسے دانشورانِ قوم و رہنمایانِ ملت بھی تھے۔

علامہ شبلی نے جب انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلامیت سے دور اور تہی مایہ پایا تو مایوس ہوئے اور علمائے کرام کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اگرچہ قدامت پرست اربابِ علم و دانش نے سخت مخالفت کی تاہم وہ اپنی ڈگر سے نہیں ہٹے اور اسلامیت کی صحیح روح پھونکنے کی خاطر انھوں نے تمام مسلمانوں کے طبقوں کو ایک مرکز پر لانے کے لیے لا الٰہ الا اللہ یعنی کلمۂ توحید قرار دیا اور قومیت کی بنیاد بھی اسی کو کہا کیونکہ "ان کے نزدیک نہ سیادت و مشیخت اور نہ عربیت و عجمیت اس کی اساس ہے بلکہ اسلام اور صرف اسلام ہے" اور ساتھ ہی اسلام اور علم کو ایک سکّے کے دو رُخ قرار دیے اور مزید کہتے ہیں کہ "علم اسلام کا مایۂ خمیر ہے" لہٰذا مرورِ زمانہ کے ساتھ طریقۂ تعلیم، نصابِ تعلیم اور علومِ درسیہ میں تبدیلی لانا ضروری و لازمی سمجھا کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ بنو امیہ کے عہد میں کتابی درس کا رواج نہیں تھا بلکہ زبانی درس ہی نظامِ تعلیم کی بنیاد تھی لیکن بنو عباسیہ میں زبانی کے ساتھ کتابی درس شامل نصاب کیا گیا۔ ابتدا میں علوم عقلیہ کو نصاب میں جگہ نہیں تھی لیکن زمانے کے ساتھ نظامِ تعلیم کا ضروری حصہ بن گئے۔ حکیم فارابی کے وقت تک یعقوب کندی کی تالیفات درس معقولات میں داخل تھیں اور بعد میں حکیم فارابی کی تصنیفات کو شامل درس کیا گیا اور بتدریج بوعلی سینا کی کتب مقبول ہوئیں۔ بعینہٖ زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہر دور میں درس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں حتیٰ کہ ملا نظام الدین کے نام سے درس نظامیہ کہلاتا ہے اور آہستہ آہستہ ضروریاتِ وقت کے پیش نظر ملا حسن، غلام یحییٰ، حمد اللہ اور قاضی مبارک کی تصانیف نصابی کتب کا جزو لاینفک بن گئیں۔ پس ظاہر ہے کہ جس طرح زمانے کے ساتھ نصابات بدلتے رہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج سلسلۂ نظامیہ میں تبدیلی کیوں نہ لائی جائے۔

اگرچہ ۱۹۰۳ء میں دار العلوم ندوہ کے معتمد تعلیم مقرر ہونے کے بعد علامہ شبلی کے لیے بظاہر اپنے حصول مقصد کے لیے راہ کھلی ہوئی تھی تاہم مشکلات تھیں اور بہت زیادہ۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اصلاح نصاب کا خیال صرف چند علما کے دل میں پیدا ہوا تھا باقی تمام لوگ اسی لکیر کے فقیر ہیں اور چونکہ فیصلہ عموماً کثرت رائے سے ہوتا ہے اسی لیے انھیں بزرگوں کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ مشکل ہے کہ مدرسین جو ہاتھ آسکتے ہیں اسی قدیم نصاب کے تعلیم یافتہ ہیں اس لیے وہ جدید نصاب کے پڑھانے سے عاجز ہیں اور چونکہ اپنے عجز کا تسلیم کرنا کسر شان ہے، اس لیے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اس قسم کی کتابوں سے کافی استعداد پیدا نہیں ہوتی۔ بہرحال یہ قطعی فیصلہ کیا گیا کہ جو کچھ ہو جدید نصاب جاری کر دیا جائے"

آخر میں مزید فرماتے ہیں:

"اگر ندوہ میں اس قدر بھی ہمت اور حوصلہ نہیں کہ وہ مشکلات کا مقابلہ کرے تو سرے سے اصلاح نصاب کا نام نہ لینا چاہیے۔ یہ سخت بددیانتی ہے کہ تمام دنیا میں اصلاح نصاب کا غل مچایا جائے اور ایک ذرہ اصلاح نہ کی جائے۔"

علامہ شبلی عصرِ حاضر کے تقاضوں کے سبب انگریزی کو
ل نصاب کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق
یزی کی تعلیم ہمارے طلبا کے لیے ازلبس ضروری ہے۔
ے انگریزی کی جانکاری کے سبب مغربی مستشرقین کے اسلام
ساس کی تاریخ پر اعتراضات سے واقف ہوں گے اور
ں کے جوابات معقول طریقے پر بزبان انگریزی دے سکیں
ے۔ دوم یہ کہ یورپ میں مذہب اسلام کی تبلیغ واشاعت
ی خاطر برائے نام انگریزی سے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی
اصل نہیں ہوسکتی۔ ایک خط میں یوں رقم طراز ہیں :

"اور جب وہ درجۂ تکمیل میں دو برس تک
صرف انگریزی پڑھیں گے تو زبان دانی
میں قابل گریجویٹوں کی برابری کرسکیں گے اور
اس وقت انگریزی میں تاریخ اسلام کو انجام
دے سکیں گے۔"

علامہ شبلی کی یہ خواہش تھی کہ انگریزی داں طلبا مسائل
سلام اور تاریخ اسلام سے بقدر ضرورت واقف ہوں
ور انھیں اس طرح مذہبی تعلیم دی جائے کہ ان کے دلوں
یں مذہب کی عظمت پیوست ہوجائے اور اس کی افادیت
سے وہ واقف کار ہوجائیں۔ ایک مضمون بعنوان "تعلیم
قدیم وجدید" میں فرماتے ہیں :

"یہ ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں
سے ہم کو مذہبی جذبات یعنی امامت، وعظ
یا افتاء کا کام لینا ہے بلکہ غرض یہ ہے کہ
وہ خود بقدر ضرورت مسائل اسلام اور
تاریخ اسلام سے واقف ہوں۔ اس
کے لیے صرف ایک مختصر اور جامع ومانع
سلسلۂ کتب دینیات کی ضرورت ہے
جس میں سلسلہ بہ سلسلہ اسکول سے
کالج اور دیگر کلاسوں تک کے قابل کتابیں
ہوں۔ اس سلسلہ میں تین قسم کی کتابیں ہونی
چاہییں: فقہ، عقاید، تاریخ اسلام۔"

مزید لکھتے ہیں :

"لیکن نہایت مقدم امر یہ ہے کہ کالجوں
میں صرف کتابی تعلیم سے مذہبی اثر پیدا
نہیں ہوسکتا بلکہ اس بات کی ضرورت ہے
کہ طلبا کے چاروں طرف مذہبی عظمت کی
تصویر نظر آئے۔
(الف) دینیات کے نتائج امتحان کو
انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار
دیا جائے۔
(ب) مذہبی علما کے بیش قرار مشاہرے
مقرر کیے جائیں۔
(ج) وعظ کے موقعوں پر اکثر اور ارکان
کالج تا امکان شریک ہوں۔
(د) مذہبی پابندی کی بنا پر طلبا کی خاص
توقیر وتحسین کی جائے۔ اور
(ہ) سب سے مقدم یہ کہ دو چار طلبا کو
گراں بہا وظائف دے کر ڈگری حاصل
کرنے کے بعد مذہبی اعلیٰ تعلیم دلائی
جائے۔"

اس ضمن میں اس بات کا اعادہ کرنا مناسب معلوم
ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کے الفاظ میں "جس طرح اس
وقت جدید علوم وفنون کے سیلاب میں ہمارے مذہبی
علوم بہہ رہے ہیں ٹھیک اسی طرح ایک وقت ہماری
قوم پر عباسیوں کے زمانہ میں بھی آیا لیکن ہماری قوم
زندگی سے معمور تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنے مذہبی علوم
کے ساتھ قدیم یونانی علوم کو بھی پہلو بہ پہلو جگہ دی جس
کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ہر دو قسم کے علوم کے مابین ایک

...اصل قایم ہو گئی۔ اس کے بعد ایک گروہ پیدا ہوا جس... مذہب اور عقل کی تطبیق کی جس کے گل سرسبد ...ام غزالی تھے۔ بعینہ یہی کیفیت مذہب کی اس جدید ...ن کے دور میں ہو گئی ہے اور اس خرابی کو دور کرنے ...غرض سے ندوۃ العلما کی بنیاد ڈالی گئی تاکہ ایک ...ما تعلیم یافتہ طبقہ نمودار ہو جو مذہب اور عقل میں مطابقت ...یدا کر سکے" ۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکی نداند جام و سندان باختن

علامہ شبلی علماے اسلام سے خطاب کرتے ہوئے ...ن کی ذمہ داریوں کا انھیں احساس دلاتے ہوئے فرماتے ...یں کہ دوسری قومیں بھی آج کے نامساعد حالات میں استقلال ...ور مضبوطی سے اپنے کام انجام دے رہی ہیں اور نئی ...لیم کے ساتھ اپنی مذہبی تعلیم کو فراموش نہیں کر رہی ہیں ...ر جس طرح آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں سے ...ارغ التحصیل نوجوان عیسائی پادری بن کر اپنے مذہب ...ی خاطر جنگل جنگل مارے مارے پھرتے ہیں تاکہ جنگلی ...دمیوں کو "انجیل" سے آشنا کر سکیں یا آریہ تحریک ...ے پرچارک اپنے "گروکل" قایم کر کے انگریزی کے ...اتھ سنسکرت کی تعلیم لازمی قرار دیتے ہیں تاکہ وہ ...پنے ہندو مذہب کی اشاعت باقاعدگی سے کر سکیں ...ا پونہ کے مرہٹوں کے فارغ التحصیل نوجوانوں کی ...انجمن خدام الھند" کے رضا کاروں نے اپنی زندگی ...قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے تاکہ آنے ...الی نسل ان کے نقش قدم پر چل کر اپنے مرہٹہ برادری ...ی خدمت کے لیے تیار ہو جائے۔ لیکن بقول علامہ شبلی

"مسلمان اس معاملے میں سب سے پیچھے ہیں اور اسی لیے علما کو اسلامیت کی صحیح اسپرٹ سے آگاہ کرنے اور زندگی کے ہر شعبے میں خدمت اور صحیح خدمت کرنے کی غرض سے ندوۃ العلما کی نگرانی میں "دار العلوم" کو قایم کیا گیا ہے، جہاں فروعی معاملات کو اہمیت نہیں دی جائے گی تاکہ وہ اچھے واعظ اور مبلغ کی حیثیت سے اسلام کے فروغ و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکیں"۔

مزید کہتے ہیں کہ ندوۃ العلما کا یہ "دارالعلوم" دراصل 'جامعہ دینیہ' ہے جہاں تمام اسلامی علوم کے اعلیٰ درجے تک پڑھانے کا اہتمام ہوگا، جہاں سے اسلامی مولف اور مصنف پیدا ہو سکیں گے، جہاں مغربی علوم و فنون کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہوگا اور جہاں کے جدید علم کلام کی روشنی میں فارغ التحصیل طلبا میں انگریزی زبان میں وعظ و تقریر اسلام کے مختلف پہلوؤں پر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ اس کا دوسرا مقصد اشاعت اسلام ہے: "تاکہ عیسائی مشنری اور آریہ پرچارک کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے طلبا واعظ یا مولوی کی صورت میں آمادہ ہو جائیں گے اور "اسلامیت' کے ساتھ 'وطنیت' کا پیام عام کرنے میں ہمہ تن مصروف رہیں گے۔

آخر میں علامہ شبلی حالات حاضرہ کا جائزہ لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آج بعینہ اسی قسم کی حالت اور اسی قسم کا موقع ہے۔ یورپ نے تمام علوم و فنون کا قالب بدل دیا ہے، فلسفہ نے بالکل نئی صورت اختیار کی ہے، منطق میں نئے برگ و بار پیدا ہوئے ہیں، معانی و بلاغت کا اصول بدل گیا ہے، تاریخ ایک قسم کا فلسفہ بن گئی ہے اور مذہبی مباحث کے نئے نئے پیرائے میں آئے ہیں تو کیا آج عقائد کو علم کلام کی صورت میں پیش نہیں کر سکتے۔ عربیت کے ذریعے معانی و بلاغت قالب نہیں بدل سکتے۔ اصول فقہ میں منطقی استدلالات

پیدا نہیں کر سکتے۔ تفسیر میں فلسفہ کی آمیزش نہیں کر سکتے فرائض میں علم حساب کے دقیق اصول شامل نہیں کر سکتے ان تمام امور کا حل نکل سکتا ہے بشرطیکہ علوم قدیمہ کی غلامی کی صورت میں نہیں بلکہ آزاد و خود مختار بن کر کی جائے، جہاں غلطیاں ہوں ان کی اصلاح ہو جائے جو حصہ فضول ہو اس کو الگ کر دیا جائے۔ پریشان اور غیر مرتب مسائل نئے سرے سے درست کیے جائیں جو حصہ اسلامی علوم میں تحلیل ہو سکتا ہے، اسے تحلیل کیا جائے اور جو جدا ہے اس کو مستقل حیثیت سے قائم رکھا جائے اور اس طرح ہم اپنے علوم و تمدن کو باوقار اور مغربی علوم کی ہمسری کے قابل بنا سکتے ہیں۔

الغرض علامہ شبلی کی ذات گرامی جنہوں نے ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو آخری سانس لی، دراصل ایک ایسی منفرد ممتاز اور وحید عصر اور یگانۂ روزگار ہستی ہے جس کی مثال گزشتہ ایک صدی میں تمام عالم اسلامی میں بمشکل مل سکے گی اور جو آئندہ ہزاروں سال تک شبستان انسانیت و معاشرت کو چراغاں اور نزہت گاہ علم و ادب کو گل بداماں رکھے گی۔ بالفاظ دیگر علامہ شبلی جیسے معدن لعل و گوہر کے ایک انمول موتی، چمنستان علم و دانش کے ایک گل تازہ، آسمان فضل و کمال کے ایک تابندہ ستارہ بلکہ ایک جہان معنی، ایک تاریخ کے معلم اول سائنسات تحقیق، ایک دنیائے معلومات اور اس سے بڑھ کر فارسی کے بلبل شیراز اور اردو کے مینا بازار نے علم و دانش کی جن راہوں پر بھی اپنے نقش قدم چھوڑے ہیں وہ مدتوں یاد رہیں گے ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

"میں اپنی جانب سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں بلکہ محض احکام الٰہی کو نافذ کرنے والا ہوں۔ میں خود اپنی جانب سے کوئی بات شروع کرنے والا نہیں ہوں بلکہ محض پیرو ہوں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ خدا کی معصیت میں اس کی پیروی کی جائے۔ میں تم میں کا بہتر آدمی بھی نہیں ہوں البتہ خدا نے مجھ کو تمہارے مقابلے میں زیادہ گراں بار کیا ہے۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

# لیزر — جادوئی شعاعیں

محمد اسلم پرویز ( )

بہت سی سائنسی ایجادات ایسی ہیں جو عالم وجود میں آنے سے قبل ہی انسان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں۔ ایسی ہی ایک چیز "قاتل شعاع" ہے۔ ٹیلی ویژن پر اسٹار ٹریک میں سبھی نے ان رنگ برنگی شعاعوں کا استعمال دیکھا ہے۔ ہیرو کے پستول سے یا اس کے خلائی جہاز سے ایک رنگین روشنی کی دھار سی نکلی اور دشمن آناً فاناً بھسم۔ سائنسی ناولوں اور فلموں میں ایسی کرنوں سے اکثر سابقہ پڑتا ہے جو ہر چیز کو نیست و نابود کردیتی ہیں۔ ان کے سامنے نہ تو پتھر کی دیواریں ٹکتی ہیں نہ لوہے کے پھاٹک۔ اگرچہ ان قاتل شعاعوں کا ذکر انگریزی فلموں اور سائنسی کہانیوں سے شروع ہوا تھا لیکن اردو صحافت بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ جن لوگوں نے ابن صفی کے جاسوسی ناول پڑھے ہیں وہ زیرو لینڈ سیریز میں استعمال کیے گئے الیکٹرو گس کو بھولے نہ ہوں گے جس سے نکلنے والی کرنیں ہر چیز کو جلا کر دھواں کردیتی ہیں۔ انسان کے دل میں چھپی اس خواہش کو بالآخر سائنس داں حقیقت کا روپ دینے میں کامیاب ہوئے، جس کے نتیجے میں آج ہمارے پاس لیزر شعاعیں موجود ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ہم نے خیالوں میں ان کے تباہ کن کردار سے لطف اٹھایا تھا لیکن حقیقی دنیا میں ان کی افادیت ان کی فنا کرنے کی صلاحیت سے کہیں زیادہ عیاں اور حوصلہ افزا ہے۔

## لیزر کیا ہے؟

لیزر درحقیقت ایک لمبے نام کا مخفف ہے جو کہ پانچ الفاظ پر مشتمل ہے۔ ہر لفظ کے پہلے حرف کو ملا کر لیزر (LASER) نام کی تشکیل کی گئی ہے

(LIGHT AMPLIFICATION BY STIMU-LATED EMISSION OF RADIATION)

چونکہ لیزر بھی روشنی کی ایک خاص قسم ہے، اس لیے مناسب ہوگا کہ اگر ہم روشنی کے بارے میں بھی کچھ جان لیں۔ روشنی کی کرنیں چھوٹے چھوٹے ذرات پر مشتمل ہوتی ہیں جن کو فوٹون کہا جاتا ہے۔ فوٹون ایک قطار میں لیکن لہروں کی طرح چلتے ہیں اور اپنے اندر توانائی رکھتے ہیں۔ یہ فوٹون ایٹم کے اندر ایک خاص عمل کے دوران بنتے ہیں

---

○ لیکچرر، باٹنی ڈپارٹمنٹ، ذاکر حسین کالج، اجمیری گیٹ - دہلی ۶

جیسا کہ ہم جانتے ہیں ایٹم کے نیوکلیس میں دو طرح کے ذرات ہوتے ہیں۔ ایک تو پروٹون جس پر مثبت چارج ہوتا ہے اور دوسرا نیوٹرون جس پر کوئی چارج نہیں ہوتا۔ نیوکلیس کے گرد منفی ذرات اپنے مخصوص ہالوں میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان منفی ذرات کو الیکٹران کہتے ہیں۔ کسی بھی مستحکم ایٹم میں پروٹون اور الیکٹران کی تعداد برابر ہوتی ہے یعنی مثبت اور منفی چارج برابر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے مل ملا کر ایٹم پر کوئی برقی چارج نہیں ہوتا۔ مستحکم ایٹم میں زیادہ تر الیکٹران نیوکلیس کے نزدیک والے ہالوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان الیکٹرانس کو اگر کہیں سے توانائی مل جاتی ہے تو یہ اچھل کر اپنے سے اوپر والے ہالے میں چلے جاتے ہیں لیکن اس ہالے میں یہ مستحکم نہیں ہوتے اور ایک سیکنڈ کے دس لاکھویں حصے میں ہی یہ واپس اپنے ہالے میں آجاتے ہیں اسے ہم اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگر ایک گیند زمین کی سطح پر پڑی ہے تو یہ اپنی جگہ "مستحکم" ہے لیکن اگر ہم اسے اوپر فضا میں اچھالیں تو ہمارے ہاتھ کی جو توانائی گیند کو اوپر لے جائے گی اس کا اثر ختم ہوتے ہی گیند فوراً زمین کی طرف واپس آئے گی۔ الیکٹران توانائی کو جذب کر کے اوپر کے ہالوں میں جاتے ہیں لیکن چونکہ اس جگہ پر وہ مستحکم نہیں رہ سکتے اس لیے فوراً اپنی جگہ واپس آجاتے ہیں۔ واپسی کے وقت وہ اس تمام توانائی کو خارج کر دیتے ہیں جس کو جذب کر کے وہ اوپر گئے تھے۔ یہ خارج ہونے والی توانائی فوٹون یعنی روشنی کی شکل میں خارج ہوتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو الیکٹران کی حرکت کی وجہ سے فوٹون خارج ہوتے ہیں۔ جس طرح پانی میں ہم کو اونچی نیچی، کم اور زیادہ قوت کی لہریں ملتی ہیں، اسی طرح روشنی کی لہریں بھی کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ لہر کی لمبائی کا رنگ سے بڑا گہرا تعلق ہے ہم کو نظر آنے والی روشنی سات رنگوں سے مل کر بنی ہے (روشنی میں کچھ ایسی شعاعیں بھی شامل ہوتی ہیں جو ہمارے دائرہ بصارت میں نہیں آتیں۔ اس لیے ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔ اگرچہ وہ بھی روشنی کا ہی ایک حصہ ہوتی ہیں مثال کے طور پر ریڈیائی شعاعیں یا ایکسرے وغیرہ) ہر رنگ کی لہر کی خاص لمبائی ہوتی ہے اور یہ مخصوص قسم کی فوٹون سے بنتی ہے۔ کم لمبائی والی لہروں کے فوٹون میں زیادہ قوت ہوتی ہے۔ جب کہ زیادہ لمبائی والی لہروں کے فوٹون کم طاقت ور ہوتے ہیں روشنی کی ان عام لہروں میں ایک اور خاصیت ہوتی ہے جس سے ہم سب واقف ہیں، وہ یہ کہ یہ شعاعیں پھیلتی ہیں۔ ٹارچ کو جب آپ روشن کرتے ہیں تو بلب کے مرکز سے نکل کر روشنی کی کرنیں دور تک پھیلتی ہیں اگر روشنی کی ان لہروں میں فوٹون کی تعداد بڑھا دی جائے اور اگر ان کو کسی طرح پھیلنے سے روک کر سیدھی لائن میں رکھا جائے تو یقیناً ایسی شعاعوں میں بہت زیادہ توانائی ہوگی۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے روشنی کی شعاع فوٹون سے بنتی ہے جس میں توانائی ہوتی ہے جتنے زیادہ فوٹون ایک لہر میں ہوں گے اتنی ہی وہ توانا ہوگی ایسی شعاعوں کو ہی لیزر کہا جاتا ہے۔

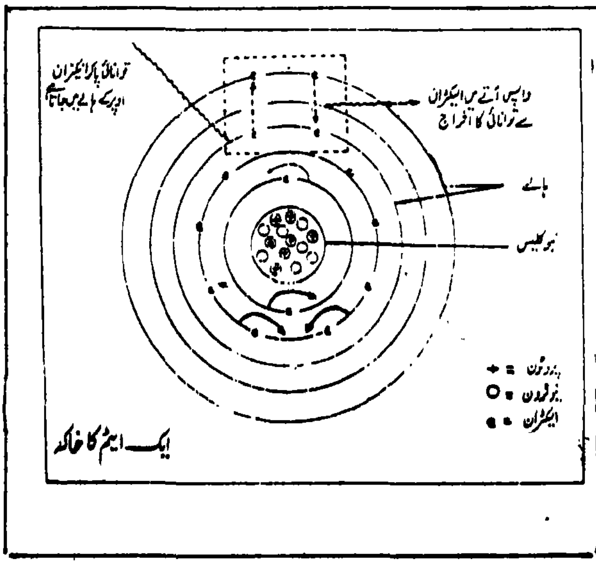
اس میدان میں سب سے پہلا اور اہم مشاہدہ البرٹ آئن سٹائن نے ۱۹۱۷ء میں کیا تھا انھوں نے یہ دریافت کیا تھا کہ قدرتی طور پر خارج ہونے والی روشنی کسی تحریک کے نتیجے میں پیدا ہونے والی روشنی سے مختلف ہوتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر غیر مستحکم ایٹم پر کسی مخصوص قسم کے فوٹون کی بارش کی جائے تو اس ایٹم کے مستحکم حالت میں لوٹتے وقت جو فوٹون خارج ہوں گے وہ اسی قسم کے ہوں گے کہ جن سے اس ایٹم پر بارش کی گئی تھی۔ یہ فوٹون جذب ہونے

کے بجائے دوسرے غیر مستحکم ایٹموں پر حملہ کرکے ان سے بھی اپنے جیسے فوٹون خارج کرائیں گے اور اس طرح ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا جس کی رفتار بہت تیز ہوگی۔ اس مشاہدے کو عملی شکل بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے دوران ملی جب نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں کام کررہے چارلس ٹونس نے ایٹم کی بنیادی خصوصیت پر تحقیقات کے دوران ایک نئی دریافت کی۔ ٹونس اپنے تجربات کے دوران بہت چھوٹی لمبائی کی لہریں استعمال کررہے تھے جن کو مائیکرو ویو کہا جاتا ہے۔ یہ آنکھ سے نظر نہیں آتیں۔ مزید چھوٹی لہریں پیدا کرنے کے لیے انھوں نے ۱۹۵۱ء میں ایک آلہ بنایا جس میں مائیکرو ویو کو استعمال کرکے ان سے بھی چھوٹی لہریں پیدا کی جاتی تھیں۔ ان شعاعوں کو ٹونس نے میزر (MASER) کا نام دیا جو ایک لمبے نام کا مخفف تھا۔

(MICROWAVE AMPLIFICATION BY STIMULATED EMISSION OF RADIATION)

اس دریافت سے متاثر ہو کر ٹونس نے یہ کام جاری رکھا اور ۱۹۵۷ء میں انھوں نے مائیکرو ویو کی جگہ روشنی سے بھی ایسی ہی شعاع تیار کرنے کی ترکیب معلوم کرلی۔ ان شعاعوں کو ٹونس نے لیزر کا نام دیا ۱۹۵۸ء میں ٹونس نے شولو کی شراکت میں ایک مقالہ شائع کیا جس میں لیزر بنانے کی ترکیب اور اس کی خامیوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس مقالے نے سائنسی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ دوراندیش محقق اس جادو کی کرن کے ممکنہ فائدوں کو بھانپ گئے اور تمام عالم میں ان شعاعوں پر تحقیقات شروع ہوگئیں۔ یہ کوششیں آخرکار پھل لائیں اور ۱۹۶۰ء میں تھیوڈور میمن پہلی لیزر شعاع بنانے میں کامیاب ہوئے۔ چارلس ٹونس نے اس میدان میں جو بنیادی کام کیا تھا اس کے اعتراف بطور ان کو ۱۹۶۴ء میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔

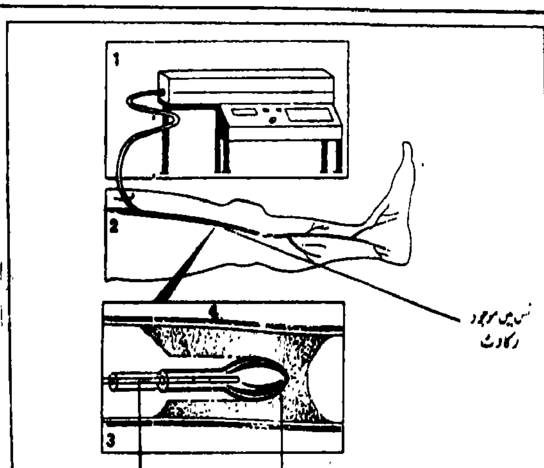
## لیزر کیسے بنتی ہے



ایک ایٹم کا خاکہ

لیزر روشنی کی سب سے تیز قسم ہے کسی بھی مادے کے ایٹموں سے لیزر شعاع پیدا کی جاسکتی ہے سب سے پہلی لیزر روبی نامی دھات سے پیدا کی گئی تھی۔ بعدازاں کئی رقیق مادے اس کام کے لیے استعمال ہوئے اور اب گیس کے میڈیم سے بھی لیزر بنائی گئی ہے۔ بہ نسبت ٹھوس مادوں کے رقیق اور گیس سے بنی لیزر زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ کسی بھی مادے سے لیزر شعاع بنانی ہو تو بنیادی طریقہ یکساں ہے۔ پہلے مرحلے میں مادے کے ایٹموں کو غیر مستحکم بنایا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ روشنی، بجلی یا کسی کیمیائی عمل سے حاصل کی جاتی ہے۔ یہ توانائی ٹریگر کا کام کرتی ہے۔ غیر مستحکم ایٹم جب استحکام پاتے ہیں تو ان سے توانائی فوٹون کی شکل میں خارج ہوتی ہے جو کہ قدرتی اخراج ہوتا ہے یہ فوٹون دوسرے ایٹموں کو غیر مستحکم کرکے ان سے مزید

فوٹون خارج کراتا ہے۔ چونکہ یہ ایک تحریکی عمل ہوتا ہے اس لیے اس کے نتیجے میں خارج روشنی "تحریکی" ہوتی ہے اگرچہ ان دونوں اقسام کی لہروں کی لمبائی ایک ہی ہوتی ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ ان کا رخ ایک سمت نہ ہو۔ ان لہروں کو ایک سمت دینے کے عمل کو ایمپلی فیکیشن۔ (AMPL-IFICATION) کہتے ہیں۔ لیزر بنانے کے لیے عموماً ایک ٹیوب استعمال کیا جاتا ہے جس میں وہ مادہ بھرا ہوتا ہے جس سے کہ لیزر بنانا ہوتی ہے۔ اس ٹیوب کے دونوں سروں پر آئینے لگے ہوتے ہیں جو کہ ان پیدا شدہ شعاعوں کو منعکس کر کے واپس اسی مادے میں لوٹا دیتے ہیں جہاں یہ مزید ایٹموں سے فوٹون خارج کرتی ہیں اس طرح ان کی قوت بڑھتی جاتی ہے۔ ان آئینوں میں سے ایک کچھ ترچھا اور اس انداز سے لگایا جاتا ہے کہ کچھ روشنی اس سے ٹکرا کر باہر آسکے۔ اس باہر آنے والی شعاع کو مختلف قسم کے آئینوں کی مدد سے ایک خاص سمت دی جاتی ہے۔ باہر آنے والی یہ باریک کرن ہی وہ جادوئی شعاع ہوتی ہے کہ جس سے ایک طرف آنکھ کی نازک پتلی کی مرمت ہوتی ہے تو دوسری طرف سخت ترین ہیرے کا جگر چیرا جاتا ہے۔ اگرچہ اس وقت ۵۰ اسے زائد اقسام کی لیزر موجود ہیں لیکن عام استعمال میں آنے والی شعاعیں کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس سے یا آرگن گیس سے یا یٹریم، ایلومنیم اور گارنیٹ (YAG) کے مکسچر سے بنائی جاتی ہیں۔ عام روشنی کے برخلاف لیزر شعاع صرف ایک ہی قسم کی لمبائی والی لہروں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے صرف ایک ہی رنگ کی ہوتی ہے۔ مثلاً نیلی، ہری یا سرخ ان کے رنگوں کا چناؤ ان کے استعمال کے مطابق کیا جاتا ہے یہ شعاعیں بہت دور تک بغیر پھیلے ہوئے ایک دوسرے کے متوازی اور ساتھ ساتھ چل سکتی ہیں۔ اگر زمین سے چاند کی طرف لیزر کو روانہ کیا جائے تو اس ۲,۵۰,۰۰۰ میل کے سفر میں یہ صرف دو میل کی چوڑائی میں پھیلیں گی، اس خاصیت کی وجہ سے ان کو کسی بھی خاص سمت میں باریک کرن کی شکل میں بھیجا جاسکتا ہے۔




پیر کی نس میں موجود رکاوٹ (۲) کو لیزر سے دور کرنے کا عمل۔ (۱) آپٹیکل فائبر کی مدد سے لیزر شعاع کو خون کی نس تک لے جایا جاتا ہے۔ (۲) رکاوٹ کے نزدیک جا کر دھات کے سرے کو لیزر کی مدد سے گرم کیا جاتا ہے۔ (۳) دھات کا گرم سرا رکاوٹ کا جلا کر خاتمہ کردیتا ہے۔

## لیزر کے استعمال

لیزر کا پہلا استعمال دودھ کی بوتل کے نپل میں باریک سوراخ کرنے کے لیے ہوا تھا۔ اگرچہ ان شعاعوں کی عمر ابھی صرف ۲۰ سال ہے لیکن اس مناسبت سے کہیں زیادہ ان کے استعمال ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں لیزر نے کچھ نہ کچھ کرامات ضرور دکھائی ہیں۔ چونکہ ہر قسم کے مادے سے ہر رنگ کی لیزر بنائی جاسکتی ہے۔ اس لیے اب مطلوبہ خصوصیات کی لیزر حاصل کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ لیزر کی قوت کا دار و مدار اس میں موجود فوٹون کی تعداد اور ان سے پیدا کی گئی لہروں کی لمبائی پر ہوتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کو میڈیم قسم کی 'مقدار'، خارج شدہ شعاع کی جسامت اور اس تمام عمل کو شروع کرنے والی توانائی

مقدار سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ اس شعاع پر پوری طرح ہ یاب ہونے کے بعد سائنسداں اب اس قابل ہیں کہ حسب منشا زر بنا سکیں۔ شدید قوت والی لیزر کی مدد سے سخت ے سخت چیز کو نہایت آسانی سے محض چند سکنڈ میں کاٹا ا سکتا ہے۔ ہیرے جیسی سخت شے جس کو کاٹنے والے وزار بھی اکثر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس شعاع کے نیچے دھواں ن کر تحلیل ہو جاتی ہے سیکڑوں میل کے علاقے میں پھیلے جنگلات پلک جھپکتے ان شعاعوں کی مدد سے کاٹے جا سکتے ہیں۔ لیزر میں پوشیدہ قوت کو پہچانتے ہوئے س کی جنگی صلاحیت کا اندازہ بہت پہلے لگا لیا گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ لیزر ۱۹۶۰ء میں بنی تھی لیکن امریکہ کے جنگی ماہرین نے پنٹاگن کو ۱۹۵۹ء میں ہی اس کی اہمیت کا احساس دلا دیا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں امریکہ میں باقاعدہ لیزر ہتھیار بنانے پر کام شروع ہو چکا تھا۔ ۶۸-۱۹۶۶ء کے دوران ویت نام جنگ میں امریکا نے لیزر شعاعوں کی مدد سے بہت کامیاب بمباری کی تھی۔ لیزر نے بمبار جہازوں کی آنکھ کا کام کرتے ہوئے ان کے صحیح ٹھکانوں کی نشاندہی کی۔ ۱۹۷۲ء میں جب ترقی پذیر ممالک میں لیزر کی آمد کے چرچے تھے امریکا لیزر گن سے تجربات کر رہا تھا آج ریگن کے "اسٹار وار" پروگرام کی اہم بنیاد لیزر شعاعیں ہی ہیں جن کی مدد سے دشمن ممالک کے سیارے، خلائی جہاز اور میزائل پل بھر میں تباہ کر دیے جائیں گے۔ کل کے خواب آج حقیقت میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ چونکہ لیزر بھی روشنی کی رفتار سے سفر کرتی ہے اس لیے اس کی مدد سے دشمن کے میزائل کو کافی دیر سے موصولہ اطلاع کے بعد بھی کامیابی سے تباہ کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۲ء سے اب تک امریکہ اور دیگر بڑی طاقتوں نے اس میدان میں مزید کتنی ترقی کر لی ہے، یہ ایک راز ہے، بہت قیمتی راز لیکن ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۲ء کے درمیان ہونے والی ترقی کی رفتار کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لیزر گن سے بھی زیادہ مہلک ہتھیار بن چکے ہوں گے۔

لیزر اگر میدان جنگ میں خطرناک ثابت ہوئی ہے تو اسپتالوں میں بھی اس نے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ آج لیزر کی باریک، نرم اور کم توانائی والی کرنوں سے آنکھ کے آپریشن نہایت کامیابی سے کیے جا رہے ہیں۔ ان کی دھار کسی بھی سرجن کے نشتر سے زیادہ تیز اور کم تکلیف دہ ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ سے بنی لیزر خاص طور سے سرجنوں میں مقبول ہے لیزر جب جسم کے کسی بھی حصے پر پڑتی ہے تو اس کی توانائی حدت میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ مخصوص حصہ گرم ہو جاتا ہے۔ ہمارا جسم ہر جگہ پر الگ الگ قسم کے مادوں سے بنا ہوا ہے۔ ہر مادہ الگ رنگ اور لمبائی کی لہروں کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کی وجہ سے ایک خاص لیزر اسی حصے پر اثر انداز ہوتی ہے جب کہ بقیہ حصے محفوظ رہتے ہیں۔ اس بنیاد پر لیزر سے بہت کام لیے جا رہے ہیں۔ میڈیکل لیزر کو میڈیلاز (Medilas) کہتے ہیں۔ ان کی مدد سے آنکھ کے باریک آپریشن نہایت آسانی سے کر لیے جاتے ہیں۔ آنکھ کے اندرونی حصوں تک انسانی دسترس بہت مشکل تھی۔ معمولی خرابی کے لیے کبھی کبھی سر کے بڑے حصے کا آپریشن کرنا پڑتا تھا اور اکثر یہ ناممکن ہوتا تھا جس کی وجہ سے مریض کو بینائی سے ہی ہاتھ دھونا پڑتا تھا لیکن اب لیزر سے اس مخصوص حصے کو "ویلڈنگ" کی مانند جوڑا بھی جا سکتا ہے اور کسی بے مصرف یا بیکار عضلے کو پل بھر میں جلا کر ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔ دل کے زیادہ تر امراض خون کی نسوں میں چکنائی یا پارٹیکلوں کے جمنے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ایک معمولی سے ٹکڑے کو نکالنے کے لیے دل کے خطرناک آپریشن کرنا پڑتے تھے

جن پر ہزاروں روپیہ خرچ ہوتا تھا، کامیابی یقینی نہیں تھی اور ہفتوں تک مریض کو بستر پر محدود رہنا پڑتا تھا۔ اب ایسے لچک دار ریشے ایجاد ہو چکے ہیں جن سے لیزر کو نہایت آسانی سے گزارا جا سکتا ہے۔ جس طرح تاروں سے بجلی گزرتی ہے اسی طرح ان آپٹیکل فائبرس (Optical Fibres) سے لیزر گزر جاتی ہے۔ یہ ملائم تار مریض کے جسم میں آسانی سے داخل کر دیے جاتے ہیں۔ جس جگہ پر جمے ہوئے چکنائی کے ٹکڑے کو ختم کرنا ہوتا ہے وہاں تک اس تار کو لے جاتے ہیں۔ اس تار کے سرے پر دھات کا ایک ننھا سا سر ہوتا ہے۔ خاص نشانے پر پہنچنے کے بعد اس تار سے لیزر گزاری جاتی ہے جو کہ دھات کے سرے کو گرم کر دیتی ہے جس سے وہ جماؤ جل کر ختم ہو جاتا ہے۔ مریض کو تکلیف بھی نہیں ہوتی اور "آپریشن" کے صرف چند گھنٹے بعد وہ اپنے گھر جا سکتا ہے۔ اسی طرح کینسر اور رسولی کو بھی لیزر کی مدد سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ بطور سرجن کے لیزر کی کامیابی کا راز کئی باتوں میں پوشیدہ ہے۔ اول تو یہ عین مطلوبہ جگہ پر کام کرتی ہیں، غیر متعلقہ حصوں کو متاثر نہیں کرتیں۔ ان کی مدد سے خون کی باریک نسیں سیل ہو جاتی ہیں تو خون بھی بالکل نہیں نکلتا۔ زخم پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے کسی اور پیچیدگی کا خوف بھی نہیں رہتا اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مریض چند گھنٹوں بعد ہی اپنے پیروں سے چل کر اسپتال سے رخصت لیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لیزر کے استعمال اتنے ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا اس مضمون کی حد سے باہر ہے۔ ان کی کارکردگی کے دیگر میدانوں کا جائزہ آئندہ کسی تحریر میں پیش کیا جائے گا۔

## اعلان

قارئین تہذیب الاخلاق اور ایجنٹ حضرات کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ستمبر کا شمارہ اکتوبر ۱۹۹۲ء کے ساتھ شائع کیا جائے گا جس کی مجموعی ضخامت تقریباً ۲۰۰ صفحات اور قیمت پندرہ روپے ہوگی۔ جو حضرات ۳۰ ستمبر ۹۲ء تک تہذیب الاخلاق کی خریداری قبول فرمائیں گے ان کو خاص شمارہ زرِ سالانہ ہی میں پیش کیا جائے گا۔ ایجنٹ حضرات ۱۵ ستمبر ۹۲ء تک اپنے آرڈر بھیج دیں۔

سرکولیشن منیجر

## ایک جاگیردار خاندان کی باشعور اور

# روشن خیال لڑکیاں

قسط نمبر ۲

ریاض الرحمٰن خاں شیروانی ○

سماجی اور تعلیمی کاموں میں دل چسپی اس سے عیاں ہے کہ ایک خط میں، جس پر تاریخ درج نہیں ہے، لکھتی ہیں۔ "مہربانی کر کے بہت جلد چندہ مسلم یونیورسٹی روانہ کر دو۔ اب کے تم سب سے پیچھے کیوں رہ گئیں"؟ یہی موضوع ۱۹۱۹ء کے ایک خط میں اس طرح زیر بحث آیا ہے، "مہربانی کر کے بہت جلد چندہ مسلم یونیورسٹی روانہ کر دو۔ اب کے تم سب سے پیچھے کیوں رہ گئیں؟ آج خالہ صاحبہ (اہلیہ عبدالجلیل خاں شیروانی صاحب رئیس بھیکم پور) سے ان شاء اللہ چندہ وصول ہو جائے گا۔" اس وقت کے احرار ملت سے شغف اور تعلق خاطر کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان کے نام کے ساتھ بالعموم "بھائی" یا اس طرح کا کوئی دوسرا لفظ لکھتی ہیں۔ ۱۹۱۵ء کے ایک خط میں رقم طراز ہیں: "یہ خط دیکھتے ہی بھائی جان ظفر (مولانا ظفر علی خاں) کی نظم مبارک کا پرچہ زمیندار اور حسرت بھائی (مولانا حسرت موہانی) کا دیوان بھیج دو۔ اس کے بعد حسرت بھائی کی مصنفہ کتب اور بھیجوں گی"۔ خط کے نیچے مکتوب الیہا کا نام اس طرح لکھا ہے "ہمشیرہ خورد جناب مولوی ظفر علی خاں صاحب سلمہا" اور پھر لفافے پر اس کی تصحیح کی ہے: "خط کے اندر غلطی سے ہمشیرۂ ظفر علی خاں کے بجائے ہمشیرۂ خورد ظفر علی خاں لکھ گیا ہے۔ معاف کرنا۔" ۱۹۱۵ء ہی کے ایک دوسرے خط میں لکھتی ہیں: "ہاں بنے میاں (احمد اللہ خاں حیراں کی عرفیت) سلمہ کو مبلغ چار سو روپیہ زاد سفر (مسوری) کے لیے ملے۔ وہ خوشی سے مست تھے۔ میں نے اس میں سے ایک اشرفی مولانا آزاد بھائی سلمہ کے کسی خورد سال بچے کے ہاتھ پر رکھنے کا وعدہ لے لیا ہے۔ یہ اصرار تو بہت کریں گے۔ لینا نہ لینا آپ کا کام ہے۔ میرا شکریہ ادا کرو۔" اس عبارت سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ انھیں اس کا علم ہے کہ مولانا آزاد کا قیام ان دنوں مسوری تھا لیکن یہ معلوم نہیں ہے

○ سابق صدر شعبہ عربی اے ایم یو، علی گڑھ - حبیب منزل - میرس روڈ - علی گڑھ

کہ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ مولانا غیور آدمی ہیں اس لیے ان کا رقم قبول کرنا آسان نہیں۔ دراصل ان دونوں بہنوں میں مولانا آزاد انیس خاتون صاحبہ کے ہیرو تھے (خود نکہت کے ہیرو مولانا ظفر علی خاں تھے)، اسی لیے لکھا ہے: "میرا شکریہ ادا کرو"۔ آگے لکھتی ہیں: "بتے میاں والد سے چھپ کر لینس ڈاؤن پر محمد علی بھائی کے پاس جانے کا بھی ارادہ موافق رکھتے ہیں۔" حریت پسندوں کے سلسلے میں باپ اور اولاد کے طرزِ عمل کا فرق ان جملوں سے واضح ہوجاتا ہے۔ اپنے اپنے ہیروؤں کے سلسلے میں ان لوگوں میں نوک جھونک بھی چلتی رہتی ہے مگر اس کی حقیقت محض لطفِ سخن کی ہے ورنہ عقیدت ان سب سے ان سب ہی کو ہے۔ نکہت صاحبہ اپریل ۱۹۱۹ء کے ایک خط میں لکھتی ہیں: "ہاں بہن دیکھو۔ بڑے بول کا سر نیچا، غرور کا کلہ ٹرا۔ اسی واسطے کہتے ہیں۔ ایک ظفر علی خاں بھائی کی روانگی حیدرآباد پر تم نے کیا کیا ریمارک کیے تھے... ان کو برا کہنا کسی کو سزاوار ہی نہیں۔ برا کہا اور سامنے آگیا۔ یاد کرلو ان کے اخبار کی ضمانت ضبطی، پریس، جرمانہ، حتّٰی کہ نظربندی۔ جس جس پر تم ہنستی رہیں تمہارے آزاد صاحب کے سامنے آیا۔ پھر دیکھ لو وہ تو ماشاء اللہ اپنے گھر بیٹھے ہیں۔ جنگ اختتام پذیر بھی نہ ہونے پائی اور وہ بیمار ہوگیا۔ اپنے آزاد کو کہو۔ ہر چند چیخے چلائے کہ "ارے اگر مجھے حضور شہنشاہِ معظم جارج پنجم کے دشمنوں، غنیموں کا دوست بتایا گیا تو میں تباہ و برباد ہوجاؤں گا مگر ان کی مہیب وزنی زنجیریں خلخالِ پا ہی بن کر رہیں... اب غریب کی جانب سے کوئی خبر ہی نہیں آتی۔ خدا جانے شور دریا آتار دیے گئے، یا آن پر فیر ہوگیا یا کیا بلا ہوئی۔" ۱۹۱۹ء ہی کے ایک دوسرے خط میں لکھتی ہیں۔ "تمہارے ابو اعلام صاحب کا "تذکرہ" آگیا مگر مجھے بڑی مایوسی ہوئی، جب میں نے ایسے خراب کاغذ پر ٹائپ میں چھپا ہوا پایا۔ قسم اعلیٰ ختم ہوچکا تھا اور اس کی بابت بھی عمدہ ہونے کے اشارات درج تھے لہٰذا اسے ہی منگانا مناسب سمجھا۔ خیر جو بند گیا سو موتی۔" اس سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ایک دوسری کے ہیروؤں کے بارے میں جملہ بازی محض تفننِ طبع کی خاطر ہوتی تھی۔ ورنہ احرارِ ملت سے عقیدت سب کو کم و بیش یکساں تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو مولانا آزاد کے مضامین کی فراخ دلانہ داد (جس کا ثبوت اگلے اقتباس سے ملے گا) "تذکرہ" کی خریداری کا اشتیاق اور حسبِ منشا اعلیٰ قسم نہ ملنے پر مایوسی کیوں ہوتی! اسی خط میں یہ بھی تحریر ہے: "اپنی ایک شایع شدہ تازہ نظم ارسال کرتی ہوں.... احتیاط سے واپس کر دینا۔" افسوس ہے کہ نکہت صاحبہ کا کلام، جیسا کہ مذکور ہوا، محفوظ نہیں رہ سکا اور یہ اردو ادب کا بڑا نقصان ہے۔ ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں رقم طراز ہیں: "زمیندار کی تازہ مصیبت کی خبر تو تم سن کر محظوظ ہوئی ہوگی۔ سچ ہے کسی کا گھر جلے، کوئی ہاتھ تاپے۔" آگے لکھتی ہیں: "انیسہ بیگم! کیا تم نے ام الا (کذا) مولانا آزاد کا بے مثل و بے نظیر مضمون "شہید کالج" دیکھا ہے؟ دوسرا مضمون "عراق (و) لیلائے عراق" بھی قابل دید ہے۔ واللہ قلم توڑ دیے ہیں مگر ہر شخص کا سمجھنا مشکل ہے۔"

اندرون ملک کے حریت پسندوں سے عقیدت و تعلق خاطر کے ساتھ ساتھ ترکوں اور دولت عثمانیہ سے شغف و دلچسپی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ۱۹۱۳ء کے ایک خط کے آخر میں دستخط سے پہلے تحریر ہے: "خدا ترکوں کو فتح اور دشمن کو ہزیمت

دے۔ آمین (تم بھی "آمین" کہو)" "ہلال احمر" کی تحریک کی مناسبت سے خود اپنے لیے چاندی کا ایک ہلال بنوانا چاہتی ہیں اور یہ کام انیسہ خاتون صاحبہ کے سپرد کر رہی ہیں۔ اس ہلال کے ڈیزائن کے بارے میں انھیں کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس پر جو عبارت کندہ کرانے کی خواہش مند ہیں وہ عبارت یہ ہوگی "زندہ و پائندہ باد دولت عثمانیہ"۔

اس زمانے کے ان لڑکے لڑکیوں نے ایک انجمن "ینگ شروانیز لیگ" کے نام سے قائم کی تھی جس کا مقصد ممبروں میں "مضمون نویسی کا ذوق پیدا کرنا، سماجی اور سیاسی شعور بیدار کرنا اور باہمی ربط و اخلاص کو مستحکم کرنا" تھا۔ اس طرح کی کوششیں بعد میں بھی جاری رہیں اور شروانی خاندان کے جو طلبہ علی گڑھ کے مختلف اداروں میں زیر تعلیم تھے، انھوں نے وہاں اس انجمن کی تجدید کی اور اس کا نام بدل کر ینگ شروانیز کلب" کر دیا۔ یہ کلب بار بار قائم ہوتا اور ختم ہوتا رہا۔ اس کے احیاء کی آخری کوشش ہم نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں ۱۹۴۴ء میں کی اور تین برس کے بعد ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے ساتھ یہ کلب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ ایک فرق یہ تھا کہ "ینگ شروانیز لیگ" کے ممبر اور عہدے دار لڑکے اور لڑکیاں دونوں تھے لیکن "ینگ شروانیز کلب" صرف لڑکوں تک محدود تھا۔ یہ گویا ترقیٔ معکوس تھی۔ غالباً اس کے دو سبب تھے۔ "ینگ شروانیز لیگ" کی ممبرشپ قریبی اعزہ تک محدود تھی جب کہ "ینگ شروانیز کلب" کے ممبر شروانی خاندان کے سب طلباء تھے۔ دوسرے حصولِ آزادی سے قبل تک شروانی خاندان کی لڑکیوں کو تعلیمی اداروں میں داخل ہو کر پڑھنے کی اجازت شاذ ہی ملتی تھی اور جن دو چار لڑکیوں کو اس کا موقع ملا غالباً ان کے بزرگ بھی اس کے حامی نہیں تھے کہ وہ ایک ایسے کلب کی ممبر بنیں جن میں ان کے علاوہ سب لڑکے ہی لڑکے تھے۔ بات ذرا دور چلی گئی۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ اس "لیگ" کے تعلق سے ان خطوط میں نکہت کی بعض ایسی تحریریں دستیاب ہوئی ہیں جو اس کے احوال پر بہت اچھی روشنی ڈالتی ہیں۔ ایک خط میں جس پر تاریخ درج نہیں ہے انیسہ خاتون صاحبہ کو لکھتی ہیں: "...... بحیثیت پریسیڈنٹ لیگ کے تم کو تحریر کرتی ہوں کہ مونسہ بیگم صاحبہ و مونس خاں صاحب وانس خاں صاحب کو لکھ کر بہت جلد پروپوزل لے لو اور مجھے روانہ کر دو۔ ایک ہفتہ کو جلسہ ہٹ گیا ہے۔ ان شاء اللہ عن قریب پروگرام حاضر ہوگا۔ جلسہ کثرت رائے سے چند روز کو ہٹ گیا اس وجہ سے کہ ہم تین آدمی شریک ہونے کو (تھے) ان میں سے خاکسار بیمار۔ بس دو نفر کیا کر لیتے .... اس مرتبہ لیگ و صاحبان لیگ ہرگز نہیں مانیں گے جب تک واپس پریسیڈنٹ صاحبہ (مکتوب الیہا) کا مضمون نہ پڑھا جائے۔ جلد مضمون کا نام لکھو تاکہ پروگرام میں اس کا ذکر ہو۔ محمد انس خاں صاحب سے بھی مضمون "پردۂ نسواں" کی التجا ہے خواہ نظم ہو یا نثر مگر ہو مفید۔ یعنی پردہ کی از روئے مذہب حقیقت ...." ایک تحریر جو خط نہیں ہے بلکہ صدارت سے استعفیٰ ہے اور اس کے مخاطب "معزز ممبران و حاضرین جلسہ" ہیں خاصی طویل ہے۔ سرنامہ یہ شعر درج ہے:

نہ ہو نکہت رہ کے احقر زیادہ
چل اب لیگ آباد۔ ممبر نہ زیادہ

اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ نکہت صاحبہ "ایک سال سات مہینہ" لیگ کی صدر رہیں۔ آغاز کلام میں یہ قطعہ درج ہے۔

ہم چلے، لیگ کا خدا حافظ
انبیا حامی، اولیا حافظ
یہ امانت ہے مجھ مسافر کی
اس کا، میرا سدا خدا حافظ

استعفے میں اپنی "کوتاہی یا کمی" کی "معافی" طلب کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ استعفیٰ کا سبب "انجمن کی کسی کارروائی کی مخالفت نہیں ہے بلکہ" اپنی نالائقی" اور "نامعاملہ فہمی" ہے۔ ساتھ ہی لیگ کے ساتھ اپنی "بے انتہا محبت اور وابستگی" کا اعتراف کیا گیا ہے۔ آگے چل کر اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ بعض ممبر صدر صاحبہ کے خلاف "ووٹ آف سنشیور" لائے تھے اور اس کے مجوزہ لیگ کے مرد اراکین تھے۔ کیوں کہ صدر صاحبہ نے لکھا ہے: "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"۔ اور "مرداں چنیں کنند" زیادہ موٹے قلم سے لکھا ہے۔ بعد میں مجوزین کے نام بھی تحریر کر دیے ہیں یعنی "ہمارے لائق دوست احمد اللہ خاں صاحب (سگے بھائی) و مسٹر انس خاں صاحب و میاں محمد یونس خاں صاحب (دونوں پھوپی زاد بھائی)"۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ "خواتین ممبران کا کچھ ذکر نہیں"۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "میری رائے میں یہ ووٹ پاس ہی نہیں ہوا کیونکہ مرد بغیر ہماری شرکت کے کچھ نہیں کر سکتے"۔ پھر یہ تکنیکی سوال بھی اٹھایا ہے کہ "جب تک صدر جلسہ صاحبہ نے جلسہ جاری رکھا اس قسم کا کوئی ووٹ پیش یا پاس نہیں ہوا۔ ہاں اس کے بعد ان تینوں صاحبان نے جداگانہ جلسہ کیا اور اس میں وائس پریسیڈنٹ سکریٹری اور پریسیڈنٹ لیگ کے واسطے ووٹ آف سنشیور پاس کیا"۔ پھر چوٹ کی ہے "آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو"۔ اور یہاں بھی "مردانہ" موٹے قلم سے لکھا ہے۔ اب یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس استعفے کا کیا حشر ہوا اور اگر منظور کر لیا گیا تو نکہت صاحبہ کی جگہ کون صدر مقرر ہوا۔ ایک اور خط میں جو "ینگ شروانیز لیگ" کے ایک اور انجمن کا ذکر ملتا ہے جس کا نام "انجمن معاون نسواں" ہے۔ اس خط پر بھی تاریخ درج نہیں ہے لیکن سواد خط اور اسلوب تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسبتاً کم عمری کا ہے ممکن ہے "انجمن معاون نسواں" "ینگ شروانیز لیگ" کی باقیات رہی ہو۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً یہ خواتین کی انجمن تھی لیکن بعد میں مردوں کو بھی اس کا ممبر بنا لیا گیا تھا کیونکہ اس خط میں نکہت لکھتی ہیں:

"میری رائے میں تو محمد یونس خاں، محمد انس خاں اور بنے (احمد اللہ خاں) کو اور مولوی جیک کو ممبر "انجمن معاون نسواں" کا ممبر (کذا) ضرور بالضرور بنا دیا جائے تاکہ کسی طرح تو بے چاری انجمن کو ترقی نصیب ہو ورنہ ہمارے دو دو، تین تین پیسوں میں بھلا کیا خاک بھلا ہوگا اور چندہ ہر ممبر کو ضرور بالضرور دینا پڑے گا اب ہر ممبر کے ذمہ سالانہ چندہ عہ (ایک روپیہ آٹھ آنے) ہوا۔ دو آنہ ہر ماہ دینے سے تو یک مشت (عہ) سالانہ چندہ یک دم دینا (کذا) بدرجہا بہتر ہے اور اس میں بڑی آسانی ہوگی... اور ہاں لڑکوں سے یہ نہ کہنا کہ ہمیں بارہ بارہ (آنے) دینے پڑتے ہیں بلکہ یہ کہنا کہ ہمارا چندہ ممبری بھی وہی ہے جو تمہارا ہے۔ بعض وقت جھوٹھ (جھوٹ؟) بھی بولنا رہتا ہے اور اس میں یہ مصلحت ہے کہ ہم تو اور چندہ بھی جمع کر رہے ہیں اور خود بھی دیتے ہیں اور دیں گے۔" ایک خط جو "جوائنٹ سکریٹری صاحبہ انجمن" کے نام ہے لیکن نہ جوائنٹ سکریٹری صاحبہ کا نام دیا ہوا ہے اور نہ انجمن کا نام۔ یہ معلوم نہیں "ینگ شروانیز لیگ" ہے یا "انجمن معاون نسواں"۔ بہرحال صدر نکہت صاحبہ ہی ہیں اور خط کے آخر میں انھوں نے اپنا نام "A.B" اور اردو میں "الف بے"

لکھا ہے یعنی احمدی بیگم۔ اس خط میں " ۲۵-۲۶-۲۷ ماہ رمضان المبارک مطابق ۱-۲-۳ ستمبر" (سنہ ندارد) کو سالانہ جلسے کی اطلاع دی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ اگر خود نہ آسکیں تو ووٹ پراکسی بھیج کر اپنا فرض منصبی ادا کر دیجیے"۔ یہ بھی تحریر ہے کہ "۱۴ ماہ رمضان" تک رائے آجانی چاہیے۔ اس کے بعد باطل سمجھی جائے گی۔" نیز یہ کہ "جس خاتون یا جنٹلمین کو آپ ممبر کرانا چاہیں اس کی بھی درخواست ۱۴ رمضان (تک) آجانی چاہیے۔" ۱۹۱۳ء کے ایک خط میں بجائے "ینگ شروانیز لیگ" کے "گرل شروانیز لیگ" کا ذکر ملتا ہے۔ نہ معلوم ان دونوں میں کیا فرق تھا! لکھتی ہیں "فاطمہ بیگم دختر محبوب عالم (ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور) کی طرف ایک خط تمہارے بعد آیا ہے، روانہ کرتی ہوں میرا وہ ضروری خط جو غالباً تمہارے سامنے لکھا تھا (جس میں میں نے "گرل شروانیز لیگ" کا ذکر لکھا تھا) انھیں نہیں پہنچا۔"

جیسا کہ عرض کیا گیا، محترمہ زاہدہ خاتون شروانیہ کا کلام تو پہلے "آئینۂ حرم" اور پھر "فردوسِ تخیل" کے نام سے دار الاشاعت پنجاب، لاہور سے شائع ہو گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ محترمہ احمدی بیگم نکہت کا کلام محفوظ نہیں رہ سکا اور ضائع ہو گیا۔ اپنے ۱۹۱۹ء کے ایک خط میں اپنی ایک نظم اور ایک غزل کا حوالہ دیا ہے لیکن وہ کسی دوسرے کاغذ پر لکھ کر بھیجی تھی اور وہ کاغذ مکتوب الیہا نے پڑھ کر واپس کر دیا ہوگا یا کہیں علیحدہ رکھ لیا ہوگا۔ اس لیے ہمیں دستیاب نہیں ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں ابھی احمد اللہ خاں مرحوم اور محمد انس خاں مرحوم کا غم تازہ ہے۔ اس کی پرچھائیں اس خط پر پڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ لکھتی ہیں: "اپنی دو نظمیں مطالعہ کے لیے روانہ کرتی ہوں "ترانۂ معرفت" تو بعد ملاحظہ واپس کر دینا۔ کیونکہ اس کی دوسری نقل موجود نہیں ہے اور غزل رہنے دینا۔ اب کیسی نظمیں اور کس کی شعریں! دردِ دل کا رونا رہ گیا ہے سو تمام عمر رو دیں گے اور ختم نہ ہوگا۔ بس اس اظہار کا نام شعر سمجھو..... ہاں غزل کی دو شعریں کاغذ پر لکھنے سے رہ گئی ہیں ؎

بہت دیکھیں نیرنگ عالم کی سیریں
بس ہم کو تربت کا کونا ہی اچھا

اور:

جو دنیا میں نیکی کا بدلہ بدی ہے
تو تخمِ بدی دل میں بونا ہی اچھا

یہ دو شعر بھی اس لیے محفوظ رہ گئے کہ اصل کاغذ پر لکھنے سے رہ گئے تھے اب ان کی حیثیت تبرک کی ہے۔

۱۹۱۶ء میں احمد اللہ خاں حیرانؔ کے حادثۂ وفات کے بعد یہ سب اتنے دل گرفتہ ہو گئے تھے کہ ایک کی علالت سب کو پریشان کر دیتی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں ایک طرف انس خاں ابھی علیل ہیں اور دوسری طرف زاہدہ خاتون شروانیہ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا انس خاں کا تو انتقال ہی ۱۹۱۸ء میں ہو گیا۔ یہ غالباً ان کا مرض الموت تھا۔ زاہدہ خاتون ۱۹۲۲ء تک زندہ رہیں لیکن زیادہ تر علیل، مغموم و مہجور۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء کے ایک خط میں نکہت صاحبہ، انیسہ خاتون صاحبہ کو لکھتی ہیں: "انس خاں میاں کی حالت سن کر دل پھٹا جاتا ہے۔ نیز والد ماجد بھی بہت ہراساں ہیں، کہتے ہیں نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن۔ زاہدہ کو کیسے چھوڑ کر جاؤں؟ زاہدہ، پیاری زاہدہ! خدا اس کے ساتھ ہو اور ساتھ خیر کے جان کی سلامتی میں اس کا مرض زائل کرے..... مختصر یہ کہ انتہائی تکالیف کا شکار رہے۔ بخار اس قدر تیز کہ کیا بتاؤں۔ کل سہ پہر سے شام تک بالکل غفلت رہی۔ اب بھی غفلت ہو جاتی ہے۔ کبھی ہوشیار

ہوجاتی ہے.... دعا کرو، وظیفہ پڑھواؤ، خدا تمہاری پیاری نزہت (کو) جلد سے جلد شفائے عاجلہ (کذا) عطا کرے۔ آمین ۔" یہ تو مذکور ہو چکا کہ ۱۹۱۹ء میں محمد انس خاں آیدؔ کی وفات ہوئی اور ۱۹۲۲ء میں ناہدہ خاتون نزہتؔ نے اپنی بڑی بہن احمدی بیگم نکہتؔ اور عزیز دوست انیسہ خاتون کو داغ مفارقت دیا۔ نواب مزمل اللہ خاں صاحب کی دوسری اہلیہ کے بطن سے ایک صاحب زادے داؤد احمد خاں عرف ننے میاں تھے جو کم عمری سے بہت دین دار اور صالح تھے۔ ان کی پیدائش ۱۹۰۵ء کی تھی اور وفات ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ بالخصوص بڑے بھائی کی وفات کے بعد سے بزرگوں اور عزیزوں کے نور نظر اور راحت قلب و جگر تھے۔ ۱۹۲۲ء میں نزہت شروانیہ کے انتقال کے بعد سے نکہتؔ کی خواہرانہ محبت کا مرکز ان ہی کی ذات تھی۔ جب وہ بھی بیمار ہوئے اور بیماری نے خطرناک نوعیت اختیار کی تو نکہت کا اضطراب فطری تھا۔ ۱۹۲۳ء کے آغاز میں انیسہ خاتون صاحبہ کو لکھتی ہیں: "کیا کروں، تقدیر کا چین اپریل ۱۹۲۱ء سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا ہے اور شومئی قسمت کسی طرح مفارقت گوارا نہیں کرتی۔ کوئی نہ کوئی آفت عظیم سر پر معلق ہی رہتی ہے۔ موجودہ پریشانی نے تو واقعی حیات مستعار کو زلزلہ میں ڈال دیا ہے یعنی عزیزم ننے میاں (متعنا اللہ بطول حیاتہ واحسن صفاتہ) کی چار ماہ سے وقتی حرارت نے میرے لیے جو جنون انگیز و ہلاکت خیز کیفیت پیدا کر دی ہے وہ خط نہ لکھنے کا صحیح معقول اور حقیقی عذر ہے... جب تک حرارت کا ایک شمّہ اس کے جسد عزیز از جان میں باقی ہے دنیا بھر کی کوئی شے میرے لیے مفرح و مسکن نہیں ہو سکتی۔"

اس زمانے کی ڈاک کی بدنظمی کی طرف اوپر اشارہ گزر چکا ہے۔ ۱۳۴۰ھ (اس خط پر بھی عیسوی تاریخ کا اندراج نہیں ہے) کے ایک خط میں، جو مسوری گیا ہے (کیونکہ اب نکہت اور انیسہ دونوں ہی شادی شدہ اور ایک ایک بچّی کی ماں ہیں اور اپنے اپنے غم پر بڑی حد تک قابو پا چکی ہیں۔ نکہت کی یہ بچّی ہمشیرہ محترمہ ناجیہ خانم ہیں جن کی عنایت سے یہ خطوط دستیاب ہوئے ہیں) اس بارے میں ذرا تفصیل سے لکھتی ہیں لیکن اس کا نقل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ایک طرف اس سے اس دور کی بدنظمی پر روشنی پڑتی ہے جسے آج ہمارے بہت سے اہل وطن محض خوش فہمی کی بنا پر مثالی دور قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف غیر ملکی حکومت کے بارے میں نکہت کے جذبات کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا ہے۔ بالخصوص اقتباس کے آخری جملوں کا طنز قابل ملاحظہ ہے لکھتی ہیں: "خدا جانے آج کل ڈاک کی صورت پر کیا خدائی مار ہے کہ جدھر سنو خطوط ضائع ہونے کا شہرہ سننے میں آتا ہے... کل کا ایک لطیفہ اور سنو۔ مونس خاں میاں (مکتوب الیہا کے چھوٹے بھائی) کی جانب سے چھٹو (ان کی چھوٹی بہن مونسہ خاتون) کو ایک پارسل موصول ہوا... کھولنے پر معلوم ہوا کہ انھوں نے لایم جوس کی ایک بوتل روانہ کی تھی۔ مگر یہاں کیا پہنچا؟ ایک بیندہ شکستہ بوتل جس میں ایک قطرہ کسی چیز کا موجود نہ تھا نیچے گھاس بھی صاف تھی جیسے اس میں کبھی کوئی شے رکھی ہی نہیں گئی۔ لایم جوس کی تری یا کچھ نشانی کا تو ذکر کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کل ڈاک تو کیا، کسی کا ٹھکانہ نہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ ہم مہذب ہیں، ذی علم ہیں، مہربان حاکم ہیں، ہم سے سوالات کرو۔"

(باقی آئندہ شمارے میں)

# قوت مدبرۂ بدن

فراست علی ○

نظام جسمانی میں فطرت نے دفع مرض کے لیے مختلف قوتیں ودیعت کی ہیں جو اکثر وبیشتر انسانی و مصنوعی تدابیر سے کہیں پہلے دفاع مرض کے لیے آمادہ و برسرکار ہوتی ہیں۔ انسانی تدابیر کا مقصد بیشتر اُن فطری قوتوں کو مزید تقویت پہنچانا ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت اطباء نے علاج بالحفظ و التدبیر کو معالجاتی اصول کے طور پر اپنایا۔ طبیعت انسانیہ اور قوت مدبرۂ بدن کے اوپر نہ صرف یہ کہ اپنے اعتماد و یقین کا اظہار کیا بلکہ طبیعت ہی کو اصل معالج قرار دیا جیسا کہ ابن سینا، ابن زہر اور ابن رشد اور دوسرے اطباء کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے۔ نظریۂ امنیت کو جب یورپ نے نئے اور واضح انداز میں پیش کیا ساتھ ہی مصنوعی مناعت کا طریقہ ایجاد کر لیا تو اس نظریے نے فن تشخیص اور معالجات کی دنیا میں یکسر انقلاب پیدا کر دیا اور اس قوت کی یوں تعریف کی گئی کہ یہ جسم انسانی کا وہ دفاعی نظام ہے جو کہ افراد کو انفرادی طور پر اندرونی اور بیرونی تعفن سے بچاتی ہے اور صحت وتندرستی کو برقرار رکھتی ہے۔

طبی دنیا میں لفظ "طبیعت" کا استعمال تقریباً تمام اطباء نے کیا ہے اور اس کو اپنے تئیں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ بقراط کا یہ قول؛

"طبیعت اس قوت کو کہتے ہیں جو جسم انسانی کی بلا ارادہ شعور و تدبر اور حرکت و سکون کا مبداء ہے"

زمانہ قدیم کی طب یونانی اور اُن کے اطباء کے ذہنی شعور کو واضح کرتا ہے لیکن اس قول سے قوت مدافعت کی طرف کوئی رہنمائی نہیں ملتی ہے۔

عہد وسطیٰ میں ابن سینا نے طبیعت کے مختلف افعال وخواص کے ساتھ اجسام خبیثہ کے مقابلے کے لیے قوت مدبرۂ بدن کا تصور دیا ساتھ ہی اجسام خبیثہ یا جراثیم کا نظریہ پہلی بار واضح طور پر پیش کیا۔ وہ امراض وبائی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اجسام خبیثہ پانی اور ہوا میں شامل ہو کر انسان تک پہنچتے ہیں۔ اس نظریے کی تقویت اس کے اس قول سے بھی ملتی ہے کہ حمی اور ورم دونوں ہی اخلاط میں عفونت پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ دوسرے اطباء کے اس نظریے کو وہ باطل

○ ایم۔ ڈی، اجمل خاں طبیہ کالج، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

قرار دیتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حمی مرض صرف وہ ہے جو
ورم سے پیدا ہوتا ہے۔ حمی پر بحث کرتے ہوئے آگے
لکھتا ہے

"و الانتہاء، وھو الوقت الذی یشتد
القتال فیہ بین الطبیعۃ والمادۃ و
یظھر حالے الاستعلاء احدھما علی
الاخر وھو وقت الملحمۃ

[انتہا کا وقت وہ ہے جب طبیعت اور
مادہ مرض کے درمیان شدید جنگ ہوتی
ہے یہاں تک کہ ان دونوں میں سے کوئی
ایک دوسرے پر غالب آجاتا ہے]

ابن رشد نے تو اس نظریہ کو اور واضح کر دیا وہ
اپنی کتاب الکلیات میں ایک جگہ لکھتا ہے:

"اعضائے رئیسہ میں ہونے والے
اورام کے ساتھ بعض بخار ایسے ہوتے ہیں
جن کی صحت کے لیے کسی علاج کی بالکل
ضرورت نہیں ہوتی ان کے دفع کے لیے
طبیعت ہی کافی ہوتی ہے لیکن بعض امراض
ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے نجات حاصل
کرنے کے لیے محض طبیعت کافی نہیں ہوتی"

اس حقیقت کا اعتراف تقریباً مشرق و مغرب
کے تمام اطباء نے کیا ہے بلکہ بعض نے اس نظریے کو
جراثیمی نظریے پر ترجیح دیا ہے جو حقائق پر مبنی ہے
عہد وسطیٰ جو کہ مسلمانوں کا عہد زریں اور
تجرباتی دور کہا جاتا ہے ابن سینا کے اس نظریے پر
کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ کر سکا اور یہ نظریہ ایک طبی فلسفے
تک محدود ہو کر رہ گیا۔ بعد کے ادوار میں اس قوت
کا گہرائی سے مطالعہ کیا گیا اور خاص طور پر یہ مشاہدہ
کیا گیا کہ ایک فرد خسرہ و چیچک میں مبتلا ہونے کے
بعد بالعموم دوبارہ اس کا شکار نہیں ہوتا۔ ان مشاہدات
کو مدنظر رکھتے ہوئے مناعت اکتسابیہ کا کامیاب
تجربہ کیا گیا۔ سب سے پہلے جینر (JENNER)
پھر اس کے بعد پاسچر (PASTURE) اور
اس کے رفقاء نے مدافعانہ ٹیکے کی بنیاد ڈالی اور بعد
کے ماہرین نے قوت مدبرہ بدن کو ایک دفاعی نظام
سے لا جوڑا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دور حاضر میں
اطباء نے اس طبعی قوت مدافعت کو بروئے کار لانے
کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس طرح انسانی آبادی
کو مختلف قسم کے وبائی امراض اور جراثیمی حملوں سے
محفوظ کر لیا ہے۔ ساتھ ہی اس قوت کو بھی کسی حد تک
برقرار رکھنے اور اس کو مستحکم کرنے کا انتظام کیا ہے۔

طبی دنیا کے ساتھ یہ عجیب سانحہ اور المیہ
ہے کہ ان تمام جدوجہد اور حفاظتی تدابیر کے باوجود طبیعت
انسانیہ کی قوت مدافعت کو بچانے میں اس وقت ناکام
ہو گئی جب دور حاضر کی مغربی تہذیب ایک معاشرتی بیماری
کی شکار ہوئی۔ شاید تاریخ انسانی کا اپنی نوعیت کا
یہ پہلا واقعہ ہے کہ مغربی معاشرہ نے طبی دنیا سے اس
کو اپنے معاشرے تک گھسیٹ لایا اور وہ بین الاقوامی
معاشرے کا موضوع بن گئی۔ اس طرح یہ قوت مدبرہ
بدن مزید اہمیت کی حامل ہو گئی۔

مغربی معاشرے نے قانون قدرت کے فطری
طریقوں اور معاشرتی اصولوں سے منحرف ہو کر ایڈس
(AIDS) جیسے مہلک مرض کو اپنے سر تھوپ لیا جو کہ
قوت مدبرہ بدن کو نہ صرف یہ کہ کمزور کرتا ہے بلکہ
آہستہ آہستہ اس کو ختم کر دیتا ہے اور انسان کی ہلاکت
مقدر بن جاتی ہے۔

سائنسات کے چھپے ہوئے رازوں کو افشاء
کرنا اور ان کو انسانی معاشرہ کے لیے مفید بنانا بھی یا

صدی کی سائنس کا بہت بڑا کمال ہے اور آدمیت پر احسان بھی۔

کیمیاوی دوا سازی اور اینٹی بایوٹکس کا وجود اسی کا ایک حصہ ہے لیکن اس کے باوجود فطری اصولوں سے بغاوت حدود سے تجاوز کیمیاوی دواؤں اور اینٹی بایوٹکس کا بے تحاشہ استعمال اس قوت کے لیے خطرہ بن چکے ہیں اور غیر شعوری طور پر مضر اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ ان دواؤں کے خلاف جسم کی قوت مزاحمت مسلسل بڑھ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کل جو دوائیں ۹۵ فیصد موثر تھیں آج صرف ۷۵ یا اس سے کم اپنا اثر رکھتی ہیں اور یہ کچھ عجب نہیں کہ کل ان کا اثر ۵۰ فی صد ہو جائے گا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ آج کی کیمیاوی دوائیں کل ہمارے لیے سم قاتل ثابت ہو سکتی ہیں۔ آج کا انسان خوب سے خوب تر کی تلاش میں ان راہوں پر چل پڑا ہے جو پرخطر ہیں اس بات کو وہ جانتا ہے پھر بھی اس پر چلنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔

یہ قوت مدافعت ایک قدرتی تحفہ ہے جو فطرت کی جانب سے انسانوں کو ودیعت کی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فطری طریقوں اور قدرتی دواؤں کو اپنا کر اس کی حفاظت زیادہ کی جا سکتی ہے۔ یونانی طب جو کہ دوسرے فن طب کے مقابلے میں فطری اصولوں سے زیادہ قریب ہے اور قدرتی دواؤں پر مشتمل ہے، اس کی حفاظت میں ایک اہم رول ادا کر سکتا ہے۔

## حوالے


۱ے علامہ کبیر الدین۔ ارمغان۔ ص ۱۵۔ دفتر المسیح نور الامراء، حیدر آباد ۱۹۵۴ء

۲ے حکیم محمد کبیر الدین۔ رسالہ جراثیم اور طبیعت۔ ص ۱۵۔ دفتر المسیح نور الامراء حیدر آباد، ۱۹۵۲ء

۳ے حکیم محمد کبیر الدین۔ ارمغان ص ۱۵۔ دفتر المسیح نور الامراء حیدر آباد، ۱۹۵۴ء

۴ے ابو ولید محمد ابن رشد کتاب الکلیات۔ ص ۴۰۴۔ اردو ترجمہ۔ سی۔سی۔آر۔یو۔ ایم۔ ۱۹۸۰ء

۵ے رسالہ تجدید طب ص ۱۱۔ شعبۂ کلیات۔ اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء

۶ے ابو علی ابن سینا۔ حمیات القانون۔ بتصحیح محمد اشرف۔ ص ۵۔ مطبع ثمر ہند لکھنؤ ۱۲۹۶ھ

۷ے ایضاً

۸ے ابو ولید محمد ابن رشد۔ کتاب الکلیات۔ ص ۴۰۴۔ اردو ترجمہ۔ سی سی آر یو ایم۔ ۱۹۸۰ء

۹ے ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ۔ مناعت۔ ص ۳۔ اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

# سائنس کی اہم ایجادات

# اور

# ایشیائی ممالک

○ عرفان احمد

آج جس دور میں ہم رہ رہے ہیں وہ اپنی اہم سائنسی دریافتوں کی وجہ سے سائنس کا دور کہلاتا ہے آج تمام شعبہ ہائے زندگی پر سائنس کی بالادستی ہے۔ بقول پنڈت جواہر لال نہرو:

"زندگی کی جملہ سمتوں اور شعبوں میں سائنس نے انقلاب برپا کر دیا ہے۔ مستقبل اب سائنس کے ہاتھوں میں ہے اور ان کے جو سائنس کے دوست ہیں۔"

سائنس کہتے ہیں مناظر قدرت اور مختلف قسم کی توانائیوں کی خصوصیات کو سمجھنے کی کوشش کرنے کو۔ سائنس جب روزمرہ کی ضروریات میں لائی جاتی ہے تو ٹکنالوجی کہلاتی ہے۔ موجودہ دور کی سائنس اور ٹکنالوجی کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ بنیادی سائنس جیسے فزکس، کیمسٹری، ریاضی بایولوجی اور میڈیکل سائنس۔

۲۔ اطلاقی سائنس: جیسے زراعت، صحت عامہ، توانائی، ماحولیات اور ارضی سائنس۔

۳۔ روایتی ٹکنالوجی جیسے فولاد اور دوسری دھاتوں کی صنعتیں، کپاس، چمڑے وغیرہ سے متعلق صنعتیں پٹرولیم کی صنعتیں، پاور کی پیداوار۔

۴۔ اعلیٰ ٹکنالوجی جیسے الکٹرانکس، فوٹانکس، خلائی سائنس اور بایو ٹکنالوجی۔

اس ضمن میں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ آج کے اس دور میں جب کہ سائنس ہر میدان میں آگے بڑھ رہی ہے مندرجہ بالا سائنس اور ٹکنالوجی کی قسموں کے درمیان فرق کی حتمی لکیر ہم نہیں کھینچ سکتے۔ مثال کے طور پر بایوٹکنالوجی کے میدان میں فزکس، کیمسٹری، بایولوجی وغیرہ میں آج اعلیٰ سطح کے تربیت یافتہ سائنس داں کام کر رہے ہیں۔ اس لیے آج مختلف اقسام کی سائنس کی سرحدیں ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی ہیں۔ سر جارج پورٹر کا یہ خیال بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ آج سائنس صرف دو طرح کی ہے۔ ایک وہ جس کا اطلاق ہو چکا ہے اور دوسری وہ جس کا اطلاق ہونا ابھی باقی ہے۔

اب ذرا سائنسی لحاظ سے ترقی پذیر ایشیائی ممالک

---

○ لیکچرر شعبہ طبیعات، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ۔ یو۔پی۔

ہم ایک نظر ڈالیں۔ بھارت، چین، جاپان، اسرائیل اور روس کو چھوڑ کر جو سائنسی لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک ہیں بقیہ ایشیائی ممالک کو ہم تین زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے زمرے میں پاکستان، بنگلہ دیش، کوریا، سنگاپور، ملیشیا اور ترکی آتے ہیں جہاں اعلیٰ معیار کے مراکز کھولے جا رہے ہیں۔ ان مراکز میں سائنس داں اپنے طور پر تحقیق کر رہے ہیں۔ دوسرے زمرے میں ایران، عراق، اردن، لبنان مشرق وسطیٰ میں اور سری لنکا، فلپائن، انڈونیشیا، تھائی لینڈ اور ویت نام جنوب مشرقی ایشیا میں آتے ہیں۔ ان میں انفرادی طور پر کچھ لوگ اچھا خاصا کام کر رہے ہیں۔ تیسرا زمرہ ان ممالک کا ہے جو غربت لائن کے نیچے ہیں۔ ان میں بعض غیر معمولی ذہین افراد ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں یعنی "سائنس کی اہم ایجادات اور ایشیائی ممالک"۔ یوں تو حیرت انگیز ایجادات کا سلسلہ بہت قدیم ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ہر نئی ایجاد اول اول حیرت انگیز طور پر جلوہ گر ہوتی ہے لیکن وقت گزرنے پر عمومی حیثیت اختیار کر لیتی ہے لیکن جن اہم ایجادات کا تذکرہ ہم یہاں کرنے جا رہے ہیں وہ اس قدر انقلاب آفرینیوں کی حامل ہیں کہ کئی عشروں پر محیط عمریں گزار لینے کے باوجود ابھی تک ارتقا کی حیرت انگیز صلاحیتوں کی حامل ہیں۔ چونکہ ولیم ہیوئیویل (William Whewell) کے بقول سائنس کا انتہائی نصب العین طبیعات ہی میں ہے۔ اس لیے بیشتر مثالیں ہم طبیعات ہی سے دیں گے۔

## ۱۔ الکٹرانکس، مائیکرو الیکٹرانکس اور کمپیوٹر:

آج الکٹرانکس ہماری معاشرت میں داخل ہو کر ہماری ترقی اور تعمیر کی ضامن بن چکی ہے۔ اس صدی کی آخری چار دہائیاں الکٹرانکس کی ترقی کے لیے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ الکٹرانکس کی سب سے اہم دریافت کمپیوٹر ہے جو آج زندگی کے مختلف شعبوں میں کامیابی سے داخل ہو گیا ہے۔ پچھلے دس سالوں میں کمپیوٹر انتہائی پاپولر ہوا ہے۔ اس کی وجہ ہے مائیکرو الکٹرانکس کی ترقی۔ یہ الکٹرانکس کی وہ شاخ ہے جس کے ذریعے الکٹرانکس کے سامان کی چھوٹی سے چھوٹی سائز کرنے کے متعلق معلومات حاصل کی جاتی ہے۔ مائیکرو الکٹرانکس کی وجہ سے اب ڈاک کے ٹکٹ جتنے سیلیکان چپ (Silicon Chips) پر کئی ہزار سرکٹس (Circuits) آسانی سے چڑھائے جاتے ہیں۔ اس میدان کی سب سے اہم دریافت مائیکرو پروسیسر (Micro-processors) کی چپ ہے جس کے اندر کمپیوٹر کی طرح کام کرنے کی صلاحیت ہے۔ مائیکرو پروسیسر کی دریافت کی وجہ سے چھوٹے اور ذاتی کمپیوٹر کم قیمت پر ملنے لگے ہیں۔

جاپان آج مائیکرو الکٹرانکس کے میدان میں بادشاہ ہے۔ ٹیلی ویژن کے کام میں جاپان صرف ایشیا میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے سبھی ممالک پر بازی لے گیا ہے۔ چین نے قومی سطح پر الکٹرانکس کا فن اس کے آخری مرحلوں تک حاصل کیا ہے۔ بھارت بھی الکٹرانکس کے میدان میں خاصی کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ سیمی کنڈکٹر کامپلکس (Semi-Conductor-Complex) نامی کارخانہ چنڈی گڑھ میں جدید ترین مائیکرو پروسیسر بنانے کے لیے کھولا گیا ہے۔

## ۲۔ سپر کنڈکٹرس اور منظری دھاگے

سپر کنڈکٹرس کی دریافت نے آج سائنس کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ سائنس دانوں

نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ایبسولوٹ زیرو (Absolute Zero) (پانی کے نقطۂ انجماد سے 273°C کم) کے نزدیک کچھ میٹلس اور میٹلس آکسائڈ (Metals and Metal oxides) میں بجلی کی قوت مدافعت بالکل صفر ہو جاتی ہے اور وہ اِن میں بغیر کسی رکاوٹ کے گذر سکتی ہے۔ ١٩٨٦ء تک کمرے کے درجۂ حرارت پر سپر کنڈکٹرس تیار نہیں کیے جا سکے تھے۔ ١٩٨٧ء میں جاپان نے یہ انکشاف کیا کہ ان کے پاس ایسے سپر کنڈکٹرز ہیں جو 14° پر سپر کنڈکٹیوٹی کی خصوصیت رکھتے ہیں۔ مارچ ١٩٨٧ء میں نیشنل فزیکل لیبارٹری دہلی (National Physical Laboratory Delhi) کے سائنس دانوں نے کچھ ایسے نمونے بنانے میں کامیابی حاصل کرلی جو 27°C پر سپر کنڈکٹرس کی خصوصیت رکھتے تھے۔ سپر کنڈکٹرس کو بجلی کے تار کی شکل میں بنا کر ان میں بجلی بلا کسی نقصان کے ہزاروں کلومیٹر دور تک بھیجی جا سکتی ہیں۔ ان کا استعمال کینسر جیسے بھیانک مرض اور کمپیوٹر میں کیا جانے لگا ہے۔ گویا سپر کنڈکٹرس کی تحقیق سے الیکٹرانکس کے میدان میں اب ایک نئے اور تابناک عہد کا آغاز ہو رہا ہے۔

منظری دھاگے (Optical fibres) شیشے کے کھینچے ہوئے کئی کئی کلومیٹر لمبے مہین تار ہیں جو روشنی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اسی طرح لے جاتے ہیں جیسے تانبے کے تار بجلی کی رو کو۔ ایشیائی ممالک میں جاپان اس میدان میں سب سے آگے ہے۔ بھارت میں بھی یہ کام خاصا آگے بڑھ چکا ہے۔ مستقبل قریب کے مواصلات (Communications) ان منظری دھاگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ان کی مدد سے بہت جلد اعلیٰ قسم کے ٹیلی ویژن سیٹ، ویڈیو فون اور اس قسم کے دوسرے بہت سے آلات ہمارے گھروں کی زینت بن سکیں گے۔

٣- خلائی تحقیق، ترسیلات اور انٹارکٹکا

بیسویں صدی میں سب سے زیادہ حیران کن پیش رفتیں خلائی پرواز اور مصنوعی سیاروں کے میدانوں میں ہوئی ہیں۔ اس میدان میں روس سب سے آگے ہے۔ بھارت نے اپنی خلائی تحقیق کا آغاز اپریل ١٩٧٥ء میں "آریہ بھٹ" سیارے سے کیا پھر SLV راکٹ سری ہری کوٹا سے چھوڑ کر بھارت نے ایک تاریخ بنائی۔ اس وقت پاور بلاک (Power Block) کے باہر بھارت پہلا ملک ہوا جس نے سیارے داغنے کی صلاحیت حاصل کی۔ پھر بھارت نے سیارہ ارتباط (Communication Satellites) کے لیے کام شروع کیا اور اس میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ابھی حال ہی میں بھارت نے ملکی قدرتی نظام کی تنظیم کے لیے IRS سیریز شروع کی ہے IRS-1A ١٧ مارچ ١٩٨٨ء کو اور IRS-1B ٢٨ اگست ١٩٩١ء کو خلاء میں داخل کیے گئے IRS-1B خلاء میں چھوڑ کر سولہ سال کے اندر بھارت نے بارہویں کامیابی حاصل کی۔

آج دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی انٹارکٹکا تک پہنچنے کی ایک دوڑ سی لگی ہوئی ہے۔ بھارت نے بھی ٩ جنوری ١٩٨٢ء کو قطب جنوبی کے برفیلے ساحل پر پہنچ کر عظیم الشان کامیابی حاصل کرلی ہے۔ اس کامیابی کے بعد بھارت "انٹارکٹکا کلب" کا ممبر بن گیا ہے اور اس میدان میں ایشیا میں جاپان کے بعد بھارت دوسرے نمبر پر ہے اور اس کا مستقبل خاصا روشن ہے۔

٤- نیوکلیائی تجربات اور توانائی:

پنڈت جواہر لال نہرو کہا کرتے تھے:

"کسی ملک کی ترقی کا اندازہ ہم صرف اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ وہ ملک کتنی توانائی پیدا کرتا ہے یا کتنی استعمال کرتا ہے۔"

توانائی خصوصاً فیوژن فزکس (Fusion Physics) ر تھرمو نیوکلیئر انرجی (Thermo-Nuclear energy) ے میدان میں چین، روس اور جاپان خصوصی اہمیت کھتے ہیں۔ بھارت نے ایٹمی توانائی کی تحقیق، تربیت رکام کاج میں جس لگن اور محنت کا مظاہرہ کیا ہے وہ ی ضرورت کے عین مطابق ہے۔ بھارت دنیا کا وہ ٹا ملک ہے جس نے نیوکلیائی تجربات میں مہارت اصل کی اور اس کے پرامن استعمال میں کامیاب وا۔ چین نے حال ہی میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ جوہری ید حسن ضرورت مند ممالک کو درآمد کرے گا۔ چین نے نیوکلیائی فضلہ (Nuclear waste) کو دوبارہ ستعمال میں لانے کا طریقہ بھی دریافت کر لیا ہے۔ ایک قت جب امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں فیوژن فزکس (Fusion Physics) میں ریسرچ کا رجحان بالکل تم ہو رہا تھا یہ جاپان ہی تھا جس نے اس میدان میں لچسپی رکھی۔ آج ہم سب کو بخوبی علم ہے کہ نسل انسانی کے لیے فیوژن فزکس کی کتنی اہمیت ہے۔

۔ بائیو ٹکنالوجی، لیزر، فوٹانکس، کینسر، ایڈس۔

موجودہ دور میں ہماری بڑھتی ہوئی ضروریات نے ایک بالکل نئی قسم کی ٹکنالوجی کو فروغ دیا ہے اور وہ ہے بائیو ٹکنالوجی۔ اس میں بہت ہی چھوٹے چھوٹے ایک یا چند خلیے یا جراثیم جن کو حیاتیاتی اجزا کہا جاتا ہے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ ان سے ہیضہ، ملیریا ٹائیفائڈ، ٹی بی جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں جن کا علاج بھی ان حیاتیاتی اجزا سے تیار کی گئی دواؤں سے ہوتا ہے کینسر اور دوسری وائرس بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لیے ان حیاتیاتی اجزا کو انسانی جسم کے جلدی خلیات سے تیار کیا جاتا ہے۔ تجربہ گاہوں میں ٹشو کلچر Tissue culture کے طریقوں سے ان حیاتیاتی اجزا کو اُگا کر ان سے انٹرفیران (Interferon) نکالا جاتا ہے ابھی تک دنیا میں اسرائیل ہی سب سے زیادہ انٹرفیران پیدا کر رہا ہے۔ پودوں سے انٹرفیران حاصل کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ بمقابلہ انسانی انٹرفیران کے زیادہ کارگر ثابت ہوں گے۔ چونکہ بائیو ٹکنالوجی کے ذریعے ہماری زندگی کا بیشتر حصہ پورا ہوتا ہے۔ اس لیے امید ہے کہ اس ٹکنالوجی سے ہم مستقبل میں پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔

لیزر شعاعوں کی دریافت موجودہ دور کا ایک انتہائی اہم سائنسی کرشمہ سمجھا جاتا ہے۔ ان شعاعوں کو سرجری میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ لیزر سرجری میں نہ تو تکلیف ہوتی ہے اور نہ خون ہی نکلتا ہے۔

آج فوٹانکس (Photonics) سائنس کی ایک نئی شاخ کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئی ہے یہ سائنس کی وہ شاخ ہے جس میں روشنی کو روشنی ہی سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ جہاں فوٹان (Photons) ایک پیغام رساں کے طور پر کام کرتے ہیں۔ جس طرح الیکٹرانکس کے میدان میں انقلاب لانے کا کام ٹرانزسٹر نے کیا ہے آج وہی کام فوٹانکس کے ابھرتے میدان میں لیزر کر رہے ہیں۔ لیزر اور فوٹانکس پر ہو رہی تحقیقات اس بات کی طرف واضح اشارہ کر رہی ہیں کہ آنے والی اکیسویں صدی فوٹانکس صدی کے نام سے جانی جائے گی جیسے ختم ہونے والی یہ بیسویں صدی الکٹرانکس کی صدی رہی ہے۔

نیوکلیر جنگ کے خوف اور دنیا کے قدرتی ماحول کی تباہی کے دو خطروں کے علاوہ ایڈیس ایک تیسرا عالمی خطرہ چیلنج بن کر آج دنیا کے سامنے آیا ہے جس سے نسل آدم کا مستقبل خطرے میں ہے۔ ایڈس یعنی ایمینو ڈیفیشینسی سنڈروم (Immuno Defficiency Syndrome) HTLV III نامی وائرس سے پھیلتا ہے۔ اس کی وجہ سے کسی بھی بیماری کی مدافعت کی صلاحیت مریض میں باقی نہیں رہتی۔ اس کے لیے اب تک کوئی ٹیکہ، ویکسین وغیرہ ایجاد نہیں ہو سکی ہے ابھی حال ہی میں امریکہ، کناڈا، بھارت، آسٹریلیا اور جرمنی کے ایک بین الاقوامی ڈاکٹروں کے گروپ نے ایک اجلاس میں بیان دیا ہے کہ اس خوفناک بیماری کا صحیح علاج آیورویدمیں مل سکتا ہے اور ہمیں اس کے اثر پر محکم یقین ہے۔

۶۔ بنیادی سائنس، پروفیسر سلام کا نظریۂ وحدت، چندر شیکھر کا ستاروں کے ریاضیاتی عمل کا نظریہ

ایک ملک کی اعلیٰ سطح کی تعمیر کے لیے بنیادی سائنس میں تحقیق ایک اہم ضرورت ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ آج کی سائنس ہی کل کی ٹکنالوجی ہے۔ اس ضمن میں دو مثالیں حاضر ہیں۔ پہلی مثال مشہور ہندوستانی ریاضی داں رامانوجن کی ہے جن کا انتقال ۱۹۲۰ء میں ہوا۔ رامانوجن کا زیادہ تر کام نمبر تھیوری سے متعلق ہے جو ریاضی کی ایک ایسی شاخ ہے جس میں اعداد و شمار سے متعلق قوانین اور مساواتوں پر غور کیا جاتا ہے۔ رامانوجن نے بیسویں صدی کے شروع میں جو نظریات پیش کیے تھے ان کو سمجھنے کی کوشش اب کی جا رہی ہے جب کہ بیسویں صدی خاتمے کے قریب ہے۔ ان نظریات سے آج کل کمپیوٹر سائنس اور طبیعات کی جدید کامیابیاں حاصل کی جا رہی ہیں۔

دوسری مثال پازیٹران انیہالیشن (Positron - Annihilation) کی ہے جو آج الکٹرانکس کے میدان میں اور گاما شعاعوں (Gamma-rays) کے مطالعہ اور استعمال میں مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔ نیز اس سے دماغی ٹیومر اور ٹوموگرافی میں تہلکہ خیز بہتری ہو رہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ آج کل کی جدید صنعتیں صرف جدید سائنس ہی کی بنیاد پر قائم رہ سکتی ہیں۔

اب ہم دو مشہور نظریے یعنی پروفیسر عبدالسلام کا قوتوں کے عظیم وحدت کا نظریہ اور سبرامنیم چندر شیکھر کا ستاروں کے ریاضیاتی طرز عمل سے متعلق نظریے کا ذکر مختصراً کریں گے۔

عظیم پاکستانی سائنس داں پروفیسر عبدالسلام کا برق مقناطیسی (Electro magnetic) اور ضعیف نیوکلیر (Electro-weak) قوتوں کی وحدت کا نظریہ جس پر ان کو ۱۹۷۹ء کا نوبل انعام دیا گیا واقعی نظری طبیعات (Theoretical Physics) کے میدان بنیادی ذرات (Fundamental - Particles) پر اعلیٰ ترین تحقیق کا ایک نمونہ ہے اس نظریے نے نیا نیوٹرل ویکٹر بوسان (New Neutral Vector boson) ذرہ ($Z^0$) اور ڈبلیو پلس ومائنس ($W^\pm$) ذرات کے متعلق جو پیشن گوئیاں کی تھیں۔ ۱۹۸۳ء میں جنیوا کی سرن (Cern) تجربہ گاہ میں ان ذرّات کی تجرباتی تصدیق ہو چکی ہے اس ضمن میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اب پروفیسر عبدالسلام چار مختلف و متضاد قوتوں یعنی تجاذب (Gravitation) برق مقناطیسی Electromagnetic زبردست (Weak) اور زبردست (Strong) کے درمیان سلسلۂ وحدت تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ان کے ساتھ مشہور ہندوستانی سائنس داں جوگیش پاٹی

بھی شامل ہیں۔ یہ نظریہ "عظیم وحدت کا نظریہ" یا "پائی۔ سلام تھیوری" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اگر اسے تجرباتی کسوٹی پر کھرا پایا گیا تو طبیعیات میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو جائے گا اور ایک بار پھر پروفیسر سلام کو نوبل انعام سے نوازا جائے گا جن کے ساتھ جوگیش پائی بھی شریک ہوں گے۔ اگرچہ اس نظریے پر کچھ لوگوں نے تنقیدیں بھی کی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس نظریہ کا کوئی تجرباتی ثبوت موجود نہیں ہے اور نہ ممکن ہے لیکن اس نظریے کو ریاضی کی تائید حاصل ہے نیز اس نظریے نے کئی الجھنیں واقعی سلجھا دی ہیں۔

پروفیسر سبرامنیم چندر شیکھر کا نظریہ ستاروں کے ریاضیاتی طرز عمل سے متعلق ہے۔ یہ نظریہ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں دیا تھا لیکن تجرباتی ثبوت ملنے کے بعد انھیں ۱۹۸۳ء میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ اس نظریے کے مطابق ستارے ہمیشہ یوں ہی چمکتے رہیں گے اور ایک نہ ایک دن ان کی موت واقع ہو جائے گی اور پھر یہ چمک باقی نہ رہے گی۔ ستاروں کی چمک ان میں موجود کیمیائی عنصر ہائیڈروجن گیس میں تبدیلیوں کی وجہ سے ہوتی ہے جب ستاروں میں یہ گیس ختم ہونے لگتی ہے اس وقت اس میں موجود دوسرے عناصر اس کی جگہ توانائی کے ذریعے بنتے ہیں لیکن اس طرح ستاروں میں دو تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ ستاروں میں چمک کم ہونے لگتی ہے۔ دوسری ستارے کے مرکزی حصے کا وزن بڑھنے لگتا ہے اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی گیسیں، ہلکے عناصر، مرکبات کی پرتیں پھیلنے لگتی ہیں۔ ستارے کا مرکزی حصہ سکڑنے لگتا ہے اور وہ اپنا توازن کھونے لگتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں آس پاس گھومتے ہوئے سیاروں کو اپنی طرف کھینچنے لگتی ہیں۔ ایک ایک کرکے یہ سیارے اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور آخر کار اسی میں سما جاتے ہیں۔ اس نظریے نے سفید بونے ستارے (White Dwarf Stars) نیوٹران ستارے، بلیک ہول (Black hole) اور سپرنووا (Super Nova) وغیرہ کو سمجھنے میں کافی مدد کی ہے۔

مضمون کے اخیر میں چند باتیں ایشیائی ممالک کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ جارج سارٹن (George Sarton) نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "ہسٹری آف سائنس" میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ سنہ [illegible]ء سے سنہ ۱۳۵۰ء تک ایشیائی ممالک خصوصاً چین، عرب ترکستان، افغانستان اور ایران نے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں دنیا کی رہنمائی کی تھی۔ اس کے بعد ان ممالک میں سائنس کا زوال ہوگیا۔ ہم اس مختصر سے مضمون میں اس پر بحث نہیں کریں گے کہ یہ زوال کیوں اور کیسے ہوا۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ایشیائی ممالک سائنس اور ٹکنالوجی کو چھوڑ کر غریب بنے اور اب اس کو ہی پکڑ کر غربت کی گہرائیوں سے باہر آرہے ہیں۔

سائنسی علوم کی اہمیت کا احساس سب سے پہلے جاپان کو ہوا۔ وہاں کے شہنشاہ میجی نے سنہ ۱۸۶۸ء میں نئے آئین کے تحت پانچ حلف اٹھائے تھے جن میں ایک یہ بھی تھا:

> "جاپان کی عظمت اور تحفظ کے لیے علم کو دنیا کے کونے کونے اور ہر ممکن طریقے سے حاصل کیا جائے گا۔"

اس احساس کے پیدا ہونے سے جو فرق پڑا آج وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ یہی حال روس اور چین کا بھی ہوا۔

روس میں سوویت اکیڈمی آف سائنس سے کہا گیا تھا کہ اپنے ممبروں کی تعداد بڑھائیں اور ان میں یہ حوصلہ پیدا کریں کہ ہر سائنسی میدان میں دوسروں سے آگے بڑھنا ہے۔ آج یہ اکیڈمی دس لاکھ سے زائد ممبروں پر مشتمل ایک خود مختار جماعت ہے۔ ۱۹۴۹ء میں چین میں ان کے سارے ریسرچ اداروں میں مجموعی طور پر کل پانچ سو سائنس داں تھے، آج کل یہ تعداد بڑھ کر ساڑھے تین لاکھ سے زیادہ ہو گئی ہے۔ چین نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ اس صدی کے اخیر تک وہ برطانیہ سے خلائی سائنس، جینیٹکس، مائکرو الکٹرانکس، ہائی انرجی فزکس، نیوٹرن فزکس اور تھرمونیوکلیر انرجی وغیرہ کے میدانوں میں آگے بڑھ جائیں گے۔ اسرائیل کی قومی کونسل برائے تحقیق و فروغ نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ۱۹۹۵ء تک انھیں چھیاسی ہزار سات سو علمی اعتبار سے تربیت یافتہ لوگوں کی ضرورت ہوگی بمقابلہ ۱۹۷۴ء کے جب ایسے لوگوں کی تعداد صرف چونتیس ہزار آٹھ سو تھی۔ یعنی ڈیڑھ سو فی صدی اضافہ۔ نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ اسرائیل کا شمار اب دنیا کے بیس ترقی یافتہ ملکوں میں ہونے لگا ہے۔ اسرائیل کی آبادی صرف پانچ ملین ہے لیکن وہ دنیا کا واحد ملک ہے جو اپنی قومی آمدنی کا سب سے زیادہ حصہ ریسرچ اور ٹکنالوجی پر خرچ کرتا ہے۔

## اور اب آخر میں بھارت

آزادی کے بعد ہمارے قومی رہنماؤں اور خاص طور پر پنڈت نہرو نے نئے ہندوستان کی تعمیر سائنس اور ٹکنالوجی کی بنیاد پر رکھی۔ خوش قسمتی سے ہمیں رمن، ساہا، بھابھا، وکرم سارابھائی، بھٹناگر وغیرہ جیسے سائنس داں ملے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہندوستانی سائنس کا دھارا بہت تیزی سے دنیا کے انسانی ترقیات کے سمندر میں مدغم ہو کر نمایاں اور ممتاز ہوتا جا رہا ہے۔ بھارت سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبوں میں متعدد ممالک کے ساتھ مل کر مشترکہ بین الاقوامی کارکردگی اور اشتراک عمل کی راہ پر گامزن ہے۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ اکیسویں صدی میں بھارت ضرور ایسے ممالک کے ہم پلہ ہو جائے گا جو آج سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں سربر آوردہ ہیں۔

"پھر کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔ اس لیے اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔"

[الجاثیہ ۲۳]

# قدرت کے کرشمے

سیّد خالد محمود ○

سائنسی تعلیمات میں دو اقسام زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک وہ قسم جس کے تحت روز بروز نئے نئے تجربات ہوتے ہیں اور اُن کی روشنی میں نئی ایجادات۔ فاؤنٹین پین سے لے کر جدید زمانے کے جدید ترین آلات اس تیزی سے بن رہے ہیں کہ یہ حقیقت ہی ہے کہ آپ کسی جدید ترین آلے کو خرید کر گھر پہنچیں گے تب تک سائنسی دنیا میں اس نوعیت میں مزید تبدیلی آچکی ہوگی۔ یہ تمام تر تجربات اس انسانی دماغ کی مرہونِ منت ہیں جس میں خداوندِ عالم نے روز افزوں غور وفکر کرنے کی صلاحیتوں کے خزانے مقید کر رکھے ہیں۔ اس کے برعکس لاتعداد سائنسی تعلیم کے وہ حصے ہیں جن کا علم ہم کو ایک بار ہو چکا ہے اور اس کو ہم دنیا کی ایک حقیقت مان کر قبول کر چکے ہیں۔ ان ہی بے شمار حقائق کے بارے میں ابتدائی علم حاصل کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مخفی طور پر ایک طاقت کہیں ہے جو ہر لمحہ ہونے والے ان عوامل کو یقیناً کہیں نہ کہیں سے اپنے پوشیدہ دفتر میں کنٹرول کرتی ہے۔

ایک چھوٹی سی مثال لیں۔ ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ جنگل میں ایک حقیر سا خود رو اگنے والا پودا بھی نر اور مادہ مادّوں کے امتزاج سے پیدا ہو سکتا ہے بیشتر پودے ایسے ہیں جن میں نر مادہ پھول کے اندر سے نکل کر فضا میں آتا ہے اور پھر فضا میں کچھ دیر رہنے کے بعد اپنی ہی قسم کے پودے میں داخل ہو کر مادہ عضو کے اندر جا کر مادہ مادّے سے مل جاتا ہے۔ اس طرح مل جانا ہے کہ اب دوبارہ دونوں کو الگ کرنا دنیا کی کسی سائنسی آلے کی طاقت سے باہر ہے۔ یہ چھوٹی سی مثال جو بظاہر ایک چھوٹا سا عمل لگتا ہے اس حقیقت کی روشنی میں نہایت اہم ہے کہ لق ودق دنیا میں لاتعداد پیڑ پودے ہیں اور ان تمام کے نر مادّے فضا میں بکھرے پڑے ہیں لیکن ایک قسم کا نر مادّہ فضا میں گم ہو جانے کے باوجود اپنی ہی مخصوص قسم کی مادہ مادّے کی آغوش میں جا کر گرتا ہے۔ اتنی سائنسی ترقیات میں یہ تو اب بھی ممکن ہے کہ کسی مشین کا ایک پرزہ انسانی غلطی سے کسی دوسری جگہ فٹ کر دیا جائے لیکن ان خالص جنگلی تعلیم وتربیت سے نابلد، انسانی شکل وصورت سے بہرا اور انسانی دماغ کے مکمل نقدان کے باوجود معمولی سی غلطی کبھی کسی پودے سے سرزد نہیں ہوتی ہے کہ آپ کے باغ میں لگے آلو کے پودے

○ ریڈر، شعبۂ باٹنی، تری بھون یونیورسٹی، نیپال گنج - نیپال -

کا نر مادّہ غلطی سے ٹماٹر کے پیڑ پر جا کر اس کے مادہ مادّے سے اختلاط کرے۔

دوسری مثال لیں۔ سائنس کے طلبا بخوبی واقف ہیں کہ انسانی جسم بے شمار اور نہایت چھوٹے چھوٹے سیلس سے مل کر بنا ہے۔ بغیر کسی آتشی شیشہ لگائے ان سلس کو دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے ایک سیل کے اندر سیل کے سائز سے اور بھی بہت چھوٹا ایک گول گول حصہ ہوتا ہے۔ اس گول حصے کو نیوکلیس کہتے ہیں۔ نیوکلیس کے اندر نہایت مہین تاگے کی طرح گھماؤ دار باریک سا کروموسوم رہتے ہیں۔ ان کروموسوم کی تعداد دنیا جہاں میں ملنے والے تمام جانداروں، جس میں انسان جانور اور پیڑ پودے سب شامل ہیں کہ چھوٹے سے چھوٹے قسم میں متعین رہتی ہے۔ انسانی جسم میں جہاں اُن کی تعداد چھیالیس ہونا طے شدہ ہے اسی طرح معمولی سے بھنگے یا حقیر سے جنگلی پودے کے جسم میں بھی ایک طے شدہ تعداد میں تبدیلی کسی بھی صورت میں دنیا کے وجود میں آنے کے وقت سے لے کر تا دم تحریر کسی بڑے سے بڑے سائنس داں دستیاب نہیں کر سکے ہیں۔

ان باریک تاگوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے اندر معلوم ہے کیا عمل پوشیدہ ہوتا ہے؟ ہر باریک دھاگہ دراصل دو متوازی دھاگوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور یہ دونوں جن کو ہم کروموٹڈ کہتے ہیں اپنے سراپا میں بے شمار ایسے چھوٹے چھوٹے نقطے رکھتے ہیں جن کو ہم جین کہتے ہیں۔ ذرا غور کریں کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ سیلس خود ہی اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ آنکھوں سے ان کو دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ اس سیل کے دسویں حصے کے برابر نیوکلیس، اس کے اندر نہایت باریک کروموسوم، ان کے اندر باریک تر کروموٹڈ اور ان کے بھی اندر ناقابل گمان سائز کے جین لیکن ان میں سے ہر ایک جین یہی نہیں کہ اپنے اندر زندہ و جاندار جسم میں پائے جانے والے کسی ایک کردار کا ذمّہ دار ہوتا ہے بلکہ نر اور مادہ مادّوں کے اختلاط کے وقت دونوں کے کرداروں کو نئے بننے والے جسم میں پہنچانے کا کام بھی سرانجام دیتے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد کرتے چلیں کہ جاندار جسم جن بے شمار سیلس سے مل کر بنا ہے اس قسم کے ایک سیل کی تعمیر دنیا جہان کے بے شمار سائنس داں بھی سر جوڑ کر بیٹھیں تو نہیں کر سکتے ہیں۔ انسانی جسم ہی نہیں معمولی سے پودینے کے پودے کی پتیاں اگر مڑی ہوتی ہیں تو مڑی پتی کا یہ کردار اس پودے کے سیلس کے اندر نہایت اندر کہیں پوشیدہ رہے گا اور نر و مادہ پودینہ کے اختلاط باہمی کے وقت یہ کردار نوزائیدہ پودینے کے جسم میں نمایاں طور پر دکھائی دے گا۔ یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی ایک جسم کا ایک چھوٹا سا کردار نوزائیدہ میں منتقل تو ہو جاتا ہے لیکن نمودار نہیں ہوتا ہے اور نوزائیدہ کے جسم میں محفوظ رہتے ہوئے اس نوزائیدہ کے نر یا مادہ مادّہ کے ذریعے عالم وجود میں آنے والے تیسری پشت کے جسم میں نمودار ہوتا ہے۔ جسم کے اندر معمولی سے نقطہ کی شکل میں پوشیدہ ایک باریک ترین حصہ یہ طے کرتا ہے کہ فلاں انسان کے جسم کا رنگ کالا ہوگا یا سفید، بال بھورے ہوں گے یا کالے، چلنے کا انداز ایسا ہوگا یا ویسا۔ معمولی پودوں میں چھوٹے پھل ہوں گے یا بڑے، ترکاری کا ذائقہ ترش ہوگا یا شیریں اور تو اور ایک چھوٹے سے جاندار بھنگے میں بھی یہ عمل جاری رہتا ہے جب کہ بھنگے کے جسم کے سائز کا اندازہ آپ خود اس حقیقت سے کریں کہ کاغذوں کو نتھی کرنے والی آل پن کے سر پر دس ہزار بھنگے ایک دوسرے پر چڑھائے بغیر رکھے جا سکتے ہیں۔

کرۂ ارض پر پائے جانے والے ان لاتعداد

انسان، جانور، کیڑے مکوڑے، پتنگے، بھنگے، پیڑ پودے، جنگلی و پانی کے چھوٹے سے چھوٹے انواع و اقسام کے جانداروں کی ایک ایک قسم کو منظم طریقے سے ایک مخصوص دستور اور لائحہ عمل میں پروئے رکھنا اس طرح کہ معمولی سا بھنگا بھی کبھی کسی لغزش کا شکار نہ ہو سکے کس انتظام کے تحت ہوتا ہے۔ کس مخفی طاقت کے خوف سے ایک حقیر ترین جاندار اپنے طریق عمل سے انحراف کرنے میں قاصر ہی نہیں ہے۔ آفرینش عالم کے اس پیچ در پیچ اور باریک ترین انتظامیہ کی کلید اس خالق حقیقی کے پاس ہے جس کو رب العالمین کہتے ہیں۔ رب العالمین کے معنٰی ہی یہی ہیں اور پھر جانداروں کی دنیا ابھی صرف زمین پر ہی بسی ہے۔ یہ زمین علم انسانی میں تادم تحریر آنے والے سیاروں میں سے ایک سیارہ ہے۔ باقی ماندہ آٹھ سیاروں پر اور اس کے بعد ان لا تعداد سیاروں پر بھی جس میں سے ایک ایک زمین کے برابر ہے، جانداروں کی دنیا بستی چلی جائے گی اور ان لاتعداد جانداروں کا علم اور ان کی نقل و حرکت پر مکمل اختیار صرف معبودِ حقیقی کو ہی ہے۔ یہ سارے سیارے ایک ایک عالم ہیں ان کے مجموعے کو عالمین کہتے ہیں اور خدا وحدہٗ لاشریک ہی رب العالمین ہے اور ہم ورد کرتے ہیں

الحمد للہ رب العالمین

---

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر میں اس معزز مجمع کے سامنے صفائی سے یہ بات پیش کر دوں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خودغرضیاں، تنگ نظری اور ملک کے مستقبل کا صحیح تصور قایم نہ کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شبہ کا بھی بہت بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کو تمدنی ہستی فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے کو تیار نہیں اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کو ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا وہ ہوگا ہی خود ہندوستان کا تمدن کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔"

ذاکر حسین خاں

خطبۂ صدارت مسافنی و دیا پیٹھ بنارس

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۱۱ شمارہ ۸ (اگست ۹۲ء)

# کثرتِ مال وزر کی ہوس

محمد اسلم صدیقی ○

ایک منظر:

" میں ستمبر ۱۹۲۶ء میں ایک مرتبہ اپنی بیوی کے ساتھ برلن کی زمیں دوز ٹرین پر سوار تھا کہ اچانک میری نظر ایک ایسے آدمی پر پڑی جو میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کوئی خوش حال اور دولتمند تاجر معلوم ہوتا تھا۔ ایک چھوٹا سا خوب صورت بیگ اس کی گود میں رکھا ہوا تھا اور ہیرے کی ایک بڑی انگوٹھی اس کی انگلی میں نظر آرہی تھی۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ یہ دراصل اس خوش حالی اور فارغ البالی کا عکس ہے جو ان دنوں وسط یورپ میں ہر شخص میں دیکھی جاسکتی تھی۔ اس خوش حالی سے پہلے افراطِ زر کے چند سال گزرے تھے جنھوں نے اقتصادی زندگی کو درہم برہم کر دیا تھا اور بدحالی اور بری ہیئت میں رہنا ہی اصول بن گیا تھا لیکن اب لوگوں کی اکثریت اچھا کھاتی اور اچھا پہنتی ہے۔ اس لحاظ سے جو شخص میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا لوگوں سے کچھ مختلف اور نیا نہ تھا لیکن جب اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی مطمئن اور پر مسرت چہرے کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ مجھے بے چین اور غیر مطمئن نظر آیا۔ صرف بے چین ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ غمزدہ اور حرماں نصیب بھی۔ اس کی نظریں کھوئی ہوئی خلا میں گھور رہی تھیں اور اس کے ہونٹ کے دونوں کنارے کسی تکلیف سے بھنچے ہوے تھے۔

### ایک غیر جسمانی تکلیف

اس کے پہلو میں ایک مہذب خاتون بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر بھی بے چینی اور بے اطمینانی کے آثار تھے جیسے کسی ایسی چیز کے متعلق سوچ رہی ہوں جس کے سوچنے سے انھیں تکلیف ہو رہی ہو۔ ایک پھیکی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں

---

○ غازی پور لاج، سرسید نگر، علی گڑھ

پھیلی ہوئی تھی۔ پھر میں نے کمپارٹمنٹ میں اور لوگوں کی طرف نظر دوڑائی اور ان کے چہروں کو نگاہوں سے ٹٹولنے لگا جو بلا استثنا خوش حال نظر آرہے تھے اور خوش پوشاک تھے۔ ہر چہرے میں ایک پوشیدہ اَلم کی جھلک دیکھی۔ اتنی پوشیدہ کہ خود ان کو بھی اس کا احساس نہ ہوگا۔ درحقیقت یہ ایک عجیب بات تھی کہ ایک جگہ پر اتنے بہت سے غمزدہ چہروں کو دیکھنے کا اتفاق مجھے اس سے قبل نہیں ہوا تھا۔ اس بات کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں نے اس کا ذکر اپنی بیوی سے کیا۔ وہ بھی ایک ماہر فن کار اور آرٹسٹ کی طرح تمام لوگوں کے چہروں کو دیکھنے لگی پھر حیرت کے ساتھ میری طرف رخ کر کے کہنے لگی ”آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ سب جہنم کی تکلیف برداشت کر رہے ہوں۔ میں یہ سوچتی ہوں کہ ان پر جو گزر رہی ہے ان کو اس کی خبر بھی ہے یا نہیں؟“

معمہ کا جواب:

جب میں گھر میں آیا تو اتفاقاً میری نظر میز پر پڑی اس پر قرآن کا ایک نسخہ رکھا ہوا تھا جو میرے مطالعے میں رہتا تھا۔ میں اس کو بند کر کے کسی دوسری جگہ رکھنا چاہتا ہی تھا کہ غیر شعوری طور پر اچانک میری نگاہ کھلے ہوئے صفحے پر پڑ گئی۔ اس میں یہ آیت لکھی ہوئی تھی الھٰکم التکاثر (پوری سورہ تکاثر)۔ میں ایک لمحہ کے لیے گم سم سا ہو گیا۔ میرا خیال ہے کتاب (قرآن) میرے ہاتھ میں جنبش میں تھی۔ پھر میں نے اپنی بیوی سے کہا ”دیکھو سنو! کیا یہ اس کا جواب نہیں ہے جو رات کو ہم نے ریل میں دیکھا تھا؟“ ہاں! وہ ایسا قطعی جواب تھا کہ سارے شکوک و شبہات ایک دم ختم ہو گئے آج سے تیرہ سو برس پہلے اس میں بہت وضاحت کے ساتھ ایک ایسی چیز کی پیشین گوئی تھی جو ہمارے اس پیچیدہ اور مشینی دور سے زیادہ واضح طور پر کسی اور دور میں سامنے نہ آئی تھی۔“

[نومسلم فاضل لیوپولڈ اسد۔ طوفان سے ساحل تک۔ ص ۱۸۰ - ۱۸۴]

فاضل لیوپولڈ اسد نے سورہ تکاثر کا ذکر حیرت و استعجاب کے ساتھ کیا ہے۔ اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

[تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ (اسی فکر میں) لبِ گور تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں! عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں! اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمہارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا)۔ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ پھر (سن لو کہ!) تم بالکل یقین کے ساتھ اسے (دوزخ کو) دیکھ لو گے۔ پھر ضرور اس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔“

ان آیات میں لوگوں کو اس دنیا پرستی کے برے انجام سے خبردار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک زیادہ سے زیادہ مال و دولت اور دنیوی

فائدے اور لذتیں اور جاہ و اقتدار حاصل کرنے اور ان میں
ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور انھیں اشیاء
کے حصول پر فخر و کبر کرنے میں منہمک و مشغول رہتے ہیں
اور اسی فکر اور تگ و دو نے ان کو اس درجہ منہمک کر رکھا
ہے کہ انھیں اس سے بالاتر کسی چیز کی طرف توجہ کرنے
کا ہوش ہی نہیں ہے۔ اس انجام پر متنبہ کرنے کے
بعد لوگوں کو یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ نعمتیں جن کو تم یہاں
بے فکری کے ساتھ سمیٹ رہے ہو یہ محض نعمتیں ہی نہیں
ہیں بلکہ تمہاری آزمائش کا سامان بھی ہیں۔ ان میں
سے ہر نعمت کے متعلق تم کو آخرت میں جواب دہی کرنی
ہوگی کہ ان کو تم نے کس طرح برتا اور خرچ کیا۔

حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالیؒ نے فرمایا
"جب کسی (کھاتے پیتے) آدمی کی نبض دیکھتا
ہوں اور وہ کمزور معلوم ہوتی ہے تو میں
سمجھ جاتا ہوں کہ اس کے پاس مال زیادہ
ہے یا مال کی محبت۔ اکثر لوگ ایسے مرض
میں مبتلا ہیں جن کا قرآن میں ذکر کیا
گیا ہے "اے کاش ہم کو ملے جیسا کچھ
ملا ہے قارون کو (دولت) بے شک اس
کی بڑی قسمت
ہے" (قصص ۸)
یعنی اہلِ دولت
پر رشک اور مال
کی کثرت کی تمنا۔
میں نے ایسے بہت
سے لوگوں کا ہارٹ
فیل ہوتے ہوئے
دیکھا ہے اور
جو اس مرض سے

آزاد ہے وہ تندرست اور قوی و توانا
ہے" مثلاً مزدور اور دوسرے محنت
کش لوگ"۔
[صحبتے با اہل دل ص ۱۸۳ مجلس ۱۰۔ مرتبہ
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی]

آج سامان راحت و آسائش کی کوئی کمی نہیں،
بہتات ہے لیکن دل کا چین و سکون میسر نہیں کہ
زیادہ سے زیادہ کی ہوس نے بے چین و بے سکون
کر رکھا ہے۔ معلوم ہوا کہ سامان راحت و آسائش سے
دل کو چین و سکون نصیب نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ جیسا کہ
ارشاد الٰہی ہے:

["جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دلوں
کو اللہ کی یاد سے اطمینان ملتا ہے
جان لو! اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو
اطمینان ہوتا ہے۔"]
[رعد۔ رکوع ۴]

یہ ہے وہ نسخۂ کیمیا جس سے تمام دکھوں سے نجات
ملتی ہے۔

حرص و ہوس کے متعلق ارشاد ربانی ہے:
"اور جو بچا گیا اپنے
جی کو لالچ سے
تو وہی لوگ ہیں
مراد پانے والے۔
[حشر: رکوع ۱
اور یہی بات سورہ تغابن
کے رکوع ۲ میں بھی فرمائی
گئی ہے] یعنی بڑے
کامیاب اور بامراد
ہیں وہ لوگ، جن کو

"ہم نے ابھی سائنس کے انکشافات کا آغاز ہی
کیا ہے اور ابھی سے یہ حال ہے کہ ہماری ہر نئی معلومات
خدا کے وجود پر پہلے سے زیادہ تیزی سے روشنی
ڈالتی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ دنیا کسی انتہائی
صاحب عقل و فراست ہستی نے پیدا کی ہے۔"

مور لیس

لہ کی توفیق دست گیری نے ان کے دل کو لالچ اور
بن و بخل سے محفوظ رکھا۔ لالچی اور بخیل انسان
دوسروں کو پھلتا پھولتا دیکھ کر گھٹتا ہے۔ وہ
دوسروں کے لیے ایثار و قربانی کیا کرے گا۔

امام بخاریؒ اور ابن جریرؒ نے حضرت
ی بن کعبؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول کریم صلی
للہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

"اگر اولاد آدم کے پاس دو وادیاں بھر
کر مال ہو تو وہ تیسری وادی کی تمنا کرے
ابن آدم کا پیٹ مٹی کے سوا کسی چیز
سے نہیں بھر سکتا۔"

مال و زر کی زیادتی و حرص و ہوس اور اس کے
انجام بد کے متعلق ارشاد ربانی اور رسول کریم صلی
اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں انسانوں کو ہوش
میں لانے اور اس سے بچنے کے لیے بہت کچھ
سبق اور سامان عبرت ہے۔

کاش ہم اس سے سبق اور عبرت
حاصل کریں۔

## فطرت سلیم کی خلاف ورزی

"ایک فرد اگر فطرتِ سلیم کی خلاف ورزی کرتا ہے اور
تجربات کو ہمیشہ پس پشت ڈالتا ہے تو اس سے صرف ایک
فرد کو نقصان پہنچے گا لیکن وہی فرد جتنا ممتاز مقام رکھتا ہے
اور اس کو اپنے ساتھیوں اور دوستوں اور معاشرے کا
جتنا اعتماد حاصل ہے اسی قدر اس کو نقصان ہوگا اور قوم و
نسل کا نقصان پوری قوم یا پوری نسل کو محیط ہوگا۔"

سید ابوالحسن علی ندوی

# خداداد صلاحیتیں اور ان کا استعمال

محمد اللہ خان ○

میرے سامنے کچھ مرغی، مرغے چل پھر رہے تھے، دوڑ رہے تھے، دانہ چگ رہے تھے، پانی پی رہے تھے پر پھڑپھڑا رہے تھے، آپس میں لڑ رہے تھے اور مرغے مرغیوں پر جھپٹ رہے تھے۔ اُس وقت میں یہ غور کر رہا تھا کہ وہ مرغی مرغے اپنی سرشت کے مطابق اور تو ہر عمل میں مشغول تھے لیکن قوت پرواز کا عمل مفقود تھا جب کہ مرغی بنیادی طور پر اُڑنے والا جانور ہے۔ چنانچہ جنگلی مرغیاں خوب آزادی سے اُڑتی ہیں لیکن پالتو مرغیاں بڑے سے بڑے خطرے میں بھی بھرپور کوشش کے باوجود پوری طرح نہیں اُڑ سکتیں۔ گھریلو مرغیوں کی طرح گھریلو بطخیں اور پنجروں میں بند رہنے والے پرندے بھی قوت پرواز سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اُن کے برعکس پالتو کبوتر اپنی قوت پرواز پوری طرح استعمال کرنے پر قادر رہتا ہے اور یہ فرق محض اس لیے ہوتا ہے کہ اُن نسلوں کے پالنے کے مقاصد میں فرق ہے۔ مرغیاں اور بطخیں اس لیے پالی جاتی ہیں کہ انھیں اور ان کے انڈوں کو بطور غذا استعمال کیا جائے۔ اُس کے لیے انھیں اُڑانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی جب کہ کبوتر شوقیہ پالے جاتے ہیں اور انھیں خاص اہتمام کے ساتھ اُڑانا اُس شوق کا ایک حصہ ہو[تا] ہے۔ یہاں تک کہ پرانے دور میں کبوتروں کو پیغا[م] رسانی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ مسلسل مشق پرواز کی بنا پر ہی گھریلو کبوتر کی اُڑان جنگلی کبوتر سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ مرغی، بطخ اور کبوتر کے اس جائزے سے ذہن اس حقیقت کی طرف منتقل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو جو قوتیں عطا فرمائی ہیں انھیں یا اُن میں سے کسی ایک کو مسلسل استعمال نہ کیا جائے تو وہ قوت کمزور یا معدوم ہو جاتی ہے۔

دنیا میں جب سے انسان کا وجود ہوا ہے وہ اپنی زندگی کے نظام کو برقرار رکھنے، آگے بڑھا[نے] خود بلند ہونے اور اپنے مدمقابل کو پست کرنے کے لیے انفرادی اور اجتماعی طور پر صحیح یا غلط طریقوں سے جدوجہد کر رہا ہے اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔ چنانچہ اس کشمکش اور مقابلہ آرائی کے ماحول میں کوئی شخص یا گروہ اپنی توانائیوں کو پوری طرح کام میں نہ لاتا رہے تو اُس کی صلاحیتیں مضمحل ہو جاتی ہیں اور تباہی و بربادی ا

---

○ قصبہ سہاور، ضلع ایٹہ۔

کا مقدر بن جاتی ہے۔ دنیا کی تاریخ بھی ہمیں یہی بتاتی
ہے کہ جو افراد اور گروہ اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو عقلمندی
کے ساتھ جب تک استعمال کرتے رہے انھیں عروج
حاصل ہوتا رہا اور جب ان کی جولانیاں سرد پڑ گئیں
تو دوسرے تیز رفتار قافلے انھیں روندتے ہوئے
آگے بڑھ گئے اور وہ گروہ اپنی قسمت کا نوحہ کرتے ہوئے
تڑپتے رہ گئے۔

امت مسلمہ کی بھی یہی تاریخ ہے۔ اُسے
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمان الٰہی

لیس للانسان الا ما سعیٰ

(کوشش کے بغیر انسان کو کچھ نہیں ملتا)

کی روشنی میں مسلسل حرکت و عمل کے ذریعے اپنی تقدیر
بنانے کا حکم دیا ہے۔ ذہنی اور جسمانی کاہلی کو اس کے لیے
سم قاتل بتایا ہے۔ حتی الوسع محنت و مشقت اور بہترین
تدابیر اختیار کیے بغیر تائید غیبی کی امید رکھنے سے منع
فرمایا ہے۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام
کی اشاعت اور غلبہ کے لیے جس درجہ ذہنی اور جسمانی
محنت فرمائی اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے جتنا کام لیا
پوری تاریخ انسانی اس کی مثال پیش کرنے سے
قاصر ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والی
نسلوں پر اس طریق کار پر جس حد تک عمل کیا انھیں انفرادی اور
اجتماعی کامیابیاں حاصل ہوئیں اور ایک وقت تک
انھیں زندگی کے ہر میدان میں رہنمائی کا درجہ حاصل
رہا لیکن جب وہ ذوق عمل اور شوق جستجو سے بیگانہ
ہونے لگے تو اُن کے حالات بدل گئے۔ ان کی قسمت
اُن کے بزرگوں کی بنائی ہوئی شاندار عمارتوں کے
کھنڈرات میں سسکنے لگی۔ یہاں تک کہ مسجد اقصیٰ کی
سرزمین یروشلم بھی یہودی جیسی معتوب قوم کے زیر قدم
آگئی اور آج دنیا کا ایک ایک مسلمان مسجد اقصیٰ کی
بازیابی کے لیے تڑپ تڑپ کر دعائیں مانگ رہا ہے
لیکن اس کا کوئی نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا۔

اب سے چند سو سال پہلے بھی بیت المقدس
غیروں کے قبضے میں پہنچ گیا تھا۔ اُس وقت سلطان
صلاح الدین ایوبیؒ جو ایک گوشہ نشین بزرگ تھے
اپنے حجرے سے نکل کر میدان کارزار میں آگئے اور
امت مسلمہ کو للکارا کہ اب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے
اور تقدیر کا نوحہ کرنے کا وقت نہیں ہے۔ اپنے مضمحل
اعضا اور خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاؤ
تو فتح و کامرانی تمہارے قدم چومے گی۔ چنانچہ ایسا ہی
ہوا اور سرزمین مسجد اقصیٰ پر سبز ہلالی پرچم لہراتا ہوا
نظر آنے لگا۔ پھر صدیوں بعد وہ اس وقت پامال
کیا جا سکا جب کہ عربوں کا اضمحلال اور تن آسانی اپنی
انتہا کو پہنچ گئی اور ان کے لیے عزت و وقار کی زندگی
گزارنے کا کوئی جواز نہ رہا۔

عربوں کے برعکس افغانوں نے روس جیسی
عظیم الشان مملکت کے مقابلے میں جو حیرت انگیز کارنامہ
انجام دیا ہے وہ کوئی تاریخی دستاویز نہیں آنکھوں دیکھا
احوال ہے۔ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو
عزم و استقلال کے ساتھ پوری قوت سے استعمال
کیا تو روس کو اُن کی سرزمین سے پسپا ہونا پڑا۔
یہاں تک کہ اُس کا شیرازہ بکھر گیا۔ اُس کی عالمی حیثیت
ختم ہو گئی اور اب وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے
لیے دنیا کی مالدار قوموں کے دست کرم کا محتاج ہے۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ کا خدائی ضابطہ
بڑے دائروں کی طرح چھوٹے دائروں میں بھی جاری و
ساری رہتا ہے۔ چنانچہ کوئی سیاسی پارٹی، سماجی
انجمن، تعلیمی ادارہ، صنعتی یونٹ، دکان، سمنت یہاں
تک کہ گھریلو نظام بھی اس وقت تک کامیابی سے نہیں

چلایا جا سکتا جب تک کہ اس کے چلانے والے اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو پوری طرح کام میں نہ لائیں۔ جو لوگ آرام و راحت اور تفریحات کی حد سے زیادہ خوگر ہو جاتے ہیں اُن کی صلاحیتوں میں گھن لگ جاتا ہے۔ وہ کوئی کام کرنا بھی چاہیں تو پوری قوت سے نہیں کر پاتے اور چھوٹی چھوٹی رکاوٹوں کے سامنے بھی ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

اسی لیے خدا اور خدا کے رسول نے مسلمانوں کو ہمیشہ جہاد میں مصروف رہنے کا حکم دیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ تم جہاد سے پہلو بچاؤ گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ عرفِ عام میں جہاد کا لفظ صرف قتال کے لیے مستعمل ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس لفظ کو بہت وسیع معنیٰ میں استعمال فرمایا ہے اور ہر اس جدوجہد کو جہاد قرار دیا ہے جس میں کسی شخص یا گروہ کی بھرپور صلاحیتیں صرف ہوں۔ چنانچہ اپنے نفس پر قابو پانے کے لیے جو انتہائی کوشش کی جائے اسے سب سے بہتر جہاد قرار دیا گیا ہے۔ اس کوشش کا مقصود اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہو تو وہ جہاد فی سبیل اللہ کے دائرے میں آجاتی ہے۔

اس جگہ میں اپنے مضمون کو سمیٹتے ہوئے یہ کہنا چاہوں گا کہ امتِ مسلمہ خواب غفلت سے بیدار ہو جائے اور علامہ اقبال کے الفاظ میں ثوابت نہ رہ کر سیارہ بن جائے تو اس کی تاریخ کا رخ بدل جائے گا اور یہ نہ ہو سکا تو تباہی و بربادی کا اندھیرا دن بدن گہرا ہوتا چلا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے ہم سب کو محفوظ فرمائے اور ہمیں اپنے بزرگوں جیسا ذوقِ عمل اور شوقِ جستجو عطا فرمائے۔ آمین

"ہم ایک ایسا سررشتہ تعلیم چاہتے ہیں جس سے تھوڑے ہی نہیں بلکہ بہت سے فائدے اٹھائیں اور اس کے باعث سے تھوڑے لوگ نہیں بلکہ کل قوم مغربی علم و ہنر کو بخوبی تمام حاصل کر سکے۔"

سرسید

# ابن سینا طبیہ کالج

## ایک لالۂ صحرائی

ابوسعد اصلاحی

حکومت کے اعداد وشمار اور معیار کے مطابق اعظم گڑھ اقتصادی، علمی اور صنعتی اعتبار سے پسماندہ ضلع شمار کیا جاتا ہے اسے تسلیم کر لینے کے باوجود بھی یہ ماننے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ تہذیبی اور مردم خیزی کے لحاظ سے یہ خطہ کبھی افلاس کا شکار نہیں رہا۔ بقول علامہ اقبال سہیل ؎

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

شخصیات کے اعتبار سے مولانا فاروق چریاکوٹی علامہ شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا اقبال سہیل، مولانا امین احسن اصلاحی اور خلیل الرحمن اعظمی وغیرہ ایسے نام ہیں جو اپنے میدان اور علمی جولانگاہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عصری و دینی علوم کی ترویج واشاعت کے لیے عالمی پیمانے کے ادارے اپنی اپنی خدمات برسہا برس سے انجام دے رہے ہیں۔ شبلی کالج، مدرسۃ الاصلاح، دار المصنفین اور جامعۃ الفلاح ایسے ادارے ہیں جو ہند اور بیرون ہند اپنے مخصوص تعلیمی مزاج کی بنا پر اپنی الگ شناخت و انفرادیت کے لیے ممتاز ہیں۔ سکار جنوں کا یہ سلسلہ اور دیوانوں کا یہ قافلہ رکا نہیں ہے بلکہ اسلاف کے نقش قدم چومتے ہوئے مسلسل آگے بڑھ رہا ہے اور خطہ کی علمی ضروریات پوری کرنے کے لیے پوری دماغ سوزی اور دلجمعی کے ساتھ قوم کی علمی وتہذیبی اٹھان میں سرگرداں ہے۔

وقت وحالات کے تقاضے کو مد نظر رکھ کر اگر غور کیا جائے تو جو چیز مسلمانوں کو اس وقت بہت زیادہ راس آتی ہے وہ میڈیکل سائنس ہے۔ خاص کر طب پر مسلمانوں کی ایسی گرفت ہے کہ جس کے توسط سے اس بیروزگاری کے دور میں بھی مسلمان میدان زندگی میں اس تعلیم کے حصول کے بعد خاصا سرخرو اور کامیاب نظر آتا ہے۔ اسی بات کو غالباً ابن سینا طبیہ کالج کے بانیوں نے محسوس کیا ہوگا اور پھر اس کے قیام کے لیے ایسے کمربستہ وسنجیدہ ہوئے کہ جوش وخروش، ہمت و لگن اور دیوانگی و فرزانگی کی ایسی مثال کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ قصبہ سرائے میر سے تقریباً دس کلومیٹر شمال میں بنیاپارہ گاؤں سے ملحق ویرانے میں پھول کھلا دینا بغیر محنت ولگن کے ممکن بھی کیسے ہوسکتا تھا۔ چٹیل میدان میں لب جوا دور سے چمکتی ہوئی خوب صورت عمارت صحرا میں پھول کے مانند جھلکتی ہے شاید اسی لیے اسے لالۂ صحرائی کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ اس کالج کے قیام کے

لیے خلوص و نیک نیتی اور مادی وسائل کی فراہمی خام مواد
کے طور پر تو ضرور کام آسکتے تھے اصل ضرورت تھی کسی
ماہر فن سنگ تراش کی جس کا اخلاص و تدبر خاکے میں
رنگ آمیزی کرکے تصویر کو مکمل کرتا۔ بجا طور پر لوگوں کی
نگاہ انتخاب بیک وقت حکیم سید ظل الرحمٰن اور جناب عبدالصمد
مرحوم (سابق منیجر) پر پڑی۔ ایک اگر فن طب کی معروف
شخصیت تھی تو دوسرا بے لوث اخلاص و عمل کا جوگی۔

حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب نے اپنے ہاتھوں
سے کالج کا سنگ بنیاد رکھ کر اس کی فلاح و بہبود اور
ترقی سے آنکھیں نہ بند کرکے ہمہ تن اس کی اٹھان کے
لیے مصروف عمل ہیں۔

حکیم صاحب کی شخصیت کے پہلو بہ پہلو جن
شخصیتوں نے اپنے خون جگر سے اس لالۂ صحرائی کو
مستقل سیراب کرکے اس کی آب و تاب اور جلال و
جمال میں روز افزوں اضافہ کیا ہے ان میں سرفہرست
نام جناب عبدالصمد مرحوم عرف مکھن شیخ (سابق منیجر)
اور حاجی نیاز احمد صاحب (موجودہ منیجر) کا ہے۔

مکھن شیخ کاندھیالیؒ
طرز زندگی کے علم بردار
اپنی انفرادی زندگی کی
شادمانی و کامرانی سے
بے پروا، ملک و ملت
کی تعمیر و ترقی کا غم جاوداں
لیے پیدا ہوئے تھے
اور اسی غم کو زندگی بھر
حرز جاں بنائے ہوئے
جان جان آفریں کے حوالے
کر دی۔

یوں تو وہ بہت ساری فلاحی ورفاہی سوسائٹیوں
کے رکن و ممبر رہے لیکن زندگی کے آخری دور میں ان
کی تمام تر توجہات کا مرکز ابن سینا طبیہ کالج تھا۔ یہ بات
بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مرحوم نے اعظم گڑھ
اور خاص کر اس علاقے کے متمول افراد کے اندر اس کالج
کے توسط سے اشاعت علم و ہنر کا ایک ذوق پیدا کردیا
ایسے چند لوگوں میں سب سے اہم نام مرحوم کے دیرینہ
بلکہ تا دم آخر رفیق جناب حاجی نیاز احمد صاحب کا ہے۔

شیخ مکھن مرحوم اور حاجی صاحب کی رفاقت
کا زمانہ نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔
دونوں ہم پیالہ و ہم مشرب و ہم راز اس وقت بھی رہے
جب دونوں سماج میں ایک ہی سطح پر زندگی کی گاڑی
کھینچ رہے تھے اور اس وقت بھی دونوں کی رفاقت
اور حاجی صاحب کے دوستانہ رویے میں سر مو انحراف
پیدا نہیں ہوا جب کہ قدرت نے حاجی صاحب پر دولت
کا دہانہ کھول دیا۔ یہ حاجی صاحب کے کردار کی بلندی
اور مزاج کا بڑکپن ہے کہ انھوں نے ہمیشہ فرق مراتب
کا لحاظ کیا اور کبھی بھی مرحوم دوست کی دل آزاری نہیں
ہونے دی۔

منتظمہ ابن سینا
طبیہ کالج نے شیخ مکھن
مرحوم کے انتقال کے بعد
ان کی جائز جانشینی کے
لیے انھیں کے ہم نشیں
حاجی نیاز صاحب کو کالج
کا منیجر منتخب کیا۔ اپنے
اس انتخاب پر منتظمہ پوری
طرح مطمئن ہے اس لیے
کہ حاجی صاحب جس جاں سوزی
اور جگر کاوی کے ساتھ کالج کی فلاح و بہبود اور ترقی

"بحری فوج امیر معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ ہی
کے زمانے میں قائم کردی تھی اور اس کو اتنی ترقی
دی تھی کہ اس زمانے میں پانسو جہازوں کے
بیڑے کے ساتھ قبرص پر حملہ کیا تھا۔ خود ان کے
زمانے میں بحری بیڑہ اتنا طاقت ور ہو گیا تھا کہ
بحر روم مسلمانوں کا بازی گاہ بن گیا۔"

مولانا عبدالسلام ندوی

کرنے کوشاں ہیں اس کا بدل ملنا شاید ممکن نہ ہو۔ مادی وسائل کی فراہمی جو ایک نومولود کالج کی سب سے اہم ضرورت ہوتی ہے اس سے حاجی صاحب نے منتظمہ کو تقریباً بے نیاز کر دیا ہے۔ حاجی صاحب کا باطن ان کے ظاہر کی طرح بالکل آئینہ کی مانند صاف و شفاف ہے۔ وہ دیکھنے میں جس قدر وجیہہ و پُر رونق لگتے ہیں کردار و گفتار میں بھی اتنے ہی بھلے ہیں۔

کالج کے تئیں ان کی دردمندی کی ادنیٰ سی مثال ابھی حال ہی کا ان کا بیرون ہند کا سفر ہے۔ کالج کے لیے رقم کی فراہمی مستقل ایک مسئلہ ہے اور اس کام کے لیے کوچۂ رسوائی" میں ٹھوکریں کھانا آسان کام نہیں ہے خاص کر حاجی صاحب جیسے متمول اور صاحب ثروت آدمی کے لیے تو یہ اور بھی مشکل تھا۔ مگر قومی تعمیر کے جذبے اور ملت میں تعلیم کے فروغ کے احساس نے انھیں ایک شمع گداختہ بر کا یہ حوصلہ قائم رہا تو انشاءاللہ ابن سینا طبیہ ترقی کے ابھی اور منازل طے کرے گا۔

کالج کی ایک خوش نصیبی یہ بھی ہے کہ اسے حکیم ارشاد احمد صاحب جیسا پرنسپل ہاتھ آیا ہے۔ پرنسپل صاحب نہ صرف یہ کہ اپنے فرائض منصبی بحسن و خوبی ادا کر رہے ہیں بلکہ کالج کو گزشتہ دنوں بحرانی دور سے نکالنے میں انھوں نے جس کاوش و کوشش کا مظاہرہ کیا ہے اور اس وقت بھی کالج کو ترقی کی "منزل مقصود" تک لے جانے میں وہ جس انتھک محنت سے کام لے رہے ہیں، یقیناً وہ لائق تحسین و قابلِ مبارک باد ہے۔

"قرآن کہتا ہے کہ خدا کی سچائی ایک ہے اور ابتدا سے موجود ہے اور تمام انسانوں اور قوموں کے لیے یکساں طور پر آتی رہی ہے۔ دنیا کا کوئی ملک اور کوئی گوشہ نہیں جہاں خدا کے سچے بندے پیدا نہ ہوئے ہوں اور انھوں نے سچائی کی تعلیم نہ دی ہو لیکن ہمیشہ ایسا ہوا کہ لوگ کچھ دنوں تک اس پر قائم رہے لیکن پھر اپنے خیال اور وہم سے طرح طرح کی نئی اور جھوٹی باتیں نکال کر اس طرح پھیلا دیں کہ خدا کی سچائی انسانی ملاوٹ کے انبار میں گم ہو گئی اب ضرورت تھی کہ سب کو جگانے کے لیے ایک عالم گیر صدا بلند کی جائے یہ اسلام ہے۔"

مولانا آزاد


"میری اصلی پسند!
روح افزا مِلک شیک!"
روح افزا ملک شیک بے حد انتہائی مزے دار اور
تازگی بخش ہے ، اس کے ساتھ یہ صحت افزا بھی ہے۔
جب بھی آپ کا بچہ دودھ پیئے ، اس میں چینی کے بجائے
روح افزا ڈالیے اور دیکھیے ، دودھ کیا سے کیا بن جاتا ہے !
مِلک شیک کے علاوہ دہی کی لسی ، آئس کریم ، فالودہ ،
کسٹرڈ اور نیبو پانی میں بھی ہمیشہ روح افزا ڈالیے !
جڑی بوٹیوں ، زندگی بخش عناصر اور قدرتی وٹامنوں کا نادر مرکب
روح افزا
۸۵ سال سے زیادہ مدت سے سب کا من پسند شربت
ہمدرد

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

# تہذیب الاخلاق

شمارہ ۹-۱۰

جلد ۱۱

ستمبر-اکتوبر ۹۲ء



زر سالانہ :

انڈیا ... RS. 45·00

بیرونی ممالک ... US $ 20.00 ہوائی ڈاک

US$ 8·00 عام ڈاک



ترسیلِ زر کا پتہ :

ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

EDITOR,

TAHZIBUL AKHLAQ &

NISHANT,

ALIGARH MUSLIM

UNIVERSITY,

ALIGARH. 202002.





PHONE : 24827

# مندرجات

---

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد ؛ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق
ایڈ نشانات، اے ایم یو علی گڑھ۔ پریس: اے۔ایم۔یو پریس۔

# اداریہ

دنیا کے گوشے گوشے میں بسے علیگ برادران کو یومِ سر سید مبارک ہو۔ ہر سال سر سید احمد کو یاد کرنے کا مقصد نہ سر سید ڈے ڈنر ہے، نہ برقی قمقموں کی روشنی، نہ مذاکرات نہ جلسے، نہ شور ہائے وہو نہ گانا بجانا۔ ان کو یاد کرتے رہنے کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ قوم کی اپنی اصل اور بنیاد سے روگردانی، علمی پستی، مالی زبوں حالی، کم ہمتی اور حقائق سے چشم پوشی پر غائر نظر ڈالی جائے اور ان مسائل کو حل کرنے کے لیے دامے، درمے، سخنے اور قدمے آمادۂ عمل ہوا جائے۔ اس سلسلے میں اگر ہم نے انفرادی یا اجتماعی طور پر کوئی کام کیا ہے تو اس کا بھی دقت نظری سے تجزیہ کرکے یہ دیکھا جائے کہ ہم اب تک کیا کر چکے ہیں، کس حد تک کامیابی سے دوچار ہوئے ہیں۔ کہاں کہاں ہم کو ناکامی ہوئی ہے اور ہماری ناکامی کے اسباب کیا ہیں اور وہ کون سی تدبیریں کی جا سکتی ہیں جن سے ہماری ناکامیاں، کامیابیوں میں بدل جائیں، قوم کو اپنی اصل اور حقیقی حالت کا احساس ہو اور خواب دیکھنے کی عادت ترک کرکے سنگین حقائق سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کرے اور اللہ کا نام لے کر پیش رفت کی راہوں پر گامزن ہو جائے۔

۱۹۸۲ء میں جب اُس زمانے کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شیخ الجامعہ سید حامد صاحب کی سرکردگی میں بیسویں صدی کے تہذیب الاخلاق کا اجرا ہوا تو اس کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ درج بالا مسائل کی طرف قوم کے دردمندوں کی توجہ مبذول کرائی جائے، عظمت پاستاں کی داستان سنا کر قوم کو اس کی پستی، کم مائگی اور ذہنی غلامی کی واضح و روشن تصویر دکھائی جائے اور اس کو یہ احساس دلایا جائے کہ کسی قوم کے حالات دوسرے افراد نہیں صرف اسی قوم کے افراد بدل سکتے ہیں اور اپنی قوم کو عزت و وقار کا مقام دلا سکتے ہیں۔ سید حامد صاحب کے جانشین سید ہاشم علی صاحب سابق شیخ الجامعہ نے تہذیب الاخلاق

کی اہمیت و افادیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کو یونیورسٹی بجٹ پر لے کر اس کے مالی مسائل کو مدتوں کے لیے حل کر دیا۔ سید ہاشم علی صاحب کے جانشین اور موجودہ وائس چانسلر پروفیسر محمد نسیم فاروقی صاحب بھی اپنے پیش روؤں کی طرح تہذیب الاخلاق کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اور اس بات کے متمنی ہیں کہ تہذیب الاخلاق قومی زندگی میں اپنا مثبت رول ادا کرتا رہے۔

تہذیب الاخلاق کو اس منزل تک لانے میں میرے تین پیش روؤں قاضی معز الدین احمد مرحوم، پروفیسر نور الحسن نقوی اور پروفیسر اسرار احمد کی شب و روز کی دلسوزی جاں کاہی کا بڑا دخل ہے۔

اس سال چونکہ یوم سرسیّد عالمی پیمانے پر منانے کا فیصلہ کیا گیا ہے، اس لیے تہذیب الاخلاق کی مجلس ادارت نے یہ مناسب سمجھا کہ اس موقع پر تہذیب الاخلاق میں گزشتہ دس برسوں میں جو مقالات شایع ہوئے ہیں ان کا ایک انتخاب شایع کیا جائے ہم نے اولین مرحلے میں جن مقالات کا انتخاب کیا تھا ان کو دیکھ کر کاتب صاحب نے اندازہ لگایا کہ وہ سارا مواد لگ بھگ سات سو صفحات میں آئے گا۔ ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہم سات سو صفحات پر مشتمل رسالہ شایع کرنے سے قاصر تھے۔ چار و ناچار ہم کو اپنے آپ کو لگ بھگ دو سو صفحات تک محدود کرنا پڑا اور ہم سے جو کچھ بن پڑا وہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

اس انتخاب کے مضامین عنوان وار شایع کیے جا رہے ہیں، یوم سرسید کی مناسبت سے شروع میں ایک انتخاب ان مقالات کا بھی شریک اشاعت ہے جو سرسید پر تہذیب الاخلاق میں شایع ہو چکے ہیں۔ ہم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ سرسید احمد کے کارناموں کے ہر پہلو پر ایک مضمون ضرور آ جائے۔ اس کے علاوہ اصلاح معاشرہ سائنسی مضامین، شخصیات، دینی مدارس ـــــ مسائل اور امکانات اور جہان دیگر کے عنوانات سے مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان تمام عنوانات پر تہذیب الاخلاق نے بہت سے مضامین شایع کیے ہیں، ہم نے ان میں نسبتاً مختصر مضامین کا انتخاب کر کے ہر گوشے کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ علی گڑھ سے وابستہ شخصیات پر بھی تہذیب الاخلاق نے اتنے مضامین شایع کیے ہیں کہ یکجا کرنے پر بلا مبالغہ وہ نسبتاً ایک ضخیم جلد میں آئیں گے۔ ہم نے اس انتخاب میں ان نسبتاً مختصر مضامین کو جگہ دی ہے جو ایسی شخصیات پر لکھے گئے ہیں جن پر اردو میں کم ہی مضامین لکھے گئے ہیں ـ دینی مدارس

اور ان کے مسائل و امکانات پر بھی تہذیب الاخلاق برابر مضامین شائع کرتا رہا ہے پروفیسر اسرار احمد صاحب کی ادارت میں تو دینی مدارس اور سائنسی تعلیم کے موضوع پر تہذیب الاخلاق اپنا ایک ضخیم نمبر بھی شائع کر چکا ہے چونکہ یہ نمبر بہت مقبول ہوا تھا اور اس کی جلدیں ہندوستان کے گوشے گوشے میں محفوظ ہیں اس لیے ہم نے اس انتخاب میں صرف چند ہی مضامین شامل کرنے پر قناعت کی ہے۔

پُر از معلومات مگر عام فہم سائنسی مضامین کی اشاعت تہذیب الاخلاق کا طرۂ امتیاز رہی ہے گزشتہ دس برسوں میں سائنسی موضوعات پر بھی تہذیب الاخلاق نے بہت سے مضامین شائع کیے ہیں۔ زیر نظر انتخاب میں صفحات کی کمی کی وجہ سے ہم صرف چند مختصر مضامین شائع کر رہے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ تہذیب الاخلاق کا یہ شمارہ علمی و ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا اور اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے گی خدا کرے ہماری یہ سعی، سعیِ مشکور ثابت ہو۔ آمین۔

کبیر احمد جائسی

# مکتوب شیخ الجامعہ

*Prof. M. N. Faruqui*
VICE CHANCELLOR

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH

محترمی پروفیسر کبیر احمد جائسی صاحب　　　　السلام علیکم

مجھے یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ تہذیب الاخلاق یوم سرسید کے موقع پر ایک ضخیم نمبر شایع کر رہا ہے جو اُن مقالوں پر مشتمل ہوگا جو گزشتہ دس برسوں میں تہذیب الاخلاق میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ میرے نزدیک اس طرح کا انتخاب شایع کرنا خود احتسابی ہے اور اسی کے ذریعے یہ بھی معلوم کیا جاسکے گا کہ اب تک تہذیب الاخلاق نے کیا کیا کیا ہے اور کیا کیا کرنا باقی ہے۔

میری رائے میں تہذیب الاخلاق میں تعلیمی مسایل پر کھل کر بحث ہونی چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم وقت اور زمانے کے ساتھ کس حد تک چل سکنے کے قابل ہو سکے ہیں اور کن کن مقامات پر ہم ابھی بہت پیچھے ہیں اور زمانے کا قافلہ تیز رفتاری کے ساتھ بہت آگے جاچکا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ تہذیب الاخلاق میں ایسے عام فہم، دلکش مگر سادہ انداز میں لکھے گئے سائنسی مضامین شایع ہونے چاہییں جو تہذیب الاخلاق کے پڑھنے والوں میں سائنسی فکر و نظر پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ مزید جستجو کے جذبے کو بھی مہمیز کریں۔

تہذیب الاخلاق کو دینی مدارس کے نظام تعلیم، ان کے مسائل اور امکانات پر بھی خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ مسلمان طلبا کی ایک بڑی تعداد انہی دینی مدرسوں سے نکل کر، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آتی ہے اور عصری تعلیم حاصل کرتی ہے۔ ان مدرسوں کے جو بھی مسایل ہوں اُن پر تہذیب الاخلاق میں کھل کر بحث ہونی چاہیے اور اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ مدرسے مزید فعال اور متحرک ہوں۔

جس طرح سرسید احمد رح کے عہد حیات میں ذہنی انقلاب کی ضرورت تھی اُسی طرح ہمارے دور میں بھی ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے۔ تہذیب الاخلاق کو ذہنی انقلاب لانے کے لیے پوری کوشش کرتے رہنا چاہیے اور اس بات پر خاص طور سے زور دینا چاہیے کہ ہماری نئی نسل اپنی اصل اور بنیاد، تاریخ اور تہذیب سے پوری طرح آگاہ ہو تاکہ کوئی بھی ذہنی انقلاب اُس کو اس کی اصل اور بنیاد سے دور نہ کرنے پائے۔ تہذیب الاخلاق کے ذریعے ہم کو یہ بھی کوشش کرنی چاہیے کہ ہماری نئی نسل اپنے دور کے تقاضوں اور ضرورتوں سے پوری طرح واقف رہے اور موجودہ دور کی ضرورتوں کے مطابق اپنے آپ کو خوب سے خوب تر بنانے کے عمل میں سرگرم ہو جائے۔

مجھے امید ہے کہ تہذیب الاخلاق واقعی اور حقیقی دانشوری، روشن خیالی، ذہنی بیداری اور اپنی اصل سے آگاہی کو عام کرنے میں اسی طرح مصروف رہے گا۔

مخلص

محمد نسیم فاروقی

# مکتوب نائب شیخ الجامعہ

Prof. Abul Hasan Siddiqi
PRO-VICE CHANCELLOR

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH

مکرمی پروفیسر کبیر احمد جائسی صاحب

السلام علیکم

مجھے اس اطلاع سے بڑی خوشی ہوئی کہ تہذیب الاخلاق یوم سرسید کے موقع پر ایک خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔ یوں تو ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ اشاعت کی طرف سے ہر سال اکتوبر میں خصوصی نمبر شائع کیا جاتا ہے مگر اس سال کا یہ نمبر سابقہ نمبروں سے مختلف ہوگا اور اس میں ان مضامین کا ایک انتخاب ہوگا جو گزشتہ دس برسوں میں تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے ہیں۔ میرے لیے یہ بات مزید خوشی کی ہے کہ اس طرح ہم کو اپنے ماضی کے کاموں کا جائزہ لینے کا موقع ملے گا اور اس کے ذریعے ہم اپنا آئندہ کا لائحہ عمل بھی مرتب کر سکیں گے۔

تہذیب الاخلاق سرسید احمدؒ کی تعلیمی و اصلاحی تحریک کا نقیب رہا ہے اور اسی کے ذریعے سرسید احمدؒ نے اپنی قوم کو اس کے مسایل اور مصائب سے آگاہ کرایا اور اس کو دعوتِ عمل بھی دی۔ موجودہ تہذیب الاخلاق کا یہ فریضہ ہے کہ وہ بھی اپنی قوم کو اس کی زبوں حالی، پستی، ناعاقبت اندیشی اور تباہ کن جذباتیت سے آگاہ کراتا رہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے سامنے پستی و ذلت سے نکلنے کا کوئی مثبت لائحہ عمل بھی پیش کرتا رہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس نکتہ کو ہمیشہ ذہن میں رکھیں گے اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے وہی کام انجام دینے کی کوشش کریں گے جو سرسید احمد علیہ الرحمہ کا منتہا و مقصود تھا۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ تہذیب الاخلاق کا یہ خاص نمبر ہر طبقہ میں مقبول ہو اور اسی کے ذریعے ہماری قوم کے ہر طبقے میں کچھ نہ کچھ مثبت اقدام کرنے کا جذبہ بیدار ہو۔

والسلام

خیر اندیش

# گوشۂ سرسید

۹ —— ۶۰

# سرسید کے کارنامے

نورالحسن نقوی

سرسید کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سوتوں کو ھوڑا، قوم کا کھویا ہوا اعتماد بحال کیا، اسے جذبۂ فکر و عمل سے شناس کیا اور مختصر یہ کہ اسے ادبار سے نکالا۔ قوموں کو ادبار نکالنا بقول تھیوڈ مارین صرف پیغمبروں کا کام ہے۔ اگر نبوت کار دو عالمؐ پر ختم نہ ہو گئی ہوتی تو کیا عجب کہ سرسیدؒ کا نام بیغمبروں میں شامل ہوتا مگر وہ پیغمبر نہیں انسان تھے اور اکثر قعوں پر اُن سے لغزشیں ہوئیں پھر بھی ان کا کوئی کام نیکی نیک نیتی سے خالی نہ تھا۔[۱]

اقبال کے نزدیک سرسید کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ انھوں نے والے زمانے کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔[۲] بلکہ اصلیت یہ ہے کہ ضی، حال اور استقبال سب اُن کے آگے بے نقاب تھے تاریخ اُن کی گہری نظر تھی۔ انیسویں صدی میں جو کچھ پیش آ رہا تھا اس ہ بغور جائزہ لے رہے تھے۔ اس لیے مستقبل میں رونما نے والے حالات اُن کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکے

سید احمد خاں نے اپنے لڑکپن میں مغل دربار کو بہت یک سے دیکھا تھا۔ مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور اس کی حدود جمنا کنارے سے آگے نہ بڑھتی تھیں مگر دربار کا طراق اکبر و شاہجہاں کے عہد کی یاد تازہ کرتا تھا۔ "شہنشاہ" طرف سے خطابات دیے جاتے تھے، خلعت عطا ہوتے تھے،

شہزادے فاتحے کرتے تھے مگر بادشاہ کو اب بھی زعم تھا کہ وہ ملک ہندوستان کی ساری رعایا کا محافظ ہے، ان کی خبرگیری کرتا ہے اور مکھی مچھر بن کے شہروں شہروں کی خبریں لے آتا ہے۔ یوں کہ حکم کمپنی بہادر کا سہی مگر ملک ابھی بادشاہ کا ہی کہلاتا تھا۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ سید احمد خاں کا بادشاہ دہلی اور کمپنی بہادر دونوں سے قریبی تعلق رہا۔ ان کے نانا کی رسائی ریسیڈنٹ دہلی اور ان کی وساطت سے انگریزی حکام تک تھی۔ انگریز ان پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ سفارت کی اہم خدمت دو بار انھیں سونپ چکے تھے۔[۳] ادھر بادشاہ دہلی سید احمد کے والد کو بھائی متقی کہتا تھا۔[۴] اور وہ بلا روک ٹوک اس کی خلوت میں باریاب ہو سکتے تھے۔ اس طرح انھوں نے دونوں طاقتوں کو جن میں سے ایک دم توڑ رہی تھی اور دوسری عن قریب ملک کے سپید و سیاہ کی مختار ہونے والی تھی، بہت قریب سے دیکھ لیا تھا اور آگے چل کر جب فیصلہ کن قدم اُٹھانے کا وقت آیا تو سید احمد خاں نے گرتی ہوئی دیوار کا سہارا لینے کے بجائے انگریزی قوت پر تکیہ کیا اور کمپنی کی ملازمت قبول کر لی۔ جلد ہی ترقی کر کے وہ صدر امین ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء میں ملازمت کے سلسلے میں وہ بجنور میں مقیم تھے کہ اچانک شورش کی اطلاع ملی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ملک کا بڑا حصہ بغاوت کی لپیٹ میں آگیا۔ مسلمان خاص طور پر تباہ ہوئے۔ یہ حالت دیکھ کر سرسید کا ذہنی سکون درہم برہم ہو گیا۔ اس ہنگامے کی

شروعات تو اس طرح ہوئی تھی کہ ہندو مسلمان دونوں شانہ بشانہ انگریزوں سے نبرد آزما تھے۔ انجام کار برادران وطن نے حکمراں قوم سے مصالحت کرنے میں ہی عافیت دیکھی اور ان کے ہم نوا ہو گئے ۱۸۵۷ء کے "رستاخیز" کے بعد غالب کی دلی میں ہندو تو آباد تھے مگر مسلمان اجڑ گئے تھے اور بلا ٹکٹ ان کا داخلہ شہر میں ممنوع تھا۔[۴۶] انگریز حاکموں کے نزدیک باغی کے معنی تھے مسلمان اور مسلمان کے معنی تھے باغی۔

سر سید نے اس ہنگامے میں جان پر کھیل کر انگریزوں کا ساتھ دیا جس کے صلے میں وہ صدر الصدور بنا کر مراد آباد بھیجے گئے۔ یہاں آ کر انہیں مسلمانوں کی تباہی کا پورا اندازہ ہوا۔ یہ عالم ہو گیا تھا کہ؛ اب تم تمام ہندوستان میں پھرو اور قدیم شہروں اور قدیم قصبوں میں جاؤ اور دیکھو جو معبد کہ ویران اور شکستہ حال پاؤ گے وہ مسلمانوں کی مسجدیں ہوں گی۔ جو چھت بوسیدہ اور خم در خم رسیدہ دیکھو گے وہ سقف خانہ مسلم ہو گی جو دیوار تباہ اور از سرتا پا افتادہ پاؤ گے وہ دیوار کسی مسلمان کی محل سرا کی ہو گی۔[۴۷] انھوں نے محمد بن تغلق کی اولاد کو پلے جلاتے اور خلیل اللہ شاہجہانی کے پوتوں کو پیر دباتے دیکھا تھا۔[۴۸] ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کی جاگیریں جائیدادیں ضبط ہو گئیں۔ ہر طرف پھانسیوں کا بازار گرم ہو گیا۔ گلی کوچے تختۂ دار بن گئے۔ لکھتے ہیں کہ؛ ایک مدت اسی غم میں پڑا سوچتا رہا کہ کیا کیجیے جو خیالی تدبیریں کرتا تھا کوئی بن پڑتی معلوم نہ ہوتی تھیں۔ جتنی امیدیں باندھتا تھا سب ٹوٹ جاتی تھیں۔ آخر یہ سوچا کہ سوچنے سے کرنا بہتر ہے۔ کرو جو کچھ کر سکو۔ ہو یا نہ ہو۔ اسی بات پر دل ٹھہرا ہمت نے ساتھ دیا اور صبر نے سہارا اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا۔[۴۹]

سید کے کارنامے اسباب بغاوت ہند کی تصنیف سے شروع ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے انھوں نے یہ ثابت کیا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں پیش آنے والے واقعات کی ذمہ داری ہندوستانیوں پر نہیں انگریزی حکمت عملی پر عائد ہوتی ہے لیکن جلد ہی مسلمانوں کی بربادی اور تباہ حالی نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو خاص طور پر اپنی توجہ کا مرکز بنائیں۔ ایک ماہر طبیب کی طرح پہلے قوم کے مرض کی تشخیص کرنی چاہی مگر واسطہ ایسے مرد بیمار سے تھا جس کا عضو عضو بیماری سے متاثر تھا۔

رگ رگ میں نیش غم ہے کہیے کہاں کہاں کی!

" اسلام کی وہ صورت پائی کہ خدا کسی کافر کو بھی نہ دکھائے۔ پوری قوم کیا دنیا کی باتوں میں اور کیا دین کے کاموں میں ایسے تاریک گڑھے میں پڑی تھی کہ ادھر ادھر کی چیزیں تو درکنار وہ خود اس گڑھے کو بھی نہ دیکھ سکتی تھی جس میں پڑی تھی۔[۵۰]" یہ صورت حال تھی کہ سر سید نے اپنی ہمہ جہتی کوششوں کا آغاز کیا۔ انھوں نے اپنی تصانیف (لائل محمڈنز آف انڈیا رسالہ احکام طعام، تحقیق لفظ نصاریٰ، تبیین الکلام) کے ذریعے مسلمانوں اور انگریزوں میں مفاہمت کی بنیاد ڈالی کمیشن کے ایک رکن کی حیثیت سے بے گناہ مسلمانوں کو پھانسی کے پھندے سے بچایا، ہزاروں کی جائیداد واگزار کرائی۔

مسلمانوں کی بہتری کی تدبیریں ہی اب ان کا مقصد حیات تھیں۔ دن رات وہ اسی فکر میں لگے رہتے تھے کہ کس طرح قوم کا کھویا ہوا وقار بحال ہو۔ کبھی مضامین لکھتے، کتابیں لکھتے، تقریریں کرتے۔ کبھی عام فلاح و بہبود کے لیے کوئی ادارہ قایم کرتے کبھی کوئی سیاسی انجمن قایم کرتے۔ کام کرنے کو بہت تھے اور وقت قلیل ایک تقریر میں کہا تھا؛ وقت کم اور کام بہت۔ نہ مجھ میں یہ قوت ہے کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھا دوں، نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو وسعت دے دوں۔ اگر ایک طرف ایک کام پر متوجہ ہوتا ہوں تو اور بہت سے ضروری کام رہ جاتے ہیں۔[۵۱] بہر حال انھوں نے ہمت نہ ہاری اور مسلمانوں کے مسائل پر غور کرتے رہے۔ اس اثنا میں ان کا تبادلہ غازی پور ہو گیا۔ اس طرح وہ تباہی و بربادی کے مرکز سے دور ہو گئے۔ اب انھیں غور و فکر کے لیے لمبا وقت ملا

اور زیادہ اطمینان میسر تھا۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ
ن کے تمام مسایل کا حل اور تمام مصائب کا علاج یہ ہے
ہیں جدید تعلیم سے روشناس کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے
یلیم کے لیے منصوبے تیار کرنے شروع کیے اور اسی مقصد
لایت کا سفر بھی کیا۔

قیام انگلستان کے دوران انھیں ایک اور نسخۂ کیمیا ہاتھ
وہاں انھیں پتہ چلا کہ جو حالت اس وقت ہندوستان کی
ہ بھی انگلستان کی بھی رہ چکی ہے۔ وہاں " لندن کے بیمبرول
ولیزلیٹن کے دلیوتاوّںؔ" (ایڈیسن اور اسٹیل) نے رسالہ
کیا تھا "تاکہ" انسان کی زندگی جو جھوٹی بناوٹوں سے عیب دار
ہے، اسے بے عیب کریں اور مکاری اور جھوٹی شیخی کو
یں اور بناوٹی پوشاک کو اتاریں اور اپنی قوم کی پوشاک
تگو اور برتاؤ میں عام سادہ پن پیدا کریں"۔ سر سید آگے
ر لکھتے ہیں کہ : ان پرچوں کے جاری ہونے سے انگریزوں کے
ن اور عادات اور دین داری کو نہایت فائدہ پہنچا اور ہر
۔کے دل پر اُن کا اثر ہوا۔ جس زمانے میں کہ پہلے پہل
ر نکلا ہے انگلستان کے لوگوں کی جہالت اور بد اخلاقی
ناشائستگی نفرت کے قابل تھی۔ وضع دار لوگ کیا مرد کیا
ت تحصیل علم سے نفرت رکھتے تھے اور علم پڑھنے کو خود فروشی و
روشی کہتے تھے اور رکینوں کا کام سمجھتے تھے۔ جہالت کی شرم
کو نہ تھی۔ عورت کا پڑھا لکھا ہونا اس کی بدنامی کا باعث
تھا۔۔۔ عورتیں آپس میں بدگوئی کیا کرتی تھیں۔ خلاف تہذیب
باتیں کرنا گویا ایک بڑی وضع داری گنی جاتی تھی۔۔۔۔ اسپیکٹیٹر
ایک دفعہ لکھا تھا کہ میں اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈالوں
اور خوش طبعی کو اخلاق سے ملا دوں گا تاکہ جہاں تک ممکن
اس کے پڑھنے والے دونوں باتوں میں نصیحت پاویں اور
فنیک لوگ ان تمام خرابیوں سے جن میں اس زمانے کے
پڑے ہیں سنبھل جاویں ہر روز ان کو نصیحت کی باتیں یاد
نا رہیں گا کیونکہ جو دل ایک دن بھی بے کار پڑا رہتا ہے اس

میں بے شمار عیب جڑ پکڑ جاتے ہیں جن کے ریشے بہت مشکل
سے دور ہوتے ہیں۔ سقراط کی نسبت ایسا کہا گیا ہے کہ اس
نے فلسفے کو آسمان سے اتارا اور انسانوں میں بسایا مگر میں
اپنی نسبت صرف اتنا ہی کہلانا چاہتا ہوں کہ میں نے فلسفے کو
مدرسوں اور مکتبوں کے کتب خانوں کی کوٹھریوں سے نکالا
اور جلسوں اور چائے خانوں و قہوہ خانوں تک پھیلایا اور
ہر ایک دل میں بسایا۔ ایڈیسن اور اسٹیل نے اپنے پرچوں
ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر سے جو کام انگلستان میں لیا تھا سر سید
نے وہی کام تہذیب الاخلاق سے لیا جو انھوں نے انگلستان
سے واپسی پر اسی مقصد سے جاری کیا تھا۔

تہذیب الاخلاق کا نکلنا تھا کہ چاروں طرف سے مخالفت
کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ایڈیسن اور اسٹیل نے مذہبی
معاملات میں دخل دینے سے احتراز کیا تھا اور اس میں
کامیاب رہے تھے لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا۔ یہاں یہ حال
تھا کہ جب کسی کام کے لیے کہا جاتا کہ کرو تو یہ عذر پیش کیا جاتا کہ
مذہباً ممنوع ہے اور اگر کسی کام سے باز رہنے کی تاکید کی
جاتی تو فوراً جواب ملتا کہ ثواب ہے۔ چنانچہ مجبور ہو کر سر سید
کو کہنا پڑا کہ جس چیز کو تم مذہب سمجھ رہے ہو وہ مذہب نہیں
بلکہ تمہاری اختراعات ہیں۔ یہ وہ باتیں تھیں جنھوں نے مسلمانوں
کو برانگیختہ کر دیا۔ انھیں کافر، مرتد، ملحد، زندیق، اسلام کا
دشمن، مسلمانوں کا ہاجی، قوم کا عیب جو۔ سبھی کچھ کہا گیا مگر
انھیں نے ہمت نہ ہاری۔ کئی بار مایوسیوں نے گھیرا مگر ہر بار
اللہ پر بھروسہ کر کے ہمت پھر باندھی۔ انھوں نے ایک بار
اپنے بارے میں لکھا تھا : وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی
بھلائی کی فکر کرتا ہے۔ دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ ہر
وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے، ان کی تلاش میں دور دراز
کا سفر اختیار کرتا ہے۔ بیگانوں بے گانوں سے ملتا ہے۔ ہر ایک
کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈتا ہے مشکل کے وقت ایک
بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے،

انھیں کو دشمن پاتا ہے۔ شہری وحشی بتلاتے ہیں۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھلاتے ہیں۔ عزیز اقارب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں۔

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں
بھائی سید تو کچھ دوانے ہیں[1]

غرض یہ کہ سرسید نے شدید مخالفت کے باوجود تہذیب الاخلاق کے ذریعے سوتوں کو جھنجھوڑنے کا کام اس وقت تک جاری رکھا جب تک قوم میں بیداری کے آثار پیدا نہ ہوگئے۔۔۔ یہ تہذیب الاخلاق کا ہی کارنامہ تھا کہ مسلمان قومی ہمدردی اور قومی خیرخواہی جیسے الفاظ سے آشنا ہوئے۔ اُن میں اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا ہوا۔ انھوں نے آپ اپنی عزت کرنا سیکھی۔ جدید علوم کی طرف متوجہ ہوئے اور اُن میں اجتماعی قوت کا احساس پیدا ہوا۔ یہ بھی تہذیب الاخلاق کا ہی کارنامہ تھا کہ مسلمانوں نے اپنے شعروادب کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا اور اس کی ترقی پر کمربستہ ہوئے۔ مذہبی امور اور غیرمفید رسم ورواج میں تمیز کرنا تہذیب الاخلاق نے ہی سکھایا اور بقول نذیر احمد "یہ تہذیب الاخلاق ہی کا تصرف تھا کہ مسلمان جو پیچھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے تھے انھوں نے نسل چڑھوا لیے اور سان تک نہیں ہلایا۔"[2]

جدید تعلیم کو سرسید مسلمانوں کے سارے مسائل کا حل خیال کرتے تھے۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق کے اجرا کے ساتھ ہی انھوں نے اس طرف بھی توجہ کی اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کیا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے گوشے گوشے میں تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں اور اس کے سالانہ جلسوں میں مختلف علاقوں کی تعلیمی حیثیت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا گیا جسے سرسید کے تعلیمی منصوبے میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بقیہ حصہ اس کے استحکام و ترقی کے لیے وقف کر دیا چندہ جمع کرنے کے لیے اپنے ذاتی مصارف پر دور دراز کے سفر کیے اپنوں بیگانوں کے آگے دامن پھیلایا، چراغی مانگی، لاٹری کھولی، کیا اور آخر کار ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ اگر سرسید نے جدید تعلیم کو مسلمانوں میں عام کرنے کی مہم شروع نہ کی ہوتی تو اس قوم کو جہالت اور افلاس سے کبھی نجات نہ ملتی۔

مذہب اسلام کو سرسید کے عہد میں طرح طرح کے خطروں کا سامنا تھا۔ سرسید نے ان خطروں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اسلام کی حمایت میں سرسید نے جو کچھ کیا اُس کی تفصیل علیحدہ باب میں بیان کی گئی ہے لیکن یہاں صرف اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ اس وقت اسلام کو ایک خطرہ تو اُن پادریوں سے تھا جو اسلام پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے تھے۔ سرسید نے ان تمام اعتراضات کے نہایت شائستگی اور متانت کے ساتھ مدلل جواب دیے۔ وہ زمانہ مناظروں کا زمانہ تھا اور مسلمان مولوی عیسائیوں کے اعتراضات کے الزامی جوابات دیتے تھے۔ عام مسلمانوں کے عقیدے میں ان جوابات سے استحکام تو ضرور پیدا ہوتا تھا لیکن اصل اعتراض بغیر جواب کے رہ جاتا تھا۔ سرسید نے مناظرانہ انداز سے تو احتراز کیا لیکن بعض موقعوں پر انھوں نے ایسا ضرور کیا کہ مدلل جواب کے ساتھ لطیف طنز سے بھی کام لیا مگر شائستگی کو یہاں بھی ملحوظ رکھا۔ ولیم میور نے سرور کائنات کی ابتدائی زندگی کے غیر معتبر واقعات طنز و تعریض کے ساتھ بیان کیے تھے۔ مثلاً کم عمر بچوں کے ساتھ آپ کا کھیل کود میں مصروف رہنا، مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اُڑا دینا، اپنی رضاعی بہن کی پیٹھ میں سے کاٹ کھانا اور اپنی والدہ کی قبر پر رونا۔ سرسید اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "اگرچہ ان باتوں کی کوئی معتبر سند نہیں ہے لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کر لی جائیں تو ایسی باتیں ہیں جو ایام طفولیت میں انسانی فطرت کے موافق ہمیشہ ہوا کرتی ہیں۔ آنحضرت صلعم نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے۔ انھوں نے اپنے آپ کو صرف یہ کہا تھا کہ

إنما انا بشر مثلکم یوحیٰ إلیّ بس ایسی باتیں اگر ہوتیں بھی تو
انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں۔

نئی تعلیم بھی مذہب اسلام کے لیے ایک خطرہ تھی۔ اس تعلیم سے بہرہ ور نوجوان مذہب کی بہت سی باتوں کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے تھے۔ اس خطرے کے تدارک کے لیے سرسید نے اسلام کی نئی تعبیر پیش کی۔ اسلام کو مطابق فطرت بتایا اور اس نقطۂ نظر سے کلام پاک کی تفسیر لکھی۔ حشر و نشر، حساب و کتاب اور جنت و جہنم کو تمثیل ٹھہرایا۔ شق القمر اور معراج کو رویا کے واقعات بتایا۔ اجنّہ کو ایک قوی الجثہ قوم کہا۔ شیطان کے خارجی وجود سے انکار کیا اور تقلید کو گمراہی کہہ کر اجتہاد کا راستہ اختیار کیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اسلام کو مطابق عقل و مطابق فطرت ثابت کر کے نئی تعلیم یافتہ نسل کو مرتد ہونے سے بچایا جاسکے۔ نیک نیتی کے باوجود یہاں ان سے سخت لغزشیں ہوئیں۔ نتیجہ یہ کہ انھیں کرستان، مرتد، کافر، ملحد، دجّال کہا گیا۔ مکے تک سے کفر کے فتوے منگائے گئے مگر سرسید نہ تو مایوس ہوئے اور نہ برہم۔ انھوں نے اپنا کام آہنی عزم کے ساتھ جاری رکھا

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلمانوں کو کانگریس کے پرچم تلے جمع رکھنا چاہا مگر قوم ان کی نصیحت کی طرف متوجہ نہ ہوئی اور سیاسی حالات ایسی کروٹیں لیتے رہے کہ ملک بالآخر تقسیم ہوگیا۔ ہر طرف خونیں فسادات ہوئے۔ ہزاروں مسلمان اپنا آبائی وطن چھوڑ کر پاکستان کا رُخ کرنے لگے۔ اس موقع پر مولانا آزاد نے دہلی کی جامع مسجد میں جو تقریر کی، اس میں ہمدردی کم تھی اور تلخی زیادہ۔ انھوں نے کہا:

"تمھیں یاد ہے میں نے تمھیں یہیں سے پکارا
اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا
اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر لیے۔ میں نے چلنا چاہا
اور تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے، میں نے
کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی۔
میں نے تمھیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن
تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ
غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کردیں۔
تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا
ایک غول تھا ملک کی آزادی کے بارے
میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے محو
ہوجانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔"

ایسا لگتا ہے کہ بس وہ اپنی قوم کو غرق ہونے کی بد دعا دینے کے لیے ہاتھ اٹھانا ہی چاہتے ہیں۔ سرسید کا معاملہ مولانا آزاد سے بہت مختلف تھا۔ مولانا کے ساتھ قوم نے یہ بدسلوکی کی تھی کہ اُن کی آواز پر لبیک کہنے سے انکار کردیا تھا۔ اسی قوم نے سرسید کو کہیں زیادہ ایذائیں پہنچائیں تھیں مگر ان کی زبان سے نکلی تو صرف یہ دعا نکلی:

"اے خدا ان پر رحم کر کیوں کہ وہ نہیں جانتے
کہ کیا کر رہے ہیں۔"

سیاسی معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی اس وقت اور بھی ضروری تھی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ناکام ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ سے ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے حوصلے پست ہوگئے تھے۔ انگریز افسران ان سے پوری طرح انتقام لینے کے درپے تھے۔ ان کے لیے باغی اور مسلمان مترادف الفاظ تھے۔ مسلمان صنعت و تجارت سے ناآشنا تو تھے ہی بغاوت کے الزام میں انھیں سرکاری ملازمتوں سے محروم کردیا گیا تھا اور ان کی جائیدادیں ضبط کرلی گئی تھیں۔ اب وہ پوری طرح مصیبت زدہ اور مفلوک الحال تھے۔ سرسید نے ہنگامہ آرائی سے بچنے، شورش سے دور رہنے اور انگریزوں سے دوستی کرنے کا مشورہ دے کر انھیں مزید تباہی سے بچا لیا۔

بری رسمیں مسلم معاشرے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھیں۔ بہت سی رسمیں ایسی تھیں جو دین کا حصہ خیال کرلی گئی تھیں اور معاشرے کو ان سے نجات دلانا کوئی آسان

کام نہ تھا۔ شادی وغم دونوں موقعوں پر مضحکہ خیز رسمیں دیکھنے میں آتی تھیں۔ مسلمانوں کی اقتصادی حالت خراب تھی لیکن جو لوگ آسودہ حال تھے وہ بیہودہ رسموں پر اپنی دولت برباد کرتے تھے۔ تعصب، تنگ نظری، بغض وعداوت، نمود و نمائش، کج بحثی، ماضی پرستی، اجداد پرستی، جا ... غرور، خوشامد پسندی، خود غرضی، اور طرح طرح کے عیب اور بری عادتیں مسلمانوں میں پیدا ہوگئی تھیں۔ سرسیّد نے اپنے مضامین کے ذریعے بری عادتوں کے نقصانات واضح کیے اور ان سے نفرت دلائی۔ اسی طرح اچھی عادتوں کی خوبیوں پر روشنی ڈالی اور انھیں اختیار کرنے کے لیے مسلمانوں کو آمادہ کیا۔ انھیں رہنے سہنے کے عمدہ طریقوں اور خورد و نوش کے آداب سے روشناس کیا۔ دوسری قوموں سے مل کر رہنے کے فائدے بتلائے۔

اردو زبان وادب کی خامیوں پر سب سے پہلے سرسید نے غور کیا۔ ان کے نزدیک وہ ادب غیر مفید بلکہ مضر ہے جو ذہنوں کو روشنی نہ عطا کرے۔ گویا انھوں نے ہمارے ہاں پہلی بار یہ آواز اُٹھائی کہ ادب کو افادی ہونا چاہیے۔ ان کے زمانے تک اردو شاعری کا معتدبہ حصہ غزل اور قصیدے پر مشتمل تھا۔ غزل عام طور پر عشق وعاشقی کے مضامین تک محدود تھی اور قصیدہ جھوٹ، مبالغہ اور خوشامد جیسے عیبوں سے پُر تھا۔ نثر کی حالت اور بھی ابتر تھی۔ عبارت آرائی، لفاظی، وزن اور قافیے کی پابندی نے اردو زبان کو اس قابل نہ ہونے دیا تھا کہ اسے خیالات کے بے تکلف اظہار کا ذریعہ بنایا جاسکے۔ سرسید نے اردو نثر و نظم کے عیبوں پر سخت تنقید کی۔ خود اپنے مضامین اور تصانیف سے نثر جدید کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ انھوں نے رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرکے لکھنے والوں کی ایک جماعت تیار کردی۔ شعر کہنے پر وہ قادر ضرور تھے لیکن شعر وشاعری سے ان کی طبیعت کو کوئی خاص مناسبت نہ تھی۔ اس لیے وہ خود تو کوئی نمونہ پیش نہ کرسکے لیکن انھوں نے شاعروں کو ذہنی طور پر آمادہ کیا کہ وہ زمانے کے رُخ کو پہچانیں، وقت کے تقاضے کو سمجھیں اور زندگی کو بہتر بنانے میں اپنی شاعری کے ذریعے مدد کریں۔ سرسید کو س... سے زیادہ کامیابی اسی مقصد میں حاصل ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو نظم ونثر میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوگ...

سرسید ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ہندوستا... اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے ہر شع... کی خامیوں اور خوبیوں کا انھوں نے گہری نظر سے مطالع... ان کی ضرورتوں پر غور کیا اور مصلحانہ کوششوں سے ان... زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ ان کی یہ رہنمایانہ کوشش... کسی ایک میدان تک محدود نہ رہی بلکہ انھوں نے مذہ... ادب، سیاست، تعلیم، معاشرت۔ ہندوستانی مسلمانوں... جملہ مسائل پر توجہ کی۔ اگر انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو کسی ا... شعبہ پر مرکوز کردیا ہوتا تو شاید اس میں سب سے بڑا ام... ہونے کا اعزاز پایا ہوتا لیکن ہندوستانی مسلمانوں... یقیناً ان کی ذات سے وہ فائدہ نہ پہنچا ہوتا جو موجو... صورت میں پہنچا۔ اگر سرسید صرف قرآن وحدیث ک... طرف توجہ کرتے تو چوٹی کے مفسرین ومحدثین میں ان کا ش... ہوتا۔ رشد وہدایت دیتے خانقاہ میں بیٹھتے تو مرجع خلائ... اگر سیاسی رہنمائی پر اکتفا کرتے تو اس میدان میں قوم... کاروان سالار ہوتے۔ اگر صرف مسائل تعلیم پر غور کرتے تو... کے مشہور ماہرین تعلیم کی صف میں جگہ پاتے۔ اگر شاعر... تو میر وغالب واقبال کے ہم پلّہ ہوتے مگر وہ تخصیص کا را... اختیار کر نہ سکتے تھے کیونکہ وہ پیدا ہوئے تھے ہندوستان... کو پستی وزبوں حالی سے نکالنے کے لیے اور ہندوستانی مسل... کو ایک ایسے ماہر طبیب کی ضرورت تھی جس کے پاس ہر مر... کا علاج اور ہر دکھ کا مداوا ہو۔ چنانچہ سرسیّد نے اپنے ط... کو محدود نہیں کیا۔ پھر بھی وہ کون سا میدان تھا جس میں... قیادت کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں اور ہندوستانی مسلما... کی زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جو سرسید کے احسان... گراں بار نہ ہو ــــــ انھوں نے بے عملوں کو جہد وعمل کا د...

یا۔ عزلت نشینوں کو گوشۂ تنہائی سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لینا سکھایا، ماضی کے پرستاروں کو حال کی اہمیت سے آشنا کیا۔ تنگ نظروں کو وسعتِ نظر سکھلائی، اجداد کے کارناموں پر فخر کرنے والوں کو اپنے آپ میں اوصاف پیدا کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ مشرق کے پجاریوں کو مغرب سے روشناس کیا۔ تقلید پرستوں کو اجتہاد کی اہمیت سے آگاہ اور غور و فکر، تجزیہ و استدلال کی ضرورت سے باخبر کیا۔ دنیا کو بے حقیقت سمجھنے والوں کو دنیا میں نیکی کمانے اور آخرت کے لیے توشہ جمع کرنے کا راستہ دکھایا۔ انھوں نے سوتوں کو جگایا، مُردوں میں جان ڈالی۔ غرض یہ کہ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو زندہ قوموں کی طرح زندگی گزارنے اور سربلند ہو کر جینے کا سلیقہ سکھایا۔

## حواشی

۱۔ "اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے اور نہ اُس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس بات کا خود ہم کو بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا۔" حالی: حیاتِ جاوید، طبع لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۷۰

(اس کتاب میں حیاتِ جاوید کے حوالے اسی ایڈیشن سے دیے گئے ہیں)

۲۔ بحوالہ رشید احمد صدیقی، فکر و نظر، اپریل ۱۹۶۵ء، ص ۵۶۔

۳۔ سرسیّد: اسبابِ بغاوتِ ہند، مرتبہ فوق کریمی۔ طبع دہلی، ۱۹۷۱ء، ص ۸۸

۴۔ سرسیّد: سیرتِ فریدیہ: مرتبہ محمود احمد برکاتی، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۹۶

۵۔ سرسید: سیرتِ فریدیہ، ص ۱۰۶، ۱۰۷

۶۔ مکتوبِ غالب بنام میر مہدی مجروح، مشمولہ اردوئے معلّیٰ، مرتبہ حکیم فیروز الدین، طبع لاہور، ۱۹۳۰ء، ص ۱۱۶، ۱۱۷

۷۔ لیکچر ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء بمقام پٹنہ، مشمولہ لیکچروں کا مجموعہ، مرتبہ منشی سراج الدین، طبع لاہور، ۱۹۳۰ء، ص ۱۳۹

۸۔ لیکچر ۲۶ مئی ۱۸۷۲ء، بمقام پٹنہ، لیکچروں کا مجموعہ، ص ۴۰

۹۔ مضامینِ تہذیب الاخلاق جلد دوم۔ مرتبہ ملک فضل دین ککے زئی، طبع لاہور، ب ت، ص ۴۳

۱۰۔ مضامینِ تہذیب الاخلاق، جلد دوم ص ۵۷۰

۱۱۔ لیکچر جالندھر، ۴ فروری ۱۸۸۴ء لیکچروں کا مجموعہ، ص ۲۴۴

۱۲۔ مضامینِ تہذیب الاخلاق، جلد دوم ص ۵۷۰

۱۳۔ ایضاً ص ۴۴۹

۱۴۔ سرسید: امید کی خوشی، مشمولہ مضامینِ تہذیب الاخلاق، ص ۱۱۰

۱۵۔ نذیر احمد، تہذیب الاخلاق، یکم شوال ۱۳۱۵ھ

۱۶۔ حیاتِ جاوید، ص ۵۲۹۔

(پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ اکتوبر ۱۹۸۵ء)

# سرسید کے اساسی افکار

نادر علی خاں

اورنگ زیب عالمگیر کے جنوبی ہند کے طویل قیام کے باعث مرکز کی اجتماعیت اور گرفت کمزور ہوگئی اور وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد عمومی انحطاط کا آغاز ہوا جو نادر شاہ درّانی اور احمد شاہ ابدالی کی تاخت و تاراج سے نقطۂ عروج پر پہنچا اور سلاطین چغتائیہ شاہ شطرنج کے مصداق بن کر رہ گئے، حتیٰ کہ بہادر شاہ ظفر کی ذات پر اس کا سلسلہ ہی منقطع ہوگیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی آخری کوشش تھی جو اجتماعیت کے فقدان اور ہم وطنوں کے عدم تعاون کی وجہ سے ناکام ہوکر رہ گئی۔ چونکہ اس معرکۂ عظیم میں انگریزوں کا اصل مقصد مسلم خواص اور عوام سے تھا۔ اس لیے فتوحات کے بعد یہی قوم جبر و ستم کا نشانہ بنی، ریاستیں بحق سرکار ضبط ہوگئیں اور والیان ریاست کے علاوہ ان گنت افراد موت کے گھاٹ زندگی کے دریا کے پار اُتار دیے گئے۔ بیرونی حملہ آوروں کی مسلسل یورش اور باہمی کشاکش کی شعلہ سامانی کے باعث معاشی نظام تو پہلے ہی نذر آتش ہو چکا تھا، سیاسی اقتدار بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی نذر ہوگیا۔

فریدالدین احمد خاں کی حیات ہی سے سرسید کا گھرانہ قدیم و جدید کا سنگم بنا ہوا تھا جس میں اول الذکر اکبر شاہ ثانی کے وزیر اعظم ہونے کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل و عقد کے معتمد تھے۔ اسی طرح سرسید بھی بہادر شاہ ظفر کے خطاب یافتہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے باقاعدہ ملازم تھے مگر موخر الذکر کی شخصیت شبہات سے بالاتر تھی باوجود راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے کمپنی کے سچّے وفادار اور مطیع و منقاد تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے زلزلہ خیز حالات میں موصوف کا حسن سلوک حکومت کی وفاداری کے بجائے خشیت الٰہی پر مبنی تھا۔

۱۸۵۷ء کی شکست فاش کے بعد سرسید اس نتیجے پر پہنچے کہ عنان اختیار ہاتھ سے جاتی رہی اور معاشی کشاد بازاری کے باعث قوم فقیر ہوگئی۔ اس لیے غیر ملکی اقتدار کو قبول کر لینے کے علاوہ چارہ کار نہیں لیکن موصوف نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسباب بغاوت ہند کی تالیف سے ایک جرأت مندانہ اقدام کیا اور اپنی قوت استدلال سے اسلام اور اہل اسلام کے خلاف الزامات کی مدلل تردید کی اور اُن شبہات کا ازالہ کیا جو حکومت کو مسلمانوں کے بارے میں پیدا ہوگئے تھے۔

اگر ایک طرف سرسید نے اس بُعد کو رفع کرنے کی ہمہ جہت کوشش کی جو مسلمانوں اور انگریزی حکومت کے مابین پیدا ہوگیا تھا تو دوسری طرف اسلام کی حیات اور بقاء کی بھرپور فکر و تدبیر کی حتیٰ کہ مسلسل غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے وجود کی سالمیت دو باتوں پر منحصر ہے اول منہج اسلامی زندگی دوم جدید علوم و فنون کی تحصیل و ترویج چنانچہ سرسید کی

اصلاحی تحریک میں اساسی طور پر انہیں دو عناصر کا رنگین امتزاج ملتا ہے۔

مدرستہ العلوم کی تاسیس سے قبل ایک سوال نامہ جاری کیا اور اس موضوع پر مقالات کی دعوت دی اور علی الترتیب پانچ سو، تین سو اور ڈیڑھ سو روپے کے تین انعامات کا اعلان کیا۔ مذکورہ سوال نامے کے اساسی نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ کیا جدید علوم و فنون مسلمانوں کے لیے ضروری ہیں؟
۲۔ اگر واقعی ضروری ہیں تو کیا از روے شریعت ان کا حصول جائز ہے؟
۳۔ اگر حصول جائز ہے تو موجودہ مشنری ادارے اس کے لیے کافی ہیں؟
۴۔ اگر مذکورہ ادارے ناکافی ہیں تو کیا ترمیم و اضافے کے بعد کافی ہو سکتے ہیں؟
۵۔ اگر ترمیم و اضافے کے بعد بھی ناکافی ہیں تو کیا ہمیں اپنے ذاتی ادارے قایم کرنا چاہییں؟
۶۔ اگر ذاتی ادارے قایم کرنا ناگزیر ہے تو کیا ہمارے پاس اتنا سرمایہ موجود ہے کہ مطلوبہ ادارے جاری رہ سکیں؟

مذکورہ بالا نکات پر مشتمل بتیس مقالات موصول ہوئے جن میں محسن الملک مرحوم کا مقالہ بہترین تصور کیا گیا مگر موصوف نے انعام قبول نہیں کیا۔ چنانچہ پہلا انعام مولوی اشرف علی ایم اے کو عطا کیا گیا اور سر سید نے مذکورہ تنقیحات کی روشنی میں حسب ذیل نتائج اخذ کیے۔

۱۔ جدید علوم و فنون مسلمانوں کے لیے ضروری ہیں۔
۲۔ شاہ عبد العزیز دہلوی قدس سرہ کے فتاویٰ سے اس کا جواز ثابت ہے۔
۳۔ موجودہ مشنری ادارے ہمارے لیے ناکافی ہیں۔
۴۔ ترمیم و اضافے کے بعد بھی کافی نہیں ہو سکتے۔
۵۔ اس لیے ہمیں ذاتی ادارے قایم کرنا ناگزیر ہے۔
۶۔ الحمد للہ ابھی قوم کے اندر اس انداز و نوعیت کے ادارے جاری کرنے اور باقی رکھنے کی استطاعت موجود ہے۔

چنانچہ سر سیّد نے قدیم و جدید کے سنگم کے طور پر نہ صرف مدرستہ العلوم قایم کیا بلکہ مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے دوسری تدابیر بھی اختیار کیں جن میں سائنٹی فک سوسائٹی اور برٹش انڈیا ایسوسی ایشن، سائنٹی فک سوسائٹی گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے علاوہ ایجوکیشنل کانفرنس بھی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ موخر الذکر کے ذریعے ملک کے مختلف حصوں میں علوم و فنون کے ذوق کو عام کرنے اور افادہ و استفادہ کی فضا کو ہموار کرنے کی ناقابلِ فراموش کوشش کی۔ چنانچہ ایجوکیشنل کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں تعلیم کی اہمیت اور ضرورت، افادیت اور ہمہ گیری کے بارے میں فرمایا:

"اے صاحبو! جن لوگوں کا خیال ہے کہ پولیٹکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہو گی میں اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ میں تعلیم کی ترقی کو اور صرف تعلیم ہی کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں۔ ہماری قوم کو اس وقت بجز ترقی تعلیم کے اور کسی چیز پر کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہماری قوم میں تعلیم کی کافی ترقی ہو جاوے گی تو ہم کو وہی کافی ذریعہ تنزل کی حالت سے نکلنے کا ہو گا۔[1]"

لیکن سر سیّد مذکورہ تعلیم کی ترویج و اشاعت کو سرمایۂ ایمان کے بغیر جسد بے روح کے مترادف سمجھتے تھے۔ چنانچہ مولوی ممتاز علی کے نام ایک گرامی نامے میں تحریر فرمایا:

"محبِ دل نوازِ من! آپ کا عنایت نامہ مع مضمون کے پہنچا جس کے پڑھنے سے میری

دلنوازی ہوئی، میرے دل کو تقویت ہوئی ۔
خدا آپ کو جزائے خیر دے ۔
میں نے ایک جلسے میں کہا تھا کہ میری
آرزو یہ ہے کہ ہماری قوم لا الٰہ الا اللہ
محمد رسول اللہ پر یقین رکھے اور ترقی پاوے
اور اگر یہ یقین جاتا رہا تو وہ ہماری قوم نہیں
رہی پھر وہ اگر آسمان کے تارے ہو جائیں
تو ہم کو کیا ؟

سرسید نے صرف اظہار خیال ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مدرسۃ العلوم کے قیام کے ذریعہ اپنی اساسی فکر کو جسیل اور توانا جسم بھی عطا کیا اور شعبۂ دینیات کے ذریعے اس کی رگوں میں تازہ اور گرم خون کا اضافہ کیا ۔

سرسید کے کمالات ظاہری اور باطن کا احصئی دشوار ہے لیکن اس کے باوجود موصوف کے اخلاق حمیدہ میں اخلاص کا پلّہ یقیناً بھاری ہے ۔ یہ ایسی امتیازی اور اختصاصی صفت ہے جو تمام کمالات پر حاوی اور غالب نظر آتی ہے ۔ چنانچہ موصوف نے مدرسۃ العلوم میں اپنے مخصوص عقائد اور اختلافی مسلک سے یکسر اعراض کرکے سواد اعظم کے عقائد و مسلک کے وجود پر زور دیا اور اپنے حریف مولوی علی بخش شرر کو لکھا :

"بہر حال اب مدرسۃ العلوم میں آپ کا مددگار ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ میرے عقائد کے مداخلت کا اندیشہ جس کو خلاف شرع سمجھتے ہیں اور کمیٹی کی دست اندازی کا خوف مسائل مذہبی میں نہ رہے اور اسی کے رفع ہونے کے لیے آپ یہ تجویز فرماتے ہیں کہ کمیٹی "خزینۃ البضاعۃ" تعلیم مذہبی میں کچھ مداخلت نہ کرے اور ایک کمیٹی جس پر عام اہل اسلام کو اطمینان ہو اور متعلقہ تعلیم مذہبی کے مقرر کی جاوے ۔

میں نہایت خوش دلی سے جو امر آپ نے پیش فرمایا ہے بتمام منظور کرتا ہوں اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ کمیٹی کے کسی ممبر کو بھی اس میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ جو ہدایت کہ آپ نے فرمائی ہے اس کو میں دل سے قبول کرتا ہوں اور جو کچھ کہ میں نے آپ کی مخالفت مدرسۃ العلوم کو آپ کی نفسانیت پر محمول کیا ہو اس کی معافی میں آپ سے چاہتا ہوں ۔[۲]

بالآخر حسب ذیل اساطین ملت پر مشتمل ایک مجلس دینیات قائم ہوئی جو مدرسۃ العلوم میں امور دینیہ کی ذمہ دار اور محافظ تھی ۔

### کمیٹی تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ | محمد عنایت اللہ خاں صاحب | رئیس بھیکم پور |
| ۲۔ | محمد عبدالشکور خاں صاحب | " " |
| ۳۔ | محمد مسعود علی خاں صاحب | رئیس دان پور |
| ۴۔ | مولوی محمد اسمٰعیل صاحب | رئیس علی گڑھ |
| ۵۔ | سید فضل حق صاحب | " " |
| ۶۔ | محمد اسمٰعیل خاں صاحب | رئیس دتاولی |
| ۷۔ | مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب | سب آرڈی نیٹ جج علی گڑھ |
| ۸۔ | نواب محمد محمود علی خاں صاحب | رئیس چھتاری |
| ۹۔ | حاجی محمد فیض احمد خاں صاحب | رئیس دتاولی |
| ۱۰۔ | محمد ارشاد علی خاں صاحب | |
| ۱۱۔ | مولوی محمد لطف اللہ صاحب | علی گڑھ |
| ۱۲۔ | مولوی عبدالقیوم صاحب | |
| ۱۳۔ | مولوی محمد علی صاحب مونگیری[۳] | |

مؤخر الذکر تینوں حضرات امت مرحومہ کے کبار اہل علم اور مشائخ میں شمار کیے جاتے ہیں اور اپنے تبحر علمی، تقویٰ اور ورع کے لحاظ سے زبان زد اہل علم و کمال تھے اور مسلمانوں کے سواد اعظم کے نزدیک ان حضرات گرامی کی بڑی شرکت و

شمولیت صد ہزار اطمینان کے مصداق تھی۔

سرسید نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شعبۂ دینیات کی نظامت کے لیے اپنے خواجہ تاش اور حریف، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد (مولانا عبداللہ انصاری مرحوم) کا انتخاب کیا جو سرسید کے خواب کی صحیح تعبیر تھے۔ چنانچہ مولانا شبلی کے نام ایک گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں:

"مولوی شبلی صاحب! آپ نے اپنی طولانی تحریر کو ایسے عنوان سے شروع کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مجھ کو مولوی صاحب (مولوی عبداللہ انصاری) کے کام پر اطمینان نہیں ہے۔ حاشا وکلا اگر ایسا ہوتا تو ایسا عظیم الشان کام جو کہ کالج کی جان ہے ان کے سپرد ہرگز نہ کیا جاتا۔ مجھے ان پر بہت بڑا اطمینان ہے وہ صدہا علماء میں سے اس جلیل القدر کام کے واسطے منتخب کیے گئے ہیں شاید آپ کے خیال خرابی یا بے اطمینانی کی طرف اس فقرہ سے گیا ہوگا (یہ کام ان سے متعلق کرنا مناسب نہیں) اس کے یہ معنی ہیں کہ میں کسی طرح ان کے خلاف مرضی کوئی کام ان کے متعلق کرنا پسند نہیں کرتا مگر میں منشی سید احمد صاحب کی معرفت مولوی صاحب کی مرضی مبارک دریافت کروں گا" ؎

۱۸۵۷ء کی ہزیمت کے بعد حکومت کے جبر و استبداد میں معتدبہ اضافہ ہوا اور لظام و دار و گیر عام ہو گئی بالخصوص اہل ایمان کا سرمایۂ ایمان دل بردار رجان و مال معرض خطر میں آگیا لیکن ایسے نازک، زہرہ گداز اور جاں گسل حالات میں بھی سو دو زیاں سے بے نیاز حق و صداقت کے علم بردار اور نقیب بنے رہے چنانچہ انتہائی جلال و جبروت کے دور میں بھی کمال اطاعت اور وفاداری کے باوجود مقصود کی سالمیت اور ناموس ملت کے تحفظ کے لیے سینہ سپر رہے اور کسی کی قوت و صلابت حق گوئی کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ عمائدین سلطنت کی جابرانہ حکمت عملی بھی پائے ثبات کو متزلزل نہ کر سکی۔ فی الحقیقت سرسید استقامت کا پیکر اور استقلال کا پہاڑ تھے۔ چنانچہ ممتاز علی کے نام ایک گرامی نامے میں تحریر فرمایا:

"ہم ہندوستانیوں کی تمام مجلسیں بے جان ہیں یا تو اُن میں کچھ کام نہیں ہوتا یا کسی یوروپین افسر کے ہاتھ فروخت ہو جاتی ہیں اور اس کے مقاصد یا رائے کی تکمیل کی بھی آلہ بن جاتی ہیں یہ قوت ہم میں نہیں ہے کہ ہم اپنا کام اپنی رائے اور اپنی قوت سے چلاویں۔ ہم سے اور مسٹر کیمسن صاحب ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن سے نہایت ناموافقت تھی ملاقات اور صاحب سلامت بھی نہ ہوتی تھی۔ ہمارے تمام کاموں کے وہ برخلاف تھے۔ سبب صرف یہ تھا کہ ان کی خواہش تھی سینٹی فک سوسائٹی اور مدرستہ العلوم ان کے قبضے میں ہو۔ ہم نے نہایت استقلال سے کسی بات میں دخل دینے نہیں دیا اور خود آپ اور اپنی رائے سے اور اپنے مقاصد کے لحاظ سے چلایا اور اپنے دوستوں کو کئی دفعہ بطور وصیت کے کہہ چکا ہوں کہ میرے بعد مدرستہ العلوم کا جو حال ہو سو ہو مگر ایسا نہ کرنا کہ قوم کے ہاتھ سے نکل کر اور لوگوں کے قبضے میں چلا جائے بری طرح یا بھلی طرح ہماری قوم ہی اس کے چلانے والی ہو۔

لوگ عام فائدے کے کاموں میں حکام کے سامنے اپنا رسوخ چاہتے ہیں مگر حقیقت میں اپنی عزت کھو بیٹھتے ہیں۔ ہم اس ضلع کے حکام کا نہایت ادب کرتے ہیں، تمام مجلسوں میں انہیں کو افسر بناتے ہیں انعام انہیں کے ہاتھ سے تقسیم کرواتے ہیں مگر ہمارے کام میں اُن کو ایک

نقطہ برابر بھی نہیں ہوتی۔"؎

سرسید نے مدرسۃ العلوم کی تاسیس اور شعبۂ دینیات کے قیام ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ شعبۂ دینیات کی ہمہ گیر اساسی اہمیت، افادیت اور عظمت کے پیش نظر نصاب تعلیم کا ایک خاکہ بھی پیش کیا:

بنام ممبران کمیٹی تعلیم مذہبی۔ عرض یہ ہے کہ سلسلہ کتب درسی مذہبی کا جو آپ مقرر فرماویں اس کے چار درجے حسب تفصیل ہونے چاہیں۔

اول سلسلۂ عام ضروری درسی کتابوں کا یہ سلسلہ صیغۂ مدرسہ سے متعلق ہوگا جس کا ذکر طریقۂ تعلیم کی دفعہ ۸ میں مندرج ہے اس درجہ میں جو لڑکے تعلیم پاویں گے اُن کی مدت تعلیم جملہ علوم کے پانچ برس مقرر ہے۔ اس درجے میں ہر طالب علم کو مذہبی کتابوں کا پڑھنا ضروری ہوگا اس درجے کے طالب علموں کی استعداد اس درجہ تک پہنچ جائے گی کہ عربی و فارسی عبارت مع قواعد صرف و نحو بخوبی پڑھ سکتے ہوں۔ پس اس صیغے کے لیے ایسے درجے کی کتابیں عربی زبان کی تجویز کی جاویں جو رفتہ رفتہ اس قدر استعداد کے طالب علموں کے مناسب ہوں اور یہ بھی تجویز کیا جاوے کہ صرف و نحو کے کس درجے تک پہنچ جانے کے بعد عربی سلسلہ مذہبی کتابوں کا پڑھنا شروع کرایا جاوے گا۔ علاوہ اس درجے کی لیاقت کے موافق ایک دوسرا سلسلہ مذہبی کتابوں کا فارسی زبان کا منتخب ہونا چاہیے تاکہ جو لوگ عربی زبان کی تعلیم اختیار نہ کریں گے اور فارسی زبان میں تعلیم ہونا چاہیں گے ان کو وہ سلسلہ مذہبی تعلیم کا پڑھنا پڑے گا۔ اس کے سوا اسی قسم کا ایک تیسرا سلسلہ مذہبی کتابوں کا اردو زبان میں مرتب ہونا چاہیے تاکہ جن لوگوں نے یورپ کی زبانیں اختیار کی ہوں گی اُس کو اُس اردو سلسلہ کے ذریعے سے مذہبی تعلیم حاصل کرنی ضروری ہوگی۔"

دوم سلسلہ اس سلسلے سے اعلیٰ درجے کی مذہبی کتابوں کا مقرر ہونا چاہیے کیونکہ یہ سلسلہ مدرسۃ العلوم کے ادنیٰ درجے سے علاقہ رکھے گا جس کا ذکر دفعہ ۱ طریقۂ تعلیم میں ہے اور اس درجے میں بشمول دیگر علوم کے چار برس تک تعلیم ہوگی۔ اس درجے میں دینیات کی ایسی کتابیں عربی کی منتخب ہونی چاہیں جو ایک مستعد طالب علم کے پڑھنے کے لائق ہوں اور جو عموماً اعلیٰ درجے کے طالب علموں کے درس و تدریس میں داخل ہوں گی گو اس درجے کے لیے فارسی زبان کی کتابوں کا بھی کوئی سلسلہ منتخب ہو تو نہایت مناسب ہوگا بلکہ اگر اس درجے کے لائق اردو زبان میں بھی کوئی سلسلہ پیدا کیا جاوے تو مسلمانوں کے حق میں نہایت مفید ہوگا اور اگر آپ کی کمیٹی توجہ فرمائے گی تو بذریعۂ تصنیف و ترجمہ کتب بزبان اردو ایسا سلسلہ مرتب ہو جانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

تیسرا سلسلہ: اس سلسلے سے بھی اعلیٰ درجے کی مذہبی کتابوں کا مقرر ہونا چاہیے، کیونکہ یہ سلسلہ مدرسۃ العلوم کی اعلیٰ درجے کی تعلیم سے علاقہ رکھتا ہے جس کا ذکر دفعہ ۱۱ طریقۂ تعلیم میں ہے۔ اس سلسلہ میں ایسی مشکل اور دقیق کتابیں داخل ہونی چاہئیں جو ایک ہی سے اور مکمل فاضل ہونے کے لیے

درکار ہیں اور اگر اس درجے کے لیے بھی فارسی
اور اردو زبانوں کا سلسلہ بھی مرتب کیا جاوے
تو نہایت عمدہ بات ہوگی۔

**چہارم:** یہ تینوں سلسلے اس لحاظ سے
مرتب ہوں گے کہ طالب علموں کو اور علوم کے
پڑھنے کا بھی، جس کے ساتھ یہ سلسلہ مذہبی
پڑھایا جائے گا، موقع رہے، لیکن بعض طالب علم
ایسے ہوں گے جن کی خواہش یہ ہوگی کہ صرف دینیات
ہی میں اعلیٰ اور کامل درجے کی تعلیم پاویں
پس ان کے لیے ایک عمدہ سلسلہ خاص صرف
عربی زبان کا مرتب کرنا چاہیے جس میں کتابیں
ہر ایک درجے میں کسی قدر زیادہ اور بہ نسبت
کتب سلسلہ ہائے مذکورہ بالا زیادہ مشکل
اور زیادہ دقیق ہوں کیونکہ جو لوگ صرف دینیات
ہی میں اعلیٰ درجے کی تعلیم چاہیں گے اور پوری
کامل درجے کی اور دقیق تعلیم ہونی چاہیے۔

یہ تمام سلسلے جن کا اوپر مذکور ہوا
مذہب اہل سنت وجماعت کے مطابق حنفی
مذہب کے منتخب ہونے چاہییں۔ کیونکہ تمام
اہل ہند سنی حنفی مذہب ہیں اور مدرسۃ العلوم
میں حنفی مذہب کی تعلیم ہوگی۔ دینیات
میں علوم مفصلہ ذیل داخل ہوں۔
فقہ، حدیث، تفسیر، اصول فقہ
اصول حدیث، اصول تفسیر، علم عقائد
علم کلام۔

پس انھیں علوم کی کتابیں سلسلہ تعلیم
علوم مذہبی میں جس طرح کے مناسب
ہوں داخل کی جاویں۔" ؎

مذکورہ بالا تجزیے کی روشنی میں جدید علوم کی
احادیث اور علوم دینیہ کی اہمیت اور عظمت کا عرفان
مشکل نہیں لیکن مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات کا
وجود طاق نسیاں ہو کر رہ گیا ہے۔ اگرچہ دینیات نصاب
کا لازمی جزو ہے لیکن اس لزوم کے باوجود نہ ترقی درجات
اور حصول انعام کا ذریعہ نہیں بنتے۔ غالباً اسی لیے طلباء اور
طالبات اس مضمون کے ساتھ اعتناء نہیں برتتے۔ اس کا
لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف معلومات کا دائرہ محدود ہے بلکہ
غیر سنجیدگی کی فضا بھی عام ہے۔ اس کے علاوہ بی۔ ٹی ایچ
اور ایم۔ ٹی ایچ کی سطح پر اختیاری مضمون کی حیثیت سے اس
کا برسوں سے رواج ہے مگر اول الذکر کے ایم۔ اے کے
ساتھ کرنے کی غیر معمولی رعایت اور بی۔ اے کی سطح تک اختیاری
مضمون کی حیثیت سے فقدان کے باعث معیار ناگفتہ بہ
ہے۔

ایم۔ ٹی ایچ کا نصاب اپنے معیار کی بلندی اور
معلومات کی وسعت کے اعتبار سے یونیورسٹی کے شایانِ
شان ہو سکتا ہے لیکن حیرت کا مقام ہے کہ اس
کے نصاب یونیورسٹی کے مروجہ دو سالہ نصاب کے مقابلہ
میں صرف ایک سال ہی میں درجۂ اتمام کو پہنچ جاتا ہے
اور مستثنیات کے علاوہ اس کا معیار بھی دینی اداروں
کے مروجہ نصاب کا حریف نہیں بن سکتا اور کیسے بن
سکتا ہے جب کہ دینی اداروں کا دس سالہ مبسوط اور
مفصل نصاب اور شبانہ روز محنت اور یہاں عربی
کی مناسب استعداد کا فقدان اور سہ سالہ سرسری
نصاب۔

مسلم یونیورسٹی علوم عالیہ کا مرکز اور بین الاقوامی
شہرت کا ادارہ ہے۔ لہٰذا شعبۂ دینیات کی صرف
یہی ذمہ داری نہیں ہے کہ نوجوان مسلم طلبا اور طالبات
کی روحانی اصلاح اور ذہنی تربیت کی خدمات انجام
دے بلکہ عالمی سطح پر اسلام اور بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

کے خلاف تحقیقات کی گرم بازاری کا عالمانہ اور محققانہ جواب دے اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے علوم عالیہ کی تجدید و ترسیل کی خدمات بھی انجام دے۔

# حواشی

۱ سرسید اجلاس اول محمڈن ایجوکیشنل کانگریس، منعقدہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء، بمقام علی گڑھ (سرسید کے لکچروں کا مجموعہ ص ۲۵۰)

۲ مکاتیب سرسید، مرتبہ مشتاق حسین، ص ۱۳۶

۳ ایضاً ص ۱۰۵، ۱۰۴

۴ ایضاً ص ۱۳۶

۵ مولانا عبداللہ انصاری کے تقرر سے قبل قرآن پاک کے ترجے کا کام مولانا شبلی کے سپرد تھا۔ جب موصوف کا ناظم دینیات کی حیثیت سے تقرر ہوا تو مولانا شبلی نے سرسیّد کے نام ایک خط میں لکھا:

> "بلکہ جو شخص خاص دینیات کے لیے ایک معقول مشاہرہ پاتا ہو کالج کی انتظامی حیثیت سے یہ کام (قرآن شریف کا ترجمہ) اس کے تعلق ہونا، بہتر ہے۔"

۶ مکاتیب سرسید، مرتبہ مولوی مشتاق حسین ص ۳۹- ۲۳۸

۷ ایضاً ص ۲۹- ۲۲۸

۸ ایضاً ص ۲۶- ۳۲۲

(پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ اکتوبر ۱۹۸۵ء)

> "دنیا میں کسی قوم کی ترقی کے یہی دو نشان ہیں۔
> ایک یہ کہ وہ سمجھنے لگیں کہ وہ ذلت اور خرابی میں مبتلا ہیں
> اور
> دوسرا یہ کہ وہ اس ذلت سے نکلنے کی کچھ کوشش کریں۔"
>
> سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱ شمارہ ۹-۱۰ (ستمبر اکتوبر ۹۲ء)

# تفسیر القرآن کا فارسی ترجمہ

کبیر احمد جائسی

اِس بات کا علم کم ہی لوگوں کو ہوگا کہ سرسیدؒ کی متنازع فیہ تفسیر کلام پاک کا فارسی زبان میں ۲ جلدوں میں تفسیر القرآن ہی کے نام سے بڑی آب و تاب کے ساتھ ترجمہ ہوا ہے۔ شاید یہ یاد دلانا بے محل نہ ہو کہ علمی دنیا میں صرف انہی کتابوں کے ترجمے کیے جاتے ہیں جن کو کسی نہ کسی لحاظ سے کوئی نہ کوئی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ سرسیدؒ کی تفسیر کی پذیرائی ہندوستان میں تو کم ہی ہوئی مگر ایک ایرانی عالم کے نزدیک یہ تفسیر اتنی اہم ٹھہری کہ اس نے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کر ڈالا۔ حالانکہ خود فارسی زبان میں جو تفسیری سرمایہ موجود ہے اس کے سامنے اردو زبان کے تفسیری سرمایے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ سرسیدؒ کی تفسیر کے مترجم مشہور ایرانی عالم سید محمد تقی فخر داعی گیلانی ہیں جنھوں نے متعدد اردو اور انگریزی کتابوں کے فارسی ترجمے کرکے اپنی زبان کے ادبیات کے دامن کو وسیع تر کرنے کی کوشش کی ہے۔

فاضل مترجم نے سرسیدؒ کی تفسیر کے صرف ترجمے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ دونوں جلدوں میں انھوں نے مقدمے بھی لکھے ہیں، جن میں انھوں نے سرسیدؒ کی تفسیر کی اہمیت و معنویت کو واضح و روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے سرسیدؒ کے اندازِ تفسیر کو سمجھنے کے لیے دو مقالات سے بھی مدد لی ہے جن میں سے ایک خود سرسیدؒ کا ہے جس کا عنوان "تحریر فی اصول التفسیر" ہے۔ انھوں نے سرسیدؒ کے اس مقالے کا بھی فارسی زبان میں ترجمہ کرکے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے اور دوسرا علامہ شبلی نعمانیؒ کا ہے جو علوم القرآن کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں علامہ شبلی نعمانیؒ کو تو سرسیدؒ کی مذہبی فکر کا شدید مخالف سمجھا جاتا رہا ہے اور ان کے معتقدین ان کو اسی رنگ میں نہ صرف پیش کرتے رہے ہیں بلکہ آج بھی پیش کرتے ہیں، مگر یہ ایک عجیب لیکن دلچسپ بات ہے کہ ایک ایرانی سرسیدؒ کی تفسیر کو علامہ شبلی نعمانیؒ کے حوالے سے سمجھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔

فخر داعی گیلانی کے مقدمہ سے اس حیرت انگیز مگر خوش گوار حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ سرسید کے انتقال کے تقریباً ۲۰ بیس برسوں کے بعد ایک فارسی مجلّہ "کاوہ" برلن میں "مشاہیر مردمانِ مشرق و مغرب" کے عنوان سے ایک مقالہ شایع ہوا تھا، جس میں سرسید کا بھی خاص طور سے ذکر ہے۔ فخر داعی گیلانی نے مجلۂ "کاوہ" کی اس تحریر کو حرف بہ حرف نقل کرکے اپنے قارئین کو سرسیدؒ کی شخصیت اور کارناموں سے روشناس کرایا ہے۔ مذکورہ تحریر میں ہم ہندوستانیوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے، اس لیے اس سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ البتہ اس قدر عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں یہ تحریر معرضِ وجود میں آئی تھی، علی گڑھ مسلم

یونیورسٹی علی گڑھ اپنے ابتدائی دور میں تھی اور اس وقت اس درس گاہ میں کل ایک ہزار طلبا زیر تعلیم تھے۔ مقالہ نگار کے نزدیک یہ ہندوستان کی وہ واحد یونیورسٹی ہے جو خود ہندوستانیوں کے سرمایے سے عالم وجود میں آئی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مقالہ نگار نے یونیورسٹی کی مسجد، پریس، اسپتال اور گزٹ کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ غالباً یہ چیزیں ایک ایرانی کے لیے نئی رہی ہوں گی اس لیے اس نے خاص طور سے ان کا ذکر کیا ہے۔

فخر داعی گیلانی نے اپنے قارئین سے مقدمہ میں گزارش کی ہے کہ وہ سرسید کی تفسیر کا فارسی ترجمہ پڑھنے سے پہلے سرسیدؒ کے مقالے "تحریر فی اصول التفسیر" کو ٹھہر ٹھہر کر غور و فکر سے چند بار پڑھ لیں تاکہ ان کو سرسید کی مذہبی فکر تک رسائی حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ علاوہ بریں انھوں نے اپنے مقدمہ میں سرسیدؒ کے اس قول "من شاگرد مکتب قرآنم [میں مکتب قرآن کا طالب علم ہوں] کو خاص طور سے نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ سرسیدؒ کی تحریر کا ماخذ چونکہ قرآن اور صرف قرآن ہے اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں سے کسی بھی فرقے کی طرف داری نہیں کی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے ہر اس مفسر کی رائے کو بلا خوف و خطر مسترد کر دیا ہے جس کی رائے کا اثبات کلام پاک سے نہیں ہوتا۔ فخر داعی کے نزدیک سرسیدؒ کی تفسیر کلام پاک "عدیم النظیر" ہے اور وہ اپنے مقدمے میں بار بار اس کی طرف اشارہ کرکے اس تفسیر کی اہمیت کو اپنے قارئین پر واضح کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

"کتاب تفسیر القرآن روی ہم رفتہ حقایق و معارفی را در بر دارد کہ نظیر آنرا در ہیچ یک از کتب مماثل نمی توان بدست آورد و چون پایۂ بیانات (علیہ) بقدری بلند و نیز عمیق و دقیق است کہ بحث در اطراف آن و اظہار نظر از عہدۂ من بندہ بواسطۂ کمی سرمایہ خارج است علیہذا قضاوت آنرا بعہدہ خوانندگان فاضل وامیگذارم و این بیان را در ہمین جا ختم می نمایم، ہمین قدر می نویسم کہ امروز بواسطۂ ترقی حیرت انگیز علوم، مذہب در ہمہ جا رو بہ ضعف و سستی نہادہ تنہا طریق برای حفظ عقاید مذہبی دانشجویان ہمانا انتشار و انتشار این گونہ آثار علمی محققین معاصر است[۳۵]"

[مجموعی طور سے کتاب تفسیر القرآن اُن حقایق اور معارف کی حامل ہے جن کی نظیر کسی بھی تفسیر کی کتاب سے ہاتھ نہیں آسکتی۔ چوں کہ اُن کے بیانات کی اساس اتنی بلند، دقیق اور عمیق ہے کہ یہ بندہ اپنی کم علمی کی وجہ سے ان کے اطراف کا نہ تو احاطہ کرسکتا ہے اور نہ ہی اُن پر کوئی رائے ظاہر کرسکتا ہے اس لیے اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا کام میں قارئین پر چھوڑتا ہوں اور اپنی بات کو یہیں پر ختم کرتے ہوئے صرف اس قدر تحریر کرتا ہوں کہ آج علوم کی حیرت انگیز ترقی کی وجہ سے (دنیا میں) ہر جگہ مذہب ضعیف اور سست بنیاد ہو گیا ہے اپنے مذہبی عقائد کی حفاظت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس طرح کے معاصر طالبان علم محققوں کی علمی یادگاروں کو شایع کیا جائے]۔

اس مقدمہ کی یہ بات ہم کو بہت کھٹکتی ہے کہ سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے اپنی "کم علمی" کا سہارا لیتے ہوئے سرسیدؒ کی تفسیری فکر پر کوئی تنقیدی نظر نہیں ڈالی ہے۔ اگر وہ وقت نکال کر فارسی کی چند قدیم و جدید تفسیروں سے سرسیدؒ کی تفسیر کا تقابلی مطالعہ کر لیتے تو اُن کے قارئین کے سامنے یہ نکتہ بالکل واضح ہو کر آجاتا کہ سرسیدؒ اپنی تفسیری آرا میں کسی قدیم یا

اپنے معاصر مفسّرے متاثر ہیں یا نہیں ؟ علاوہ بریں اس بات کا بھی علم ہوتا کہ چوتھی صدی ہجری کے وسط سے سرسیّد کے عہد تک فارسی زبان ہیں ایران میں جو تفسیریں لکھی گئی ہیں، اُن میں کوئی ایسی تفسیر بھی ہے جو سرسیّدؒ کی تفسیری فکر کی ہم نوائی کرتی ہے ؟ فارسی کا تفسیری سرمایہ انتہائی وسیع ہے۔ اگر فخر داعی گیلانی نے سرسیّدؒ کی تفسیر کا ترجمہ کرنے کے بعد اپنا مقدمہ لکھتے وقت اس کام کو کر ڈالا ہوتا تو اُن کا مقدمہ عدیم النظیر نہ سہی اعلیٰ درجے کا کہلانے کا مستحق ہوتا۔

تفسیر القرآن کی دوسری جلد بہمن ماہ ۱۳۳۲ھ ش میں شایع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس کے مقدمے کے مطالعے سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ جب تفسیر القرآن کی پہلی جلد کا ترجمہ شایع ہوا تو اہل علم نے اس کی بڑی گرم جوشی سے پذیرائی کی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد ان سے تقاضا ہونے لگا کہ تفسیر القرآن کی دوسری جلد کا بھی ترجمہ وہ جلد از جلد منظر عام پر لائیں لیکن اس وقت وہ پرسی سایکس کی انگریزی کتاب کا فارسی ترجمہ "تاریخ مفصل ایران" کے نام سے کرنے میں مشغول تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ علامہ شبلی نعمانی کی کتاب "سوانح مولانا روم" کا بھی فارسی ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ جب ان دونوں ترجموں سے ان کو فرصت ملی تو ان پر اتنی تھکن غالب آگئی کہ ان کے معالجوں کو انھیں مشورہ دینا پڑا کہ وہ کچھ دنوں تک ایران سے باہر کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام کریں لیکن ان کے ایک دوست نے، جن کا نام انھوں نے نہیں لکھا ہے، تفسیر القرآن کی دوسری جلد کے ترجمے کی ترغیب دینی شروع کی۔ اس ترغیب نے ان پر مہمیز کا کام کیا اور وہ یکسو ہو کر اس کام میں لگ گئے۔ اس طرح تفسیر القرآن کی دوسری جلد کا ترجمہ اختتام کو پہنچا۔

جلد دوم کے مقدمے میں بھی فخر داعی گیلانی نے سرسیدؒ کی مختصر سوانح حیات تحریر کر دی ہے۔ تاکہ جو لوگ تفسیر القرآن کی پہلی جلد نہ دیکھ سکے ہوں اور دوسری جلد ان کے ہاتھوں میں ہو وہ بھی سرسیّدؒ کی زندگی اور ماحول سے کسی قدر واقف ہو جائیں۔ تاکہ ان کو اس بات کا اندازہ کرنے میں آسانی ہو کہ سرسیّد کون تھے، کیا تھے۔ کن حالات اور کس ماحول میں انھوں نے زندگی بسر کی اور ان کے کارہائے نمایاں کیا کیا تھے۔ جب وہ اُن حقایق سے کسی حد تک آگاہ ہو جائیں تو تفسیر القرآن جلد دوم کا مطالعہ کریں۔ سرسیّدؒ کے مختصر حالات زندگی تحریر کرنے کے بعد انھوں نے اس مقدمہ میں بھی "تحریر فی اصول التفسیر" کے تمام نکات کا اپنی زبان میں ایک خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ تاکہ اُن کا ایرانی قاری سرسیّد کی تفسیری فکر سے بخوبی آشنا ہے اور جب وہ تفسیر القرآن کے ترجمے کا مطالعہ کرے تو سرسیّد کی ہر بات کا سمجھنا اس کے لیے سہل ہو۔

تفسیر القرآن جلد اول کے مقدمہ ہی کی طرح جلد دوم کے مقدمہ میں بھی فخر داعی گیلانی نے سرسیّدؒ کی تفسیری فکر پر اپنی کوئی رائے ظاہر کرنے سے گریز کیا ہے۔ تاہم وہ بعض بعض باتیں ایسی لکھ گئے ہیں جن کے مطالعے سے یہ نتیجہ برآمد کیا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک سرسیّدؒ کی تفسیری فکر کس قدر و قیمت کی حامل ہے ؟ مثلاً ایک جگہ تحریر کرتے ہیں :

"او در ضمن بیان تفسیر آیات، بسیاری از
مسایل غامضہ و نیز مطالب بسیار دقیق و علمی
را با منطق توانا و بیان شیوا القدری قشنگ و
خوب روشن و صلاحی نمودہ کہ از روی بسیاری
از رازہا پردہ برداشتہ است، بعلاوہ تمامی ایرادات و
اعتراض سخت مخالفین را ہم جواب قاطع و دندان
شکن دادہ است، در اثبات مسائل اکثر دلائلی
کہ آوردہ راستی بقدر سادہ و روشن و دلنشین
است کہ برای خوانندہ جای ابہام و تردیدی
باقی نمی ماند۔"[۳]

(ت) انھوں نے آیتوں کی تفسیر کے سلسلے میں بہت سے غامض مسئلوں اور گہرے علمی و فلسفیانہ مطالب کو زبردست منطق اور بہترین انداز بیان

میں اس قدر خوب صورت واضح اور چھان پھٹک کر پیش کیا ہے کہ بہت سے رازوں سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ اس کے علاوہ مخالفین کے تمام سخت اعتراضوں کا بھی مسکت اور دنداں شکن جواب دیا ہے۔ مسائل کے اثبات میں وہ جو دلیلیں پیش کرتے ہیں واقعی وہ اس قدر سہل دلنشیں اور واضح ہیں کہ ان کے قاری کے لیے ابہام اور انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی]۔

ایک غیر جانب دار اور غیر عالم کی حیثیت سے جب ہم سر سید کی تفسیر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس الجھن سے دوچار ہوتے ہیں کہ قرآن پاک کی اب تک جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ اپنے افکار و نظریات میں ایک جیسی نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جس دور کے علما کا احادیث کے مطالعے سے خاص شغف رہا ہے اس دور میں کلام پاک کی جتنی بھی تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ سب کی سب صرف احادیث نبوی سے مستفاد ہیں۔ جب مسلمانوں میں یونانی فلسفہ عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تو اس دور کی بیشتر تفسیروں میں یونانی فلسفے کے افکار و نظریات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ جب تصوف مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تو اس دور کی ساری تفسیریں متصوفانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئیں۔ لیکن جب سر سید اپنے عہد کے علوم جدیدہ کے انکشافات و اکتشافات کی روشنی میں قرآن پاک کی آیات کی توضیح، تشریح و تعبیر کرتے ہیں تو ان کی نہ صرف شدید مخالفت ہوتی ہے بلکہ ان کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے حالانکہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ "ایک خدا خالق کائنات موجود ہے[۴۴]۔ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیا مبعوث کیے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق و خاتم المرسلین ہیں[۴۵]۔" "قرآن مجید کلام الٰہی ہے[۴۶]" "قرآن مجید بلفظہ آنحضرت کے قلب پر القا ہوا تھا اور وہی الفاظ اور اسی نظم سے جس طرح القا ہوا ہے آنحضرت نے لوگوں کو پڑھ کر سنایا[۴۷]" "قرآن مجید بالکل سچ ہے کوئی بات اس میں غلط یا خلاف واقعہ مندرج نہیں[۴۸]" "صفات ثبوتی اور سلبی ذات باری کے جس قدر قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں سب سچ اور درست ہیں، مگر ان صفات کی ماہیت کا من حیث ہی ہی جاننا مافوق عقل انسانی ہے[۴۹]۔" "صفات باری عین ذات ہیں اور وہ مثل ذات کے ازلی و ابدی ہیں اور مقتضائے ذات ظہور صفات ہے[۵۰]" "تمام صفات باری نامحدود اور مطلق عن القیود ہیں[۵۱]" "قرآن مجید میں کوئی امر ایسا نہیں جو قانون فطرت کے برخلاف ہو[۵۲]" "قرآن مجید جس قدر نازل ہوا ہے بتمامہ موجود ہے نہ اس میں ایک حرف کم ہوا ہے نہ زیادہ ہے[۵۳]۔" "ہر ایک سورۃ کی آیات کی ترتیب منصوص ہے[۵۴]" "قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ نہیں ہے یعنی اس کی کوئی آیت کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوئی[۵۵]۔" "قرآن مجید دفعۃً اور واحدۃً نازل نہیں ہوا، بلکہ نجماً نجماً نازل ہوا ہے[۵۶]"۔ "موجودات عالم اور مصنوعات کائنات کی نسبت جو کچھ خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے وہ سب صوصًو یا بحیثیۃ من الحیثیات مطابق واقع ہے[۵۷]۔" "باوجود اس بات کے تسلیم کرنے کے کہ قرآن مجید بلفظہ کلام خدا ہے مگر جب کہ وہ عربی میں اور انسان کی زبان میں نازل ہوا ہے تو اس کے معنی اس طرح پر لگاوے جاویں گے جیسے کہ ایک نہایت فصیح عربی زبان

ہیں کلام کہنے والے کے معنی لگائے جاتے ہیں
اور جس طرح کہ انسان استعارہ و مجاز، کنایہ و
تمثیل اور لمی و اقناعی و خطابی و استقرائی و
الزامی کو کام میں لاتا ہے، اسی طرح قرآن مجید
میں بھی استعارہ و مجاز، کنایہ و تمثیل اور دلائل
لمی و اقناعی و خطابی و استقرائی و الزامی سب
موجود ہیں۔" ؎ ۵

سرسید درج بالا جن پندرہ باتوں کے قائل ہیں اُن میں
رے نزدیک ایک اہم بات یہ ہے کہ بعض علما کے برخلاف
سیدؒ اس بات کے قایل ہیں کہ قرآن کے مضامین ہی نہیں بلکہ
س کے الفاظ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیے گئے ہیں
رے نزدیک سرسیدؒ کی تفسیر سے علما نے جو شدید اختلاف
یا اس کے دو خاص اسباب تھے۔

- خرق عادت کا انکار اور آیات متشابہات کی تعبیر
بیہ و تشریح میں جمہور علما کی روش سے ہٹ کر ایک دوسری
ں روش اختیار کرنا بالخصوص ان تفسیری تفصیلات کا انکار
رنا جو اسرائیلیات کے ذریعے ہماری بیشتر تفسیروں میں سرایت
یے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان اسرائیلی تفصیلات سے ہمارے بعض
م اور معتبر علما اختلاف کرتے رہے ہیں مگر قصّہ سننے اور
سنانے کی جو جبلّی خواہش انسان میں ہوتی ہے وہ اس کو
ہم قدم پر افسانہ و افسوں کے اختراع پر اکساتی رہتی ہے۔
شاہ ولی اللہ صاحب بھی اس بات کے قایل ہیں کہ "نقل از
نی اسرائیل بیشتر است کہ در دین ما داخل شدہ وقلم" ؏ بہت سی
سرائیلی روایتیں ایسی ہیں جو ہماری دین میں داخل ہوئیں ؏
سرسید کے ایک کم عمر معاصر علامہ شبلی نعمانیؒ کا بھی کچھ ایسا
ہی خیال ہے (علامہ سرسید سے چالیس برس چھوٹے تھے)
وہ اپنے مقالے علوم القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:
"قصص اور حقائق اشیاء کے متعلق
تفصیلات کا جو سرمایہ ہے وہ درحقیقت
قدرِ کا باعث ہے اور افسوس اور سخت افسوس
ہے کہ تفسیر کے اجزا میں جو حصہ سب سے زیادہ
عوام میں مقبول اور متداول ہے اور سلسلہ بہ سلسلہ
تمام اسلامی لٹریچر میں سرایت کر گیا ہے وہ یہی
حصہ ہے۔ انبیا اور صلحائے سابقین کے افسانے
جو یہودیوں میں پھیلے ہوئے تھے وہ نہایت مبالغہ
آمیز اور دور از کار تھے۔ قرآن مجید میں نہایت
اجمال کے ساتھ صرف ان واقعات کو بیان کیا
گیا جو فی نفسہٖ صحیح تھے اور جن سے طبائع پر کوئی
اخلاقی عمدہ اثر پڑتا تھا۔ ہمارے مفسرین نے
قرآن مجید کو ایک متن قرار دیا اور اس کی
شرح میں وہ تمام بے ہودہ افسانے شامل کر دیے
جن کے سامنے بوستان خیال کی بھی کچھ حقیقت
نہیں۔ حقائق اشیا کے متعلق جو کچھ قرآن
مجید میں مذکور تھا اس کے ساتھ بھی یہی سلوک
کیا گیا۔ چاہ بابل، کوہ قاف، سکندر ذوالقرنین
یاجوج ماجوج وغیرہ وغیرہ کی نسبت جو روایتیں
مسلمانوں میں پھیلی ہیں وہ اُن ہی تفسیروں
کی بدولت ہیں" ؎

یہ مقالہ جس زمانے میں معرض وجود میں آیا ہوگا
سرسیدؒ کی تفسیر کے کئی ناقدین القیدحیات رہے ہوں گے مگر
ہم کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوتا ہے کہ علامہ شبلیؒ کی اس تحریر پر
سرسیدؒ کا کوئی ناقد ان کی گرفت نہیں کرتا کہ وہ اسرائیلی روایات
کے سلسلے میں سرسید کے ہم نوا کیوں ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی یہ
سوچنا پڑتا ہے کہ سرسید کی مذہبی فکر سے ان کے عہد حیات میں
جو اختلاف کیا گیا اس کے محرکات صرف یہی نہیں تھے کہ علما سرسید
کی تفسیری فکر کو "گمراہ کن" سمجھتے تھے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ بھی
ہوگی کہ ان کے مخالفین کو ان کی علمی، اصلاحی اور سماجی تحریک
سے شدید اختلاف تھا۔ فریق مخالف کی ہر بات کی مخالفت کرنا

انسان کی فطری کمزوری ہے جس سے اس عہد کے علما بھی مبرّا قرار نہیں دیے جا سکتے۔ سرسیّد سے پہلے نہ جانے کتنے تفسیری مکتب فکر وجود میں آئے، نہ جانے کتنی نئی نئی عقلی باتوں کو تفسیر کلام پاک میں شامل کیا گیا، معتزلی، متصوفانہ اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے قرآن پاک کی آیات کی تفسیر، تاویل اور تشریح کی گئی مگر جس شد و مد کے ساتھ سرسید کی تفسیر کو ہدف تنقید بنایا گیا وہ دوسروں کی تفسیری تاویلات کے ضمن میں کم نظر آتا ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک سرسید کی تفسیر کی مخالفت کا اصل سبب ان کی "دینی گمراہی" نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سرسیّد نے خرق عادت کے سلسلے میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس کو ماضی قریب کے ایک عالم نے کس نظریے سے دیکھا ہے۔ اس سلسلے میں مخدوم گیلانی نے اپنے ترجمے کی دوسری جلد میں تحریر کیا ہے:

"درخصوص مسئلہ اعجاز و خرق عادت کہ از مسایل عمدۂ کتاب است و راجع بان منقول از ابن رشد در صدر کتاب مبسوطاً بحث شدہ یکی دو تذکر است کہ لازم می دانم آنرا در این جا بعرض برسانم۔ اولاً این مرد بزرگ منکر اصل اعجاز نیست ولی باین حرف کہ آن دلیل بر ثبوت نبوت باشد جداً مخالف است و ثانیاً در این شکی نیست کہ در انسان قوہ ای وجود دارد کہ افعال شگفت انگیز از وی صدور می یابد کہ حتی دانش مندان علوم جدید آنہا را بہ خرق تعبیر می کنند و معترفند کہ آن از دسترس جسم و مادہ خارج می باشد و بنا برین کسی کہ عاقل است چگونہ می تواند آنرا سراسر انکار کند البتہ این عرق ہست کہ عوام مردم معتقداند کہ آنہا مستقیماً و بلا واسطہ از خدا بیرون و ظہور می رسند بخلاف خواص و مردم دانا کہ می گویند در عالم اسباب ہر چیز وابستہ سبب و علت است و روی این اصل برای خوارق عادات ہم علت و سببی در کار است، چنانکہ حکما و عرفای اسلام مثل حکیم ابو علی سینا، امام غزالی، شاہ ولی اللہ امور خارق العادہ را معلول علل و اسباب دانستہ اند و آن علل و اسباب را ہم وضوحاً تشریح کردہ اند۔ ابن سینا در آخر کتاب اشارات فصلی بنام "مقامات العارفین" باز کردہ و راجع بہ علل و اسباب مزبور مبسوطاً بحث نمودہ و آنہا را مخصوصاً نشان دادہ است، ما خوانندگان را بآنجا حوالہ میدہیم۔ در خاتمۂ این بیان تذکر آمی نویسم کہ ترقی شگفت انگیز علوم، پیش رفت سریع فلسفۂ مادی و بالاخرہ واژگون شدن اساس حکمت کہ بر مشاہدات طبیعی و علوم تجربی و ریاضی گذاشتہ شدہ است چنانچہ دیدہ میشود عقاید کہن را از ریشہ کندہ و اساس مذہب را در ہمہ جا بطور وحشتناکی متزلزل گردانیدہ است برای حفظ عقاید مذہبی دانشجویان امروز جز نشر و انتشار این گونہ آثار و کتابہای کہ بر مبانی تحقیق و موازین عقل و منطق قرار گرفتہ باشند گمان نمی کنم راہ دیگری باشد۔" [۱]

[۱] خاص طور سے معجزات و خرق عادت کا مسئلہ جو کہ کتاب کے عمدہ مسائل میں سے ہے، اس سلسلے میں ابن رشد نے جو کچھ لکھا ہے، اس پر کتاب میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے (اس سلسلے کی) دو ایک باتیں ہیں جن کو میں اس جگہ پر بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہ عظیم انسان (سرسیدؒ) معجزات

کی حقیقت کا منکر نہیں ہے لیکن وہ اس بات کا سخت مخالف ہے کہ معجزات نبوت کی دلیل اور ثبوت ہوتے ہیں۔ دوئم یہ کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ انسان میں ایک ایسی قوت موجود ہے جس سے ایسے حیرت انگیز افعال ظاہر ہوتے ہیں جن کو علوم جدیدہ کے ماہرین بھی خرق عادت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ (افعال) جسم اور مادہ کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ شخص جو کہ عاقل ہے کس طرح ان (افعال) کا کلیتاً انکار کر سکتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ عوام اس بات کے قایل ہیں کہ یہ براہ راست خدا کی طرف سے نمایاں اور ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس خواص اور دانشمند لوگ یہ کہتے ہیں کہ عالم اسباب میں ہر چیز سبب اور علت سے وابستہ ہے اور اس نظریے کے مطابق خرق عادت کے لیے بھی سبب اور علت درکار ہیں۔ چنانچہ مسلمان فلسفیوں اور علماؤں مثلاً ابوعلی سینا، امام غزالی اور شاہ ولی اللہ نے خارق العادت امور کو علل و اسباب کا معلول سمجھا ہے اور ان علل و اسباب کی بڑی وضاحت کے ساتھ تشریح کی ہے۔ ابن سینا نے اپنی کتاب اشارات کے آخر میں ایک فصل "مقامات العارفین" کے عنوان سے لکھی ہے اور درج بالا علل و اسباب کے سلسلے میں بڑی تفصیل سے بحث کرتے ہوئے ان کی خاص طور پر نشاندہی کی ہے۔ ہم اپنے قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہیں۔ اس بحث کے خلاصے پر ہم بطور یادداشت تحریر کرتے ہیں کہ علوم

کی حیرت انگیز ترقی مادی فلسفہ کی تیز رفتار پیش رفت اور اس فلسفے کی بنیادوں کے ڈھے جانے نے، جس کی بنیاد طبیعی مشاہدات تجرباتی علوم اور ریاضی پر رکھی گئی ہے۔ قدیم عقاید کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہے اور (دنیا میں) ہر جگہ مذہب کی بنیادوں کو حیرت انگیز حد تک متزلزل کر دیا ہے۔ مذہبی عقیدوں کی حفاظت کے لیے آج کے دانشمندوں کے سامنے اس راہ کے علاوہ میرے خیال میں کوئی اور راہ نہیں ہے کہ اس طرح کی مذہبی کتابوں کی نشر و اشاعت کی جائے جن کی بنیاد تحقیق، عقلی میزانوں اور منطق پر رکھی گئی ہو۔"

درج بالا اقتباس کے غائر مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف تو فخر داعی گیلانی نے سرسید پر عاید ہونے والے الزامات کی تردید کی ہے اور دوسری طرف اس بات کی ضرورت بھی محسوس کی ہے کہ موجودہ دور میں مذہبی عقاید کی حفاظت کے لیے "تفسیر القرآن" جیسی کتابوں کی اشاعت ہونی چاہیے۔ علوم جدیدہ کی برق رفتار پیش رفت نے مذہبی اعتقادوں کو جس طرح متزلزل کر دیا ہے اس کا دفعیہ اسی طرح ممکن ہے۔ "تفسیر القرآن" لکھنے کا سرسید کا مقصد بھی یہی تھا جس کی طرف فخر داعی گیلانی نے اشارہ کیا ہے۔ سرسید نے "تحریر فی اصول التفسیر" کے دیباچے میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں علوم جدیدہ کو رائج کرنے کے ذمہ دار وہ ہیں۔ اس لیے یہ ان کا فرض ہوتا ہے کہ علوم جدیدہ کی تحصیل کے بعد ہندوستانی مسلمان جن مذہبی شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں ان کا سد باب وہی کریں۔ سرسید کی تفسیر قرآن پاک "تفسیر القرآن" ان راسخ العقیدہ مسلمانوں کے لیے نہیں لکھی گئی ہے جن کے قلوب مذہبی امور میں شکوک و شبہات سے پاک ہیں۔

سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے جس محنت، دیدہ ریزی اور علمی بصیرت سے سر سید کی اردو نثر کا خوبصورت ترین فارسی میں ترجمہ کیا ہے اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ ان کے ترجمے کے اسلوب پر تو ہم کسی دوسرے موقع پر روشنی ڈالیں گے اس وقت ان کے ترجمے کے چند نمونے ہی نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان نمونوں کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے سر سیدؒ کی علمی تحریر کا کس شگفتہ اور علمی انداز کی فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔

سر سیدؒ نے سورہ بقرہ کی تفسیر کی ابتدا اس طرح کی ہے:

"(الٓمٓ) یہ سورۃ انہی انتیس ۲۹ سورتوں میں سے ہے جن کو خود خدا نے ان کے نام سے موسوم ہے۔ یہ حروف مقطعات ان سورتوں کے نام ہیں جن کی (جو اُن کی؟) ابتدا میں آئے ہیں اور جو سورتیں باہم کسی قسم کی مناسبت رکھتی ہیں ان کے ایک ہی نام مقرر کیے ہیں۔ اب یہاں تین باتیں غور طلب ہیں۔ ایک یہ کہ انہی انتیس سورتوں کا نام مقرر کرنے کا کیا سبب ہے۔ دوسرے یہ کہ حروف مقطعات سے کیوں ان کے نام مقرر کیے ہیں۔ تیسری یہ کہ جن حروف مقطعات سے ان سورتوں کے نام مقرر کیے ہیں۔ انہی حروف سے ان کا نام مقرر کرنے کا کیا سبب ہے؟[۲۳]

سر سید کی اس تحریر کا ترجمہ فخر داعی گیلانی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"(الٓمٓ) از میان سورِ نوزدگانہ ای کہ خدا برای آنہا نام مقرر کردہ است یکی ہم ہمین سورہ است این نام عبارت از حروف مقطعہ ایست کہ در ابتدای سورہ مزبورہ درج می باشد و مخصوصاً سوری کہ بین آنہا جہت جامعہ یا قدر مشترکی وجود دارد بنام واحد خواندہ شدہ اند۔ حال سہ مطلب در این جاہست کہ ہر کدام قابل ملاحظہ می باشد یکی آنکہ چرا برای این سورہ ہا نام تعیین شدہ و دیگر چرا این نام بحروف مقطعہ تخصیص یافتہ است۔ سوم این کہ وجہ اختصاص آن بحروف مزبورہ چیست؟"[۲۴]

اس کے بعد سر سید تحریر کرتے ہیں:

"قرآن مجید پر غور کرنے سے اعلانیہ پایا جاتا ہے کہ جس سورت کو خدا تعالیٰ نے قسمیہ طور پر یا اس طرزِ کلام پر شروع کیا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے یا یہ خدا کی کتاب ہے، اس مقام پر خدا نے اس سورۃ کو کسی اسم سے موسوم کیا ہے تاکہ ان کا نام لینے سے اس کے مسمّٰی پر اس امر کا اطلاق ہو جس کا اطلاق کرنا منظور ہے اور جن سورتوں کو اس طرز کلام سے شروع نہیں کیا، ان کا نام رکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔"[۲۵]

اب اس عبارت کا فارسی ترجمہ ملاحظہ ہو:

"بعد از غوص در قرآن مجید این مطلب ظاہر میشود کہ خداوند ہر سورہ ای را کہ بطور قسمیہ یا بدین اسلوب افتتاح کردہ کہ این ست کتاب خدا و یا آن، کلام خدا است برای آن سورہ نام مقرر داشتہ است تا از ذکر نام اطلاق امری کہ در نظر گرفتہ شدہ است آن امر بر مسمای آن نام اطلاق شدہ باشد و معلوم است سورہ ہای کہ بطرز مزبور افتتاح کلام نشدہ ضرورتی برای تعیین یا انتخاب نام نبودہ است۔"[۲۶]

اس کے بعد سر سیدؒ نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے

تحریر کیا ہے:

" مثلاً اس سورت کا نام جس کی ہم تفسیر کر رہے ہیں (الٓمٓ) ہے۔ اب خدا تعالیٰ نے طرز کلام اس طرح پر شروع کیا ہے کہ یہ سورت خدا کے کتاب کی ہے تو اس نے اس سورت کا نام لے کر کہہ دیا کہ الٓمٓ یعنی اس کا مسمّٰی وہ کتاب ہے پس الٓمٓ جو اس سورت کا نام ہے مبتدا ہے اور ذٰلِکَ مبتدا ثانی ہے اور الکتاب اس کی خبر ہے اور یہ مبتدا و خبر مل کر پہلے مبتدا کی خبر ہیں اور الٓمٓ کا مسمّٰی ذٰلِکَ الکتاب پر محمول ہے۔"[۲۷]

فخر داعی گیلانی نے اس عبارت کو یوں فارسی زبان کے قالب میں ڈھالا ہے،

" مثلاً سورۂ حاضر کہ نامش الٓمٓ می باشد چون طرز کلام را خداوند بدین نحو شروع فرمود کہ " این سورۂ کتاب خدا است" لذا دیدہ میشود کہ نام برای آن مقرر کردہ می فرماید، الٓمٓ، یعنی مسمای وی آن (مسمی) کتاب است، پس الٓمٓ کہ نام سورہ است، مبتدا است، " ذٰلِکَ" مبتدا ثانی و " الکتاب" خبر آن میشود و این جملۂ مبتدا و خبر، خبر است برای مبتدای اول و " الٓمٓ" یعنی مسمای آن محمول بر " ذٰلِکَ الکتاب" است۔"[۲۸]

درج بالا چند مثالوں ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فخر داعی گیلانی نے سرسید کی اردو تفسیر القرآن کو کتنی آسان، دلکش اور غیر مبہم فارسی زبان میں منتقل کیا ہے اور اپنے ترجمے کو ایک طبع زاد تحریر کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔

بعض تاملات کی بنا پر ہندوستان میں تو سرسید کی تفسیر کے پڑھنے والے انگشت شمار ہیں، مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ اس فارسی ترجمے کے ذریعے سرسید کی مذہبی فکر سے وہ لوگ واقف ہوتے رہتے ہیں جن کی مادری زبان فارسی ہے۔ اس ترجمے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ایرانی عالم کے نزدیک سرسیّد کی مذہبی فکر اتنی توانا اور فعال ہے کہ اس نے اس فکر سے اپنے ہم زبانوں کو واقف کرانا ضروری سمجھا اور اس کے ترجمے میں اپنی عمر عزیز کا اچھا خاصا حصہ صرف کیا۔

# حواشی

۱۔ مقالات شبلی، جلد ۱۔ صفحہ ۲۵-۳۳، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء

۲۔ تفسیر القرآن، ج ۱، اشاعت دوم، مرداد، ۱۳۳۴ھ ش ص ح

۳۔ تفسیر القرآن ج ۲ اشاعت اول، ص ھ

۴۔ تحریر فی اصول التفسیر، نول کشور سٹیم پریس، لاہور، ۱۹۱۳ء ص ۱۹

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

۸ تحریر فی اصول التفسیر، نول کشور سٹیم پریس، لاہور، ۱۹۱۳ء — ص ۲۰
۹ ایضاً — ص ۲۰-۲۱
۱۰ ایضاً — ص ۲۱
۱۱ ایضاً — ص ۲۱
۱۲ ایضاً — ص ۲۵-۲۶
۱۳ ایضاً — ص ۲۸
۱۴ ایضاً — ص ۲۸
۱۵ ایضاً — ص ۲۸
۱۶ ایضاً — ص ۲۹
۱۷ ایضاً — ص ۳۰
۱۸ ایضاً — ص ۳۰
۱۹ الفوز الکبیر بحوالہ تحریر فی اصول التفسیر — ص ۳۴
۲۰ مقالات شبلی ج ۱- مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء — ص ۳۰-۳۱
۲۱ تفسیر القرآن (فارسی ترجمہ) — ص ہ، و
۲۲ ایضاً — ص ۲
۲۳ تفسیر القرآن، ج ۱، مطبع گلزار محمدی، لاہور، ۱۸۹۱ء — ص ۱۴
۲۴ تفسیر القرآن (فارسی ترجمہ) جلد ۱، ص — ص ۴۰
۲۵ ایضاً (اردو) — ص ۱۴
۲۶ تفسیر القرآن (ترجمہ فارسی) جلد ۱، — ص ۱۴
۲۷ ایضاً (اردو) ج ۱ — ص ۱۴
۲۸ ایضاً (فارسی) ج ۱ — ص ۴۰

[ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۵ - ش ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء]

"مسلمانوں کو یہ شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں۔ ان کو جوش پیدا نہیں ہوتا۔ ان کو غیرت نہیں آتی۔"

سرسید رح

# سرسیّد، تعلیم اور قومی یکجہتی

علی اختر خاں

ہندوستان صدیوں سے مختلف مذاہب، نظریوں، زبانوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف قوموں، نسلوں اور رنگوں کے لوگ یہاں آئے اور سدا کے لیے یہیں رچ بس گئے۔ وہ آپس میں اس طرح شیر وشکر ہوئے کہ دوئی کا احساس جاتا رہا۔ تہذیبوں کے اس اختلاطِ مسلسل سے 'کثرت میں وحدت' کا تصور جاگا اور "پرامن بقائے باہم" کا جمہوری نظریہ وقت کی اہم ترین ضرورت بن کر نمودار ہوا اور ہندوستان میں ایک ایسے کلچر کا فروغ ہوا جسے "گنگاجمنی" کلچر سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ یہ گنگاجمنی تہذیب (جو دراصل مختلف تہذیبی عناصر کا ایک حسین امتزاج اور سرگم ہے) ہندوستان کے مزاج کی پہچان اور اس کے خوابوں کی آبرو بن گئی، جس کی حفاظت شاہوں اور گداؤں، صوفیوں اور سنتوں، دانشوروں اور مزدوروں نے ہر دور میں اپنے اپنے طور پر کی ہے۔ جب بھی اس پر کوئی کڑا وقت آن پڑا ہے عوام اور خواص کی صفوں سے لوگ آگے بڑھے ہیں اور اپنی حریت فکر، سماجی سرگرمیوں اور خدمت و ایثار سے اس کی بقا کی ضمانت دی ہے اور اسے پروان چڑھانے کی سبیلیں نکالی ہیں۔ ایک مشترکہ تہذیب سے یہ والہانہ اجتماعی لگاؤ اور اس کی بقا و فروغ کے لیے یہ مشترکہ اور مسلسل کوششیں ہی دراصل ہندوستان کی عظمت کا نشان اور اس کی بقا اور فلاح و بہبود کی ضمانت ہیں۔

تہذیبوں کے اس تنوع اور رنگارنگی کے صدقے کہ جس کے طفیل ہمارا یہ عظیم ملک ایک حسین اور دلکش گلدستہ نظر آتا ہے لیکن برا ہو بیرون و اندرون ملک سے چلنے والی ان تیز وگرم ہواؤں کا کہ جن کی سازشوں سے گلدستے کے پھول کبھی کبھی (اور اب تو اکثر) آپس میں زور زور سے ٹکرانے لگتے ہیں، ٹکرا ٹکرا کر لہولہان ہوجاتے ہیں، ان کی خوشبو اڑنے لگتی ہے رنگ بگڑنے لگتا ہے۔ ایسے میں ان لوگوں کی بے ساختہ یاد آنا عین فطری ہے جنھوں نے ان پھولوں کو بادِ سموم سے بچایا ہے انھیں اپنے خونِ جگر کی سرخی دی ہے، ان کے درمیان فاصلوں کو کم کرنے اور ان میں جذباتی ہم آہنگی یگانگت اور یکجہتی پیدا کرنے کے سو سو جتن کیے ہیں، اپنے سر دھڑ کی بازی لگائی ہے اور حب الوطنی اور قومی خدمت و ایثار کی اعلیٰ ترین مثالیں اور معیار قایم کیے ہیں۔ ہندوستان کے انھیں مایۂ ناز اور جیالے سپوتوں میں ایک سرسیّد احمد خاںؒ بھی تھے۔ ایک انقلابی مصلح، علی گڑھ تحریک کے بانی اور روحِ رواں، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (موجودہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے بانی، اور جدید ہندوستان کے عظیم معماروں میں ایک۔

سرسیّد نے ہندوستان کی گنگاجمنی تہذیب کی حفاظت

اور صحیح معنوں میں یہاں قومی یک جہتی کو فروغ دینے کی کوششوں کے اس سلسلے کو جس کا ایک سرا اکبر اعظم اور دوسرا مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور ان کے ہمنواؤں سے ملتا ہے، آگے بڑھانے میں ایک نہایت اہم اور انقلابی کردار ادا کیا ہے۔ وہ انقلاب روس سے سو سال قبل، ۱۷ ر اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور انھوں نے قیام انڈین نیشنل کانگریس سے تیرہ سال بعد، ۲۷ ر مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں وفات پائی۔ وہ گفتار ہی کے نہیں کردار کے بھی غازی تھے۔ وہ فکر و عمل کا ایک ایسا آتش فشاں تھے جو ملک وملت کی دردمندی میں ایک بار پھٹ پڑا تو پورے اکیاسی سال تک دہکتا رہا اور لوگوں کو دہکاتا رہا۔ وہ اصلاحی سرگرمیوں کا ایسا سرچشمہ تھے جس نے تعلیم، مذہب ادب اور سیاست جیسے ہماری قومی وملی زندگی کے مختلف میدانوں کو سیراب کیا ہے اور ریگ زاروں میں بھی گل و بوٹے اگائے ہیں۔ سرگرمیوں اور کارکردگیوں سے پُر ان کی اکیاسی سالہ زندگی بلاشبہ ہماری قومی وملی تاریخ کا ایک ایسا روشن باب ہے جس کی بتدریج پھیلتی شعاعوں سے نسلیں در نسلیں کسب نور کرتی رہیں گی۔

سرسید ایک بیحد بینی نگاہ، صدیوں کا سینہ چیر کر آگے نکل جانے والے ذہن رسا اور زبردست سماجی حسیت کے مالک تھے۔ قومی وملی مسائل کے سلسلے میں ان کا رویہ عام مسلمانوں اور مصلحوں کی طرح جذباتی نہیں بلکہ بیحد عقلی، عملی اور حقیقت پسندانہ تھا۔ 'اسباب بغاوت ہند' کے مصنف سے اس سے کم یا مختلف کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ انھوں نے مغلیہ سلطنت کا زوال، برطانوی سامراج کا عروج اور اس کا جور و استبداد، ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت ہند اور اس سے پیدا شدہ جہنم زا حالات اور اپنے ہم وطنوں خصوصاً مسلمانوں کی زبوں حالی اور کسمپرسی کا عالم آنکھوں سے دیکھا تھا اور ایک دوراندیش اور مصلحت بیں مدبر کی حیثیت سے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمان مستقبل قریب میں ایک اور ناکام بغاوت ہند کے سنگین نتائج کے متحمل نہیں ہو سکتے، نہ ہی وہ اپنے آپ کو ایک اور 'اسباب بغاوت ہند' لکھنے کو راضی پاتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے ہم وطنوں بالخصوص مسلمانوں کی اشک شوئی و شیرازہ بندی کرنے، ان کی صلاحیتوں اور محدود وسائل و ذرائع کو ضائع ہونے سے بچانے اور ان کو مستقبل کے لیے ایک ہمہ گیر، مضبوط اور موثر مگر فی الوقت انگریزوں کی آنکھوں میں نہ کھٹکنے والی تیاری میں لگانے کا تاریخی اور دوررس فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے سے جو پالیسی انھوں نے مرتب کی اس کے تین اہم نکات تھے:

۱۔ حکومت وقت کے تئیں وقتی طور پر سیاسی مخاصمت کے بجائے مفاہمت کا رویہ اپنانا اور بدلے میں تعلیمی اور معاشی میدانوں میں ترقی کے زیادہ سے زیادہ مواقع اور ذرائع حاصل کرنا۔

۲۔ وقتی اور لاحاصل سیاسی سرگرمیوں اور ایجی ٹیشنوں میں حصہ لینے کے بجائے تعلیمی، سماجی اور اقتصادی میدانوں میں بنیادی اور ٹھوس نوعیت کے اصلاحی کام کرنا تاکہ ان میدانوں میں ہندوستانی قوم کی پسماندگی دور ہو سکے اور وہ یورپین اقوام کے ہم پلہ ہو سکے۔

۳۔ مسلمانوں کو ان کی روایتی تعلیم کے ساتھ ہی جدید سائنسی تعلیم سے بھی آراستہ و پیراستہ کرنا اور ان کی تعلیمی پسماندگی اور معاشی بدحالی دور کرنے پر خصوصی توجہ دینا، کیونکہ وہ انگریزوں کے عتاب کا زیادہ شکار اور زبردست انتشار اور یاس میں مبتلا تھے اور اپنے ہم وطنوں سے تعلیمی و معاشی میدان میں نصف صدی پیچھے تھے۔

ایک بار فیصلہ کر لینے اور حکمت عملی طے کرنے کے بعد وہ اسے عمل میں لانے کے لیے جی جان سے جٹ گئے۔ چنانچہ ۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم یا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جو اپنے قیام سے ہی ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا امین اور اس کے سیکولر

اور جمہوری مزاج کا پاسدار اور پاسبان ہے۔ کالج کے قیام کی غرض و غایت اور اس کے سیکولر اور قومی کردار اور نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے سر سیّد ۳۰ جنوری ۱۸۸۴ء کو انڈین ایسوسی ایشن لاہور کی طرف سے پیش کیے گئے ایک سپاس نامے کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میرے عزیز دوستو! آپ نے اپنے ایڈریس میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کا ذکر کیا ہے مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کے لیے قایم کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو اس کالج کے قیام کرنے کا ہوا یہ تھا جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ بھی واقف ہیں کہ مسلمان روز بروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے جاتے تھے۔ ان کے مذہبی تعصبات نے ان کو اس تعلیم سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں، مدرسوں میں مہیا کی گئی تھی اور اسی وجہ سے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ ان کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جاوے اس کی مثال اس طرح پر دی جا سکتی ہے۔ فرض کرو کہ دو بھائی ایسے ہیں جس میں ایک بالکل طاقتور اور تندرست ہے اور دوسرا بیمار ہے اور اس کی تندرستی زوال پر ہے۔ پس اس کے تمام بھائیوں کا یہ فرض ہوگا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کریں اور اس کو مدد دیں یہی خیال تھا جس نے مجھ کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قایم کرنے کے لیے آمادہ کیا مگر میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک ہی سی تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے تمام حقوق جو اس شخص سے جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے۔ صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی اور کوشش سے اسے حاصل کرے۔ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں اور دونوں کے ساتھ بطور بورڈر یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔"[۱]

اور ۲۶ جنوری ۱۸۸۴ء کو انجمن اسلامیہ لاہور کی طرف سے پیش کردہ ایک سپاس نامے کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"مدرسۃ العلوم بیشک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی سے نہیں ہے بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی سے مدرسۃ العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کے درست کرنے کے لیے اور جو افسوس ناک محرومی ان کو یورپین سائنسز اور لٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی اس کے رفع کرنے کو قایم کیا گیا مگر اس میں ہندو اور مسلمان دونوں پڑھتے ہیں اور تربیت جو ہندوستان میں مقصود ہے دونوں کو دی جاتی ہے۔ ہم لوگ آپس میں کسی کو ہندو کسی کو مسلمان کہیں، مگر غیر ملک میں ہم سب نیٹو (NATIVE) یعنی ہندوستانی کہلائے جاتے ہیں۔ غیر ملک والے خدا بخش اور گنگا رام دونوں کو ہندوستانی سمجھتے ہیں۔"[۲]

اِس طرح اپنی حکمت عملی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے انھوں نے اپنے ہم وطنوں بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کا مناسب انتظام کیا اور اسی طرح جب ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو انڈین نیشنل کانگریس قایم ہوئی تو سر سیّد نے اپنے ہم وطنوں بالخصوص مسلمانوں کو اس سیاسی گروہ اور اس کی سرگرمیوں سے دور رہنے اور اپنے آپ کو خالص تعلیمی و سماجی نوعیت کے قصبات بغرض

لیکن زیادہ سودمند اصلاحی کاموں میں لگائے رکھنے کی تلقین کی۔

سرسید کی انگریزوں سے مفاہمت، کانگریس سے مغایرت اور مسلمانوں کے کاز (Cause) کی وکالت کی پالیسی کو لے کر بعض مصنفین اور سیاسی تجزیہ کاروں نے ان پر شدید نکتہ چینیاں اور الزام تراشیاں کی ہیں۔ انگریزوں سے قربت اور کانگریس سے دوری کی بنا پر بعضوں نے انھیں انگریزوں کا آلہ کار اور آزادیٔ ہندوستان کا مخالف تک گردانا ہے۔ حالاں کہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک سرسید ہی پر کیا موقوف انیسویں صدی کے بیشتر ہندو اور مسلم سماجی رہنما اور مصلح انگریزی حکومت کے ملازم یا مقرب اور اس کی پالیسیوں کے زبردست حامی رہے ہیں۔ خود راجہ رام موہن رائے (۱۷۷۲ء-۱۸۳۳ء) جنھیں جدید ہندوستان کا معمار اول کہا جاتا ہے۔ ۱۸۰۳ء-۱۸۱۵ء کے دوران یعنی اپنے رٹائرمنٹ تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم رہے اور اپنی بیش بہا سماجی اور اصلاحی سرگرمیوں کے ساتھ ہی انگریزی حکومت اور لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کی بھرپور حمایت کرتے رہے۔ ۱۸۲۳ء میں لارڈ ایمہرسٹ (Lord Amherst) کو ایک خط لکھ کر انھوں نے "سائنٹفک اور انگلش ایجوکیشن کی زبردست سفارش اور روایتی انداز کی سنسکرت (ورناکیولر) ایجوکیشن کی شدید مخالفت کی۔" کانگریس کی مخالفت وہ اس لیے نہیں کر سکے کہ کانگریس اس وقت تک وجود میں آئی ہی نہیں تھی۔ لیکن ان کے طرز فکر و استدلال کو دیکھتے ہوئے قیاس اغلب ہے کہ اگر وہ سرسید کے زمانے میں ہوتے اور انہیں جیسے مسائل سے دوچار ہوتے تو وہ بھی شاید سرسید ہی کی طرح وقتی طور پر کانگریس کی مخالفت کرتے۔

راجہ رام موہن رائے اور سرسید کے خیالات میں زبردست مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں انگریزی حکومت کے مقرب اور ملازم، دونوں جدید سائنٹفک ایجوکیشن کے مبلغ اور ورناکیولر ایجوکیشن کے نکتہ چیں، دونوں اپنے اپنے مزاج و کردار میں سیکولر اور روادار، دونوں قومی یک جہتی و ترقی کے علم بردار، دونوں اپنے اپنے مذہبی فرقوں میں مروجہ فرسودہ روایات و تعصبات کی بیخ کنی کے درپے اور ان کی جگہ ایک جدید سائنسی مزاج اور رویہ پیدا کرنے کے خواہاں اور دونوں مقصد براری کے لیے سیاسی ایجی ٹیشن کے بجائے تعلیمی و سماجی اصلاحات کو زیادہ موثر حربہ سمجھنے اور اسی طور استعمال کرنے پر مصر —— پھر یہ کیسی ستم ظریفی اور ناانصافی ہے کہ ایک کو تو بڑے فخریہ انداز میں 'جدید ہندوستان کا معمار اول' اور دوسرے کو تحقیر آمیز انداز میں 'انگریزوں کا آلہ کار' کہا جاتا ہے؟ جب کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں پر کیے گئے اندھا دھند مظالم کا چشم دید گواہ ہونے اور پسماندہ اور کمزور اقلیتی فرقے سے متعلق ہونے کی بنا پر سرسید کے یہاں انگریزوں کی عدم مخالفت کا راجہ رام موہن رائے کے بمقابلے زیادہ معقول جواز موجود تھا۔ آخر کو دودھ کا جلا چھاچھ پھونک کر پیتا ہے! ان حالات میں انگریزی حکومت کی انفرادی یا اجتماعی مخالفت خودکشی کے مترادف ہوتی اور خودکشی کو تدبر اور بہادری سے علاقہ نہیں ہوتا اور اسلام میں تو خودکشی بہرطور حرام ہے۔

یہ صحیح ہے سرسیدؒ نے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو (جس دن کانگریس کا تیسرا سالانہ اجلاس مدراس میں بدرالدین طیب جی کی صدارت میں ہو رہا تھا) لکھنؤ میں اپنی ایک سیاسی تقریر (جو ان کی واحد سیاسی تقریر تھی) میں کانگریس پر سخت تنقید کی اور مسلمانوں کو کانگریس سے دور رہنے کو کہا لیکن یہ مخالفت بعض لوگوں کے خیال کے برخلاف، اس بنا پر نہیں تھی کہ کانگریس ایک ہندو آرگنائزیشن ہے یا یہ کہ وہ ہندوستان کی آزادی چاہتی ہے، بلکہ اس وقت وہ سرے سے ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں اور ایجی ٹیشنوں کے ہی خلاف تھے۔ چنانچہ جب ۱۸۸۸ء میں سید امیر علی نے سرسیدؒ سے کلکتہ میں ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ محمڈن نیشنل کانفرنس (جو کانگریس کی پیش رو انڈین نیشنل کانفرنس کی متبادل آرگنائزیشن سمجھی جاتی تھی) میں شامل ہو جائیں تو انھوں نے کانگریس ہی کی

طرح اس میں بھی سمویت سے انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ سیاسی سرگرمیاں بلاوجہ انگریزی حکومت کے غصّے اور عتاب کو دعوت دیں گی اور اس طرح ان کی تعلیمی اور سماجی اصلاحات کے ہمہ گیر پروگرام میں خلل پڑنے لگا جسے کہ وہ پوری یک سوئی اور دلجمعی کے ساتھ چلانا چاہتے تھے تاکہ مسلمانوں کی پسماندگی دور ہوسکے اور وہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر پورے اعتماد کے ساتھ قومی ترقی کی شاہراہ پر چل سکیں اور ان پر کسی طرح بھی بوجھ نہ بنیں۔ مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کے سلسلے میں سرسید کی یہ عبوری حکمت عملی کسی طرح بھی فرقہ وارانہ اور علیحدگی پسندانہ نہ تھی بلکہ خالص قوم پرستانہ اور سوشلسٹک (SOCIALISTIC) تھی جس کی عملی تائید ہمیں آگے چل کر ہریجنوں کی پسماندگی دور کرنے کے سلسلے میں اپنائی گئی مہاتما گاندھی کی پالیسیوں میں ملتی ہے۔ گاندھی جی نے ہریجنوں (جو اتفاق سے ان کے ہم مذہب ہیں) کے کاز کی بجا طور پر بڑے زور سے وکالت کی اور ان کے لیے ایک لمبی مدت تک ہر قسم کے تحفظات و مراعات کو قومی پالیسی کا جزو بنایا لیکن ان کی قوم پرستی اور جمہوریت نوازی بجا طور پر ہمیشہ شبہ سے بالاتر رہی، پھر اگر خالص انسانیت نوازانہ جذبہ کے تحت سرسید نے اپنے ہم مذہب پسماندہ طبقے کو محض وقتی طور پر انگریزی حکومت سے مخاصمت سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اور کانگریس سے مغایرت اختیار کرنے کی تلقین کی تو ان پر فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی جیسے سنگین الزامات کیوں کر عاید کیے جا سکتے ہیں؟ کوئی بھی قومی رہنما یا مصلح اگر خالص قومی مفاد اور ضرورت کے تحت کسی فرقے یا طبقے کی عام طور پر تسلیم شدہ پسماندگی دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، چاہے وہ فرقہ یا طبقہ اس کا ہم مذہب ہی کیوں نہ ہو تو اس کی کوششوں کو خالص قوم پرستانہ، جمہوری اور سوشلسٹک اور اس لحاظ سے قابل تحسین و ستائش قرار دینا چاہیے، چاہے وہ قومی رہنما اور مصلح مہاتما گاندھی ہوں یا سرسید، راجہ رام موہن رائے ہوں یا ڈاکٹر امبیڈکر۔ دور رس قومی شخصیتوں اور ان کے کارناموں کو آنکنے کا سماجی پیمانہ ہر قسم کے تعصبات سے پاک ہونا چاہیے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ سرسید نے جس کانگریس سے بے اعتنائی برتی وہ ١٩٢٠ء کے بعد صحیح معنوں میں ایک عوامی اور سیکولر تحریک بن کر ابھرنے اور مکمل آزادئ ہند کا نعرہ بلند کرنے والی مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر، جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کانگریس نہیں تھی بلکہ ١٨٨٥ء۔١٨٩٨ء کے درمیان کی وہ نوزائیدہ کانگریس تھی جس کی پیدائش مشکوک، خدّوخال غیر واضح اور مقاصد مبہم تھے۔ کانگریس کے بانی اور اس کے اصلی قائد اور روح رواں الن اکٹیوین ہیوم (ایک ریٹائرڈ انگریز سول سرونٹ) نے کانگریس کو ایک 'سیفٹی والو' (SAFETY VALUE) کے طور پر متصور کیا تھا جو آئندہ چوتھائی صدی میں برطانوی نظام کے خلاف ہندوستانیوں کے دلوں میں پک کر تیار ہونے والے انقلاب اور آزادی کے لاوے کو آسانی اور خاموشی سے خارج کر دے اور برطانوی نظام کو تہس نہس ہونے سے بچالے۔ کانگریس کے قیام کی غرض و غایت ہیوم کے اپنے الفاظ (ترجمہ: مضمون نگار) میں پڑھیے:

> "اس سے پہلے کہ وہ ناعاقبت اندیش اور فتنہ انگیز بازاری لیڈر رونما ہوں جو کہ آئندہ چوتھائی صدی میں یقیناً رونما ہونے والے ہیں (ہندوستانیوں کے) اس عظیم نچلے متوسط طبقے کو پکڑ کر اور بڑی احتیاط کے ساتھ ان کو ایک ہلکے اور بے ضرر قسم کے سیاسی بخار کا ٹیکہ لگا کر ہم اس آئندہ پھوٹ پڑنے والی پُرتشدد اور وبائی سیاسی ابتری کی غارت گری کے خلاف جو کہ دوسری صورت میں ناگزیر ہوگی ایک واحد اور قابل اعتماد احتیاطی تدابیر اختیار کر رہے ہیں۔"[5]

> "مغربی تعلیم اور خیالات و نظریات نے ایسے دھاروں کا بند کھول دیا ہے جن کو اگر صحیح سمت

نہ دی گئی اور کنٹرول نہ کیا گیا تو دیر یا سویر ان سے ایسے نتائج برآمد ہوں گے جن کی ہلاکت آفرینیوں کا تصور بھی محال ہے اور محض انہیں دھاروں کو، جب تک کہ مہلت حاصل ہے، محدود کرنے، کنٹرول کرنے اور محفوظ سمتوں میں موڑنے کی غرض سے ہی اس کانگریس کی تشکیل کی گئی ہے۔"[۵۲]

اس طرح یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کی پیدائش مشکوک تھی اور اس کا قیام تحریک آزادیٔ ہند کے بطور نہیں بلکہ اس کے اسقاط یا کم از کم اسے چوتھائی صدی موخر کرنے کی غرض سے عمل میں آیا تھا۔ لالہ لاجپت رائے کی بھی اس ابتدائی دور کی کانگریس کے متعلق ایسی ہی رائے تھی ان کا خیال تھا کہ:

"چونکہ کانگریس کے بانی اور رفقاید اے۔ او۔ ہیوم تھے جن کی اولین وفاداری ناگزیر طور پر برطانیہ کے ساتھ تھی، اس لیے کانگریس کا مقصد ہندوستان کی آزادی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔"[۵۳]

بہت سے سیاسی مبصرین کی رائے ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس ۱۹۱۷ء کے بعد ہی انڈین نیشنل موومنٹ (قومی تحریک ہند) بن پائی جب کہ اس پر کانگریس کے "انتہا پسندوں" کا قبضہ ہو گیا۔[۵۴] ۱۸۸۵ء–۱۹۱۷ء کے دور میں تو وہ لارڈ میکالے کے تعلیمی نظام کے پروردہ اور برطانوی طرز فکر و زندگی کے دلدادہ، اعلیٰ طبقے کے خوش باش خوش پوش اور عوام سے کٹے ہوئے لوگوں کا زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی کلب تھی جس کے غالب ممبروں (سریندرناتھ بنرجی، ڈبلیو سی بونرجی، دادا بھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتہ وغیرہ) کی مستقل یہ خواہش اور کوشش تھی۔ (طوالت کے ڈر سے متعلقہ اقتباسات سے گریز کیا جا رہا ہے) کہ:

۱۔ برطانوی تخت و تاج سے ان کی غلامانہ وفاداری کے پیہم اظہار کو ان کے مسلسل اصرار پر قبولیت کا سرٹیفکیٹ اور پھر اس کا صلہ مل جائے۔

۲۔ ہندوستان کا مملکت برطانیہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انضمام ہو جائے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان کی کونسل کو توڑ دیا جائے اور کانگریس کو برٹش پارلیمنٹ برائے ہندوستان کا درجہ حاصل ہو جائے۔

۳۔ لیجسلیٹو کونسلوں میں منتخب ہندوستانیوں کو بھی نمائندگی دی جائے اور برطانوی سیاسی اداروں کو ہندوستان میں بھی قائم کیا جائے۔

۴۔ انڈین سول سروس کے لیے مقابلے کا امتحان انگلستان کے ساتھ ہی ہندوستان میں بھی لیا جائے۔

۵ اسلحہ ایکٹ میں سدھار کر کے ہندوستانیوں کو بھی اسلحہ رکھنے کا حق دیا جائے وغیرہ۔

کانگریس کے قیام (۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء) کے وقت ہی بمبئی میں منعقد اس کے پہلے اجلاس میں اس کے ڈبلیو سی بونرجی نے اپنے صدارتی خطبے میں کانگریس کو "نیشنل اسمبلی آف انڈیا" قرار دیا اور تقریر کا خاتمہ اس بات پر زور دے کر کیا کہ:

(ترجمہ مضمون نگار)

"کانگریسی ہندوستان میں برطانوی حکومت کو دائمی بنانے کے آرزومند ہیں اور ان کا منتہائے مقصود صرف انتظام حکومت میں شرکت حاصل کرنا ہے اور وہ یہ حلف لیتے ہیں کہ یہ مقصد وہ خالص دستوری طریقوں سے حاصل کریں گے۔"[۵۵]

اسی طرح ۲۸ دسمبر ۱۸۹۸ء کو (یعنی سرسید کی وفات کے چند مہینوں بعد) مدراس میں منعقد کانگریس کے چودھویں سالانہ اجلاس میں اس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر سبا راؤ پنٹولو نے ۱۸۵۷ء کے غدر کی یاد دلاتے ہوئے ناگواری کے ساتھ کہا

(ترجمہ مضمون نگار)

"آج ہندوستانی رہنماؤں میں چیدہ اور بہترین

اپنے اپنے پیشوں میں کمال یافتہ اور اپنے ہم وطنوں میں عزت یافتہ، سال بہ سال ملتے ہیں۔ اسی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے جس کو ۱۸۵۷ء میں جاہل اور گمراہ عوام نے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی تھی۔" [۱۰]

یہ یقین دلایا کہ:

"جب تک کانگریس زندہ ہے، ۱۸۵۷ء کے واقعات دوبارہ رونما نہیں ہوں گے۔" [۱۱]

کانگریس مکمل آزادی ہندوستان کا نعرہ بلند کرنا تو بجا سوراج (ہوم رول) کی بات بھی زبان پر لانے ڈرتی تھی۔ (دادا بھائی نوروجی سوراج کو "ضبط نفس" سے زیادہ کا مفہوم دینے کو تیار نہیں تھے) سوراج کی مانگ تو ۱۹۰۶ء میں کانگریس کے کلکتہ سیشن میں بیحد محتاط لفظوں میں پیش کی گئی اور "مکمل آزادی ہندوستان" کی مانگ کی تجویز تو پہلی بار کانگریس کے دسمبر ۱۹۲۱ء کے احمد آباد سیشن میں گلستان سرسید کے ہی ایک پھول مولانا حسرت موہانی نے پیش کی تھی مگر مصلحتیں آڑے آئیں اور تجویز مسترد کر دی گئی۔

اس طرح یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ سرسید نے ۱۸۸۵ء۔ ۱۸۹۸ء کی تیرہ سالہ مدت میں جس کانگریس کو دیکھا وہ ایسی دلکش ہرگز نہیں تھی کہ آدمی کا دل بے اختیار اسے اپنانے کو چاہے۔ اس لیے کانگریس میں ان کی عدم شمولیت کا اتنا ملال نہیں ہونا چاہیے۔ رہی حکومت وقت کی تئیں وفاداری تو اس میں کانگریس اور سرسید کے رویوں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ کانگریس سیاسی حربہ استعمال کر کے سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتی تھی جب کہ سرسید نے اپنے لیے تعلیم کا میدان چن لیا تھا۔

ایک اور وجہ کانگریس سے سرسید کی مغایرت کی یہ تھی کہ کانگریس پر بی جی تلک اور لالہ لاجپت رائے جیسے انتہا پسندوں کا غلبہ بڑھتا جا رہا تھا جن کے نیشنلزم کے بارے میں بعض مورخین اور سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ اس سے ہندو بنیاد پرستی اور احیا پسندی نیز مسلم بیزاری اور اردو دشمنی کے جذبوں کو ہوا مل رہی تھی۔ لالہ لاجپت رائے (جو ہندو مسلم اور سکھ مشترکہ کلچر کی پیداوار تھے، جن کی ماں سکھ تھیں اور والد منشی لالہ رادھا کشن اگروال عملی طور پر اسلام کے بیحد قریب اور سرسید کے زبردست مداح تھے) جب آریہ سماج کے زیر اثر آئے تو اپنے خیالات میں بیحد کٹر اور انتہا پسند ہوگئے وہ اپنی سوانح میں لکھتے ہیں (ترجمہ مضمون نگار):

"اسلام کے لیے احترام کا جذبہ جو میرے اندر اوائل عمری کی ٹریننگ سے پیدا ہوگیا تھا وہ نفرت میں بدل گیا۔" [۱۲]

اور اپریل ۱۸۸۲ء میں امبالہ میں اپنی پہلی پبلک تقریر میں انھوں نے اردو کی سخت مخالفت کی اور ہندی کی زبردست وکالت کرتے ہوئے کہا کہ ہندوؤں کے سیاسی اتحاد اور استحکام کے لیے لازمی ہے کہ ہندی کو قومی زبان بنایا جائے اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ اردو کی مخالفت اور ہندی کی موافقت انھوں نے اردو کے وسیلے سے کرنی شروع کی تھی کیونکہ اس وقت تک وہ ہندی کے حروف تک سے ناآشنا تھے۔ [۱۳]

ہو سکتا ہے کہ اگر سرسید ۱۹۲۰ء کے بعد کے زمانے میں ہوتے اور ان کے سامنے مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر امبیڈکر کی عوامی اور سیکولر کانگریس پیش کی جاتی تو وہ اور ان کے رفقاء اسے اپنا لیتے اور ان کے اور گاندھی جی کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر آجانے سے ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی برصغیر کا نقشہ ہی آج کچھ اور ہوتا کیونکہ گاندھی جی ہی کی طرح سرسید بھی ایک ٹھنڈے دل و دماغ اور آہنی ارادوں کے، انسانیت نواز اور دور ساز انسان تھے۔

سرسید کے متذکرہ بالا سیاسی موقف اور تعلیمی پالیسی کی بھرپور تائید پنڈت جواہر لال نہرو جیسے عظیم سیاسی مدبر اور قومی

انے بھی کی ہے۔ اپنی آٹو بائیو گرافی میں وہ رقم طراز ہیں:

"انھوں نے اس قسم کی تعلیم کو رواج دینے کے لیے مسلمانوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں تمام تر توجہ وقف کر دی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی توجہ کسی اور طرف منعطف ہو مسلمانوں کے جمود اور جھجک پر غلبہ پانے کا کام بہت مشکل تھا۔ دوسری طرف بورژوا ہندوؤں کی کوششوں سے وطن پرستی کی ایک نئی تحریک شروع ہو رہی تھی۔ اس میں مسلمانوں کی شرکت سے ان کے نزدیک ان کی توجہ اور دھیان بٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کی مخالفت کی۔ ہندو جو مغربی تعلیم میں نصف صدی مسلمانوں سے آگے تھے، حکومت پر نکتہ چینی کا مشغلہ اختیار کر سکتے تھے لیکن وہ اپنے تعلیمی کاموں کے لیے حکومت کا بھرپور تعاون چاہتے تھے اور اس کے وہ جلدبازی میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے جس سے ان کے کاموں کو نقصان پہنچے۔ سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہیں یقیناً درست اور صحیح تھا۔ بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں مسلمان کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے تھے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہندوؤں کے مقابلے میں غیر موثر بن جائیں گے جو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی ان سے زیادہ مضبوط تھے۔ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں ابھی تک کوئی بورژوا طبقہ نہیں پیدا ہوا تھا اس لیے نہ تو تاریخی حالات اس کی اجازت دیتے تھے اور نہ اُن کے خیالات میں کوئی ایسا انقلاب پیدا ہوا تھا کہ مسلمان بورژوا تحریک وطنیت میں شامل ہو جاتے۔ سرسید کی یہ تمام کاروائیاں جو بظاہر ہمیں معتدل قسم کی معلوم ہوتی ہیں حقیقتاً ایک قسم کا انقلاب پیدا کرنا چاہتی تھیں"۔ [۱۴]

پروفیسر خلیق احمد نظامی پنڈت نہرو کی مندرجہ بالا رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ان کے اس خیال سے بھی متفق نظر آتے ہیں کہ:

"سرسید کا پیغام ..... اس وقت کے لیے مناسب حال اور ضروری تھا لیکن ایک ترقی کرنے والی جماعت کے لیے وہ آخری نصب العین نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ممکن ہے اگر وہ ایک نسل تک اور زندہ رہتے تو اپنے پیغام کو کوئی نیا رُخ دیتے"۔ [۱۵]

بعض مصنفین اور سیاسی مبصرین سرسید کو علیحدگی پسند ہی نہیں بلکہ "دو قومی نظریے" کا بانی مبانی بھی قرار دیتے ہیں مثلاً کے۔ ایم۔ پانیکر "اپنی کتاب" دی فاؤنڈیشنز آف نیو انڈیا" (The Foundations Of New India) میں دو قومی نظریے اور مسلم علیحدگی پسندی کے لیے سرسید کو ہی ایک طرح سے ذمہ دار قرار دیتے ہیں [۱۶]۔ اور عتیق صدیقی اپنی کتاب "سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ" میں لکھتے ہیں:

"یہ حقیقت ہے کہ سرسید کا ذہن فرقہ پروری کی آلودگی سے اگرچہ کبھی بھی پاک نہیں رہا، تاہم مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاسی تنظیموں کے خارزار میں اُلجھنے سے اپنے دامن کو انھوں نے بچایا تھا"۔ [۱۷]

مزید لکھتے ہیں:

"یہ حقیقت ہے کہ دو قومی نظریہ (Two - Nation Theory) - جسے مسلم لیگ نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں اپنا کر مطالبۂ پاکستان

کی بنیاد بنایا۔ اس کے موجد اقبال یا جناح نہیں سرسید ہی تھے۔" [۱۸]

لیکن ان دو سنگین الزامات (سرسید کے ذہن کا فرقہ پروری کی آلودگی سے کبھی بھی پاک نہ رہنا، اور ان کا دو قومی نظریے کا موجد ہونا) جنھیں عتیق صدیقی "حقیقتیں" مانتے ہیں، کے سلسلے میں انھوں نے جو ثبوت پیش کیے ہیں، اس میں لفظوں کی کھینچ تانی کر کے بہت دور کی کوڑی لانے والی بات تو ضرور ہے لیکن عقل کو باور کرانے والی بات نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسی کے بارے میں معروضی اور ایماندارانہ رائے قایم کرتے وقت کس بات کو وزن دینا چاہیے؟ اسے جو اس نے برملا اور متعدد بار کہا اور کیا ہے؟ یا اسے جس کا وجود یا واضح ثبوت فرد اس کے قول و فعل میں تو نہ ملے لیکن جسے ضرورت سے زیادہ تخلیقی اذہان اپنے تخیل سے برآمد کر لیں؟

سرسید کی تقریر، تحریر اور عمل میں تو کہیں بھی فرقہ پروری یا دو قومی نظریے کی حمایت کا واضح ثبوت نہیں ملتا۔ انھوں نے کہیں یہ نہیں کہا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کا فائدہ صرف اور صرف ان کے فرقے کے لوگ ہی اٹھائیں گے اور دوسرے اس سے یکسر محروم رکھے جائیں گے۔ دنیا جانتی ہے کہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کا قیام ہے اور اس کے قیام کی غرض و غایت اس مضمون میں شامل ان کی تقریروں کے اقتباسات سے صاف اور واضح ہو جاتی ہے۔ یہ ادارہ روز اول ہی سے اپنے بانی کے سیکولر اور روادار مزاج اور طرز فکر کا ترجمان رہا ہے۔ اس کے دروازے بلا ملک و مذہب سبھی کے لیے ہمیشہ کھلے رہے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے اپنی متعدد تقریروں میں صاف اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وہ ہندوستان میں بسنے والے تمام لوگوں کو جن میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی شامل ہیں، ایک قوم سمجھتے ہیں۔ پھر یہ دو قومی نظریے کا بانی ہونے والی بات کہاں سے آگئی؟ ان کے اپنے قول و فعل میں تو فرقہ پروری یا دو قومی نظریے کی وکالت کہیں دور دور تک نظر نہیں آتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

والی بات ہو؟

مندرجہ بالا بہتانوں کی تردید میں پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر تارا چند کی مستند رایوں پر مشتمل دو اقتباسات (ترجمہ مضمون نگار) پیش ہیں:

"وہ (سرسید احمد خاں) کسی طرح بھی ہندو مخالف یا فرقہ وارانہ بنیاد پر علیحدگی پسند نہ تھے۔ بار بار انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مذہبی اختلافات کو سیاسی یا قومی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ "کیا ایک ہی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے"؟ انھوں نے کہا۔ "یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان الفاظ صرف مذہبی پہچان کے لیے ہیں ورنہ تمام لوگ چاہے ہندو یا مسلمان یہاں تک کہ عیسائی بھی جو کہ اس ملک میں بستے ہیں، سبھی اس لحاظ سے ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔" [۱۹]

---

"سرسید احمد خاں ہندو مسلم سیاسی تعاون میں یقین رکھتے تھے۔ یہ کہنا حقیقت کا منہ چڑانا ہے کہ وہ دو قومی نظریے کے بانی تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور اس اتحاد کی راہ میں وہ مذہب یا ضمیر کے نام پر کسی رکاوٹ یا اعتراض کے قایل نہ تھے۔ کانگریس سے ان کا اختلاف محض سیاسی مصلحت اور حکمت عملی کی بنیاد پر تھا اور اس قسم کے اختلافات ہندوؤں میں بھی موجود تھے۔ مثلاً زمین داروں اور تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے مابین۔" [۲۰]

خود سرسید نے ۳۰ جنوری ۱۸۸۴ء کو انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے صدر دیال سنگھ کی جانب سے پیش کردہ ایک سپاس نامے کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے اپنے کسی تصورِ قومیت کی تشریح وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

"لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ نیشن کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے۔ کیوں کہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن جو بات کہ ہم دیکھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیرِ حکومت ہیں۔ ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں۔ ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں (یہاں سرسید قوم بمعنی مذہبی فرقہ یا کمیونٹی استعمال کر رہے ہیں مضمون نگار) کو جو ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ 'ہندو' یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔"[11]

اور ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو پٹنہ میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"اے عزیزو! جس طرح ہندوؤں کی شریف قومیں اس ملک میں آئیں اسی طرح ہم بھی آئے۔ ہندو اپنا ملک بھول گئے۔ اپنے دیس سے پردیس ہونے کا زمانہ ان کو یاد نہیں رہا اور ہندوستان ہی کو انھوں نے اپنا وطن سمجھا۔ ہم نے بھی ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا۔ پس اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندوستان کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں اختیار کر لیں ہندوؤں نے مسلمانوں کی سیکڑوں عادتیں لے لیں۔ اگر ہم اس حصے سے جو ہم دونوں میں خدا کا حصہ ہے (یہاں سرسید کا اشارہ مذہبی معاملات کی طرف ہے۔ مضمون نگار) قطع نظر کر لیں تو درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں باعتبار اہلِ وطن ہونے کے ایک قوم ہیں (واضح ہو کہ سرسید قومیت کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ ملک و وطن قرار دے رہے ہیں۔ مضمون نگار) اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبود ممکن ہے (واضح ہو کہ سرسید ہندو مسلم اتحاد و تعاون کو ملک کی فلاح و بہبود کے لیے لازم قرار دیتے ہیں۔ مضمون نگار) اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی دو خوبصورت اور رسیلی آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ آپس میں نفاق رکھیں گے تو پیاری دلہن بھینگی ہو جاوے گی۔"[12]

اور ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو گورداسپور میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"اس وقت ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں (یہاں سرسید قوم کا لفظ بمعنی مذہبی فرقہ یا کمیونٹی استعمال کر رہے ہیں۔ مضمون نگار) آباد ہیں اور اس طرح سے ہیں کہ ایک کا

گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک آب وہوا کے شریک ہیں۔ ایک دریا یا کنویں کا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت کا شریک ہوتا ہے۔ ایک کو دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں۔ ہم کو ایک دل ہو کر مجموعی حالت میں کوشش کرنی چاہیئے (واضح ہو کہ سرسید یہاں ہندو مسلم اتحاد و تعاون کی تلقین کر رہے ہیں۔ مضمون نگار)۔ اگر ایسا ہوگا تو سنبھل جائیں گے نہیں تو ایک دوسرے کے اثر سے دونوں قومیں (یہاں پھر سرسید قوم کا لفظ بمعنیٰ مذہبی گروہ یا فرقہ استعمال کر رہے ہیں۔ مضمون نگار) تباہ اور بگڑ جاویں گے۔ پرانی تاریخوں، پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے (سرسید کا جغرافیائی اور سماجیاتی تصورِ قومیت ملاحظہ ہو۔ مضمون نگار) افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہلاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں۔ یورپین مختلف خیال اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں گو اُن میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آ کر بس جاتے ہیں مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلاتے ہیں۔ غرض یہ کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے گو ان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ (یہاں سرسید کا اشارہ مذہبی لسانی اور تہذیبی انفرادیتوں اور امتیازات کی طرف ہے۔ مضمون نگار) [illegible] ہو اور مسلمانو!

کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے باشندے ہو؟ کیا اسی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے؟ یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو اُن سب کو ملکی فائدے میں جو اُن سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے۔"[۳۵] (یہاں پھر سرسید قوم کا سماجیاتی تصور پیش کرتے ہوئے ملک کے مفاد میں سب کے اتحاد و تعاون کی تلقین کر رہے ہیں۔ مضمون نگار)

اور اسی طرح ۳۰ دسمبر ۱۸۷۳ء کو لاہور میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"میں نے اس وقت انجمن میں اپنی زبان سے کئی دفعہ "قوم" کا لفظ بیان کیا۔ اس سے مطلب صرف مسلمانوں ہی سے نہیں ہے۔ میری یہ رائے ہے کہ تمام انسان بالکل شخص واحد ہیں اور میں قوم کی خصوصیت کے واسطے مذہب اور فرقہ اور گروہ کو نہیں پسند کرتا (سرسید کا غیر فرقہ وارانہ اور خالص سماجیاتی تصور قومیت ملاحظہ ہو۔ مضمون نگار) میری رائے اگر صحیح ہے تو میں کالے سے کالے رنگ کے انسان اور گورے سے گورے رنگ کے انسان کو جو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی تہذیب میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں اور وہ جو ابھی نیچر کے جوش میں ہیں اور جنگلوں میں [illegible] رہتے ہیں [illegible] کی

اپنا بھائی اور ایک قوم تصور کرتا ہوں (سرسید کا غیر نسلی، غیر طبقاتی، بین الاقوامی اور انسانیت نوازانہ تصور قومیت ملاحظہ۔ مضمون نگار) -
میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم و مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں مذہب بے شک سب کا علیحدہ علیحدہ ہے مگر اس لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے"۔[۲۳] (مذہبی اختلافات سے بلند ہو کر انسان دوستی کے لیے اتحاد و تعاون کی تلقین ملاحظہ ہو۔ مضمون نگار)۔

مختلف مواقع و مقامات پر کی گئی سرسیدؒ کی متعدد تقاریر کے طویل اقتباسات، جو شامل مضمون ہیں، کا اگر بغور مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے تو سرسید کے نظریۂ قومیت و قومی یکجہتی اور تعلیم سے متعلق مندرجہ ذیل اہم نکات اُبھر کر سامنے آتے ہیں:-

۱- سرسیدؒ سماجیات اور سیاسیات کے باقاعدہ طالب علم تو تھے نہیں۔ اس لیے جدید سیاسی و سماجیاتی اصطلاحات کے استعمال کے سلسلے میں پیشہ ورانہ مہارت اور احتیاط کی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے "قوم" کی اصطلاح موقع و محل کے اعتبار سے کہیں تو "نیشن" اور کہیں "مذہبی فرقہ یا کمیونٹی" کے مفہوم میں استعمال کی ہے (آج بھی پنجاب کے اطراف میں لوگ عام بول چال میں اکثر "قوم" کو ان دونوں معنوں میں استعمال کر لیتے ہیں) لیکن اس طرح نہیں استعمال کی ہے کہ ان کا منشا سمجھنے میں کسی کو دقت ہو پھر بھی اگر لوگ غلط فہمی کو راہ دینا ہی چاہیں تو کیا کیا جا سکتا ہے؟۔

۲- سرسیدؒ کا تصور قومیت فسطائی نہیں ہے جہاں اقلیتی مذاہب زبانوں اور تہذیبوں کو کچل کر اکثریت کی چکی میں پیس کر، ان کی انفرادیت کو ختم کر دیا جاتا ہے اور صرف اکثریتی اور غالب مذہب اور زبان اور تہذیب کو قوم کا درجہ دے دیا جاتا ہے اور "ایک ملک، ایک مذہب ایک زبان، ایک تہذیب" کا مہلک نظریہ سب پر تھوپنے کی اُٹھتے بیٹھتے کوشش کی جاتی ہے سرسید کا نظریہ قومیت جدید، سماجیاتی اور جمہوری ہے جہاں ملک و سماج کے مختلف طبقوں کو اپنے اپنے مذاہب، زبانوں اور تہذیبوں پر قایم رہنے اور ان کو فروغ دینے کی مکمل آزادی اور مناسب مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ سرسید کا تصور قومیت گنگا جمنی ہے جہاں عناصر ترکیبی اپنی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی ایک اجتماعی وحدت کا نمونہ پیش کرتے ہیں اور گلدستے کے پھولوں کی طرح اپنی انفرادیت سے اجتماعیت کو فروغ دیتے ہیں اور ساتھ ہی ایک دوسرے کا رنگ و روپ بھی دوبالا کرتے ہیں۔

۳- سرسید کا نظریہ قومیت جمہوری ہونے کے ساتھ ہی سیکولر اور سوشلسٹک بھی ہے۔ وہ طبقوں اور فرقوں کے درمیان مذہب، زبان اور کلچر کی بنیاد پر کسی تفریق کے قایل نہیں ہیں ان کا خیال ہے کہ تمام طبقوں اور فرقوں کو بلا تفریق ترقی کے یکساں مواقع ملنے چاہییں۔ لیکن اوروں کے برخلاف ان کے یہاں "یکساں مواقع" کا تصور بھی نہایت جدید اور سوشلسٹک ہے۔ مواقع اور ذرائع کی فراہمی کے سلسلے میں نہ سیاسیاتی مساوات (Equality -

(Mathematical کے قایل نہیں تھے کہ ہر طبقے
یا فرقے کو یکساں مواقع دیے جائیں۔ چاہے وہ دوسروں
کے مقابلے میں کتنا ہی پسماندہ یا ترقی یافتہ کیوں نہ
ہو۔ وہ اس معاملے میں سماجیاتی مساوات
(Sociological Equality) کے قایل تھے
یعنی کہ جو طبقہ یا فرقہ جتنا پسماندہ یا ترقی یافتہ ہو
اس کو اسی کی مناسبت سے مواقع اور ذرایع مہیا
کیے جائیں تاکہ پسماندہ اور ترقی یافتہ طبقوں اور
فرقوں کے درمیان کا سماجی فاصلہ (Social
Distance) – جلد سے جلد دور ہو جائے
مہاتما گاندھی کی ہی طرح وہ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ
اگر پسماندہ اور ترقی یافتہ طبقوں اور فرقوں کو یکسانیا
مساوات کے نام پر بالکل برابر کے مواقع اور ذرایع
فراہم کیے گئے تو دونوں کے درمیان کا فاصلہ کبھی
پُر نہیں ہو سکتا بلکہ اور بڑھتا جائے گا کیونکہ
ترقی یافتہ طبقہ یا فرقہ اپنی بہتر پوزیشن کی وجہ
سے ان مواقع اور ذرایع کا بہتر استعمال کر کے
ان سے نسبتاً زیادہ فائدہ اٹھائے گا اور زیادہ
آگے بڑھ جائے گا۔ اسی لیے گاندھی جی نے ہریجنوں
کے لیے ہر قسم کے تحفظات و مراعات کا اہتمام کیا
اور اسی لیے سرسید نے مسلمانوں کی پسماندگی دور
کرنے کے لیے خصوصی انتظام کیا۔ یعنی محمڈن اینگلو
اورینٹل کالج قایم کیا گو سیکولر اور جمہوری مزاج
کی وجہ سے انھوں نے اس کے دروازے روزِ
اول ہی سے بلا تفریق ملک و مذہب سبھی
پر کھول دیے ہیں۔

۴۔ سرسید کا تصور قومیت فرقہ وارانہ اور
طبقاتی عصبیتوں سے بھی پاک ہے جیسا کہ
آخری اقتباس سے ظاہر ہے۔ وہ مذہب،
فرقہ اور گروہ کی بنیاد پر تفریق کو ہی ناپسند نہیں
کرتے بلکہ کالے اور گورے، مہذب اور غیر مہذب
ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ یا ترقی پذیر میں بھی کسی
تفریق کے روادار نہیں ہیں۔ وہ سبھی انسانوں کو
اپنا بھائی اور ایک قوم سمجھتے ہیں۔ اس طرح سرسید
کا نظریہ قومیت اپنے اندر جمہوریت، سیکولرازم،
سوشلزم، ہیومنزم (Humanism)
اور بین الاقوامیت کا حسین اور گنگا جمنی امتزاج
لیے ہوئے ہے اور مہاتما گاندھی اور پنڈت
جواہر لال نہرو جیسے عظیم قومی رہنماؤں کے تصور
قومیت کی پیش روی کرتا ہے۔

۵۔ گاندھی جی ہی کی طرح سرسید کا بھی خیال تھا
کہ صحیح معنوں میں قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی
اسی وقت ممکن ہے جب سماج کے مختلف طبقوں
اور فرقوں کے درمیان تعلیمی، سیاسی، سماجی
اور سب سے بڑھ کر اقتصادی سطح پر یگانگت
ہو اور کسی طبقے یا فرقے کے دل میں "نظر انداز کر دیے
جانے یا پیچھے چھوڑ دیے جانے" (Having
Been Left Out) کا احساس نہ ہو
ان کو اپنی انفرادیتوں کے ساتھ زندہ رہنے اور
ترقی کرنے کے مناسب اور ضروری مواقع ملیں اور
قومی دولت (National Wealth)
کے پیدا اور خرچ کرنے میں ان کو برابر کا موقع اور
حصہ ملے۔ سرسید کو شدید احساس تھا کہ ہندو
اور مسلمان ہندوستانی قوم کی دو ٹانگوں کی
مانند ہیں۔ اس لیے قومی ترقی کی دوڑ میں ایک
ٹانگ اگر دوسری سے بہت پیچھے رہ گئی تو قوم لڑکھڑا
جائے گی اور ملک منہ کے بل آ گرے گا۔ اسی
لیے مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پسماندگی دور کرنے

کی تازندگی کوشش کر کے انھیں جو عظیم قومی خدمت انجام دی ہے، ملک و قوم اس کے لیے ہمیشہ ان کے احسان مند رہیں گے۔

۲۔ گاندھی جی کی ہی طرح سرسیّد بھی تعلیم کو شخصیت کی ہمہ گیر تعمیر کا ذریعہ اور ملک کے مسائل اور دکھوں کا مداوا سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چوں کہ مسلمان بحیثیت ایک طبقہ یا فرقہ زیادہ مسائل سے دوچار ہیں اس لیے ان کو تعلیم، خاص کر جدید سائنسی اور تکنیکی تعلیم کی اوروں سے زیادہ ضرورت ہے تعلیم کے بغیر وہ قومی یک جہتی و ترقی کے سلسلے میں اپنا جائز رول ادا نہیں کر سکتے۔ اس لیے سرسید نے جس ذہنی انقلاب کی بنیاد ڈالی اس کی ابتدا تعلیم ہے ـــــ اور انتہا؟ شاید حدِ امکان سے پرے! اقبال کے شعر میں تصرف کرتے ہوئے ؎

ستاروں سے آگے جہاں در جہاں ہیں
بہت سے مگر امتحاں درمیاں ہیں

# حواشی

۱۔ خلیق احمد نظامی: سید احمد خاں (ترجمہ اصغر عباس) پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، صفحہ ۱۱

۲۔ عشرت علی قریشی (مرتب) سرسید احمد خاں: سیکولرازم اور ہندو مسلم اتحاد کا دیوتا' (مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۷۹ء، صفحہ ۸۔

۴ خلیق احمد نظامی: متذکرہ، صفحہ ۱۵۵

عتیق صدیقی؛ سرسید احمد خاں — ایک سیاسی مطالعہ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء) صفحہ ۲۹۰

۵ A.O. Hume's Speech: The Indian National Congress Its Origin, Aims and objects" — as quoted by Daniel Argov: Moderates and extremists in the Indian Nationalist Movement 1883 – 1920 (Asia Publishing House Bombay- 1967) P. 63.

6 Abid. (Quoted in the footnote)

7 Abid

8 Abid (Introduction. P.x)

9 Abid P. 31

10 Abid P 80

12 Abid P. 6[illegible]

۱۴ خلیق احمد نظامی، متذکرہ، صفحات ۵۶ - ۱۵۵

۱۵ ایضاً صفحات ۵۷ - ۱۵۶

۱۶ K. M. Pannkar; The Foundations of new India (George Allen & Unwin Ltd; London 1969) PP 55-57.

۱۷ عتیق صدیقی؛ متذکرہ، صفحہ ۲۸۹

۱۸ ایضاً صفحہ ۳۰۰

۱۹ Jawahar Lal Nehru:- Discovery of India. P 411. The Signet Press Culcutta.

۲۰ Tara Chand: History of the freedom Movement in India Publications Division, Ministry of Information & Broad-Casting, Govt of India, N. Delhi (1967) PP 358-59

۲۱ خلیق احمد نظامی: متذکرہ، صفحہ ۱۴۶

۲۲ ایضاً صفحہ ۱۵۲

۲۳ ایضاً صفحات ۱۵۳ - ۱۵۲

۲۴ عشرت علی قریشی (مرتب) متذکرہ صفحات ۶ - ۵

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۵ - شمارہ ۱۰ - (اکتوبر ۱۹۸۶ء)

"اے صاحبو! اب زمانہ ایسا نہیں ہے کہ ہم صرف اپنے ہونہار پودوں کی پرورش کرنے پر بس کریں بلکہ زمانہ مقابلے کے میدان میں بہت قوی اور زبردست پہلوان لایا ہے۔ بس جب تک کہ ہم بھی اپنی قوم کے نوجوانوں کو میدان میں نہ لائیں ہماری کامیابی ممکن نہیں۔ اس وقت ہم کو ضرورت ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے ایک تعداد کثیر، اگر کثیر نہیں تو ایک تعداد معقول اپنی قوم کے نوجوانوں کی پیدا کریں جو علم اور قابلیت میں اور ان علوم میں جو اس زمانے کی حاجتوں کے لیے ضروری ہیں بہرہ آور دہ ہوں۔"

سرسید[۴]

# سرسید اور مذہب

الطاف حسین ندوی

سرسید احمد خاں ابتدا ہی سے دین کے شیدائی اور مذہب کے پرستار تھے۔ انھیں بچپن ہی سے ایسا ماحول میسر آیا جس نے ان کے اسلامی شعور کو بیدار کیا اور ان کے دینی جذبات کو تقویت پہنچائی۔ دین کی تکریم و تعظیم انھیں ورثے میں ملی تھی۔ انھوں نے اسلام کی حقانیت اور اس کی صداقت کا یقین اپنے خاندان سے حاصل کیا تھا۔ سرسیدؒ کی والدہ ایک دین دار اور خدا ترس خاتون تھیں وہ مذہب کے معاملے میں بڑی راسخ العقیدہ تھیں اور اوہام و خرافات پر بالکل یقین نہیں رکھتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شاہ غلام علیؒ جیسے پابندِ شرع بزرگ سے بیعت رکھتی تھیں اس لیے انھوں نے کبھی نہ کوئی منت مانی اور نہ نذر و نیاز کی۔ انھیں ایام و اوقات کی سعادت و نحوست پر بھی کوئی اعتقاد نہ تھا۔ سرسید کے اوپر مذہب کے ان ابتدائی نقوش اور معتقدات کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ انھوں نے بڑے ہونے کے بعد اسلامی عقاید اور تصورات کے متعلق اپنی تحقیق و تنقیح سے جو خیالات قایم کیے تھے وہ ان کی والدہ کے خیالات سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ سرسید خود کہا کرتے تھے کہ میں اپنی والدہ کے عقاید میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک بدعت کا اطلاق ہو سکے، نہیں پاتا۔ سرسید کے والد بھی ایک درویش صفت اور پرہیزگار انسان تھے۔ راست بازی اور بے نیازی ان کی طبیعت کا خاصہ تھیں۔ سرسید کے اندر یہ دونوں خصوصیات ان کے والد کے اثر ہی سے پہنچی تھیں۔

اس کے ساتھ ساتھ سرسید نے جس فضا میں پرورش پائی اور جس ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی وہاں خالص دینی تصورات اور اسلامی افکار کے دو سرچشمے بھی جاری تھے۔ یہ دونوں سرچشمے اپنے اندر حقیقی اسلام کی صفائی، توانائی اور روانی رکھتے تھے اور ان سے دہلی اور بیرون دہلی کے بے شمار بندگان خدا فیض یاب ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک سرچشمہ تو شاہ غلام علیؒ کا تھا اور دوسرا شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کا۔ سرسید کا ددھیال شاہ غلام علیؒ کے چشمۂ رشد و ہدایت سے سیراب ہو رہا تھا اور ننھیال شاہ عبدالعزیزؒ کے چشمۂ صافی سے دین و شریعت کا علم و ایمان حاصل کر رہا تھا۔ سرسید کی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہ بیک وقت ان دونوں سرچشموں سے سیراب ہوئے۔ آگے چل کر سرسید نے دین کو سمجھنے کی شعوری کوشش کی اور اس کا براہِ راست مطالعہ کرنے کی غرض سے انھوں نے مولوی نوازش علی دہلوی سے فقہ اور اصول فقہ کا درس لیا۔ مولانا فیض الحسن سہارن پوری سے قرآن فہمی کے لیے عربی ادب پڑھا اور مولانا مخصوص اللہ دہلوی سے جو شاہ عبدالعزیزؒ کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدینؒ کے فرزند تھے، حدیث کا علم حاصل کیا اور قرآن کی سند لی۔ اس طرح والدین کی مذہبیت، تصوف سے خاندانی نسبت، شاہ غلام علیؒ سے عقیدت اور شاہ ولی اللہؒ کی تجدید و احیائے دین کی کوششوں

اور شعوری طور پر دینی علوم سے واقفیت کی بنا پر مذہب سے سرسید کی وابستگی بہت گہری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو خدا کا آخری اور مکمل دین سمجھتے تھے۔ انھیں سرورِ کائنات اور ان کے صحابۂ کرامؓ سے غایت درجے کا عشق تھا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

خدا دارم، دل بریاں ز عشقِ مصطفیٰ دارم
نہ دارد ہیچ کافر، ساز و سامان کہ من دارم

اسی جذبۂ محبت کے تحت انھوں نے فتح پور سیکری کے زمانۂ قیام [۱۸۴۲ تا ۱۸۴۶ء] میں "جلاء القلوب بذکر المحبوب" نامی رسالے کی تالیف کی۔ اس رسالے میں سرسید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، وفات، معجزات اور دیگر حالات کا ذکر کیا ہے۔ اسی زمانے میں ایک رسالہ "تحفۂ حسن" بھی لکھا۔ ایک اور رسالہ ۱۸۴۹ء میں "کلمۃ الحق" کے نام سے مرتب کیا اور اس میں پیری مریدی اور بیعت کے مروجہ طریقوں کی مخالفت کی۔ ۱۸۵۰ء میں ایک دوسرا رسالہ "راہِ سنت در ردِ بدعت" قلم بند کیا اور لوگوں کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی۔ قرآن و سنت کی تعلیم اور زندگی میں دین کی پابندی کے ضمن میں سرسید علمائے اسلام کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خدا کا کلام اور رسول کا کلام ہرگز خلاف واقعہ نہیں ہو سکتا۔ وہ فرماتے ہیں:

"قرآن مجید بلاشبہ کلامِ الٰہی ہے۔ کوئی حرف اس کا نہ خلافِ حقیقت ہے اور نہ خلافِ واقعہ۔ قرآن مجید کی اگر کوئی آیت ہم کو بظاہر خلافِ واقعہ یا خلافِ حقیقت معلوم ہو تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو اس آیت کا مطلب سمجھنے میں ہم سے غلطی ہوئی یا جس کو ہم نے حقیقت اور واقعہ سمجھا ہے اس میں غلطی کی ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال و افعال میں بالکل بجا ہے۔ مصلحتِ وقت کی نسبت رسول کی طرف کرنی سخت بے ادبی ہے جس میں خوفِ کفر ہے کوئی انسان سوائے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسا نہیں جس کا قول و فعل، بلا سندِ صحیح، دینیات میں قابلِ تسلیم ہو یا جس کے عدمِ تسلیم سے کفر لازم آتا ہو۔ اس کے برخلاف اعتقاد رکھنا شرک فی النبوت ہے۔"

ان اعتقادات اور نظریات کا پرتو ہمیں سرسید کی زندگی میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ تاحیات ان پر کاربند رہے اور ان سے کبھی منحرف نہیں ہوئے۔

اسلام پر سرسید کا یقین بہت پختہ اور مضبوط تھا۔ وہ اس کی حقانیت اور صداقت پر غور و فکر کے بعد ایمان لائے تھے۔ چنانچہ جب کچھ مخالف لوگوں نے ان کے اسلام پر شبہ کا اظہار کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اگر دین اسلام کے حق ہونے میں مجھے ذرّہ برابر بھی شک ہوتا تو میں فوراً اسلام ترک کر دیتا۔ وہ ایک خط میں سید مہدی علی خاں سے بھی یہی بات کہتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں۔ اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقاتِ حقیقتِ اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا۔"

اسلام پر ان کا یقین اپنی ذات کی حد تک ہی محدود نہ تھا بلکہ وہ اسے پوری قوم کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایک تقریر میں فرمایا:

" ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتے ہیں۔ یاد رکھو جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور پابند ہیں تبھی تک وہ قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا اور جس پر تم کو مرنا ہے

اسے قایم رکھنے سے ہماری قوم، قوم ہے"۔

سرسیّد کے زمانے میں اسلام کے استحکام، دین کی بقا اور اس کی حقانیت کو کئی محاذوں پر مقابلہ درپیش تھا اور مختلف قسم کی آزمائشیں اس کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھیں۔ اس آڑے وقت میں سرسیّد نے اپنی دینی فراست اور مومنانہ بصیرت کے ذریعہ اسلام کو ان حضرات سے بچانے کی سرتوڑ کوشش کی اور ہر محاذ پر مخالفین کے حملوں کا سینہ سپر ہو کر جواب دیا۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے بہترین اسباب و ذرایع سے کام لیا اور اس میدان میں جدید ترین اسلحہ سے لیس ہو کر دشمن کے مقابلے میں آئے۔ اسباب و ذرایع کے اختیار کرنے اور انھیں اسلام کے حق میں کارگر بنانے کے سلسلے میں ان سے کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئیں لیکن اسلام کے معاملے میں ان کی نیت اور ان کے خلوص پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سچے دل سے اسلام کی برتری کے لیے لڑے اور پوری نیک نیتی سے اس کی بقا اور ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ ان کے دور میں اسلام کو جن مختلف محاذوں کی طرف سے خطرات لاحق تھے، ان میں تین بڑے محاذ یہ تھے:

۱۔ اسلام کے پیرو: سرسید کے عہد میں مذہب کا تصور محدود ہو چکا تھا اور مسلمانوں نے اسے چند اعمال اور کچھ فقہی مسائل کے اندر محصور کر دیا تھا۔ عام مسلمانوں کا ذہن تقلیدی تھا اور ان کے اندر مذہب کے نام پر بہت سی غیر مذہبی باتیں رائج تھیں تقلید سے ان کے ذہن چونکہ جامد ہو چکے تھے اس لیے تنگ نظری تعصب اور باہمی اختلاف کا کافی زور تھا۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک اور سید احمد شہید کی تحریک نے مسلمانوں کو جمود و تعطل سے باہر نکالا لیکن آہستہ آہستہ وہ پھر اسی کا شکار ہو گئے"۔ سرسید نے محسوس کیا کہ مسلمان اپنے جمود اور تقلیدی ذہن کی بنا پر ہی مغربی علوم سائنس اور نئی تہذیب سے دور بھاگ رہے ہیں اور اپنے عمل سے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ گویا اسلام ان چیزوں کا مخالف ہے۔ انھی خیالات کے پیش نظر سرسیّد نے اسلام کا ایک متحرک

اور ترقی پسندانہ تصور پیش کیا اور یہ بتلایا کہ وہ سائنس اور ترقی کا مخالف نہیں ہے۔ سرسیّد نے یہ بھی ثابت کیا کہ اسلام ایک مکمل دین ہے اور ہر زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا چیلنج قبول کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مذہب کے بہت سے عقائد کی عقلی تاویل کی اور انھیں فطرت کے عین مطابق ثابت کیا۔ انھوں نے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کیا کہ جو عقائد فطرت کے مطابق ثابت نہ ہو سکے انھیں ماننے سے انکار کر دیا۔ سرسید سے علما کے شدید اختلاف کی اصل وجہ یہی انکار ہے۔ سرسید جمود کے سخت مخالف تھے۔ اس لیے انھوں نے تقلید اور تعصب کے خلاف بہت کچھ لکھا اور مسلمانوں کو اس سے بچانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ:

"جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا اور یہ اسلام کے حق میں سنکھیا سے بھی زیادہ زہر قاتل ہے"۔

قرآن اور اس کی تعلیمات چونکہ ارتقاے انسانی کے ہر مرحلے پر چراغِ راہ ہیں اور قیامت تک انسان کی رہبری اس کی ذمّہ داری ہے اس لیے قرآنی حقایق کی توضیح اور تفسیر میں عصری تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کے مفسّر کے لیے ضروری ہے کہ وہ سماج کے بدلتے ہوئے حالات، علوم و معارف کے انکشافات اور نئے ذہنی رجحانات کو سامنے رکھے اور ان کی روشنی میں آیات کی ایسی تشریح پیش کرے جس سے دینی روح بھی برقرار رہ سکے اور موجودہ خدشات و شبہات کا ازالہ بھی ہو سکے۔ سرسیّد نے اپنے تفسیر کے مقدمے میں اسی اصول کے پیش نظر عصرِ جدید کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ قرآن فہمی کے لیے اس کی ایسی ہی سادہ توجیہ ہونی چاہیے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کے دور میں تھی۔ روایتوں کے شوق، لطف بیان اور اعجوبہ پسندی کی خاطر تفاسیر میں جو اضافے نظر آتے ہیں وہ سب بعد کی چیزیں ہیں اور ان کی بنیاد بڑی حد تک محض قیاسات اور تاریخ نا آشنا

یم ہے علمائے اسلام نے ان تمام چیزوں کو اسرائیلیات
ام سے موسوم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن ذہنوں کو
رنے نہیں بلکہ روشن کرنے آیا ہے۔ اس نے آفاق اور
ر کائنات میں ہمیشہ غور و فکر کی دعوت دی ہے اور اسباب
سبب کا پتہ لگانے کی تلقین کی ہے۔ قرآن کے نقطۂ نظر کے
بق کلام بھی آیت الٰہی ہے اور مظاہر قدرت بھی آیت الٰہی ہیں
لیے قرآنی آیت کی توجیہہ اور تفسیر میں سائنسی تحقیقات
یداکتشافات اور انسانی تجسس کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا
سید کے نزدیک فطرت فعل الٰہی ہے اور قرآن قول الٰہی اور
اہر ہے کہ قول اور فعل میں تضاد نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے مظاہر
رت کو دیکھ کر قادر مطلق تک پہنچنا ایک معروف طریقہ رہا ہے۔
فیائے حق کے یہاں معرفت الٰہی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے ؎

سراپا میں اس کے نظر کرکے تم
جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہے

سرسید نے اپنی تفسیر میں ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھا ہے اور
ا سلسلے میں کچھ اجتہادات بھی کیے ہیں۔ اجتہادات میں ان سے
لیاں بھی ہوئی ہیں جن سے خود سرسید کے رفقاء نے
لاف کیا ہے۔

- مسیحی حکومت:

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں اور
گریزوں کے درمیان منافرت اور مغایرت کی دیوار حایل ہو گئی
ی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس ہنگامے میں انگریزوں نے
سلمانوں ہی سے اقتدار چھینا تھا اور ان کے ظلم و ستم کا سب
ے زیادہ نشانہ مسلمان ہی بنے تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں
ا مسیحی حکومت کے قیام کے بعد سرسید نے مذہب کی راہ سے
س منافرت کو دور کرنے کی کوشش اور اس کی جگہ مفاہمت
مصالحت کی راہ اختیار کی اس سلسلے میں سرسید نے اسلام
ور مسیحیت میں مماثلت کی راہیں تلاش کیں اور ان اصولوں کو منظر عام
ر لائے جو اسلام اور مسیحیت میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتے

تھے۔ اس طرح انھوں نے عیسائیوں کی ان بدگمانیوں کو دور
کیا جو ان کے اندر قرآن و سنت کے بارے میں عام تھیں اور
مسلمانوں کی ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جو ان کے ذہنوں میں
بائبل اور دین مسیح سے متعلق تھیں۔ سرسید نے اسی مقصد کی
خاطر بائبل کی ایک تفسیر بھی لکھی اور اس کا نام "تبیین الکلام"
رکھا۔ اس تفسیر کی تیاری کے سلسلے میں انھوں نے عہد نامۂ
عتیق اور عہد نامۂ جدید کا گہرا مطالعہ کیا اور قرآن و حدیث
سے ان عہد ناموں کی تطبیق کرکے اسلام اور عیسائیت میں اتحاد
کی بنیادیں استوار کیں۔ انھوں نے اپنی تحقیق کے ذریعے موجودہ
عیسائیت کو جس کی بنیاد عقیدۂ تثلیث، کفارہ اور تکذیب
محمدؐ پر ہے بالکل غلط ٹھہرایا۔ یہ تفسیر مسلمانوں اور عیسائیوں
کے لیے زیادہ پسندیدہ ثابت نہ ہوئی۔ اسی لیے یہ مکمل نہ ہو سکی۔
مگر اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ مخاصمانہ مناظرہ کے بجائے
افہام و تفہیم اور مصالحت کا طریقہ رائج ہوا۔ "تبیین الکلام"
میں سرسید نے اس بات پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے کہ
عیسائیت سے قریب ترین اگر کوئی مذہب ہے تو وہ اسلام
ہے۔ دوسری بات یہ کہ اسلام خوں ریزی، بربریت اور
جنگ و جدال کا مذہب نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہ
امن و آشتی اور توافق للبقا کا علم بردار ہے۔

۳۔ عیسائی مشنری:

سرسید کے زمانے میں اسلام کو ایک اور زبردست
خطرہ عیسائی مبلغین سے تھا۔ ان مبلغین کی ایک خاص بات
یہ تھی کہ انھیں حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اس لیے یہ
پوری طاقت کے ساتھ رفاہی کاموں کے علاوہ اسلام دشمنی
کا بھی منظم پروگرام چلا رہے تھے۔ وہ قرآن و حدیث نبی
آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دوسرے احکام
مثلاً طلاق، تعدد ازدواج اور غلامی وغیرہ پر رکیک حملے کرکے
مسلم نوجوانوں اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو دین سے برگشتہ
کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد"

زدں میں شائع ہوئی۔ اس میں میور نے اسلام کی تعلیمات
کو ضرب لگانے کی پوری کوشش کی تھی۔ سرسید نے اپنی
بت اور اسلام کی محبت کی بنا پر اس کتاب کا بہت ہی
سائنٹفک اور بھرپور علمی جواب "خطباتِ احمدیہ" کی
میں دیا۔ یہ پوری کتاب عیسائی علما اور پادریوں کے
مات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ اس میں سرسید نے رسول
سانی حیثیت، ان کی خاندانی عظمت، رسول کی اعلیٰ دماغی
ت اور غیر معمولی فہم و فراست کو نہایت علمی اور تحقیقی انداز
پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں انھوں نے مختلف
رتی مسائل اور دوسرے دنیاوی معاملات میں اسلام کی
ں اور ہدایت کو بھی بہ صراحت ظاہر کیا ہے۔ سرسید علیہ الرحمۃ
سول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک اور اسلامی
سے جو گہری محبت اور حد درجہ عقیدت تھی اس کا اندازہ
ت احمدیہ" سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے جب
اقدس پر نا روا حملے دیکھے تو اس سے انھیں بے حد
راب ہوا اور وہ دنیا کی ہر تکلیف کو اس کے مقابلے میں
سمجھنے لگے۔ انھوں نے لندن سے نواب محسن الملک کو
:

اِن دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ ولیم
صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں—
اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں
اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا اور
مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت کی سیر میں جیسا کہ
پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے
اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر
بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا
سے۔"

سرسید اس کتاب کی تیاری کو سب سے بڑا دینی فریضہ خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں وہ اس کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ اگر میری یہ کتاب تیار ہوگئی تو میں لندن میں آنا حج کے برابر سمجھوں گا۔ خدا قبول کرے۔

خطباتِ احمدیہ سرسید کے دینی جوش اور دینی جذبے کی صحیح عکاسی کرنے کے لیے کافی ہے۔ دین کی خدمت اور اسلام کی حمایت کا جذبہ اس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے اور اس سے یہ ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے کہ مذہب کی محبت ان کے رگ و ریشے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔

[ پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ ۔ ۱۶ر فروری ۱۹۸۴ء ]

"دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے
زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔ جس وقت کے
انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی
ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اسی وقت انسان
مرضِ مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔"

سرسیّد

# سرسید اور سیاستِ وقت

شان محمد

سرسید کے سیاسی رجحانات کو سمجھنے کے لیے ۱۸۵۷ء کے بحران کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہی وہ زبردست حادثہ ہے جس نے ان کی زندگی علمی و تحقیقاتی میدان سے ہٹا کر سیاست وقت کی طرف مایل کر دی اور وہ یہ سوچنے لگے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی بقا کے لیے اس ملک میں کون سا رخ اختیار کرنا چاہیے۔

سید احمد دہلی کے معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ شاہی درباری ورثہ میں ملی تھی۔ اپنے نانا حضرت خواجہ فریدالدین صاحب کے ذریعے جو اکبر شاہ ثانی کے وزیر اعظم تھے محل میں رسائی ہوئی۔ علمی تحصیل کے ساتھ ساتھ محل کی دعوتوں، راگ رنگ کی محفلوں میں میلوں ٹھیلوں کی ہر تقریب میں شریک ہوتے تھے۔ دربار میں سید کو انگریز ریزیڈنٹ کے بڑھتے ہوئے اثر رسوخ کو دیکھتے ہوئے اور مغلوں کی بگڑتی ہوئی حالت کے سمجھنے کا کافی موقع ملا اور بقول حالی سرسید کا سیاسی شعور اپنے نانا جان کا رہین منت ہے اور یہ اس صحبت کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۳۸ء میں جب ان کے والدِ محترم جناب سید محمد متقی صاحب انتقال کر گئے تو انھوں نے شاہی نوکری پر سرکار انگلشیہ کی نوکری کو ترجیح دی اور صدر امین کے دفتر میں محکمۂ فوجداری میں سررشتہ دار ہو گئے ۱۸۳۹ء سے ۱۸۵۷ء تک کم و بیش بیس سال کا عرصہ ہوتا ہے اور اس درمیان سید نے اپنا سارا وقت تاجداران مغلیہ کی تاریخ تصنیف کرنے اور عمارات دیرینہ کی کھوج میں صرف کیا۔ جام جم اور آثار الصنادید ان کی اس تحقیقی ماحول کی زبردست مثال ہیں ان بیس سالوں میں ان کو سلطنت وقت کی صحیح طاقت اور مسلمانوں کی بگڑتی ہوئی معاشی زندگی کے سمجھنے کا اور بہت موقع ملا۔ ساتھ ہی ساتھ ان کا یہ احساس بھی بڑھتا جاتا تھا کہ انگریز دن بہ دن ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہوتے جاتے ہیں اور ان کے زیر اثر مسلمان تنزل کی طرف بڑھ رہے ہیں مگر اس کے باوجود سید نے ملکی سیاست میں کوئی عملی قدم نہیں رکھا اور ایک محقق کی حیثیت سے وہ علمی ماحول میں لگے رہے۔ ۱۸۵۷ء ان کی علمی زندگی میں عظیم انقلاب لایا اور یہیں سے سرسید کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ شمالی ہند کے ان حصوں کو جو غدر سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے، سرسید نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مفلسی اور بدنصیبی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ ان کا دل اپنی قوم کی حالت پر جلتا تھا۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے نواب خلیل اللہ شاہ جہانی کے پوتوں کو صرف چند پیسوں کی مزدوری پر پاؤں دابتے دیکھا۔ ان کی تحقیق نے ان کو یہ بتایا تھا کہ تغلق آباد کے گاؤں میں جس قدر مسلمان گھسیارے آباد تھے اور جو تمام دن گھاس کاٹ کر شام کو بیچتے تھے وہ سلطان محمد عادل شاہ تغلق کی اولاد میں تھے مسلمانوں کی تباہی سے وہ اس قدر پریشان تھے کہ بقول حالی ان کی حالت ایک ایسے آدمی کی تھی جس کے مکان میں آگ لگ گئی ہو اور وہ بقیہ حصے کے بجھانے میں ہمہ تن مصروف ہو۔ غدر اور اس کے بعد مسلمانوں کی تباہی عموماً

پر پہنچ چکی تھی اور سر ڈبلو ڈبلو ہنٹر کے الفاظ میں کہ اگر برطانوی ایوان میں سے کسی ممبر پارلیمنٹ کو سنسنی پیدا کرنا ہوتی تو وہ بنگال کے مسلمانوں کی تباہی سنا دیتا۔ ہنٹر نے صرف بنگال ہی کے مسلمانوں کی حالت کے بارے میں اپنی کتاب 'ہمارے ہندوستانی مسلمان' میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے لیکن ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مسلمانوں کی حالت بنگال سے بہتر نہ تھی۔

غدر اور انگریزوں کے مظالم نے سرسید کو چند بنیادی باتوں پر پہنچنے کا موقع دیا:

۱۔ انگریز مسلمانوں کو غدر کا بانی سمجھتے تھے۔

۲۔ مسلمان حد سے زیادہ رجعت پسندی کی طرف مایل تھے اور اسی لیے انگریز اور انگریزی تعلیم ان کے لیے کفر کے برابر تھی۔

۳۔ حاکم اور محکوم کے درمیان اختلافات کی وسیع خلیج تھی اور دونوں ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔

سرسید کا خیال تھا کہ کوئی طاقت اب انگریزوں کو اس ملک سے نہیں نکال سکتی اور اگر بیرونی طاقت کی محکومی قسمت ہو چکی ہے تو ہندوستان کے لیے انگریزوں سے بہتر کوئی حکمراں نہ تھا۔ تلوار اور ڈھال کی جنگ ختم ہو چکی تھی اور انگریز صنعتی انقلاب کے ذریعے نئے آلات سے لیس تھے ہندوستانیوں کے لیے اب اگر کوئی راستہ تھا تو وہ اتحاد اور تعاون کا تھا اور اسی کے ذریعے وہ حاکم وقت سے اپنے حقوق لے سکتے تھے۔ ان باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے سرسید ان اسباب کے تدارک میں لگ گئے جو غدر کے بعد فوراً ان پر آشکار ہوئے۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے پہلا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے "اسباب بغاوت ہند" لکھی جس میں بڑی دوراندیشی سے ان تمام غلطیوں کو اجاگر کیا جو انگریز اس ملک میں کر رہے تھے اور جس کا انجام آخر غدر ہوا۔ سیاسی اعتبار سے یہ کتاب بہت اہم سمجھی گئی اور انگلستان کے سیاسی حلقوں اور اخبارات نے اس پر کافی عمدہ رائیں دیں۔ یہ اسی کتاب کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۶۱ء میں حکومت ہند نے راجہ نریندر سنگھ (رئیس پٹیالہ) راجہ دیو نراین (رئیس بنارس) اور راجہ دنکر راو (دیوان گوالیار) کو مجلس قانون ساز کا ممبر منتخب کیا۔ ہندوستانیوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کے لیے انھوں نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نکالا اور برابر تحریرات سے یہ کوشش کرتے رہے کہ ہندوستانی گھروں میں بیٹھ کر سرکار کو لعنت و ملامت نہ دیں بلکہ میدان عمل میں آکر سرکار سے اپنے حقوق مانگیں۔ اپنی ایک تقریر میں جو انھوں نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے جلسے میں کی کہا:

"اگر رعایا (اپنی) ناراضگی کو چھپائے اور اس کو علانیہ گورنمنٹ کے سامنے پیش نہ کرے اور دل میں رنج رکھے اور بظاہر ہاتھ جوڑے تو یہ علانیہ ثبوت اس بات کا ہے کہ رعیت گورنمنٹ کی خیر خواہ نہیں۔"

سیاست وقت کا تقاضا تھا کہ مسلمان حکومت وقت سے اس کے تعمیری ماحول میں تعاون کریں لیکن غدر کی فضا میں یہ ممکن نہ تھا۔ برطانوی حکومت اور اخبارات یہ سمجھتے تھے کہ سرکار انگلشیہ کے خلاف مسلمانوں پر مذہباً جہاد کرنا فرض ہے۔ نیز یہ کہ اسلام غیر مذہب کی عورتوں اور بچوں کے قتل کی اجازت دیتا ہے اور عیسائی اور اسلام مذاہب کے درمیان مماثلت ممکن نہیں۔ سرسید یہ سمجھتے تھے کہ جب تک انگریزوں کے دلوں سے یہ شبہات دور نہ ہوں گے مسلمان تباہی اور بدحالی کا شکار رہیں گے۔ انگریز حکمراں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے انھوں نے لایل محمڈن آف انڈیا لکھی۔ احادیث کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ برطانوی عمل داری میں جہاد ممکن نہیں کیونکہ مسلمان اس ملک میں امن و امان سے ہیں اور

نگریزوں کے خلاف جہاد نہیں کر سکتے۔ جہاد کا سوال وہاں
ہوتا ہے جہاں اہلِ اسلام کو مذہبی آزادی نہ ہو۔ پائنیر اخبار
رق گردانی میں سر سید کے ایسے درجنوں خطوط ملتے ہیں
میں بخاری اور مسلم کے حوالے سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ
مان سرکارِ انگلشیہ کے خلاف جہاد نہیں کر سکتے کیونکہ برطانوی
ار ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی۔ تفسیر
یہ کے حوالے سے سید نے بتایا کہ اگر کوئی شخص اپنے مذہبی
ظالموں یا کافروں کی وجہ سے نہ کرے تو اس پر ہجرت
ہے۔ یعنی اس ملک میں جائے جہاں وہ شخص اپنے
کے احکام بخوبی بجا لا سکے۔

سر سید نے انگریزوں کے اس الزام کی بھی وضاحت
کہ اسلام غیر مذہب کی عورتوں اور بچوں کے قتل کی اجازت
ہے اور غدر میں مسلمانوں نے بہت سے عیسائی عورتوں
بچوں کو تہہ تیغ کیا۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں سر سید
جناب رسولؐ کے فرمان کو پیش کیا، جنہوں نے حکم دیا تھا
اگر کافروں کے ساتھ کبھی لڑائی ہو تو عورتوں اور بچوں اور
بوڑھوں کو جو لڑ نہ سکیں اور جو امان میں آجاویں مت قتل
کرو۔"

عیسائی اور انگریزوں کو قریب لانے کے لیے انھوں
تبیین الکلام لکھی اور کہا کہ عیسائی اہلِ کتاب ہیں۔
قرآن شریف سے ایسی آیات پیش کیں جن میں کہا گیا تھا کہ
عیسائی اور اہلِ اسلام ایک دوسرے سے بے حد قریب
ہیں۔ تاریخ اسماعیل ابوالفدا کے حوالے سے سر سید نے
مکّہ کے مشرکوں نے مسلمانوں کو بہت ستایا تو خدا کے
سے جناب رسولؐ نے مسلمانوں کو حبشہ جانے کا حکم دیا جہاں
بادشاہ عیسائی تھا۔ ان مہاجروں کی تعداد ۸۰ مرد اور
عورتوں پر مشتمل تھی۔ شاہ حبشہ نے مسلمانوں سے پوچھا
حضرت عیسٰی کے لیے ان کا کیا خیال ہے تو مسلمانوں نے
قرآن شریعت کی آیت پڑھی جس کا مطلب یہ تھا کہ حضرت عیسٰی

مریم کے بیٹے اور اللہ کے رسول ہیں۔ اسی طرح کی اور بھی بہت
سی آیات ہیں جن کی مدد سے سر سید نے یہ ثابت کیا کہ مسلمان
کسی بھی طرح انگریزوں کے اس ملک میں جہاد نہیں کر سکتے۔

یہی نہیں انھوں نے مسلمانوں کے رجحانات کو بھی
ہموار کیا جو یہ سوچتے تھے کہ انگریزوں کے ساتھ میز کرسی پر
بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا مذہبًا ممنوع ہے اس کے لیے
انھوں نے طعام اہلِ کتاب لکھی جس میں قرآن مجید کی روشنی
میں یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں کا انگریزوں کے ساتھ کھانا
کفر نہیں ہے۔ یہ تمام تحریرات مذہبی ہیں مگر ان کی پشت
میں سیاسی جذبہ کار فرما تھا اور وہ یہ کہ مسلمان حکومت
وقت سے تعاون کریں، ان کے علوم پڑھیں، سرکاری نوکریوں
میں داخل ہوں اور ترقی کی راہوں میں دوسری قوموں کے
ساتھ شامل ہوں۔ علی گڑھ تحریک اسی خواب کی تعبیر تھی جو
سر سید اپنے مشن کے حاصل کرنے کے لیے بڑی جاں فشانی
اور گرم جوشی سے چلا رہے تھے۔ سر سید جب کہ سیاسی
میدان میں مسلمانوں کے راہیں ہموار کر رہے تھے، مسلمانوں
کو اس کی اجازت نہ تھی کہ وہ سیاست میں حصّہ لیں یا کسی
سیاسی تنظیم میں شریک ہوں۔ دوسری طرف ملک کا
انگریزی داں طبقہ جو زیادہ تر غیر مسلموں پر مبنی تھا، انگریزی تعلیم
کے زیرِ اثر برطانیہ سے حقوق طلبی میں مصروف ہو چکا تھا اور
انڈین نیشنل کانگریس کا جنم اسی پڑھے لکھے گروہ کی اختراع
تھی۔ سر سید جن کی سیاسی حکمتِ عملی اسی پر مبنی تھی کہ مسلمان
صرف مغربی علوم حاصل کریں اور سیاسی میدان سے الگ
رہیں۔ اس نئی جماعت سے پریشان ہو گئے۔ شروع شروع
میں خاموشی اختیار کی مگر ایک سال بعد ابل پڑے اور اس
کی مخالفت میں تقریریں کیں اور علی گڑھ گزٹ میں مضامین لکھے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ پچھلے تیس سالوں
سے سر سید حاکم و محکوم کے تعلقات استوار کرنے میں دل و
جان سے کوشاں تھے۔ غدر کی ہولناک تباہیوں نے جس میں

مسلمان بُری طرح شکار ہوئے تھے انھیں بہت خوفزدہ کردیا
تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان پھر کسی سیاسی بحران کا
شکار ہوں' انگریزوں سے دشمنی مول لیں۔ ان کا خیال تھا کہ
اگر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ظہور میں نہ آتا تو آج ہمارے سیکڑوں
جوان لفٹیننٹ ہوتے ہم میں بہت سے لوگ فوج کے کپتان
اور جنرل نظر آتے اور اب یہ پوزیشن اعلیٰ تعلیم اور حاکم و محکوم
کے خوشگوار تعلقات سے پھر حاصل ہوسکتی ہے۔

سرسید کی کانگریس مخالفت سے بدرالدین طیب جی
اور ہیوم کو بڑی تشویش ہوئی۔ ہیوم نے کہا کہ انڈین نیشنل کانگریس
کی بنیاد ڈالنے کا خیال اُن کے ذہن میں سرسید ہی کی تقاریر
اور تحریرات سے جو ہندوستانیوں کی حقوق طلبی سے پُر ہیں
یہیں ان کے ذہن میں آیا تھا۔ طیب جی اور ہیوم ایک عرصے
تک مراسلت کے ذریعے سرسید کو اپنا نقطۂ نظر سمجھاتے رہے
مگر سید جواباً یہی تحریر کرتے رہے کہ ہم ہندوستانیوں کی
قومی ترقی روکنا نہیں چاہتے اور نہ دوسرے لوگوں کو اُن کے
حقوق کی طلبی کے لیے منع کرتے ہیں۔ اپنے ایک بہت ہی موثر
مکتوب میں طیب جی نے پھر سید کو لکھا کہ یہ خیال بالکل درست
ہے مگر آپ کو ایک بڑے فلسفی کا قول نہ بھولنا چاہیے کہ جب
تک عراق سے تریاق آئے سانپ کا کاٹا ہوا مریض چل
بسے گا۔

ان دونوں عظیم شخصیتوں کے درمیان اختلاف ہونا ضروری
تھا۔ غدر نے شمالی ہند کے مسلمانوں کو بُری طرح کچل دیا تھا
مگر خوش قسمتی سے دکن کے مسلمان اس حادثہ سے بچ گئے
تھے۔ طیب جی نے نہ تو ہولناک غدر دیکھا تھا اور نہ اُن کو شمال
کے مسلمانوں کی تباہی کا کچھ اندازہ تھا۔ کانگریس اور علی گڑھ
تحریک کشمکش نے سرسید کو بہت ہی متنازعہ فیہ بنادیا ہے
کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ وہ انگریزی سیاست کے شکار
ہوگئے اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے کانگریس کی مخالفت
صرف اس کو غیر مسلموں کی ایک جماعت سمجھ کر کی اور سرسید
ہی کی حکمت عملی نے تحریک پاکستان پر جاکر دم توڑا اور ۱۹۴۷ء
میں ان کا خواب پورا ہوگیا لیکن سطحی مطالعے کے بعد یہ نظریے
غلط ہوجاتے ہیں۔ سرسید ہی وہ انسان تھے جنھوں نے اسباب
بغاوت ہند لکھ کر برطانیہ کو غدر کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ سید ہی
بھارت کے وہ سپوت تھے جنھوں نے صرف اس لیے آگرہ دربار
میں شرکت نہیں کی کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے بیٹھنے
کا انتظام حاکم و محکوم کے نقطۂ نظر سے کیا گیا تھا۔ انھوں نے
۱۸۶۶ء کے گزٹ میں ایک طویل مضمون لکھا جس میں ہندوستانیوں
کے ساتھ انگریزوں کے برتاؤ کی سخت مذمت کی گئی ایسے نڈر اور
بیباک انسان کو کس طرح برطانوی سیاست کا شکار کہہ سکتے ہیں
انھوں نے کانگریس کی مخالفت اس کو غیر مسلموں کی جماعت سمجھ
کر نہیں کی بلکہ انھوں نے جسٹس امیر علی کی سینٹرل نیشنل محمڈن
ایسوسی ایشن کی مخالفت بھی کی جو خالص مسلمانوں کی جماعت
تھی اور جو انھوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ۱۸۷۷ء
میں قایم کی تھی۔ اپنے قریبی دوست مولوی نیاز محمد وکیل پنجاب
کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

میں محمڈن نیشنل کانفرنس کے مقاصد سے متفق
نہیں ہوں میری رائے میں مسلمانوں کے لیے
سیاسی ایجی ٹیشن کرنا مناسب ہے۔"

اس خط سے یہ صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ ہندو اور مسلمانوں
کے سوال نے سرسید کو پریشان نہیں کیا اور نہ انھوں نے ہندو
اور مسلمانوں کو دو قوم ہی سمجھا۔ دو قومی نظریہ مسٹر جناح کی تخلیق
ہے جنھوں نے ۱۹۴۰ء میں علم پاکستان بلند کیا اور ۱۹۴۷ء
میں ملک کے دو حصے کروالیے۔ ڈاکٹر رفیق زکریا اپنی کتاب
"رائز آف مسلم ان انڈین پالیٹکس" میں لکھتے ہیں کہ سرسید
اور محمد علی جناح کے خیالات تقاریر و تحریرات میں بالکل
یکسانیت ہے۔ ہو بہو باتیں سرسید نے ۱۹ویں صدی میں
کہی تھیں وہی جناح نے اسی شدومد کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں
کہا۔ گویا جناح سرسید کے نعم البدل تھے لیکن مصنف کے

لزامات سرسید کی کسی بھی تحریر یا تقریر سے ثابت نہیں ہوتے سید نے ہندو اور مسلمانوں کو نفرت کے جذبے سے دو ھا۔ دونوں کو ایک قوم بتایا۔ دونوں کے لیے گنگا جمنا کی ایک ی اہمیت بتائی۔ دونوں کو ایک دوسرے کی خوشی اور غم ں شریک بتایا۔ رسم و رواج میں دونوں کی کم و بیش یکسانیت ائی۔ اپنے کو ہندوستانی اور ہندو بتایا اور دونوں کو متفق رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ ان کے درجنوں بیانات ج بیج کر ان کے ہندو مسلم یک جہتی کا ثبوت دیتے ہیں، مگر ج کل کے مصنف کانوں پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، اسی کے ساتھ چند سنجیدہ نقادوں نے سرسیدی رجحان کو سراہا ہے ول پنڈت جواہر لال نہرو سرسید کی کانگریس مخالفت س کے ہندو ہونے کی وجہ سے نہ تھی بلکہ وہ سوچتے تھے کہ ہندو جو مسلمانوں سے انگریزی تعلیم میں ایک صدی آگے اس تحریک میں حصہ لے سکتے تھے مگر مسلمانوں کی شمولیت یقیناً ان ی تعلیمی سرگرمیوں کو نقصان پہنچاتی۔ سرسید کا مغربی تعلیم پر ور دینا اور کانگریس کی مخالفت کرنا بالکل درست تھا چونکہ اس کے بغیر وہ ہندوستانی قومی تحریک میں مستقبل میں تنا زبردست حصہ نہ لے سکتے تھے۔ انھوں نے کانگریس کی مخالفت وقتی طور سے کی ور وہ مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رہنے کی تلقین کرتے رہے جب تک کہ ان کے اندر سیاسی شعور پیدا نہ ہو جائے۔

تحریک آزادی کے لیے ملک کے ہر فرقے کا سیاسی اور تعلیمی نقطۂ نظر سے برابر ہونا نہایت ضروری ہے کیوں کہ کسی دوسرے کے ہم پہلو نہ ہونے سے قومی تحریک پنپ نہیں سکتی۔ سرسید اس خیال کے حامی نظر آتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندو مغربی تعلیم اور سیاسی میدان میں مسلمانوں سے آگے ہیں اور اتنی بڑی اقلیت کا پیچھے رہنا اکثریت کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ جسٹس بدرالدین طیب جی اور رحمت اللہ سیانی نے کانگریس کی صدارت اس لیے کی کہ مغربی تعلیم اور معاشی اعتبار سے وہاں کے مسلمان شمالی ہند کے مسلمانوں سے آگے تھے۔ متوسط طبقہ جو ہر سیاسی تحریک کا جزِ خاص ہوتا وہ پیدا ہو چکا تھا۔ سرسید نے یہ کبھی ظاہر نہیں کیا کہ اگر ۱۸۵۷ء کے بعد تعلیمی اور معاشی اعتبار سے مسلمان ہندوؤں کے برابر ہوتے تو ان کا سیاسی رجحان کیا ہوتا۔ لیکن ان کی تقاریر اور تحریرات سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہ ہوگا کہ ایسی صورت میں وہ کسی سیاسی تحریک کی مخالفت کرتے۔ ان کو بیسویں صدی کے اصلاحی معنوں میں نیشنلسٹ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کو فرقہ پرست کہنا بھی بڑی غلطی ہوگی۔

سیاست وقت کے تقاضے سرسید زندگی بھر پورے کرتے رہے۔ جمال الدین افغانی کی مخالفت مول لی۔ انگریزوں کی مشرق وسطی اور افغان پالیسی کی حمایت کی اور وہ تمام سیاسی ماحول میں پیش پیش رہے جن سے ذرا بھی مسلمانوں کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ سیاسی علیگڑھ اور تعلیمی رجحان سرسید کے بعد بھی علی گڑھ کا طرۂ امتیاز رہا۔ بقول شبلی سے

مدتوں بحث سیاست کی اجازت نہ تھی
کہ وفاداریٔ مسلم کا تقاضا تھا سکوت

لیکن جیسے جیسے مغربی تعلیم ترقی کرتی جاتی تھی عام مسلمانوں میں بے چینی بڑھ رہی تھی اور انگریزی داں مسلمانوں میں ایک ایسا بھی طبقہ تھا جو انگریزوں کے خلاف آواز بلند

> "سرسید احمد خاں کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں، خواہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں جو سرسید پسند کرتے۔"
>
> خالدہ ادیب خانم

نا چاہتا تھا۔ جب ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ کالج کے طلبا نے انگریز
پرنسپل اور اسٹاف کے خلاف اسٹرائک کر دی تو وفادار
مسلمان بھی اس قدم کو قبل از وقت سوچتے تھے اور اقبال
نے کیمبرج سے طلباء کے نام لکھا ؎

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی

لیکن مولانا محمد علی اس اسٹرائک سے خوش تھے۔ کالج
کے اولڈ بوائز اپنا جلسہ منا رہے تھے۔ مولانا بھی اس میں شریک
تھے۔ سرسیّد کی تصویر کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے
ایک نظم پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

سیاسی علیحدگی کا رجحان اب ختم ہوتا جا رہا تھا اور مولانا
محمد علی نے اس نظم کے شعر میں اس کا اظہار کیا ؎

تمہیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علی گڑھ میں
اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اور جا بجا تم ہو

سرسیّد کی تحریک کا یہ لامحالہ نتیجہ تھا جو اس طرح
ظہور میں آیا بعد میں ہندوستانی قومی تحریک کے ساتھ ساتھ
علی گڑھ بھی شانہ بہ شانہ چلا۔ بھارتی سپوت یا یوں کہوں
کہ فرزندان علی گڑھ ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا محمد علی، رفیع
احمد قدوائی، پروفیسر محمد حبیب، حسرت موہانی اور راجہ مہندر
پرتاب سنگھ اور بے شمار حضرات نے ہندوستانی عوام کے
ساتھ مل کر جدوجہد کر کے ۴۷ء میں انگریز غلامی کا جوا
اتار پھینکا اور دستور ساز اسمبلی نے آزاد ہندوستان کا
دستور مرتب کرنا شروع کیا یہ سرسیّد کے خواب کی
تعبیر تھی۔ شاید اسی دن کے لیے سرسیّد نے اب سے ۹۴ سال پہلے
کہا تھا: ہندوستانیوں کو علوم و فنون میں اور زیادہ ترقی کرنی
درکار ہے۔ چند ہندوستانیوں کا لیجس لیٹو کونسل میں داخل ہونا
ہندوستانیوں کی ترقی کا شروع ہے۔ تم میری اس پیشن گوئی کو
یاد رکھو کہ وہ دن دور نہیں ہے کہ ہر ضلع میں سے ایک شخص کا
کونسل میں داخل ہونا ضروری ہوگا۔ وہ دن آوے گا کہ تم خود ہی
قانون بناؤ گے اور خود ہی اس پر عمل کرو گے۔

(ہفتہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ ۱۶ مئی ۱۹۸۵ء)

"مرحوم سرسید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف
ایک کالج ہی قایم نہیں کیا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی اور
ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا
کر دیا تھا۔ اس حلقے کی مرکزی شخصیت خود ان کا
وجود تھا اور اس کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع
ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے کسی موقت الشیوع
رسالے نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت
کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں۔ جیسے کہ "تہذیب
الاخلاق" سے مرتب ہوئے۔"

مولانا آزاد

# اصلاح معاشرہ

۶۱ ———— ۸۶

# ہمارے مسائل

سید حامد

سو سال سے زیادہ ہوئے سر سید نے ایک رسالہ تہذیب الاخلاق کے نام سے جاری کیا تھا۔ یہ تین بار نکلا اور بند ہوا۔ تہذیب الاخلاق کی کل مدتِ حیات دس برس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ سر سید نے آخری بار اسے اس لیے بند کیا کہ جن اصلاحی خیالات کا اظہار وہ اس کے ذریعے کر رہے تھے وہ بعض ان با اثر اور قدامت پسند اشخاص کو ناگوار تھے جن کی مدد سر سید ایم۔ اے۔ او کالج کے قیام اور فروغ کے لیے لینا چاہتے تھے۔ انھوں نے یہ رسالہ بادلِ ناخواستہ بند کیا۔ اگرچہ ان اشخاص کا اور خود اسی تحریک کا بھرم رکھنے کے لیے انھوں نے اپنے اس لختِ جگر کو پیوند خاک کرتے ہوئے کہا تو یہی کہ وہ اپنا مقصد پورا کر چکا تھا۔ مقصد کی ایک گونہ تحصیل ضرور ہوئی تھی یعنی پڑھے لکھے مسلمانوں کے ایک طبقے میں یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ ہمیں مایوسی، جہالت، مجبوری قناعت اور اندھی قدامت سے دل کے دامن کو بچانا ہے۔ ان برائیوں سے نجات حاصل کرنا ہے۔ ہمیں زمانے کے تقاضوں کو سمجھنا ہے اور انھیں پورا کرنا ہے۔ اگر ہم نے جدید تعلیم سے منھ موڑا تو زندگی کی دوڑ میں ہم پیچھے رہ جائیں گے اور پیچھے رہ جانے کا انجام شروع میں تحقیر اور رسوائی اور آخر میں فنا ہے۔ لیکن یہ احساس ابھی عام نہیں ہوا تھا کہ یہ رسالہ بند ہو گیا۔ سر سید نے سوچا ہوگا کہ جس کالج اور جس یونیورسٹی کا خواب انھوں نے دیکھا ہے اس کے قیام کے بعد وہ ادارہ خود سرچشمۂ تہذیب و ہدایت بن جائے گا۔ اس نور کے منبع سے جو کرنیں پھوٹیں گی وہ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے ہر گوشے کو منور کریں گی۔ اس سے ادارہ کا کام نہ صرف تعلیم دینا اور تحقیق کرنا ہوگا بلکہ تربیت دینا اور اخلاق کو سنوارنا بھی ہوگا۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو قایم ہوئے ۱۰۰ سال ہو گئے اور اسے یونیورسٹی بنے ہوئے دو اوپر ساٹھ سال۔ تہذیب الاخلاق کو جو کام کرنا تھا وہ یہ ادارہ نہ کر پایا۔ اس میں شک نہیں کہ اس ادارے نے حوصلہ پیدا کیا، روشنی بخشی۔ اس نے ایسے فرزندوں کو جنم دیا جو ملک و ملت کے لیے سرمایۂ افتخار بنے۔ جو کچھ روشنی ہم ہندوستانی مسلمانوں میں دیکھتے ہیں وہ بڑی حد تک اسی ادارہ کی دین ہے لیکن آگے چل کر یونیورسٹی کے ولولے سرد ہو گئے۔ ملک کی تقسیم کے لیے اسے الزام دیا گیا۔ یہ اس کے ساتھ ناانصافی تھی۔ یہ خیال کہ ہم پر شبہ کیا جا رہا ہے، ہمیں عداوت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے، ہمت کے لیے مضر ہے۔ ہمارے طالب علم سمجھنے لگے کہ ہمارے ساتھ اپنے ملک میں انصاف نہیں ہوگا، ہمیں یہاں روزگار نہیں ملے گا اور واقعی جب انھوں نے روزگار کے دروازہ کو یہاں بند پایا تو ان کے پاس اس کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا کہ روزگار کی تلاش میں سرحد کو پار کریں۔ وہ اس طرح گئے کہ نہ جانے والوں کو اور مشتبہ کر گئے۔ مشتبہ رہنے کے بعد حوصلہ کہاں باقی رہتا ہے چنانچہ جس ملت کو سر سید نے سرگرمِ عمل ہونا اور آگے بڑھنا اور زمانے کے ساتھ چلنا سکھایا تھا وہ

ملّت اپنے خول میں واپس چلی گئی۔ خول کے اندھیرے سے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچی، روشنی کھٹکنے لگی، مایوسی نے الٹے مشورے دیے۔ خود پر ترس کھانے، طبیعت شکایت کی خوگر ہو گئی۔ شبہ کا جواب بدگمانی سے دیا گیا۔ غرض کہ حالات کے صحت مند اور نارمل ردّعمل سے ہم لوگ محروم ہو گئے۔ فسادات اور تجربات نے اس لو کو اور تیز کر دیا۔

یونیورسٹی جوکھوں میں پڑ گئی تھی۔ اس کو ایک بڑے رہنما اور اس کے ایک مشیر کی بصیرت نے بچا لیا۔ یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ کی تعداد، اس کی عمارتوں اور ساز و سامان، اس کے بجٹ میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس کے سارے مصارف کی حکومت کفیل بن گئی لیکن اس دارالعلوم میں وہ روح پلٹ کر نہ آئی جس نے اسے تعلیم و تہذیب کا ایک بڑی تحریک کا مرکز بنا دیا تھا۔ اس کے فرزند اس اعتماد اور ولولے سے محروم ہے جو ان کی پہلی پیڑھیوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ انھوں نے ریاضت سے دامن بچایا، مقابلے سے آنکھ چرائی۔ انھوں نے مقدار کو معیار کا بدل سمجھا۔ بساط سے زیادہ داخلے کیے گئے۔ ہم آگے بڑھے، صرف تعداد میں۔ اس اطمینان نے بھی حکومت وقت سارے اخراجات کی ضامن ہے، ہمت کو پابہ زنجیر کر دیا۔ انجام کار یونیورسٹی عام یونیورسٹیوں کی صف میں بیٹھ گئی۔ جسے عہد آفریں ہونا تھا وہ عہد شکن ثابت ہوئی۔ اس عہد کو توڑنے والی جو اس نے اپنے بانی سے کیا تھا یعنی یہ پیمان کہ وہ شہر سے پیوستہ رہتے ہوئے جدید ترین ترقیوں کو جذب کرے گی، تعلیم اور تہذیب کی نقیب اور کارواں سالار بنے گی۔ افسوس کہ یہ جیتا جاگتا، امنگوں، خوابوں اور زندگی سے بھرپور ادارہ، ضابطہ آسایش اور بے امنگی اور معیار فروشی کے شکنجے میں جکڑ گیا۔ اب یہ خود کو سنبھال لے، اپنے طالب علموں کو روشنی اور حوصلہ بخشے تو بڑی بات ہے۔ پوری ملت کی رہنمائی کا اس کا ہوتا نہیں ہے۔ حالانکہ یونیورسٹی کے ایکٹ میں حال ہی میں جو ترمیمیں ہوئی ہیں ان میں ایک کی رُو سے یونیورسٹی پر یہ فریضہ عاید ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی بہبود اور ترقی کے لیے جد و جہد کرے، یہ دفعہ اہم اور دھیان دینے کے لائق ہے۔

اس کام میں اسے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ کانفرنس نے ایک زمانہ میں کارہائے نمایاں انجام دیے اس کے سالانہ اجلاس ہندوستانی مسلمانوں کے سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس اجلاس کے صدارتی خطبے مسلمانانِ ہند کے تمام اہم مسائل کا احاطہ کرتے تھے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی تجویز پیش کرتے تھے۔ تہذیب الاخلاق کی طرح آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ تحریک کا اہم جزو تھی۔ وقت کا تقاضا ہے کہ تہذیب الاخلاق کو نئے سرے سے زندہ کیا جائے اور کانفرنس کی مردہ رگوں میں خون زندگی دوڑایا جائے۔

اس رسالہ کو کوئی دوسرا نام دے سکتے تھے لیکن تہذیب الاخلاق نام رکھنے کی جسارت تسلسل کی خاطر کی جا رہی ہے اور توانائی اور روشنی حاصل کرنے کے لیے بھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں یہ موڑ بہت کچھ ویسا ہی ہے جیسے ۱۸۵۷ء کی بغاوت یا پہلی جنگ آزادی کے بعد کا موڑ۔ پہلی جنگ آزادی کے بعد پہلی بار مسلمانوں کے اطوار و افعال اور زاویۂ نگاہ کو انگریزوں سے شکست اور ان کے مظالم نے مسخ کر ڈالا تھا۔ بٹوارہ اور آزادی کے بعد ایک بار پھر ان کے اعتماد کو دھکا لگا۔ انھوں نے بے رحم دنیا سے بدلہ اس طرح لیا کہ اس کی ہماہمی اور اس کی پیش رفت سے کنارہ کش ہو گئے۔ بند پانی میں فساد کی بو آتی ہے۔ پانی مرتا ہے تو سڑنے لگتا ہے۔ کارواں رک جائے تو ناکارہ ہو جاتا ہے۔

۱ ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت ہیں۔ انھیں اقلیت کہنا نامناسب ہوگا۔ صدیوں تک صاحبِ اقتدار و اختیار رہ چکے ہیں۔ ان کا تعلق ایک ایسی ملت سے ہے جس نے علم و اعمال کی مشعلیں روشن کیں، جس نے اخوت، حریت اور مساوات کے دیے جلائے، ان مشعلوں، ان چراغوں کو لے کر چشم زدن میں دنیا کو منور کر دیا۔ تاریخ کا یہ بڑا طنز ہے کہ چند صدیاں گزرنے کے بعد وہی لوگ جو مشاہدہ، تجربہ اور غور و فکر کے علمبردار، علم و اخلاق کے کارواں سالار تھے، جہالت، جمود اور

اندھی تقلید کے حصار میں آبیٹھے۔ جہالت نے انھیں کہیں کا نہ رکھا اپنے بھلے برے کا انھیں شعور نہ رہا۔ جب تک کہ تعلیم عام نہیں ہوتی مسلمان تہذیب کی برکتوں سے محروم رہیں گے۔ علم ہماری گم شدہ میراث ہے اسے حاصل کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔ اس پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے یہ کام تہذیب الاخلاق انجام دے گا۔

اردو میں اخبار و رسائل کی کمی نہیں لیکن ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سنجیدہ انداز میں مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور اقتصادی مسایل پر غور کرتے ہوں جن کا مقصد ہو مسلمانوں میں وہ خواص پیدا کرنا جو انھیں تنزل سے ہٹا کر ترقی کی طرف لے جائیں۔ یہ بات کہتے ہوے ہماری گردن شرم سے جھک جاتی ہے کہ مسلمان اس ملک کا سب سے پسماندہ فرقہ ہے۔ اس سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ انھیں اپنی پسماندگی کا نہ علم ہے نہ احساس۔

ہماری دوسری شان امتیاز کاہلی ہے۔ اگر ہمارا کوئی عضو سرگرم عمل ہے تو زبان۔ زیادہ بولنے والے دو طرح ٹوٹے میں رہتے ہیں۔ اس عادت سے ایک تو قوت عمل کو زنگ لگتا ہے دوسرے یہ سننے غور کرنے اور سمجھنے کا موقع نہیں دیتی۔ ہم قول کو فعل کا بدل سمجھنے لگتے ہیں۔ یہیں سے فرد فریبی کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جو کردار کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور انسان کو جھوٹ کے گھڑے میں ڈھکیل دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ آرام طلبی ہماری طبیعت بن گئی ہے۔ محنت، ریاضت اور جفاکشی سے ہم جی چراتے ہیں ہر وقتی جوش میں کبھی کبھی خون بہانے کی بات تو کرتے ہیں لیکن پسینہ بہانے سے گھبراتے ہیں۔ پتہ مارنے کے بجاے ہم ڈینگ مارتے ہیں۔ بادشاہی، جاگیرداری اور زمینداری کے زمانے ختم ہوے لیکن وہ مزاج ہنوز باقی ہے۔ رسی جل گئی بل نہ گیا۔

ملے خاک میں پر رعونت وہی ہے
ہوئی صبح اور خواب راحت وہی ہے

شراب کی طرح کاہلی بھی ام الخبائث ہے۔ ان گنت برائیوں کی جڑ ہے۔

اور رعونت وہ تیسرا روگ ہے جو گھن کی طرح ہمیں لگ گیا ہے جسے دیکھیے فرعون بے ساماں بنا ہوا ہے۔ اگر سامان ہوتا تو نہ جانے کیا کرتے۔ یا شاید بے سرو ساماں ہونے کی نفسیاتی تلافی مریضانہ گھمنڈ کے ذریعہ کی جارہی ہے۔ انانیت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ بڑے بڑے اہم ملی مسائل میں کیا رخ اختیار کیا جائے اس کا فیصلہ صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ جو شخص براہ راست اس مسئلہ سے متعلق ہے وہ آپ کی طرف کس حد تک ملتفت ہوا۔ اس نے قصداً یا سہواً آپ کو نظر انداز کر دیا تو آپ نہ صرف اس کے دشمن ہو جائیں گے بلکہ اس مسلک کی مخالفت پر بھی تل جائیں گے جو اس غریب نے اپنایا ہے۔ امور کے متعلق ردّ عمل کا یہ انداز خام کاری اور تنگ ظرفی کی دلیل ہے یہ طریق کار افراد کی بے سوچی اور بھولی ہوئی انانیت، جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ عبرت کی جگہ ہے کہ انفرادی نخوت نے اجتماعی عزت نفس کا خون کر دیا ہے بلکہ خود جمعیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔

فرد قایم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

یہی رعونت نفاق کی جڑ ہے۔ اتحاد نہ ہوگا تو طاقت کہاں سے آے گی جسے دیکھیے لڑنے مرنے کے لیے تیار ہے بے مہار انفرادیت نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ طغیان آمادہ انانیت اور بے زنجیر انفرادیت پر انکس لگانا ہے

انانیت نے ایک اور بہروپ بھرا ہے حسد۔ اس کے جو زیادہ قریب ہوتا ہے وہی زیادہ مورد التفات ہوتا ہے بیگانے ترقی کریں پھلیں پھولیں، کوئی فکر نہیں لیکن اپنوں میں کوئی بننے نہ پاے، آگے بڑھنے نہ پاے۔ اس سے یہ راز کھلا کہ بیچارے مسلمانوں پر جو برق گرتی ہے وہ انھیں کی خود ساختہ پرداختہ ہوتی ہے۔ اسلام نے اجتماعیت اور قناعت پر بڑا زور دیا ہے۔ یہ دونوں سبق ہم فراموش کر چکے

دوسرے حیوانوں پر انسان کی برتری عقل کی وجہ سے ہے۔ عقل ہی جذبات کو قابو میں رکھتی ہے، ان کی عنان گیر

ہوتی ہے، اُن کو راہ پر لگاتی ہے، ان کو اچھے کاموں میں استعمال
کرتی ہے۔ عقل ہی بُرے بھلے کو پہچانتی ہے۔ وہی اندھیرے
میں راستہ دکھاتی ہے۔ ہم نے عقل کو معزول کر رکھا ہے۔ ہمارے
یہاں سارا کھیل جذبات کا ہے۔ کوئی خطیب، کوئی چابک دست
اہلِ قلم، کوئی سیاست داں، کوئی بانیٔ شر جب چاہے ہمارے
جذبات کا رُخ جس طرف چاہے موڑ دے۔ جذبات کا طوفان
ہمیں اونچ نیچ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ جو چاہے ہمیں
برانگیختہ کر دے، بے وقوف بنا دے، خودکشی پر آمادہ کر دے
جذبات کے سیلاب میں بہنا کون سی اچھی بات ہے۔ سیلاب
میں تو خس و خاشاک بھی بہتے ہیں۔ ہمیں چٹان کی طرح قدم
گاڑ کر رہنا ہے۔ یہی عزتِ نفس کا تقاضا ہے، بقا بھی اسی میں
ہے۔ عقل بھی یہی سکھاتی ہے۔ عقل کی بازیابی، عقل کی بالادستی
ہمارا مقصود ہے۔

یہاں تک تو ہم نے اپنے مزاج، اپنی افتادِ طبع کو آئینہ
دکھایا ہے۔ وہ افتادِ طبع جو ہماری خوش حالی، ہماری ترقی کے
خلاف جاتی ہے۔ اب ہم ان باتوں کا ذکر کریں گے جن پر
رسالہ میں خاص طور سے دھیان دیا جائے گا۔ پہلے ان توہمات
کو لیجیے جنھوں نے ہمیں کمزور، اپاہج اور ڈھلمل یقین بنا دیا ہے
خدا کے بنائے ہوئے مہینے اور دن انسان کو امکانات اور
مواقع فراہم کرنے میں یکساں ہیں۔ ہم نے اپنی ضعیف الاعتقادی
کے باعث اُن پر مبارک اور منحوس کے لیبل لگا دیے ہیں بہت
سی تباہ کن، وقت، پیسہ اور اعتماد ضائع کرنے والی رسموں کو
ہم نے پتھر کی لکیر مان لیا ہے۔ عقلی اور علمی ترقی کے دور میں ہم
جھاڑ پھونک اور ٹونے ٹوٹکے پر ایمان لائے ہیں ذرا ذرا سی
بات کے لیے ہم دوسروں کے دستِ نگر بن جاتے ہیں اور اپنے
اپنے خدا کے درمیان فاصلوں کو طول دیتے رہتے ہیں۔ خدا
کے سوا ہم ہر ایک سے ڈرتے ہیں۔ مل کر ہم کوئی کام نہیں
کر سکتے۔ ہماری شرکت کی ہانڈی ہمیشہ چوراہے پر پھوٹتی ہے
اس لیے ہمارے کاریگر اور ہنرور امدادِ باہمی اور ہم کاری اور
اشتراکِ عمل سے طاقت نہیں اخذ کر پاتے۔ جہالت اور نفاق اور
کم حوصلگی ہنر کے باوصف انھیں آگے بڑھنے نہیں دیتی۔

علی گڑھ تحریک کا ادبی اور لسانی پہلو کس قدر درخشاں
تھا۔ اردو زبان و ادب کو اس تحریک نے کہاں سے کہاں پہنچا
دیا لیکن یہ احسان یک طرفہ نہ تھا اگر اردو زبان اور ادب
کی پُرزور تائید اسے حاصل نہ ہوتی تو یہ تحریک کمھلا کر رہ جاتی
سرسید اور ان کے رفقا، حالی، شبلی، ذکاء اللہ، نذیر احمد،
محسن الملک، وقار الملک وغیرہ نے اردو تحریر و تقریر کو سرسید
کے مقاصد اور منصوبوں کی تکمیل اور اشاعت کے لیے استعمال کیا
اُس زمانہ میں اردو میں سلیقہ اور خلوص سے جو بات کہی یا
لکھی گئی، مسلمانوں کے دلوں میں اترتی چلی گئی۔ اس زمانہ
میں یہ عالم ہے کہ دن بہ دن مسلمانوں میں اردو جاننے والوں
کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کے مشاہیر اہلِ قلم کے
گھروں کو ٹٹولیے تو بیشتر کے بچے کو اردو سے ناواقف پائیے
گا۔ اگر زمانہ کی رفتار یہی رہی تو وہ دن دور نہیں جب اردو
ایک بحرِ بیکراں سے سمٹ کر جوئے کم آب رہ جائے گی۔ یعنی
صرف ایک بولی جس کے بولنے والے بہت ہوں گے اور لکھنے پڑھنے
والے بہت کم۔ اردو کو مطالبات سے زیادہ مجاہدات کی
ضرورت ہے۔ یہ ریاضت اور ایثار کی طالب ہے اور ان
اجناس کی ہوا تک ہمارے ذخیرہ نہیں لگی۔

شادیوں میں داد و ستد کا شرمناک سلسلہ کہیں کہیں
ہمارے یہاں بھی شروع ہو گیا ہے۔ اس رسم کو بڑھنے سے
پہلے جڑ سے اکھاڑنا ہوگا ورنہ لڑکیوں کی زندگی اجیرن ہو جائے
گی اور ان کے والدین پر عرصۂ حیات تنگ ہونے لگے گا۔

جمود اور آسائش طلبی اور تن آسانی نے خانہ نشینی کو
فروغ دیا ہے۔ وہ لوگ جو ایک صدی میں دنیا میں پھیل گئے
تھے، دنیا پر چھا گئے تھے، اب گھر چھوڑتے ہوئے گھبراتے ہیں
لہٰذا ترقی سے جس کے لیے نقل و حرکت ضروری ہے محروم
رہتے ہیں۔

تعلیم نسواں کی اہمیت ہم نے دیر سے تسلیم کی جس کا اثر
ندہ نسلوں کی تعلیم پر پڑ رہا ہے۔ جب لڑکیوں میں تعلیم پھیلی
ایک اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو حسب
لاحیت، بر سر روزگار بر ملنے مشکل ہو گئے۔ ملک کے
ارہ کے بعد جب بہت سے لڑکے تلاش معاش میں پاکستان
، گئے، اس مسئلہ نے اور شدت اختیار کرلی۔ نہ معلوم
نے مسلم گھرانوں میں لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ضرورت اس بات
ی ہے کہ ان تھک کوشش کر کے روزگار کی راہیں لڑکوں
کھولی جائیں۔

تہذیب اور شائستگی مسلمانوں کے ساتھ منسوب کی جاتی
ہے لیکن جب یہ حدود سے بڑھ جاتی ہے تو بناوٹ اور تصنع
ن جاتی ہے۔ کبھی ظاہر داری کی شکل اختیار کر لیتی ہے کبھی مبالغہ
رغلو کی، کبھی کھوکھلی لفاظی کی۔ ان سب سے گریز اولیٰ۔

مسلمان اسراف پر ناز کرتے ہیں۔ فضول خرچی کو شاہ خرچی
رفراخ دلی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس آیت کریمہ کو نظر انداز کیا
اتا ہے۔ ان المبذرین کانوا اخوان الشیٰطین ہ (فضول
رچ شیاطین کے بھائی ہیں) اس اسراف کی بدولت لاکھوں
ر تباہ ہو گئے۔ اقتصادی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں۔ ہمارے یہاں
وراندیشی اور منصوبہ بندی جو فی زمانہ افراد کے لیے اتنی ہی ضروری
ہے جتنی اقوام کے لیے بخل اور ناقناعتی اور ضعف ایمان پر محمول
ی جاتی ہیں۔

ہم لوگ زبان کے زخم خوردہ ہیں۔ ایک پہلو دراز نفسی اور
وہ گوئی کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ زبان کا چٹخارہ گفتگو تک محدود
ہیں رہتا۔ لذت کام و دہن اس کی پیٹ میں آجاتی ہے
ور لذت کام و دہن کا چسکا صحت جسمانی اور ذہنی صحت کے
یاں کے علاوہ وقتی تضیع کا ذمہ دار بھی ہے۔ اوسط مسلمان
گھرانے میں عورتوں کا سارا وقت کھانے پکانے میں صرف ہوتا
ہے۔ اس کا سابقہ پھکنی اور دست پنے، چولہے اور توے دھویں
ور انگارے سے رہتا ہے۔ لذیذ مرغن مسالہ دار کھانے

عورتوں کے اوقات کو تلخ اور مردوں کے اذہان کو کند کرتے
ہیں۔ اس حد تک کہ مسلسل دماغی ریاضت اور یکسوئی سے
ہم بیشتر دامن بچاتے ہیں۔ ریاضی ہیں اسی لیے آج تک راس نہ
آئی۔ سائنس کے مضامین کو ہم ہفت خواں سمجھتے ہیں۔ یہ ہماری
غذا ہے جو ہمیں سہل پسندی اور آرام طلبی کی طرف لے جاتی ہے۔
ہمارے طالب علم اکثر وہ مضامین لیتے ہیں جن میں متواتر اور
باقاعدہ محنت کی ضرورت نہ پڑے۔ امتحان کے قریب نصاب
کی ورق گردانی کی اور اگلی جماعت میں ڈھکیل دیے گئے۔ کاش
ہمیں احساس ہو کہ وقت اور صحت کام و دہن کی لذت سے زیادہ
اہم ہیں اور مہارت اور کامیابی کے لیے لگاتار اور ان تھک محنت
کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ دور سخت اور جاں فشاں مقابلہ کا
دور ہے جو لوگ محنت سے جی چرائیں گے وہ صفحۂ ہستی سے مٹا
دیے جائیں گے۔ یہ دور دماغ کی بالادستی کا دور ہے۔ اگر
دماغ پر ہم نے زنگ لگنے دیا یا اسے دھویں اور کہرے میں گھر
جانے دیا یا اسے طویل وقفوں میں جست کے ساتھ کام کرنے
کا عادی بنا دیا تو ہمارا نام پستی میں بالا تر ہو جائے گا اور ذلت
کی راہ سے ہم فنا کے دہانے پر پہنچ جائیں گے۔ جسم و دماغ کے
باہمی ربط کو نظر انداز کر کے کوئی پنپ نہیں سکتا۔ دماغ کو
پس پشت ڈال کر کوئی جماعت جانبر نہیں ہو سکتی۔ ہمیں زندگی
کے ہر شعبے میں تکلف اور تصنع سے دامن بچانا ہے خصوصاً غذا
میں۔ سادہ اور صحت مند غذا رواج پا جائے تو ہمارا "دلدر"
دور ہو جائے۔ بہت سی برائیاں، جن میں سر فہرست کاہلی و بدذوقی
ہے، چٹخارا مل جائے، غذا میں سادگی کے ساتھ توازن کا اہتمام
بھی کرنا پڑے گا۔ ذائقہ برحق، مگر اعتدال کے ساتھ غذا
ہمیں چٹورے پن سے بچائے۔

من حیث القوم ہم جسمانی ورزش سے کچا جی کرتے
ہیں۔ "نماز نیند سے بہتر ہے" کی صدا ہمارے کان تک
پہنچتی اور پہنچ بھی جائے تو دوسرے کان سے نکل جاتی ہے
کسی بستی میں جا کر دیکھ لیجیے ان لوگوں میں جو علی الصباح

چہل قدمی کے لیے نکلتے ہیں، مسلمان ڈھونڈے نہ ملیں گے۔

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے

اور ان لوگوں میں جو روز سویرے غسل کرتے ہیں ہلکہ گویہ ل سا گزرنہ ہوگا۔ زندگی کی دوڑ میں ہم روز پیچھے رہتے ہیں ہمارے دن کا آغاز دیر سے ہوتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ طہارت کی لطافت تک ہم پہنچ جاتے ہیں لیکن بنیادی صفائی اور حفظانِ صحت سے ہم غفلت برتتے ہیں خواہ اس کا تعلق جسم سے خواہ گھر سے۔ ہمارے ساتھ کاہلی کے علاوہ گندگی منسوب کی جانے لگی ہے اور یہ الزام کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔

جذبات کے ہاتھ میں عناں دے دینے سے ہمیں بہت نقصان پہنچے ہیں۔ ہمیں لپکانا ورغلانا اور بھڑکانا بہت آسان ہوگیا ہے۔ ہم کوئی منصوبہ نہیں بنا سکتے اور اگر بنا بھی لیا تو اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جذبات ہمارا اوڑھنا بچھونا ہیں، وہی نشیب وفراز سمجھ سکتی ہے۔ جذبات کو ثبات کب ہے۔ ندی کی طرح چڑھتے ہیں اور اسی طرح اُتر جاتے ہیں۔ وہ غور وفکر کا موقع کہاں دیتے ہیں۔ جذباتیت سے ہمیں اپنا ناتہ توڑنا پڑے گا۔

مذہب کا نفوذ واثر جتنا مسلمانوں میں ہے کسی اور قوم میں نہیں لیکن محرومی نے ہمارا یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ ہم نے عبادات کو ظواہر تک محدود کر دیا ہے۔ آیات تو فر فر پڑھنے لگے دل تک آنچ بھی نہ پہونچی، دل کو آہٹ بھی نہ ملی۔ جو لوگ ٹکریں مار لیتے ہیں انھیں سجدہ اور تلاوت کی قدر وقیمت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ سجدہ جس کے لیے اقبال نے کہا ہے ؎

وہی سجدہ ہے لائق اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

حضورِ قلب بڑی بات ہے۔ کاش ہم نماز حضورِ ذہن کے ساتھ پڑھنے لگیں تو ہمارے اخلاق واطوار خود بخود سنور جائیں نماز میں جو کچھ ہم پڑھتے ہیں اس کا مفہوم ذہن نشیں ہونا چاہیے ذہن تک بات پہنچ دیجیے تان بالآخر دل ہی پہ ٹوٹے گی فی الحال ہم نہ عبادات کا حق ادا کر رہے ہیں نہ عباد کا۔ خلقِ خدا کی خدمت اور معاملات میں راست روی کو ہم نے ثانوی حیثیت دے رکھی ہے۔

خلقِ خدا کی خدمت کا جہاں تک تعلق ہے یہ روایت ہماری متروک ہو چکی ہے۔ بہت کم تنظیمیں ہمارے یہاں ایسی ہیں اور بہت کم افراد جو سماج کی خدمت کے لیے میدان میں آئے ہیں۔ سوشل ورکر نام کی کوئی چیز ہمارے یہاں نہیں ہے کیونکہ معاشرے کی خدمت اور اصلاح کے جذبے نے ہمارے دامنِ دل کو چھوا تک نہیں۔ یہ کام سخت ہے۔ نفس کشی، جان فشانی، پامردی اور استقامت کا طالب ہے اور ہم صرف دفعوں کے ساتھ جو تکے ہیں۔ ہمارا مزاج "صحافی" وضع کا بن گیا ہے۔ یعنی شہرت اور سنسنی والا مزاج۔ ملک کی اکثریت سے اپنا موازنہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں سنجیدگی، خاموشی اور محنت سے خلق کی خدمت کرنے والوں کا ہجوم ہے، ہمارے یہاں وہ معدوم ہیں۔ محنت اور خدمت کے بجائے یہاں سیاست کا چٹخارہ لگا ہوا ہے۔ چھوٹی اور ارزاں سیاست جو تبادلہ اور پرمٹ سے آگے نہیں بڑھ پاتی جو اربابِ اقتدار کے ٹکڑوں پر گزرتی ہے ہماری قیادت ٹکاؤ نہیں بکاؤ ہے۔ اپنے آپ کو بازار میں لیے پھرتی ہے۔ جنس کاسد کی جو قیمت لگ جائے غنیمت ہے ہمارے مقامی رہنما اربابِ اقتدار کا طواف کرتے رہتے ہیں اور ان کی نگاہِ لطف کا انتظار۔ ملک گیر قیادت درکنار اب صوبہ کی سطح کی رہبری بھی ہمیں میسر نہیں۔ مستثنیات ہر جگہ ہوتی ہیں اور کلیہ کو بنانے میں ان سے مدد ملتی ہے۔ بہرحال بحیثیت مجموعی ہماری رہنمائی حاضر باشوں اور خوشہ چینوں اور ہنگامہ خیزوں کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں احساس نہیں کہ کسی ملت یا جماعت کی تعمیر اور ترقی سیاست سے نہیں ہوتی، تعلیم، تربیت اور محنت سے ہوتی ہے۔ طاقت امداد باہمی سے آتی ہے۔ ہمارا یہ حال ہے کہ ہم نے صلہ رحمی کو بے دردی کے ساتھ ترک کر دیا ہے۔ تعلیم اور تربیت کے سلسلہ میں اپنے عزیزوں کی مدد

کرنا ہمیں گراں گزرتا ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مقابلہ کیجیے تو مسلمانوں کی یہ خامی اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ اُن کے یہاں یہاں مشترک خاندان کا تصور ابھی تک باہمی امداد اور مناسب پرداخت کا ضامن ہے۔ ہمارے یہاں سب کچھ انانیت کی طغیانی اور نفسی نفسی کے سیلاب میں بہہ گیا۔ ہمارے یہاں جو افراد ترقی کرتے ہیں اُن سے نہ رہبری ملتی ہے نہ مدد۔

ایک اختلاف نے ملت کو دو نیم کر دیا ہے۔ ہم لوگ دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک وہ طبقہ جس نے دینی تعلیم پائی ہے۔ دوسرا وہ گروہ جس نے عام تعلیم انگریزی اسکولوں میں پائی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک وسیع کھائی ہے گویا دونوں الگ الگ دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کھائی کو پاٹنا ہوگا۔ یہ کام بہت دشوار اور رہرو گزار ہے۔ ایسا نہ ہوا تو ملت کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔ دینی تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم کا اہتمام کرنا ہوگا اور ان طلبہ کو جو عام اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں جز وقتی طور پر دین کی تعلیم دینا ہوگی۔ یہ نہ ہوا تو ایک دنیا کا نہ رہے گا اور دوسرا دین کا۔

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں اُن برائیوں، کمزوریوں اور بیماریوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہندوستانی مسلمانوں خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے زوال اور پستی کے لیے ذمہ دار ہیں۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین شرح و بسط کے ساتھ ان کمزوریوں اور دوسری برائیوں کا ذکر کریں گے اور ان کو دور کرنے کی عملی تجاویز سامنے رکھیں گے۔ حالات اور ان سے زیادہ ہماری بے حسی میں "تہذیب الاخلاق" دراڑ ڈال سکے گا یا نہیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس رسالہ کا اجراء اور احیاء، اسی امید کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ ہم ان سب حضرات سے اپیل کرتے ہیں، بلا لحاظ مذہب و ملت جنہوں نے مسلمانوں کے مسائل پر غور کیا ہے، جو اُن کے انحطاط سے فکرمند ہیں کہ اصلاح کی اس مہم میں ہمارا ہاتھ بٹائیں، ہمارا حوصلہ بڑھائیں۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا تجربہ اور ولولہ کے تحت ہم اس رسالہ کی وضع میں ترمیم اور اس کی افادیت میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر ایک سے زیادہ زبانوں میں شائع کیا جائے۔ بہرکیف "تہذیب الاخلاق" کا مستقبل اور منفعت قارئین کرام کے تعاون اور مدد پر منحصر ہوگی۔

دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان مقاصد میں کامیاب کرے اور یہ رسالہ اصلاح اور ترقی کی ایک بڑی اور ملک گیر مہم کا ترجمان بن جائے۔ آمین

[ پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱، شمارہ ۱۔ فروری ۱۹۸۲ء ]

---

بقیہ —— متعلقہ صفحہ نمبر ۸۳

بملکل یا سناتی شادی کو سماجی منظوری ملے۔ مادیت اور زر پرستی کی چمک سے دور ہو کر سماجی بیداری پیدا کرنی ہوگی جس میں اخلاقی قدروں کو اجاگر کرنا ہوگا۔ جہیز سے پیدا شدہ خطرناک نتائج سے عوام کو آگاہ کرنا ہوگا جو ہمارے سکھ اور سکون کو پریشانیوں میں بدل دیتا ہے۔ خواتین میں بیداری بہت ضروری ہے۔

خواتین کو مل کر اس لعنت کے خلاف آواز بلند کرنی ہوگی۔ ایئرکنڈیشن روم میں قید و محدود تحریک نسواں آزادی کو محلوں کی گندی بستیوں میں لانا ہوگا جہاں عورتوں کے دامن میں صرف آنسو ہی آنسو ہیں۔

[ ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۶، شمارہ ۶۔ جون ۱۹۸۷ء ]

نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱، شمارہ ۹-۱۰ (ستمبر-اکتوبر) ۱۹۹۲ء

# سماج میں بوڑھوں کی ضرورت

اطہر پرویز

جارج برناڈ شا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کسی نے ان سے کہا کہ :

"نئی نسل، آپ کی نسل کے مقابلے میں زیادہ قد آور ہے۔"

برناڈ شا نے برجستہ جواب دیا :

"کیوں نہیں ـــــ ظاہر ہے کہ قد آور تو دکھائی دیں گے ہی کیونکہ وہ ہمارے کندھوں پر کھڑے ہوئے ہیں۔"

اِس بیان میں بڑی صداقت ہے۔ تہذیبوں کی عظمت اور توانائی کا انحصار درختوں کی طرح اُن کی جڑوں پر ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کی جھنڈی والی دوڑ ہے کہ ایک دوڑنے والا، اپنی منزل پر پہنچ کر وہ جھنڈی اگلے کے سپرد کرتا ہے جو اس کو لے کر دوڑتا ہے اور وہ جھنڈی پھر اگلی منزل پر کسی دوسرے کو دے دیتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ اسی لیے جب آگے والا آگے نکلتا ہے تو ہم جانتے ہیں کہ اس کے آگے نکلنے میں پہلے والے کا بھی ہاتھ ہے اور اسی لیے جب نئی نسل کوئی بڑا کام کرتی ہے تو اس میں پچھلی نسل کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ دنیا راکٹ کی منزل میں پہنچ گئی ہے لیکن جس آدمی نے پہیا ایجاد کیا تھا، اس کی حکمت بھی اس میں شامل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں بوڑھوں کی بڑائی کو ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ تجربے اور دانائی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

مغرب میں بوڑھوں کو سماج سے علیحدہ کرنے کی کوشش نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ہمارا سماج مغرب سے بہت مختلف ہے۔ مغرب میں جہاں فرد کی آزادی کا بڑا ڈھول پیٹا جاتا ہے وہاں بوڑھے کو اس انفرادی آزادی سے گویا محروم کرنے کا عمل کارفرما ہے۔ جیسے انسان بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھتا ہے وہ معاشرے سے بھی الگ ہوتا ہے۔ جن لوگوں سے ان کا خون کا رشتہ ہوتا ہے۔ وہ اس سے اپنا ناتا توڑ لینا چاہتے ہیں۔ اب وہ چلتا پھرتا ہے تو صرف اس لیے کہ وہ زندہ ہے۔ اس کی انفرادی آزادی محض اس حد تک رہ جاتی ہے کہ وہ چل پھر سکتا ہے لیکن معاشرے میں رہنے کے معنی محض چلنا پھرنا نہیں ہوتا بلکہ معاشرتی زندگی کے مختلف شعبوں میں حصّہ لینا ہوتا ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں بوڑھے کو ایک اہم سماجی حیثیت حاصل ہے۔ مشترکہ خاندان میں اس کی حیثیت ایک سرپرست کی ہوتی ہے۔ وہ اپنے بال بچوں کی زندگی کی سمت مقرر کرنے میں ایک نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ وہ اس چھوٹے سے خاندان کا مشیر بھی ہوتا ہے اور اُن کا ذمہ دار بھی۔

جب میں بوڑھے کا لفظ استعمال کر رہا ہوں تو اس سے مراد محض مرد نہیں بلکہ عورتیں بھی ہیں۔ اس لیے کہ بوڑھی عورتیں گھر میں ایک مثبت کردار ادا کرتی ہیں وہ خاندانی روایات کی پاسبان ہوتی ہیں۔ وہ بے لکھے خاندانی قانونوں کو عمل درآمد کرانے میں مددگار ہوتی ہیں۔ وہ رشتوں کے اعتبار سے ہر ایک کے حقوق و فرائض سے نہ صرف واقف ہوتی ہیں بلکہ ان کی رہنمائی میں ان حقوق و فرائض پر عمل ہوتا ہے۔ معاشرتی قوانین اپنی جگہ پر ـــــ لیکن ہمارے معاشرے میں روایات اور رسومات کو ان سے کم حیثیت حاصل نہیں ہے اور ان روایات اور رسومات نے ہندوستانی معاشرے کو بکھرنے سے بچا رکھا ہے۔

بڑے بوڑھے نہ صرف یہ کہ ان کی پاسبانی کرتے ہیں ان پر عمل کرواتے ہیں۔ وہ گھر کے اندر اور کبھی کبھی باہر بھی "عدالت" کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ گھر کے لڑائی جھگڑے، ان کے تصفیوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اور گھر کا ہر فرد ان کے فیصلوں کا پابند ہوتا ہے لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ وہ اپنے خاندان کا ڈکٹیٹر ہوتا ہے سچی بات تو یہ ہے کہ ڈکٹیٹر شپ ہندوستانی مزاج سے بعید ہے۔ ہندوستانی مزاج کبھی بھی ڈکٹیٹر شپ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ ہندوستانی معاشی تکلیف برداشت کر لیتا ہے، موسموں سے لڑ جھگڑ لیتا ہے اور ان کے سامنے ہتھیار بھی ڈال دیتا ہے، چھوٹی موٹی زیادتی برداشت کر لیتا ہے لیکن وہ اپنی انفرادی آزادی کو کبھی کسی دوسرے کے سپرد نہیں کر سکتا۔ یہ انفرادی آزادی اسے جان سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ اپنی زباں بندی گوارا نہیں کرتا کہ اس کے بغیر اسے روحانی تسکین حاصل نہیں ہو سکتی۔

بوڑھے کی یہ حیثیت نہ صرف اپنے گھر میں ہوتی ہے باہر بھی اس کو عزت سے دیکھا جاتا ہے۔ اسے پنچ کے منچ پر بٹھایا جاتا ہے۔ سب لوگ اس کے سامنے اپنی شکایتیں اور اپنے جھگڑے رکھتے ہیں۔ اس وقت اس کی حیثیت پنچ پرمیشور کی ہوتی ہے۔ وہ حق اور انصاف کی روشنی میں اپنے فیصلے کرتا ہے۔ وہ اس وقت انصاف کی ترازو کو ہاتھ میں لینے کے بعد اپنے پرائے میں امتیاز نہیں کرتا۔ یہاں اس کی عمر کے تجربے اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک بڑی اور بامصرف زندگی گزار دینے کے بعد وہ خود غرضی کی سطح سے اپنے آپ کو بلند کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارا گاؤں اس کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

ہندوستانی بوڑھا، علم، عقل اور تجربے کا دوسرا نام ہے۔ وہ ایک بڑی روایت کا حامل ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ آنے والی نسل کو اپنا سب کچھ دے جو اس نے برسوں کی محنت، مشقت اور ریاضت کے بعد حاصل کیا ہے اور وہ ایسا کرتا بھی ہے لیکن کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ہم اپنے کے مالی ورثے کو بلا جھجک قبول کر لیں لیکن اس کے تہذیبی ورثے سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھیں۔ کیا یہ خواہش بہت زیادہ نہیں کہ ہم از سر نو اپنے تجربے سے ہی سب کچھ حاصل کریں۔ کیا یہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو تھو نہیں ہے۔ حالانکہ جس کو کڑوا سمجھ کے تھوکا جا رہا ہے وہ اتنا کڑوا بھی نہیں ہے۔

شاید ہندوستانی معاشرے نے یہ بات روز اول سے ہی سمجھ لی ہے کہ بوڑھے بھی سماج کا الوٹ انگ ہوتے ہیں۔ ان کو اگر توڑ دیا جائے تو ہمارا معاشرہ لولا اور لنگڑا ہو جائے گا۔ اس لیے سماج میں ان کا کردار مثبت حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ سرکاری ملازمت سے وہ ایک خاص عمر میں پہنچ کر سبکدوش ہوتے ہیں لیکن وہ معاشرے سے سبکدوش نہیں ہوتے۔

یہ بوڑھا جسے لوگ غلطی سے از کار رفتہ سمجھ لیتے ہیں، ان کا ذہن ایک شاندار کمپیوٹر ہوتا ہے جس میں زندگی کے تجربے، انسانی رشتوں کی نزاکتیں

علم و عمل کی سرگرمیاں سب محفوظ ہو جاتے ہیں۔ رات میں بچہ
اچانک رونے لگتا ہے۔ نوجوان ماں اور باپ پریشان ہو جاتے ہیں
کہ ان کے بھلے چنگے بیٹے کو کیا ہوا۔ ماں تو اپنے ہوش و حواس کھونے
لگتی ہے۔ اس وقت گھر کا یہ بزرگ آگے بڑھ کر ان کو تسلی دیتا
ہے۔ ان میں اعتماد پیدا کرتا ہے اور پھر غور سے بچے کو دیکھتا
ہے اور مسکراتا ہے۔ "بہو ذرا بستر تو دیکھو یہ کیا ہے، چونٹیاں
کاٹ رہی ہیں۔ بغلوں اور جانگوں میں چونٹیاں رینگ رہی
ہیں"۔ ماں کے بہلانے سے بچہ کیسے چپ ہو جاتا۔ وہ اپنی
تکلیف کو بیان نہیں کر سکتا اور بوڑھی دادی نے بروقت اپنے
تجربے سے مدد لی۔ یہ ضروری نہیں کہ بچے کے چونٹی ہی
کاٹ رہی ہو۔ اس کے کان میں درد بھی ہو سکتا ہے۔ اپنی
تکلیف بیان نہیں کر سکتا لیکن بوڑھی دادی غور سے دیکھنے کے
بعد یہ دریافت کر لیتی ہے کہ اس کے کان میں درد ہے۔
وہ سب کو مطمئن کر دیتی ہے اور طاق میں سے کوئی تیل نکال کر
ایک آدھ قطرہ کان میں ٹپکا دیتی ہے اور ذرا سی دیر میں بچہ
خاموش ہو کر سو جاتا ہے۔

گویا یہ بوڑھے اپنے چٹکلوں سے اس چھوٹے سے
گھر کے بروقت معالج بھی بن جاتے ہیں۔

بوڑھوں کی ہمہ جہتی حیثیت سے کون انکار کر سکتا ہے
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جدید سوسائٹی بوڑھوں کا بوجھ برداشت
نہیں کر سکتی۔ یہ خیال خام ہے بلکہ میں تو اور آگے بڑھ کر یہ کہوں
گا کہ آج ان کی جتنی ضرورت ہے اتنی شاید اس سے پہلے نہیں
تھی۔ اب جب کہ نوجوان میاں بیوی دونوں گھر سے باہر بھی کام
کرتے ہیں۔ ان کو کم از کم آٹھ گھنٹے تو ضرور اپنے منصبی فرائض کی
وجہ سے باہر رہنا پڑتا ہے تو اس وقت ان کے ننھے منے بچے
ان بوڑھوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ
ملازم ان کی دیکھ بھال کر لیتے ہوں لیکن ان کو وہ محبت تو نہیں
مل سکتی جو اُن کو دادی اور دادا دے سکتے ہیں۔ وہ نہ صرف
اپنے بچوں کی پرورش کرنے میں ہی ممد و معاون ثابت ہوتے
ہیں۔ بلکہ ان بچوں کی ابتدائی تربیت میں بھی بڑا نمایاں کردار
ادا کر سکتے ہیں۔

یہ کہنا کہ حکومت چوں کہ ایک خاص عمر پر بلا وجہ تھوڑا ہی اپنے
کارکنوں کو سبکدوش کرتی ہے یہ سچ ہے لیکن کلی حقیقت نہیں۔
وہ بڑوں کو اس لیے سبکدوش کرتی ہے کہ نوجوانوں کو موقع فراہم
کرے لیکن یہ بھی دیکھا گیا اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ دوسرے
لوگ ان کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں اور اُن کے علم اور تجربے
سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سیاست کے میدان میں بڑے
اہم فرائض انجام دیتے ہیں۔ کاروبار کی دنیا میں وہ اپنی کامیابی
کے سکے گاڑتے ہیں۔ ان کے مشورے سے قومیں سرفراز
ہوتی ہیں۔

(پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ ۱۶ فروری ۸۴ء)

"الٰہی تو اپنے بندوں مسلمانوں کو توفیق نیک دے
اور ان کے دل کی آنکھوں کو روشن کر کہ وہ موجودہ
حالت کو دیکھیں اور آئندہ کی حالت کو سمجھیں۔ سچ
ہے۔ تُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ بِیَدِکَ
الخَیر اِنَّکَ عَلیٰ کُلِّ شَیءٍ قَدِیر۔"

سرسیدؒ

# نقل کرنے کی بری عادت

محمد مختار اصلاحی

نقل کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک نقل تو وہ ہے جو کچھ دیر کے لیے محض دلچسپی و تفریح کے طور پر دوستوں اور ساتھیوں میں کی جاتی ہے۔ اس طرح کی دل بہلانے والی نقل میں کوئی قباحت و حرج نہیں ہے لیکن جو نقل کسی کا دل دکھانے یا ذلیل و رسوا کرنے کی غرض سے کی جائے وہ بہت بری ہے اور اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ اس طرح کی حرکت کرنے والا خود بہت جلد لوگوں کی نظروں سے گر جاتا ہے اور سماج میں اُسے کوئی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوتا۔

ایک نقل پیشہ ورانہ ہوتی ہے۔ فی زمانہ اس پیشے کی طرف لوگوں کا رجحان کچھ زیادہ ہی بڑھا ہوا ہے اس لیے کہ یہ تن آسانی کا دور ہے اور اس پیشے میں معمولی ذہنی عیاشی کے بدلے گھر بیٹھے زیادہ پیسے آجاتے ہیں۔ آج کل اس طرح کی نقلوں کے کیسٹ بھی تیار ہو کر بازاروں میں ہاتھوں ہاتھ بک رہے ہیں۔ غور کیا جائے تو اس میں بھی کئی نقصانات ہیں:

۱۔ اس نقالی میں سچ کے ساتھ جھوٹ بھی کچھ زیادہ ہی ملانا پڑتا ہے اور جھوٹ کی یہ عادت دوسرے معاملات میں بھی اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔

۲۔ یہ بہت سی دوسری اچھی صلاحیتوں کو بھی برباد کر دیتی ہے۔

۳۔ آسمان و زمین کا قلابہ ملانے میں آدمی پھر کسی اور کام کا نہیں رہتا۔

۴۔ آسانی سے جو رقم ملتی ہے وہ اللے تللے خرچ بھی ہو جاتی ہے کچھ بچنے کی نوبت نہیں آتی۔

۵۔ کچھ دنوں کے بعد جب مسخرہ پن کا دور ختم ہوجاتا ہے اور وہ کسی مصرف کا نہیں رہتا، جیب بھی خالی ہو تو مجبوراً لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اور بھیک مانگ کر زندگی گزارنا پڑتا ہے۔

نقل کرنے کی نہایت غلط اور خطرناک صورت وہ ہے جو طلبا امتحان گاہ میں کیا کرتے ہیں۔ اس طرح کی نقل پہلے زمانے میں بھی ہوا کرتی تھی لیکن بہت کم اور وہ بھی ڈر و شرم کے ساتھ اب اس طرح کی نقل عام ہوتی جا رہی ہے اور بہت کم طلبا ایسے ہیں جو اس لعنت سے بری ہیں کچھ طلبا، زور زبردستی کاپی و کتاب کھول کر آزادانہ نقل کیا کرتے ہیں کچھ چاقو و پستول دکھا کر اور کچھ رشوت و خوشامد کے سہارے اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں اس بُری عادت نے بھی سماج میں کئی طرح کی خرابیاں پیدا کر دی ہیں:

۱۔ بہت سے طلبا نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا ہے

کیونکہ ان کو اس بات کا یقین ہے کہ بغیر پڑھے لکھے اور بغیر محنت کیے نقل کی مدد سے پاس ہو جائیں گے۔

۲- جب کوئی طالب علم سال بھر اپنی کتابوں کے مطالعے سے محروم رہے گا تو یقیناً اس کی استعداد و صلاحیت آگے نہ بڑھ سکے گی۔

۳- جب کسی طالب علم میں استعداد و صلاحیت ہی نہ ہوگی تو روز بروز اس کا علمی ذوق و شوق کم ہوتا جائے گا۔

۴- علمی شوق کی کمی کے نتیجے میں بالآخر جلد ہی طالب علم پڑھنا لکھنا چھوڑ کر فکر معاش کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔

۵- علم کی دولت کی کمی اور بڑھتی ہوئی جہالت کی وجہ سے سماج میں طرح طرح کی کمزوریاں و برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس کی بنا پر اچھا بھلا معاشرہ بگڑ کر تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

نقل کرنا و کروانا بعض ملکوں میں ایک نفع بخش تجارت بن گئی ہے اس کے پھیلانے و بڑھاوا دینے میں کم فہم خود غرض اور نافرض شناس اساتذہ پیش پیش ہیں۔ وہ اپنا جیب بھرنے کی غرض سے بچے کے لیے ٹیوشن پر زور دیتے ہیں، ٹیوشن میں بچوں پر محنت کے بجائے سال بھر وقت گزاری کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلباء کی کمزوری تو دور نہیں ہوتی لیکن ٹیوشن کے صلے میں نقل کے ذریعہ ان کا نتیجہ بہت اچھا آتا ہے۔ ٹیوشن کی اس تجارت کو برقرار رکھنے کے لیے ہر استاد ایک دوسرے کا مددگار ہوتا ہے۔ ماں باپ بھی یہ سوچ کر ٹیوشن کو جاری رکھنے پر مجبور رہتے ہیں کہ بچوں کو کچھ آئے یا نہ آئے اس ٹیوشن سے یہ فائدہ تو حاصل ہے کہ بغیر کچھ محنت کیے وہ ہر سال اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ نفع بخش تجارت بڑی تیزی سے فروغ پا رہی ہے۔ اساتذہ اور ماں باپ دونوں اس لین دین سے مطمئن ہیں لیکن چکی کے دو پاٹوں میں غریب طالب علم بُری طرح پیسا جا رہا ہے۔ کبھی بدقسمتی سے استادوں کا توڑ جوڑ صحیح نہیں بیٹھتا تو بے چارہ طالب علم ناکامی سے دوچار ہوتا ہے اور اگر دوسرے سال بھی یہی ناکامی قسمت میں آئی تو طالب علم دل برداشتہ ہو کر ہمیشہ کے لیے تعلیم ہی کو خیر باد کہہ دیتا ہے۔ یہ خطرناک کاروبار اب تو کم و بیش ساری دنیا میں جاری ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارا ملک اس میں بہت آگے ہے اور اسی کا یہ افسوسناک نتیجہ ہے کہ یہاں کا تعلیمی معیار دن بہ دن تیزی سے گرتا جا رہا ہے۔ اس تشویشناک صورت حال پر ملک کی با اثر جماعتیں اور اقتدار و اختیار رکھنے والے اصحاب ہی بآسانی قابو پا سکتے تھے لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ یا تو انھیں اس مسئلے کی نزاکت و خرابی کا احساس ہی نہیں ہے یا پھر اپنے مسائل و مصالح سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ اس مسئلہ پر اپنی توجہ مبذول کر سکیں، مگر اس حقیقت کو بھولنا نہ چاہیے کہ اس بُری عادت کا جو وبائی شکل اختیار کر کے پوری سوسائٹی کو نکما اور کھوکھلا بنا رہی ہے جلد تدارک نہ کیا گیا تو یہ ملک اور قوم کا ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔

نقل کرنے کی اس بُری عادت کی روک تھام میں جیسا کہ میں نے کہا ہے، حکومت وقت اور با اثر جماعتیں موثر رول ادا کر سکتی ہیں لیکن وہ اپنے فرائض ادا کرنے سے غافل ہوں تو ماں باپ، گھر و خاندان کے لوگ اپنے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دے کر اس کمی کو پورا کر سکتے ہیں۔ ٹیوشن اور اس طرح کے دوسرے سہاروں کو نظر انداز کر کے باہمی تعاون سے ایک دوسرے کی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے تو بھی اس افسوسناک صورت حال کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ تعلیمی کمزوری دور ہوگی تو بچوں کو نہ ٹیوشن کی ضرورت پڑے گی نہ نقل کرنے کی۔ اسی طرح تربیت صحیح و بہتر ہوگی تو انھیں ہر طرح کی نقالی اور خرافات سے نجات مل جائے گی۔

کچھ عرصہ ہوا تقریباً گیارہ سال کا ایک لڑکا اپنی ماں

کے ساتھ مطب میں آیا۔ ماں نے بتایا کہ:
"سات آٹھ برس تک یہ بالکل بھلا چنگا تھا اور اسے کوئی تکلیف نہ تھی۔ پڑوس میں ایک صاحب کو ہکلانے کا مرض تھا۔ پڑوس کے بچے جب اُن کی نقل اُتارتے تو وہ ان کو دوڑاتے اور گالی دیتے، لڑکوں کو انھیں بار بار چھیڑنے اور گالی سننے میں بڑا مزا آتا تھا۔ ہمارا یہ لڑکا اُن کی نقل اُتارنے میں سب بچوں سے آگے تھا۔ جب کبھی اُن سے سامنا ہو جاتا۔ بناوٹی طور پر یہ ہکلانا شروع کر دیتا، وہ سخت برہم ہوتے اور کبھی کبھی تو جھنجھلا کر یہ بھی کہہ دیا کرتے کہ جا، خدا نے چاہا تو تو بھی مجھ جیسا ہو جائے گا۔ نقل کرتے کرتے دھیرے دھیرے دو سال سے اس نے بھی ہکلانا شروع کر دیا ہے۔ اب تو کچھ زیادہ ہی ہکلانے لگا ہے۔"

میں نے بچے کا بغور معائنہ کیا اور اس کو سمجھایا کہ یہ ایک پڑوسی کے دل دکھانے کا نتیجہ ہے۔ اب دل سے توبہ کر ڈالو اور جا کر اپنے پڑوسی سے معافی مانگو۔ اگر وہ معاف کر دیں گے تو تمہارا علاج آسانی سے ہو جائے گا۔ لڑکے نے ایسا ہی کیا۔ کم عمر تھا اس لیے اسے چند مہینے کے علاج سے فائدہ ہوا اور اس کا ہکلانا دور ہو گیا۔ یہاں اس واقعہ کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ماں باپ نے اسی وقت سمجھا بجھا یا ڈانٹ ڈپٹ کر اسے نقل کرنے سے روکا ہوتا تو یہ بچہ ہکلانے کی تکلیف دہ مرض میں مبتلا نہ ہوتا۔ یہ صرف ایک بچے کا معاملہ نہیں ہے۔ کنبہ، خاندان میں نہ جانے اس طرح کے کتنے بچے ہیں جو صحیح تعلیم و تربیت نہ پا کر خود بھی حیران و پریشان ہوتے ہیں اور ماں باپ، خاندان اور ملک کی بھی رسوائی و بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔

نقل کرنا تو دراصل بندروں کے لیے مخصوص تھا لیکن افسوس کہ اس نقالی میں اب انسان اس سے کہیں آگے ہے۔

اکبر الہ آبادی مرحوم نے ڈارون اور اس کے مقلدین کو مخاطب کر کے اپنے مخصوص انداز میں اس حقیقت کی بڑی اچھی ترجمانی فرمائی ہے ؎

ہم تو انسان سے بنے جاتے ہیں بندر اے حضور
آپ خوش قسمت تھے، بندر سے جو انسان ہو گئے

[ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۹، شمارہ ۱۱ نومبر ۱۹۹۰ء]

# طلبا میں نشہ آور اشیا کا استعمال

چودھری نور احمد

انسانی تہذیب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنے شعور کی ابتدائی منزلوں میں بھی نشیلی اشیاء مثلاً بھنگ، افیون وغیرہ کا عادی تھا۔ مثال کے طور پر آریہ قوم میں سوم رس، نام کے مشروب کا رواج تھا جو کہ جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ ایک قسم کی شراب تھی اسی طرح 'پرانوں' میں بھی 'بھنگ اور مدیرا (شراب) کا ذکر ہے اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نشہ آور اشیاء کی تاریخ بھی انسانی تہذیب کے نشیب و فراز سے وابستہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کل یہ نشیلی ادویہ عوام میں اور خصوصاً نوجوانوں میں ایک وبا کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ گو کہ ہمارے ملک میں نشیلی ادویہ کی لت مغربی ممالک کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جیسے جیسے مغرب کی نقالی کا شوق بڑھتا جا رہا ہے، اسی تناسب سے ہندوستانی طلبا میں نشہ آور اشیاء کا استعمال عام ہوتا جا رہا ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے اخبار 'ڈان' کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر پندرہویں منٹ ایک شخص اس طرح کی نشیلی اشیاء کا شکار ہو جاتا ہے اور دوسرے پڑوسی ملک نیپال کی حالت تو اس سے بھی بدتر ہے۔

حال ہی میں انگریزی روزنامہ 'ٹائمس آف انڈیا' میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جو کہ متعدد تعلیمی اداروں کے طلبا کی گفتگو پر مبنی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ہندوستان کے ساڑھے چار فی صد طلبا نشیلی اشیاء کے عادی ہیں۔ ان طلبا کی بڑی تعداد کا تعلق سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے سے ہے۔ ان میں ۱۲ فیصد طلباء معمولی ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہیں اور ڈھائی فیصد طلبا شدید ذہنی الجھنوں کا شکار ہیں۔ انگریزی روزنامہ 'انڈین ایکسپریس' اپنے اداریے میں لکھتا ہے کہ ۵۲ فیصد طلباء جو نشہ آور اشیاء کے عادی ہیں، ذہنی پراگندگی اور مایوسی کے ساتھ ناپختہ کار ہیں۔ حال ہی میں مدھیہ پردیش کے شہر جبل پور میں نشہ آور اشیاء کے عادی طلباء کا سروے کیا گیا، اس سے حاصل شدہ اعداد و شمار بڑے دلچسپ ہیں۔ اس شہر کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ ہے۔ یہاں ۲۷ کالج ہیں اور ۱۵ ہزار طلباء زیر تعلیم ہیں۔ ان تعلیمی اداروں کے طلبا پوشیدہ طور پر ایل۔ایس۔ڈی، ہیروئن، کوکین، ایمفیٹامین (Amphetamine) مینڈرکس، کمپوز کے علاوہ گانجا، چرس وغیرہ بھی کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ کوکین، ایل۔ایس۔ڈی اور ہیروئن کو چھوڑ کر بقیہ تمام نشیلی ادویہ بہ آسانی شہروں میں دستیاب ہیں۔ اس طرح ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں بھی اسی طرح کے اعداد و شمار سامنے آئے ہیں۔

## مختلف نشہ آور اشیاء

اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہمارے ملک کے طلبا کی معتد بہ تعداد اس بری لت میں مبتلا ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ کون کون سی نشہ آور ادویہ طلباء میں مروج ہیں۔ فیناسیٹین (Phenacetin) اپی ڈون (Apidon)

یتھن، ڈرسٹام، نیوفیبرین (Nuephebrin) ویگنن
(Vaganin) ویریڈون (Vaidon) ایڈو
زین (Aneidopyrene) اوپٹیلڈون (Optildon)
لساڈرن، بلیک ڈائمنڈ، مینڈرس، افیون، مارفین، کوکین،
ل. ایس. ڈی، ہیروئن (Heroin) بھنگ، بیڑی، سگریٹ
۔مختلف اقسام کی شرابیں ان نشہ آور اشیاء میں شامل ہیں جو
ندوستانی طلباء میں کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔

## نشیلی ادویہ کی لت کے لیے ذمّہ دار عوامل

ان تمام اسباب کو جو طلباء میں نشہ آور اشیاء کے فروغ دینے
لیے ذمّہ دار ہیں ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

### ۱- نفسیاتی عوامل :

کچھ طلباء یہ تصور کرتے ہیں کہ نشیلی اشیاء مثلاً چرس کا استعمال کرنے سے ذہنی صلاحیت میں اضافہ ہوجاتا ہے اور وہ بہتر طور پر اپنے کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ کچھ طلباء چرس کے استعمال کے بعد ڈرامے میں حصّہ لیتے ہیں تاکہ وہ بہتر طور پر اداکاری کرسکیں۔ مگر یہ ان کی خام خیالی ہے اور یہ ایک طرح کی ذہنی بیماری ہے جو خود اعتمادی کی نقصان کی وجہ سے پیدا ہورہی ہے۔ کچھ طلباء امتحانات کے دوران خود کو چاق وچوبند رکھنے کے لیے نشہ آور ادویہ کا استعمال کرتے ہیں۔ ان طلباء کا خیال ہے کہ نشہ آور ادویہ کے استعمال سے قوت ارتکاز بڑھ جاتی ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ نشیلی اشیاء کا براہ راست اثر اعصابی نظام پر ہوتا ہے اور وقتی طور پر انسان کی قوت ممیزہ اس قدر متاثر ہوتی ہے کہ وہ اس حالت میں اچھے اور بُرے میں امتیاز نہیں کرسکتا۔ جو طلباء پورے سال گھومتے رہتے ہیں اور صرف امتحانات کے دوران پڑھائی پر توجہ کرتے ہیں ان کی تیاری تسلی بخش نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نیند خود بخود غائب ہوجاتی ہے اور دماغی تناو اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ ان کی قوت برداشت سے باہر ہوجاتا ہے۔ آخر میں وہ خود کو اس تناو سے نجات دلانے کے لیے بھی نشہ آور اشیاء کا سہارا لیتے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ ان کے عادی ہوجاتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور محدود قدرتی وسائل اس دور کے اہم مسائل ہیں جو کہ بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی حکومت تمام افراد کو روزگار فراہم نہیں کرسکتی ایک تو اس قدر مہنگی تعلیم اور پھر روزگار کی کوئی ضمانت نہ ہونے سے طلبا ذہنی الجھنوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ان کے ذہنوں پر ہر وقت نا امیدی اور مایوسی کے گھنے بادل چھائے رہتے ہیں۔ وہ اس تناو کو دور کرنے کے لیے نشہ آور اشیاء کا جھوٹا سہارا لیتے ہیں اور بظاہر کچھ دیر کے لیے دماغی تناو سے سکون حاصل کرلیتے ہیں۔

### ۲- ماحولیاتی عوامل :

اپنے گرد وپیش کے ماحول سے متاثر ہونا انسان کی فطرت ثانیہ میں شامل ہے۔ ماحول کی مناسبت سے انسان میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ بچّہ کا ذہن خاص طور پر تقلیدی ہوتا ہے جو کچھ بھی اپنے اردگرد دیکھتا ہے وہی سب کچھ عملی طور پر کرنا اپنا فرض تصور کرتا ہے۔ جب ایک معصوم بچہ کسی شخص کو دھویں کے مرغولے اڑاتے دیکھتا ہے تو وہ بھی ایسا کرنے کی سوچتا ہے۔ اپنے دوست اور اقارب کی حرکات کو بھی بغور دیکھتا ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں وہی سب کچھ کرنا وہ بھی شروع کر دیتا ہے۔ ٹیلی ویژن، ویڈیو، وی۔سی۔آر اور فلمیں اس ضمن میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ جب طلباء اپنے محبوب فلمی اداکاروں کو نشہ آور ادویہ کا بے دریغ استعمال کرتے دیکھتے ہیں تو وہ بھی ان کی پیروی کرتے ہیں۔ چوں کہ یہ فلمی اداکار طلباء کے آئیڈیل ہوتے ہیں وہ اُن کی ہر نقل وحرکت پر غور کرتے ہیں اور پھر اُن کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہ غور نہیں کرتے

کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔

۳۔ سیاسی عوامل:

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کسی بھی ملک کے مستقبل کا انحصار اس کے نوجوانوں پر ہوتا ہے سلیقہ مند اور باصلاحیت نوجوان ایک ملک کے لیے درخشاں مستقبل کی ضمانت ہیں۔ اگر کسی ملک کو تباہی و بربادی کے دہانے پر لے جانا ہے تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ نئی نسل کو دماغی اور نفسیاتی طور پر مفلوج کر دیا جائے ظاہر ہے کہ اس کا سب سے آسان طریقہ نشہ آور اشیاء کا استعمال ہے۔ اس کے بعد یہ مقصد خود بخود حل ہو جائے گا۔ ترقی یافتہ ممالک کی ہمیشہ یہ سازش رہتی ہے کہ دوسرے غریب اور ترقی یافتہ ممالک کی ہمیشہ یہ سازش رہتی ہے کہ دوسرے غریب اور غیر ترقی یافتہ ممالک ہمیشہ یہ سازش رہتی ہے کہ دوسرے غریب اور غیر ترقی یافتہ ممالک ہمیشہ ان کے دست نگر رہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ جائز اور ناجائز ہر ممکن ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً دو ملکوں کے درمیان تنازعہ پیدا کرا دینا، خانہ جنگی کے حالات پیدا کر دینا اور ان ہی سازشوں میں سب سے گھناؤنی سازش یہ ہے کہ کسی ملک میں نشہ آور ادویہ کی فراہمی اور وہاں کے طلباء کو ان کا عادی بنا دیا جائے۔ اس کے بعد فطری طور پر ان کا مشن پورا ہو جاتا ہے۔ دنیا کی منظم بین الاقوامی تنظیمیں مثلاً مافیا وغیرہ اس طرح کی نشیلی اشیاء کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔ اس سلسلہ میں قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ نشہ آور چیزیں بے حد مہنگی ہوتی ہیں۔ اس طرح یہ تنظیمیں نہ صرف ایک غریب ملک کے نوجوانوں کی صحت کو خراب کرتی ہیں بلکہ وہ انھیں نفسیاتی اور ذہنی طور پر مفلوج بھی کر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تنظیمیں ان ملکوں کو بالکل مفلوک الحال اور معاشی طور پر کمزور بھی بنا دیتی ہیں۔

نشیلی اشیاء کے مہلک اثرات:

سگریٹ نوشی ایک عام وبا ہے۔ آیئے ہم سب سے پہلے اسی سے شروعات کرتے ہیں۔ سگریٹ پینا آج کل عین فیشن ہے۔ حالانکہ ہر پیکٹ پر تنبیہ درج ہوتی ہے کہ سگریٹ پینا صحت کے لیے سخت مضر ہے مگر پھر بھی لوگ اس پر توجہ نہیں دیتے۔ حال ہی میں ہوئی تحقیق کے مطابق قلبی مرض آئی۔ ایچ۔ ڈی جس کی محرک سگریٹ ہے اور اس طرح کے ۲،۶۵ فیصد مریض سگریٹ کے عادی ہیں۔ میڈیکل رپورٹ سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ سگریٹ سے کینسر کے جراثیم بھی پیدا ہوتے ہیں۔ متعدد ترقی یافتہ ملکوں میں انھیں اسباب کی بنا پر لوگوں نے سگریٹ نوشی کم کر دی ہے۔ مثال کے طور پر جاپان میں ۱۹۶۶ء میں ۷،۳۰، فیصد لوگ سگریٹ پیتے تھے اور یہ تعداد گھٹ کر ۱۹۸۳ء میں ۱،۰، فیصد رہ گئی۔ آج فرانس میں سگریٹ نوشی کرنے والوں کی تعداد صرف ۹،۵۵ فیصد اور امریکہ میں ایسے افراد ۳۹ فیصد ہیں۔ ابھی تو ہم نے سگریٹ نوشی کے متعلق غور کیا تھا جو کہ ایک بہت ہی کم ڈینسی والی نشیلی شئے ہے۔ جب یہ صحت کے لیے اس قدر مضر ہے تو دوسری قوی الاثر اشیاء کا کیا حال ہوگا؟ اس ضمن میں ہیروئن (Heroin) سرفہرست ہے۔ اس کے استعمال کے ایک منٹ تک تو استعمال کرنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ مگر اس کے فوراً بعد ہی جسم میں تساہلی اور سستی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ ایل۔ ایس۔ ڈی کے استعمال کے فوراً بعد انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت عجیب و غریب ہو جاتی ہے جسے سائنس کی زبان میں Hallucination کہتے ہیں۔ وہ اس ہذیانی حالت میں مجرمانہ حرکات مثلاً قتل، چوری، زنا وغیرہ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ انتہائی حیرت کی بات یہ ہے کہ ایل۔ ایس۔ ڈی کا اثر زائل ہونے کے بعد انسان خود بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ اس نے اس کے زیر اثر کیا کیا ہے۔ اسی طرح دوسری نشہ آور اشیاء بھی کچھ کم مہلک نہیں ہیں۔ ان سب اشیاء کے استعمال سے انسان

نی اور جسمانی طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان قیمتی نشہ آور
یا کو خریدنے سے پیسہ بھی ضایع ہوتا ہے۔ انسان اگر ان کا عادی
جائے تو وہ کسی قیمت پر ان کو نہیں چھوڑ سکتا، وہ یہ قبول کر سکتا
ہے کہ وہ بھوکا رہے۔ جسم ڈھکنے کو لباس نہ ہو، سر چھپانے کو جگہ نصیب
ہو، مگر اس کی پسندیدہ نشہ آور شے اسے ملتی رہے۔

تدارک کی تدابیر:

طلبا کو اس لت سے نجات دلانے کے لیے کیا کیا اقدامات
کیے جائیں۔ یہ ایسا سوال ہے جس پر غور کرنا ضروری ہے۔ نشہ آور
اشیاء کے استعمال کو روکنے کے لیے مندرجہ ذیل تدارکی اقدامات
کیے جا سکتے ہیں:۔

۱۔ اخلاقی اور مذہبی تعلیم:

اسکولوں میں فلسفہ اور سائنس، معاشیات، سماجیات
اور دیگر علوم و فنون کی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے۔ میڈیکل
اور انجینیرنگ کی تعلیم دی جاتی ہے مگر مروجہ تعلیمی نصاب
میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور
جب تک اس طرح کی تعلیم کو فروغ نہیں دیا جاتا یہ ناممکن ہے
کہ آنے والی نسل کو نشہ کی وبا سے محفوظ رکھا جائے۔ اگر
نئی نسل کی تربیت میں اخلاق اور مذہب کو مناسب
اہمیت دی جائے تو بچوں کو اس وبا میں مبتلا ہونے
سے روکا جا سکتا ہے۔

۲۔ والدین کی ذمہ داری

نپولین بونا پارٹ اپنی سوانح حیات میں رقم طراز ہے کہ
اگر میرے ملک میں اچھی سلیقہ مند مائیں ہوں تو میں جنت
کو زمین پر لا سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک اور مشہور
مفکر کا قول ہے کہ بچہ کا پہلا اسکول اس کا گھر ہوتا ہے۔
بچوں کی یہ نفسیات ہے کہ انھیں بچپن میں جو کچھ سکھایا جاتا
ہے، جس چیز کے خلاف ان کے دل میں نفرت بھر دی
جاتی ہے یا جس چیز کی خوبیوں سے ان کو روشناس کرایا
جاتا ہے، وہ اس سے ساری زندگی ویسا ہی اثر لیتے
رہتے ہیں۔ اب والدین پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی
ہے کہ بچوں کو شروع سے ہی نشیلی چیزوں کے مضر
اثرات سے آگاہ کرائیں اور ان کے خوفناک انجام
بتا کر ان میں ان کے خلاف نفرت پیدا کر دیں۔ والدین
خود بھی ایسی چیزوں سے سخت پرہیز کریں۔ تاکہ بچے ان
کی نقل نہ کریں۔

۳۔ ذرائع ابلاغ پر کنٹرول

طلبا جس چیز سے سب سے زیادہ اثر لیتے ہیں
وہ ذرائع ابلاغ ہیں۔ اب حکومت پر یہ ذمہ داری عاید
ہوتی ہے کہ وہ ایسے تمام پروگراموں پر پابندی عاید
کرے جن میں نشیلی اشیاء کو استعمال کرتے ہوئے
دکھایا جاتا ہے۔ تمام فحش رسایل اور گندی کتابوں
پر پابندی لگا دی جائے، فحش فلموں اور نغموں پر سنسر
لگا دیا جائے تاکہ وہ طلبا جن کا شعور پوری طرح بیدار
نہیں ہوا وہ ان مہلک چیزوں کے اثر سے محفوظ رہ سکیں۔
حکومت اس موذی وبا کی طرف فوری طور پر توجہ
کرے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے توسط سے کم
سے کم ایک ہفتہ میں دو دن ایسے بلیٹن نشر کیے جائیں جن
میں عوام کو ان کے مہلک اثرات سے روشناس کرایا جائے
دنیا کی تمام حکومتوں کو سنجیدگی کے ساتھ اس خوفناک وبا
پر قابو پانے کے لیے مستحکم اقدامات کرنے چاہیں ورنہ یہ
وبا نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی گرفت میں لے
لے گی۔

# جہیز — لعنت اور قانونی راحت

ایم۔ ایس۔ رحمٰن

اترپردیش میں ۱۹۸۴ء میں ۱۸۲، ۱۹۸۵ء میں ۳۲۳ اور ۱۹۸۶ء میں ۳۸۶ جہیزی اموات ہوئیں۔ جہیزی اموات میں یہ اضافہ ہمارے سماج میں تیزی سے بڑھ رہے جہیز کے لالچی لوگوں کی درندگی کی دردناک تصویر کھینچتا ہے۔ خاندان کو مسرت و شادمانی دینے والی دلہن کے گجرے کی خوشبو کی جگہ جب اس کے ادھ جلے جسم کی سڑاندھ آتی ہے تو کلیجہ منھ کو آتا ہے جس جسم پر لال جوڑا ہوتا تھا وہ جسم سفید کفن سے لپٹا ہو، یہ نظارہ کتنا درد بھرا ہوگا، محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دولت ٹی۔ وی۔ فریج اور موٹر سائیکل سے جب جہیز کے لالچی دلہن کو تولنے لگے اور مقدس آدرشوں کی دہائی دینے والا سماج خاموش تماشائی بنا رہے تو دلہن کے آنسو، چیخ اور ادھ جلے جسم ہی ملیں گے۔

اترپردیش ہی نہیں ملک کے ہر صوبے اور مرکزی حکومت کے زیرِ انتظام علاقوں میں جہیزی موتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ہریانہ میں ۱۹۸۴ء میں ۴۵، ۱۹۸۵ء میں ۹۹، اور ۱۹۸۶ء میں ۱۸۰۔ دہلی میں ۱۹۸۴ء میں ۲۰، ۱۹۸۵ء میں ۳۳ اور ۱۹۸۶ء میں ۶۴۔ مہاراشٹر میں ۱۹۸۴ء میں ۱۲۳، ۱۹۸۵ء میں ۱۳۶، ۱۹۸۶ء میں ۸۱۔ ۱۹۸۶ء میں راجستھان میں ۸۴۔ پنجاب میں ۴۵۔ کرناٹک میں ۷۵ جہیزی اموات ہوئیں۔ اعداد و شمار کے مطابق اترپردیش میں ہر ۲۲ گھنٹے میں ایک اور ہریانہ میں ہر ۴۸ گھنٹے میں ایک سفید دلہن کفن میں لپٹی نظر آتی ہے

نازونخرے سے پالی گئی لڑکی زندگی بھر کی جمع پونجی کو شادی میں خرچ کرکے ڈولی میں بٹھائی گئی دلہن کے جنازہ یا ارتھی کو باپ جب کندھا دیتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے دور میں نہیں بلکہ قدیم وحشی دور سے گزر رہے ہیں۔ رادھا اور ممتاز کی سرزمین پر آریا بالا کا ادھ جسم ملے، حیرت ہوتی ہے۔ جس مقدس سرزمین پر کرشن نے سات سو اشلوکوں میں ارجن کو کائنات و حیات کا پوشیدہ راز کھولا ہو، جس مقدس سرزمین پر منداکنی اور بھگیرتی کی روانی ہو، وہاں انسانیت اس قدر لہولہان ہو گئی، یہ گمان سے بھی باہر کی بات ہے۔

جنگل بیل سے صدائیں گونجتی ہیں کہ اب کسی کو صلیب پر نہیں چڑھایا جائے گا مگر زرپرست معاشرے کی صلیب کارا بیجا کر رہی ہے۔ ہم چاہ کر بھی اس سے بچ نہیں پاتے۔ ہم لاشوں کو دیکھتے ہیں، دو آنسو بہا دیتے ہیں لیکن معاشرے کی صلیب کو توڑ نہیں سکتے۔ پھر بھی ہمیں فخر ہے کہ ہم آریہ ہیں، تہذیب و تمدن کو جلا بخشنے والی نسل۔

پورا جہیز نہ ملنے پر دلہن کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی کہانیاں بے شمار ہیں۔ ہریانہ میں ۱۵ فی صد عورتیں، مدھیہ پردیش میں ۱۲ فیصد عورتیں، پنجاب ۱۶،۷ فی صد عورتیں علیحدہ زندگی گزار رہی ہیں۔ دو ہزار سے زیادہ مقدمات دہلی کی عدالتوں میں۔ ۳ ہزار مقدمات ہریانہ کی مختلف عدالتوں میں اور

، ہزار سے زیادہ مقدمات اتر پردیش کی بڑی عدالتوں میں عدلیہ کے حکم کا بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔

اتنے سنگین اور اہم مسئلہ کو روکنے کے لیے سرکار نے کئی قوانین بنائے۔ عورتوں کو جہیز کی لعنتوں سے نجات دلانے کے لیے سب سے پہلے صوبۂ بہار نے پہل کی۔ بہار ریاستی قانون ساز اسمبلی نے ۱۹۵۰ء میں جہیز مخالف قانون پاس کیا۔ بہار ریاستی قانون ساز اسمبلی کا یہ قدم تاریخی قدم مانا جائے گا جس نے معاشرے میں پنپ رہی ایک نئی برائی کو روکنے اور اسے قانونی گرفت میں لینے کی پہلی کوشش کی۔ ۸ سال بعد ۱۹۵۸ء میں آندھرا پردیش نے بھی ضرورت محسوس کی کہ صوبے میں تیزی سے بڑھ رہی جہیز کی رسم کو غیر قانونی قرار دیا جائے جس سے کہ خواتین کو اس بھیانک اور غیر انسانی رسم سے چھٹکارا ملے۔ اسی سال ریاست کی قانون ساز اسمبلی نے جہیز مخالف قانون پاس کیا۔ چھ کی دہائی میں یہ وبا قومی سطح تک پھیل چکی تھی اور ملک کے مختلف گوشوں میں اس کے برے نتائج رونما ہونے لگے تھے۔ عوامی بہبود سے منسلک جمہوری نظام حکومت کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ قومی سطح پر ایک ٹھوس اور با اثر قدم اٹھائے۔ اس لیے ہندوستانی پارلیمنٹ نے جہیز مخالف قانون ۱۹۶۱ء میں پاس کیا۔ اس قانون کے پاس ہونے پر ریاستی قانون ساز اسمبلی کے ذریعے پاس کیا گیا جہیز مخالف قانون رد ہو گیا۔ بدلتے ہوئے وقت، بدلتے ہوئے نظریۂ فکر اور پیدا شدہ قانونی پیچیدگی نے قومی ایوانوں کو جہیز مخالف قانون پر بحث و غور کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ قومی ایوانوں نے جہیز مخالف قانون کو اور بھی با اثر اور ثمر آور بنانے کے لیے جہیز مخالف ترمیمی قانون ۱۹۸۴ء پاس کیا۔ یہ ترمیم بھی مسئلہ کو سلجھانے میں کامیاب نہ ہو سکا اور اسے اور بھی ٹھوس اور با اثر بنانے کے لیے جہیز مخالف قانون ترمیم ۱۹۸۶ء پاس کیا گیا۔ اس طرح جمہوری نظام حکومت سماج کی اس برائی کو دور کرنے کے لیے اور خواتین کو راحت دلانے کے لیے کافی کوشاں نظر آتی ہے جس کے نتیجے میں قومی ایوانوں میں بار بار اس مسئلے کو اٹھایا گیا لیکن افسوس صد افسوس یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

جہیز ترمیمی قانون میں جہیز کو یوں واضح کیا گیا ہے کہ شادی کے وقت یا شادی کے پہلے ایک فریق دوسرے فریق کو یا کسی دوسرے فرد کو پہلے یا شادی کے وقت یا بعد میں اگر ایک فریق دوسرے کو یا کسی دوسرے فرد کے ذریعے کسی قسم کی دولت، قیمتی چیز، بانڈ یا لقدر سرٹیفکیٹ وغیرہ شادی کے متعلق دیا جائے تو وہ جہیز کہلائے گا۔ اس کے تحت کسی شکل میں جہیز کا طالب مجرم مانا جائے گا۔

تاہم شادی کے وقت بغیر کسی مانگ کے بھینٹ یا تحفہ دولہا، دلہن کو اس کے والدین یا رشتہ دار دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ تحفہ عام رسم و رواج کے مطابق ہو۔ تحفہ کی قیمت اس شخص کی معاشی حیثیت کے مطابق ہو۔ تحفہ کی مکمل فہرست بنانی ہوگی۔ یہ فہرست شادی کے وقت یا بعد میں جلد تیار کی جانی چاہیے۔ شادی کے وقت جو تحفہ دلہن کو دیا گیا ہو وہ فہرست دلہن رکھے گی اور جو تحفہ نوشہ کو دیا جائے گا اس کی فہرست نوشہ رکھے گا۔ ان فہرستوں میں ہر تحفہ کا مختصر تذکرہ اس کی قیمت، دینے والے کا نام اور دولہا دلہن سے اس کے رشتے کا تذکرہ ہونا چاہیے۔ اس پر دولہا دلہن کے دستخط ہوں۔

۱۹۸۵ء کے ترمیم کے مطابق مجرم کو دولہا، دلہن یا اس کے والدین سے جہیز مانگنے کے جرم میں کم سے کم چھ ماہ کی سزا دی جا سکتی ہے جو دو سال تک بڑھائی جا سکتی ہے۔ دس ہزار یا جہیز کے برابر کی رقم دونوں میں سے جو زیادہ ہو، جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی فرد کو چھ ماہ سے کم مدت کی سزا دی جاتی ہے تو عدلیہ کے حاکم کو فیصلے میں کم مدت کی وجہ کا بھی ذکر کرنا ہوگا۔ ترمیم قانون ۱۹۸۶ء میں سزا کی مدت کو ۶ ماہ سے بڑھا کر ۵ سال کا کر دیا گیا ہے اور جرمانہ کی رقم دس ہزار سے بڑھا کر پندرہ ہزار

کر دی گئی ہے۔ اس طرح سزا کی مدت اور جرمانے کی رقم کو بڑھا کر قانون کو سخت بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۹۸۵ء کی ترمیم کے مطابق عدالت اپنی جانکاری پر، پولیس رپورٹ پر یا جس شخص پر زیادتی ہوئی ہے، اس کی شکایت پر یا اس کے والدین یا رشتہ دار یا سماجی تنظیمی اداروں کی طرف سے شکایت ملنے پر کارروائی کر سکتا ہے۔ سماجی تنظیمی اداروں کا مرکزی حکومت یا ریاستی حکومت سے منظور شدہ ہونا ضروری ہے۔

انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۴۰۶ میں درج معاملات کو چھوڑ کر دوسرے تمام معاملات میں جہیزی جرم کاگنیزنس مانا جائے گا۔ اس طرح اس جرم کو پولس کی دخل اندازی کے قابل بنا دیا گیا ہے اس کے مطابق پولس بغیر اعلیٰ افسر کے حکم کے بھی دخل انداز ہو سکتی ہے۔

۱۹۸۵ء کی ترمیم کے مطابق اگر جہیز دلہن کے علاوہ کوئی دوسرا شخص شادی سے پہلے لیتا ہے تو وہ شادی ہونے کے تین ماہ کے اندر دلہن کو واپس کر دے گا۔ اگر دلہن نابالغ ہے تو دلہن کی عمر ۱۸ سال ہونے کے بعد تین ماہ کے اندر جہیز دلہن کو واپس کر دے گا۔ اگر جہیز کا تبادلہ ہو گیا ہے تو وہ دلہن یا اس کے جائز وارث کو ہی دیا جانا چاہیے۔

عدالت کے ذریعے تحریری شکل میں حکم نامہ جاری کیا جاتا ہے کہ مجرم دلہن کو مقررہ وقت میں جہیز واپس کر دے۔ اس حکم کی تعمیل نہ ہونے پر جہیز کی قیمت جرمانہ کی شکل میں مجرم سے وصول کی جائے گی جو دلہن کو دے دیا جائے گا۔

۱۹۸۶ء کی ترمیم کے مطابق اب یہ ذمہ داری مجرم پر عاید کی گئی ہے کہ وہ ثابت کرے کہ اس نے جہیز نہیں لیا ہے۔ اس سے قبل یہ ذمہ داری دلہن کے رشتہ داروں پر تھی کہ وہ ثابت کریں کہ انھوں نے کتنا جہیز دیا ہے۔ اس ترمیم سے عورتوں کو سہولت پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۱۹۸۶ء کا جہیز ترمیمی قانون کا اہم دفعہ قابل قدر مانا جائے گا جس کے تحت انڈین پینل کوڈ ۱۹۶۰ء میں ایک نئی دفعہ ۳۰۴ بی کا اضافہ کر دیا گیا ہے جس کے مطابق اگر شادی کے ۷ سال کے اندر کسی شادی شدہ عورت کے جلنے یا جسمانی اذیت وغیرہ کی وجہ سے اس کی موت ہوتی ہے اور اگر یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے شوہر یا دوسرے رشتہ داروں کے ذریعہ تکلیف دی جاتی تھی یا ظالمانہ سلوک کیا جاتا تھا تو ایسی موت کو جہیزی موت کہا جائے گا۔ جن رشتہ داروں یا شوہروں کی وجہ سے موت ہوئی ہے ان سب کو کم سے کم سات سال جیل کی سزا دی جائے گی جو عمر قید تک بڑھائی جا سکتی ہے۔ اس دفعہ کا اضافہ جہیز مخالف قانون کی تاریخ میں ایک نیا سنگ میل مانا جائے گا۔ اس دفعہ کے ذریعہ ملک میں تیزی سے بڑھ رہی جہیزی اموات کو قانونی گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہیز کی کمی یا نہ ملنے پر عورتوں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک ہو رہا ہے جو دماغی جسمانی اذیت پہنچائی جا رہی ہے اس سے نجات دلانے کے لیے جمہوری و فلاحی نظام حکومت نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ اس قانون میں یہ بھی صاف طور پر واضح کر دیا گیا ہے کہ کرمنل پروسیجر کوڈ ۱۹۷۳ء اور گواہ قانون کو زیادہ سے زیادہ موثر بنا سکے

اس ترمیم کی رو سے کسی بھی فرد کے ذریعے لڑکا یا لڑکی کی شادی کسی اخبار یا رسالے میں یا کسی ذرائع سے دولت کی جانکاری دینے والے اشتہار کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اگر کوئی فرد یا اخبار اس قسم کے اشتہارات کو شائع کرتا ہے تو غیر قانونی مانا جائے گا۔

۱۹۸۶ء کی ترمیم کے مطابق جہیز مخالف آفیسر اور اس کی مدد کے لیے ایک بورڈ قائم کیا جائے گا جو جہیز کے متعلق معاملات کی تفتیش کرے گا اور اس بدنما داغ کو سماج سے دور کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ جہیز مخالف افسر کو یہ اختیار ہوگا کہ جہیز کی روک تھام کے لیے ہر ممکن اقدامات اٹھائے اس افسر کی بحالی سرکار کے ذریعے ہوگی۔

اس طرح ہم پاتے ہیں کہ قومی ایوانوں نے سخت، ٹھوس اور با اثر قانون بنا کر ہندوستانی سماج میں تیزی سے بڑھ رہے

اس ناسور کو روکنے کی کوشش کی ہے لیکن ۱۹۸۴ء سے مارچ ۱۹۸۷ء تک ۵۷۲۲ خواتین جہیز اموات کا شکار بنیں۔ ۱۹۸۰ء سے مارچ ۱۹۸۷ء تک ۲۸۷۵ خواتین کی جلنے سے اموات ہوئیں آخر کیوں؟ ایک ٹھوس اور با اثر قانون کے باوجود بھی جہیز سے وابستہ جرائم وزیادتیوں میں اضافہ کیوں؟ ایک صدی سے زیادہ سالوں کے عدالتی تجربات کے باوجود ہندوستانی عدلیہ اس جرم کو روکنے میں ناکام کیوں؟

جہیز کا لین دین کرنے والا سماج کا ہی فرد ہوتا ہے۔ دولت کی بھوک، مادیت کی بڑھتی ہوئی غلامی اور سماجی شان و شوکت جہیز کی کھائی کو بڑھاتی ہے۔ نوشتہ کا اعلیٰ نسبی ہونا، اچھی تعلیم اور اچھی نوکری کا ہونا اور گھر کی معاشی حالت کا بہتر ہونا ذہن کے رشتہ داروں کی سرگرمی کو بڑھا دیا ہے۔ ہمارے اندر چھپا حرص وطمع جب سماجی شان وشوکت کا غلاف اوڑھتا ہے تو جہیز کی بنیاد شروع ہو جاتی ہے۔

کل ہند جہیز مخالف سمیلن ۱۹۸۵ء میں میں نے کہا تھا کہ:

"جہیز پسند کی ایک قیمت ہے"

ہمارے سماج میں ہر کوئی اپنی پسند کی چیز خریدتا ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بھی اپنی لڑکی کے لیے معاشی طور سے خود کفیل گھر کی تلاش کرتا ہے۔ اس طرح کے رشتے کم ہیں، اس لیے جہیز کا وزن بھی بڑھنے لگتا ہے۔ ہم اپنی جھوٹی شان وشوکت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنا سب کچھ کھو کر بھی سماج میں یہ رعب برقرار رکھنا پسند کرتے ہیں کہ ہم زیادہ فضول خرچ کرنے کی وسعت رکھتے ہیں۔ شاہی طرز کی بارات، اعلیٰ قسم کے کھانے کا انتظام، کہکشاں کی طرح بجلیوں کی سجاوٹ اور ڈسکو کی دھن پر ناچتے ہوئے باراتیوں کا رواں دواں قافلہ ہمارے معاشرے کو نہ جانے کہاں لے جانا چاہتا ہے۔ ہم صرف نقل ہی نہیں کرتے بلکہ حدود کو پار کرنے میں بھی باز نہیں آتے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

جہیز کی نمائش اور سماج کا خوشی خوشی دیکھنا اور تعریف کرنا جہیز کو سماج کی خاموش منظوری دلاتی ہے۔ جہیز نہ ملنے پر عورتوں کے ذریعے کی گئی تنقید اور سماج میں اس شخص کی گرتی ہوئی ساکھ ہر غریب کو اپنی زمین گروی رکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مقدس آدرشوں کی دہائی دینے والے سماج کے سامنے جب آدرشوں کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے تو یہی سماج اسے دقیانوس کٹر پنتھی اور غیر مہذب جیسے ناموں سے پکارتا ہے

ہندوستان میں عورتیں جہیز کا شکار ہوتی ہیں جب کہ عورتیں ہی اس کو فروغ دیتی ہیں۔ جہیز نہ ملنے یا کم ملنے پر شکایت کا سلسلہ عورتیں ہی شروع کرتی ہیں۔ با مہذب اور پڑھے لکھے خاندان کی لڑکیاں خود اپنے والدین سے جہیز کے انتخاب پر اصرار کرتی ہیں۔ دلہن کو اذیت اور دماغی پریشانی بڑھانے والی عورتیں ہی ہوتی ہیں۔

دانش وروں کی رائے تھی کہ علم جہیز کی لعنت کو روک دے گا لیکن جہیز کی مانگ پڑھے لکھے لوگوں میں بہت تیزی سے پنپ چکی ہے۔ علم اور معاشی طور سے خود کفالت بھی جہیز کی لعنت کو روک نہ سکا۔

جہیز مخالف تحریک کی رہنمائی وہ کرتے ہیں جو خود شادی شدہ ہوتے ہیں اور اپنے بچوں کی شادی میں جہیز لے چکے ہوتے ہیں۔ ۱۹۵۰ء، ۱۹۶۱ء، ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۶ء کے جن ایوانوں میں اس عظیم قانون کو پاس کیا گیا ان ایوانوں میں شریک بیشتر لوگوں نے پانچ ستارہ طرز کی شادی میں حصہ لیا۔ کیونکہ قانون تو صرف مسلم لوگوں کے لیے گویا بنا ہے۔ ان کے لیے نہیں جو بلند مقام رکھتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج اسے منظوری نہ دے۔ جہیز کی نمائش یا تعریف کرنے کی جگہ شرمی یا

باقی صفحہ ۸۵ پر ملاحظہ فرمائیں

# فضول رسم و رواج اور ان سے نجات

محمد اللہ خان

ہم اپنے سماج میں پھیلے ہوئے بیجا اور فضول رسم و رواج سے
شکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے
یہ آسان کام نہیں ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے
بڑے استقلال، تحمل، دانش مندی اور اخلاص کے ساتھ
سلسل جد وجہد کرنی ضروری ہے۔ دنیا کا ہر سماج بڑے سے
ے رسم و رواج کو چھوڑنے کے لیے بھی بڑی مشکل سے آمادہ
وتا ہے۔ کسی سماج میں زندگی کے جو طریقے قدامت یا کسی دوسری
جہ سے اجتماعی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ان پر قبول عام کی مہر
لگ جاتی ہے تو ان طریقوں کو ٹکسالی سکے جیسی حیثیت حاصل
ہو جاتی ہے اور جو لوگ ان طریقوں کو اختیار نہیں کرتے، انھیں حقارت
کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور وہ اپنی سوسائٹی میں نکو بن جاتے
ہیں۔ بلکہ کچھ صورتوں میں ایسے لوگوں کو کسی نہ کسی شکل میں اپنے
سماج کے جبر و استبداد کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہی وہ
قدرت ہے جو ہر قسم کے رسم و رواج کو قائم رکھتی ہے اور جس
کے خوف سے لوگ ان طریقوں کے چھوڑنے سے بھی مجبور ہوتے
ہیں کہ جنھیں وہ دل سے برا سمجھتے ہیں اور جو ان کے لیے سخت
نقصان دہ ہوتے ہیں۔

دنیا کے کسی بھی سماج کی بلندی و پستی کا اندازہ اُن کی رسم و
رواج ہی سے لگایا جا سکتا ہے جو اس سماج میں رائج ہوتے
ہیں۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ کا
گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو بڑی عبرت حاصل ہوتی ہے۔ جو
دور مسلمانوں کے عروج کا تھا کہ جب قیصر و کسریٰ کے تاج ان کے
قدموں میں لوٹ رہے تھے اور دنیا کی سیاسی، علمی اور
تہذیبی رہنمائی ان کے ہاتھوں میں تھی، اس وقت ان کے
جو رسم و رواج تھے ان میں اور ان واہیات رسم و رواج میں
زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے کہ جب وہ اپنی ہر خصوصیت
ختم کرنے کے بعد زمانہ کی بے رحم ٹھوکروں کا نشانہ بن گئے۔

مسلمانوں کے دورِ عروج میں ان کے روزمرہ کے مشاغل
مردانہ مشاغل تھے۔ مثلاً تیر اندازی، گھوڑوں کی سواری، تیراکی،
ورزش، بنوٹ، خونخوار درندوں کا شکار، کشتی، لمبے لمبے
دشوار گزار سفر۔ زندگی کے مختلف معاملات کی تحقیق و جستجو،
اور اُن کے علمی، فنی اور عملی کارناموں کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔
انھوں نے زندگی کے جس میدان میں طرف رخ کیا، اسے اپنی
محنت، دانش مندی اور فنی مہارت کے ذریعے بامِ عروج پر
پہنچا دیا۔ وہ کسی مقام پر ٹھہر جانا اپنے عمل کی توہین سمجھتے تھے۔ وہ
آرام کرتے تھے تاکہ دم ہو کر نئی منزلیں سر کرنے کے لیے وہ تفریح کرتے
تھے، دل و دماغ اور روح کی بالیدگی حاصل کرنے کے لیے زندگی
کی اس گہما گہمی میں ہمارے بزرگ وہ رسم و رواج کس طرح اختیار
کر سکتے تھے جو ان کے کاہل، بے معرف اور پست حوصلہ اخلاف
نے اختیار کیے یا جو رواج اُس وقت ہماری انفرادی اور اجتماعی

زندگی کو گھن کی طرح چاٹ رہے ہیں۔

ہمارے بزرگوں کو نہ اتنی فرصت تھی اور نہ اُن کے کام کرنے والے دماغ فضول رسم و رواج کی تشکیل کرنے کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔ انھیں تو ہر وقت اپنے روحانی اور مادی مقامات کو بلند کرنے کی فکر دامن گیر رہتی تھی اور اسی فکر نے انھیں دنیا کی امامت کے درجہ پر فائز کر دیا تھا لیکن جب ان کے اخلاف کی نگاہوں سے وہ بلند مقامات اوجھل ہو گئے تو اُن کے دن اور رات کبوتر بازی، تیتر بازی، ہر وقت چوسر شطرنج کھیلنے، شادی بیاہ کے موقعوں پر زر کثیر اور وقت جیسی قیمتی چیز کو برباد کرنے، جھوٹی شان و شوکت کا اظہار کرنے کے لیے بچوں کے عقیقہ، بسم اللہ اور ختنہ پر لکھ لٹانے میں لطف آنے لگا۔ اسلامی تہذیب کی سادگی کے بجائے عجمی رنگ رلیوں نے مسلم سماج کو اپنے رنگین جالوں میں اس مضبوطی سے جکڑ لیا کہ اس سے نکلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اُن کے پھندے اور زیادہ مضبوط ہو جاتے ہیں لیکن اِس وقت مسلم سماج جس دَور سے گزر رہا ہے وہ بڑا نازک اور پریشان کن دور ہے۔ بڑی بڑی پریشانیوں اور آفتوں نے مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ ان کی اقتصادی حالت خراب ہو چکی ہے اور مسلسل ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں وہ ان مہمل رسم و رواج کو بوسیدہ اور گندے کپڑوں کی طرح اُٹھا کر پھینک نہ دیں گے تو اُن کاموں کے لیے پیسہ اور وقت کس طرح بچا سکیں گے جو اُن کے عروج بلکہ وجود کی برقراری کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

فی زمانہ مسلم سماج فضول اور انتہائی مہنگے رسم و رواج کے وزنی بوجھ کے نیچے دبا ہوا، بُری طرح کراہ رہا ہے۔ چند گنے چنے دولت مند شیخی خوروں کی تو میں بات نہیں کہتا لیکن ان غلط رسم و رواج کے بوجھ نے عامۃ المسلمین کی کمر توڑ دی ہے اور وہ اس بوجھ کو اپنے اوپر سے ہٹا دینے کے لیے ہر وقت بے چین رہتے ہیں لیکن اپنے سوسائٹی کے لعن طعن کے خوف سے یہ کام نہیں کر سکتے۔ مہمل رسم و رواج کو پورا کرنے کے لیے لوگ اپنی زمینیں فروخت کر دیتے ہیں۔ برتن گروی رکھ دیتے ہیں، گھر بیچ دیتے ہیں یا مقروض ہو جاتے ہیں۔ ایسا نہ کریں تو اپنی لڑکیوں کو قیمتی جہیز کس طرح دیں۔ لڑکوں کی بارات میں ناچ گانے، باجے گاجے آتش بازی کا کس طرح انتظام کریں۔ اپنے بزرگوں کی وفات کے بعد ان کی دسویں، بیسویں اور چہلم کے موقعوں پر دیگیں کس طرح پکوائیں اور یہ سب کچھ نہ کریں تو عزیزوں اور دوستوں کی زہریلی تنقید سے کس طرح بچیں۔

اس جگہ میں یہ بات صاف کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں فاتحہ اور چہلم وغیرہ کے جائز و ناجائز ہونے کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ یہ میرا میدان بھی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں اسے صرف رواجی اور اقتصادی پہلو سے ہی ملاحظہ کیا جائے۔ جو حضرات فاتحہ اور چہلم وغیرہ کو ایصال ثواب کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ اس عمل کو ضرور اختیار کریں لیکن اتنے ہی پاؤں پھیلائیں جتنی چادر ہو۔ اس قسم کے کاموں میں اللہ تعالیٰ نیت دیکھتا ہے بریانی اور قورمے کی دیگیں نہیں دیکھتا۔ کوئی شخص صرف ایک خوراک کھانے پر فاتحہ دے کر کسی بھوکے آدمی کو کھلا سکتا ہو تو وہ قرض کے پیسے سے دیگیں کیوں پکوائے۔

اس قسم کے فضول اور بے جا رسم و رواج سے ۹۸ فیصد مسلمان سخت پریشان ہیں اور ان سے جلد از جلد چھٹکارا بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن انھیں ترک کر دینے کی اس لیے ہمت نہیں کرتے کہ ان کی ہنسی اڑائی جائے گی، ان پر لعنت بھیجی جائے گی، انھیں ملعون کیا جائے گا۔ ایسی صورت میں ملّت اِسلامیہ کو اس خرافات سے کس طرح نجات حاصل ہو سکتی ہے؟ یہ ایک اہم اور پیچیدہ سوال ہے جس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ کسی بھی بُرائی کو ختم کرنے یا اچھائی کو رائج کرنے کے لیے زبردست انسانی قوت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ قوت اِس طرح فراہم ہوتی ہے کہ خدا کے کچھ نیک بندے اس بُرائی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ پھر اسے ختم کرنے کی تدبیریں سوچتے اور انھیں عمل میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے وہ کوشش انفرادی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کچھ ہم خیال

ے ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہ ہوتے ہیں تو وہ آپس
ں ملتے ہیں، تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ اپنی انفرادی کوششوں
اجتماعی شکل دے کر انھیں منظم کرتے ہیں۔ اس سے کام کی توانا
روزن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ابتدائی مرحلہ میں اس تحریک کا مذاق بنایا جاتا ہے۔
ں کے چلانے والوں کو پریشان کیا جاتا ہے لیکن ان لوگوں کے دلوں
ں اخلاص اور اپنے مشن کی کامیابی کا بھرپور یقین ہوتا ہے تو وہ
حرکتوں سے ذرا بھی نہیں گھبراتے بلکہ ان سے ان کے عزائم
ں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اپنی کوششوں کو اور زیادہ تیز کر دیتے
یں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نیک مقاصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ہمارے سماج میں ایسے دردمند اور مخلص لوگوں کی کمی
ہیں ہے جو ملتِ اسلامیہ کو فضول رسم و رواج کی چکی میں پستا ہوا
یکھ کر خون کے آنسو بہاتے اور دل سے چاہتے ہیں کہ ان غلط
ر تباہ کن رسم و رواج کا چلن ختم ہو کر ملت کو آسودگی حاصل
جائے۔ وہی لوگ مل کر بیٹھیں اور اپنے دلی مقاصد کو حاصل
رنے کے لیے اجتماعی طور پر ممکن کوشش کریں۔ تحریر و تقریر یا ا
پنے عملی نمونوں کے ذریعے لوگوں کے سامنے اپنی بات رکھیں تو
نشاء اللہ ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت نہ ہوگی بلکہ ان کی بات
لے دل و دماغ سے سنی جائے گی اور اس پر عمل بھی کیا جائے
ا اور ان دردمند حضرات کا یہ کارنامہ اتنا عظیم الشان ہوگا کہ
س کے تعلق سے ملت کی سماجی تاریخ انھیں ہمیشہ یاد رکھے
۔ لیکن اس مہم کو سر کرنے کے لیے سب سے زیادہ موثر ہتھیار
م کرنے والوں کا عملی نمونہ ہوگا۔ یہ نہ ہوا تو تحریر و تقریر اور
ے اور جلوس سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہو سکے گا

حال ہی کا واقعہ ہے کہ ایک کھاتے پیتے اور متمول شخص کو اس کے احباب اور محلے والوں نے کندھے پر چنوں کی گٹھری لادے اور ہاتھ میں چھوٹا سا ترازو لیے آواز لگا کر چنے فروخت کرتے ہوئے دیکھا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی اور یہ سمجھے کہ ان صاحب کے دماغ میں فتور پیدا ہو گیا ہے۔ اُن سے ان کی اس حرکت کی وجہ دریافت کی گئی تو انھوں نے مسکرا کر بڑی شائستگی سے جواب دیا:

"آپ میرے لیے بالکل پریشان نہ ہوں۔
اپنا کام دیکھیں اور مجھے اپنا کام کرنے دیں۔"

لوگوں نے ان صاحب میں دیوانگی کا کوئی اثر محسوس نہ کیا تو انھیں اس طرف سے "تو اطمینان ہو گیا" لیکن حیرت اپنی جگہ قائم رہی۔

ان صاحب نے اپنے دوستوں کی حیرت رفع کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی اور کئی دن تک بڑے اطمینان سے چنے بیچنے کا کام کرتے رہے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ چند ہی روز میں ان کے حلقۂ تعارف میں کئی نوجوانوں نے چھوٹی چھوٹی دکانیں کھول لیں، ٹھیلے لگانے اور گٹھریاں لادنے لگے۔

وہ صاحب اپنے عمل کے بجائے تحریر و تقریر کے ذریعے اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی خیر و برکت سمجھانے کی کوشش کرتے تو انھیں اپنے مقصد میں وہ کامیابی حاصل نہ ہوتی جو خاموش عملی درس کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ چنانچہ ملتِ اسلامیہ کے جو مخلص فرزند مسلمانوں کو بیجا اور فضول رسم و رواج سے نجات دلانے کے خواہش مند ہیں وہ اخلاص اور سمجھ داری سے کام لیں تو انشاء اللہ اس سے بہت مفید اور دور رس نتائج حاصل ہوں گے۔

# شخصیات

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱، شمارہ ۹-۱۰ (ستمبر-اکتوبر ۱۹۹۲ء)

# ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر

آل احمد سرور

۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو صبح سات بجے کے قریب ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر مشہور ماہر امراض چشم اور پروفیسر ایمری ٹس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا دماغ کی رگ پھٹ جانے کی وجہ سے جواہر لال نہرو میڈیکل کالج ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی بے ہوشی کی حالت میں اپنے مکان "گل رعنا" سے وہاں لائی گئی تھیں۔ ان کے منہ سے خون جاری تھا۔ غالباً رات میں کسی وقت وہ اپنے ڈرائنگ روم میں گئیں اور وہاں گر پڑیں۔ تین دن پہلے ان پر لُو کا ہلکا سا اثر ہوا تھا اور بخار بھی تھا جو زیادہ تیز نہ تھا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر سرسٹھ برس کی تھی۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر رام پور کے ایک نہایت ممتاز خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ ان کے والد ڈاکٹر سعید الظفر ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے انگلستان کے ساتھی اور گہرے دوست تھے۔ ڈاکٹر سعید الظفر لکھنؤ میڈیکل کالج کے پہلے ہندوستانی پرنسپل تھے اور اپنے معاصرین میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے دہرہ دون میں قیام کی غرض سے وہاں ایک بڑا خوب صورت مکان بنا لیا تھا۔ انھیں آن پڑھ بالغوں کی تعلیم سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ ان کی ایک انگریزی کتاب URDU FOR ADULTS کتابستان الہ آباد سے آزادی سے پہلے شائع ہوئی تھی۔ اردو میں ادارہ تعلیم و ترقی دہلی نے ان کی دو کتابیں شائع کی تھیں۔ ان کے بھائی محمود الظفر آکسفورڈ کے گریجویٹ اور مشہور کمیونسٹ رہنما تھے۔ سجاد ظہیر نے اپنی کتاب روشنائی میں ان کی علمی، تنظیمی صلاحیت اور باقاعدگی کا بڑے لطف سے ذکر کیا ہے۔ ان کی بھاوج ڈاکٹر رشید جہاں اردو کی ممتاز افسانہ نگار اور سیاسی و سماجی کارکن تھیں۔

ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر نے پہلے لکھنؤ میڈیکل کالج سے ایم۔بی۔بی۔ایس اور پھر M.S. (OPTHALMOLOGY) کیا۔ میری ملاقات ان سے سب سے پہلے لکھنؤ میں قیصر باغ کے قریب اس مکان میں ہوئی تھی جہاں اُن کے بھائی اور بھاوج رہتے تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ ڈاکٹر سی بی مصرا صدر شعبہ جو گرو جی کہلاتے تھے خود انھیں M.S. میں کامیابی کی اطلاع دینے آئے تھے۔ وہ شعبے کی بہت ممتاز اسکالر تھیں۔ اس کے بعد وہ امراض چشم میں ڈپلوما لینے انگلستان گئیں اور وہاں سے واپسی کے بعد ہی موہن لال آئی ہسپتال علی گڑھ میں لے لی گئیں۔ جب یونیورسٹی نے امراض چشم کا انسٹی ٹیوٹ موہن لال اسپتال کے تعاون سے قایم کیا تو وہ اس میں پہلے ریڈر اور پھر پروفیسر ہوئیں۔ انھیں دو سال کی توسیع دی گئی اور اس کے بعد پروفیسر

ایری ٹس مقرر کیا گیا۔ حال میں W.H.O. کی طرف سے انھوں نے اس کے مرکزوں کے کام کی جانچ کے لیے ہندوستان، سری لنکا، بنگلہ دیش اور برما کا دورہ کیا تھا۔ انھوں نے انگلستان سے اپنے مخصوص فن میں پی ایچ۔ ڈی بھی کر لیا تھا۔ وہ امراضِ چشم کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرتی تھیں اور ان کے ایک شعبے کی صدارت بھی کی تھی۔ درس و تدریس کے علاوہ انھیں ریسرچ سے بھی گہری دلچسپی تھی اور ان کے متعدد مقالے شائع ہو کر بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ نہایت پابندی سے ہفتہ میں دو بار مریضوں کو دیکھتی تھیں۔ ہر شخص کا معائنہ اس کے نمبر کے مطابق ہوتا تھا۔ امیر غریب کی تخصیص نہ تھی۔ وہ معائنے میں مرض کے ہر پہلو پر پوری توجہ کرتی تھیں اور طلبا جو موجود ہوتے ان کے لیے بعض نکتوں کی تشریح بھی کرتی جاتی تھیں وہ بہت اچھی سرجن تھیں اور بہت اچھی معالج۔ اپنے مریضوں سے بڑی ہمدردی اور دل سوزی سے پیش آتی تھیں۔ فضول باتیں کرنے کے بجائے کام کی بات پر ان کا اصرار تھا۔ انھوں نے آنکھ کے پردے (Retina) کالا پانی (Glaucoma) اور [illegible] کے امراض میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ سارے ہندوستان سے ان کے پاس مریض آتے تھے۔ ان کے شاگرد بھی ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی وجہ سے ڈاکٹر موہن لال کے بعد یونیورسٹی کا یہ انسٹی ٹیوٹ امراضِ چشم کے لیے ایک ہندوستان گیر شہرت کا ادارہ بن گیا تھا۔

اپنے باپ کی طرح وہ اپنے پیشے میں ممتاز ہی نہ تھیں، امام فن بھی تھیں اور انھیں کی طرح بہت دوسرے معاملات سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ بہت اچھی فوٹو گرافر تھیں اور اس کے علاوہ انھیں پرندوں کی عادات کا مطالعہ کرنے کا بھی شوق تھا اس کی وجہ سے وہ ڈاکٹر سالم علی سے بہت قریب آ گئی تھیں۔ انھیں کے اثر سے ڈاکٹر سالم علی نے یونیورسٹی میں Bird Life کے مطالعے کا ایک الگ شعبہ کھلوایا تھا۔

میرے نواسے عرفی نے جب علی گڑھ کے پرندوں پر ایک وضاحتی فہرست تیار کی تو اس میں ڈاکٹر حمیدہ کی رہنمائی اور ہمدردی شامل تھی۔ اپنے شاگردوں پر وہ بڑی شفقت کرتی تھیں اور اپنے پیشے کے علاوہ ان کی ذاتی ضروریات پر بھی توجہ کرتی تھیں۔ انتقال سے تین دن پہلے ایک مریض کو دیکھا اور اس سے کہا کہ تم چمن کے وسط میں ایک دفعہ اور آؤ۔ مریض نے کہا مجھے تو آپ کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر حمیدہ نے بے ساختہ کہا، تمھیں ضرورت نہیں مگر تمہاری آنکھوں کو ضرورت ہے۔

ڈاکٹر حمیدہ صاف گو تھیں، لگی لپٹی نہیں رکھتی تھیں ان کے دل میں دکھی انسانوں کے لیے ہمدردی کا ایک سمندر موجزن تھا۔ ان کی زندگی بڑی مرتب اور منظم تھی۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ ان کا پیشہ ہی ان کا سب کچھ تھا۔ وہ بڑی وضع دار خاتون تھیں، جن سے مراسم تھے ان سے آخر تک اسی گرم جوشی سے پیش آتی رہیں۔

اپنے پیشے کی جدید ترین تحقیقات پر تو اُن کی نظر رہتی ہی تھی۔ وہ عام سائنسی، علمی، تہذیبی اور ادبی مسائل سے بھی گہری دلچسپی رکھتی تھیں۔ خیالات کے اعتبار سے وہ بائیں بازو سے قریب تھیں مگر انھوں نے عملی سیاست میں کبھی حصّہ نہیں لیا۔ ادھر وہ اپنی خودنوشت لکھ رہی تھیں اور اپنے والد کی کتاب Urdu For Adults کو دوبارہ چھپوانا چاہتی تھیں۔ افسوس کہ موت نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ یہ سب کام کر پاتیں۔

میرے چالیس سال سے اوپر اُن سے مراسم تھے۔ ان میں خلوص کی گرمی تھی اور لہجے میں ایک وقار۔ ڈاکٹر اسلام الحق انصاری سے بھی پرانے مراسم تھے۔ ڈاکٹر اسلام الحق ان کے چچا کے ساتھی تھے۔ ابھی عید کے دن اُن سے اور مجھ سے ملنے آئیں۔ طبیعت میں ایک بزلہ سنجی تھی اور کبھی کبھار بہت پتے کی بات کہہ جاتی تھیں۔ ایک دفعہ فرمانے لگیں

"جو شخص دن میں پانچ دفعہ نماز پڑھتا ہے

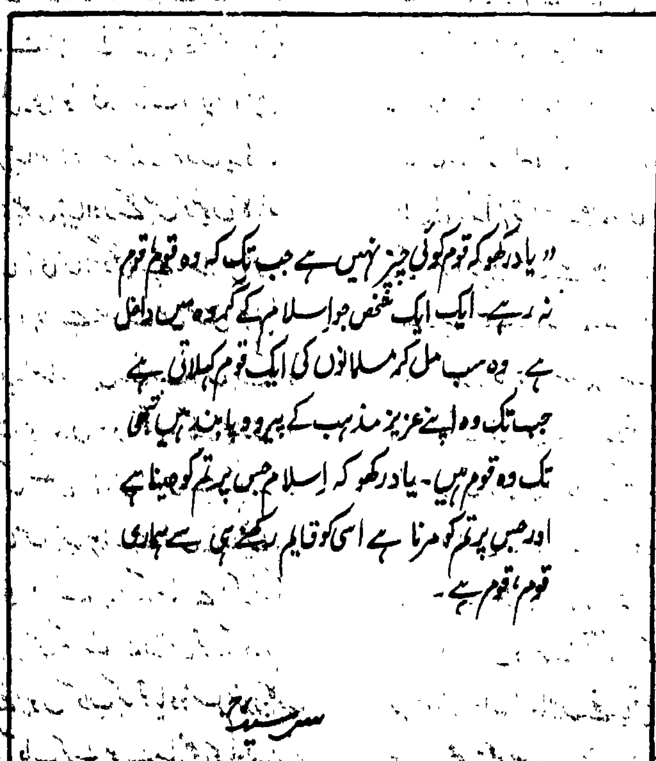
اسے کبھی ARTHARTIS نہیں ہوسکتی۔"

آہ رام پور کی یہ دفتر نیک اختر، لکھنؤ کی یہ گوہر شب چراغ
ی گڑھ کی یہ آبرو، اپنے فن کی یہ امام اور مجتہد! انسان دوستی
ں علمبردار تہذیب اور شائستگی، اخلاق اور دل سوزی کی یہ
یتی جاگتی تصویر تھیں، ہم سے رخصت ہو گئی۔ اس نے ہزاروں
ں زندگی کے دھندلکے میں روشنی کی کرن دوڑائی، ہزاروں کو
مایوسی کی دلدل سے نکالا اور زندگی کا مقابلہ کرنا سکھایا، ان
ا جسم خاکی تو خاک ہو گیا، مگر ان کی روح روشنی کے ایک مینار
ں طرح، علم و عمل میں امتیاز، بہترین معیار ان کی جستجو اور
انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی لگن کے لیے اپنے ساتھیوں، شاگردوں، دوستوں اور ملنے والوں کو اکساتی رہے گی۔

وہ جس کی چارہ گری ہیں ادائے محبوبی
وہ جس نے کتنے دھندلکوں کو روشنی دی تھی
نہ جانے کتنے اندھیروں کی چاک کی تھی قبا
نہ جانے کتنے مریضوں کو زندگی دی تھی

(سرور)

[ ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۷ - ش ۷ - جولائی ۱۹۸۸ء ]



"یاد رکھو کہ قوم کوئی چیز نہیں ہے جب تک کہ وہ قیوم قوم نہ رہے۔ ایک ایک شخص جو اسلام کے کلمے میں داخل ہے۔ وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو و پابند ہیں تبھی تک وہ قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے اسی کو قائم رکھنے ہی سے تمہاری قوم، قوم ہے۔

سید احمد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۱، شمارہ ۹-۱۰ (ستمبر-اکتوبر ۱۹۹۲ء)

## پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

# سروجنی نائیڈو

مختار مسعود

کعبۂ دل میں ایک روز جھانکا تو دیکھا ایک صنم نے وہاں گھر کرلیا ہے۔ ہمیں گمان تھا کہ دورِ آزری ختم ہوئے مدّت بیت چکی ہے اور اس عرصے میں دل اگر صحن مسجد نہیں بن سکا تو کیا غم کم از کم بت کدہ تو نہیں رہا۔ اب جو یہ گمان غلط نکلا تو اپنے ہی بارے میں لاعلمی پر تشویش ہوئی۔ یہ کس کا بت ہے جو اب تک سلامت ہے اور نہاں خانۂ دل میں کیسے آن چھپا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر نظر ڈالی تو یہ بت ایک دیوی کا نکلا۔ دبلی پتلی، بوٹا قد، تنگ دہن، آنکھیں کشادہ اور روشن بالوں میں گھنگھر ہیں اور چھوٹا سا جوڑا گردن پر ڈھلکا ہوا ہے۔ جوڑے میں جڑاؤ پھول ہیں اور گلے میں موتیوں کا ہار۔ بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی میں بڑی سی انگوٹھی ہے۔ ساڑھی کا پلّو کاندھے پر کلپ سے بندھا ہوا ہے۔ صورت من موہنی، پہلی نظر میں پُراثر، دوسری میں پُراسرار۔ میں نے جب اس بت کو دوسری بار نظر بھر کر دیکھا تو صورت ہی بدلی ہوئی تھی۔ ایک بھاری سانولی اور معمر عورت نے سلک کی سلیٹی ساڑھی باندھی ہے۔ پلّو سر پہ ہے اور نصف چہرہ بھی اس میں چھپا ہوا ہے۔ اس نے داہنے ہاتھ سے ایک خوشنما قوس بنائی اور لے ابرو کے سامنے لاکر سر کی ہلکی جنبش کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے اراکین کو جو وکٹوریہ گیٹ میں صف بستہ کھڑے تھے، یوں آداب کیا گویا وہ مسلم تمدن کا مرقع ہے یا شائستگی کا مجسمہ۔ آداب کرتے ہوئے ساڑھی کا پلّو چہرے سے ڈھلک گیا تو ہم نے پہچانا کہ یہ سروجنی نائیڈو ہے۔

نوجوان مسلمانوں کی ایسوسی ایشن کے نام سے مدراس میں ایک انجمن ہوا کرتی تھی، اس انجمن میں تقریر کرتے ہوئے سروجنی نے ۱۹۱۷ء میں کہا تھا کہ جب میں کسی نئے شہر میں جاتی ہوں تو ہمیشہ اس خصوصی استقبال کی منتظر رہتی ہوں جو مجھے وہاں کے مسلمانوں سے میسر آتا ہے۔ اس سلسلے میں نہ کبھی مجھے مایوسی ہوئی اور نہ کبھی میری حق تلفی ہوئی۔ اب جو سروجنی ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ آئیں تو ہم نے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیے۔ یونیورسٹی گیٹ سے وکٹوریہ گیٹ تک اُن کی موٹر کو طلبا کے گھڑ سوار دستے کی جلو میں لایا گیا۔ معزز مہمان کی موٹر آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور گھوڑے شاہ گام چل رہے تھے۔ سوار زین سے لگے بیٹھے تھے۔ ان کی وردی بڑی خوشنما تھی گہرے سبز رنگ کے ٹرکش کوٹ، سبز پگڑی، سنہری کلاہ، سنہری جھالر، سفید جھالر، سفید دستانے، سیاہ جوتے اور پنڈلیوں پر اسی رنگ کی گرم پٹیاں، دوش اور کمر میں چمڑے کی پیٹی جس کے ساتھ تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ سروجنی وکٹوریہ گیٹ پر اُتر گئیں اور سوار مسجد کے پاس جا اترے۔ تھوڑی دیر بعد جلوس شعبۂ تاریخ کی عمارت سے اسٹریچی ہال کی طرف روانہ ہوا۔ سرخ بانات بچھی ہوئی تھی۔ دستے کے دو لڑکے آگے آگے چل رہے تھے، ان کے بعد سروجنی اور نواب اسماعیل تھے۔ باقی دستہ دو دو کی صف بنائے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ دستے کی سج دھج خوب تھی، سر اُٹھا سینہ پھلائے قدم ملائے اور آبدار تلواریں بے نیام کیے ہوئے

ں اور گارڈ اسں دستے کی اس صف میں تھے جو مہمان خصوصی
رہ وائس چانسلر کے بالکل پیچھے تھی۔ گارڈ ایم۔ اے اقتدار
ں میرے ہم سبق اور گھڑ سوار دستے میں میرے ہم رکاب تھے
ب وہ ایک بینک چلاتے ہیں مگر گھوڑا چلانے کا شوق برقرار
ہے۔ آج بھی ان کے اصطبل میں دو گھوڑے بندھے ہیں اور ان
ی تنخواہ اور فرصت کا بیشتر حصہ ان کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا
ہے۔ وہ چمکار کر گھوڑے پر چڑھتے ہیں، سواری کے دوران اس
ے گفتگو بھی کرتے رہتے ہیں۔ جب تھپتھپا کر اترتے ہیں تو تولیے
ے اس کی گردن کا پسینہ خشک کرتے ہیں اور جیب سے گڑ کی
لی نکال کر گھوڑے کے سامنے کر دیتے ہیں۔ ہم دونوں نے ان
لوں بھی گھوڑے کی دوبار اسی طرح اکٹھے سواری کی ہے جیسے
م بیس برس پہلے کیا کرتے تھے۔ راستے میں وہ پوچھتے ہیں تم نے
ی تو گھوڑا رکھا ہوگا۔ میں جواب دیتا ہوں کہ ان دنوں میرے
صطبل کی خبر نہ پوچھو، بس اس کی خیر مانگتے رہو اور یہاں جو سلوک
م اپنے گھوڑے سے کرتے ہو وہ تو انسانوں کو بھی میسر نہیں۔

صبح یونیورسٹی کی طرف سے اسٹریچی ہال میں جلسہ تھا اور
سہ پہر کو طلبا کی طرف سے یونین ہال میں۔ اسٹریچی ہال میں تل دھرنے
ں جگہ نہ تھی۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ تھا۔ سال بھر پہلے اس بات
ا تصور بھی ناممکن تھا کہ مسلم یونیورسٹی میں کسی کانگریسی لیڈر کو خوش
مدید کہا جاسکتا ہے۔ چند ہی ماہ میں نقشہ بالکل بدل گیا۔ برٹش
نڈیا کی جگہ دو آزاد ملک وجود میں آگئے۔ آزادی بڑی کافر صورت
ور جاں لیوا نکلی۔ بس غدر مچ گیا، سر کٹ گئے اور سامان لٹ
یا۔ لہذا لوگ بے سر و سامان ہوگئے۔ مرنے والوں کو کسی نے دفن
ہ کیا مگر بچ رہنے والے زندہ درگور ہوگئے۔ ہر شہر اور قریہ
یں قتل و غارت کا بازار گرم تھا، مگر مسلم یونیورسٹی ابھی تک محفوظ
ھی۔ پھر بڑی بڑی خبریں آنے لگیں۔ یونیورسٹی پر حملہ کی تیاری
و رہی ہے، قرب و جوار کے دیہات میں باقاعدہ تربیت دی جارہی
ہے۔ حملہ سخت اور کئی سمت سے ہوگا۔ ادھر یہ طے ہوا کہ حملے کی صورت
یں طالبات تو اپنے سرسید ہال کی کشادہ اور محفوظ عمارت میں محصور

ہوجائیں گے اور نوجوان باہر نکل کر مقابلہ کریں گے۔ کچھ ایسے انتظامات
بھی کیے گئے کہ حملے کی اطلاع اگر ممکن ہو تو پہلے ہی مل جائے۔ یہ
بات سب کو معلوم تھی کہ حملے کی صورت میں یونیورسٹی کا سائرن
بجایا جائے گا تاکہ فوری طور پر ہر ایک کو خبر ہوجائے۔ صبح شام
مقررہ وقت پر بجنا اس کا معمول تھا۔ مگر دو ایک بار جب
سائرن کو ناوقت بجایا گیا تو وہ راتیں جوں توں ہی بے آرام تھیں
لوگوں نے آنکھوں میں کاٹ دیں۔ ایک ایک رات بھاری تھی
ایک ایک دن کٹھن تھا لیکن جسے اللہ رکھے وہ اس ابتلا سے بھی
بچ نکلتا ہے۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی بالکل محفوظ رہی۔ اس کی
حفاظت کے سامان پیدا ہوگئے اور اسے نئے پاسبان میسر
آگئے۔ ان پاسبانوں میں سرفہرست سروجنی نائیڈو کا نام
آتا ہے۔

سروجنی جب اسٹریچی ہال میں تقریر کے لیے کھڑی
ہوئیں تو لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی حفاظت کا کچھ
اور مشروط اعلان کریں گی۔ سروجنی کے دو چار معترف اس فکر
میں تھے کہ نصف صدی تک اسلامی تمدن کا دم بھرنے والا
اسلام سے عشق کا دعویٰ کرنے والی آج کیوں کر مسلم یونیورسٹی
کی توقعات پر پوری اتر سکے گی۔ سروجنی کے ساتھ گاندھی کیپ
پہنے کچھ کانگریسی بھی آئے تھے جو پہلی صف میں بیٹھے تھے۔ سروجنی
نے تقریر شروع کی اور اُن کے پہلے فقرے پر ہی سب لوگ
چونک اُٹھے۔ پہلی بات پوری ہوئی تو ہم لوگ دنگ رہ گئے اور
سروجنی کے ساتھ آنے والوں پر سکتہ طاری ہوگیا۔ کہنے لگیں:

"میں آج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کئی لوگوں کے
مشورے کے خلاف اور چند لوگوں کی دھمکی کے باوجود
حاضر ہوئی ہوں۔ مجھے علی گڑھ کی ضلعی اور یو۔پی کی
صوبائی کانگریس نے پہلے مشورہ اور پھر حکم دیا کہ تم
مسلم یونیورسٹی کا دورہ منسوخ کردو۔ انھیں یہ بات
بھول گئی کہ گورنر کی حیثیت سے میں اب کانگریس
کی ممبر نہیں رہی۔ لہذا نہ اُن کی رائے کی پابند ہوں

نہ اُن کے مناظلے سے مجبور اور میں کسی کی دھمکیں
کو کب خاطر میں لاتی ہوں۔ میں حاضر ہو گئی ہوں۔
بلبل کو چمن میں جانے سے کون روک سکتا
ہے۔"

ہم نے بلبلِ ہند کی یہ بات سنی تو خدا کا شکر بجا لائے ؎

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

وحشت سا ایک دور آیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دور کے ختم ہونے کے ساتھ علی گڑھ بھی ختم ہو جائے گا۔ طویل دس مہینوں کے بعد سروجنی کی تقریر ہوئی۔ بے اعتباری کی فضا چھٹ گئی۔ علی گڑھ کو اس کا نیا مقام مل گیا۔ اب یہ سرسید کے علاوہ سروجنی کا بھی علی گڑھ ہے۔ کل نہ جانے یہ اور کس کس کا علی گڑھ ہو جائے گا۔ یہ تو دریا کی مانند ہے۔ بلند چوٹیوں سے چلا اور خشک صحرا کو سیراب کرتا ہوا سمندر کی جانب رواں ہے بالآخر یہ بحرِ ہند میں جا گرے گا اور اس کا صاف اور میٹھا پانی اپنے سے کہیں بڑے سمندری ذخیرے میں جا ملے گا۔

اسٹریچی ہال کے جلسے میں استقبالیہ پروفیسر ہادی حسن کو پیش کرنا تھا۔ پروفیسر صاحب خاص طور پر اس تقریر کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ کیونکہ وہ اساتذہ میں انگریزی زبان کے سب سے اچھے مقرر تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ برصغیر کی تمام درس گاہوں کے اساتذہ میں بھی اس نہج کا کوئی اور مقرر نہیں تھا۔ گورے چٹے، دبلے پتلے، سیاہ اچکن اور سمور کی ٹوپی ریشمی ڈوری سے بندھا ہوا عینک کا شیشہ، سراپا نزاکت سراسر نفاست شخصیت کے سحر کے ساتھ وہ آواز کا جادو جگاتے تھے۔ ان کی آواز مترنم، صاف اور بلند تھی اور اس کے زیر و بم پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کی تقریر کے چار عناصر تھے۔ روانی، مبالغہ، تکرار اور مزاح۔ اور اس کی ادائیگی کے دو اصول تھے۔ کچھ انداز مدرسی کا اور بہت کچھ تھیٹر کی اداکاری کا۔ تقریر میں مبالغہ اسی قدر تھا جتنا فارسی قصائد میں ملتا ہے۔ وہ اسی زبان کے صدر شعبہ تھے۔ طبیعت پر اس کا اثر لازم تھا۔ ان کے بیان جو بلا کی روانی تھی وہ اُن کے حافظے کا کرشمہ تھا۔ اسٹیج پر کھڑے ہو کر شکنتلا کا ڈراما تنہا دکھاتے۔ تین گھنٹے تک اس ڈرامے کے سارے مکالمے سناتے ہوئے وہ نہ جھکتے تھے اور نہ اٹکتے تھے۔ سنا ہے کہ جب وہ انگلستان میں زیرِ تعلیم تھے تو نوٹس بورڈ سے بچ کر چلتے تھے کہ مبادا اس پر نظر پڑ جائے اور کالج کے تمام اعلانات خواہ مخواہ حفظ ہو جائیں۔ والد محترم ایک بار ان کے ہم سفر تھے اور ساری رات ریل گاڑی میں سو نہ سکے۔ کیوں کہ اوپر والی برتھ پر پروفیسر ہادی حسن کسی طویل تقریر کی ریہرسل کر رہے تھے۔ ذہانت اور محنت کے اس امتزاج کی وجہ سے ہادی حسن کی ہر تقریر لاجواب ہوا کرتی تھی اور اس کا اثر اور لطف بہت دیر تک قائم رہتا۔ خیال تھا کہ سروجنی کے سامنے یہ علی گڑھ کی ترجمانی کا حق کوئی ادا کر سکیں گے اور وہ شہرہ آفاق مقررہ ان کی تقریر سے محظوظ ہوگی۔

اسٹریچی ہال میں پروفیسر ہادی حسن کی تقریر بہت اچھی ہونے کے باوجود توقع سے کمتر نکلی۔ ان کی انگریزی تقریر اس جلسے کی سطح سے بلند نہ ہو سکی کہ بلبلِ ہند کو چمنستانِ علی گڑھ میں جس گلاب کی کشش کھینچ لائی ہے اسے نواب اسماعیل کہتے ہیں نواب اسماعیل ہمارے وائس چانسلر تھے اور اُن کے ذاتی اثر و رسوخ کو سروجنی کے دورے میں بڑا دخل تھا۔ پروفیسر صاحب نے جس رعایتِ لفظی سے کام لیا وہ سروجنی کے لیے فرسودہ تھی کیونکہ وہ پچاس برس سے بلبلِ ہند کہلاتی اور اپنے ہر استقبال پر گل و بلبل کے افسانے سنا کرتی تھیں۔ ممکن ہے ہادی حسن پر سروجنی کا جادو چل گیا ہو۔ وہ سحر بیان بھی تھی اور عظیم الشان بھی، اس کا مرتبہ اونچا اور شہرہ بلند تھا۔ اس کی آواز ملک کے ہر گوشے میں اور دور دور تک پہنچ چکی تھی۔

پروفیسر ہادی حسن اتنے سرد و گرم زمانہ چشیدہ تھے کہ سرنگا محض تہمت معلوم ہوتی ہے۔ پروفیسر ہادی حسن کو سنا تو اندازہ ہوا کہ وہ سیاسی موضوع پر تقریر کرتے ہیں تو بات ہی نہیں بنتی۔

ان کا مزاج اپنی نفاست اور علمیت کی وجہ سے سیاست کی طرف نہیں جاتا اور جب وہ کوشش بھی کرتے ہیں تو ناکام اور درد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک الگ تھلگ اور اپنی ذات ہی سے آباد، آرام دہ، مختصر اور کسی قدر سادہ زندگی میں اس محتاج ہجوم کو داخل ہی نہیں کرتے جنھیں جاننے اور سمجھے بغیر سیاسی شعور اور جنھیں چاہے بغیر سیاسی بصیرت ناممکن ہے۔

سہ پہر کو طلبا کے یونین ہال میں سروجنی کے اعزاز میں جلسہ تھا۔ میں نے اس جلسے میں شرکت کی تو احساس کی شدت اور جذبات کی فراوانی کا عالم تھا۔ یہ جلسہ یونین ہال میں میرے طالب علمی کے دور کا آخری جلسہ ہوگا۔ اس کے چند دن بعد ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔ والد محترم نے اپنی جوانی کے بیس برس جنھیں وہ حاصل عمر کہتے ہیں، اسی درس گاہ کی خدمت میں صرف کیے ہیں۔ حالات روز بروز خراب ہو رہے ہیں، عزیز و اقارب لکھ رہے ہیں کہ جلد واپس آجایئے۔ اباجان کو تامل ہے بیس برس کی یاد پاؤں پڑ گئی اور ایک اصول آڑے آگیا۔ وہ جواب میں لکھتے ہیں ؎

کہن شاخے کہ زیر سایۂ او پر برآوردی !
چو برگش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است

میں یونین ہال میں پہلی بار تیسری جماعت کے بچے کی حیثیت سے والدہ محترمہ کے ساتھ داخل ہوا اور خواتین کی گیلری میں چق کے پیچھے بیٹھا۔ وہ ۱۹۳۵ء کی بات تھی۔ آج ۱۹۴۸ء ہے اور میں ایم۔ اے کا امتحان دے چکا ہوں۔ وہ یونین ہال میں میرا پہلا جلسہ تھا اور آج طالب علم کی حیثیت سے آخری بار شامل ہو رہا ہوں۔ اس روز کسی کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور آج لوگوں کو میں اپنی بات سمجھانے آیا ہوں۔ چق اس روز بھی تھی مگر والدہ محترمہ ہال میں بیٹھی تھیں۔ چق آج بھی ہے اور والد محترم ہال کے باہر لان میں ٹہل رہے ہیں۔ اس پہلے جلسے کی طرح اس آخری جلسے کی مہمان خصوصی بھی ایک عورت ہے۔ دونوں میں خوبیاں یکساں ہیں۔ صنف کی رعایت سے نازک اور صنف کی نسبت سے سخت کوش اور سخت جان۔ وہ خاتون بھی انقلابی اور حریت پسند تھی اور یہ بھی۔ وہ تحریر میں منفرد یہ تقریر میں یکتا۔ وہ کوہ قاف کی پری یہ گلشن ہند کی بلبل۔ اس کا نام خالدہ ادیب خانم تھا اور اس کا نام سروجنی نائیڈو ہے ان دو ناموں کے درمیان بزم آرائی کی جو مسافت ہے وہ میں نے مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین ہال میں طے کی تھی آج جلسہ شروع ہوا تو ہمارے یہاں کوئی مجاز نہ تھا جو نذر خالدہ کی طرح ایک نظم "نذر سروجنی" کے عنوان سے لکھتا اور لہک لہک کر سناتا۔ لیکن مجاز کی نظم کے کتنے ہی ایسے شعر تھے جو سروجنی پر بھی صادق آتے ہیں۔ مجاز نے خالدہ ادیب خانم کے نطق گوہربار اور فطرت احرار کا ذکر کیا۔ آزادی کے راز پوچھے، بیداری کا ساز چھیڑنے کی فرمائش کی۔ اس کی باتوں میں کوثر و تسنیم کا خمار دریافت کیا۔ عربوں کا ذکر اتنا اچھا کہ بلبل خوش نوا کو بھی رشک آنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ نظم آج بھی اسی طرح تازہ اور حسب حال ہے جتنی اس موقع پر تھی جب کہ یہ لکھی گئی۔ یہی نہیں کہ مجاز نے جو کچھ خالدہ کے بارے میں کہا وہ چودہ برس بعد سروجنی پر بھی حرف بحرف پورا اترا بلکہ اس نے اپنے بارے میں بھی اس موقع پر جو کچھ کہا میں نے یہ جانا کہ گویا وہ میرے دل میں بھی ہے ؎

پھر ادھر آئے نہ آئے یہ نسیم جاں نواز
پھر میسر ہو نہ ہو ایسا سماں ایسی ہوا
چھیڑ اس انداز سے اے مطرب رنگیں نوا
ٹوٹ جائے آج اک اک تار تیرے ساز کا
ذکر جس کا دہر دہرائے گا کاشانوں میں
وہ صنم بھی آج اپنے ہی صنم خانے میں ہے

یونیورسٹی کے طلبا کی طرف سے خیر مقدم کے لیے ایک لڑکے کا نام پکارا گیا۔ یہ دبلا پتلا لڑکا بھیڑ چیرتا ہوا صدر جلسہ کے سامنے رکھی ہوئی میز کے اس کنارے پہنچا جہاں مائکروفون رکھا تھا۔ وہ صدر اور سروجنی کے درمیان کھڑا

تھا۔ اس نے ہال کی طرف دیکھا تو آواز آئی۔ ٹوپی، ٹوپی۔ کسی نے ایک ٹوپی بڑھائی اور اس لڑکے کے سیاہ گھنے بال اس میں چھپ گئے۔ ٹوپی کھلی تھی، کانوں تک ڈھلک آئی۔ اس سے پہلے کہ صورت کے یوں بدل جانے پر کسی کو ہنسی آئے تقریر شروع ہوگئی اور اس کے بعد کسی نے یہ نہ دیکھا کہ مانگے کی ٹوپی کب تک کانوں پر ڈھلکی رہی اور کب مقرر نے اسے اُتار کر میز پر رکھ دیا۔ یہ بڑی محنت سے تیار اور بڑے جوش سے ادا کی ہوئی تقریر تھی۔ ترشے ہوئے فقرے چنے ہوئے الفاظ، خیال جس میں غور و فکر شامل تھا، جذبہ جو عمر کا تقاضا تھا، بے باکی جو باتمیز تھی، اختلاف جو باادب تھا۔ جملے ہوں کہ خاموشی کے وقفے دونوں کی ادائیگی اسلو ذلنس یونین کی تربیت کا حاصل تھی۔ یہ تقریر انگریزی میں تھی، اس کے ابتدائی کلمات کا آزاد ترجمہ کچھ یوں ہوگا۔

'اس خوش رنگ اور روشن شخصیت کے استقبال
کے لیے حاضر تو ہوگیا ہوں، مگر سوچتا ہوں کہاں سے
شروع کروں۔ اس خطابت سے جیسے کوئی نہ پہنچ
سکا یا اس محبت سے جو ہر ایک کے حصے میں آئی
اس سیاست سے جس میں آزردگی داخل ہے
یا اس شاعری سے جس میں مستی شامل ہے
اس نسبت سے جو اقلیت کو اکثریت سے ہوتی
ہے یا اس رعایت سے جو مساوات کہلاتی ہے
سارے رنگ شوخ اور ساری کرنیں روشن ہیں
لفظ، آغاز ملے تو کیوں کر۔ میں کیوں نہ بات
اس تاریخی رشتے کے حوالے سے کروں جو علی گڑھ
اور ہندوستان کے درمیان قائم ہے یا اس
ذاتی تعلق سے جو مہمان خصوصی نے مجھے ایک
بار چھوٹا بھائی کہہ کر استوار کیا تھا۔ حالات
ایسے بدلے ہیں کہ ہم یا تو چھوٹے بھائی ہیں یا بڑے
دشمن، درمیانی صورت کوئی بھی نظر نہیں آتی'۔

سروجنی جب یونین ہال میں تقریر کے لیے کھڑی ہوئیں تو اُن پر گل پاشی کی گئی۔ یونین ہال کی اس رسم کا جواب میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ بڑے ملکوں کے بڑے بڑے استقبال دیکھے۔ جاہ و حشم اور شان و شوکت کی کہیں کمی نہ تھی۔ مگر پھر بھی جو حسن اور سادگی یونین ہال کی گل پاشی میں ہے۔ اس کی یکتائی کو کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔ یونین ہال میں ڈائس کے بالکل اوپر چھت میں ایک مستطیل شگاف ہے جس کے چاروں طرف روشن دان ہیں اور اوپر لکڑی اور ٹین کی چھت پڑی ہوئی ہے اس چوکور سقفی روشن دان کے اردگرد چھت پر گیندے کے سنہری پھولوں کی پتیاں منوں کے حساب سے ڈھیر کر لیتے ہیں مہمان خصوصی جب تقریر کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو وہ عین شگاف کے نیچے ہوتا ہے۔ اس کی آمد پر تالیاں بجتی ہیں اور وہ خاموش کھڑا رہتا ہے۔ جوں ہی تالیاں مدھم ہوئیں اور وہ تقریر کے لیے تیار ہوا کہ اوپر سے پھولوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے پہلے تھوڑی تھوڑی اور پھر بہت سی پتیاں نیچے دھکیل دیتے ہیں۔ اس اونچائی سے فرش کی طرف اوپر تلے گرتے ہوئے پھولوں کی لرزش اور ریزش دیدنی ہوتی ہے۔ پہلے وہ مینہ کی بوندیں لگتی ہیں پھر آسمان سے زمین تک سہرے کی لڑیاں پروئی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں اچھے لوگوں پر نور برستا ہے، برستا ہوگا۔ مگر میں نے تو چند اچھے لوگوں پر عرش سے فرش تک بہار کو بہتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ وہ سماں بندھتا ہے کہ جس نے ایک بار پھولوں کی برسات دیکھی وہ تمام عمر اسے یاد رکھتا ہے اور جس پر ایک بار یوں گل پاشی ہو جائے وہ ساری عمر ان پھولوں کے نیچے دبا رہتا ہے۔

خالدہ ادیب خانم پر جب گل پاشی ہوئی تو وہ حیران ہو کر بار بار اوپر دیکھنے کی کوشش کرتیں کہ یہ پھول کہاں سے آرہے ہیں مگر ہر بار پتیاں اُن کی نظر اور اُن کے چہرے کو ڈھک لیتیں۔ وہ اتنی متاثر ہوئیں کہ اس رسم کا ذکر اپنی کتاب میں بھی کیا جو برِ عظیم کے سفر کے بعد لکھی تھی۔ آج گل پاشی سروجنی پر ہوئی۔ دیکھنے والوں نے گل و بلبل کا یہ نیا رشتہ بھی

دیکھا۔ گل تھا کہ آج بلبل پر نثار ہو رہا تھا۔ بلبل کی باری آئی تو اس نے کہا۔ میں آج ایک طویل مدت کے بعد یونین ہال میں آئی ہوں، پھولوں کی لڑیاں اور جوشیلے نوجوانوں کے جذبات کی کڑیاں ہی اس مدت کے دونوں سروں کو آپس میں ملاتی ہیں۔ ہم نے پھول برسائے تھے سروجنی نے جواب میں موتی لٹانے شروع کر دیے۔

یونین ہال کا جلسہ ختم ہوا تو صبح کے جلسے کی طرح ہجوم کا وہ عالم تھا کہ جو لڑکے اپنی آٹوگراف البم ساتھ لائے تھے وہ سروجنی تک نہ پہنچ سکے۔ میں ان لڑکوں کے گروہ میں شامل نہ تھا۔ میری آٹوگراف البم گھر پر تھی اور اس کے بیسویں صفحے پر سروجنی نائیڈو نے دستخط کر رکھے تھے۔ اس صفحے کے ایک کونے پر میں نے یادداشت کے طور پر کلکتہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۴ء لکھا ہوا ہے۔ کلکتے میں ایک اردو کانفرنس تھی۔ میں اس میں طلبا کے نمائندے کی حیثیت سے شامل ہوا تھا۔ کم سنی کے دن تھے اور میرے لیے دو مشکلات تھیں۔ ایک طوفان میل میں علی گڑھ سے کلکتے کا طویل سفر تنہا طے کرنا اور پھر وہاں پہنچ کر سروجنی نائیڈو ڈاکٹر بی سی رائے اور شیر بنگال اے کے فضل الحق کے سامنے تقریر کرنا۔ جوانی اور نادانی کے بہت سے فائدے ہوتے ہیں اور اس موقع پر یہ دونوں جوہر بہت کام آئے۔ اب تو اس موقع کی نزاکت کو سوچ کر کانپ جاتا ہوں۔ کلکتے کے اسی جلسے میں جب میرے بعد سروجنی نائیڈو نے تقریر کی تو میری دلجوئی کی خاطر دو چار جملے میرے بارے میں کہے اور مجھے چھوٹا بھائی کہہ کر مخاطب کیا۔ جلسے کے بعد میں نے آٹوگراف البم سروجنی کو پیش کی۔ وہ جہاں کھڑی تھیں وہاں بلب کی روشنی بہت مدھم تھی۔ میں نے کہا دستخط بھی کر دیں اور کچھ نصیحت بھی لکھ دیں کہنے لگیں کہ روشنی اتنی کم ہے کہ محض اندازے سے دستخط کر دیتی ہوں تم اس کے اوپر خود ہی کوئی اچھی سی بات لکھ لینا اور اسے میری جانب سے سمجھ لینا۔ سروجنی نے دستخط کیے تو انگریزی کے پہلے چار حروف روشن لکھے گئے اور باقی واضح مگر بجھے بجھے سے۔ میں نے اجازت کے باوجود ان دستخطوں پر کوئی نصیحت نہیں لکھی۔ البتہ ان پر ایک مضمون ضرور لکھا ہے۔

میں نے سروجنی کی صرف تین تقریریں سنی ہیں۔ ایک کلکتے میں اور دو علی گڑھ میں۔ آج مجھے ان کے اقتباس یاد نہیں جتنے ان تقریروں اور بیانوں کے جو میں نے اخبار یا کتاب میں پڑھے ہیں۔ جب میں نے سروجنی کو آخری بار سنا تو اُن کی بعض مشہور تقریروں کو جو انھوں نے نوجوانی میں کی تھیں تقریباً پچاس برس کا عرصہ ہو چکا تھا اس نصف صدی میں نہ اُن کا پیغام بدلا نہ پیامبری کے انداز۔ پیغام میں وہی تازگی اور پیامبری میں وہی دلبری شامل تھی جن پر بیسویں صدی کی پہلی دو نسلیں فریفتہ ہو چکی تھیں۔ جوانی میں ان کی تقریروں میں پختہ کاری ملتی تھی۔ بڑھاپا آیا تو اُن میں جوانی جھلکنے لگی۔ ان کے موضوع میں عمر بھر یک رنگی رہی مگر ان کے بیان کے سو رنگ تھے اور ہر رنگ ایک نیا، شوخ اور شاعرانہ رنگ تھا۔ پچاس برس کے بعد بھی ان کی سحر بیانی میں عالی خیالی بدستور تھی اور رومانی رنگینی برقرار تھی۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ دلبری کی جگہ دردمندی نے لی اور فکر کے ساتھ تفکرات بھی نمایاں ہو گئے وقت کے ساتھ مقرر کی دلکشی اور تقریر کی دلآویزی بڑھتی چلی گئی۔

سروجنی کی تقریر ایک اچھی غزل کی طرح دلکش ہوتی جس طرح غزل میں صدیوں سے مضامین کی تکرار کے باوجود تازہ غزل بھی ایک نوع ہے۔ وہی کیفیت سروجنی کی تقریروں کی تھی۔ سروجنی نے جوانی ہی میں یہ جتا دیا تھا کہ وہ خطابت کے ہنر کو جدوجہد آزادی کے لیے وقف کر چکی ہیں اور کسی قیمت پر اس کے کسی دوسرے استعمال کو جائز نہیں سمجھتیں۔ یہ بات وہ ۱۹۱۵ء میں ان الفاظ میں واضح کر چکی تھیں:

"تم میں بہت سے ایسے ہوں گے جنھوں نے پچھلے چند دنوں میں مجھے کئی بار سنا ہے، وہ کہتے ہوں گے یہ تو صرف ایک ہی راگ

الاپتی ہے لیکن قوموں کی تاریخ میں کبھی ایسا
وقت بھی آتا ہے جب یہ لازم ہوجاتا ہے کہ آپ
کا ساز سی تار نہیں بلکہ محض ایک تارہ ہونا چاہیے۔"

سروجنی کے ہاتھ میں جو ساز تھا وہ اس پر ساری عمر مسلمانوں کا ترانہ بجاتی رہیں۔

سروجنی نے بارہا اپنی تقریروں میں اسلام اور مسلمانوں سے اپنا رشتہ جوڑا۔ عورتوں سے خطاب ہو تو وہ پدمنی ساوتری اور سیتا کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس احسان کا بھی ذکر کرتیں جو اس صنف پر اسلام نے اس کے حقوق تسلیم کرنے کے سلسلے میں کیا ہے۔ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جب لکھنؤ سیشن میں جگہ ملی تو یوں اعتراف کیا کہ

"اگر مجھے اس مقام پر کھڑا ہونے کا کوئی حق
حاصل ہے تو اس کی بنیاد یا تو وہ الفت ہے
جو مجھے مسلم ہند کے نوجوانوں سے ہے یا وہ
جدّ و جہد جو میں مسلمان عورتوں کے ان
حقوق کے لیے کرتی ہوں جو اسلام نے دیے
ہیں مگر آپ نے پورے نہیں کیے"۔

یہ بات وہ اکثر دہراتیں تھیں کہ اُن کے کانوں نے بچپن میں جو پہلی آوازیں سنیں وہ امیر خسرو کی زبان میں تھیں اور جو پہلے دوست بنائے وہ بھی مسلمان گھرانوں سے تھے مسلم تمدّن سے سروجنی کی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ وہ مسلمانوں کے شہر کی آوازوں اور دوسرے شہروں کے شور و غل میں تمیز کرتی تھیں۔ کیونکہ مسلمانوں کے شہر کی فضا میں اذان کی گونج ہوتی ہے جو ہر دوسری آواز سے مختلف اور اس پر غالب ہے۔ وہ حافظ اور رومی کے ساتھ اقبال کا ذکر ان دنوں کیا کرتی تھیں جب اپنوں نے بھی انھیں پوری طرح نہ اپنایا تھا۔

مجھے معلوم نہیں کہ سروجنی نے دین اسلام کا کتنا مطالعہ کیا تھا مگر اس بارے میں جو رائے اس نے قائم کی وہ گہرے مشاہدے اور وسیع مطالعے کے بغیر ممکن نہ تھی۔ تیرہ سو برس کے بعد اسلام کے نظریات کی تازگی اور روح اسلام کی توانائی نے سروجنی کو بہت متاثر کیا۔ مساوات کے خواب کی تعبیر بھی اسے اسلام میں نظر آئی اور اس کے عملی نمونے کو دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ ایسا واحد مذہب ہے جو مساوات کو فلسفیانہ بحث سے نکال کر نماز کی صفوں میں لا کھڑا کرتا ہے اور پھر اسے احرام کی چادریں پہنا کر عالمگیر بنا دیتا ہے۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی جو توانائی اسلام میں پائی جاتی ہے، اس کی وجہ سروجنی کو یہ نظر آئی کہ اس کا بیج ایک تپتے صحرا میں سادہ اور غیور لوگوں کے درمیان بویا گیا تھا کچھ سخت جانی ابتدائی ماحول نے پیدا کی، کچھ بہادری نسل در نسل ورثہ میں تقسیم ہوئی۔ تمام مذاہب میں اسلام کم عمر تو ہے مگر اس بات میں سب پر سبقت رکھتا ہے کہ وہ روح اور بدن دونوں کے لیے نازل ہوا۔ دوسرے پیغامات اس کے مقابلے میں نامکمل لگتے ہیں۔

سروجنی نے ایک بار مدراس کے نوجوان مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے قرآن مجید پڑھنے کا ذکر کیا تھا۔ معلوم نہیں اس کی نگاہ "مولفۃِ قلوبہم" اور وہ کہ اِن کے دلوں میں کلمہ حق کی الفت پیدا کرنی ہے۔ پر گئی کہ نہیں۔ دل کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے مگر سروجنی کی زبان پر کلمہ حق جاری تھا۔ ایک دن مسلمانوں سے خطاب کیا تو کہا "اگرچہ میں تمہارے دوش بدوش کھڑے ہونے کے باوجود تمہاری نظروں میں ایک کافرہ ہوں مگر میں تمہارے سارے خوابوں میں تمہاری شریک ہوں۔ میں تمہارے خوابوں اور بلند خیالوں میں بھی تمہارے دوش بدوش ہوں۔ کیونکہ اسلام کے نظریات بنیادی اور حتمی طور پر اتنے ترقی پسند نظریات ہیں کہ کوئی انسان جو ترقی سے محبت کرتا ہو ان پر ایمان لانے سے انکار نہیں کر سکتا۔"

ذات پات اور چھوت چھات کی گھٹی گھٹی فضا کے مقابلے

ہیں اسے وہ کھلی اور کشادہ فضا بہت پسند آئی جس میں رنگ و نسل اور شرق و غرب کے جھگڑوں کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اِس برادری کے سب انسان برابر تھے اور افضل صرف وہ تھا جو دوسروں سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ پرہیزگاری کا فیصلہ بھی انسان پر نہیں چھوڑا۔ یہ فیصلہ سب انسانوں کے سامنے ان کا خالق کرے گا۔ اس فضا میں سروجنی نے لمبے لمبے سانس لیے تو نفس مطلب اس پر عیاں ہو گیا اور اسے بہت سے ایسے اصول حقیر نظر آنے لگے جنھیں لوگ عزیز رکھتے ہیں۔ اسے حیرت ہوئی کہ انسان اپنی مختصر زندگی کا بیشتر حصہ ایک تنگنائے میں بسر کر دیتا ہے۔ حالانکہ آفاق اور کائنات کی ساری فراخی اس کی منتظر ہے۔ سروجنی ہر تنگ نظری اور تنگ دلی سے نفرت کرنے لگی۔ وہ علاقائی وفاداریوں اور صوبہ پرستی سے بھی متنفر ہو گئی اس نے سنہ ۱۹۱۵ء میں ایک تقریر صوبائی عصبیت کے خلاف کی۔ اس نے اپنے سامعین سے کہا کہ،

"تم تنگ نظری کا شکار ہو جس کی وجہ سے تمہارے افق کی ایک حد تمہارا صوبہ اور دوسری حد محض تمہاری اپنی ذات ہے۔ یہ محدود افق، یہ مختصر کائنات، یہ مفلس ذہن، یہ عاجز فکر نفرت کے قابل ہے اور تم ہو کہ اسی تنگ نظری سے محبت کرتے ہو۔ میں نے سفر کیا، میں نے سوچا میں نے آس لگائی تو میری محبت کا دامن وسیع ہو گیا۔ میری ہمدردیوں میں تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ مختلف نسلوں، قوموں، مذاہب اور تہذیبوں سے ربط رکھنے کی وجہ سے دوستو مجھے بصیرت مل گئی ہے۔"

سروجنی کی تربیت میں نہ جانے کون کون سے عوامل ہوں گے مگر اس کی بصیرت میں گنگا جل سے زیادہ آب زم زم کا اثر ملتا ہے۔

ایک بار گوکھلے نے سروجنی سے پوچھا کہ ہندو مسلم تعلقات کا کیا حال ہے تو سروجنی نے کہا، شاید پانچ سال میں یہ مسئلہ طے ہو جائے گا۔ گوکھلے نے کہا، میری بچی تو محض ایک شاعرہ ہے۔ تیری توقعات کی سطح واقعات کی سطح سے ہمیشہ بلند رہتی ہے۔ اس بلند سطح پر وہ اپنے تخیل اور تمناؤں کے ساتھ تنہا زندگی بسر کرتی رہی۔ وہ رخصت ہوئی تو اس وقت بھی تنہا تھی۔ گورنمنٹ ہاؤس کے ایک طویل و عریض کمرے میں وہ اکیلی سوئی ہوئی تھی۔ سوتے میں اس کی آنکھ لگ گئی اور پھر وہ جاگ نہ سکی۔ جب موت کا فرشتہ آیا ہو گا تو اس نے کہا ہو گا۔ تنہا کیوں آئے ہو۔ تمہاری تعداد تو لاکھوں میں بیان ہوتی ہے۔ آج سے تم میرے سامعین ہو۔ آؤ میں تمہیں اپنی نظم "الوداع" سناؤں ؎

کیا تمہیں اس کے سوا کوئی اور صلہ بھی چاہیے
اے وہ جس نے مجھ سے میری متاعِ حیات چھین لی،
اچھا میں تمہیں الوداع کہے بغیر رخصت ہو جاؤں گی،
اے مردہ خوابوں کے معبد،
اے میرے آنسوؤں کے مندر!

اب اس دنیا میں نہ سروجنی ہے اور نہ ہی والدہ محترمہ، جنھوں نے ایک بار مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ یہ کافرہ کون ہے کہ جب جوان تھی تو باپ گرویدہ تھا اور بوڑھی ہوئی تو بیٹا شیدا ہے۔ بیٹے نے سوچا۔ بھارت سراب ہے اور مہابھارت پکار، بلبل ہند ایک پکار ہے اور سروجنی ایک خواب۔ خواب اچھا ہو تو اسے بیان کرنا چاہیے۔

(پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ — ۱۶ جولائی ۱۹۸۴ء)

# دیوانہ بکارِ خویش ہشیار

# احمد شفیق

**مختار الدین احمد**

میں جب اکتوبر ۱۹۵۳ء میں آکسفرڈ پہنچا تو وہ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ علی گڑھ میں وہ میرے معاصر تھے۔ آفتاب ہوسٹل میں رہتے تھے اور یہاں کے ذہین طلباء میں شمار کیے جاتے تھے۔ ایم ایس سی کر کے ڈھاکا چلے گئے تھے اور وہاں یونیورسٹی میں لکچرر مقرر ہو گئے تھے۔ وہیں سے روڈس اسکالرشپ پر آئے ہوئے تھے اور سائنس میں ڈی- فل کر رہے تھے۔ بڑے ہنس مکھ اور دلچسپ آدمی۔ کچھ کھوے کھوے سے رہتے تھے اور ہمیشہ اپنے خیالات میں مستغرق۔ کالج کے پورٹر سے لے کر ان کے سپروائزر تک کسی کو صحیح اطلاع نہ تھی کہ حضرت رہتے کہاں ہیں اور ان کے مشاغل کیا کیا ہیں۔

۱۷؍ اکتوبر کے ہفتے عشرے کے بعد جب تنہائی بڑھی اور اپنے کو گونگوں اور بہروں کی دنیا میں محصور پایا تو فطری طور پر ایک شناسا کی تلاش شروع ہوئی۔ ان کے بارے میں علم تھا کہ وہ یہاں موجود ہیں۔ ان کی جستجو میں پہلے بلیل کالج گیا۔ پورٹر سے معلوم ہوا، کالج کی سکونت چھوڑ چکے ہیں اور اب ڈگس میں رہتے ہیں۔ اس سے پتا لے کر اس جگہ پہنچا تو لینڈ لیڈی نے بتایا وہ کالج سے یہیں آئے تھے لیکن اب وہ یہ مکان چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ تم فلاں جگہ جاؤ۔ اس نے ایک چٹ پر پتا لکھ کر دے دیا جہاں وہ ان کے نام آئے ہوئے خطوط بھیجا کرتی تھی۔ وہاں بھی کچھ ایسا ہی جواب ملا۔ جہاں بھی گیا یہی معلوم ہوا کہ وہ یہاں پہلے رہتے ضرور تھے لیکن اب وہ دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں۔ سہ پہر سے شام کے سات بج گئے، کالے گاؤن میں ملبوس ایک لمبا مفلر گلے میں ڈالے ہوئے ایک انڈر گریجویٹ ملے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ اس مضمون کا فلاں جگہ محل ہے، وہاں پتا لگ جائے گا۔ وہاں پہنچا تو خوشخبری سنی وہ یہاں آئے تھے ضرور ان کا بریف کیس اور دستانے یہیں رکھے ہوئے ہیں۔ ڈنر لینے گئے ہوں گے۔ ایک رقعہ لکھ کر چھوڑ آیا۔ احتیاطاً نو بجے وہاں ٹیلی فون کیا۔ اس وقت تک واپس نہیں آئے تھے۔ معلوم نہیں کس زمین دوز خفیہ سیاسی پارٹی سے متعلق ہو گئے تھے۔

ہفتوں کے بعد اچانک وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں ان سے ملاقات ہو گئی۔ دیکھ کر خوش ہوئے لیکن اس طرح ملے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ میں نے خود چھیڑا تو بولے۔ اس رات دس بجے اپنے محل واپس آیا۔ دیر ہو چکی تھی اس لیے آپ کے پاس نہ آیا اور آپ نے جس لینڈ لیڈی کا پتا لکھا تھا وہ تو بڑی خوفناک بڑھیا ہے۔ میں تو دو دن میں اس کے پاس سے چلا آیا، آپ وہاں کس طرح ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کہیے تو کہیں آپ کا انتظام کر دوں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن آپ بتلایے آپ میرے کالج کیوں نہیں آگئے۔ بولے

کاموں میں ایسا مصروف ہوا کہ بالکل بھول گیا۔ وہ کہیں لنچ کے لیے پر تول رہے تھے۔ میں نے سمجھا، اب کی یہ چھوٹے تو ہاتھ سے گئے۔ برٹش میوزیم میں اس زمانے میں لنچ اور ہائی ٹی کا انتظام ہوتا تھا۔ میں نے فوراً انھیں مدعو کرلیا۔ میں لنچ انھیں بڑے چاؤ سے کھلاتا رہا اور وہ خشوع و خضوع سے کھاتے رہے اور بڑی دلچسپی سے علی گڑھ، ڈھاکا اور آکسفرڈ کا ذکر کرتے رہے اور مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ جب آخر میں کافی کا دور چلا تو ہم دونوں پھر علی گڑھ پہنچ چکے تھے تقسیمِ ہند سے پہلے کے علی گڑھ میں۔

لوگ ان پر رشک کرتے تھے کہ انھیں روڈس اسکالر شپ ملی ہوئی ہے۔ اسکالر شپ ان پہ نازاں تھی کہ اسے ایسا ذہین، محنتی اور فرض شناس اسکالر ملا تھا۔ لکھنا پڑھنا ان کی زندگی کا مقصد تھا اور یہی اس کا حاصل۔ انھوں نے ریسرچ عبادت سمجھ کر کی۔ زندگی کے دوسرے معاملات سے ہمیشہ بے پروا رہے۔ اپنے کپڑے وہاں کسی درزی سے نہیں سلواتے تھے کہتے تھے یہ لوٹ لیتے ہیں۔ آکسفرڈ میں کارفیکس کے چوراہے کے قریب ایک دکان تھی جس میں سلے سلائے کپڑے سستے مل جاتے تھے۔ اس کا نام "ففٹی شلنگ" تھا۔ وہیں سے وہ ایسے رنگ کے کپڑے خریدتے تھے جو ان کے بقول میلے ہونے پر بھی میلے معلوم نہ ہوتے تھے۔ یہ اُن کا حسنِ ظن تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ بغیر میلے ہوئے بھی وہ بہت میلے اور گندے معلوم ہوتے تھے۔ ہاں قیمت میں انھیں کچھ رعایت ضرور مل جاتی تھی۔ "گراں بہ عملت ارزاں بہ حکمت" کی فارسی مثل ان کے کپڑوں کو دیکھ کر سمجھ میں آئی۔ ان کی پتلون پر کریز کبھی نہیں دیکھی۔ کیا دیکھتا، جب وہی دن کے کپڑے پہن کر وہ رات کو بستر میں چلے جاتے تھے۔

کھانا وہ ایسے طعام خانوں میں کھاتے تھے جن پر دور سے تہہ خانوں اور قدیم سرایوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ ایک بار کئی ماہ بعد اچانک مل گئے۔ کوئی تجربہ صحیح ہوگیا تھا۔ بہت خوش تھے اور بہت اچھے موڈ میں۔ چھوٹتے ہی انھوں نے اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت دے دی۔ ان کا اصرار میرے انکار پر غالب آیا۔ چلتے چلتے وہ ماڈلین برج کے پاس ایک ایسی عمارت کے سامنے رک گئے جس سے میں واقف نہ تھا اور جہاں حدِّ نظر تک کسی ریستوراں کا پتا تک نہ تھا۔ میں نے انھیں حیرت سے دیکھا تو بولے۔ سامنے کا دروازہ کھول کر نیچے اتریے۔ سپر سینما کے پاس ایک نانبائی کی دکان تھی۔ انھوں نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا اور وہ ایک لامعلوم اور نسبتاً تاریک گوشے کی طرف بڑھے اور کھٹا کھٹ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ایک تہہ خانے میں اُتر گئے۔ متوسط طول و عرض کا ایک ہال ملا جس میں کچھ لوگ بیٹھے، زیادہ تر کھڑے اکل و شرب میں مصروف تھے۔ میں اس عجیب و غریب کیفے ٹیریا سے مطلق واقف نہ تھا۔ Q میں کھڑے ہوکر انھوں نے میرے لیے ٹرے میں ایک کافی کی پیالی رکھی اور اپنے لیے بیل کی دُم کا شوربا، پنیر کا ایک ٹکڑا، روٹی کے دو تین سلائس اور سادہ پانی کا ایک گلاس۔ میں نے کہا خیر! بولے گیارہ بج چکے ہیں، اب لنچ کا وقت کہاں ملے گا۔ سوچا یہ قصہ بھی چکتا ہی چلوں۔ چنانچہ وہ قصہ چکاتے رہے اور اس درمیان میں اپنی لینڈ لیڈی (مالکۂ مکان) کے قصے سناتے رہے، کچھ گفتنی کچھ ناگفتنی۔

میرے کرم فرما اور علی گڑھ میں ایک زمانے میں میرے وارڈن، لندن سے اپنی ریسرچ کے سلسلے میں آکسفرڈ آئے ہوئے تھے اور میرے ساتھ ہی قیام پذیر تھے۔ ایک شام میں اِنھیں اُن سے ملانے لے گیا۔ وہ اس زمانے میں وڈ اسٹاک روڈ پر رہا کرتے تھے۔ کئی منزلیں طے کرکے ان کے کمرے تک پہنچے۔ دروازے پر دستک دی۔ خاموشی رہی۔ پھر دستک دی، صدائی برنخواست۔ لینڈ لیڈی نے کہا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں موجود ہیں۔ خاموشی پر حیرت ہوئی۔ غور کرنے سے معلوم ہوا جیسے شیکسپیر کا کوئی کردار مونو لوگ میں مشغول ہو۔ خود ہی دروازہ کھول کر ہم دونوں داخل ہوئے تو عالم ہی دوسرا نظر آیا۔ کمرے کی ہر چیز بے ترتیب۔ فیلٹ ہیٹ

سی روٹیوں کی آغوش میں، ٹائیاں، جام کے ڈبوں اور دودھ کی بوتلوں سے شاخ بیجاں کی طرح پیوست، ریڈیو پر کتابوں اور اخباروں کا انبار، کمرہ کاغذات سے بھرا ہوا، بستر بے ترتیب، خط بڑھائے ہوئے، ڈریسنگ گاؤن پہنے، ایک ہاتھ جیب میں دوسرے میں ایک کتاب لیے ہوئے، کمرے میں چہل قدمی کر رہے تھے اور بہ آواز بلند کچھ پڑھ رہے تھے۔ معلوم ہوا تحقیقی مقالہ یونیورسٹی میں داخل کر چکے ہیں اور شفوی امتحان (وایوا) کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

انھوں نے کئی بار معذرت کی کہ افسوس ہے کہ میں آپ لوگوں کو کافی نہیں پلا سکتا۔ کافی کا ڈبہ ختم ہو گیا ہے اور اتوار کی وجہ سے دکانیں بند ہیں۔ گھنٹے دو گھنٹے میں متعدد قومی اور بین الاقوامی مسائل پر گفتگو ہوئی لیکن سرسری سی پھر "سلام علیٰ نجد ومن حلّ بالنجد" علی گڑھ کا ذکر چلا اور خوب بھرپور۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ علی گڑھ کے تین گناہگار ایک جگہ وقتی طور پر بھی جمع ہو جائیں اور علی گڑھ کا ذکر نہ آئے۔ بہت باتیں ہوئیں اور خوب خوب غیبتیں ہوئیں۔ اس لیے کہ یہ ہمارا ملی شعار ہے اور وقت گزاری کا بہترین مشغلہ۔

وہ بھی عجیب زمانہ تھا۔ انگلستان میں میرے دوران قیام علی گڑھ کے تعلیم یافتہ خاصے اصحاب جمع تھے جو مختلف جامعات میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لندن میں شہاب الدین محمد منیٰ، انور انصاری (نفسیات) حفیظ زیدی (فلسفہ) غزالہ انصاری، مسز جمیلہ حبیب (تعلیمات)، محمد شفیع (جغرافیہ)، ابوالاحرار ضیاء الحسن (انجینئرنگ)، ابو سالم، عبدالحسیب، سائرہ عرفان (اقتصادیات)، سید ظہور قاسم، شاہ مشہود عالم، سید عبدالعزیز (حیوانیات) قمر الحسن فاروقی (تجارت)، اڈنبرا یونیورسٹی میں سید رضا حسین زیدی (جو ہر وقت سگار پیتے رہنے کی وجہ سے سگار زیدی کے نام سے مشہور تھے)، کیمبرج میں ریاض الاسلام (تاریخ) آکسفرڈ میں احمد شفیق (حیوانیات)، عرفان محمد حبیب (تاریخ) اور سید متین الزمان (سیاسیات) اور راقم الحروف (عربی و اسلامیات)، خورشید الاسلام بھی اس زمانے میں لندن میں مقیم تھے لیکن طالب علم کی حیثیت سے نہیں۔ وہ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اردو کے استاد تھے ان علیگ حضرات میں کچھ لوگ کم آمیز تھے، کچھ خوب ملنے جلنے والے، دعوتوں کی بزم منعقد کرنے والے، پارٹیوں میں شریک ہونے والے، کچھ سنجیدہ اور متوازن، کچھ بڑے مجلسی اور گپ باز۔

آکسفرڈ میں اس دن جب ہم تینوں علی گڑھ کی باتیں کر کے تھک گئے تو دوپہر کا وقت ہو گیا اور بھوک چمک اٹھی۔ انھوں نے ہم دونوں کو لنچ کی دعوت دی جو معمولی سے رسمی انکار کے بعد فوراً قبول کر لی گئی۔ ایک لمبی دوڑ کے بعد جس میں بھوک اور زیادہ جاگ اٹھی، ہم لوگ ہائی اسٹریٹ پہنچے۔ دیر تک وہ ریستورانوں کے دروازوں اور دیواروں پر فریم کی ہوئی فہرست طعام (مینو) پڑھتے رہے۔ کہیں بیل کی دم کا شوربا نہ تھا تو کہیں سانپ کے چھاتے کا سوپ موجود نہ تھا۔ کہیں یارک شائر کی پڈنگ غائب تھی تو کسی ریستوران کا "اینٹ موسفیر" انھیں پسند نہ تھا۔ اچھی خاصی ریاضت اور وقت صرف کرنے کے بعد قرعۂ فال "کونٹی نینٹل ریستوراں" کے نام پڑا۔ اس کی زیارت کا مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ لیکن ایک کرائے کے جوکر کو کورفیکس کے چوراہے پر ایک قد آدم سائن بورڈ لیے اکثر چلتے پھرتے دیکھ چکا تھا جس پر جلی قلم سے لکھا ہوتا تھا:

Polite and friendly ser-
vice 25% reduction for under-
graduate lunch for 1/6

لنچ کی تفصیلات ہمارے موضوع سے خارج ہیں لیکن یہاں اس قدر لکھنا نامناسب نہ ہوگا کہ جب کھانے کے بعد بل چکانے کا وقت آیا تو انھوں نے ڈسکور کیا کہ بٹوا تو ان کے کمرے ہی میں چھوٹ گیا ہے۔

پتہ نہیں کہ وہ کون سرگزشتہ خمار بسوم وقیود تھے جنھوں نے ایک
انھیں آکسفرڈ مجلس کا ٹریژرر بنا دیا تھا، وہ خود اپنا ہی حساب
اب نہیں رکھتے تھے۔ مجلس کا کیا رکھتے۔ چنانچہ پورا ٹرم گزر جانے کے بعد بھی
ین کو یہ علم نہ ہو سکا کہ مجلس کے کتنے پونڈ انھوں نے دوستوں اور
ردت مندوں کو اُدھار دے دیے ہیں یا دوستوں کی کالج
فیس چلا دی ہے اور کتنی رقم ان کی جیب سے فاضل نکل کر
لس کے جلسوں اور ایشین ایوننگ میں آئے ہوئے لندنی
ن کاروں کی نذر ہو گئی ہے۔

تھیٹر اور اوپیرا کا کیا ذکر، عام جلسوں میں بھی وہ شاید
ہی جاتے ہوں۔ کبھی میں نے انھیں آکسفورڈ کی مجلسوں/انجمنوں
میں لے جانا چاہا تو صاف مکر گئے۔ ایک آدھ بار تیار بھی ہوئے
آدمی راہ چل کر انھیں اچانک یاد آگیا کہ
تو انھیں اپنے پروفیسر سے ملنا ہے یا کوئی کام انھوں
معمل میں ایسا کام شروع کر رکھا ہے کہ اگر وقت پر جا کر سوئچ آف
ہیں کرتے تو آن کا کمرا ہی نہیں پوری لیبارٹری دھماکے کی
ذر ہو جائے گی۔

ان سے آخری ملاقات نیو مین سوسائٹی میں ہوئی جو میرے
الج کے بالکل سامنے واقع تھی۔ میں سوسائٹی کے کینٹین میں لنچ
لے رہا تھا کہ وہ اچانک داخل ہوئے۔ ہاتھ میں تین پینس لیے
لی فون کی طرف بڑھنے لگے۔ مجھے دیکھتے ہی میرے پاس آئے
در کرسی کھینچ بیٹھ گئے۔ موڈ ہی خراب نہ تھا بلکہ بے حد افروختہ
بھی تھے۔ بار بار کہتے تھے میں اسے مار ڈالوں گا۔ غنیمت یہ ہے
، وہ گفتگو اردو میں کر رہے تھے ورنہ کیا عجب کہ اسکاٹ لینڈ
ارڈ کے سادہ لباس لوگ ہم دونوں کے پیچھے لگ جاتے۔ بہت
رم ہو رہے تھے۔ میں نے بہ مشکل انھیں کولڈ ڈرنک کرا کے کچھ
ٹھنڈا کیا۔ معلوم ہوا لینڈ لیڈی سے سخت جھگڑا ہو گیا ہے اور
س ظالم نے انھیں ایک ہفتہ میں کمرہ خالی کر دینے کا نوٹس
ے دیا ہے۔ بہت کچھ تو وہ اسے سنا آئے ہیں، اب باقی
الیاں اور دھمکیاں جو بعد کو انھیں یاد آئی ہیں۔ بذریعہ ٹیلی فون

اس کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں۔ اس زمانے میں ٹیلی فون
کی ایک کال پر تین پینس خرچ ہوتے تھے۔ میں نے پیسے
ان کے ہاتھ سے لے کر اپنے پاس رکھ لیے۔ انھیں باتوں میں
لگایا اور انھیں ہیومر کرتا رہا۔

ان کے خیال کے مطابق بات کچھ اہم نہ تھی۔ ہوا صرف یہ
تھا کہ انھوں نے غسل خانے جا کر نہانے کی غرض سے گرم پانی کا
نل کھول دیا تھا کہ ٹب بھر جائے۔ ابھی کپڑے بھی اتارنے نہیں
پائے تھے کہ نل کھلا دیکھ کر انھیں یاد آیا کہ معمل میں (جو قریب
ہی واقع تھا) گیس کھلی رہ گئی ہے۔ وہ لرزاں ترساں اپنے معمل
پہنچے۔ وہاں گیس کی نالی بند دیکھ کر انھیں اطمینان ہوا، ممکن ہے
کوئی دوسرا ریسرچ اسکالر بند کر گیا ہو۔ یا واقعتاً انھوں نے گیس
کھولی ہی نہ ہو اور یہ سب اُن کے واہمے کا کرشمہ ہو۔

بہرحال دوڑتے بھاگتے جب وہ اپنے ڈگس پہنچے تو دروازہ
کھولتے ہی انھیں عجیب نقشہ دکھائی دیا۔ ہال، گیلری اور کمرے کا
سارا سامان پانی سے بھیگا ہوا تھا۔ قالین اور فرش سب اُٹھا
دیے گئے تھے اور ان کی لینڈ لیڈی سخت بیزاری اور بدحواسی
کی حالت میں اِدھر اُدھر پھر رہی تھی اور دروازے اور سامان
پٹک رہی تھی اور برابر پولش لہجے میں انگریزی میں بڑبڑا
رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ آخر یہ سب ہوا کس طرح۔ بولے مجھے کیا
معلوم۔ لینڈ لیڈی کہتی ہے کہ جب وہ گروسری کی دکان
سے، جو قریب ہی تھی، واپس آئی تو دروازہ کھولتے ہی ایسا
معلوم ہوا جیسے اس کے گھر میں سیلاب آگیا ہو۔ ہوا یہ کہ پہلے
ٹب بھرا (ٹب کہنہ اور از کار رفتہ تھا) پھر فاضل پانی چھلک
چھلک کر غسل خانے کے فرش پر گرا۔ پھر باہر پھیلا کہ دروازے
تک پانی ہی پانی تھا۔

کہنے لگے احمد صاحب اب آپ ہی بتایے اس میں میرا
کیا قصور تھا۔ میں تو چند لمحوں کے لیے باہر گیس بند کرنے
چلا گیا تھا۔ سوچا جتنی دیر میں ٹب بھرے گا، اتنی دیر میں واپس

جاؤں گا - میں ہمدردی اور خاموشی سے انھیں دیکھتا رہا تو بولے ب میں کہاں تک یاد رکھوں، کہاں کون سا نل کھلا ہے اور کہاں ون سی گیس کھلی رہ گئی ہے۔ یہ کہہ کر وہ بڑی بے چارگی اور معصومیت سے مسکرائے۔

---

یہ احمد شفیق تھے علی گڑھ اور آکسفرڈ میں میرے معاصر۔ یہاں وہ آفتاب ہوسٹل میں رہتے تھے جہاں بہت اچھے اور ذہین طالب علموں کو جگہ ملتی تھی۔ ۴۹ء میں انھوں نے حیوانیات میں ایم ایس سی کا امتحان دیا اور فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ بابر مرزا (متوفی ۱۹۷۶ء)، افضال حسین قادری، عبدالبصیر خاں (م ۱۹۶۶ء) اور شاہ مشہود عالم (جو متقاعد ہونے کے بعد یہیں میڈیکل کالج روڈ پر "مشہود کدہ" میں فروکش ہیں) جیسے ممتاز اور شفیق اساتذہ کے سامنے انھوں نے زانوے تلمذ تہ کیا تھا۔ اسی سال وہ اپنے شعبے میں لکچرر مقرر ہو گئے، لیکن وہ وسیع تر دنیا کی تلاش میں پر تول رہے تھے۔ انھوں نے سائنس میں ریسرچ کے لیے فرانسیسی اور جرمن زبانوں سے واقفیت ضروری خیال کیا۔ چنانچہ انھوں نے کوشش کر کے قلیل عرصے میں خاصی دست گاہ پیدا کرلی۔ وہ ۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) جاکر ڈھاکا یونیورسٹی میں شعبۂ حیوانیات میں لکچرر ہو گئے۔ ۱۹۵۲ء میں انھیں روڈس اسکالرشپ مل گئی اور وہ آکسفرڈ پہنچ گئے، جہاں پروفیسر بیکر (انگلستان کے نامور سائنس داں اور رائل سوسائٹی کے فیلو) جیسے ممتاز استاد کی نگرانی میں انھوں نے تحقیقاتی کام شروع کیا۔ ۱۹۵۵ء میں انھیں آکسفرڈ سے ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔ وہ انگلستان میں رہ کر مزید ریسرچ کرنی چاہتے تھے لیکن ڈھاکا یونیورسٹی سے انھوں نے واپس آکر وہاں پانچ سال تعلیم دینے کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ وہ ڈھاکا واپس چلے گئے۔ میعاد پوری ہوتے ہی ۱۹۶۰ء میں فل برائٹ اسکالرشپ پر وہ Seattle کی واشنگٹن اسٹیٹ پہنچے۔ ایک سال کے بعد نیو یارک کے Muscle Division کے انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ فیلو مقرر ہو گئے۔ یہاں دس سال مقیم رہ کر ۷۰-۱۹۷۱ء میں وہ ڈاؤن اسٹیٹ میڈیکل سینٹر نیو یارک میں ایسوسی ایٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ یہاں تک کی تو مجھے اطلاع ہے۔ اس بیس سال کے عرصے میں یقین ہے انھوں نے اپنے اور دوسروں کے علم میں بہت اضافے کیے ہوں گے۔ کتنے ہی سائنس کے سمیناروں میں انھوں نے شرکت کی ہوگی اور ان کے سیکڑوں ریسرچ کے مضامین یورپ اور امریکہ کے ممتاز مجلات میں شایع ہوئے ہوں گے۔ عرصہ ہوا انھوں نے امریکی شہریت اختیار کرلی ہے۔ وہ اپنے مضمون کے امریکی سائنس دانوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور کیا عجب علی گڑھ کا یہ فرزند ایک دن امریکہ کے ممتاز سائنس دانوں میں شمار ہونے لگے۔

میں نے اس مضمون کا عنوان "دیوانہ بکار خویش ہشیار" رکھا ہے۔ علی گڑھ اور ہماری ملت کو ایسے ہی دیوانوں کی ضرورت ہے۔ اور اب موجودہ حالات میں، پہلے سے کہیں زیادہ۔

[یہ مضمون میں نے یورپ سے واپس آکر ۵۶ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کیا تھا۔ اس زمانے میں ساغر نظامی مرحوم اردو سیکشن کے سربراہ تھے۔ انھوں نے لیڈر، اخبار نویس، طبیب، شاعر، پروفیسر وغیرہم پر نیم مزاحیہ تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ میری تقریر کا موضوع "اسکالر" تھا۔ ۳۵ سال کے بعد اس ہفتہ اتفاق سے اس تقریر کا مسودہ کاغذات میں مل گیا جو قارئین کی نذر ہے۔ تہذیب الاخلاق کی مناسبت سے اس آخری حصہ کا میں نے اضافہ کر دیا ہے]۔

[ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۰، شمارہ ۷ جولائی ۱۹۹۱ء]

# مولانا محمد تقی امینی

محمد مسعود عالم قاسمی

۲۱ جنوری ۱۹۹۱ء بروز پیر مولانا پروفیسر محمد تقی امینی کے اچانک حادثۂ انتقال کی خبر سن کر مجھ جیسے ان کے ہزاروں معتقدین متوسلین اور تلامذہ ذہنی زلزلے کا شکار ہوئے۔ علمی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ یہ حادثہ تا دم تحریر آنسوؤں اور دعاؤں کا خراج وصول کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ اس حادثے نے مولانا محترم کی ذات، علمی و دینی خدمات، تدریس و تقریر اور مجلس و ملاقات کی یادوں کی ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھیر دیا ہے۔ اس تسبیح کے کچھ دانے فرط الم کی تاریکی میں گم ہوگئے اور کچھ کف دست میں ہیں۔ سنا ہے کہ بزرگوں کو یاد کرنا اور ان کی خوبیوں اور نیکیوں کا تذکرہ کرنا ثواب کا کام ہے تو میں ٹوٹی ہوئی تسبیح کے ان چند دانوں سے ثواب کی نیت کیے قلم برداشتہ ہوں۔

۴ اگست ۱۹۹۰ء کے ہفت روزہ بلٹز کے آخری صفحہ پر جناب تسیم طارق صاحب کا "ستارہ جو آفتاب بن گیا" کے عنوان سے مولانا کا سوانحی خاکہ شائع ہوا تو مولانا نے مجھے بلا بھیجا اور اس کی ایک فوٹو کاپی عنایت کی۔ میں نے کہا مولانا شاید آپ کے بعد آپ کا ذکر خیر کرنے والا پہلا آدمی میں ہی ہوں گا۔ مولانا نے فرمایا: مجھے بھی اس کا یقین ہے۔ میں خوش نصیب سمجھتا ہوں اپنے آپ کو کہ مولانا کی نماز جنازہ سے پہلے تبرکاً جنازہ کے سامنے اور نماز جنازہ کے بعد فیکلٹی آف تھیالوجی کے تعزیتی جلسے میں یہ سعادت مجھے ملی اور شاید یہ تحریر بھی اسی سے وابستہ ہے۔ بلٹز کے مذکورہ اختصاریہ پر مولانا نے متعدد مرتبہ فرمایا یہ مضمون تو چھپ گیا کہ 'ستارہ جو آفتاب بن گیا'۔ اب یہ بھی چھپے گا کہ 'وہ آفتاب غروب ہوگیا' اور بیچ ۶ ماہ کے اندر ہی یہ آفتاب غروب ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد تقی امینی ۵ مئی ۱۹۲۶ء مطابق ۲۲ شوال ۱۳۴۴ھ کو ضلع بارہ بنکی کے ایک گاؤں صبیحہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے میں حاصل کی جو تجوید و حفظ اور عربی و فارسی کی ضروری واقفیت پر مشتمل تھی۔ پھر جامع العلوم کانپور میں تحصیل علم کیا اور آخر میں مدرسہ امینیہ دہلی میں داخل ہوئے جہاں مولانا مفتی کفایت اللہ وغیرہ جیسے جلیل القدر علماء سے رسمی تعلیم کی تکمیل کی۔ مولانا اپنے نام کے ساتھ امینی لکھتے تھے عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ امینی کی نسبت قاسمی اور ندوی کی طرح اس ادارہ کی طرف اشارہ کرتی ہے، جہاں سے آپ نے سند فراغت حاصل کی مگر مولانا اس نسبت کو 'امانت' سے جوڑتے تھے جو دین کی اساس ہے۔

فراغت کے بعد مولانا نے مدرسہ سبحانیہ دہلی، جامع العلوم کانپور، مدرسہ فرقانیہ اور مدرسہ ثانویہ ناگپور، دارالعلوم معینیہ اجمیر اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ابتدا میں مولانا نے وعظ و تقریر اور مناظرہ کو

بھی اپنا میدان بنایا۔ سانپور اور اپنے وطن میں متعدد مناظرے
کیے۔ بدعات و خرافات اور منکرات کے خلاف لسانی جہاد کیا
جس کے نتیجے میں بہت سے وہ لوگ ان کے مخالف اور درپے آزار
ہوگئے جو منکرات و بدعات کو اپنے مفادات اور جذبات کا وسیلہ
بنا چکے تھے۔ بعد میں مولانا خود اس طریق تبلیغ سے دست بردار
ہوگئے کیونکہ ان کو اس سے کسی مثبت تبدیلی کی توقع نہ رہی۔
مولانا اکثر و بیشتر اپنے علاقے کے چودھری محمد شفیع کا ذکر کرتے
جو اس فضا میں مولانا کے ہم نوا، قدرداں اور پشت پناہ تھے
اجمیر کے دوران قیام میں اگرچہ وہ مناظرہ چھوڑ چکے تھے مگر ان
کی حق گو طبیعت کو وہاں بھی آنا پہنچے۔ ایسے ہی مخالف ماحول
میں ایک مرتبہ اپنے حالات مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کو
لکھے تو مفتی صاحب نے جواباً لکھا:

"یہ ضروری ہے کہ آدمی جب بھی کہے
حق بات کہے مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر
وقت کہتا رہے۔"

مولانا ممدوح مفتی صاحب کا یہ فقرہ اکثر دہرایا کرتے
تھے۔ ۱۹۴۸ء میں جب کہ ہندوستان کی فضا مسلمانوں کے
لیے کچھ زیادہ سازگار نہ تھی مولانا نے ناگپور کو اپنا مستقر بنایا
وہاں انھوں نے امامت، تدریس اور تصنیف کی سرگرمیوں کا
حصار اپنے گرد قائم کر لیا۔ مسجد کا وہ حجرہ آج بھی موجود
ہے جہاں مولانا محترم نے اپنی پہلی باقاعدہ تصنیف "اسلام
کا زرعی نظام" مکمل کی۔

اجمیر میں مولانا صدر مدرس رہے اور تدریس و
تصنیف کے ساتھ سماجی کاموں میں بھی حصہ لینے لگے۔ وہ
منظور حسین ایڈوکیٹ اور محمد یوسف سابق ایڈیٹر ریڈینس
وغیرہ کے ساتھ تعلیمی کونسل کے بھی روح رواں رہے۔ مولانا
نے وہاں اپنا ایک چھوٹا سا ادارہ علم و عرفان کے نام سے
قائم کیا۔ کچھ عرصے کے لیے مولانا کا قیام دارالعلوم ندوۃ العلما
لکھنؤ میں بھی رہا۔ جہاں انھوں نے مجلس تحقیقات شرعیہ
کے کنوینر کی حیثیت سے کام کیا۔ بعد میں کچھ متعین اسباب
کی بنا پر اس سے کنارہ کش ہو گئے۔

۱۹۶۴ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لکچرر
ناظم سنی دینیات کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور بہت
جلد طلباء، اساتذہ اور ملازمین کی محبتوں کا مرجع بن
گئے۔ ۱۹۸۴ء میں محنت و دیانت کے ساتھ انجام دی
گئی ان کی بیس سالہ خدمات اور علمی حلقوں میں ان
کی مقبولیت و مرجعیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس
وقت کے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب نے ان
کو پروفیسر شپ کی پیش کش کی جسے مولانا نے قبول کر لیا
اور اگست ۱۹۸۶ء تک مولانا نے تدریسی خدمات کے ساتھ
صدر شعبۂ سنی دینیات اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی
کی حیثیت سے تعلیمی و انتظامی فرائض انجام دیے۔
مولانا کی طویل دینی و علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے
سابق شیخ الجامعہ سید ہاشم علی صاحب نے ۱۹۸۹ء تک
ان کی ملازمت میں توسیع کی۔

مولانا ممدوح علی گڑھ میں ناظم کی ذمہ داری
سنبھالنے کے بعد پابندی سے ہر جمعہ کو جامع مسجد میں
۲۰ منٹ کا اردو میں جامع اور بلیغ خطبہ دیا کرتے تھے
اس خطبے میں شریک ہونے کے لیے بہت سے نمازی
پہلے سے جگہ لیتے اور ذوق و شوق کے ساتھ ان کا خطبہ
سنتے۔ ممتاز ادیب و علیگ پروفیسر رشید احمد صدیقی
مرحوم بھی انہی میں سے ایک تھے۔ بلکہ یہ بزرگ پابندی
سے اپنے تاثرات کا بھی اظہار فرماتے۔ مولانا اپنے خطبے
میں مبادیات دین سے لے کر تاریخی و علمی مسائل اور
حالات حاضرہ کے بہت سے حقائق اور معارف کو سمیٹ
لیتے تھے۔ مولانا کا اپنا انداز بیان ہوتا، اپنا رنگ و آہنگ
ہوتا جسے جمیل بھی کہیے اور جلیل بھی۔ مولانا کے خطبات
مدتوں یاد کیے جائیں گے۔ ان خطبات میں یونیورسٹی

کا ملازم نہیں بلکہ عالم دین اپنی حق گوئی و بیباکی کی روایتی شان کے ساتھ نظر آتا تھا۔ مولانا کے خطبات کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

مولانا کی دوسری کتابیں اس طرح ہیں:

۱۔ اسلام کا زرعی نظام۔ ۲۔ حدیث کا درایتی معیار

۳۔ فقہ کا تاریخی پس منظر۔ ۴۔ اجتہاد کا تاریخی پس منظر

۵۔ مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر (یہ دونوں کتابیں یکجا پاکستان سے شائع ہوئی ہیں) ان میں سے ایک کتاب کا انگریزی ترجمہ Fundamentals of (Ijtehad) کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

۶۔ احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت۔ اس کا بھی انگریزی ترجمہ پروفیسر غلام محمد صاحب سابق ڈین فیکلٹی آف قانون اے ایم یو نے Time Changes Islamic Laws کے نام سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ ادارہ ادبیات دہلی سے شائع ہوا ہے۔

۷۔ لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ (The Era of Atheism) کے نام سے شائع ہوا ہے اور عربی ترجمہ ڈاکٹر عبدالحلیم عویس کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

۸۔ تہذیب کی تشکیل جدید۔ اس کتاب کا بھی انگریزی ترجمہ Reconstruction of Culture کے نام سے اور عربی ترجمہ الاسلام تشکیل جدید للحضارۃ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

۹۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام: اس کا عربی ترجمہ النظام الالٰہی للرقی والانحطاط کے نام سے ڈاکٹر ازہری نے کیا ہے۔

۱۰۔ الاسس الفکریہ الایمانیہ (عربی) یہ کتاب ہم آہنگ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعض حصوں کا ترجمہ راقم نے کیا تھا۔

۱۱۔ بین الانسان الحقیقی والانسان الصناعی: عربی کی مذکورہ ساری کتابیں دار الصحوہ للنشر القاہرہ سے طبع ہوئی ہیں۔

۱۲۔ کائنات میں انسان کا مقام۔

۱۳۔ مراسلات (دینی رسائل و مسائل کا مجموعہ)۔

۱۴۔ حکمت القرآن۔

۱۵۔ مقالات امینی۔

۱۶۔ انشورنس کی شرعی حیثیت۔

۱۷۔ خطبات جمعہ و عیدین۔

۱۸۔ ہدایت القرآن۔ اس نام سے عمر کے آخری حصے میں مولانا نے قرآن کریم کی تفسیر لکھنی شروع کی تھی۔ سورۃ البقرہ کے آخر تک کی تفسیر حکمت القرآن لاہور اور دوسرے رسائل میں بالاقساط شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا نے یہ تفسیر سورۃ المائدہ تک لکھ لی تھی اور پورے قرآن کی تفسیر کی خواہش رکھتے تھے مگر ہدایت القرآن مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کی ہم قسمت ہو گئی۔ ان کتابوں کے علاوہ بچاس سے زیادہ طویل و مختصر مضامین ہیں جو مختلف رسائل بالخصوص برہان اور احتساب کی فائل میں محفوظ ہیں۔

مولانا کے علمی کام کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے مولانا کے فن سے واقف ہونا ضروری ہے یوں تو مولانا نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا قرآن و حدیث، فقہ و سیرت، تعلیم و تہذیب، مذاہب و نظریات سب سے دلچسپی رکھی مگر ان کی صلاحیت کا اصل میدان فقہ تھا۔ مولانا نے فقہ کی تدوین جدید کی پرزور انداز میں وکالت کی اور اس سلسلے میں رہنما خطوط و اشارات کی نشان دہی کی۔ مولانا نے فقہی دنیا کے جمود کو توڑنے اور عصر حاضر کی تغیر پذیر قدروں کو سمجھنے پر جتنا زور دیا وہ ان کے معاصرین کے یہاں کم ملتا ہے۔ مولانا کی بصیرت ان

کے ہی الفاظ میں یہ تھی کہ ہماری کوشش زندگی اور قانون کے متوازن اور مقدس رشتے کو بحال کرنے کی ہونی چاہیے زندگی اور قانون کا رشتہ ٹوٹے گا تو نہ قانون کی اہمیت ہوگی اور نہ زندگی کی قیمت برقرار رہے گی۔ مولانا کی فقہی تحریروں میں اس کوشش کا عکس صاف نظر آتا ہے۔

مولانا کے علمی تفردات سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے مگر اس جذبہ صادق کی ناقدری درحقیقت تقدس علم سے انحراف ہوگا۔ بعض وہ مسائل جن میں بہت پہلے مولانا منفرد تھے وقت گزرنے کے ساتھ ہندوستان کے بیشتر علما نے ان کی تائید کی۔ اس طرح کے بعض مسائل تہذیب کی تشکیل جدید میں اور احکام شرعیہ میں موجود ہیں۔ مولانا اپنے قدیم علمی ورثہ سے بھی وابستہ اور جدید فکری رجحانات سے بھی باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر ان رجحانات کا جمعہ کے خطبات اور احتساب کے صفحات میں محاسبہ بھی کرتے تھے۔ ان کتابوں اور مضامین میں یہ پہلو بھی خاصا ممتاز نظر آتا ہے۔ میں ڈاکٹر عبدالحلیم عویس کے اس تجزیہ سے اتفاق کرتا ہوں کہ

" وہ نہ تو مقلد قلم کار ہیں اور نہ ایسے مفکر ہیں جو عقل سے زیادہ جذبات سے کام لیتے ہیں بلکہ وہ ایسے مسلمان مفکر ہیں جو ان فکری اسلحوں سے لیس ہیں جن کی عصر حاضر میں اسلام کے دفاع کے لیے ضرورت ہے۔"

مولانا اپنی بات کا حوالہ ماضی سے ڈھونڈ کر لاتے تھے اور کہتے تھے کہ میں اپنی بات گزشتہ علماء کی زبان سے کہتا ہوں، اسی لیے کوئی میری مخالفت نہیں کرتا۔ بعض لوگوں کو ان کے مسلسل اقتباسات اور حوالوں سے تکدر ہوتا اور اس کا اظہار بھی ہوتا مگر مولانا اس راہ کی نزاکتوں سے واقف تھے۔ اس لیے اس انداز تصنیف میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے تھے۔

مولانا اپنی تحریریں چھپنے سے پہلے دوسروں کو سنایا کرتے۔ اکثر راقم کو بھی سناتے اور کہتے تبصرہ کرو اور میرا حال یہ ہوتا "گویم مشکل نہ گویم ہم مشکل"۔ کبھی کہتے میری کتابیں کون پڑھتا ہے۔ میں تو اپنی دماغی خارش مٹانے کے لیے لکھتا ہوں۔ آخری عمر میں پروفیسر رفیع الدین ناگپوری نے کہا۔ مولانا لکھنا بھی بند کر دیجیے۔ یہ بھی حجاب ہے۔ اب ہم لوگوں کا بلاوا آنے والا ہے۔ مولانا بولے میں نہیں چھوڑ سکتا۔ یہی میری عبادت ہے۔ یہی میرا ذکر ہے اور یہی سب کچھ ہے۔ مولانا اکثر یہ فرماتے۔ دنیا میں حسن کی کمی نہیں آن کی کمی ہے۔ مولانا کے علم و اخلاق سے فیض یاب ہونے والے جانتے ہوں گے کہ اللہ نے حسن بھی دیا تھا اور آن بھی۔ مولانا کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوسروں کا اعتراف اور اکرام دونوں کرتے تھے کسی کی کوئی بات اچھی لگتی اسے اپنا لیتے۔ خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ ایک مرتبہ مشہور ہندی مترجم قرآن محمد فاروق خاں صاحب ان سے ملنے آئے۔ مولانا نے پوچھا۔ نجات آسان ہے یا مشکل۔ خاں صاحب نے کہا اللہ کے ساتھ اگر راست بازی اختیار کی جائے تو نجات آسان ہے اور اگر اللہ کے ساتھ چالاکی کی جائے تو نجات مشکل ہے۔ عافیت اسی میں ہے کہ گناہ سرزد ہو تو اعتراف گناہ کرے۔ مولانا اپنی مجلسوں اور تقریروں میں بار بار اس جملہ کو بیان فرماتے۔ مولانا کے پڑوس میں ایک چھوٹا سا ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی ہے مولانا معمولاً وہاں جاتے۔ وہاں علما اور طلبا سے گھل مل کر باتیں کرتے اور مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے بے تکلف مسئلہ پوچھتے، طلبا مطلب کہتے۔ مولانا جب یہاں آتے تو سب لوگ روحانی سرور محسوس کرتے۔ ایک مرتبہ مجھ سے پوچھنے لگے: بتاؤ کہ قرآن کی آیت "لم یمسسہم سوء" میں دنیاوی تکالیف کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ عظمتیں یہ رفعتیں یہ بانکپن یہ رعنائیاں مولانا

پنے ساتھ لے گئے۔

مولانا دینی جلسوں، علمی سیمناروں اور مشاورتی میٹنگوں میں بھی حسب سہولت شرکت فرماتے اور اپنی منفرد شخصیت کا نقش ذہنوں میں چھوڑ آتے۔ علمی ذوق کی تسکین کے لیے صدق جدید کے انداز پر پندرہ روزہ دینی اخبار احتساب بھی نکالتے جس کے لیے ذہنی اور مالی صلاحیت خرچ کرتے۔ بعد میں یہ بند ہو گیا۔ مولانا طالب علموں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے ان کے مسائل پوچھتے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے بہت سے طلبا کی مالی امداد کرتے۔ کسی کو تکلیف میں مبتلا دیکھتے تو اس کی کسک اپنے دل میں محسوس کرتے اور اس کی مدد کے لیے بے چین رہتے۔ غریبوں اور ناداروں کا پورا خیال رکھتے اور کبھی اپنے دروازے سے سائل کو ناکام نہ لوٹاتے۔ ایسے لوگوں کا پتہ چلاتے جو ان کی مدد کے مستحق ہوں۔ ایسے متعدد واقعات کا خود میں عینی شاہد ہوں۔ ایک واقعہ بطور مشتے نمونہ از خروارے سن لیجیے۔

ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند کے کچھ طالب علم علی گڑھ آئے تو مجھ سے ملنے آئے۔ میں اُن کو مولانا کی خدمت میں لے گیا۔ سردی کے ہی دن تھے۔ ایک طالب علم سوئیٹر قمیص کے نیچے پہنے ہوئے تھا۔ مولانا نے مجھے الگ بلایا اور سو روپیے کا ایک نوٹ ہاتھ میں تھما کر کہا۔ اِسے دے دینا سوئیٹر خرید لے گا۔ میں نے تعمیل حکم کیا۔ مگر اس طالب علم نے قمیص اٹھا کر سوئیٹر دکھایا۔ میں نے مولانا کو صورت حال بتائی تو فرمایا پھر بھی دے دو، سفر میں کام آئے گا۔

اپنی یونیورسٹی کے متعدد طالب علموں سے میں واقف ہوں جن کے ڈیوز مولانا کی تنخواہ سے ادا ہوئے۔ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے میرے سامنے کہا۔ مولانا ایک عورت برقعہ پہن کر آتی ہے آپ اسے پیسے دے دیتے ہیں، وہی برقعہ اتار کر پھر مانگنے آتی ہے آپ منع نہیں کرتے۔ مولانا نے مخلوق خدا کی ضرورت کا حوالہ دے کر ٹال دیا اور اس اصول پر مرتے دم تک قایم رہے کہ کسی کی کمائی میں سب کا حصہ ہے۔

ہمارے مولانا مرنجا مرنج اور ہشت پہلو شخصیت کے حامل تھے۔ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے بھی دوست تھے۔ ان کا شیوہ فیض کی زبانی یہ تھا ؎

غم زمانہ ہو خیال یار ہو کہ دست عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

بعض لوگوں نے مولانا پر رکیک حملے کیے اور سنگین الزامات لگائے مگر مولانا صبر و تحمل اور عفو و درگزر کی تصویر بنے رہے۔ البتہ ایسے لوگوں سے محتاط رہتے۔ انھوں نے بچوں کی سی معصوم طبیعت پائی تھی۔ جلد ناراض بھی ہوتے اور جلد ہی مان بھی جاتے۔ کسی کو ڈانٹ دیتے پھر محسوس کرتے تو خود ہی معافی مانگتے اور اس کی تلافی کرتے۔ فیکلٹی کے ایک چپراسی سے ناراض ہوئے تو ڈانٹ لگائی۔ دوسرے دن بلا کر معافی مانگ لی۔ ہاں صاحبو! میرے مولانا نے ڈین ہو کر اپنے چپراسی سے معافی مانگی اور جیب سے کچھ روپیے نکال کر دیے اور کہا جاؤ چائے پی لینا۔

مولانا کسی کا دل دکھانا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے اور ہر کسی کی دل جوئی کرنا اپنا وطیرہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ میں اور بصیر بھائی (استاد سنی دینیات) رات گئے تک مولانا سے استفادہ کرتے رہے۔ بات مصر کے سابق حکمراں جمال عبدالناصر اور اخوان المسلمون پر چل نکلی۔ مولانا کہہ گئے کہ اخوان نے جمال کی حکومت چھیننا چاہی تو جمال نے اخوان کو مٹانا چاہا۔ معاملہ برابر کا تھا۔ اس پر میں نے عرض کیا۔ مولانا! تو پھر حضرت موسیٰ نے فرعون کی حکومت چھیننا چاہی اور فرعون نے ان کے قتل کی سازش کی۔ یہ معاملہ بھی برابر کا رہا۔ اس پر مولانا بہت ناراض ہوئے اور بصیر بھائی سے کہا: اس کی دیدہ دلیری دیکھتے ہو۔ یہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔ پھر مجلس برخاست

ہوگئی۔ فجر کی نماز پڑھ کر مولانا سیدھے میرے کمرے پر آئے اور پھر فرمایا: "بھئی رات میری بات سے تمہیں تکلیف ہوئی معاف کرنا۔" ادھر میرا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں پیروں تلے سے زمین نکل چکی تھی۔ فرشتہ صفت عالم دین میرے سامنے کھڑا تھا۔ ایسے دور میں جب کہ اپنی باتوں پر اصرار اور ہر بات پر اپنی انا کا اظہار دانش وری کا معیار بننے لگا ہو مولانا کا کردار بڑا پاکیزہ نظر آتا ہے۔ مولانا اپنی تعریف اور دوسروں کی غیبت سے پرہیز کرتے تھے۔

حقوق اللہ کے ساتھ مولانا حقوق العباد کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ خود مجھ سے ایک سے زیادہ مرتبہ فرمایا کہ میں نے ۲۳ سالوں تک جامع مسجد کے منبر پر تقریریں کیں مگر میرا مذہب ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھا، عبادات میں تو جاری وساری ہے مگر معاملات میں داخل نہ ہو سکا۔ مولانا کی خانگی زندگی قابل رحم سی تھی۔ مولانا کی اہلیہ ہمیشہ ذہنی عارضے میں مبتلا رہیں۔ مولانا کو بہت سے قریبی لوگوں نے عقدِ ثانی کا مشورہ دیا مگر مولانا نے انکار کر دیا۔ اس کے برخلاف اہلیہ کی تیمارداری اور نگہداشت کی ذمہ داری نبھا کر اپنا مرتبہ بلند کیا۔ مولانا ۱۹۸۵ء کے بعد خود داڑھ کے درد اور گٹھیا کے مرض میں مستقل طور سے مبتلا رہے۔ تکلیف میں کبھی کمی ہوتی اور کبھی اضافہ ہوتا مگر اس عالم میں بھی وہ دوسروں کی عیادت کرنا نہ بھولتے۔ پڑوسیوں کی خبر گیری سے غافل نہ رہتے اور حقوق کی ادائیگی میں حساس رہتے۔ راقم ایک شناسا نے جو فیض آباد کے رہنے والے ہیں بتایا کہ میں احتساب کا خریدار تھا۔ ایک مرتبہ احتساب نہیں آیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد منی آرڈر سے باقی پیسہ واپس آیا اس تحریر کے ساتھ کہ احتساب بند ہے۔ آپ کی بقیہ امانت واپس کی جاتی ہے۔

مولانا ممدوح حق گو اور جری تھے اور حق بات کہنے میں رشتے اور تعلقات، منصب وحیثیت کا لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کینڈی ہال میں تقریر ہوئی مولانا ندوی نے پیام انسانیت سے متعلق تقریر کی اور کہا کہ ہمیں اس کام کو ہر قسم کی لالچ اور مفاد سے بالاتر ہو کر کرنا چاہیے یہاں تک کہ دینی مفاد سے بھی بلند ہو کر۔ مولانا مرحوم کو یہ بات غلط محسوس ہوئی اور انھوں نے جمعہ کے خطبے میں اس کی تردید کی اور فرمایا: دین کی سربلندی کا جذبہ سارے مفادات سے بالاتر ہونا چاہیے اور قرآن وحدیث سے اسے مبرہن کیا۔ ایک مرتبہ عبداللہ گرلس کالج میں ایک مخلوط ثقافتی پروگرام ہوا۔ دین دار طلبا نے مولانا سے شکایت کی تو مولانا نے جمعہ کے خطبے میں اس پروگرام اور اس کے منتظمین کے خلاف سخت تقریر کی جو اخبارات ورسائل میں بھی چھپی اور شیخ الجامعہ سید حامد سے برطانیہ میں بھی اس حوالے سے سوالات کیے گئے۔ ایک مرتبہ ایک عرب نژاد شیخ وارد جامعہ ہوئے۔ وائس چانسلر صاحب نے جمعہ کی نماز میں قالین بچھانے اور صف اولیٰ میں مہمان کے لیے جگہ رکھنے کے لیے اطلاع بھجوائی۔ مولانا نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ اس جگہ امیر وغریب سب برابر ہیں۔

اس کے باوجود مولانا نقطۂ نظر کی سختی اور مفاد پرستی دونوں سے الگ ہو کر حقیقت پسندی کے قائل تھے۔ وہ اگر کہیں اپنے موقف پر اٹل رہتے تو اپنی بات کو واپس لینا بھی جانتے تھے۔ مولانا کی ذات دلگداز بھی تھی اور دلنواز بھی۔ کھلی کتاب کی طرح ہر کسی سے بے لوث طریقے سے ملتے۔ وہ مذہبی تشخصیات اور جماعتوں سے الگ تھلگ رہ کر بھی ان سے دلی لگاؤ رکھتے اور ان کے اچھے پہلوؤں اور کارناموں کا ذکر کرتے۔ وہ چند جملے اکثر دہراتے "میاں جیسا آدمی ویسا اس کا مذہب"، "ساری جماعتیں ٹھیک ہیں کسی نے حق پر ہونے کا اللہ سے پٹہ لکھا لیا ہے۔" مولانا مسلک وجماعت کی تمیز وتفریق کے کبھی قائل نہیں تھے۔ ان کا شیوہ اقبال کی زبان میں یہ تھا

تمیز رنگ و بو بر ما حرام است     کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

طبیہ کالج کے پرنسپل صاحب سے ایک مرتبہ کسی ضرورت مند کی ملازمت کی سفارش کی۔ پرنسپل صاحب نے کہا وہ تو بریلوی ہے اور آپ سفارش کر رہے ہیں۔ مولانا نے فرمایا وہ کچھ بھی ہو مسلمان ہے۔ اس کی مدد ہونی چاہیے۔" کوئی عالم خواہ کسی مسلک کا ہو اگر علی گڑھ آتا تو مولانا کی خواہش ہوتی کہ وہ اُن کا مہمان ہوتا۔ وہ اگر مولانا سے ملنے آتا تو بہتر ورنہ مولانا ان سے ملنے کا اہتمام کرتے اور ان کی سہولتوں کا خیال رکھتے۔ اپنے ملنے والوں کی خبر گیری بھی کرتے رہے۔

مولانا کی طبیعت میں نرمی اور بذلہ سنجی تھی۔ شرافت مع ظرافت تھی۔ وہ سلیکشن کمیٹی میں بیٹھتے تو بہت کم سوال کرتے اور کہتے مجھے امیدواروں سے بڑی ہمدردی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ اسی صلاحیت کے ساتھ میں اسی کرسی پر ہوں اور وہ اس جگہ فرق کتنا ہے۔ یہ تو حالات ہیں جن کے سبب سے بے چارہ مجھے انٹرویو دے رہا ہے۔ مولانا اپنے شاگردوں اور چھوٹوں کو اکثر چھیڑ کر سوالات کرتے۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتے بلکہ ان کو شوخ بناتے اور ان کی شوخی کو پورا کرتے۔ قربانی کا ایک موقع تھا۔ مولانا چک والی نئی شروانی پہنے تشریف لائے۔ محلّہ کے بچوں نے کہا مولانا مٹھائی (علی گڑھ کی یہ روایت بھی [illegible] کی طرح بڑی محبوب ہے)۔ مولانا بولے۔ ایک شروانی کے لیے درزی بھی پیسے لے اور تم لوگ بھی۔ اچھا یہ لو۔" مولانا نے دس روپیے کا نوٹ نکالا۔ بچوں نے فوراً فی صد کا حساب لگایا اور کہا یہ تو کم ہیں۔ مولانا نے اسے دوگنا کر دیا۔

مولانا نے جن شاگردوں کو شوخ بنایا ان میں یہ عاجز بھی ہے۔ میں نے اپنی کتاب 'موضوع احادیث کی پہچان' جو اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے مولانا ہی کی تحریک پر اور ان کی ہی نگرانی میں لکھی۔ مولانا اپنے شاگرد کا ہر مضمون پڑھتے اور اس کی علمی مصروفیات سے باخبر رہتے، مشورہ دیتے، حوصلہ افزائی کرتے اور مجلسوں میں اس کی وکالت کرتے۔

مولانا نے آخری نکاح ڈاکٹر نبی احمد اور ناہید کا پڑھایا، آخری خط سید حامد کو لکھا اور آخری خواہش ہتھیالوجی کی نئی مسجد میں نماز ادا کرنے کی کی اور اچانک وضو کرتے ہوئے نماز وصال میں مصروف ہوگئے۔

مولانا اپنے پیچھے مریض اہلیہ، چار لڑکیاں (صرف ایک شادی شدہ) دو چھوٹے لڑکے اور ایک بڑا علمی حلقہ سوگوار چھوڑ گئے۔ مولانا کو ان کی وصیت کے مطابق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں مولانا فضل اللہ جیلانی کی قبر کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

اقبال نے شاید انہی جیسے درویشوں کے لیے ہی کہا تھا ؎

چناں خود را نگہداری کہ با ایں بے نیازیہا

شہادت بر وجود خود ز خون دوستاں خواہی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۰۔ شمارہ ۱-۲ (جنوری۔فروری ۱۹۹۱ء)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۱، شمارہ ۹-۱۰ (ستمبر-اکتوبر) ۱۹۹۲ء

## علی گڑھ کی ایک دلنواز شخصیت

# جناب مراری لال متل

اشتیاق محمد خاں

فلم ڈائرکٹر تنویر احمد صاحب (علیگ) نے اپنی فلم مسٹر عاشق کے ایک ٹرائل شو میں مجھ سے کہا:

"اشتیاق صاحب! میں نے آج کے شو میں یونیورسٹی کے ایک بہت ہی پرانے اولڈ بوائے متل صاحب کو بھی مدعو کیا ہے۔ آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

متل صاحب کی آمد کا میں بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ فلم کا شو بھی ختم ہو گیا لیکن وہ کسی وجہ سے نہ آسکے۔

بہرحال تنویر صاحب سے متل صاحب کے گھر کا فون نمبر حاصل کیا اور دوسرے ہی دن صبح متل صاحب سے فون پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا:

"متل صاحب! میں آپ کو جانتا ہوں لیکن آپ مجھے نہیں جانتے۔ تعارف کے طور پر یوں سمجھیے کہ میں علیگ ہوں اور ایک چھوٹے علیگ بھائی کو اپنے بڑے علیگ بھائی سے ملنے کا اشتیاق ہے۔"

متل صاحب نے جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"آپ بھی علیگ ہیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ میرے بھائی علیگ ہونے کا تعارف تو سب تعارفوں پر بھاری ہے۔ ہم تو دیوانہ سرسید کے پرانے دیوانوں میں سے ہیں۔ ظہور وارڈ میں اے۔بی۔سی۔ڈی کے ابتدائی درجات سے لے کر بی۔اے، ایل ایل۔بی کی ڈگری تک ایم اے او کالج کے مرہون منت ہیں جب آپ کو فرصت ملے بلاتکلف گھر (جو بھی) پر تشریف لایئے۔ پھر تفصیل سے گفتگو ہوگی۔"

چوتھے دن شام کے وقت اطلاع کیے بغیر میں متل صاحب کے مکان پہنچ گیا۔ دروازے کی گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا! "میں اشتیاق ہوں۔ علیگ!" متل صاحب کی جیسے باچھیں کھل گئیں پرتپاک طور پر مصافحہ کیا۔ ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ میرے سوالوں کے جواب میں متل صاحب نے فرمایا "ہمارا خاندان گو علی گڑھ شہر کے محلہ مانک چوک میں اب بھی ہے۔ میری پیدائش ۷ نومبر ۱۸۹۳ء کی ہے۔ میرے والد رائے صاحب لالہ کشوری لال علی گڑھ سول کورٹ کے مشہور وکیل تھے۔ ۱۹۰۲ء میں مجھے سرسید احمد خاں کے مدرسہ میں دوسری جماعت میں داخل کیا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں میں نے انٹرنس پاس کیا۔ پھر ایم اے او کالج سے ۱۹۱۴ء میں بی۔اے پاس کیا۔ دو سال بیمار رہنے کے باعث تعلیمی سلسلہ ختم ہو گیا۔ جب صحت مند ہو گیا تو پھر ایم اے او کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۱۹ء میں ایل ایل بی پاس کیا۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد ڈیڑھ سال تک والد صاحب کے ساتھ علی گڑھ سول کورٹ میں پریکٹس کی۔ ۵ اپریل ۱۹۲۱ء کو آگرہ میں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر میری پوسٹنگ ہو گئی۔ کافی عرصہ آگرہ میں رہا۔

۱۹۴۲ء میں اڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ ریٹائرمنٹ کے وقت میں لکھنؤ میں تھا اور اس کے فوراً بعد ہی بمبئی منتقل ہو گیا۔ یہاں میرے لڑکے تھے۔"

میرے اس سوال کے جواب میں کہ آپ علی گڑھ کب سے نہیں گئے؟ فرمایا

"بھئی ۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک تو یو پی ہی میں گورنمنٹ ملازم کی حیثیت سے اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ ۱۹۴۲ء میں بمبئی آگیا اور ابھی تک علی گڑھ جانا نہ ہو سکا۔ سنا ہے علی گڑھ شہر بھی بہت بڑھ گیا ہے اور یونیورسٹی کے علاقے میں تو میدان اور بنجر زمین تک آبادیوں اور سبزہ زاروں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ جی بہت چاہتا ہے علی گڑھ دیکھنے کو بالخصوص یونیورسٹی کو۔ اس لیے کہ صاحب باغ کے پاس ہماری جائداد بھی ہے والد صاحب کا قائم کیا ہوا دھرم شالہ اور ایک مندر بھی ہے۔ والدین کی قبریں بھی وہیں ہیں اور کچھ کھیت بھی ہیں۔

سوال: آپ جب ایم۔ اے۔ او کالج کے طالب علم تھے تو اس وقت طلبا کی کتنی تعداد تھی۔ بورڈر کتنے تھے اور ڈے اسکالر کتنے؟ ہندو طلبا کتنے تھے۔ ماحول کیسا تھا؟

مِتّل صاحب: میرے خیال میں یہی چار پانچ سو طلبا ہوں گے۔ زیادہ تعداد بورڈرز کی تھی۔ میں ڈے اسکالر تھا ماحول بہت اچھا تھا۔ ہندو مسلم طلبا کے درمیان کوئی فرق یا امتیاز نہ تھا۔ بالکل بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے ہندو طلبا اندازاً پانچ سے دس فیصد تک تھے۔ کالج کا یونیفارم ترکش کوٹ، ترکش ٹوپی اور پتلون تھا۔ گریجویٹ ہونے کے بعد ہر طالب علم اپنے نام کے آگے "علیگ" ضرور لکھتا تھا۔ اور علیگ ہونا گویا ایک بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ علیگ برادری میں بھائی چارہ کا جذبہ بلاامتیاز مذہب و فرقہ اتنا زبردست تھا کہ دوسرے لوگ رشک کرتے تھے۔ پتہ نہیں کہ وہ جذبہ ہے کہ نہیں"۔

میں نے کہا: علیگ برادری کا وہ جذبہ ہے تو اب بھی لیکن کم کم۔ آپ کو علی گڑھ چھوڑے ہوئے باسٹھ سال ہو رہے ہیں۔ نصف صدی میں زمانے نے جتنے انقلابات دیکھے ہیں، اتنے تو صدیوں میں بھی کبھی نہیں ہوئے۔ ہر جگہ تبدیلی آئی ہے، علی گڑھ بھی اس سے مبرا نہیں۔

رخصت ہونے سے پیشتر ایک ذاتی سوال اور پوچھ لیا۔ مِتّل صاحب! آپ زندگی کے نوّے سال گزار کر اب ماشاء اللہ اکیانوے سال میں داخل ہوئے ہیں۔ آپ کی رفتار، گفتار اور جسمانی حالت سے عمر کم ہی لگتی ہے، آپ کی صحت کا راز کیا ہے؟

مِتّل صاحب نے فرمایا "علی الصبح جوہو بیچ پر (سمندر کے کنارے) ڈیڑھ کلومیٹر تک چہل قدمی۔ پھر لوگوں کی شفقتیں معتدل کھانا اور ذہن کو پُرسکون رکھنا۔ بس یہی صحت کا راز ہے۔"

(پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ——— ۱۶ دسمبر ۱۹۸۴ء)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۔ جلد ۱۱ شمارہ ۹ ۔ ۱۰ (ستمبر ۔ اکتوبر) ۹۲ء

# عنایت اللہ خاں شروانی

## سرسید کے ایک ساتھی

فرخ جلالی

علی گڑھ میں سرسید امیدوں کے سہارے کام کرتے رہے یہاں آس کی گھنی چھاؤں کم اور غریب الوطنی کی دھوپ زیادہ تھی۔ انھوں نے نہ ہمت ہاری نہ مایوس ہوے۔ امید کی خوشی اُن کی سچی رہبر اور اعلیٰ مقصود کی تلاش ان کی آرزو تھی۔

سب کو معلوم ہے کہ سائن ٹیفک سوسائٹی کا تخیل غازی پور میں پروان چڑھا اور علی گڑھ میں اس کی نشو و نما ہوئی۔ سائن ٹیفک سوسائٹی کے قانون ۱۸۶۴ء میں تحریر تھا۔

۲۔ مستقل مقام سوسائٹی کا انجام کو الٰہ آباد میں ہوگا۔ مگر جب تک کہ سوسائٹی بخوبی نہ چل نکلے۔ اس وقت تک اس کا مقام ان مقاموں پر ہوگا جہاں جہاں سید احمد خاں صدر الصدور کا قیام ہوتا رہے گا۔"

سرسید کا ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ تبادلہ ہوگیا۔ یہاں کئی حضرات نے سوسائٹی کی مدد کی اور ممبر ہو گئے۔ محمد عنایت اللہ خاں نے سر سید کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور خود ممبر بنے محمد عنایت اللہ خاں علی گڑھ ضلع کے ممتاز رئیس محمد داؤد خاں کے بیٹے تھے جن کے سرسید سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ محمد عنایت اللہ خاں نے اپنے بھائی غلام احمد خاں سے سوسائٹی کو ڈھائی سو روپیہ دلوائے نواب محمد مزمل اللہ خاں حاجی غلام احمد خاں کے چھوٹے بیٹے تھے۔

۱۲ اگست ۱۸۶۴ء کو سائن ٹیفک سوسائٹی کا جلسہ ہوا۔ اس میں محمد عنایت اللہ خاں رئیس بھیکم پور نے ایک تجویز پیش کی۔

"اے صاحبو! مجھ کو یاد ہے کہ قانون سوسائٹی میں یہ بات مندرج ہے کہ انجام کو مقام مستقل سوسائٹی کا الٰہ آباد قرار پاوے گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس ضلع کے رئیسوں اور تعلقہ داروں نے واسطے تعمیر مکان سوسائٹی کے چندہ دینا قبول کیا ہے۔ اس لیے میں تحریک کرتا ہوں کہ آئندہ اجلاس میں حسب ضابطہ تحریک کی جاوے کہ اب سے ہیڈ کوارٹر اس سوسائٹی کا ہمیشہ کے واسطے علی گڑھ قرار پاوے۔"

سرسید کے مشہور دوست راجہ جے کشن داس نے اس تحریک کی تائید کی اور بالاتفاق یہ تجویز منظور ہوئی۔

اسی جلسہ میں سرسید نے کہا:

"کہ جمیع قسم کے علوم و فنون کے آلات جو یورپ میں مروج ہیں اور جن کے ذریعے طالب علموں کو ہر قسم کے علوم و فنون کے تجربے دکھلائے جاتے ہیں، سوسائٹی کو جمع کرنا چاہیں۔ کیونکہ ابتدا سے سوسائٹی کی خواہش ہے کہ ہر مہینے میں دو تین دفعہ بذریعہ لکچروں اور دکھانے تجربوں کے

ہندوستانیوں کو یورپ کے علوم و فنون کی نئی تحقیقاتیں بخوبی سمجھاوی جاویں۔

سائنٹیفک سوسائٹی کی اسی رویداد میں درج ہے:

"محمد عنایت اللہ خاں رئیس بھیکم پور نے ان تدبیروں کے پورا ہونے کے لیے زیادہ تر اپنا شوق ظاہر کیا اور یہ صلاح دی کہ ان امور کے انجام ہونے کے لیے چندہ جمع کیا جاوے اور انھوں نے خود ایک ہزار روپیہ دے کر اس چندہ کی فہرست میں اپنا اول نمبر قائم کیا۔"

(رو داد نمبر ۲۔ صفحہ ۴)

سرسید کی اس وسعت نظر اور عنایت اللہ خاں کی تائید اور نذرانہ گزر مقامی انگریز حکام کو پسند نہیں تھا۔ حالی نے حیاتِ جاوید میں لکھا ہے کہ کمشنر میرٹھ ولیمس نے سرسید سے کہا کہ سائنٹیفک سوسائٹی کے اجلاس میں اگر محمد عنایت اللہ خاں شریک ہوں گے تو وہ نہیں آئیں گے۔ محمد عنایت اللہ خاں کے بارے میں کمشنر کو یہ معلوم تھا کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء میں باغیوں کی خفیہ حمایت کی تھی۔ سرسید نے محمد عنایت اللہ خاں کی عدم شرکت پر اتفاق نہیں کیا۔ محمد عنایت اللہ خاں شریک کیے گئے۔ علی گڑھ کی سرزمین پر سرسید کی یہ پہلی باغیانہ لغزش تھی جس پر وہ بضد رہے یہ سچ تھا کہ محمد عنایت اللہ خاں نے ۱۸۵۷ء میں باغیوں کی خفیہ مدد کی تھی جس کی وجہ سے باغی دہلی سے سکندرہ پہنچ سکے تھے۔ اس لیے عنایت اللہ خاں سے اعلیٰ انگریز حکام ناخوش تھے۔ سرسید نے ان حکام کی ناراضگی کو سہا اور ۱۸۸۲ء کے ہنٹر ایجوکیشن کمیشن کے سامنے مفصل شہادت دیتے ہوئے کہا تھا کہ مقامی حکام ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے لیے اعلیٰ مغربی تعلیم کے مخالف ہیں۔

سرسید نے جب ۱۸۷۰ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی تحریک شروع کی تو محمد عنایت اللہ خاں نے بڑھ کر حصہ لیا۔ سرسید نے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو کالج شروع کیا۔ شمالی ہند کے ممتاز علما جن میں مولانا عبدالقادر بدایونی مولانا محمد قاسم، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور دوسرے علما شامل تھے، ان مقدس حضرات سے "کمیٹی مدبران تعلیم اہل سنت و جماعت" سے شرکت کی درخواست کی اور تقریباً سب نے شرکت سے انکار کر دیا۔ سرسید نے ایک نئی "کمیٹی مدبران اہل سنت و جماعت" بصدارت محمد عنایت اللہ خاں بنائی جس کے سکریٹری سمیع اللہ خاں تھے۔ جس کے ایک ممبر مولوی حافظ محمد اسماعیل تھے، جن کے والد مولانا عبدالجلیل علی گڑھی کو ۱۸۵۸ء میں انگریزوں نے سزائے موت دی تھی۔

اس کے علاوہ محمد عنایت اللہ خاں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی "کمیٹی منتظم مدرستہ العلوم" کے خاص ممبر تھے۔ انتظامی امور میں شرکت کے علاوہ محمد عنایت اللہ خاں سرسید کی ہر طرح مدد کرتے تھے۔ ۱۸۸۳ء کی سالانہ رپورٹ میں سرسید نے لکھا ہے:

"تعمیر کے کام میں ہم کو زیادہ مشکل ہے مگر میں ان دوستوں کا دل سے شکر گزار ہوں، جن کی امداد

"دوست ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے اور دشمن عیبوں کو، اس لیے ہم کو اپنے دشمن کا زیادہ احسان مند ہونا چاہیے کہ وہ ہم کو ہمارے عیبوں سے مطلع کرتا ہے۔ اگر ہم نے اس کے طعنوں کے سبب ان عیبوں کو چھوڑ دیا تو دشمن سے ہم کو وہی نتیجہ ملا جو ایک شفیق استاد سے ملنا چاہیے تھا۔"

سرسید

نے اس قدر عمارت تیار ہوگئی ہے۔ ہمارے ضلع کے رئیسوں میں سے رئیسان بھیکم پور نے سوائے محمد عنایت اللہ خاں صاحب کے ہمارے کالج پر کچھ توجہ نہیں کی ہے۔ ان کے دل کے شبہات ابھی دور نہیں ہوئے ہیں۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ کبھی دور نہ ہوں گے۔ مگر میرا یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی اُن کا دل بھی نرم ہوگا۔"

دیکھیے کیسی موہوم امید پر سرسید جی رہے تھے اور آگے بڑھ رہے تھے ـــــ سرسید کی اسی یقین کی روشنی میں ہم اس یونیورسٹی تک پہنچنے کے قابل ہوئے ہیں۔

محمد عنایت اللہ خاں کے دو بھتیجے تھے کوئی بیٹا نہ تھا۔ محمد احمد سعید خاں جو ہمیشہ سرسید کی نیازمندانہ مدد کرتے رہے اور دوسرے نواب مزمل اللہ خاں تھے جو زندگی میں سرسید کے ہر کام میں شریک رہے اور سرسید کے انتقال کے بیس برس بعد تک کالج کے اسسٹنٹ سکریٹری رہے۔ دونوں بھائی سرسید کے ساتھی اور جاں نثار تھے۔

۱۸۸۶ء میں محمد عنایت اللہ خاں کا انتقال ہوگیا۔ سرسید کو سخت رنج ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۸۸۹ء میں سرسید نے جب قانون ٹرسٹیاں پاس کیا تو علی گڑھ اور آس پاس کے بعض رئیسوں نے سرسید کی سخت مخالفت کی، مگر احمد سعید خاں اور نواب مزمل اللہ خاں سرسید کے وفادار رہے اور مکمل کر ساتھ دیا۔

یونین کے سامنے کا فوارہ عنایت اللہ خاں کی یادگار ہے۔ یوں ہماری نئی اور پرانی نسل محمد عنایت اللہ خاں سے ناواقف ہی ہے۔

(پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ یکم مئی ۸۲ء)

"بالفعل مدار اخلاق ہم لوگوں میں اس پر رہ گیا ہے کہ جب کسی سے ملے کچھ ہنس کر سلام کیا، کچھ محبت کی جھوٹی باتیں بنائیں، دو چار میٹھی میٹھی باتیں سنائیں کچھ اپنی جھوٹی نیازمندی کا اظہار کیا کچھ ان کی جھوٹی تعریف کی آؤ بھگت کی اور دل میں کہا کہ خوب الّو بنایا۔ جب وہ چلا گیا تو یا تو برا کہنے لگے یا جو باتیں کی تھیں ان کا نقش برآب کا سا بھی نشان نہ تھا۔"

سرسید رح

# سائنسی مضامین

۱۱۷ ـــــــــــــــ ۱۵۶

# عرب اور عالمِ اسلام میں سائنس کا احیاء

عبد السلام | مترجمہ | نسیم انصاری

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد انّ
محمداً عبدہٗ ورسولہ
اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں آج کی نشست میں بنیادی سائنس پر گفتگو کرنا اہتا ہوں۔ میں خاص طور سے یہ التجا لے کر آیا ہوں کہ آپ سب الم اسلام میں اور عرب کی سرزمینوں پر سائنس کی ایسی دولتِ مشترکہ بنائیں جہاں علم کے خزانے تیار کیے جا سکیں۔ یں س راستے کا نقشہ پیش کرنا چاہتا ہوں جس پر چل کر ہم علمی نیا میں اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر سکیں لیکن اس وضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے میں چند باتیں ذرّاتی طبیعات (Particle Physics) کے متعلق کہنا چاہتا ہوں سے میرا خصوصی تعلق رہا ہے۔

## بنیادی قوتوں میں وحدت کا ظہور

ابھی بیس بائیس سال پہلے تک طبیعات کے عالموں نہیں تھا کہ دنیا میں چار بنیادی محرکات یا توانائیاں ہیں - یں ثقلی توانائی (Gravitational Energy)، برق مقناطیسی انائی (Electro Magnetic Energy) اور دو طرح نیوکلیائی یعنی شدید و خفیف (Strong And Weak - Forms Of Nuclear Energy) سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے۔

یہ سب ہی جانتے ہیں کہ یہ چاروں توانائیاں ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ثقلی توانائی برق مقناطیسی توانائی میں تبدیل ہو سکتی ہے جس کی ایک مثال پانی سے بننے والی بجلی ہے۔ شدید نیوکلیائی توانائی برق مقناطیسی توانائی میں تبدیل ہو سکتی ہے جس کی مثال سورج کے قلب سے نکلی ہوئی برق مقناطیسی شعاعیں ہیں۔ تقریباً بیس سال ہوئے جب میں نے اور میرے ساتھیوں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ خفیف نیوکلیائی اور برق مقناطیسی قوتوں کی ماہیت ایک ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں تھا کہ یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ بلکہ بات تو اس سے آگے کی تھی۔ ہماری رائے یہ تھی کہ ان دونوں قوتوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر تجربہ گاہ میں مناسب حالات پیدا کیے جا سکیں تو ان کی وحدانیت جو عام طور سے پوشیدہ رہتی ہے، عیاں کی جا سکتی ہے۔

ہمارے نظریہ کے صحیح ہونے کا پہلا اشارہ ۱۹۷۳ء میں ملا جب جنیوا کی عظیم یورپین نیوکلیر ریسرچ لیبوریٹری میں اس نظریہ کی بنیادی کڑی یعنی نیوٹرل کرنٹ (Neutral - Current) کے وجود کی شہادت تجربات سے ملی، اس کے بعد ۱۹۷۸ء میں امریکہ میں اسٹینفورڈ لینیر ایکسلیریٹر (Stanford Linear Accelerator) نے کیے

گئے تجربات نے نہ صرف ہمارے نظریہ کی صداقت کا حتمی ثبوت فراہم کیا بلکہ اس کے دوسرے اہم و بنیادی پہلو کی تصدیق بھی کی۔ ان تجربات سے ہماری یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی کہ برقی مقناطیسی و خفیف نیوکلیائی قوتیں فی الحقیقت ایک ہیں اور یہ کہ ان کے انضباط میں ایک اور چار ہزار کی نسبت ہوتی ہے۔ ان باتوں کی مزید تصدیق پروفیسر بارکو (BARKOV) کی سربراہی میں نووسی برسک (Novosibirsk) میں کیے گئے تجربات سے بھی ہوئی۔ میں ان دونوں اور بہت سی عظیم تجربہ گاہوں کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں جہاں یہ ثابت کر دیا گیا کہ خفیف نیوکلیائی قوت اور برقی مقناطیسی قوت کی حقیقت ایک ہے۔

آگے کا مرحلہ یہ دیکھنا ہے کہ تیسری یعنی شدید نیوکلیائی قوت بھی اس وحدت کا ایک حصہ ہے۔ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ہم نے اس نظریہ کو پیش کیا ہے اور ساتھ ہی کچھ ایسے تجربات بھی تجویز کیے ہیں جن سے اس نظریہ کی تصدیق ہو سکے۔ یہ تجربات امریکہ، یورپ اور ہندوستان میں شروع ہو چکے ہیں۔ اگر ان تجربوں سے مثبت نتائج برآمد ہوئے تو انشاء اللہ چند برسوں میں ہم یہ ثابت کر دیں گے کہ ہر قسم کی نیوکلیائی قوت (اور صرف خفیف نیوکلیائی قوت ہی نہیں) بعینہٖ برقی قوت ہے جو ایک ایٹم کو گرفت میں رکھے رہتی ہے۔

اس کے بعد آخری مرحلہ یہ رہ جائے گا کہ ثقلی برقی مقناطیسی اور نیوکلیائی قوتوں کی وحدانیت بھی ثابت کی جا سکے اس نظریۂ وحدت کا نقطۂ عروج یہ ہوگا کہ وہ قوت جو چاند کو اپنے دائرہ گردش میں رکھتی ہے اور جس کی وجہ سے سیب زمین پر گرتا ہے یعنی کشش ثقل اس وحدانیت کا ایک جزو ہے جس کے اجزا نیوکلیائی اور برقی مقناطیسی قوتیں ہیں گو آج یہ بات ناممکنات میں شمار کی جاتی ہے، لیکن ہمیں کامل یقین ہے کہ یہ بھی صحیح ثابت ہوگی۔ اس نظریہ کو جس کا اشارہ آئن سٹائن (EINSTEIN) کے یہاں ملتا ہے صحیح طور پر پیش کرنے اور اس کے لیے ثبوت حاصل کرنے میں شاید ابھی پچاس سال اور لگ جائیں۔ کتنا جی چاہتا ہے کہ اس مسئلہ کے حل کا سہرا عالم اسلام کے کسی جواں سال اور جواں فکر ماہر طبیعات کے سر بندھے۔ فطرت کی بظاہر غیر متعلق قوتوں کے درمیان وحدانیت کی تلاش سائنس دانوں کا مسلک ہے اور میرے لیے مسلمان ہونے کے ناطے جزو ایمان۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے توفیق عطا فرمائی اور اس کی قدرت کے راز اس طرح آشکار ہوئے۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاءُ
واللہ ذو الفضل العظیم ہ (سورۃ الجمعہ/۴)
[ یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا
ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے ]

۱۹۷۹ء میں تقسیم انعام کے موقع پر مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں طبیعات میں انعام یافتہ سائنس دانوں کی طرف سے اعلیٰ حضرت شاہ سویڈن کی طرف سے دیے ہوئے خطبہ کا جواب دوں جو انھوں نے از راہ کرم اس دعوت میں دیا تھا۔ اپنی اس تقریر کے چند اقتباسات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کیوں کہ ان میں میرے اس یقین کی طرف اشارے ہیں جو مجھے فطرت کی وحدانیت و یکسانیت پر ہے۔

"علم الطبیعات نوع انسانی کی مشترکہ میراث ہے۔ مشرق و مغرب، شمال و جنوب کے رہنے والوں نے اس کے فروغ میں برابر کا حصہ لیا ہے اسلام کی مقدس کتاب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
ماتری فی خلق الرحمن من تفوت۔ فارجع البصر ھل تری من فطور۔ ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا و ھو حسیر۔

[ تو خدا کی اِس صنعت میں کوئی نہ دیکھے گا۔ سو تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے۔ کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ۔ نگاہ خیرہ اور درماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی ] (سورۃ الملک ۳-۴)

بہ غور دیکھیے تو یہی تمام ماہر طبیعات کا مذہب ہے۔ اِسی سے ہمارے دلوں میں گرمی ہے اور یہی ہے جس سے ہم متحرک ہیں۔ ہم جتنا ہی گہرائی میں جاتے ہیں اتنا ہی ہمارے لیے حیرت کا سامان ہے۔ ہم جتنی ہی گہری نگاہ ڈالتے ہیں، اتنا ہی ہماری آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔

میں یہ باتیں صرف ان لوگوں کے لیے ہی نہیں کہہ رہا ہوں جو آج یہاں موجود ہیں بلکہ میرا خطاب تیسری دنیا کے ان احساس شکست کے ماروں سے بھی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس کی دوڑ میں وہ صرف اس لیے پیچھے رہ گئے کہ ان کو نہ تو مواقع میسر آئے اور نہ ساز و سامان۔"

## سائنس - انسانیت کی مشترکہ میراث

میں نے اس نوبل لکچر میں ایک واقعہ بیان کیا تھا جس کا مقصد یہ بتانا تھا کہ تہذیب و تمدن کی تاریخ کی طرح سائنسی انکشافات کی تاریخ میں بھی ادوار آیا کرتے ہیں۔ میں نے آج سے تقریباً سات سو سال پرانا قصہ سنایا تھا کہ کس طرح اسکاٹ لینڈ کا ایک نوجوان مائیکل (MICHAEL) اپنے وطن سے یہ ارادہ کر کے اسپین گیا کہ طلیطلہ (TOLEDO) اور غرناطہ کی عرب یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرے اور وہیں روزگار بھی تلاش کر لے۔ ۱۲۱۷ء میں وہ طلیطلہ (TOLEDO) پہنچا جہاں اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ لاطینی یورپ کو یونانی فلسفے سے متعارف کرلے۔ اسے یونانی زبان سے واقفیت نہیں تھی اور وہ صرف ان عربی کتابوں ہی سے، جو اس وقت اسپین میں پڑھائی جاتی تھیں، لاطینی زبان میں ترجمہ کر سکتا تھا۔ طلیطلہ سے مائیکل صقلیہ (SICILY) پہنچا اور شہنشاہ فریڈرک دوم کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ سالرنو (SALERNO) کے طبیہ کالج بھی گیا جس کے قیام کی اجازت فریڈرک نے ۱۲۳۱ء میں دی تھی۔ یہاں اس کی ملاقات ڈنمارک کے طبیب۔ HENDRIK - HARPESTRAENG - سے ہوئی جو بعد میں شاہ ایرک چہارم والڈ مارسن۔ (KING ERIC IV - WALDE MARSSON) کے دربار کا طبیب بنا۔ ہنڈرک ڈنمارک سے سالرنو (SOLERNO) اس لیے آیا تھا کہ وہ فصد کھولنے اور سرجری کے فن پر اپنی وہ ضخیم کتاب تصنیف کرے جو سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ اس کے ذرائع معلومات عالم اسلامی کے مشہور اطباء الرازی اور ابن سینا کی تصانیف تھیں جن کا ترجمہ صرف اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا مائیکل ہی کر سکتا تھا۔

مغرب نے سائنس کا پہلا سبق طلیطلہ (TOLEDO) اور سالرنو (SALERNO) میں پڑھا۔ اس نے اپنی درس گاہوں میں علم کی نئی شمعیں ان قندیلوں سے جلائیں جو عالم اسلام میں صدیوں سے روشن تھیں۔

سائنسی انکشافات کی تاریخ میں جو مختلف ادوار آئے ہیں ان کی تھوڑی اور وضاحت شاید بے محل نہ ہو۔ جارج سارٹن (GEORGE SARTON) نے اپنی شہرۂ آفاق پانچ جلدوں پر مشتمل تاریخ سائنس میں سائنسی کارناموں کی تاریخ کو نصف صدی کی اکائیوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر نصف صدی کے کارناموں کو ایک مرکزی شخصیت سے منسوب کیا ہے۔ چنانچہ ۴۵۰ ق م لغایت ۴۰۰ ق م

کو وہ افلاطون کا زمانہ کہتا ہے۔ اس کے بعد کی نصف صدیوں کو ارسطو، اقلیدس، آرشمیدس وغیرہ سے علی الترتیب منسوب کیا گیا ہے۔ سن ۶۰۰ء لغایت سن ۷۰۰ء چینی علماء ژیون سانگ اور آئی چنگ کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد ۷۵۰ء سے سن ۱۱۰۰ء تک یعنی ساڑھے تین سو سال کا تسلسل زمانہ جابر، خوارزمی، رازی، مسعودی، ابوالوفا، البیرونی اور بوعلی سینا، ابن ہیثم اور عمر خیام یعنی عرب، ترک، افغان اور اہل ایران کا زمانہ ہے۔ ان سب کا تعلق عالم اسلام سے تھا۔ اس کہانی میں سن ۱۱۰۰ء کے بعد پہلی بار یورپی علماء جیسے Roger Bacon، Gerard of Cremona کا نام آتا ہے لیکن اس اعزاز میں بھی ابن رشد، نصیر الدین طوسی اور ابن نفیس برابر کے شریک ہیں۔ یہ وہی ابن نفیس ہیں جنھوں نے ہاروے (Harvey) سے کئی سو برس قبل دوران خون کا نظریہ دیا تھا۔

البتہ سن ۱۳۵۰ء کے بعد سے دنیا اسلام سائنس کی اس دوڑ میں عام طور سے پیچھے رہ جاتی ہے بجز ان ایک آدھ درخشاں ستاروں کے جو پھر بھی نظر آجاتے ہیں۔ جیسے ۱۴۳۰ء میں تیمور کے پوتے الغ بیگ کا دربار جہاں خود امیر الغ بیگ دوسرے علماء کے ساتھ علم الہیئت پر سرگرم مناظرہ اور تحقیق میں ڈوبا دکھائی دیتا ہے یا ۱۷۲۰ء میں مغل دربار میں (راجہ جے سنگھ کی طرف سے) زیج محمد شاہی کی تیاری جس میں یورپ کے مستند جدول کی ۲۰ ڈگری زاویہ کی حد تک تصحیح کی گئی۔ لیکن باوجود ان اکا دکا کارناموں کے سائنسی جستجو و تحقیق کا جذبہ سرد اور اس کی طرف عام رجحان کم ہو چکا تھا اور اس سے بہت پہلے سے ہی روایت پرستی اور جمود کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔

اب ہم بیسویں صدی میں پہنچتے ہیں جب وہ سفر جس کی ابتدا اسکاٹ لینڈ کے مائیکل نے کی تھی، ختم ہوتا ہے اب علم کی پیاس بجھنے کے سامان کہیں اور ہیں اور آج یہ عالم اسلام و دنیائے عرب ہے جو مغرب کے علم و ہنر و سائنسی تخلیق کے اشاروں کی محتاج ہے۔

آج سے گیارہ سو سال قبل الکندی نے لکھا تھا "ہم لوگوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ سچ کو تسلیم کرنے میں شرم محسوس کریں بلکہ اسے تو بلا امتیاز مآخذ شوق سے قبول کرنا چاہیے جو تلاش حق میں سرگرداں ہیں ان کے لیے صداقت سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں۔ سچ اپنے متلاشی کو کبھی سبک نہیں ہونے دیتا اور نہ ہی اسے کم رتبہ بناتا ہے۔ الکندی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ "سچ تو سچ ہی رہتا ہے چاہے جہاں سے آشکار ہو۔" میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ فطرت کے بھید کھولنے کی آرزو انسان کا مقدر ہے۔ اللہ جل شانہ فرماتا ہے۔

ربّ زدنی علماً

آیئے میں آپ کو سائنسی تاریخ میں بشری برتری کی ایک جھلک دکھاؤں۔ ۱۹۶۷ء میں طبیعات کا نوبل پرائز پانے والے سائنس دان ہنس بیتھے (Hans Bethe) کا قصہ ہے۔ جس روز انھوں نے کاربن کا وہ سلسلہ دریافت کیا جس میں ستاروں میں پیدا ہونے والی زبردست توانائی کا راز پوشیدہ تھا۔ اس دن وہ اپنی بیوی روز بیتھے (Rose Bethe) کے ساتھ میکسیکو کے صحرا میں کسی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ صحرائی رات میں روز نے چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ کر بے اختیار کہا کہ دیکھو یہ تارے کیسے چمک رہے ہیں۔ بیتھے نے جواب دیا: "کیا تم جانتی ہو کہ جس آدمی سے کھڑی تم باتیں کر رہی ہو وہ اس دنیا کا واحد انسان ہے جسے یہ معلوم ہے کہ ستارے کیوں چمکتے ہیں۔"

## اسلامی دنیا میں سائنس کا زوال

لیکن آخر ہم جن کا تعلق عالم اسلام سے ہے وہ اس دوڑ میں کیوں پیچھے رہ گئے؟ کسی کو ٹھیک سے اس کا جواب معلوم نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے خارجی وجوہات بھی تھیں جیسے منگولوں کی لائی ہوئی تباہ کاری۔ لیکن

غالباً یہ تباہی محض ایک عارضی رکاوٹ تھی۔ چنگیز کے ساٹھ برس بعد اس کے پوتے ہلاکو نے مراغا (Maragha) میں ایک رصدگاہ بنوائی۔ میرے خیال میں دنیائے سائنس کے رخصت ہونے میں داخلی وجوہات کارفرما تھیں۔ میں آج ان کا جائزہ نہیں لوں گا۔ لیکن ابن خلدون کی تحریروں سے ایک اقتباس ضرور پیش کروں گا جس سے مسلمانوں کے تغافل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ابن خلدون کا شمار تاریخ و تمدن کے ممتاز ماہروں میں ہوتا ہے اور وہ یقیناً عظیم ترین دانش وروں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے اسکاٹ لینڈ کے مائیکل اور ڈنمارک کے ہنڈرک کی تلاش علم میں سرزمین اسلام کی یاترا کے ایک سو ستر برس بعد اپنی تصنیف "مقدمہ" میں لکھا:

"ہم نے حال میں سنا ہے کہ فرنگیوں کے ملک، بحر روم کے شمالی ساحل کے علاقوں میں طبیعاتی فلسفہ کا بڑا چرچا ہے۔ اس کی تعلیم مختلف درجوں میں بار بار دی جاتی ہے اور ان علوم کی تشریح مفصل کی جاتی ہے۔ ان کے جاننے والے بہت ہیں اور طلبا کی تعداد بھی بے شمار ہے واللہ اعلم لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ ان علوم سے ہماری مذہبی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس لیے ان سے دور ہی رہنا بہتر ہے۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ ابن خلدون کو کوئی تجسس نہیں ہوا۔ بس ایک بے رخی کی کیفیت تھی جو کھلی ہوئی مخالفت سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اس بے رخی کا لازمی نتیجہ علمی دنیا سے علیحدگی تھا۔ الکندی کی روایت کہ "علم جہاں ملے حاصل کیا جائے" بھلا دی گئی۔ اس سے پانچ سو برس قبل مسلمانوں کے علم کے شوق کا یہ عالم تھا کہ وہ علم کی تلاش میں یونانی اور نصرانی چشموں سے فیض یاب ہونے کے لیے جندی شاپور (Jundi Shapur) اور حران (Harran) پہنچے تھے جہاں یونانی اور فارسی کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ انھوں نے بغداد، قاہرہ اور دوسرے شہروں میں اعلیٰ درجہ کی بین الاقوامی درس گاہیں بنوائیں جنھیں بیت الحکمۃ کہا جاتا تھا۔ انھوں نے بین الاقوامی شہرت کی تجربہ گاہیں بھی بنوائیں تھیں جنھیں شمسیہ کہا جاتا تھا اور جہاں ساری دنیا کے سائنس داں اکٹھا ہوتے تھے اور فیض اٹھاتے تھے۔ اب ان سب کی شروعات مغرب میں ہو چکی تھیں۔ طلیطلہ (Toledo) اور سالرنو (Salerno) کے اداروں میں اس زمانہ کی سائنس کی زبان عربی سے کیے گئے ترجمے اس کی بنیاد بنے۔ لیکن ہمارے ملکوں میں اس قسم کی کوئی تحریک باقی نہ رہی۔ ہم لوگ بالکل بے تعلق ہو گئے اور سب ہی جانتے ہیں کہ سائنس میں بے تعلقی کے معنی ہیں ذہنی موت۔

ابن خلدون کے زمانے سے یہ ذہنی علیحدگی اور علم سے بے تعلقی جاری ہے۔ یہ اس زمانہ میں بھی قائم رہی جب دنیائے اسلام میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ جیسے عثمانی ترکوں کی سلطنت، ایرانی صفوی حکمرانوں کی بادشاہت اور ہندوستان میں مغلوں کی حکومت۔ ایسا نہیں تھا کہ سلاطین اور شہنشاہ ان ترقیوں سے بے خبر ہوں اور یہ بھی ناممکن تھا کہ ان لوگوں کو وینس (Venice) اور جنیوا (Geneva) کے رہنے والوں کی اس ترقی کا علم نہ رہا ہو جو انھوں نے بندوق سازی میں کی تھی یا وہ پرتگالیوں کی اس مہارت سے ناواقف ہوں جو انھوں نے جہاز رانی اور جہاز سازی میں حاصل کی تھی اور جس کی وجہ سے ان کی حکومت سمندروں پر تھی، ان میں وہ سمندر بھی شامل تھے جو حج کے راستے میں پڑتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں یہ احساس بھی نہیں تھا کہ پرتگالیوں کی جہازرانی میں برتری محض اتفاقی بات نہیں بلکہ یہ نتیجہ اس سائنسی ترقی کا تھا جو بڑی جانفشانی سے حاصل کی گئی تھی اور جس کی ابتدا، جہازرانی کے اس تحقیقی ادارے سے ہوئی جسے شہزادہ ہنری نے ۱۴۱۹ء میں قائم کیا تھا۔ جب ہم نے یہ کوشش بھی کی کہ مختلف فنون میں مہارت حاصل ہو جائے، اس وقت بھی ہم فنون و علوم کے باہمی رشتے کو سمجھ نہ سکے۔ حتیٰ کہ ۱۷۹۹ء میں جب سلیم سوم نے ترکی میں جدید

تعلیم الجبرا، ٹرگنا میٹری، میکانکس، بیلسٹکس (BALLISTICS)
اور معدنیات میں اس وجہ سے شروع کر دی تھی کہ بندوق اور
توپ سازی میں وہ یورپ والوں سے پیچھے نہ رہ جائیں اور
اس تعلیم کے لیے سوئیڈن اور فرانس سے اساتذہ بھی بلائے
گئے۔ اس وقت بھی بنیادی سائنسی علوم کی اہمیت پر کوئی زور
نہ دیا گیا۔ نتیجۃً ترکی یورپ کی برابری کبھی نہ کر سکا۔ اس کے تیس
برس بعد مصر کے محمد علی نے اپنے آدمیوں کو کوئلہ اور سونے کے
ذخیروں کی تلاش کے لیے تربیت دلوائی لیکن نہ اُن کی اور نہ
اُن کے جانشینوں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ مصر میں علم طبقات
الارض کی بنیادی تعلیم بھی ضروری ہے اور آج بھی جب کہ
ہم سب یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ فنون میں مہارت کے بغیر
طاقت کا حصول ناممکن ہے۔ ہم یہ نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ ترقی
کا کوئی قریب کا راستہ نہیں ہے جب تک سائنس کی بنیادی تعلیم
ہماری معاشرت کا ایک لازمی جز نہیں بنے گی ہم سائنس کا
استعمال کرنے سے قاصر رہیں گے۔ یہ سمجھنے کے لیے کسی غیر معمولی
عقل کی ضرورت نہیں کہ جو لوگ بغیر بنیادی سائنس کے ہمیں
ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہیں وہ
ہمارے دوست اور بہی خواہ نہیں۔ اس بات کی مزید وضاحت
کے لیے میں لندن کے رسالہ "ایکنامسٹ" مورخہ ۲ ستمبر
۱۹۸۰ء سے ایک اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں جو شمسی توانائی
کے متعلق ہے:

"اگر شمسی توانائی کا حصول پٹرول کے عالمی بحران
کا واقعی جواب ہے تو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے
کہ یہ توانائی ان بڑے بڑے آئینوں سے حاصل
کر کے کام میں نہیں لائی جا سکتی جو مکانوں کی
چھتوں پر لگائے جا سکتے ہوں اور جن کی بنیاد
انیسویں صدی کی سائنس پر ہے۔ یہ مقصد
کوانٹم فزکس (QUANTUM PHYSICS)
بائیو کیمسٹری (BIO CHEMISTRY) اور

اسی طرح کے دوسرے جدید علوم پر عبور پا کر ہی
حاصل ہوگا۔ آج کل کی جدید صنعتیں صرف جدید
سائنس ہی کی بنیاد پر قائم رہ سکتی ہیں۔"

## عالم اسلام میں سائنس کے احیاء کے شرائط

یہ جاننے کے لیے اپنے سنہری دور آٹھویں، نویں، دسویں
گیارہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے سائنس کی تلاش و
ترقی میں اس قدر دلچسپی کیوں لی، ہمیں بہت دور جانے کی
ضرورت نہیں۔ مسلمان بس ان ہدایتوں پر عمل کر رہے تھے
جو انھیں قرآن اور ان کے نبیؐ نے بار بار دی تھی۔ دمشق یونیورسٹی
کے ڈاکٹر محمد اعجاز الخطیب کا خیال ہے کہ اس سے زیادہ اور
کسی ثبوت کی ضرورت نہیں کہ قرآن کریم میں صرف دو سو یا
آیتیں ایسی ہیں جو قوانین سے متعلق ہیں۔ اس کے مقابلے میں
ساڑھے سات سو آیتوں یعنی قرآن شریف کے تقریباً آٹھویں
حصے میں ایمان لانے والوں سے کہا گیا ہے کہ وہ غور کیا
کریں، اپنی عقل کا بہترین استعمال کریں اور سائنس کے چرچے
کو اپنی تہذیب کا لازمی حصہ بنا لیں۔

مجھے حاضرین کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے
پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان والے علماء کو (جن میں سائنس
کے ماہرین بھی شامل ہیں) نبیوں کا وارث قرار دیا ہے:

انما العلماء ورثۃ الانبیاء

[علماء انبیاء کے وارث ہیں]

اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ عربی زبان میں
سائنس کے لیے "علم" کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں۔

قرآن شریف میں عالموں یعنی سائنس اور دوسرے علوم
کے جاننے والوں کی برتری جتائی گئی ہے۔

قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین
لا یعلمون ۝

[آپؐ کہیے کہ کیا علم والے و جہل والے (کہیں)
برابر ہوتے ہیں] سورۃ الزمر/۹

قرآن کریم کی ان ہی ہدایتوں پر عمل کی بدولت اسلامی معاشرہ میں سائنس کا بول بالا رہا۔

سائنس کی حرمت کا ایک اہم پہلو وہ سرپرستی تھی جو اسے عرب و اسلامی ممالک کی دولت مشترکہ میں حاصل تھی۔ ایچ۔ اے۔ آر گب نے ایک جگہ عربی ادب کے بارے میں جو لکھا ہے۔ اگر تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ وہی بات اس زمانہ کی سائنس کے متعلق کہی جائے تو یوں کہی جائے گی۔

"دوسری جگہوں کے مقابلہ میں عالمِ اسلام میں سائنس کے پھولنے پھلنے کا انحصار زیادہ تر اس سرپرستی پر تھا جو اسے اربابِ حل و عقد سے حاصل ہوتی تھی۔ جہاں جہاں مسلمانوں کی معیشت زوال پذیر تھی وہاں سائنس کی حالت بھی ابتر تھی، لیکن جہاں کہیں بھی بادشاہوں اور وزیروں کو سائنس سے دلچسپی رہی جہاں بھی سائنس سے ان کے نفع، عیش اور عزت میں اضافہ کا امکان تھا وہاں یہ شمع جلتی رہی۔"

یہ صورتِ حال کم و بیش چودھویں صدی عیسوی تک برقرار رہی۔ اس کے بعد یہ سرپرستی ختم ہو گئی۔ صورتِ حال کی اس تبدیلی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مراد سوم کے حکم سے قسطنطنیہ کی مشہور رصدگاہ توپوں سے اڑا دی گئی اور اس اندوہناک واقعہ کا ذکر دربار کے شاعر علاؤالدین منصور نے ایک نظم میں اس انداز سے کیا گویا کہ یہ بہت خوشی کی بات تھی۔ رصدگاہ کو تباہ کرنے کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ چونکہ الغ بیگ کے علم الہیت کے جدولوں کی صحت کا کام مکمل ہو گیا جو اس رصدگاہ کے قایم کرنے کا مقصد تھا۔ اس لیے اب اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی اور اس کے بعد تو زوال کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو ختم ہی ہونے کو نہ آیا۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں دولتِ عثمانیہ میں برطانوی قونصل ولیم ایٹون (William Eton) لکھتا ہے۔

"اس ملک میں کسی کو بھی جہازرانی کا کوئی علم نہیں ہے اور نہ ہی کسی کو مقناطیس کا علم آتا ہے۔ سفر جو ذہنی نشوونما کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے اس کا دروازہ ان لوگوں کے مذہبی تعصب نے ان پر بند کر دیا ہے اور اس میں اس حسد کو بھی دخل ہے جو ان لوگوں سے ہو جاتا ہے جو بغیر کسی سرکاری کام کے غیر ملکیوں سے رابطہ قایم کرتے ہیں۔ اس لیے ایسا کوئی شخص نہیں ملتا جس کو عام سائنس کی واقفیت ہو۔ فنون اسلحہ سازی اور جہاز سازی سے متعلق لوگوں کے علاوہ سائنس سے رغبت رکھنے والوں کو لوگ تقریباً خبطی سمجھتے ہیں۔"

آخر میں وہ جس نتیجے پر پہنچتا ہے وہ آج بھی قابلِ غور ہے۔

"یہ صرف انھیں لوگوں سے تجارت کرتے ہیں جو مفید اور بیش قیمت چیزیں لائیں تاکہ خود انھیں ان چیزوں کے بنانے کی زحمت نہ گوارا کرنی پڑے۔"

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم تاریخ کے صفحات الٹ دیں اور پھر اس قابل ہو جائیں کہ سائنس کے میدان میں دنیا کی رہبری کر سکیں؟ میں بہت ادب سے عرض کروں گا کہ ہم ایسا یقیناً کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہمارا معاشرہ خصوصاً ہمارے نوجوان اس کا بیڑہ اٹھالیں ہمارا اپنا صدیوں کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے اور یہی تجربہ دوسروں کو بھی ہے کہ منزل تک پہنچنے کے لیے راستے کی دشواریاں جھیلنا ہی پڑیں گی۔ اس کے بغیر منزل تک کوئی نہیں پہنچتا۔ پس یہ ضروری ہے کہ نوجوانانِ قوم کے دلوں میں اس منزل کو پالینے کا ولولہ پیدا کیا جائے اور پوری قوم کو جوش و خروش سے اس کام کے لیے تیار کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر ہیں نصف سے بھی زیادہ آبادی کو سائنسی تربیت دینی پڑے گی اور پوری قومی پیداوار کا ایک یا دو فیصد حصہ بنیادی اور عملی سائنس تحقیقات اور اس کے فروغ پر خرچ کرنا ہوگا۔ اس رقم کا

کم سے کم دسواں حصہ سائنس کے بنیادی پہلوؤں کی تحقیق پر صرف کرنا پڑے گا۔ یہ سب جاپان میں میجی (Meiji) انقلاب کے وقت ہو چکا ہے جب کہ شہنشاہ نے قسم کھائی تھی کہ علم ہر قیمت پر اور ہر جگہ سے حاصل کیا جائے گا چاہے وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں کیوں نہ ہو۔ یہی سوویٹ یونین میں بھی ہوا جب آج سے ساٹھ برس قبل پیٹر اعظم کی قایم کردہ سوویٹ اکیڈمی آف سائنس سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے ممبروں کی تعداد بڑھائیں اور ان میں یہ حوصلہ پیدا کریں کہ ہر سائنسی میدان میں دوسروں پر سبقت لے جانا ہے۔ یہ اکیڈمی آج دس لاکھ ممبروں کی ایک خود مختار جماعت ہے، جس کے اراکین اس سے منسلک مختلف اداروں میں کام کرتے ہیں اور یہی عوامی جمہوریہ چین میں طے ہوا ہے کہ اس برق رفتاری سے ترقی کی جائے کہ دولتِ برطانیہ کو ہائی انرجی فزکس، خلائی سائنس، جینیٹکس (Genetics) مائیکرو الیکٹرانکس۔ (Micro - Electronics) ۔ اور تھرمونیوکلیر انرجی (Thermo - Nuclear Energy) کے میدانوں میں پیچھے چھوڑ دیں۔ اہلِ چین نے اس حقیقت کو بھی باور کر لیا ہے کہ ترقی کے لیے ہر قسم کی بنیادی سائنس ضروری ہے اور یہ کہ آج کی بنیادی سائنس کی سرحد کل کی عملی سائنس کے میدان کا حصہ ہو گی۔ انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ انھیں ہمیشہ بنیادی سائنس کی اگلی سرحدوں پر رہنا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اسلامی اور عرب قوموں کے مادّی وسائل چینیوں سے کہیں زیادہ ہیں اور انسانی وسائل بھی ان سے بہت کم نہیں ہیں۔ مزید چینی ہم سے سائنس کے میدان میں صرف چند دہائیاں ہی آگے ہیں۔ کیا ہم لوگ چین کے برابر پہنچنے کا منصوبہ بھی نہیں بنا سکتے؟

میں نے تھوڑی دیر پہلے سائنس کی سرپرستی کی ضرورت کا ذکر کیا تھا۔ اس مسئلہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سائنس دانوں کو اپنی ملازمت کے برقرار رہنے کی طرف سے اطمینان رہے اور انھیں اپنے مستقبل کی فکر نہ کرنا پڑے۔ آج ایک عرب یا پاکستانی سائنس داں یا ماہرِ فن کو یہ یقین ہے کہ برطانیہ اور امریکہ میں لوگ اسے ہمیشہ خوش آمدید کہیں گے بشرطیکہ اس کے پاس قابلیت اور مہارت ہو۔ یہ خیال رہے کہ ایسے عرب اور پاکستانی سائنس دانوں کی تعداد تیس ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ انھیں یقین ہے کہ ان ملکوں میں عزت ملے گی، مستقبل کی طرف سے بے فکری رہے گی اور دوسروں کے برابر کام کرنے اور ترقی کرنے کے مواقع ملیں گے۔ ہمیں اپنے آپ سے سوال کرنا چاہیے کہ کیا ہمارے ملکوں میں بھی یہی صورت ہے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ کیا ہم اپنے سائنس دانوں کے ساتھ زیادتی تو نہیں کرتے اور وہ بھی اس حد تک کہ ان کی ملازمت صرف اس بنیاد پر ختم کر دی جاتی ہے کہ ان کا تعلق ایک ایسے ملک سے ہے جس کی حکومت سے ہمارے اختلافات ہیں اور وہ بھی عارضی۔

میں نے اپنی تقریروں میں عرب اور دنیائے اسلام کی سائنس کی دولتِ مشترکہ کی بات بار بار کہی ہے اور یہ اس حالت میں جب کہ ان ممالک کی سیاسی دولتِ مشترکہ کا ابھی کوئی ذکر بھی نہیں۔ لیکن ایسی ہی ایک دولتِ مشترکہ عالمِ اسلام کی سائنس کے دورِ شباب میں بن چکی ہے۔ اس زمانہ میں وسطِ ایشیا کے جلیل القدر علماء جیسے ابن سینا اور البیرونی عربی زبان میں لکھتے تھے اور ان کے ہم عصر اور میرے علمی بھائی ابن الہیثم اپنے وطن بصرہ سے، جو بنو عباس کی مملکت میں تھا، نقل مکان کر کے بنو عباس کے حریف فاطمی خلیفہ الحکم کے دربار میں اس اطمینان کے ساتھ چلے جاتے تھے کہ وہاں ان کی تعظیم و تکریم ان کے مرتبے کے مطابق ہو گی۔ حالاں کہ ان دونوں حاکموں میں نہ صرف سیاسی اختلافات تھا بلکہ فرقہ وارانہ مخالفت بھی تھی جو اتنی شدید تھی جتنی کہ آج کل ہوتی ہے۔ اس سائنس دولتِ مشترکہ کی ضرورت کا احساس ہمیں اور ہماری حکومتوں کو ہونا چاہیے اور اس کی منصوبہ بندی کے لیے کافی غور و خوض

ضرورت ہے۔ آج کل دنیائے اسلام اور عرب ممالک میں سائنس دانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس حد تک کہ بین الاقوامی معیار پر سائنس دانوں کی جو تعداد ہمارے ملکوں میں ہونا چاہیے ہیں تو اس کا دسواں حصّہ ہے اور کہیں صرف ایک فیصد۔ پس ہیں آپس میں ایک ہونے کی ضرورت ہوگی۔ ہیں اپنے وسائل اکٹھا کرنے ہوں گے اور ایک جماعت کی طرح مل کر کام کرنا ہوگا اور اس کی ابتدائی الحقیقت ہو بھی چکی ہے۔ اس فطری اتحاد کے لیے کیا ہم یہ نہیں کر سکتے کہ آپس میں طے کر لیں کہ آئندہ کم از کم پچیس برس تک ہم اپنے سائنس دانوں کو ایک خاص حیثیت دیں گے۔ سائنس کی اس دولتِ مشترکہ یا امتہ العلم میں وہ اپنے آپ کو محفوظ پائیں گے۔ باوجود سیاسی اور فرقہ وارانہ اختلافات کے جو اُن ممالک میں موجود ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے ماضی میں سائنسی دولتِ مشترکہ میں ہوتا تھا۔

اور آخر میں عالمی سطح پر سائنس کے میدان میں ہمارا دوسروں سے بے تعلق رہنے کے رجحان کا سوال آتا ہے یہ بات حیرت انگیز ہے کہ سوائے مصر کے دنیائے اسلام اور سرزمین عرب کا کوئی دوسرا ملک پانچ سے زیادہ بین الاقوامی انجمنوں کا رکن نہیں ہے۔ مصر کا تعلق البتہ سولہ بین الاقوامی سائنسی انجمنوں سے ہے۔ سائنسی تحقیقات کا کوئی بین الاقوامی ادارہ ہمارے ملکوں کے اندر موجود نہیں ہے۔ ہمارے یہاں سائنس کے بین الاقوامی جلسے شاذ ہی ہوتے ہیں۔ ہم میں سے بہت کم لوگوں کو دوسرے ممالک کے اداروں میں جانے اور وہاں کی کانفرنسوں میں شریک ہونے کی سہولت میسر ہے۔ ایسے سفر کو عموماً فضول خرچی سمجھا جاتا ہے۔ گو پٹرول پیدا کرنے اور برآمد کرنے والے عرب ممالک میں حالت کچھ بہتر ہے۔ لیکن غیر عرب دنیائے اسلام میں حالت بہت ہی خراب ہے۔ یہی بے تعلقی اور سائنس کے تئیں بے اعتنائی تھی جس نے آج سے پچیس سال قبل مجھے اپنے وطن کو جہاں میں نے برسوں درس و تدریس کا کام بھی کیا تھا، چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

میرے سامنے بڑا سخت سوال تھا۔ یا تو میں فزکس سے متعلق رہ سکتا تھا یا پاکستان میں۔ بالآخر اپنے سینے میں ایک درد لیے اپنے وطن سے رخصت ہوا اور اس کے بعد میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ترئیسٹے (TRIESTE) میں موجود فزکس کے بین الاقوامی مرکز کے قیام کی تجویز رکھوں تاکہ مجھ جیسے دوسرے بحران اندوہناک حالات سے دوچار نہ ہوں۔ اس مرکز کا تعلق اقوام متحدہ کے دو اداروں یعنی یونیسکو (UNESCO) اور آئی۔ اے۔ ای۔ اے (I.A.E.A.) سے ہے جہاں ہر سال ایک سو مسلمان اور عرب ماہرینِ طبیعات کو مدد دی جاتی ہے لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس کا خرچ عرب اور عالمِ اسلام کے ممالک نہیں بلکہ اقوام متحدہ، اٹلی اور سویڈن اٹھاتے ہیں۔

اور یہ بے تعلقی ہمیں صرف ذاتی سطح پر ہی نہیں بھگتنا پڑتی بلکہ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سائنس کے بین الاقوامی طور طریقے بھی ہمارے لیے اجنبی ہیں۔ ہم جس طریقے سے اپنے سائنسی ادارے چلاتے ہیں وہ اس سے بالکل مختلف ہیں جس سے خود مختار ادارے مغرب میں چلائے جاتے ہیں یا جس طرح سے سوویت یونین کے سائنس دانوں کی جماعت کام کرتی ہے۔ ہمارے یہاں تربیت یافتہ لوگوں کے ادارے چلانے کا کوئی نظام نہیں اور نہ ہی کسی داخلی کمیٹی کا رواج ہے جو اپنے اداروں کی کارکردگی کا خود احتساب کرے اور نہ ایسا کوئی نظم ہے جس کے تحت کام کی قدر و قیمت کا غیر جانب داری سے اندازہ لگایا جا سکے۔ کوئی سائنسی وقف بھی ایسا نہیں ہے جس کا انتظام خود سائنس داں کریں اور نہ ہی غیر رسمی امداد کا کوئی سلسلہ ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دنیائے اسلام اور عرب ممالک میں سائنس کے احیاء کے لیے کم سے کم پانچ چیزوں کا ہونا لازمی ہے۔ جذباتی وابستگی، نیاضانہ امداد، مستقبل کی ضمانت انتظامی آزادی اور ہماری سائنسی کاوشوں کا بین الاقوامی تعلق۔

## ہمارے ملکوں میں ٹکنالوجی

اب میں ٹکنالوجی کے سوال پر آتا ہوں۔ کلام پاک میں تسخیر اور تفکیر پر برابر زور دیا گیا ہے۔ تسخیر سے مراد علم کے ذریعے کائنات پر قابو حاصل کرنا اور تفکیر سے مراد علم کی تحلیل ہے۔ قرآن شریف میں حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ کی مثالیں دی گئی ہیں کہ کس طرح انھیں اس زمانہ کی ٹکنالوجی پر عبور حاصل تھا۔ "اور ہم نے لوہے کو ان کے لیے نرم کر دیا۔۔۔۔ وَاَلَنَّا لَہُ الحدید ان اعمل سابغات (سورۃ سبا/۱۰-۱۱) اور "ہم نے ہوا کو ان کا تابعدار بنا دیا" اور "جنّات ان کے حکم میں تھے" اس کی تفسیر میری ناقص رائے میں یہ ہے کہ ان کے قبضے میں اس زمانے کی بھاری مشینری کے مخفی راز تھے۔ بڑی بڑی عمارتیں، محل، باندھ اور گودام تیار کیے جاتے تھے۔ اس کے بعد ہمیں ذوالقرنین یاد دلائے جاتے ہیں۔ جو لوہے اور تانبے سے اپنی پناہ گاہیں تیار کرتے تھے۔ اس طرح دھاتوں کی کاریگری بڑی عمارتوں کی تعمیر کی صلاحیت، ہوائی قوت کی تسخیر اور رسل و رسائل پر قابو پانے پر زور دیا گیا ہے اور ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن شریف میں روایتیں صرف اس لیے بیان کی گئی ہیں کہ ان کے ذریعہ سے پیغام عمل دیا جائے اور امت ان باتوں کی تقلید کرے اور انھیں اپنائے۔

تلک الامثال نضربہا للناس لعلہم یتفکرون۔ (سورۃ الحشر/۲۱)

[ہم لوگوں کو یہ مثالیں دیتے ہیں کہ شاید وہ غور کریں]

آخر ہمارے معاشرے میں وہ کون سی رکاوٹیں ہیں جو ٹکنالوجی اور فنی مہارت حاصل کرنے کی راہ میں حائل ہیں۔ غور طلب بات ہے کہ انسانی تاریخ میں اس سے پہلے صنعتی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے اتنی زبردست کوشش اور اتنا وافر سرمایہ اتنے کم وقت میں کبھی نہیں لگایا گیا جتنا دنیائے عرب نے پچھلے دس سال میں کیا ہے۔ ذعلن (Zannan) کا اندازہ ہے کہ ۱۹۷۵ء تک تقریباً چار سو بلین ڈالر کا سودا عرب ملکوں اور باہر کے ٹھیکیداروں کے درمیان ہوا۔ جن چیزوں کا سودا ہوا ہے، ان میں ہائیڈرو کاربن اور پیٹرو کیمیکلس (۱۲۰ بلین ڈالر) تعمیرات بشمول رسل و رسائل (۸۰ بلین ڈالر) اور لوہے و فولاد، دوائیں تیار کرنے اور کھاد بنانے کے کارخانے (۴۰ بلین ڈالر) قابل ذکر ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے ان منصوبوں کو اس طرح بروئے کار لایا گیا کہ کسی قسم کی فنی مہارت نہ ابھر سکی اور نہ عرب ماہرین فن اور انجینیروں کو نہ تو روزگار ہی کے مواقع ملے اور نہ تحقیق اور ترقی کے کاموں ہی سے انھیں منسلک کیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سارے منصوبے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بروئے کار لائے جا رہے ہیں۔ ذعلن کے تجزیہ کے مطابق ۱۹۷۶ء تک ۱۵۸۴ اسکیمیں مکمل ہوئیں جن کے خاکے ۸۳ بین الاقوامی فرموں نے تیار کیے تھے ان اسکیموں میں ۱۶ یوریا کے کارخانے تھے جن میں سے الجیریا کے حصّے میں ایک، مصر میں ایک، عراق میں دو، کویت میں چار، لیبیا میں ایک، قطر میں دو، سعودی عرب و سوڈان، شام و متحدہ عرب امارات میں ایک ایک لگائے گئے۔ کسی ایک عرب ملک یا عرب ممالک کے کسی گروپ میں بھی اتنی مہارت نہ تھی اور نہ ہی اب ہے کہ وہ ان اسکیموں کو بروئے کار لانے کا خاکہ خود تیار کرے یا انھیں عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنی خدمات پیش کر سکے اور نہ ہی کسی میں یہ صلاحیت ہے کہ ضرورت پڑنے پر ان کارخانوں میں مناسب تبدیلی کر سکے یا ان کو اور آگے بڑھا سکے۔

اس صورت حال کا موازنہ جاپان سے کیجیے جہاں کی آبادی تقریباً اتنی ہی ہے جتنی عرب ممالک کی اور جو پیٹرو کیمیکل میدان میں ابھی بیس برس قبل ہی آئے ہیں۔ شروع ہی سے جاپانیوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اس قسم کی مشینری برآمد کریں گے۔ چنانچہ گزشتہ بیس برسوں میں ہر تیسرا جاپانی کارخانہ ملک سے باہر فروخت کر دیا گیا۔ جاپانیوں کے پاس لوگ بھی تھے اور ارادے بھی۔ غیر عرب اسلامی ممالک کا حال بھی تقریباً یہی ہے فرق ہے تو صرف اتنا کہ جو سرمایہ وہاں لگایا گیا ہے وہ نسبتاً کم ہے اور جو پروجیکٹ عمل میں لائے گئے ہیں، ان کی

تعداد تھوڑی ہے۔

آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم میں مستقبل میں صنعتی اعتبار سے خود کفیل ہونے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب ہر جگہ ایک ہی ہے اور یہ کہ جن لوگوں کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہے وہ ماہرین فنیات نہیں ہیں۔ ہمارے ممالک اگر کسی کے لیے جنت کا نمونہ ہیں تو وہ منصوبہ کار اور انتظامیہ کے لوگ ہیں نہ کہ فن دانوں کے لیے۔ پاکستان میں منصوبہ بندی کمیشن میں سائنس اور ٹکنالوجی کا کوئی گوشہ تک نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ برطانوی دور کی یہ ذہنیت ابھی تک کارفرما ہے کہ ماہرین فن اپنے مخصوص میدان کے باہر کسی اور قسم کے فیصلے نہیں کر سکتے۔ ان کی نظر وسیع نہیں ہوتی اور انھیں انتظامی امور کی کوئی تربیت حاصل نہیں ہے غالبًا ہماری نظر اس پر نہیں جاتی کہ جاپان، چین، کوریا، سویڈن اور فرانس جو سب کے سب کامیاب، خود کفیل اور ترقی کی راہ پر گامزن ہیں، ایسے ممالک ہیں جہاں سائنس دانوں، ماہرین اور انتظامیہ کے لوگوں میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کی روایت بہت مضبوط ہے۔ کام کو اپنا سمجھ کر کرتے ہیں اور انھیں ایک دوسرے کی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ رہتا ہے۔

سوال صرف صنعت کاری اور سائنس پر منحصر ٹکنالوجی کا نہیں بلکہ یہ حالت دوسرے تمام ایسے شعبوں میں ہے جن کا انحصار سائنس پر ہے۔ مثلاً زراعت، صحت عامہ، بائیو ٹکنالوجی انرجی سسٹم اور دفاع۔ سب کا حال یکساں ہے مجھے آنجہانی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ایک تقریر یاد آتی ہے جو انھوں نے رائل سوسائٹی میں کی تھی۔ وہ اپنے ایسے تجربے بیان کر رہے تھے جو انھیں دوران جنگ میں مشہور سائنس دانوں سر سولی ذوکرمین (Sir Solly Zuckerman) اور بعد میں نوبل انعام پانے والے لارڈ بلیکٹ (Lord Blackett) کے ساتھ کام کرنے میں ہوئے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس پہلی میٹنگ کا قصہ سنایا جو ۱۹۳۹ء میں سائنس دانوں کے ساتھ ہوئی تھی اور جس میں انھوں نے ان جنگی مسائل کی فہرست پیش کی جو افواج کی نظر میں سائنس دانوں کو حل کرنے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ جب فہرست پڑھ کر سنائی گئی تو سر سولی ذوکرمین (Sir Solly Zuckerman) ہنسنے اور کہنے لگے "براہ کرم آپ ہمیں یہ نہ بتلایئے کہ آپ کی نظر میں کون سے مسائل حل طلب ہیں۔ آپ ہمیں اپنا ہمراز بنایئے اور یہ بتلایئے کہ آپ کرنا کیا چاہتے ہیں۔ پھر ہمیں اپنے طور پر یہ طے کرنے دیجیے کہ اس راہ میں کیا کیا رکاوٹیں ہیں اور کیسے کیسے مسائل درپیش ہیں۔ اس کے بعد آپ مل کر یہ کوشش کریں گے کہ ان مسائل کا ایسا حل تلاش کریں جس سے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائیں۔"

## دو درخواستیں

آپ پوچھیے گا کہ آخر میں علمی تخلیق کی اتنی پرجوش وکالت کیوں کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم حاصل کرنے کی خواہش عطا فرمائی ہے اور نہ محض یہ کہ آج کی دنیا میں علم کے معنیٰ ہیں طاقت اور سائنس کی عمل داری جو بہت بڑی ضمانت ہے مادی ترقی کی۔ ایک بہت بڑی وجہ تو حقارت کے ان کوڑوں کی چوٹ ہے جو ارباب دانش کی طرف سے اکثر وبیشتر ہم پر لگائے جاتے ہیں۔ مگر ان کوڑوں میں آواز نہیں ہوتی لیکن ان سے لگی چوٹ بڑی جان لیوا ہوتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ آج سے کئی سال پہلے نوبل انعام یافتہ ایک ماہر طبیعیات نے مجھ سے پوچھا تھا: "سلام! کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ ہم پر ان قوموں کو زندہ رکھنے اور امداد دینے کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے جنھوں نے انسانی علم میں ایک نقطہ کا بھی اضافہ نہ کیا ہو۔" اور اگر اس نے یہ نہ بھی کہا ہوتا تب بھی میری عزت نفس کو اس وقت دھکا لگتا ہے جب میں کسی اسپتال میں جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ جان بچانے کے لیے کوئی بھی دوا چاہے وہ پنسلین ہو یا کوئی اور ایسی نہیں جس کی دریافت میں ہم تیسری دنیا والوں یا سرزمین عرب یا دنیائے اسلام کے باشندوں

کا کوئی حصّہ ہو ۔

میں اس تقریر کو ختم کرنے سے پہلے دو گزارشیں چاہتا ہوں ـــــ ایک تو اپنے ساتھی سائنس دانوں سے چاہے وہ اپنے ملک میں رہتے ہوں، چاہے باہر۔ دوسرے اپنے حکمرانوں اربابِ حل وعقد سے ۔ پہلی گزارش اپنے بھائی سائنس دانوں سے ہے ۔ ہمارے حقوق بھی ہیں اور ذمّہ داریاں بھی ۔ گو تعداد میں ہم کم ہیں اور ہماری برادری ہر جگہ چھوٹی ہی سی ہے لیکن اگر ہم ایک امۃ العلم کے دھاگے میں پروا لئیں تو کافی ہیں ۔ اس نئی اسلامی دولت مشترکہ کا قیام اور اس میں سائنس کے احیاء کا دارومدار ہم ہی پر ہے ۔ تعداد میں کمی کی وجہ سے پستی نہ آنا چاہیے ۔ کیونکہ صلاحیت کی کمی نہیں ہے ۔ میں آپ سے وہی کہتا ہوں جو جمال عبدالناصر نے کہا تھا:

"ارفع راسك يا اخي

[اے میرے بھائی! اپنے سر کو بلند کر ]

جب میں ۱۹۴۶ء میں کیمبرج میں داخل ہوا تھا تو عمر میں اپنے ہم عصر برطانوی طلباء سے بڑا تھا اور مجھے سائنس بھی ان سے زیادہ آتی تھی لیکن ان میں ایک غرور تھا جس کی تہہ میں یہ بات چھپی تھی کہ ان کا تعلق نیوٹن، میکس وِل، ڈارون اور ڈراک کی قوم سے تھا ۔ آپ بھی یاد رکھیے کہ آپ کے یہاں بھی ابن الہیثم، ابن سینا اور البیرونی گزرے ہیں ۔ دلوں میں یہ یقین پیدا کیجیے کہ آپ کو بھی بنیادی اور عملی سائنس کے میدانوں میں سہولتیں مہیا کی جائیں گی ۔ امید رکھیے کہ عملی سائنس میں آپ کی تحقیقات بروئے کار لائی جائیں گی ۔ یہ بھی بھروسہ رکھیے کہ آپ کو اپنے میدان میں کام کرنے کی آزادی ہوگی اور اپنے معاشرے کی منصوبہ بندی میں آپ بھی ہوں گے ۔ جو لوگ پردیس میں ہیں وہ جان لیں کہ انھیں سائنس کی اس نشاۃ ثانیہ میں اپنا رول ادا کرنا ہے ۔ آپ اولوالعزمی کے ساتھ اپنے اداروں کی ترقی کے منصوبے بنائیے اور عالم اسلام کی سائنسی دولت مشترکہ کے پروگراموں کے خاکے تیار کیجیے ۔ میری اپنی دلچسپی کے مضمون طبیعات کو ہی لیجیے ۔ اگر چین جس کی کل آمدنی ہمارے ملکوں کی آدھی ہے اور جسے سائنس میں ہم سے صرف چند دہائیوں کی سبقت ہے، یہ ارادہ کر سکتا ہے کہ جاپان سے پہلے دنیا کا چوتھا بڑا ہائی انرجی ایکسی لریٹر ـ (HIGH-ENERGY-ACCE-LERATOR) ـ بنا کر امریکہ، روس و متحدہ یورپ کی لیگ میں شامل ہو جائے، اگر وہ اس بات کا تہیہ کر سکتا ہے کہ وہ عالمی ٹوکامک فیوژن ریکٹر پروجیکٹ انٹور ـ (TOKAMAK FUSION RE-ACTOR PROJECT INTOR) ـ میں شامل ہو کر ۱۵ برس میں فیوژن پاور ڈیڑھ بلین ڈالر کی لاگت سے پیدا کر سکے، اگر چینی سائنس داں ثقلی لہروں کو ناپنے کا سب سے حساس آلہ بنا سکتے ہیں جیسا کہ انھوں نے ۱۹۷۸ء میں صرف ان مضامین کی مدد سے کیا جو فزیکل ریویو (PHYSICAL REVIEW) میں چھپے تھے ۔ اگر ہندوستان جس کی قومی آمدنی عرب ممالک سے بہت کم ہے، ریڈیو ٹیلی سکوپ بنانے کا منصوبہ بنا سکتا ہے اور اگر وہ پروٹان کے ٹوٹنے کا گہرا زمین دوز تجربہ کر سکتا ہے (ایسا تجربہ جس کی مجھے ذاتی طور پر بڑی خوشی ہے اگر وہ لوگ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مجوزہ دولت مشترکہ میں فزکس اور فزکس پر منحصر ٹکنالوجی کے اعلیٰ منصوبے بروئے کار لائے جا سکیں ۔ میری نظر میں کوئی وجہ نہیں کہ ہم دنیائے اسلام میں اپنے ہی مضمون ریاضی میں دنیا کا سب سے زیادہ قابل احترام ادارہ نہ قایم کر سکیں ۔ اگر ہمارے پاس آدمیوں کی کمی ہے تو ہمیں چاہیے کہ یہ ادارہ اپنے یہاں قایم کر کے اس کے دروازے بین الاقوامی تعاون کے لیے کھول دیں ۔ اس میں ہمارا ہی فائدہ ہوگا اور اس طرح ہم وہ قرض بھی تھوڑا سا چکا سکیں گے جو بین الاقوامی سائنس کا ہم پر ہے ۔ اسی کے ساتھ میرا یہ بھی جی چاہتا ہے کہ ہمارے ملک فیوژن انٹور (INTOR) اور آئی ۔ سی ۔ ایس ۔ یو (I.C.S.U) کے بین الاقوامی ارض نگہبان (EARTH WATCH) پروجیکٹ جیسی انجمنوں کا باقاعدہ یا رفیق ممبر بن جائیں ۔ اگر یونان جس کی قومی آمدنی عرب ممالک

ی آمدنی کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے اور جس کے پاس ماہرین طبیعات بھی بہت کم ہیں، یہ ہمت کرسکتا ہے کہ وہ جنیوا کی یورپین آرگنائزیشن فار نیوکلیر ریسرچ کا باقاعدہ ممبر بن جائے تاکہ وہ اس نصف بلین ڈالر قیمتی ایکسی لیریٹر (Accelerator) کے پروجیکٹ میں شامل ہو سکے جو تجربہ گاہ میں بھاری فوٹان (Photon) کو پیدا کرنے کے لیے ہے جس کی پیشین گوئی ہمارے نظریہ سے ہوتی ہے تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہمارے حوصلے کم کیوں ہوں؟ عزائم بلند ہوں۔ مقصد سے جذباتی وابستگی ہو تو قابلیت بھی پیدا ہو گی۔ کیوں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ان تمام لوگوں سے ہے جو کوشش کرتے ہیں۔

اِنی لا اضیع عمل عاملٍ منکم

[میں کسی شخص کے کام کو جو کہ تم میں سے کام کرنے والا ہو اکارت نہیں کرتا] (سورہ آل عمران ۱۹۵)

اب میرا خطاب ان لوگوں سے ہے جو ہمارے معاملات کے ذمہ دار ہیں۔ سائنس اس لیے اہم ہے کہ اس سے ہم اپنے گرد وپیش کی دنیا کو سمجھ سکتے ہیں اور اس سے اللہ کے رموز ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے ذریعے ہم مادّی فائدے بھی حاصل کر سکتے ہیں اور اس لیے بھی کہ اس کی ہمہ گیری واسطہ بنتی ہے تمام انسانوں میں تعاون کا۔ خصوصاً عرب دنیا اور دنیائے اسلام کے ممالک میں تعاون کا۔ ہم بین الاقوامی سائنس کے قرض دار ہیں اور ہماری عزتِ نفس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ ادھار چکا دیں۔ لیکن سائنس کے میدان میں آپ کی سرپرستی کے بغیر ترقی ممکن نہیں ہے۔ وہ سرپرستی جو ماضی میں دنیائے اسلام میں حاصل تھی۔ بین الاقوامی دستور کے مطابق اگر قومی آمدنی کا ایک یا دو فیصد حصہ اس مد میں خرچ کیا جائے تو دو سے چار بلین ڈالر سالانہ صرف عرب ممالک سے اور اسی قدر بقیہ دنیائے اسلام سے سائنسی تحقیق اور ترقی کے کاموں کے لیے مہیا ہو سکتا ہے۔ اس رقم کا دس فیصد محض بنیادی سائنس پر خرچ ہونا چاہیے ہمارے ملکوں میں سائنسی اوقاف کی ضرورت ہے جس کا انتظام خود سائنس دانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اعلیٰ تحقیق کے بین الاقوامی ادارے ہماری یونیورسٹیوں میں اور ان کے باہر بھی قائم ہونے چاہیں۔ جہاں سارے سائنس دانوں کو روزگار کی ضمانت، فیاضانہ امداد، کام کے تسلسل کی ضمانت، سب کچھ میسر ہوں، تاکہ مستقبل کا گبن (Gibbon) یہ نہ کہہ سکے کہ پندرھویں صدی ہجری میں سائنس داں تو بہت تھے لیکن ایسے امرا، نہیں تھے جو دل کھول کر ان کی سرپرستی کر سکیں۔

ربنا وآتنا ما وعدتنا علیٰ
رُسلِکَ ولا تخزنا یوم القیامہ
انکَ لا تخلف المیعاد

[اے ہمارے پروردگار ہم کو وہ چیز بھی دیجیے جس کا ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت آپ نے وعدہ فرمایا ہے اور ہم کو قیامت کے روز رسوا نہ کیجیے۔ یقیناً آپ وعدہ خلافی نہیں کرتے]

(سورہ آل عمران ۱۹۴)

[پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۸۳ء]

# سائنس اور ہم

اسرار احمد

بات تلخ ہے لیکن سچ - ہم مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بہ مقابلہ دوسری قوموں کے کافی پیچھے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس میدان میں ہمارا دور دور تک پتہ نہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جسے ثابت کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کی ضرورت نہیں۔ سائنس کے موقر جریدے میں لکھنے والوں کی فہرست یا کسی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکاء کی لسٹ پر ایک نگاہ ڈال لینا کافی ہوگا۔ سو میں اگر ایک دو مسلمانوں کا نام نظر آجائے تو شکر کا مقام جانیے۔

یہ المیہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کا نہیں بلکہ سارے عالم اسلام کا ہے۔ اس پہ ستم یہ کہ ہمیں اپنی اس کم مائگی کا احساس تک نہیں۔ سائنس میں تحقیق اور تخلیق کرنے کی بات تو ذرا اونچی ہے۔ ہم تو اس بات کے بھی روادار نہیں کہ دوسروں کی تحقیقات کو سمجھیں اور انھیں اپنی زبان میں منتقل کریں۔

کیا ہمیشہ سے ہمارا یہ حال رہا ہے؟ نہیں۔ ایک زمانہ گزرا ہے جب سائنس کے میدان میں صرف ہم تھے۔ کسی دوسرے کا دور دور تک پتہ بھی نہ تھا اور سائنس ہی کیا علم کی ایسی کوئی بھی شاخ نہ تھی جس کی زندگی ہماری مرہون منت نہ رہی ہو۔ ہم سن ۷۵۰ء تا سن ۱۱۰۰ء یعنی مسلسل ساڑھے تین سو سال تک بلا شرکت غیرے دنیائے علم کے امام رہے۔ یہ زمانہ جابر، خوارزمی رازی، مسعودی، ابوالوفا، البیرونی اور ابن ہیثم کا ہے۔ آج دنیا جسے فرما FERMATE اصول اور نیوٹن کے قوانین حرکت کے پہلے اصول کے نام سے جانتی ہے وہ فی الحقیقت ابن ہیثم کی ایجاد ہیں۔ ابن ہیثم کتنا عظیم تھا کہ اس نے فرما اور نیوٹن سے پانچ سو سال قبل یہ قوانین دیے۔

گو سن ۱۱۰۰ء کے بعد دیگر اقوام نے بھی سائنس کے میدان میں قدم رکھنا شروع کر دیا تھا لیکن سن ۱۳۵۰ء تک امامت ہمارے ہی ہاتھ رہی۔ اس کے بعد سے جو ہم نے اس میدان کو چھوڑنا شروع کیا تو سولہویں صدی تک آتے آتے ہمارا نام و نشان بھی باقی نہ بچا۔ پچھلے لگ بھگ چار سو سال سے امامت کا منصب حاصل کرنے کی بات تو دور کی ہے، ہم نے سنجیدگی سے مقتدی بھی بننے کی کوشش نہ کی۔

ایسا کیوں ہوا؟ یہ ایک تحقیق طلب بات ہے۔ وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس درگت میں ہمارا اپنا ہاتھ زیادہ ہے۔ ہم بڑی طرح جمود کا شکار ہو گئے۔ توہم و روایت پرستی ہمارا شیوہ بن گئی۔ ہم تن آسان ہو گئے جس نے اندھی تقلید کو پروان چڑھایا۔ اسلاف کے کارناموں کو آگے بڑھانے کے بجائے ہم نے ان پر فخر کرنے کو کافی سمجھا۔ ہم تکبر کا شکار ہو گئے۔ ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ جو علم ہمیں اسلاف سے ملا ہے وہی سب کچھ ہے۔ ہم نے علم کے تصور کو محدود کر دیا۔ صرف دین کی جانکاری کو علم سمجھا

مختصراً ہم نے اپنے آپ کو ایک خول میں بند کر لیا۔ وہ ملت جسے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ علم حاصل کرو چاہے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے اس نے یہ جاننے کی بھی زحمت نہ گوارا کی کہ دوسری قومیں کیا کر رہی ہیں۔ وہ ملت جس کے پاس قرآن جیسی کتاب ہو جس میں بار بار غور و فکر و تسخیر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس نے پچھلے چار سو سال میں اسلامیات اور ادبیات کے علاوہ شاید ہی کسی اور علمی میدان میں کوئی گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہو۔ خود اسلامیات میں چند ایک کو چھوڑ کر بیشتر نے اسلاف کے کارناموں کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے یا اُن پر حاشیہ آرائی کرنے کو ہی اعلیٰ درجے کا علمی کارنامہ سمجھا۔ ادبیات میں بھی ہمارا حال ایسا ہی کچھ رہا ہے۔ مستثنیات ضرور ہیں مگر اس میدان کی بھی بڑی اکثریت نے یا تو رگِ گل سے بلبل کے پر کو باندھا ہے یا "حیات اور کارنامے" لکھے ہیں۔

دراصل ہماری بیشتر ذہنی توانائی خرافات کی نذر ہو گئی۔ الفاظ کے کھیل کو ہم نے علمی کارنامے کا درجہ دیا۔ غور و فکر ہم نے کیا ضرور مگر پیغامِ محمدؐ پر نہیں بلکہ لفظ محمدؐ پر۔ مناظرہ بازی اور ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے کو ہم نے علمی بحث کا مقام دیا۔ ہم گروہوں میں بٹ گئے اور مخالف گروہوں کی تحریروں کو نت نئی تعبیر دینے کو ہم نے تحقیق کہا۔ ایسا نہیں کہ قدرت نے ہم کو ذہنی صلاحیتوں سے محروم کر رکھا ہو۔ ہماری ذہنی صلاحیتیں کسی طور بھی دیگر اقوام کے مقابلے میں کم نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم ان صلاحیتوں کو بیشتر ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور ایک دوسرے کو کافر، مرتد، زندیق اور دہریہ ثابت کرنے میں صرف کر رہے ہیں۔ ہر گروہ اپنے کو بہتر اور دوسرے کو کمتر درجے کا مسلمان ثابت کرنے کو عین علمی کارنامہ سمجھ رہا ہے۔ ہم ایک ایسی بھنور میں پھنس گئے ہیں جس میں سے نکلنے کے لیے زبردست کوشش کی ضرورت ہے۔ ماضی میں اس سلسلے میں کئی کوششیں ہوئیں بھی مگر وہ پرانی شراب کو نئی بوتل میں انڈیلنے کے مصداق تھیں۔ اس سے ہم میں اور گروہ پیدا ہو گئے اور ہم اس گرداب سے نکلنے کے بجائے اس میں اور تیزی سے گردش کرنے لگے۔

بغور دیکھیے تو ہماری مذہبیت بھی عجیب قسم کی ہے ایک طرف ہماری اکثریت دنیاوی تگ و دو کو مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں سمجھتی اور وہ چند مسلمان جو اپنے کام، روزگار یا پروفیشن کو بخوبی کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان پر دنیا پلیٹ لینے کا الزام رکھتی ہے۔ دوسری طرف یہی اکثریت ہر اس دنیاوی آلائشات سے مستفید ہونے میں فخر محسوس کرتی ہے جو بغیر محنت یا تھوڑی بہت محنت کرکے حاصل ہو سکے۔ دراصل یہ ہماری محنت، جانفشانی اور عرق ریزی سے فراریت ہے جو ہمیں مذہب کے غلط تصور کی آڑ لینے اور دین و دنیا کی تفریق کرنے پر مجبور کیے ہوئے ہے۔ سائنسی دور کی وہ کون سی ایجاد ہے جس سے ہم مستفید نہیں ہوتے یا اگر وہ ہماری دسترس سے باہر ہوں تو ہم ان سے استفادہ کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔ لیکن کیا کبھی ہم نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ ان ایجادات کے پیچھے جو عرق ریزی ہے اس میں ہمارا اپنا کتنا ہاتھ ہے۔ یہ ایجادات جدید طب سے متعلق ہوں یا انجینئرنگ سے، طبیعیات سے متعلق ہوں یا علم کیمیا سے کہیں بھی تو ہمارا ہاتھ نظر نہیں آتا۔ ایک حساس اور غیور قوم کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ وہ دوسروں کی عرق ریزی سے فیض یاب تو ہو مگر اس میں شریک ہونے کی کوشش نہ کرے۔ دوسرے ہماری تن آسانی اور بے حسی کا مذاق کس طرح اڑاتے ہیں، اس کا اندازہ اس چٹکلے سے کیجیے جسے میں نے چند سال پہلے فرانس کے ایک ریستوران میں سنا تھا۔

"کسی خیالی بازار میں ایک صاحب انسان کا دماغ خریدنے گئے۔ دوکان پر ہر ملک و مذہب کے دماغ رکھے ہوئے تھے۔ دریافت کرنے پر دوکان دار نے انھیں بتایا کہ ایک یہودی دماغ کی قیمت ایک فرانک، عیسائی دماغ کی

چار فرانک اور مسلمان دماغ کی ۱۶ فرانک ہے۔
فریدار حیرت سے بولا۔ عجیب بات ہے۔ یہودی جو اس وقت دنیا میں اپنی ذہانت کے لیے مشہور ہیں، ان کا دماغ سب سے سستا اور مسلمانوں کا اتنا مہنگا۔ دوکاندار نے جواب دیا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، مسلمانوں نے الجبرا کی ایجاد کے بعد سے اپنے دماغ کو خرچ ہی کب کیا ہے ان کے دماغ کا سارا مغز محفوظ ہے۔"
ضرب کاری ہے لیکن حقیقت سے قریب۔

ملّی غیرت اور حمیت کی بات ذرا اونچی ہے خالص کاروباری نقطۂ نگاہ سے دیکھیے۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں ہمارے دیوالیے پن نے ہمارا کیا حال کر رکھا ہے۔ ہماری زمینیں مختلف النوع معدنیات کے ذخائر سے بھری پڑی ہیں مگر ہمارے پاس وہ ٹیکنالوجی نہیں جس سے انھیں تلاش کر سکیں اور نکال کر استعمال میں لائیں مجبوراً ہمیں ان ممالک کا سہارا لینا پڑتا ہے جو کسی طرح بھی ہمارے بہی خواہ نہیں۔ وہ اپنی من مانی شرائط پر ہمیں لوٹتے ہیں اور ہمارے پاس جان بوجھ کر لٹ جانے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں۔ ہمارے پاس زراعتی زمینوں کی کثرت ہے مگر وہ جدید وسائل نہیں جن کو بروئے کار لا کر ان زمینوں کی پیداوار کو کئی گنا بڑھایا جا سکے۔ اس کے لیے بھی ہمیں انھیں ممالک کا منہ تکنا پڑتا ہے۔ ہمارے پاس آدمیوں کی طاقت (MAN POWER) ہے مگر وہ انڈسٹری نہیں جہاں اُن کی کھپت کر سکیں۔ لاچار وہ دوسروں کی صنعتوں کے کل پرزے بنتے ہیں۔ یورپ کے بڑے شہروں سے گزریے۔ یہ دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ ریستوراں میں بیراگیری سے لے کر کوڑا کرکٹ پھینکنے جیسا چھوٹا کام کرنے والوں میں اکثریت محمدؐ کے نام لیواؤں کی ہے۔ ترکی، یوگوسلاویہ، مراکش، الجیریا، انڈونیشیا، پاکستان، ہندوستان وغیرہ جیسے ممالک کے مسلمانوں سے ارزاں لیبر (LABOUR) مغربی ممالک کو کہاں ملے گا۔ یقین نہیں آتا یہ اس ملت کے فرزندوں کی حالت ہے جن سے کبھی یورپ کی مائیں اپنے بچوں کو ڈرایا کرتی تھیں۔

سائنسی علوم کی ناپیدگی نے ہم کو دنیا کی سب سے زیادہ جذباتی اور روایت پرست قوم بنا دیا ہے۔ سائنس وقوعات پر ٹھنڈے دماغ سے مختلف پہلوؤں سے غور کرنے کی تربیت دیتی ہے اور ظاہر و باطن کشید کر لینے کی ٹریننگ بھی۔ یہ حالات کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کرنا سکھاتی ہے اور تجربات و مشاہدات پر مبنی قوت استدلال پیدا کرتی ہے۔ سائنس سنت ابراہیمی ہے جو پتھر کے بت کے جمود اور چاند و سورج کے عروج و زوال کی راہ سے حق تک پہنچاتی ہے۔ یہ روایتوں پر سختی سے عمل بھی کرتی ہے اور جب تجربات ان کے فرسودہ ہونے کا حتمی ثبوت فراہم کر دیں تو اُن کو توڑنے میں دریغ بھی نہیں کرتی۔ یہ اپنے اکابرین سے گہری عقیدت بھی رکھتی ہے اور وقت پر کھل کر ان کی تنقید بھی کرتی ہے۔ یہاں کوئی بات حق ہے اس لیے نہیں کہ اسے نیوٹن، آئن اسٹائن یا عبدالسلام جیسے عظیم سائنس دانوں نے کہا ہے بلکہ اس لیے کہ تجربات، مشاہدات اور تجزیے اس کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ یہاں اندھی تقلید، شخصیت پرستی، نری روایت پرستی اور کج بحثی کا کوئی دخل نہیں۔ یہ کھلے ہوئے اذہان اور روشن دماغوں کا کوچہ ہے۔ یہ وہ بستی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ اور آنحضرتؐ کی عقل و دانش کو بروئے کار لانے اور بے جا آبا پرستی، گروہی عصبیتوں، فرسودہ روایتوں اور اندھی عقیدتوں کو توڑنے کی سنتوں پر عمل ہوتا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ وہ ملت جو ان پیغمبروں پر رات دن میں پانچ بار درود بھیجتی ہے، اس نے پچھلی چار صدیوں

سے اس بستی میں قدم بھی نہیں رکھا۔

سائنس کی تربیت کی کمی نے ہم کو کس حد تک جذباتی بنا دیا ہے، اس کا مشاہدہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔ کسی نے نعرہ تکبیر بلند کر دیا۔ اللہ اکبر کہہ کر اس کے پیچھے ہو لیے۔ یہ جاننے تک کی زحمت گوارا نہ کی کہ نعرہ بلند کرنے والا مسلمان بھی ہے یا نہیں یا کل تک وہ قبلہ رُخ بھی ہوا تھا یا مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا کوئی کارنامہ اس کے اعمال میں ہے اس اندھی جذباتیت کے ہاتھوں ماضی میں ہم نے کافی نقصان اُٹھایا ہے اور آج تک اُٹھاتے چلے آ رہے ہیں اپنی قوم کے شاطر اور دوسری قوموں کے سرپسند ہماری اس کمزوری سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ جب اور جس وقت چاہتے ہیں ہماری اس جذباتیت سے فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔

یقین کیجیے اوپر جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے خود میرا اپنا دل ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ لکھتے ہوئے قلم رک رک گیا ہے۔ اپنی خامیوں کو اجاگر کر کے کون خوش ہو سکتا اپنے زخموں کو کریدنے میں کسے مزا آئے گا لیکن کیا کیجیے جب چہرہ داغ دار ہو جائے تو آئینہ سامنے ہی رکھنا پڑتا ہے۔ سائنس کے تئیں ہماری جاہلیت کی جڑیں کافی دور تک گئی ہیں۔ ہمارا مرض پرانا بھی ہے اور شدید بھی۔

جہاں سنجیدگی سے ان عوامل کو ڈھونڈھ نکالنے کی ضرورت ہے جس سے ہم اس مرض کے شکار ہوے وہیں اس فوری توجہ کی بھی ضرورت ہے جس سے مرض کی شدت پر قابو پایا جا سکے اور اس میں کمی کی جا سکے۔ سائنس دانوں کی فہرست میں چند ایک مسلم ناموں کو دیکھ کر ہمیں اس غلط فہمی کا شکار نہ ہونا چاہیے کہ ہم اس میدان میں اتر چکے ہیں اور بہت جلد دیگر اقوام کے ہم پلہ ہو جائیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وسیع میدان میں ابھی ہماری حیثیت ایک نقطے سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ ہمارے اور دیگر اقوام کے درمیان ویسے ہی کافی فاصلہ ہے۔ مزید وہ اس میدان میں تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ پہلے ہمیں ان فاصلوں کو طے کرنا ہے اور پھر کم سے کم ان کے برابر آنا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم ان سے بہت زیادہ تیزی سے آگے بڑھیں یہ چند 'دیوانوں' کے بس کی بات نہیں بلکہ اس طرف پوری ملت اسلامیہ کی توجہ کی ضرورت ہے۔

اب یہ ملت اسلامیہ کے اکابرین، دانشوروں اور رہنماؤں کے طے کرنے کا مسئلہ ہے کہ کیا وہ تن من دھن سے اس اہم فریضے کو انجام دینے کے لیے تیار ہیں یا وہ ہمیشہ کے لیے علم و دانش کی امانت کے منصب سے دست بردار ہو چکے ہیں۔

(پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ یکم اگست ۸۴ء)

"سر سید کے اندر بڑی صلاحیتیں تھیں لیکن اس سے زیادہ ان کا اعلیٰ اخلاق تھا۔ مجھے پورے انگلستان اور ہندوستان میں کوئی شخص ایسا نہیں ملا جس نے میرے اندر اپنے لیے اتنا جذبۂ پسندیدگی اور عزت پیدا کیا ہو۔"

تھیوڈر بک

# ہماری آنکھیں

حمیدہ سعید الظفر

آنکھیں انسان کے لیے بڑی نعمت ہیں اور خوب صورتی بھی
ن کی صحت اور چمک سے وابستہ ہے۔ جب کسی شخص کی طبیعت
ذرا بھی گری گری ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس کی آنکھوں میں
تھکاوٹ اور پلکوں میں بھاری پن دکھائی دیتا ہے جس کو
دیکھ کر لوگ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ آج اُن کی طبیعت کچھ ناساز
ہے۔ تو یہ تو رہی ایک عام سی بات۔

ہاں تو آپ کیا پوچھ رہے تھے؟

سوال: کسی نے کہا کہ "آنکھ انسان کے دماغ کی کھڑکی ہے" کیوں جناب یہ کیسی بات کہہ دی انھوں نے کیا دماغ کی بھی کوئی کھڑکی ہو سکتی ہے؟

جواب: اس کہاوت کا مطلب یہ ہے کہ آنکھ کی بناوٹ اور دماغ کی بناوٹ کا بہت نزدیکی رشتہ ہے۔ اسی لیے جب ہم کسی چیز کی طرف دیکھتے ہیں تو اُس کی تصویر یا عکس [Image] آنکھ کے پردے (Retina) پر بن جاتی ہے۔ یہ تصویر الٹی (Inv-erted) ہوتی ہے۔ اس طرح دونوں آنکھوں کے پردوں پر ایک ایک تصویر بنتی ہے جو کہ دماغ تک ایک خاص نس (Optic Nerve) کے ذریعہ سے پہنچتی ہے۔ دماغ ان دونوں تصویروں کو ایک کر دیتا ہے (Fuses the Images) اور پوری تصویر کو سیدھا بھی کر دیتا ہے۔ (Interprets The Image as right-way-up)

سوال: یہ تو بہت ہی کمال کی بات ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟

جواب: اس کے بارے میں ابھی تحقیقات چل رہی ہے۔ مگر جب اس طریقے سے سامنے کے نظارے آنکھوں کے راستے سے دماغ کو دکھائی دیتے ہیں تو آنکھیں کھڑکی نہیں ہوئیں تو کیا ہوئیں۔ اب ایک دوسرے طریقے کی کھڑکی بھی ملاحظہ فرمائیے! ہم ڈاکٹر آپ کی آنکھ میں دوا ڈال کر اور پتلی (Puppet) پھیلا کر اپنے آلوں Opthalmo-Scope سے آپ کی آنکھ میں تیز روشنی ڈالتے ہیں۔ تو آپ کو یہ چکا چوند ناگوار معلوم ہوتی ہے مگر ہم آپ کی آنکھ کے پردوں کی تصویر (Fundus Picture) دیکھ کر خوش یا پریشان نظر آتے ہیں۔

سوال: اس "کھڑکی" کا تصور کیسے ہوتا ہے؟

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ دماغ کی نسوں اور رگوں میں جو بھی خرابی ہوتی ہے وہ سب سے پہلے آنکھوں کے پردوں پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آنکھ کے پردے کو دیکھ کر ڈاکٹر کو کئی قسم کے جسمانی مرض کا پتہ بھی چل جاتا ہے مثلاً خون کے دوران گردوں کی خرابی اور دیگر کئی امراض کا راز جلد از جلد کھل جاتا ہے۔

سوال: اچھا یہ تو مان لیا کہ آنکھ کئی طریقے سے دماغ

کی کمزوری ہے۔ مگر اب آنکھوں کے بارے میں اور کچھ بھی بتایئے مثلاً یہ "پھولا" یا "پھلی" کیا ہوتی ہے؟

جواب: آنکھ کے سامنے والا شیشہ (Cornea) معمولی طور سے بالکل صاف (Transparent) رہتا ہے مگر جب اس میں دھندلاہٹ یا سفیدی آجاتی ہے تو اس کو پھلی کہتے ہیں اور بچوں میں اس کی سب سے اہم وجہ مناسب غذا کی کمی (Malnutrition) ہے جس میں وٹامن اے (Vitamin 'A') کی کمی کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

سوال: تو اس وٹامن اے (Vitamin 'A') کی کمی سے بچوں کو کس طرح بچایا جاسکتا ہے؟

جواب: سب سے ضروری بات یہ ہے کہ خود ماں کی صحت جب بچے کو دودھ پلاتی ہو، اچھی ہونی چاہیے اور اس کی غذا میں دودھ، ہری سبزی، کچی گاجر اور دیگر اشیاء ہونی چاہیں جس سے کہ بچے کی خوراک بھی مناسب رہے اور اس کے بعد جب اوپر کا دودھ دیا جائے تو پھر برتن کی صفائی اور احتیاط کے ساتھ ساتھ دودھ بنانے کا صحیح طریقہ بھی معلوم ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر بچے کو دست اور پیچش ہو جائے تو اس کا بہت جلدی علاج ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ایسی حالت میں چھوٹے بچے بہت تیزی سے کمزور ہو جاتے ہیں اور ٹھیک ہونے پر اکثر ان کی آنکھوں پر پھلی سفیدی آجاتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو فوراً آنکھ کے ڈاکٹر کو دکھا کر علاج شروع کر دینا چاہیے۔ ورنہ آنکھ میں زیادہ خرابی آنے کا ڈر ہے۔

سوال: اگر بچے کی آنکھیں لال ہو جائیں اور ان میں سے پانی یا کیچڑ آنے لگے تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے اور کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اس کو "آنکھ آجانا" یا "دکھنا" کہتے ہیں اور یہ کیفیت زیادہ تر برسات کے موسم میں ہوتی ہے، جب مکھیاں اور گندگی کی زیادتی ہوتی ہے۔ اس بیماری کو (Conjunctivitis) بھی کہتے ہیں اور یہ ایک دوسرے کو جلدی لگ جاتی ہے۔ اس لیے جس کی آنکھیں دکھ رہی ہوں، اس کی تولیہ، تکیہ، رومال وغیرہ علیحدہ کر دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ آنکھوں کو دن میں کئی بار صاف پانی یا (Boric Lotion) سے دھونا بہت ضروری ہے تاکہ آنکھیں چپکے نہیں۔ اگر ایک دو دن میں فائدہ نہ ہو تو کسی ماہر چشم سے مشورہ کرنا ضروری ہے اور ان کی رائے سے ہی (Antibiotic) کا استعمال کرنا چاہیے کیونکہ ان کے غلط استعمال سے آنکھ کو نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ Conjunctivitis کے علاوہ بھی بہت سی بیماریوں میں آنکھ سرخ ہو جاتی ہے اور سرخی کے ساتھ آنکھ میں درد بھی ہوتا ہے۔ اگر کیچڑ یا پانی آئے بغیر آنکھ لال ہو جائے تو ماہر چشم کو فوراً دکھانا چاہیے۔

سوال: میں نے سنا ہے کہ کالا پانی ایک بہت خطرناک بیماری ہوتی ہے جس میں آنکھ کی روشنی چلی جاتی ہے کیا یہ سچ ہے؟ اور کیا یہ بھی ٹھیک ہے کہ یہ صرف چالیس سال سے زیادہ عمر کے لوگوں میں پائی جاتی ہے؟

جواب: کالا پانی یعنی Glaucoma دراصل کئی طرح کا ہوتا ہے اور ان میں سے ایک قسم میں آنکھ لال ہو جاتی ہے، شدید درد ہوتا ہے اور مریض بے چین ہو کر فوراً ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اس کو Acute Glaucoma کہتے ہیں اور یہ زیادہ تر بڑی عمر کے لوگوں میں ہوتا ہے۔

ایک اور طرح کا Glaucoma آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے اور جس میں آنکھ کا دباؤ (Pressure) بڑھتا جاتا ہے۔ اس کو Chronic Glaucoma کہتے ہیں اور یہ اس معنی میں زیادہ خطرناک ہوتا ہے کہ مریض کو شروع میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر کے پاس جانے میں تاخیر ہوتی ہے اور جب مرض بڑھ جاتا ہے تو آنکھ کی روشنی میں کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ ضروری ہے کہ چالیس سال کے اوپر کے لوگوں کو اپنی آنکھ کا مکمل معائنہ (Check up) کروا لینا چاہیے۔

سوال: کیا Glaucoma چھوٹے بچوں میں

بھی ہوسکتا ہے؟
جواب: ہاں! ایک قسم کا Glaucoma پیدائش ہی سے ہوسکتا ہے۔ یہ (Infantile Glaucoma) بہت خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی علامتیں والدین ہی کو پہچان کر اس کو ماہر چشم کے پاس جلد از جلد لے جانا چاہیے۔

سوال: ان ننھے بچوں کے Glaucoma کی کیا علامت ہے؟

جواب: سب سے نمایاں بات تو یہ ہے کہ ایک یا دونوں آنکھیں معمول سے اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ بچے کی شکل ذرا عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس بیماری کو بزرگوں نے بیل کی آنکھ (Ox - Eye) قرار دیا ہے۔ دوسری علامت یہ ہے کہ آنکھ کا شیشہ (Cornea) دھندلا ہوتا جاتا ہے اور اس کی چمک کم ہوجاتی ہے۔ اس کی وجہ سے بچے کو روشنی ناگوار ہوتی ہے (Photophobia) اور آنکھ سے تھوڑا تھوڑا پانی بھی نکلتا ہے۔ مگر کچھ بہت آتا ہے۔

سوال: کیا موتیا بند بھی بچوں میں ہوسکتا ہے؟ یا صرف بڑی عمر کے لوگوں کی بیماری ہے۔

جواب: چھوٹے بچوں میں پیدائش سے موتیا بند ہوسکتا ہے۔ اس کو Congenital Cataract کہتے ہیں۔ اس لیے جب کبھی بچے کی پتلی یعنی Pupil کے بیچ میں کوئی سفیدی دکھائی دے تو فوراً کسی ماہر چشم کی صلاح لے لینی چاہیے۔ کیونکہ یہ موتیا بند کے علاوہ اور بھی کئی خطرناک امراض کی علامت ہوسکتی ہے۔

عمر رسیدہ لوگوں کے موتیا بند کو Senile Cataract کہتے ہیں۔

سوال: دراصل یہ موتیا بند ہے کیا؟

جواب: آنکھ کے جس شیشے (Cornea) کا پہلے ذکر ہوا تھا اس کے پیچھے ایک اور شیشہ یعنی Lens ہوتا ہے۔ یہ عام طور سے بالکل صاف Transparent ہوتا ہے مگر بڑھتی عمر کے ساتھ یا کسی خاص بیماری یا غذائی کمی کی وجہ سے اس میں موٹا پن (Thickness) یا دھندلاہٹ (Cloudiness) آجاتی ہے اور روشنی کو آنکھ کے پردے پر پڑنے میں رکاوٹ ہوتی ہے، اس کو موتیا بند کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ موتی سے مشابہت رکھتا ہے۔

سوال: اس بڑھتی ہوئی سفیدی کو دور کرنے کا کوئی طریقہ بھی ہے؟

جواب: ابھی تک اس کے لیے کوئی خاص دوا ایجاد نہیں ہوئی ہے۔ جس سے یہ سفیدی دور ہوسکے۔ لہٰذا اس کا واحد علاج آپریشن ہی ہے۔

سوال: کبھی کبھی بچے کی آنکھ کچھ ٹیڑھی معلوم ہوتی ہے؟

جواب: اس کو بھینگا پن Squint کہتے ہیں یہ پیدائشی بھی ہوسکتا ہے مگر کبھی کبھی لمبی بیماری، مثلاً میعادی بخار (Typhoid) یا خسرا (Measles) کے بعد نمایاں ہوجاتا ہے۔

سوال: ایسا کیوں ہوتا ہے؟

جواب: یہ آنکھوں پٹھوں (Muscles) کی کمزوری سے ہوسکتا ہے اور اگر بچے کی نظر بھی کمزور ہو تو آنکھ پر زیادہ زور پڑنے سے یہ Squint ہوجاتا ہے۔ اسی لیے بہت ضروری ہے کہ اسکول جانے والے لڑکوں کی آنکھ کا معائنہ (Eye Test) ہر سال ہونا چاہیے اور اگر نظر کمزور ہو تو صحیح چشمہ پہنایا جائے۔

سوال: یہ تو کیا یہ Squint چشمے ہی سے ٹھیک ہوجاتا ہے؟

جواب: اگر ٹھیک وقت پر علاج شروع ہوجائے تو کسی کسی میں چشمے ہی سے 90% فائدہ ہوجاتا ہے۔ باقی علاج ورزش (Special Eye Exercises) سے ٹھیک ہوسکتے ہیں۔ یا آپریشن کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے

علاج میں تاخیر کرنے سے اکثر ایک آنکھ کی روشنی میں کافی کمی ہو جاتی ہے Eye Patch اس کے لیے کبھی کبھی کمزور آنکھ سے کام کروانے کے لیے اچھی آنکھ کو چند دن تک بند رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال: یعنی بچّے کی اچھی آنکھ پر پٹی باندھ دی جاتی ہے؟

جواب: نہیں پٹی سے تو نقصان ہوتا ہے۔ لہٰذا بچّے کے چشمے کے اوپر Patch Tape لگا دیتے ہیں تاکہ اس میں سے دکھائی نہ دے سکے۔ وقتاً فوقتاً اس Tape کو بدلنا پڑتا ہے اور اس علاج سے بچے کی کمزور آنکھ کی روشنی دھیرے دھیرے بڑھ سکتی ہے۔

سوال: سنا ہے کہ چھوٹے بچوں کو چشمہ نہیں لینا چاہیے ورنہ آنکھ اس کی عادی ہو جاتی ہے اور کمزوری بڑھتی ہے؟

جواب: یہ ہمارے یہاں کی عام غلط فہمی ہے جیسا کہ میں نے بتایا چشمہ کا صحیح استعمال Squint کے علاج میں بہت اہم ہے اس کے علاوہ بھی اگر نظر کمزور ہو تو چشمہ سے آنکھ کو سکون ملتا ہے اور دور یا پاس کی چیزیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ اکثر شروع میں بچے چشمہ لگانے سے گھبراتے ہیں کیونکہ دوسرے بچے ان کو چھیڑتے ہیں مگر جب ان کو خود زیادہ آرام ملتا ہے تو وہ خوشی سے چشمہ استعمال کرنے لگتے ہیں۔ چشمہ سے بذاتِ خود نظر کی کمزوری میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ہے۔

سوال: اچھا یہ بتایئے کہ آنکھوں میں کاجل یا سرمہ لگانا چاہیے یا نہیں؟

جواب: کاجل یا سرمہ اگر صفائی سے بنا کر لگایا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور حسب معمول کی خاطر لگایا جا سکتا ہے۔ اس سے آنکھ کی روشنی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ ہاں اگر صفائی سے نہ لگایا جائے تو آنکھ کو نقصان ہو سکتا ہے۔

سوال: کھیل کود وغیرہ سے بچوں کی آنکھ میں اکثر چوٹ لگ جاتی ہے اور سنا گیا ہے کہ ایک آنکھ میں چوٹ لگنے سے دوسری آنکھ کو خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

جواب: بندوق (Airgun) آتش بازی گلی ڈنڈا تیر کمان وغیرہ جیسی خطرناک چیزوں کو چھوٹے بچوں کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہیے۔ اسی طرح قینچی، سوئی، چھری وغیرہ بھی بچّے سے دور رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اگر ان سے آنکھ چھد جائے تو اس سے آنکھ میں شدید نقصان ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر اس کا فوراً صحیح علاج نہیں ہوا تو دوسری آنکھ پر بھی خراب اثر پڑ سکتا ہے۔

سوال: کیا اس طرح کی بگڑی ہوئی آنکھ کی جگہ دوسرے کی آنکھ لگائی جا سکتی ہے؟

جواب: پوری آنکھ تو نہیں بدلی جا سکتی ہے مگر سامنے والا شیشہ (Cornea) کسی دوسرے کے Cornea سے بدلا جا سکتا ہے۔ اس آپریشن کو Corneal Grafting کہتے ہیں اور یہ کامیاب ہو جائے تو آنکھ کی نظر اچھی ہو جاتی ہے۔

سوال: آخر میں آنکھ کو صحت مند رکھنے کے لیے تھوڑی سی ضروری باتیں بتا دیجیے؟

جواب: سب سے اہم بات یہ ہے کہ آنکھوں کی صفائی رکھی جائے اور آنکھ کو گندگی دھول اور مٹی سے بچایا جائے۔ سفر وغیرہ کے بعد آنکھوں کو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے سے اچھی طرح دھو لیا جائے۔

بچوں کو اچھی اور مناسب غذا دینی چاہیے اور کوئی بھی غیر معمولی تکلیف ہو تو جلد از جلد کسی ماہر چشم ڈاکٹر کے پاس مریض کو لے جانا چاہیے۔

(پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ——— ۱۶ رجب ۱۹۸۲ء)

# ادویات اور جدید تحقیق

عبدالماجد صدیقی

آج کی قلیل مدت میں آپ کی توجہ انھیں ادویات کی تحقیق کی طرف مبذول کروں گا جن کا تعلق براہ راست میری کاوشوں سے ہے۔

کسی ادویہ کی مکمل تحقیق کا دائرہ کسی سائنس داں کی بساط سے باہر ہے۔ کسی بھی نئے کیمیائی مرکب کو انسانی امراض میں دوا کی حیثیت سے استعمال کا حق اسی وقت ملتا ہے جب وہ بین الاقوامی معیار پر تجربات کی ہر کسوٹی پر کھری ثابت ہو۔ ایسی تحقیقات میں Biochemists، Cell-chemists، Pharmacologists، Biologists اور میڈیکل ڈاکٹر کا باہمی اشتراک بے حد اہم ہے۔ ایک تخمینہ کے مطابق ۱۱500 فی سال درکار ہیں جن کا وقفہ ۱۱سال سے لے کر کوئی بھی مدت ہو سکتی ہے۔ اس تحقیق میں تقریباً ۶۰ کروڑ روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف Multinational Drug Companies ہی اس بوجھ کو برداشت کر پاتی ہیں۔ ذرا سوچیے تجربہ گاہ سے دوا کی دوکان کا راستہ کتنا طویل اور پُر پیچ ہے۔

آزادی کے بعد حکومت کی دوراندیش سائنسی پالیسی نے تحقیق کے فن کی بے حد ہمت افزائی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی سائنس داں اپنے محدود وسائل کے باوجود ایسی نئی تحقیقات دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے جس سے ہندوستان کا وقار بڑھ رہا ہے اور بین الاقوامی سطح پر دوسرے ترقی پذیر ملکوں کے مقابلے میں ہندی سائنس دان کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ حکومت کے Science اور Techonology کے شعبے کی مزید ہمت افزائی محترمہ اندرا گاندھی کی قیادت میں ایک خوش آئند بات ہے۔

بہت تیزی سے ہندوستان صنعتی انقلاب کی طرف رواں ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح یہاں بھی انسانی زندگی کی بھاگ دوڑ میں مصروف ہے۔ زندگی کی قدریں بدل رہی ہیں، زندگی کی الجھنیں بڑھ رہی ہیں۔ مشینوں کے استعمال نے جسمانی جفاکشی کی جگہ دماغی کاوشیں بڑھا دی ہیں۔ رہن سہن کا ڈھنگ بھی بدل رہا ہے۔ ان سب کا لازمی نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں اب ایسی بیماریاں عام ہو رہی ہیں جو مشینی دور کی مرہون منت ہیں۔ ان بیماریوں میں "قلبی بیماریاں" سرفہرست ہیں۔ امریکہ میں آبادی کا بیشتر حصہ اس کا شکار ہے۔ ہر سال تقریباً دس لاکھ آدمی مر جاتے ہیں۔ اعداد و شمار کی کمی کی وجہ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندوستانی آبادی کا کتنا حصہ اس موذی مرض کا شکار ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اکثر و بیشتر اب اس بیماری کی خبریں ہندوستان میں بھی سننے میں آ رہی ہیں۔ آیئے اب ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ یہ بیماریاں

ہوں کر ہوتی ہیں۔ کس طرح ان امراض کی دواؤں کی
تحقیق جاری ہے۔ کس طرح ان امراض پر قابو پایا جا سکتا
ہے۔

بچے کی دل کی دھڑکن ماں کے پیٹ سے ہی
شروع ہو جاتی ہے۔ اگر ہندوستانی کی عمر اوسطاً ۵۵ برس
مان لی جائے تو اس کا دل اس کی زندگی میں تقریباً
۲ کروڑ مرتبہ دھڑکتا ہے۔ اس طرح دل جسم کے تمام
اعضا کو خون پمپ کرتا ہے۔ انسانی جسم میں شریانوں کی
مجموعی لمبائی تقریباً 96000 KM ہوتی ہے جس میں
روزانہ 7200 لیٹر خون گردش کرتا ہے۔ جسم کے تمام اعضاء
۲۴ گھنٹے میں کسی نہ کسی وقت کچھ نہ کچھ آرام کرتے ہیں لیکن
دل کے آرام کا نام موت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان
کو اپنے دل کا تمام اعضاء کے مقابلے میں زیادہ خیال
لازم ہے۔ انسانی خون میں "شحمی اور دسوی مادے"
ایک خاص مقدار میں موجود ہیں جن کا تکنیکی نام - Triglycerides
Phospholipids - اور Cholesterol
ہے۔ یہ مادے اگر بڑھ جائیں تو شریانوں کی اندرونی دیوار
پر دھیرے دھیرے جمع ہوتے رہتے ہیں اس وجہ سے
یہی نہیں کہ شریانوں کی لچک کم ہو جاتی ہے بلکہ اندرونی
قطر بھی کم ہو جاتا ہے۔ چونکہ خون کا جسم کے ہر Cell
(خلیہ) کو پہنچنا ضروری ہے اس لیے قطر کے کم ہو جانے سے
شریانوں میں خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور ان "شحمی دسوی
مادوں" کی وجہ سے خون کے دوران میں رکاوٹ پڑتی
ہے۔ ان مادوں کی جماوٹ کو - Atherosclerotic
Plaques - بھی کہا گیا ہے۔ خون کے
بڑھے دباؤ کی وجہ سے اکثر ان Plaques کا کوئی
ذرہ ٹوٹ کر الگ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ ذرہ Coronary
Artery میں پھنس جائے تو Coronary Thro-
mbosis - کا حملہ ہوتا ہے۔ دل کے عضلات (Muscles)

کو خون پوری طرح نہیں پہنچ پاتا اور اس طرح دھیرے دھیرے
یہ عضلات کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے
خلیے (Cells) مر جاتے ہیں۔ اس بیماری کو - Myocardial
Infarction - کہا گیا ہے۔ اگر یہی ذرے
دماغ کو خون لے جانے والی شریانوں میں پھنس جائیں تو
فالج کا حملہ ہوتا ہے۔ اگر یہ ذرے سر یا ہاتھ کو خون
لے جانے والی شریانوں میں پھنس جائیں تو یہ اعضاء
مردار ہو جاتے ہیں اور پھر ان کو جسم سے کاٹ کر الگ
کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

کسی بیماری کا علاج دریافت کرنے سے پہلے
یہ جاننا ضروری ہے کہ بیماری کن وجوہات سے پیدا ہوتی
ہے، کس طرح یہ بیماری بڑھتی ہے۔ کیا یہ بیماری مردوں
اور عورتوں میں تخصیص کرتی ہے۔ یہ بیماری کس طرح
انسان کے خلیوں پر اثر کرتی ہے۔ خلیوں کے کن افعال
پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ کس طرح کی غذا اس بیماری کو
پھلنے پھولنے میں مدد دیتی ہے۔ ان سوالات کا علمی
جواب ڈھونڈا جاتا ہے اور جن وجوہات کو مشتبہ سمجھا
جاتا ہے۔ ان کی مدد سے یہ بیماری جانوروں میں پیدا کی
جاتی ہے۔ اس طرح یہ جانور ادویہ کی تحقیق کا ماڈل
ہوتے ہیں۔ انسانی جسم پر کسی دوا کا اثر دیکھنے سے
پہلے ان جانوروں پر تجربہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے
تجربوں کا بین الاقوامی معیار مقرر ہے۔ اس بین الاقوامی
کسوٹی پر جو بھی مرکب پورا اترتا ہے وہی انسانوں میں
بطور دوا استعمال ہوتا ہے۔

ان سوالات کے جواب کی روشنی میں جب قلبی بیماریوں
کا تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ Atherosclerotic
Plaques کا سب سے اہم جزو کولسٹرول (Cholest-
erol) ہے اور ایسے امراض کے شکار افراد کے خون میں
ان "شحمی دسوی مادوں" کی زیادتی ہوتی ہے جن کا ذکر

ادپر کیا جا چکا ہے۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ اس پر بعض اکثر و بیشتر High Blood Pressure کا شکار رہتے ہیں یہ مرض عموماً ان حضرات میں زیادہ ہوتا ہے جو مرغن کھانا کھاتے ہیں۔ شراب اور سگریٹ نوش کرتے ہیں۔ Diabetes میں مبتلا ہیں، دماغی کام زیادہ کرتے ہیں یہ ضروری نہیں ہے کہ ایسی تمام عادتوں والے اس مرض کا شکار ہوں۔ اس لیے یہ بات بھی ابھر کر سامنے آرہی ہے کہ اس بیماری کا تعلق جینی ساخت (Genetic Make up) سے بھی ہے۔ عورتوں میں یہ بیماری مردوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔

خون کے تمام "شحمی دموی مادوں" میں کولسٹرول کا نام سرفہرست ہے۔ تمام سائنس داں اس بات پر متفق ہیں کہ انسانی جسم میں جگر کولسٹرول بناتا ہے اور ایسے مریضوں میں کولسٹرول بنانے کا فعل ناقص ہوتا ہے وہ تمام وجوہات جو خون میں کولسٹرول بڑھا دیں وہ اس بیماری کے پھیلنے پھولنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں اس لیے ایسے تمام کیمیائی مرکبات جو خون میں ان مادوں کو کم کر دیں وہ اس بیماری کی دوا بن سکتے ہیں۔ بشرطیکہ انسانی جسم پر اس کے کوئی مہلک اثرات نہ مرتب ہوں بدقسمتی سے تمام انگریزی دوائیں جو آج کل استعمال ہو رہی ہیں وہ اس بیماری کی روک تھام تو کرتی ہیں لیکن مرض کو جڑ سے نہیں اکھاڑ پھینکتیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان دواؤں کے مضر اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی دوائیں ایجاد کی جائیں جو انسانی جسم کے لیے مہلک نہ ہوں لیکن مرض کو روکیں اور مرض کی جڑ کو ختم کریں۔ ہندوستانی سائنس داں ہندی جڑی بوٹیوں کی طرف متوجہ ہیں۔ آیورویدک و یونانی طریقۂ علاج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نئے نئے مرکبات معلوم ہو رہے ہیں۔ حکومت نے خود ان طریقۂ علاج کو

فروغ دینے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ ایسے مرکبات جو شریانوں کے اندرونی قطر کو بڑھا دیں تاکہ بلڈ پریشر کم ہو۔ وہ مرکبات بھی ان امراض کے لیے قابل غور ہیں۔ عورتوں میں ان امراض کی کمی کے وجوہات ڈھونڈنے پر یہ معلوم ہوا کہ یہ مرض عموماً انھیں عورتوں میں ہوتا ہے جن کی عمر ۴۵ برس سے اوپر ہوتی ہے جب کہ ان کی ماہواری بند ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں عورتوں کے خون میں ایک نسوانی ہارمون Estrogen کم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ان میں بچہ جننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منگولین نسل کے لوگ (تھائی، انڈونیشی، چینی) اس مرض کا دوسری نسل کے مقابلے میں کم شکار ہوتے ہیں۔ ان کے مردوں کے خون میں Estrogen کی زیادتی ہوتی ہے یونانی طریقۂ علاج میں چنا بکثرت شباب لاتا ہے اور مقوی باہ بھی ہے۔ Diabetes کے مریض بیسن کی روٹی کھاتے ہیں۔ آگرہ میڈیکل کالج میں ڈاکٹر ملماتھر نے کئی برس پہلے یہ دکھایا کہ چنا خون میں "شحمی دموی مادوں" کو کم کرتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہمارے تحقیقی گروپ نے چنے سے ایسے دو اجزاء الگ کیے جن کی کیمیائی ساخت Estrogen سے ملتی ہے ان کے نام بالترتیب —— Formononetin اور Biochanin "A" ہیں۔ ان مرکبات نے خون کے "شحمی اور دموی مادوں" کو کم کر دیا۔ اگر آپ میں سے کوئی بھی خدانخواستہ اس موذی مرض کا شکار ہے تو براہ کرم روزانہ ۲۵ سے ۵۰ گرام بھیگے چنے کھائے جن میں کم از کم ۴ انکھوا نکل آیا ہو۔ ایسے چنے میں مندرجہ بالا کیمیائی مرکبات بڑھ جاتے ہیں۔ اس یونیورسٹی کے شعبۂ کیمیا میں ایک تحقیقی گروپ بہت سے جڑی بوٹیوں کا تجزیہ کر رہا ہے اور ایسے بہت سے مرکبات حاصل ہوئے ہیں جن کی ساخت Estrogen سے مشابہ ہے۔ ان پر تجربہ باقی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے مرکبات باجرہ مثلاً اور

ماش میں بھی موجود ہیں اور جن کی چھال کی نہار منہ چائے بھی اس مرض میں مفید ہے۔ یونانی میں اس چھال کا سب سے اہم فعل 'محرک قلب' ہے۔ اس چھال میں بھی کچھ ایسے اجزاء موجود ہیں جن کی کیمیائی ساخت Estrogen سے مشابہ ہے۔

انسانی خون میں کولسٹرول کی مقدار تقریباً یکساں رہتی ہے صرف قلبی امراض میں بڑھ جاتی ہے۔ جگر کولسٹرول بناتا ہے اور جگر سے یہ کولسٹرول جسم کے تمام اعضاء کو خون میں ہو کر پہنچاتا ہے۔ خون میں کولسٹرول کا زیادہ حصہ ایک پروٹینی مادہ سے مل کر پایا جاتا ہے۔ پروٹینی مادہ بھی جگر بناتا ہے۔ چوں کہ پروٹین کے بننے کا نظام جین (Gene) سے کنٹرول ہوتا ہے۔ اس لیے حالیہ تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ بیشتر قلبی بیماریاں موروثی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ جگر میں کولسٹرول کس طرح بنتا ہے اور کیوں کر اس کی مقدار خون میں یکساں رہتی ہے۔ اس خیال سے میرے تحقیقی گروپ نے ایک ایسے مرکب پر تحقیق شروع کی جو جگر کو کولسٹرول کے کنٹرول والے عمل کو کم کر دے۔ پچھلے بیس برس سے ہم لوگ اس مرکب پر کام کر رہے ہیں اور خاطر خواہ نتیجہ نکلا ہے۔ اس مرکب کا نام HMG ہے۔ یاد رہے کہ یہ مرکب سب سے پہلے السی سے نکالا گیا۔ یونانی نقطۂ نظر سے السی یا کتان، مختلف قسم کے ورم جگر میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ محلل ورم بھی ہے اور مخرج بلغم بھی۔ مادی وسائل کی کمی نے HMG کو دوا کی دوکان تک پہنچنے کا سفر طویل کر دیا ہے۔ گو ہم لوگ اس پر ایک امریکی پیٹنٹ بھی حاصل کر چکے ہیں اب تک کے تجربات کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ مرکب ہر طرح سے ان امراض کے لیے موزوں معلوم ہوتا ہے۔ یہ خون کے تمام "شحمی دموی مادوں" کو کم ہی نہیں کرتا بلکہ جگر، دل، گردہ، تلی، دماغ، پھیپھڑہ اور Adrenal اور Pancreas غدود کی ساخت پر کوئی مہلک اثر نہیں ڈالتا۔ مکھن اور شکر کھانے والے خرگوش اور چوہوں پر بھی اس کا تجربہ کامیاب رہا۔ شراب پینے والے انسانوں پر بھی اس کا تجربہ کامیاب رہا۔ جینی ساخت کی وجہ سے کچھ لوگ اپنے خون میں زیادہ کولسٹرول رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر بھی HMG کا تجربہ کناڈا میں کامیاب رہا۔ اس مرکب کا 1000 mg/Kg Body Wt. سے زیادہ ہے جو کسی کیمیائی مرکب کو دوا کے طور پر استعمال کرنے کی بہت اہم کسوٹی ہے۔

اس مختصر جائزہ سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہندوستان میں سائنس داں نئی ادویات کی تحقیق میں مصروف ہیں۔ حکومت کا مثبت رویہ بھی یقیناً قابل ستائش ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ Multi National Drug Companies آگے بڑھ کر ایسے پروجیکٹ کی ذمہ داریاں لیں جن کا ابتدائی تجربہ کامیاب رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یونیورسٹی اور دواسازی کمپنیوں سے تعاون بڑا نیک فال ہوگا اور اس طرح ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کا ذخیرہ انسانی امراض پر قابو پانے کے کام آئے گا اور اس سے ملک کا نہیں بلکہ ہندی سائنسدانوں کا وقار بڑھے گا۔

# جانوروں کے اخلاق و آداب

محمد افضال حسین قادری

جانوروں کے اخلاق اور آداب کا انسانوں کے طور طریقوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مطالعہ کیا گیا ہے، لہٰذا ان کے نام بھی ویسے ہی رکھ دیے گئے ہیں جیسے انسانی تہذیب اور اخلاق کے مختلف پہلوؤں کے ہیں۔ بحیثیت ایک سائنس داں میرا فرض ہے کہ میں آگاہ کر دوں کہ جانوروں کے فعل یا کام بالکل انسانوں کے افعال کی طرح نہیں ہوتے۔ انسانوں کی سمجھ بوجھ اور اچھے برے میں تمیز کرنے کی قوت نے ان کے اکثر افعال کو اس قدر پیچیدہ کر دیا ہے کہ وہ اصلی حیوانی عادتیں اور جبلی افعال سے بالکل مختلف ہو گئے ہیں۔ بہت سے جانوروں کی حرکتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے دیکھنے اور مطالعہ کرنے والوں کو بجز تعجب کرنے اور ان کی داد دینے کے کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اکثر اوقات تو ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ جن سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان جانوروں کی حرکتوں میں عقل و شعور کو کچھ نہ کچھ دخل ہے۔ کئی سال گزرے کہ حیوانات کے ایک ماہر نے اپنی گفتگو کے دوران میں یہ کہا کہ متعدد جانوروں میں انسانوں سے زیادہ انسانیت ہوتی ہے اس قول کے بعد بہت سے تجربے اور مشاہدے حیوانی زندگی کے کیے گئے ہیں۔ ان مشاہدوں اور تجربوں کی بنا پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے جانوروں کی حرکتوں اور کاموں میں ایسے جذبات کا دخل ہوتا ہے جو اگر انسان سے زیادہ نہیں تو اس کی برابر ضرور نفاست اور شائستگی سے لبریز نظر آتے ہیں۔ اب میں چند مشاہدے اور قصے حیوانوں کے پیش کروں گا جن سے میرا مطلب پہلے اپنے دعوے کی دلیل پیش کرنا ہے اور اس کے بعد آپ کے دل میں حیوانی زندگی کے مطالعے کا شوق پیدا کرنا ہے جس کے لیے ہندوستان ایک بہت مناسب ملک ہے۔

حیوانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک ترتیب کے ساتھ بیان کرتے ہوئے پہلے میں جانوروں کے رہنے اور بسنے کے طریقوں کو بیان کروں گا۔ مکانوں کا بنانا اور رہائش کا خاص طور پر انتظام کرنا تمام جانوروں کی عادتوں میں داخل ہے۔ چاہے وہ حقیر کیڑے مکوڑے ہوں یا بڑے اور ارتقا شدہ جانور۔ اس سلسلے میں چند مشاہدات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سمندر کے پہاڑی کناروں پر آپ نے بہت سے گھونگے پتھروں سے چپٹے ہوئے دیکھے ہوں گے۔ یہ گھونگے اپنے چمٹنے سے پتھروں میں چھوٹے چھوٹے گڑھے کر دیتے ہیں۔ یہ گڑھے ان گھونگوں کے مکان ہوتے ہیں، جہاں سمندر کی لہریں آکر ان کے کھانے کے لیے چھوٹے کیڑے ڈال دیتی ہیں اور ان کو دھوپ کی گرمی سے بچانے کا اور پانی کے اندر سانس لینے کا پورا انتظام کر دیتی ہیں۔

جانوروں کے مکانوں کے بنانے کا مطالعہ نہایت دلچسپ ہے۔ چھوٹے کیڑوں سے لے کر چڑیوں

اور چوپایوں کی دست کاری اور صنعت کے بہت سے ایسے نمونے ملتے ہیں جن پر ان کو پوری داد دینی چاہیئے۔ کئی قسم کی بھڑیں اور مکھیاں کمہار اور معمار کہی جاتی ہیں۔ ان میں کئی ایسے گھر بناتی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں مکان کی خوبی اور عمارت کی خاص بناوٹ کا خیال موجود ہے۔ ہندوستان کے بہت سے قدیم برتنوں اور ہانڈیوں کے نمونے انہیں مکھیوں کے گھروں کی نقل ہیں۔ اس کے علاوہ اگر شہد کی مکھیوں کے چھتے کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ہوا اور صفائی کا خاص طور سے انتظام ہوتا ہے چھتے کے مختلف خانوں میں آپ کو کئی مکھیاں ایسی ملیں گی جو صفائی کرنے اور جھاڑنے میں مصروف ہوں گی۔ صفائی اور حفظان صحت کا خاص اہتمام اودھ بلاؤ کے گھروں میں بھی ہوتا ہے۔ اودھ بلاؤ سوشل جانور ہیں یعنی بہت سے مل کر ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے گھر زمین کے اندر کسی چشمے یا دریا کے کنارے بنے ہوتے ہیں۔ ہر گھر میں مختلف کوٹھریاں ہوتی ہیں۔ کچھ ان میں سے رہنے بسنے کے کام میں آتی ہیں اور کچھ میں ان کی خوراک کا سامان جمع رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر مکان میں نہانے کے تالاب ہوتے ہیں اور روشنی اور ہوا کے لیے خاص طور پر کھڑکیاں بنی ہوئی ہوتی ہیں۔

اب اس کے بعد جانوروں کے خوراک حاصل کرنے کی تدبیروں کو لیجیے۔ شاہین، عقاب، اور چرغ وغیرہ اپنی ہمت، بے باکی اور پھرتی کے لیے مشہور ہیں لیکن ان کی زندگی کا ایک قابل تعریف پہلو بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر اڑتا ہوا عقاب کسی خرگوش یا بھیڑ پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے اور آناً فاناً اپنے مضبوط پنجوں میں دبا کر آسمان کے اندر غائب ہو جاتا ہے۔ باوجود اپنی بھوک کے وہ یہ نہیں کرتا کہ اپنے شکار کو خود ہی کھالے بلکہ سالم جوں کا توں اپنے گھونسلے میں اپنی مادہ اور بچوں کے سامنے لاکر حاضر کر دیتا ہے جہاں سب ساتھ بیٹھ کر مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔

بہت سے جانور لوٹ اور چوری سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ ان کی ترکیبیں، دھوکے، فریب اور بے ایمانیاں عجیب عجیب طرح کی ہوتی ہیں۔ ان کے چند حالات کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک چھوٹا سا کیڑا ہے جس کا نام نمازی مینٹس ہے کھیتوں کے کناروں پر یہ کیڑا خاموش اگلے ہاتھ باندھے ہوئے اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا ہوا آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ڈھب اس قدر مودبانہ اور سنجیدہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف ملکوں کے رہنے والے کسان کہا کرتے ہیں کہ یہ کیڑا عبادت کرتا ہے۔ لیکن تجربے سے معلوم ہوگا کہ اس ادا کے اندر ایک زبردست دھوکا چھپا ہوا ہے۔ یہی خاموش مینٹس جو کہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ عبادت کے ذریعے اپنی روحانیت اور اخلاق کی ترقی میں مشغول ہے، درحقیقت اس وقت کا انتظار رہا ہوتا ہے جب کہ کوئی معصوم کیڑا اس کے قریب آ جائے۔ جب کوئی بدنصیب سیدھا سادہ کیڑا اس کے قریب آ جاتا ہے تو مینٹس کے جسم میں بجلی کی طرح ایک تیز حرکت ہوتی ہے اور وہ بندھے ہوئے ہاتھ جن کے اندر کا حصہ قینچی کے پھل کی طرح تیز ہوتا ہے اس کیڑے کو ایک پل کے اندر پکڑ کر مینٹس کا نوالہ بنا دیتے ہیں۔

اسی طرح سے ایک چھپکلی کی ترکیب بھی قابل حیرت ہے یہ چھپکلی اپنے منہ کو خوب چوڑا کھول لیتی ہے اور زبان کو ساکن کر لیتی ہے۔ پھر وہ لال پھولوں کے جھنڈ میں جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ زبان اور منہ کا طرز اور رنگ تمام پھول کی مانند خوشنما اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔ یہ نقل اس قدر کامیاب ہوتی ہے کہ بہت سے کیڑے یہی سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ایک لال پھول کھلا ہوا ہے، چنانچہ بے چارے کئی ایک کیڑے جو پھولوں پر شہد یا تفریح کی خاطر بیٹھتے ہیں بلا کھٹکے اس چھپکلی کے منہ کے قریب آ جاتے ہیں لیکن ان بیچاروں کو خوش گوار مستقبل نصیب نہیں ہوتا اور سیدھے موت کے منہ میں پہنچ کر چھپکلی کی غذا بن جاتے ہیں۔

بہت سے جانور اپنی خوراک کے لیے ڈاکہ ڈالتے ہیں۔

ایک بے حد دلچسپ مثال کرکس کی ہے۔ کرکس ایک چھوٹا سا دودھ پلانے والا جانور ہے۔ یہ اس جگہ رہتا ہے جہاں بہت سے حواصل یا (Pelicans) رہا کرتے ہیں۔ Pelican یا حواصل غالباً آپ نے دیکھے ہوں گے۔ ان کی شکل سارس کی طرح ہوتی ہے۔ البتہ ان کے گلے کی کھال بہت لٹکی ہوتی ہے اور یہ اپنے پوٹے میں بڑی بڑی مچھلیاں نگل لیتے ہیں۔ یہ حواصل روزانہ بڑی تعداد میں جھیلوں اور تالابوں کے کنارے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جاتے ہیں اور اپنے پوٹوں میں بہت سی مچھلیاں بھر کر واپس آجاتے ہیں۔ جس وقت حواصل مچھلیاں پکڑنے کے لیے جاتے ہیں، اس وقت کرکس ایک اچھے ہمسایے کی طرح ان کو خدا حافظ کہتا ہے مگر جب حواصل لوٹتے ہیں تو کرکس ان کے قریب آکر چیخنے اور دھاڑنے لگتا ہے۔ چنانچہ کبھی سامنے اور کبھی پیچھے آکر اس ہیبت ناک طرح سے شور کرتا ہے کہ بیچارے حواصلوں کا ناک میں دم آجاتا ہے اور وہ تنگ آکر اپنی مچھلیاں اگل دیتے ہیں۔ کرکس نہایت اطمینان سے ان مچھلیوں کو کھا لیتا ہے اور پھر حواصلوں کا پیچھا چھوڑ دیتا ہے۔

ڈاکو اور رہزنوں کے مقابلے میں چور جانوروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ چھوٹے جانوروں میں شہد کے چھتوں کے چور بہت مشہور ہیں۔ یہ مختلف قسم کے پروانے یا اور کیڑے ہوتے ہیں جو چوری سے اپنے انڈے شہد کے چھتے کی کوٹھریوں میں دے جاتے ہیں۔ جب انڈوں میں سے بچے نکلتے ہیں تو شہد کی مکھیاں ان کی وہی خدمت کرتی ہیں جو اپنے بچوں کی اور یہ بغیر کوئی فکر و تکلیف اٹھائے اپنی غذا حاصل کر لیتے ہیں۔ بڑے جانوروں میں انڈوں کی چوری عام ہے بہت سی چھپکلیاں اور چڑیاں چور ہوتی ہیں۔ یہ دوسرے کے گھونسلوں کی تاک میں رہتی ہیں اور موقع پاتے ہی انڈا چرا کر بھاگ جاتی ہیں۔ ٹٹیریاں اور کوے عام طور پر انڈوں کی چوری کرتے ہیں۔ آپ لوگوں میں سے اکثر نے فاختہ اور کوّے کی لڑائی دیکھی ہوگی۔ بیچاری فاختہ اپنے انڈے اور بچوں کا بدلہ لینے کے لیے کوّے کا پیچھا کرتی ہے اور اس پر بار بار حملہ کرتی ہے۔ کوئل کی چوری بھی ایک مشہور بات ہے۔ کوئل ہمارے شمالی ہندوستان کے میدانوں میں برسات سے پہلے آجاتی ہے اور چپکے سے کوے کے گھونسلے میں انڈا دے دیتی ہے۔ پھر اس کے بعد اس کو انڈوں بچوں کی کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کوئل کا بچہ کوّے کے گھونسلے میں پیدا ہوتا ہے اور وہ غریب اس کو اپنا بچہ سمجھ کر پالتا ہے۔

انڈوں اور بچوں کی محبت حیوانی فطرت کا عام تقاضا ہے۔ چھوٹے سے لے کر بڑے جانوروں تک سیکڑوں دلچسپ مثالیں بیان کی جاسکتی ہیں۔ یہاں صرف چند مثالیں بیان کی جائیں گی۔

ایک کالا سا کیڑا جو گوبر کے قریب پایا جاتا ہے گوبریلا کہلاتا ہے۔ نر و مادہ گوبریلے مل کر زمین کے اندر اپنے لیے گھر بناتے ہیں۔ ان کے گھروں میں کئی کوٹھریاں ہوتی ہیں انڈے دینے سے قبل یہ گوبر کوٹ پیس کر گولیاں اور ٹکیاں بنا لیتے ہیں اور اپنے مکان کی مختلف کوٹھروں میں رکھ دیتے ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے گوبریلے بڑی بڑی گولیاں بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ جب یہ گولیاں پہلی بار کھودی گئی تھیں تو بہت سے لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ ہندوستان کی پرانی توپوں کے گولے ہیں۔ ہر ایک گولے کے اوپر ایک انڈا رکھ دیا جاتا ہے اور مادہ اس کی نگہداشت کرتی ہے۔ جب بچے نکل آتے ہیں تو والدین ان کو پالتے ہیں۔ فادریہ بیان کرتا ہے کہ اگر کوئی خطرہ پیش آئے تو یہ گوبریلے اپنے بچوں کو ایک محفوظ مقام پر اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ انڈوں کی نگہبانی اور فکر چڑیاں بھی کرتی ہیں۔ شتر مرغ اس بات کے لیے ایک خاص شہرت رکھتے ہیں۔ جب صبح کو ریگستان میں دھوپ تیز

ہو جاتی ہے تو یہ ایک گہرا گڑھا کھود کر اس کے اندر انڈے رکھ دیتے ہیں اور اسے ریت سے چھپا دیتے ہیں اور جب شام ہوتی ہے تو اسے دوبارہ ریت سے نکال لیتے ہیں۔

کلکتہ کے علی پور چڑیا گھر کے ایک اورنگوٹان کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک اورنگوٹان کا بچہ کسی بیماری سے مر گیا۔ اس بچے کی لاش کو چڑیا گھر سے باہر پھینکنے کے لیے لوگ لے گئے۔ باپ نے جب اپنے بیٹے کی لاش کو جاتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ ہو لیا اور اپنے احاطے کی دیوار سے لپٹ کر کھڑا ہو گیا۔ باوجودیکہ دھوپ بہت تیز تھی اس نے وہاں سے حرکت نہ کی۔ یہاں تک کہ اسے لو لگ گئی اور وہ مر گیا۔

جانوروں کی زندگی کے ازدواجی پہلو کے مطالعے کے دوران میں جانوروں کی حرکتیں اکثر ایسی دیکھنے میں آئی ہیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ سمجھ بوجھ کے ساتھ کی گئی ہیں۔ مادہ کے حاصل کرنے کے لیے اور اس کے تنہا مالک بننے کے لیے جانوروں میں بڑی بڑی خوفناک لڑائیاں ہوا کرتی ہیں۔ قطب شمالی اور جنوبی کے برفستانوں میں سمندری شیروں کی لڑائیاں بہت مشہور ہیں۔ بارہ سنگھے کے خوبصورت سینگ صرف اس کام آتے ہیں کہ وہ ان کی مدد سے اپنی مادہ کو حاصل کرنے کے لیے جنگ کرے۔ بہت سے جانور اپنی شادی منانے میں نفاست پسندی اور خوش مذاقی کا اظہار کرتے ہیں۔ گانا، ناچ، خوشبوؤں کا استعمال عجیب عجیب طریقوں سے چھوٹے کیڑوں سے لے کر بڑے بڑے جانوروں تک میں عام طور پر پایا جاتا ہے پروفیسر کارپینٹر نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ ایک دو پروالی مکھیوں کا گروہ جس کا نام ایفیڈ ہے، دریاؤں اور چشموں کے کنارے پر پایا جاتا ہے۔ اس گروہ کے نر ہوا میں منڈلاتے ہوئے اکثر دیکھے جاتے ہیں۔ یہ نر پانی کے چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو اپنے پنجوں میں پکڑ کر ہوا میں منڈلاتے رہتے ہیں لیکن اپنے شکار کو خود نہیں کھاتے۔ اگر کوئی مادہ قریب سے اڑتی ہوئی آ پہنچتی ہے تو نر اس کی طرف نہایت مودبانہ طریقے سے بڑھتا ہے اور شکار کو اس کی خدمت میں شادی کے تحفے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس تحفے کے پیش ہونے کے بعد مادہ اس کو بحیثیت اپنے شوہر کے قبول کر لیتی ہے۔

بہت سے جانوروں کی ازدواجی زندگی میں ایک خودداری کا جذبہ اور اپنی مادہ کی محبت پائی جاتی ہے۔ بہت سے جانوروں کے نر اور مادہ اپنے بچوں کی پرورش مل کر کرتے ہیں۔ شتر مرغ اور بہت سی چڑیوں کے نر اپنی مادہ کو جب کہ وہ انڈے سیتی ہے، موقع دیتے ہیں کہ وہ جا کر سیر اور آرام کر لے اور اس دوران میں خود انڈوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ سانپوں کے نر و مادہ کی باہمی محبت کے بہت سے افسانے مشہور ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور قصہ یہ ہے کہ کوبرے کی مادہ یعنی ناگن ناگ کے قاتل سے بدلہ لینے کی کوشش کرتی ہے۔

ازدواجی زندگی کی خودداری کا ایک دلچسپ قصہ لندن کے چڑیا گھر کے بندروں کی لڑائی کے متعلق ہے ایک بار ایک کنوارا بندر بندروں کے چند جوڑوں میں رہنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ اس سے قبل یہ جوڑے ایک خاموش زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس نو وارد نے ایک شادی شدہ مادہ کو اپنی طرف راغب کرنا چاہا، نر اس کی تاب نہ لا سکا اور نو وارد اور نر میں ایک مہلک لڑائی شروع ہو گئی۔

جذبات کے تاثرات بہت سے جانوروں کی حرکات سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ہاتھیوں کے جھنڈ میں یہ قاعدہ ہے کہ سب سے بڑا اور سب سے مضبوط ہاتھی اکثر

سرگروہ ہوتا ہے ۔ جب یہ سرگروہ کسی دوسرے طاقت ور ہاتھی سے ہار جاتا ہے تو پھر اس کی طبیعت میں ایک نفرت اور جھنجلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے ۔ ایسے ہاتھی جو چیز بھی ان کے سامنے آئے اس پر حملہ کرنے لگتے ہیں اور بعض بعض دفعہ آدمیوں کو بھی مار ڈالتے ہیں ۔ بچوں پر مہربانی اور محبت کا جذبہ خواہ وہ غیر کے ہی کیوں نہ ہوں، جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے ۔

لوبیجر نے لندن کے چڑیا گھر کے ایک ہاتھی کا قصہ بیان کیا ہے ۔ چڑیا گھر میں کسی سیر کرنے والے نے ایک بچہ کو گاڑی میں اکیلا چھوڑ دیا تھا ۔ ہاتھی نے خیال کیا کہ یہ کوئی لکڑی ہے یا کھانے کی چیز ہے ۔ چنانچہ اس نے بچے کو گاڑی میں سے اُٹھا لیا ۔ جب بچے کو اس نے سونڈ میں پکڑ کر اُٹھایا تو اسے معلوم ہوا کہ اس نے غلطی سے ایک بچے کو اُٹھا لیا ہے ۔ چنانچہ اس نے اس بچے کو پھر اس گاڑی میں رکھ دیا ۔

غیر کے بچوں کے پالنے کے واقعات اکثر جانوروں میں دیکھے گئے ہیں ۔ پین گوئینس قطب شمالی اور جنوبی کی برفستان کی چڑیاں بڑے بڑے گروہوں میں رہتی ہیں اور اپنی رحم دلی کے لیے مشہور ہیں ۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی جن کی مائیں یا تو کسی حادثے سے مر جائیں یا جنھیں انسانوں نے گولی سے مار دیا ہو، اپنے بچوں کی طرح نگہداشت اور پرورش کرتی ہیں ۔

[ ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۔ جلد ۷ ۔ شمارہ ۱۲ ۔ دسمبر ۱۹۸۸ء ]

"اے عزیز بچو! اگر کوئی آسمان کا تارہ ہو جاوے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا ۔ وہ تو ہماری قوم ہی نہ رہا ۔ پس اسلام کو قایم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے ۔ امید ہے کہ تم ہمیشہ اس کو قایم رکھو گے اور اس کے ساتھ تمام باتوں میں ترقی کرتے جاؤ گے کہ یہی قومی ترقی ہو گی جو تم کو بھی فائدہ دے گی اور قوم کی بھی عزت ہو گی اور آئندہ آنے والی نسلیں بھی اس سے فائدہ اُٹھاویں گی ۔"

سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۔ جلد ۱۱، شمارہ ۹-۱۰ (ستمبر-اکتوبر) ۱۹۹۲ء

# کینسر ــــــ ایک مہلک مرض

سید مفتاح العارفین رضوی

میڈیکل سائنس کو انسانی زندگی میں بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ زمانۂ قدیم میں مختلف امراض جڑی بوٹیوں کے علاج سے ہی دور ہو جایا کرتے تھے مگر جیوں جیوں سائنس نے ترقی کی، امراض بھی بتدریج پیچیدہ مسئلہ بنتے گئے۔ آج ہم سائنسی دور میں سانس لے رہے ہیں جہاں سائنسی تحقیق و تجسس نے انسانی دشواریوں کو بہت آسان طور پر حل کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود بہت سارے امراض ایسے بھی ہیں جس پر میڈیکل سائنس دانوں کو شب و روز کی انتھک کوششوں کے بعد بھی جزوی کامیابی ہی حاصل ہو سکی ہے۔ مرض کینسر بھی ان میں ایک ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے نوبل لاریٹ نے بھی کینسر پر تحقیق کی مگر اب تک کے برآمد نتائج سے یہ باتیں واضح ہو چکی ہیں کہ ان کی تحقیق میں متضاد رائے کارفرما ہیں اور جن سے خود بھی سائنس داں متفق نہیں۔

کینسر لاطینی لفظ ہے جس کے معنی کیکڑے کے ہوتے ہیں۔ آیورویدک میں کارسکار یعنی دس پیروں والے کیکڑے کو کہتے ہیں۔ طب یونانی میں اسے سرطان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دراصل یہ ایک قسم کا ورم ہے جو جلے ہوئے سودا سے پیدا ہوتا ہے۔

عالمی صحت تنظیم (W.H.O.) کے اعداد و شمار سے دنیا میں اوسطاً ہر سال ۶۰ لاکھ لوگ کینسر کے شکار ہوتے ہیں جن میں سے ۵۰ لاکھ موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

مرض کینسر کے قابل قبول اسباب موروثی اور اکتسابی ہیں۔ اب ہم دیکھیں کہ ان میں بھی کس طرح متضاد رائے موجود ہیں۔

مثلاً ایسے والدین کی مثال بھی سامنے ہے جو خود کینسر کے شکار تو ہوئے مگر ان کی اولاد اس موذی مرض سے دور رہے۔ دوم تمباکو نوشی کے اثرات تو خاص طور سے بیحد خطرناک ثابت ہوتے ہیں جو بعد میں کینسر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو اس کے عادی ہیں مگر انھیں کچھ بھی نہیں ہوا۔

حالیہ تحقیقات سے تمباکو کے مضر اجزا کی جانکاری حاصل ہوئی ہے جو بعد میں کینسر کے باعث بنتے ہیں جن میں نکوٹین ایک خطرناک زہریلا مادہ ہے۔ ۴۰ سے ۶۰ ملی گرام نکوٹین ایک نوجوان کے عمل تنفس کو مفلوج کرنے کے لیے کافی ہے۔ ۵۰۰ ملی گرام نکوٹین انجکشن سے سیدھے خون میں پہنچنے پر اس شخص کی موت یقینی ہے۔ ایک سگریٹ میں تقریباً ایک ملی گرام، پائپ میں ۲.۷ ملی گرام اور سگار میں ۳.۶ ملی گرام سے ۷.۹ ملی گرام تک نکوٹین پائی جاتی ہے۔

جرمن اور امریکہ کی ایک تحقیقی رپورٹ سے ثابت ہو چکا ہے کہ تمباکو نوشی سے ہی زبان، گلے اور پھیپھڑے کے

کینسر ہوا کرتے ہیں۔ یہ مادے پھیپھڑے سے خون اور تب گردوں تک پہنچ جاتے ہیں جہاں چھننے کے بعد مثانہ میں آکر مثانہ کے کینسر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بائرڈین مادہ بھی کینسر پیدا کرتا ہے۔ بنزو پائرن مادہ کولتار سے مشابہ ہے جو کینسر پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ کاربالک ایسڈ سے عموماً منھ کا کینسر ہوا کرتا ہے۔

دنیا کے مختلف خطوں میں خصوصاً افریقی اور ایشیائی ممالک میں جگر کے کینسر نے ایک بھیانک مسئلہ پیدا کر دیا ہے جس کے لیے ٹیکوں کے استعمال پر زور دیا جا رہا ہے۔ عالمی شہرت یافتہ سائنسداں اور نوبل لاریٹ پروفیسر بلوک برگ نے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس میں اپنے لکچر کے دوران بتایا کہ ہیپاٹٹس بی نام کے وائرس جگر کینسر کے لیے ذمہ دار ہیں۔ اس وائرس سے الگ کیے گئے "سرفیس اینٹی زن" نامی مزاحمتی عنصر سے جو ٹیکہ تیار کیا گیا ہے وہ بڑا ہی کارآمد ثابت ہوا ہے لیکن اس سے صرف ایک مرتبہ بیماری ہونے سے سرطانی خلیات کے بڑھنے کی رفتار کو کم کیا جا سکتا ہے، لیکن پوری طرح کنٹرول کرنا ممکن نہیں۔ پروفیسر برگ کو اسی "سرفیس اینٹی زن" کے لیے نوبل انعام ملا تھا۔ اسے آسٹریلین اینٹی زن کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

ایسے وائرس بتدریج بڑھتے ہیں جس میں کافی وقت لگتا ہے۔ ڈاکٹر برگ کے مطابق مردوں میں عورتوں کے نسبتاً یہ مرض زیادہ پایا جاتا ہے۔ جگر کینسر سینیگل اور موزامبک جیسے افریقی ممالک اور ایشیا میں چین، جاپان اور تائیوان میں خطرناک اور پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔ سینیگل میں ایک ہزار لوگوں میں سے ۳۰ اور موزامبک میں ۱۰۰ لوگ اس مرض سے دوچار ہیں۔ ایسے ممالک میں ٹیکہ لگانے کا زور ہے۔ مزید تحقیق سے پتہ چلا کہ مچھر اور کھٹمل وغیرہ سے افریقی ممالک میں اس طرح کے کینسر زیادہ ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ وائرس کے یہ پرپوٹر ہیں۔ پروفیسر موصوف نے ہندوستان کے متعلق بتایا کہ یہاں اس وائرس سے زیادہ نان A اور نان B وائرس ایکٹیو ہیں جس پر تحقیق کی جا رہی ہے۔

نئی تحقیق سے کچھ اور اہم باتوں کا انکشاف ہوا ہے کہ بعض قسم کے کینسر مخصوص جگہ پر ہی ہوا کرتے ہیں۔ برطانیہ میں پھیپھڑے کا کینسر ہندوستان سے چھ گنا زیادہ ہے جب کہ الیسافیزیل کینسر اتری فرانس میں ہنگری سے ۶ گنا زیادہ ہے۔ حالیہ سروے کے مطابق اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں مسوڑھے کے کینسر کے مریضوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ وہاں تمباکو نوشی کا رواج عام ہے جاپان میں پیٹ کا کینسر مسئلہ بنا ہوا ہے۔ تقریباً ایک لاکھ کی آبادی پر وہاں ۹۰ لوگ اس مرض کے شکار ہیں۔ جب کہ امریکہ میں ان کی تعداد ۱۵ ہے۔ مختصر یہ کہ جن جگہوں پر کارسینوجینس ذرے (کینسر پیدا کرنے والے ذرے) کرۂ ہوا میں زیادہ ہیں وہاں اس طرح کے کینسر زیادہ ہوں گے۔

سائنس دانوں نے کینسر پیدا کرنے والے عناصر کا پتہ لگانے کے لیے کچھ اور تجربے کیے ہیں جن میں چوہوں پر کیے گئے عمل بڑے ہی مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اس تحقیق سے چوہوں میں کینسر کے عناصر کی وجہ ایک جین بتایا گیا ہے جو ان چوہوں کے وائرس سے حاصل کیا گیا۔ ٹھیک اسی طرح کی بات انسان کے سرطانی خلیات میں بھی پائی گئی۔ انسانی جسم میں موجود (D.N.A) میں جہاں لاکھوں اقسام کے جین ہیں وہی سرطانی بیج بھی ہوتے ہیں۔

چوہوں کے ان وائرس کے اندر ایک چھوٹا قطعہ ہوتا ہے جو جینیاتی خبریں فراہم کرتا ہے جس سے بے ترتیبی کی شکل پیدا ہو جاتی ہے اور عام خلیات ابنارمل ہو کر ایک دوسرے پر چڑھ جاتے ہیں۔ چوہوں کے خلیات میں ہدایات قطعہ کے دبیز حصے سے پہنچتی ہے جب کہ دوسرے حصے سے مخصوص قطعہ رنگولیٹ کیے جاتے ہیں جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ کینسر کے لیے صرف جین ہی ذمہ دار نہیں ہے۔ کیونکہ چوہوں میں وائرس سے بغیر رابطہ بنائے کینسر کا ہونا غیر یقینی ہے۔

بیشتر ماہرین طب نے کینسر کی اہم وجہ تابکاری اور کیمیات بھی بتایا ہے۔ تجربے کے دوران دیکھا گیا کہ ایک نارمل چوہے کے خلیات کو کارسینوجین نامی کیمیا میں بدلا جائے اور

بھر سرطان شدہ خلیات کے (D.N.A) کو غیر سرطانی چوہوں
ے خلیات میں ملایا جائے تو یہ خلیات بھی سرطانی ہو جاتے ہیں
دوسری جانب انسانی مثانہ سے سرطانی خلیات کے متعلق
یا گیا کہ یہ چوہوں کے خلیات میں کینسر پیدا کرنے میں معاون
ہے۔

کروموسوم کی ابنارمل تعداد ہی کینسر کی سب سے بڑی وجہ ہے
س لیے سائنس داں اس بات کے لیے بھی کوشاں ہیں کہ ابتدائی
دور میں ہی اگر خلیات میں پیدا ہونے والے غیر ضروری پروٹین
پر روک لگ جائے تو کسی حد تک اس تاریک پہلو میں امید کی
ی کرنیں نظر آسکتی ہیں۔

آج عام طور پر ٹی اسٹالوں یا دوران سفر پلیٹ فارم پر چینی
ی جگہ سیکرین ملی چائے زیادہ تر پینے کو ملتی ہے۔ دراصل سیکرین
یں چینی سے ۵۰۰ گنی زیادہ مٹھاس پائی جاتی ہے۔ ۱۹۶۰ء سے اس کا
ستعمال زیادہ ہونے لگا ہے جب کہ کیمیائی نقطۂ نظر سے سیکرین
رتھو سلفو بنیزوئیک ایسڈ امائڈ ہے اس کے زیادہ استعمال
سے بھی عموماً پیشاب کے راستے پر کینسر ہوا کرتا ہے کیونکہ کیمیاوی
بناوٹ ہی کچھ ایسی ہے جس سے پیشاب کے راستے کے حصے میں
آسانی سے پہنچ جاتا ہے۔

امریکہ کے نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ کے سائنس داں درج بالا
باتوں سے متفق نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا کہنا ہے کہ سیکرین کے
کم استعمال سے ایسا کوئی خدشہ نہیں رہتا لیکن پورے دن اگر
کوئی شخص تقریب ساتھ مرتبہ سیکرین ملی پیالی اشیاء کا استعمال کرے
و کینسر ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کی رپورٹ
کے مطابق یہ (Permotion) کا کام کرتی ہے اور براہ راست موذی
مرض کو بھیانک شکل میں بدل دیتی ہے۔

ہر نئی تحقیق کے بعد امیدیں بڑھ جاتی ہیں اور ایسا معلوم
ہونے لگتا ہے کہ کینسر جیسے مہلک مرض پر فتح حاصل کر لی گئی ہے
لیکن آہستہ آہستہ تمام باتیں مایوسیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں جب
دوبارہ یہ سننے کو ملتا ہے کہ فلاں تحقیق سے مرض کا مکمل علاج ممکن نہیں۔

ہماری معلومات اب تک یہیں تک ہیں کہ حیاتین (وٹامن) ہر
انسان کو صحت مند رہنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ وٹامن سی ایک
بالغ کے لیے ۶۰ ملی گرام روزانہ استعمال کرنا چاہیے۔ سائنس دانوں نے
اب یہ مقدار ۴۵ ملی گرام بتائی ہے لیکن نوبل انعام یافتہ سائنسداں
لنس پاؤلنگ کی تحقیق سے اس وقت سنسنی پھیل گئی جب انھوں نے
بتایا کہ حیاتین (وٹامن) سی کٹ سردی اور کینسر کے لیے بھی مفید ہے
اس کی ۱۰۰۰۰ ملی گرام مقدار تک کھانے کا مشورہ دیا مگر بعد میں
خود انھوں نے دیکھا کہ زیادہ مقدار سے کینسر ہونے کا خدشہ بنا رہتا
ہے کیونکہ زیادہ مقدار خلیات میں میوٹیشن پیدا کرتا ہے۔

مندرجہ بالا باتوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے
کہ کینسر کا دائرۂ اثر جہاں محدود تھا اب دن بہ دن بڑھتا ہی
جارہا ہے۔ لوگ اسے ہلاکت آفریں اور دائمی تصور کرنے لگے
ہیں۔ عالمی سطح پر موضوع بحث اور تحقیق و تجسس کا مرکز بنا
ہوا ہے۔ طب جدید نے بہت ساری دوائیں اور تشخیص آلات
تو ایجاد کر دیے مگر سب ہی کینسر جیسی بیماری کے سامنے
گھٹنے ٹیکتے نظر آرہے ہیں۔

ڈاکٹر امان ڈائریکٹر اینڈ وارکین اسپتال میسور
اور عالمی شہرت یافتہ اوسکر پروفیسر نے کینسر پر بڑی اہم تحقیق
کرکے دنیا کو حیران کر دیا ہے۔ انھوں نے قرآن پاک کی
آیات کی بنیاد پر کینسر کے لیے دوائیں ایجاد کی جائیں۔ اس
مفید تحقیق سے متاثر ہو کر اقوام متحدہ کا ادارہ عالمی صحت
تنظیم (W.H.O) نے انھیں ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری
دی ہے۔

سائنس دانوں کی اس سعی و جستجو سے اندازہ ہوتا ہے
کہ جلد ہی اس موذی مرض پر قابو حاصل کر لیا جائے گا اور
مستقبل قریب میں کینسر کا مرض صرف ایک بھیانک کہانی
کی شکل میں لوگوں کو یاد رہے گا۔

(تہذیب الاخلاق جلد ۷، ش ۳۔ مارچ ۸۸ء)

# کہانی الیکٹرانکس کی

سید حسن شاہد رضوی

ریڈیو، ٹیلی ویژن، آواز اور ویڈیو کے مقناطیسی ٹیپ ریکارڈر، مائکرو پراسسر کمپیوٹر، ڈجٹل گھڑیاں اور جیبی کلکیلٹر، ٹیلی فون اور ٹیلی پرنٹر اور اسی قسم کے لاتعداد دوسرے الیکٹرانک آلہ جات اب عام ہو گئے ہیں اور شہروں کے بچے ویڈیو کھیلوں کے لیے اکثر ضد کرتے پائے جاتے ہیں۔ درحقیقت ہمارے معاشرے اور سماجی زندگی میں الیکٹرانکس کچھ یوں گھر کر گئی ہے کہ ان معلومات اور ان سے حاصل شدہ وسائل ہماری موجودہ دور کی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ الیکٹرانکس کی ترقی اور ہمہ طرفہ ترقی سے ہمارے زمانے کی ہر بڑی اور چھوٹی صنعت نے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔

الیکٹرانکس کی ترقی کوئی پانچ دس سال کی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے علوم و فنون کی طرح ایک مستقل اور مستعدی اور جان فشانی کے ساتھ کی ہوئی کوششوں کا گراں قدر عطیہ ہے۔ ہزاروں سائنس دانوں، بے شمار انجینروں اور لاکھوں ٹیکنیشینوں کی جدوجہد آج بھی جاری ہے کہ کس طرح سے اس علم کی وسعتوں کو بڑھایا جائے اور کیوں کر ان نتائج کو تعمیری یا تخریبی کاموں کے لیے موزوں بنایا جائے اس علم و فن کی ٹکنیکل جان کاری رکھنے والے ممالک ایک دوسرے سے جنگی اسلحہ کی بہتر مار اور تردید کرنے والے اسلحہ کی ایجاد میں سرگرم کوششیں کر رہے ہیں اور سبقت لے جانے پر زیادہ طاقتور کہلانے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

ذیل میں ہم یہ کوشش کر رہے ہیں کہ عام پڑھنے والوں کو اس بات سے روشناس کرائیں کہ اس گراں قدر علم و فن نے کن کن مراحل سے گزر کر کن کن مایۂ ناز اور باصلاحیت اشخاص غور و فکر، جدوجہد اور لیڈرشپ سے مختلف کلیات کو یکجا کر کے عملی جامہ پہنایا۔ وہ کون سی ضروریات تھیں جن کی وجہ سے اچھی تحقیق کے لیے درکار سرمایہ مہیا ہوتا رہا ہے اس علم میں کم و بیش ہر پانچ چھ برس کے وقفے پر جان کاری دوگنی ہوتی رہی۔ یہی نہیں، بلکہ تیز تر معلومات حاصل کرنے کی غرض سے کچھ اور علوم و فنون نے جنم لیا اور پروان چڑھے۔ ان کی حیثیت شروع میں تو ضمنی پیداوار جیسی تھی مگر دھیرے دھیرے مزید تحقیقات اور منظم کاوشوں کی وجہ سے انھیں ایک الگ تھلگ علم کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ بہر حال ہم یہ دیکھیں گے کہ عالمی لڑائیوں کی پریشانیاں جہاں پر اپنے گھناؤنے داغ چھوڑ گئی ہیں وہیں پر ایسی گراں قدر بیش قیمت اور نمایاں ایجادات کی مولود ثابت ہوئی ہیں جو بعد میں ہمارے لیے نہایت سود مند اور کارآمد قرار پائیں۔

کہانی بیان کرنے سے پہلے ہم ایک بات کا اعتراف کر لینا چاہتے ہیں کہ ذیل کے بیانات میں ہم ہر پہلو پر شاید

رابر زور نہ دے پائیں اور قارئین کو لگے کہ گویا ایک طرف تو ہم طرف دارانہ رخ اپناتے ہیں تو دوسری طرف غیر ذمہ دارانہ ۔ یہ کمی چونکہ ہر تاریخ نویس تک میں پائی جاتی ہے اور ہم ٹھہرے محض ایک کہانی گو، اس لیے معافی کے مستحق ہوے ۔ قارئین اس امر سے واقف ہیں کہ جب ہم کبھی کسی دور کی تشتے پر نگاہ ڈالتے ہیں تو بہت زیادہ غور و خوض سے کام نہ لے کر بس ایک سرسری جائزہ لے لیا کرتے ہیں ۔ اگر وہ تشتے قریب میں ہوتی تو اس کی مجموعی جھلک کو نہیں سراہتے بلکہ فرداً فرداً اس تشتے کی ہر چیز کا نہایت باریکی سے گویا خوردبین لگا کر تجزیہ کرتے ہیں ۔ پس ہماری کہانی میں ساری باتیں پوری پوری کہنا مشکل ہوگا ۔ ہم کہیں کہیں تو صرف سرسری طور پر مجموعی اثر اور تشکل بیان کر کے آگے بڑھ جائیں گے مگر زیادہ اہم باتوں کو تفصیل اور زور و شور سے بیان کریں گے ۔

جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں سائنس اور ٹکنالوجی کی تاریخ بیان کرتے وقت لڑائیوں اور جنگوں کے دور کو علم کی ترقی کے اعتبار سے بے حد عمدہ دور گردانا جائے گا ۔ ہم اس دور کی تباہیوں اور بربادیوں کو سرے سے بھول جائیں گے اور ان تمام نمایاں تحقیقات اور سود مند دریافتوں کو گردانیں گے جن سے بنی نوع انسان کے رہن سہن میں بہتری پیدا ہوئی اور اس کی علم حاصل کرنے کی کوششوں کا نتیجہ سامنے آیا ۔ دراصل الیکٹرانکس کی بیشتر ترقی جنگ کی صفات اور دور مار والے ہتھیاروں کی دستیابی ان کے استعمال اور بالخصوص ٹیلی گائڈنگ (TELEGUIDING) ٹیلی ڈٹکشن (TELEDETECTION) وغیرہ جیسے اعمال کو عملی شکل دینے کے سلسلے میں ہوئی ۔ ایسے تمام کام گو کہ پوشیدہ طور پر انجام دیے جاتے رہے ہیں ورنہ ایک طاقت یا ایک ترقی یافتہ ملک دوسری طاقت یا دوسرے ترقی یافتہ ملک سے آگے ہو جانے کی دوڑ نہ لگا پائے گا ۔ ترقی پذیر یا غیر ترقی یافتہ ممالک تو فیر طفیلیوں سی حیثیت کے حامل ہیں ۔ انھوں نے زیادہ سے زیادہ پرانی ٹکنالوجی کو اونچے داموں خرید کر یا درآمد کر کے ہی خوش ہو لینے میں چین اور عافیت سمجھ رکھی ہے کچھ تو صرف ساز و سامان کو ترقی یافتہ ممالک سے درآمد کرا لیتے جس کے عوض وہ اپنے بیش قیمت کچے مال کو سستے داموں ان ترقی یافتہ ممالک کو بیچنے پر مجبور ہیں ۔

پھر بھی کچھ عرصے کے بعد ان ہتھیاروں، تحقیقات اور ایجادات کے بارے میں پتہ چل ہی جاتا ہے ملٹری اسٹریٹیجی (MILITARY STRATEGY) کے نقطۂ نظر سے خفیہ ایجادات کے ذریعے دشمن کو لڑائی کے دوران حیرت زدہ کر کے انگشت بدنداں کیا جا سکتا ہے اور سکتے میں آئے ہوئے دشمن سے تکنیکی برتری کی بنا پر لڑائی جیتی جا سکتی ہے، یا لڑائی کا رخ اپنے حق میں کیا جا سکتا ہے ۔ مثال کے طور پر برطانیہ کی راڈار (RADAR) کی دریافت چوتھی دہائی کے شروع میں ہی کر لی گئی اور جرمن سائنسدانوں اور جنرلوں کو ۱۹۴۲ تک اس کی بھنک بھی نہ لگنے پائی تھی اور یہی دریافت کیپ ملاپن کی بحری جنگ میں برطانیہ کے کام آئی اور اس کی نمایاں کامیابی کا باعث ثابت ہوئی ۔ اسی طرح جرمنی کی مقناطیسی سرنگوں (MAGNETIC MINES) کی خطرناک اور پوشیدہ دریافت نے برطانیہ اور اس کے شریک ساتھیوں کے جگہ جگہ پر دانت کھٹے کیے ۔ الائڈ فورسز (ALLIED FORCES) نے دوسری عالمی جنگ میں فاتح ہونے کے بعد جب جرمنی کے بحری جہازوں پر قبضہ کیا تو متعجب اور ششدر رہ گئیں کہ جرمن سائنس دانوں اور تکنیکی ماہرین نے کس اعلیٰ درجے کی مہارت اور چالاکی کے ساتھ مقناطیسی ایمپلی فائرس (MAGNETIC AMPLIFIERS) کو استعمال کیا تھا ۔ قارئین اس امر سے اتفاق کریں گے

کہ یہ ممکن ہے کہ کچھ دریافتیں، کچھ ایجادات، کچھ تحقیقات
اور انکشافات جنگوں اور لڑائیوں میں کام آگئے ہوں
اور فروغ علم میں ان کا حصّہ ہمارے لیے صفر ہو کر رہ گیا ہو۔
اب ہم تمہید ختم کرتے ہیں اور ان تمام دریافتوں
کا بیان کرنے جا رہے ہیں جو دوسری عالمی جنگ کے بعد
ہمارے سامنے آئیں۔ ہم ان بیش قیمت اور گراں قدر
دریافتوں کو نظر انداز نہ کریں گے جو اس صدی کی تیسری
اور چوتھی دہائی میں نمایاں قرار پائیں۔
آئیے پہلے ہم سلسلہ وار جائزہ لیں کہ سنہ ۱۹۴۰ء سے
قبل ہم کتنا کچھ جان سکے تھے اور کیا کچھ کر چکے تھے۔

## ریڈیو نشریات

ریڈیو لہروں (RADIO WAVES)
کی مدد سے بغیر تار کے پل بھر میں اپنی بات کو سمندر یا
زمین کی بڑی بڑی دوریوں تک مرضی کے مطابق پہنچا دینے
کا فن ہمیں پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں ہی آ گیا تھا گویا
ہم نے فاصلوں کو مختصر کر دیا تھا۔ اس دریافت کے پہلے
ہی ٹیلی گراف (TELEGRAPH) کے نظام کا بہت
سود مند استعمال ملٹری، اخبار والوں اور دیگر شہریوں
میں رائج ہو چکا تھا۔ مگر ۱۹۱۴ء میں جرمن اور روسی
فوجوں میں تانن برگ (TANNEN BERG) کی مشہور
لڑائی میں کمیونیکیشن (COMMUNICATION) کے لیے
ریڈیو لہروں کا تجربہ کیا گیا اور یہ فیصلہ کن ہتھیار بن
بیٹھا۔ لڑائی کے مقاصد کے علاوہ ریڈیو کو امن پسند
سیاست کے پرچار اور خبروں کی نشریات کے کام میں بھی
لایا جانے لگا۔ یہ سب کچھ ۹-۸ برس کے چھوٹے سے
وقفہ کی کاوشوں کا حصول تھا۔ ۱۹۰۶ء میں لی ڈیفارسٹ
(LEE-DE-FOREST) نے آڈیان (AUDION)
یعنی تین الیکٹروڈز (ELECTRODE) والا ویکیوم ٹیوب
ایجاد کیا تھا جس میں براہ راست گرم ہونے والا کیتھوڈ
(CATHODE) لگایا گیا تھا۔ یہ کیتھوڈ خالص ٹنگسٹن کے
ہوتے تھے اور کوئی ۲۸۰۰ ڈگری سلسیس درجہ حرارت
پر الیکٹران خارج کرتے تھے۔ ان الیکٹران کی نقل و حرکت
کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک جالی دار گرڈ (
کیتھوڈ کی قربت میں نصب کیا گیا تھا اور ان سے خارج
ہو کر جانے والے الیکٹران دھات کے بنے شیٹ
کے مقابل اونچے وولٹیج (VOLTAGE) پر کام کرنے والے
اینوڈ (ANODE) پر اکٹھا کر کے بجلی کے سرکٹ (
میں ڈالے جا سکتے تھے۔ کیتھوڈ کی بے پناہ حرارت اور
کرنٹ کی شدت کی وجہ سے تانبے یا تانبے جیسی
دھات سے بنے اینوڈ بہت جلد گرم ہو جاتے۔
انھیں ٹھنڈا کرنے کے ذرائع تلاش کرنے پڑے۔
مگر جلد ہی ایسے عناصر تلاش کر لیے گئے جو قدرے کم حرارت
پر الیکٹران خارج کر سکتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ
کو پانی کے ذریعے ٹھنڈا کرتے رہنے کا گر بھی آ گیا۔
اب زیادہ توانائی کے ساتھ ترنگیں نشر کی جا سکتی تھیں
کیونکہ زیادہ پاور ہینڈل کرنے والے ٹیوب آسانی کے
ساتھ دستیاب ہونے لگے تھے۔ جنگ کے فوراً بعد کے
دور میں خاصے طاقتور ریڈیو اسٹیشن چلائے گئے۔
ریڈیو کی سماجی ضرورت کو سمجھا جانے لگا۔ تقاریر
اور خبریں ریڈیو سے نشر ہونے لگیں اور کم و بیش
میں ریڈیو تنظیم قائم ہو گئی۔ اس اثنا میں دو نمایاں
دریافتیں بیان کی جانے کی مستحق ہیں۔ ایک
کی حرارت کم کرنے کی بابت آکسائڈ کوٹیڈ (OXIDE
(COATED) کیتھوڈ کی دریافت جو تقریباً ۱۲۰۰ ڈگری
پر الیکٹران اُٹھنے لگتے تھے اور جن کی دستیابی سے
ہائی فڈلٹی ری پروڈکشن (HIGH FIDELITY -
(REPRODUCTION یعنی کم و بیش آواز کی سمت
کے ساتھ ادائیگی کے ہنر کو از بر کر لیا اور دیگر یہ کہ

دوریوں تک آواز کے پرواز کے بابت پہلے قدم اُٹھلے دوسرے زیادہ دوری تک پرواز کرنے والی شارٹ ویو (SHORT WAVE) جن کی ویو لنگتھ (WAVE LENGTH) ڈیسی میٹرک ویعنی دس سینٹی میٹر سے لے کر ایک میٹر تک ہوتی ہیں، کی دست یابی اور اُن کا فوری استعمال ان لہروں پر آواز کو دور دور تک بآسانی پہنچایا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اِن سے ہر قسم کی خبر رسانی میں نمایاں ترقی حاصل کی گئی۔

اس دور کی ایک ضمنی پیداوار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ شارٹ لہروں کی پرواز سے قریبی خلا (SPACE) کو سمجھنے کی کاوشیں شروع ہوئیں اور خاص طور سے ہیوی سائڈ کینیلی پرت (HEAVI SIDE KENNELY LAYER) جو زمین کی سطح سے کوئی ۲۰ کلومیٹر اوپر واقع ہے، کا انکشاف ہوا۔ مزے کی بات ہے کہ شروع شروع میں اس پرت کا فائدہ شوقیہ ریڈیو یاروں نے اُٹھایا اور بعد میں انجنیروں نے ریڈیو ترنگوں کو منعکس (REFLECT) کرانے کا فن سیکھا۔ فزکس والوں نے پہلے تو اس دریافت پر دھیان ہی نہیں دیا۔ مگر بعد میں ان عملی نتائج کی روشنی میں اس پرت کی فزکس کو سمجھا اور سیکھا گیا اور ایکو (ECHO) کے اصول کو کام میں لاکر اس پرت کی اونچائی اور اس کے اجزاء کا تخمینہ نکالا جاسکا۔ درحقیقت یہی طریقہ کار آگے چل کر راڈار (RADAR) کی ایجاد کا نشان دہ بنا۔ جس آلے سے ریڈیو ترنگوں کی مدد سے سمت اور دوری کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جاتا ہے۔

ریڈیو لغویات سے کا طریقہ سلاٹ۔ ایک سرسری تجربہ

آواز یا موسیقی پیچیدہ قسم کے ذرات کے وائبریشن (VIBRATION) کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے پرواز کے لیے کسی سنڈری میڈیم (MEDIUM) کی ضرورت ہوتی ہے ہم مان سکتے ہیں کہ آواز انواع و اقسام کے سادہ لوح وائبریشن کا ایک اجتماع ہے۔ ہر سادہ لوح وائبریشن کچھ مخصوص وقفہ کے بعد اپنی تمام صفات شروع کرتا ہے اور اس کی ایک خاص صفت اس کا ٹائم پیریڈ (TIME PERIOD) ہوا۔ جو اس کی فری کیونسی (FREQUENCY) کا الٹا ہوتا ہے۔ دوسری صفت وائبریشن کی صحت یعنی اس کا ایمپلی ٹیوڈ (AMPLITUDE) جو اس کے کمزور یا طاقتور ہونے کی نشان دہی کرتا ہے۔ تیسری صفت فیز (PHASE) کا زاویہ وائبریشن کے مبنع پر یعنی صفر وقفہ پر اس کی صحت کا پتہ دیتا ہے۔ یہ عموماً یونانی زبان کے حرف نائی [ φ ] سے دکھلایا جاتا ہے۔ وائبریشن کی فوری صحت ایک مساوات کی شکل میں پیش کی جاسکتی ہے۔

$$a(t) = A \sin [2 \pi \phi t + \phi]$$

یہاں t وقت بتاتا ہے اور sine ایک ٹرگنامٹری کا رشتہ ہے جو کسی زاویہ کے عمود اور وتر کے تعلق کی نشان دہی کرتا ہے۔ کسی بھی CIRCLE کے محیط دائرہ اور قطر کی نسبت ہے۔ ریڈیو ترنگیں برقی مقناطیسی ترنگیں ہیں اور یہ روشنی کی رفتار یعنی خلا میں تین لاکھ کلومیٹر فی سکنڈ کی رفتار سے پرواز کرتی ہیں۔ لیس ان کی فری کیونسی ہرے رنگ کی روشن شعاعوں کے مقابلے کئی لاکھواں حصہ ہوتی ہیں۔ ہاں آواز کی فری کیونسی کوئی ۲۰ تا ۲۰۰۰ ہرٹز (HERTZ) تک ہوتی ہے اور اگر ۲۰۰۰ ہرٹز کی فری کیونسی کو برقی مقناطیسی ترنگ بنایا جائے تو پرواز تو کرسکتی ہیں مگر ویو لنگتھ کے کئی کلومیٹر میں ہوجانے کے باعث ان کا نشر کرایا جانا ناممکن نہ سہی انتہائی دشوار ضرور ہے۔ اس دشواری کو ہم یوں دور کر دیتے ہیں کہ زیادہ فری کیونسی اور کم ویو لنگتھ والی ریڈیو ترنگوں کی کسی ایک صفت کو آواز کی ترنگوں کے مطابق مستقل بدلنے کی صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس عمل کو ماڈولیشن (MODULATION) کہتے ہیں اور جس صفت کی تبدیلی آواز

کے مطابق ہو اس کے لحاظ سے ماڈولیشن کا نام ہوتا ہے چنانچہ کلیاتی نظریے سے تین طرح کے ماڈولیشن یعنی ایمپلی ٹوڈ ماڈولیشن (A.M) فری کیونسی ماڈولیشن (F.M) اور پیز ماڈولیشن (P.M) ہوتے ہیں۔

ماڈولیشن کے عمل کے بعد یہ قاصد ترنگیں کئی طریقوں سے نشر کرا دی جاتی ہیں اور تھوڑی بہت صحت و توانائی کے ساتھ ریسیور کے ذریعے پکڑ لی جاتی ہیں اور اس احتیاط کے ساتھ کہ فضا میں موجود دوسری ترنگوں سے علیحدہ کر لی جائیں اور غیر ضروری اور مہمل آوارہ ترنگیں ان پر اپنا کم سے کم اثر ڈالیں۔ ریسیور میں پہلے تو یوں ہی ایمپلی فائر کے ذریعے باصحت کی جاتی ہے اور پھر آواز کی ترنگوں کو یوں ہی کے کر چھان لیا جاتا ہے اور مناسب صحت کے ساتھ اس دور کی آواز کو پلک جھپکنے سے بھی کم تاخیر کے ساتھ سنا جا سکتا ہے۔ ماڈولیشن کردہ ریڈیو ترنگوں سے آواز زیادہ حاصل کرنے کے عمل کو ڈی ماڈولیشن (DEMODULATION) یا ڈیٹکشن (DETECTION) کہتے ہیں۔

ایک عرصۂ دراز سے ریسیور میں ایک خاص ترکیب کو استعمال کرتے ہیں جسے سپر ہیٹروڈائننگ (SUPER HETERODYNING) کہتے ہیں۔ اس میں کسی بھی فری کیونسی کی ماڈولیشن شدہ ریڈیو ترنگوں میں موجود اطلاع (INFORMATION) کو ایک پہلے سے طے شدہ فری کیونسی جسے درمیانی فری کیونسی (INTERMEDIATE FREQUENCY) کہتے ہیں میں تبدیل کر لیا جاتا ہے اور پھر آسانی سے توانا اور تندرست کر کے ڈیماڈولیٹ کرا لیتے ہیں۔ گویا مرض چاہے جو بھی کھجلی میں تبدیل کرا کے صرف کھجلی دور کرنے کا مرہم دے دیا جاتا ہے۔ کاش ادویات میں یہ کلیہ عملی شکل اختیار کر لے۔

(پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ——— یکم ستمبر ۸۵ء)

"انسانوں میں نیک وہی ہوگا جس نے بہت سی نیکیاں کی ہوں گی مگر سب سے زیادہ نیک وہی ہوگا جس نے ایسی نیکیاں کی ہوں جو سب نیکیوں سے افضل اور اعلیٰ ہوں۔"

سر سید

# دینی مدارس ـــــ مسایل اور امکانات

۱۵۷ ـــــــــــ ۱۷۲

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۱ شمارہ ۹-۱۰ (ستمبر-اکتوبر) ۱۹۹۲ء

# اسلامی درسگاہوں کے اسباب زوال اور ان کا علاج

مفتی نظام الدین رضوی

بچپن سے سنتا آیا ہوں کہ دنیا میں صرف ایک چیز ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں اور وہ چیز ہے "موت"۔

لیکن مسلم قوم کی مساعی جمیلہ سے ایک چیز اور دریافت ہو چکی ہے جس میں ارباب دانش کے مابین کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا اور وہ چیز ہے "مسلمانوں کا علمی زوال"۔

آج کے زمانے میں اس امر پر تقریباً سب کا اتفاق ہو چکا ہے کہ مسلم قوم تمام (قابل ذکر) اقوام عالم میں تعلیم کے میدان میں سب سے زیادہ پیچھے اور نہایت پسماندہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ "موت" اور علمی زوال کے درمیان بڑی یگانگت پائی جاتی ہے۔ صحیح معنوں میں زندگی عبارت ہے علم سے۔ جب علم ہی نہیں تو زندگی بھی نہیں۔ اس لیے بڑی بھول ہوگی کہ اگر ہم نے علمی زوال اور موت کو الگ الگ شے تصور کیا ہ

اخو العلم حی خالد بعد موتہ
واوصالہ تحت التراب رمیم
و ذو الجہل میت وھو ماش علی الثری
یظن من الاحیاء وھو عدیم

[صاحب علم اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے اپنی موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا، حالانکہ اس کے اعضاء مٹی میں بوسیدہ ہو چکے ہوتے ہیں اور جاہل مردہ ہے، حالانکہ وہ زمین پر چلتا پھرتا ہے، لوگ تو اسے زندہ سمجھتے ہیں لیکن واقع میں اس کی کوئی ہستی نہیں ہوتی]۔

یہ اس قوم کی زبوں حالی کا تذکرہ ہے جس کے فرزندوں نے کبھی علوم و فنون اور تحقیقات و انکشافات کے میدان میں ساری دنیا میں ایک امتیازی مقام حاصل کیا تھا اور جس کے ایک فرد کے متعلق پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لو کان العلم معلقا بالثریا لنالہ رجل من اھل فارس۔

[اگر علم ثریا پر ہوتا تو بھی اہل فارس کا ایک شخص (امام ابو حنیفہؒ) اسے حاصل کر لیتا]

مگر ع

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل

ہم تفصیل میں نہ جا کر صرف مدارس کے گھٹتے ہوئے تعلیمی اسباب اور علل کا ایک خاکہ پیش کرتے ہیں جو درج ذیل ہے:

## اسباب زوال

۱۔ سرمائے کی کمی۔ ۲۔ انتظامیہ کے اختلافات اور ان کی گروہ بندی۔ ۳۔ تعلیم کی طرف سے اساتذہ کی

ناالتفاتی' یا صرف تنخواہ کی حد تک لگاؤ ۔ ۴۔ قابل و تصنیفی اساتذہ کی کمی ۔ ۵۔ اساتذہ کی قلت اور بعض بعض جماعتوں میں طلبا کا ہجوم ۔ ۶۔ مدارس کا غیر تعلیمی ماحول ۔ ۷۔ طلبا کی تن آسانی، عیش پسندی محنت سے گریز اور تقریر سے حد درجہ دلچسپی ۔ ۸۔ سخت امتحان سے غفلت اور نقل و چوری میں ڈھیل یا تعاون ۔ ۹۔ کتابوں کا نافراہمی ۔ ۱۰۔ انعام تعلیم و نظام درس کی خامیاں ۔

چند اسباب کی وضاحت: ہم چند اہم اسباب کی قدرے وضاحت کرتے ہیں:

سرمایہ کی کمی مدرسے کے لیے ہو یا اساتذہ کے لیے یا طلبا کے لیے۔ یہ بہرحال اعلیٰ تعلیم کے انتظام وحصول کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

طلبا کے لیے کمی کی صورت میں حصول علم کے لیے جتنا وقت درکار ہے وہ اتنا وقت نہیں دے سکتے، جب کہ علم کی وسعت کے لحاظ سے وقت کی وسعت لازم وضروری ہے لیکن اس کا علاج بایں طور سہل ہو جاتا ہے کہ مدرسے سے ان کے لیے وظیفہ کا انتظام ہو جائے۔

اساتذہ کے لیے سرمایہ کی کمی انھیں تدریس کے ساتھ دوسرے ذرائع معاش بالخصوص "خطابت" کی طرف متوجہ کرے گی۔ حالانکہ تدریس وخطابت باہم ایک دوسرے کی ضد و منافی ہیں یا کم از کم دونوں میں ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور تال میل کا کوئی گوشہ نہیں پایا جاتا۔ کسی بھی مدرسے میں اساتذہ کے زمرے میں "خطباے کرام" کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی تعلیم بھی اسی کے تناسب کے لحاظ سے کمزور سے کمزور تر ہوگی۔

مدرسے کے لیے سرمایے کی کمی درج بالا دونوں امور کا سبب ہونے کے ساتھ لائق اساتذہ اور کتابوں کی قلت کی بھی باعث ہوگی جو براہ راست تعلیمی ترقی پر اثر انداز ہوں گے لیکن اس کا علاج کوئی دشوار نہیں جیسا کہ ہم آئندہ واضح کریں گے۔

انتظامیہ کے باہمی مشاجرات و اختلافات کا تعلیم پر دو طرح سے اثر پڑتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اساتذہ الا ماشاء اللہ کافی حد تک آزاد ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ارکان ادارہ کو آپسی رقابتوں اور جھگڑوں سے ہٹ کر تعلیمی نظام کی طرف توجہ کی فرصت ہی نہیں مل پاتی۔

اور دوسرا بھیانک اثر یہ ہوتا ہے کہ اساتذۂ کرام، جو فی الواقع مدرسے کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں، یہ بھی مختلف گروہوں میں بٹ جاتے ہیں اور انتظامیہ کی طرح یہ حضرات بھی زیادہ تر اپنی ذہنی توانائی، داؤ پیچ اور غیر تعلیمی امور میں صرف کرتے ہیں۔ یہ تعلیم کی بربادی کا نہایت خطرناک موڑ ہوتا ہے مگر ضد اور نفسانیت اس موڑ پر بھی فریقین کو راہ راست کی طرف مائل نہیں ہونے دیتی اور مدرسہ بتدریج تباہی کے دہانے پہنچ جاتا ہے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ انتظام نا اہلوں کے سپرد نہ کیا جائے اور خداے پاک سے اخلاص و اصلاح کی دعا کی جائے۔

اساتذہ کی تعلیم کی طرف نا التفاتی یا صرف تنخواہ کی حد تک وابستگی ہمارے علمی زوال کا ایک بڑا سبب ہے۔

بات تلخ ہے مگر حقیقت ہے کہ بہت سے اساتذۂ کرام اپنی دلچسپی کے مختلف مشاغل (تعویذ گنڈا، خوش گپی اور اخبار بینی وغیرہ) کی مصروفیت کے باعث یا تو مطالعے کی زحمت نہیں کرتے یا ناکافی مطالعہ کرتے ہیں۔ درس گاہوں میں چند منٹ پڑھا کر باقی اوقات غیر درسی گفتگو میں ضائع کرتے ہیں۔ گویا ان کے خیال میں فریضۂ درس سے سبکدوشی کے لیے ادنیٰ ما یطلق علیہ الدرس کافی ہے۔

جب اساتذہ کی بے اعتنائی کا یہ عالم ہوگا تو طلبا بیچارے "بھلے مانسوں" کی آزادی کا کیا حال ہوگا ع

قیاس کن زگلستان او، بہارش را

اس کی وجہ فرض ناشناسی، خدا ناترسی، صدر مدرس کی ڈھیلی اور خواہ مخواہ اساتذہ کی رضا جوئی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اب بھی بہت سے اساتذۂ کرام پوری محنت و لگن کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہتے ہیں اور رہی سہی تعلیم فی الواقع انھیں کی جاں فشانیوں اور انھیں کے خلوص کا ثمرہ ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ قابل و شفیق اساتذہ جن کی کاوشوں سے شجرِ علم بارآور ہو سکتا ہے، اکثر مدارس میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ ایک اچھے و شفیق استاد کے بنیادی اوصاف یہ ہیں کہ:

۱۔ وہ خود باصلاحیت ہو ۲۔ مطالعہ کرکے بخوبی تدریس کی تیاری کرے۔ ۳۔ اس کے اندر طلبا کو بامقصد تعلیم کی طرف آمادہ کرنے کے ساتھ انھیں اپنے فن میں لائق و فائق بنانے کا جذبہ کارفرما ہو۔ ۴۔ ان کے شبہات و اعتراضات کا خوش دلی کے ساتھ تشفی بخش جواب دے اور ان کی حوصلہ افزائی کرے۔ ۵۔ پاکیزہ سیرت اور بلند اخلاق کا حامل ہو اور ساتھ ہی طلبا کی کردار سازی و تشکیل سیرت میں کوشاں بھی ہو ——— ہم میں کتنے حضرات ایسے اوصاف کے حامل ہیں؟

ایک دانش ور[1] کا قول ہے کہ

"استاد کی شفقت اور توجہ کی نگاہ شاگرد کو آسمان تک پہنچا سکتی ہے۔"

تو کیا وجہ ہے کہ ہم آسمان فضل تک رسائی تو درکنار، اس کی بلندیوں کی طرف رُخ بھی نہیں کر پاتے؟ اس کے ذمہ دار ہم ہیں یا فقط سرمایہ؟

اکثر مدارس کے غیر تعلیمی ماحول کی زیادہ تر ذمہ داری رئیس المدرسین اور اساتذہ کے سر جاتی ہے۔ یہ ماحول تعلیم کے ارتقا کی راہ میں ایک "بحر ظلمات" ہے جس کی تاریکی میں ایسے ایسے ذہن و دماغ بھی بے نور ہو کر رہ جاتے ہیں جنھیں اپنے وقت میں سمائے علم و عرفان کا آفتاب و ماہتاب ہونا چاہیے تھا۔ سباع و بہائم سے ماحول کا تربیت یافتہ انسان اپنی قوت نطق و بشری خصائل کو کھو سکتا ہے تو غیر تعلیمی ماحول کا پروردہ متعلم کیا اپنی فطری صلاحیتوں کے نور سے محروم نہیں ہو سکتا؟

یہ کتنا عظیم المیہ ہے کہ ایک تشنۂ علم "آب حیات کے چشمۂ شیریں" کے قریب پہنچ کر بھی پیاسا رہ جاتا ہے اور اپنی زندگی کو "زندگیٔ جاوداں" بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں کر پاتا ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اساتذہ و صدر المدرسین کے بعد تعلیم کی زبوں حالی کا سہرا طالبان علم کے سر بندھتا ہے۔

عام مشاہدہ ہے کہ طلبا پڑھنے میں سخت محنت بلکہ صرف محنت سے کتراتے ہیں۔ ان کے مسلک میں تن آسانی عیش پسندی اور تضیع اوقات کا ایک اہم مقام ہے جبکہ جدّ و جہد اور محنت و مزاولت کا کوئی مقام اور کوئی وقار نہیں، حالانکہ انھیں اس دشوار گزار مگر عظیم سفر کے آغاز میں ہی یہ درس دیا جاتا ہے کہ

بقدر الکد تکتسب المعالی
ومن طلب العلی سہر اللیالی
یغوص البحر من طلب اللآلی
ویحظی بالسیادۃ والنوال
ومن طلب العلی من غیر کد
اضاع العمر فی طلب المحال

ت: بلندیاں محنت و ریاضت کی مقدار ہی حاصل ہوتی ہیں اور بلندی کا طالب راتوں کو بھی جاگ جاگ کر گزارتا ہے۔ موتی کا جویا سمندر میں غوطہ لگاتا ہے اور سرداری اور انعامات سے بہرہ یاب ہوتا ہے اور جو شخص بغیر محنت و جانفشانی کے بلندی

---

[1] پروفیسر عبد السلام۔ نوبل انعام یافتہ، سربراہ عالمی مرکز فروغ سائنس، ٹریسٹے، اٹلی۔

کاطالب ہوتا ہے عمر کو محال کی جستجو میں ضایع و
برباد کرتا ہے ]۔

انھیں اس بات کی بھی ہدایت کردی جاتی ہے کہ:

لو کان ھذا العلم یدرک بالمنیٰ
ما کان یبقیٰ فی البریۃ جاھل
فاجھد ولا تکسل ولا تک غافلاً
فندامۃ العقبیٰ لمن یتکاسل

[ اگر آرزوؤں اور تمناؤں سے علم حاصل ہو جاتا تو کائنات میں کوئی بھی انسان جاہل نہ رہتا۔ لہٰذا محنت کرو، کاہل مت بنو اور غفلت ولاپرواہی نہ برتو کہ کاہل کے لیے عقبیٰ کی شرمندگی ہوتی ہے ]۔

مگر کم ایسے طلبا ہیں جو اس درس یا ہدایت کو یاد رکھتے ہوئے اس پر کاربند ہوتے ہیں جب محنت و ریاضت حصول علم کے لیے بنیادی شرائط میں سے ایک ہے۔ اگر آج بھی طلبا پوری لگن اور دلچسپی کے ساتھ حصول علم کے لیے جہدِ مسلسل وسعیٔ پیہم میں منہمک ہو جائیں تو مذکورہ بالا اسباب میں سے کوئی بھی سبب ان کو علمی ترقی وحصول بلندی سے نہیں روک سکتا مگر تعلّم کے میدان میں اُن کے جہد و ریاضت کا حال اس سے بھی کہیں زیادہ بُرا ہے جو تعلیم کے میدان میں عام اساتذۂ کرام کا ہے۔

طلبا و مدرسین کی مشترکہ سستی وعیش پسندی نے اب ہمیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ مغرب میں ہمارا اس طرح سے مذاق اُڑایا جاتا ہے:

”کسی خیالی بازار میں ایک صاحب انسان کا دماغ خریدنے گئے۔ دکان پر ہر مذہب کے ماننے والوں کے دماغ رکھے ہوئے تھے۔ دریافت کرنے پر دکان دار نے انھیں بتایا کہ ایک یہودی کے دماغ کی قیمت ایک ڈالر، عیسائی دماغ کی چار ڈالر اور مسلمان دماغ کی قیمت سولہ ڈالر ہے خریدار حیرت سے بولا: عجیب بات ہے یہودی جو اس وقت دنیا میں اپنی ذہانت اور تخلیقی صلاحیت کے لیے مشہور ہیں، ان کا دماغ سب سے سستا اور مسلمانوں کا اتنا مہنگا؟ دکان دار نے جواب دیا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں مسلمانوں نے الجبرا کی ایجاد کے بعد اپنے دماغ کو خرچ ہی کب کیا ہے ان کے دماغ کا سارا مغز محفوظ ہے۔“[1]

تعجب ہے کہ ہم اس طرح کے طنز وطعن سن لیتے ہیں اپنی زوال وانحطاط کا کچھ بھی احساس نہیں ہوتا —— آخر تک طلبا کے محنت سے گریز کی ایک وجہ تعلیم کے مقصد یا اس کی افادیت سے صرف نظر ہے اور بڑی وجہ ہے امتحان سے غفلت اور نقل وچوری میں ڈھیل یا چشم پوشی ظاہر سی بات ہے کہ ایک ناعاقبت اندیش طالب علم جب جان لے گا کہ اسے امتحان میں کسی بھی طرح نقل کی رعایت مل سکتی ہے تو وہ محنت یا شب بیداری کی تکلیف کیوں برداشت کرے گا؟ —— کسی بھی مدرسے کے معیار کا اندازہ وہاں کے معیار امتحان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے امتحان کی سختی معیار تعلیم کی بلندی کی اور نرمی وچھوٹ پستی کی دلیل ہوتی ہے۔

پستی کا ایک اہم اور بنیادی سبب قدیم نصاب تعلیم ونظامِ درس کا نقص ہے جو پورے طور سے عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا اس لیے جدید ذہن اس سے ہم آہنگ ہو پاتے ہیں۔

کتب منطق وفلسفہ کا بوجھ، جدید علم کلام کا فقدان، سائنسِ جدید، ریاضی اور بین الاقوامی زبان انگریزی

لہ ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۶، شمارہ ۵، ماہ مئی ۸۷ء، ص ۱۳- مقالہ پروفیسر اسرار احمد، استاد طبیعیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عدم شمول بیشتر مشکل ترین اور پیچیدہ کتابوں کا انتخاب سہل العمل کتابوں سے تقریبًا بالکلیہ اعراض "تاریخ و سیرت اور ادب عربی و انشا سے لاتعلقی و بیگانگی حلِ عبارات کی غیر ضروری توجیہات قیل و قال میں حد درجہ انہماک اصل مسائل و مقاصد کے اجراء سے بے توجہی، علوم و فنون کے مختلف و متنوع شعبہ جات کی عدم تقسیم ہمارے نصاب تعلیم و نظام درس کی نمایاں خامیاں ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک خامی کی وضاحت کرتے ہیں۔

فلسفہ جس کے نظریات پہلے ہی سے لچر ولایعنی تھے جیسا کہ امام احمد رضا قدس سرہ کی کتاب الکلمۃ الملھمۃ کے مطالعے سے عیاں ہے اور اب سائنس جدید کی تحقیقات و انکشافات نے بھی ان کا فرسودہ ہونا ثابت کر دیا ہے۔ اسے پڑھنے و پڑھانے سے کیا فائدہ، جب کہ اس کے بیشتر اصول نظریۂ اسلام سے متصادم بھی ہیں؟ چنانچہ ہم عن قریب اس کی تائید میں ایک عبقریِ اسلام کی رائے پیش کریں گے۔

اس حیثیت سے بھی غور فرمایئے کہ جس زمانے میں علمائے اسلام نے فلسفہ یا نام نہاد 'حکمت' سے اشتغال کیا تھا اس زمانے میں اسی "حکمت مشائیہ" کے اصول و نظریات کی بنیاد پر براہ راست اصول اسلام کے ڈھانے کی کوشش کی جارہی تھی تو ضرورت تھی کہ ان کے "اصول مزخرفہ" کو دلائل کی روشنی میں باطل کیا جائے اور چمنستانِ اسلام کو فلسفہ کے باد سموم سے بچایا جائے۔ اس لیے متقدمین کے عہد میں فلسفہ کا درس اس زمانے کے مقتضیات کے عین موافق و مطابق تھا لیکن اب زمانہ ہوا کہ باطل نے اسلام پر اپنے حملے کا میدان و انداز بدل دیا۔ اب جدید طرزِ استدلال ہے، جدید اسلوب ہے، جدید اسلحہ اور جدید ساز و سامان ہیں مگر ہم ہیں کہ طرز کہن سے ایک انچ کھسکنے کو تیار نہیں ہیں ؎

سب باندھ چکے رخت سفر اپنا سر شام
ہم ہیں کہ نمودِ سحری دیکھ رہے ہیں

ضرورت تھی کہ وقت کے تقاضوں کے بدلنے کے ساتھ ہم بھی اپنے نصاب میں ترمیم و تنسیخ کرتے رہتے مگر افسوس کہ اب تک ایسا نہ ہو سکا۔

مجھے اس بات کے خیال پر تعجب ہوتا ہے کہ سیکڑوں شرعی احکام میں زمانے کے بدلنے کے ساتھ اسلام نے تغیر و تبدیل کی اجازت دی ہے اور ہم بڑی فراخ دلی کے ساتھ یہ تغیر کرتے بھی رہتے ہیں مگر اپنے ہی بنائے ہوئے نصاب تعلیم میں "تغیر" تو درکنار ترمیم بھی گوارا نہیں کرتے۔ ہم اسے اپنے بزرگوں کا اتباع سمجھتے ہیں مگر یہ فی الواقع ان کا اتباع نہیں بلکہ فکر و تجدید کی خار دار وادی میں قدم رکھنے سے گریز کا بیجا عذر ہے۔

پھر یہاں یہ بات بھی خصوصیت کے ساتھ لائق غور ہے کہ علم کلام جو عقاید اسلام سے روشناس کراتا ہے اور اسی وجہ سے وہ "اشرف العلوم" ہے اس کی تو صرف ایک کتاب داخل درس ہے جب کہ فلسفہ جو عقاید اسلام کا ابطال کرتا ہے اس کی لگ بھگ نصف درجن کتابیں بڑے انہماک و شوق و ذوق کے ساتھ پڑھائی جاتی ہیں۔

## فلسفہ عبقریِ اسلام کی نظر میں

اب فلسفہ کے متعلق عبقریِ اسلام کی رائے ملاحظہ کیجیے امام احمد رضا قدس سرہ رقم طراز ہیں:

"اکثر طبعیات و عامۂ الٰہیاتِ فلاسفہ صدہا کفر صریح و شرک جلی پر مشتمل ہیں۔ مثلاً زمان و حرکت وافلاک و صورت جرمیہ و نوعیہ و سطقسات وانواع موالید و نفوس کا قدم اور خالقیتِ عقول مفارقہ وانکار فاعل مختار و علم جزئیات و حشر اجساد و جنت و نار وامکانِ خرقِ افلاک و اعادۂ معدوم و صدور کثیر عن الواحد وغیرہا اور ان کے سوا اور اجزاء و فروع فلسفہ بھی کفریات صریحہ و محرمات قبیحہ سے مملو ہیں۔ انصافًا ان کی تعلیم و تعلم زہر مہلک ہے و نا رحق مگر بچند شروط" [1]

پھر سات شرطیں بیان کیں کہ جن میں اب بہت سی مفقود ہیں

---

[1] فتاویٰ رضویہ جلد دہم نصف اول ص ۸۲۔

لکھتے ہیں:

"ان تصرفات کے لحاظ کے ساتھ بعونہ تعالیٰ اس کے ضرر سے تحفظ رہے گا اور اس تعلیم و تعلم سے انتفاع متوقع ہوگا کہ تشحیذ اذہان ہوگی۔ ضلالاتِ فلسفہ کے رد پر قدرت ملے گی، بہت بدمذہب کہ مناظرات میں کفار فلاسفہ کا دامن پکڑتے ہیں، ان کی دنداں شکنی ہو سکے گی انھیں اغراض سے درس نظامی میں یہ کتب رکھی گئی تھیں کہ اب شدہ شدہ از کیا" تاکی نوبت پہنچی۔"[1]

اس کے برخلاف عصری علوم کے متعلق آپ کا یہ نظریہ ہے،

"اسی طرح بہت سے اجزائے حکمت مثل ریاضی ہندسہ و حساب و جبر و مقابلہ و ارثماطیقی و سیاحت و مرایا و مناظر و جر ثقیل و علم مثلث کروی و مثلث مسطح و سیاست مدن و تدبیر منزل و مکائد حروب و فراست طب و تشریح و آلات رصدیہ و مواقیت و معادن و نباتات و حیوانات و کائنات الجو و جغرافیہ وغیرہا بھی شریعت مطہرہ سے منافات نہیں رکھتے بلکہ ان میں بعض بلا واسطہ اور بعض بالواسطہ امور دینیہ میں نافع و معین اور بعض دیگر دنیا میں کار آمد ہیں۔۔۔ زید و عمرو پدر و پسر نے ایک تاریخ معین میں دو مختلف شہروں میں ٹھیک طلوع شمس کے ساتھ انتقال کیا، ناواقف فرائض داں وقت موت کے ایک ہونے کے خیال سے مطلقاً ایک دوسرے کے وارث نہ ہونے کا حکم دے گا اور وقت اطوال و عروض بلاد و دقائق مریہ قطر شمس و مطالع بلدیہ بدرجہ بواہرہ نتیجہ حکم صحیح دے گا۔"[2]

اس طرح مثالوں سے علوم مذکورہ کی افادیت کو واضح کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"غور کیجیے کتنا تفاوت احکام ہوگیا اور تعلیقات میں تو ہزار ہا صورتیں نکلیں گی جن کا حکم بے ان علوم کے ہرگز نہ کھلے گا اور فقیہ کو ان کی طرف ضبع سے چارہ نہ ملے گا۔ تو مطلقاً علوم عقلیہ کے تعلیم و تعلم کو ناجائز بتانا یہاں تک کہ بعض مسائل صحیحہ عقلیہ پر اشتمال کے باعث توضیح و تلویح جیسے کتب دینیہ کے پڑھانے سے منع کرنا جہالت شدیدہ و سفاہت بعیدہ ہے۔"[3]

**علاج:** اوپر جن خامیوں کا ذکر ہوا ہے ان کی اصلاح ہمارے مدارس کی تعلیم کو بلندی تک پہنچا سکتی ہے ہم اس اصلاح کی قدرے وضاحت کرتے ہیں:

**سرمایے کی کمی** کا مسئلہ ضرور بجائے خود اہم ہے لیکن موجودہ زمانے میں اس کا حل کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ اکثر مدارس اب اس قدر خود خوش حال ہیں کہ وہ اگر اپنی بساط کے مطابق ہی تعلیم کا نظم و نسق کریں تو وہ خود کفیل ہوں گے اور ساتھ ہی معیار تعلیم بھی اپنی حد تک بلند و مضبوط ہو سکا۔ یہ کیا ضروری ہے کہ چھوٹے، بڑے، نئے پرانے ہر مدرسے میں دورے (فضیلت) تک تعلیم ہو۔ اگرچہ اس کے لائق اساتذہ بھی فراہم نہ ہوں۔ پھر بھی اہل خیر کو مدارس کے تعاون کی طرف مزید توجہ کی ضرورت ہے

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

باصلاحیت غیر خطیب مدرس کا تقرر کیا جائے، کسی بھی مدرس کے درس میں ایسی کتاب نہ رکھی جائے جو اس کے پڑھانے کا اہل نہ ہو۔ مقدار تعلیم کا ایک اندازہ مقرر کر دیا جائے جس کی تکمیل متعینہ مدت میں لازمی ہو۔ اساتذہ درسی کتابوں اور ان کے متعلقات کا بالالتزام مطالعہ کریں۔ پوری گھنٹی درس جاری رکھیں۔ اساتذہ

---

[1] فتاویٰ رضویہ۔ جلد دہم نصف آخر، ص ۸ [2] ایضاً ص ۸۲ [3] ایضاً ص

بالخصوص صدر مدرس ہفتہ عشرہ میں ایک دو بار طلبا کی قیام گاہ یا دار المطالعہ میں تشریف لے جا کر ان کے مشاغل کی جانچ کرتے رہیں کسی بھی قسم کی ناول یا کتاب پر تعلیم کے اوقات میں پابندی رکھی جائے امتحان میں پوری سختی کی جائے اور کسی بھی قسم کی ڈھیل روا نہ رکھی جائے۔ ممتحنین کاپیوں کا باقاعدہ مطالعہ کریں اور کسی بھی طالب علم کو اتنے ہی نمبر دیں جتنے کا وہ حق دار ہے۔ داخلے کے وقت تمام امیدواروں کا مقابلہ جاتی امتحان (کمپٹیشن) بھی لازمی قرار دیا جائے یہ امتحان بھی پوری سختی کے ساتھ ہو اور کامیاب طلبا کا داخلہ ہی منظور کیا جائے۔

نصاب تعلیم میں منطق و فلسفہ کا بوجھ کم کر کے ریاضی و سائنس کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ زبان کی حد تک انگریزی انٹرمیڈیٹ تک پڑھائی جائے۔ اصول فقہ اور نحو کی ایک ایک کتاب (مثلاً حسامی، شرح جامی) کم کر کے جدید علم کلام و جدید فقہی مسائل کو شامل نصاب کیا جائے (لیکن اس سے پہلے ان موضوعات پر دو جامع کتابیں مرتب کرنے کا انتظام بے حد ضروری ہے) کچھ تاریخ و سیرت کی کتابیں بھی شامل نصاب کرنا ضروری ہیں۔ نحو میر، کبریٰ، میزان اور منشعب کی جگہ آسان اردو کی متعلقہ کتابیں بچوں کو پڑھائی جائیں کہ بچے غیر مانوس زبان کی بہ نسبت اپنی زبان میں قواعد کو سہولت کے ساتھ سمجھ کر محفوظ رکھ سکیں گے اور فارسی دانی کے لیے تو ادب فارسی کی بہت سی کتابیں ہیں۔

مختلف علوم و فنون کے شعبے تقسیم کر کے ہر شعبہ باذوق اور قابل اساتذہ کے سپرد کیا جائے۔ اپنے نصاب کو مختلف یونیورسٹیوں سے منظور کرایا جائے تاکہ ہمارے طلبا وہاں عصری تعلیم حاصل کر کے زندگی کے دوسرے میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دے سکیں۔ ان کا دائرہ فکر صرف مسجد کا امام، جلسوں کا خطیب اور درس گاہوں کا استاد ہونے تک ہی محدود ہو کر نہ رہے بلکہ وقت کے تقاضوں اور عصر نو کے مسائل سے آشنا ہو کر وہ ملی قیادت کے صالح بھی بن سکیں۔ آخر کنتم خیر امۃ اخرجت للناس کا خطبہ ہم پڑھتے ہیں تو اس کے تقاضوں کو پورا کون کرے گا ؎

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے۔

اور ان سب سے ضروری اور اشد ضروری یہ ہے کہ ہم تعلیم و تعلم اور علمی ارتقا کے لیے کامل دلچسپی و شوق و ذوق کے ساتھ جد و جہد اور محنت و ریاضت میں مشغول ہو جائیں اور اس کا تسلسل اس طور پر برقرار رکھیں کہ طلب کی پیاس آخر دم تک کم نہ ہونے پائے اور بڑی سے بڑی منزل پر پہنچنے کے بعد بھی ہم یہی محسوس کریں کہ ابھی ہماری ترقی کا آغاز ہوا ہے اور یہ ہمارے عروج کا ابھی پہلا زینہ ہے ؎

پئے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

پگھلنا علم کی خاطر مثال شمع زیبا ہے
بغیر اس کے نہیں پہچان سکتے ہم خدا کیا ہے

[ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۸ شمارہ ۶ جون ۱۹۸۹ء]

# مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی راہ میں دشواریاں

محمد مستان عمری

ہماری بات یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اور ایک عالمگیر مذہب ہے۔ سارے ادیان میں صرف مذہب اسلام ہی ہے جو خالق کائنات کے نزدیک محبوب ہے کیونکہ یہ اپنے اسی اصل مرتبہ میں موجود اور محفوظ ہے جسے محسن انسانیت رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔ مذہب اسلام میں حصول تعلیم پر جتنا زور دیا گیا ہے شاید ہی کسی مذہب میں ایسی تاکید ہو گی۔ احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی قدر ہے۔

"طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم

مزید فرمایا:

" اطلبوا العلم و لو کان بالصین

انتہا یہ کہ:

العلم من المھد الی اللحد

قول رسولؐ میں "العلم" کہا گیا تو مطلب یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان بالخصوص مسلمان ہر اس علم کے حصول کی کوشش کرے جو اسے اپنے خالق کی پہچان دے اور اس کو دائرۂ انسانیت سے خارج نہ کرے۔ ایسا ہی علم محبوب و مطلوب ہے۔

شعبہائے سائنس میں مسلمانوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اس کی مخالفت کی جائے تو اس کے جواب میں مسلمانوں کی اپنی تاریخ بھی اس کی تردید کرتی ہے۔ کیوں کہ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ ابتدائی دور میں مسلمانوں نے سائنس کے شعبوں میں زبردست ترقی کی۔ حتیٰ کہ جس زمانے میں یورپ کی قوموں نے سائنس کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا تھا، اس وقت مسلمانوں نے سائنس کی راہ میں شاندار ترقیاں حاصل کر لی تھیں" (ماہنامہ الرسالہ، مولانا وحید الدین خاں، جولائی ۸۶ء)

جیسا کہ ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ دور سائنس کا ہے وہی انسانی گروہ آج ترقی یافتہ ہے اور بالادست ہے جس کے پاس سائنس اور ٹکنالوجی ہے۔ اس تلخ حقیقت کے احساس نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "مرکز فروغ سائنس" کا قالب اختیار کیا جو ملک بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں میں سائنس کے فروغ کے لیے سہ روزہ کانفرنس کا انعقاد کیا ہے، قابل تحسین ہے۔ اس کانفرنس میں راقم الحروف اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے "مدارس عربیہ میں سائنسی تعلیم کی راہ میں دشواریاں" عنوان کے تحت چند باتیں پیش کرنا چاہے گا، جن سے جزئی اختلاف تو ممکن ہے، کلی اختلاف ممکن نہیں۔

۱۔ سائنسی شعور کا عدم وجود

سائنس کے میدان میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کی وجہ اگر مختصر طور پر بتائی ہو تو وہ صرف ایک ہو گی، مسلمانوں میں سائنسی شعور کا نہ ہونا۔ اس کی ایک واضح مثال وہ فرق ہے جو مسلمانوں کے درمیان دینی تعلیم اور سائنسی تعلیم کے بارے میں

پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے اندر دینی تعلیم کی اہمیت کا شعور موجود تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کا پورا اہتمام کیا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں سائنسی تعلیم کا شعور موجود نہ تھا، اس لیے وہ اس کا اہتمام نہ کر سکے، جس کے بغیر کسی قوم میں سائنسی تعلیم نہیں آسکتی۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانے میں جہاں بڑے بڑے دینی مدارس قایم کیے، وہیں ابتدائی سطح پر دینی تعلیم کا نظام پھیلا دیا جو بڑے بڑے مدارس کو غذا فراہم کرتے ہیں۔ یہی بات جدید سائنس کی تعلیم کے سلسلے میں بھی ملحوظ رکھنے کی تھی۔ ہندوستان میں مثال کے طور پر ہندو اور عیسائی بہت بڑے پیمانے پر ابتدائی تعلیم کا نظام قایم کر رہے ہیں، مگر مسلم رہنماؤں نے اس مثال سے کوئی سبق نہیں لیا۔ انھوں نے کالج اور یونیورسٹیاں بنانے کے لیے زبردست کوشش کی مگر ابتدائی اسکول قایم کرنے کی طرف اتنا کم دھیان دیا کہ وہ "نہیں" کے برابر ہے۔ لہذا ہمیں اس شعور رفتہ کو پھر سے بیدار کرنا ضروری ہے۔" (ماہنامہ الرسالہ مولانا وحیدالدین خاں جولائی ۸۶ء)

۲۔ ہندوستان کے عربی مدارس کی سائنس کی افادیت سے بے خبری۔

بالعموم یا یوں کہیے کہ پچھتر فی صد ایسے افراد جو مدارس عربیہ کے ذمہ دار ہیں وہ سائنس کی افادیت اور اس کی صحیح ضرورت سے بے خبر ہیں۔ اب ضروری ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں سائنس کی اہمیت اور اس کی ضرورت مدارس عربیہ میں اس کام کے لیے اولین شکل میں مذاکرات اور جلسے کیے جائیں، تاکہ سائنس سے بدگمانیاں اور دور جدید کی ان خامیوں کو کہ جنھیں سائنس کی پیداوار سمجھ لیا گیا ہے ایسی ذہنیت کا ہمیں اخلاق و محبت کے مشترکہ جذبے سے قلع قمع کرنا چاہیے۔ اس کے بغیر مدارس عربیہ کے نصاب میں سائنسی کتب کے نصاب کا نفوذ ناممکن ہے۔

۳۔ مسلمانوں کا طبقہ اور ان کا ذہنی ارتقاء

موجودہ دور میں مسلمانوں کے احساسات معیشت کے تصور سے حد درجہ متاثر ہیں جس کی وجہ سے مسلمان دینی تعلیم سے ہٹ کر دنیوی تعلیم کے لیے کوشاں ہیں۔ اس ارتقائی شکل کے خلاف مسلمانوں کی کافی تعداد جو افلاس، غربت، تنگ دستی سے دوچار ہے وہ عربی مدارس میں دینی تعلیم کے لیے آجاتی ہے۔ اب ایسے لوگوں کا مستقبل کے لیے سوچنا اور ان کے آگے معیشت کا وہ تصور جو اسلام سکھاتا ہے، پیش کرنا ایک ناممکن سی بات ہو جاتی ہے۔ یہی وہ فرق ہے کہ جس سے دین و دنیا کو الگ الگ خانوں میں بانٹا جاتا ہے۔ ہمیں عمدہ اور صحیح طریقے سے اس فرق کو مٹاتے ہوئے اسلامی تعلیمات کے ذریعے سائنس کی اہمیت و ضرورت اور اس سے مستفید ہونے کی راہیں بتلانا ضروری ہیں۔

کشمکش اس بات کی پیدا ہوتی ہے کہ وہ لب و لہجہ اور وہ اسلوب وہ طرز بیان جس کے ذریعے ہم یہ اہم کام کر سکیں اس کے لیے خاص طور پہ ایک کتاب جو قرآن و حدیث کی روشنی میں سائنس کو لازم بتلائے، کسی مفکر اور قابل ترین شخص سے لکھوائی جائے یا چیدہ چیدہ اہم مضامین اکٹھے کیے جائیں اور انھیں کتابی شکل دی جائے اور صحیح آراء مذاکرات اور خصوصی سیمینار وغیرہ کے ذریعے صحیح استصواب کیا جائے یہ کام بہت اہم اور ضروری ہے اور یقین ہے کہ "مرکز فروغ سائنس" اس کو باحسن الوجوہ انجام دے گا۔

ناواقفیت ایک ایسی چیز ہے جس سے اہمیت اور ضرورت معلوم نہیں ہوتی جب صحیح بات معلوم نہ ہو تو تاثرات کی بنیاد پر غلط فہمی ذہنوں میں جنم لیتی ہے اور ایک مخالفت کی عمارت تیار ہو جاتی ہے۔ ایسی بہت سی اس طرح کی وجوہات ہیں جس سے عربی مدارس سائنسی تعلیم کے خلاف ہیں۔

۴۔ سائنس کی افادیت کا پس منظر اور پیش منظر

کسی بھی چیز میں جاذبیت کے معروف و موثر عناصر جب تک نہ قایم کیے جائیں تب تک اس کے اندر دلآویزی اور دلکشی نہیں پیدا ہو سکتی۔ ماحول کا صحیح جائزہ و حالات کا صحیح تقاضا اور مستقبل کا روشن خاکہ واضح مرتب نہ کیا جائے تو

یہ دشواری حائل ہوتی ہے کہ ہم اپنے احساسات جو کہ سائنس کی ترویج کی راہ میں ضروری درجہ رکھتے ہیں، کیسے عمل میں لایا جائے۔

پس منظر جتنا مفید اور ضروری ہوگا، اپنے صحیح منہاج پر اس کی مناسب و ضروری تشکیلی حیثیت آشکارا کرنا ضروری ہے اب جب کہ پس منظر جو اپنی حیثیت اور وقعت رکھتا ہے اس سے باخبر کرنے کے لیے مذکورہ کام پوری توجہ سے انجام دیے جائیں۔

پس منظر کا جو رشتہ و تعلق پیش منظر سے ہونا چاہیے وہ کمزور ہو تو پس منظر کی تاثیر پالیں کہ اس کی اثر آفرینی پورے طور پر نہ ظاہر ہوگی اور نہ مطلب کی وضاحت کا کام ہو سکے گا —— یہ دو پہلو اپنی اپنی انفرادیت کے باوجود آپس میں ایک صحیح مشترک اور حسین ربط رکھتے ہیں۔ اب ضرورت یہ ہے کہ خاکے کو صحیح خطوط پر ڈھال دیا جائے اور اس سلسلے میں شعبۂ سائنس کے ماہرین سے استصواب کرا کے اس خاکے میں ایسی رنگ آمیزی کی جائے کہ جس سے منفعت اور ضروریات انسانی سائنس سے اپنا تعلق رکھتی ہے، یہ واضح کیا جائے۔

یہ صورت حال جب صحیح طور پر اور صحیح نہج پر ظاہر ہوگی تو منکرین سائنس کے انکار میں اضمحلال پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہوگا —— آج تک سائنس کی افادیت بتلانے والے یا سائنس کی حمایت کرنے والے اس اہم اور ضروری پہلو سے جو کہ مذکورہ خاکے میں دینی مزاج کی بنیاد پر پیش کیا گیا ہے شاید کہ کسی نے ایسی کوشش کی ہو، لیکن کوئی منظم بات ایسی نظر نہیں آتی۔

دین کا جو وسیع مفہوم ہے اس وسعت کے صحیح تقاضے کے اظہار میں سائنس کسی طرح جدا نہیں بلکہ داخل و شامل ہے قدرتِ الٰہی کا جو مشاہدہ سائنس کے ذریعے ہوتا ہے وہ ایک ایسی بات ہے جس سے ہمارے دین حنیف کی بنیادی اور اساسی خوبی کا پتہ چلتا ہے جو

'سیروا فی الارض الخ'

کی ایک تفسیر اور تشریح ہے۔

"ہر قوم کے کچھ اپنے قومی علوم ہوتے ہیں، ان قومی علوم سے دوسری قوموں کو دلچسپی نہ ہونا ایک فطری بات ہے۔ مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم ایک علم کو لے کر اٹھتی ہے، مگر حقیقتاً وہ اس کا قومی علم نہیں ہوتا، بلکہ اس کی حیثیت ایک آفاقی علم کی ہوتی ہے۔ یہ علم اپنی حقیقت کے اعتبار سے تمام قوموں کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ کسی ایک قوم کے لیے وہ انسانیت کا مشترک سرمایہ ہوتا ہے نہ کہ کسی قوم کا انفرادی ورثہ۔

مسلمانوں نے جب مغربی اقوام پر فتح حاصل کی تو وہ فتح کے جوش میں مبتلا ہو گئے۔ اس جوش نے انھیں سائنس کی تحقیق سے غافل کر دیا اس کے بعد موجودہ زمانے میں یہی واقعہ ایک اور شکل میں پیش آیا۔ مسلمان مغربی قوموں کے مقابلے میں مفتوح ہوئے، ان کے اندر مغربی اقوام کے خلاف نفرت جاگ اٹھی۔ وہ نفرت کی نفسیات میں مبتلا ہو کر مغربی سائنس کی طرف سے بے رغبت ہو گئے، جس کی حیثیت ایک آفاقی علم کی ہے۔ یک لحظہ غافل گشتم صد سالہ راہم دور شد۔

سب سے بڑی دشواری جو سد باب بنی ہوئی ہے اگر ایک لفظ میں بیان کی جائے تو وہ یہ ہوگی مسلمان انگریز اور انگریزی میں فرق نہ کر سکے۔

[مولانا وحید الدین خاں، الرسالہ، جولائی ۱۹۸۶ء]

مذکورہ بالا جو باتیں میں نے اپنے مضمون میں پیش کی ہیں اس پر غور و خوض، توجہ اور التفات مابین آراء مختلفہ اور عملی تدابیر کے لیے جستجو، مختلف النوع سطح اور مزاج کو ملحوظ رکھ کر کی جانی ضروری ہے اور میں ارباب "مرکز فروغ سائنس مسلم یونیورسٹی" سے متوقع ہوں کہ وہ ضروری توجہات مبذول فرمائیں گے۔

(ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۶ شمارہ ۵۔ مئی ۱۹۸۷ء)

# مدارس اور سائنس

نفیس احمد ندوی

ہم مسلمانان ہند کے لیے خصوصًا اور تمام مسلمانان عالم کے لیے عمومًا نہایت خوشی و مسرت کی بات ہے کہ مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے اور انھیں ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے علوم جدیدہ سائنس کی ٹکنالوجی کو فروغ دینے کی از سر نو جد و جہد شروع کی ہے اور "مرکز فروغ سائنس" قایم کرکے عملی قدم اُٹھایا ہے جو نہایت خوش آیند اور مبارک قدم ہے خدا اسے کامیاب کرے۔

اس سے زیادہ پر مسرت و حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مدارس اسلامیہ کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی اور ذمہ داران مدارس کو احساس دلایا کہ وہ میراث جو انھوں نے اپنے اسلاف سے پائی تھی آج اس پر غیروں کا قبضہ ہے اسے دوبارہ واپس لینے کی سعی کریں اور سائنس کو داخل نصاب کرکے اس کی صحیح معنوں میں خدمات انجام دیں اور اس میں جو فساد آگیا ہے اسے دور کرکے سائنس کو صالح و کارآمد بنائیں اور اسے اپنا گراں قدر مال سمجھیں۔

"الحکمۃ ضالۃ المؤمن"

دینی مدارس خصوصًا مدارس اسلامیہ ہندیہ میں اگرچہ علم سائنس اب تک داخل نصاب نہیں کیا گیا، البتہ ایک عرصے سے سائنس کو بحیثیت مستقل مضمون کے داخل نصاب کرنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا یہ عملی اقدام قدیم صالح اور جدید نافع کے حسین امتزاج سے استفادہ کرنے کا زریں موقع فراہم کرتا ہے اور اسلامی فکر و شعور، سائنس و ٹکنالوجی، علمی بصیرت اور دوربینی کی تاریخ کے ایک حسین اور دلآویز درخشاں باب کا افتتاح کرتا ہے، خدا اسے سدابہار رکھے۔

سائنسی تحقیقات و تجربات سے نہ تو دین و ایمان کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق ہے اور نہ ہی یہ مقاصد قرآن سے متصادم ہیں بلکہ قرآن خود آیات ربانی پر تدبر و تفکر اور تسخیر کائنات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض
جمیعًا منہ ان فی ذٰلک لآیات لقوم
یتفکرون۔ وفی انفسکم افلا تبصرون ہ

ایک جگہ ارشاد ہے کہ ارض و سماء کی تخلیق اور لیل و نہار کی تبدیلی میں غور و فکر کرنے کے لیے بڑی نشانیاں ہیں:

"ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف
اللیل والنہار لآیات لاولی الالباب"

ایک دوسری جگہ خالق کائنات نے انسان کو غفلت سے بیدار ہونے اور کائنات کے ذرہ ذرہ پر غور و فکر کرنے کی توجہ دلائی ہے

وما خلقنا السماء والارض وما بینهما لٰعبین
لو اردنا ان نتخذ لھوا لاتخذنٰہ من
لدنا ان کنا فاعلین ہ

"ہم نے آسمان اور زمین اور کل کائنات
کو محض کھیل کے لیے پیدا نہیں کیا، اگر ہم کو
کھیل بنانا منظور ہوتا تو ہم اپنی تجویز سے
(کھیل کی طرح سا کوئی) کھیل بناتے (لیکن)
ہم کو ایسا کرنا منظور ہی نہیں تھا۔"

یعنی اگر یہ سب کچھ کھیل ہوتا تو کارخانۂ عالم میں یہ توافق، تدبر اور حکمت نہ پائی جاتی۔

اس کے علاوہ قرآن جگہ جگہ اعلان کرتا ہے:
لآیات لاولی الالباب، لآیات لقوم
یتفکرون، لآیۃ لکم، لآیات لقوم
یعقلون۔

ان قرآنی آیات سے صاف ظاہر ہے کہ تدبر و تفکر کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسی سے کسی قوم کی بیداری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور ترقی کے بڑے سے بڑے مدارج طے کیے جاسکتے ہیں۔ خواہ اس کا تعلق روحانیت سے ہو یا مادیت سے، دونوں میدان میں بغیر غور و فکر کے آگے نہیں بڑھ سکتے جب یہ بات کھل کر واضح طور پر سامنے آ گئی کہ تسخیر کائنات کے لیے جو غور و فکر کیا جائے یا سائنسی تحقیقات و تجربات کیے جائیں، مذہب سے متصادم نہیں ہیں تو بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ دینی مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم دینے سے ایمان وعقیدہ پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ بشرطیکہ اعلیٰ نظام درسیات کے ساتھ بہترین نظام تربیت بھی فراہم کیا جائے۔

آج ذمہ داران مدارس اسلامیہ بچوں کو سائنس کی تعلیم دینے سے ہچکچاتے ہیں جب کہ سائنس سلے اصل موجد مسلمان ہیں قطب نما کس نے ایجاد کیا؟ جس کے سہارے کولمبس امریکہ تک پہنچ گیا، جس کا اعتراف یورپین کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ یورپ کا ایک مشہور فاضل مورخ لکھتا ہے کہ:

"اگر اہل اندلس قطب نما ایجاد نہ کرتے تو کولمبس
جیسا عالی دماغ شخص بھی اٹلانٹک کی بھیانک
موجوں سے زندہ نہ بچ پاتا اور راستے میں بھٹکتے
ہوئے اپنی زندگی کے آخری لمحات گزار دیتا۔"

یورپ کو جو کچھ ملا ہے وہ سب مسلمانوں کی دین ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے جس وقت اندلس فتح کیا، یورپ جسے آج سائنس و ٹکنالوجی ایجادات واکتشافات کا امام تصور کیا جاتا ہے، جہالت وسفاہت کی تاریک وادیوں میں بھٹک رہا تھا۔ علم وحکمت کی باتیں ایک ناقابل معافی جرم تھا۔ یورپ کے تمام ممالک علوم وفنون کی روشنی سے محروم اور تہذیب و ثقافت سے کافی دور تھے۔ وحشیانہ زندگی گزارنا ان کے لیے سرمایۂ فخر تھا۔ مسلمانوں نے انھیں علم وتمدن اور تہذیب وثقافت کی شمعوں سے منور کر دیا۔ جہاں علم وتہذیب کا ایک دیا بھی روشن نظر نہ آتا تھا، اس ملک میں ہر ہر شہر، ہر ہر گاؤں کو علماء، فضلاء، ماہرین فن ادباء، واطباء، ریاضی داں و سائنس داں سے بھر دیا۔

مسلمان چھ سو برس تک مشرق ومغرب سارے یورپ کے استاد رہے ہیں لیکن افسوس آج ہم بیگانہ ہیں اور ہمیں احساس زیاں تک نہیں ہے

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

مسلمانوں کی سائنس اور ٹکنالوجی، ایجادات واکتشافات میں حیرت انگیز کامیابی دراصل قرآن مجید کی ان آیات پر غور وفکر کرنے جو انسان کو کائنات کی تحقیق وجستجو کی دعوت دیتی ہیں۔ یہ آن ہی آیات کا ثمرہ تھا کہ اندلسی دور میں مسلمانوں نے جہاں بین تحقیق وتفتیش کی جس کی بدولت موجودہ سائنس کی بنیاد پڑی۔ مسلمان سائنس دانوں نے جغرافیہ، ریاضی، فزکس کیمسٹری، بیالوجی، طبیات، حیاتیات میں شاندار کامیابی

مل کی اور تمام عالم کو علوم و فنون سے مالا مال کر دیا۔ اس ر کے مشہور سائنس دانوں میں جابر بن حیان، محمد بن موسیٰ ارزمی، ابوالقاسم زہراوی وغیرہ قابل ذکر ہیں، جن کی بلند پایہ تحقیقات اور شہرہ آفاق تصنیفات ہی کی وجہ سے یورپ نے م جدید کی بنیاد ڈالی۔

ایک ہلکا سا خدشہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ سائنسی تعلیم نے طالب کو الحاد اور دہریت کی طرف مائل کرتی ہے؟ اس ں شک نہیں کہ اگر اعلیٰ تربیت کا انتظام نہ کیا جائے تو کسی ی غیر دینی علوم کے حاصل کرنے والے طالب کا رجحان اور یلان جو برابر بنتا اور بگڑتا رہتا ہے، بگڑ سکتا ہے، اسی خطر مرحلے میں اگر اس طالب علم کے ذہن و دماغ کی، علم دین ے آبیاری نہ کی گئی تو کوئی بعید نہیں کہ وہ دہریت کی طرف ائل ہو جائے اور الحاد کا شکار ہو جائے لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دیگر مذاہب کی طرح سائنس کے ذریعے ہریت کا خراب اثر اسلام یا متبعین اسلام پر نہیں پڑا۔ اگر ھوڑا بہت اثر آیا بھی تو وہ اُن لوگوں پر جو اپنے مذہب سے الکل ناواقف تھے یا اس قدر واقفیت نہ رکھتے تھے جو سلام اور سائنس کو پہلو بہ پہلو لے چلنے کے لیے کافی ہوتی۔

اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا بھر کے تمام مذاہب و دیان کا اگر موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صرف مذہب سلام ایک ایسا ہمہ گیر مذہب ہے جو سائنس کے ہم پہلو چلنے ی صلاحیت رکھتا ہے۔ یورپ کی اکثریت عیسائیت کی پرستار ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سائنسی تحقیقات کے عہد یورپ میں جو طوفان برپا ہوا اور بڑے بڑے محققین و سائنس دانوں کو جو تہ تیغ کیا گیا یا زندہ جلا کر بھسم کر دیا گیا اس ے اصل اسباب کلیسائی حکومت اور اس کے ظلم و ستم تھے۔ ۱۴۸۱ء تا ۱۴۹۱ء دس سال کے قلیل عرصے میں تقریباً ایک لاکھ بندگانِ خدا انسانوں کو محض اس لیے تہ تیغ کر دیا گیا یا جلا دیا گیا کہ وہ علم و حکمت کی باتیں نوکِ زبان یا نوکِ قلم پر لاتے تھے۔ مثلاً وی نی نی کو مسئلہ ارتقا پر ایمان رکھنے کی وجہ سے آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ برونو کو ذہنی ترقی کے سبب دہکتی آگ میں جھونک دیا گیا۔ کوپرنیکس کو زمین کی گردش اور آسمان کو ساکت بتلانے کی وجہ سے تہ تیغ کیا گیا اور گلیلو کو اس کے نظریے کی حمایت کرنے کی وجہ سے جلاوطن کر دیا گیا۔ آج بھی عیسائیت دو بڑے طبقوں میں بٹی ہوئی ہے جس کے بُرے اثرات اہل دانش کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔

دینی مدارس میں علم سائنس کو ترویج دینے کا ایک عظیم فائدہ یہ ہوگا کہ مغرب نے علم سائنس پر قبضہ کر کے اسے جو الحاد، بے دینی، مادیت کے فروغ اور خلق خدا کے استحصال کا ذریعہ بنایا ہے۔ اعلیٰ نظام تربیت اختیار کر کے مسلم علماءِ طبیعات، محققین، سائنس دانوں کے ذریعے خدا پرستی اعلاءِ کلمۃ اللہ، خلق خدا کی خدمت اور انسانی فلاح و بہبود کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے جو اسلاف کی یاد رفتہ کو تازہ کر دے۔

لہٰذا مسلمانوں کی عقل مندی اور اقبال مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ماضی کی طرح آج بھی مدارس اسلامیہ علم کی ہمہ گیری کو تسلیم کریں اور سائنس و ٹکنالوجی کو موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق اپنائیں اور اس میں سبقت و پیش قدمی کو اپنا دینی و ملی فریضہ خیال کریں۔

یہ بات تو مسلم ہے کہ سائنس کی تعلیم و ترویج کی ضرورت کا احساس تمام مدارس اسلامیہ ہندیہ کو ہو چلا ہے لیکن مدارس کے مروجہ نصاب تعلیم میں سائنس کو کہاں پر جگہ دی جائے۔ ایک غور طلب مسئلہ ہے اس لیے کہ مدارس اسلامیہ ایک خاص نہج پر چل رہے ہیں جن کا اصل مقصود ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں جہاں لادینیت کا غلبہ ہے۔ اسلام کی نشر و اشاعت کرنا ہے۔ مدارس کے لیے سب سے بڑی دشواری کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے نصاب میں سے دین کے بنیادی اور اساسی مضامین کو نکال نہیں سکتے، اس لیے کہ دین کے بنیادی اور اساسی مضامین کو نکال نہیں سکتے، اس لیے کہ دین کے بنیادی اور اساسی مضامین کا نصاب سے خارج کرنا مدارس کو اپنی

ہے وہ دنیا کی بہت کم یونیورسٹیوں میں ہوگا ان کی طرف بھی بہت کم لوگ دیکھتے ہیں، سترہویں صدی میں طب میں نئے نئے دروازے انہی لوگوں نے کھولے جنھیں ان کتابوں کے ترجموں پر عبور تھا جو آج ہمارے کتب خانوں کی زینت ہیں۔ نہ معلوم ان میں کیسے کیسے جواہر پارے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہمارے اساتذہ اس کام پر کمر باندھ لیں تو ہمارا طبیہ کالج ایک ایسا مستند ادارہ بن سکتا ہے کہ جس سے فائدہ اٹھانے کے لیے محققین دنیا کی بڑی بڑی دانش گاہوں سے کھنچ کر علی گڑھ آئیں گے۔

یہ تو تصویر کا ایک رُخ ہے۔ دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ علی گڑھ میں کوئی نظریاتی معرکہ کبھی نہیں ہوا، سیاسی معرکے ضرور ہوے۔ پچھلی نصف صدی سے زیادہ یہاں جماعتِ اسلامی اور کمیونزم کے ماننے والوں کی کافی تعداد رہی ہے لیکن تصورِ ریاست پر کوئی بحث ایسی نہیں ہوئی جس میں دونوں طرف کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہو۔

حد تو یہ ہے کہ آج کل جب مشرقی یورپ کے ملکوں میں زبردست تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور ساری دنیا کے علمی حلقوں میں اس کے چرچے ہیں، علی گڑھ کے دانشور بالکل خاموش ہیں۔ مارکس کے تصورِ تاریخ اور لینن کے ریاست کے متعلق نظریات تو ایسی باتیں ہیں، جن پر گفتگو سے نہ صرف علمی گتھیاں سلجھانے میں مدد ملے گی بلکہ شاید آج کے ہندوستانی سماج کے مسایل کے حل کرنے میں بھی کوئی مدد مل سکے۔

سرسید نے تعلیمی اداروں میں لبرل مزاج کو بڑی اہمیت دی تھی۔ بدقسمتی سے ہماری یونیورسٹی میں اب اسے نظر انداز کیا جانے لگا ہے۔ سیاسی حلقے تو دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا تعلق زیادہ تر یونیورسٹی کی اندرونی سطح کی سیاست سے ہے یعنی کہ کس امیدوار زیر اثر آدمی کا تقرر کس جگہ پر ہوتا ہے یا الیکشن میں کس امیدوار کی کامیابی سے کس گروپ کا اقتدار یونیورسٹی میں بڑھے گا لیکن اس سیاست کا کوئی تعلق ملکی سیاست سے نہیں ہے۔ اہل علم کی عزت وہی کرتے ہیں جن کے مزاج میں رواداری ہو اور نہ پیر پرستی

شروع ہو جاتی ہے یعنی جو زیادہ شاطر ہیں وہ بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی کامیاب بھی ہو جاتے ہیں اور کم حیثیت لوگ ان کے گرد حلقہ بنا کر ان کی بات پر آمنّا و صدقنا کہتے ہیں۔ اس طرزِ فکر سے سوائے گروہ بندی کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا اور یہ گروپ یونیورسٹی کے بدن میں ناسور کی طرح پیوست ہو جاتے ہیں۔

علمی حلقوں میں معاصرانہ چشمک کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن اس کے حدود بھی مقرر ہیں۔ جب بات حد سے بڑھتی ہے تو بغض اور حسد شروع ہو جاتا ہے۔ اس زہر کا تریاق رواداری یا لبرل اندازِ فکر ہے۔ انقلابِ فرانس کے زمانے میں کسی نے اپنے مخالف سے کہا تھا کہ:

> "میں آپ کی ہر بات سے اختلاف کرتا ہوں اور پوری کوشش کروں گا کہ آپ کو غلط ثابت کر دوں لیکن میں آپ کے اس حق کی حفاظت اپنی جان دے کر کروں گا کہ آپ مجھ سے برملا اختلاف کر سکیں۔"

جن کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، ان سے بچنے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ ہم شاہراہِ ترقی پر گامزن ہیں اور ہمیں اپنا دامن ہر اس چیز سے بچانا چاہیے جس سے ہماری رفتار میں فرق آئے۔ ہماری شاندار لائبریری، ہمارے فاضل اساتذہ، ہماری تجربہ گاہیں، ہمارا انجینیرنگ کالج، ہمارا میڈیکل کالج، ہمارے کھیل کے میدان، ہمارے شہسوار سب قابلِ فخر ہیں، لیکن اگر ہماری درس گاہ میں علمی فضا نہیں ہے۔ اگر ہم میں علمی رواداری اور بردباری کی کمی ہے تو یہ عالی شان عمارتیں، یہ ساز و سامان، ایسے قابل اساتذہ اور ایسے لائق طلبا سب مل کر ڈگریاں بانٹنے والی فیکٹری تو چلا سکتے ہیں لیکن ان سے دانش گاہ نہیں بن سکتی۔

[ ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۹ شمارہ ۵۔ مئی ۸۷ء ]

# تعلیم

۱۷۳ ـــــــــ ۱۸۶

# تعلیم قسمت کی بات نہیں

## منصوبہ بند کوشش کا نتیجہ ہے

محمد اسحاق

۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ ہم بالکل ابتدائی جماعتوں میں ایک چھوٹے سے گاؤں کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ اسی سال اس قصبے سے محبوب نگر ہائی اسکول سے تین طلباء میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئے اور صرف ایک صاحب درجہ سوم سے کامیاب ہوئے۔ اخبار میں نام آیا سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی۔ سارے گاؤں کے بڑے لوگوں کی ضیافت بریانی سے کی گئی۔ ہر ایک کی زبان پر صرف ایک ہی جملہ تھا "تعلیم قسمت کی بات ہے"۔

۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ ایک ریونیو انسپکٹر میرے پاس آئے اور اپنے لڑکے کو انجینیر بنانے کے سلسلے میں مشورے کے طلب گار ہوئے۔ یہ لڑکا میٹرک میں دو سال فیل ہو کر تیسرے درجے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس صاحبزادے کی قابلیت پر مجھے شک تو تھا ہی، میں نے ان صاحب کو مشورہ دیا کہ یہ لڑکا انجینیر نہیں بن سکتا۔ بہتر ہے کہ انھیں کوئی دکان لگا کر دیجیے یا پھر اپنے اثرات سے کسی تحصیل میں انھیں صیغہ دار بنا دیجیے۔ باپ بیٹا دونوں سخت مایوس ہو گئے۔ لڑکے کی یہ ضد کہ وہ انجینیر بن کر رہے گا اور باپ کی یہ تمنا کہ وہ اپنے لڑکے کو انجینیر بنا کر ہی رہیں گے۔ کچھ منت کرنے پر میں نے انھیں مشورہ دیا کہ لڑکے کو حیدرآباد کے کسی کالج میں شریک کروا دیجیے۔ ماہانہ سو روپیے بھیجیے اور دوسرا کام دعا کرنے کا ہے۔ یہ صاحب زادے انٹرمیڈیٹ کے دو سال کے بعد آخری امتحان میں مسلسل پانچ سال ناکام ہوتے رہے اور آخر کار سہارا رہ گئے، اور وظیفے پر ہٹتے وقت اپنے لڑکے کو تحصیل میں کسی خدمت پر تقرر کروا سکے۔ مجھ سے ملاقات ہوئی، شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے "تعلیم قسمت کی بات ہے"۔

ان دو مثالوں سے ہٹ کر تیسری مثال ان ذہین غریب اور متوسط گھرانوں کے طلباء کی ہے جن کے والدین نے کبھی اپنے بچوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دی لیکن انھوں نے خود ہی محنت و مشقت کر کے مندر و مسجد کے چراغوں کے نیچے پڑھ کر تعلیم کے اعلیٰ معیار تک پہنچ پائے۔ آج بھی شہر حیدرآباد اور اضلاع میں ڈاکٹر، انجینیر، وکیل اور پروفیسر مل جائیں گے جن کا تعلیمی ریکارڈ نہایت شاندار رہا ہے اور جن کی جدوجہد بھی حیرت ناک ہوگی اور یہ بات بھی قریب قریب ہر ایک کے تجربے میں ہوگی کہ ان ہی کے خاندان کے قریبی رشتے دار ان کی تعلیم کے سخت مخالف رہے ہوں گے۔ جہاں تک وہ پست ہمت کر سکتے تھے کر چکے ہوں گے اور یہ بھی مشورہ دے چکے ہوں گے کہ زیادہ پڑھنے سے دماغ پگھل جاتا ہے اور آدمی پاگل ہو جاتا ہے اور جب ان کی ایک نہ چلی تو وہ دل میں شرمندہ ہوں گے اور بالآخر کہیں گے کہ "تعلیم قسمت کی بات ہے"۔

گزشتہ پچاس برس سے ہم یہی سنتے آئے ہیں کہ تعلیم قسمت کی بات ہے اور آج بھی یہی خیال عام ہے۔ اتنے برسوں میں پہلے سچ مچ تعلیم اتنی پھیلی ہوئی نہیں تھی۔ غربت وجہالت کی وجہ سے ایک ہزار بچے اسکول میں شریک ہوتے تو بس دس پانچ میٹرک پہنچ پاتے۔ اس کے علاوہ اسکولوں کا تنگ وتاریک ماحول اور سخت سزاؤں کا رواج عام تھا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ بچے کو جتنی سزا ملے گی اتنا ہی وہ تعلیم میں ابھر آئے گا۔ جو استاد سزا دینے میں استاد ہوتا اس کی گاؤں میں اتنی ہی زیادہ قدر ہوتی مگر ان اساتذہ نے کتنے معصوم طلباء کی زندگی اجاڑ دی، اس کی شاید انھیں خبر نہ ہوگی جو مار کے خوف سے اسکول چھوڑ بیٹھے۔ ان حالات میں کوئی سخت جاں طالب علم آگے نکل جاتا تو ظاہر ہے کہ یہ قسمت ہی کی بات ہو سکتی تھی۔

تعلیم منصوبہ بند کوشش کا نتیجہ ہے۔

تعلیم قسمت کی بات ہرگز نہیں۔ بچوں کی تعلیم ایک سوچے سمجھے دور رس واضح منصوبے کا نام ہے جو بچے کی ۴، ۵ سال کی عمر سے شروع ہو کر پندرہ سولہ سال کی عمر تک جاری رہتا ہے جب کہ یہ لڑکا میٹرک کا امتحان کامیاب کر لیتا ہے اس منصوبے کی تکمیل کے لیے تھوڑے بہت سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن سب سے زیادہ اہم بات سرمایہ نہیں بلکہ یہ بات ہے کہ :

"آپ نے اپنے بچے کی تعلیم پر کتنی توجہ دی، کتنی دلچسپی لی اور اپنا کتنا وقت اس کی تعلیم پر دیا۔ یہی تو اصل سرمایہ ہے جو بچے کی تعلیم کے لیے مشغول کرنا ضروری ہے۔"

کم از کم یہ منصوبہ بند جد وجہد دس برس یا دو پنج سالہ منصوبوں پر محیط ہے۔

یہاں پر تعلیمی منصوبہ بندی اور عام منصوبہ بندی کے بنیادی فرق کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ کوئی مکان ڈیم یا برج بنانا ہو تو یہ منصوبہ پہلے کاغذ پر تیار کیا جاتا ہے کاغذی نقشے کی تکمیل کے لیے ضروری سرمائے کی فراہمی اور پھر اصل کام نقشے کے مطابق شروع ہو جاتا ہے۔ آخر میں یہ جانچ کی جاتی ہے کہ جو منصوبہ ہم نے بنایا تھا وہ کہاں تک کامیاب رہا اور ہم نے جو نشان مقرر کیے تھے کس مدت میں کس حد تک تشفی بخش طریقے پر حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

آپ کے بچے کی تعلیمی منصوبہ بندی بالکل الگ چیز ہے۔ وہاں کاغذی پلان یا نقشے کی طرح بچے بے حس و بےجان نہیں ہیں۔ کاغذی پلان پوری طرح پلانر اور انجینیر کے قابو میں ہوتا ہے وہ جب چاہے اس میں رد و بدل کر سکتا ہے لیکن یہاں جس کے لیے پلان بنایا گیا ہے وہ خود ذی روح اچھلتا کودتا اور زندگی کی ساری توانائیوں کا مرکز ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے اکثر چھوٹے بڑے منصوبے ناکام ہو جاتے ہیں۔

## ذاکر حسین تعلیمی فارمولا

ڈاکٹر ذاکر حسین ہمارے ملک کے بڑے ماہر تعلیم ہوئے ہیں۔ کوئی چالیس برس پہلے ایک کالج کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے انھیں ایک تعلیمی فارمولا دیا جو کامیابی کا ضامن ہے۔ ڈر ہے کہ یہ فارمولا یوں ہی ضائع نہ ہو جائے کیوں کہ ذاکر صاحب پر جو کتابیں انگریزی یا اردو میں ہیں کہیں پر اس تقریر کا ذکر نہیں ہے۔ فارمولا یہ ہے:

" شدّت × مدت = مقصد

شدّت سے مراد مقصد کو حاصل کرنے کا جوش، جذبہ، ولولہ، لگن اور دھن کا پیمانہ ہے۔ اس کو ہم یہاں ۱۰۰ درجوں یا ڈگریوں میں ظاہر کریں گے۔

مدّت اس مقصد کے حاصل کرنے کا جوش یا جذبہ کتنے دن تک باقی رہا۔ کیونکہ مقصد کے حصول کے لیے جتنی مدت درکار ہے وہ دلچسپی باقی رہی یا اس میں اُتار چڑھاؤ آئے

ہے۔ کیا یہ دلچسپی درکار مدت تک ایک ہی سطح اور ڈگری پر قایم رہی یا نہیں۔

مقصد اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہماری زندگی کے کئی مقاصد قلیل مدتی اور طویل مدتی اسی فارمولے کے تابع ہیں۔ اس کا اطلاق آسانی سے تعلیمی منصوبہ بندی پر ہوتا ہے۔ ایک بات یہاں یاد رکھنے کی یہ ہے کہ جو مقصد جتنا اونچا ہوگا اسی کے حصول کا جذبہ (شدت) بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا اور پھر درکار مدت بھی اتنی ہی مزید ہوگی۔

مثال کے طور پر ہم یہاں ۳ طلبا کا ایک فرضی جدول پیش کرتے ہیں جو اس سال میٹرک کے امتحان میں شریک ہیں ان کے نتائج اسی فارمولے کے تحت دیکھیے۔

شدّت × مدت = مقصد (نتیجۂ امتحان)

| | | | |
|---|---|---|---|
| پہلا طالب علم | ۹۰ × ۳ ماہ = | ۲۷۰ نشانات | ناکام |
| دوسرا طالب علم | ۶۰ × ۸ ماہ = | ۴۸۰ " | کامیاب |
| تیسرا طالب علم | ۸۰ × ۱۲ ماہ | ۹۶۰ " | درجہ اول |

پہلا طالب علم امتحان کے سر پر آجانے سے شدت کا پارہ بہت زیادہ ہے لیکن درکار مدت بہت کم ہے۔

دوسرے طالب علم میں کامیابی کا جذبہ ٹھیک ہے اور مدت بھی وسط ہے۔ درجہ سوم یا دوم بہر حال کامیاب ہے۔

لیکن تیسرا طالب علم وہ ہے جس نے شدّت کے پارہ کو ایک برس تک اعلیٰ سطح کی ڈگری پر قایم رکھا، اسی لیے درجہ اول میں کامیاب ہوا۔ اس کا مقصد بھی اونچا تھا اور جذبہ بھی بہت تھا اور طویل مدت تک وہ آئندہ زندگی میں کوئی معتبر مقام حاصل کر کے رہے گا۔ اس مثال میں ذہانت کے اعتبار سے ہم تینوں کو مساوی سمجھتے ہیں۔

آپ کے سامنے بہت سی ایسی مثالیں ہوں گی۔ ہمیں ایک بات پورے وثوق سے کہنا ہے کہ "تعلیم قسمت کی بات نہیں"۔ آپ اس وہم سے نکل آیئے کہ تعلیم قسمت کی بات ہے تعلیم ایک منصوبہ بند جدّ وجہد کا نتیجہ ہے جو اس دلچسپی اور ولولے کو ایک طویل مدت تک برقرار رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔

ہماری آرزو ہے کہ ذاکر حسین تعلیمی فارمولا ہر گھر میں آویزاں ہو اور ہر طالب علم کی میز کی زینت بنے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۷۔ شمارہ ۸۔ اگست ۱۹۸۸ء

"ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور اس کی عقل اور ذہن میں ایک جودت پیدا ہو تاکہ جو امور پیش آئیں ان کے سمجھنے کی، برائی بھلائی جاننے کی اور عجائبات قدرت الٰہی پر فکر کرنے کی اس کو طاقت ہو، اس کے اخلاق درست ہوں، معاملات معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے اور امور معاد پر غور کرے۔"

سرسید

# تعلیمی ادارے جرائم کی تربیت گاہ

عبدالرحیم قدوائی

تعلیم کا بنیادی مقصد طلبا کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کرنا اور ان کو تہذیب سے آراستہ کرنا ہے ہمارے اردگرد کا اخلاقی زوال، معاشرتی انتشار اور بے مقصدیت ہمارے تعلیمی اداروں کی ناکامی کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ ان تعلیمی اداروں نے اپنی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرنے کی شاذ و نادر ہی کوشش کی ہے۔

مرکزی وزارت تعلیم کے مہیا کردہ حالیہ اعداد و شمار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۴۶ فی صد طلبا پانچویں جماعت تک پہنچنے سے قبل اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ طلبا کی ۷۷ فیصد تعداد آٹھویں جماعت تک اپنی تعلیم ترک کر دیتی ہے۔

۶ ـ ۱۴ سال کی عمر کے تقریباً ۵ کروڑ بچے اب تک تعلیم سے محروم ہیں۔ ان بچوں میں لڑکیوں کا تناسب ۱۷ فیصد ہے ۵ کروڑ کی اس تعداد میں تعلیم ترک کر دینے والے اور تعلیم سے محروم دونوں ہی قسم کے بچے شامل ہیں۔ کم سنی میں جرائم کرنے کے رجحان کا سدباب کرنے میں تعلیم اب تک کوئی موثر کردار ادا کرنے سے قاصر رہی ہے۔ اجتماعی شوریدہ سری بے ہودگی اور سرکاری املاک کو تباہ و برباد کرنا روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔ یونیورسٹیوں کے تقریباً ۴۰ فیصد طلبا نشہ آور اشیاء کے عادی ہیں۔

۱۸۳۵ء میں میکالے نے بڑے پرزور انداز میں یہ پیش کیا تھا کہ افراد اور املاک کے تحفظ کا سب سے کارگر طریقہ تعلیم عامہ ہے۔ کیا آزادی کے ۴۵ سال گزر جانے کے بعد اب تک تعلیم کے مقاصد کو متعین کر پائے ہیں؟ انگریزوں سے ورثے میں ملنے والے نظام تعلیم کو ہم موردِ الزام قرار نہیں دے سکتے۔

سب سے اہم معاملہ استاد اور شاگرد کے مابین بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنا اور تعلیمی معاملات میں افراد کا زیادہ سے زیادہ اشتراک حاصل کرنا ہے۔ دور قدیم کی استاد اور شاگرد کے مابین گہری موانست کو بحال کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں لیکن نوعمر طلباء میں ہم زندگی کے بارے میں مزید اشتیاق پیدا کر سکتے ہیں اور اساتذہ اسی کی مناسبت سے طلباء کو آسودہ کر سکتے ہیں۔ تعلیم میں طلباء کی دلچسپی کا محرک جذبۂ تحیر ہوتا ہے تعلیم کا محض افادی پہلو اتنا اہم نہیں ہے۔ بہترین تعلیمی ماحول کا اصول نصاب تعلیم میں ترمیم اور تربیت کے انداز میں ردوبدل کے ذریعے ممکن ہے۔ اس سے طلباء کا ذہنی ارتقاء بھی ہوگا۔ نظام تعلیم کے ایک تکلیف دہ پہلو کے خاتمے میں مرکزی وزارتِ تعلیم کی یہ ہدایت یقیناً معاون ثابت ہوگی کہ بجائے سالانہ امتحان کے پورے تعلیمی سال کے دوران مناسب وقفوں پر امتحان لیا جائے۔

اسکولوں کو مزید پرکشش بنانے کے لیے UNICEF نے ایک ہدایت نامہ پیش کیا ہے۔ اس کی رو سے نصاب تعلیم

میں روزگار کی زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کرنا ہے۔ اکثر و بیشتر غلط ترجیحات، لال فیتہ شاہی اور اخراجات ان مقاصد کے حصول میں آڑے آتے ہیں۔ UNICEF کا پانچ نکاتی پروگرام صحت تغذیہ بخش غذا، حفظانِ صحت، حالات کی مناسبت سے موزوں نصابِ تعلیم اور افراد کے بیش از بیش اشتراک و تعاون پر مشتمل ہے۔ مالیات کی کمی کے باعث یہ پروگرام ابھی تک محض زیبِ قرطاس ہی ہے۔

کم سنی میں جرم کرنے اور نشہ آور اشیاء کے عادی ہونے کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پیشِ نظر مذکورہ بالا پروگرام پر عمل درآمد کہیں زیادہ فوری توجہ کا محتاج ہے۔ وزارت داخلہ کے ایک جائزے کے مطابق ۱۹۶۹ء میں ہونے والے ۷۶۱،۵۴۸ جرائم کی بہ نسبت ۱۹۷۹ء میں ۱۰۳۰۰۰۰ قابلِ تعزیر جرائم کا ارتکاب ہوا۔

گویا دس سال کے قلیل عرصے میں جرائم میں ۴۴ فیصد اضافہ ہوا۔ بے روزگاری، غربت، آبادی میں اضافے اور ہمارے سماج میں دیگر خرابیوں کے باوجود جرائم کے ارتکاب میں یہ زبردست اضافہ ہر اعتبار سے خطرناک ہے۔ ڈکیتی کی حالیہ وارداتوں میں زیادہ تر نوجوان ہی ملوث پائے گئے۔ اسی طرح گاڑیوں کی چوری کے مجرمین میں بھی نوجوانوں کی نمایاں اکثریت ہے۔

## طرزِ عمل کا مطالعہ

کم سنی میں جرائم کرنے کے رجحان اور تعلیمی اداروں کی ناکامی کے مابین گہرے تعلق کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ نوجوانوں میں سرکشی کا جذبہ درحقیقت تعلیمی اداروں میں پائے جانے والے بیشتر و ماحول کے خلاف ایک ردِ عمل کی شکل ہے۔ اس جذبے کا محرک گھر یا پڑوس کا ماحول نہیں ہے۔ جھگی جھونپڑیوں کے وجود میں آنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اثرات کا تدارک اسکولوں میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ گھریلو پس منظر کے تحت پیدا ہونے والے غلط طرزِ عمل کی اصلاح بھی اس طور پر ممکن ہے کہ طلباء کے مزاج اور ردِ عمل کا مناسب انداز میں مطالعہ کیا جائے۔

NCERT نے نصاب کی یکسانیت کو ختم کرنے اور اسے مقامی حالات کی مناسبت سے ترتیب دینے پر بجا طور پر زور دیا ہے۔ اسی ادارے نے پرائمری اسکولوں اور ٹیچرس ٹریننگ کے لیے بطور نمونہ ایک لائحہ عمل تیار کیا ہے۔ ملک کے ۵ لاکھ پرائمری اور ۶ لاکھ ابتدائی اسکولوں کے اساتذہ، عمارت اور دیگر ضروریات پر توجہ کرنا لازمی ہے۔ جرائم کے رجحان کی بیخ کنی کے لیے معاشرتی علاج پر مبنی اصلاحی اداروں، آبادکاری اور دماغی علاج کے مراکز کے قیام کی بھی ضرورت ہے۔ اسکول سے نفرت کے ردِ عمل کی بھی اصلاح خصوصی توجہ سے ممکن ہے۔ دماغی طور پر ناکارہ اور معذور طلباء کا رویہ عموماً تخریبی ہوتا ہے جس کا اظہار ان کی طرف سے راہ چلتے افراد پر فقرے کسنے اور سواریوں پر خشت باری کرنے سے ہوتا ہے۔ سماج دشمن عناصر ان طلباء کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں۔ دماغی ناکارہ پن اور غیر متوازن طرزِ عمل امراضِ خبیثہ اور صرع کا ساخسانہ ہوتا ہے۔

## تعلیم کی افادیت

ہمارا مقصد اس رجحان کا انسداد کرنا نہیں بلکہ اس پر قابو پانا ہونا چاہیے۔ کیونکہ اوّل الذکر طریقۂ کار اختیار کرنے سے منفی نتیجہ بھی برآمد ہو سکتا ہے۔ مغربی ممالک میں ایسے مجرمین کو بہترین مراکز میں رکھا جاتا ہے اور رضاکارانہ سماجی اداروں کے تعاون کی بدولت ان مجرمین کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ البتہ سنگین جرائم کے مرتکب مجرمین کو سخت سزا دی جاتی ہے۔ اگر ان حوالاتی مراکز میں بھی جیل کا سا ماحول ہوا تو اصلاح اور آبادکاری کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اس رجحان کے عوامل کا سدِ باب کرنے میں تعلیم بہت موثر کردار ادا کر سکتی ہے، گو مکمل انسداد ممکن نہیں ہے۔ والدین

نابے توجہی اور طلباء کی جذباتی ناآسودگی پر اس طرح قابو پایا
جاسکتا ہے کہ ناخواندہ اور غور وفکر سے عاری والدین کو
مناسب ہدایات دی جائیں۔ اگر ماں باپ دونوں ہی برسرروزگار
ہیں تو اس امر کا قوی امکان پایا جاتا ہے کہ بچے جذباتی ناآسودگی
کا شکار ہو جائیں۔ مناسب تعلیم اور سودمند تربیت کے حق میں
سم قاتل مندرجہ ذیل امور ہیں:

اردگرد کا ماحول، سینما کا پیش کردہ
تشدد، فحش ادب کی بہتات اور پست
معیار کے حامل مزاحیہ رسائل۔

VIDEO اور TV کے ذریعہ فروغ پانے والی
تہذیب اس قابلِ مذمت سلسلہ کو مزید تقویت بخش رہی
ہے۔ اخلاقی تعلیم سے قطع نظر، ضرورت اس امر کی ہے
کہ مجرم جرم کے ارتکاب سے قبل از خود اپنے فعل کے بارے میں
سوچے۔ سماجی تحفظ کا حصول اس طرح ممکن نہیں کہ جرم کے
ارتکاب کے بعد مجرم کو گرفتار کیا جائے۔ زیادہ ضرورت
حفظ ماتقدم کے طریقۂ کار میں اصلاح کرنے کی ہے۔

جیسا کہ ویلیمز۔ سی۔ کیو ارسیس نے کہا ہے کہ کم سن
مجرمین سے نپٹنے کے لیے نہ غصّے اور نہ ہی جذباتیت کی ضرورت
ہے۔ کم سن مجرم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسا تجربہ
کرے جس سے اس کے بڑے تک ناواقف ہیں۔ وہ اپنا تشخص
چاہتا ہے۔ جرائم پر قابو پانے کے لیے مناسب لائحہ عمل کے
حصول کی امید اسی وقت ہو سکتی ہے، جب مصلحین ان مجرمین
کے طرزِ عمل کا مطالعہ بھی کریں۔

(پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ یکم فروری ۱۹۸۳ء)

## بقیہ متعلقہ صفحہ نمبر ۸۶

تی ہے جس میں ہر استاد اپنے شاگرد کے حسن و قبح
پوری روشنی ڈالتا ہے۔ اچھے بچوں کی ہمت افزائی کی
تی ہے۔ میڈیا بھی بچوں کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ مخصوص
میابیوں پر تصویریں اور انٹرویو چھاپتا ہے۔ ٹی۔ وی
تصویریں آتی ہیں۔ بچوں کے برتھ ڈے پروگرام نشر
تے ہیں۔ اخباروں کے مخصوص شمارے بچوں کے لیے
لتے ہیں۔ اس وقت میرے سامنے خلیج ٹائمس کا
تہ واری ضمیمہ ویک اینڈ (WEEK END) پڑا ہے۔
س کا موضوع ہے۔ "کھیل سے زیادہ" یعنی کھلونے
رف کھیل نہیں ہیں بلکہ درسیات بھی ہیں۔ اس سے
متعلق رنگین عکسی تصویروں سے یہ رسالہ بھرا ہوا ہے۔
اس طرح سے ایک پورا مصور رسالہ اس سال کے ٹاپر
(TOPPER) بچوں پر ہے۔ افسوس اس کا رہا کہ ٹاپر کی فہرست
میں مسلمان بچے بچیوں کے نام مشکل ہی سے نظر آتے ہیں۔ اس
سال کی ایک لڑکی جس نے پورے خلیج میں ٹاپ کیا ہے
اس کا نام "بیجل" ہے۔ ویک اینڈ (WEEK END)
نے ایک پورا شمارہ اس پر شایع کیا جس میں ان کی تصاویر
کے ساتھ فیملی کی تصاویر اور انٹرویو وغیرہ ہیں۔ اس طریقۂ
عمل سے بچوں کی بڑی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

[ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۰، شمارہ ۵ مئی ۱۹۹۱ء]

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱، شمارہ ۹-۱۰ (ستمبر - اکتوبر) ۹۲ء

# نرسری اسکول میں تعلیمی پروگرام

محمد شریف خان

ہمارے ملک میں یہ عام رواج ہو گیا ہے کہ بچوں کو جلد از جلد اسکول میں داخل کر دیا جاتا ہے اور پھر اس میں جلدی کی جاتی ہے کہ اُن کو لکھنا پڑھنا سکھانا شروع کر دیا جائے۔ اس سے بچوں کی شخصیت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اوّل تو اس بات کی ضرورت ہے کہ تین سال سے قبل بچوں کو اسکول میں داخل نہ کرایا جائے۔ دوم روزانہ مندرجہ ذیل پروگرام کے تحت نرسری درجات میں تعلیم دی جائے۔

نرسری اسکول کی استانیوں کو بچوں کے اسکول پہنچنے کے وقت سے ایک گھنٹہ قبل اسکول پہنچ جانا چاہیے۔ تاکہ جو بچے وقت سے پہلے بھی آجائیں ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے استانی موجود رہوں۔ ایک استانی کو اسکول کے دروازہ پر موجود رہنا چاہیے۔ بچے کو استانی کو سلام علیکم کرنا چاہیے۔ استانی کو وعلیکم السلام کہنا چاہیے۔ جو بچے پہلے آچکے ہوں ان کو بعد میں آنے والے بچوں کو سلام بھی کرنا چاہیے اور خیریت بھی معلوم کرنا چاہیے۔ استانی کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ بچے خوش و خرم ہوں اور بیمار نہ معلوم ہوتے ہوں۔

بچوں کو اس کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی کلاس میں جا کر کھلونوں اور دیگر اشیاء سے کھیلیں۔ استانی کو طلباء سے گزشتہ دن کی کارگزاری پر گفتگو کرنی چاہیے ان کو بچوں سے معلوم کرنا چاہیے کہ کل انھوں نے کیا کیا، کہاں کہاں گئے، کن دوستوں اور رشتہ داروں سے ملاقات کی۔ ان سب سوالات کا مقصد یہ ہے کہ بچوں میں یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ اپنی بات درست زبان میں ادا کر سکیں۔ بچے اس بات کا بھی شوق رکھتے ہیں کہ ان کے بھائی بہنوں کے بارے میں بات کی جائے۔ ان سے یہ معلوم کیا جائے کہ ان کے پاپا ان کے لیے کیا چیزیں خرید کر لائے۔ انھوں نے راستے میں کن کن چیزوں کو دیکھا۔ بچوں میں یہ ذوق بھی پیدا کیا جائے اور فروغ دیا جائے کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں بات کریں تاکہ معاشرتی ترقی ہو سکے ان بچوں کی طرف خصوصی توجہ دی جائے جو شرمیلے ہوں۔ استانی کو ایسے بچوں کی محنت کی تعریف کرکے ان کو باتوں میں لگانا چاہیے۔ اور ان بچوں کے خاندان کے افراد کی بات چیت ان بچوں کے ساتھ کرنی چاہیے۔

اس کے بعد تمام بچوں کو ایک جگہ پر اکٹھا کرنا چاہیے وہ چاہے کوئی بڑا کمرہ ہو یا اسکول کا کھلا میدان۔ ان بچوں کے سامنے قرآن کی کوئی سورہ پڑھی جانی چاہیے اس کے بعد ہر کلاس کو اپنی استانی کے پاس ایک دائرہ میں کھڑا ہو جانا چاہیے اور باری باری سے گیت یا کھیل کا پروگرام ہونا چاہیے۔ بچوں کے اجتماعی پروگرام متوازن ہونے چاہییں جن میں جسمانی، دماغی، سماجی، جذباتی اور اخلاقی صلاحیتیں

کو فروغ دینا چاہیے۔ بچوں کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے استانیوں کو ان میں کچھ نیا پن ہر روز لانا چاہیے۔ شروع کے ایک گھنٹے کی بڑی اہمیت ہے اس کی وجہ سے اسکول کی شہرت عام ہو سکتی ہے۔ کیونکہ بیشتر سرپرست جو بچوں کو اسکول چھوڑنے آتے ہیں وہ کچھ دیر اسکول کے باہر اس لیے ٹھہرتے ہیں کہ وہ دیکھ سکیں کہ ان کے بچے اسکول میں کیا کرتے ہیں اسکول کی تمام استانیوں کو ان پروگراموں میں شریک ہونا چاہیے۔ ایک کلاس سے دوسری کلاس کے مقابلے کرانے چاہییں۔ مثال کے طور پر فرش پر مختلف چیزوں کے کھلونے ڈال کر مختلف کھیل کھیلے جا سکتے ہیں جن پر نمبر دے کر ٹیم کی ہار جیت طے ہو سکے۔

ہر اسکول میں ایک بینڈ ہونا چاہیے جس پر بچے کو کھیلنا اور گیت گانا چاہیے۔ بچوں کو مختصر وقت کے ڈرامے بھی کرنے چاہییں تاکہ لسانی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ استانی کو ڈرامے پر ایسے سوالات پوچھنا چاہییں جس سے بچوں میں کچھ اخلاقی قدریں فروغ پا سکیں۔ بچوں کو ایسے کھیل بھی کھلانا چاہیے جن میں ان کو تیزی سے ایکشن کرنا ہو اور ان کو بینڈ بند ہوتے ہی یک لخت رک جانا ہو۔

زبان سکھانے کے لیے استانی کو کہانی سنانا چاہیے یا کسی بکس یا تھیلے میں کوئی چیز چھپا کر رکھ دینے کے بعد اس پر سوالات پوچھنا چاہیے کہ اس میں کیا ہے، اس سے بچوں میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اس کہانی یا سوال و جواب سے بچوں اور استانی میں بہت بات چیت ہو گی۔ استانی اس ذریعے سے کچھ نئے الفاظ سے بچوں کو واقف کرا سکیں گی۔ کچھ بصری امدادوں سے لفظوں کا پڑھنا بھی سکھایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے کھلونے، پوسٹر اور تصویریں بھی استعمال کی جا سکتی ہیں۔ سبق کو اور زیادہ دلچسپ بنانے کے لیے کھیل بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ استانی کارڈوں پر چیز کی تصویر بنا کر اور چیز کا نام لکھ کر بچوں سے

اس کی آواز اور دائیگی کی حرکات کی مشق کرا سکتی ہیں۔ اگر کہانی کا استعمال کیا جائے تو اس کے لیے پانچ یا چھ پوسٹر تیار کیے جائیں۔ یہ پوسٹر رنگین ہوں اور ان کو تختۂ سیاہ پر انھیں ترتیب سے لگایا جائے جو کہانی کے واقعات کی ترتیب ہو۔ اس کے بعد استانی ان پوسٹروں کو تختۂ سیاہ سے علاحدہ کر دے اور ان کی ترتیب بگاڑ دے اور بچوں سے ان کو ترتیب سے لگانے کے لیے کہا جائے۔ نئے الفاظ کو بڑے بڑے حروف میں تختۂ سیاہ پر لکھا جائے اور ہر لفظ کی تصویر اس لفظ کے برابر بنائی جائے۔ کچھ بچے اس بات کی کوشش ضرور کریں گے کہ ان الفاظ کو اپنی کاپی میں نقل کریں جو ایسا نہ کریں ان کو ایسا کرنے کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ ان کو تصویر بنانے کو کہا جائے جو تصویر بھی نہ بنا سکتے ہوں ان کو بنی ہوئی تصویر دی جائے اور اس میں رنگ بھرنے کو کہا جائے۔ استانی اس دوران بچوں کے پاس گھومتی رہیں اور ضرورت پڑنے پر ان کی مدد بھی کریں۔

اس کے بعد بچوں کو ناشتہ دیا جائے۔ اس وقت بچوں پر نظر ضرور رکھی جائے مگر بچوں کو آزادی بھی فراہم کی جائے۔ اتنا وقت ضرور دیا جائے کہ سب بچے اپنا ناشتہ تسلی سے کھا لیں۔ مگر استانی اس وقت ناشتہ نہ کریں۔

ریاضی سکھانے کے لیے بھی جدید بصری امداد کا استعمال کیا جائے، ان میں گنتی کرنے، وزن کرنے اور ناپنے کے لیے مختلف چیزیں تیار کی جائیں یا تیار شدہ بازار سے خرید لی جائیں۔ ریاضی کی سوچ بڑھانے کے لیے ایسی جگہوں پر بچوں کو لے جایا جا سکتا ہے، جہاں بچوں کی لسانی سماجی سائنٹفک اور جسمانی صلاحیتوں کو بھی بڑھایا جا سکتا ہے۔ مثلاً سمندر، بازار، بینک وغیرہ میں ایسی چیزیں بچوں کو دکھائی جا سکتی ہیں جن میں گنتی، وزن، پیمائش

شکل اور رنگ کے سبق دیے جاسکیں۔

گانا سکھانے کے لیے بچوں کو گانے کے کمرے میں لے جایا جائے جہاں پر گانے کی استانی بچوں کو حمد، نعت، حب الوطنی کی نظموں اور قومی ترانہ کی مشق کرا سکتی ہیں۔ اس بات کی بھی کوشش کی جائے کہ جس قسم کی مشق کرائی جارہی ہو، ویسا ہی ماحول گانے کے کمرے کا کیا جائے تاکہ بچے اچھی طرح لطف اندوز ہوسکیں اور صحیح ماحول سے واقف بھی ہوسکیں۔

بچوں کو اسلامی تربیت دینے کے لیے کلمے سکھائے جائیں اور کورس میں یاد کرنے کی مشق کرائی جائے۔ اس کے بعد کلاس میں بچوں کو پھل، بسکٹ اور ٹافیاں بھی کھانے کو تقسیم کی جائیں۔ ان چیزوں کو کھا لینے اور ہاتھ دھونے کے بعد گھومنے کی کچھ آزادی دے دی جائے۔

ماحولیاتی مطالعہ کا بھی سبق دینا ضروری ہے جس میں "اپنا گھر" سے شروعات کی جاسکتی ہے گھر کی ضروری اشیاء کے صحیح صحیح نام یاد کرائے جائیں اور ان چیزوں کو صحیح طریقے سے استعمال کرنے کے طریقے سکھائے جائیں۔ اس سبق کا خاص مقصد بچوں کو اپنی سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرانا ہے۔

بچوں کو اسکول کی لائبریری میں لے جایا جائے جہاں ان کو رنگین تصاویر کی کتابیں دی جائیں اور ان کو تصویروں کے ذریعے پڑھنے دیا جائے۔ بچوں کو کتابیں پڑھنے کے بعد ایک دوسرے سے بدلنے کے لیے بھی ترغیب دی جائے۔ ایک وقت میں ایک بچے کے پاس ایک کتاب بھی فراہم کی جائے۔ ایک کہانی پر مبنی تصاویر کی کتاب بچوں کو دی جائے اور سب بچوں کے پاس ایک ہی کتاب ہو۔ استانی اس کہانی کو پڑھتی جائیں اور بچے کہانی کو تصویروں میں دیکھتے جائیں۔ اس کے بعد کچھ بچوں سے وہ کہانی سنی جائے جس کو تمام باقی بچے سنیں۔

دن کی چھٹی سے قبل بچوں کو اپنے کلاس کے کمرے میں لایا جائے اور ان کے سرپرستوں کے ساتھ واپس جانے دیا جائے۔ اس پروگرام سے بچوں کی تعلیم کو دلچسپ بنایا جاسکتا ہے۔

[ ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۰، شمارہ ۳ (مارچ ۱۹۹۱ء) ]

"انسان کو تعلیم دینا درحقیقت کسی چیز کا باہر سے اس میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ اس کے دل کے سوتوں کا کھولنا اور اندر کے سرچشمے کے پانی کو باہر نکالنا ہے جو صرف اندرونی قوی کو حرکت میں لانے اور شگفتہ و شاداب کرنے سے نکلتا ہے اور انسان کو تربیت کرنا، اس کے لیے سامان مہیا کرنا اور اس سے کام کا لینا ہے۔ جیسے جہاز تیار ہونے کے بعد اس پر بوجھ لادنا اور حوض بنانے کے بعد اس میں پانی بھرنا۔"

سرسید رح

# تعلیم

ریاض الدین احمد

آج ہم قطر کے تعلیمی حالات کا کچھ ذکر کریں گے مگر پہلے ہیوسٹن (Houston) چلتے ہیں جہاں ہماری پیاری بیٹی صوفیہ کمال نے تعلیمی مقابلے میں پورے صوبہ ٹکساس (Texas) میں اول مقام حاصل کیا ہے اور اب ریاست ٹکساس کے صدر مقام آسٹن (Austin) جاکر اپنا انعام حاصل کرنے والی ہے۔ دوسرا انعام اس کو خود اپنے شہر ہیوسٹن میں پیش کیا جائے گا جس کے لیے اس نے صوبائی اعزاز کمایا ہے۔ اس سے پہلے اسے اعلیٰ تعلیمی کارکردگی کے لیے ایک سرٹیفیکٹ سابق صدر امریکہ ریگن کے دستخطوں سے مل چکا ہے مگر سب سے پہلے اس نے اللہ جل شانہ کے دربار سے قراۃ القرآن کا سرٹیفیکٹ حاصل کیا اور ۸ سال کی عمر میں ہمارے خاندان کی سب سے پہلی قاریہ بن گئی اور برکتوں کا خزانہ لے کر زندگی کے محاذ پر چہکنے لگی۔ دعا ہے کہ تاعمر اس سرزمین کفر میں ایمان کی شمع جلاتی رہے۔ ہم نے سنا ہے کہ اولاد کا حفظ قرآن والدین کے لیے باعثِ نجات بنتا ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ پڑھنے میں آیا کہ انھوں نے اپنے عالم بیٹے کو بلاکر فرمایا میں نے تم کو عالم بنایا تمہاری فلاح کے لیے، اس علم کا حق ادا کرنا، مگر قرآن پڑھایا اپنی نجات کے لیے، میری اس امانت کو سینے سے لگائے رکھنا۔" تو اب مجھے یقین آرہا ہے کہ صوفیہ کا کمال اس کے مرحوم باپ کی روح کے لیے باعث طمانیت ہوگا اور اس پیاری بیٹی کا قرآن اس کے لیے اور دادا دادی کے لیے باعث نجات ہوگا۔ جو بھی نجات کا طالب ہو اسے اپنی اولاد کو قرآن پڑھانا چاہیے۔

آیئے اب دوحہ چلیں۔ یہ دولت قطر کا صدر مقام ہے۔ یہاں کی ترقیات کو ہم اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس کی آزادی کی عمر نے ابھی دو دہائی بھی پوری نہیں کی ہے۔ خلیج عرب کے وسط میں یہ ایک جزیرہ نما ۱۱ر۴۳۷ مربع کلومیٹر رقبے کا ہے۔ یہاں کی کل آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔ حکومت تعلیم کی طرف کافی توجہ دے رہی ہے۔ قطری طلبا کے لیے مفت تعلیمی انتظام کے علاوہ کتابیں، تعلیمی ضروریات کی مختلف چیزیں، سواری، کھیل کا لباس سب مفت ہیں اس کے علاوہ دیگر ترغیبات مثلاً انعامات، تعلیمی سفر کی سہولتیں، وظیفے، بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے اخراجات کی فراہمی وغیرہ کثیر مقدار میں موجود ہیں مگر سب سے زیادہ واضح جو تصویر سامنے آرہی ہے وہ تعلیمی میدان میں لڑکیوں کا حصہ ہے۔ دن کے اسکولوں میں طلبا و طالبات کی مجموعی تعداد ۲۷ر۹۷۱ ہے۔ اس میں تقریباً نصف لڑکیاں ہیں۔ ثانوی سطح پر سائنس پڑھنے والی قطری

لڑکیوں کی تعداد ۱۶۳ اور لڑکوں کی ۱۷۱ ہے۔ آرٹس کے درجات میں لڑکیاں بہت آگے بڑھی ہوئی ہیں۔ ۱۵۰۰ میں ۵۲۹ لڑکیاں ہیں اور باقی لڑکے۔ قطر یونیورسٹی میں لڑکیوں نے دھوم مچادی ہے۔ یہاں اُن کی تعداد ۳،۶۴۴ ہے جب کہ لڑکے صرف ۱۷۰۳ ہیں۔ غیر ممالک میں جاکر تعلیم حاصل کرنا لڑکیوں کے لیے ذرا مشکل ہے لیکن اس سطح پر بھی ۱۸۸۱ میں ۳۰۷ لڑکیاں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں ہر ملک کے سفارتی انتظام کے تحت تقریباً ۱۱۱ اسکول چل رہے ہیں ان میں بھی لڑکیاں بھاری تعداد میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں یعنی ۱۸،۵۳۵ میں لڑکیاں ۱۲،۴۰۵ ہیں۔ ان اعداد سے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس ملک کی تعلیمی ترقیات میں خواتین ایک کلیدی کردار ادا کرنے جا رہی ہیں۔ مذہبیات میں بھی یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں لڑکیاں ۳۹ ہیں جب کہ لڑکے ۱۱۱۔ شعبۂ تعلیمات میں ان کی تعداد ۱،۵۱۳ ہے جب کہ لڑکے صرف ۵۰۴ ہیں۔ یہاں تک کہ شعبۂ ایڈمنسٹریشن میں لڑکیاں ۱۳۰ ہیں اور لڑکے ۱۱۰۔ مگر ثانوی سطح کی خالص مذہبی اداروں میں جن کی تعداد نہیں معلوم ہوسکی ہے لڑکیوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ حالانکہ قطر کی وزارت نظم ونسق میں خواتین کی تعداد ۲،۶۰۹ ہے جو مجموعی تعداد کی ۸۴،۸۵ فیصد ہے۔ اس کے برخلاف وزارت تعلیمات میں خواتین صرف ۸ فیصد ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قطری خواتین اسکولوں کی چار دیواری میں محبوس رہنے کے بجائے اب کھلی دنیا میں قدم جمانا چاہتی ہیں۔

یہاں کی کثیر الاقوام برادریوں نے اپنی اپنی قومی ضرورتوں کے لحاظ سے ثانوی سطح کے پرائیویٹ اسکول کھول رکھے ہیں۔ ان میں دو ہندوستانی اسکول ایک مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کیرالہ کا ایم۔ ای۔ ایس کے نام سے ہے، دوسرا انڈین آئیڈیل اسکول کے نام سے مشہور ہے۔ تعریف ہے کیرالہ مسلم سوسائٹی کی کہ انھوں نے اس دور افتادہ مقام پر اپنے عزم کا جھنڈا گاڑ دیا

ہے۔ ان کے پاس ایک وسیع عمارت ہے جو چار ہزار بچوں کے لیے اب چھوٹی پڑ رہی ہے۔ چالیس بسیں ہیں جو بچوں کو روزانہ لاتی اور لے جاتی ہیں اور اساتذہ کی ایک فوج۔ ہر چند کہ درجات میں بچے معیاری تعداد سے کہیں زیادہ ہیں اور کمرے بھی روز افزوں تعداد کا ساتھ نہیں دے پا رہے ہیں مگر بچے جو مرکزی تعلیمی بورڈ کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں سو فیصد کامیاب ہو رہے ہیں۔ یہاں فیس بھی کم ہی ہے یعنی ۵۰۰ درہم سالانہ اور تنخواہوں کی شرح بھی کم ہی ہے یعنی ۱۵۰۰ سے ۲۰۰۰ ریال تک۔ اس کے باوجود نتائج اتنے شاندار ہیں تو اس سے اساتذہ کی کارکردگی پر روشنی پڑتی ہے جو کہ اپنے وطن کے تعلیمی اداروں اور اساتذہ کے لیے باعث تقلید اور ترغیب ہے۔

ان کے مقابلے میں یہ دوحہ کالج ہے جہاں ہماری تینوں بیٹیاں پڑھ رہی ہیں۔ یہ ایک برطانوی اسکول ہے جو یورپی روایات کے مطابق چل رہا ہے چار ہزار کے بجائے یہاں بچوں کی تعداد صرف چار سو ہے اور کلاسوں میں پچاس کی جگہ صرف بیس بچے۔ ہر چیز نپی تلی، ہر کام معیاری، مگر فیس وہاں کی ۵۴ سو کے مقابلے میں صرف ۵۴ ہزار۔ اس میں درسی کتابوں کی قیمت شامل ہے مگر بس کا کرایہ الگ دینا پڑتا ہے۔ ٹھیک سات بجے صبح کو بچوں کو لے کر بس روانہ ہوجاتی اور ½۱ بجے سہ پہر میں پہنچا دیتی ہے۔ (اس وقت میری گھڑی میں ٹھیک ½۱ بجے ہیں اور بچوں نے گھر میں قدم رکھ دیا ہے) یہاں صرف دو مضامین ـــ انگریزی اور ریاضی لازمی ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ باقی مضامین کیسے چنیں۔ یہ لیجیے، میرے سامنے میز پر ایک ایسا

جاذب نظر رسالہ پڑا ہوا ہے جس کو نہ دیکھنا بد ذوقی میں شمار ہو سکتا ہے۔ اس میں ان مضامین کی فہرست ہے جن میں سے آپ چن سکتے ہیں، ہر ایک کے نفس مضمون پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے کیا صلاحیت متوقع ہے۔ کیا کام اور کیسی محنت کرنا پڑے گی۔ یہ تمام باتیں تفصیل سے درج ہیں۔ ہوم ورک کا رواج بالکل نہیں ہے۔ ہر کام اسکول ہی میں ہوتا ہے اور کاپیاں بھی اسکول ہی میں محفوظ رہتی ہیں۔ گھر پر غیر درسی کام کیجیے۔ اپنی ہابی پر وقت صرف کیجیے۔ اسکولی مقابلوں اور مظاہروں کے لیے تیاری کیجیے۔ ہماری بڑی بیٹی آرٹسٹ نکل رہی ہے اور اس کی دوسری ہابی کتابوں کو ہضم کرنا ہے۔ جب بازار جائے گی تو کچھ کتابیں خرید لائے گی۔ دوسری صاحبہ ڈرامے میں اپنے حصہ کی تیاری کر رہی ہیں اور تیسری فرانسیسی سیکھ رہی ہیں۔ اسکول کے اوقات کے باہر بھی اسکول میں مختلف پروگرام ہوتے رہتے ہیں، اس کا ٹائم ٹیبل شایع کر کے بچوں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔ وقت مقررہ پر والدین بچوں کو لے جاتے ہیں اور واپس لاتے ہیں۔ ایک ڈرامے میں ہماری شرکت بھی ہو گئی۔ اس میں قصہ ان جنگلی جانوروں کا تھا جنھوں نے ایک انسانی بچے کو پال لیا تھا۔ بچوں نے جنگلی جانوروں کا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا تھا اور انسانی بچہ جسے شیر نے پال لیا تھا۔ ہماری بھتیجی ڈاکٹر شہلا اور ڈاکٹر قوی کا بیٹا تھا۔ داخلہ ٹکٹ سے تھا۔ ٹکٹ کی شرح شاید ۲۵ ریال تھی۔

یہ لوگ خدمت خلق کی ترغیب بھی دلاتے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہڈی کے کینسر پر ریسرچ پروجیکٹ کی امداد کے لیے ایک نادر طریقہ اختیار کیا گیا۔ اساتذہ کی طرف سے ایک اعلان ہوا کہ ہم اپنے کو ایک دن کے لیے بیچ رہے ہیں جو طالب علم چاہے خرید لے۔ چنانچہ بچوں نے اپنے استاد اور استانیوں کی قیمت لگا کر خرید لیا۔ مگر ایک شوخ طالب علم نے ایک کتے کی زنجیر لا کر اپنی استانی کے ہاتھ میں تھما دی اور کہا: آج میں آپ کا باس (Boss) ہوں۔ آپ کے سپرد یہ کام ہے کہ اس کتے کو نہلاتی رہیے۔"

مگر کرسچین اسکولوں میں عیسائیت کی تبلیغ کا کام بھی کسی نہ کسی نہج سے ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا۔ پہلے تو یہی بات ہمارے لیے گراں تھی کہ بچوں سے پیغمبرانہ کردار ادا کروایا گیا۔ دوسرے یہ کہ اس قصے کی ترتیب انجیل کے مطابق رکھی گئی تھی جو قرآنی بیان سے ٹکراتا تھا۔ ہم نہیں جانتے کہ والدین پر اس کا کیا رد عمل ہوا۔

یہاں والدین اور اساتذہ کے درمیان بھی گہرا ربط قایم رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ کبھی کبھی والدین کو بچوں کے اساتذہ سے ملاقات کے لیے ایک خاص پروگرام بنتا ہے۔ قبل ملاقات یہ پروگرام شایع کر دیا جاتا ہے۔ اس میں ملاقات کی تاریخ کا اعلان ہوتا ہے کس استاد/استانی کی کس وقت ملاقات ہوگی اور کس کمرے میں ہوگی اور اسکول کی عمارت کا ایک نقشہ ساتھ ہوتا ہے تاکہ حسب ضرورت کمروں کے جائے وقوع سے آگہی ہو جائے۔ ملاقات کے وقت آپ کے بچے کے تعلیمی کردار پر پوری روشنی ڈالی جاتی ہے۔ بچوں کی کاپیاں آپ کے سامنے ہوں گی اور آئندہ ترقی کے لیے تبادلۂ خیال اور مشورے۔ یہ ملاقاتی پروگرام والدین کے لیے ایک لازمی کورس کی طرح ہوتا ہے اور توقع یہ کی جاتی ہے کہ اس میں حصہ لینے کے لیے والدین اپنا قیمتی وقت ضرور فارغ کریں گے۔

• ہر بچے کے لیے ایک تفصیلی پروگریس رپورٹ

# جہانِ دیگر

۱۸۶ ــــــــــــ ۲۰۷

# سوویت یونین اور مشرقی یورپ کی حالیہ تبدیلیوں کا

## ایک سرسری جائزہ

محمد ظل الرحمٰن خاں

دنیا بھر کے لیے عموماً اور تیسری دنیا، جس میں عالم اسلام بھی شامل ہے، کے لیے خصوصاً سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں ہونے والی حالیہ تبدیلیاں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ اب ایک واضح تصویر سامنے آرہی ہے، اس لیے اس پر کچھ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ پہلی قسط پیش خدمت ہے۔

سوویت یونین کیسے بنی اور مشرقی یورپ کے ممالک میں کمیونزم کیسے آیا، اس کا ذکر اگلی قسطوں میں تفصیل سے کیا جائے گا۔ اس پہلی قسط میں ہم کمیونزم کے بنیادی فلسفے کے کچھ پہلوؤں پر مختصراً روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ اس فلسفے کی کچھ بنیادی کمزوریوں نیز ان کے مثبت پہلوؤں پر روشنی ڈالے بغیر معاملات کو ٹھیک سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ راقم الحروف اس فلسفے پر تو عبور نہیں رکھتا ہے لیکن اس کی موٹی موٹی باتوں سے کچھ واقف ہے۔ لہذا ماہرین سے معذرت کے ساتھ یہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ اپنی دانست میں میں اس کو پوری دیانت داری سے پیش کروں گا۔ کسی مارکسیات کے ماہر نے لکھا ہوتا تو بہتر ہوتا مگر اسے شاید بعض باتیں کہنے میں دقت ہوتی۔

ہمارے بعض دانشور مارکسزم کا نام سننا نہیں چاہتے تھے، یہ رویہ صحیح نہیں ہے۔ اگر ہمارے نوجوان باتوں کو جانیں گے نہیں تو چیزوں کا مقابلہ کیسے کریں گے۔ ہم کوئی موم کے بنے ہوئے نہیں ہیں کہ سنتے ہی ہمارا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لیے تصویر کے دونوں رخ دکھائے گئے ہیں۔ یہ معاملات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔

شاید عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کارل مارکس سماج واد اور کمیونزم کے بابا آدم ہیں لیکن ان سے پہلے بھی لوگوں نے سماج واد کے خیالات کو پیش کیا تھا، گو کہ کوئی واضح اور جامع نظریہ یہ لوگ نہیں پیش کر سکے تھے۔ اس سلسلے میں فرانس میں سینٹ سائمن اور مشہور ماہر ریاضیاتی طبعیات فوریے ([illegible]) کے نام قابل ذکر ہیں۔ انگلستان میں رابرٹ اوون (Robert Owen) کے کا نام قابل ذکر ہے۔ آخر الذکر نے مانچسٹر میں ایک کالج قایم کیا جس کا نام اوون کالج رکھا گیا اور جو بعد میں چل کر مانچسٹر یونیورسٹی بنا جہاں راقم الحروف نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اوون ایک مال دار جاگیر دار تھے۔ انھوں نے اپنے بڑے زرعی فارم کو سماج وادی اصولوں پر چلانے کی ایک قابل قدر کوشش کی لیکن سرمایہ داری کے سمندر میں یہ چھوٹا سا جزیرہ پنپ نہ سکا اور یہ تجربہ ناکام ثابت ہوا۔

کارل مارکس مئی ۱۸۱۸ء میں جرمنی میں پیدا ہوئے اور مارچ ۱۸۸۳ء میں انگلستان میں انتقال ہوا اور لندن کے

ہائیگیٹ قبرستان میں دفن کیے گئے۔ اب بھی ان کی قبر پر ہر سال ہزاروں لوگ جاتے ہیں۔ مارکس کے کام میں فرائیڈرخ اینگلز نے بڑی مدد کی۔ اینگلز ایک دولت مند جرمن تھے جو اپنے والد کے بزنس کی مانچسٹر کی شاخ میں کافی عرصے تک کام کرتے رہے۔

مارکس نے سماج واد اور کمیونزم کا ایک واضح اور جامع نظریہ پیش کیا جسے سائنٹفک سوشلزم کہتے ہیں۔ ہم اس کی موٹی موٹی باتیں یہاں مختصراً بیان کر رہے ہیں۔

مارکس کا زاویۂ نگاہ اپنے وقت کے فلسفیوں اور مفکرین سے بالکل جداگانہ تھا۔ انھوں نے ہر زمانے میں دنیا کو دو طبقوں میں تقسیم کیا۔ محنت کش طبقہ اور حکمراں طبقہ۔ جو اول الذکر پر ہر طرح سے ظلم وستم کر کے اس کی محنت سے خوش حال اور مالا مال رہا ہے۔ ان دونوں طبقوں میں برابر کشمکش جاری ہے اور تاریخ اس کشمکش کی خونی داستان ہے۔ محنت کش عوام نے برابر اپنے حقوق کے لیے لڑائی لڑی ہے مگر حکمراں طبقہ عوام کو کچلنے میں کامیاب رہا ہے، اسی کے نتیجے میں جنگیں لڑی گئی ہیں۔ مارکس کے مطابق یہ صورت حال ہر ملک میں اور ہر زمانے میں رہی ہے۔ اس کو طبقاتی کشمکش کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق تاریخ کو عیسائی ہندو اور مسلم وغیرہ کے ناموں کے عنوانات سے نہیں بلکہ مختلف عہدوں کے لحاظ سے طبقاتی کشمکش کی روشنی میں دیکھنا چاہیے جب مال کی پیدائش کے طریقوں میں تبدیلی آئی ہے تو اس جدوجہد نے نیا رنگ اختیار کیا ہے۔

مارکس کے مطابق تاریخ بنانے والے عوام ہیں نہ کہ چند اشخاص جن کو عام طور پر مورخ تاریخ ساز سمجھتے رہتے ہیں۔

مارکس کے نظریے سے یہ بات نکلتی ہے کہ حکمراں طبقے نے عوام کی جدوجہد کو کمزور کرنے کے لیے ان کے مذہبی، ثقافتی اور دیگر اختلافات کا سہارا لیا ہے اور ان اختلافات کو ابھارا ہے۔ محنت کش عوام میں منافرت پھیلا کر کے اُن کو آپس میں جھگڑوں میں پھنسا کر اپنے کام کو آسان کیا ہے۔ ہندوستان میں جات واد کو مضبوط کر کے حکمراں طبقے کو اور بھی زیادہ مدد ملی ہے۔

مارکس کے نظریے کے مطابق جھگڑا مختلف مذاہب اور ثقافتی گروہوں کے درمیان اتنا شدید نہیں ہے جتنا کہ بڑھا چڑھا کر اسے بنا دیا گیا ہے۔ مارکس کے مطابق دونوں طبقوں میں ہر مذہب، نسل، زبان وغیرہ کے لوگ شامل ہیں۔ اس لیے اس نے نعرہ دیا کہ "دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ۔ تمہارے پاس ان زنجیروں کے سوا جو تم کو گرفتار کیے ہوئے ہیں کھونے کے لیے کچھ اور نہیں ہے"۔ لیکن اس نعرے کا اثر بہت محدود دکھائی رہا۔ پھر بھی ایک زمانے میں یہ بڑا پُر اثر معلوم ہوتا تھا۔

مارکس نے اپنا جامع نظریہ انیسویں صدی کے یورپ کو سامنے رکھ کر دیا تھا، اس وقت سرمایہ دارانہ نظام جنم لے چکا تھا اور برابر ترقی کر رہا تھا اور جاگیردارانہ نظام ٹوٹ رہا تھا۔ لیکن مزدوروں کی حالت اس وقت بہت ابتر تھی، ان کی آمدنی بہت کم تھی، لہٰذا پیٹ پالنے کے لیے عورتوں اور کم عمر بچوں کو بھی مردوں سے بہت کم اجرت پر کام کرنا پڑتا تھا۔ کام کے اوقات بہت زیادہ تھے اور صنعتی علاقوں کا ماحول زہریلی گیسوں سے بُری طرح آلودہ تھا۔ پھر کارخانوں میں کام کرنے کے لیے لوگ بڑی تعداد میں گاؤوں سے شہروں میں آئے تھے۔ وہاں ان کی رہائش کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ ذرا سی جگہ میں بیسیوں خاندانوں رہتے تھے۔ گھروں میں نہ دھوپ آتی تھی نہ تازی ہوا اور نہ ہی پانی کا کوئی معقول انتظام تھا۔ غسل کرنا ایک بہت بڑی عیاشی کے برابر تھا۔ شاید لوگوں کو یہ جان کر تعجب ہو کہ مزدوروں کے گھروں میں غسل خانے بنانے کا انگلستان میں دوسری جنگ عظیم تک تقریباً کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ میں نے یہ کہاوت سنی ہے کہ عام آدمی زندگی میں صرف تین بار نہاتا ہے۔ ایک تو پیدائش کے وقت، دوسرے جب اسے دولہا یا دلہن بنایا جاتا ہے اور آخری بار جب وہ اس دنیائے فانی سے کوچ کرتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اس صورت حال میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ پھر بھی مزید اقدامات

کی شاید اب بھی ضرورت ہے۔ بہرحال ان سب حالات کا نتیجہ
یہ تھا کہ بڑی تعداد میں عوام دق جیسے مہلک امراض کا شکار ہو جاتے
تھے اور ان کے علاج کا بھی کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ انیسویں
صدی کے یورپ میں انگلستان کے مشہور ناول نگاروں اور
مصوروں نے اس صورت حال کو بڑی صفائی سے پیش کیا ہے
جس سے خود پڑھنے والے اس کے بارے میں تفصیل سے واقفیت
حاصل کر سکتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ بعض زمانوں میں کام
کم ہو جانے کی وجہ سے مزدور عارضی طور پر برطرف کر دیے جاتے
تھے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں میں بے چینی پیدا
ہوئی اور بہت سے ہمدرد اور انسان دوست دانش وروں
نے اس صورتِ حال کے خلاف مزدوروں کے ساتھ آوازیں
اٹھائیں جن کا تھوڑا بہت اثر بھی ہوا۔ مارکس ان لوگوں میں
سرفہرست ہیں۔ ایسی صورت حال کی وجہ صاف یہ تھی کہ سرمایہ داری
کی بنیاد منافع بڑھانے پر ہے۔ لہٰذا وہ مزدوروں کو جتنا کم سے
کم دے سکتے تھے، دیتے تھے۔ جب شورش زیادہ بڑھنے کا
امکان ہوتا تو کوئی رعایت دے دی جاتی جس سے کم از کم وقتی
طور پر کچھ چین پڑ جاتا۔ کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ بتدریج جو رعایتیں
مزدور حاصل کرتے رہے ان سے ہی یورپ میں جمہوریت نے
جنم لیا۔ اس نظریے کے مطابق جمہوریت سرمایہ داری کی دین
نہیں ہے، بلکہ اپنے بچاؤ کا ایک حربہ ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو اس
میں کوئی شک نہیں کہ پارلیمانی جمہوریت کے بہت مفید نتائج
نکلے ہیں۔ اس تجربے سے سب کو فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا
چاہیے جو صورت انگلستان میں تھی وہی تقریباً یورپ کے سب ہی
ممالک میں کم و بیش تھی۔

انیسویں صدی کے یورپ کے مزدوروں کے ابتر حالات
سے ہی متاثر ہو کر مارکس نے کہا تھا کہ

"اب تک فلسفیوں نے دنیا کو سمجھنے کی کوشش
کی ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا
کو تبدیل کیا جائے۔"

یہ کہہ کر مارکس یقیناً مزدوروں کو انقلاب لانے کی تلقین کر رہا تھا
اس کا پارلیمانی اداروں پر عقیدہ نہیں تھا۔ وہ اُن کو ایک فریب
سمجھتا تھا مزدوروں کے لیے ایک جھوٹا دلاسا۔ چنانچہ اس نے
ایک خونی انقلاب لا کر مزدوروں کی ریاست بنانے کی بار بار
تلقین کی ہے۔ اس ریاست میں مزدوروں کا استحصال کرنے
کے لیے سرمایہ دار طبقہ نہیں ہوگا۔ نہ جاگیردار ہوں گے ان کا تو صفایا
پہلے ہی سرمایہ دار کر چکے تھے۔ ذاتی جائدادوں کا تقریباً پوری طرح
خاتمہ ہو جائے گا۔ اس طرح ایک غیر طبقاتی نظام وجود میں آ جائے
گا جس میں مزدوروں کا واحد طبقہ رہ جائے گا اور وہی حکمراں
ہوں گے۔ ابتدائی دور میں جب کہ اس کا خطرہ ہوگا کہ کہیں
پرانے حکمراں واپس نہ لوٹ آئیں۔ مزدور ایک ڈکٹیٹرشپ
قائم کریں گے جس میں سوائے کمیونسٹ مزدوروں کے کسی اور
گروہ کو اختیارات حاصل نہ ہوں گے۔ اس کو "DICTATORSHIP OF THE PROLETARIAT" کہا گیا ہے۔ آگے چل کر جب مزدور
پوری طرح اپنا تسلط قائم کر لیں گے اور مخالف عناصر کا پوری طرح
خاتمہ ہو جائے گا تو اصلی جمہوریت قائم کر دی جائے گی۔

مارکس نے کمیونزم کو سماج واد کی آخری سب سے ترقی
یافتہ منزل بتایا ہے جب سب کی ضرورت پوری کی جا سکے
گی اور اس طرح یہاں تک ہوگا کہ بہت آگے چل کر ریاست
ہی ختم ہو جائے گی جس کو مارکس نے ہر صورت میں ایک ظلم اور جبر
کا ادارہ قرار دیا۔ اس آخری سطح کو WITHERING AWAY OF THE STATE۔ یعنی ریاست کا خاتمہ، کا نام دیا گیا ہے
اس آخری سطح کا تصور ہی کرنا دانش وروں کے لیے بھی ذرا مشکل
معلوم ہوتا ہے لیکن مارکس کی پوری بات سامنے رکھنے کے لیے
اس کا بیان کرنا ضروری تھا۔ تو یہ تھا مارکس کا بتایا ہوا راستہ۔

مارکس کا ایک بنیادی تصور 'شہنشاہیت'۔ (IMPERIALISM) کا ہے، اس کے بارے میں بڑی غلط فہمیاں خاصے
پڑھے لکھے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس لیے اس کا مختصراً
بیان کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے ترقی یافتہ...

ملکوں میں مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ لہٰذا وہ کارخانوں میں بنے ہوئے قیمتی مال کو نہیں خرید سکتے تھے، اس لیے منافع کمانے کے لیے مال کا غیر ملکوں میں بھیجنا ضروری تھا اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ تجارت میں منفعت اسی وقت ہے جب تاجر کو سیاسی بالادستی حاصل ہو۔ اس کے لیے ضروری ہوا کہ ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے ممالک فتح کیے جائیں تاکہ ان کو منڈیاں بنایا جائے جہاں من مانی دھاندلے بازی کر کے خوب منافع حاصل کیا جائے۔ اس طرح سے خاص طور پر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں صنعتی ترقی کرنے والے ممالک، خاص طور پر انگلستان، فرانس اور امریکہ نے بڑے پیمانے پر ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں نوآبادیاتی نظام قائم کیے۔ اس دور کو شہنشاہیت کا دور کہا گیا ہے۔

ایک خاص قابل اعتراض بات جو یا تو نظریے کا حصہ تھی یا کم از کم عملی طور پر ضرور سامنے آگئی وہ یہ تھی کہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے تقریباً کوئی بھی ذریعہ اختیار کرنا قابل قبول سمجھا گیا۔ یہ ایک بڑا خطرناک فلسفہ ہے جس کے بڑے مضر نتائج سامنے آئے ہیں۔

مارکس کے نظریے کا ایک بہت اہم حصہ یہ ہے کہ وہ ہر آدمی کا یہ حق سمجھتا ہے کہ اسے مناسب روزگار ملے۔ اس طرح مارکس کے یہاں کسی قیمت پر بے روزگاری قابل قبول نہیں ہے جب کہ سرمایہ دارانہ نظام میں زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنا مقصد ہے جس کے لیے کم سے کم مزدوروں کی مدد سے مال تیار کرنا ضروری ہے۔ پس جب کہ سماج واد یا کمیونزم میں بے روزگاری ناقابل قبول ہے۔ سرمایہ داری کے لیے بے روزگاری ضروری اور لازمی ہے۔

ایک بات یہ صاف کر دی جائے کہ مارکس کے ذہن میں مزدور کے معنی صنعتی مزدور کے تھے، اسے زرعی مزدوروں سے امیدیں نہیں تھیں۔ اس کو وہ بہت پچھڑا ہوا سمجھتا تھا۔ اسے یہ خیال تھا کہ صنعتی مزدور چونکہ نئے سائنسی اور تکنیکی آلات سے کام کرتا ہے اس لیے وہ نئے خیالات کو جلدی اور آسانی سے قبول کر کے انقلاب کی پہلی صف میں ہوگا۔ پھر اس کے ساتھ دانشوروں کا ایک طبقہ آجائے گا اور بعد میں شاید زرعی مزدور بھی آجائیں گے۔ اس تصور کی بنا پر مارکس کا خیال تھا کہ سماج واد اور کمیونسٹ انقلاب سب سے پہلے دنیا کے ان ملکوں میں آئے گا جہاں صنعتی ترقی سب سے زیادہ ہوئی ہے اور اس لیے جہاں مزدوروں کی بڑی تعداد ہے اور اُن کے گمبھیر مسائل سے ان میں بے چینی رہتی ہے اس کی روشنی میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب اگر آنا تھا تو انگلستان یا فرانس میں آنا چاہیے تھا لیکن وہ آیا روس میں جو اس وقت دنیا کی صرف پانچویں یا چھٹی صنعتی طاقت تھی۔ اس بات پر مارکس کے نظریے کی بہت نکتہ چینی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سائنس کے نظریوں کی بات بالکل مختلف ہے۔ جہاں تک انسانی معاشرے اور تاریخ سے متعلق نظریے ہیں، ان سے سائنس کے نظریوں والے توقعات نہیں رکھنا چاہیے۔ مارکس کی ضرور یہ بڑی غلطی تھی کہ اس نے اپنے نظریے کو ایک مکمل سائنسی نظریہ قرار دیا۔ اس لیے اس اعتراض کا جواز پیدا ہوا ورنہ تو اس کے پوری طرح صحیح ہونے کی توقع ہی نہیں ہونا چاہیے تھی۔

ویسے یہ بات بتانا باعث دلچسپی ہے کہ کانی پہلے فرانس میں ایک انقلاب آیا تھا جسے کمیونارڈ کا نام دیا گیا لیکن یہ تھوڑے ہی عرصے میں ناکامیاب ہو گیا۔ اسی صدی کی دوسری دہائی میں جرمنی میں بھی ایک انقلاب آیا مگر جلد ہی ناکامیاب ہو گیا۔

ہم اس قسط کے آخری حصے میں مارکس کے بنیادی فلسفے کی ایک مدلل نکتہ چینی کریں گے جس سے کچھ اہم باتیں صاف ہو جائیں گی۔

روس میں انقلاب کا آنا کوئی اتنے بڑے تعجب کی بات بھی نہیں تھی۔ اگرچہ روس بمقابلہ انگلستان، فرانس، جرمنی اور امریکہ ایک پچھڑا ہوا ملک تھا لیکن پھر بھی وہ ایک خاصی صنعتی

طاقت بن کر ابھر رہا تھا اور کچھ لوگوں کا یہ خیال پہلے ہی سے تھا کہ اس کی تاریخ میں ایسی باتیں تھیں کہ اس میں انقلاب آنے کے امکانات زیادہ روشن تھے۔ اور سب باتوں کے علاوہ اس سلسلے میں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ روس نے انیسویں صدی میں یا اس سے پہلے ہی کئی دیو قامت سائنس داں پیدا کیے تھے جن کی مثالیں سائنس کی تاریخ میں کم ملتی ہیں۔ ان میں سر فہرست ماہر کیمیا دمتری ایوانوچ ماندلیف ہیں، جنھوں نے کیمیاوی عنصروں کی مشہور جدول مرتب کر کے علم کیمیا کو ایک نیا موڑ دیا۔ یہ سائنس کی تاریخ میں ایک بہت بڑا کارنامہ مانا جاتا ہے ماندلیف کو کیمبرج کی اعزازی ڈگری کے لیے پیش کرتے ہوئے مشہور برطانوی ماہر کیمیا داں سر ولیم ریمزے نے ان کو ماہرین کیمیا کا استاد بتایا تھا۔ پھر چکیناف نے اس صدی کے شروع میں جراثیم پر ایک بنیادی اہمیت کا کام کیا جس پر انھوں نے نوبل انعام حاصل کیا۔ انقلاب کے کچھ ہی دنوں بعد پاولاو نے فزیالوجی میں ایک اہم کام کر کے نوبل انعام حاصل کیا۔ روس ہی سے تعلیم حاصل کر کے انقلاب کے کچھ ہی دنوں بعد گیاموف مغرب میں ہجرت کر گئے، جہاں انھوں نے کئی بہت بنیادی اہمیت کے کام کیے جن پر ان کو آسانی سے کم از کم ایک نوبل انعام ملنا چاہیے تھا۔ لیکن یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ وہ اس سے محروم رہے۔ اس پر تو الگ سے ایک تفصیلی مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ ان آخری دو حضرات کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ گو کہ ان کا اہم کام تو انقلاب کے بعد ہی سامنے آیا لیکن اس کی بنیادیں پرانے روس میں ہی پڑی تھیں۔ اس کے علاوہ خلائی راکٹوں پر پہلا بنیادی کام کانسٹنٹائن زیالوسکاوسکی نے انقلاب سے پہلے کیا تھا۔ آخر الذکر ماسکو یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ اس کام کا دنیا نے اعتراف کیا ہے۔ امریکہ نے زیالوسکاوسکی کے اعزاز میں ایک ڈاک کا ٹکٹ جاری کیا تھا۔ ماسکو یونیورسٹی ہی کے ایک دوسرے پروفیسر الکزانڈر رسکورسکی نے انقلاب سے قبل روس میں ہیلی کاپٹر بنانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس وقت اس وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکے تھے کہ ان کو دس ہارس پاور کے انجن کی ضرورت تھی اور ان کے بقول پرانے روس میں دس ڈاگ پاور کا انجن بھی میسر نہیں تھا۔ انھوں نے وہاں سے امریکہ کو ہجرت کی اور وہاں پہلا ہیلی کاپٹر بنایا۔ پھر سینٹ پیٹرسن برگ (موجودہ لینن گراڈ) کے نیول کمیونیکیشن اسکول کے انسٹرکٹر پاپاف نے قریب قریب مارکونی کے ساتھ ہی ساتھ ریڈیو بنا لیا تھا وغیرہ۔ اس صدی کے شروع ہی کے زمانے میں روس نے الکزنڈر ایلخائن جیسا افسانوی شہرت کا مالک شطرنج کا کھلاڑی پیدا کیا تھا۔

اٹھارہویں صدی میں مشہور سوئیس ریاضی داں آئیلر (Euler) روس آگئے اور آخر کار وہیں سکونت اختیار کرلی۔ برسوں وہاں کام کیا اور وہیں دفن ہیں۔ ریاضی میں آئیلر کے اتنے کارنامے ہیں کہ ان کے ذکر کرنے کے لیے ایک بہت طویل مضمون لکھنے کی ضرورت پڑے گی۔ ان کا کام حال میں ۷۳ جلدوں میں روسی زبان میں شایع ہوا ہے۔ مختصراً آئیلر تھیورم، آئیلر اینگل، آئیلر اکویشن، آئیلر نمبر وغیرہ وغیرہ اُن کی دین ہیں۔ اس کے علاوہ cos، sin وغیرہ $\Sigma$، $\Delta x$، $\Delta$، $f(x)$ اور $i$ وغیرہ کی علامتیں بھی انھوں نے ہی مقرر کیں۔ پھر کازان یونیورسٹی کے پروفیسر لیبوچاوسکی کا کام غیر اقلیدسی جیومیٹری میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مشہور ماہر طبیعیات کرچاف کا روس سے تعلق تھا گو کہ وہ خود جرمنی میں رہے۔

پھر ادب، ڈراما اور مغربی رقص اور موسیقی میں روس نے بڑے بڑے دیو قامت لوگ پیدا کیے تھے جن کے کارناموں سے لوگ آج بھی بخوبی واقف ہیں۔ روسی ناول نگار تو عالمی ادب کی صف اوّل میں شمار ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بتانا باعث دلچسپی ہوگا کہ ہندوستانی رقص اور موسیقی کو مغرب سے پہلی بار روشناس کرانے کا سہرا افسانوی شہرت کی مالک روسی رقاصہ آنا پاولوا کے سر ہے جن کی نگاہ انتخاب اودے شنکر پر پڑی اور وہ ان کو اپنے ساتھ مغرب کے دورے پر لے گئیں۔

یہ کہانی پیٹر اعظم کا بغیر مفصل ذکر کیے ہوئے ادھوری

ہے گی۔ مختصراً انھوں نے سترھویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے شروع میں ایسی زبردست بنیادیں ڈال دیں کہ ان سے روس بعد میں ایک زبردست عالمی طاقت بنا۔

جیسے ہی انٹارکٹکا کے دریافت ہونے کی خبر زار روس نے سنی اس نے فوراً ہی ایک مہم انٹارکٹکا کے لیے روانہ کر دی جس نے انٹارکٹکا کا طواف کیا اور ایک بیان کے مطابق میناروں پر کچھ جھنڈے بھی علامتی طور پر کہیں کہیں لگائے۔ اس طرح روس انٹارکٹکا دریافت کرنے والا دوسرا یا تیسرا ملک ہے۔ یہ بات انیسویں صدی کے ختم ہونے سے بہت پہلے کی ہے۔ ٹرانس سائبیرین ریلوے (TRANS-SIBERIAN RAILWAY)۔ بھی انیسویں صدی کے ختم ہونے سے بہت پہلے بچھائی جا چکی تھی۔ یہ نہ صرف دنیا کی سب سے لمبی ریلوے لائن ہے بلکہ یہ ایسے علاقوں سے گزرتی ہے جن پر ریلوے لائن ڈالنا کم از کم اس وقت بڑا ہی مشکل کام رہا ہوگا۔ حال ہی میں اس ریلوے لائن پر مغرب میں ایک بہت ضخیم کتاب چھپی ہے۔

اس طرح پرانے روس نے وہ ذیلی ساخت فراہم کر دی تھی جس کی مدد سے انقلاب روس نے اپنے وجود میں آنے کے تین سال کے اندر ہی ان بیسیوں طاقتوں کو جن میں امریکہ اور انگلستان بھی شامل تھے، جنھوں نے روس پر حملہ کر دیا تھا شکست دے دی تھی۔ اس میں یقیناً لیون ٹراٹسکی کی حکمت عملی اور دور اندیشی کو بھی بڑا دخل ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب امریکہ نے روس پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا تو اس نے ملک کے بڑے بڑے سائنسی اور تکنیکی ماہروں کی ایک کمیٹی سے مشورہ طلب کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ روس کا تکنیکی تعلیم کا نظام بہت اچھا ہے۔ وہ بہت جلد بڑی تعداد میں ایسے لوگ پیدا کرے گا جن کی اسے جنگ کے لیے ضرورت ہوگی لہٰذا اس پر فوج کشی کرنا عقل مندی کی بات نہ ہوگی مگر اس رائے کو نہیں مانا گیا۔

پس پرانے روس کو بالکل ہی بوسیدہ اور پچھڑا ہوا سمجھنا زیادہ صحیح نہیں ہے۔ بعض لوگ تو انیسویں صدی کو روس کا عہدِ زریں مانتے ہیں۔ روس کے کمیونسٹ حاکموں نے اپنی کارکردگی اجاگر کرنے کے لیے اول الذکر تصویر کو ضرورت سے زیادہ باور کرانے کی کوشش کی ہے۔

روس میں انقلاب آنے کی ایک وجہ لینن کی شخصیت بھی ہے۔ مارکس کی یہ بات بھی پوری طرح صحیح نہیں ہے کہ تاریخ میں شخصیات کو سرے سے دخل ہی نہیں ہے۔ میں شیخ عبداللہ سے متفق ہوں کہ بات کچھ دونوں کے بیچ کی ہے (آتش چنار)

اب ہم آخری بات پر آتے ہیں کہ مارکس نے اپنے نظریے کو پورے طور پر ایک سائنسی نظریہ قرار دیا۔ یہ ایک دھوکا تھا جس میں مارکس مبتلا ہو گئے۔ بعد میں ہر بڑے آدمی کے پیچھے اندھی تقلید کرنے والے اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ مارکس کے پیچھے کچھ ایسے زیادہ ہی لوگ اکٹھا ہو گئے۔ اس نظریے کے ماننے والے لوگوں نے بحث بند کر دی اور امام کے پیچھے نیت کر کے کھڑے ہو گئے۔ ایک وقت تک کام چلتا چلا گیا، کامیابیاں بھی حاصل ہوتی رہیں لیکن جس تخلیقی بحث کی ضرورت تھی وہ اب بھی نہیں شروع ہوئی ہے۔ اب اسے زیادہ دنوں تک نہیں ٹالا جا سکتا۔ اس نقطۂ نگاہ کے لوگوں کو نئی بنیادوں کو تلاش کرنا ہوگا۔ ضروری تبدیلیاں کرنا ہوں گی۔ یہ کام آج نہیں تو کل کرنا ہوگا۔ بڑی حد تک سوشلسٹ ممالک کے حالات خراب کرنے میں اس بات کو بھی دخل ہے۔

اچھا اب مارکس کے سب سے بنیادی فلسفے پر آیا جائے مارکس نے اپنے فلسفے کا ڈھانچہ جرمن فلسفی ہیگل (HEGEL) کے بتلائے ہوئے اصولوں پر رکھا۔ ہم اس حصے پر کوئی بحث نہیں کریں گے۔ یہاں پر بحث آگے اس حصے پر کی جائے گی جس کو مارکس پورے طور پر سائنسی سمجھ بیٹھے۔

مارکس کے فلسفے کی بنیاد انیسویں صدی کی سائنس پر ہے یہ سائنس جس کی بنیاد نیوٹن نے رکھی تھی اور جس کی انھوں نے خاص طور پر نشو و نما کی تھی قطعی یقینیت (ABSOLUTE CERTAINTY) کا واضح سبق دیتی تھی۔ یعنی یہ کہ ہر مادی جسم مستقبل میں کہاں پر ہوگا اور کیسے چل رہا ہوگا، اس کی پورے طور پر پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ اگر ہم کو اس کی ابتدائی چال کی حالت کی پوری خبر ہو مارکس نے مادے کو کائنات میں اولین مقام پر اٹھا کر رکھ دیا۔ سائنس کے قانون غیر جاندار اجسام کے لیے تھے۔ مارکس نے اس پر نہ غور کر کے اس قانون کو انسانی سوسائٹی پر لاگو کر دیا اور وہاں بھی قطعی یقینیت پر پوری طرح سے یقین کر بیٹھے۔ چنانچہ انھوں نے پورے اعتماد اور یقین سے دعویٰ کر دیا کہ انسانی سوسائٹی برابر ترقی پذیر ہے اور اس کا مناسب حالات میں سرمایہ داری سے سماج واد میں تبدیل ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ خواہ کوئی چاہے یا نہ چاہے یہ بات ہو کر رہے گی۔

ایسا دعویٰ کرنے کا کوئی ذرا سا بھی سائنسی جواز موجود نہیں تھا کیونکہ انیسویں صدی کی سائنس کا قطعی یقینیت کا دعویٰ غیر جاندار اجسام کے لیے تھا۔ اس کا پورے طور پر انسانی سوسائٹی پر اطلاق کر دینا ایک انتہائی مشکوک مفروضہ تھا جس کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں ہے۔ ویسے یہ بات بھی بیان کرنا باعثِ دلچسپی ہوگا کہ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی یقینیت کے فلسفے پر بڑی ضرب لگی جب یہ پایا گیا کہ ایٹم وغیرہ جیسے انتہائی چھوٹے اجسام کو سمجھنے کے لیے ایک نئے نظریے کی ضرورت ہے۔ جس کو کوانٹم میکانیات کہتے ہیں۔ یہ غیر یقینیت (UNCERTAINTY) کا سبق دیتا ہے لیکن یہ بات ہماری بحث کے لیے اس لیے بیکار ہے کہ سائنس کے یہ دونوں اصول جن کی الگ الگ ضرورت ہے غیر جاندار اجسام کے لیے ہیں ان میں سے کسی کا بھی انسانی سوسائٹی پر اطلاق کرنا ایک انتہائی گمراہ کن بات ہے۔

انیسویں صدی کی سائنس کسی حد تک ایک خود کفیل کائنات کی نشاندہی کرتی ہے جس میں کسی باہر کی طاقت کی بظاہر ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اس لحاظ سے وہ مذاہب کے بنیادی عقاید پر ضرب لگاتی ہوئی معلوم ہوئی۔ گو کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بھی نہیں ثابت ہوتا کہ خدا کا وجود نہیں ہے۔ چنانچہ آج بعض سائنس داں خدا اور مذہب کے قایل ہیں اور بہت سے نہیں ہیں لیکن جو قایل نہیں بھی ہیں، وہ عام طور پر مذہب کے دشمن نہیں ہیں، صرف مذہب سے غیر متعلق ہیں۔ البتہ انیسویں صدی میں الحاد کا بہت زور تھا۔ یہ اپنے اپنے ذاتی نظریے اور رجحان کی بات ہے۔ دراصل سائنس اس میں غیر جانب دار ہے۔ البتہ مارکس نے ملحدانہ رویہ واضح طور پر اپنایا اور مذہب کی کھلے الفاظ میں مخالفت کی۔ اگر ہم کھلے ذہن سے دیکھیں تو یہ سائنسی نظریوں کا لازمی نتیجہ نہیں تھا اور مارکس کو الحاد کو اپنے فلسفے اور نظریے کا حصہ نہیں بنانا چاہیے تھا۔ اس سے بعد میں خواہ مخواہ کی بدمزگیاں پیدا ہوئیں۔ مذہب کے متعلق ہر آدمی کو اپنا انفرادی فیصلہ کرنے کی پوری آزادی ہونا چاہیے تھی البتہ سیکولرازم کو فلسفہ کا حصہ ہونا ضروری تھا تاکہ مختلف مذاہب وغیرہ کے لوگ ایک ساتھ کھڑے ہو کر اپنے حقوق کے لیے لڑ سکتے۔ مخدوم نے اسی بات کو بڑے خوب صورت طریقے سے کہا ہے ؎

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

یہ تو رہا معاملہ بنیادی فلسفے کا لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس کے صحیح نہ ہونے سے سب کچھ یا زیادہ تر اور باتیں جو مارکس نے کہی ہیں وہ سب غلط ہو گئیں۔ کئی باتیں بڑی حد تک صحیح ہو سکتی ہیں۔ بحث ہونا چاہیے اور جزوں میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہے، ایک نئے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ مارکس کے بتائے ہوئے کچھ بنیادی گر مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

مارکس کے نظریے کی اور بھی زاویوں سے نکتہ چینی کی گئی ہے مگر ہم ان بحثوں میں یہاں نہیں پڑیں گے۔
ہم نے یہ بات تو کہی اور اس کی دلیلیں دیں کہ مارکسی

تو اپنے نظریے کو سائنسی کہنے کا حق نہیں تھا بلکہ یہ دعویٰ بالکل گمراہ کن تھا لیکن اس سے مطلب یہ نہیں نکالنا چاہیے کہ تاریخ اور انسانی سوسائٹی سے متعلق علوم میں سائنسی رویہ کو کوئی دخل ہی نہیں حاصل ہو سکتا۔ سائنسی رویہ اور بہت سے سائنسی طریق کار ان علوم میں اپنائے گئے ہیں اور ان کی بڑی افادیت ہے۔ نہ صرف اعداد و شمار بلکہ ہر قسم کے DATA کا تجزیہ کرنے اور ان سے نظریات بنانے میں سائنسی رویے اور طریق کار سے بڑی مدد ملتی ہے۔ سائنس کی مخالفت کا رویہ بھی نقصان دہ ہے۔ ساتھ ساتھ انسانی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے علوم کو یہ سمجھ لینا کہ ان کے لیے کوئی پوری طرح سائنسی نظریے دیے جا سکتے ہیں، شاید اس سے بھی زیادہ غلط ہے۔

باوجود اس کے کہ مارکس کے نظریے اور فلسفے سے بہت سے لوگوں کے جذبات بُری طرح مجروح ہوئے ہیں پھر بھی یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا اس کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے کچھ مثبت چیزیں ہیں یا نہیں۔ اس سوال کا دا اس کی گردن پر ہمارے اسلاف نے تو اسلامی فلسفہ پیش کرنے کے لیے یونانی فلسفے سے بڑی مدد ملی ہے تو مارکس پر باوجود اس کے باطل پہلوؤں کے نظر ڈالنا چاہیے شاید کوئی کارآمد باتیں ملیں۔ ویسے تو اگر ہم اس کو آخر میں پوری طرح رد کرنے کا ہی فیصلہ کریں تب بھی اس سے کچھ جان کاری تو جب بھی حاصل کرنا چاہیے۔ مغرب کے وہ علما جو مارکس کے عقیدے کے پکے" مخالف ہیں وہ بھی اس کے بارے میں جان کاری حاصل کرتے ہیں۔ اس مضمون کے لکھنے میں یہ پہلو بھی مدّ نظر تھا۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ بیسویں صدی کے شروع میں یہ ایک عام خیال تھا، موافقین اور مخالفین دونوں کا، کہ سرمایہ داری دنیا سے ختم ہو جائے گی لیکن مارکس نے سرمایہ داری کی جو کڑی تنقید کی تھی اس سے سرمایہ داری کو بچانے میں ہر موقع پر بڑی مدد ملی ہے۔ سرمایہ داری کی شکل برابر بدلتی رہی ہے اور وہ کم از کم فی الوقت تو دنیا پر بُری طرح حاوی ہے۔ عجیب بات ہے کہ یہ بھی مارکس کا ایک بڑا کارنامہ ہے اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ اس کے خیالات کا محل بُری طرح ڈھے گیا ہے تب بھی یہ کہنا پڑے گا کہ ایک لحاظ سے اس کے پیچھے بھی اس کا ہاتھ کارفرما ہے۔ مارکس کی کڑی مخالفت کی جا سکتی ہے لیکن اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

[ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۹۔ شمارہ ۹۔ ستمبر ۱۹۹۰ء]

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور
اس کے پرکھنے کے لیے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر
سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں
کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں
تہذیب و شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے
دینا نہیں چاہیے۔"

سید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱، شمارہ ۹-۱۰ (ستمبر-اکتوبر) ۹۲ء

# ایران کا ایک سنگین مسئلہ

کبیر احمد جائسی

ایران - عراق جنگ سے قطع نظر، ایران ایک اور اندرونی مسئلہ سے دوچار ہے جو کسی وقت بھی آتش فشاں بن سکتا ہے۔ یہ مسئلہ مذہبی یا سیاسی نہیں خالص لسانی ہے جس سے غیر ایرانی اہل علم کم ہی واقف ہیں اور جو حضرات اس سے کسی حد تک واقف بھی ہیں، ان کو اس سنگینی کا ابھی احساس نہیں ہو سکا ہے۔ اس لیے درج ذیل سطور میں اس مسئلے کے سلسلے میں چند بنیادی باتیں تحریر کی جا رہی ہیں۔

ایران کا شمال مغربی صوبہ آذربائجان زمانۂ ماقبل اسلام سے ہی بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے اور اس کی یہ مخصوص حیثیت عصر حاضر میں بھی برقرار ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ایران کی ⅕ آبادی اس صوبے میں آباد ہے۔ عصر حاضر میں اس صوبے میں جو لوگ بود و باش رکھتے ہیں وہ نسلاً ترک ہیں جو تقریباً ایک ہزار سال سے وہاں رہتے ہیں اور ایک ایسی زبان بولتے ہیں جو فارسی نہیں ہے بلکہ آذری یا ترکی آذربائجانی کہلاتی ہے۔ ایران کے صوبہ آذربائجان میں ترکوں کی آمد کا سلسلہ گیارہویں صدی عیسوی میں شروع ہوا جب کہ ایران پر سلجوقیوں کی حکمرانی تھی ہوا یوں کہ غز نام کے ایک ترک قبیلے نے آذربائجان پر حملے کرنے شروع کیے۔ اردو دائرۃ المعارف کے مقالہ نگار کے قول کے مطابق "پہلے یہ حملے چھوٹے چھوٹے جتھوں کے ذریعے کیے گئے۔ بعد ازاں بڑی جمعیتوں نے آذربائجان پر حملہ کرکے بالآخر اس پر قبضہ کرلیا۔" چونکہ فاتح غزوں کی مادری زبان ترکی تھی اس لیے آذربائجان کی ایرانی آبادی نے بھی رفتہ رفتہ یہی زبان اختیار کرلی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صوبے کے تمام باشندوں کی زبان ایک ہوگئی جو آج کل آذری یا ترکی آذربائجانی کے نام سے معروف ہے۔

آذری بولی ہے یا زبان؟ یہ فارسی زبان کی ذیلی شاخ ہے یا ترکی زبان کی؟ ان سوالوں پر اب سے چالیس پچاس سال قبل کافی گرما گرم مباحثہ ہو چکا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پورے وسط ایشیا پر روس کا اقتدار مستحکم ہو چکا تھا وسط ایشیا کے بہت سے افراد نے روسی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور دس برسوں تک اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے برسرپیکار رہے لیکن تنظیم کے فقدان اور آلات جنگ کی کمی نے ان کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس وقت جن وسط ایشیائی باشندوں نے افغانستان، ترکی وغیرہ میں پناہ لی تھی، انھوں نے "دنیا کے ترکو! متحد ہو جاؤ" کا نعرہ بلند کیا اس نعرے کا دیرپا اثر تو نہیں ہوا لیکن کچھ دنوں تک فضا میں ہلچل ضرور مچی رہی جس کے اثر سے آذربائجان بھی محفوظ نہ رہا۔ ترکی اخبارات اور رسالے آذربائجان میں بولی جانے والی زبان آذری یا ترکی آذربائجانی کو ترکی الاصل زبان ثابت کرنے میں مشغول ہوگئے، جس کا نتیجہ بہرحال یہ ہوا کہ آذربائجان کی ایک بہت بڑی آبادی نے اپنی بول چال کی زبان کو ترکی الاصل سمجھنا شروع کردیا۔ ترکی کے ترکوں کے اس خیال سے آذربائجان

کے ایک ترک اور اپنے زمانے کے ایک متنازع فیہ فرد احمد کسروی تبریزی متفق نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آذربائجان کی قدیم زبان آذری ایک ایرانی الاصل بولی تھی جس کی باقیات آج بھی موجود ہیں بہرحال یہ علمی مباحثہ چند برسوں کے بعد سرد ہوگیا اور بظاہر دونوں طرف خاموشی چھاگئی۔

محمد رضا شاہ کے والد رضا شاہ نے قاچاریوں کی حکومت ختم کرنے کے بعد جو ملکی اصلاحات کیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ انھوں نے فارسی زبان کو پورے ایران کی سرکاری زبان قرار دے کر علاقائی زبانوں میں درس و تدریس کا سلسلہ یکسر موقوف کرادیا اور کردستان، آذربائجان، بلوچستان، خوزستان وغیرہ صوبوں کے مدرسوں اور اسکولوں میں بھی فارسی زبان درس و تدریس کی زبان بن گئی۔ رضا شاہ کی اس روش کے خلاف آذربائجان میں غم و غصہ کا اظہار تو ضرور ہوا مگر حکومت کے سامنے سب ہی بے بس ہوکر رہ گئے۔ بہرحال آذربائجان کے عوام و خواص کی بول چال کی زبان وہی آذری رہی جس نے ترکی آذربائجانی کا نام اختیار کرلیا تھا لیکن وہاں کا پڑھا لکھا طبقہ اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کا بھی اتنا ہی ماہر ہونے لگا جتنا کوئی غیر آذربائجانی، ایرانی ہوسکتا ہے زبان کی یہ کشاکش و کش مکش اندر ہی اندر لاوے کی طرح ابلتی رہی لیکن حکومت کی سخت گرفت کی وجہ سے سطح پر نمودار نہ ہونے پائی۔ ۱۹۷۹ء میں ایرانی انقلاب سے کچھ ہی پہلے ایک آذربائجانی جلاوطن ادیب و عالم رضا براہینی نے The Crowned Cannibals کے نام سے امریکہ سے ایک کتاب شایع کی جس میں پہلوی حکومت پر جو فرد جرم عاید کی گئی تھی اس میں آذربائجان کے لوگوں پر زبردستی فارسی زبان کا مسلط کرنا بھی شامل ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے کچھ ہی عرصے بعد ایران کا حالیہ انقلاب رونما ہوا اور کچھ دنوں کے لیے پھر یہ مسئلہ دب گیا۔

انقلاب کے چند ہی برسوں کے بعد "ولایت فقیہ" کی تشریح توضیح کے مسئلے میں آیت اللہ شریعت مداری مرحوم اور آیت اللہ خمینی میں شدید اختلافات رونما ہوئے۔ آیت اللہ شریعت مداری، آذربائجانی تھے اور نسلاً ترک۔ اس اختلاف میں ایران کے بیشتر عوام نے آیت اللہ خمینی کا ساتھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تو آیت اللہ شریعت مداری خانہ نشین ہوگئے اور پھر خانہ نشینی کی زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ ان دونوں بزرگوں کے اختلاف کے سلسلے میں آذربائجان میں خاموشی رہی مگر آیت اللہ شریعت مداری کے انتقال کے بعد ایک بار پھر زبان کا مسئلہ اپنی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آگیا ہے جس کی واضح مثال ڈاکٹر جواد ہیئت کی کتاب "سیری در تاریخ زبان و لہجہ ھای ترکی" ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳۶۴ھ ش (۱۹۸۶ء) میں "نشر نو" تہران نے شایع کی تھی لیکن ایک سال کے اندر ہی اندر اس کے سارے نسخے فروخت ہوگئے۔ اس لیے ناشر نے ۱۳۶۵ھ ش میں اس کو دوبارہ شایع کیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر جواد ہیئت نہ تو کبھی ادبیات و لسانیات کے طالب علم رہے ہیں اور نہ ہی تعلیم و تعلم ان کا ذریعہ معاش ہے۔ وہ ایک طبیب ہیں اور علاج معالجہ ان کا پیشہ۔ اس کے باوجود انھوں نے متعدد روسی عالموں اور ترکی کے زبان شناسوں کی تصانیف کا غائر نظروں سے مطالعہ کرکے اپنی مذکورہ کتاب تحریر کی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ایرانی عالموں کا وہ طبقہ از حد برافروختہ ہے جو "ایک ملک ایک زبان" کے نظریے کا حامل ہے۔

ڈاکٹر جواد ہیئت نے اپنی مذکورہ کتاب میں ترکی زبان کے عہد بہ عہد ارتقا اور اس سے نکلنے والی بولیوں کا خود زبان کا درجہ حاصل کرکے اپنی آزادانہ شان قایم کرنے کا جو مفصل بیان کیا ہے ہم اس سے سردست صرف نظر کرکے صرف اس حصے پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں جس میں انھوں نے طرح طرح سے گھما پھرا کر صرف ایک بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ فارسی زبان کو جبراً اسکے

بان کی زبان قرار دینا نہ تو اسلامی فعل ہے اور نہ ہی ملکی مصالح
، مطابق ہے۔ اگر فارسی زبان حضرات ترکوں، کردوں، بلوچیوں
، رکمردوں وغیرہ پر اپنی زبان جبراً مسلط کریں گے تو اس کا
بہ ایسے ردِ عمل کی شکل میں سامنے آئے گا جو ممکن ہے ملک کی
سالمیت کو بھی نقصان پہنچا دے۔ ڈاکٹر جواد ہیئت کی تحریر
ے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے ملک میں ہندی
بان کے نادان دوست دوسری ہندوستانی زبانوں کی نفی کر کے
ورے ہندوستان کی زبان ہندی بنا دینا چاہتے ہیں اسی طرح
ا ایک گروہ ایران میں بھی پیدا ہو گیا ہے جو ایران سے فارسی
زبان کے علاوہ دوسری تمام زبانوں کو نابید کر دینے کا
خواہاں ہے۔ ڈاکٹر جواد ہیئت کی کتاب ایسے ہی افراد کے عمل
کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ
آج آذری یا ترکی، آذربائجانی کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ وہی
سلسلہ ہے جس کی ابتدا پہلویوں نے ایران کے تخت و تاج پر قابض
ہوتے ہی کر دی تھی۔ ڈاکٹر جواد ہیئت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

" آنچہ با آمدن حکومت پہلوی عاید مردم آذربائجان
شد گذشتہ از استبداد و خفقان سیاسی ستم ملی
بود کہ احساسات ملی گرائی افراطی و شوونیستی
فارسیان چشمہ می گرفت۔" (ص ۲۶۱)

[ پہلوی حکومت کے قایم ہونے کے بعد آذربائجان
کے لوگوں پر جو چیز مسلط ہوئی وہ سیاسی ظلم
اور پاگل پن کے علاوہ وہ قومی ظلم تھا جس کی
آبیاری فارسیوں کے بڑھے ہوئے ملی تفوق کے
احساس اور جارحانہ وطن پرستی کے جذبات سے ہوتی ہے]

پہلوی حکومت اپنے ظلم و استبداد میں کامیاب ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آذربائجان کے سارے مکتبوں، مدرسوں، اسکولوں اور اعلیٰ تعلیم گاہوں سے آذری یا ترکی، آذربائجانی کو خارج کر دیا گیا اور اس کی جگہ پر فارسی زبان کو جبراً رائج کیا گیا۔ اس طرح وہاں کے عوام اپنے اس بنیادی حق سے محروم کر دیے گئے کہ وہ اپنی مادری زبان میں علم حاصل کریں اور اپنے بچوں کو اسی زبان میں تعلیم دیں۔ اس تلخ حقیقت کا اندازہ ڈاکٹر جواد ہیئت کے درج ذیل جملے سے لگایا جا سکتا ہے:

" مردم از نخستین حقوق انسانی یعنی تعلیم و تعلم و تکلم و
تحریر بہ زبان مادری محروم ماندند۔" (ص ۴۹)

[ لوگ اپنے اولین انسانی حق یعنی مادری زبان میں
پڑھنے پڑھانے، بات چیت کرنے اور اس میں لکھنے
سے محروم ہو گئے۔]

اپنے بنیادی حق سے محروم ہونے کے بعد آذربائجان کے عوام و خواص نے اس کی بازیابی کے لیے تحریک چلائی جس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کو جیل خانوں میں زندگی بسر کرنی پڑی اور بہتوں کو اپنی جان تک سے ہاتھ دھونا پڑا لیکن پہلوی حکومت کی دار و گیر کی پالیسی کے سامنے ان کی کوئی تحریک برگ و بار نہ لا سکی اور پورے آذربائجان میں فارسی زبان، ذریعۂ تعلیم بن گئی۔ اس بجا زیرِ شکست کھانے کے بعد بھی آذربائجانی عوام نچلے نہ بیٹھے اور وہ ہر اس تحریک کا گرم جوشی سے خیر مقدم کرتے جو پہلوی حکومت کے خلاف چلائی جاتی خواہ اس کا تعلق اصلاح اراضی سے ہوتا خواہ پردہ پر پابندی سے۔ آذربائجان کے علما اس قسم کی تحریکوں میں ہراول دستہ کا کام انجام دیتے۔ بہرحال تقریباً پچاس برسوں کی جدوجہد اور گیر و دار کے بعد جب ایران میں انقلاب کی زمین ہموار ہونے لگی تو آذربائجان کا صوبہ آتش فشاں بن گیا۔ ۱۹۷۹ء میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ایران کے بادشاہ محمد رضا شاہ پہلوی کو اپنے وطن سے فرار ہونا پڑا اور ایران میں ایک اسلامی حکومت قایم ہوئی۔ انقلاب کے فوراً بعد آذربائجان کے عوام دوسرے صوبوں کے عوام ہی کی طرح جشن فتح مناتے رہے۔ جب جذبات کے امڈتے سیلاب میں اتار آیا تو آذربائجان کے لوگوں نے پھر اپنا پرانا مطالبہ دہرانا شروع کیا جس کو ڈاکٹر جواد ہیئت نے ایک جملے میں یوں تحریر کیا ہے:

" خصوصیات مذہبی و زبانی و فرہنگی ہر یک محترم
شناختہ شود۔" (ص ۳۹۳)

[ ہر ایک شخص کی مذہبی، لسانی اور تمدنی خصوصیات

کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جائے ]۔

اس مطالبہ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دنیا کے بہت سے ترقی یافتہ ممالک ایسے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے ملکوں میں ایک سے زیادہ زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ دے رکھا ہے جس کی وجہ سے لسانی اقلیتیں اکثریت سے نہ صرف یہ کہ نالاں نہیں ہیں بلکہ اس بات کے لیے بھی کوشاں ہیں کہ وہ اکثریت کی زبان کو اس طرح سیکھ لیں کہ ان کے شانہ بہ شانہ اور گام بہ گام مل کر ملک کی پیش رفت میں ان کے برابر حصہ لیں۔ اگر ان ترقی یافتہ ممالک نے کسی بھی ایک زبان کو پورے ملک کے عوام پر جبراً مسلط کیا ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ضرور برآمد ہوا ہوتا کہ اس ملک کے عوام کئی دھڑوں میں تقسیم ہو چکے ہوتے اور لسانی جارحیت ملک کی پیش رفت کو نقصان پہنچا چکی ہوتی۔ ڈاکٹر جواد ہیئت نے بھی مثال کے طور پر بہت سے ملکوں کا نام لیا ہے جہاں کئی کئی سرکاری زبانیں ہیں اور ہر زبان کو اپنے منطقے میں پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل ہیں۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:

> " در سوئیس چہار زبان رسمی است، در کانادا در قسمت فرانسہ زبان، زبان اول فرانسہ است، در بلژیک دو زبان فرانسہ و فلامان رسمی است. در شوروی بیش از پانزدہ زبان و در چین پنج زبان رسمی است۔ در یوگوسلاوی ہم پنج زبان رسمی است۔ در کشور فرانسہ زبانہای ترماندی و لمبوزیم ہم پذیرفتہ شدہ است در انگلستان در منطقۂ اسکاتلند و ویلز زبانہای محلی ہم بعد از جنگ دویم جہانی شکوفا گردیدہ است "
>
> (ص ۳۹۳)

[ سوئٹزرلینڈ میں چار سرکاری زبانیں ہیں کناڈا میں جہاں فرانسیسی بولنے والے ہیں وہاں کی پہلی (سرکاری) زبان فرانسیسی ہے بلجیم میں دو سرکاری زبانیں ہیں ایک فرانسیسی اور دوسری فلامان۔ ممالک متحدہ روس میں پندرہ سے زیادہ زبانیں اور چین میں پانچ سرکاری زبانیں ہیں۔ ملک فرانس میں ترماندی اور لمبوزیم زبانوں کو بھی (سرکاری زبانیں) تسلیم کیا گیا ہے۔ انگلستان میں اسکاٹ لینڈ اور ویلز کے منطقوں میں دوسری جنگ عظیم کے بعد سے مقامی زبانیں برگ و بار لا رہی ہیں ]۔

غالباً ان ملکوں کی مثالوں ہی کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جب متمدن اور ترقی یافتہ ملکوں میں ایک سے زیادہ سرکاری زبانیں ہو سکتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ایران میں ایسا نہ ہو سکے یعنی اگر فارسی بولنے والے اپنی لسانی عصبیت سے باز آجائیں تو کُردی، بلوچی، آذری، تالشی، گیلکی وغیرہ وغیرہ بولیوں میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو جائے اور ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہو جائے کہ وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت صاف صاف الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ

> " مردم ہر منطقہ ... باید بتوانند بزبان مادری و محلی خود تحصیل و تدریس کنند۔ زبان محلی باید در محل رسماً پذیرفتہ شدہ باشد... انتخاب یک زبان و تحمیل اجباری آن بہ ہمہ اقوام بہ قیمت نفی زبان قومی و مادری آنہا عاقلانہ و بہ مصلحت ہیچ کشوری نیست و جز نفاق و ایجاد عکس العمل دفاعی و تنفر کینہ نتیجہ، ندارد "۔
>
> (ص ۳۹۳)

[ چاہیے کہ ہر منطقے... کے لوگ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کریں اور تعلیم دیں۔ یہ بھی چاہیے کہ مقامی زبانوں کو اپنے اپنے مقام پر سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے.... کسی ایک زبان کو منتخب کرنا اور اس کو دوسری قوموں پر جبراً ان کی مادری زبان کی نفی کر کے مسلط کرنا نہ تو عاقلانہ (فعل) ہے اور نہ ہی کسی ملک کے مصالح کے مطابق ہے۔ اس (عمل) کا نتیجہ سوائے افتراق، دفاعی ردّ عمل، نفرت اور کینہ کے کچھ اور نہیں ہے ]۔

درج بالا اقتباس سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بات اب دھمکی کی حد تک پہنچنے لگی ہے اور اس کے بین السطور سے یہ مطلب برآمد ہوتا ہے کہ ایران کے حالیہ انقلاب کے بعد آذربائیجان کے لوگ اس صورت حال کو بہت دنوں تک برداشت کرنے کے

لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر آذربائیجان کے لوگوں پر مرکز کی سرکاری زبان نہ لادی جائے تو وہ از خود پہلے ہی کی طرح فارسی زبان پڑھتے پڑھاتے رہیں گے۔ کیونکہ ایسا نہ کرنے میں خود ان کا ہی نقصان ہے۔ آذربائیجان کے لوگ اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ آذری یا ترکیٔ آذربائیجانی ان کے صوبے کے علاوہ ایران کے کسی قریہ یا کسی گوشے کی زبان نہیں ہے۔ اس لیے وہ خود اس بات کو پسند نہ کریں گے کہ وہ اپنے ہی ملک کی پوری آبادی سے کٹ کر رہ جائیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان کی مادری زبان کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے اور اس کو آذربائیجان میں ذریعۂ تعلیم کی حیثیت دی جائے۔ اگر غیر جذباتی انداز سے حکمت و دانائی کے ساتھ آذربائیجان کے لوگوں سے معاملہ کیا جائے تو اس لسانی کشاکش و کشمکش کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فارسی زبان حضرات آذربائیجان کے عوام کے احساسات کو کس حد تک سمجھ پاتے ہیں اور کس طرح اس مسئلہ کا حل نکالتے ہیں۔

اس بات سے شاید ہی کوئی منصف مزاج ایرانی انکار کر سکے کہ ایران کے ترک (آذربائیجانی) ہر تحریک میں فارسوں کے شانہ بشانہ رہے ہیں اور انھوں نے بھی اپنے ملک کی آزادی کے لیے اپنی جان گنوائی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ ایران کے ترکوں کے اس احساس کو یکسر ختم کر دیا جائے کہ ان کے ساتھ کوئی لسانی تعصب برتا جا رہا ہے اور اس کے ذریعے ان کی زبان اور تمدن کو دھیرے دھیرے ختم کیا جا رہا ہے۔ غالباً اسی احساس کے تحت ڈاکٹر جواد ہیئت نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

"تجربۂ پنجاه سالۂ دوران پهلوی نشان داد که روش غیر انسانی و ضد اسلامی نتیجۂ معکوس دارد و ممکن است در روزهای ضعف و تاریک بهانه و دستاویزی به دست دشمنان بدهد و مورد سوء استفادهٔ دیگران قرار گیرد۔" (ص ۳۹۳)

[پہلوی دور کا پچاس سالہ تجربہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ غیر انسانی اور غیر اسلامی روش کا نتیجہ بالکل الٹا نکلتا ہے اور ممکن ہے کہ (یہ روش) کمزوری کے تاریک دنوں میں (ملک کے) دشمنوں کے ہاتھ میں ایک ایسی دستاویز اور بہانہ دے دے جو نقصان پہنچانے کا ایک ذریعہ بنے۔]

ڈاکٹر جواد ہیئت کے درج بالا اقتباس میں جس روش کو غیر اسلامی قرار دیا گیا ہے، اگر اس کو ایرانی پاسداران انقلاب بھی غیر اسلامی سمجھ لیں اور اپنے رویے میں تھوڑی سی لچک پیدا کر لیں تو یہ آواز اپنے ابتدائی مرحلے میں دب سکتی ہے۔ اگر خدانخواستہ اس آواز کو زور و جبر کے ذریعے دبانے کی کوشش کی گئی تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا انجام کس صورت میں ظاہر ہوگا۔

## حواشی

۱؎ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۱ (آئین - ابجد) طبع اول، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۳۸

۲؎ تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب 'آذری'، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ۱۹۷۸ء، ملاحظہ ہو

[ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۷، شمارہ ۷ (جولائی ۱۹۸۸ء)]

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱ - شمارہ ۹ - ۱۰ (ستمبر - اکتوبر) ۹۲ء

# چین پر پہلی نظر

سید الطفر چغتائی

چین کی سرزمین پر میں قریب دو ہفتے گزار چکوں گا۔

۲۰ مئی کی شام کو پیکنگ پہنچا جسے اب اس کا پرانا نام بیجنگ دیا جا چکا ہے تو لوگوں نے شہر میں داخل ہونا روک رکھا تھا اس لیے کہ ہڑتالی طلبا کے خلاف فوج کی مداخلت کا خطرہ تھا۔ ٹیکسی دو راستے بدل کے ایک زیر تعمیر سڑک سے ہو کر داخل ہوئی اور مجھے "دوستی ہوٹل" میں ٹھہرا دیا گیا، جو شاہراہ ' بائی تسی کیاؤ پر باغوں میں واقع ایک پورا محلہ ہے اس میں ۱۹۰۰ اکہرے، دہرے اور تہرے کمرے ہیں۔ چار کمروں تک کے اقامتی انتظامات ہیں۔ متعدد ریستوراں' ڈاکخانہ اور ایک چھوٹا سا بند' بازار' یا ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے جو ۱۹۵۴ء کی تعمیر ہے۔ سنا ہے کہ یہاں ٹھہرنے کا یومیہ خرچ ۱۵۰ ڈالر سے کم نہیں ہوتا ہے مگر میں چینی سائنسی اکادمی کا سرکاری مہمان ہوں' اس لیے مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ہوئی۔

دوسری صبح پروفیسر یاؤ آدھ گھنٹہ سائیکل چلا کر مجھ سے ملنے آئے، کیونکہ بسیں بند تھیں۔ کئی گھنٹے میرے ساتھ رہے مجھے شہر دکھلانے نہ لے جا سکے کیونکہ رسل و رسائل معطل تھے۔

والنٹیر سہ پہر کو خاصے وقت سے مجھے ٹیکسی میں ریلوے اسٹیشن پہنچا کر ساڑھے چھ بجے ٹرین میں بٹھا گئے۔ یہاں کے بالائی درجے میں ہمارے ایرکنڈیشنڈ سکنڈ جیسے چار چار بستروں کے کیبن ہوتے ہیں۔ دروازہ فرسٹ کلاس کی طرح کھینچ کر بند کیا جا سکتا ہے۔ 'بلند گو' پر اعلانات ہوتے رہتے ہیں یا ریڈیو موسیقی وقتاً فوقتاً نشر ہوتی رہتی ہے۔ صبح چھ بجے سے خاص طور پر بہت دلکش چینی گانے آتے رہے۔ ہمارے کیبن میں ہم سفر دو چینی تھے اور ایک فرانسیسی نوجوان لڑکی جو فرانس کی دکانوں اور دفتروں میں کام کرنے والوں کو ہفتہ دس دن کے ہمہ وقتی درس کمپیوٹر استعمال پر دیتی ہے۔ یہ کئی مہینے کے لیے آئی ہے چین بھر میں ماری ماری پھرے گی اور ستمبر میں کہیں واپس ہوگی۔ کیبن میں کھولتے پانی کا تھرماس رکھا تھا جسے ہر بارہ گھنٹے پر بھر جاتے تھے۔ لوگ اس سے چینی چائے بناتے اور پیتے رہتے تھے۔ طریقہ یہ ہے کہ بڑی بڑی ہری پتیاں ذرا سی پیالی میں لیں جو ہماری پیالی سے تین گنی بڑی ضرور ہوتی ہوگی یا شیشے کی شیشی میں اور پانی ڈال کر ڈھک کر رکھ دیا۔ دس پندرہ منٹ میں پتیاں نیچے بیٹھ گئیں۔ اب یہ جوشاندہ چوس چوس کے دھیرے دھیرے پی رہے ہیں۔

۱۹ گھنٹے میں ہنفئی پہنچے۔ ٹرین ہماری پرانی جنتا یا آیر انڈیا جیسی گاڑی تھی۔ زیادہ تیز ٹرینیں شاید ابھی یہاں نہیں۔ رکتے ہی 'منگ سے' اندر آ گئے اور سامان اٹھا کر

ٹیکسی سے یونیورسٹی کے مہمان خانے لے آئے۔ یہ چار منزل کی چھوٹی سی عمارت ہے۔ ہر منزل پر آٹھ آٹھ دُہرے کمرے سامنے کمرۂ ملاقات، پیچھے کمرۂ استراحت پر دے پڑے، فرش پر معمولی قالین، دو صوفہ نما آرام دہ کرسیاں، تین استعمالی، یورپی دُہرا بستر، میز، درازیں، رنگین ٹی۔ وی، فرج، میز کا لیمپ، سنگ سیاہ اور شیشے کی بڑی بڑی قلموں کا خوب ترشا ہوا، غسل خانے میں فوارہ اور بچوں بھر کا ٹب۔ اس مہمان خانے کو 'غیر ملکی ماہروں کی عمارت' کہتے ہیں۔ ریستوراں ساتھ ہے۔

اس وقت صبح و شام خنکی ہوتی تھی۔ اب دن گرم ہوتے جا رہے ہیں۔ رات دس بجے کے بعد ہی کمرہ خوش گوار ہوتا ہے، جس میں دروازے کھڑکیاں خوب ہیں۔ جالی اور شیشے کے دہرے۔ ایک ایرکنڈیشنر بھی، جسے ہم نے ابھی تک چلایا نہیں ہے۔

ہر روز ایک دو تجربہ گاہیں دیکھ رہا ہوں۔ جدید ساز و سامان سے لیس، ہندوستان میں صرف بڑے تحقیقی ادارے ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان کے سامنے ہماری چیزیں مدرسے یا عجائب خانے کی لگتی ہیں۔ بعض مشینیں ہمارے ملک میں ہیں ہی نہیں جیسے دیو قامت ND³ Glass لیزر اور ثرا Cyclotron کل پچاس کلومیٹر پر ایک جھیل کے اندر جزیرے میں واقع منظر پانی حرفت کے ادارے میں پذیرائی تھی اور تقریر بھی —— یہاں ترقیاتی منصوبے سائنس دانوں اور انجینیروں کے سپرد کیے جاتے ہیں کہ وہ ان کو دی ہوئی مدت میں پورے کریں۔ اس کے بعد ہی بنی ہوئی چیزیں، مشینیں، آلات ادارے ہی کے صنعتی حصّے کو سڑک کے دوسری طرف دے دیے جاتے ہیں انھیں بڑے پیمانے پر بناؤ اور بیچو۔ ساتھ ہی ساتھ سائنس داں خالی وقت میں خاصی اچھی تحقیقات بھی انھیں آلات کو استعمال کر کے ذاتی طور پر کر لیتے ہیں اور طالب علموں کو انفرادی طور پر تربیت دیتے رہتے ہیں۔ بیجنگ میں طلبا کی ہڑتال ختم ہو چکی ہے مگر کئی اور جگہوں سے اطلاع ملی ہے کہ تعلیم ہنوز معطل ہے۔ حکومت کا کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندرونی سیاست کی رسہ کشی ہے مگر مغربی دنیا کے مہمان اس سے بہت خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تحریک کی مقبولیت دیکھو۔

اس منظر پانی حرفت کے ادارے میں اچھا خاصا سامان ہمارے سائنسی اور حرفتی کام کا بنتا ہے۔ شنگھائی اور پیکنگ میں بھی۔

میرے پروگرام میں ایک دو تجربے کرنے ہیں اور ابھی کئی اور اداروں کا معائنہ کرنا ہے۔ دو تین تقریریں بھی کرنی ہوں گی جہاں کہیں جاتا ہوں، خاصی افہام و تفہیم کا موقع ملتا ہے اور کئی لوگوں کو میں نے مشورے دیے کہ اپنے آلات سے یہ مزید اور نئے کام کر سکتے ہو اور اس طرح ایک کمسٹری کے پروفیسر میری تحقیقات کے نتائج کثرت سے اپنے کام میں استعمال کر رہے ہیں۔ مزید اعداد و شمار کی فرمائش کی ہے جو میں واپسی پر انھیں فراہم کر دوں گا۔

یونیورسٹی کے دو کیمپس ابھی اور ہیں۔ ایک میں نئی طبیعیات کے شعبے دیکھنے جاؤں گا جہاں ہمارے میزبان نائب پروفیسر منگ ہے کی بیوی ایک میں صدر شعبہ بھی ہیں اور دوسرے میں سنکروٹرون تابناکی۔ Radiation کا مرکز واقع ہے جو میری ذاتی دلچسپی کا بھی مرکز ہے۔ یونیورسٹی کے باہر ریشم کا کارخانہ دیکھنے کے لیے بھی یہ لوگ لے جائیں گے، جہاں سے کچھ نمونے خریدنے کا ارادہ ہے۔

یونیورسٹی کی تجربہ گاہوں میں خواتین کی بڑی تعداد ذمہ داری کے عہدے سنبھالے ہوئے ہے۔ چینی شہروں کا رہن سہن یورپی ہے، جس سے ان کی کارکردگی ہم سے کہیں

زیادہ ہے۔ کوئی شخص، کوئی بیکار چیز پڑی نظر نہیں آتی۔ ہر مشین استعمال میں ہے۔ جو ہے کام سے لگا ہے، عزت کا نام نہیں۔ سب لوگ صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں اور انسانوں کی طرح رہتے ہیں صرف شکایت یہ سنی کہ تجارت پیشہ کے پاس پیسہ زیادہ ہے، جس کی تلافی عن قریب تنخواہیں بڑھا کر کی جانے والی ہے۔

چین میں صبح سات بجے ناشتہ ہوتا ہے۔ بارہ بجے دوپہر کو اور سات بجے شام کو کھانا۔ کام صبح ساڑھے سات بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک ہوتا ہے اور سہ پہر میں تین سے پانچ بجے تک۔ دوپہر کے کھانے کے بعد لوگ آرام کرتے ہیں مگر کوئی دن بھر کا پروگرام بھی ہو سکتا ہے جس میں دعوت گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چل جائے اور آرام کا وقفہ ۱۵ منٹ کا ہی رہ جائے۔ چینی چائے ہر وقت مل سکتی ہے۔ ایک پیالی میں پتیاں ڈال لیں اور گرم پانی بڑھاتے رہیں۔

چینی معاشرے کو کسی اعتبار سے ہم پر فوقیت حاصل ہے۔ ہر چینی چینی ہے۔ ذات پات، مذہب، زبان، شمال، جنوب، اونچ نیچ میں بٹا نہیں ہے۔ ہر شخص، عورت، مرد اپنے ہاتھ سے کام کرتا ہے۔ دوسروں کی کمائی پر پلنے والے ناکارہ نہیں ہیں۔ اپنا مستقبل، اپنی دنیا آپ پیدا کر رہے ہیں کہ زندوں میں ہیں۔ شہروں میں عام طور پر گھر پیچھے ایک ہی بچہ ہوتا ہے۔ لڑکا ہو یا لڑکی۔ خال خال دو ہیں لیکن سنا ہے کہ گاؤں پر آبادی کے کنٹرول میں ابھی اتنا قابو نہیں پایا ہے اور وہاں بڑے بڑے خاندان ملتے ہیں، جن سے آبادی ابھی تک ٹھہری ہوئی نہیں ہے اور اب ایک ارب بیس کروڑ تک پہنچ گئی ہے۔

علم ترقی کی سطح ہماری ہی جیسی ہے۔ عام چیزوں کی قیمتیں بھی ہمارے یہاں جتنی ہی ہیں مگر صفائی خوب ہے۔ ٹرین یا کار سے سفر کرنے میں، یا پیدل آنے جانے میں، خال خال ہی کہیں دو چار کاغذ پڑے دیکھے۔

چینی غذا ستھری ہے۔ چاول کا پیالہ۔ طرح طرح کی سبزیاں، طرح طرح کی مچھلیاں اور "پانی کی پھل" گوشت دعوتوں میں دس بارہ پندرہ تیاریاں سامنے آ جاتی ہیں مگر لطف یہ کہ سب ہضم ہو جاتا ہے۔ نہ معدے کی گرانی، نہ زکام، نہ دردِ سر۔ ماحول کی صفائی بھی کیا نعمت ہے۔ غذا کا ہلکاپن اور تیل گھی سے پناہ! کھانا دو تیلیوں سے ہوتا ہے اور ایک چوڑے چمچے سے۔ غیر ملکیوں کو چمچ کانٹا دے دیتے ہیں لیکن مجھے ضرورت نہیں پڑتی ہے اور زیادہ تر بھی مہمان تیلیاں ہی استعمال کر رہے ہیں۔ بغیر زیادہ زحمت کے سارس اور لومڑی کی دعوتوں کی کہانی یاد آتی ہے۔

مہمان خانے غیر ملکی ماہروں سے بھرے رہتے ہیں۔ لوگ آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ دنوں، ہفتوں اور مہینوں کے لیے (کسی زمانے یعنی ۱۹۷۹ سے پہلے ایسا ہی ماحول میں نے پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں دیکھا تھا، مگر افسوس کہ اس کہانی کا ورق الٹ گیا!) امریکی، چینی اور جاپانیوں کی تعداد زیادہ رہی ہے لیکن ملاقات فرانسیسی، جرمن، سویلس، ڈچ، انگریز، امریکی سبھی سے ہوئی۔ کچھ لوگ بیویاں ساتھ لائے۔

چینی زبان کے بہت مشکل ہونے کے چرچے کس نے نہیں سنے ہیں مگر مجھے سن کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبان ہے جو ہم نہیں جانتے، "تلفظ مشکل نہیں ہے۔ ایک ایک لفظ کہہ کے کانوں سے سیکھی جائے تو آسان ہے

• نی ہاؤ۔ آپ کا مزاج (سوال و جواب دونوں)، سستن۔ خط۔ شن شیان۔ لیٹر بکس، شیے شیے شکریہ۔ شیان بکس۔

صرف رسم خط مشکل ہے اس لیے کہ حروف تہجی نہیں۔ صرف مصوری کے خطوط اور خطاطی کے نمونے

ہیں۔ معلوم ہوا کہ چین کا قومی نام (چینی زبان میں) "ژینگرا" ہے جس کے معنی 'مرکزی سلطنت' ـــــ دنیا کے وسط میں ہونے کا خبط سبھی کو تھا۔ ہندوستان کی قدیم تواریخ میں 'جمبو دویپ' سے بھی تصور وابستہ تھا ـــــ چین میں چھپے عالمی نقشے دیکھیے ان میں بحر الکاہل کے پورب میں شمالی وجنوبی امریکا دکھاتے ہیں اور چین سے پورب اور افریقا تک پچھم میں بحر اوقیانوس کو گول کر دیتے ہیں۔ جیسے ہم یورپ کے زیر اثر بحر الکاہل کو فراموش کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح چین دنیا کے بیچ میں دکھائی دیتا ہے۔

اس سے یہ بات بھی یاد آتی ہے کہ آسٹریلیا میں عالمی نقشہ الٹ کر بنتا ہے، جس میں قطب جنوبی اوپر ہوتا ہے اور قطب شمالی نیچے۔ اس طرح آسٹریلیا بھی اوپر آجاتا ہے اور کیوں نہ آئے، زمین کسی کی جاگیر نہیں۔ صرف جرمن ہی کیا کہیں کہ

DEUTCH LAND

جرمنی سب کے اوپر

اور ہم بھی تو کہتے ہیں، زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ کیا آسٹریلیا زبردست اور چین میں بھی چین کو مرکزی ہونے کا حق نہیں۔

چینی ٹی۔ وی شام چھ بجے سے رات گیارہ بجے تک چار پانچ چینلوں پر آتا ہے۔ رات آٹھ بجے چینیوں کو انگریزی پڑھانے کا ایک اونچا پروگرام ہفتے میں کئی دن نشر کرتے ہیں جس کے بعض حصے ہم لوگوں کے لیے بھی دلچسپی کے ہوتے ہیں۔ ورنہ، ۱ بج کر دس منٹ پر انگریزی خبریں اور ایک بین الاقوامی معلومات کا پروگرام ہوتا ہے جس کا معیار ہر طرح بلند ہوتا ہے۔ کیا خبروں کا انتخاب، کیا تلفظ، کیا مواد۔ ایک دلچسپ اور مفید چیز موسم کی پیشین گوئی ہے۔ نہ صرف چین کے اہم شہروں اور صوبوں بلکہ دنیا بھر کے تقریباً بڑے شہروں کے درجۂ حرارت اور موسمی حالات پر یک لفظی اطلاع نقشے کے ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے برّ صغیر میں صرف کراچی کا نام آتا ہے۔ سبب ظاہر ہے۔

طلبا بڑی تعداد میں انگریزی پڑھ رہے ہیں لیکن وہ یا استاد وہی سمجھتے اور بولتے ہیں، جن کا غیر ملکیوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ کئی پروفیسر بڑی محبت سے ملے مگر بات چیت تیسرے شخص کے وسیلے سے ہوئی۔ عوام میں سے کوئی نہیں سمجھتا۔ مہمان خانے کے ملازموں میں صرف دو لڑکیاں کچھ سمجھ بول لیتی ہیں۔ بازار ایک دو بار گیا اور کوئی چھوٹی موٹی چیز خرید بھی لایا۔ ذہانت سے کام لے کر اپنی بات سمجھا دی اور قیمت کے معاملے میں اعتماد کیا مگر لوگ عزت نفس والے ہیں۔ کوئی گھٹیا کام کرنا جانتے ہی نہیں۔ چوری، جیب کتری کے شاید لفظ ہی جدید چینی میں نہ ہوں۔ جیسے سگے بھائی بہن کے ایک بڑے جلتے میں نہیں ہیں۔

[تہذیب الاخلاق علی گڑھ : جلد ۸۔ ش ۸ اگست ۸۹ء]

---

بقیہ ـــــ متعلقہ صفحہ نمبر ۲۰۷

گئے ہیں۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترکوں کو کبھی بھی کسی ایک رسم الخط سے قلبی لگاؤ نہیں رہا ہے اور اب بھی اس کا امکان ہے کہ مستقبل میں کوئی اور رسم الخط اختیار کر لیا جائے۔

[ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۸۔ شمارہ ۸ اگست ۱۹۸۹ء]

# ترکی زبان ایک مطالعہ

اکمل ایوبی

ترکی ایشیا اور یورپ کے ترکوں کی مادری زبان ہے اس کا شمار دنیا کی قدیم زبانوں میں ہوتا ہے۔ یہ ایک سیدھی سادی لیکن بامحاورہ اور زرخیز زبان ہے اور دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں اس کا ایک مقام ہے۔ اس کا لسانی تعلق نہ تو عبرانی اور عربی جیسی سامی زبانوں سے ہے اور نہ ہی سنسکرت اور فارسی جیسی آریائی زبانوں سے ہے۔ یہ بذات خود ایک مستقل زبان ہے اور یورال التائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے جس کو تورانی خاندان بھی کہتے ہیں۔ اس وقت ترکی زبان کے مختلف لہجے تقریباً پچیس علاقوں میں بولے جاتے ہیں اور دس ملکوں میں انھیں قومی زبان کا درجہ بھی حاصل ہے اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بھی تقریباً بارہ کروڑ ہے جو ولاڈی واسٹک سے لے کر بلگریڈ تک پھیلے ہوئے ہیں جن میں ترکی جمہوریہ کے علاوہ سین کیانگ (چینی ترکستان) ازبکستان، قرغزستان، قازاقستان، ترکمانستان، آذربائیجان اہم خیال کیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ یونان، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، رومانیہ، افغانستان، عراق، شام، قبرص کے بھی متعدد علاقوں میں اسی زبان کا بول بالا ہے۔

ترکی زبان کو خود ترک "تورک دلی" کہتے ہیں لیکن ترکی جمہوریہ کی زبان "تورکچہ" کہلاتی ہے۔ یہ ہماری اردو زبان سے بھی زیادہ جامع زبان ہے اور اس کے جملوں میں لفظوں کی ترتیب عموماً اردو جیسی ہوتی ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر حمید اللہ کا یہ کہنا صداقت پر مبنی ہے کہ اگر ایک زبان کی عبارت کا ترجمہ دوسری زبان میں لفظ بہ لفظ کر دیا جائے تو وہ خود بخود بامحاورہ ترجمہ ہو جاتا ہے۔ تاہم ترکی زبان میں تذکیر و تانیث کا وجود نہیں ہے۔ اس میں کسی ایک نحوی عبارت یا مجموعۂ عبارات کے عوامل نحوی اپنے معمولات کے بعد آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جملے کا اہم ترین حصہ عموماً جملے کے آخر میں رکھا جاتا ہے اور اس طرح روا فعا عیل کے بعد آتے ہیں اور اجزائے موصوفہ اپنی صفت کے بعد لکھے جاتے ہیں اور اصلی و اہم بیانات عارضی بیانات کے بعد آتے ہیں۔ ترکی زبان میں ایک ہی ماخذ سے بہت سے الفاظ بنانے کی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم موجود ہے جس سے ہندی اور اردو زبانیں کسی حد تک محروم ہیں۔ یہ اصلیت ہے کہ ہندی اور اردو دونوں میں ہر زبان کے الفاظ کو اپنے میں جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہے لیکن کافی تعداد میں الفاظ وضع کرنے کی خصوصیت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہندی والے حضرات نے سنسکرت کا رخ کیا ہے اور اردو والوں نے عربی اور فارسی زبانوں سے اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیا ہے۔

ترکی بہت ہی بامحاورہ اور زرخیز زبان ہے۔ اس میں حروف علت کی تعداد آٹھ ہے لیکن ان میں ہم آہنگی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کی رو سے حرکات لاحقہ کے بعد حرکات لاحقہ ہی آتے ہیں اور حرکات سابقہ کے بعد حرکات سابقہ ہی آتے ہیں۔ اسی طرح حروف صحیح کی مماثلت پر بھی بہت زور دیا جاتا ہے۔ اس زبان میں لاحقہ کا بھی استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ جمع کا لاحقہ اسم اور فعل دونوں کے ساتھ یکساں استعمال کیا جاتا ہے۔ ترکی زبان میں ایک صیغہ ایسا بھی رائج ہے جو زمانہ کی قید سے آزاد ہے۔ یہ صیغہ نہ حال ہے نہ ماضی اور نہ ہی مستقبل۔ اس میں صرف ان باتوں کو بیان کیا جاتا ہے جن کا تعلق کسی ایک مخصوص زمانے سے نہیں ہے بلکہ ہر زمانے سے ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ترکوں کا ابتدائی مسلک آسمان پرستی اور آتش پرستی تھا۔ ان کے بعض قبائل نے مختلف اوقات میں شمانیت، بدھ مت، یہودیت، مسیحیت اختیار کیا تھا اور آخر میں زیادہ تر ترک مذہب اسلام کے پیرو بن گئے اور مسلمان ترکوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ آج بھی غیر مسلم ترک موجود ہیں جن میں زیادہ تر بت پرست، بدھ، یہودی اور عیسائی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی زبان کے اصل ذخیرے میں یونان کے خانہ بدوشوں کی بولیوں سے لے کر چین کے شمالی علاقوں کے الفاظ شامل تھے لیکن اس کے حلقہ بگوش ہونے اور مسلم علاقوں میں ہجرت کرنے کی وجہ سے ترکوں پہ بہت گہرا اثر پڑا اور انھوں نے عربی اور فارسی زبانوں کے صرف الفاظ ہی بکثرت اپنی زبان میں شامل نہیں کر لیے بلکہ عربی اور فارسی رسم الخط بھی اپنا لیا۔ یہ ترکوں کے لیے کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ انھوں نے اپنی زبان کا رسم الخط متعدد بار پہلے بھی تبدیل کیا تھا۔ ترکوں کا قدیم ترین رسم الخط "اورخون" نامی ہے جو ترکستان اور منگولیا کے علاقوں میں پانچویں صدی قبل رائج تھا۔ اس میں کل اڑتیس حروف اور علامتیں ہیں۔ آٹھویں صدی سے منگولیا اور ترکستان کے ترکوں میں "اویغوری" رسم الخط کا رواج ہو گیا جس میں تیئیس حروف اور ترپن علامتیں ہیں۔ یہ خط کسی نہ کسی طرح پندرھویں صدی تک استعمال ہوتا رہا۔ لیکن ترکوں کے بعض قبایل نے آٹھویں صدی میں "چینی" رسم الخط بھی اختیار کر لیا تھا جو تقریباً بیس ہزار تصاویر پر ہے۔ اس کے برخلاف بعض ترکوں نے "صغدی" رسم الخط پسند کیا جس میں کل بائیس حروف ہیں اور جو ترکوں میں آٹھویں تا گیارہویں صدی تک رائج رہا۔ اسی طرح چند ترک قبیلوں نے اپنی مادری ترکی زبان کے لیے "تبتی" رسم الخط کو پسند کیا جو ساتویں صدی سے دسویں صدی تک استعمال ہوتا رہا اور جس میں ۳۵ حروف اور ستانوے علامتیں ہیں لیکن عیسائی اویغوروں میں "نسطوری سریانی" رسم الخط آٹھویں تا گیارہویں صدی تک استعمال ہوتا رہا۔ جس میں کل بائیس حروف ہیں۔ آٹھویں صدی سے گیارہویں صدی کے دوران بعض ترکی قبیلوں میں "مانی" رسم الخط بھی رائج رہا جو چھتیس حروف پر ہے۔ ترکوں کے بیشتر قبیلوں نے بدھ مت بھی اختیار کیا اور وہ "برہمنی" رسم الخط استعمال کرنے لگے تھے جو ایک طرح سے سنسکرت سے تعلق رکھتا ہے یہ خط ترکستان کے بعض علاقوں میں آٹھویں سے گیارہویں صدی تک مستعمل رہا۔ اس میں تیرہ حروفِ علت تینتالیس حروفِ صحیح اور چودہ ماترائیں ہیں۔ ان کے علاوہ ترکوں نے پاسا پا، بیچینیک، قومان، یونانی، ارمنی، سلاوی یا سلانی جیسے رسم الخط بھی متعدد دور میں استعمال کیے ہیں۔ اب کرایم نامی یہودی ترک "عبرانی" رسم الخط استعمال کر رہے ہیں۔ سوویت یونین کے ترکوں میں "روسی" رسم الخط نافذ ہے۔ ایران اور افغانستان کے ترک "فارسی" خط اپنائے ہوئے ہیں۔ جب کہ ترکی جمہوریہ کے ترکوں نے ۱۹۲۸ء سے عربی و فارسی کے بجائے "لاطینی" رسم الخط اختیار کر لیا ہے۔ اس طرح ترکی زبان کے لیے اب تک اٹھارہ رسم الخط استعمال کیے

(باقی صفحہ ۹ پہ ملاحظہ فرمایئے)

# ایک مکمل ہیلتھ ٹانک ، بلکہ اور بھی بہت کچھ !



## سنکارا: دل اور جگر کی صحت اور قوّت کے لیے لازمی بنیادی عناصر کا نادر مرکّب

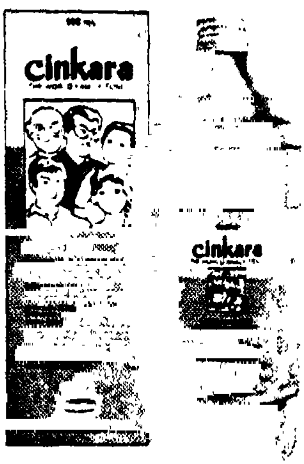
سنکارا واحد ٹانک ہے جس میں اچھی صحت کے لیے تمام لازمی بنیادی اجزا موجود ہیں۔ مثلاً آئرن، سوڈیم، پوٹاشیم اور کیلشیم وغیرہ۔ انھی کے ساتھ قدرتی جڑی بوٹیوں اور وٹامنز کے فوائد بھی شامل ہیں۔ ان سے آپ کے دل، جگر، ہڈیوں، عضلات اور دیگر اعضا کو طاقت ملتی ہے اور نظام ہضم اور مرکزی نظام کو بھی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

آپ کو سنکارا کی کب کب ضرورت ہوتی ہے ؟

• عام اور غیر معمولی کمزوری میں • سخت جسمانی محنت کے بعد • جسم میں وٹامنوں کی کمی میں • بیماری کے بعد کی کمزوری میں • بھوک نہ لگنے میں • چھوت کی بیماریوں سے بچاؤ کی قوت بڑھانے کے لیے • حمل کے دنوں میں • بچوں کو ان کی بڑھوتری کے دنوں میں • وزن کی کمی میں • اعصابی بے چینی اور کام کی زیادتی سے تھکاوٹ میں • تغذیہ کی عام خرابی میں • تناؤ، دباؤ اور شدتِ مرض میں۔

چند مشہور ٹانکوں میں موجود آئرن، کیلشیم، زِنک اور الکحل کی مقدار (فی خوراک) کا موازنہ قیمتوں کے ساتھ ساتھ :

| Reputed brands of tonics | Iron (mg) | Calcium (mg) | Zinc (mg) | Alcohol content percent (V/V) | Contents per unit pack | Retail price excluding tax (Rs.) |
|---|---|---|---|---|---|---|
| 1. | — | 12 4 | — | 12 00 | 400 | 31.95 |
| 2 | — | — | — | 11 0 | 240 | 32 00 |
| 3 | 9.68 | — | — | — | 454 | 27 50 |
| 4. | 13 00 | — | — | — | 200 | 25 31 |
| 5. | 21 50 | — | 0.00682 | 5.5 | 200 | 28 26 |
| 6. | 16 709 | — | — | — | 300 | 23 40 |
| 7. | — | — | — | — | 200 | 28 00 |
| 8. | 7 63 | — | 0 50 | — | 100 | 35 00 |
| 9. | 5.60 | 9 50 | — | 9 5 | 300 | 31 95 |
| **Cinkara** | **20.59** | **19.07** | **2.00** | **Nil** | **500** | **24.44** |




لازمی بنیادی عناصر، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکّب

# سنکارا

مشہور عالمی ٹانک — ہر موسم میں سب کے لیے

ہمدرد

جلد ۱۱

شمارہ ۱۱

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

# تہذیب الاخلاق

نومبر ۹۲ء



زر سالانہ :

| | | |
|---|---|---|
| انڈیا | ... | RS. 45·00 |
| بیرونی ممالک | ... | US $ 20.00 ہوائی ڈاک |
| | | US $ 8·00 عام ڈاک |



* بانی :

سرسید احمد خاںؒ

* سرپرست :

## پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

* مدیر :

کبیر احمد جائسی

* نائب مدیر :

احمد مجتبیٰ قریشی

* انچارج سرکولیشن

شفیق احمد

* ترتیب : سرفراز



ترسیل زر کا پتہ :

ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

EDITOR,

TAHZIBUL AKHLAQ &

NISHANT,

ALIGARH MUSLIM

UNIVERSITY,

ALIGARH. 202002

PHONE : 24827

# مندرجات



[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال اُن سے متفق ہو]


مالک : علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۔ پرنٹر پبلشر : اسرار احمد ۔ مقام اشاعت : ادارہ تہذیب الاخلاق
[illegible] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ، پریس : اے ایم یو پریس علی گڑھ

# اِدارِیہ

ہر نسل اپنے بعد والی نسل کے لیے ایک اخلاقی، تہذیبی اور معیشتی ورثہ چھوڑتی ہے۔ نئی نسل اپنے تجربات کی روشنی میں اس میں اضافہ کرتی رہتی ہے اور جب وہ بھی اپنے بعد والی نسل کو یہ ورثہ منتقل کرتی ہے تو اس میں بہت کچھ اضافہ ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ صدیوں سے نہیں بلکہ جس دن پہلے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا ہے، اس دن سے چلا آ رہا ہے۔ اب موجودہ نسل کی باری ہے کہ وہ اپنے بعد آنے والی نسل کے لیے ایک ایسا ورثہ چھوڑ جائے جس کو پا کر وہ پیش رفت کی راہوں پر گامزن ہو اور اس کی زندگی کم سے کم مصائب اور مسائل سے دوچار ہو۔

غائر نظروں سے دیکھیے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ نسل، آنے والی نسل کے لیے جو ورثہ مہیا کرنے میں سرگرم عمل ہے وہ فرقہ وارانہ منافرت، مالی گھوٹالے، علمی پستی اور زبوں حالی، اقربا پروری، رشوت ستانی، توپ اور تفنگ کی سیاست، جنسی کج روی، جہیزی موتیں، ہلڑ، ہنگامہ، آتش زنی، قتل و غارت گری اور لسانی تنگ نظری جیسے کھوٹے سکوں کا پشتارہ ہے جس کو موجودہ نسل کھرا سکہ سمجھ کر اپنے اخلاف کے لیے بڑی تن دہی، سرگرمی اور شب و روز کی محنت سے جمع کرنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔

آنے والی نسل اس ورثہ میں جب اپنے حصے کا اضافہ کرنے میں مصروف ہوگی تو قرائن یہ کہتے ہیں کہ اس وقت کا عالم یہ ہوگا کہ فرقہ وارانہ کشت و خون اور دار و گیر کو لازمۂ حیات سمجھا جائے گا، مالی گھوٹالے معیشت کے لازمی جزو ہوں گے، علم کے نام پر جہالت کے پھریرے فضا میں اُڑتے نظر آئیں گے، اقربا پروری، رشوت ستانی، توپ اور تفنگ کی سیاست، جنسی کج روی اور جرائم، ہلڑ، ہنگامہ، آتش زنی، ضابطۂ اخلاق کے سنہرے عنوانات ہوں گے۔ جہیزی موتیں، شادی بیاہ کے تصور کو بھولا ہوا خواب بنا دیں گی۔ آنے والی نسل انسان نما تو ضرور ہوگی مگر دوسری قومیں اس کو انسان قرار دینے سے قاصر رہیں گی۔ موجودہ نسل نے جو کچھ بویا ہے آنے والی نسل اس کو کاٹتے کاٹتے خود بھی کٹنے کے قریب پہنچ چکی ہوگی۔

دنیا میں بسنے والی دوسری قوموں کی نئی نسلیں جب اپنے اجداد کے ورثے کو سینے سے لگائے ہوئے پیش رفت کی طرف قدم اُٹھا رہی ہوں گی اس وقت ہندوستان کی نئی نسل موجودہ نسل کے ورثہ کا بھگتان

بھگت رہی ہوگی۔ علمی اور فنی ترقی دوسری قوموں کی نئی نسل کی زندگی کا رخ بدل دے گی وہ اپنے اجداد سے کہیں زیادہ فارغ البالی اور سکون کی زندگی بسر کرے گی لیکن ہندوستان کی نئی نسل کی حالت اس کے برعکس ہوگی، پڑھے لکھوں کی "جہالت" کا درثہ اسے وہ تھوڑی سی آسودگی بھی چھین لے گا جو آج اس کو اپنے بچپن میں حاصل ہے۔ ہندوستان کی نئی نسل کے ضابطۂ اخلاق میں جو چیزیں داخل ہوں گی وہ اس کو جانوروں سے بدتر بنا کر رکھ دیں گی۔ جانوروں میں اتنا "شعور" تو ہوتا ہی ہے کہ ایک نوع کا جانور اپنے ہی نوع کے جانوروں کے ساتھ ریوڑ بنا کر رہتے ہیں۔ اگر دشمن حملہ آور ہوتا ہے تو وہ مل جل کر اپنا دفاع کرتے ہیں اور قوی سے قوی دشمن کو مار بھگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ غیر معمولی حالات کے علاوہ ایک نوع کا جانور اپنے ہی نوع کے دوسرے جانوروں کا نہ تو شکار کرتا ہے نہ اُن کا گوشت کھاتا ہے نہ ہی ان کا "گھر" تاراج و برباد کرتا ہے۔ جن حضرات نے حیوانی زندگی کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کے گواہ ہیں ہر قسم کے جانور خواہ وہ درندے ہی کیوں نہ ہوں اپنے ریوڑ کی ان تمام مادینوں سے دور رہتے ہیں جو بلوغیت کو نہیں پہنچی ہوتی ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ نسل میں ایسے انسان نما شیطان روز بروز بڑھتے چلے جا رہے ہیں جو کم سن بچیوں سے اپنی ہوس کی پیاس بجھاتے ہیں۔ اب یہ شیطانیت اس حد تک بڑھ چلی ہے کہ تین تین سال کی معصوم جانیں بھی شیطنت کی بھینٹ چڑھنے لگی ہیں اور وہ دن دور نظر نہیں آتا جب نوزائیدہ بچیاں بھی ہوس کی دیوی پر بلی ہونے لگیں۔ یہ ہے ایک تصویر کل کے ہندوستان کی۔

اس تشویش ناک گھور اندھیرے میں امید کی ایک کرن نظر آتی ہے۔ انسان کے اندر قدرت نے یہ جذبہ ودیعت کیا ہے کہ وہ اپنی اصل یعنی انسانیت کی طرف برابر مراجعت کرتا رہے۔ انسانیت کی درس گاہ نہ تو تعلیمی ادارے ہوتے ہیں نہ ہی بڑے بڑے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، انسان کی اصل درس گاہ تو خود انسان کا ضمیر ہے جو وقتی طور سے بھٹک سکتا ہے، اندھیرے میں گم ہو سکتا ہے، جہالت کے دامن میں پناہ لے سکتا ہے مگر اپنی اصل کی طرف مراجعت کا اس کا جذبہ مر نہیں سکتا۔ خدا کرے آنے والی نسل اپنی اصل کی طرف مراجعت کرے، اس کا جذبۂ انسانیت بیدار رہے وہ واقعی اور حقیقی معنوں میں انسان بن کر زندہ رہے۔ جہاں تک ہندوستان کی موجودہ نسل کا سوال ہے اس کو تو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہونا ہی ہے۔ موجودہ نسل کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ہم کو اعتراف ہے کہ ہم عادی مجرم ہیں مگر عادی مجرم بھی تو اپنی اولاد کو ان جرموں میں ملوث نہیں دیکھنا چاہتا جن کا وہ مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ ہم بھی اپنے اخلاف کو اپنی بداعمالیوں سے محفوظ دیکھنا چاہتے ہیں۔ خدا کرے ہندوستان کی نئی نسل پر موجودہ نسل کی کوئی چھاپ نہ ہو۔ وہ اپنا زمین و آسمان خود پیدا کرے اور انسانیت کا درس دیتے ہوئے وقت آنے پر دنیا اپنے بعد کی نسل کو اس کی تمام رعنائیوں اور دل کشیوں کے ساتھ سونپ دے۔

کبیر احمد جائسی

# ہمارے بعد ہمارا نام رہے گا

سر سید احمد خاںؒ

یہ ایک نہایت لغو اور بیہودہ خیال ہے جس کا کچھ نتیجہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس میں شک نہیں کہ لوگ اس لغو خیال میں مبتلا ہیں۔ کوئی اولاد چاہتا ہے کہ اس کے ذریعے ہمارا نام چلے۔ کوئی محل بناتا ہے کہ اس کے بعد اس کا نام قایم رہے، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ اس سے فائدہ کیا ہے؟ اگر اس کے بعد لوگوں نے کہا کہ یہ قلعہ اکبر کا بنایا ہوا ہے اور وہ قلعہ شاہ جہاں کا تو اس سے مرنے والوں کو کیا فائدہ؟ مرنے والا تو گیا اور اپنی کرنی اور اپنی بھرنی ساتھ لے گیا۔ اب لوگ کچھ ہی کہا کریں جو ہونی تھی وہ ہو گئی۔ سعدی فرماتے ہیں ؎

زندہ ست نام فرخ نوشیرواں بہ عدل
گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند

[نوشیرواں کا نیک نام انصاف کی وجہ سے زندہ ہے حالانکہ اس کو ختم ہوئے ایک عرصہ گزر گیا]۔

اس شعر کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ نوشیرواں کے بعد لوگ کہا کرتے تھے کہ نوشیرواں بہت عادل تھا مگر یہ نہ کہا کہ اس سے نوشیرواں کو کیا فائدہ ہوا؟ پس لوگوں کو جو تمنا ہوتی ہے کہ ہمارے بعد ہمارا نام قایم رہے۔ یہ کیوں ہوتی ہے؟ اور اس سے [illegible] تو محض خیال خام ہے اور انسان کے بودے پن کی دلیل ہے۔ انسان کو یہ خیال رہنا چاہیے کہ میں کوئی ایسا کام کر جاوں جس سے انسانوں کو (اور) قوم کو فائدہ پہنچتا رہے۔ مثلاً کسی علم کا ایجاد کرنا، کسی ہنر کا پیدا کرنا یا کوئی ایسی بات ایجاد کرنا جو لوگوں کو فائدہ مند ہو۔ یہ خیال بہت صحیح ہے کیونکہ اپنی ذات کے واسطے نہیں ہے خصوصاً جب کہ وہ ذات بھی فنا ہو جاے بلکہ زندہ لوگوں کے لیے ہے اور ایسوں کے لیے ہے جن کا سلسلہ برابر قیامت تک جاری رہے گا۔ پس ہمارے خیال میں اس سے زیادہ انسان کے لیے کوئی بے وقوفی نہیں ہے جو یہ خیال کرے کہ میں ایسا کام کر جاؤں جس سے میرے بعد میرا نام جاری رہے ؎

گزشتم از سرِ مطلب تمام شد مطلب
حجاب چہرۂ مقصود بود مطلبہا

[جب خواہش کو دل سے نکال دیا تو مطلب برآری ہو گئی کیونکہ ہماری خواہشیں ہی ہمارے اصل اصل مقصد پر پردہ ڈال دیتی ہیں]۔

— — — — — — — —

# سائنس کی عوامی تحریک

سید حامد*

سوا سو سال ہونے کو آئے، سرسید نے سائنس کی معلومات کو عام کرنے اور عوام کی طرز فکر کو سائنس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔ سائنس سے مراد اور اس کا منشاد یہ تھا کہ انسان اپنے گرد و پیش کو غور سے دیکھے اور عقل کی مدد سے اُن گتھیوں کو سلجھائے جو ریسمان قدرت میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ وہ لاعلمی پر قناعت کرنے کے بجائے ہر موڑ پر جستجو کے چراغ روشن کرے اپنے حال پر بہر حال صابر نہ رہے بلکہ قدرت پر اس دسترس کے ذریعے جو سائنس فراہم کرتی ہے، اپنی حالت کو سدھارے اور سنوارے۔ جو پرکھوں سے ہوتا چلا آیا ہے اس کی چھان بین کرے اور جو بات فرسودہ اور بے کار یا مضر نظر آئے اسے ترک کر دے کہ دنیا میں ترقی ترک و اختیار کے اس جرأت مند عمل سے ہی ہوتی چلی آئی ہے۔ سرسید نے تقریروں اور تہذیب الاخلاق میں اپنی تحریروں کے ذریعے سائنسی اسلوب فکر سے عوام کو روشناس کیا۔ مدعا یہ تھا کہ تقلید اور جذبات پر عقل اور شعور کو بالادستی حاصل ہو۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ یہ مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ ہندوستانی مسلمانوں نے یونیورسٹی قائم کرنے کے پروگرام کو تو اپنا لیا لیکن عمل تجدید کو اپنا نہ سکے۔ جذبات میں بہتے رہنے کے پُر سکون عمل کو انھوں نے عقل اور فکر کی تکلیف دہ ریاضت پر کھلی ہوئی ترجیح دی۔ اس ترجیح نے مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچایا۔ انھیں مشتعل کر دینا بائیں ہاتھ کا کھیل بن گیا؛ کیونکہ مسئلہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پرکھنے یا تجزیہ کرنے کی انھیں عادت ہی نہیں پڑی۔ ان کی افتاد طبع غیر سائنسی ہو گئی۔ وہ سائنس اور ریاضی سے کترانے لگے اور سدھار کی کوشش اور پیش قدمی سے جی چرانے لگے۔ غافل اس سے کہ اگر کورانہ تقلید اچھی بات ہوتی تو رسول اکرمؐ بھی اپنے باپ دادا کی روش پر چلتے۔

اگر تقلید بودی شیوۂ خوب

پیمبر ہم رہِ اجداد رفتی

اس غفلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان زندگی کی دوڑ میں سب قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ جہالت ان سے منسوب کی جانے لگی۔ عالم یہ ہے کہ ہندوستان دوڑ رہا ہے اور یہ پیچھے پیچھے گھسٹتے ہوئے چل رہے ہیں۔ مسلم یونیورسٹیوں اور کالجوں کو دیکھیے۔ چند سال ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ سائنس اور ریاضی کے مضامین میں ڈاکٹریٹ پانے والے سب اور پوسٹ گریجویشن کرنے والے بیشتر طلبا غیر مسلم تھے۔ مسلمان طلبا اور طالبات بیشتر اردو فارسی عربی میں پوسٹ گریجویشن یا تحقیق کرتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ سائنس سے فرار گویا

---

* سابق وائس چانسلر، اے ایم یو علی گڑھ ــــ ہمدرد نگر، نئی دہلی

زندگی سے فرار ہے، اپنے گرد و پیش سے فرار ہے، زندگی کی ساری مادی حقیقتوں سے فرار ہے۔ عقل سے حواس کے ادراک سے فرار ہے۔ وہ دور گزر گیا، وہ تاثر زایل ہو چکا کہ سائنس پڑھنے سے انسان نیچری اور بے دین ہو جاتا ہے۔

کوٹھاری کمیشن (۶۴ - ۶۶ء) کی رپورٹ کے بعد سائنس کو دسویں جماعت تک لازمی مضمون قرار دے دیا گیا لیکن مسلمان ہیں کہ سائنس سے جو ان کے آبا کا ورثہ اور موجودہ زمانے کا سب سے بڑا ہتھیار ہے خوفزدہ ہیں۔ سائنس اور ریاضی کو انھوں نے ہوا بنا رکھا ہے۔ ہوا صرف اس لیے کہ سائنس اور ریاضی ریاضت اور لگاتار باقاعدہ محنت کی طالب ہیں۔ یہاں رٹے پر دار و مدار رکھنا پڑتا ہے جست لگانے غلط کھلانے، ڈھیل ڈالنے یا آرام کرنے کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں جھانکیے۔ اکثر و بیشتر مسلمان ٹیچر اردو یا فارسی پڑھاتے ہوئے ملیں گے۔ مسلم تعلیمی اداروں میں سائنس اور ریاضی کے اچھے معلم ڈھونڈے نہیں ملتے۔ اب بھی موقع ہے اس دیرینہ گناہ کا کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے؛ اب بھی اگر ہم غافل رہے تو ایک طرف زندگی، دوسری طرف تعلیم سے ہمارا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔

ہمارے ملک میں اس وقت دو بڑی تحریکیں چل رہی ہیں جن کے وجود سے ابھی ہم میں سے زیادہ تر لوگ ناآشنا ہیں۔ ایک تو ہمہ گیر خواندگی کی مہم، دوسری عوامی سائنس کی تحریک۔ آخر الذکر کا آغاز راجیو گاندھی کے دور میں ہوا تھا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے 'National Council of Science and Technology Communication' (سائنس اور ٹکنولوجی کے بارے میں خبر رسانی کی قومی کونسل) قایم کی تھی۔ سرکار نے سائنس کی مقبولیت کے لیے کروڑوں روپیے کی رقم منظور کی ہے یہ تحریک کیمپین کی شکل میں چلائی جا رہی ہے لیکن عوام کا دھیان جذب کرنے کے لیے پوری دھوم دھام کے ساتھ معینہ مدت کے اندر۔ ۱۹۸۷ء میں بھارت جن وگیان جتھا ترتیب دیا گیا اور ۱۹۹۰ء میں بھارت گیان وگیان جتھا اور اسی سال "Class Action for National Regeneration" (قوم کی تخلیق نو کے لیے اجتماعی اقدام) کی شروعات کی گئی۔

مذکورہ بالا اقدامات کے نتیجے میں سائنس کی عوامی طلب ایک موجیں مارتا ہوا سمندر بن گئی۔ اس طرح سائنسی خواندگی کو زبردست فروغ ہوا۔ طے کیا گیا کہ اب ہر سال ۲۸ فروری کو قومی یوم سائنس منایا جائے گا۔

مغربی بنگال میں سائنس کی تحریک چھا گئی ہے۔ اس کے سائے تلے روزمرہ کے مسایل حل کیے جا رہے ہیں کہیں بایو گیس (گوبر گیس) کہیں سولر کوکر، کسی چولھے کو مقامی حالات اور ضروریات کے مطابق ڈھالا گیا ہے، کہیں ندیوں کی صنعتی آلودگی کی روک تھام کی جا رہی ہے۔ یاد کیجیے بنگال والوں نے انگریزی سیکھنے اور جدید تعلیم حاصل کرنے میں پہل کی تھی۔ سائنس کو گلے لگانے میں بھی وہ دوسری ریاستوں سے بازی لے جا رہے ہیں۔ سائنس کا قرب ان کے لیے خوش حالی، روشنی، اعتماد اور ولولے کا پیغام لے کر آیا ہے۔

ایک طرف خواندگی کا مشن، دوسری طرف عوامی سائنس کا؛ مقصد یہ ہے کہ سب لوگ پڑھ لکھ جائیں، سب کی آنکھیں کھل جائیں۔ عجب ایمان افروز منظر ہے کہ جس خطۂ ارض میں قدرت کے مظاہر سے خوف زدہ ہو کر انھیں دیوی دیوتا بنا دیا جاتا تھا اور انھیں خوش رکھنے کے لیے ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ وہاں ہر چھوٹا بڑا، اپنی بساط بھر قدرت کی تسخیر کے لیے تیاریاں کر رہا ہے۔ مسایل کو مواقع کا روپ دے رہا ہے ذہنوں پہ صدیوں سے جو بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں، انھیں کاٹنے پر تل گیا ہے اور حالات کا یہ انوکھا منظر ہے کہ ایک ملت جو خوابیدہ انسانی ذہن کو بیدار کرنے کے لیے آئی تھی، جس نے روشنی کا ہر چہار طرف سرو سامان کیا تھا، وہ توہم، تقلید،

اور کسل مندی کی کھال کو گٹھریاں بنا کر آنکھیں بند کیے ہوئے اُن میں پڑی ہوئی ہے۔ تعلیمی اور ذہنی اعتبار سے مسلمان ہندوستان کے دوسرے باشندوں سے یوں بھی بہت پیچھے تھے۔ خواندگی کے مشن اور عوامی سائنس کی تحریک کے اتمام تک (جو اب چند سال کی بات ہے) وہ صدیوں پیچھے رہ جائیں گے۔ ملک میں ایک زبردست انقلاب آ رہا ہے جس کی آہٹ بھی ہم تیرہ بختوں تک نہیں پہنچی۔ ہم ابھی تک یہ سوچ رہے ہیں کہ ہندوستان گمراہی اور ضلالت میں گرفتار ہے اور اسے نجات ہمارے ہاتھوں ملے گی۔ کم از کم یہ نامۂ سیاہ تو اس قسم کی کوئی لکیر اُنتی پر نہیں دیکھ رہا ہے۔ کیا ہم اپنے بچوں سے بے خبر ہیں؟

ہم کم نصیبوں نے اردو کی لڑائی تو کبھی کی ہار دی اور اب ہم نے اس ہار کو ایک دوسری ہار کا پیش خیمہ بنانے کی ٹھان لی ہے۔ تعلیم اور روشنی کی لڑائی بھی کہیں ہم اردو کا نام لے کر نہ ہار جائیں۔ کہیں ہم خواندگی اور عوامی سائنس کی تحریکوں سے یہ کہہ کر نہ کترا جائیں کہ یہ سب کچھ دوسری زبانوں میں ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو (مجھے ڈر ہے کہ ہو رہا ہے) کہ ہم اردو کے زیاں کو علم اور روشنی کے زیاں میں نہ بدل دیں۔ اردو کے لیے ہمیں (اگر توفیق ہو) اب بھی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے لیکن یہ بات ایک پل بھولنے لائق نہیں ہے کہ ایک نقصان پر جان بوجھ کر دوسرا نقصان لادنا دانش مندی نہیں ہے۔ اردو علم کی اجارہ دار نہیں ہے اور نہ کوئی ایک زبان علوم پر فائق ہے۔ اردو بھی دوسری زبانوں کی طرح اظہارِ خیال اور حصولِ علم کا ایک ذریعہ ہے۔ ذریعہ کو مقصد پر نادان ہی ترجیح دے سکتے ہیں۔ اب سماں کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ اردو کی آئینی جدوجہد کو جاری رکھتے ہوئے ہمیں گھر پر اپنے بچوں اور پڑوس کے بچوں کو اردو پڑھانی چاہیے اور خواندگی اور عوامی سائنس اور ترقی اور روشنی کے جو پروگرام ہمارے وطن نے وضع کیے ہیں خواہ وہ کسی زبان میں ہوں ان میں تن من دھن کے ساتھ شریک ہونا چاہیے، ان کا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے، اپنی چھوٹی چھوٹی رقابتوں، عداوتوں، حسد اور کوتاہ اندیشیوں سے اوپر اُٹھ کر جہالت کی موٹی موٹی زنگ آلود زنجیروں نے ہماری ٹانگوں میں جگہ بنالی ہے، ان میں گہرے گھاو بنا دیے ہیں۔ ہماری جہالت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ ۱۸۰ یونیورسٹیوں میں سے جو دو ہماری ہیں، ایک عنوان ہمارے زیرِ انتظام ہیں؛ دونوں بدنظمی، نااتفاقی اور بے بصیرتی کا شکار ہیں۔ دونوں میں انتشار ہے ——— جو ملت دو بنے بنائے ادارے بھی نہ چلا سکے وہ فلاح اور اصلاح اور دعوت اور برکت کے فرائض سے کیوں کر عہدہ برآ ہوگی۔

"مسلمان کوئی پودا لگائے اور اس سے لوگ فائدہ اُٹھائیں تو اس کے لیے صدقہ ہے اور اگر چوری جائے یا اس کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو بھی اس کے لیے صدقہ ہے۔"

بخاری

ہمیں سدا یہ شکایت رہی ہے کہ ہمیں اچھی قیادت نہیں ملتی۔ لیکن ملے تو کیونکر جو لوگ ہم میں سے بصیرت کی روشنی میں خدمت کے لیے اُٹھتے ہیں، جو پھیلے ہوئے جمود کی تاریک چادر کو چاک کرتے ہیں، ان کی پیٹھ ٹھونکنے کے بجائے ہم ان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، جینا اُن پر حرام کر دیتے ہیں لیکن یہ ایک الگ بحث ہے جسے ہم آئندہ کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں۔

خواندگی اور عوامی سائنس کی تحریکوں والے جو

طریق کار اختیار کیا ہے وہ "کم پین" اور جتھے کا طریقہ ہے کم وقت کے لیے بہت ذوق شوق اور جوش وخروش اور طبلے تاشے کے ساتھ، ہزاروں کی تعداد میں آواز بلند کرنے کا طریقہ ہے تاکہ اس طرح جو ہنگامہ برپا ہو، وہ ہر فرد بشر کو اس میں شریک ہونے پر مجبور کر دے۔ عزائم اور اعلانات کا ایک سیل رواں سب کو بہالے جاے۔ گویا ہنر وروں، دانشمندوں اور منصوبہ سازوں کے سوچے سمجھے اور بنائے ہوئے پروگرام کو جن سموہ کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی کمک حاصل ہو جاے۔ کام جب بہت بڑا ہو اور سبھی کوششیں صدا بصحرا ثابت ہو چکی ہوں وہاں یہی طرز عمل کام آتا ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے اور ان کے حق میں بھی یہ بات ہے کہ بڑے پیمانے پر ان دونوں تحریکوں میں شریک ہوں کہ اس کی ضرورت سب سے زیادہ انھی کو ہے، اور فائدہ بھی سب سے زیادہ انھی کو پہنچے گا اور انھیں تو یہ بھی چاہیے کہ اس طریق کار کو اپنی دوسری اہم ضروریات کے لیے بروئے کار لائیں۔ اسی اپریل میں ایک کوشش تعلیم، اردو، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور اصلاح معاشرہ کے لیے ہم لوگوں نے اتر پردیش میں کاروان تعلیم کی شکل میں کی تھی۔ اس کے نتائج امید سے بڑھ کر نکلے۔ جہاں جہاں گئے وہاں سے ایک زندہ تابندہ رابطہ قائم ہو گیا لیکن یہ بات تو ضمناً کہہ دی گئی — ہندوستانی مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنی شناخت اور مصالح کو محفوظ رکھتے ہوئے ان تمام قومی تحریکوں میں حصہ لیں جو تعمیری رخ رکھتی ہوں۔ اب گہرے جمود سے نکلنے کی یہی سبیل رہ گئی ہے ہم میں سے ہر ایک کو ملک اور ملت دونوں کے تئیں اپنا فرض ادا کرنا ہے۔

---

# شرف وعزت

"اگر تم دنیا میں خلق خدا کی خدمت کروگے تو بارگاہ عالی میں شرف وعزت پاؤگے۔ جو لوگ زبان سے تو ایشور کا نام لیتے ہیں اور دوسروں سے کینہ و نفرت رکھتے ہیں ان کا دل صاف نہیں ہو سکتا۔ وہ دن رات خواہ کتنے ہی نیک کام کریں ان کو خواب میں بھی چین نصیب نہیں ہو سکتا۔"

گرونانک

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱، شمارہ ۱۱، نومبر ۱۹۹۲ء

# مولانا عبدالسلام ندوی

## جن سے میں نے اردو سیکھی

عبدالقوی دریابادی *

مکرمی جائسی صاحب سلام مسنون

اپنی علالت اور معذوری کے باوجود تہذیب الاخلاق کے لیے مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم پر ایک مضمون ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ بدخطی کے لیے مجبور ہوں۔ امید ہے کہ شائع شدہ سلسلے سے اس کے پڑھنے میں آپ کو مدد مل جائے گی۔ مولانا عبدالسلام ندوی کے بعض تصانیف کے نام مجھے یاد نہیں آ رہے ہیں اُن کا اضافہ آپ فرما سکتے ہیں۔ دوسری آنکھ کا آپریشن ہفتہ عشرہ میں ہونے والا ہے۔ دعا کا طالب ہوں۔ بہرحال مطب ابھی کسی نہ کسی طرح پابندی سے کر رہا ہوں۔ اب ادھر مضمون نگاری بالکل چھوٹ گئی تھی اور بعض وقت معمولی خط لکھنا بھی بار معلوم ہوتا تھا لیکن اب اللہ کا شکر ہے ایسا نہیں ہے۔ آپ کے رسالے کے لیے ایک مختصر مضمون ارسال ہے اگر پسند ہو تو شائع فرما دیں۔

نیازمند

حکیم عبدالقوی دریابادی

درج بالا خط اور مضمون مجھے ۱۴ اکتوبر کو ملے مضمون نومبر کے شمارے میں شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ابھی مضمون کی کتابت بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ۱۸ اکتوبر کو قومی آواز میں یہ خبر نظر سے گزری کہ ۱۷ اکتوبر کو دن کے ۲ بجے حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی نے ۸۱ سال کی عمر میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

تہذیب الاخلاق مرحوم کے اس مقالہ کو شائع کر کے ان کی آخری تحریر کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر رہا ہے۔

کبیر احمد جائسی

جن ادیبوں و مصنفین سے میں نے خصوصی فیض حاصل کیا ان میں ایک اہم نام ناقابل فراموش نام علامہ شبلی کے شاگرد جلیل مولانا عبدالسلام ندوی رفیق دار المصنفین اعلی اللہ مقامہ کا ہے۔ میں نے عم محترم مولانا عبدالماجد دریابادی کی حسب ہدایت ان کی تصنیف

* خاتون منزل، حیدر آباد روڈ، گولہ گنج، لکھنؤ

سیرت عمر بن عبدالعزیز کا مطالعہ ایک سے زائد بار کیا اور اس سے تقریبًا وہی فیض حاصل کیا جو ان کے استاد علامہ شبلی کی تحریر کردہ سوانح عمری "الفاروق" سے حاصل کیا تھا۔ اس کتاب کے متعلق مولانا محمد علی کی جو اس زمانے میں چھندواڑہ (سی پی) میں نظربندی کے دن گزار رہے تھے، بڑی مداحانہ رائے ان کے کسی شایع شدہ مکتوب میں نظر سے گزری تھی۔ پھر مکاتیب شبلی میں ان کے نام کے جو خط درج ہیں دلچسپی سے پڑھے جن سے اندازہ ہوا کہ علامہ شبلی اپنے اس شاگرد کو کس قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کا تعلق کچھ دنوں مولانا آزاد کے مشہور زمانہ الہلال سے بھی رہا تھا۔ مولانا شبلی نے اپنے ایک خط میں ان کی اس مشغولیت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا تھا اور یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اخباری مشغولیت سے ان کی صلاحیتیں دب جائیں گی۔ الہلال میں مضمون نگاروں کے نام بہت کم شایع ہوتے تھے۔ اس لیے عام طور سے اس کی ہر تحریر مولانا آزاد ہی کی تحریر سمجھ لی جاتی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ مولانا عبدالسلام کا کوئی مضمون ان کے نام سے اس میں شایع ہوا صرف اتنا یاد پڑتا ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلما میں ہونے والی ایک اسٹرائیک (ہڑتال) کے سلسلے میں ان کا ایک مضمون الاعتصاب فی الاسلام کے عنوان سے ایک مشہور دیوبندی عالم کے جواب میں نکلا تھا جس میں مولانا نے اسٹرائیک کا جواز ثابت کیا تھا۔

پھر رسالہ الندوہ میں ان کے مضامین اور دارالمصنفین کے ترجمان معارف میں ان کے بھی مضمون پڑھے۔ غالبًا مولانا سید سلیمان ندوی کی عدم موجودگی میں دو ایک بار معارف کے شذرات بھی ان کے قلم سے نکلے۔ ان کی جن چار کتابوں نے خاص طور سے میرے مطالعے میں اضافہ کیا اور مجھے اردو سکھائی وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ ۲۔ اسوۂ صحابہ (حصۂ اول اور دوم)

اس کتاب میں مستند ماخذوں سے صحابۂ کرام کے عقائد، عبادات اور معاشرت کی صحیح عکاسی کی گئی ہے اور ان کے سیاسی و دینی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ اسی طرح اسوۂ صحابیات میں صحابیات کے بارے میں ایسی ہی تمام چیزوں کو جمع کر دیا ہے۔ میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ صحابہؓ کے متعلق ایسی جامع اور دل نشیں کتاب اردو میں موجود نہیں۔

۳۔ شعرالہند (حصۂ اول و دوم)

اردو شعرا کے تذکروں میں شمس العلما محمد حسین آزاد کی آب حیات نے بڑی شہرت حاصل کی لیکن اس پر مخالفانہ تبصرے بھی اچھے خاصے ہوے۔ شعرالہند میں جس کا مطالعہ احقر نے کئی بار کیا ہے، ہر شاعر کے ساتھ انصاف سے کام لیا گیا ہے اور اس کے احاطہ میں عہد حاضر کے وہ شعرا بھی آگئے ہیں جو آب حیات کے بعد پیدا ہوے یا شہرت حاصل کی۔ کتاب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں شعرا کے اشعار کا بہترین انتخاب کیا گیا ہے اور اس سے مولانا کی سخن فہمی پوری طرح عیاں ہوتی ہے کتاب کی عبارت سلیس اور بامحاورہ ہے حالانکہ مولانا نہ دہلی کے تھے نہ لکھنؤ کے۔ کتاب بلاشبہ اس قابل ہے کہ اسے یونیورسٹی کے ایم۔ اے اردو کے نصاب میں شامل کی جاے۔

۴۔ چوتھی اور مجھے سب سے زیادہ متاثر کرنے والی ان کی کتاب اقبال کامل ہے۔ اقبالیات پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے لیکن اس کتاب میں مصنف نے اقبال کی شاعری، پیام اور فلسفہ پر جو کچھ لکھ دیا ہے وہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ لکھنؤ کے ادارہ فروغ اردو نے احقر سے ایک کتاب فلسفۂ اقبال کے نام سے لکھوائی تھی اس کا بیشتر حصہ اسی فاضل کامل کی اقبال کامل سے مستفاد ہے۔ عبارت میں معمولی تبدل و تغیر سے کام لیا ہے۔

تحریک خلافت و ترک موالات کے زمانے میں مولانا نے ایک مختصر رسالہ تحریم شراب لکھا تھا۔ گاندھی جی کے سیاسی پروگرام میں امتناع شراب (PROHIBITION) کا درجہ اولین اہمیت کا حامل تھا۔ میں خود بھی گاندھی جی کی اس تحریک سے صوفی صدی

متاثر تھا۔ رسالہ بار بار پڑھا۔ افسوس ہے کہ یہ رسالہ دوبارہ شایع نہیں ہوا اور اب شاید اس کے جاننے والے بھی بہت کم ہوں گے۔

اس کے علاوہ میں نے حسب ذیل تصانیف کا بھی مطالعہ کیا ہے جو کہ سرسری اور سطحی رہا۔ التربیۃ الاستقلالیہ، القضا فی الاسلام، تاریخ اخلاق اسلامی، حکمائے اسلام (دو جلدیں) امام رازی، ابن خلدون ان کی بیشتر تصانیف دار المصنفین اعظم گڑھ ہی سے شایع ہوئیں اور یہ تصانیف اس وقیع ادارہ کے شایان شان ہیں۔ ان کی یہ کتابیں پنجاب کے کسی ادارے سے فقرائے اسلام اور ابن یمین (فارسی کے ایک ممتاز شاعر) فطرت نسوانی اور تاریخ الحرمین الشریفین کے نام سے شایع ہوئی تھیں۔ افسوس ان کے مطالعہ کا راقم آثم کو اتفاق نہیں ہوا۔

مولانا شاعری بھی کرتے تھے لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی ان کی سخن فہمی کو ان کی شاعری سے زیادہ بلند پایہ قرار دیتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں اعتراف کیا ہے کہ لکھنؤ کے ایک نامور شاعر مرزا ثاقب نے اردو کے دو متحد المعنیٰ اشعار کے بارے میں ان سے دریافت کیا تھا کہ وہ کس کو ترجیح دیتے ہیں تو انھوں نے اس سلسلے میں مولانا عبدالسلام سے مشورہ کیا تھا اور ان کے رائے کے مطابق ایک شعر کو ترجیح دی تھی۔

مولانا کی وفات کے بعد ان کے مضامین کی ایک جلد دار المصنفین اعظم گڑھ سے شایع ہوئی ہے لیکن میں اپنی خرابی صحت کے باعث اب تک اس کا مطالعہ نہیں کر سکا ہوں۔

افسوس مرحوم سے ملاقات کی نوبت زندگی میں صرف دو بار آسکی۔ ایک بار ان کے زمانۂ شباب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں جس کی صدارت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے فرمائی تھی اور جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں چار سلیمان اکٹھا ہوئے تھے (اور چاروں نے تقریریں بھی کی تھیں) یعنی مولانا سید شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا قاضی محمد سلیمان بن سلمان مصنف رحمۃ للعالمین، مولانا سلیمان اشرف اور مولانا سید سلیمان ندوی۔ اس جلسے میں مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی کسی علمی موضوع پر آدھ گھنٹہ تقریر فرمائی تھی اور اس طرح ان کو پہلی اور آخری بار سننے کا اتفاق ہوا اور اپنی کم علمی کے باوجود (اس وقت احقر کی عمر ۱۴ سال رہی ہوگی) اس کی تقریر سے خاصہ متاثر ہوا تھا۔

اپنی زندگی میں پہلی بار مولانا سے باقاعدہ ملاقات دار المصنفین جانے کے موقع پر ہوئی اس وقت وہ چراغ سحری ہو رہے تھے۔ میری مدت قیام بھی مختصر رہی۔ صرف چند منٹ کے لیے ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا اور کوئی قابل ذکر گفتگو نہ ہو سکی۔

---

"تعصب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا اور دیدہ دانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔"

سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۱۱، شمارہ ۱۱ (نومبر) ۱۹۹۲ء

# سرسید اور کلکتہ

وفا راشدی ★

شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کے فیضان اور تعلیمات کے زیر اثر حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی جس تحریک کا آغاز انیسویں صدی کی ابتدا میں ہوا تھا، اس کی تکمیل اس صدی کے وسط میں ہوئی۔ یہ عہد سرسید احمد خاں کا تھا۔ سرسیدؒ سید احمد بریلوی اور ان کے رفقائے کار حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کے دینی عقاید اور سیاسی خیالات سے بہت متاثر تھے جس کے نتیجے میں علی گڑھ کالج کی تحریک وجود میں آئی۔ سید احمد اور شاہ اسمٰعیل شہید کے خصوصی رجحانات کے متعلق ۱۸۵۰ء میں "راہ سنت در رد بدعت اور کلمۃ الحق وغیرہ جیسے نام کی کتابیں لکھی گئیں —
آثار الصنادید میں بھی شاہ عبدالعزیزؒ، سید احمد اور شاہ اسمٰعیل کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا گیا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی "جنگ آزادی میں اردو کا حصہ" مطبوعہ کلاسیکی ادب میں لکھتے ہیں:

> "رام بابو سکسینہ اور مولانا حالی دونوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ سرسید میں حق گوئی اور بے باکی کا جوہر حضرات سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریروں کے مطالعے سے پیدا ہوا۔"

۱۸۹۷ء میں چارلس گرانٹ کی تجویز پر انگریزی زبان کو ہندوستان میں رائج کرنے کی غرض سے ۱۸۳۵ء میں اعلیٰ تعلیم کی ترویج کے لیے کلکتہ اور مدراس میں یونیورسٹیاں قایم ہوئیں مگر بقول مولانا حالی:

> "۱۸۵۷ء تک تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوئیٹس کی تعداد بمقابلہ ہندو گریجوئیٹس کے مشکل سے اتنی ہوگی جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔" (حیات جاوید)

جب انگریزی تعلیم کی اشاعت شروع ہوئی ہندوؤں نے اسے اپنی ترقی کا ذریعہ قرار دیا اور پوری دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا۔ مسلمانوں کے ایک گروہ علما نے سختی سے مخالفت کی۔ یہاں تک کہ فتوے صادر کر دیے کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے انگریزوں کا مقصد ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔ ان حالات میں سرسید کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت و اہمیت واضح کرنے اور راس طرف راغب کرنے میں بڑی دشواریاں حائل ہوئیں لیکن علی گڑھ تحریک نے سرسید اور ان کے رفقائے کار کی پیہم کوششوں اور مسلسل جدوجہد سے ایک انقلاب برپا کر دیا اور بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے الفاظ میں:

---

★ ...شاہ فیصل ...

"سرسید نے مسلمانوں کو ذلت سے نکالنے کا ایک ہی علاج سوچا تھا۔ یعنی مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج۔ ایک بار فیصلہ کرنے کے بعد اسے عمل میں لانے کے لیے طرح طرح کے جتن کیے۔ کیسی کیسی مخالفتیں اور صعوبتیں برداشت کیں۔ طعن و تشنیع، لعنت ملامت سہا اور کیسی کچھ کھیکریں نہ اٹھائیں لیکن نہایت استقلال اور اعلیٰ حوصلگی کے ساتھ اپنے خیال پر جمے رہے اور جو سوچا تھا اسے کرکے چھوڑا۔" (سرسید احمد خاں۔ ص ۳۳۳)

تاریخ شاہد ہے کہ علی گڑھ تحریک مسلم ہندوستان کا تعلیمی، ذہنی، ثقافتی اور سیاسی مرکز ثابت ہوئی۔ شیخ محمد اکرام نے سرسید کی بے پناہ خدمات کی جامع تعریف ان الفاظ میں کی ہے؛

"سرسید نے نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی تنظیم سرسید کی مرہون منت ہے۔"

سرسید احمد خاں کی یہ تحریک صرف علی گڑھ، شمالی ہندوستان یا اس نواح کے علاقوں تک محدود نہ رہی بلکہ اس کے اثرات بہار اور بنگال تک پھیلے ہوئے تھے۔ بنگال میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کے کارناموں کو نہ صرف سراہا گیا بلکہ ان کی ہر طرح امداد و اعانت کی گئی۔ کلکتہ میں جن مخلص رہنماؤں نے سرسید کی فراخ دلی سے تائید و حمایت کی اور ان کے مشن کو عملی جامہ پہنایا ان میں نواب عبداللطیف، عبدالغفور نساخ، رائٹ آنریبل سید امیر علی اور حاجی محمد محسن کے نام اسلامی ہند کی تاریخ میں ہمیشہ روشن رہیں گے۔

ان حضرات نے ہندوستانی مسلمان خصوصاً مسلم بنگال کی تعلیمی سیاسی و سماجی، ترقی و ترویج کی خاطر دن رات محنت و جاں فشانی سے کام کیا۔ جسمانی ذہنی دماغی صلاحیتوں کے علاوہ مالی قربانیوں سے بھی کبھی دریغ نہ کیا۔ وقت ضرورت اعلیٰ سے اعلیٰ جذبۂ ایثار کا نمونہ پیش کیا۔ ان کی خدمات کا مرکز کلکتہ تھا۔ بنگالی مسلمانوں کی تعلیم سیاست تہذیب ثقافت علم و ادب غرض یہ کہ ہر قسم کی سرگرمیوں کا سرچشمہ کلکتہ کی سرزمین سے پھوٹا۔

۱۲ مئی، ۱۸۵۷ء کو دہلی کالج فنا کر دیا گیا اور اس کا تمام کتب خانہ نذر آتش ہو گیا تو اس کی وقف آمدنی سے چاندنی چوک کلکتہ میں دہلی انسٹی ٹیوٹ نام کا ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا۔ لارڈ کیننگ کی سفارش سے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کو جو امداد ملتی تھی اس سے دوگنی کر دی گئی۔

۱۸۵۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی کا قیام اور مسلمانوں کی تعلیمی مراعات کے سلسلے میں یونیورسٹی ایکٹ میں تبدیلی عمل میں آئی۔ یہ وہ سال تھا جب سرسید کا تبادلہ بجنور سے بنارس ہو گیا۔ اس وقت تک کالجوں کی تعلیمی و مالی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ سرسید نے اس سال تعلیم کا ایک نیا اور پر زور منصوبہ بنایا۔ ۱۸۶۲ء میں ڈیوک آف آرگائل وزیر ہند کے زیر سرپرستی سائنٹیفک سوسائٹی غازی پور کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اسی سال رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے سرسید کو اعزازی فیلوشپ کے اعزاز سے نوازا گیا۔ ان کو یہ اعزاز آثار الصنادید کی تصنیف کے صلے میں اس وقت ملا جب گارساں دی تاسی نے اس کا ترجمہ پیش کیا۔ آثار الصنادید عمارات دہلی کی تاریخی اہمیت سے متعلق ہے سرسید کے مغربی علوم کی اشاعت کی تائید و حمایت میں نواب عبداللطیف نے کئی کارنامے انجام دیے۔ ۱۸۶۳ء میں محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ کا قیام بھی ان کا ایک کارنامہ ہے۔ ۱۸۶۴ء میں نواب عبداللطیف کی صدارت میں یادگار جلسہ ہوا جس میں برصغیر کے مختلف علاقوں کے سیاسی و قومی رہنماؤں اور علمی و ادبی شخصیتوں نے شرکت کی۔ اس

سال سرسید غازی پور اسکول کے افتتاح کے سلسلے میں بہت مصروف تھے لیکن وہ وہاں سے فارغ ہو کر کلکتہ تشریف لائے اور اس جلسے میں علم و حکمت اور قومی خدمات پر مفصل تقریر اردو میں کی۔ انھوں نے فرمایا:

" اپنے آبا و اجداد کی طرح علم و حکمت میں اپنا نام روشن کریں اور یہ تجویز پیش کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک کمیٹی بنائی جائے جس میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ ہو۔ اس کمیٹی کے سپرد یہ کام ہو کہ جہاں تک ہو سکے، جملہ علوم و فنون کی کارآمد کتابوں یا مذہبی اور دینی کتابوں کے ترجمے کیے جائیں جن کے اردو اور ہندی دونوں ایڈیشن شایع ہوں تاکہ ان سے ہندو اور مسلمان دونوں استفادہ کریں۔"

اس انجمن کی جانب سے ۶۰ ہزار روپیے کے انعامات ان لوگوں کے لیے مقرر کیے گئے جو اردو میں مندرجہ ذیل موضوع پر مضامین لکھیں۔ "حیات اورنگ زیب، ہندی مسلمان انجمن اور اس کے کسل لٹریچر، مطبع کے تاریخ و تمدن پر اثرات"۔ [۲۶]

انجمن مذکور کی سرپرستی بنگال کے لفٹیننٹ گورنر نے کی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سرکاری حلقوں میں بھی اس انجمن کی قومی اہمیت تسلیم کی گئی۔ اس زمانے میں سید امیر علی جو اس وقت تک رائٹ آنریبل نہیں ہوے تھے۔ نواب عبد اللطیف ہی کے زیر عاطفت و شفقت کلکتہ میں زیر تعلیم تھے اور تعلیمی تحریک کے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے پہلی بار ان کی ملاقات سرسید سے مذکورہ بالا سوسائٹی کے جلسے میں ہوئی تھی۔

نواب عبد اللطیف کی مساعی جمیلہ سے سرسید کے زمانے میں مسلمانوں کی تعلیمی اصلاحات و ترقیات کی غرض سے تعلیمی و قومی ادارے عالم وجود میں آئے۔ ۱۸۶۶ء میں ڈاکٹر لائٹنر کی تجویز پر لاہور میں ایک جامعہ قایم کرنے کا منصوبہ عمل میں آیا جس کا ذریعۂ تعلیم اردو قرار پایا۔ پھر ہندوستان کے مختلف صوبجات میں جلسے ہوئے۔

۱۸۶۷ء میں انجمن اسلامیہ کلکتہ نے دو ہزار لوگوں کے مجمع میں اس تحریک کی پرزور تائید کی اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

اسی سال یعنی ۱۸۶۷ء میں سید امیر علی نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔اے اور ۱۸۶۹ء میں ایل ایل بی کے امتحانات اول پوزیشن کے ساتھ پاس کیے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس کے آٹھ سال بعد علی گڑھ کالج قایم ہوا۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے اوقاف کے تحت اعلیٰ تعلیم کے لیے فنڈ مقرر کیے تھے۔ نواب فنڈ سے سید محمود فرزند سرسید کو اور محسن فنڈ سے سید امیر علی کو انگلستان میں بیرسٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے امداد دی گئی۔

سرسید اپریل ۱۸۶۹ء میں بنارس میں تھے کہ وہاں سے انگلستان چلے گئے۔ ۱۸۷۰ء میں امیر علی ولایت پہنچے تو وہاں سرسید سے ان کی دوسری ملاقات ہوئی۔ ولایت میں سرسید اور امیر علی نے زیادہ تر وقت ہندی مسلمانوں کے سیاسی و دینی مسایل اور تعلیم و ترقی سے متعلق تبادلۂ خیال میں گزارا۔ سرسید مسلمانوں[۹] کی تعلیمی ترقی کو سیاسی ترقی پر ترجیح دیتے تھے لیکن امیر علی کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو صحیح دینی تربیت کے ساتھ ساتھ سیاسی تربیت اور سیاسی شعور کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ تعلیمی ترقی کی۔ علاوہ ازیں امیر علی مغربی تعلیم کی تقلید کے بجائے محض اس کے کارآمد پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے۔ مغربی تہذیب و تعلیم کی اچھائیوں کو ضرور اپنانا چاہیے لیکن مغربی علوم کو سو فی صد ہندوستانی مسلمانوں پر مسلط کرنا اسلامی تمدن کے منافی ہے سرسید ۱۸۷۰ء میں ولایت سے واپس آگئے۔ ولایت میں ان کا قیام کئی اعتبار سے بہت اہم تھا جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے

خارج ہے۔ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ سید امیر علی کے خیالات سے سرسید کسی حد تک متفق ہوئے جس کا ایک ردّ عمل یہ تھا کہ جس سال ولایت سے واپس آئے اسی سال نئے طرزِ تعلیم کی ایک اسکیم "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" چلائی۔

سید امیر علی ۱۸۷۳ء میں بیرسٹری کی ڈگری لے کر کلکتہ واپس آئے۔ ۱۸۷۴ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے فیلوشپ کا اعزاز ملا۔ اپنی زندگی ملتِ اسلامیہ کی خدمت و فلاح کے لیے وقف کر دی۔ ۱۸۷۶ء میں سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی داغ بیل ڈالی۔ ۱۹۰۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کی پریوی کونسل کے رکن کی حیثیت سے انگلستان چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ بنگال کے یہ قابلِ فخر سپوت اپنی غیر معمولی ذہانت بے پناہ صلاحیت اور اعلیٰ تعلیمات کی بنا پر انڈین گورنمنٹ کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا، لیکن اپنے فرائض منصبی کو بحسن و خوبی ادائیگی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی قانونی و شرعی حیثیت منوانے، ان کے قومی حقوق دلوانے اور ان کے اندر صحیح اسلامی اسپرٹ کی روح پھونکنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ۱۹۰۶ء میں جب ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی داغ بیل ڈالی گئی تو امیر علی نے اس کی ایک شاخ لندن میں قایم کی اور نہ صرف انگلستان کو بلکہ پورے عالمِ اقوام کو بھی نظریہ اتحادِ اسلامی سے آگاہ کیا۔ اس کی توضیح و تشریح اور تبلیغ و اشاعت میں نمایاں حصّہ لیا۔ سید امیر علی میں مسلمانوں کی خدمت کا رجحان دراصل علی گڑھ تحریک کا یہ ایک ایسا موڑ تھا جس نے امیر علی کے ذریعے مشرق سے مغرب تک انقلاب کی لہر دوڑا دی بقول شیخ محمد اکرام:

"مغربی زبانوں میں اسلام کی بہترین ترجمانی
سید امیر علی نے کی۔"

حقیقت یہ ہے کہ سرسید برصغیر کی سیاسی و مذہبی زندگی کا گہرا احساس رکھتے تھے۔ مشرقی و مغربی علوم سے یکساں طور پر واقف و بہرہ ور تھے۔ ہندوستان کے مشرقی تہذیب و تمدن اور انگلستان میں مغربی ثقافت و معاشرت کا بہت قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ مشرقی و مغرب کے سیاسی و تعلیمی حالات پر بڑی وسیع و گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک نہ مشرق کی ہر بات اچھی تھی اور نہ مغرب کی ہر بات بُری۔ وہ فراخ دلی اور وسیع النظری کے ہر معاملہ کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے نظریات و خیالات کو نہایت واضح الفاظ اور مستند شواہد و دلائل کے ساتھ تحریروں اور تقریروں میں سمو دیا۔ سرسید کا رسالہ تہذیب الاخلاق اور ان کی غیر فانی تصانیف ان تمام حقایق و کوائف کی پوری عکاسی کرتی ہیں۔ سرسید احمد خاں کا عہد اردو ادب کا زرّیں عہد تھا۔ سرسید کی عظمت ہماری نظروں میں اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اردو نثر میں جدید اندازِ فکر اور طرزِ تحریر کی بنیاد ڈالی۔

سرسید اور ان کے رفقائے کار نے فورٹ ولیم کالج کی عربی و فارسی، ہندی و سنسکرت آمیز نثر کی بجائے عام فہم آسان اور سلیس زبان میں نثر لکھنے کی ترغیب دی۔ تہذیب الاخلاق اور دوسرے جرائد میں سرسید کے جو مضامین شایع ہوئے ان کے پیشِ نظر ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں یہ کہنا درست ہوگا کہ:

"وہ ادب کو مقاصدِ زندگی کا منبع اور آلۂ کار
سمجھتے تھے۔ ہرچند کہ ان کا ادبی سرمایہ خالص
ادبی معیار کے قابلِ ذکر ادبوں میں شمار ہو سکتا
ہے اور ان کی انشاء اردو، ان کا طرزِ بیان، ان
کی مقالہ نگاری غرض ان کا کل سرمایۂ تحریر،
زبان و ادب کا قیمتی اور ناقابلِ فراموش
حصّہ ہے۔" [۱۲]

یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ نے اردو نثر میں جو خدمات انجام دیں وہ بلاشبہ اردو ادب کی ترقی و ترویج کے باب

میں انقلاب انگیز تھیں لیکن اس تحریک کی جڑیں عربی وفارسی اور قدیم اردو کی زمینوں میں پیوست تھیں۔ یہ شجر اس وقت ثمر آور ثابت ہوا جب اس کی آبیاری سرسید احمد نے نہ صرف خود کی بلکہ اپنے رفقائے کار کو بھی اس باغبانی میں شریک کیا۔ اس طرح فورٹ ولیم کالج کی ادبی تحریک کی تکمیل سرسیّد کے ہاتھوں ہوئی۔

انھوں نے اردو نثر کو آسان اور عام فہم کیا۔ صحافت اور ادب میں امتزاج پیدا کیا۔ ہر موضوع کے لیے اس کی مخصوص طرزِ ادا بنا ڈالی۔ کلکتہ فورٹ ولیم نے جس عربی و فارسی آمیز ادب کو رواج دیا تھا، اسے سرسید نے سلیس و دلکش ادب کے پیکر میں ڈھال دیا۔ یوں عوام میں اردو زبان وادب کی مقبولیت سرسید کی کاوشوں کی رہین منت ہے۔

سرسید کے مخالفین میں علمائے دیوبند مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے علاوہ ادبی شخصیتوں میں اکبر، شبلی، محمد علی جوہر اور مولانا آزاد سب سے زیادہ مشہور رہیں۔ اکبر اور شبلی جب کلکتہ آئے تھے تو سرسید کا ذکر کسی نہ کسی عنوان سے ضرور کرتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کی سیاسی وصحافتی زندگی کا ایک حصّہ کلکتہ کی فضا میں گزرا۔ اکبر الہ آبادی مشرقی تمدن کے سب سے بڑے حامی اور مغربی تہذیب کے سب سے بڑے نقاد تھے۔ دورِ جدید میں اکبر نے مغرب ومشرق کی خامیوں اور خوبیوں کی ترجمانی جس دلآویز و دلکش پیرایے میں کی اس کی مثال نہ ان سے پہلے اردو ادب میں موجود تھی اور نہ ان کے بعد ملتی ہے۔ اکبر ابتدائی دور میں سرسیّد کے مذہبی خیالات اور تعلیمی رجحانات سے متفق نہ تھے۔ اخبار اودھ پنچ لکھنو اس بات کا شاہد ہے۔ چنانچہ اکبر نے اس زمانے میں کہا تھا

لیکچر سے، نہ کچھ خیالات سے ہے نہ دعوت سے ہے نہ ترک عادات سے ہے[١١]

اکبر خدا یہ کامیابی ساری
تقدیر اور اتفاقات سے ہے

بے شک کئی روشن سے بہتر ہے کہیں
انسان کے لیے کرسچین ہو جانا

ابتدا کی ہے سیّد نے
جن کے کالج کا اتنا نام ہوا[١٢]
انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی
قوم کا کام اب تمام ہوا[١٣]

جس کام کی بنیاد خلوص اور سچائی پر رکھی گئی ہو، اس کی اہمیت اجاگر ہو کر رہتی ہے۔ سرسید نے جس خلوص ایثار کے ساتھ قوم کی کشتی کو کنارے پر لگانے کا عزم کیا تھا۔ ان کا وہ عزم آخری وقت تک پہاڑ بن کر رہا۔ ہر آنے والا اس کے دامن سے گزرا۔ علی گڑھ سے کلکتہ تک کا سفر بھی ان کے اسی عزم واستقلال کا ایک جزو تھا، کُل میں سما کر کائنات کو مسخر کر گیا۔ بڑے سے بڑے حریف کو بھی سرسید کے کاموں کا نہ صرف یقین بلکہ اعتراف کرنا پڑا۔ ان میں اکبر الہ آبادی بھی تھے جس کی زندہ مثال یہ ہے کہ سرسید کی وفات پر اکبر نے اس انداز سے اپنی عقیدت کے پھول پیش کیے ؂

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

علاّمہ رضا علی وحشت کلکتوی اپنے ایک مقالے میں تحریر فرماتے ہیں:

" اکبر جب کلکتہ آئے تھے[١٤] اور اودھ پنچ

کے مشہور کالم نگار سید محمد آزاد سے کے
یہاں مقیم تھے۔ اکبر اور سر سید کے دوست
عبدالغفور خاں نساخ کا انتقال ہو چکا تھا
علامہ وحشت کے استاد نساخ کے صاحبزادے
حضرت شمس فرید پوری نے اکبر سے دریافت
فرمایا:

آپ پہلے سر سید احمد کے سخت مخالف تھے
لیکن بعد میں ان کی تعریف کرنے لگے۔ آپ
کے خیالات میں یہ تبدیلی کیسے آئی۔

اکبر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

جس طرح لوگوں نے سر سید کو سمجھنے میں
غلطی کی تھی اسی طرح مجھے بھی ان کو سمجھنے میں
مغالطہ ہوا تھا۔ لیکن جب میں علی گڑھ گیا
ان کے کاموں کو قریب سے دیکھا، ان کی
محنت ان کا خلوص اور ان کا ایثار دیکھ کر
میں حیران رہ گیا۔ مجھے بہت پشیمانی ہوئی کہ
جس قوم کو سر سید جیسا مخلص رہنما نصیب
ہو اس کی کامیابی میں شک کرنا کفر
ہے۔"

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نواب وقار الملک کے
رفیق کار تھے اور ان کی حمایت کرتے تھے لیکن بعض معاملات
میں ان سے اختلاف ہو گیا۔ سر سید کے طریقۂ کار کے
پہلوؤں پر انھوں نے شدید نکتہ چینی کی۔ مولانا محمد علی
جوہر ولایت اور علی گڑھ سے واپس آ کر ایک عرصہ تک
دہلی اور کلکتہ میں مقیم رہے۔ کامریڈ کلکتہ سے اور ہمدرد
دہلی سے شائع کرتے تھے۔ خلافت تحریک سے متعلق جتنے
مضامین قلم بند کیے ان میں سر سید کے سیاسی خیالات
تعلیمی نظریات اور تہذیب الاخلاق میں شائع ہونے والی
نگارشات، براہ راست اثرات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ زمانہ
تھا جب کلکتہ میں خلافت تحریک زوروں پر تھی۔ مولانا محمد علی
کی گرج دار اور موثر دلنشین آواز نے قوم کے ہر طبقہ کو ایک
کونے سے دوسرے کونے تک بیدار کر دیا تھا۔ مولانا
عبدالماجد دریابادی جو مولانا جوہر کے رفیق کار اور ہم خیال
تھے انھوں نے کلام جوہر کے مقدمے میں علی گڑھ تحریک
کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

"۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے (مولانا محمد علی) نے
اپنا انگریزی ہفتہ وار اخبار کامریڈ نکالا۔ حاکموں
اور محکوموں، انگریزوں اور ہندوستانیوں
سارے انگریزی دانوں کے حلقے میں دھوم
مچ گئی۔ نثر میں شاعری واہ واہ سبحان اللہ
کے نعرے ہر طرف ڈرائنگ روم میں بھی
اور کلب میں بھی شیکسپیئر کے خلاف تنقید
کیا خوب لکھ دی مسلم یونیورسٹی کے نظام پر
مضمون کیا زبردست لکھ ڈالا۔ ۱۹۱۲ء آیا
کامریڈ دہلی لائے یہیں سے ہمدرد نکالا۔
اب محمد علی جوہر ایڈیٹر نہ تھے۔ ایڈیٹر سے کہیں
بڑھ کر صحیح معنوں میں لیڈر تھے۔ اب قوم
ان کی نہ تھی وہ قوم کے تھے۔" [۱۱]

علامہ شبلی نعمانی اردو ادب کے عناصر خمسہ میں سے
ایک ہیں۔ وہ برسوں سر سید کی صحبتوں اور ان کی خیالات و
خدمات سے براہ راست متاثر و فیض یاب ہوئے۔ ان کا
معاملہ اکبر کی نسبت بالکل برعکس تھا۔ یعنی ابتدائی زمانے
میں سر سید تحریک کی تائید کرتے رہے۔ سر سید اور
اور ان کے رفقائے کار بھی شبلی سے اخلاص و حمایت کا
جذبہ رکھتے تھے لیکن ندوہ اور دارالمصنفین کے قیام کے
بعد مولانا شبلی سر سید کے اتنے شدید مخالف ہوئے
کہ آخری وقت تک ان کی ہر بات کی خامیاں گنوانے معترضانہ
خیال آرائی سے گریز نہ کرتے۔ مولانا شبلی کی اس روش

مخاصمانہ کے اسباب وعوامل کیا تھے ان کی جھلکیاں مولانا موصوف کی تحریروں اور تقریروں میں جا بجا ملتی ہیں (مقالات شبلی) سرسید اور کلکتہ کے باب میں مولانا شبلی سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن ان کے جانشین اور شاگرد رشید مولانا ابوالکلام آزاد ساکن کلکتہ کا گہرا تعلق تھا غالب کے سب سے بڑے نکتہ چین مرزا قتیل تھے۔ غالب اور قتیل کا معرکہ میدان پلاسی یعنی کلکتہ میں عمل میں آیا تھا۔ اسی طرح سرسیّد کے سب سے بڑے معترض مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ قتیل و آزاد دونوں کا مسکن کلکتہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی مخالفانہ روش نہ اکبر جیسی تھی نہ شبلی وجوہر جیسی بلکہ ان کا معاملہ ان سب بزرگوں سے الگ تھا۔ یعنی وہ اول تا آخر سرسید، تحریک اور سرسید کے خیالات کے کسی پہلو سے کسی طور پر ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ ان کا اختلاف صرف مذہب سیاست اور تعلیم تک محدود نہ تھا۔ بلکہ سرسیّد کے جدید علم الکلام اور نئے طرز کا ادب اور انشا پردازی بھی انھیں گوارا نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود ایک یگانہ روزگار انشا پرداز تھے جس کا آج تک کوئی ثانی نہیں۔ مزید شبلی اسکول[۹۸] کے سب سے ذہین فرد ہمارے بزرگ معاصر غلام رسول مہر کی زبان میں:

> ”علم وفضل، حقایق دین، فلسفہ وحکمت، شعرو ادب، تصنیف وتالیف تقریر خطابات، اخبار نویسی، صحیفہ نگاری سیاست ملک داری غرض کون سا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی ابتدا ہی سے سب کے نزدیک ثابت و مسلم نہ تھی اور آج تک اس کی تصدیق و توثیق ہوتی رہی ہے۔“ [۹۱]

مولانا ابوالکلام آزاد کی جو تحریریں علی گڑھ تحریک کی مخالفت میں کلکتہ کے ہی اخبارات الہلال والبلاغ میں شایع ہوئیں ان کی بدولت علمی وادبی اعتبار سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کلکتہ کی تاریخ میں سرسیّد احمد خاں اور ان کی علی گڑھ تحریک کو

[illegible]

اُن اجلاسوں نے بھی کلکتہ میں علی گڑھ تحریک کو کامیاب بنانے اور بنگال کے مسلمانوں میں سیاسی، سماجی، تعلیمی شعور کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا جو وقتاً فوقتاً آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام منعقد ہوئے اور ان میں متعدد قرار دادیں منظور کی گئیں۔ ان اجلاسوں کی مفصل روئدادیں سید الطاف علی بریلوی مرحوم سابق سکریٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس بانی سرسید گرلز کالج کراچی نے اپنی کتاب موسوم بہ ”علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں“ میں بیان کی ہیں۔

کلکتہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تیرھواں سالانہ اجلاس ۱۸۹۹ء میں زیر صدارت آنریبل جسٹس سید امیر علی[۲۰] سی آئی اے منعقد ہوا۔ اودھ کے دو شہزادے بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔ صوبۂ بنگال کا حاکم اعلیٰ سرووڈ برن لفٹننٹ گورنر نے اجلاس کی قرار دادوں کی حمایت میں تقریر کی۔ مولوی امجد علی اشہری نے ”مسدس اشہری“ کے عنوان سے قومی نظم پیش کی۔

کانفرنس کا اکتیسواں سالانہ اجلاس بمقام کلکتہ ۱۹۱۷ء میں ہوا۔ محمد اکبر علی نذر علی حیدری[۲۱] (نواب سر حیدر نواز جنگ) نے صدارت فرمائی۔ یہ اجلاس کانفرنس کے جائنٹ سکریٹری مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نواب صدر یار جنگ بہادر کی کوششوں سے منعقد ہوا تھا۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر عبدالرحیم بخش الہٰی اور آنریری سکریٹری واحد حسین تھے۔ اسی اجلاس میں مولانا حالی اور علامہ شبلی کی قومی نظمیں پڑھی گئیں۔

کانفرنس کے پچاسویں سالانہ اجلاس کا انعقاد ۱۹۳۹ء میں بمقام کلکتہ ہوا۔ اس کی صدارت نواب کمال یار جنگ بہادر[۲۲] نے کی۔ اس اجلاس کا انعقاد اس وقت کے وزیر اعظم بنگال آنریبل مولوی ابو القاسم فضل الحق (شیر بنگال) کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا۔ مولوی فضل الحق صدر استقبالیہ کمیٹی اور جنرل سکریٹری استقبالیہ کمیٹی وزیر حکومت بنگال حسین شہید سہروردی تھے

[illegible]

اور آنریبل سر شاہ محمد سلیمان جیسی نامور شخصیات نے اس اجلاس میں یادگار تقریریں کیں۔ خان بہادر علامہ رضا علی وحشت کلکتوی[۲۲] نے منظوم سپاس نامہ پیش کیا۔ پروفیسر قمر صدیقی تلمیذ علامہ وحشت نے قومی نظم پڑھی جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

رنگ میں ہم کو نظر آئے گی دولت کی بہار
خاک میں ہم کو دکھائی دے گی ثروت کی بہار

یہ جو پستی ہے وہ بن جائے گی رفعت کی بہار
یہ جو نکہت ہے وہ ہو جائے گی رحمت کی بہار

گل بداماں ہوں گے ہم شاداب ہوگا یہ چمن
یہ چمن کہتے ہیں عرفِ عام میں جس کو وطن

---

# حواشی

۱ـ سید صاحب کو حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تعلیمات سے خاص شغف تھا (سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ناشر مکتبہ کارواں لاہور، اشاعت دوم، ۱۹۶۵ء)

۲ـ مولانا اسمٰعیل شہید نے ان کے (سر سید کے) خیالات کی زیادہ اصلاح کی اور انھیں تقلید کے بندھنوں سے آزاد کیا (حیات جاوید، مولانا حالی، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ طبع دوم، ۱۹۲۲ء)

۳ـ حیات جاوید ص ۲۵۰۔ نسخۂ ہند

۴ـ خطبات گارساں دی تاسی ص ۴۲۲، مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

۵ـ حیاتِ جاوید ص ۴۵۰

۶ـ خطبات گارساں دی تاسی، ص ۵۰۰ - ۴۳۷

۷ـ گارساں دی تاسی اور اس کے ہم عصر بہی خواہان اردو۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ص ۱۲۵-۱۲۳

۸ـ حیات جاوید، ص ۴۵۰

۹ـ سید امیر علی مصنفہ شاہد حسین رزاقی، مطبوعہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور

۱۰ـ حیات جاوید، ص ۴۵۰

۱۱ـ تاریخ ادب اردو، تصنیف رام بابو سکسینہ ترجمہ مرزا محمد عسکری مطبع منشی نول کشور لکھنو تیسرا ایڈیشن۔

۱۲ـ سر سید کے نمایاں افکار و تصورات ص ۱۶، مشمولہ سر سید اور ان کے نامور رفقاء۔

۱۳ـ "اگر سر سید احمد خاں اور اودھ پنچ نہ ہوتے تو اکبر حسین بھی نہ ہوتے۔ سید صاحب کے ہر کام پر نکتہ چینی کرنا اُس زمانے میں اکبر کا فرض تھا اور اس کی اشاعت کے لیے اودھ پنچ کے اوراق وقف تھے۔ (گل رعنا، محمد یحیٰی تنہا)

۱۴ـ [illegible]

۱۵۔ علی گڑھ کالج۔

۱۶۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۷ الف مقالہ اکبرالہ آبادی اور کلکتہ از ڈاکٹر وفا راشدی (بحوالہ مقالات وحشت قلمی) مشمولہ نگار پاکستان کراچی اکبرالہ آبادی نمبر۔ نومبر، دسمبر، ۱۹۶۹ء

۱۷۔ مقالاتِ ماجد، ص ۱۹۶۔ عبدالماجد دریا بادی، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، طبع دوم

۱۸۔ شبلی، ص ۱۹۴ - ۲۰۱۔ مشمولہ سرسید اور ان کے نامور رفقا.....

۱۹۔ مقالہ ابو الکلام آزاد ایک نادر روزگار شخصیت مشمولہ آج کل دہلی، آزاد نمبر ۱۹۵۸ء

۲۰،۲۱،۲۲۔ جسٹس امیر علی، اکبر علی نذر علی حیدری (سر اکبر حیدری) اور نواب کمال یار جنگ بہادر کے حالات و خدمات اور ان اجلاسوں کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو "علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں" مؤلفہ سید الطاف علی بریلوی، مطبوعہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، ۱۹۷۰ء

۲۳۔ علامہ وحشت کی حیات و خدمات کے لیے ملاحظہ ہو "حیات وحشت"، ناشر مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۸۲ء اور بنگال میں اردو، اشاعتِ اول، ۱۹۵۵ء مکتبہ اشاعتِ اردو کراچی۔ یہ دونوں راقم (ڈاکٹر وفا راشدی) کی تصانیف ہیں۔

۲۴۔ پروفیسر قمر صدیقی کی حالات و خدمات کے لیے ملاحظہ ہوں بنگال میں اردو اور راقم الحروف کا مقالہ "علامہ وحشت کے ایک اہم شاگرد، پروفیسر قمر صدیقی"، مشمولہ سہ ماہی روحِ ادب کلکتہ (مغربی بنگال اردو اکیڈمی) اپریل، جون ۱۹۹۱ء

# دیگر حوالہ جات


۱۔ انصار زاہد۔ ترجمہ تنویر فاطمہ لئیق۔ وارث سرہندی۔ تاریخ علی گڑھ تحریک، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اشاعت اول

۲۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ سرسید احمد خاں، حالات و افکار، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، اشاعت دوم ۱۹۷۵ء

۳۔ شبلی نعمانی، علامہ۔ مقالات شبلی (متعدد جلدیں) دارالمصنفین اعظم گڑھ

۴۔ شجاع احمد زیبا، پروفیسر۔ مولوی نذیر احمد اور علی گڑھ تحریک، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۷ء

۵۔ طاہر نسیم۔ سرسید اور صحافت۔ مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۰ء

۶۔ ظفر حسن، ڈاکٹر۔ سرسید اور حالی کا نظریۂ فطرت، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۹۰ء

# ہیومن جی نوم پراجیکٹ

محمد زکریا ورک*

مغربی دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں، لیبارٹریز، ریسرچ کے اداروں میں اس وقت اس بات نے تہلکہ مچا دیا ہے کہ کون سی یونیورسٹی یا لیبارٹری انسان کے ڈی این اے D.N.A کا مکمل نقشہ تیار کرنے میں سبقت لے جاتی ہے۔ امریکہ میں اس جدید اور انقلابی ریسرچ کے لیے سرکار نے ایک بلین امریکی ڈالر مختص کیا ہے۔ امریکہ کی وفاقی حکومت کے ڈپارٹمنٹ آف انرجی نے ایک خاص سات سالہ منصوبہ اس ریسرچ کے لیے تیار کیا ہے اسی طرح جاپان کی حکومت نے بھی ایک بلین ڈالر اس جدید ریسرچ کے لیے خرچ کرنے کا عزم کیا ہے جب کہ کینیڈا کی وفاقی حکومت نے کچھ ہی عرصے پہلے اس کام کے لیے بیس ملین ڈالر خرچ کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔

مغربی ممالک کے سائنس داں اس کوشش میں سرگرداں ہیں کہ کون سا ملک یا سائنسی ادارہ انسان کے جنیٹک کوڈ (D.N.A) کا مکمل نقشہ تیار کرنے میں سبقت لے جاتا ہے۔ لیبارٹریز میں سائنس داں اس کوشش میں ہیں کہ وہ ان ناقص جینز کا پتہ لگائیں جو انسان میں ۳۶۰۰ کے قریب امراض کا باعث بنتے ہیں اور یوں ان جین کا پتہ لگانے سے ان امراض کا علاج بھی دریافت ہو سکے گا۔

انسان کے جسم کے اندر پچاس ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک جین موجود ہوتے ہیں۔ سائنس داں اس تگ و دو میں مصروف ہیں کہ ۱۹۹۳ء تک ان ایک لاکھ کے قریب جینز کی ایک مکمل فہرست تیار کریں اور پھر اگلے پندرہ سالوں میں ہر ایک جین کا مختلف فنکشن بھی پتہ کریں۔ انگلستان میں اس ریسرچ میں امپیریل کینسر ریسرچ فنڈ کے ڈاکٹر پیٹر گڈ فیلو (Peter Good Fellow) کا نام سرفہرست ہے۔ اس ڈاکٹر نے چند سال قبل وہ جین دریافت کیا تھا جس کی بنا پر ہونے والا بچہ نر یا مادہ ہوتا ہے۔

کینیڈا میں ہیومن جی نوم پراجیکٹ کے سربراہ کا نام ڈاکٹر رانلڈ وارٹن (RONALD WARTON) ہے جو ٹورنٹو کے معروف بچوں کے ہسپتال میں ریسرچ کا کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے لڑکوں میں پائی جانے والی خاص بیماری Muscular Dystrophy پٹھوں کی بیماری کے جین کی دریافت کی تھی۔ اسی طرح اگر ایک شخص کے اندر Huntington's Disease کا جین موجود ہو تو ایسا شخص ایک روز اعصابی بیماری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس

---

* کنگسٹن، کینیڈا۔

بیماری کا منبع بھی جین ہوتے ہیں۔

کینیڈا کے ہسپتالوں اور بڑی بڑی کمپنیوں میں جینٹک اسکریننگ کا کام عن قریب شروع ہو جائے گا اس اسکریننگ سے والدین اپنے ہونے والے بچوں کی ذہنی و جسمانی صحت کا اندازہ بھی لگا سکیں گے اور بعض صورتوں میں وہ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ آیا ان کو بیمار بچہ چاہیئے یا نہیں؟ کینیڈا کے ہیلتھ اینڈ سیفٹی کے قوانین اس قدر سخت ہیں کہ کمپنیوں کے لیے یہ بات لازمی ہو جائے گی کہ وہ ایسے اشخاص کو ملازمت نہ دیں جو آئندہ چل کر کسی خاص بیماری کا نشانہ بنیں گے یا وہ جائے ملازمت پر یک لخت دل کے دورے سے اس دنیا سے کوچ کر جائیں گے۔

مغربی ممالک میں انشورنس کمپنیوں نے اس جینٹک اسکریننگ میں خاص دلچسپی کا اظہار اس لیے کیا ہے کیونکہ وہ کسی شخص کو انشورنس پالیسی دینے سے پہلے یہ جان سکیں گے کہ فلاں شخص کس بیماری سے کس سال فوت ہوگا؟ یا وہ یہ جان سکیں گے کہ اس کے جسم میں کتنی قسم کے ناقص 'جین' موجود ہیں۔

چند ماہ قبل ہالینڈ سے یہ خبر آئی ہے کہ ایمسٹرڈیم میں ایک کمپنی نے ایک ایسا نیا پودا تیار کیا ہے جو جینٹک انجینیرنگ سے تیار کیا گیا ہے۔ اس پودے کا نام فلورنٹ (Floriant) ہے' اس کا اصل رنگ گلابی ہوتا تھا مگر اب یہ سفید رنگ میں پیدا کیا جائے گا۔ سائنس دانوں نے اصل پودے کے جین تبدیل کر کے یہ نیا پودا تیار کیا ہے جو عنقریب یورپ کے بازاروں میں فروخت کے لیے دستیاب ہو جائے گا۔

اسی طرح واشنگٹن ڈی سی سے یہ خبر آئی ہے کہ یونیورسٹی آف نارتھ کیرولائینا میں سائنس دانوں نے انسانوں میں پایا جانے والا مرض 'Cystic Fibrosis' کے جین چوہوں میں تجربے کے طور پر انجکشن کے ذریعے داخل کیے ہیں۔ تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ یہ مرض پیدا کیسے ہوتا ہے نیز اس مرض کو کنٹرول کرنے کے لیے کون سی دوا موثر ہوگی یاد رہے کہ کینیڈا میں ہر دو ہزار بچوں میں سے ایک بچہ اس مرض کا شکار ہوتا ہے۔ اس مرض سے بلغم پھیپھڑوں اور نظام ہضم کے اندر پھنس (clog) جاتا ہے اور یوں ایسا مریض بیس یا پچیس سال سے زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ موروثی بیماریوں میں سے اس بیماری کی وجہ سے کینیڈا میں سب سے زیادہ بچے موت کا شکار ہوتے ہیں۔

ٹورنٹو میں بچوں کے معروف اسپتال میں ایک اور ڈاکٹر لیپ چی سوئی (Lap Chee Sui) ریسرچ کا کام کرتے ہیں۔ اس ڈاکٹر نے ۱۹۸۹ء میں C.F کا جین دریافت کیا تھا۔ انھوں نے اس خبر پر کہ C.F. کے جین چوہوں میں ریسرچ کے لیے ڈالے گئے ہیں نہایت خوشی کا اظہار کیا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے ڈاکٹروں کو ایک ماڈل مل گیا ہے جس پر وہ تجربات کر سکتے ہیں۔ اس بیماری کا علاج نہ ملنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ریسرچ کے لیے ماڈل کی عدم موجودگی میں تجربات لامحال تھے۔ انسانی ماڈل پر تجربات کرنا گویا زندگی اور حیوانیت کے مترادف تھا اس لیے اب چوہے کا ماڈل ملنے سے سائنس داں ان کو مختلف ادویات دے کر ان کے اثرات ملاحظہ کر سکیں گے۔

## ڈی این اے (DNA) کا تعارف

ہمارے جسم کے اندر ہر ایک سیل (cell) کے اندر ہمارا جینٹک کوڈ محفوظ ہوتا ہے۔ ہمارے مکمل ڈی این اے (DNA) کے اندر ۳.۵ بلین حروف ابجد ہیں جس طرح اردو زبان کے حروف ابجد ہیں بعینہ ڈی این اے (DNA) کے بھی حروف ابجد ہوتے ہیں جن کو نیوکلیوٹائیڈ (Nucleotide) کہا جاتا ہے یہ آپس میں مل کر جین بنتے ہیں جس طرح مختلف الفا

مل کر لفظ بنتے ہیں۔

ہر صاحب علم یہ بات جانتا ہے کہ انسانی جسم چھوٹے چھوٹے خلیوں سے مل کر بنا ہے۔ آتشی شیشہ لگائے بغیر ان خلیوں (cells) کو دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ ہر ایک سیل کے اندر سیل کے سائز سے بھی چھوٹا ایک گول حصہ ہوتا ہے جس کو نیوکلیئس کہتے ہیں۔ اس نیوکلیس (Nucleaus) کے اندر نہایت مہین دھاگے کی طرح گھماؤ دار باریک کروموسوم (Chromosome) ہوتا ہے۔ ہر باریک دھاگہ دراصل دو متوازی دھاگوں کا مجموعہ ہوتا ہے ان دھاگوں یعنی کروموسوم کے اندر بے شمار چھوٹے چھوٹے نقطے ہوتے ہیں جن کو جین کہا جاتا ہے۔

جین ناقابل گمان سائز کے ہوتے ہیں ان میں سے ایک ایک جین اپنے اندر زندہ جاندار جسم میں پائے جانے والے انسان کے کردار کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ نر اور مادہ مادوں کے اختلاط کے وقت دونوں کے کرداروں سے نئے بننے والے جسم کے کردار کا ذمہ دار بھی یہ جین ہوتے ہیں۔

جسم کے اندر معمولی سے نقطے کی شکل میں پوشیدہ ایک باریک ترین حصہ یہ طے کرتا ہے کہ فلاں انسان کے جسم کا رنگ سیاہ ہوگا یا سفید، اس کے بال سیاہ ہوں گے یا بھورے اس کے چلنے اور گفتگو کرنے کا انداز کیا ہوگا؟ بعینہٖ پودوں میں اگر پودینے کے پتے مڑے ہوں گے تو وہ ایسے ہی رہیں گے کیوں کہ اس کے جین ایسے ہیں اور پھلوں میں ایک پھل کا ذائقہ ترش ہوگا یا شیریں اس کا فیصلہ بھی جین کریں گے جب تک کہ جین کو بدل نہ دیا جائے۔

ہمارا DNA کمانی کی طرح گھماؤ دار ہوتا ہے گویا ہمارا DNA ہمارے متعلق معلومات کا اسٹور ہے اس معلومات کے اسٹور کو پڑھنے کے لیے اس کے حروف ابجد کا جاننا ضروری ہے۔ ایک جین کا مقصد کس قسم کا ہوتا ہے یہ ملاحظہ فرمائیں:

ہر انسان کے جسم کے اندر پچاس ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک جین موجود ہیں —— ابھی تک سائنس داں صرف ایک ہزار جین دریافت کر چکے ہیں۔ باقی جسم کے اندر کہاں موجود ہیں۔ اس بات پر ریسرچ کا کام مغربی ممالک میں سرعت سے شروع ہو چکا ہے۔ اس پراجیکٹ کا نام "ہیومن جی نوم پراجیکٹ" رکھا گیا ہے۔ وہ سائنسی ادارے اور یونیورسٹیاں جو جین میپنگ کا کام کر رہے ہیں اس کا نام ہیومن جی نوم آرگنائزیشن (Human Genome Organization) ہے۔ جو سائنس داں اس بین الاقوامی پروجیکٹ میں ریسرچ کا کام کر رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس جدید ریسرچ سے ہم ایک روز ایسے جین جاننے میں کامیاب ہو جائیں گے جن سے امراض کے PREVENTION اور مناسب علاج کا کام آسانی سے ہو سکے گا۔

ہر انسان کے اندر ناقص جین موجود ہوتے ہیں یوں کوئی بھی شخص سائنسی اعتبار سے کامل اور فائز نہیں ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ایک جسم انسانی کے اندر پانچ سے دس ناقص جین موجود ہوتے ہیں۔ مستقبل قریب میں جینیٹک اسکریننگ کے ذریعے ایسے ناقص جین کا پتہ لگایا جا سکے گا۔ پچھلی سطور میں جین کے متعلق جو معلومات پیش کی گئیں ان کا خلاصہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

انسانی سیل ← نیوکلیس ← نیوکلیوٹائیڈ
← جین

**علم سیکھنے کے جین کی دریافت**

کینیڈا کے کثیر الاشاعت اخبار ٹورنٹو اسٹار کے ۱۹ جولائی ۱۹۹۲ء کی اشاعت میں یہ سنسنی خیز خبر شائع ہوئی ہے کہ امریکہ میں سائنس دانوں نے علم سیکھنے کا جین دریافت کر لیا ہے۔ اس جین کو دریافت کرنے کے لیے سائنس دانوں نے لیبارٹری میں ایک چوہے کے دماغ سے وہ جین نکال دیا جو کہ تمام جانداروں میں

موجود ہوتا ہے۔ ایسے چوہے کو جب ایک لیبارٹری کے اندر بھول بھلیّ (Maze) میں سے گزارا گیا تو وہ اپنے اصلی جائے مقام کو یاد نہ رکھ سکا اور اسے بھول بھلیّ میں سے گزر کر اپنے جائے مقام تک واپس آنے میں دقت ہوئی اس کے مقابل ہر وہ چوہے جن کے دماغ سے علم سیکھنے کا جین نکالا نہیں گیا تھا۔ ان کو اس بھول بھلیّ میں سے گزر کر اپنی اصلی جگہ تلاش کرنے میں ذرا دقت نہیں ہوئی۔ امریکی سائنس داں ڈاکٹر جی این وے نر (WEHNER) جو یونیورسٹی آف کولوریڈو میں پروفیسر ہیں اور جنھوں نے اس جدید ریسرچ میں کافی حصّہ لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ چوہا جس کے دماغ میں سے سیکھنے کا جین نکال دیا گیا تھا وہ درحقیقت اپنی نارمل قابلیت کھو بیٹھا تھا اور یہ کہنا بجا ہوگا کہ ایسا چوہا "ناقص" ہوگیا تھا۔

دماغ کے اندر ایک کیمیکل Calcium-Calmodu-lin خاصی مقدار میں موجود ہوتا ہے۔ اس تجرباتی چوہے کے دماغ سے جب سیکھنے کا جین نکالا گیا تو دوسرے لفظوں میں یہ کیمیکل دماغ میں پیدا نہ ہوا اور اس کیمیکل کے نہ ہونے سے اس کے سیکھنے کی اہلیت ختم ہوگئی۔ اس کیمیکل کی مناسبت سے اس نئے جین کا نام CAMK II رکھا گیا ہے۔

انسانی جسم میں ۴۶ کروموسوم ہوتے ہیں۔ جین اور کروموسوم (Deoxy-Ribonucleic DNA) (Acid) سے بنتے ہیں۔ انسان کے ایک سیل کے اندر چھ فٹ کے برابر DNA ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پورے انسانی جسم کے اندر DNA کی لمبائی ۲۷ بلین کلو میٹر ہوتی ہے۔

اگر ایک نوزائیدہ بچے میں کروموسوم کی تعداد ۴۶ سے کم یا زیادہ ہو جائے تو ایسے بچے ذہنی طور پر غیر متوازن ہوتے ہیں۔ Mentally Retarded ایک بیماری جس کا نام Downs Syndrome ہے۔ ایسی بیماری والے بچوں میں کروموسوم کی تعداد ۴۷ ہوتی ہے سائنس دانوں نے ابھی تک ۱۸۰۰ بیماری کا پتہ لگایا ہے جو ناقص جین کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور ایک نسل دوسری نسل کو یہ بیماری ناقص جین کی بنا پر دیتی ہے۔

انگلش کا لفظ جین GENE یونانی زبان سے آیا ہے یونانی زبان میں اس کے معنیٰ ہیں پیدا ہونا۔

برطانیہ کی سب سے مشہور ملکہ وکٹوریہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے جسم کے اندر ایک ایسا جین موجود تھا جس سے HEMOPHILIA کی بیماری پیدا ہوتی ہے۔ یہ جین اس کے ایکس کروموسوم میں تھا۔ ملکہ وکٹوریہ سے یہ جین اس کی بیٹی شہزادی ایلیس (ALICE) کو ملا۔ اس کے بعد اس کی بیٹی شہزادی اے لکس (ALEX) کو یہ جین نصیب ہوا۔ اے لکس کی شادی روس کے زار بادشاہ نکولس ثانی سے ہوئی تھی اور ان سے شہزادہ ایلگزینڈر پیدا ہوا جو Hemophilia کی بیماری سے بیمار رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ زار نکولس اپنے پیارے بیٹے کی علالت سے اس قدر پریشان رہتا تھا کہ اس کو حکومت کے کاموں اور ذمہ داریوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زار کا تختہ الٹ دیا گیا اور اس کی وجہ اس کے بیٹے کی علالت بنی جو اسے انگلینڈ کی ملکہ وکٹوریہ سے ملی تھی۔ ہیموفیلیا (خون کا جم جانا) کی بیماری صرف مردوں میں ہوتی ہے مگر عورتیں ایک سے دوسرے کو دیتی ہیں۔

کینڈا کی سب سے مشہور میگل یونیورسٹی مانٹریال (McGILL) کے ایک پروفیسر ڈاکٹر چارلس کا کہنا ہے کہ جین کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ آپس میں ہمیشہ جڑواں ہوتے ہیں۔ نیز جب ایک جین تقسیم

ہونا شروع ہوتا ہے تو یہ فوراً اپنی کاپی کر لیتا ہے۔ جین کے اندر بجلی کے سوئچ کی طرح ON/OFF بٹن بھی ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جین ایک دوسرے سے کمیونیکیشن بھی کرتے ہیں۔

کینیڈا کے صوبے برٹش کولمبیا میں حکومت نے اب ایک محکمہ جین رجسٹری کا کھول دیا ہے جہاں لوگوں کے ناقص جین کا اندراج کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر چارلس کی رائے کے مطابق ایک شخص کے بیمار ہونے کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اس کے جین کتنے مضبوط ہیں کہ وہ بیماری سے دفاع کر سکیں اس دعوے کا ثبوت سائنس والوں کو لیبارٹری میں تجربات کرنے سے مل چکا ہے۔

---

"ہم کو یہ بات کبھی بھولنی نہیں چاہیے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطنی بھائی ہیں گو وہ ہمارے ساتھ اس کلمہ میں جس نے ہم مختلف فرقوں کو ایک قوم اور آپس میں روحانی بھائی بنا لیا ہے، شریک نہیں ہیں مگر بہت سے تمدنی امور ہیں جن میں ہم اور وہ مثل بھائیوں کے شریک ہیں۔ اسی سرزمین پر وہ ہندوستان کی ہو یا پنجاب کی، دکن کی ہو یا ہمالہ کی ہم دونوں رہتے ہیں۔ اسی ملک کی ہوا سے، اسی ملک کے پانی سے، اسی ملک کی پیداوار سے دونوں کی زندگی ہے۔ ہزاروں امور تمدن ایسے ہیں کہ بغیر ہمارے ان کو اور بغیر ان کے ہم کو چارہ نہیں۔ ہمسایہ کا ادب ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے اور یہی ہمسائگی وسعت پاتے پاتے ہم ملکی ہم وطنی کی وسعت تک پہنچ گئی ہے۔"

سرسید رح

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱، ش ۱۱، نومبر ۹۲ء

# مولانا فراہیؒ اور دار المصنفین

ظفر الاسلام ★

[ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی مختلف علوم وفنون کے میدان میں اپنی نمایاں خدمات اور متعدد موضوعات پر اپنی گراں قدر تصنیفات کے لیے معروف ہیں۔ ایک دوسرے کے قریبی عزیز (ممیرے و پھوپھیرے بھائی) ہونے کے علاوہ ان میں استاد و شاگرد کا بھی بہت گہرا اور مستحکم رشتہ تھا۔ حسن اتفاق سے علی گڑھ (ایم۔ اے۔ او۔ کالج) سے بھی استاد و شاگرد دونوں منسلک رہے ہیں۔ دونوں کی تاریخ وفات بالترتیب ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء اور ۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء ہے۔ اسی نسبت سے علامہ شبلی کی قیمتی وعلمی یادگار دار المصنفین سے ان کے شاگرد عزیز و ماہر قرآنیات مولانا فراہی کی گہری وابستگی پر یہ مضمون نومبر کے شمارے میں شایع کیا جا رہا ہے۔ ]

مولانا حمید الدین فراہیؒ (۱۸۶۳ء — ۱۹۳۰ء) جدید ہندوستان کے ان نامور علماء اور ممتاز دانشوروں میں سے ہیں جو علوم قدیمہ وجدیدہ دونوں پر عبور رکھتے تھے اور جن کی صلاحیتیں مختلف میدانوں میں نمایاں ہوئیں۔ ترجمہ وتفسیر، عربی فارسی و انگریزی زبان وادب، بلاغت ومعانی، فلسفہ وعلم کلام، تاریخ جغرافیہ وغیرہ متعدد علوم میں مولانا فراہی کو مہارت حاصل تھی اور درس وتدریس، تصنیف وتالیف وانتظامی امور جیسے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ان کی صلاحیت واستعداد اور تحقیق و تجربہ کے نقوش ظاہر ہوئے۔ ان کی ان مختلف الجہات مصروفیات کا سب سے امتیازی پہلو یہ ہے کہ ان سب میں قرآن کریم سے ان کے گہرے تعلق اور قرآنی علوم میں غیر معمولی دلچسپی (جو ان کی جملہ مصروفیات کا اصل محور تھا) کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ زندگی کے مختلف مراحل میں مولانا فراہی تعلیمی وتدریسی مصروفیات، تصنیفی وتالیفی سرگرمیوں یا انتظامی ذمہ داریوں کے سلسلے میں کئی ایک تعلیمی اداروں وعلمی مراکز سے منسلک رہے اور ان تمام میں اپنے علمی فیوض اور برکات اور فضل وکمال کے اتنے گہرے اثرات چھوڑ گئے کہ انھیں مولانا کی علمی یادگاروں میں شامل کرنا غلط نہ ہوگا۔ ان اداروں اور علمی مراکز میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج (علی گڑھ) میور کالج (الٰہ آباد) دار العلوم (حیدرآباد) دار المصنفین (اعظم گڑھ) اور مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڑھ) قابل ذکر

---

★ لکچرر شعبۂ علوم اسلامیہ، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔

پیشِ نظر مضمون میں صرف دار المصنفین سے مولانا فراہی کی وابستگی اور اس کے نقوش و اثرات زیرِ بحث آئیں گے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ علامہ شبلی کے ذہن میں دار المصنفین نام سے ایک ادارہ کا تخیل اصلاً اس وقت پیدا ہوا جب ندوۃ العلماء میں ان کی معتمدی کے دوران ۱۹۱۰ء میں کتب خانہ کا قیام عمل میں آیا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اس سے ملحق ایک شعبۂ تصنیف و تالیف بھی قائم ہو جس کے تحت فارغین ندوہ کو اس میدان میں تربیت دی جائے اور ساتھ ہی دوسروں کو بھی یہاں مختلف موضوعات پر مطالعہ و تحقیق کی سہولتیں فراہم ہوں۔ ندوۃ العلماء کے تیرہویں اجلاس (منعقدہ دہلی مارچ ۱۹۱۰ء) میں ایک کتب خانہ اور دائرۂ تالیف کے قیام کی تجویز پیش ہوئی۔ سید سلیمان ندوی نے اس کی تائید میں تقریر کی جس میں ایک عظیم الشان کتب خانہ کے ساتھ ایک دار المصنفین کے قیام کی ضرورت کو بھی واضح کیا[۲۳] علامہ شبلی اسی زمانے سے اس نوع کے ادارے کے قیام کے لیے کوشاں رہے اور اہلِ علم و اصحابِ خیر کی توجہ اس جانب مبذول کراتے رہے[۲۴] لیکن ندوہ میں قیام کے دوران ان کی یہ تجویز روبہ عمل نہ آسکی۔ اس کے لیے انھیں یکسو ہو کر اس وقت جد و جہد کرنے کا موقع ملا جب وہ ۱۹۱۳ء میں ندوہ کے معتمد تعلیمات کے عہدے سے مستعفی ہو کر اپنے وطن اعظم گڑھ میں مستقلاً سکونت پذیر ہوے۔ اب جب کہ ان کے تخیل کی عملی صورت قریب نظر آئی تو انھوں نے مجوزہ ادارے کے قیام کے لیے قطعی طور پر اعظم گڑھ کو منتخب کیا اور اس کے لیے کوششیں تیز کرتے ہوے انھوں نے متعدد حضرات سے رابطہ قائم کیا[۲۵]۔ ابتدائی تیاری کے طور پر انھوں نے اعظم گڑھ شہر میں اپنا آبائی بنگلہ، باغ اور ملحقہ آراضی خاندان والوں کے مشورے سے اس کے لیے وقف کیا[۲۶]۔ اسی مرحلہ سے علامہ شبلی دار المصنفین کے قیام اور اس کے آئندہ کاموں کے لیے مولانا فراہی کو کس قدر اہمیت دیتے تھے اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جسے انھوں نے مسلسل بیماری کی حالت میں اکتوبر ۱۹۱۴ء میں مولانا کو لکھا تھا۔ اس خط کا ایک حصہ ملاحظہ ہو۔ ” وقف ناموں میں اسٹامپ کا جھگڑا تھا، اس لیے کلکٹر کے یہاں درخواست دے دی وہ طے کر دیں تو تکمیل ہو جائے گی تم کو متولیوں میں رکھا ہے اور اگر دار المصنفین قائم ہوا تو تمہارے سوا کون چلائے گا[۲۷]“

دار المصنفین سے علامہ شبلی کا مقصود ایک علمی و تحقیقی ادارے کا قیام تھا۔ جہاں بالخصوص اسلامی علوم و فنون کے میدان میں مطالعہ و تحقیق کی سہولتیں فراہم ہوں اور تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں جاری ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ مدرسۃ الاصلاح اور دار المصنفین کو ملا کر اسلامی علوم و فنون کے میدان میں تعلیم و تربیت کا ایک عظیم مرکز (جامعہ) قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کے ذہن میں اول الذکر کی حیثیت ابتدائی اور ثانی الذکر کی تکمیلی مرحلے کی تھی جیسا کہ مولانا مسعود علی ندوی کے نام اُن کے خط کے اِن الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ” دار المصنفین درجۂ تکمیل اور سرائے میر درجہ ابتدائی پورا جامعہ اِسلامیہ کا مصالحہ ہے[۲۸]“ دار المصنفین میں درجۂ تکمیل کے تحت ان کے پیشِ نظر سب سے پہلے سیرت کے موضوع پر مطالعہ و تحقیق کی سہولتیں فراہم کرنا اور اس فن کے ماہرین تیار کرانا تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے تحقیقی کام کرنے والوں کو وظیفہ (Fellowship) دینے کا اہتمام بھی کیا[۲۹] اور شروع میں اس کے لیے کوئی مستقل آمدنی نہ ہونے کی صورت میں ایک وظیفہ فنڈ قائم کیا۔ علامہ شبلی کی اپیل پر اس فنڈ کے لیے جن لوگوں نے عطیات پیش کیے ان میں سرِ فہرست مولانا فراہی کا نام آتا ہے۔ انھوں نے اس مد میں تیس روپیہ ماہوار دینا منظور کیا۔ ایک خط میں علامہ شبلی اس کا تذکرہ کرتے ہوے لکھتے ہیں:

” اس صیغہ کے لیے میاں حمید نے ۳۰ روپیہ ماہوار دینا منظور کیا ہے۔ ۳۰ روپیہ میں بھی دوں گا[۳۰]“

دار المصنفین کے قیام اور اس کے مجوزہ خاکہ میں رنگ

ہجرت کی تیاریاں زوروں سے جاری تھیں کہ علامہ شبلی ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پا گئے اور ان کی یہ کوشش ان کی وفات کے بعد ہی بار آور ہو پائی۔ اس کی مختصر روداد یہ ہے کہ مولانا فراہی کی تحریک پر علامہ شبلی کے ادھورے کاموں کی تکمیل کے لیے جماعت نعمانیہ یا اخوان الصفا کے نام سے ایک مجلس قایم ہوئی جو ان کے تلامذہ پر مشتمل تھی۔ اس کی مجلس تاسیسی کے پانچ ممبران میں مولانا فراہی سرفہرست تھے۔ بعد میں اسی مجلس نے دارالمصنفین کے قیام کی تجویز کو عملی شکل دی۔ دارالمصنفین کے ۱۱ ارکان اساسی منتخب ہوئے جن میں مولانا فراہی کی حیثیت صدر اور مولانا سید سلیمان ندوی کی ناظم کی تھی۔ مولانا فراہی تاحیات اس منصب پر فائز رہے۔ اسی مجلس نے دارالمصنفین کے قواعد و ضوابط کی ترتیب کا کام انجام دیا اور مئی ۱۹۱۵ء میں باقاعدہ دستوری طور پر اس اہم علمی و تحقیقی مرکز کا قیام عمل میں آیا۔[۱۱۱]

دارالمصنفین کے پیش نظر اولین کام سیرت النبی کی تکمیل تھا۔ گرچہ اس کام میں اصلاً مولانا سید سلیمان ندوی مصروف ہوئے لیکن مولانا فراہی نے اس میں تعاون دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ خواہ اس کا تعلق مالی معاونت سے ہو یا قلمی سے۔ اس کی بعض مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ یہاں اس پر یہ مزید اضافہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کی وفات پر نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال کی دعوت پر مولانا فراہی و مولانا سید سلیمان ندوی ۲۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو بھوپال گئے اور سیرت کے اہم منصوبے کی تکمیل کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ سرکار عالیہ نے انھیں سیرت کے لیے مالی تعاون جاری رکھنے کی یقین دہانی کرائی اور اس کے لیے اپنی سابقہ گرانٹ کو ان دونوں حضرات کے نام جاری کر دیا۔ سید صاحب اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس کے بعد میں اور وہ دونوں مل کر سرکار عالیہ نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال کی طلبی پر بھوپال گئے۔ سرکار عالیہ نے تسلی دی اور سیرت کی تصنیف کی رقم بدستور ہم دونوں کے نام جاری [illegible]

کی پہلی بارش تھی۔"[۱۱۲] بعد میں مولانا فراہی نے حیدرآباد قیام کے دوران سرکار عالیہ سے منظور شدہ وظیفہ کی رقم (تین سو روپیہ ماہانہ) دارالمصنفین کے نام منتقل کرا دی جو بقول سید سلیمان ندوی:

"دارالمصنفین کی بقا کی بہترین ضمانت بنی۔"[۱۱۳]

یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ دارالمصنفین کی اشاعتی منصوبوں میں سیرت النبی کو اولین و اہم ترین حیثیت حاصل تھی اور بعد میں اس کی مطبوعات میں اسی کتاب کو شاہکار کا درجہ ملا۔ اس کی تالیف و تکمیل میں مولانا فراہی کا معتدبہ حصہ رہا ہے جیسا کہ اس کے مختلف مباحث سے متعلق مولانا فراہی سے علامہ شبلی کے استفسارات سے واضح ہوتا ہے۔ اس کی توثیق مولانا سید سلیمان ندوی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے: "سیرت کے ان مباحث میں جن کا تعلق صحف بنی اسرائیل اور قرآن پاک سے ہے وہ اپنے بھائی مولوی حمید الدین صاحب سے جنھوں نے اس قسم کے مسایل پر بہ تحقیق غور کیا تھا اکثر مشورے کرتے رہتے تھے جن کا حوالہ مکاتیب شبلی میں جا بجا ملتا ہے۔"[۱۱۴] علامہ شبلی کے استفسارات کے جواب میں مولانا فراہی نے جو خطوط ارسال کیے تھے وہ دستیاب نہیں ہیں اس لیے سیرت النبی شبلی میں افادات فراہی کی کمیت و کیفیت کا قطعی اندازہ لگانا مشکل ہے، تاہم مولانا فراہی کے نام علامہ شبلی کے خطوط سے یہ بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ انھوں نے مولانا فراہی سے کن مباحث میں علمی معاونت حاصل کی۔ وہ خاص خاص امور یا مضامین جن میں علامہ شبلی نے سیرت النبی کے سلسلے میں مولانا فراہی سے استفادہ کرنا یا ان کی تحقیقات سے فائدہ اٹھانا چاہا، مکاتیب شبلی کی روشنی میں یہ بیان کیے جا سکتے ہیں: حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح ہونے کے دلائل شواہد تورات سے، حضرت اسحاقؑ و حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں معلومات کتب سماوی سے،[۱۱۵] جاہلی شاعری سے دین حنیف کا ثبوت،[۱۱۶] — ازواج مطہرات سے متعلق بعض آیات کی تفسیر،[۱۱۷] — سورۂ برات کا زمانہ و شان نزول[۱۱۸] وادی مکہ کی

ان، تعمیر کعبہ، حج کعبہ، مسکن ابراہیم، مقام ابراہیم، مقام قربانی
یرہ کے بارے میں تحقیقات بالخصوص کتب مقدسہ (تورات
یل، زبور) کے اصل متن کے حوالے سے اور بعض انگریزی
ب و انسائیکلوپیڈیا سے ماقبل اسلام عرب کے بارے
ی جغرافیائی معلومات[20]۔

مولانا فراہی کی جانب سے ان استفسارات کے
ابات کی نوعیت یا ان کی قدر و قیمت کا اندازہ علامہ شبلی
، نام ان کے ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے جو ماہنامہ
راق لاہور کے خصوصی شمارہ مکاتیب فراہی نمبر (مرتبہ ڈاکٹر
رف الدین اصلاحی) میں شایع ہوا ہے[21]۔ علامہ شبلی کے
ستفسار (سورۂ احزاب کے حوالے سے ازواج مطہرات
ے متعلق بعض شرعی احکام کی وضاحت[22]) کے جواب میں مولانا
راہی کی یہ تحریر عربی میں ہے جو تقریباً ۶ صفحات میں پھیلی ہوئی
ہ۔ یہ اس موضوع پر ایک نہایت محققانہ بحث ہے جو نقلی و
لی دلائل سے پوری طرح مستحکم ہے۔ اس میں شروع میں
جین کے فرائض سے متعلق بعض شرعی احکام کی حکمتیں
ی زیر بحث آئی ہیں[23]۔ مزید براں مولانا فراہی سے علامہ
شبلی کے استفسارات کی روشنی میں سیرت النبی کے متعلقہ
احث اور مولانا فراہی کی تصانیف بالخصوص ان کے تفسیری
ا کا موازنہ و تجزیہ کیا جائے تو اس سے بھی سیرت النبی میں
دات فراہی کا حصہ متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے[24]۔ مثال
طور پہ حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح ہونے اور قربانی کی حقیقت و
وم سے متعلق سیرت النبی کے مباحث اور مولانا فراہی کی تصنیف
لرای الصحیح فی من ھو الذبیح[25] کے مشتملات کے موازنہ و
بلہ سے یہ بات واضح طور پہ سامنے آتی ہے کہ مذکورہ موضوعات
لامہ شبلی کی پوری بحث مولانا فراہی کی تحقیقات سے مستفاد
۔ اسی طرح سیرت النبی میں ایلاد، تخییر اور اعتزال کی بحثوں
ں مولانا فراہی کی تفسیر سورہ تحریم[26] کی جھلک صاف طور
نظر آتی ہے۔

سیرت النبی کی دو ہی جلدیں مکمل ہو پائی تھیں کہ علامہ شبلی
وفات پا گئے۔ اس کی بقیہ جلدیں مولانا سید سلیمان ندوی کے ہاتھوں
تکمیل کو پہنچیں۔ اس مرحلے میں بھی اس اہم کام میں مولانا فراہی کی
علمی معاونت جاری رہی۔ یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ اخیر
عمر میں علامہ شبلی کے سامنے جب یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا کہ اگر
وہ سیرت کے عظیم و جامع منصوبہ کو اپنی زندگی میں پورا نہ کر سکے
تو پھر اس کی تکمیل کیسے عمل میں آئے گی تو اس وقت اس
اہم کام کے لیے انھوں نے مولانا فراہی و مولانا سید سلیمان ندوی
کے نام پیش کیے۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ
علامہ شبلی نواب سلطان جہاں بیگم سے ملاقات
کے لیے بھوپال گئے۔ ملاقات کے دوران سیرت النبی کی تکمیل
کے لیے مزید مصارف کا ذکر آیا تو سرکار عالیہ نے اس کے لیے
بھرپور مالی تعاون کی یقین دہانی کرائی اور علامہ شبلی سے ان
کی گرتی ہوئی صحت دیکھ کر دریافت کیا کہ "آپ نہ رہے تو
پھر یہ کیسے پوری ہوگی"۔ اس پر علامہ شبلی نے برجستہ یہ جواب
دیا کہ "کتاب ضرور پوری ہوگی، میں نے دو آدمی تیار کر لیے
ہیں۔ حمید الدین اور سید سلیمان ندوی وہ پوری کر لیں
گے"[27]۔ اس کی مزید تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ
علامہ شبلی نے اپنی وفات سے قبل ان دونوں حضرات
کو یہ تلقین کی تھی کہ وہ سیرت النبی کو تکمیل تک پہنچائیں اور
اسے ہر کام پر مقدم رکھیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی
کے خود اپنے بیان کے مطابق "۱۲ (نومبر ۱۹۱۴ء) کی شام
کو مولانا حمید الدین بھی تشریف لائے جن کے لیے مولانا
ابتدا ہی سے منتظر تھے۔ ۱۷ کی صبح کو مجھے اور انھیں یاد
فرمایا، زبان مبارک سے تین مرتبہ سیرت، سیرت، سیرت
کہا اور پھر انگلی سے لکھنے کا اشارہ کر کے کہا کہ سب
کام چھوڑ کے"[28]۔ بعد میں دار المصنفین کے باقاعدہ قیام
کے بعد سیرت کی تکمیل کی ذمہ داری اصلاً مولانا سید سلیمان
ندوی کے سر رہی جسے انھوں نے بحسن و خوبی انجام دیا۔

ہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان تکمیلی مراحل میں بھی سیرت النبی ں افادات فراہی کا سلسلہ جاری رہا جب کہ خود سید صاحب نے بعض مقامات پر اس کا اعتراف کیا ہے۔ سیرت النبی جلد دوم کے طبع اول کے دیباچے میں محسنین کا اعتراف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: " ان اوراق کی تالیف میں ہم اپنے محسنوں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے ان کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹایا، مشکلات و غوامض میں مخدومنا مولانا حمید الدین صاحب کے مشوروں نے فائدہ پہنچایا ہے۔"[۷۹]

ان تفصیلات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دار المصنفین کے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے کے علاوہ مولانا فراہی نے اس کے کاموں میں دامے، درمے، قلمے وسخنے ہر طریقے سے اپنا تعاون دیا اور اس کی علمی وتحقیقی فضا کو پروان چڑھایا۔

دار المصنفین سے مولانا فراہی کے گہرے تعلق پر یہ امر بھی شاہد ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے ذاتی ذخیرۂ کتب کا ایک بڑا حصہ دار المصنفین کی لائبریری کی زینت بنا۔ یہ ذخیرہ اس اعتبار سے بہت قیمتی ہے کہ ان میں سے متعدد کتابوں پر (جو اُن کے زیر مطالعہ تھیں) ان کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے حواشی اور تائیدی یا تنقیدی نوٹس ہیں۔ یہاں یہ پیش نظر رہے کہ مولانا فراہی کا یہ معمول تھا کہ وہ جن کتابوں کو پڑھتے تھے ان پر حواشی ضرور لکھتے تھے۔ یہ قلمی حواشی نہ صرف متعلقہ کتابوں سے استفادے میں معاون ثابت ہوتے ہیں بلکہ مختلف موضوعات پر مولانا فراہی کے افکار وخیالات جاننے کا ذریعہ بھی ہیں۔ ان کی روشنی میں مولانا فراہی کی تحقیقات عالیہ اور علمی خدمات سے متعلق بہت سے مفید مقالے تیار ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء میں مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڑھ) میں منعقدہ امام فراہی سیمینار میں ناظم دار المصنفین مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے ایک مبسوط ووقیع مقالہ "رسایل ابن تیمیہ پر مولانا فراہی کے حواشی" کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ یہ مقالہ علامہ ابن تیمیہ کے رسایل کے دو مجموعوں (شایع شدہ مطبعہ حسینیہ، مصر، ۱۳۲۳ھ) میں شامل متعدد رسایل پر مولانا فراہی کے قلمی حواشی پر مبنی ہے[۸۰]۔ اس نوع کے کچھ اور مقالے ششماہی علوم القرآن (علی گڑھ) میں بھی شایع ہوئے ہیں اگرچہ وہ دار المصنفین کے بجائے بعض دوسرے علمی مراکز میں محفوظ ان کتابوں سے مستفاد ہیں جو مولانا فراہی کے زیر مطالعہ تھیں[۸۱]۔

دار المصنفین سے مولانا فراہی کی وابستگی کے ضمن میں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ مولانا فراہی کی متعدد تصانیف دار المصنفین یا اس کے متعلقین کے زیر اہتمام مطبع معارف اعظم گڑھ سے شایع ہوئیں، ان میں سورہ الذاریات، المرسلات، عبس، والتین، الفیل، الکوثر، اللھب واخلاص کی تفاسیر کے علاوہ اسباق النحو کے 'الرای الصحیح فی من ھو الذبیح'، جمہرۃ البلاغۃ اولین ایڈیشن شامل ہیں[۸۲]۔ مزید براں دار المصنفین نے مولانا کی معرکۃ الآراء تصنیف "الامعان فی اقسام القرآن" کو اپنے مصارف پر مطبعہ سلفیہ، قاہرہ سے ۱۹۳۰ء میں بڑے اہتمام سے شایع کیا تھا، اس پر مولانا سید سلیمان ندوی کا مبسوط مقدمہ بھی ہے جس سے مولانا فراہی کی حیات و خدمات کے بارے میں بڑی مفید معلومات فراہم ہوتی ہیں یہ واضح رہے کہ مولانا فراہی کی اب تک کی مطبوعات میں یہ اولین کتاب ہے جو کسی عرب ملک سے بھی شایع ہوئی ہے۔

مولانا فراہی اور دار المصنفین کی نسبت سے آخر میں یہ وضاحت بے موقع نہ ہوگی کہ دار المصنفین سے شایع شدہ متعدد کتابوں سے مولانا فراہی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور علمی کارناموں سے متعلق جو مستند وقیمتی مواد فراہم ہوتا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا۔ اس ضمن میں مکاتیب شبلی، مقالات شبلی (جلد اول ودوم)، حیات شبلی (مصنفہ سید سلیمان ندوی)

اور حیات سلیمان (مصنفہ شاہ معین الدین ندوی) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا فراہی کے افکار و خیالات کی اشاعت اور ان کی تصانیف کے تعارف میں دارالمصنفین کا ترجمان ماہنامہ معارف جو خدمت انجام دیتا رہا ہے، اسے بھی کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس موقر رسالے کے توسط سے مولانا فراہی کی تصانیف اور ان کے اردو تراجم سے اہل علم کو متعارف کرانے میں اس کے موجودہ مدیر محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی خدمات بہت اہم رہی ہیں۔

# حواشی

لے تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں خاکسار کا مقالہ "مولانا حمید الدین فراہی" مشمولہ "علامہ حمید الدین فراہی — حیات و افکار" (مقالات فراہی سیمینار) انجمن طلباء قدیم مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء، ص ۳۷ - ۵۴

سے ان اداروں سے مولانا فراہی کی وابستگی کی تفصیلات کے لیے دیکھیں مختصر حیات حمید الدین (مرتبہ عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی) دائرہ حمیدیہ، سرائے میر، ۱۹۷۳ء، ص ۲۱ - ۳۸ اور ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی معارف، فروری ۱۹۹۱ء، ص ۹۱ - ۱۰۵

سے سید سلیمان ندوی، حیات شبلی - مطبع معارف، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء، ص ۶۸۸ - ۶۹۰

سے مکاتیب شبلی، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۲۷ء، ۲/ ۲۴۸، حیات شبلی، ص ۶۹۰ - ۶۹۱

ھے مکاتیب شبلی ۱/ ۲۰۸ - ۲۱۰، ۲۴۸، ۲/ ۱۱۶ - ۱۱۷؛ حیات شبلی، ص ۶۹۴ - ۶۹۵

لے مکاتیب شبلی، ۱/ ۲۰۹ - ۲۱۰/ ۲/ ۵۳ - ۵۴، ۱۱۶ - ۱۱۷، حیات شبلی ص ۶۹۷

کے مکاتیب شبلی: ۲/ ۵۴ - اس خط میں جس وقف نامہ کے تقیضیے کی طرف اشارہ ہے وہ دار المصنفین کے لیے علامہ شبلی کے خاندان کے مکان و جائداد کے وقف سے تعلق رکھتا ہے۔

شے مکاتیب شبلی: ۲/ ۱۳۵؛ نیز دیکھیے حیات شبلی، ص ۶۸۷ - ۶۸۸

ؤے حیات شبلی، ص ۶۹۳ - ۶۹۴، مکاتیب شبلی: ۱/ ۲۰۸

نلے مکاتیب شبلی: ۲/ ۱۳۱، ۱۴۰، حیات شبلی، ص ۶۹۷

للے حیات شبلی، ص ۶۸۹، مختصر حیات حمید، ص ۱۶ - ۱۷، شاہ معین الدین ندوی، حیات سلیمان مطبع معارف ۱۹۷۳ء، ص ۹۶ - ۱۰۱

للے سید سلیمان ندوی، یاد رفتگان، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۴ - ۱۲۵، محمد امین زبیری مارہروی حیات سلطانی، عزیزی پریس، آگرہ، ۱۹۳۹ء - ص ۱۴۱، حیات سلیمان ص ۹۷

سلے مختصر حیات حمید (مقالہ سید سلیمان ندوی) ص ۱۶، شاہ معین الدین ندوی، حیات سلیمان، ص ۹۷

سلے مولانا فراہی علامہ شبلی کے ماموں زاد بھائی تھے

ھلے حیات شبلی، ص ۲۰۷

لٹلے مکاتیب شبلی: ۲/ ۳۸ - ۳۹، ۴۱ - ۴۲، ۴۴، ۴۵، ۴۸ - ۴۹

۱۷ـ مکاتیب شبلی ۲/ ۴۲ - ۴۳

۱۸ـ مکاتیب شبلی ۲/ ۳۷، ۳۸، ۴۵ — ۴۶، ۴۷

۱۹ـ مکاتیب شبلی: ۲/ ۵۱ - ۵۲

۲۰ـ مکاتیب شبلی ۲/ ۳۱، ۴۰، ۴۱، ۴۳، ۴۹ - ۵۰

۲۱ـ شائع شدہ مئی ۱۹۹۲ء (جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۵)

۲۲ـ مکاتیب شبلی: ۲/ ۳۷ - ۳۸

۲۳ـ ماہنامہ اشراق، مئی، ۱۹۹۲ء، ص ۲۲ — ۵۵ (مکتوب نمبر ۲۲)

۲۴ـ اس نوع کے ایک عالمانہ و محققانہ مطالعہ کے لیے دیکھیے ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی "سیرت النبی شبلی میں فکرِ فراہی"، علامہ حمید الدین فراہی ـ حیات و افکار (مقالات فراہی سیمینار)، محولہ بالا، ص ۴۱۶ — ۴۱۴

۲۵ـ مطبوعہ مطبعۃ معارف اعظم گڑھ، ۱۹۱۹ء ـ اردو ترجمہ: ذبیح کون ہے (از مولانا امین احسن اصلاحی)، دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڑھ (بدون تاریخ)

۲۶ـ مطبوعہ مطبعۃ فیض عام، علی گڑھ، ۱۹۰۸ء، اردو ترجمہ (از مولانا امین احسن اصلاحی) مشمولہ تفسیر نظام القرآن، دائرہ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڑھ ۱۹۹۰ء

۲۷ـ حیات سلطانی، محولہ بالا، ص ۱۴۱

۲۸ـ حیات شبلی: ص ۷۲۵

۲۹ـ سیرت النبی (مولفہ سید سلیمان ندوی) مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۴ء ۳/ ۱

۳۰ـ اس مقالہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں "علامہ حمید الدین فراہی ـ حیات و افکار" (مقالات فراہی سیمینار)، محولہ بالا، ص ۱۸۶ - ۲۲۲

۳۱ـ ملاحظہ فرمائیں؛ مولانا سلطان احمد اصلاحی "مولانا فراہی کے غیر مطبوعہ قرآنی حواشی"۔ علوم القرآن: ۵/ ۱، جنوری ـ جون ۱۹۹۰ء: ص ۵۰ - ۶۹، ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی، "مولانا فراہی کے قلمی حواشی الاتقان فی علوم القرآن پر" ۱/ ۱ جولائی ـ دسمبر ۱۹۸۵ء ص ۶۷ - ۱۲۴

۳۲ـ ان کتابوں کی تفصیلاتِ اشاعت راقم کی مرتب کردہ "کتابیات فراہی" (ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء، ص ۳۲ - ۳۷) میں دیکھی جاسکتی ہیں ـ

# فیشن کی اندھی پیروی

محمد مختار اصلاحی علیگ *

اردو نے اور زبانوں کی طرح انگریزی سے بھی کچھ الفاظ مستعار لیے ہیں، انھیں میں یہ لفظ "فیشن" بھی ہے جس کے معنی وضع قطع، رسم و رواج، طرز طریقہ اور آرائش و زیبائش کے ہیں۔

فیشن کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے۔ کچھ لوگ تو اس کی ابتدا آدم و حوا سے کرتے ہیں کیونکہ انھیں بھی تن ڈھانکنے کے لیے پتوں کا سہارا لینا پڑا تھا لیکن اگر آپ اسے ایک فطری ضرورت سمجھتے ہیں اور فیشن نہیں مانتے تو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب سے انسانی تہذیب و تمدن کی بنیاد پڑی ہے، اسی وقت سے فیشن بھی بڑی آب و تاب کے ساتھ جلوہ نما ہے۔ ہر قوم، ہر ملک اور ہر علاقے کا فیشن بھی جداگانہ ہے۔ ہر خطے کے لوگ اپنے اپنے فیشن کے ذریعے دور ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔

فیشن میں اچھائی بھی ہے اور برائی بھی۔ جو فیشن خوش گوار تبدیلی لائے جو نئے ڈھنگ اور سلیقے سکھائے، جو تعمیر و ترقی کی نئی راہیں بتائے، اسے اچھا کہا جائے گا اور جو فیشن صرف اندھی تقلید کی دین ہو اور اس میں کوئی فائدہ نہ ہو، جو بے حیائی، بے غیرتی، آوارگی و بدچلنی پر اکسائے اور جو گھر پھونک کر تماشہ کرے وہ نہایت برا ہے۔

فیشن تیز آندھی اور طوفان کی طرح ہے۔ جس طرح آندھی کمزور درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے، اسی طرح سادہ لوح، اعتقاد کے کمزور اور ڈانوا ڈول قسم کے لوگ نہایت آسانی سے فیشن کی زد اور لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ جو لوگ اپنے حالات کو سامنے رکھ کر اور سوچ سمجھ کر کوئی فیشن اپناتے ہیں ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن جو لوگ آنکھ بند کر کے کسی فلمی مسخرے وبہروپیے کی نقل میں یا کسی فیشن پرست ملک کی اندھی تقلید میں فیشن اختیار کرتے ہیں وہ خود بھی نقصان اٹھاتے ہیں اور سماج کے لیے بھی پریشانی و رسوائی کا باعث بنتے ہیں۔ دور کیوں جائیے اپنے ہی یہاں دیکھیے کچھ دنوں پہلے بچیوں کے سر پر اوڑھنیاں اور عورتوں کے سر پر دوپٹے پابندی سے رہا کرتے تھے۔ لباس ڈھیلے ڈھالے صاف ستھرے اور حیا و شرم کے محافظ ہوا کرتے تھے، نہ اس میں کوئی قباحت تھی اور نہ کوئی فتنہ، لیکن نہ جانے فیشن کی کون سی لہر اور کہاں سے آئی کہ سر سے دوپٹے اتر گئے، ڈھیلے ڈھالے آرام دہ لباس کو پھینک کر تنگ، چست اور تکلیف دہ لباس زیب تن کیے گئے۔ کوئی ان فیشن کے

* اصلاحی دواخانہ، محمد علی روڈ، بمبئی۔

دوں سے پوچھیے کہ سر سے دوپٹے اتارنے کا آپ کو کیا فائدہ ملا؟ تمام ماہرینِ طب اس بات پر متفق ہیں کہ جو سر ڈھکا رہتا ہے وہ عموماً سردی و گرمی کی آفتوں سے محفوظ رہتا ہے لیکن کھلے سر والے خاص طور سے موسم کی تبدیلی کے وقت بہت سی دماغی و اعصابی بیماریوں میں آسانی سے مبتلا ہو جاتے ہیں۔ سر کھول کر بہت سی بیماریوں کو دعوت دینا کہاں کی عقل مندی ہے؟

اسی طرح چست و تنگ لباس کو لیجیے اس کو پہن کر اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا سب دشوار ہو جاتا ہے۔ تنگ کپڑوں میں ہوا کا گزر نہ ہونے کی وجہ سے خارش، کھجلی، داد، اکزیما اور نہ جانے کتنی جلدی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ اعضا جن کو چھپانے کے لیے تمام مذاہب نے سخت تاکید کی ہے وہ بھی ظاہر ہو جاتے ہیں اور اس سے بے شرمی اور بدچلنی کو راہ ملتی ہے۔ غرض کہ تنگ، چست لباس میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ ایک بچی اپنی ماں کے ساتھ میرے مطب میں آئی۔ اس کی پنڈلی کے اوپری حصے میں ایک سفید داغ تھا۔ ماں کی یہ خواہش تھی کہ ایک نظر آپ اسے دیکھ لیں تاکہ مرض کا صحیح اندازہ ہو جائے لیکن بچی اتنی چست ازار پہن کر آئی تھی کہ کوشش کے باوجود وہ اوپر نہ چڑھ سکی۔ بالآخر ماں نے جھنجھلا کر قینچی منگوائی اور بچی کی نئی ازار کو اپنے ہاتھ سے کاٹا تاکہ سفید داغ کو دکھلا کر مرض کی صحیح تشخیص کرا کے اپنا اطمینان کرے اس حیرانی، پشیمانی اور نقصان سے بچی کو سبق ملا۔ دوبارہ جب مطب میں آئی تو اس کی ازار کے پائنچے ڈھیلے تھے۔

آج کے بہت سے مردوں کا حال بھی عورتوں سے کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ عرصہ ہوا سر سے ٹوپی اتر چکی ہے ان کے ہپی نما بال ان کی بدحواسی و ہیجانی کیفیاتِ حالی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ چست، تنگ اور تکلیف دہ لباس انھیں بھی پسند ہے۔ ابھی تک تو لمبی قمیص اور کرتے ان کی آبرو کو ڈھانکے ہوئے تھے اب چھوٹی سی "بش شرٹ" اور "ٹی شرٹ" نے آ کر سب کچھ اس طرح کھول کر رکھ دیا ہے کہ لباس کا کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہا۔ حد یہ ہے کہ جب اس ہیئت کذائی سے بے حیا عبادت گاہوں میں جاتے ہیں تو باغیرت لوگوں کی آنکھیں شرم سے نیچی ہو جاتی ہیں۔

عورتوں اور مردوں کے لباس ان کی ضروریات اور حالات کے تحت بنائے گئے ہیں تاکہ کسی کو بھی کوئی زحمت پیش نہ آئے لیکن اب اس اندھی فیشن پرستی کو کیا کہیے؟ کہ لڑکیاں لڑکے بننا چاہتی ہیں اور لڑکے لڑکیوں کا روپ اختیار کرنا پسند کرتے ہیں اور یہ تبدیلی دونوں میں کسی کے لیے بھی مناسب نہیں بلکہ دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔

آفات و حادثات کی طرح فیشن کی لہریں و موجیں بھی آتی جاتی رہیں گی، ان پر پابندی لگانا اور ان کو روک دینا اپنے بس و اختیار میں نہیں ہے۔ جب آندھی آتی ہے تو آپ اپنے گھر کی کھڑکیاں بند کر لیتے ہیں تاکہ گرد و غبار سے محفوظ رہیں جب کوئی طوفان آتا ہے تو اس کے نقصانات سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح اچانک جب کوئی وبا آجاتی ہے تو اس کی روک تھام کے لیے ہر ممکن تدابیر اختیار کرتے ہیں بالکل اسی طرح اگر آپ فیشن کی اس آندھی اور وبا سے بھی بچنے کی ممکنہ کوشش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں آپ کو کامیابی حاصل نہ ہو۔ فیشن اپنے دامن میں ہر طرح کی رعنائیاں لے کر آتا ہے اس میں امرت بھی ہے اور زہر بھی۔ امرت کو لے لیجیے اور زہر کو چھوڑ دیجیے۔

# کون سا ذریعہ تعلیم مناسب ہے

محمد اسحاق ★

اخبار "سیاست" میں "آپ کے کالم" کے تحت ایک نہایت ہی مفید بحث "مسلم طلبا کس ذریعے تعلیم سے استفادہ کریں"؟ دیکھنے میں آئی۔ اس میں مسٹر ایم۔ اے۔ سلیم کا تفصیلی جائزہ نظر سے گزرا۔ یہ عنوان ذرا تشنہ طلب ہے کیونکہ طلبا کے اختیار میں نہیں کہ وہ کس ذریعے تعلیم سے استفادہ کریں یہ تو والدین کا کام ہے وہ جہاں بچوں کو شریک کروادیں بس وہ اسی کے ہو کر رہ گئے۔ دوسرے یہ کہ مسئلہ صرف مسلم طلبا کا نہیں ہے بلکہ بنیادی تعلیمی ہمہ گیر مسئلہ ہے۔ بچے کے لیے کون سا ذریعہ تعلیم مناسب ہے؟

"بچہ مادری زبان ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے۔" (ذاکر حسین) یہ زبان ماں کے دودھ کے ساتھ ساتھ بچے کے جسم و جان کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہ فطرت کی ایک دین ہے۔ ہر بچہ مادری زبان جس تیزی کے ساتھ ابتدائی عمر میں سیکھتا ہے، باقی ساری عمر کوئی اور زبان اس تیزی کے ساتھ نہیں سیکھ پاتا۔ ابتدا میں تو وہ چیزوں کو دیکھتا ہے اور پھر ان کے نام سے واقف ہوتا ہے۔ پانی، روٹی، انڈا، اشیاء کا مشاہدہ اور زبان کی علامت کے بعد اس نام کے ساتھ نہ صرف اس کی ماہیت بلکہ خصوصیات سے بھی وہ واقف ہو جاتا ہے بلکہ وہ مٹھائی کے نام سے اس کے مزہ کا بھی احساس کرنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ غیر مشاہد باتوں کو بھی سمجھ جاتا ہے جس کا تعلق سماج میں اقدار تہذیب و روایات سے ہوتا ہے۔ سچ، جھوٹ، ہمدردی، محبت، دھوکا وغیرہ ایسی بہت سی باتیں ہیں جن کا تعلق لوگوں کے عمل سے ہوتا ہے، پھر وہ رفتہ رفتہ زبان کی نزاکتوں اور لطافتوں، شعر و شاعری، ادب سے واقف ہو جاتا ہے۔ اگر اس میں صلاحیت ہو تو ادب کے مختلف شعبوں میں وہ کمال پیدا کرتا ہے ان سارے مراحل کے طے کرنے میں بچہ کو بڑا ہونے تک کوئی خاص پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی اور نہ جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے سارے ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ بچے کی تعلیم صرف مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ اگر یہ ماہرین تعلیم اس بات پر متفق بھی نہ ہوتے تب بھی ہر صاحب فہم کا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ مادری زبان ہی میں تعلیم نہایت آسان طریقے پر اور موثر طور پر دی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد کوئی اور ذریعہ تعلیم لیا تصنعی اور مصنوعی رنگ میں ہوتی ہے۔ اس ذریعہ تعلیم کی قیمت مارکیٹ میں کتنی ہی اونچی ہو۔ اس کی ایک بنیادی

★ الجبیل، سعودی عرب

وجہ یہ ہے کہ ہر زبان کی گود اس قوم کی تہذیب، روایات، مذاق، کلچر اور شائستگی سے مالامال ہوتی ہے جو اس زبان کی نصابی کتاب میں صاف نظر آتی ہیں۔ تلگو کی کتاب میں رام سیتا کے قصے، دیو مالائی کہانیاں ضرور ہوں گی۔ ان کتابوں میں ہارون رشید کے دربار کے قصے، مولانا روم کی کہانیاں شیخ سعدی کے لطیفے ڈھونڈنا عبث ہے۔ اسی طرح انگریزوں کی قدامت پسندی گہری حس مزاح، طور طریقے اور ان کی مجلسی زندگی کا عکس انگریزی کتابوں میں ضرور ہوگا۔ بعض باتیں اور جملے ان کتابوں میں عجیب وغریب معلوم ہوں گے جیسے۔ Pig ع، B۔ یہ جملہ اپنے ماحول اور مذہبی رنگ سے بہت غیر مانوس ہے۔ ایک زمانے میں A سے Apple دیہات کے بچے پڑھتے تھے اور سیب کی شکل وصورت اور اس کے مزے سے کوئی واقف نہیں تھا بچے تو کیا ان کے بڑوں نے بھی سیب نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے بی۔ اے کے کورس میں ایک مضمون "سر راجر ڈی کاورلی" (Sir Roger D. Coverley) تھا، اس میں ایک جملہ یہ تھا کہ فیشن کئی مرتبہ بدلتا گیا لیکن اس سر راجر (نائٹ یا نواب) کا کوٹ نہیں بدلا۔ ہم اس زمانے میں یہ سوچتے رہ گئے کہ آخر فیشن کیا چیز ہے اور اس کوٹ کے نہ بدلنے کی کیا اہمیت ہے جب کہ ہندوستان میں کوٹ کسی کو نصیب نہیں گویہ بات آسانی سے حلق سے نہیں اترتی تھی لیکن یہ جملہ ہر امتحان میں حوالہ متن کے تحت پوچھا جاتا۔ یہ بات کچھ ایسی ہی ہے جسے اکبر الہ آبادی نے بہت خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

تقریہ منصور سارا سن کے بولی شوخ مس
کیسا جاہل لوگ تھا، پاگل کو پھانسی کیوں دیا

اس شوخ مس کا کوئی قصور نہیں وہ لاکھ کتابیں پڑھ جائے فلسفۂ وحدت الوجود، اس کی اہمیت، مذہبی روایات و عقاید تک نہیں پہنچ سکتی۔ جو بات اس شوخ مس کے لیے مشکل ہے وہ ہر اس بچے کے لیے مشکل ہے جو اپنی مادری زبان کے سوا کسی اور زبان کے ذریعے تعلیم پاتا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب اصل مسئلہ کی طرف آیئے۔

اردو ذریعہ تعلیم کے مسئلے کو حقائق کی دنیا میں سوچنا سمجھنا چاہئے ملک کی تقسیم کے ساتھ زبان کی بھی تقسیم ہوگئی۔ اردو پاکستان کی اور ہندی ہندوستان کی سرکاری اور قومی زبان بن گئی۔ سرکار کی زبان کا اثر سارے ملک اور لوگوں پر پڑا ہے چاروناچار لوگ قومی اور سرکاری زبان سیکھنے پر مجبور ہیں جو نہیں سیکھیں گے وہ سخت گھاٹے میں رہیں گے۔ یہ بات نہیں کہ ہم اردو کو نہیں چاہتے بلکہ ہماری آئندہ نسلوں کو اس ملک میں سب کے ساتھ رہنا، بسنا اور جینا ہے تو ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے جہاں یہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا دشوار ہو چکا ہے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ریاستی (مقامی)، قومی اور انگریزی زبانوں کی اہمیت پر سرسری نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

دستور ہند میں ریاستی زبانوں کو تسلیم کرلیا گیا ہے ہر ریاست کے لوگ اپنی زبان کو ترقی دینے کے لیے دل وجان سے لگ گئے ہیں اور مقامی زبانوں کو یونیورسٹی کی سطح تک پہنچا چکے ہیں۔ مقامی زبان ہر ایک کو سیکھے بغیر چارہ نہیں کیوں کہ یہ سرکار کی دفتری زبان ہے۔ اس زبان کو سیکھنا ہی نہیں بلکہ اردو داں طبقہ کو اس میں مہارت بھی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندی چوں کہ قومی زبان ہے۔ سینٹرل گورنمنٹ کے ہر شعبے میں اس کا سکہ چلتا ہے۔ ہندی کا اثر غیر محسوس طریقے پر آپ ہر جگہ محسوس کریں گے۔ اس زبان کے دباؤ کے خلاف جنوبی ہند کی ریاستیں احتجاج بھی کرتی آئی ہیں لیکن اس کے باوجود ہندی سیکھے بغیر کام نہیں چلے گا۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی کے ذریعہ ہندی زبان کا پرچار صبح شام چلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اردو کے ڈرامے کہانیاں مشاعرے سب ہندی کے نام سے نشر ہوتے ہیں۔ اردو کے بہت سے

الفاظ اب ہندی میں بے تکلف جذب ہو چکے ہیں، جیسے خود اردو میں بہت سے الفاظ ہندی کے ہیں۔ اب اردو کا حاشیہ سکڑتا جا رہا ہے۔ ممتاز دانشور جناب ہاشم علی اختر کے مطابق یہ اب "کانوں کی زبان" بن کر رہ گئی ہے۔ بول چال میں عام ہے لیکن لکھنے اور پڑھنے سے موجودہ نسل دور ہوتی جا رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ یو۔پی میں اردو کے پرچوں کے جوابات طلبا دیوناگری رسم الخط میں لکھتے ہیں۔ موصوف کا یہ بھی خیال ہے کہ جب اردو کسی اور طرح زندہ نہیں رہ سکتی ہے تو کیوں نہ موسم کے لحاظ سے اس کا لباس بدل دیا جائے۔ یہ مسئلہ رسم الخط کا ہے جو نازک اور حساس ہے جس کے بہت دور رس نتائج نکلیں گے۔ لیکن کوئی مانے یا نہ مانے آج سے پچاس برس بعد اردو کے پڑھنے لکھنے والے خال خال ہی رہ جائیں گے۔

انگلش میڈیم کے اسکولوں کی بہتات کچھ تو تجارتی اغراض کی وجہ سے ہے اور کچھ انگریزی زبان کی مسلّمہ اہمیت کی وجہ سے ہے۔ تعلیم ویسے آج کل انڈسٹری میں تبدیل ہو چکی ہے۔ تاجر وہی مال مارکیٹ میں لائے گا جس کی مانگ زیادہ ہے۔ یہ کہنے کو تو بہت اچھی بات ہے کہ ہمارے مذہب و ثقافت کا اصل سرمایہ اردو زبان میں محفوظ ہے اس لیے اردو داں اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکول میں پڑھائیں لیکن اکثر کہنے والے بھی اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں ہی میں پڑھاتے ہیں۔

انگریزی زبان کی اہمیت ایک تو بین الاقوامی زبان ہونے کی وجہ سے، دوسرے یہ سائنس، ٹکنالوجی، میڈیکل انجینیرنگ سب اعلیٰ فنی علوم کا مخزن بھی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگریزی زبان میں مہارت حاصل کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ دنیا کی اور زبانوں کے مقابل سب سے کم ۲۶ حروف تہجی ہیں اور کوئی اچھی کتاب، مقالہ، ریسرچ کا کام دنیا کی کسی زبان میں شائع ہو جائے اس کا مستند ترجمہ پندرہ دن کے اندر اندر انگریزی میں آپ کو مل جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن نے انگریزی کو "لائبریری زبان" کے نام سے اس کو مستقل حیثیت دی ہے۔

جب ہندوستان آزاد ہوا تو چند ہندی پریمیوں کا وفد ہندوستان کے مشہور روڑکی انجینرنگ کالج کے پرنسپل کے پاس پہنچا اور مطالبہ کیا کہ کالج میں ہندی میڈیم جلد سے جلد جاری کر دیں۔ پرنسپل اس کا کوئی جواب دیے بغیر اس وفد کو کالج کی لائبریری ہال میں لے گئے جہاں فرش تا چھت ہزاروں کتابیں الماریوں میں لگی ہوئی تھیں اور کہا کہ آپ ان سب کا ہندی میں ترجمہ کر دیجیے پھر ہندی میڈیم شروع کیا جا سکتا ہے لیکن یاد رکھیے کہ ان سب کتابوں کے ترجمے کے لیے پچاس برس بھی کافی نہیں ہوں گے اور اس عرصے میں اس سے زیادہ کتابوں کا انبار لگ جائے گا۔ ہندی پریمی ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔

انگریزی زبان کے الفاظ دوسری ساری زبانوں میں اتنے عام ہو چکے ہیں کہ اب ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم انگریزی الفاظ بے تحاشہ استعمال کرتے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر سائیکل ہی کو لیجیے۔ دیکھیے اس میں کتنے اردو کے اوزار ہیں — ٹائر، ٹیوب، رم، چین، سیٹ، کیریر، ہینڈل، پیڈل، ہب، اسٹینڈ، فریم، والو، ربر، بریک۔ یہ سب انگریزی الفاظ ہیں۔ ہو سکتا ہے اردو کے چھرے اور گھنٹی ہوں۔ ڈنڈا تو تلگو ہے۔ کسی ماہر لسانیات کو صرف والو، اسٹینڈ اور بریک کا ترجمہ اردو میں کرنے کے لیے کہیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کتنی پریشانی ہے۔ کسی صاحب نے ٹرین کا ترجمہ "تخت رواں" کیا تھا، لیکن لوگوں کی زبان پر ٹرین اور ریل ہی چلتی رہی۔

لوگ اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں نہیں شریک کرواتے، کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ ان اسکولوں کا رزلٹ ہر سال وہی تین چار فی صد رہتا ہے۔ ایسا حال کیوں ہو گیا ہے۔ ان وجوہات پر آئے دن ہر جگہ بحث ہوتی رہتی ہے لیکن ان باتوں کو دہراتے رہنے سے نہ تو ہم وقت کے دھارے کو موڑ سکتے ہیں اور نہ حالات پر قابو پا سکتے ہیں۔ ان حالات میں ہمارے لیے کون سا لائحۂ عمل مفید ہو سکتا ہے اسی پر سنجیدگی سے غور کرنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

مسلمان طلبا ہوں یا اور کوئی لسانی اقلیت ہو، انھیں چار زبانی فارمولا اختیار کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے ہندی کے علاقے کے لوگوں کے لیے یہ دو زبانی فارمولا ہے، کیونکہ یہ مادری زبان ہے، ریاست کی زبان ہے اور قومی زبان ہے۔ انھیں صرف ایک نئی زبان انگریزی سیکھنی ہے جن لوگوں کی مادری زبان علاقائی زبان ہے ان کے لیے ہندی اور انگریزی سیکھنا ہوگا۔ یہ سہ لسانی فارمولا ہوگا۔ اردو کے طلبا کو، مادری زبان اردو، علاقائی زبان (تلگو) قومی زبان (ہندی) بین الاقوامی زبان انگریزی سیکھنا ضروری ہے۔ یہاں پر ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ بچہ دو چار زبانیں بارہ برس کی عمر تک نہایت آسانی سے سیکھ جاتا ہے ان پر کوئی زبان بوجھ نہیں بلکہ بوجھ اس وقت بن جاتی ہے جب کہ خاندان کے بڑے لوگ آپس میں دوسری زبانوں کا تذکرہ حقارت سے کرنے لگتے ہیں۔ بچوں میں غیر محسوس طریقے پر اس زبان کے خلاف تعصب آ جاتا ہے۔ اس زبان کے سیکھنے سے دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ اب وہ یہ زبان امتحان کی خاطر پڑھتا ہے لیکن انگریزی زبان کی اہمیت سے وہ ناواقف ہے۔ دیکھیے وہ کس شوق سے انگریزی زبان سیکھتا ہے۔

مکتب میں پہنچ چکی ہے۔ مساجد کے اراکین قابلِ مبارکباد ہیں کہ وہ محلے اور قصبے کے بچوں کو عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو ذریعۂ تعلیم سے ابتدائی جماعتوں کا بھی انتظام کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یو۔پی کی دینی تعلیمی کونسل نے گزشتہ تیس چالیس برس میں جو کام کیا ہے وہ سارے مسلمانوں کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ اس کونسل نے سارے صوبے میں پانچویں جماعت تک کے اسکولوں کا خانگی طور پر جال بچھا دیا ہے جہاں پر مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو میڈیم میں پانچویں جماعت تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان طلبا کو ہندی میڈیم سرکاری اسکولوں میں چھٹی جماعت سے شریک کروا دیا جاتا ہے۔ بچے کی ابتدائی عمر میں مادری زبان میں تعلیم کی وجہ تعلیم کی مضبوط بنیاد قایم ہو جاتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو بچہ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم حاصل کرتا ہے وہ دوسری زبانیں بہت تیزی کے ساتھ سیکھتا ہے اور پھر اپنے دین و ایمان سے یہ طلبا آگے چل کر اجنبی نہیں ہو جاتے۔

مختصر یہ کہ ہم ہوش و حواس اور بے جا تعصب کو ختم کر کے اپنے بچوں کو علاقائی، قومی اور انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنے کی ترغیب دیں اور اپنی مادری زبان کے تحفظ کے لیے حکومت سے زیادہ خود اپنی تنظیموں پر بھروسہ کر کے پانچویں جماعت تک کے اردو میڈیم اسکول قایم کریں۔ پھر اس کے بعد سب دروازے کھلے ہیں۔ خود مسلم تنظیمیں انگریزی میڈیم نہیں بلکہ علاقائی زبانوں میں بھی اپنے اسکول کھول لیں تو اچھا ہے۔

# ایک جاگیردار خاندان کی باشعور اور روشن خیال لڑکیاں

آخری قسط

ریاض الرحمٰن خاں شروانی ★

زاہدہ خاتون نزہت کے تعلقات انیسہ خاتون سے زیادہ گہرے اور بے تکلفانہ تھے۔ وہ انھیں بیشتر ایسے القاب لکھتی تھیں جیسے عزیز از جانم، میری دل و جان کی مالک انیسہ، میری جان انیسہ، جان سے بھی شاید کچھ زیادہ پیاری انیسہ، ڈیرسٹ، جان من، بہت پیاری انیسہ اور جانِ نزہت۔ نزہت طبعاً شاعرہ تھیں اور ان کی شاعرانہ طبیعت ان القاب کے پردے میں سے صاف اپنا جلوہ دکھائی نظر آتی ہے۔ اس کی شہادت ملتی ہے کہ اپنے بہن بھائی اور کزنس میں شاعری کے جراثیم پیدا کرنے میں زیادہ تر ان ہی کا ہاتھ تھا۔ پیش نظر خطوط میں، جن کے اقتباسات آگے آئیں گے، انھوں نے جس طرح انیسہ خاتون صاحبہ کو شعر کہنے اور نثر لکھنے پر اُبھارا ہے، ان کی جس طرح ہمت افزائی اور کبھی کبھی چشم نمائی کی ہے اس سے اس کا وافر ثبوت ملتا ہے۔ انیسہ خاتون صاحبہ (جو بعد میں انیسہ ہارون شروانیہ ہوئیں) نے اپنے مجموعۂ کلام انیسیات کا "انتساب" ز۔ خ۔ ش مرحومہ کے نام کیا ہے اور اس ضمن میں لکھا ہے، "یہی وہ جنتی حور تھی جس کے فردوسی نغمات نے طفولیت ہی میں اپنے ہم عمر رفیقوں کو شعر و شاعری سے روشناس کیا۔" شاعرہ ہونے کی بنا پر نزہت فطری طور پر غم پسند بھی تھیں اور چھوٹے چھوٹے گھریلو حادثات و واقعات انھیں بہت متاثر کرتے تھے۔ ان [illegible] ان میں قومی درد اور ملی جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جس کا اظہار وہ مختلف عناوین سے کرتی تھیں۔ اس کا ایک پہلو اکابر ملت کے ساتھ ان کا جذبۂ عقیدت و انسیت بھی تھا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، ١٩١٦ء میں لائق اور محبوب بھائی احمد اللہ خاں حیراں کی وفات نے ان کی اور ان کی بڑی بہن احمدی بیگم نکہت کی زندگیوں کا رُخ ہی بدل دیا اور اب ان کی غمگین فطرت دو آتشہ ہو گئی۔ پھر ١٩١٨ء میں انیسہ خاتون کے بھائی محمد انس خاں آبد بھی راہیٔ ملک بقا ہوئے اور وہ بھی رنج و حزن میں ان بہنوں کی شریک و سہیم ہو گئیں۔ اسی لیے ہم دیکھیں گے کہ ز۔ خ۔ ش کے ١٩١٦ء سے پہلے اور ١٩١٦ء کے بعد کے خطوط کا رنگ و آہنگ جدا جدا ہے۔ ہمیں ان کے جو خطوط دست یاب ہوئے ہیں ان میں کچھ ابتدائی خطوط ایسے ہیں جن پر تاریخ و سنہ درج نہیں ہے لیکن سوادِ خط اور عبارت سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ابتدائی عمر سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں کوئی قابل ذکر بات بھی نہیں ہے۔ ان میں ایک خط منظوم ہے جو شاعری کے ابتدائی دور مشق سے تعلق رکھتا ہے اور اس لیے نزہت کی شاعری کا جو رنگ بعد میں نمایاں ہوا

---

★ سابق صدر شعبۂ عربی، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر۔ حبیب منزل، مریس روڈ، علی گڑھ

اس سے عاری ہے۔ پھر بھی اس میں جذبۂ الفت وانسیت کی فراوانی
ہے اور ایک شعر سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی ان کے گھر میں
ان کی نظم گوئی کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ یہ شعر ہے

خط لکھتی ہوں منظوم تو کیا عیب ہے اس میں
کیوں ہم پہ ملامت ہے لگاتار انیسہ

البتہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۰ء تک کے خطوط کئی اعتبار سے، جن کی تفصیل آگے آئے گی، اہم ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں انیسہ خاتون صاحبہ کی شادی اپنے عم زاد ہارون خاں شروانی (بعدہ، پروفیسر، ڈاکٹر، پدم بھوشن) کے ساتھ ہوئی اور ۱۹۲۲ء میں نزہت کی وفات ہوگئی۔ سلام ہے نام اللہ کا۔

۱۹۱۱ء کے ایک خط میں لکھتی ہیں: "ایک بات کی (جس کی بابت میں ہمیشہ تقریراً و تحریراً تم کو سمجھاتی ہوں) پھر یاد دہانی کرتی ہوں "شاعری" قومی خدمت کا اعلیٰ ذریعہ ہے، "شاعری" سے زیادہ موثر وکارگر کوئی چیز نہیں، شاعری سے حیات جاوید حاصل ہو سکتی ہے۔ شعر:

نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید

معلوم نہیں تم کو کیوں شعر کہنے سے عار ہے! خبردار اس تحریر کے جواب میں منظوم آئے"۔ ۱۹۱۱ء کے ایک دوسرے خط میں تحریر کرتی ہیں: "مبلغ ۶ (۶ روپے) بدیں تفصیل ارسال کرتی ہوں عہ اشرفی (۵ روپے)، عہ (ایک روپیہ) داخل آنہ فنڈ کر کے باضابطہ رسید دو" یہ آنہ فنڈ محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار، لاہور کا قائم کیا ہوا تھا۔ اس اقتباس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ بہنیں شروع ہی سے مفید قومی مسائل میں کس قدر دلچسپی رکھتی تھیں۔ ۱۹۱۱ء ہی کے ایک اور خط میں مکتوب الیہا سے خط نہ لکھنے کا شکوہ کرتی ہیں اور اس بارے میں چند اشعار بھی رقم کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں لکھتی ہیں: "اس (منظوم) خط کا مضمون بھی اس وقت مناسب حال ہے۔ تلافیٔ مافات کی تو تم سے مطلق امید نہیں، ہاں، یہ ممکن ہے کہ اس نظم کو پڑھ کر ذرا اپنی بے اعتنائیوں پر نادم ہو جاؤ"۔ چند شعر آپ بھی ملاحظہ کریں:

اے جلیس شادی و راحت، انیس درد و غم
ہے دعا، دنیا کی ہوں سب خوبیاں تجھ میں بہم
غالباً تم کو نہیں میری محبت کا یقیں
ہاں اسی سے آہوئے وحشی صفت کرتی ہو رم
یاد رکھو ظاہر و باطن ہمارا ایک ہے
اس پہ لعنت جس کے ہونٹوں پر ہو لا دل میں نعم
نزہتا! اب ہو نظر انداز تقصیر انیس
آج ہی کو کیا اٹھا رکھا تھا سب زورِ قلم

اس خط کے ساتھ ایک پرچے پر ایک غزل بھی ارسال کی ہے لیکن وہ بھی شاعری کا نقشِ اولین ہی ہے۔ دو، ایک شعر پڑھتے چلیں:

مرضِ کبر تھا تبدیل ہوا کا محتاج
شیخِ مغرور کا اس عہد میں بدلا ہے مزاج
کس مپرسی کا گلہ نزہت رنجور نہ کر
ملک الموت ترا پوچھنے آیا ہے مزاج

۱۹۱۲ء کے ایک خط میں اپنی بعض نظموں کی ترسیل کا ذکر اس طرح کیا ہے "خط تو لکھ چکی ہیں مگر اس دن جلدی میں بیہودہ نظمیں نہ لکھ سکی وہ آج بھیجتی ہوں۔ شاید ناپسند نہ ہوں"۔ اسی سنہ کا ایک خط تفنن طبع اور مزاح کا دلچسپ نمونہ ہے معلوم ہوتا ہے انیسہ خاتون صاحبہ نے اپنے خط میں کسی کتاب کا حوالہ دیا ہے، اس کے بارے میں رقم طراز ہیں: "ارے کون سی "النساء فی الاسلام"؟ کہاں سے منگائی؟ کب منگائی؟ کہیں میری "نساء المسلمین" تو نہیں چرالے گئیں؟ اچھا اب یہ عقدہ کھلا کہ تم کیوں میرے کتب خانے کو الٹا پلٹا کرتی تھیں۔ کیا تم نے "السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیہما" نہیں پڑھا؟ لاؤ تو کوئی میری نادر شاہی چھری!... دعا، دو میرے روزہ نہ ہونے کو ورنہ خدا معلوم کیا ہو جاتا۔ اس خیال خام میں نہ رہنا کہ چھوٹی آپا جان راقمۂ مکتوب، حلیم ہیں، بردبار ہیں، خاموش ہیں

دہیں گی۔ بقول صائبؔ:

زینہار ایمن مباش اے غافل از خشمِ حلیم
چوں زمیں در جنبش آید خانہ ہا ویراں کند

۱۹۱۲ء میں نزہت کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی۔ اس عمر میں ان کی عربی اور فارسی کی لیاقت کا تھوڑا بہت اندازہ اس خط سے ہو جاتا ہے۔ اس سنہ کے ایک اور خط میں لکھتی ہیں:

"سعد اللہ ماشاء اللہ تبارک اللہ یوں ہی حق گوئی کریں گے اور شقاوت اللہ یوں ہی جلیں گے۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء"۔ پھر "شقاوت اللہ" پر نوٹ دیا ہے: "شقاوت اللہ توبہ توبہ خدا گناہ بخشے شقاوت خاں!!" نہ معلوم "سعد اللہ" اور "شقاوت اللہ" یا "شقاوت خاں" کس کس سے استعارہ ہے۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "سعد اللہ" خود اپنی طرف اشارہ ہے اور "شقاوت اللہ" یا "شقاوت خاں" جلنے والوں کی طرف خواہ وہ کوئی بھی ہوں، اسی خط میں آگے تحریر ہے۔ "انجمن خواتین اسلام کی ممبر زاہدہ بیگم شروانی تھوڑی ہیں۔ وہ تو کوئی ز۔خ۔ش ہے۔ اس وسیع دنیا میں مجھ سے کیا مطلب؟ یہ ایک ہی ہوئی۔ کیا خوب، سبحان اللہ! کہاں کی اینٹ کہاں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ رجسٹر ممبران میں ز۔خ۔ش ہی مندرج ہوگا۔" گویا انجمن آرائی اور انجمن سازی کا شوق شروع ہی سے تھا لیکن پابندیاں اس قدر تھیں کہ اپنا نام ظاہر نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لیے ز۔خ۔ش کی نقاب چہرے پر ڈال لی تھی۔

۱۹۱۳ء کے ایک خط سے پہلے شوق مطالعہ اور پھر اکابرِ ملت کے ساتھ تعلق خاطر پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے لکھتی ہیں: ..... "افغان کے چند نمبر (خصوصاً وہ جس میں "افسانۂ لندن" مترجمہ ظفر علی خاں صاحب کا اشتہار ہے) ضرور اور جلد بھیجو۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ "زمیندار" میں ناول مذکورہ کا اشتہار شائع نہیں ہوا۔ آپا جان (احمدی بیگم صاحبہ) انشاء اللہ بقیہ حصص "فسانہ لندن" ضرور منگائیں گی۔

اور پھر: "کیا تم نے ایک کمال رنج بخش اور حسرت ناک خبر سن لی؟ یقیناً سن لی ہوگی اور میری طرح نہایت رنجیدہ ہوئی ہوگی۔" تو حیدؔ و "زمیندار" میں بکمال اندوہ پڑھی کہ لسان العصر (اکبر الہ آبادی) کا چہار سالہ نور نظر سید ہاشم بعارضۂ ہیضہ، وسر سام جاں بحق ہو گیا۔ اکبر کا حال زار ناگفتہ بہ ہے تاہم ان کے صبر کا اندازہ کرو کہ حسن نظامی لکھتے ہیں کہ "جب میں ہاشمی کی ..... کفن کا جوڑا سل رہا تھا، تہیۂ بارات (روانگیٔ جنازہ سے مراد) ہو رہا تھا مگر اکبر مجلس ماتم پرسانِ حال میں بیٹھے اسرار ہستی کے نکات پر عارفانہ بحثیں کر رہے تھے"۔ فبشریٰ للصابرین و طوبیٰ للشاکرین۔ "توحید" میں نہایت مفصل حالات ہاشم و متعدد خطوط اکبر مدظلہ، دربارۂ علالت ہاشمی مندرج ہیں ان شاء اللہ اگر تم نے کہا تو بغرض مطالعہ بھیج دوں گی۔ بنن (احمد اللہ خاں صاحب) کہتے تھے (واللہ یعلم انہ صدق او کذب) کہ میں نے ایک تار اور ایک خط ہمدردی کا بھیجا تھا۔ بھائی جان (مراد غالباً محمد انس خاں صاحب ہیں) اگر مناسب سمجھیں تو عشرت حسین ڈپٹی کلکٹر سیتا پور کو خط ماتم پرسی لکھ دیں۔ اکبر صاحب کو لکھنا جراحت پر نمک پاشی ہے۔" ۱۹۱۳ء ہی کے ایک خط میں رسالہ "مخزن" رسالہ "ادیب" اور "حسن تخیل" اور بعض دیگر کتب کے پارسل کی آمد کا مژدہ سنائی ہیں بعض کتابیں مطالعے کے لیے بھیجتی ہیں اور بعض کے بعد میں بھیجنے کا وعدہ کرتی ہیں۔ اسی سنہ کا ایک اور خط بہت اہم اور دلچسپ ہے۔ اس میں مکتوب الیہا کو بطور تفنن طبع "رعایائے دولت عثمانیہ" کہہ کر مخاطب کرتی ہیں لیکن اس مزاح میں یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ "رعایائے دولت برطانیہ" کی جگہ "رعایائے دولتِ عثمانیہ" ہونے کی خواہش دل ہی دل میں جاگزیں ہے۔ آگے چل کر "اطلاع" دیتی ہیں کہ "اخوی ابوالکلام آزاد کا اسم بامسمیٰ نام "محی الدین" میں نے علی گڑھ کانفرنس کے جدید انتخاب طلب ممبروں کی فہرست میں (من جانب

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں) چھپا ہوا دیکھا تھا۔ دیکھیں برادر موصوف
کیا جواب دیتے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ مولانا آزاد کو خط لکھ کر ان سے
کچھ دریافت کیا ہے۔ اس سے آگے تحریر ہے: "اپنے پیارے
"الہلال" میں اپنی آزاد کا مضمون "حزب اللہ" دیکھا۔ دیکھو،
اب بھی موقع ہے کہ ہم اس شرف سے محروم نہ رہیں اور آزاد
صاحب کو خدائے لایزال کی سوگند دے کر اخفائے راز
کا عہد لے لیں۔ اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو تمہارا تو علم
نہیں مگر میں ہمیشہ پچھتاؤں گی۔ دیکھو بجواب استفسار صالحہ
خاتون انھوں نے لکھا تھا کہ پردہ نشیں خواتین بھی بہت
آسانی سے ممبر حزب اللہ ہو سکتی ہیں۔ نہایت غور و خوض
کے بعد اپنی رائے قائم کر کے لکھنا"۔ ایک طرف خدمتِ
ملک و ملّت کا جذبہ کتنا شدید ہے اور دوسری طرف
پابندیاں کیسی سخت ہیں کہ "آزاد صاحب کو خدائے لایزال
کی سوگند دے کر اخفائے راز کا عہد" لینے پر مجبور ہیں۔
لڑکیاں تو علیحدہ رہیں، اس طرح کی پابندیاں اس خاندان
کے لڑکوں پر بھی کم سے کم ایک نسل بعد تک جاری رہی تھیں
اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا آزاد انیسہ خاتون صاحبہ
کی مانند زاہدہ خاتون صاحبہ کے بھی پیرو تھے۔ البتہ احمدی بیگم کا
زیادہ رجحان مولانا ظفر علی خاں کی طرف تھا۔

تقریباً اسی زمانے میں انھیں سودیشی تحریک سے
دلچسپی پیدا ہوئی۔ چوں کہ کھدر کا استعمال ایک طرح حکومت
وقت کے خلاف بغاوت کی علامت بن گیا تھا، اس لیے
زمیں دار اور جاگیر دار گھرانوں میں اس کی حیثیت شجر ممنوعہ
کی تھی۔ اس کا مداوا انھوں نے یہ سوچا کہ کھدر ان کپڑوں
میں استعمال کی جائے جو لوگوں کی نظر سے پوشیدہ رہتے
ہیں اور اسی کی ترغیب اپنے ہم خیال رفقا کو دی۔ مثلاً
انیسہ خاتون صاحبہ کو لکھا کہ "تکیے اور زیر جامہ کھدر کا سلوایا
جائے" کیوں کہ ان کے اوپر غلاف اور دوسرا لباس
مل کے کپڑے کا ہوگا اور اس طرح ان کے کھدر کے استعمال
کا راز افشا نہیں ہو سکے گا۔

۱۹۱۴ء کا ایک خط دو لحاظ سے قابلِ توجہ ہے۔ اس
سے ایک طرف ان کے انیسہ خاتون صاحبہ کے ساتھ گہرے
تعلقِ خاطر کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف حسنِ ذوق
کا۔ لکھتی ہیں:

خلعت می بینم و گردِ سوادِ نامہ می گردم
فدائے جنبشِ آں دست و طرزِ خامہ می گردم

میری جان انیسہ! السلام علیکم
دو محبت نامے یکے بعد دیگرے ملے۔ لاؤ،
میں ان پیارے پیارے ہاتھوں کو چوم لوں
جنھوں نے باوجود مرضِ چشم میرے ہر دو خطوط
کا جواب لکھا"۔ اس خط کے لفافے پر پتہ بھی "عزیزۂ
از دل و جانم انیسہ خانم سلمہا" درج ہے۔ لیکن ساتھ ہی ان
کا حسنِ ذوق خط میں داغ دھبوں کا متحمل بالکل نہیں ہوتا
ہے۔ چنانچہ تنبیہ کرتی ہیں: "کیوں جی، یہ خطوط میں داغ دھبے
کیوں ہوا کرتے ہیں؟ ہے شرط کہ لفافۂ زیرِ نظر کو واپس
بھیج کر دوسرا لفافہ منگاؤں! پھر میں تمہاری کم زور آنکھوں
پر رحم کرتی ہوں"۔ اسی سنہ کا ایک اور خط اس
دور کی اہلِ قلم خواتین کے ساتھ ان کے ربط اور قومی مسائل
سے ان کی دلچسپی کا غماز ہے۔ تحریر ہے: "ز (رابعہ) سلطانہ کا
خط شام آیا ہے جس میں انھوں نے بڑے سخت اصرار سے
فوراً تمہارا وہ خط (جس کا تذکرہ میں نے ان سے کیا تھا)
طلب کیا ہے لیکن اس خط کے صفحہ ۴ کے آغاز کی چار سطور
ایسی ہیں جن کا افشا خلافِ مصلحت ہے۔ اس لیے اس خط
کو تمہارے پاس روانہ کر رہی ہوں۔ بصد عنایت، مہربانی،
احسان، منت، کرم، لطف ہوگا اگر اس کی نقل تمام و کمال (باستثنائے
سطور مندرجہ بالا جس میں زمیندار پریس کے خط کے متعلق
استفسار ہے) کر دو گی۔ اگر یہ کسی طرح (خدانخواستہ) ممکن
نہ ہو تو سطور مذکورہ کی جگہ بعض الفاظ کو چاقو سے چھیل کر اپنے

ہے ایسے الفاظ میں تبدیل کردو کہ یہ کوئی پوشیدہ قابل
ب بات نہ رہے۔" اس عبارت سے یہ تو نہیں معلوم
تا ہے کہ "زمیندار" کے پریس کا ایسا کیا معاملہ تھا
س سے متعلق خط کے استفسار کا پوشیدہ رکھنا
ں قدر ضروری تھا۔ تاہم یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ اس
ے کے مسائل سے ان لوگوں کی دلچسپی کتنی گہری اور شدید
ی۔ ۱۹۱۵ء کا ایک خط بھی لگ بھگ اسی نوعیت کا
ے۔ ان کی مشترکہ دوست "فاطمہ" کو کوئی "تمغہ" ملا ہے
انچہ یہ لکھتی ہیں: "فاطمہ کی تمغہ یابی کی بابت اپنے اشعار
ے نہ دکھاؤ گی تو کسے دکھاؤ گی؟ .... "شریف بی بی"
ر جلسہ کی بابت احتیاط سے رکھنا۔ داشتنی شے ہے۔"
یدالفطر ۱۹۱۵ء پر جو عید کارڈ بھیجا ہے، مطبوعہ اشعار
علاوہ اس کی پشت پر خود اپنے اشعار بھی لکھے ہیں۔ پوری
ارت اس طرح ہے: "(اشعار نتیجۂ طبع خاکسار
ہت شیروانیہ اخص الخاص برائے عزیز از جان انیسہ
لون پنہاں) :

جلوۂ خور میں نظر آئے گا کیا عید کا چاند
تم جو چھپ جاؤ تو ہو چہرہ نما عید کا چاند
منہ دکھاتی نہیں ایک ایک برس تک[۱]
(رُخ روشن نہیں دکھلاتی ہو ایک ایک برس)
ہو گئیں تم تو پیاری بخدا عید کا چاند

۱۹۱ ہی کے ایک خط سے رسایل وکتب کے تبادلے
پتا لگتا ہے۔ لکھتی ہیں: "نپولین اعظم" کی پہلی جلد تم
اس قدر جلد بھیجی؟ "الہلال" کے زائد نمبر بھی بھیج
لو۔ حسب الحکم "پردہ نشیں" کا وہ نمبر جس میں لو لو
تاب پر ریویو ہے، مرسل خدمت ہے۔" اسی سنہ کے
ے اور خط میں "علمائے سلف" (تصنیف مولانا حبیب الرحمٰن
ں شیروانی) کی ایک جلد کی فرمائش کی ہے اور "العبتان"
لفظ پوری طرح پڑھا نہیں گیا۔ ر۔ش) بھیجنے کی اطلاع دی

ہے اور اس کی رسید طلب کی ہے۔

"الہلال" کی خریداری کا نہایت اشتیاق ہے لیکن مسئلہ وہی پابندی کا ہے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح والد ماجد، جنھیں وہ "ابویا" کہتی ہیں، کو اس پر راضی کر لیتی ہیں کہ صرف ۶ ماہ کے لیے "الہلال" ان کے نام جاری کرا دیا جائے اور پھر اس کی خوش خبری انیسہ خاتون صاحبہ کو سناتے ہوئے لکھتی ہیں کہ "اب جب ۶ مہینے کے لیے اس کے اجرا کی اجازت مل گئی ہے تو امید ہے کہ آئندہ بھی جاری رہ سکے گا۔"

جیسا کہ عرض کیا گیا، ۱۹۱۶ء میں وہ حادثۂ فاجعہ پیش آیا جس نے ان کی دنیا ہی بدل دی اور دل کا سکون چھین لیا۔ پھر بھی خاطر احباب کا کس قدر خیال رہا اس کا اندازہ اسی سال کے ایک خط سے ہوتا ہے۔ یہ خط حادثے کی تھوڑی ہی مدت کے بعد لکھا گیا ہے۔ تحریر ہے: "پیاری! خدا کے واسطے اس تھوڑی سی مہلت کو، جو ہمیں بدقسمت نئے قلعہ (ظفر منزل، راقمۂ مکتوب کا مستقر) کے ایام غم و اندوہ کے بعد نصیب ہوئی ہے، میری حالت زار سے بے لطف نہ کرو اور اپنے بے گناہ ہم نشینوں کا عیش منغص نہ کرو۔ میرا حال کیا پوچھتی ہو؟ جس رنج و ملال کا ایک تھوڑا سا حال تمھیں معلوم ہے ——

اس میں شک ہے کہ روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ خیر خدا کی جو مرضی۔" اور خط کے آخر میں اپنا نام اس طرح لکھا ہے "محبوب بہ غم کردہ زاہدہ"۔ یکم جنوری ۱۹۱۷ء کے خط میں لکھتی ہیں: "۱۹۱۶ء آج ۱۲ بجے شب کے اپنا بوریہ بستر باندھ کر چلتا پھرتا نظر آیا۔ اس لیے آغاز سال نو میں بطور فال نیک اپنی نہایت پیاری بہن کو خط لکھنے کی بے پایاں مسرت جس طرح ہو سکے گا ... حاصل کروں گی۔"

اسی سنہ کے ایک خط میں انیسہ خاتون صاحبہ کی کیسی تحریر پر ان کی کس طرح ہمت افزائی کرتی ہیں لیکن ساتھ

---

گذا ور اصل ... ۱۹۱

ہی مفید مشورہ بھی دیتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے: "ارے واللہ تم تو اہلِ قلم نکلیں۔ تمہارے جوابات سے جس قدر خوشی مجھے ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ کس قدر عمدہ جوابات لکھے ہیں۔ میں تو دنگ رہ گئی۔ خدا جانے تم اس قدر قابل آدمی ہونے کے باوجود کیوں کسی کی لیاقت دیکھ کر رشک کیا کرتی ہو۔ تمہارے بلاغتِ مضمون و الفاظ سے ظاہر ہے کہ تم نے نہایت غور سے یہ تحریر لکھی ہے لیکن میری رائے میں اگر تمہاری زبان اور تلیث (کذا) ہو جائے تو بہت ہی کم لی بیاں زورِ قلم میں تمہارا مقابلہ کر سکیں"۔

۱۹۱۷ء میں شروانی خاندان میں ایک اور اندوہ ناک حادثہ پیش آیا۔ یعنی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی رئیس حبیب گنج کے بڑے صاحب زادے مولوی محبوب الرحمان خاں نے ۲۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ز۔خ۔ش کا دل اپنے بھائی کے حادثۂ رحلت سے پہلے ہی دکھا ہوا تھا۔ اس لیے اس حادثے پر کتنے رنج و الم سے تحریر کرتی ہیں: "حبیب گنج کا دردانگیز واقعہ تو تم نے سن ہی لیا ہوگا۔ افسوس ہم ایسی حسرت ناک خبریں سننے کے لیے زندہ ہیں اور وہ قیمتی جانیں جن کے دم سے ہزاروں کی تمنائیں وابستہ ہیں، نابود ہو رہی ہیں ؎

بس یہی دولت مجھے دی لوٹنے اے عمرِ دراز
سینہ ایک گنجینۂ داغِ عزیزاں ہو گیا

..... رضیہ بیگم (محبوب الرحمٰن خاں مرحوم کی بڑی ہمشیرہ) کے دوروں نے تو بہت ہی پریشان کر رکھا ہے۔ دعا کرو کہ خدا بیچاری کو جلد شفا بخشے۔"

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ۱۹۱۸ء میں مکتوب الیہا کے بڑے بھائی محمد انس خاں صاحب کا بھی جوان العمری میں انتقال ہو گیا اور اب گویا ان بہنوں کا جامِ حیات زہرِ الم سے لبالب بھر گیا۔ اس سال کے آخر میں نزہت نے ایک نظم صاحبہ کو بھیجی کیونکہ اس میں اپنے ساتھ ان کا حالِ دل بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم میں دونوں چلے جانے والوں کے وصل اور دونوں پیچھے رہ جانے والیوں کے فصل کا ماجرا بیان کیا گیا ہے۔ نظم خاصی طویل ہے اور "فردوسِ تخیل" میں شامل ہے۔ پھر بھی چند اشعار گوش گزار کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ لکھنے والی کی کیفیتِ اضطراب کا کچھ اندازہ ہو سکے:

رنجِ مہاجرت سے تھے بے قرار دونوں
ہو کر رہے مُلاقی انجامِ کار دونوں

---

لے کر گئے جہاں سے دل ہی میں دل کے ارماں
لائے تھے ساتھ بختِ ناسازگار دونوں
چھوڑی نہ کچھ نشانی ہاں دے گئے ہیں دل کو
داغِ مفارقت کی اِک یادگار دونوں

---

او پیچھے جانے والے! پہلے سے جب ہو ملنا
ملنے سے سیر ہو لیں جب دوست دار دونوں
بہنوں کا حال شاید بھولے سے پوچھے احمد
کہیو کہ خستہ جاں ہیں اور دل فگار دونوں

---

میری انیس مضطر، میری غریب خواہر
پائیں گے ہم نہ اُن کو، روئیں ہزار دونوں
ہیں اک خدنگِ غم سے، ہاں ایک سنگِ غم سے
سینہ فگار دونوں اور زخمی بار دونوں

---

اب بند کر کے آنکھیں یک بارگی چڑھا لیں
صبر و رضا کا جامِ ناخوش گوار دونوں
ہاں آؤ دل کو تھامیں، رکھا ہے کیا بکا میں
کوشاں رہیں دعا میں لیل و نہار دونوں

جنت میں تیری رویت، تیرے نبی کی قربت
پائیں یہ دونوں چیزیں اے کردگار دونوں

"فردوسِ تخیل" میں احمد اللہ خاں حیراں کی یاد میں کئی اور نظمیں بھی شامل ہیں اور یہ سب نہایت دل گداز اور اثر آفریں ہیں۔ بعض نظموں کے عنوان ہیں۔ گرم گرم آنسو، اللہ الصمد تیرے بعد اور حادثہ، ہائلہ (فارسی) اسی حادثے سے متاثر ہو کر غالب کی دو مشہور غزلوں،

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

اور ______

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور

پر تضمین بھی کی ہے۔ دوسری تضمین کے چند اشعار درج ذیل ہیں؛

منزل کو ترے آنے سے خوش تھا دلِ محزون
اب بندہ کو ہے جانے کے تصور سے جگر خون
جانے کی تھی جلدی تو پھر آئے ہی تم کیوں
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور

ایک نظم ان کی زندگی میں، جب وہ کلکتہ گئے ہوئے تھے "تم کہاں ہو؟" کے زیرِ عنوان کہی تھی۔ یہ نظم جہاں ایک طرف غایرانہ محبت کی آئینہ دار ہے وہاں دوسری طرف وطنی و ملی جذبات سے بھی معمور ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں،

راحتِ دل ہو، لطفِ جہاں ہو تم
احمد اللہ خاں کہاں ہو تم

---

جلوہ گاہِ عروسِ حبِ وطن
ہے یہی سرزمیں جہاں ہو تم

---

چاہیے تم کو بھی وطن پہ نظر
چشمِ بد دور، نوجواں ہو تم

---

تم پہ آنکھیں لگی ہیں ملت کی
کس تصور میں ہو، کہاں ہو تم

مولوی محبوب الرحمٰن خاں مرحوم کے حادثۂ ارتحال پر نزہت کے جذبات رنج و غم کا ذکر اوپر گذر چکا ہے" وفاتِ حسرت آیات" کے عنوان سے ان کی وفات پر بھی مرثیہ لکھا اور تاریخ وفات نکالی۔ اس کے عنوان میں "حسرت آیات" سے محبوب الرحمٰن خاں کے والد ماجد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے تخلص "حسرت" کی طرف اشارہ ہے۔

ضمناً یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ نزہت کے وطنی و ملی جذبات اور سماجی و سیاسی شعور کا اندازہ صرف خطوط کے ان اقتباسات سے ممکن نہیں ہے بلکہ اس کے لیے "فردوس تخیل" کا مطالعہ ضروری ہے۔ "فردوسِ تخیل میں اسلام سے گہری وابستگی، ہندوستان سے سچی محبت، عالمِ اسلام کے مسائل سے بے پناہ دلچسپی، ادبا و شعرا، اور اکابرِ ملت اور رہنمایانِ قوم سے انتہائی عقیدت اور عورتوں کی زبوں حالی کا احساس اور دوستوں اور عزیزوں سے تعلقِ خاطر غرض کہ سب کچھ مل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اعزہ و احبا، کے علاوہ جن اکابر کی موت پر اظہارِ غم کیا گیا ہے، ان میں شبلی، حالی، گوکھلے، غلام حسین، اکبر الہ آبادی، وقار الملک اور مولانا محمود حسن شامل ہیں۔

فروری ۱۹۱۹ء میں داؤد احمد خاں عرف ننھے میاں کا کوئی آپریشن ہوا تھا۔ اس کی اطلاع اس طرح دی ہے (یہ خط علی گڑھ سے لکھا گیا ہے)؛

"آپریشن آج ۱۰ بجے دن کے ہو گیا۔ بڑا سخت اور غیر متوقع شدید آپریشن ہوا۔ ایسا سخت خون نکلا ہے کہ سلنے والوں کے رونگٹے کھڑے

ہوتے ہیں۔ جس وقت میں نے اسے بے شمار
آدمیوں کے درمیان بے حس وحرکت پلنگ پر
لیٹا ہوا دیکھا تو مجھے حقیقتاً اختلاج ہوگیا۔ ۱۰ بجے
سے ۵ بجے تک ہوش نہیں آیا... کلوروفارم
کے اثر سے بار بار قے ہوتی ہیں اور اس میں
خون بھی بعض دفعہ نکلتا ہے۔ دعا کرو کہ خدا
ہم پر رحم کرے... اس وقت حد سے زیادہ
پریشانی میں خط لکھ رہی ہوں... مجھے خوف
ہے کہ یہ خط تمہیں پریشانی میں ڈالے گا مگر
مجھے اس وقت بدحواسی میں کچھ نہیں بن پڑ رہی
پریشانیوں میں انسان کو اپنا دوست ہی یاد آتا
ہے۔"

---

خانگی وخاندانی حادثات سے طبیعت اس درجہ پژمردہ ہو چکی تھی کہ والدہ ہی کے ایک دوسرے خط میں لکھتی ہیں:

"خدا جانے کیا بات ہے کہ اچھی بُری خبر معلوم
کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ ہر وقت دعا کرتی
رہتی ہوں کہ خدا بُری خبروں کی میعاد ختم کرکے
اچھی خبروں کا سلسلہ شروع کردے۔ وما ذٰلک
علی اللّٰہ بعزیز۔"

اسی سنہ کا ایک اور خط بالکل مختلف نوعیت کا ہے۔ یہ خط نصف شب کو لکھا گیا ہے۔ اس میں یہ مسئلہ زیرِ غور ہے کہ حور بانو (دختر خواجہ حسن نظامی) کی شادی ہونے والی ہے اور انھیں کوئی تحفہ دینا ہے۔ شادی کی تاریخ قریب ہے اور سوال یہ ہے کہ کیا تحفہ دیا جائے۔ فیصلہ جوڑے کے حق میں کرتی ہیں۔ اب دشواری یہ ہے کہ اس زمانے میں شرفائی خاندان کی خواتین میں تنگ موری کا پائجامہ پہننے کا رواج تھا اور دہلی میں ڈھیلے پائجامے پہنے جاتے تھے۔ نزہت صاحبہ کے پاس پائجامے کا اعلیٰ درجے کا کپڑا (کمخواب اور پوتھ) موجود تھا لیکن اس میں ڈھیلا پائجامہ بننا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا وہ ڈھیلے پائجامے کے لیے پوتھ کا ایک تھان خریدنا چاہتی ہیں جو اس وقت بھیکم پور میں میسر آنا محال تھا۔ اگر علی گڑھ سے منگوائیں تو ضروری نہیں کہ لانے والا حسب دلخواہ لاکر دے۔ انھیں معلوم ہے کہ اُن کی پھوپی صاحبہ (مکتوب الیہا کی والدہ ماجدہ) کے پاس ایسے کئی تھان رکھے ہوئے ہیں لیکن ان سے درخواست کرنے میں اندیشہ بلکہ یقین ہے کہ وہ قیمتاً دینا پسند نہیں فرمائیں گی اور انھیں بغیر قیمت ادا کیے ہوئے لینا منظور نہیں۔ لہٰذا مکتوب الیہا کو بعد اصرار لکھتی ہیں کہ وہ کسی طرح اپنی والدہ ماجدہ کو قیمتاً ایک تھان دینے پر آمادہ کردیں اور اگر سمجھیں کہ وہ نزہت صاحبہ کو قیمتاً نہیں دیں گی تو کسی اور کے نام سے حاصل کرلیں۔ اس خط سے ایک طرف نزہت کے اپنے حلقۂ احباب کے ساتھ تعلق خاطر اور حسن سلوک اور دوسری طرف غیرت مندی اور اصول پسندی کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔

۱۹۲۰ء کے ایک خط میں لکھتی ہیں:

"زمیندار" میں میری نظم "جلوۂ شب" گئی ہوئی
ہے۔ اگر ہڑتال کی ہڑبونگ اور بے قاعدگی
سے بچ کر وہ پرچہ مل جائے تو ذرا خیال
کرکے بھیج دینا۔ جس وقت ملے اسی وقت روانہ
کرنا... اگر تمہیں بہت زیادہ دقت نہ ہو تو
پرانے پرچوں میں سے وہ "زمیندار" نکال
کر بھیج دو جن میں "برطانیہ کا دشمن کون ہے
—— اسکوئتھ یا لائڈ جارج" مع وہ
سلسلہ وار شائع ہوئے ہیں... تمہارے
"زمیندار" اپنے رعیتوں کے ساتھ (غالباً
بعض دوسرے اخبارات یا رسائل مراد ہیں)
بھیجتی ہوں۔"

دسمبر ۱۹۲۰ء میں "انیس خواتین" "مائیوں" بیٹھ رہا ہے

ہیں۔ نزہت کو اندیشہ ہے کہ اس تقریب میں وہ گزشتہ حادثات کے پیش نظر بہت زیادہ پریشان ہوں گی اور روئیں گی۔ خود نزہت اپنی علالت کی بنا پر اس تقریب میں شریک ہونے سے معذور ہیں۔ اس لیے خط لکھ کر انھیں سمجھاتی ہیں

"میری جان سے زیادہ پیاری بہن! تمہیں
قسم ہے کل کی تقریب سعید میں ضرورت
سے زیادہ ہلکان نہ ہونا۔ تمہاری نازک دماغی
کی طرف سے حد درجہ پریشان رہتی ہوں۔"

خط و کتابت کا یہ سلسلہ بظاہر اس خط پر ختم ہو جاتا ہے البتہ دو نظمیں لکھ کر انیسہ خاتون صاحبہ کی تاریخ عقد اور تاریخ وداع فصلی اور بنگلہ سنوں میں نکالی گئی ہے۔ تاریخ عقد میں یہ صنعت رکھی گئی ہے کہ ایک ہی مصرع سے ایک حرف کی کمی اور زیادتی سے فصلی اور بنگلہ دونوں سنہ نکلتے ہیں۔ وہ مصرع آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

زروئے بہجت انیسہ خاتون کی زندگی جدید نزہت

۱۳ ۲۵ ۲
۲
۱۳ ۲۷

یوں تو "فردوس تخیل" میں ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۱ء تک کا کلام شامل ہے لیکن اس کا بیشتر حصہ ان خطوط کی مانند ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۰ء کی درمیانی مدت ہی کا ہے۔

# حواشی

۱ یہ نام خطوط میں اسی طرح بعض اور مقامات پر بھی آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی کا رمزیہ یا علامتی نام ہے لیکن کوشش کے باوجود صاحب اسم کی شخصیت کا علم نہیں ہو سکا۔

۲ معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں سے دل چسپی اور کتب خانے کا قیام نواب مزمل اللہ خاں صاحب مرحوم کی اولاد کو باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ آج بھی ان کے صاحب زادے اور نزہت مرحوم کے بھائی نواب رحمت اللہ خاں شروانی (طال بقائہٗ) کا کتب خانہ دیدنی ہے۔ (ر۔ش)

۳ خطوط کے یہ حصے کرم خوردہ ہیں۔ (ر۔ش)

۵ غم میں اضافے پر ادائیگی شکر غم کے جس انتہائی درجے کی نشان دہی کرتی ہے اس کا ادراک صاحبان دل ہی کر سکتے ہیں۔ (ر۔ش)

۶ نزہت نے یہ خط اپنے قلم سے نہیں لکھا ہے بلکہ املا کیا ہے۔ لکھنے والی نے "سلیس" کو غلطی سے "ثلیث" لکھ دیا ہے۔ (ر۔ش)

۷ خود بھی کہاں زیادہ مدت تک زندہ رہیں۔ جلدی ہی اس راہ پر چلی گئیں جس راہ سے کبھی کوئی واپس نہیں آتا ہے۔ (ر۔ش)

۸ اس وقت ان کی "عمر دراز" صرف ۲۳ سال تھی اور پھر پانچ سال اور زندہ رہ کر دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ (ر۔ش)

۹ پیدائش کا دن

۱۰ انتقال کا دن

۱۱ کلکتہ

# ایڈس سے کیسے بچیں

محمد اسلم پرویز *

ایڈس اس وقت دنیا کی مہلک ترین بیماری ہے ہلاکت خیزی کی بنیاد پر اس کو کینسر سے بھی زیادہ خطرناک اس لیے مانا گیا ہے کیونکہ کینسر کا شروع کی حالت میں علاج ممکن ہے۔ کینسر کی شروعات ہوتے ہی اگر اس کی تشخیص ہو جائے تو ساٹھ فی صد یہ امید رہتی ہے کہ اس کا مکمل علاج ہو جائے گا اس کے برخلاف ایڈس کا چاہے کتنی جلدی ہی پتہ کیوں نہ چل جائے اس کا علاج قطعاً ممکن نہیں ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو کینسر کا مریض اپنے آپ کو موت کے اتنے قریب نہیں سمجھتا جتنا کہ ایڈس کا شکار ملک الموت کو اپنے قریب دیکھتا ہے۔ علاوہ ازیں کینسر کسی بھی حالت میں ایک مریض سے دوسرے شخص میں منتقل نہیں ہوتا۔ چاہے دونوں کے درمیان کتنا ہی قریبی تعلق کیوں نہ ہو جب کہ ایڈس کو کافی حد تک چھوت کی بیماری ہی سمجھا جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے' لیکن اس واہمہ اور خوف کی وجہ سے ایڈس کے مریض کو سماج اس حد تک الگ کر دیتا ہے کہ اس کو اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن کاٹنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ ایڈس اس وقت اگرچہ بڑی حد تک امریکہ اور افریقہ کے ممالک کی بیماری ہے لیکن ہندوستان میں بھی رفتہ رفتہ اس کے مریضوں کا انکشاف ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ چونکہ ایڈس کے ساتھ یہ لیبل چسپاں ہے کہ یہ بیماری جنسی بے راہ روی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس لیے ہمارے ملک میں اس کے مریض خاص طور سے اس کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کا چال چلن سب کے سامنے ظاہر نہ ہو جائے۔ علاوہ ازیں ہمارے ملک میں تیزی سے پھیلتی ہوئی دواؤں کی وبا، جنسی بے راہ روی کا عام ہونا اور زمانۂ قدیم سے چلے آرہے ہم جنسی کے اعمال اس بات کا شدت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم ایڈس جیسی خطرناک بیماری کے متعلق زیادہ سے زیادہ عوام کو روشناس و خبردار کر دیں تاکہ وہ اس یقینی موت سے اپنی حفاظت کر سکیں

## وجہ تسمیہ

ایڈس بیماری ایک قسم کے وائرس سے ہوتی ہے۔ وائرس ایک ایسے جرثومے کا نام ہے جس کو سائنسداں جاندار اور بے جانوں کے درمیان رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جرثومہ عام حالت میں بے جان رہتا ہے لیکن جیسے ہی یہ کسی جاندار جسم میں داخل ہوتا ہے اس میں زندگی کی رمق دوڑ جاتی ہے۔ یہ تیزی سے تقسیم ہونے لگتا ہے اور جاندار کے جسم میں مختلف بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ بیماری کی

* لکچرار باٹنی ڈپارٹمنٹ، ذاکر حسین کالج، اجمیری گیٹ، دہلی ۶

نوعیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ جاندار پر کون سے وائرس نے حملہ کیا ہے۔ مثلاً اگر چیچک کا وائرس حملہ کرتا ہے تو چیچک نکلتی ہے۔ اسی طرح عام نزلہ جس کے ہم سبھی لوگ کبھی نہ کبھی شکار ہوتے ہیں، وائرس کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔ اس جرثومے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ اتنا ڈھیٹ یا مضبوط ہوتا ہے کہ اسے کسی بھی طریقے سے تباہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ سے وائرس کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماریاں لاعلاج ہوتی ہیں جب یہ وائرس خود ہی اپنی زندگی مکمل کر کے ختم ہوتا ہے تو مرض جاتا ہے۔ نزلہ اسی لیے لاعلاج ہے اور خود ہی تین یا پانچ دن بعد ختم ہو جاتا ہے۔

ایڈس جس وائرس کی وجہ سے ہوتا ہے اس کی دریافت کا سہرا ایک امریکی سائنس داں ڈاکٹر رابرٹ گیلو کے سر ہے جو کہ امریکہ کے نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہیں اس وائرس کا نام ایچ۔ٹی۔ایل۔وی سوئم (HTLV-III) رکھا گیا تھا۔ اس وائرس اور بیماری کے نام کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ انسان کے خون میں سرخ ذرات کے علاوہ سفید ذرات بھی ہوتے ہیں۔ سرخ ذرات کی زیادتی کی وجہ سے ہی خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے اور یہ ذرات خون میں آکسیجن لانے لے جانے کا کام کرتے ہیں۔ سفید ذرات اگرچہ سرخ ذرات کی بہ نسبت کم ہوتے ہیں لیکن یہ کسی بھی طرح اہمیت کے اعتبار سے کم نہیں ہوتے۔ بیماریوں سے دفاع انہی کا کام ہے۔ ان کو ہم اپنا سپاہی یا فوجی کہہ سکتے ہیں۔ جسم میں محافظ کا کام ایک خاص قسم کے سفید ذرات کرتے ہیں، جن کو لمفوسائٹ (LYMPHOCYTE) کہا جاتا ہے۔ یہ خون میں داخل ہونے والے مختلف جراثیموں کو تباہ کرتے رہتے ہیں، ان کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک کو بی (B) ٹائپ اور دوسری کو ٹی (T) کہتے ہیں۔ ایڈس کے وائرس اسی ٹی ٹائپ کو ہی متاثر کرتے ہیں۔ اسی لیے اس وائرس کا نام Human T-CELL LYMPHOTROPIC VIRUS رکھا گیا ہے۔

چونکہ اس سے قبل اس قسم کے دو وائرس اور دریافت ہو چکے تھے اس لیے اس کو ایچ ٹی ایل وی سوئم کہا گیا۔ ایچ.ٹی.ایل وی اول (HTLV-I) کی وجہ سے خون کا کینسر - LEU) (KAEMIA - ہوتا ہے جب کہ ایچ ٹی ایل وی دوئم -HT) (LV-II - لمف غدود کے کینسر کا ذمہ دار ہے۔ ایچ ٹی ایل وی سوئم چونکہ انسانی خون کے ٹی قسم کے ذرات کو ختم کر دیتا ہے۔ اس لیے خون میں موجود دفاعی نظام بے کار ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس بیماری کا نام ایڈس - ACQUIRED) (IMMUNE DEFICIENCY SYNDROME -رکھا گیا ہے جس کا مفہوم ہے جسم کا قوت مدافعت کھو دینا۔ اس قدرتی مدافعت کے کھو دینے باعث جسم ہر قسم کی بیماریوں کا گھر بن جاتا ہے اگر ایک بیماری ختم ہوتی ہے تو دوسری شروع ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ انسان کے ختم ہونے پر ہی ختم ہوتا ہے۔

عالمی صحت تنظیم (WHO) کے ایک جائزے کے مطابق تمام دنیا میں تقریباً دس لاکھ ایڈس کے مریض ہیں جب کہ ۵۰ لاکھ سے زیادہ میں یہ جراثیم موجود ہیں۔ لیکن اب تک کی اطلاع صرف پچاس ہزار مریضوں کی ہے جن میں سے ۸۰ فی صد صرف امریکہ میں ہیں۔ ہندوستان میں اگرچہ اب تک صرف چند مریضوں کی اطلاع ہے لیکن صورت حال واضح نہیں ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ ہندوستان میں یہ بیماری پہنچ چکی ہے اور خاص طور سے دہلی، بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں اس کے خطرات نسبتاً زیادہ ہیں کیونکہ غیر ممالک کے سیاح سیدھے ادھر ہی آتے ہیں۔ ان شہروں میں نشیلی دواؤں کا بھی زور ہے اور بدچلنی بھی کافی پائی جاتی ہے جس کا اندازہ جرائم کی رفتار سے لگایا جا سکتا ہے۔

## پہچان

اس بیماری سے متاثر مریض کا وزن یکلخت گھٹنے لگتا ہے۔ بخار کا حملہ ہوتا رہتا ہے جو کہ ایک ماہ

اس سے زیادہ بھی جاری رہ سکتا ہے۔ کھانسی کے ساتھ کافی غم آتا ہے۔ دست بھی آسکتے ہیں اور عام طور سے طبیعت گراوٹ کا شکار رہتی ہے۔ خون کی جانچ سے پتہ چلتا ہے کہ خون کے سفید ذرّات خاص طور سے اور سُرخ ذرّات اور پلیٹیلیٹس (PLATELETS) بھی کم ہو گئے ہیں۔ اس بیماری کی تصدیق کرنے کے لیے کئی ٹیسٹ ہیں، ہندوستان میں فی الحال الیسا (ELISA) ٹیسٹ عام طور پر رائج ہے اور اس سے ۹۸ فی صد تک صحیح نتائج مل جاتے ہیں۔ ایڈس بیماری کے آثار کے سلسلے میں ایک بات نوٹ کرنے کی یہ ہے کہ اس قسم کی حالت دیگر کئی امراض کی وجہ سے بھی ہوتی ہے اس لیے محض ان میں سے کسی ایک حالت کے ظاہر ہونے سے ایڈس کا شک یا وہم نہیں ہونا چاہیے ایسی حالت میں بہتر ہے کہ فوراً نزدیکی ڈاکٹر سے مشورہ کر کے ایڈس کا ٹیسٹ کرا لیا جائے تاکہ تصدیق ہو سکے۔



ایڈس کے وائرس (HTLV-III) سے متاثرہ خلیے

## شکار کون اور کیسے:

چونکہ یہ بیماری ۱۹۸۱ء میں ہی دریافت ہوئی ہے، اس لیے ابھی اس کے متعلق بہت سے حقائق نامعلوم ہیں۔ اس لاعلمی نے بہت سی افواہوں کو بھی جنم دیا ہے جن کی تردید میں یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔ عام تصورات کے خلاف اب تک کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایڈس کوئی چھوت کی بیماری نہیں ہے۔ اس کے مریض کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے ہاتھ ملانے یا گلے ملنے سے یہ بیماری منتقل نہیں ہوتی بلکہ بوسہ لینے سے بھی یہ بیماری کسی کو متاثر نہیں کرتی۔ ایڈس پیدا کرنے والا وائرس صرف انسان کی منی (نطفہ) کے ذریعے اور خون کے ذریعے ہی پھیلتا ہے۔ درحقیقت اس بیماری کا انکشاف ہم جنسوں میں ہوا تھا اور یہ بات بالکل طے ہو چکی ہے کہ ہم جنسی کے شکار افراد خاص طور سے اس موذی مرض کا شکار ہوتے ہیں۔ ہم جنسوں کے علاوہ اس بیماری کے جراثیم ہیجڑوں اور طوائفوں میں بھی بہت پائے جاتے ہیں۔ پہلے قیاس یہ تھا کہ شاید مرد ہی اس کا شکار ہوتے ہیں لیکن اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ عورتیں بھی ایڈس کے وائرس کا شکار ہوتی ہیں مرکزی افریقہ میں ۵۰ فیصد عورتیں اس مہلک بیماری کے جراثیم رکھتی ہیں جب کہ یورپ میں خاص طور سے فرانس اور بیلجیم میں ۲۵ فی صد عورتوں میں ایڈس کے وائرس پائے گئے ہیں اس وقت تمام دنیا میں یہ خطرناک بیماری جنسی بے راہ روی پر ہم جنسی کے ذریعے یا طوائفوں اور ہیجڑوں کے توسط سے پھیل رہی ہے اس کے علاوہ نشیلی دواؤں کے شکار افراد بھی اس بیماری کا شکار ہوتے ہیں۔ کیونکہ نشیلی ادویات کی سوئیاں اور انجکشن جب ایک شخص کے جسم سے دوسرے کے جسم میں جاتے ہیں تو سوئی کے ذریعے خون کی معمولی مقدار ایک شخص سے دوسرے میں منتقل ہو جاتی ہے بس اتنی سی مقدار ہی اس بیماری کو پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر کی دکان پر انجکشن یا ٹیکہ لگواتے وقت بھی یہ مرض آپ کو متاثر کر سکتا ہے۔ اگر انجکشن کی سوئی استعمال کے بعد صحیح ڈھنگ سے صاف نہ کی گئی (جیسا کہ عموماً ڈاکٹروں کا طریقہ ہے) تو یہ سوئی بھی موت کا پیغام ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک اور چیز جس سے ایڈس پھیل سکتا ہے وہ ہے جسم کے مختلف حصوں خاص طور سے ہاتھوں پر

ان کھدوانا - آج بھی میلوں وغیرہ میں لوگ چھوٹی شینیں لے کر بیٹھتے ہیں جن سے ہاتھوں پر نام یا پھول جاتی ہے - یہ شین بھی ایک جسم سے دوسرے ت کا پیغام لے جا سکتی ہے لیکن ان تمام ذریعوں سب سے عام ذریعہ جنسی بدچلنی اور نشیلی دواؤں ل ہے - تحقیقات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ دی شدہ لوگ اپنی عزت و عصمت کی حفاظت کرتے اری کے بعد تعلقات صرف اپنی شریک حیات تک کھتے ہیں اور بیوی سے بھی صرف جائز اور صحیح ڈھنگ قایم کرتے ہیں - وہ اس بیماری سے سو فی صد ہتے ہیں - اس خطرناک بیماری کا ابھی تک کوئی علاج ن نہیں ہوا ہے - امریکہ اور یورپ کے سائنس داں م تحویر کوئی علاج ڈھونڈھنے میں ناکام ہیں - اگرچہ سال ہزاروں افراد اس کا شکار ہو رہے ہیں - چنانچہ علاج فی الحال ممکن نہیں ہے لیکن اس سے بچا سکتا ہے - مندرجہ ذیل احتیاطی تدابیر پوری طرح سے ایڈس سے محفوظ رکھ سکتی ہیں - اول یہ کہ جنسی ی و بدچلنی بالکل نہ ہو - ہم جنسی سب سے خطرناک . غیر عورت یا کئی عورتوں سے تعلقات قطعاً نہ رکھے طوائفوں اور ہیجڑوں کی صحبت سے ایک دم بچا بیوی سے صرف جائز مقام سے رجوع کیا جائے۔ نشیلی ادویات کا استعمال بالکل نہ ہو - ڈاکٹر سے لگواتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ انجکشن کی سوئی جراثیم سے پاک ہو، چونکہ ایسا طے کرنا مشکل کام ہے - اس لیے بہتر یہی ہے کہ پلاسٹک کی صرف ایک مرتبہ استعمال ہونے والی سرنج و سوئی سے ہی انجکشن لگوائیں جس کو ڈسپوزایبل سرنج کہتے ہیں - اگر کبھی خون دینے یا لینے کا مرحلہ آئے تو بھی سوئی کا خیال رکھیں - انجکشن لگوانے کے بعد اپنے سامنے ہی سرنج کو صاف کر دینا چاہیے - تاکہ وہ غلطی سے دوبارہ استعمال نہ ہو - علاوہ ازیں کبھی بھول کر بھی کسی دوسرے کی شیو کرنے کی مشین یا ٹوتھ برش استعمال نہ کریں - نائی کی دکان پر شیو بنوانے سے پرہیز کرنا چاہیے - اگر مجبوراً کرانا ہو تو استرے کو اچھی طرح صاف کرا لینا چاہیے - یاد رکھیں کہ ہر وہ چیز جس سے کسی شخص کا ذرا سا بھی خون آپ کے جسم کے تعلق میں آیا تو آپ اس مرض کا شکار ہو سکتے ہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص میں اس کے جراثیم ہوں - ایڈس موت کا دوسرا یا نیا نام ہے - اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ بدچلنوں کے لیے خدائی عذاب ہے - اسلام نے ہر اس فعل اور گناہ کے لیے منع کیا ہے جس کے نتیجے میں آج یہ مہلک بیماری پھیل رہی ہے - شاید قدرت اس طرح سے ایسے گناہ گاروں سے اس زمین کو پاک کرنا چاہتی ہے - طوائفیں ہیجڑے، نشیلی دوائیں اور ہم جنس جو کہ اب تک صرف سماج کا ناسور تھے اب پوری انسانیت کے لیے خطرہ بن چکے ہیں، ان سے بچنا بہت ضروری ہے -

"عدل مظلوم کی جنت اور ظالم کی جہنم ہے۔"

حضرت عمرؓ

# وائرس — جاندار یا غیر جاندار

محی الدین احمد*

قدرت نے اس شمسی نظام اور شاید پوری کائنات میں ہماری اس زمین پر قریب ۵ - ۱۰ ملین جانداروں کی انواع (SPECIES) ہیں اور جدید سائنسی تجربات کے پیش نظر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ تعداد ۲۵ ملین تک بھی ہو سکتی ہے لیکن جانداروں کی یہ گنتی کس بنیاد پر کی گئی؟ کیا ہم زندگی اور عدم زندگی کے درمیان ایک لکیر کھینچ سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ اس لکیر کے اس طرف جاندار ہیں تو دوسری طرف بے جان؟ شاید نہیں۔

چھوٹی جماعتوں میں اساتذہ بچوں کے سامنے جاندار کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ جو چیز چلے، کھائے اور سانس لے وہ جاندار ہے۔ ہاں ان کو اسی وقت بتا دیا جاتا ہے کہ پیڑ پودے چلتے نہیں لیکن وہ جاندار ہیں، لیکن کیا باقی جاندار اس تعریف کے زمرہ میں آتے ہیں؟ کیا کنگارو چوہا جو اپنی پوری زندگی میں کبھی پانی نہیں پیتا، جاندار نہیں؟ کیا وہ جرثومے (Microbes) جیسے خمیر (yeasts) ذی حیات نہیں جو کہ بغیر ہوا کے زندگی گزار سکتے ہیں اور اسی وجہ سے سانس نہیں لیتے؟ سائنس ابھی تک زندگی کی مکمل تعریف نہیں کر پائی ہے شاید اس لیے کہ

زندگی.....؟

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

سالماتی حیاتیات (Molecular Biology) میں ترقی کے ساتھ زندگی اور جاندار کی ایک نئی تعریف کی گئی۔ وہ یہ کہ جس چیز میں مادہ حیات (Proto-plasm) ہو وہ جاندار ہے لیکن یہ تعریف بھی پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ کچھ ایسے 'ذرّات' ہیں جن میں یہ مادہ حیات نہیں ہوتا لیکن پھر بھی وہ کبھی جانداروں جیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہ ذرّات 'وائرس' (Virus) ہیں۔

وائرس اس خط پر واقع خیال کیے جاتے ہیں جو جاندار اور غیر جاندار کو دو الگ حصوں میں بانٹتی ہے۔ ان کے کچھ اوصاف اور خصوصیات جانداروں جیسی ہیں تو کچھ بے جان اشیاء جیسی۔ پہلے ہم وائرس کے ان اوصاف کا ذکر کرتے ہیں جو ان میں اور جانداروں میں مشترک ہیں۔

وائرس میں جانداروں کی طرح تغیر کی قابلیت (Ability of Mutation) پائی جاتی ہے۔ یہ اپنے اندر تبدیلی لاتے ہیں اور اس تبدیلی سے وہ ماحول کی مشکلات کا بہتر طریقے سے مقابلہ کر لیتے ہیں۔ مثال کے

---

* ہمر ذکرنا مارکٹ 'فرسٹ فلور' میڈیکل روڈ' اے ایم یو - علی گڑھ

پر H.T.V وائرس جو انسان کے جسم میں ایڈس کی مہلک
[illegible]ں پیدا کرتا ہے اپنے ان PROTIENS کو برابر
[illegible]یل کرتا رہتا ہے جو انسان کے جسم کے لیے Antigens
[illegible] ہوتے ہیں۔ Antigens وہ جوہر ہے جو کہ ہر خارجی
[illegible] (Foreign Bodies) میں ہوتا ہے۔ جب کوئی
[illegible]ی مادہ جسم میں داخل ہوتا ہے تو اس میں موجود Antigens
[illegible] Antibodies بناتا ہے اور ان
[illegible] کے ملاپ سے خارجی مادہ تباہ ہو جاتا ہے۔ اسی کو
[illegible] ہیں۔ ہر
[illegible] ہوتے
[illegible] جسم
[illegible] داخل ہو کر [illegible] بنتے ہیں۔ اب
[illegible] بھی اس بیماری کو پیدا کرنے والا خارجی مادہ جسم میں
[illegible]خل ہوگا تو اس کو تباہ کرنے کے لیے پہلے ہی سے Anti-
bodies موجود ہوں گے اور وہ اس کو ختم کردیں گے
[illegible]نکہ H.T.V وائرس اپنا Antigen برابر بدلتا رہتا
ہے اس وجہ سے اس کے اوپر ٹیکہ کا اثر نہیں ہو سکتا۔
[illegible]ب ہم اس ایڈس یا وائرس کا Antigen جسم میں ٹیکہ
[illegible] داخل کرتے ہیں تو Antibodies بنتا
[illegible] جب کوئی H.T.V وائرس جسم میں آتا ہے تو
[illegible] کا Antigen بدلا ہوا ہوتا ہے اسی وجہ سے ان
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کسی غیر جاندار
[illegible]
[illegible]

لیے مخصوص ہے جو تعداد میں بڑھتے ہوئے اپنی نسل کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ اپنی جسامت میں بھی بڑھتے ہیں لیکن وائرس بھی اپنی تعداد اور سائز میں بڑھ سکتے ہیں! حالانکہ ان کے اس عمل کا طریقہ جانداروں سے بالکل مختلف ہے لیکن یہ وائرس کو جانداروں کی صف کے بہت قریب لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ وائرس کو افزائش نسل اور نشو و نما کے لیے ایک میزبان خلیہ (Host cell) کی ضرورت ہوتی ہے یہ میزبان خلیہ جرثومہ جیسے بیکٹریا، پیڑ اور جانور کا ہو سکتا ہے۔ وائرس اپنے میزبان میں کس طرح تعداد اور جسامت میں بڑھتے ہیں اس کو سمجھنے کے لیے پہلے وائرس کی ساخت کو سمجھنا ضروری ہے۔

وائرس Nucleo Protien کا مجموعہ ہے۔ ہر وائرس میں ڈی این اے یا آر این اے سالمات ہوتے ہیں جن کے چاروں طرف پروٹین کی ایک پرت ہوتی ہے۔ پروٹین کی یہ پرت انہیں امینو ایسڈ کی بنی ہوتی ہے جس سے انسانی پروٹین بنتے ہیں۔ چونکہ وائرس میں یا تو ڈی این اے سالمات ہوتے ہیں۔ یا آر این اے اسی وجہ سے وائرس کو دو طبقوں میں بانٹا گیا ہے۔ ڈی آکسی وائرس (Deoxy viruses) وہ وائرس ہیں جن کے اندر ڈی این اے سالمات ہوتے ہیں۔ رائبو وائرہ (Ribo viruses) کے طبقے میں ان وائرس کو شامل کیا جاتا ہے جو کہ آر۔ این اے سالمات کے بنے ہوتے ہیں H.T.V وائرس ایک رائبو وائرہ ہے۔

اب ہم اپنے موضوع پر آتے ہیں کہ وائرس تعداد میں کیسے بڑھتے ہیں جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ وائرس کو افزائش نسل کے لیے ایک میزبان خلیہ کی ضرورت ہوتی ہے جب کوئی ڈی آکسی وائرہ (جو کہ ڈی این اے اور پروٹین پرت کا بنا ہے) کسی خلیے میں داخل ہوتا ہے تو اس کے ڈی این اے سالمات پروٹین کی پرت

کے گھیرے سے نکل کر میزبان خلیہ کے مرکز میں داخل ہو جاتے
ہیں۔ یہاں پر یہ سالمات ایسے پروٹین بناتے ہیں جو کہ باہر
سے آئے وائرس کے پروٹین سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ اس
کے علاوہ وائرس کے یہ ڈی این اے سالمات خلیے کے مرکز میں
مثنیٰ ہو کر بالکل ویسے ہی بہت سے ڈی این اے سالمات
بناتے ہیں۔ اب یہ نو ساخت ڈی این اے اور پروٹین مل کر
اور بہت سے وائرس کو تشکیل کرتے ہیں۔

اگر وائرس رائبو وائرہ ہے تو خلیہ میں داخل ہونے
پر وہ اپنے آر این اے سالمات اس خلیے میں ڈال دیتا
ہے۔ یہ آر این اے اس طرح برتاؤ کرتا ہے جیسے وہ میزبان
خلیے کا Messenger R.N.A. ہے اور نئے طرح
کے پروٹین اور آر این اے سالمات بنا کر اپنی تعداد بڑھاتا
ہے۔

اب ہم وائرس کے ان اوصاف اور اس کی ساخت
کی ان خصوصیات کو دیکھیں جو اس کو غیر جانداروں سے ممتاز
کرتے ہیں۔

وائرس میں cell Organisation نہیں
ہوتا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہر جاندار خلیے کی ایک مخصوص ترتیب
ہوتی ہے، اس میں مرکز، مائٹوکونڈریا، گولگی باڈی،
ای آر وغیرہ ہوتے ہیں جو اور ان میں سے ہر ایک خلیے
میں ایک مخصوص کام کرتا ہے۔ اگر ایک بھی عضو کی کمی ہو جائے
تو خلیہ زندہ نہیں رہ پاتا۔ لیکن وائرس میں ایک ایسا عضو بھی
نہیں پایا جاتا۔ اس میں صرف ڈی این اے یا آر این
اے سالمات اور پروٹین کی پرت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ
اس میں ہر ذی حیات خلیے کے برعکس مادۂ حیات
(Protoplasm) بھی نہیں ہوتا۔

ہر جاندار کے لیے کھانا ضروری ہے۔ کھانے
میں موجود نامیاتی سالمے اس کی نشوونما اور افزائش
نسل کا سامان مہیا کرتے ہیں لیکن وائرس کو کھانے
کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے قدرت نے
اس کے اندر کوئی ایسا نظام مرتب نہیں کیا جس سے وہ کھانا
حاصل کر سکے۔ وائرس کی ایک دلچسپ خاصیت ہے کہ
وہ شکر اور نمک کی طرح crystallize کیا
جا سکتا ہے۔

تو پھر کیا وائرس غیر جاندار ہی ہیں؟ یہ
سب ہمارے ذہن کو پوری طرح الجھا دیتا ہے جب
تک ہم وائرس کو صحیح طور سے نہیں سمجھ پائیں گے
زندگی کی مکمل تعریف کرنا ہمارے بس میں نہیں ہوگا اور
جب کہ انسان اس دنیا کی حدود سے باہر نکل
کر دوسری دنیاؤں میں زندگی تلاش کر رہا ہے
کتنی عجیب بات ہے کہ وہ ایک بنیادی سوال کا جواب
نہیں دے سکتا کہ "زندگی کیا ہے؟" کہیں وہ
غالب کی طرح صرف یہ کہہ کر نہ رہ جائے کہ

؎ میں کہاں اور یہ وبال کہاں

"ہمارے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ
قوموں کے عروج و زوال میں سائنس کی بے حد
بہتر تکنالوجی کے رول کی اہمیت کو سمجھنے سے ہم
قاصر رہے" پروفیسر عبدالسلام

# ایک مکمل ہیلتھ ٹانک ، بلکہ اور بھی بہت کچھ !



## سنکارا: دل اور جگر کی صحت اور قوّت کے لیے لازمی بنیادی عناصر کا نادر مرکب

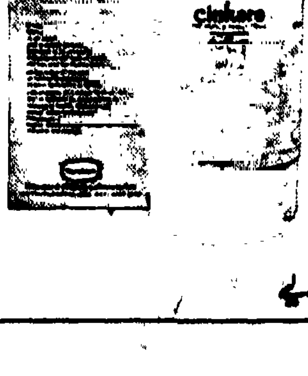
سنکارا واحد ٹانک ہے جس میں اچھی صحت کے لیے تمام لازمی بنیادی اجزا موجود ہیں ۔ مثلاً آئرن ، سوڈیم ، پوٹاشیم اور کیلشیم وغیرہ ۔ انہی کے ساتھ قدرتی جڑی بوٹیوں اور وٹامنز کے فوائد بھی شامل ہیں ۔ ان سے آپ کے دل ، جگر ، ہڈیوں ، عضلات اور دیگر اعضاء کو طاقت ملتی ہے اور نظام ہضم اور مرکزی نظام کو بھی فائدہ حاصل ہوتا ہے ۔

**آپ کو سنکارا کی کب کب ضرورت ہوتی ہے ؟**

• عام اور غیر معمولی کمزوری میں • سخت جسمانی محنت کے بعد • جسم میں وٹامنوں کی کمی میں • بیماری کے بعد کی کمزوری میں • بھوک نہ لگنے میں • چھوت کی بیماریوں سے بچاؤ کی قوت بڑھانے کے لیے • حمل کے دنوں میں • بچوں کو ان کی بڑھوتری کے دنوں میں • وزن کی کمی میں • اعصابی بے چینی اور کام کی زیادتی سے تھکاوٹ میں • تغذیہ کی عام خرابی میں • تناؤ ، دباؤ اور شدّتِ مرض میں ۔

چند مشہور ٹانکوں میں موجود آئرن ، کیلشیم ، زنک اور الکحل کی مقدار (فی خوراک) کا موازنہ قیمتوں کے ساتھ ساتھ :

| Reputed brands of tonics | Iron (mg) | Calcium (mg) | Zinc (mg) | Alcohol content percent (V/V) | Contents per unit pack | Retail price excluding tax (Rs.) |
|---|---|---|---|---|---|---|
| 1 | — | 12.4 | — | 12.00 | 400 | 31.96 |
| 2. | — | — | — | 11.0 | 240 | 32.00 |
| 3. | 9.68 | — | — | — | 454 | 27.50 |
| 4. | 13.00 | — | — | — | 200 | 25.31 |
| 5. | 21.50 | — | 0.00662 | 5.5 | 200 | 28.26 |
| 6. | 16.709 | — | — | — | 300 | 23.40 |
| 7. | — | — | — | — | 200 | 28.00 |
| 8. | 7.63 | — | 0.50 | — | 100 | 36.00 |
| 9. | 5.60 | 9.50 | — | 9.5 | 300 | 31.95 |
| Cinkara | 20.59 | 19.07 | 2.00 | Nil | 800 | 24.44 |




لازمی بنیادی عناصر، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکب

ہمدرد

# سنکارا

مشہور عالمی ٹانک — ہر موسم میں سب کے لیے

شمارہ ۱۲

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

# تہذیب الاخلاق

جلد ۱۱

دسمبر ۹۲ء



زر سالانہ :

| | |
|---|---|
| انڈیا ... | RS. 45.00 |
| بیرونی ممالک ... | US $ 20.00 ہوائی ڈاک |
| | US $ 8.00 عام ڈاک |


بانی :

سر سید احمد خاں

سرپرست :

## پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر :

کبیر احمد جائسی

نائب مدیر :

احمد مجتبیٰ قریشی

انچارج سرکولیشن

شفیق احمد

ترتیب : سرفراز


ترسیل زر کا پتہ :

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

EDITOR,

TAHZIBUL AKHLAQ &

NISHANT,

ALIGARH MUSLIM

UNIVERSITY,

ALIGARH. 202002

PHONE : 24627

# مندرجات



[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]


مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر و پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ پریس: اے ایم یو پریس۔ علی گڑھ۔

# اِدارِیَہ

اگر کوئی اور کہتا تو اس بات پر یقین نہ آتا مگر جب حکومت کے نظم ونسق کے ذمہ دار ادارے ہی اس کا اعتراف کر رہے ہیں تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں ہر سات منٹ پر ایک قابلِ سماعت عدالت جرم، ہر ۲۰ سکنڈ پر قابلِ سزا جارحانہ اقدام، ہر ایک منٹ پر حقیت سے متعلق جرائم، ہر ڈیڑھ منٹ پر چوری، ہر دو منٹ پر پُرتشدد ہیجانی جرائم، ہر چار منٹ پر نقب زنی، ہر پانچ منٹ پر بلوہ اور دنگا فساد، ہر چودہ منٹ پر ڈکیتی اور رہزنی، ہر پندرہ منٹ پر ایک قتل، ہر بارہ منٹ پر ایک زنا بالجبر کی وارداتیں ہو رہی ہیں (بحوالہ انڈین ایکسپریس ۱۲ نومبر ۱۹۹۲ء) یہ اعداد وشمار وہ ہیں جن تک حکومت کی رسائی ہوئی ہے جن وارداتوں سے حکومت لاعلم ہے اور لوگوں نے خوف وہراس کے سبب ان کو چھپا رکھا ہے۔ اگر ان کو بھی اِن اعداد وشمار میں شامل کر لیا جائے تو صورت حال کی سنگینی مزید بڑھ جائے گی۔

ہمارے دور میں جب کہ اشیائے خورد ونوش میں سے کوئی ایک چیز بھی "اصلی" نہیں رہ گئی ہے، خدا جانے کہاں سے انسانی جسم اتنی قوت وطاقت حاصل کر رہا ہے کہ "اس نے" اصلی دیسی گھی، دودھ، دہی، مکھن" کھانے والوں پر سبقت سالاری کر رکھی ہے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ موجودہ دور کے انسانی جسم کی قوت وطاقت کا سرچشمہ کہاں ہے وہ کس چکّی کا پسا کھاتا ہے کہ ملاوٹ سے بھرپور غذا استعمال کرنے کے باوجود جرائم کی دنیا میں اتنا تندرست وتوانا ہے کہ اس نے گزشتہ صدیوں کے انسانوں کو میلوں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

مندرجہ بالا جرائم کی تعداد اور رجحانات کا جس ادارے نے تحلیل وتجزیہ کر کے صحیح صورت حال سامنے لانے کی کوشش کی ہے اس کے مطالعے سے اس بھیانک حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ جب سے ہم نے "چراغِ خانہ" کو "شمعِ انجمن" بنا لیا اور اس کو اپنے شانہ بہ شانہ لا کر کارزارِ حیات میں اپنی ذمہ داریاں اس کے کاندھوں پر ڈالنی شروع کی ہیں تب سے "شمعِ انجمن" کی جرائم پیشگی میں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ وہ مَردوں سے کہیں آگے نکل گئی ہے۔ اعداد وشمار بتلاتے ہیں کہ ۱۹۷۱ء کے مقابلے میں ۱۹۹۳ء میں جرائم پیشہ عورتوں کی تعداد ۲۳۱٫۵۳ فی صد بڑھ چکی ہے جب کہ مرد مجرموں کی تعداد میں ۱۲۶٫۰۷ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ ماں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہونہار سپوتوں نے سن بلوغت کو پہنچتے ہوئے نوجوانوں نے بھی اپنے کرتب دکھانے شروع کر دیے ہیں اور ۹ا سالہ

یا اس سے کم کے نوجوان مجرموں کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ سارے سابقہ ریکارڈ ٹوٹ گئے ہیں۔ ان "وقت سے پہلے جوان" ہونے والے سپوتوں میں جنسی جرائم کا جو روز افزوں رجحان ہے اس کی ذمہ داری علم طب کے ماہرین نے ٹیلی ویژن کے ان اشتہارات پر ڈالی ہے جو خاندانی منصوبہ بندی کے دلکش عنوان سے دن میں کئی کئی بار دکھلائے جاتے ہیں۔ نوجوانوں کے اس روز افزوں خطرناک رجحان کے سد باب کے لیے ہم نفسِ ٹیلی ویژن کے خلاف تو کوئی لب کشائی نہیں کریں گے مگر علم طب کے ماہرین کے اس خیال کی ہم نوائی ضرور کریں گے کہ ٹیلی ویژن اس قسم کے اشتہارات کو دکھلانا بند کر دے جو نیم پختہ نوجوان ذہنوں کو مسموم کر رہے ہیں اور ان کو نت نئے نئے جنسی تجربے کرنے پر اکساتے رہتے ہیں۔

اِن نوجوانوں کا ایک قابل لحاظ طبقہ ایسا ہے جس کو ٹیلی ویژن نہیں بلکہ دوسرے حالات تشدد کے راستے پر چلاتے ہیں۔ غربت کے مارے یا ماحول کے ستائے گھر سے بھاگے ہوئے غریب بچے جب بڑے بڑے شہروں میں پہنچتے ہیں تو فٹ پاتھ ان کا گھر ہوتا ہے اور قوت بازو ان کا واحد سہارا۔ وہ تنازع للبقا کے اصول پر چلتے ہوئے اپنے کو زندہ رکھنے کے لیے اول اول تو اپنے ہی جیسے بچوں پر تشدد کر کے ان کی روٹی اور پیسے چھیننا شروع کرتے ہیں۔ ان لڑکوں میں جو تنومند اور سوجھ بوجھ رکھنے والا ہوتا ہے وہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنا ایک گروپ بنا کر اس کا لیڈر بن جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے چھوٹی چھوٹی وارداتوں کو چھوڑ کر بڑی بڑی وارداتیں کرنے لگتا ہے اور بہت جلد اپنے حلقے کا دادا بن جاتا ہے۔ یہ کل کا مظلوم آج کا ظالم بن چکا ہوتا ہے اور یہ لامتناہی سلسلہ آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

جو حالات کے مارے ناسمجھ اور روٹی کو ترستے ہوئے کم عمر "داداؤں" کے پلے پڑ جاتے ہیں اُن کو دو وقت کی روٹی تو ضرور ملنے لگتی ہے مگر ان کو اس دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لیے جو غلیظ کام کرنے ہوتے ہیں وہ ان کی شخصیت کو کچل کر رکھ دیتے ہیں اور جب یہ بچے بھرپور جوان ہو جاتے ہیں تو یہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ وہی برتاؤ کرتے ہیں جن سے یہ خود دوچار رہ چکے ہوتے ہیں۔

اس صورت حال کا احساس حکومت اور حکومت کے کارپردازوں کو ہے اور کبھی کبھی اس صورت حال پر اونچی آواز سے سوچ بھی لیا جاتا ہے مگر جرائم کو ختم کرنے کے لیے ابھی تک حکومت نہ ایسی کوئی پالیسی مرتب کر پائی ہے اور نہ ہی اس کے پاس کوئی مربوط پروگرام ہے اس کے علاوہ تعزیراتِ ہند کی اپنی کچھ مجبوریاں بھی ہیں جن کی وجہ سے خاصی بڑی تعداد میں مجرم عدالت سے بے داغ بری ہو کر نئے سرے سے جرائم کا آغاز کرتے ہیں۔ جب سے "نیتا گنز" نے "بھجاؤں کے بل" پر الیکشن جیتنے کے سلسلے کی ابتدا کی ہے جرائم پیشہ افراد کو پناہ گاہ کے طور پر ایک مضبوط قلعہ مل گیا ہے، انتظامیہ اور عدلیہ اس قلعہ کی ناکہ بندی بھی کرتی ہے اور گولہ باری بھی مگر اس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے نہیں کھسکتی۔ انتظامیہ اور عدلیہ کی یہ ناکامی جرائم پیشہ افراد کا حوصلہ بڑھاتی رہتی ہے اور سلسلۂ جبر و تشدد دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وطن عزیز کا ہر فرد کسی نہ کسی شکل میں زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر جرائم کے شدائد و مصائب کا شکار ہو رہا ہے مگر اس کے سد باب کی بات سوچنے کے بجائے منڈل یا کمنڈل کے گن گانے میں اپنے آپ کو ہمہ تن مصروف کیے ہوئے ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب آدمی آدمی ہی نہ رہے گا تو منڈل ہو یا کمنڈل کس کام کا؟

کبیر احمد جائسی

# بارِ زمین

خواجہ الطاف حسین حالی

کسی قوم کا جب الٹتا ہے دفتر
تو ہوتے ہیں مسخ ان میں پہلے تونگر
کمال ان میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر
نہ عقل ان کی ہادی نہ دین ان کا رہبر
نہ دنیا میں ذلت نہ عزت کی پروا
نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنت کی پروا

---

ہنر ہے نہ ہم میں فضیلت ہے باقی
نہ علم و ادب ہے نہ حکمت ہے باقی
نہ منطق ہے باقی نہ ہیئت ہے باقی
اگر ہے تو کچھ قابلیت ہے باقی
اندھیرا نہ چھا جائے اس گھر میں دیکھو
پھر اکسا دو اس ٹمٹماتے دیے کو

---

ہمارا یہ حق تھا کہ سب یار ہوتے
مصیبت میں یاروں کے غم خوار ہوتے
سب اک اک کے باہم مددگار ہوتے
عزیزوں کے غم میں دل افگار ہوتے
جب الفت میں یوں ہوتے ثابت قدم ہم
تو کہہ سکتے اپنے کو خیر الامم ہم

---

مگر ہم کہ اب تک جہاں تھے وہیں ہیں
جمادات کی طرح بارِ زمیں ہیں
جہاں میں ہیں ایسے کہ گویا نہیں ہیں
زمانے سے کچھ ایسے فارغ نشیں ہیں
کہ گویا ضروری تھا جو کام کرنا
وہ سب کر چکے، ایک باقی ہے مرنا

---

# اصلاح گھر سے شروع ہوتی ہے

سیّد حامد

قوم کے غم میں حکام کے ساتھ ڈنر کھانے کا شوق درد مندوں اور خوش ذوقوں کو ہر دور میں رہا ہے۔ ہمارے طنز نگار شاعر نے پُر لطف انداز میں لیڈروں کی پیروڈی کی ہے۔ قوم کے متعلق جو لوگ فکر مند نظر آتے ہیں، جو اس کے غم میں آنسو بہاتے ہیں، جو اس کی خرابیاں گناتے ہیں، جو اس کے زوال کا ماتم کرتے ہیں، جو اس کی ترقی کے منصوبے بناتے ہیں، ان میں سے بڑی تعداد ان افراد کی ہے جو اس نوع کے غم و فکر کو ایک مشغلہ بنا لیتے ہیں۔ اس موضوع پر ان کی فصاحت فرد ان کے لیے سرمایۂ افتخار و اعتبار بن جاتی ہے۔ فکر مندوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو قوم کی زبوں حالی پر دل کی گہرائیوں سے پریشان ہیں۔ وہ قوم اور ملت کو تحریر و تقریر سے جگانے اور حرکت میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے اجتماعی طور پر تلقین کرتے ہیں کہ پستی سے دامن چھڑاؤ اور ترقی کی طرف قدم بڑھاؤ۔ یہ سادہ لوح مفکرین یہ نہیں سوچتے کہ اجتماعی تخاطب سے اصلاح کے دروازے نہیں کھلا کرتے۔ آپ نے تقریر کی، نصیحتوں، منصوبوں اور ہدایتوں کو لکھ کر چھپوا دیا تو بات نہیں بنے گی۔ اجتماعی تخاطب اس لیے اور صرف اس حد تک کارآمد ہے کہ یہ مسئلے کی طرف آپ کے دھیان کو وقتی طور پر لے جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر مضمون نگار یا مقرر گھر بیٹھ گیا تو نتائج صفر سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ ضرورت ہے نہ صرف بات کو دہرانے کی، بڑے دائرے سے چھوٹے دائروں اور بالآخر فرد کی طرف آنے کی بلکہ اس قلعہ کو تسخیر کرنے کی جس کا نام گھر ہے کہ گھر ہی اصل اکائی ہے۔ ہدایتوں اور منصوبوں کو عملی جامہ گھر ہی پہنا سکتا ہے۔ ثبات اسی اصلاح کو ہے جو گھر سے شروع ہوتی ہو۔

گھر ہی تہذیب کی بنیاد ہے۔ انسان کی زنجیرِ ارتقا کی یہی کڑی ہے۔ بہت سے گھر اکٹھا ہو جاتے ہیں تو سماج بن جاتا ہے۔ سوسائٹی گھروں کے اس جھرمٹ کو ہی کہتے ہیں۔ گھر سے مراد اینٹ اور گارا نہیں گھر سے مراد وہ افراد ہیں جو گھر میں رہتے ہیں۔ وہ کیا سوچتے ہیں، کیا کہتے ہیں، کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں، کیا خواب دیکھتے ہیں۔ آپس میں لڑتے رہتے ہیں یا اتفاق کے ساتھ مل جل کر گزر کرتے ہیں۔ ماضی کی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے رہتے ہیں یا آگے کی طرف دیکھتے اور گرم سفر ہوتے ہیں۔ انسانیت کے لیے فرد اکائی ہے، تہذیب کے لیے اکائی گھر ہے۔ اصلاح گھر سے شروع ہوتی ہے اور گھر ہی اصلاح کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو

---

سابق وائس چانسلر اے ایم یو، علی گڑھ — ہمدرد نگر۔ نئی دہلی۔

لوگ کسی گروہ یا جماعت، قوم یا ملت کو سدھارنے کا ارادہ لے کر اٹھیں انھیں گھر پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ انھیں گھروں کے مجموعے یا معاشرے سے عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔

یو پی رابطہ کمیٹی کے حوصلہ مند نوجوانوں نے اتر پردیش کے مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کی ٹھانی ہے اور تین محاذ اپنے کام کے لیے چنے ہیں۔ تعلیم، اقتصادیات، عمرانیات۔ یعنی مسلمانوں کو پڑھنے لکھنے کی طرف لائیں ان کی مالی حالت کو بہتر بنائیں اور ان کے معاشرے کو سدھاریں اور سنواریں سلسلے کے نیچے جائیں تو یہ تینوں محاذ آپس میں گتھے ہوئے نظر آئیں گے۔ اقتصادیات کو تھوڑی دیر کے لیے الگ کر بھی دیجیے تعلیم اور سماج سدھار کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تعلیم سے معاشرہ سدھرتا ہے، سنورتا ہے اور معاشرہ کا نقطۂ نظر بدلتا ہے اور اس کی بیڑیاں کٹتی ہیں اور معذوریاں دور ہوتی ہیں۔ سماج اصلاح کو قبول کرتا ہے تو تعلیم کو فروغ ملتا ہے۔ ان دونوں کے زیر سایہ قوم یا ملت کی مالی حالت سنبھلتی ہے، ترقی پاتی ہے۔

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ تعلیم کا پرچار کرنے کے ساتھ ساتھ ہم اپنے سماج کے اندازِ فکر کو بدلیں، اس کے وہموں، بندشوں، تعصبوں، اندھیروں، جلنوں، سستیوں، بیراندازیوں، تباہ کن رسموں سے چھٹکارا دلائیں تاکہ وہ روشنی کی کرنوں کو جذب کرنے کے لائق ہو جائے تاکہ اس میں عزم و عمل کی صلاحیت پیدا ہو۔ تاکہ وہ خواب دیکھے اور ہر خواب کو شرمندۂ تعبیر کر کے دم لے۔ جو معاشرہ سُست، بے سدھ، نڈھال، آسائش طلب اور تنگ نظر بن جاتا ہے وہ تبدیلی اور اصلاح کی بات کو سننے اور سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ پس ہمیں اٹھنا چاہیے اور اصلاح معاشرے کا پیغام گھر گھر پہنچانا چاہیے۔ تحریر سے، تقریر سے اور ان دونوں سے زیادہ اہم، اٹھتے بیٹھتے، گھر میں اور احباب اور عزیزوں اور شناساؤں سے گفتگو کے ذریعے۔

مثلاً ہم لڑائی جھگڑے سے جن میں ہم نے نام کمایا ہے دامن بچائیں گے۔ اپنے اختلافات کو نرمی کے ساتھ گفتگو کر کے سلجھائیں گے۔ دانت نکالنا، غرّانا اور بھنبھوڑ کھانا جانوروں کا وطیرہ ہے، انسانوں کا شیوہ نہیں ہے۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو ہزاروں سالوں میں تہذیب نے ہمیں جو کچھ سکھایا ہے اس پر لات مارتے ہیں۔

جذبات انسان کی طبیعت میں پیوست ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں اپنی عناں دے دینا خود کو ہلاکت میں ڈال دینا ہے۔ خود جذبات کی عناں عقل کے ہاتھ میں دیجیے تاکہ جذبات کی رَو میں ایسی باتیں سرزد نہ ہوں جن کے سامنے تمام عمر پچھتانا پڑے، جن کی کوکھ سے عداوتیں، مخالفتیں اور دشواریاں پیدا ہوں جو زندگی کو اجیرن بنادیں اور ترقی کی راہ میں روڑے بچھادیں۔

سکون اور خوشی کے ساتھ زندگی گزارنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے (انفرادی یا ملّی) کام سے کام رکھیں دوسروں کے بکھیڑوں میں نہ پڑیں۔ لوگوں کے بارے میں جب تک کہ وہ خود کو اس کے برعکس نہ ثابت کردیں، اچھی رائے رکھیں۔ کیونکہ بدگمانی کرنے والا کبھی خوش اور آسودہ نہیں رہتا۔ بُری پرچھائیاں اس کے دل کے آئینے میں پڑتی رہتی ہیں۔ اُسے چھیک لیتی ہیں اور اس میں اچھے خیالات، اچھی تصویروں اور حسنِ ظن کے لیے جگہ ہی نہیں رہتی بدگمانی اور بداندیشی میں زیادہ فاصلہ نہیں رہتا۔ ایسی حالت میں خیراندیشی یا بھلا چاہنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے کسی انسان یا کسی جماعت کے لیے اس سے بڑی محرومی کیا ہوگی کہ وہ دوسروں کو عادتاً بُرا سمجھے اور اُن کے لیے بُرا سوچے۔ شاید یہ بدگمانی کے راسخ ہو جانے کا نتیجہ ہے، سوءِ ظن کا تحفہ ہے کہ مسلمانوں میں حسد کی وبا عام ہو گئی ہے اور ان کے لیے غیبت ایک پسندیدہ مشغلہ بن گئی ہے بدگمانی سے بداندیشی اور بداندیشی سے بدگوئی کی منزل طے

کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ جو لوگ شروعات برا کہنے سے کرتے ہیں وہ برا بھلا سننے بھی لگتے ہیں، برا سوچنے بھی لگتے ہیں اور برا کہنے کی بھی اُن کو عادت پڑ جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انھیں حسد اور غیبت کی لت لگ جاتی ہے۔ یہ دونوں عادتیں فرد کا کلیجہ تو پھونک ہی ڈالتی ہیں جماعت کو بھی بھسم کر دیتی ہیں۔ غیبت کا بیج بہت جلد عداوت اور بربادی کے برگ و بار لے آتا ہے۔ بری بات کے چٹخارے سے خدا بچائے۔ بری بات کو جو کوئی دہراتا ہے، اس میں اضافہ کرتا چلتا ہے۔ بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ بدگوئی اور غیبت ہر طرف عداوتیں بکھیرتی ہوئی چلتی ہے۔ حسد کی یہ لونڈی آگ لگا کر ہی دم لیتی ہے۔ یہ آگ وہ ہے جس کے لیے آگ بجھانے والے انجن وضع ہی نہیں ہوئے۔ لاکھ نصیحت کیجیے لاکھ سمجھایے کہ لوگ زیبِ داستاں کے لیے بڑھا بھی دیتے ہیں۔ پیٹھ پیچھے تو بادشاہ کو بھی لوگ برا کہتے ہیں۔ آپ یہ سن کر کہ فلاں شخص نے آپ کی برائی کی، برہم اور کفت بدہن کیوں ہوئے جاتے ہیں! وہ شخص جس کی برائی کی گئی ہے اس وقت تک آسودہ خاطر نہیں ہوتا جب تک کہ وہ بدلہ نہ لے لے اور وہ بدلہ بھی کیا جو برابر آ کر ٹھہر جائے۔ بدلہ تو ابتدائی برائی کو ضرب دیتا ہے۔ "اس نے برا کہا ہم اسے سو گنا برا کہیں گے۔ اس نے محفل میں بیٹھ کر ہماری برائی کی، ہم اسے کوچہ و بازار میں رسوا کریں گے۔ اُس بزدل اور کمینہ نے زبان سے ہم پر وار کیا ہم اسے دست و بازو سے جواب دیں گے"۔ کیسے دو خاندانوں میں ایسی پھوٹ پڑ گئی جس کی آگ مدتوں تک جلتی رہے گی۔ وہ خاندان جو مل کر اچھے کام کر سکتے تھے، جن کو تشکیل و تعمیر کی توفیق ہو سکتی تھی وہ تخریب میں لگ جاتے ہیں۔ معاشرے کو جو لوگ دان ان سے ملتا ہے وہ سراسر منفی ہوتا ہے۔ ان خاندانوں میں مصالحت کرنے کی جو لوگ کوشش کرتے ہیں، ناکام کوشش، وقت ان کا بھی ضائع ہوتا ہے۔

وقت کتنی بڑی دولت، شاید سب سے بڑی دولت ہے۔ ہم لوگ کیسی بے دردی کے ساتھ اسے ضائع کرتے ہیں۔ کبھی حسد اور غیبت اور فتنہ و فساد میں، کبھی خالی بیٹھ کر بیکار کی باتوں میں۔ کبھی انگڑائی اور جمائی لے کر، کبھی اینڈ کر، کبھی دن دہاڑے سینما اور ویڈیو دیکھ کر۔ ستم یہ کہ بچوں کو بھی کھلی چھوٹ ہے۔ ہمارے بچوں کا وقت ان دو بدعتوں میں ضائع ہوتا ہے۔ وقت ہی ضائع نہیں ہوتا، برے اثرات بھی پڑنے لگتے ہیں۔ خدارا ان بدعتوں پہ جنھیں ہم نے لعنتوں میں تبدیل کر دیا ہے، اپنے بیش قیمت اوقات میں ضائع مت کیجیے۔ یاد رکھیے کہ بہت کم چیزیں ایسی ہیں جو فی نفسہ بری ہوں جن میں اچھائی کا کوئی پہلو بھی نہ ہو۔ بعض چیزیں، خصوصاً سائنس کی نت نئی ایجادات نیوٹرل (بے صفت یا بے رنگ) ہوتی ہیں۔ یعنی فی نفسہ نہ بری نہ اچھی۔ ان کی اچھائی اور برائی ان کے استعمال پر منحصر ہے۔ ان دونوں سے آپ معین اور محدود اوقات میں معلومات اور بے ضرر تفریح حاصل کر سکتے ہیں اور ان کو وقت کے زیاں اور اخلاق کی تخریب کا ذریعہ بھی بنا سکتے ہیں۔ فیصلہ آپ کا، اختیار آپ کا۔ آپ یہ نہیں کر سکتے کہ ٹی وی اور ویڈیو کو گھر میں آنے نہ دیں یا اپنے بچوں کو پڑوس کے اس گھر میں جانے نہ دیں جہاں یہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک موجود ہو۔ گوتم بدھ کی کہانی یاد کیجیے۔ ان کے باپ نے، جو راجہ تھے، لاکھ جتن کیے کہ ان کے نونہال کے سامنے زندگی کا کوئی تکلیف دہ پہلو نہ آنے پائے لیکن بچے کو محل سرا کے پردوں میں کب تک رکھتے۔ ایک دن شہزادہ سیر کے لیے نکلا اور بیماری، بڑھاپے اور موت کے سین اس کی نظروں کے سامنے سے گزرے حیات و ممات کی حقیقت اس پر واشگاف ہو گئی اور کچھ عرصے کے بعد رات کی تاریکی میں گوتم نے محل کو چھوڑ

کر جنگل کی راہ لی۔ ہمارے محدود مقصد کے لیے اس داستان سے یہ سبق لیا جائے گا کہ کسی حقیقت کو زیادہ دیر تک چھپایا نہیں جاسکتا۔ یہ ضرور ہے کہ بہت سی حقیقتیں، بہت سی باتیں ایسی ہیں جنھیں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے وقت اور عمر، موسم اور فصل کی قید ہوتی ہے۔ یہیں ماں باپ کی ذمّہ داری آجاتی ہے۔ بچوں کو ٹی۔ وی بھی دکھائیے اور وی سی آر بھی لیکن دو شرطوں کے ساتھ: (۱) آپ کی اجازت کے بغیر کوئی بچّہ انھیں نہیں دیکھے گا اور وہی پروگرام دیکھے گا جو اُن کے ذہنی اور اخلاقی نشو و نما میں معاون ہوں گے۔ (۲) ٹی وی دیکھنے کا وقت اور مدّت والدین کی طرف سے متعین کی جائے گی۔

جو لوگ ٹی۔ وی اور وی۔ سی۔ آر کے مخالف ہیں وہ کہیں گے کہ گھر میں یہ وبا آگئی تو اسے مقید کر کے نہیں رکھ سکتے بچّے بڑوں کا آج کل کہنا ہی کب مانتے ہیں کہ ترغیب کے روبرو ہوتے ہوئے ماں باپ کی بات سنیں گے۔ جی نہیں، یہ تو بچوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینا ہوا۔ سمجھ دار اور مضبوط ماں باپ بچوں کو جب تک کہ وہ عمرِ بلوغ کو نہیں پہنچ جاتے اپنے حکم و ہدایت پر چلاتے ہیں۔ مغرب اور مشرق میں اس وقت ایک فرق یہ بھی ہے کہ مغرب میں والدین نے بچوں کو بے مہار چھوڑ دیا ہے؛ مشرق میں والدین بالعموم بچوں کی نشو و نما اور ان کے مستقبل کی خاطر ان پر نگرانی رکھتے ہیں اور انھیں سیدھے راستے پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہرکیف ہم بچوں کو اُن بے شمار فیوض سے بجز محروم نہیں رکھ سکتے جو مذکورہ ایجادات سے انسانی ذہن کو حاصل ہو رہے ہیں۔ ہماری کوشش صرف یہ ہونی چاہیے کہ ان ایجادوں کے نقصانات سے اپنے بچوں کو بچائیں۔

وقت کی طرف میں پھر لوٹ رہا ہوں۔ مثال کے طور پر اس آدمی کو لیجیے جو گھر سے بٹوے میں ایک ہزار روپیہ لے کر چلا ہے۔ بازار پہنچ کر بٹوہ کھولتا ہے تو صرف ۸۰۰ روپیے نکلتے ہیں۔ وہ بہت دیر تک سرگرداں رہتا ہے کہ الٰہی ۲۰۰ روپیے کہاں چلے گئے۔ وہ محنت سے کماتا ہے اور کمائی کو حفاظت سے رکھتا ہے۔ وہ سمجھ دار اور کفایت شعار آدمی ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ ان لوگوں کو کیا کہیں گے جو لگاتار قدرت کے عطا کیے ہوئے سب سے بڑے خزانے کو برباد کرتے ہیں؟ آپ سمجھے کہ وہ خزانہ کون سا ہے؟ جواب ملے گا وقت۔ ہمارے گھروں میں وقت کو بے دریغ اور بے دردی کے ساتھ برباد کیا جاتا ہے۔ جو معاشرہ وقت کو برباد کرے گا وہ کبھی خوش حال نہ بن سکے گا۔ وقت بنا آہٹ کے تیزی سے گزرتا چلا جائے گا، آخری وقت سر پر آجائے گا۔ چڑیاں کھیت چُگ گئیں تو پچھتانے سے کیا ملے گا۔ انسان دنیا سے حسرتوں کا ایک کارواں لے کر جاتا ہے۔ ان حسرتوں میں گناہوں اور دل آزاریوں کی کھٹک بھی ہوتی ہے اور اس کا کرب بھی کہ اتنا قیمتی وقت ہم نے اپنی لاپرواہی کی وجہ سے ضایع کر دیا۔ اس وقت میں تو ہم نہ معلوم کتنا کام کر سکتے تھے اور بات کے بارے میں تو ہم ہندوستانی

"کمینہ طبیعت اور نامہذب ناشائستہ آدمی یہ رستہ نہیں چلتا۔ وہ بات کے حسن و قبح کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، بلکہ اپنے مخالف کے عیوب ذاتی سے بحث کرنے لگتا ہے۔ سخت کلامی و زشت گوئی، سبّ و شتم اپنا پیشہ کر لیتا ہے۔ اپنے مخالف کے عیوبِ واقعی ہی کے بیان پر بس نہیں کرتا بلکہ ہر قسم کے بہتان اس پر لگاتا ہے اور جھوٹی جھوٹی باتیں اس کی طرف منسوب کرتا ہے اور خود موردِ لعنت اللہ علی الکاذبین بنتا ہے۔" سرسید

مسلمان اکثر شکایت کرتے ہوئے سنائی دیتے ہیں اور اکثر یہ شکایت صحیح بھی ہوتی ہے کلی یا جزئی طور پر کہ ہمارے ساتھ بہت ناانصافی ہوتی ہے، بڑا تعصب برتا جاتا ہے، ہمیں اپنا حق نہیں ملتا۔ لیکن وقت کو کیا کہیے گا؟ وہ تو ہمیں دوسروں کے برابر ہی ملا تھا۔ اسے ہم نے کیوں برباد کر دیا۔ رابطہ کے پروگرام کی کامیابی کے لیے ناگزیر ہے کہ ہم اپنے بھائیوں اور بہنوں کو وقت کے صحیح اور کافی استعمال پر رضامند کریں۔ جو لوگ وقت برباد کرتے ہیں وہ مالی اور ذہنی (بلکہ اخلاقی) اعتبار سے کنگال رہتے ہیں اور کنگالوں کی طرح داتاؤں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ وقت کو آخری لمحہ تک بار آور ڈھنگ سے برتتے ہیں وہ کامیابی، شادمانی اور امتیاز کی فصلیں پے در پے کاٹتے ہیں۔ مسلمان اپنے بڑے بڑے اداروں میں بھی مقابلے کی راہ سے مناسب تعداد میں داخل نہیں ہو پاتے اور انھیں کسی نہ کسی عنوان ترجیحی مراعات دی جاتی ہیں۔

دوسری طرف یہودیوں کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے بہت سے اداروں میں غیر یہودیوں کو داخلے کا معیار نیچا کر کے مراعات دیتے ہیں اور خود اپنے بچوں کے لیے داخلے کے معیار کو بہت اونچا رکھتے ہیں تاکہ ان کی کمر ہمیشہ کسی رہے

"کیا ہماری قوم میں جن کے اسلاف کے ناموں کی شہرت دنیا کے ہر ایک حصے میں گونج رہی تھی اور جن کے سیف و قلم کی نام آوری کے نشان سڑکوں میں اور دنیا کے ایک بڑے حصے میں اب تک پائے جاتے ہیں اتنی عزت اور ہمت بھی باقی نہیں رہی ہے کہ اپنی قوم کی تباہ حالت کی درستی پر توجہ کریں۔"

سرسید

تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۱، شمارہ ۱۲ (دسمبر ۹۲ء)

# پنڈت کیفی ـــــــــ اردو کے محسن

کلیم سہسرامی ▽

اردو زبان کی ہمہ گیری اور ہر دل عزیزی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ مختلف مذہب، ملک اور قوم کے لوگوں نے اس کی ترویج و تحفظ اور ارتقا و بقا میں حصّہ لیا۔ مغربی ممالک کے شاعروں اور تذکرہ نگاروں نے اردو زبان کی بہت قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ مشرق راں حضرات میں گارساں دی تاسی اور گراہم بیلی کے نام بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اگر صرف ہندوستان کا جائزہ لیں تو غیر مسلم محسنوں میں اردو کے اہم لکھنے والوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً چکبست و سرشار، دیا شنکر نسیم اور دیا نرائن نگم، سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت کیفی کے نام اور کام کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

پنڈت کیفی کی پیدائش ۱۳ر دسمبر ۱۸۶۶ء میں دہلی میں ہوئی۔ یہ کشمیری پنڈتوں کا خاندان تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کی طرف توجہ کی تو اردو، انگریزی اور فارسی زبان اور ادب پر دسترس حاصل کی۔ بنیادی طور پر شاعری شروع کی، غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی لکھیں اور مجموعۂ کلام "واردات" بھی چھپوایا، ڈرامے بھی لکھے لیکن کیفی کا اصل میدان اردو نثر تھا۔ کچھ دنوں ایک ہفتہ وار اخبار کی ادارت کی۔ اس کا نام "خیر اندیش" تھا۔ اخبار بند ہو گیا تو کپورتھلہ دربار سے منسلک ہو گئے۔ پھر ریاست کشمیر میں اسسٹنٹ خارجہ سکریٹری کی حیثیت سے کچھ دنوں کام کیا لیکن خاموش طور پر اردو زبان کے ایک محسن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ مولوی عبد الحق صاحب حیدرآباد (دکن) کی ملازمت سے علاحدہ ہوئے تو اورنگ آباد سے انجمن ترقی کا دفتر بھی اپنے ساتھ دریا گنج دہلی میں لے آئے لیکن انجمن کے کام کو آگے بڑھانا اور مستقل مزاجی کے ساتھ اسے انجام دینے کے لیے انھیں ایک رفیقِ کار کی ضرورت تھی۔ پنڈت کیفی سے ان کے پہلے سے تعلقات تھے۔ اس لیے انھیں انجمن کے کاموں میں شریک کر لیا۔ یہ دونوں بزرگ ایک ساتھ رہنے لگے اور انجمن کی سرگرمی کو آگے بڑھاتے رہے۔ بہت دنوں تک لالہ سری رام کے ساتھ بھی "خمخانۂ جاوید" کی ترتیب و تدوین میں معروف رہے اور اس کی چار جلدیں شائع ہو گئیں لیکن لالہ سری رام کے انتقال کے بعد پانچویں جلد تنہا انجمن کے کاموں کے علاوہ مرتب کی اور اسے ۱۹۴۰ء میں شائع کیا گیا۔ لالہ سری رام کے نامکمل کام کی تکمیل کیفی کی بدولت اردو والوں کے لیے قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ جہاں تک

---

▽ پروفیسر شعبۂ السنہ راج شاہی یونیورسٹی، راج شاہی۔ بنگلہ دیش

زبان اور بیان کی سادگی اور سلاست کا تعلق ہے وہ سرسید احمد خاں سے متاثر نظر آتے ہیں تاکہ ان کی ہر بات ہر پڑھے لکھے تک پہنچے اور سمجھی جاسکے۔ گویا انھوں نے اپنی زندگی اردو زبان کی خدمت کے لیے تج دی تھی۔ آپ کی اردو دوستی کا ایک نمایاں ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۵۵ء میں آپ کی سال گرہ کے جشن کے موقع پر جب عوام کی جانب سے چار ہزار روپے کی رقم پیش کی گئی تو آپ نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اسے اردو کی ترقی اور ادبی اداروں کی معاونت کے لیے جلسے کے اراکین کے حوالے کر دی۔ آخری عمر میں ضعیفی اور دوسری بیماریوں نے جب مجبور کر دیا تھا کبھی کبھی آپ کے بہی خواہ صحت کی خاطر آپ کو ادبی مشغلوں سے الگ رکھنے کی درخواست کرتے تھے تو آپ مسکرا کر فرماتے:

"میں بدترین سے خوب ترین استفادہ کرنے کا قایل ہوں... کیوں نہ میں باقی ماندہ لمحوں کو ادب کی خدمت کے لیے صرف کر دوں۔"

پنڈت کیفی اردو زبان کے سلسلے میں صوبائی تعصبات کے قایل نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دہلی، لکھنؤ، پنجاب، دکن، یوپی، بہار اور بنگال میں اردو زبان کو برابر کی مقبولیت حاصل ہو۔ ملک کی تقسیم سے جس طرح دلوں کی تقسیم ناممکن ہے، اسی طرح زبان وادب بھی تقسیم نہیں کیے جاسکتے جس طرح سر تیج بہادر سپرو اردو زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ سمجھتے تھے اسی طرح پنڈت کیفی فرماتے ہیں:

"جہاں تک اردو کا تعلق ہے میں ہندوستان پاکستان کو دو ملک نہیں سمجھتا۔"

اردو لسانیات سے بھی انھیں دلچسپی تھی، اردو رسم خط اور املا سے متعلق ان کے مضامین، الفاظ اور مرکبات سے بحث بہت دلچسپ اور قابل غور ہیں۔ اردو زبان کو سادہ، عام فہم اور آسان بنانے کے لیے کیفی نے جو باتیں پیش کی ہیں ان کی قدر و منزلت کرنا چاہیے۔ اسی طرح اردو زبان کا دامن مغربی الفاظ کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کے لیے کافی نہ تھا۔ اس لیے کیفی کو ہمیشہ یہ فکر رہتی تھی کہ اس کے لیے نئی اصطلاحیں بنائی جائیں لیکن اردو کے مزاج کو پیش نظر رکھ کر، تاکہ انھیں عوام میں مقبولیت حاصل ہو سکے۔ اس سلسلے میں وہ مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی کے نقش قدم پر چلنا مناسب سمجھتے تھے۔ اس مسئلے پر انھوں نے بڑی متانت اور سنجیدگی سے بحث کی ہے ان کے مطالعے کی وسعت اور ذہن کی رسائی، ادبی کاوش اور علمی توازن کا اندازہ لگانا ہو تو ان کی کتاب "کیفیہ" ملاحظہ کی جائے۔ اس سے کیفی کی اختراعی قوت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ہندو اور مسلمان کے لیے انھوں نے "ھندلمان" مرکب بنایا قبل مسیح کے لیے ق م اور ہجری قمری کے لیے ھق جیسے مرکب ایجاد کیے۔ اگر وہ اردو کے لیے کچھ اور بھی نہ کہتے تو بھی ان کے کارنامے کو زندہ رکھنے کے لیے "کیفیہ" بہت کافی تھی۔ موجودہ نسل اردو کے مسائل کو سمجھنا اور ان اصطلاحوں کو برتنا چاہے تو کیفی کی تحریروں سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ "کیفیہ" ان

"ہماری قومی تہذیب و شائستگی میں اوقات کے منضبط نہ ہونے سے بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ہر ایک کو اپنے خاص کاموں میں اپنی خاص اوقات کا اور جو کام عام قوم سے متعلق ہیں ان میں تمام قوم کو یکساں اوقات منضبط کرنا چاہیے کہ یہ بھی ایک اصل اصول قومی تہذیب و شائستگی کا ہے۔"

سرسیدؒ

کا صرف عہد آفریں کارنامہ نہیں ا کہ سنگ میل کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

کیفی نے جہاں اردو زبان کے مسایل کا تذکرہ کیا ہے۔ وہاں اردو زبان کے قدیم نام بھی بتاے ہیں۔ مثلاً ہندی، ہندوی، ریختی، ہندوستانی، ریختہ، دکنی اور دہلوی لیکن سبھوں کے زمانے کی تعیین نہیں کی ہے اور نہ اُن کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ دیا ہے۔ انھوں نے مولوی عبدالحق صاحب کے ایما پر انشاء اللہ خاں انشاؔ کی کتاب "دریائے لطافت" کا فارسی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے لیکن مصدقہ نہیں تعجب ہے کہ انھوں نے اس پر توجہ کیوں نہ کی۔

ایک دلچسپ اور عبرت انگیز واقعہ بیان کرنا ضروری ہے، وہ یوں کہ تقسیم ہندوستان کے بعد وہ اپنے ایک عزیز کے یہاں فیصل آباد (پاکستان) تشریف لے گئے تھے۔ فسادات کا سلسلہ رکا نہ تھا، یک بیک ایک اخبار میں یہ دل انگیز خبر شایع ہوئی کہ پنڈت کیفی فیصل آباد میں قتل کر دیے گئے۔ ہندوستان، پاکستان کے گوشے گوشے میں تعزیتی قرار دادیں چھپیں، ادبی حلقوں کی طرف سے انتہائی رنج و غم کا اظہار کیا گیا لیکن کچھ دنوں کے بعد اس خبر کی تردید اخبارات میں چھپی کہ بفضلہ پنڈت کیفی زندہ ہیں۔ سچ ہے مشیت کے حکم کو کون ٹال سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ پنڈت کیفی ایک شاعر، ڈراما نگار، صحافی، ماہر لسانیات مترجم اور اصطلاح ساز کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے کیونکہ ان کے کارنامے اس کی ضمانت ہیں:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

---

"ہمارے دین کی ہدایت ہے کہ ہم جہاں رہیں سرمایۂ حیات بن کر رہیں۔ اس لیے ہمارے تعلقات اپنے اہل وطن کے ساتھ اچھے ہونے چاہییں۔ خوش گواری اور خوش اندیشی کی پہل ہم نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟ کہ ہم اس کے مکلف ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ عزتِ نفس اور وطنی اور ملی مفادات کی حفاظت کی جائے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اقلیت کے لیے اور زیادہ ضروری ہے۔ اگر امن و امان نہیں رہا اور بلوے اور خونریزیاں ہوتی رہیں تو ہماری جہالت اور پسماندگی دور کیسے ہوں گی۔"

سید حامد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱، شمارہ ۱۲ (دسمبر ۱۹۹۲ء)

# برقی انقلاب

محمد اسلم پرویز ▽

موجودہ دور کو اگر توانائی کا دور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا آج ہمارے ہر شعبے میں توانائی کو اتنا دخل ہے کہ اس کے بغیر زندگی کا تصور محال ہے۔ ہمارے اِرد گرد کتنی چیزیں ہیں جو بجلی سے چلتی ہیں۔ نئی نئی مشینوں اور آلات کی ایجادات کے ساتھ ساتھ بجلی پر ہمارا انحصار بڑھتا ہی جا رہا ہے لیکن آج تک کی تمام تر سائنسی ترقیات کے باوجود بجلی سے متعلق دو اہم مسایل ہنوز حل نہیں کیے جا سکے ہیں۔

پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ ہم آج تک بجلی کا ذخیرہ کرنے کی کوئی تکنیک ایجاد کرنے میں ناکام رہے ہیں جس کی وجہ سے اکثر کسی ہنگامی حالت میں ہم بجلی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ محدود پیمانے پر کم قوت کی بجلی بیٹریوں وغیرہ کی شکل میں جمع کی جا سکتی ہے لیکن گھریلو یا صنعتی مشینوں کو چلانے کے لیے پوری قوت کا جو کرنٹ درکار ہوتا ہے اس کے لیے تو پاور لائن کا ہی محتاج رہنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کچھ چیزیں اور مادے بجلی کو اپنے اندر سے گزرنے دیتے ہیں۔ ان مادوں کو ہم موصل (کنڈکٹر) کہتے ہیں۔ دوسرا مسئلہ موصل سے ہی متعلق ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ مختلف چیزیں بجلی کی ترسیل کی الگ الگ صلاحیت رکھتی ہیں۔ کچھ دھاتیں مثلاً تانبہ یا ایلومنیم بجلی کی ترسیل بہت تیزی سے کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود جیسے جیسے بجلی ان دھاتوں میں سے گزرتی ہے اس کی مقدار کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر دھات اپنے اندر کچھ نہ کچھ مدافعت ضرور رکھتی ہے جو بجلی کی روانی میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ اس عمل کو سمجھنے کے لیے ایٹم کی تشکیل کے اصول کو سمجھنا ضروری ہے۔ ہر ایٹم اپنے مرکز میں ایک نیوکلیس رکھتا ہے جس کے اندر مثبت چارج والے پروٹون اور بنا چارج والے نیوٹرون ہوتے ہیں۔ نیوکلیس کے گرد مختلف ہالوں میں منفی ذرات گردش کرتے ہیں جن کو الیکٹران کہتے ہیں۔ ہر ہالے میں زیادہ سے زیادہ کتنے الیکٹران ہوں گے۔ یہ تعداد طے شدہ ہوتی ہے۔ اس تعداد سے زیادہ الیکٹران اس ہالے میں نہیں سما سکتے البتہ اس سے کم ہو سکتے ہیں۔ بجلی کے جو اچھے کنڈکٹر ہیں۔ ان کے ایٹموں کے خارجی ہالے اپنی حد سے کم الیکٹران رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہاں خالی جگہیں پائی جاتی ہیں۔ بجلی درحقیقت منفی ذرات (الیکٹران) پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔ جب کسی کنڈکٹر سے بجلی یعنی الیکٹران گزرتے ہیں تو یہ کنڈکٹر کے ایٹموں کے خارجی ہالوں سے گزرتے ہوئے جاتے ہیں۔ کچھ الیکٹران خالی جگہوں کو بھرتے ہیں تو کچھ اپنی جگہ سے ہٹ کر مزید خالی جگہ پیدا کرتے ہیں

▽ لکچرر باٹنی ڈپارٹمنٹ - ذاکر حسین کالج، اجمیری گیٹ - دہلی ۶

اس اچھل کود میں الیکٹران آپس میں ٹکراتے بھی ہیں جس کی وجہ سے ان کی توانائی حدت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور کنڈکٹر کو گرم کر دیتی ہے۔ اس طرح کنڈکٹر سے گزرنے والی بجلی کی خاصی مقدار ضایع ہو جاتی ہے۔ اوسطاً دیکھا گیا ہے کہ دوران ترسیل ۵۰ فیصد تک بجلی ضایع ہو جاتی ہے۔ سائنس داں مدت سے کوشاں تھے کہ ایسے کنڈکٹر بنائے جائیں جو بجلی کی صد فی صد ترسیل کر سکیں اس صد فی صد ترسیل کو سپر کنڈکٹوٹی کہا جاتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں ایک ڈچ ماہر طبیعات انیچ کے اونس نے دنیا کو اس مخصوص ترسیل سے روشناس کرایا تھا۔ یہ دریافت اتفاقیہ تھی اور ایک دوسرے تجربے کے دوران سامنے آئی تھی۔ اونس کم درجۂ حرارت پر بجلی کے تئیں پارے کی قوتِ مدافعت کا مشاہدہ کر رہا تھا جب درجۂ حرارت نفی ۲۷۰ کے قریب پہنچا تو پارے کی قوت مدافعت یکلخت ختم ہو گئی اور وہ مکمل کنڈکٹر بن گیا۔ سپر کنڈکٹوٹی کا یہ آغاز تھا۔ سائنس داں اسی وقت سے بڑی سرگرمی سے کوشاں تھے کہ کسی طرح زیادہ درجۂ حرارت پر بھی یہ عمل کرایا جا سکے۔ گزشتہ سال سے اس کام میں کافی تیزی آئی ہے اور خاص طور سے امسال ماہ اپریل سے تو اخبارات و جرائد میں سپر کنڈکٹوٹی کا خوب ہی چرچا ہے۔ اس جوش و خروش کی وجہ یہ ہے کہ مختلف تجربہ گاہوں میں سائنس داں زیادہ درجۂ حرارت پر یہ عمل کرانے میں کامیاب ہوتے جا رہے ہیں یہاں ایک قابلِ فخر بات یہ بھی ہے کہ اس میدان میں ہمارے سائنس داں بھی مغربی ممالک کے سائنس دانوں کے دوش بدوش ہیں۔

کم سے کم ممکنہ درجۂ حرارت ۲۷۳ ڈگری سینٹی گریڈ ہے اس کو ایبسولیوٹ زیرو یا زیرو کیلون بھی کہتے ہیں۔ اس سے کم درجۂ حرارت اس کائنات میں ناممکن ہے۔ اونس نے اپنے تجربے کے دوران یہ دریافت کیا تھا کہ اتنے کم درجۂ حرارت پر پارا اپنی قوت مدافعت کھو دیتا ہے اور بجلی کی ترسیل تیز ہو جاتی ہے۔ یہ وہ خواب تھا جو کہ سائنس داں برسوں سے دیکھ رہے تھے لیکن اس کو حقیقت کی شکل دینے کے لیے درجۂ حرارت میں اضافہ بہت ضروری تھا۔ کیونکہ کم درجۂ حرارت پیدا کرنا نہایت مشکل اور مہنگا سودا تھا۔ اونس کی اس دریافت کے بعد ۶۲ سال تک اس محاذ پر خاموشی رہی۔ لیکن یہ سکوت یقیناً کسی طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ دنیا بھر کے سائنس داں اپنی کوششوں میں خاموشی سے جٹے ہوئے تھے۔ اس سنّاٹے کو توڑنے والا پہلا دھماکہ ۱۹۷۳ء میں ہوا جب جان گیولیر نے ویسٹنگ ہاؤس امریکہ سے اطلاع دی کہ انھوں نے ۲۳٫۲ کیلون (نفی ۲۵۰٫۱۸ ڈگری) پر یہ خاص ترسیل کر لی ہے۔ اگرچہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۷۳ء کے بیچ درجۂ حرارت کے اضافے کی کوئی رپورٹ نہیں آئی لیکن اس دوران اس مخصوص ترسیل کے مختلف پہلوؤں پر غور ہوتا رہا اور اس کی وجوہات کی تلاش جاری رہی۔ ۱۹۵۷ء میں بارڈین کوپر اور شریفر نے سپر کنڈکٹوٹی کی تشریح کرنے والی مشہور بی۔سی۔ ایس تھیوری پیش کی جو کہ تا دمِ تحریر اس حیرت انگیز عمل کی سب سے مصدقہ اور مقبول (لیکن نامکمل) تھیوری ہے۔ اس میدان میں ۱۹۷۳ء کے بعد پھر سکوت چھا گیا لیکن ۱۹۸۶ء کے بعد تو جیسے اطلاعات کا تانتا بندھ گیا۔ ستمبر ۱۹۸۶ء میں سوئٹزرلینڈ کی آئی۔ بی۔ ایم کمپنی نے بیڈ نورز اور مُلر نے ۳۰ کیلون پر کامیابی حاصل کرنے کی اطلاع دی۔ جنوری ۱۹۸۷ء میں بیل تجربہ گاہ میں کام کرنے والے امریکن محقق کاوا اور ان کے ساتھیوں نے کچھ اور پیش رفت کی اور درجۂ حرارت کو ۳۶ کیلون تک لے جانے میں کامیاب ہوئے۔ تحقیقات کا میدان ایسا ہے کہ اس میں صبر اور عمل پیہم ہمیشہ ہی کامیاب ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی پال چو کے ساتھ ہوا۔ چو امریکہ کی ہوسٹن یونیورسٹی سے وابستہ ہیں اور ۱۹۶۵ء سے سپر کنڈکٹوٹی کے مختلف پہلوؤں پر یکسوئی سے کام کر رہے ہیں۔ انھیں اپنی ۲۱ سالہ محنتوں کا پھل اس وقت ملا جب وہ ۹۰ کیلون پر کام کرنے والا سپر کنڈکٹر بنانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ کامیابی انھیں مارچ ۱۹۸۷ء میں ملی یہاں کے ہندوستانی سائنس دانوں نے ہاک ڈور سنبھالی انھوں نے ہوسٹن میں کیے گئے ان تجربات کو اپنی تجربہ گاہ میں

میں دہرایا۔ ان تمام کامیابیوں کا دارومدار ان مادوں پر ہوتا ہے کہ جن سے کنڈکٹر بنائے جاتے ہیں۔ اگرچہ عام حالات میں ہم بجلی کی ترسیل کے لیے "تانبے" ایلومنیم اور لوہے وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں لیکن صدفی صد ترسیل کے لیے یہ کنڈکٹر بیکار ثابت ہوئے ہیں۔ آپ کو شاید یہ جان کر تعجب ہو کہ آج کم درجۂ حرارت پر جو چیز بجلی کی زبردست ترسیل کر رہی ہے' اسے ہم روزمرہ کی زندگی میں ایک انسولیٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں (انسولیٹر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے بجلی یا توانائی کی کوئی اور قسم بالکل نہیں گزرتی)۔ فیوز باندھنے کے لیے بجلی کا کٹ آؤٹ ہم سبھی نے میٹر سے نکالا ہوگا۔ اس کو جس چینی مٹی سے بنایا جاتا ہے وہی چینی مٹی کم درجۂ حرارت پر صد فی صد بجلی کو اپنے اندر سے گزار دیتی ہے جب کہ ہم اسے اب تک ایک ایسی چیز سمجھتے تھے کہ جس سے بجلی بالکل نہیں گزرتی۔ آج اس چینی مٹی کے ساتھ دیگر دھاتوں کو ملا کر مختلف مرکبات تیار کیے جا رہے ہیں اور اس کو بطور سپر کنڈکٹر پرکھا جا رہا ہے۔ خوش قسمتی سے ان کنڈکٹرس کی تیاری میں جو قدرتی دھاتیں استعمال ہوتی ہیں ان کے بے حساب خزانے ہمارے ملک میں پائے جاتے ہیں۔ اس وقت ہمارے یہاں کئی ادارے ان تحقیقات سے وابستہ ہیں ان میں آئی۔ آئی۔ ٹی مدراس، آئی۔ آئی۔ ایس۔ بنگلور' بھابھا ایٹمی ریسرچ سینٹر بمبئی' نیشنل فزیکل لیباریٹری نئی دہلی اور سی ایس۔ آئی۔ آر کی کئی اور تجربہ گاہیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور کے پروفیسر سی۔ این۔ آر۔ راؤ ان تمام کاوشوں کے سرخیل ہیں۔ بنگلور اور بمبئی کی تجربہ گاہوں میں چینی مٹی کی جگہ ٹیریم نامی ایک دھات کے ساتھ بیریم اور کوپر کے مرکبات بنا کر ۸۰ کیلون پر کامیابی حاصل کر لی گئی تھی۔ اب ان اجزا کو مختلف تناسب میں ملا کر تجربات کیے جا رہے ہیں جس طرح آج سے صدیوں قبل کیمیاگر اپنی تجربہ گاہوں میں مختلف چیزوں کو طرح طرح کے تناسب میں ملا کر کیمیا بنانے کے خواب دیکھا کرتے تھے' بالکل اسی طرح آج سائنس داں مختلف مرکبات بنا کر ان کی ترسیلی صلاحیت دیکھتے ہیں۔ ہماری تجربہ گاہوں میں بنیادی طور پر تین مرکبات استعمال ہو رہے ہیں۔ یعنی یٹریم آکسائیڈ اور بیریم آکسائیڈ جو کہ سفید پاؤڈر ہوتے ہیں اور کوپر آکسائیڈ جو کہ سیاہ ہوتا ہے اس سیاہ سفید کو ایک خاص تناسب میں ملایا جاتا ہے (تناسب ہی سب سے بڑا راز ہے) اس پاؤڈر سے پھر ایک یا دو گرام وزن کی گولیاں یا ٹکیاں تیار کی جاتی ہے جن کو ۹۵۰ ڈگری سینٹی گریڈ تک گرم کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں ان کو آکسیجن گیس کی محدود مقدار کی موجودگی میں دھیمی آنچ پر پکایا جاتا ہے۔ اس عمل کی مدت چھ سے دس گھنٹے کے درمیان ہوتی ہے اور اس سے جو پاؤڈر حاصل ہوتا ہے اس کی ترسیلی صلاحیت پرکھی جاتی ہے۔ دھات کے کنڈکٹر کے مقابلے ان کو ٹیسٹ کرنا بذات خود ایک مشکل کام ہے کیونکہ ان مرکبات سے تار بنانا بہت ہی دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے۔ اس وقت تک نارمل درجۂ حرارت پر سپر کنڈکٹوٹی کی دو رپورٹیں آچکی ہیں۔ واین اسٹیٹ یونیورسٹی امریکہ کے ڈاکٹر چین نے اپریل ۱۹۸۷ء میں ۲۴۰ کیلون (۳۳- ڈگری جو کہ قطب جنوبی کا اوسط درجۂ حرارت ہے) پر صدفی صد ترسیل دیکھی۔ جون ۱۹۸۷ء میں نئی دہلی کی نیشنل فزیکل لیبارٹری میں کام کر رہے سائنس دانوں کی ٹیم نے ۳۰۰ کیلون (۲۷ ڈگری جو کہ آج کل دہلی کا کم ترین درجۂ حرارت ہے) پر سپر کنڈکٹوٹی حاصل کر کے ترقی یافتہ ممالک کے سائنس دانوں کو انگشت بدنداں کر دیا لیکن واین یونیورسٹی اور نئی دہلی کے تجربات کے نتائج ابھی مزید ٹیسٹ ہونے باقی ہیں ہندوستانی سائنس داں اس وقت یہ جانچنے میں مصروف ہیں کہ اس درجۂ حرارت پر یہ عمل مستحکم بھی رہتا ہے یا نہیں' یہ بات طے ہونے کے بعد ہی اس دریافت کا سہرا ان کے سر بندھے گا لیکن اس وقت تمام متعلقہ ممالک میں ایک دوڑ جاری ہے جس طرح منزل کے نزدیک پہنچ کر ہر دوڑنے والے کی رفتار تیز

ہو جاتی ہے، اسی طرح ہمیں کوشاں ہیں کہ وہ پہلے منزل تک پہنچیں اس میدان میں ہندوستانی سائنس دانوں کی پیش رفت کو دیکھتے ہوئے حکومت نے اس جانب خاطر خواہ توجہ دی ہے وزیر اعظم نے کابینہ کی سطح کی ایک اعلیٰ کمیٹی قائم کی ہے جس کے چیرمین وہ خود ہیں۔ اس کمیٹی کے فرائض میں تحقیقات کو فروغ دینا شامل ہے۔ یہ تکنیک اتنی انقلابی ہے کہ اس سے حاصل ہونے والے فائدے صنعتی انقلاب اور الیکٹرانکس کی فیض یابیوں کو بھی بھولنے پر مجبور کر دیں گے۔ اس اعلیٰ ترسیل کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوگا کہ بجلی کی بچت ہو سکے گی۔ وہ ۵۰ فی صد بجلی جو دوران ترسیل ضائع ہو جاتی ہے۔ ہم اسے بچا سکیں گے اور اس طرح مزید بجلی پیدا کیے بغیر بجلی کی مقدار دوگنی ہو جائے گی۔ اس تکنیک سے برقی، مقناطیسی اور الیکٹرانک میدانوں میں حیرت انگیز ترقی ممکن ہو جائے گی۔ چوں کہ ان تینوں اقسام کی چیزوں میں بجلی کا استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا بجلی کی بہتر ترسیل نہ صرف یہ کہ ان کو سستا کر دے گی بلکہ دیگر بہت سی رکاوٹیں بھی دور ہو جائیں گی۔ آج بجلی فیل ہو جانے کی سب سے عام وجہ بجلی کے تاروں یا ٹرانسفارمروں میں آگ لگنا ہے جب برقی رو تیز یا زیادہ قوت سے چلتی ہے تو بجلی کے تاروں وغیرہ میں مدافعت کی وجہ سے حرارت بڑھ جاتی ہے جو زیادہ بڑھنے پر آگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جب مدافعت سے پاک مرکبات سے بجلی کے کیبل اور دیگر سامان بنے گا تو نہ مدافعت ہوگی نہ درجۂ حرارت بڑھے گا اور نہ کبھی آگ لگے گی۔ اس طرح بجلی کی مستقل فراہمی ممکن ہو سکے گی اور ایک پتلے سے کیبل کے ذریعے آج کے موٹے سے موٹے کیبل سے کہیں زیادہ بجلی گزاری جا سکے گی۔

توانائی کے میدان میں اس وقت سائنس دانوں کی تمام تر امیدیں فیوژن تکنیک سے وابستہ ہیں۔ اس تکنیک سے حاصل کی گئی توانائی لامحدود ہوگی۔ فیوژن کے عمل سے ہی سورج اپنی توانائی تیار کرتا ہے۔ سورج میں یہ عمل اربوں سال سے ہو رہا ہے اور اب بھی اس میں لامحدود توانائی موجود ہے جس کا سلسلہ نہ جانے کب تک چلے گا۔ آج ہم جس ایٹمی توانائی کا استعمال کر رہے ہیں وہ ایٹم کو توڑ کر حاصل ہوتی ہے۔ فیوژن تکنیک میں ایٹم کو توڑنے کے بجائے جوڑا جاتا ہے لیکن یہ عمل کافی بلند درجۂ حرارت پر ہی ممکن ہوتا ہے۔ کم از کم دس لاکھ سینٹی گریڈ پر ایٹم ایک دوسرے سے جڑ کر توانائی خارج کرتے ہیں۔ اتنے زیادہ درجۂ حرارت کو پیدا تو کر لیا جاتا ہے لیکن اس عمل کے دوران ایٹمی ذرّات اور توانائی کو محدود رکھنے کے لیے بہت طاقت ور مقناطیس درکار ہوتے ہیں جو بجلی کی مدد سے بنائے جاتے ہیں۔ جب بجلی کی سو فی صد ترسیل حاصل ہو جائے گی تو ایسے مقناطیس بہت آسانی سے اور چھوٹے سائز میں بن سکیں گے، ان پر لاگت بھی کم آئے گی۔ اس وقت ہمارے ملک کے سائنس داں مطلوبہ علمی صلاحیت اور تجربہ رکھتے ہیں لیکن ان تجربات کے اخراجات ان کو روکے ہوئے ہیں سپر کنڈکٹر کی آمد کے بعد یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ہندوستانی ماہرین فیوژن کے میدان میں بھی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں گے۔

سپر کنڈکٹر کی مدد سے جو اعلیٰ صلاحیت کے مقناطیس بنیں گے ان کی مدد سے تیز رفتار ریل گاڑیاں بن سکیں گی بغیر کسی حادثے کے خوف کے یہ گاڑیاں ۵۰۰ کلو میٹر فی گھنٹے سے بھی زیادہ رفتار سے دوڑیں گی۔ چونکہ یہ گاڑیاں زمین سے کچھ اوپر مقناطیسی قوت سے معلق ہو کر چلیں گی اس لیے کسی حادثے کا خطرہ بالکل نہیں ہوگا۔ جاپان اور مغربی جرمنی ایسی گاڑیاں بنا کر تجربہ کر چکے ہیں۔ اس کو "میگ لیو" ٹرین کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان بہترین مقناطیسوں سے امراض کی جانچ کے کام میں بھی سہولتیں پیدا ہوں گی۔ آج اندرونی امراض کی جانچ کے لیے این۔ ایم۔ آر اور ایم۔ آر۔ آئی مشینیں استعمال ہوتی ہیں۔ ان کی قیمت لاکھوں ڈالر ہے۔ کیوں کہ ان کے لیے اعلیٰ قوت کے مقناطیس بنانے پر بہت لاگت آتی ہے۔ اس

کام میں استعمال ہونے والی قیمتی ہیلیم گیس چھ لاکھ روپے کے عوض صرف ایک پڑتی ہے۔ سپر کنڈکٹر کی ایجاد کے بعد اس گیس کی ضرورت نہیں رہے گی اور مقناطیس بھی بہت کم لاگت سے تیار ہو سکیں گے۔

اس وقت ہمارا ملک ایک اور انقلاب سے دوچار ہے اور یہ انقلاب کمپیوٹر کی وجہ سے آیا ہے۔ سپر کنڈکٹر کی مدد سے کمپیوٹر سائز کو اور چھوٹا کیا جا سکے گا اور صلاحیت میں بھی اضافہ ممکن ہو گا۔ کمپیوٹر ہو یا کوئی بھی برقی یا الیکٹرانک آلہ۔ ان سب کے اندر سرکٹ استعمال ہوتے ہیں۔ برقی رو سے چونکہ حدت بھی پیدا ہوتی ہے اس لیے سرکٹ کو پھیلا کر اور بڑا بنایا جاتا ہے۔ ایسے الیکٹرانک آلات کو ایر کنڈیشن کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کے اندر حدت نہ بڑھے۔ سپر کنڈکٹر میں بجلی کی ترسیل میں نہ مدافعت ہو گی، نہ ہی درجۂ حرارت بڑھے گا۔ اس لیے سرکٹ کو اور چھوٹا اور ٹھوس بنایا جا سکے گا۔ علاوہ ازیں چونکہ سپر کنڈکٹر میں برقی رو مدافعت نہ ہونے کی وجہ سے بہت تیز دوڑے گی۔ اس لیے ایسے آلات نہایت حساس اور باصلاحیت ہوں گے۔ ایک نہایت پیچیدہ اور اعلیٰ کلاس کا کمپیوٹر ماچس کی ڈبیہ کے برابر ہو گا، جو آپ کی جیب میں بخوبی آرام کر سکے گا۔ ان کمپیوٹروں کو لگانے کے لیے نہ زیادہ جگہ درکار ہو گی، نہ بڑے بڑے کیبل اور نہ ہی ایر کنڈیشنر کی شرط۔

آخر میں اس مسئلے کا ذکر بھی ضروری ہے جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا تھا یعنی بجلی کی ذخیرہ اندوزی۔ سپر کنڈکٹر کی ایجاد کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ بجلی کا ذخیرہ کیا جا سکے گا۔ چونکہ سپر کنڈکٹر کے اندر نہ تو بجلی ضائع ہوتی ہے نہ مدت میں تبدیلی ہوتی ہے بلکہ صرف سفر کرتی رہتی ہے۔ لہٰذا ان کی مدد سے تیار کردہ بڑے بڑے کوائلز میں بجلی کو کسی ایمرجنسی کے لیے جمع کرنا ممکن ہو گا۔ مستقبل قریب میں ہمارے پاس بجلی کے گودام بھی ہوں گے جو ملک میں بجلی کے نظام کو استحکام بخش سکیں گے۔ قصہ مختصر ہر وہ مشین جس میں برقی مقناطیسی یا الیکٹرانک قوت استعمال ہوتی ہے اس کا سائز مختصر اور قیمت بہت کم ہو جائے گی۔ اگرچہ ابھی یہ باتیں خواب سی لگتی ہیں لیکن یہ وہ خواب ہے کہ جسے دیکھنے کی جسارت ہم کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اسے شرمندۂ تعبیر ہونے میں اب بہت زیادہ دن نہیں لگیں گے۔

"کسی کو ایک ایسی چیز حاصل ہو اور اس کو اس کی ضرورت ہو اور اس کا شوق رکھتا ہو تو اپنے شوق اور آرزو کو ترک کر کے دوسرے کو دے دے تو حق تعالیٰ اس کے گناہ بخش دے گا۔"

حضور نبی کریمؐ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۱، شمارہ ۱۲ - دسمبر ۹۲ء

# صداقت قرآن پر دو ثبوت

محمد ذکریا ورک ▽

امریکہ کی اسپیس ایجنسی "ناسا" (NASA) کے شٹل چیلنجر نے مشرق وسطیٰ کے ملک عمان کی جو تصاویر ۱۹۸۴ء میں خلاء سے لی تھیں ان کے مطابق ہزاروں سال پرانا ریت کے پہاڑوں کے نیچے مدفون شہر "اوبار" دریافت ہوگیا ہے۔ اس صدیوں پرانے شہر کو تلاش کرنے کے لیے امریکہ کے دو افراد کی ایک ٹیم نے یہ پراجیکٹ کوئی دس سال قبل شروع کیا تھا چنانچہ امریکہ کے خلائی جہاز سے جو تصاویر اس مدفون شہر کی لی گئیں اس کے مطابق اس شہر کے آثار جنوبی عمان کے ریتیلے علاقے ایمپٹی کوارٹر (EMPTY QUARTER) میں ریت کے انباروں کے نیچے پائے گئے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد اس ٹیم نے فیصلہ کیا کہ شہر کو ریت کے نیچے سے نکالنے کے لیے کھدائی کا کام شروع کیا جائے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۹۱ء میں اس مہم پر کام شروع ہوگیا۔ جب کام شروع ہوا تو موسم اس علاقے میں ایسا تھا کہ ریت کے زبردست تباہ کن طوفان اور زہریلے ریتیلے سانپ اس علاقے میں وافر مقدار میں نمودار ہوتے تھے۔ مگر اس رکاوٹ کے باوجود کام تسلی بخش رفتار سے ہوتا رہا۔

شہر کی کھدائی کے چند ہفتوں بعد ہی سائنس دانوں اور ماہرین آثار قدیمہ کو اس شہر کے نقشہ اور ہیئت کا اندازہ ہوگیا

اس شہر کی دیواریں پتھروں سے بنی ہوئی تھیں۔ اس میں اکثر گھروں میں منارے کیچڑ اور مٹی MUD اور کچی اینٹوں سے بنے ہوئے تھے۔ گھروں کے اندر کافی سارے کمرے تھے نیز پرانے برتنوں (POTTERY) کے ہزاروں ٹکڑے بھی شہر کے اندر ملے۔

اس ٹیم کے ایک ماہر آثار قدیمہ (آرکیالوجسٹ) کا نام جیورس ذارین (JURIS ZARIN) ہے جو امریکہ کی میسوری اسٹیٹ یونیورسٹی میں کام کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اندازہ ہے کہ یہ شہر ۲۸۵۵ سال پرانا ہے۔ اس کا اندازہ انہوں نے پرانے برتنوں سے لگایا ہے۔ یاد رہے کہ اس شہر کو تلاش کرنے کے لیے خلاء سے اکتوبر ۱۹۸۴ء میں عمان ملک کی تصاویر لی گئی تھیں ان میں "صحرائی ہائی وے" جو ریت کے نیچے مدفون تھیں ان کا کھوج لگایا گیا اور یوں ان سڑکوں اور ہائی ویز کو مدنظر رکھتے ہوئے شہر کے صحیح مقام کا تعین ہوگیا۔

اس قدیم ترین شہر کو تلاش کرنے والی ٹیم کے ایک ممبر کا نام مسٹر کلیپ (MR. CLAPP) ہے جو امریکہ کے ہر دل عزیز شہر لاس اینجلز میں فلمیں بناتے ہیں۔ ان کے ایک

---

▽ کنگسٹن، کینیڈا۔

دوست کا نام MR. HEDGES ہے جو پیشہ سے وکیل ہیں اور آثار قدیمہ میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں، ان دونوں نے مل کر اس شہر کو تلاش کرنے کے لیے سرمایہ لگایا اور ایک خطیر رقم صرف کی ۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ چند ماہ کے اندر اندر ان کو شہر کے آثار مل گئے۔

قرآن پاک کے سیپارے ۳۰ سورۃ الفجر میں اس شہر کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ إِرَمَ
ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي
الْبِلَادِ ۝

"اوبار" کو "میناروں والا شہر" کہا گیا ہے جو کہ حقیقت میں میناروں والا شہر ہے۔ پھر قرآن نے فرمایا کہ یہ لوگ اتنے ترقی یافتہ تھے کہ ان کی مانند کوئی قوم ان ملکوں میں پیدا ہی نہیں کی گئی تھی۔

ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق یہ شہر سنہ ۱۰۰ء (100 AD) میں کسی ناگہانی آفت سے تباہ ہو کر ریت کے نیچے دب گیا اور نئی تحقیق کے مطابق یہ شہر ایک (SINK-HOLE) زمین کے اندر نامعلوم وجہ سے پھسل کر پورے کا پورا دفن ہو گیا۔ اس شہر کی دریافت سے آثار قدیمہ کی سائنس اور علم کے ذریعے قرآن پاک کی صداقت اور کلام اللہ ہونے کا ایک اور ثبوت مہیا ہو گیا ہے۔ لاریب اس کتاب میں ہزاروں خزائن مدفون ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خزائن لوگوں کو بلا تمیز مذہب و نسل مل رہے ہیں۔ کاش کہ کلمہ پڑھنے مسلمان بھی ایسے خزائن خود تلاش کر سکیں۔

(۲)

کلام اللہ کے کتاب ہونے کا دوسرا ثبوت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سمندر میں سے اپنی قوم کے ساتھ گزرنے کا ہے۔ حال ہی میں امریکہ کے مشہور اخبار اور موقر جریدہ "لاس اینجلز ٹائمز" میں یہ رپورٹ شائع ہوئی ہے کہ ماہرین نے کمپیوٹر کی مدد سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آیا واقعی بحیرہ احمر (RED SEA) کے سمندر میں پانی آناً فاناً رک گیا تھا کہ حضرت موسیٰ اپنی قوم سمیت اس کو بلا خطر پار کر گئے تھے چنانچہ سمندر کی سائنس کے ماہرین اوشیانوگرافر نے اس جگہ کا تعین بھی کر لیا ہے جس مقام سے حضرت موسیٰ نے سمندر کو پار کیا تھا۔

امریکہ کے رسالہ "امریکن میٹرولاجیکل سوسائٹی بلیٹن" میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ان کی تحقیق کے مطابق میں اس روز جب حضرت موسیٰ نے سمندر کو پار کیا اس روز ۱۰ گھنٹے تک ہوا مخالف سمت میں چلتی رہی جس کی وجہ سے پانی کے بہاؤ کا رخ رک گیا اور سمندر کے نیچے سے خشک زمین نکل آئی یوں بنی اسرائیل خدا کے اس کرشمے کی بنا پر سمندر پار کر گئے۔ اگرچہ حضرت موسیٰ کے دشمن مصری بادشاہ کے سپاہی آپ کے تعاقب میں

"معاف کر دینا اپنی ذات کے سلسلے میں عزیمت ہے اور انتقام لینا رخصت، مگر قوم کے کمزوروں کے حق میں انتقام لازم ہے۔ اِلّا یہ کہ وہ کمزور لوگ خود ہی معاف کریں۔"

شاہ ولی اللہ محدث

تھے مگر جب دشمن سمندر کے عین اس مقام پر پہنچا تو ہوا کا رخ یکلخت مشیت ایزدی کے مطابق بدل گیا مگر جب فرعون اور اس کی فوج کے سپاہی عین اس مقام پر پہنچے اور سمندر کے پانی کو رکا پاکر نیز سمندر کی تہہ میں خشک زمین دیکھ کر وہ بلا خوف و خطر بنی اسرائیل کے تعاقب میں سمندر میں گھس گئے مگر ان کے گھسنے کی دیر تھی کہ ہوا کا رخ بدل گیا اور پانی پورے زور سے اپنے رخ پر بہنا شروع ہو گیا اور یوں فرعون اپنے لشکر سمیت پانی میں ڈوب کر نشانۂ عبرت بن گیا۔

ایک امریکی اوشیانوگرافر جرائیل سناڈی جو ورجینیا کی ریاست کے شہر نورفولک (NOR FOLK) کی ڈومینین یونیورسٹی میں تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں ان کا کہنا ہے کہ شمال مشرق سے چلنے والی ہوا جس کی رفتار ۶۵ سے ۷۲ کلومیٹر ہو وہ دس گھنٹے اگر چلتی ہے تو سمندر کے پانی کو وہ قریب ایک میل پیچھے ڈھکیل دے گی چنانچہ اس خاص علاقے میں پانی کا لیول ۱۰ فٹ کے قریب نیچے گر جائے گا۔ یہی صورت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوئی۔ ہوا کے رخ سے پانی کا لیول اتنا نیچے گر گیا کہ آپ اطمینان سے سمندر کو پار کر گئے۔

# حوالے


1. The Whig - STANDARD, KINGSTON, Canada
   Feb. 5/92
2. Los- Angeles Times. Reported in
   The TORONTO Star March 1992
   TORONTO, Canada.


"دوسری قوم کی رسومات کا اختیار کرنا اگرچہ بے تعصبی اور دانائی کی دلیل ہے مگر جب وہ رسمیں اندھے پن سے صرف تقلید و بغیر سوچے سمجھے اختیار کی جاتی ہیں تو کمالی ثبوت نادانی اور حماقت کا ہوتی ہیں"

سر سید[7]

# رسالہ "اسباب بغاوت ہند" — ایک مطالعہ

شجاع الدین فاروقی ▽

سرسید کی شخصیت کی طرح ان کے کارنامے بھی عظیم و ہمہ گیر تھے۔ انھوں نے علم و ادب، تعلیم و تہذیب اور مذہبی و معاشرتی اصلاح کے میدانوں میں ہی گراں قدر خدمات اور دوامی نقوش ثبت نہیں کیے ہیں، تاریخ و سیاسیات کی رزم گاہوں میں بھی اپنے اشہب قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔

تاریخ سے عملی دلچسپی کا اظہار وہ ۱۸۵۷ء سے قبل ہی "آثار الصنادید" کی تصنیف اور "آئین اکبری" کی ترتیب و تدوین کے ذریعے کر چکے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد انھوں نے "تاریخ سرکشی ضلع بجنور" شایع کی، جس کا مواد وہ قیامت خیز ہنگامے کے دوران ہی جمع کرتے رہے تھے۔ یہ کتاب یوں تو 'سرکشی ۱۸۵۷ء' کی تاریخ ہے۔ عملاً اس دور کے سیاسی حالات پر ایک عمومی تبصرہ بھی ہے۔ اس کے تقریباً ایک سال بعد انھوں نے 'اسباب بغاوت ہند' کے نام سے ایک مختصر رسالہ شایع کیا جس میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے مختلف اسباب پر ہی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے ان کے تدارک کے طریقوں پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس مختصر مگر انتہائی اہم تاریخی دستاویز کو سرسید کی پہلی مکمل سیاسی تحریر ہونے کا شرف حاصل ہے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بھی ان دونوں کتابوں کو سرسید کی سیاسی تصانیف کے زمرے میں ہی شمار کیا ہے ان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

> "سید احمد نے ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد دو کتابیں 'اسباب بغاوت ہند' اور 'تاریخ سرکشی بجنور' لکھیں۔ یہ دونوں کتابیں اس دور کے سیاسی حالات کو سمجھنے کے لیے بہترین مواد فراہم کرتی ہیں اس کے ساتھ ہی ان کتابوں سے سید احمد کی تاریخی حقائق پر نظر اور سیاسی مسایل کی پرکھ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔" [1]

پروفیسر ہارون خاں شروانی نے 'رسالہ اسباب بغاوت ہند' کو نہ صرف سرسید کا بلکہ کسی ہندوستانی کا پہلا سیاسی رسالہ قرار دیا ہے:

> "ان کا یہ رسالہ سیاسی طرز کا پہلا رسالہ ہی نہیں بلکہ یہ پہلا سیاسی رسالہ ہے جو کسی ہندوستانی نے لکھا ہے۔" [2]

۱۸۵۷ء کے خوں آشام حالات سے گزرنے والے جانتے تھے کہ انگریزوں کی نظر میں اس بغاوت کے اصل مجرم مسلمان ہی اس لیے وہی سب سے زیادہ عتاب کا شکار ہی۔ اس دور میں کسی شخص کا مسلمان ہونا ہی اس کا سب سے بڑا جرم تھا۔

---

▽ کاشانۂ کوثر، جامعہ اردو روڈ - علی گڑھ

بقول مولانا حالی

"مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لیے کوئی ثبوت
درکار نہ تھا۔ ان کا مسلمان ہونا ہی ان کے مجرم
ٹھہرانے کے لیے کافی تھا۔"

وہ دور زبردست خوف و ہراس کا دور تھا، مارشل لا نافذ تھا۔ حکم حاکم ہی قانون تھا۔ کوئی بھی شخص لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے وقت میں اظہار خیال کرنا اور حق بات کہنا یقیناً بہت بڑا جہاد اور جرأت کا کام سمجھا جا رہا تھا، چونکہ سرسید یہ رسالہ لکھ کر یہی کام انجام دے رہے تھے اس لیے ان کے دوست احباب انھیں اس خطرناک کام سے باز رکھنے کی مقدور بھر کوشش کر رہے تھے اور طرح طرح سے اس کے نتائج و مضرات سے ڈرا رہے تھے۔ مولانا حالی کے مطابق ان کے ایک ہندو دوست رائے شنکر داس نے جو اس وقت مرادآباد میں منصف تھے۔ آخر وقت تک یہ مشورہ دیا کہ ان مطبوعہ کتابوں کو جلا دو اور ہرگز اپنی جان کو معرض خطر میں نہ ڈالو۔"

لیکن تمام مخلصین کے لیے سرسید کا ایک ہی جواب تھا

"میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور
قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں، پس
اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں
کے لیے مفید ہو، مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو
گوارا ہے۔"

دراصل سرسید اپنے ان احباب و مخلصین سے کہیں زیادہ حالات سے باخبر اور دوربین و دور اندیش تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ کمپنی، جس کے دور میں بغاوت ہوئی تھی، ختم ہو چکی ہے اب ہندوستان کی حکومت براہ راست تاج برطانیہ کے ہاتھ میں ہے۔ کمپنی کی حکومت کے خاتمے کے بعد پارلیمنٹ میں جو مباحثے ہوئے تھے ان میں بھی بغاوت کے اسباب پیدا کرنے کی ذمہ داری [illegible]

کاروبار حکومت تاج برطانیہ کی طرف منتقل کیا گیا تھا۔ ہندوستان و انگلستان کے انگریزی اخبارات بھی کمپنی ہی کو مورد الزام ٹھہرا رہے تھے، گویا یہ ایک عام سیاسی ہوا اور مصلحت و ضرورت تھی کہ کمپنی کی حکومت کو بدنام کیا جائے تاکہ اس سے حکومت چھیننے کا جواز قائم ہو جائے۔ ہوا کے اس رخ کو دیکھ کر سرسید نے بھی یہی روش اختیار کی اور اسباب بغاوت کا تجزیہ کرتے ہوئے کمپنی کی حکومت کو ہی بڑی حد تک مورد الزام قرار دیا ورنہ اس سے ایک سال قبل وہ تاریخ سرکشی [illegible] میں بغاوت کی تمام ذمہ داری ہندوستانیوں [illegible] ناشکری و ناسپاسی کے سر ڈال چکے [illegible]

عتیق صدیقی [illegible] اس رائے کے مؤید ہیں کہ سرسید نے "اسباب بغاوت [illegible] سے قبل حکومت وقت کے چشم و ابرو کے اشاروں کو سمجھ لیا [illegible]

"اسباب بغاوت [illegible] کے اندراجات اس
نئی برطانوی حکومت کی پالیسی کے عین مطابق
تھے جو اپنی پیش رو ایسٹ انڈیا کمپنی کو ملعون
کہنے کے درپے تھی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اسباب
بغاوت ہند" کو سرکاری حلقوں میں ہاتھوں
ہاتھ لیا گیا

سرسید کی اس تحریر پر وائسرائے کی کونسل میں برطانوی پارلیمنٹ اور وزارت ہند میں گہرائی سے غور و خوض اور مباحثہ ہوا۔ وائسرائے لارڈ کیننگ اور مسٹر ہارنگ ممبر کونسل نے اس تحریر کو خیر خواہی پر محمول کیا۔ البتہ فارن سکریٹری مسٹر سیسل بیڈن کی رائے مختلف تھی۔ اس نے اس کے خلاف سخت تقریر کی اور کہا کہ "اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے۔ اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دی جانی چاہیے۔" لیکن اس انفرادی رائے کو پذیرائی حاصل نہ ہو سکی [illegible]

اس کتاب کی پذیرائی اور اہمیت کا صحیح اندازہ خود سرسید کو انگلستان جاکر ہوا۔ ان کے بیان کے مطابق

" سرجان کے' فارن سکریٹری وزیر ہند سے پرائیویٹ ملاقات ہوئی تو ان کی میز پر ایک دفتر کاغذات کا موجود تھا۔ انھوں نے ہنس کر کہا کہ تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے؟ یہ تمہارا رسالہ اسباب بغاوت ہند' اصل اور اس کا انگریزی ترجمہ ہے اور اس کے [illegible] مباحثات ہیں جو اس پر پارلیمنٹ [illegible] بلکہ وہ تمام مباحثے کا [illegible] بیے وہ نہ چھپے اور نہ ان کا [illegible] اخبار میں تذکرہ ہوا۔

مولانا حالی [illegible] یت کے پیش نظر مختلف سرکاری اداروں اور افراد [illegible] سے اس کے ترجمے ہوئے

" انڈیا آفس میں اس کا ترجمہ ہوا اور اس پر متعدد دفعہ بحثیں ہوئیں۔ گورنمنٹ انڈیا میں بھی اس کا ترجمہ کرایا گیا۔ پارلیمنٹ کے بعض ممبروں نے بھی اس کا ترجمہ کیا، مگر کوئی ترجمہ پبلک میں شائع نہیں کیا گیا لیکن ایک مدبر حاکم نے اسی زمانے میں اشاعت کی نظر سے اس کا ترجمہ شروع کیا تھا جس کو کرنل گراہم نے جو سرسید کے بڑے دوست ہیں، پورا کیا اور ۱۸۷۳ء میں چھپ کر شائع ہوا۔" ۹

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اسی زمانے میں ایک اور "ملازم سرکار" صوبہ دار سیتارام نے بھی اس موضوع پر اپنے تجربات اور خیالات قلم بند کیے ہیں جو " فرام سپاہی ٹو صوبیدار" کے نام سے تقریباً اسی زمانے میں شائع ہوئے جب اسباب بغاوت ہند' کا ترجمہ شائع ہوا تھا۔ " اسباب بغاوت" کا ترجمہ کرنل گراہم نے کیا تھا تو "فرام سپاہی ٹو صوبیدار" کو انگریزی لباس کرنل نارگیٹ نے پہنایا تھا۔ دونوں کے اسباب و نتائج میں خاصی مماثلت ہے لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سرسید کے یہاں تدبر و مصلحت کی تہیں چڑھی ہوئی ہیں جب کہ سیتارام کے یہاں سپاہیانہ بے باکی موجود ہے۔ مثلاً سرسید نے کمپنی کی حکومت کی خرابیاں اور خامیاں گنانے کے ساتھ "ملکہ عالیہ دام اقبالہا" کی حکومت اور ان کے مقرر کردہ "عادل و منصف حاکموں" کی مدح سرائی میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے جب کہ سیتارام نے انگریزوں کی اس دوسری حکومت کو اپنی پیش رو حکومت سے جابر تر اور دشوار تر، قرار دینے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا ہے۔" ۱۰

بہرحال 'اسباب بغاوت ہند' کی تصنیف کے محرکات کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ حالات حاضرہ کی روشنی میں سرسید کے فہم رسا اور تدبر و دور اندیشی نے آنے والے وقت اور حالات کا بخوبی ادراک کر لیا تھا اور اسی کے مطابق انھوں نے نہ صرف اس رسالے کے لکھنے کا بیڑا اٹھایا بلکہ آئندہ کا لائحہ عمل بھی مرتب کیا۔ اس وقت کے لوگوں کو سرسید کی بصیرت کا بھلے ہی اندازہ نہ ہوا ہو لیکن اس رسالے کی تصنیف کے کافی عرصے بعد بھی مولوی طفیل احمد منگلوری کا یہ کہنا کہ اس کتاب کو توپ کے منہ کے سامنے بیٹھ کر ایک ملازم سرکار نے لکھا تھا عدم واقفیت اور مبالغے پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔

اس پورے پس منظر کی موجودگی میں پروفیسر خلیق احمد نظامی کی رائے ہی صائب معلوم ہوتی ہے ــــ

" ان کی کتاب 'اسباب بغاوت ہند' ان کی سیاسی طور پر بیدار مغزی کی آئینہ دار ہے۔" ۱۱

سرسید کی اس بیدار مغزی اور دور اندیشی نے ہی اس مختصر سی کتاب کو وقعت و عظمت عطا کی۔ بقول مولانا حالی ـــــ

" اس تحریر سے سرسید کا ایک عمدہ مدبر سلطنت اور ملک اور گورنمنٹ کا خیر خواہ ہونا ثابت ہوتا ہے ــــ" ۱۲

انگلستان کے اخبارات "ہوم نیوز" برمنگھم ڈیلی گزٹ اورینٹ جیمس بجٹ' وغیرہ نے سرسید کی حکومت برطانیہ کے حق میں کی گئی اس گراں قدر خدمت کو سراہا۔ ایک ممبر پارلیمنٹ مسٹر ایچ جی کین نے تو اخبار "ہوم وردلڈ نیل" میں سرسید کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا ——

> "سید احمد خاں ٹھیک اس قسم کا شخص ہے جس کو ہندوستان کا ایک انگلش منتظم اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش کرے گا خصوصاً مشکل اور خطرے کے وقت میں —— وہ تاج برطانیہ کا ایک خیر خواہ اور دوست ہے ——" [۱۴]

تھیوڈر بک کے مطابق سر آکلینڈ کالون کہتے تھے کہ ——

> "کسی شخص نے — عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی، برٹش گورنمنٹ کے استحکام سلطنتِ ہندوستان کے بارے میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جس قدر کہ سرسید نے کی ہے ——" [۱۵]

بہرحال یہ شخصی رائے ہے جو مبالغے پر بھی مبنی ہو سکتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ سرسید نے یہ رسالہ لکھ کر برطانوی حکومت کو صحیح راہ دکھانے کی کوشش کی تھی اور یہ کارنامہ ان کے برطانوی خیر خواہی و وفاداری کے منجملہ بہت سے کارناموں میں سے ایک ہے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی جانیں بچانے، ان کی دوبارہ حکومت قائم کرنے میں دل و جان سے مدد دینے، انگریزوں کے قریب مسلمانوں کو ان کے قریب لانے کی کوشش کرنے اور انھیں انگریزی تعلیم و تہذیب کی طرف راغب کرنے کی تمام مساعی بڑی حد تک برطانوی حکومت کے استحکام کا ذریعہ تھیں — برطانوی حکومت نے ان خدمات جلیلہ کا معقول انعام

پیش کیا۔ ان کے عہدے و منصب میں ترقی ہوئی۔ ان کی اولاد ان کے بڑے بیٹے کی تا عین حیات دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کی گئی اور انھیں وہ عزت و احترام اور خطابات و اعزازات دیے گئے جو شاید ہی کسی ہندوستانی کے حصے میں آئے ہوں۔

رسالہ اسباب بغاوت ہند کی اہمیت اور اس کی پذیرائی و قدر و منزلت کے جائزے کے بعد اس کے مندرجات کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

یہ تقریباً ۷۰ صفحات کا ایک مختصر سا رسالہ ہے جسے پانچ سو کی تعداد میں آگرہ کے مطبع مفصلات گورنمنٹ ۱۸۵۸ء میں طبع کرایا گیا تھا، اس کی عام اشاعت سے پرہیز کرتے ہوئے تقریباً تمام کاپیاں برطانوی پارلیمنٹ کے ممبران اور حکومت ہند کو بھیج دی گئی تھیں۔ صرف چند کاپیاں ہی اپنے پاس محفوظ رکھی گئی تھیں۔ ۱۸۷۳ء میں اس کا پہلا انگریزی ترجمہ شائع ہوا لیکن دوسرے اردو ایڈیشن کی نوبت نہیں آئی اس لیے مولانا حالی نے 'حیات جاوید' میں اسے بطور ضمیمہ شامل کر لیا تھا۔

اس رسالہ کی ابتدا فارسی کے دو شعروں سے ہوتی ہے جن میں حمد باری بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد رسالہ کی ایک مختصر سی تمہید ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اسباب بغاوت کا بیان اب ضروری ہو گیا ہے۔ کیونکہ بقول سرسید ——

> "جو اشتہار جناب ملکہ معظمہ کوئن وکٹوریہ ... [illegible] ... [illegible] ... [illegible] ... ان کی ... [illegible] ... ہو گیا ——" [۲۰]

اس کے ... [illegible]

خیرخواہی اپنی گورنمنٹ کی، کہ ان اسباب کا تجزیہ ایک ہندوستانی کے نقطۂ نظر سے کریں جو اس بغاوت کے محرک ہوے۔

اس مختصر تمہید کے بعد عنوان ہے "کیا سبب ہوا؟ ہندوستان کی سرکشی کا" اس کے بعد سرکشی کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ انھیں کے الفاظ میں

"اپنی گورنمنٹ کا مقابلہ کرنا یا مخالفوں کے
شریک ہونا یا مخالفانہ ارادے سے حکم نہ
ماننا اور نہ بجا لانا یا نڈر ہو کر گورنمنٹ کے
حقوق اور حدود کو توڑنا سرکشی ہے"[۳۵]

سرکشی کی تعریف بیان کرنے کے بعد انھوں نے اس کی مختلف پانچ اقسام بتائی ہیں نیز ان کے خیال میں ۱۸۵۷ء میں ہر قسم کی سرکشی ظہور میں آئی۔ اس کے بعد انھوں نے "سرکشی کا ارادہ دل میں کیوں آتا ہے" عنوان سے یہ دلچسپ سوال کیا ہے کہ سرکشی کی بنیادی وجہ کیا ہوتی ہے؟ انھیں کے الفاظ میں اس کا جواب یہ ہے ______

"سرکشی کا ارادہ جو دل میں پیدا ہوتا ہے
اس کا سبب ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی پیش
آنا ان باتوں کا جو مخالف ہوں ان لوگوں
کی طبیعت اور طینت اور ارادہ اور عزم اور
رسم و رواج اور خصلت اور جبلت کے جنھوں
نے سرکشی کی ______"[۳۶]

سرسید کے مطابق ۱۸۵۷ء کی سرکشی کے لیے بہت سے اسباب جمع ہو گئے تھے جنھوں نے مل کر اس قیامت خیز ہنگامہ کو جنم دیا۔ انھیں کے الفاظ میں ______

"بہت سی باتیں ایک مدت دراز سے
لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بہت
بڑا میگزین جمع ہو گیا تھا صرف اس کے شتابے
میں آگ لگنی باقی تھی کہ سال گذشتہ میں
فوج کی بغاوت نے اس میں آگ
لگادی ______"[۳۷]

سرسید اس خیال کی سختی سے تردید کرتے ہیں کہ اس بغاوت کی پہلی سے منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ اس ضمن میں انھوں نے ہر اس خیال کو رد کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ اس بغاوت کے لیے پہلے سے تیاری کی گئی تھی۔

سرسید کی رائے میں اس بغاوت کی "اصلی اور بنیادی وجہ ایک ہی تھی اور وہ ان کے الفاظ میں ______

"شریک نہ ہونا ہندوستانیوں کا لیجس لیٹو
کونسل میں، اصلی سبب اس فساد کا میں
تو ایک ہی سمجھتا ہوں باقی جس قدر اسباب
ہیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں ______"[۳۸]

سرسید کے مطابق اسی ایک وجہ نے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے دلوں میں سخت قسم کی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا کر دی تھیں اور انھیں دور کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کیونکہ درمیانی رابطہ مفقود تھا۔ سرسید کے الفاظ میں ______

"بلا شبہ ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم تھا
کہ ہماری رعیت پر دن کیسا گزرتا ہے اور
رات کس مصیبت کی آتی ہے اور وہ دن
بدن کس مصیبت میں پڑتے جاتے ہیں اور
کیا کیا رنج روز بروز ان کے دل میں جمتے جاتے
ہیں جو رفتہ رفتہ بہت کثرت سے جمع
ہو گئے تھے اور ایک ادنیٰ تحریک سے
دفعتہً بھبھ پڑے ______ گورنمنٹ
کی ہر تجویز پر رعایا کو غلط فہمی ہوتی، جو
تجویز گورنمنٹ کی ہوتی تھی ہندوستانیوں
کو بسبب اس کے کہ وہ لوگ اس میں شریک
نہ تھے اور اس تجویز سے واقف نہ تھے اس

کی بنیاد معلوم نہ ہوئی اور ہمیشہ یہی سمجھے کہ یہ بات ہمارے اور ہمارے ہم وطنوں کے خراب اور برباد اور ذلیل اور بے دھرم کرنے کو ہے۔" [٤٤]

سرسید نے اس بنیادی سبب کے علاوہ پانچ دوسرے اسباب کی نشان دہی کی ہے اور پھر ان پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ انھوں نے مثالوں سے اپنے دعووں کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مطابق یہ پانچ اسباب مندرجہ ذیل ہیں ——

اول : غلط فہمی رعایا یعنی برعکس سمجھنا تجاویز گورنمنٹ کا۔

دوم : جاری ہونا ایسے آئین اور ضوابط اور طریقۂ حکومت کا جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کی عادات کے مناسب نہ تھے یا مضرت رسانی کرتے تھے۔

سوم : ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار و عادات اور ان مصائب سے جو ان پر گزرتی تھیں اور جن سے رعایا کا دل گورنمنٹ سے پھٹا جاتا تھا۔

چہارم : ترک ہونا ان امور کا ہماری گورنمنٹ کی طرف سے جن کا بجالانا ہماری گورنمنٹ پر ہندوستان کی حکومت کے لیے واجب اور لازم تھا۔

پنجم : بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج کی ۔" [٤٥]

ان ہی بنیادوں پر سرسید نے ان تمام اسباب و عوامل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جو اس بغاوت کے محرک بنے لیکن وہ اسے منظم و منصوبہ بند یا ایسی قومی لڑائی ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں جس کا مقصد انگریزی حکومت کو اکھاڑ پھینکنا ہو۔ وہ اسے بعض سپاہیوں کی حکم عدولی سمجھتے تھے اور وہ بھی کسی بغاوت یا انقلاب لانے کی غرض سے نہیں بلکہ جہالت اور مذہبی تعصب و توہمات کی وجہ سے۔

انڈیا آفس کے انڈر سکریٹری ولیم کے ۔ (WILLIAM KAY) - بھی سرسید کے ہم خیال تھے۔ انھوں نے اس موضوع پر سپاہی وار (SEPOY WAR) کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اسے سپاہیوں کی بغاوت ہی قرار دیا ہے۔ لارڈ لارنس نے بھی اسے صرف کارتوسوں کے سبب سے سپاہیوں کا ایک ہنگامہ قرار دیا ہے اور کوئی عام سازش یا ملکی بغاوت کے تصور سے انکار کیا ہے۔

انگریزوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے اور مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بچانے کی سرسید کی یہ کوشش مستحسن اور قابل داد ہو سکتی ہے لیکن جدید تحقیقات نے ان کے اکثر تجزیات اور نتائج کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ آج اسے کوئی بھی محض بغاوت یا سپاہیوں کی حکم عدولی و سرکشی ماننے کو تیار نہیں ہے۔ آج اسے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی تسلیم کیا جاتا ہے۔ سرسید کا یہ کہنا کہ بہادر شاہ ظفر کی کوئی وقعت نہ تھی اور وہ اس قدر مخبوط الحواس تھے کہ پرستان میں جنوں کے بادشاہ کو بھی اپنا تابعدار سمجھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ وہ مکھی اور مچھر بن کر اڑ جاتے ہیں اور دور دراز کی خبریں لے آتے ہیں، واقعات و حقائق کے خلاف ہے۔ بہادر شاہ ظفر اپنی تمام کس مپرسی کے باوجود اس پہلی جنگ آزادی کی علامت اور اس کے سب سے بڑے رہنما بن گئے تھے۔ آزادی کے سبھی پروانے اسی ٹمٹماتی ہوئی شمع کے گرد اکٹھا ہو گئے تھے، ملک کے سبھی ہندو مسلمانوں نے ان ہی کی قیادت پر اعتماد کیا تھا۔ اس دوران انھوں نے جو کام کیے وہ بھی تمام کمزوریوں کے باوجود انھیں بیدار مغز ثابت کرتے ہیں، مخبوط الحواس نہیں۔

ظفر کے کلام میں ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات و واقعات پر ان کی گہری نظر تھی اور وہ ان کے نتائج و مضرات سے بخوبی آگاہ تھے مگر بے بس و مجبور تھے۔ انھوں نے غدر سے کافی پہلے حالات کے پیش نظر یہ پیشین گوئی بھی کر دی تھی کہ

ہے ظفر بس تجھ ہی تک یہ انتظام سلطنت
بعد تیرے نے ولی عہدی نہ نام سلطنت

اس لیے یہ کہنا کہ وہ ایک فاطر العقل انسان تھے، حق و انصاف کے خلاف ہے۔

آج تاریخی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ ایک منظم منصوبہ کے تحت لڑی گئی تھی اور اس کا مقصد ملک سے غلامی کا خاتمہ ہی تھا، یہ الگ بات ہے کہ مختلف وجوہات کی بنا پر یہ ناکام رہی۔

مسلمانوں پر عیسائیوں کا یہ عام اعتراض ہے کہ انھوں نے جبراً لوگوں کو مسلمان بنایا ہے حالانکہ یہ ایک صریح جھوٹ اور لغو الزام ہے جس کی تردید خود انصاف پسند غیر مسلموں اور مستشرقین نے بھی کی ہے لیکن تعجب ہے کہ خود سرسید نے اس الزام کو تسلیم کیا ہے اور اسے اس طرح بیان کر دیا ہے جیسے یہ کوئی امر واقعہ ہو۔ انھوں نے جہاں عیسائیوں کی طرف سے ہندوستانیوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کا ذکر کیا ہے وہیں اسے بطور امر واقعہ ذکر کیا ہے۔

"ہر شخص دل سے جانتا تھا کہ ہماری گورنمنٹ کے احکام بہت آہستہ آہستہ ظہور میں آتے ہیں اور جو کام کرنا ہوتا ہے، رفتہ رفتہ کیا کرتے ہیں، اس واسطے دفعتہً اور جبراً مسلمانوں کی طرح دین بدلنے کو نہیں کہنے مگر جتنا قابو پاتے جائیں گے اتنی اتنی مداخلت کرتے جائیں گے ........ سب کو یقین تھا کہ ہماری گورنمنٹ علانیہ جبر مذہب بدلنے پر نہیں کرے گی"[۴۲]

بہرحال ان فروگزاشتوں سے قطع نظر رسالہ اسباب بغاوت ہند، سرسید کا ایک بہت ہی وقیع اور قابل قدر کارنامہ ہے۔ اس کے ذریعے سے ایک طرف انھوں نے قوم کو عتاب سے بچانے کی کوشش کی اور دوسری طرف خود انگریزوں کی نظر میں ایک قابل اعتبار وفادار اور خیر خواہ شخص قرار پائے۔ بقول مولانا حالی ——— :

"رسالہ اسباب بغاوت ہند، جس کا لکھنا ایک حیثیت سے ملک اور قوم کی بے نظیر خدمت اور دوسری حیثیت سے تاج برطانیہ کی حقیقی خیر خواہی کا کام تھا۔ سرسید کی ان جلیل القدر خدمات میں سے ہے جن سے وہ ارکان سلطنت میں شمار کیے جانے کے مستحق ہوئے ہیں ———"[۴۶]

# حوالے

۴۱ سید احمد خاں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ ص ۱۰۹۔ پبلی کیشنز ڈویژن، حکومت ہند۔ جون ۱۹۷۱ء
۴۲ پروفیسر ہارون خاں شروانی، خطبۂ صدارت، انڈین پولیٹکل سائنس ایسوسی ایشن، ۱۹۵۲ء ص ۳
۴۳ حیاتِ جاوید۔ مولانا حالی۔ ص ۹۲۔ ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء
۴۴ ایضاً ص ۹۳
۴۵ ایضاً ص ۹۳
۴۶ سرسید احمد خاں۔ ایک سیاسی مطالعہ۔ عتیق صدیقی۔ ص ۳۹۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۶۶ء
۴۷ بحوالہ حیات جاوید ص ۹۴

۸؎ بحوالہ 'حیات جاوید' ص ۳۲۳

۹؎ حیات جاوید' ص ۹۵

۱۰؎ بحوالہ سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ ص ۴۲

۱۱؎ مسلمانوں کا روشن مستقبل' مولوی طفیل احمد منگلوری ۔ ص ۱۹۵ ۔ دہلی ۱۹۴۵ء

۱۲؎ سیّد احمد خاں' پروفیسر خلیق احمد نظامی ۔ ص ۱۴۰

۱۳؎ حیات جاوید۔ ص ۹۵

۱۴؎ بحوالہ حیات جاوید ص ۳۲۲

۱۵؎ ایضاً ص ۳۲۲

۱۶؎ رسالہ اسباب بغاوت ہند۔ ص ۱ مشمولہ حیات جاوید' ص ۸۰۳

۱۷؎ ایضاً ص ۲ " ص ۸۰۴

۱۸؎ ایضاً ص ۲ " ص ۸۰۴

۱۹؎ ایضاً ص ۳ " ص ۸۰۵

۲۰؎ ایضاً ص ۹ " ص ۸۱۱

۲۱؎ ایضاً ص ۱۱ " ص ۸۱۳

۲۲؎ ایضاً ص ۱۲-۱۳ " ص ۱۵-۸۱۴

۲۳؎ ایضاً ص ۱۳ " ص ۸۱۶

۲۴؎ حیات جاوید ص ۲۳-۳۲۲

---

# عوام کی حفاظت

فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے کہا:

"آپ اپنے ساتھ حفاظتی دستہ کیوں نہیں رکھتے۔"

فرمایا:

"عوام کا کام میری حفاظت نہیں بلکہ میرا فرض ان کی حفاظت کرنا ہے۔"

# آرڈی اسٹیٹ

سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی▽

ارباب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہر سال چند حضرات موسم گرما میں تبدیل آب وہوا اور تفریح طبع کے لیے آرڈی اسٹیٹ رانی کھیت جاتے ہیں اور چند دن وہاں قیام فرماتے ہیں۔ راقم الحروف کو بھی وہاں جانے اور قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ لہٰذا اس کے متعلق کچھ تاثرات ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

آرڈی اسٹیٹ کے بانی ولیم آرڈی تھے۔ انہوں نے جب ہندوستان چھوڑا تو ۱۹۵۸ء میں کرنل سید بشیر حسین زیدی صاحب، وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اٹھائیس ہزار روپے میں یہ اسٹیٹ معہ فرنیچر وغیرہ اُن سے یونیورسٹی کے استعمال کے لیے خرید لی۔ یہ اسٹیٹ سوا چار ایکڑ زمین میں کمایوں رجمنٹ کے علاقے میں واقع ہے۔ پہاڑی علاقہ ہے۔ چیڑ اور دیودار وغیرہ کے درخت بکثرت ہیں۔ اسٹیٹ کے جانب مشرق نیچے کھڈ میں ایک چشمۂ آب (سوتا) بھی ہے۔ اس چشمے کے نزدیک ایک بزرگ کا مزار واقع ہے۔ یہ کالو سید بابا کا مزار مشہور ہے اور یہاں سالانہ عرس بھی ہوتا ہے۔ یہ اسٹیٹ جانب شمال مشرق پہاڑ سے ڈھکا ہوا اور جانب جنوب مغرب کھلا ہوا ہے اور کھڈ ہے۔

آرڈی اسٹیٹ میں تین بنگلے تعمیر شدہ ہیں۔ بڑا خاص بنگلہ بلند تر پہاڑی پر ہے۔ اس سے نیچے پہاڑی پر دو بنگلے ہیں۔ ایک بڑا بنگلہ اور دوسرا جھونپڑی کے مانند جو "وولیس فولی" کے نام سے موسوم ہے۔ بڑے خاص بنگلے اور نچلے بڑے بنگلے میں چار رہائشی حصے ہیں اور وولیس فولی واحد ہے۔ اس طرح یہ تینوں بنگلے نو رہائشی سوئٹس پر مشتمل ہیں۔ یہ بنگلے ترشے ہوئے سنگی بلاکوں سے تعمیر کیے گئے ہیں۔ بڑے خاص بنگلے کے جانب مشرق و شمال وسیع برآمدے ہیں۔ برآمدوں کے در سنگ سیاہ کے ترشے ہوئے ہشت پہلو ستونوں سے بنائے گئے ہیں۔ چھتیں لکڑی اور اس کے اوپر ٹین سے ڈھلوان بنائی گئی ہیں تاکہ عمارت برف باری کے ایام میں محفوظ رہے۔ خاص بنگلہ کے جانب جنوب ٹینس کورٹ تھا۔

ماحول اس علاقے کا سرد، دلفریب اور دلکش ہے اور پرسکون بھی۔ لہٰذا علمی تحقیق کا کام یہاں اطمینان کے ساتھ انجام پاسکتا ہے۔ مطالعے کے لیے یہ ماحول نہایت سازگار ہے۔ ڈپارٹمنٹ آف لائف سائنس کے ریسرچ اسکالر یہاں جنگلی جانوروں اور پرندوں وغیرہ کی تحقیق میں مصروف رہتے

---

▽ سابق چیرمین شعبۂ کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہیں — اس علاقے میں جڑی بوٹیاں بکثرت ہیں۔ شعبۂ علم الادویہ کے ریسرچ اسکالرز کو بھی تحقیق و ریسرچ کے لیے یہاں آنا چاہیے اور ایجوکیشنل ٹور میں آرڈی اسٹیٹ رانی کھیت کو بھی شامل کرنا چاہیے۔

آرڈی اسٹیٹ سے بازار مال روڈ تقریباً دو کلومیٹر فاصلے پر ہے۔ مال روڈ پر ایک مختصر بازار ہے جہاں سے روزمرہ ضروریات کی اشیاء خرید کی جاسکتی ہیں۔ چائے کے دو چھوٹے ہوٹل بھی ہیں۔ مال روڈ ہی سے بس شہر رانی کھیت اور دیگر پہاڑی مقامات خصوصاً چوبیتا گارڈن کے لیے دستیاب ہوتی ہیں۔

شہر رانی کھیت مال روڈ سے تقریباً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ مال روڈ سے بس بآسانی ملتی ہے۔ پیدل راستہ تقریباً چار کلومیٹر ہے۔ اس راستے کے وسط میں بھی ایک بزرگ کا مزار ہے۔ رانی کھیت کا بازار اچھا خاصا طویل ہے۔ ہر قسم کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ پھل تازہ اور اچھے دستیاب ہوتے ہیں۔ بازار میں متعدد گیسٹ ہاؤس ہیں۔ مون ہوٹل ایک مسلم ہوٹل ہے جہاں قیام و طعام کا بہتر انتظام ہے۔ مون ہوٹل کے عقب میں ایک مسجد بھی واقع ہے۔ بازار کے آخر میں بس اسٹینڈ ہے جہاں سے باہر جانے کے لیے بسیں ملتی ہیں۔ بازار سے قریب ہی یہاں ایک سلک فیکٹری بھی ہے جہاں شالیں اور سوئٹر کے لیے گرم کپڑا اچھا ملتا ہے۔

چوبیتا گارڈن مال روڈ سے تقریباً آٹھ کلومیٹر کے فاصلہ پر جانب مشرق واقع ہے۔ مال روڈ سے وہاں جانے کے لیے بس ہر وقت دستیاب ہوتی ہے۔ یہ ایک پُر فضا باغ ہے سیاح بکثرت یہاں آتے ہیں۔ یہاں سیب کے باغات ہیں اور باغات کے علاوہ انواع و اقسام کے پھولدار اور کانٹے دار پودے ہیں۔ وسط باغ میں ایک بارہ دری چھتری بنائی گئی ہے جہاں تکان دور کرنے کے لیے سیاح آرام کر سکتے ہیں۔

رانی کھیت سے تقریباً ساٹھ میل دور کوسانی واقع ہے جہاں سیاح طلوع و غروب آفتاب کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے جاتے ہیں یہاں پہاڑوں کا دلفریب منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔

دورحاضر میں آرڈی اسٹیٹ خراب حالت میں ہے اور قابل مرمت ہے۔ اسٹیٹ کی سڑکیں بھی خراب ہیں عمارتیں بوسیدہ ہیں ستون جھک گئے ہیں۔ کمروں اور برآمدوں کے فرش بھی خراب ہیں اور قابل مرمت۔ پارکنگ اور ٹینس کورٹ بھی درستی کے قابل ہے۔ برآمدوں میں گملوں کے بجائے ٹن کے کنستروں میں پھلواری لگی ہوئی ہے۔ اکثر کرسیاں ٹوٹی پڑی ہیں۔ اسٹیٹ میں پانی کی فراہمی دشوار ہے پانی کم اور دقت سے دستیاب ہوتا ہے۔ غسل خانوں میں گرم پانی کے لیے گیزر مہیا نہیں ہے۔

نماز کے لیے ایک چھوٹی مسجد یہاں بہت ضروری ہے تاکہ نمازی لوگ نماز صحیح طور سے ادا کر سکیں عبادت الٰہی کے لیے بھی یہ پرسکون مقام نہایت مناسب ہے۔

> "حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لوگوں نے دریافت کیا کہ اگر آپ حکم کریں تو آپ کے واسطے ہم ایک عبادت خانہ بنادیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: اچھا جاؤ! پانی پر گھر بناؤ۔ لوگوں نے پوچھا، پانی پر گھر کس طرح تعمیر کیا جائے۔ تب آپ نے فرمایا کہ دنیا کی دوستی اور عبادت دونوں کس طرح جمع ہوسکتی ہیں۔"
>
> امام غزالی
> کیمیائے سعادت

اگر ارباب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اس اسٹیٹ کی درستی کی جانب خصوصی توجہ مبذول فرمائیں تو یہ مقام رشکِ جنت بن سکتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی یہ اسٹیٹ ایک قدیم یادگار ہے اور رانی کھیت میں اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔

ارباب یونیورسٹی سے کچھ حضرات ہر سال موسم گرما میں برائے تبدیلی آب و ہوا اور سیر و تفریح یہاں تشریف لاتے ہیں اور چند دن قیام فرماتے ہیں اور مذکورہ امور کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور تکلیف بھی اٹھاتے ہیں۔ کاش ارباب حل و عقد مسلم یونیورسٹی اس قدیم تاریخی عمارت کی اصلاح و درستی کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں تو یہ مقام رشکِ جنت اور تعلیمی اعتبار سے ایک مفید مرکز بن سکتا ہے۔

"بیگم محمد علی کے ہمراہ کام کرتے ہوئے مجھے جو تجربات ہوئے ہیں میں اپنے قارئین کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ گزشتہ سال انھوں نے پبلک کاموں میں اپنے شوہر کی مدد کرنا شروع کیا۔ ابتدا سمرنا فنڈ کے لیے چندہ جمع کرنے سے ہوئی تب سے وہ ہمارے دورے اور خصوصاً بہار، آسام و بنگال کے سفر میں بھی شریک رہی ہیں۔ انھوں نے خواتین کے جلسوں سے بھی خطاب کرنا شروع کیا ہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں تقریر کا ملکہ اپنے بہادر شوہر سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ ان کی تقاریر مختصر ہونے کے باوجود انتہائی پر اثر ہوتی ہیں۔ میں کہہ نہیں سکتا وہ اپنے شوہر کو بھی کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہنے کا یہ آرٹ سکھاتی ہیں یا نہیں؟

مہاتما گاندھی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۱، شمارہ ۱۲ (دسمبر ۹۲ء)

# ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی مسایل

مدثر الاسلام

اِدھر پچھ کچھ عرصے سے یہ محسوس کیا جانے لگا ہے کہ اگر مسلمان اپنی تعلیمی پسماندگی اور کم مائیگی کو دور کرنے کی کوئی سبیل نہ نکالیں گے تو وہ ملک کے دوسرے شہریوں کے مقابلے میں ہر شعبۂ زندگی میں پیچھے رہ جائیں گے اور خود ہی دوسرے درجے کے شہری بن جائیں گے۔ اس جانب کیرالا مسلم ایجوکیشن سوسائٹی اور جمعیۃ العلمائے ہند کی حالیہ مذہبی اور تعلیمی کانفرنسیں ایک مثبت اور خوش آئند قدم ہیں۔ مسلمانوں کی یہ تعلیمی پسماندگی حقیقت میں ان کی معاشی بدحالی اور معاشی استحکام کے فقدان کی وجہ سے ہے یا وہ حقیقتاً تعلیم کے میدان سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رکھتے یہ ایک طویل، دقت طلب اور اختلافی بحث ہے۔

میری ناقص رائے میں یہ ضروری ہے کہ مذہبی معاملات کو تعلیمی مسایل سے مربوط نہ کیا جائے بلکہ ان کو بالکل الگ تھلگ رکھا جائے اور ان پر الگ الگ غور و فکر کیا جائے۔ مثلاً مسلم پرسنل لا میں مداخلت، تعدد ازدواج یعنی یہ غلط فہمی کہ اسلام صرف مخصوص حالات میں چار بیویوں تک کی اجازت دیتا ہے یا ہر حال میں ہر ایک کے لیے چار بیویاں لازمی قرار دیتا ہے۔ اسلام میں عورتوں کے ساتھ مساوی برتاؤ کی گنجایش نہیں ہے۔ مسلمان بڑی آسانی سے اپنی بیوی کو طلاق دے کر

دودھ کی مکھی کی طرح پھینک سکتا ہے۔ ان غلط فہمیوں ک
ازالہ مسلم رہنماؤں کو عموماً اور علمائے دین کو خصوصاً توجہ
ساتھ کرنا چاہیے لیکن وہ مسایل جن کا تعلق خالصتاً تعلیم
ہے مثلاً مسلم اسکولوں میں تعلیم کا اعلیٰ معیار، امتحان کے نتا
میں بہتری بلکہ اگر ممکن ہو تو برتری، نصاب تعلیم کا انتخاب ا
تعلیم پر خصوصی توجہ، مسلم اسکولوں میں کن زبانوں کی تعلیم لازمی
دی جائے۔ مادری زبان اردو کو دوسری زبانوں پر کیوں تر
دی جائے، مسلم اسکولوں کا اقلیتی کردار کس طرح برقرار رکھا
جائے۔ کون کون سے ذرایع اختیار اور استعمال کیے جائیں
ے پرائمری سطح سے یونیورسٹی تک مسلم بچوں کے اندر مقابلہ
کا مقابلہ کرنے کی اہلیت، قابلیت اور صلاحیت پیدا ہو، ج
تعلیم حاصل کرنے میں وہ دین سے بیگانہ نہ ہو جائیں۔ خود اپ
اداروں میں وہ غیر مسلم طلبا سے تعلیم کے میدان میں کسی طر
پیچھے نہ رہ جائیں۔ ہر معاملہ میں وہ "سفارش" کا منہ نہ تکیں بلک
ہر جگہ ان کی قابلیت، ان کی اہلیت، ان کی صلاحیت ہی ان ک
"سفارش" بن جائے۔ یہ وہ مسایل ہیں جن کا تعلق مذہب
ے نہیں بلکہ صرف اور صرف تعلیم سے ہے۔ اس لیے ان مسایل
پر عام جائزانہ نظر نہیں بلکہ خاص ماہرانہ نظر ڈالیں۔

پرنسپل سٹی ہائی اسکول۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ

اس وقت اترپردیش، بہار، بنگال، آندھراپردیش،
رمہاراشٹرا کے مسلم اسکولوں کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے وہ نہ صرف
نکا دینے والی بلکہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہے کیونکہ یہ
سکول تعلیم وتربیت گاہیں نہیں بلکہ سیاسی مقاصد کے حصول
لے اڈے ہیں۔ ان اسکولوں میں اکثریت ایسے اسکولوں
ا ہے جن کی مجلس منتظمہ کے بیشتر اراکین اور عہدے دار
نمول منیجر جاہلِ مطلق لوگ ہیں جو اپنے دستخط تک نہیں کرسکتے
یکن وہ یا تو اپنی دولت کے بل پر یا گروہ بندی کے بوتے
پران اسکولوں پر نہ صرف قابض ہیں بلکہ اپنے ذاتی اغراض و
مقاصد کے حصول کے لیے ان کا استعمال کر رہے ہیں۔ کیا
س کینڈے کے لوگ ملک وقوم کی کوئی خدمت انجام دے
سکتے ہیں یا اپنی ملت کے نوجوانوں کی تعلیمی پسماندگی دور
کرسکتے ہیں؟ نہیں کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔ تیس برس سے
درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہونے کی وجہ سے
یں نجی طور پر اس بات سے خوب ہی واقف ہوں کہ ان اسکولوں
یں سب کچھ ہوتا ہے، ہر کام ہوتا ہے سوائے تعلیم کے۔
چاہے وہ کانپور کا حلیم مسلم کالج ہو یا لکھنؤ کا کرامت
حسین گرلز کالج۔ چاہے وہ مسلم کالج سکندرہ راؤ ہو یا مسلم
کالج ایٹہ۔ چاہے وہ فیض عام کالج مظفرنگر کا ہو یا میرٹھ
کا۔ چاہے وہ مسلم کالج اٹاوہ ہو یا ذاکر حسین اینگلو عربک
کالج دہلی۔ چاہے وہ الہ آباد کا مجیدیہ کالج ہو یا
آگرہ کا غنیبیہ۔ چاہے وہ شاہجہاں پور کا فیض عام کالج
ہو یا ہردوئی کا رفیع احمد کالج۔ چاہے وہ ہیویٹ کالج
مرادآباد ہو یا امام المدارس امروہہ۔ چاہے وہ انجمن اسلامیہ
بمبئی کے قائم کردہ ادارے ہوں یا بہار کے ہاشمی یا ہادی اسکول
ان سب اعلیٰ مسلم اداروں کا کم وبیش ایک جیسا حال ہے
جن تعلیم کم خرافات زیادہ۔ ہمارے ان مسلم اداروں کے
قیام کا ایک اور صرف ایک مقصد ہے وہ ہے مجلس منتظمہ
سے متعلق حضرات کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانا۔ ذاتی

اغراض ومقاصد کے حصول کا ذریعہ ہیں یہ نامور ادارے۔
ہر شعبۂ زندگی میں غیر قوموں کی نقالی کو ہم اپنے لیے
باعثِ عزت وافتخار سمجھتے ہیں۔ اس لیے اپنے تعلیمی اداروں
میں نصاب کے انتخاب میں ان ہی کے نقشِ قدم پر چلنے
کی کوشش کرتے ہیں۔ چاہے اس نقالی میں ہم کو اپنے
طرزِ معاشرت، تہذیب وتمدن، مذہب اور اخلاقی ورثے
سے ہی کیوں نہ دست بردار ہونا پڑے۔ اس کا یہ مطلب
ہرگز ہرگز نہیں کہ مسلم بچے قومی دھارے سے بالکل کٹ
کر رہ جائیں لیکن جو علامات ہمارا طرۂ امتیاز ہیں وہ البتہ
ایک دم نہ مٹ جائیں۔ ہم اپنی شناخت اور اپنا تشخص برقرار
رکھیں۔ مثلاً آج کل مسلم اور غیر مسلم لڑکی میں تمیز کرنا بہت
مشکل ہے کیونکہ ماتھے پر بندی لگانا فیشن بن گیا ہے کم از کم
مسلم اداروں کو اس طرف ضرور توجہ کرنی چاہیے کہ ان کے
طلبا وطالبات اپنے چہرے بہرے سے بھی مسلمان معلوم ہوں
مسلمان ہونا احساس کمتری کی بات نہیں فخر کی بات ہے۔ فخر سے
اس بات کا اظہار کرنا چاہیے کہ ہم مسلمان ہیں۔
تعلیمی میدان میں مسلم اداروں کی فی الوقت اور
فی الحال صرف اور صرف یہی سعی وکوشش ہے کہ وہ نشستم برخاستم
کورس ختم کرائیں اور طلبا کو امتحان میں شریک کرا دیں بغیر
اس پر توجہ دیے اور کیے ہوئے کہ سال بھر میں طلبا نے
کچھ سیکھا بھی یا نہیں۔ ان کی کوشش تو صرف یہی ہوتی ہے
کہ جس طرح بھی ممکن ہو جائز یا ناجائز ان کے اسکول کا نتیجہ
اچھا رہے جس سے ان کا وجود برقرار رہے۔ طالب علم سے
مقررہ فیس مقررہ وقت پر وصول ہو جائے یہی بڑی کامیابی
ہے چاہے وہ اسکول آئے یا نہ آئے، چاہے وہ کتابیں
کاپیاں خریدے یا نہ خریدے اسی طرح ان اسکولوں کی
توجہ اس طرف کبھی نہیں ہوتی کہ ان کے جو نصاب پڑھایا جاتا
ہے وہ ملک اور مذہب دونوں سے مناسبت رکھتا ہے
یا نہیں۔ طلبا اپنی مادری زبان اردو کو ترجیحی طور پر پڑھتے

ہیں یا نہیں۔ طلبا کو مقابلے کے امتحانوں کے لیے تیار کیا جا رہا ہے یا نہیں۔ اسکول طلبا کے والدین سے طلبا کے متعلق وقتاً فوقتاً نہیں بلکہ پابندی سے رابطہ قایم کرتا ہے یا نہیں حالانکہ طلبا کے "والد صاحبان" کچھ ایسے بے حس واقع ہوتے ہیں کہ وہ بھول کر بھی کبھی اسکول کا رُخ نہیں کرتے کہ اپنے سپوتوں کی کارکردگی اور کارگزاری معلوم کریں۔ ہاں داخلے کے وقت البتہ اسکول میں پڑاو ڈالنے ہی کی نیت اور ارادہ کرکے تشریف لاتے ہیں۔ داخلہ کے لیے جائز ناجائز کوئی طریقہ، کوئی وسیلہ کوئی ذریعہ کوئی حربہ نہیں چھوڑتے۔ اس کے بعد پھر ان کی صورت نظر نہیں آتی۔ آپ شاید یقین نہ کریں کہ بعض اوقات جب کسی طالب علم کے والد کو اس کے "سپوت" کے "کرتوت" سے آگاہ کرنے کے لیے طلب کیا جاتا ہے تو وہ "نقلی والد" بھیج دیتے ہیں کیونکہ اپنی تجارت کی انتہائی مصروفیات کی وجہ سے خود تشریف نہیں لا سکتے۔ اگر کسی تعمیری کام کے لیے ان "ملک التجار" حضرات سے اعانت کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ لسے اپنی اہانت خیال کرتے ہوئے معذرت کر لیتے ہیں۔ ہاں کسی سرکاری افسر کی ضیافت کا معاملہ ہو تو ان کی تجوریوں کے منھ البتہ بڑی فیاضی سے کھل جاتے ہیں۔ دوسری طرف اگر بدقسمتی سے کبھی کوئی ٹیچر کسی طالب علم کی تادیبًا اور تنبیہًا گوشمالی کر دے تو ایک قیامت برپا ہو جاتی ہے اس کا سیدھا بحال کرایا جاتا ہے۔ افسرانِ بالا سے شکایت کی جاتی ہے اور بعض اوقات تو خود بھی درپے انتقام ہو جاتے ہیں۔ وہ زمانہ لد گیا جب والدین یہ کہہ کر بچے کو اسکول میں داخل کیا کرتے تھے کہ ہڈی میری چمڑی آپ کی۔ یہ ہماری انتہائی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم ٹیچر بچپن میں تو اپنے استاد کے ہاتھوں پٹتے اور اب اپنے شاگردوں کے ہاتھوں پٹ رہے ہیں۔ اس طرح کے "خوش گوار" واقعات نہیں حادثات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی نظروں میں اسکول نہ تو تعلیم گاہیں ہیں اور نہ تربیت گاہیں بلکہ صرف تفریح گاہیں ہیں۔ جب طلبا کا لازمی عمل یہ ہو تو تعلیم کا معیار کس طرح بلند ہو سکتا ہے اور مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کیسے دور ہو سکتی ہے۔ آیئے ذرا تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھیں۔ مسلم اسکولوں کے اساتذہ کی کارکردگی بھی بہت اطمینان بخش نہیں ہے قابل تعریف کون کہے۔ اسکول کے مفاد پر وہ اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کو ترجیح دیتے ہیں۔ طلبا کی فلاح و بہبود سے زیادہ وہ اپنی فلاح و بہبود کے لیے متفکر رہتے ہیں۔ ان کو روٹی روزی کی فکر زیادہ اور روٹی روزی کا ذریعہ یعنی اسکول کی فکر کم رہتی ہے۔ ان میں علمی موضوعات پر مباحثے کم اور تنخواہوں کے اسکیل اور مہنگائی بھتے کی ادائیگی پر مذاکرات زیادہ ہوتے ہیں۔ کلاسوں میں جانے میں نہیں کلاسوں سے آنے میں وقت کی پابندی کا خیال رکھتے ہیں۔ اسکول دیر سے پہنچنے کی وضع داری ہر حال میں بنائے رکھتے ہیں۔ کبھی کبھار منھ کا مزہ بدلنے کے لیے طلبا کو پڑھا بھی دیتے ہیں۔ اپنی قابلیت اور لیاقت کو بڑھانا اور بڑھاتے رہنا انتہائی فرسودہ خیال تصور کرتے ہیں۔ ان کے مضمون کے متعلق کون کون سی نئی کتابیں آئی ہیں اس کا علم ان سے زیادہ کتب فروشوں کو ہوتا ہے۔ ان سب "خصوصیات" کے باوجود قوم و ملت اپنے اسکولوں کا مقابلہ دہلی پبلک اسکول، سکوار اسکول، ویلہم اسکول، دون اسکول، نینی تال کے سینٹ جوزف اور آگرہ کے سینٹ پیٹرس اسکول سے کرنا چاہتی ہے جن کے یہاں فرائض منصبی کی ادائیگی دین و ایمان کا درجہ رکھتی ہے، جہاں کے ٹیچر درس و تدریس کا کام "بیگار" یا "اوور ٹایم" سمجھ کر نہیں فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔ پھر آخر ان اسکولوں کے طلبا ہمارے اسکولوں کے طلبا سے ہر شعبہ میں آگے بہت آگے کیوں نہ رہیں گے۔ اکثر لوگ یہ اعتراض جڑ دیتے ہیں کہ ملک کے ان بہترین اسکولوں میں اساتذہ کو تنخواہیں اور دوسری مراعات و سہولیات ہمارے اسکولوں سے زیادہ ملتی ہیں۔ یہ بات سولہ آنے سچ نہیں ہے کیونکہ

ہمارے یہاں کچھ چند اسکول ایسے موجود ہیں جو اپنے اساتذہ کو پبلک اسکولوں سے زیادہ تنخواہیں اور سہولیات فراہم کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان اسکولوں کی کارکردگی پبلک اسکولوں کے مقابلے میں ہیٹی ہی رہتی ہے۔ ہمارے اسکولوں میں سیشنل نمبر (Sessional Marks) عموماً طلبا کی محنت پر نہیں بلکہ اس کی شکل دیکھ کر دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح امتحان کے کمروں میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزرتے ہی ممتحن پھر جلدی مچانے لگتے ہیں کہ جلدی کرو۔ کب تک بیٹھے رہو گے جب کہ پرچہ ڈھائی یا تین گھنٹے کا ہوتا ہے۔ ادھر مسلم طلبا کا بھی یہ حال ہے کہ پڑھائی لکھائی سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ اللہ واسطے کا بیر ہے۔ بے ضابطگی ان کا خاصہ ہے اور بدتمیزی، بدزبانی، بدتہذیبی اور بداخلاقی ان کا طرۂ امتیاز۔ جہاں امتحان کے قریب وہ ضرور باادب ہو کر ٹیچر کے گھر کے چکر پر چکر لگانے لگتے ہیں کہ "Important" کے نام پر ان سے پیپر کی سن گن لے لیں۔ پچھلے دس برسوں سے Important کی اس بیماری نے وبائی شکل اختیار کر لی ہے جس میں طلبا سے زیادہ ان کے والدین مبتلا ہیں۔

مسلمانوں کے تعلیمی مسایل میں مسلم اسکولوں کی انتظامیہ بھی خاصہ اضافہ کرتی ہے۔ عام طور سے کارکردگی انعام یا سزا کا باعث نہیں بنتی بلکہ ذاتی تعلقات اور رنجی رنجشیں اس کی محرک ہوتی ہیں۔ اکثر پرنسپل صاحبان سینئر اساتذہ کی بے عزتی کرنے سے بھی نہیں چوکتے بلکہ بعض اوقات جونیئر ٹیچر کو اس کا ذریعہ بناتے ہیں جو خوش آئند مستقبل کے لالچ میں خوشامد پسند پرنسپل کے اردگرد ناچتے رہتے ہیں۔ پرنسپل اکثر و بیشتر ایسے حاشیہ برداروں کو اپنی مطلب برآری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ میری اس بات پر آسانی سے یقین نہ کریں لیکن ہے یہ ایک حقیقت بلکہ تلخ حقیقت ہے جو گاؤں کے چھوٹے موٹے اسکولوں سے لے کر بڑے شہروں کے بڑے بڑے اسکولوں اور کالجوں تک میں یہ امراض عام اور نمایاں ہے۔ زیادہ تر پرنسپل صاحبان اپنے کو "فوق البشر" متصور کرتے ہیں اور اپنے اختیارات کا بے جا استعمال ان کا شیوہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایک طرف تو اسکول کا مینیجمنٹ غیر جانب دار ہو اور دوسری طرف پرنسپل کا انتخاب بڑی احتیاط اور ہوش مندی سے کیا جائے اور ایسے شخص کو تو پرنسپل ہرگز ہرگز نہ بنایا جائے جس کے رٹائرمنٹ میں دس برس سے زیادہ باقی ہوں کیونکہ پھر وہ خود تو شتر بے مہار ہو جاتا ہے اور دوسروں کی لگام اتنی زور سے کھینچتا ہے کہ یا تو لگام ٹوٹ جاتی ہے یا منہ۔

کچھ مشورے کچھ گذارشیں

۱۔ مسلم اسکولوں کو تعلیم سے متعلق اپنے فرسودہ نظریے کو تبدیل کرنا ہوگا جس سے وہ فی زمانہ جدید اسکولوں جیسی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں۔

۲۔ مسلم اسکولوں کو اپنا اقلیتی کردار بنائے رکھنا ہوگا جن مسلم اداروں نے اپنے اسکولوں کو اقلیتی ادارہ ڈیکلیر نہیں کیا ہے ان کو جلد سے جلد یہ کام کر لینا چاہیے۔

۳۔ مسلم اسکولوں میں مذہبی تعلیم کا مناسب انتظام ہونا چاہیے جیسا کہ مسلم یونیورسٹی کے اسکولوں اور کالجوں میں پرائمری سطح سے گریجویٹ سطح تک انتظام ہے۔

۴۔ مسلم اسکولوں میں تعلیم کا ذریعہ اردو اور انگریزی دونوں ہوں لیکن مادری زبان اردو کو ترجیح دی جانی چاہیے اور ہر مسلمان طالب علم کے لیے اردو لازمی مضمون ہو۔

۵۔ ہر اسکول میں ہر درجہ کا ایک سیکشن ایسا ضرور ہو جس میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو جس کے طلبا پبلک اسکولوں کے طلبا کے شانہ بشانہ کھڑے ہو سکیں۔

۶۔ اردو اور انگریزی کے ساتھ ساتھ قومی زبان ہندی کی تعلیم بھی ہر مسلمان بچے کے لیے لازمی ہو جس سے وہ قومی دھارے سے کٹ کر نہ رہ جائے۔

۷۔ سہ لسانی فارمولے (Three Language Formula) کے تحت ہر مسلمان بچے کو یہی تین زبانیں یعنی اردو، انگریزی اور ہندی پڑھائی جائیں۔

۸۔ عربی اور دینی مدارس میں دینی تعلیم کے شانہ بہ شانہ طلبا کو دنیوی علوم جیسے انگریزی، ریاضی، سائنس، تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم سے بھی روشناس کرایا جائے جس سے وہ آئندہ زندگی میں کسی طرح کی احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔

۹۔ مسلمانوں کو منڈل کمنڈل کسی کمیشن کا سہارا نہ لینا چاہیے بلکہ اللہ اور اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ رکھنا چاہیے اللہ تعالیٰ نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی جس کو خود اپنی حالت بدلنے کا خیال نہ ہو۔ "ریزرویشن" احساس کمتری پیدا کرتا ہے اس لیے مسلم طلبا کو زندگی کے ہر مقابلے کے لیے خود کو تیار کرنا چاہیے۔

۱۰۔ یہ ہمارا زبردست المیہ ہے کہ خود اپنے اداروں میں اپنے بچے غیروں سے پیچھے رہتے ہیں جس کا ثبوت وہ رپورٹیں اور وہ اعداد و شمار ہیں جو احمد رشید خاں شیروانی برابر شایع کرتے رہتے ہیں۔ خود ہمارے ادارے سٹی ہائی اسکول میں ہر سال "ٹاپ" کرنے والے طلبا اکثر و بیشتر غیر مسلم ہوتے ہیں جو ایک طرف تو ہماری غیر جانب داری پر دال ہیں اور ہمارے متعصب اور فرقہ پرست ہونے کی پرزور نفی کرتے ہیں لیکن دوسری طرف خود ہم کو احساس شرمندگی میں مبتلا کرتے ہیں کہ کاش یہ ٹاپر (Topper) ہماری قوم و ملت کے نونہال ہوتے۔

۱۱۔ داخلے کے وقت مسلم اسکولوں میں ان طلبا کو ترجیح دی جانی چاہیے جو اردو میڈیم سے پڑھنا چاہتے ہیں۔

۱۲۔ صوبائی اور ضلعی سطح پر ایسی کمیٹیاں بنائی جائیں جو ملک کے مختلف مسلم اداروں میں تال میل پیدا کریں، ان کے لیے مفید اور یکساں نصابِ تعلیم کا انتخاب کریں۔ وقتاً فوقتاً مختلف مسلم اداروں کا دورہ کرکے ان کی کارگزاری کا جائزہ لیں اور انھیں مفید مشوروں سے نوازیں۔ ان کے مسایل حل کرنے میں ان کی مدد کریں۔ مسلم بچوں کو ان کی معاشی دشواریوں کے باوجود تعلیم کی طرف راغب کرنے کی کوشش کریں خصوصاً پیشہ وارانہ تعلیم کی طرف۔ موجودہ 10+2+3 طریقۂ تعلیم اسی مقصد کے حصول کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

۱۳۔ مسلم اسکولوں کے اساتذہ صاحبان سے بھی میری گزارش ہے کہ وہ ملی خدمت کے جذبے کے تحت کام کریں۔ خدمتِ خلق پر خدمتِ خلق کو ترجیح دیں صرف یہ سوچ کر کہ ایک دن اپنے ایک ایک عمل کا حساب محتسبِ حقیقی کو دینا ہے۔ اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مسلم اداروں میں فرض شناس اساتذہ نایاب ہیں۔ نایاب تو نہیں ہاں کمیاب ضرور ہیں۔ ہمیں یہی کوشش کرنی ہے کہ یہ کمیابی فراوانی میں تبدیل ہو جائے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش ہمارا نصب العین ہو۔ قحط الرجال نہ کل تھا، نہ آج ہے اور نہ انشاء اللہ کل ہوگا۔ ہاں کوشش اور محنت شرط ہے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ساتھ ہی اس پر بھی ہماری نظر مرکوز ہونی چاہیے کہ ہم اساتذہ سے اس طرح کی فرض شناسی کی توقعات جس میں ہماری ہر عادت عبادت بن جائے

تبھی وابستہ کریں جب ہم ان کے مسائل پر انسانی ہمدردی سے غور و فکر کریں۔ ان کی تنخواہیں، ان کی مراعات ان کی سہولیات، ان کی ترقی؛ کسی میں بھی ان کی حق تلفی نہ ہو۔ مسلم قیادت اگر سیاست کی غلاظت سے ہٹ کر ادھر بھی متوجہ ہو تو مسلمانوں کی نہ صرف تعلیمی پسماندگی دور ہو سکتی ہے بلکہ ان کی معاشی بدحالی کا بھی بڑی حد تک خاتمہ ہو سکتا ہے۔

اوپر جو کچھ بھی میں نے عرض کیا ہے اس کا تعلق صرف اصولِ تعلیم یا بچوں کی نفسیات یا مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی ضروریات سے ہی نہیں ہے بلکہ میری معروضات کی تمام تر بنیاد خود میرے طویل تجربے اور عمیق مشاہدے پر ہے۔ کیونکہ بنیادی طور پر میں خود ایک ٹیچر ہوں جس نے اپنی عمرِ عزیز کا بیشتر حصّہ درس و تدریس میں کھپایا ہے۔

---

مسلمانوں کی قوم میں کوئی صرف اس بات پر نازاں ہے کہ ہم سیّد ہیں، آلِ رسول ہیں اور ناز نے ان کو دین و دنیا دونوں قسم کی عزت حاصل کرنے سے روک رکھا ہے۔ اگر کسی سے کہو کہ آپ کا لڑکا کچھ ریاضی حساب پڑھا ہے تو کہتے ہیں کہ لاحول ولا قوۃ اِلّا باللہ اور اگر کہیں کہ صاحب قرآن حدیث پڑھا ہے تو کہیں کہ اجی صاحب ہم کیا اس کو مولوی بنانے۔ پھر اب اُن سے پوچھو کہ تم نے کیا بنایا ہے۔ مولوی تم نے نہیں بنایا۔ دنیا دار تم نے نہیں بنایا؟ کیا گدھا بنایا ہے جو ہمیشہ دوسروں کا بوجھ اُٹھائے گا۔"

سرسیّد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۱، شمارہ ۱۲ (دسمبر ۹۲ء)

# ماحولیاتی آلودگی

## حقیقت کے آئینے میں

محمد کمال الدین ▽

**تعارف:** ماحولیاتی آلودگی سے میری مراد ہمارے اردگرد کی آب و ہوا اور کھانے پینے سے ہے۔ ہمارا ماحول جس طرح دن بہ دن آلودگی کا شکار ہو رہا ہے۔ اس سے انسان اور جاندار کیا پیڑ پودے بھی متاثر ہو رہے ہیں اور ماحول کی اس آلودگی کے ذمہ دار ترقی پذیر ملکوں سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک ہیں۔ کیوں کہ آج ہماری دنیا جہاں ترقی کی راہ پر گامزن ہے، وہیں پر یہی ترقی ہمارے لیے کئی مسایل بھی پیدا کر رہی ہے جہاں ایک طرف ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، نیوکلیر بم، کیمیائی بم اور میزائیل وغیرہ ایجاد ہو رہے ہیں اور بہت سے ممالک اپنی طاقت اور ذہنی ترقی کا دبدبہ دکھاتے ہیں، وہیں اس کی جانچ اور جنگوں میں استعمال سے ہمارا ماحول گندہ ہو رہا ہے اور ان ہتھیاروں سے نکلی گیس سارے دنیا کو نسلوں میں موت بانٹ رہی ہے جس کا اثر آج کی اور آنے والی نسلوں پر بھی پڑے گا۔ ۱۹۴۵ء میں جاپان کے ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم چھوڑا گیا اور جاپان برباد ہو گیا تھا اور اس کا اثر آج بھی وہاں پیدا ہونے والے بچوں پر بخوبی دیکھا جا سکتا ہے جب کہ آج امریکہ اور دوسرے ممالک کے پاس اس سے چالیس گنا زیادہ طاقتور بموں کا اسٹاک موجود ہے۔ جس کی حال ہی میں امریکہ نے جانچ کی تھی۔ ذرا سوچیے اگر اس جیسا بم جنگوں میں استعمال ہوگا تو دنیا کی آبادی پر اس کا کیا اثر ہوگا؟۔ ماحول گندہ رہنے سے ہمارے جسم میں مختلف ذرایع جیسے کھانا، پانی اور سانس کے ذریعے آلودگی داخل ہو رہی ہے۔

### مسائل اور اسباب

آج کے ترقی یافتہ دور میں کئی مسایل ہمارے سامنے موجود ہیں۔ جیسے اوزون منڈل میں سوراخ، تیزابی بارش، سوکھا، باڑھ، زمین کے درجۂ حرارت میں اضافہ Green House Effect وغیرہ خاص ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک بہت ہی اہم گیس جو لوگوں کے لیے درد سر ہے اسے (Chloro Floro Carbon)CFC کہتے ہیں۔ یہ گیس زیادہ تر ترقی یافتہ ملکوں میں استعمال ہو رہی ہے امریکہ اس گیس کو سب سے زیادہ ماحول میں تحلیل کر رہا ہے۔ دوسرے نمبر پر مشرقی روس ہے مگر ترقی پذیر ممالک بھی اس سے بچے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ گیس زیادہ تر ایرکنڈیشنس، جیٹ جہاز، ایروسول اسپرے پینٹنگ، پلاسٹک اور ریفریجریٹروں کے بنانے میں استعمال ہوتی ہے ویسے

---

▽ محلہ بیاں، پوکھر، گیا ۸۲۳۰۰۱

یا اور بھی کئی مشینوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ
جب مشینوں سے رِسنے کے بعد ماحول میں سرایت
ہے تو وہ سیدھے اوپر کی طرف بڑھتی ہے۔ کیونکہ یہ
سے ہلکی گیس ہے اور ہماری زمین کے اوپر جو اوزون گیس
رت ہے جس کی موٹائی صرف تین ملی میٹر ہے اور جو صرف
سے ۲۵ سے ۴۰ کیلو میٹر کی دوری پر ہے۔ اس میں
کر دیتی ہے۔ یہ اوزون گیس کی پرت سبھی جاندار اور غیر جاندار
کے لیے چادر سا کام کرتی ہے۔ اگر یہ اوزون گیس کی پرت
میں نہ رہے یا دھیرے دھیرے کم ہو تو سورج سے آنے
بیرا بینگنی شعاعوں میں جو کچھ نقصان دہ شعاعیں ہیں وہ ایسے
نہیں پائیں گی جس کا بڑا اثر سبھی جاندار اور غیر جاندار پر
ے گا اور لوگ عجیب و غریب بیماری کے شکار ہو جائیں گے۔
بھی سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اس گیس کی وجہ سے وہاں
جو اوزون پرت ہے اس میں ۸ فی صد چھید ہو چکا ہے۔
بھی کئی سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر اس ماحولیاتی
دگی کو نہ روکا گیا تو اگلے ۲۵-۳۰ برسوں میں ہماری زمین
درجۂ حرارت میں اوسطاً ۵°c - ۶°c تک کا اضافہ ہو جائے
اور اگلے کئی سالوں میں اس سے بھی زیادہ اضافہ ممکن ہے
ساری دنیا کے لیے بہت نقصان دہ ہوگا۔ ایسا نہیں کہ اس
ماحولیاتی آلودگی کا اثر صرف ترقی یافتہ ممالک پر ہی ہوگا بلکہ
س کا اثر ساری دنیا پر ہوگا۔ خواہ وہ ترقی یافتہ ممالک ہوں یا
پذیر۔

دیہاتوں کی بہ نسبت شہر کے لوگ ماحول کو گندہ کرنے
زیادہ ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ شہر کی گھنی آبادی سے پیدا شدہ
گی کو وہ خود درک نہیں پاتے اور جہاں ایک طرف اونچی
ارتیں ہوتی ہیں وہیں دوسری طرف شہر کے فٹ پاتھ پر گندی
ونپڑیاں اور ان جھونپڑیوں میں ضرورت سے زیادہ لوگ
ے ہوئے ہیں اور ان جھونپڑیوں میں گندے پانی کی نالیاں
یا جہان کے گھروں کے سامنے ہی گڈھے میں جمع ہوتی ہیں

اور وہیں پر کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بھی کئی قسم کی بیماریاں پیدا
کرتا ہے کیونکہ ان جگہوں میں پلتے ہوئے کیڑے پہلے آس پاس
کے لوگوں پر ہی حملہ کرتے ہیں۔ حال ہی میں اس کی زندہ
مثال پٹنہ ضلع کے لوہانی پور اور کئی محلوں میں کئی اشخاص کی
موت ہے۔ یہاں بھی گندگی اور سور پالنے سے پُراسرار قسم کی
بیماری پیدا ہوئی۔ جس میں لوگوں کو تے دست ہوئے اور
مریض نے ۲۴ سے ۳۶ گھنٹے کے اندر دم توڑ دیا۔ شہروں
میں موٹر گاڑیوں اور فیکٹریوں کی چمنیوں سے نکلتا ہوا دھواں
بھی جاندار کے لیے Slow Poison سے کم نہیں ہے
یہ دھول اور دھواں انسان و حیوان، چرند پرند حتیٰ کہ پیڑ پودوں
پر بھی اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کی سب سے
بڑی وجہ ساری دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔ پھر ایک اور
خاص وجہ ہماری زمین کا درختوں سے محروم ہونا بھی ہے۔ کیونکہ
درخت ہی ہمارے لیے فضا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ ($CO_2$) لے
کر ہمیں آکسیجن ($O_2$) دیتا ہے اور فضا کو صاف کرتا ہے۔ ہماری
فضا میں $O_2$ کی مقدار صرف ۲۰،۶ فی صد ہے جو تمام جانداروں
کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ان درختوں کی کمی کی وجہ سے ہمارے
ماحول میں گرمی بڑھ جاتی ہے اور ایسا مشاہدہ بھی ہے کہ جن
ممالک میں جنگلوں کی کمی ہے وہاں بارش بھی کم ہوتی ہے اور
بارش نہ ہونے سے پیداوار میں کمی بھی ہوتی ہے اور کئی مسایل
رونما ہو جاتے ہیں۔ جیوں جیوں کسی بھی ملک کی آبادی بڑھتی
ہے تو لوگ اپنی ضروریات کے لیے جنگلوں کو کاٹتے ہیں جو فضا
کے لیے نہایت ہی نقصان دہ ہے۔ فضا کے صاف نہ رہنے پر
سانسوں کے ذریعے ہمارے جسم میں جو گندگی داخل ہو رہی ہے
اس کی ایک اور مثال ہمارا دلی شہر ہے جہاں اوسطاً ۱۲ فیصد
لوگ سانس کی بیماریوں میں مبتلا ہیں اور اس کی وجہ موٹر
گاڑیوں کی دھول اور دھواں ہے اور وہاں کی چمنیاں بھی
کچھ کم قہر نہیں ڈھاتی ہیں۔
ماحولیاتی آلودگی کی ایک وجہ جاہلیت بھی ہے کیونکہ ان پڑھ

لوگوں کو پتہ ہی نہیں ہوتا ہے کہ اگر ماحول گندہ رہے گا تو اس کا اثر ان پر یا سارے معاشرے پر کیا ہوگا۔ جہالت کی وجہ سے ہی لوگ چھوٹے چھوٹے جھونپڑیوں میں چھ سات بچوں کے ساتھ رہتے ہیں اور اپنے بچوں کی لازمی ضروریات کو پورا نہیں کر پاتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا معیارِ زندگی بہت نیچے چلا جاتا ہے۔ یعنی جہالت اور غریبی بھی ماحولیاتی آلودگی کو بڑھانے میں کافی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ریاست کیرل جو مکمل خواندہ ریاست بن چکی ہے وہاں آبادی کے سلسلے میں Servey کیا گیا تو وہاں اوسطاً آبادی میں اضافہ سبھی ریاستوں سے کم ہے۔ یہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ماحولیاتی آلودگی سے بچنے کے لیے لوگوں کا تعلیم یافتہ ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ تعلیم یافتہ انسان ہی ماحول کی آلودگی کا نقصان اچھی طرح سمجھ سکتا ہے اور اس سے بچاؤ بھی کر سکتا ہے۔

تدارک کی اعلیٰ سطحی کوششیں

یوں تو ماحولیاتی آلودگی سے بچنے کے لیے تقریباً ہمیشہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر جلسے اور مباحثے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ سب سے پہلا مباحثہ ۱۹۷۲ء میں اسٹاک ہوم میں ہوا اور وہاں یہ طے پایا کہ سبھی ممالک ۵ جون کو یومِ ماحولیات منائیں گے اور اس کے بعد ابھی حال ہی میں ۱۵ سے ۱۷ اپریل ۹۲ء تک دنیا کے ۳۵ ممالک کے ماہرین ماحولیات کی کانفرنس جاپان کی راجدھانی ٹوکیو میں منعقد ہوئی۔ اس کے بعد برازیل کی پرانی راجدھانی ریو۔ ڈی۔ جے نے رو میں ماحولیاتی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جنوبی امریکہ کے اس شہر میں یہ کانفرنس ۳ جون سے ۱۴ جون ۱۹۹۲ء تک چلی۔ یہاں پانچ خاص دستاویز کو سبھی کے سامنے رکھا گیا۔ تین پر سبھی ملک راضی ہو گئے۔ باقی دو پر فیصلہ نہ ہو سکا۔ ان تمام کانفرنسوں میں دنیا کی بڑھتی ہوئی ماحولیاتی آلودگی سے بچنے کے لیے تبادلۂ خیال ہوا لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس آلودگی کے زیادہ ذمّہ دار ترقی یافتہ ممالک کے لوگ ہیں جو اپنی ترقی کی دھن میں

یہ سوچتے ہی نہیں کہ مختلف قسم کے گیسوں کا اثر ہمارے ماحول پر کیا ہوگا اور انھیں ممالک کو سب سے پہلے اور زیادہ توجہ کے ساتھ اس زہر آلودہ ماحول سے بچنے کے لیے کام کرنا چاہیے ویسے تو ترقی پذیر ممالک بھی اس آلودگی میں شریک ہیں لیکن زیادہ ذمہ داری ترقی یافتہ ممالک پر عاید ہوتی ہے۔ کیونکہ قدرتی آب و ہوا کو زہر آلود کرنے میں ان کا زیادہ حصّہ ہے۔ کچھ سال پہلے دنیا کے بہت سے ممالک نے مل کر اس سے بچنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کی لیکن وہاں لوگوں نے یہ کہا کہ یہ ساری دنیا کا مسئلہ ہے اس لیے اس سے بچنے کے لیے سارے ممالک کو مل کر حل ڈھونڈھنا ہوگا۔ اسی سلسلے میں جو بھی خرچ آئے گا وہ سبھی ممالک برداشت کریں گے لیکن ترقی پذیر ممالک کے لوگوں نے کہا کہ اس آلودگی کے زیادہ ذمّہ دار ترقی یافتہ ممالک ہیں اور اس طرح بات ادھوری ہی رہ گئی۔

تدارک کے شخصی طریقے:

ماحولیاتی آلودگی سے بچنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں ایر کنڈیشنس، ریفریجریٹروں اور دیگر اقسام کی اشیاء جس میں زہریلی گیس CFC کا استعمال ہوتا ہے اسے کم سے کم کرنا ہوگا۔ بلکہ اگر ممکن ہو تو اسے بالکل بند کرنا چاہیے ساتھ ہی ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، نیوکلیر بم، کیمیائی بم اور میزائل کا جنگوں میں استعمال یا اس کی جانچ بند کر دینی چاہیے یعنی جس چیز سے بھی ماحول گندہ ہو اس کام کو بند کرنا ہوگا۔ ندی، تالاب، پوکھر، یا ایسا پانی جس کو کوئی بھی جاندار استعمال کرتا ہو اس کو نالیوں اور کوڑا کرکٹ سے دور رکھیں۔ شہروں میں نالیوں، گڑھوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر دواؤں کا چھڑکاؤ کرنا ہوگا۔ جہاں تک ممکن ہو دنیا کی آبادی اور قدرت کے انتظام کا تناسب برقرار رکھیں۔ ہمیں اپنے جنگلوں کی حفاظت کرنی ہوگی اور نئے نئے درخت لگانے ہوں گے۔ ہر انسان کو اپنے گھر کے چاروں طرف کی فضا صاف ستھری رکھنی ہوگی۔ ضرورت ہے کہ گھر کے آس پاس درخت لگائے جائیں۔ اگر

گھر کے ارد گرد جگہ نہ ہو تو کم از کم اپنے گھروں میں پیڑ پودے لگانے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے کمرے میں پھولوں اور دوسرے قسم کے پودے گملے میں رکھیں اس سے کم از کم آپ کے کمرے کی آب و ہوا تو صاف ہوگی موٹر گاڑیوں کا کم سے کم یا بہت زیادہ ضرورت پڑنے پر ہی استعمال کریں۔ جنگوں میں اموات سے بھی ماحول گندا ہو رہا ہے۔

اگر ان سب باتوں سے پرہیز نہ کیا گیا تو آنے والے دنوں میں ہماری زمین کے درجۂ حرارت میں اضافہ تو ہوگا ہی ساتھ ہی ساتھ نت نئی بیماریوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ پیدا ہونے والا بچہ بھی اپنی ماں کے پیٹ سے بیماری لے کر پیدا ہوگا۔ ہماری آنے والی نسلیں لولی اور لنگڑی پیدا ہوں گی۔ اس لیے ضرورت ہے کہ مسئلے کا حل ڈھونڈنے میں صلاحیت برباد نہ کی جائے بلکہ ایسی صورت حال پیدا کی جائے جس میں ماحولیاتی آلودگی کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہو کیونکہ احتیاط علاج سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر احتیاط برت لی جائے تو مرض کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں رہے گا۔

"حسد کا منشا، صرف وہ اوصافِ حمیدہ ہوتے ہیں جو محسود میں ہیں اور حاسد ان کا خواہاں ہے مگر وہ اس میں نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ رنجش اور ناراضی اکثر باہم معاشرت میں غلط واقع ہونے سے ہوتی ہے۔"

سر سید

# مسلم طالبات کے لیے یونیورسٹی

عبد المتین ▽

قومی مسایل کا حل مسایل کے احساس میں پوشیدہ ہے۔ کچھ دنوں پہلے تک مسلم طالبات کے لیے یونیورسٹی ہندی مسلمانوں کے تخیل سے پرے تھی لیکن اب بحث کا موضوع بن چلی ہے۔ یہ نیک فال ہے۔ اسی رسالے کے جنوری کے شمارے میں پروفیسر محمد شریف خاں صاحب نے اس طرف توجہ دلائی تھی۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ ایسے ادارے کی ضرورت سے بیشتر افراد کو اتفاق ہوگا۔ ذیل میں کچھ تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں ابتدا اہمیں کالج سے کرنی ہوگی۔ نہ تو ہم اتنے وسایل مہیا کر سکتے ہیں کہ ایک دم سے یونیورسٹی کی سطح کا عظیم ادارہ قایم کر سکیں اور نہ ہی طالبات اور تدریسی عملہ اتنا مل سکے گا کہ ہر شعبے میں تدریسی و تحقیقی کام احسن طریقے سے انجام دیا جا سکے۔ اچھی جامعہ ایک درخت کی طرح ہے جو صرف آہستہ آہستہ بڑھتا ہے۔ اس کا گھنا سایہ اور مضبوط تنا وقت کی دین ہوتے ہیں جس کے لیے صبر اور استقامت ضروری ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یونیورسٹی کے تصور کو ذہن سے نکال دیا جائے۔ فکر اور سطح نظر یقیناً بلند ہونا چاہیے اور ابتدائی کام کے نقوش اتنے واضح ہونے چاہییں کہ مستقبل کا اندازہ حال ہی میں بہ آسانی ہو جائے۔ یہ اس وقت ممکن ہوگا جب صاحب معاملہ کو قدرت کی طرف سے بلند حوصلگی، وسعت نظر اور وسیع ویژن ملا ہو۔ یاد رکھیے یہ باتیں اکتسابی نہیں۔ لہذا ان کا اظہار اور عدم اظہار بھی اختیاری نہیں ہے۔ بڑے ذہن کے کیے گئے کام میں عظمت اور وسعت کا اظہار لازمی ہے۔ سرسید کی بنائی ہوئی عمارتوں کو دیکھیے، اسٹریچی ہال اور جامع مسجد کو دیکھ کر بیشتر لوگوں نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اس ادارے کو محض مدرسہ نہیں رہنا ہے۔ خدا کرے کہ مجوزہ جامعہ کا قیام ایسے ہی شخص کے ہاتھوں عمل میں آئے جو مخلص ہو اور عظیم ذہن کا حامل بھی۔ یہاں واحد کے صیغے کا استعمال اتفاق نہ سمجھا جائے۔ زمانے میں سمت کا تعین کرنے والے افعال کے پیچھے صرف ایک فعال ذہن ہوتا ہے۔ ناپائیدار دنیا میں پائیدار نقوش ہجوم کے نہیں بلکہ فرد واحد کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ پھر مشاہدہ یہ بھی بتلاتا ہے کہ جن اعلیٰ ذہنوں نے اعلیٰ تر ذہن کا دست و بازو بننا قبول نہ کیا ان کے فہم و ادراک پر انا کی دبیز چادر پڑ جاتی ہے۔ واقعات کا صحیح تجزیہ اور صحیح حل تلاش کر لینا ان کے لیے خاصہ مشکل ہو جاتا ہے۔

---

▽ لکچرر (انگلش) اجمل خاں طبیہ کالج - اے ایم یو علی گڑھ

دوسری اہم بات شہر کا انتخاب ہے۔ آئے دن کے وحشیانہ
فرقہ وارانہ فسادات اور اس سے زیادہ تشویش ناک چیز ملک
کی روز افزوں گرتی ہوئی اخلاقی حالت کا تقاضا ہے کہ مجوزہ
ادارہ ایسے علاقے میں ہو جہاں مسلم آبادی کا تناسب اچھا
خاصا ہو اور مالی وسیاسی اعتبار سے بحیثیت مجموعی انھیں
شہر میں باعزت مقام حاصل ہو۔ ادارے کی انتظامیہ کو
اس سے مقامی وصوبائی انتظامیہ سے مسائل حل کرنے میں
بڑی مدد ملے گی۔ پھر ایک چیز اور بھی ہے۔ ہر شہر کا ایک
مخصوص مزاج ہوتا ہے اور ہم اپنے ادارے کو اونچی دیواروں
کے ذریعے باہری ماحول سے غیر متاثر نہیں رکھ سکتے۔ بعض شہر
ہیں جن کی فضا میں سیاسی رچ بس گئی ہے، جب کہ کچھ دوسرے
شہر اپنی جفاکشی کے لیے مشہور ہیں۔ کچھ ایسے بھی شہر ہیں جہاں
کے معشوقوں کا چلن معشوق فریبی ہے اور جہاں لیلیٰ مجنوں
کو تماشا کرنے پر بہت جلد آمادہ ہو جاتی ہے۔ پھر کچھ دیار ایسے
ہیں جہاں غالب اور ان کے ہم مشرب کبھی ولی نہیں بن سکے
لہذا ہمیں ایسے شہر کا انتخاب کرنا ہوگا، جہاں بحیثیت مجموعی سماج
میں وہ طرز فکر اور اخلاقی اقدار جاری وساری ہوں جن کی
نشو ونما ہم اپنی طالبات میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ایک الگ
ادارہ قائم کرنے کا اصل مقصد یہی ہے کہ مسلم معاشرہ میں تیزی
سے غائب ہوتی ہوئی اسلامی اقدار کا تحفظ کیا جاسکے، ورنہ
تعلیم کے لیے قریب قریب ہر شہر میں سرکاری کالج اور دیگر ادارے
موجود ہیں۔ اس سلسلے میں اہل الرائے کو شہر بھوپال پر
غور کرنا چاہیے۔ یہ شہر دینی اور شریفانہ ماحول کے لیے ہمیشہ
ممتاز رہا ہے۔ ریاست بھوپال سے اس سلسلے میں خاصی مدد
مل سکتی ہے۔ کیونکہ بھوپال کے حکمراں خاندان نے ملی بہبود
کے کاموں میں ہمیشہ فیاضی کا ثبوت دیا ہے۔ موجودہ بیگم صاحبہ
کے زمانے میں اگر یہ کام ہو جائے تو بہتر ہے کیونکہ بھوپال کے
بعد ملی آرزوئیں شاید قصر سلطانی میں پہنچنے کی جرأت
نہ کر سکیں۔

چند سطور پہلے طالبات میں اسلامی اقدار کی آبیاری
کی بات کہی گئی تھی۔ اقدار کا مسئلہ نازک بھی ہے اور واضح بھی
نازک ان لوگوں کے لیے جو فکری انتشار کا شکار ہیں اور واضح
ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اسلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے
اور اسلام کی تشکیل کردہ تہذیبی اقدار سے صرف جذباتی
سطح پر نہیں بلکہ عقلی وعلمی سطح پر بھی مطمئن ہیں اور ان اقدار
کو انسانی تہذیب کا بیش قیمت سرمایہ سمجھتے ہیں۔ مشاہدہ
بتاتا ہے کہ بیشتر پیچیدگیوں کا سبب تصور کا واضح نہ ہونا یا
بہت سے متضاد تصورات کا ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا
ہوتا ہے۔ خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں
طے کرنا ہوگا کہ ہمیں کن اقدار کی آبیاری کرنی ہے اور ان
اقدار کا سرچشمہ اسلام ہوگا یا دیگر فکری نظام۔ بہت سے
اہل فکر یہ کہتے ہیں کہ ہمیں دیگر نظریات کی خوبیاں قبول کرنے
میں تعصب نہیں برتنا چاہیے۔ بات بہت مناسب ہے لیکن
خوبیوں کی تلاش میں لادینی نظام ہائے فکر کی طرف چھلانگ لگانے
کا شوق بھی مناسب نہیں ہے۔ پہلے یہ جائزہ لینا چاہیے کہ
کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اسلام میں پہلے سے مطلوبہ خوبیاں
موجود ہوں۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ موجودہ ہندوستان میں
خواتین کو رواداری کی تعلیم دینا بہت ضروری ہے اور خاص طور
سے مذہبی رواداری کی۔ بات بظاہر بہت سادہ اور دلکش
لگتی ہے لیکن غمزہ وادا کے بے پناہ ایمان شکن حربے اس
میں پوشیدہ ہیں۔ بعض وقت اس سے یہ کہنا مقصود
ہوتا ہے کہ اسلام میں رواداری نہیں ہے لہذا اسلامی
تہذیب کے مطالعے پر زیادہ زور نہ دیا جائے۔ یہ سب باتیں
بہت کھل کر نہیں کہی جاتی ہیں لیکن تذبذب بہت کچھ غمازی
کر جاتا ہے۔ لہذا ہمیں شروع ہی سے فکری انتشار سے
بچنا چاہیے۔ بڑے کام میں جب پیچیدگیاں آتی ہیں تو اصول
پر یقین سہارا بنتا ہے اور مشکلات کو حل کرنے میں مدد دیتا
ہے اور پھر لطف بھی ہے کہ تذبذب کے ہوتے ہوئے سمت کا

تعین نہیں کیا جا سکتا جو بنیادی مقصد کے حصول کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

جن خواتین کے ذمّہ تدریس کا کام سپرد کیا جائے ان میں محض تعلیمی صلاحیت دیکھنا ناکافی ہوگا۔ بلکہ اسلام سے گہری وابستگی شرطِ اوّل قرار دی جائے۔ اقدار پر مبنی سماج کی تشکیل وہی اساتذہ کرتے ہیں جن میں اصولوں سے بے پناہ شیفتگی کا جذبہ موجود ہو۔ اقدار سے تہی دامن لوگ اپنے طلبا اور طالبات میں ذہنی اتھلاپن اور قومی و ملی مسایل سے بے تعلقی پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ بے تعلقی جب ماحول کا حصّہ بن جاتی ہے تو گھر اور باہر صحت مند تہذیب پرورش نہیں پا سکتی۔

یہاں ایک اور بات کا لحاظ ضروری ہے۔ ہر تحریک کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس سے عوام کے جذبات وابستہ ہوں۔ ہر نہج پر وہ یہ محسوس کریں کہ یہ ادارہ ان کا اپنا ہے اور اس کی حفاظت کی ذمّہ داری بھی ان کی اپنی ہے یہ سر سیّد کا تدبر اور دور اندیشی تھی کہ والیان ریاست کی کثیر رقوم کے ساتھ انھوں نے عوام کے ایک ایک دو دو روپے کو بھی آنکھوں سے لگایا اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم یونیورسٹی آگے چل کر قومی شعور کی تربیت گاہ بن گئی۔

تفصیل سے گریز کرتے ہوئے یہ چند اشارے تھے۔ مسلمانوں کے تعلیمی مسایل سے دلچسپی لینے والے حضرات کو چاہیے کہ وہ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے جدوجہد کا آغاز کریں۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ کوششیں اس سے پہلے نہیں کی جا سکیں اس لیے کہ وہ نہیں کی جا سکتی تھیں۔ مناسب وقت ابھی نہیں آیا تھا لیکن اب آمد کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ قومی شعور کے بغیر قومی کام انجام نہیں دیے جا سکتے ہیں اور سچ یہ آن پڑا تھا کہ ہم ابھی تک افراد تھے قوم نہیں۔

> "عالم، جاہل کو اس لیے پہچانتا ہے
> کہ وہ بھی جاہل رہ چکا ہے
> اور
> جاہل، عالم کو اس لیے نہیں پہچانتا
> کہ وہ کبھی عالم نہیں رہا۔"
>
> ارسطو

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۱۱، شمارہ ۱۲ (دسمبر ۹۲ء)

# طب یونانی میں جدید ذرائع تشخیص

## کی شمولیت و قومیت

محمد مظاہر عالم اعظمی ▽

پرانی کہاوت ہے کہ تبدیلی ترقی کی نشانی ہے اور کسی شے میں جمود اس کی تنزلی کی راہ ہموار کرتی ہے۔ خصوصاً یہ بات علم و فن پر صد فی صد صادق آتی ہے۔ موجودہ دور میں ہر شعبے کے علم و فن میں نت نئی تبدیلی اور نئی تحقیق جاری ہے جس کی بدولت آج کا انسان آسمان سے لے کر زمین کے اندر تک ہر شے کو اپنے قبضے اور استعمال میں لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کسی بھی پرانی شے کی جگہ اگر کوئی نئی چیز اپنا مقام بناتی ہے تو اس کی اہمیت اور ضرورت اسی وقت تک برقرار رہتی ہے جب تک اس کی افادیت برقرار رہتی ہے۔ عدم افادیت کی صورت میں وہ شے معدوم ہونے لگتی ہے۔ بالکل ایسا ہی کچھ طب یونانی میں نظر آ رہا ہے۔ طب یونانی زمانۂ قدیم سے لے کر موجودہ دور تک ایک نہایت مجرب اور گراں قدر فن طب رہا ہے اور اس طریقۂ علاج سے لوگ روز اول سے لے کر آج تک مستفید ہو رہے ہیں لیکن آج مشاہدہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس دور میں عوام کی رغبت اور رجحان روز بروز گھٹتا جا رہا ہے یعنی عوام میں عدم مقبولیت کی سی صورت پیدا ہو رہی ہے جو کہ سب پر عیاں ہے اور اگر یوں کہا جائے کہ اس کی سب سے بڑی وجہ سائنسی زمانے سے غیر مطابقت ہو رہی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ دواؤں کی تیاری اور ان کی ترکیب استعمال مقابلتاً مشکل ہے۔ ساتھ ہی مرض کی قطعی تشخیص کے لیے طب میں مروجہ طریقۂ تشخیص کے ساتھ جدید طریقۂ تشخیص کا فقدان ہے۔ اس وقت زیر تحریر مضمون میں میرا مقصد "طب یونانی میں جدید ذرائع تشخیص کی مکمل شمولیت اور تربیت کی اہمیت پر روشنی ڈالنا ہے۔ اور ایسے تربیت یافتہ دانش ور پیدا کرنا ہے جو کہ ان سہولیات کو استعمال کرنے کی پوری استعداد رکھتے ہوں اور ان کو بروئے کار لا کر طب کے نقشِ قدم پر علاج کر کے ملک و قوم کی اہم خدمت انجام دے سکتے ہوں۔ جب قدیم اطباء طریقۂ تشخیص کے لیے اپنے وسعت علم کے مطابق مکمل طور پر مختلف موضوع پر کتابیں لکھ کر اس بات کی طرف نشاندہی کر گئے کہ طب کے ساتھ ان کا علم نہایت ضروری اور اہم ہے تو کیا اہمیت اس بات کی نہیں ہے کہ موجودہ دور تک اس میں جتنی وسعت علوم کے سلسلے میں ہوئی ہے اس کو مزید شامل کیا جائے۔ یونانی اطباء مرض کی تشخیص میں مختلف ذرائع اور نشانیاں استعمال کر کے مریض کا علاج کرتے تھے۔ اس میں خاص طور سے مریض کے چہرے جسم کی ظاہری شناخت نبض بول و براز وغیرہ تفتیشِ مرض میں نہایت اہمیت کے حامل ارکان ہیں۔ اس میں نبض اور قارورہ کے ذریعے

---

▽ ایم ڈی (معالجات) اجمل خان طبیہ کالج ۔ اے ایم یو

مرض کی تشخیص کے طریقے نے تو اب تک عوام کے ذہن میں سکہ بٹھا رکھا ہے لیکن اب جب کہ اطبا کا فقدان ہو گیا ہے اور اس فقدان کے باوجود طب یونانی کے اطبا نے اپنے طریقۂ تشخیص پر کوئی خاطر خواہ توجہ نہ دی تو یہ فن اپنی تنزلی کی راہ پر گامزن ہونے لگا۔ مجموعی طور پر عوام کے دلوں میں اس کی وہ قدر باقی نہ رہی جو کہ پہلے تھی اور اب رہنی چاہیے۔ اب جب کہ تکنیکی طبی ایجادات نے فن طب میں انقلاب برپا کر دیا ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ تمام عملی ذرائع استعمال میں لائے جائیں جو کہ کسی مرض کی تشخیص میں معاون و مددگار ہو سکتے ہیں۔ تشخیص کے یہ ذرائع کسی ایک فرد، کسی ایک فن، کسی ایک قوم یا کسی ملک کی ملکیت نہیں ہو سکتے بلکہ اس پر ہر بنی نوع انسان کا اتنا ہی حق ہے جتنا دوسروں کا ہے جس طرح اشیاء خوردنی زراعت و سفر وغیرہ کے ذرائع پر کسی ایک کی اجارہ داری نہیں ہے۔ اسی طرح اس پر بھی سب کا حق ہے۔ قدیم اطبا کے اخذ شدہ مواد نئی ایجادات کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے تو دور جدید کے اطبا ان نئی ایجادات سے استفادہ کیوں نہیں کر سکتے۔ قدیم اطبا نے اپنے محدود ذرائع استعمال کے باوجود جتنا بھی ممکن تھا اس سے زیادہ ہی کتابوں میں محفوظ کر دیا۔ مثال کے طور پر قارورہ لیجیے تو معلوم ہو جائے گا کہ قدیم طب کی کتابوں میں کس تفصیل سے غائرانہ نظر ڈالی گئی ہے اس وقت خوردبین تو ایجاد نہیں ہوئی تھی لیکن نظری معائنہ کی بدولت ہی تمام امراض کی تشخیص کر لیتے تھے۔ آج جب کہ خوردبین اور کیمیاوی مادے کی ایجاد نے پیشاب کے مزید اجزاء اور مادے کی شناخت ممکن بنا دی ہے تو ضرورت ہے کہ اس کو مکمل طور سے داخل نصاب کر کے طب میں سمو دیا جائے تاکہ فنی طب بھی اس سے مستفید ہو اور تشخیص صحیح و مکمل ہونے پر شفا جلد ممکن ہو سکے۔ پیشاب کے معائنے میں جدید تحقیق کے مطابق صرف نظری معائنے پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ مزید وسعت دے کر نظری معائنے کے ساتھ ساتھ کیمیاوی اور خوردبینی معائنے کو شامل کر کے اس کے مشاہدے سے مزید امراض کی تشخیص کی جانے لگی جس کی وجہ سے تشخیص مکمل اور صحیح ہونے کی صورت میں مرض کا علاج صحیح ہونے لگا ہے۔ یہ ایک مثال ہے ورنہ تمام اعضائے نظامہائے بدن کے امراض کی تشخیص کے لیے بے شمار نئے نئے ذرائع منظر عام پر آ کر رائج ہو چکے ہیں جو کہ دوسرے طریقۂ علاج میں بخوبی مستعمل ہیں۔ مثلاً ایکسرے، الٹراساؤنڈ، ای۔ سی۔ جی، کلرڈ اپلرس، ای۔ ایم۔ جی، سی۔ ٹی اسکین، تمام کیمیکل، بائیوکیمیکل اور ہارمونل ٹیسٹ وغیرہ۔ ان تمام جدید ذرائع کو اپنا کر طب میں اس طرح پرو دیا جائے کہ وہ مکمل طور پر فن طب کا حصہ معلوم ہونے لگیں۔ جس طرح دیگر اقوام نے ہمارے اسلاف کے تمام علمی و فنی کارناموں کو اپنی زبان میں اس طرح تبدیل کر دیا کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ موجودہ تحقیق کا کوئی بھی حصہ کسی دوسرے کا کارنامہ ہے بلکہ ان کا ہی کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی شمولیت کے بعد اس کا علم رکھنے والے ذی استعداد حضرات کہاں سے لائے جائیں تو اس کے لیے مکمل طور پر اجتماعی کوشش کر کے ان طبی درس گاہوں میں تربیت گاہیں قائم کی جائیں تاکہ یہ درس گاہیں مکمل طور پر خود اپنے تربیت یافتہ دانشور پیدا کر سکیں جن کو طب کے علم کے ساتھ ساتھ ان علوم پر بھی علمی و عملی دسترس حاصل ہو اور علم کا جو خلا اس طب پر غالب آ کر طب یونانی کو لوگوں کی نظروں میں کمتر کر رہا ہے پر کیا جا سکے اور یہ فن بھی دوسروں کے شانہ بشانہ پر وقار طریقہ سے چل سکے۔

# مدارس کے اصلاح کی تجویز

مظفر حسین غزالی ▽

دینی مدارس کی ہندوستان میں اہمیت، افادیت ضرورت اور ان کے شاندار ماضی و دینی اور تاریخی کردار کے بارے میں تو کوئی کلام نہیں اور نہ ہی سماج میں ان کے اثرات سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔ البتہ ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ سماج کی ضرورت کو کس طرح پورا کیا جائے یا مدارس میں کن چیزوں کو پیدا کیا جائے کہ وہ موجودہ سماج کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل بن سکیں۔

سماج کا خصوصاً مسلم سماج کا اور دینی مدارس کا بیک وقت جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے تاریخی دینی کردار رکھنے والے مدارس عملاً سماج سے کٹتے جا رہے ہیں اسی لیے وہ اپنی ضرورت کا احساس دلانے کے لیے عوام کے درمیان کئی بار ایسے مسایل کھڑے کرتے ہیں کہ یک بارگی امت ان کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور ان کی ضرورت محسوس کی جانے لگتی ہے۔ عوام اور مدارس کا یہ رشتہ انتہائی تشویش ناک ہے مدارس جو سماج میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے وہ اتنے مجبور کیوں ہو گئے؟ اور عوام جو مدارس کے قدردان ہوا کرتے تھے وہ ان کی طرف سے غافل کیوں ہوتے جا رہے ہیں ۔ جہاں اس کی بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں وہیں میرے خیال میں سب سے بڑی وجہ سماج کی ضرورتوں اور مسایل سے لاتعلقی ہے۔ مدارس روایتی انداز میں چل رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ مدارس کے ذمہ داران کو نہیں معلوم کہ وہ مدرسے میں پڑھنے والے طلباء کو کیا بنانا چاہتے ہیں اور نہ طلباء کے سامنے آگے کی منزل کے نقوش واضح ہیں۔ صرف ثواب کی نیت سے ایک استاد انتہائی کم تنخواہ پر پڑھا رہا ہے اور طلباء ثواب کی نیت سے پڑھ رہے ہیں۔ صرف اتنا ہی ہوتا تو مضائقہ نہیں تھا لیکن (ذہنی کشمکش کے شکار، معاشی اعتبار سے قلاش، سماج سے ناواقف، تربیت سے عاری، اخلاقی اعتبار سے کمزور اور فنون علوم دینیہ میں دسترس نہ رکھنے والوں کی محدود چند کے علاوہ) ایک بڑی بھیڑ مدارس سے فارغ ہوتی ہے جو نہ صرف سماج کے بلکہ دین کے بھی کسی کام کے نہیں ہوتے بیروزگاری سے پریشان ہو کر مجبوری میں ان میں سے بعض انھیں مدارس میں استاد ہو جاتے ہیں۔ چاہے وہ تدریس کے اصولوں سے واقف ہوں یا نہ ہوں یا ان کا اس کام میں شوق ہو یا نہ ہو۔ وہ پڑھاتے ہیں کیونکہ بے روزگار ہیں۔ جو ان اساتذہ میں کچھ پرانے ہو جاتے ہیں اور عوامی روابط میں ماہر بھی ہو جاتے ہیں وہ ایک نئے مدرسے کی بنیاد ڈال دیتے

---

▽ ۷۔ بی جوگابائی ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ہیں اور مدرسہ چھوڑ کر ایک نئی دوکان کھول لیتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے مدرسے سے یوں ہی الگ نہیں ہوتے بلکہ پہلے کچھ حیثیت حاصل کرنے کے لیے گروپ بندی کرتے ہیں۔ پھر کچھ طلبا و اساتذہ کو اپنے حق میں کرتے ہیں اور آخر میں ان سب حواریین کو لے کر الگ ہو جاتے ہیں۔ کئی بار تو اسی مدرسے کے کسی حصّے پر قبضہ بھی کر لیتے ہیں اور اسی مقبوضہ حصّے میں نئے مدرسہ کو قایم کرتے ہیں۔

اکثر یہ خدشہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر ان مدارس کے طلبا کو جدید علوم، سائنس، عمرانیات، سیاسیات، قانون معاشیات اور انگریزی وغیرہ مضامین پڑھائے گئے تو پھر ان کا رجحان تلاش معاش کی طرف ہو جائے گا اور یہ دین کی کوئی خدمت نہ کر سکیں گے۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ مدارس میں دینی علوم کو فوقیت حاصل ہو لیکن سوال یہ ہے کہ معاش حاصل کرنا کیا اسلامی اعتبار سے جرم ہے جو انھیں نہ کرنا چاہیے اور مفلسی کی زندگی کو خواہ مخواہ ترجیح دے کر پوری زندگی پریشان رہنا چاہیے۔ کیا انھیں ان علوم کو پڑھ کر قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کا جائزہ لے کر اسلامی اعتبار سے ان کی تدوین نو کرنا مفید نہ ہوگا۔ کیا یہ اسلام کی خدمت نہ ہوگی؟ ہم کہتے ہیں اور مدارس میں پڑھایا جاتا ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے تو کیا حیات کے لیے ضروری چیزیں اسلام سے اخذ کرنے کا کام کسی اور کا ہے؟ کیا ہمارا کام صرف ایک نعرہ لگا کر اس پر اظہار مسرت کرنا ہے۔ گزرے ہوئے وقت اور مسلم سائنس داں ماہرین معاشیات، سیاسیات و جغرافیہ اور دیگر علوم کے ماہرین کے گیت کب تک گائے جائیں گے اور کب تک سینہ پھلا کر ان کے کارنامے بیان کرتے رہیں گے اور ان پر فخر کرتے رہیں گے۔ کیا زندگی کے لیے مادی روحانی اور علمی ہر طرح کی ضروریات فراہم کر رہے ہیں ہم اس سے راضی ہیں اور کیا یہ ہے کہ جب دوسرے ہمیں سب چیزیں فراہم کر رہے ہیں

تو پھر ہم کیوں ان کاموں میں اپنا سر کھپائیں؟ کیا یہ سوچ ہماری اور ملت کے لیے تباہی کا باعث نہیں ہے؟ اگر ان تمام میدانوں میں ہم اور ہمارے طلبا کام نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔ کیا ان کاموں کو کرنا ہماری دینی ذمّہ داری نہیں ہے۔ اگر یہ ہماری ذمّہ داری ہے تو پھر ہمیں اس کے لیے خود بھی تیار ہونا پڑے گا اور آنے والی نسل کی تربیت بھی انھیں خطوط پر کرنی پڑے گی۔

یہ کام کس طرح کیا جائے یہ سوچنے کا موضوع ہے جب کہ ہم میں سے سبھی لوگ مدارس کے نصاب تعلیم، نظام تعلیم، انتظامی، معاشی اور دوسرے مسایل سے واقف ہیں۔ ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں یہاں چند تجاویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ رائے عامہ کی ہمواری:

سب سے پہلا اور اہم کام رائے عامہ کی ہمواری ہے۔ کیونکہ ذہن کی تیاری عمل سے زیادہ مشکل کام ہے۔ عمل ذہن و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قرآن میں پہلے ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے بعد میں عمل صالح کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ علم مدارس کے ذمہ داران کو مدارس کی نہج تبدیل کرنے کے لیے ہموار کیا جائے۔ اس کے لیے میری تجویز ہے کہ اخبارات و رسایل میں مقالات و مضامین کی اشاعت کرائی جائے۔ تاکہ مدارس میں بیداری آسکے اور وہ عصر کے نئے مسایل سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو سکیں۔ ملک کے اہم اور ممتاز مدارس کے نظام تربیت و نصاب تعلیم وغیرہ کا تنقیدی جائزہ لیا جائے اور اس کی اشاعت کی جائے۔ ایسے مضامین اور مختصر رسالے چھاپے جائیں جو مدارس کے سیاسی کردار، سماجی کردار اور ان کے قائدانہ رول پر روشنی ڈالتے ہوں۔ مدارس کا تاریخی جائزہ، ان کا ماضی اور حال، حالات کے اعتبار سے نصاب میں تبدیلی کی روایت، مدارس کا اثر ہندی کے نظم کی درستگی ہوئی تھی

کو ذاتی نصاب کرنے کی ضرورت۔ معاشرے میں ان کی [illegible] اور انہیں کسی طرح مزید مفید بنایا جا سکتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے موضوعات پر اشاعتی کام، سیمینار، ورکشاپ اور مذاکرات کر لئے جائیں۔ اس طرح کے کاموں سے رائے عامہ کی بیداری کی توقع کر سکتے ہیں نیز ذہن سازی ہو سکتی ہے اور سوچنے کا انداز بدل سکتا ہے اور جامد خیالات میں تنوع پیدا ہو سکتا ہے۔

۲۔ نصاب کی ترتیب نو

تعلیمی نظام میں سب سے زیادہ اہمیت نصاب کی ہوتی ہے۔ لہذا ادارہ سماج کو کیسا بنانا ہے یہ بات نصاب پر منحصر کرتی ہے۔ آج جدید انسانی سماج کے لیے اتنا خطرناک نہیں ہوتا جتنا مخالف نظریے کا پڑھا لکھا۔ نصاب کی اسی اہمیت کے پیش نظر لوگوں نے کئی کئی سال اس کام پر صرف کیے ہیں۔ مدارس کے نصاب کے سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ [illegible] علوم جدیدہ اور علوم اسلامیہ کے ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی ترتیب دی جائے۔ یہ کمیٹی تمام [illegible] مدارس کے نصاب کا جائزہ لے کر علوم اسلامیہ کے [illegible] کا ایک جامع نصاب تیار کرے۔ اسی طرح جدید علوم کے ماہرین اپنے اپنے مضمون کا نصاب تیار کریں۔ پھر یہ تمام ارکان بیٹھ کر اس پورے نصاب کے ہر پہلو کا باریک بینی سے جائزہ لیں۔ نیز گھنٹوں کی تقسیم کے ساتھ کس جماعت کے نصاب کو کتنے وقت میں مکمل ہونا چاہیے اس کا تعین کریں۔ اس طرح ہر مضمون کا ایک نمونے کا نصاب تیار ہو جائے گا۔ یہ کمیٹی ہر پانچ سال بعد اس نصاب کا جائزہ لے اور اس کے نتائج پر غور کرے اور سماج کے حالات اور وقت کی ضروریات کے تحت اس میں ضروری ترامیم کی جائیں۔

اس نمونے کے نصاب کو تمام مدارس میں بھیجا جائے اور انہیں کلی اختیار ہو کہ وہ اس نصاب کے [illegible] اس کی روشنی میں اپنا نصاب مرتب کریں۔ نصاب

کو رائج کرنے کے لیے یا تو کسی مدرسے کو اپنایا جائے یا نمونے کا مدرسہ بنایا جائے جہاں اس نصاب کے مطابق تعلیم دی جا سکے تاکہ دوسرے مدارس کے ذمہ داران اس کی خوبیوں سے واقف ہو سکیں اور اگر کسی مدرسے کو اس نصاب کے رائج کرنے میں کوئی دشواری پیش آئے تو وہ یہاں آ کر اسے رفع کر سکے۔ میرا خیال ہے کہ مدارس کو صحیح رخ دینے کے لیے یہ اقدام ضروری ہے۔

۳۔ عملی اقدامات

مدارس کو معاشرے کی ضرورت کے مطابق زیادہ مفید بنانے کے لیے کچھ عملی اقدامات کرنے چاہییں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل تجاویز قابل غور ہیں:

۱۔ جدید علوم کو مدارس کے نصاب میں داخل کرنے کی بات ہر چہار طرف سے مدارس کے ذمہ داران سے کہی جاتی ہے لیکن مدارس اپنے محدود وسائل کی وجہ سے [illegible] ہوتے بھی یہ ممکن نہیں ہو پاتا کیونکہ وہ کسی بھی جدید علوم کے ماہر کو اس کی صلاحیت کے مطابق تنخواہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی وہ سہولیات فراہم کر سکتے ہیں جو اس کو درکار ہوتی ہیں۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ کچھ مدارس کو منتخب کر کے ان میں ۲ سے ۵ سال کی مدت کے لیے مدارس کی فلاح چاہنے والے ادارے اپنے خرچ پر جدید علوم کے ماہرین کو مدارس میں درس و تدریس کے لیے بھیجیں۔ ان کا [illegible] مدرسے میں پڑھنے [illegible] تو میرا خیال ہے کہ مدارس کے ذمہ داران ان مضامین کے لیے نہ صرف اپنے نصاب [illegible] میں جگہ نکالیں گے بلکہ اس پروگرام کو خوش آمدید بھی کہیں گے۔

۲۔ [illegible] پانچ سال کی مدت میں [illegible] طلبا کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ [illegible] ہو جائے۔ نیز [illegible] ملا سکے گا۔ اگر یہ تجربہ اچھا رہے تو [illegible] زیادہ [illegible]

اساتذہ فراہم کیے جائیں۔

۲- مدارس میں غیر تربیت یافتہ اساتذہ ہوتے ہیں۔ یہ بات کچھ بہت زور دے کر کہی جاتی ہے کہ جب اساتذہ ہی تربیت یافتہ نہ ہوں تو اچھے تعلیمی نتائج کی توقع کیوں کر کی جائے۔ میرے خیال میں اساتذہ کے اندر دو چیزیں ہونا لازمی ہیں۔ ایک تو پڑھانے کی صلاحیت دوسرے پڑھانے کا شوق۔ جدید ترین معلومات سے آگاہی ہو یہ بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں میری تجویز ہے کہ اساتذہ کے لیے ایک مہینے کا ایسا کیمپ لگایا جائے جس میں انھیں جدید ترین تدریسی اصولوں سے واقف کرایا جائے نیز تدریس کا مذاق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس مدت میں جس حد تک ممکن ہو سکے جدید مضامین سے بھی واقف کرانا چاہیے تاکہ وہ ان مضامین کی اہمیت، افادیت اور ضرورت سے واقف ہو سکیں۔ علما کی آمد و رفت کا نظم کیمپ کرنے والے ادارے کی طرف سے کیا جائے۔ نیز رہائش وغیرہ کا بھی مناسب انتظام ہو۔ یہ کیمپ ملک کے مختلف حصوں میں رکھے جائیں، تاکہ انھیں سفر کی زیادہ پریشانیاں برداشت نہ کرنا پڑیں۔ میرے خیال میں یہ کیمپ اور مفید ثابت ہوں گے کیوں کہ جب مختلف مدارس کے علما ایک ماہ تک ساتھ ساتھ رہیں گے اور آپس میں گفتگو کریں گے تو ذہنی ہم آہنگی پیدا ہوگی۔ کیمپ میں بلائے جانے والے ماہرین کے خیالات کے استفادے سے وسعت بھی پیدا ہوگی اس کا لازمی اثر مدارس اور طلبا پر پڑے گا۔

۳- ذہین طلبا کا انتخاب کر کے انھیں جدید مضامین اور ملکی و غیر ملکی زبانیں سیکھنے کے لیے وظائف دیے جائیں تاکہ طلبا ان زبانوں میں دینی سرمایے کو منتقل کر سکیں۔

۴- دینی مدارس کے طلبا کے لیے کیمپ اور تعلیمی ٹور کا نظم کیا جائے۔ ان اسفار و کیمپوں میں جدید مضامین کے لیکچرس کا نظم کیا جائے اور ایسی چیزیں دکھائی جائیں جن سے ان کے اندر نئی چیزوں کو سیکھنے کا جذبہ پیدا ہو۔

۵- طلبا کے بین المدارس مذاکرات کرائے جائیں۔ اس طرح کا یہ پروگرام طلبا کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں بہت مفید ہو سکتا ہے پھر مسلکی اور مکاتب فکر کی گروہی عصبیت ٹوٹے گی اور طلبا کے درمیان باہمی روابط پیدا ہوں گے نیز خوش گوار ماحول پیدا ہوگا۔ وہ اختلاف کی صورت میں بھی ایک دوسرے کے مسلک اور فکر کا احترام کرنا سیکھ سکیں گے۔ ان کا اتحاد ملت میں اتحاد کی فضا پیدا کر سکتا ہے۔

۶- ہمارے سماج میں مختلف علوم و فنون کے ماہرین کی غیر معمولی حد تک کمی واقع ہوتی جا رہی ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے مختلف علوم و فنون میں ذہین اور محنتی طلبا کو اختصاص کرایا جائے تاکہ یہ خلا پُر ہو سکے۔

۷- جدید موضوعات پر لٹریچر، کتب اور رسائل کی فراہمی سے مدارس میں نئی روح پھونکی جا سکتی ہے۔ مدارس کے بعض طلبا و اساتذہ ارادہ رکھتے ہوئے بھی جدید مضامین کی کتابیں مالی دشواریوں کے باعث نہیں خرید پاتے۔ اگر ان کو یہ مواد فراہم ہو جائے تو توقع ہے کہ مدارس میں جدید مضامین کے لیے راہ ہموار ہو سکے گی۔

۸- عصری علوم پر مدارس میں لیکچرس:

ملک کے جدید علوم کے ان ماہرین سے وقت لیا جائے جو مدارس کے مزاج سے واقف بھی ہوں اور ان میں اصلاح کے خواہاں بھی۔ ان سے کہا جائے کہ وہ مدارس کے طلبا کو اپنے مضمون کی بنیادی باتیں سہل زبان اور سادہ اسلوب میں بتائیں۔ دوسری طرف مدارس کے ذمہ داران سے بات کی جائے کہ بڑی جماعتوں کے طلبا کو لیکچر سننے کے لیے کچھ وقت کے لیے فارغ کیا جائے۔ یہ اقدام مدارس کی اصلاح کی راہ میں بہت مفید ثابت ہوگا۔

۹- تمام مدارس کی تنظیم قائم کی جائے۔ [illegible] نظم و ضبط کی دشواریوں کے شکار ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مدرسے کا طالب علم کبھی دوسرے مدرسے میں [illegible]

نہیں وہ طلبا کو لینا چاہیے جو امتحانات کے اہل نہ ہوں یا جنہیں پاس کسی مدرسے سے خراب کردار کی وجہ سے نکالا گیا ہو۔ کوئی اس سے معلوم کرے کہ اس نے فلاں مدرسہ کیوں چھوڑا۔ کئی بار معلوم ہونے کے باوجود بھی اس سے بازپرس نہیں ہوتی۔ اس سے مدارس میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور ایسا طالب علم کے مستقل طالب رہنے سے مدارس میں خرابیوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔ کئی بار چھوٹی چھوٹی خرابیاں سنگین برائیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ میری تجویز ہے کہ ان برائیوں کو روکنے کے لیے ٹرانسفر سرٹیفکیٹ داخلے کے لیے ضروری قرار دیا جائے۔

۱۱۔ مدارس میں طریقۂ تدریس اور طریقۂ امتحانات کو بہتر بنانے کی طرف بھی توجہ کی جانی چاہیے۔ میری تجویز ہے کہ جماعتوں میں طلبا کی تعداد کا تعین ضروری ہے۔ سال میں تین امتحانوں کی جگہ سمسٹر Semester کا نظام قائم کیا جائے۔ نصاب کو بھی سمسٹر کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے اور اس کے لحاظ سے تدریس کا نظم قائم ہو۔ تاکہ طلبا کو استاد سے زیادہ موقع مل سکے۔ امتحان بھی عملی بھی ہو اور تحریری بھی۔ تحریری امتحان میں سوالات معروضی انداز کے دیے جائیں یا جوابات معروضی انداز میں لکھ لیے جائیں۔ زبانی امتحان بھی لیا جائے۔ زبانی امتحان سے طلبا کی صلاحیت کا علم ہوتا ہے۔ یہ بھی علم ہو جاتا ہے کہ کس نے کس حد تک اپنے مضمون کو سمجھا ہے۔ صلاحیت کے اعتبار سے ہی نمبر دیے جائیں۔

مندرجہ بالا چند نکات تجاویز کے طور پر غور و فکر اور عملی اقدامات کے لیے درج کیے گئے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ اگر ان نکات کی روشنی میں کام کیا جائے تو ان شاء اللہ اس کے نتائج بہتر ہوں گے اور ہمارے مدارس حقیقت میں سماج کی ضرورت پوری کرنے کے قابل بن سکیں گے۔

"قومی ترقی صرف تعلیم پر منحصر ہے۔ مذہبی تعلیم عقبیٰ کی ترقی کے لیے ہے، دنیوی تعلیم دنیوی ترقی کے لیے۔ قومی ہمدردی اور رفاہ عام کا کام وہ ہے جو نہ صرف اپنے لیے کیا جائے نہ خدا کے لیے بلکہ خاص قوم کے لیے۔ جس چیز کی قوم کو حاجت ہو اس کو پورا کرے اور میری رائے میں یہی اصل ثواب کا کام ہے۔"

سرسید

## اتر پردیش کے ستائیس مسلم جونیر ہائی اسکولوں میں جونیر ہائی اسکول بورڈ امتحان ۱۹۹۲ء میں

# سو فیصد پاس پینتالیس فیصد فرسٹ ڈویژن

احمد رشید شیروانی ▽

"نتیجہ" کا مطلب عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ کتنے فیصد پاس ہوئے لیکن اگر سب (یا تقریباً سب) مسلم اسکولوں سے سو فیصد بچے کسی بورڈ امتحان میں پاس ہونے لگیں تب ہم ان اسکولوں کے نتائج کا موازنہ کس بنا پر کریں؟ اتر پردیش کے ہمارے ستائیس جونیر ہائی اسکولوں کے نتیجے چارٹ میں پیش ہیں۔ ان سب اسکولوں سے جتنے طلبا و طالبات ۱۹۹۲ء کے جونیر ہائی اسکول بورڈ امتحان میں شریک ہوئے سب کے سب یعنی سو فیصد پاس ہوئے لہٰذا ان ستائیس اسکولوں کے نتیجے چارٹ میں فرسٹ ڈویژن کے تناسب کے اعتبار سے درج کیے گئے ہیں۔

۱۔ ظفر محمود علی مسلم گرلز جونیر ہائی اسکول سیتاپور سے سترہ شریک اور سب کے سب یعنی سو فیصد فرسٹ ڈویژن میں پاس۔ اس کے بعد

۲۔ محمدیہ گرلز اسکول سلطان پور سے تیتیس شریک میں سے اٹھائیس یعنی ستاسی فیصد نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔

۳۔ سنبھل کے مدرسہ انصار جونیر ہائی اسکول سے تیتیس میں سے اٹھائیس یعنی ترانوے فیصد فرسٹ ڈویژن لائے۔

۴۔ اسلامیہ عربیہ جونیر ہائی اسکول دھام پور ضلع بجنور سے بیالیس میں سے تینتیس ۳۳ یعنی اناسی فیصد فرسٹ ڈویژن۔

۵۔ نورمت جونیر ہائی اسکول مبارک پور ضلع اعظم گڑھ سے اکتیس میں سے چوبیس یعنی ستتر فیصد فرسٹ ڈویژن۔

۶۔ نسواں جونیر ہائی اسکول بانس پار بھوڑوا ضلع بلیا سے تیس میں سے بائیس ۲۲ یعنی تہتر فیصد فرسٹ ڈویژن۔

۷۔ اسلامیہ جونیر ہائی اسکول رودولی ضلع بارہ بنکی سے بہتر میں سے انچاس ۴۹ یعنی پینسٹھ فیصد فرسٹ ڈویژن۔

ان ساتوں اسکولوں میں سے کسی میں نہ تو کوئی فیل ہوا اور نہ کوئی تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ جتنے پاس ہوئے سب کے سب فرسٹ یا سکنڈ ڈویژن مارکس لائے۔

علی خان انڈین ماڈل جونیر ہائی اسکول سے بچپن شریک میں سے چھتیس یعنی پچپن فیصد فرسٹ ڈویژن

---

▽ کناٹ پلیس، نئی دہلی۔

اس اسکول سے چار بچے تھرڈ ڈویژن میں بھی پاس ہوئے۔
اس کے بعد چار اسکول ہیں جن سے پچاس فیصد سے
لے کر ترپن فیصد تک بچے فرسٹ ڈویژن میں پاس
ہوئے۔ باقی سکنڈ ڈویژن لائے۔ تھرڈ ڈویژن کوئی
نہیں۔ نقشہ بالا میں درج پہلے تیرہ جونیر ہائی اسکولوں
میں بحمد اللہ کوئی ایک بھی تھرڈ ڈویژن نہیں۔ سب
کے سب بچے فرسٹ یا سکنڈ ڈویژن میں پاس
ہوئے۔

کچھ اور نتائج آنے پر دیگر جونیر ہائی اسکولوں اور مسلم
غیر مسلم بچوں کے نتائج کا مقابلہ تجزیہ کر کے دیکھا جائے
گا۔

## جونیر ہائی اسکول بورڈ امتحان ۱۹۹۰ء

| کل پاس | فرسٹ ڈویژن تعداد | فرسٹ ڈویژن فیصد | سکنڈ ڈویژن | تھرڈ ڈویژن | جونیر ہائی اسکول کا نام و مقام و ضلع |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱۷ | ۱۷ | سو | — | — | فخر المدارس مسلم گرلز۔ سیتاپور |
| ۳۰ | ۲۹ | ستانوے | ۱ | — | محمدیہ بنکر نسواں کانپور |
| ۳۰ | ۲۸ | ترانوے | ۲ | — | مدرسہ انصار 〃 |
| ۴۲ | ۳۳ | اناسی | ۹ | — | اسلامیہ عربیہ دھام پور۔ بجنور |
| ۳۱ | ۲۲ | ستر | ۷ | — | لزرمی۔ مبارک پور۔ [illegible] آباد |
| ۳۰ | ۲۲ | تہتر | ۸ | — | نسواں۔ بانس پار بہوروا۔ ضلع بلیا |
| ۷۵ | ۴۹ | پینسٹھ | ۲۶ | — | اسلامیہ۔ ردولی۔ بارہ بنکی |
| ۵۵ | ۳۰ | پچپن | ۲۱ | ۴ | علی خان اردو میڈیم۔ [illegible]۔ [illegible] آباد |
| ۱۰۱ | ۵۴ | ترپن | ۴۷ | — | اسلامیہ۔ رسڑا۔ ضلع بلیا |
| ۱۵ | ۸ | ترپن | ۷ | — | قادری گرلز 〃 〃 |
| ۲۳ | ۱۲ | باون | ۱۱ | — | اصلاح قوم۔ رام پور |
| ۲۲ | ۱۱ | پچاس | ۱۱ | — | اسلامیہ گنگوہ۔ [illegible] پور |
| ۲۶ | ۱۳ | پچاس | ۱۳ | — | مسلم [illegible]۔ [illegible] نگر |
| ۱۷ | ۷ | اکتالیس | ۹ | ۱ | رحمانیہ گرلز [illegible] |
| ۲۵ | ۹ | چھتیس | ۱۵ | ۱ | سید [illegible] گرلز 〃 |
| ۲۲ | ۸ | چھتیس | ۹ | ۵ | شمسی گرلز رامپور |
| ۳۴ | ۱۰ | [illegible] | ۱۴ | ۱۰ | [illegible] انگلو اردو مڈل۔ آگرہ |

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| ۴۸ | ۱۳ | ستائیس | ۳۰ | ۵ | مسلم رحمانیہ۔ راجہ کا تاج پور۔ بجنور |
| ۸ | ۲ | پچیس | ۶ | — | تعلیم و تربیت۔ جلال پور۔ بلند شہر |
| ۴۱ | ۱۰ | چوبیس | ۱۲ | ۱۹ | عابد میموریل دریاباد۔ بارہ بنکی |
| ۲۳ | ۵ | بائیس | ۱۳ | ۵ | سوتنتر سلمانیہ آدرش۔ اٹائی کلاں۔ مرادآباد |
| ۷۲ | ۱۲ | سترہ | ۴۰ | ۲۰ | نانا رشید شیروانی گرلز۔ صلاح پور۔ الہ آباد |
| ۳۶ | ۶ | سترہ | ۲۳ | ۷ | اسلامیہ کورشی۔ شوہرت نگر۔ سدھارتھ نگر |
| ۳۹ | ۵ | تیرہ | ۲۸ | ۶ | سید بدیع الدین۔ پچپیڑوا۔ گونڈہ |
| ۳۹ | ۵ | تیرہ | ۲۳ | ۱۱ | جعفری بیگم میموریل۔ سنگرام پور۔ بدایوں |
| ۱۳ | ۱ | آٹھ | ۱۱ | ۱ | مسلم نیشنل۔ دہرہ دون |
| ۳۰ | ۲ | سات | ۲۴ | ۴ | مسلم رحمانیہ۔ شاہ جہاں پور |
| ۹۴۴ | ۴۲۵ | پینتالیس | ۴۲۰ | ۹۹ | ستائیس کا ٹوٹل |

"دنیا کے تمام قانون سازوں اور فاتحین میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کی زندگی کی تفصیلات محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرح صحیح اور حقیقت پر مبنی ہوں"

جان ڈیون پورٹ

# ایک مکمل ہیلتھ ٹانک ، بلکہ اور بھی بہت کچھ !



## سنکارا: دل اور جگر کی صحت اور قوت کے لیے لازمی بنیادی عناصر کا نادر مرکب

سنکارا واحد ٹانک ہے جس میں اچھی صحت کے لیے تمام لازمی بنیادی اجزا موجود ہیں۔ مثلاً آئرن، سوڈیم، پوٹاشیم اور کیلشیم وغیرہ۔ انہی کے ساتھ قدرتی جڑی بوٹیوں اور وٹامنز کے فوائد بھی شامل ہیں۔ ان سے آپ کے دل، جگر، ہڈیوں، عضلات اور دیگر اعضا کو طاقت ملتی ہے اور نظامِ ہضم اور مرکزی نظام کو بھی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

**آپ کو سنکارا کی کب ضرورت ہوتی ہے؟**

• عام اور غیر معمولی کمزوری میں • سخت جسمانی محنت کے بعد • جسم میں وٹامنوں کی کمی میں • بیماری کے بعد کی کمزوری میں • بھوک نہ لگنے میں • چھوت کی بیماریوں سے بچاؤ کی قوت بڑھانے کے لیے • حمل کے دنوں میں • بچوں کو ان کی بڑھوتری کے دنوں میں • وزن کی کمی میں • اعصابی بے چینی اور کام کی زیادتی سے تھکاوٹ میں • تغذیہ کی عام خرابی میں • تپ زدہ اور شدتِ مرض میں۔

چند مشہور ٹانکوں میں موجود آئرن، کیلشیم، زنک اور الکحل کی مقدار کا سنکارا سے مختلف قسموں کے ساتھ موازنہ:

| Reputed brands of tonics | Iron (mg) | Calcium (mg) | Zinc (mg) | Alcohol content percent (V/V) | Contents per unit pack | Retail price excluding tax (Rs.) |
|---|---|---|---|---|---|---|
| 1. | — | 12.4 | — | 12.00 | 400 | 31.95 |
| 2. | — | — | — | 11.0 | 240 | 32.00 |
| 3. | 9.68 | — | — | — | 454 | 27.50 |
| 4. | 13.00 | — | — | — | 200 | 25.91 |
| 5. | 21.50 | — | 0.00682 | 5.5 | 200 | 28.26 |
| 6. | 16.709 | — | — | — | 300 | 23.40 |
| 7. | — | — | — | — | 200 | 28.00 |
| 8. | 7.63 | — | 0.50 | — | 180 | 35.00 |
| 9. | 5.60 | 9.50 | — | 9.5 | 300 | 31.95 |
| Cinkara | 20.59 | 49.07 | 2.00 | [illegible] | [illegible] | 34.44 |




لازمی بنیادی عناصر، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکب

# سنکارا

مشہور عالمی ٹانک — ہر موسم میں سب کے لیے

ہمدرد


بہار نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے، دردانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ کے لئے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے پھنسی، خارش اور داد دھبوں کی دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U. ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

Litho Colour Printer: Achal Tal G. T. Road Aligarh Phone: 24185